کالا جادو
ایم اے راحت

پہلی مرتبہ مکمل 178 اقساط کے ساتھ

کالا جادو

ایم اے راحت

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546-37668958

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کرکے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخِ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

پیش لفظ

کائنات کے لاکھوں سربستہ رازوں میں سے ایک ''کالا جادو'' ہے۔ اس کی حقیقت بے شمار پیش آنے والے واقعات سے ثابت ہوتی ہے۔ مالک ایزدی نے شیطان کو ملعون کیا اور شیطان نے انسانوں کو بہکانے اور انہیں برے راستوں پر لگانے کی قسم کھائی۔ شیطانی طاقتیں اپنے ہتھکنڈے بروئے کار لائیں اور انہی میں سے ایک کالا جادو ہے جسے استعمال کر کے انسانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ ہندو ازم میں اسے بڑی فوقیت حاصل ہے۔ ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں اسے خصوصاً دشمنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جادو کی ہانڈیاں جنہیں ''مٹھ'' کا نام دیا جاتا ہے فضاؤں میں پرواز کرتی ہیں اور دشمنوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

میں نے کالے جادو کے مدارج پر تحقیقات کے لئے بھرپور جدوجہد کی ہے اور اس کے لئے جن چند لوگوں سے مدد حاصل کی ہے ان میں پنڈت سیوا رام جنم کنڈ' متھرا' دھونی مل چمار اور ہری مل اچھوت کے نام نمایاں ہیں۔ انہوں نے مجھے بیر' بھیروں' سر کٹے' لونا چماری' چڑیل' بھوت اور پدما' شنکھا اور کھنڈولا کی تفصیل بتائی اور میں نے اس سے استفادہ کر کے یہ سب کچھ ''کالا جادو'' میں استعمال کیا ہے۔

''کالا جادو'' 78 ہفتے تک ہفت روزہ میں قسط وار شائع ہوئی۔ تو 78 اقساط میں کتابی صورت میں زائد صفحات بننے کی وجہ سے ایڈیٹر کے کہنے پر میں نے کہانی کو اس انداز میں ایڈٹ کیا کہ قارئین کہانی میں کسی قسم کی کوئی تشنگی محسوس نہ کر سکے۔

ایک عرصے کے بعد ہفت روزہ میں کالا جادو کی اشاعت جب دوبارہ شروع ہوئی تو قارئین نے کتابی صورت میں بھی مکمل اقساط کی پرزور فرمائش کر دی تو انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو لیجئے قارئین کالا جادو مکمل اقساط میں نئی تزئین اور تمکین کے ساتھ مطالعہ فرمایئے۔

ایم۔ اے۔ راحت

مجھے اپنا مستقبل تعمیر کرنے کے لئے آسان راستوں کی تلاش تھی اور میرے جیسے کئی ساتھی میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہم دوسروں کی محنت پر گزارا کرتے تھے اور ہم سے محبت کرنے والے، ہمیں چاہنے والے ہمیں ہماری ضرورت کے لئے دیتے تھے۔ ریس، سٹہ، فلیش، ہر طرح کی شرطیں ہمارا ذریعہ آمدن تھیں اور ہم انہی میں کمال حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ اس کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے تھے۔ رفیق کہتا۔

''کچھ ہونا چاہئے استاد......کوئی لمبا ہاتھ لگ جائے تو پو بارہ ہو جائیں۔''

''لمبا ہاتھ کہاں ہے؟''

''کوشش تو کرنی چاہئے۔''

''مشکل ہے۔ بہروپئے ہزاروں ہیں، کام کا کوئی نہیں ملتا۔''

''یار! کوئی چلہ وغیرہ کیا جائے جس سے سٹے اور گھوڑے کا نمبر معلوم ہو جایا کرے۔''

''آسان نہیں ہے۔ عمل اُلٹا بھی ہو جاتا ہے اور پھر ایسا اُلٹا کرتا ہے کہ کبھی سیدھے نہیں ہو پاتے۔''

میں ایک دن قصائی کی دُکان سے گوشت خرید رہا تھا۔ دست کا گوشت تھا۔ قصائی نے بڑی ہڈی سے گوشت صاف کیا اور پھر ہڈی کو بغدا مار کر توڑا اور ایک طرف ڈال دیا۔ یہ عمل میں نے بیشتر قصائیوں کو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دن پوچھے بغیر نہ رہ سکا......

''شیخ جی! ایک بات تو بتایئے۔ آپ لوگ اس ہڈی کو توڑ کر کیوں پھینک دیتے ہیں؟ جبکہ دوسری ہڈیوں کے ساتھ آپ ایسا نہیں کرتے۔''

''میاں جی! باپ دادا کی روایت ہووے ہے۔ یہ ثابت ہڈی سفلی عمل کرنے والوں کے کام آوے ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اسے ہمیشہ توڑ کر پھینکنا چاہئے۔''

''اس سے سفلی عمل ہوتا ہے؟''

''یہی سنا ہے جی۔''

سفلی عمل کیسے ہوتا ہے؟ اور یہ ہڈی کہاں استعمال ہوتی ہے؟ اس بارے میں تو کچھ نہیں معلوم تھا، لیکن ذہن بھٹک گیا تھا۔ دوستوں سے تذکرہ کیا تو انہیں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ایک جاننے والے بزرگ سے ملاقات ہوئی اور ان سے یہی سوال کیا تو وہ بولے۔

''ہاں میاں! گندے علم تو ہوتے ہیں۔ ایمان کھونے میں کتنی دیر لگے ہے، مگر مسلمان بچے ہو ایسی باتوں کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے۔''

سنا اور کان سے اُڑا دیا۔ کسی سفلی عمل والے کی تلاش شروع کر دی۔ میرا شہر بڑا خوبصورت تھا۔ زندگی سے بھرپور چھوٹی بڑی عمارتوں، بازاروں اور صنعتوں سے سجا ہوا۔ مشرق میں لہلہاتے کھیت حد نگاہ تک چلے گئے تھے۔ مغرب میں نگاہ کی حد سے خوب صورت پہاڑی ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ریس کورس کا میدان اسی سمت تھا اور اسی طرف سے پیر پھاگن کے مزار

کو راستہ نکلتا تھا۔ ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کا مشاہدہ میرا دلچسپ مشغلہ تھا اور اکثر عام دنوں میں بھی اس طرف نکل آتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دیر تک اصطبل میں بندھے ہوئے گھوڑوں کی ناز برداری دیکھتا رہا' پھر یونہی آوارہ گردی کرتا ہوا ٹیلوں کی طرف نکل گیا۔ خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا وجود نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر آواز پیدا کر رہے تھے۔ کافی دُور نکل آیا۔ پھر ایک طرف نظر اُٹھی اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ انسان ہی تھا۔ بہت چھوٹے قد کا مالک۔ سوکھا بدن' گھٹا ہوا سر' اوپری بدن برہنہ' نچلے جسم پر چھوٹی سی دھوتی بندھی ہوئی۔ گلے میں جنیئو پڑا ہوا' آنکھیں بند کئے ایک نکیلے پتھر پر ایک پاؤں سے کھڑا ہوا تھا۔ دُور سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ دلچسپی پیدا ہوگئی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ مکروہ شکل تھی۔ بندر کی طرح اُبھری ہوئی پیشانی' سانولا رنگ۔ میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے اپنا اٹھا ہوا پاؤں نیچے رکھ لیا۔ اطراف میں ایک عجیب سی چراند پھیلی ہوئی تھی' جو بدبودار تھی۔ وہ مجھے دیکھنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی شیطانی چمک پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بھی شیطنت لئے ہوئے تھی۔ نجانے کیوں مجھے اپنے بدن میں کچھ جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں ایک شدید سرد لہر دوڑ گئی تھی۔

''کا ہے رے چھورا! کا ہے ٹکر ٹکر دیکھے ہے؟'' اس کی باریک سی آواز اُبھری' جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ لگتی تھی۔

''کون ہو تم؟'' میں نے سنبھل کر کہا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''جو کوئی بھی ہیں...... ہیں تیرے کام کے۔'' اس نے مخصوص آواز میں جواب دیا۔

''سادھو ہو......؟'' میں نے اس کے حلئے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تجھے کا لگ رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا اور میرے ذہن میں بجلی سی چمک گئی۔ ہو سکتا ہے یہ سادھو میرے کام آ جائے۔ ذہن میں وہ تمام گندے خیالات جاگ اُٹھے تھے' جن کے تصور میں دن رات سرگرداں رہتا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے تمہاری تلاش تھی۔''

وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور کچھ فاصلے پر پڑے دو پتھروں کے پاس پہنچ گیا اور ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔ ''بیٹھ جا۔'' اور میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔

''تُو کا ہماری تلاش تھی تو ہم بھی تیرے ہی لئے یہاں آئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تعجب سے پوچھا اور وہ خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

''تجھے ہماری تلاش کا ہے تھی بھائی؟ کوئی بات تو ہووے گی نا تیرے دل میں۔''

''تم سادھو ہو' مجھے سٹے وغیرہ کا نمبر بتا سکتے ہو؟ یہ بتا سکتے ہو کہ اب کی ریس میں کون کون سے گھوڑے اوّل آئیں گے؟''

وہ اس طرح ہنس پڑا جیسے اسے مجھ سے اسی سوال کی توقع تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''اگر ہم تجھے ایک گھوڑے اور ایک سٹے کا نمبر بتا دیں تو تیرا کا بھلا ہوئے۔ ارے کام کر و سو پکا۔ اگر تجھے زندگی بھر گھوڑے اور سٹے کا نمبر معلوم ہوتا رہے تو کا برا ہوئی رے۔ پر بٹوا! ہر کام کو کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔''

میرے دل میں دلچسپی اور تجسس پیدا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے کیا محنت کرنی پڑے گی؟''

''ایک علم ہووے ہے' جسے تُو اگر سیکھ لے تو ای سمجھ لے کہ دولت تیرے پیروں میں ڈھیر لگی ہوگی۔''

میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ یہ تصور تو نجانے کب سے میرے سینے میں پل رہا تھا کہ ایسی کوئی قوت مجھے مل جائے' جس سے میں دنیا کا امیر آدمی بن جاؤں۔ میں نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

''اگر تم میرا یہ کام کر دو سادھو بابا! تو میں زندگی بھر تمہارے قدموں میں رہوں گا۔''

"اپنا کام تجھے خود ہی کرنا ہوگا بٹوا! بس ای سمجھ لو کہ ہم تیری مدد کریں گے۔"

"تو بس یوں سمجھ لو کہ میں آج سے تمہارا چیلا۔" وہ پھر اسی انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "مگر ایک بات پکی کرنی ہوگی تجھے' جو ہم کہیں گے وہی کرے گا۔ نہیں تو تیرا نقصان ہو جائے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو تم کہو گے وہی کروں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ابھی ہم کئی دن یہاں رہیں گے۔ تُو کسی اور کو ہمارے بارے میں مت بتانا۔ ورنہ ہمیں پتہ چل جائے گا اور پھر ہم تجھے ناہی ملیں گے۔"

"نہیں بتاؤں گا۔"

"تو پھر سن! ایک ہڈی لانی ہوگی تجھے' عمل کرنے کے لئے۔ وہ ہڈی جناور کے بازو میں ہووے ہے' ثابت لانی پڑے گی' کہیں سے ٹوٹی پھوٹی نہ ہو۔"

مجھے ایک دم شیخ جی کی بات یاد آ گئی تھی اور اس وقت اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا تم سفلی عمل کرو گے سادھو بابا؟"

"اب تُو ہمارے کان مت کھا...... جو کچھ ہم کریں گے وہ تیری آنکھوں کے سامنے ہی ہوگا۔ پر ایک بات پھر کہیں تجھ سے۔ بات کریو تو سوچ کی۔ ہم کچی بات کرنے والے کو چھوڑتے نہیں ہیں۔"

"میں بھی پکی ہی بات کرتا ہوں سادھو بابا!...... نام کیا ہے تمہارا؟"

"بس رے' جو نام تُو نے رکھ لیا وہی ہے۔ یہ ہڈی تُو کب لائے گا؟"

"کل ہی۔"

"تو ٹھیک ہے کل ادھر آ جائیو ہم انتظار کریں گے۔ بس اب جا۔"

میں خاموشی سے پتھر سے اٹھ گیا اور گردن جھکا کر واپس چل پڑا۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پاؤں لرز رہے تھے۔ ایک طرف ہلکا سا خوف بھی تھا اور دوسری طرف بے پناہ مسرت کا احساس بھی۔ واقعی اگر مجھے ایسی مستقل قوت حاصل ہو جائے تو پھر دنیا دیکھے گی کہ میں کیا بن گیا ہوں۔ خصوصی طور پر اس بات کو دل میں چھپائے رکھا اور اس بات کے منصوبے بناتا رہا کہ ہڈی کے حصول کے لئے کیا کرنا چاہئے اور ایک ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ دوسرے دن گوشت مارکیٹ گیا اور اچھی خاصی مہنگی قیمت پر جانور کا پورا دست حاصل کر لیا' کیونکہ قصائی ہڈی توڑے بغیر نہ دیتا اور بات عام ہو جاتی۔ اس کے بعد اسے کاغذ میں لپیٹ کر کندھے پر رکھتے ہوئے اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ ٹیلے کے قریب بیٹھ گیا اور پہلے سے ساتھ لائی ہوئی تیز دھار چھری کی مدد سے اس ہڈی سے گوشت صاف کرنے لگا۔ یہ کام مشکل ترین تھا اور اسے صاف کرتے ہوئے طبیعت جھک ہو گئی تھی' لیکن لگن کام کر رہی تھی اور بڑی مشکل سے صحیح سالم ہڈی نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور گوشت پر جھپٹا مارنے کے لئے نیچی پرواز کر رہی تھیں۔ کئی بار انہیں اُڑانا بھی پڑا۔ جب صاف ستھری ہڈی نکل آئی اور میں تھک کر پسینہ پسینہ ہو گیا تو اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

میرے ہٹتے ہی چیلوں کے غول گوشت پر جھپٹے مارنے لگے تھے۔ میں برق رفتاری سے اسی جانب جا رہا تھا' جہاں سادھو مجھے ملا تھا۔ وہ اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرایا' جیسے اسے میرے آنے کا یقین ہو اور پھر اس نے بڑی چاہت سے وہ ہڈی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے' آنکھیں سورج پر گاڑ دیں اور نجانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ دیر تک اسی عمل میں مصروف رہا اور اس کے بعد اس نے وہ ہڈی ایک پتھر پر رکھ دی اور مجھ سے بولا۔

"اب تُو کل شام ڈھلے ہمارے پاس آنا' پرسوں جمعرات ہے نا؟"

"ہاں۔"

"کل ضرور آ جانا' ورنہ پھر تجھے ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔"

''کس وقت آؤں میں تمہارے پاس؟''

''کوئی چھ بجے۔'' اس نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ وہ بولا۔ ''جا' اب بھاگ جا۔ زیادہ دیر رُکنا اچھا نہیں ہوگا۔''

میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ بس یوں لگ رہا تھا' جیسے میرا کام بننے ہی والا ہے۔ یار دوستوں سے ملاقات بھی ہوئی' لیکن یہ کوئی بتانے والی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی مجھے اس کے لئے منع کر دیا گیا تھا۔ اگر انہیں بتا دیتا تو وہ سب بھی سادھو بابا کی طرف دوڑ پڑتے' لیکن بڑی بے چینی ہو رہی تھی اور بڑا تجسس تھا۔ دوسرا دن بھی نجانے کس طرح کٹا۔ تیار ہوا اور جیسے ہی ساڑھے چار بجے گھر سے نکل آیا' سادھو بابا کا خیال دل میں تھا۔ وقت گزارتا رہا اور مقررہ وقت پر وہاں جا پہنچا۔

سادھو کے سامنے اس وقت نجانے کیا الا بلا رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی لکڑیاں آپس میں جوڑ کر رکھی گئی تھیں اور ان میں مدھم مدھم آگ سلگ رہی تھی۔ وہی چراند اور بدبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی' جو پہلے دن میں نے محسوس کی تھی۔ ایک عجیب سا طلسمی ماحول تھا۔ بوڑھے سادھو نے مجھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنا کام کر لیا ہے۔ اب تیرا کام باقی ہے۔''

''مجھے بتاؤ سادھو بابا! مجھے کیا کرنا ہے؟''

''پہلے وعدہ کر' میں جو کہوں گا وہ تُو ضرور کرے گا۔''

''یہ وعدہ تو میں پہلے ہی کر چکا ہوں بابا جی!''

''تو پھر رُک .....'' سادھو نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر عقب کے پہاڑی ٹیلے کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نجانے کس چیز سے بنا ہوا ایک بدہیئت انسانی شکل کا پُتلا تھا۔ اُس نے یہ پُتلا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے اپنے لباس میں چھپا لے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بڑی کراہیت کا احساس ہوا۔ پتلا لجلجا اور بدبودار تھا۔ اس میں عجیب سی ٹھنڈک تھی' لیکن میں نے کسی بات پر توجہ نہیں دی۔ سادھو نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تُو یہاں سے پیر پھاگن کے مزار پر جائے گا۔ سیڑھیاں طے کر کے اوپر جانا اور قبر کے پیچھے جو تین طاق بنے ہوئے ہیں' ان میں سے بیچ کے طاق میں یہ پُتلا رکھ دینا۔ بس یہی تیرا کام ہے۔ بعد میں سب ہمارا کام ہوگا اور تیرے مجے ہی مجے ہوں گے۔''

''پیر پھاگن کے مزار پر؟'' میں نے سہم کر کہا۔ دل کے کسی گوشے میں کچھ ایمان باقی تھا۔ پیر پھاگن سے بچپن سے عقیدت تھی اور ساری آوارگیوں کے باوجود ان کا احترام دل میں تھا۔ اس کی وجہ شاید اس مزار سے منسوب کہانیاں تھیں۔

''ای کام اب تجھے کرنا ہے۔ اس سے منہ موڑے گا تو ای دنیا تو ہار واسطے نرکھ بن جائے گی۔ جا' جلدی کر۔ نئیں تو رات ہو جائے گی۔''

میں لرزتے قدموں سے واپس مڑا۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر پیر پھاگن کے مزار کا معاملہ نہ ہوتا تو میں خوشی سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا' مگر نہ جانے کیوں دل کو ایک جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے کوئی غلیظ اور ناپاک شے اس مقدس جگہ لے جا رہا ہوں۔ کچھ دور جا کر میں نے گردن موڑی' مگر بوڑھا وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ناپاک پتلا مجھے اپنے سینے پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دور چل کر ایک اور عجیب احساس ہوا۔ پتلے میں انسانی جسم جیسی حرکت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور شاید یہ میرے خوف کا تخلیق کردہ احساس تھا کہ وہ پُتلا مجھے اپنے سینے کے قریب کلبلاتا محسوس ہو رہا تھا' جیسے اس میں جان پڑ گئی ہو۔ خوف و دہشت کی سرد لہریں میرے بدن میں دوڑنے لگیں' مگر میں اسے لباس میں سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ مزار تک کا فاصلہ نہ جانے کس طرح طے کیا۔ مزار ایک ٹیلے پر تھا اور وہاں تک جانے کے لئے ٹیلے پر اُنیس سیڑھیاں تراشی گئی

تھیں۔ میں نے لرزتے قدموں سے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ اوپر خاموشی چھائی ہوئی تھی‘ چونکہ یہ مزار شہر سے بالکل باہر تھا اور یہاں زیادہ لوگ نہیں آتے تھے۔ ہاں جمعرات کو یہاں رونق ہوتی تھی اور کافی لوگ نذر نیاز کرنے آ جاتے تھے۔ عام دنوں میں بس چند مجاور یا ملنگ یہاں موجود ہوتے تھے۔

میں سہما سہما سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ دماغ ایک ہیجانی کیفیت کا شکار تھا اور بدن میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ پاؤں مسلسل اوپر اٹھ رہے تھے اور میں بلندی پر پہنچتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی ایک انوکھا احساس ہوا۔ یہ اُنیس سیڑھیاں تو اب تک طے ہو جانی چاہئے تھیں۔ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ مزار اتنا بلند نظر آیا کہ ہوش اُڑ گئے۔ یہ اُنیس سیڑھیاں اُنیس سو سیڑھیاں بن گئی تھیں۔ خوف کے عالم میں پلٹ کر نیچے دیکھا تو جان ہی نکل گئی۔ زمین سینکڑوں فٹ نیچے نظر آ رہی تھی۔ بدن پر شدید کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ کیا ہو گیا؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟ بے شمار بار اس مزار پر آیا تھا‘ مگر یہ اتنا اونچا تو نہیں تھا۔ اوپر نظر ڈالتا تو سیڑھیاں آسمان میں گم نظر آتیں۔ نیچے دیکھتا تو خوف سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔

’’ہمت کر...... ہمت کر چڑھتا جا۔ پہنچ جائے گا۔‘‘ میرے کانوں میں وہی منحوس باریک آواز اُبھری اور میں اُچھل پڑا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ پھر اس کا مخرج علم میں آ گیا۔ میرے سینے کے قریب لباس میں پوشیدہ پُتلا بول رہا تھا۔ رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ میرے حلق سے کئی دہشت بھری چیخیں بلند ہوئیں اور میں پلٹ کر نیچے بھاگا۔ میرے سینے کے قریب شدید ہلچل پیدا ہو گئی۔ پُتلے کے ننھے نوکیلے ہاتھ میرے سینے میں چبھ رہے تھے۔ وہ مجھے روکنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اس کی چبھتی ہوئی باریک آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔

’’او پاپی!...... او مورکھ! کیا کرے ہے؟ ارے تیرا ستیاناس‘ بنا بنایا کام بگاڑے دے رہا ہے۔ ارے سنبھل رُک۔ ڈرنے کی ضرورت نا ہے۔ ہمت سے چل‘ اوپر پہنچ جائے گا۔‘‘ میرے قدم نہ رک پائے تھے۔ مزید حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ پہلے مجھے زمین جتنی نیچے نظر آئی تھی‘ اب اتنی نیچے نہ رہی تھی۔ میں آخری سیڑھی عبور کر رہا تھا کہ پاؤں لڑکھڑائے اور میں بری طرح نیچے گرا۔ نیچے پتھریلی زمین تھی۔ سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور آنکھوں میں سورج اُتر آیا۔ پھر گہری تاریکی چھا گئی۔ نہ جانے کب تک یہ کیفیت رہی تھی۔ ہوش آیا تو ماموں ریاض کی آواز سنائی دی۔

’’کیسی طبیعت ہے مسعود؟ کیا حال ہے بیٹے؟‘‘ میری آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ کچھ صاف نہیں نظر آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت دور ہوئی۔ والدہ کا چہرہ نظر آیا اور پھر ان کی رندھی ہوئی آواز اُبھری۔

’’مسعود بیٹے! آنکھیں کھولو۔ کیسی طبیعت ہے بیٹے؟‘‘ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں گزرے ہوئے واقعات یاد تھے۔ وہ خوفناک لمحات پوری طرح ذہن میں تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ سینے پر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ موجود نہیں تھا۔ دل کو قرار سا ہوا۔ میں نے ماموں ریاض کو دیکھا‘ والدہ کو دیکھا اور اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی‘ لیکن ماموں ریاض نے جلدی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

’’نہیں نہیں‘ لیٹے رہو۔ بہت کمزور ہو گئے ہو گے۔ لیٹے رہو۔ کیسی طبیعت ہے؟‘‘ میں نے کہنا چاہا کہ ٹھیک ہوں‘ مگر منہ سے آواز نہیں نکل سکی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ دوبارہ کوشش کی‘ مگر گلا بھنچا ہوا تھا‘ آواز نہ نکل سکی۔

’’چائے لے آؤں؟‘‘ والدہ نے کہا۔

’’ہاں ڈاکٹر صاحب نے یہی کہا تھا۔ آپ لے آیئے۔‘‘ ریاض ماموں بولے اور والدہ اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ میں اپنے گھر میں تھا‘ اپنے کمرے میں تھا۔ نہ جانے یہ سب کیسے ہوا تھا؟ اور میری آواز کو کیا ہو گیا تھا؟ ماموں ریاض نے کہا۔

’’بولو مسعود میاں! کیا ہوا تھا؟ پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے؟ وہاں بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟ تمہیں اندازہ ہے کہ پورے دو دن کے بعد ہوش میں آئے ہو۔ سخت بخار میں پھنک رہے تھے۔ وہاں مزار کے مجاوروں نے تمہیں بے ہوش پڑے پایا تھا۔ اتفاق سے میرے ایک شناسا حیدر علی مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے ہوئے تھے‘ تمہیں جانتے تھے۔ وہی تمہیں

یہاں تک لائے تھے۔ کیا واقعہ ہوا تھا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔''

میں نے بولنے کے لئے زور لگایا' مگر آواز کسی طرح نہ نکل سکی اور میرے چہرے پر بے بسی پھیل گئی۔ ماموں ریاض کو شاید احساس ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اتنی دیر میں والدہ چائے لے آئی تھیں۔ ماموں ریاض بولے۔ ''یہ بول نہیں پا رہا باجی۔''

''ہیں......؟'' والدہ متوحش لہجے میں بولیں۔

''ہاں...... یوں لگ رہا ہے جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہے' لیکن آواز نہ نکل رہی ہو۔''

''کیا ہو گیا میرے بچے کو...... الٰہی خیر۔ کیا ہو گیا اسے؟'' والدہ صاحبہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''حوصلہ رکھیں باجی! اللہ بہتر کرے گا۔ اٹھو مسعود میاں چائے پی لو۔ بدن میں جان آئے گی۔'' مجھے اٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ ماموں میاں نے چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگائی' مگر منہ ہی نہ کھل سکا۔ لاکھ کوشش کی' مگر ہونٹ ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ماموں ریاض اب بے حد پریشان نظر آنے لگے۔ پھر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''چمچہ لے آیئے۔ شاید منہ کھولنے میں دقت ہو رہی ہے۔'' تمام جتن کر لئے گئے' مگر میرا منہ نہ کھلا۔ والد صاحب بھی آ گئے۔ مجھ پر تبصرے ہوتے رہے۔ والد صاحب کے ایماء پر مجھے کاغذ تھما دیا گیا تاکہ میں لکھ کر کچھ بتانے کی کوشش کروں' لیکن میری انگلیاں اکڑ گئیں۔ قلم پر گرفت ہی قائم نہ رہ سکی۔ شام کو کئی ڈاکٹر آئے' میرے معائنے ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ میں غذا اور پانی سے محروم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے فالج کا اثر ہو۔ سب لوگ میرے سامنے ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں' مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے دن مجھے ایک اچھے ہسپتال میں داخل کیا جائے گا۔

رات ہو گئی۔ اہل خاندان کی پریشانی کا مجھے پورا احساس تھا۔ دل میں سخت شرمندہ تھا کہ مصیبت خود مول لی ہے۔ دوسرے بھی پریشان ہوئے اور اپنی جان پر بھی بن گئی۔ آدھی رات تک سب میرے قریب رہے۔ پھر مجھے نیند آ گئی تو مجھے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آنکھ کھل گئی۔ مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ مگر رات کا وقت تھا۔ وولٹیج زیادہ ہونے کی وجہ سے اس زیرو کے بلب کی روشنی تیز ہو گئی تھی۔ پہلے میری نگاہ چھت پر پڑی' جہاں ایک غیر معمولی طور پر بڑی مکڑی چپکی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی اور ہیبت ناک مکڑی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ خاص طور سے اس کی آنکھیں۔ وہ سرخ آنکھیں مٹر کے دانوں کے برابر تھیں اور مجھے گھور رہی تھیں۔ میرے بدن میں خوف و دہشت کی لہریں اٹھنے لگیں۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے اس بھیانک مکڑی کو دیکھتا رہا۔ اچانک اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور اپنے بدن کے لیس دار مادے کا ایک تار چھوڑتی ہوئی وہ اس کے سہارے نیچے اترنے لگی۔ اس کا نشانہ میرا سینہ تھا۔ دہشت سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ مکڑی میرے سینے پر اتر گئی اور یہ دیکھ کر میری سانس رکنے لگی کہ اس کا چہرہ بوڑھے سادھو کا چہرہ تھا۔ بدن مکڑی کا تھا اور اس کا ہلکا سا وزن مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بوڑھے سادھو کی وہی منمناتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

''تو نے وعدہ خلافی کی ہے مورکھ!''

''مم...... میں نے...... میں نے......'' میرے منہ سے نکلا اور اپنی آواز کھل جانے پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

''تجھ سے پہلے ہی کہا تھا میں نے' مجھ سے کام لینا ہے تو ہمت کرنا ہو گی۔ پہلے میرا کام کرنا ہو گا۔ اس کے بعد سنسار میں تیرے لئے اتنا کچھ ہو گا کہ تجھ سے سنبھالے نہ سنبھالا جائے گا۔ دولت تیرے سامنے کوڑے کے ڈھیر کی طرح پڑی ہو گی۔ تو منہ سے جو بات نکالے گا' پوری ہو گی۔ اب بھی میں تجھ سے یہی کہتا ہوں۔ پتلا وہاں پہنچا دے جہاں میں چاہتا ہوں۔ تیرا کام ختم ہو جائے گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو......''

''آخر تو کون ہے؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''میں تیری خوش بختی ہوں مورکھ! میرا یہ کام ایک مسلمان ہی کر سکتا تھا۔ وہ مسلمان جو خود میرے پاس آئے' مجھ سے کچھ لینا چاہے۔ تُو نہیں جانتا کہ پُتلا وہاں پہنچ گیا تو مجھے کیا مل جائے گا اور تُو خود ہی تو آیا تھا میرے پاس' مجھ سے اپنا کام کروانے۔ تُو نے ہڈی لا کر دی تھی مجھے۔''

''مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں ایک پاک بزرگ کے مزار پر تیری نجاست نہیں لے جا سکتا اور پھر تجھے بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرے مزار پر جانے کے راستے بند ہو گئے تھے۔ سیڑھیاں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ میں اوپر پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔''

''بھول ہے تیری۔ تُو نے نو سیڑھیاں چڑھی تھیں۔ دس باقی رہ گئی تھیں۔ بس تیری آنکھوں کو دھوکا دیا تھا میاں جی نے۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اوپر جا سکتا تھا۔ یہ ہمت تو کرنی ہے تجھے۔''

''نہیں سادھو! میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

''اب یہ نہیں ہو سکتا بالک! یہ تجھے کرنا ہی پڑے گا۔ سن بالک! میں تجھے تین دن دیتا ہوں۔ ان تین دنوں میں' میں تجھے سمجھاؤں گا اور اگر پھر بھی تیری سمجھ میں نہیں آیا تو تُو وہ دیکھے گا' جو دیکھ نہ پائے گا۔ خون کے آنسو روئے گا تُو اور تیرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ ہو گا۔ جا' ٹھیک ہے۔ سمجھ میں آ جائے گا تو اسی جگہ میرے پاس آ جانا اور نہ سمجھ میں آئے تو......''

مکڑی میرے سینے سے اُٹھ گئی اور اسی تار کے ذریعے اوپر جا رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ چھت سے چپک گئی تھی۔ پھر اس کا جسم چھوٹا ہونے لگا اور پھر وہ ایک ننھا سا دھبہ بن کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ یہ دھبہ کھسکنے لگا۔ پھر ایک جگہ دیوار سے اتر کر کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔ خوف و دہشت اب میرے لئے بے معنی ہو گئے تھے۔ جو کچھ نگاہوں سے گزر چکا تھا' وہ خود میرے لئے ناقابل یقین تھا' لیکن قصور میرا ہی تھا۔ اتنا بے عقل نہیں تھا کہ اچھا برا نہ سمجھتا۔ لالچ نے آنکھیں بند کر دی تھیں اور گندے علوم کا سہارا لے کر تقدیر بنانے کی کوشش کی تھی۔ کسی سے کچھ کہتا بھی تو کیا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اب تک شاید اس گندے جادو کے زیر اثر تھا اور اب اس سے آزاد ہو گیا تھا۔ بدن کو ایسی شدید نقاہت کا احساس ہوا کہ پورے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ زبان تالو سے چپک گئی' کیونکہ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ دے رہے تھے۔ پہلے جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی' اب نہیں تھی۔ گھر والے بے چارے تھک کر سو گئے تھے۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ نجانے کس طرح دیواریں پکڑ پکڑ کر باورچی خانے تک جا پہنچا۔ روشنی جلائی اور اس کے بعد کھانے پینے کی اشیاء تلاش کرنے لگا۔ کھانا تیار ضرور کیا گیا تھا' لیکن جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ گھر والے بے چارے خود اپنی پریشانیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ کوئی کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ میں نے خود ہی پانی پینے کے بجائے کھانے پینے کی کچھ چیزیں نکالیں اور انہیں کھانے میں مصروف ہو گیا۔ غالباً باورچی خانے میں ہونے والی روشنی اور پھر برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ نے دوسرے لوگوں کو بھی جگا دیا۔ والد صاحب' ان کے پیچھے والدہ اور والدہ کے عقب میں ریاض ماموں باورچی خانے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ حیران کن منظر دیکھا اور پریشان ہونے کے بجائے خوش ہو گئے۔ والدہ کے منہ سے آواز نکلی۔

''الٰہی! تیرا شکر ہے۔ الٰہی تیرا شکر ہے۔ بھوک لگ رہی ہے میرے بچے! تُو پیچھے ہٹ' میں تجھے کھانا دیتی ہوں۔''

''نہیں امی! میں نے کھانا کھا لیا ہے۔ بس ایک گلاس پانی دے دیجئے۔'' میں نے کہا اور ان سب کے زرد چہرے خوشی سے کھل گئے۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی اور اس سے ایک سال چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ دونوں شاید نہیں جاگے تھے' لیکن باقی تینوں افراد میرے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مجھے بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ والدہ نے اپنے کمرے کا بستر درست کیا' ایک طرف جائے نماز بچھی ہوئی تھی۔ اس کا کونا موڑ دیا گیا تھا اور اس پر تسبیح بھی رکھی ہوئی تھی۔ غالباً والدہ جاگ رہی تھیں اور میرے لئے دعائیں کر رہی تھیں۔ والد صاحب مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''بیٹے! اب کیسی طبیعت ہے؟ اب تو تم بول سکتے ہونا' ہاتھ پاؤں بھی ٹھیک ہیں؟''
''جی ابو!''
''مگر بیٹے! کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا تھا؟''

یہ بات تو میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ ان لوگوں کو اپنی اس گندی حرکت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے خاموشی ہی اختیار کی تو ریاض ماموں بولے۔ ''رہنے دیجئے بھائی جان! یہ بالکل صحت مند ہو جائے تو ہم اس سے پوچھ لیں گے۔ دماغ پر زور ڈالنا مناسب نہیں ہے...... تم یوں کرو مسعود میاں! یہیں سو جاؤ' باجی کے بستر پر۔ کسی قسم کی کوئی گرانی تو محسوس نہیں کر رہے؟''

''نہیں...... اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''یہ تو یاد ہوگا کہ تم پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے؟'' والد صاحب نے پوچھا۔ شدید تجسس انہیں بے چین کر رہا تھا۔ مگر ماموں ریاض نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! خدا کے لئے ابھی یہ تمام باتیں رہنے دیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی مشکل سے صورتحال درست ہوئی ہے۔'' والد صاحب خاموش ہو گئے۔ ماموں ریاض ہمارے ساتھ ہی ہمارے گھر میں رہتے تھے۔ نانا' نانی مر چکے تھے۔ ان کی بھی بس یہ ایک بہن تھیں' جو میری والدہ تھیں۔ مجھ سے بس چند سال ہی بڑے تھے۔ بڑے باہمت اور مخلص آدمی تھے' لیکن میں نے انہیں بھی اپنی کارستانیوں کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ بہر طور مجھے افسوس تھا کہ میری غلط حرکت کی وجہ سے ان لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ دوسرے دن والد صاحب بھی دفتر نہیں گئے۔ ماموں ریاض نے بھی چھٹی کر لی تھی۔ بہن اور بھائی بھی گھر ہی میں تھے اور سب خوش نظر آ رہے تھے۔ میری جسمانی کیفیت بالکل اعتدال پر تھی۔ بس دل کی دھڑکنیں تیز تھیں اور یہ خوف بار بار دل کو دہلا رہا تھا کہ کہیں وہ منحوس جادوگر کوئی ایسا عمل نہ کرے جس کی وجہ سے ان لوگوں کو دوبارہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بڑا ہی پچھتاوا تھا دل کو کہ اپنی ایک غلط حرکت کی وجہ سے پورے گھر کے لئے مصیبت مول لے بیٹھا۔

دن پرسکون گزر گیا۔ پر رات خوفناک تھی۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ اپنے کمرے میں نہ سوؤں' لیکن ان لوگوں سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ پورا دن چونکہ بہتر گزارا تھا' اس لئے اب وہ لوگ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ بس قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ البتہ جب آنکھیں بند ہوئیں تو خوابوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایسے ایسے بھیانک خواب نظر آ رہے تھے کہ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ کبھی میں خود کو ایک ویران کھنڈر میں دیکھتا جس کی دیواریں ٹوٹی پھوٹی ہوتیں۔ میں فرش پر لیٹا ہوتا اور چھت سے اینٹیں نکل کر نیچے گر رہی ہوتیں۔ میں اس خوفناک منظر سے دہشت زدہ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک ستون کا سہارا لینے کے لئے اسے پکڑا' لیکن اچانک ستون نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پھر بہت سی انسانی آوازیں مجھے سنائی دیں اور میں جاگ گیا۔ آوازیں درحقیقت باہر سے آ رہی تھیں۔ میں حیران سا ہو کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ گھر کے تمام افراد صحن میں کھڑے ہوئے ہیں۔ تیز روشنی ہو رہی ہے اور سامنے کامن باتھ روم کے قریب ایک بڑے تھال میں کوئی چیز رکھی ہوئی ہے' جو سب کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ میں آگے بڑھا تو وہ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ والدہ صاحبہ دل پکڑے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں۔ ماموں ریاض بھی سہمے سہمے سے نظر آ رہے تھے۔ اس تھال میں' میں نے دو کالے بکروں کے کٹے ہوئے سر اور ایک بڑی سی کلیجی رکھی ہوئی دیکھی۔ اس کے چاروں طرف خون کے دھبے بکھرے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے پریشان لہجے میں کہا۔ ''خدا جانے کیا ہے یہ سب۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' یہ کہاں سے آیا؟ آخر یہ ہو کیا رہا ہے' میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ اب بتاؤ کیا کریں ان چیزوں کا؟''

''خ...... خدا کے لئے' یہ تو سفلی کا عمل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی ہمارے لئے کچھ کرا رہا ہے۔ مگر کون؟ بھلا ہمارا کون دشمن ہو گیا؟ دنیا میں کسی سے جھگڑا نہیں ہے ہمارا۔ الٰہی خیر۔ یہ ہمارے گھر کو کیا ہو رہا ہے؟'' والدہ صاحبہ رندھی ہوئی آواز میں

بولیں۔ بہن بھائی بھی سہمے ہوئے انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے ماموں ریاض سے کہا۔

''میاں ریاض! ہمت کرنا ہوگی۔ میں اٹھاتا ہوں ان چیزوں کو۔ خاموشی سے باہر پھینک دیں۔ پڑوسیوں کو خبر ہوگئی تو نجانے کیا کیا قیاس آرائیاں کریں گے۔'' ماموں ریاض بہت باہمت تھے۔ فوراً ہی آگے بڑھ کر وہ تھال اٹھالیا۔ والد صاحب نے دروازہ کھولا اور رات کی تاریکی میں دونوں باہر نکل گئے۔ میری زبان پر تالا لگا ہوا تھا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن نجانے کیوں زبان خاموش تھی۔

جاگتی راتیں تو اب مقدر بن گئی تھیں۔ اس پُرسکون گھر میں مصیبت کا بیج تو میں نے بویا تھا۔ ایک خبیث سفلی عمل کے ماہر کو میں نے اپنا گھر دکھادیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا اس کا پہلا نمونہ پیش کر دیا تھا۔ گھر والے انہیں یاد کر رہے تھے' جنہیں کبھی ان کے ہاتھوں تکلیف پہنچی تھی۔ مگر ایسا کوئی یاد نہیں آرہا تھا۔ سب مصیبت کا شکار تھے اور میرا دل رو رہا تھا' کیونکہ ان کی مصیبت کا باعث میں تھا۔ میں نے اس گندگی کو پورے ہوش و حواس کے عالم میں مزار پر پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اب میں کسی کو کیا بتاتا۔ وہ بے چارے خود بھی کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا' میری کیفیت خراب ہوتی جارہی تھی۔ بہن بھائی سہمے ہوئے تھے۔ ماموں ریاض اور والد صاحب سخت پریشان تھے۔ دوسری رات بھی بھیانک تھی۔ رات بھر ہماری چھت پر دھما چوکڑی مچی رہی۔ بلیوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ آوازیں در و دیوار سے بلند ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ ماموں ریاض' والد صاحب اور میرا چھوٹا بھائی اختر ڈنڈے لئے چھت پر اور صحن میں بھاگتے پھرے' مگر ایک بھی بلی نظر نہیں آئی تھی۔ صبح کو ایک اور دہشت ناک واقعہ پیش آیا۔ چھوٹی بہن شمسہ غسل خانے میں غسل کرنے گئی تو اس کی دلدوز چیخوں سے سب کے کلیجے دہل گئے اور تو کوئی اس کے پاس نہ جاسکا' والدہ غسل خانے میں داخل ہوگئیں۔ شمسہ بے ہوش ہو کر غسل خانے میں گری پڑی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نجانے کس طرح والدہ صاحبہ نے اسے چادر میں لپیٹا اور اسے بستر پر لایا گیا' مگر وہ بالکل زخمی نہیں تھی' بلکہ خون کی پھواریں شاور سے نکلی تھیں۔ دوسرے نلوں کو چیک کیا گیا۔ سب کی ٹونٹیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ بقول شخصے ہمارے گھر میں تازہ تازہ سرخ خون کے دریا بہہ گئے تھے۔ ماموں ریاض اوور ہیڈ ٹینک کی طرف بھاگے' مگر ٹینک میں شفاف پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بعد میں نلوں کی ٹونٹیاں بھی صاف پانی اُگلنے لگیں۔ مگر وہ خون اپنی جگہ ایک مستحکم حیثیت رکھتا تھا' کیونکہ جہاں وہ گرا تھا اپنی خاصیت کے مطابق جمتا جارہا تھا۔ والدہ صاحبہ حواس باختہ ہوگئیں۔ شمسہ کو مشکل سے ہوش آیا تھا اور اس نے یہی بتایا کہ جونہی اس نے شاور کھولا اس سے خون کی دھاریں اُبل پڑیں۔ غرض اس گھر میں پریشانیوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ میں سکتے کے عالم میں تھا۔ مجھے خاص طور سے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی جارہی تھی' کیونکہ وہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ میں ہی جانتا تھا کہ یہ بیماری ان سب کے لئے میں خود خرید کر لایا ہوں۔ والدہ صاحبہ نے کہا۔

''یہ گھر چھوڑ دو' خدا کے لئے یہ گھر چھوڑ دو۔ یہاں کچھ ہوگیا ہے۔ ہم سب کسی خوفناک مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے ہم کسی بڑی مصیبت کا شکار ہونے والے ہیں۔''

''مگر ہم کہاں جائیں؟'' والد صاحب نے حیرت سے کہا۔

''جنگل میں جاکر پڑے رہیں گے۔ آہ...... کون دشمن ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔'' والدہ صاحبہ روتے ہوئے بولیں۔

والد صاحب اور ماموں میاں کے درمیان بڑی یگانگت تھی۔ سالے بہنوئی ایک جان دو قالب تھے۔ جو کچھ بھی کرتے تھے' آپس کے مشورے سے کرتے تھے۔ والد صاحب بولے۔

''کبھی خواب میں بھی ان فضولیات کے بارے میں نہیں سوچا تھا' مگر آخر کیا کہوں ان واقعات کے بارے میں۔ تمہاری کیا رائے ہے ریاض میاں؟''

''میں خود حیران ہوں بھائی جان! لیکن ایک بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں یہ سب کچھ شروع اسی دن سے ہوا ہے۔''

ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو مسعود میاں! تم خود بھی ذہن دوڑاؤ۔ اگر کوئی اشارہ مل جائے تو۔ تم اس دن پیر پھاگن کے مزار پر کیوں گئے تھے؟ وہاں بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟'' میرے ذہن میں سب کچھ تازہ ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی کا ہاتھ گلے پر آ پڑا ہو۔ میرے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ آنکھیں حلقوں سے اُبھر آئیں اور میں اپنا گلا پکڑ کر تڑپنے لگا۔ وہ نادیدہ قوت میری گردن دبا رہی تھی۔ ایک بار پھر ہنگامہ ہو گیا۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ اپنے اس سوال سے تائب ہو گئے تھے۔ رات گئے میری حالت بحال ہو سکی تھی۔

پریشانیوں کے دن، پریشانیوں کی راتیں۔ سارا کاروبار بند ہو گیا تھا۔ کوئی ڈیوٹی پر نہیں جاتا تھا۔ میں بھی گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اس دوران میں نے کچھ تجربات بھی کئے تھے۔ مثلاً اپنے اوپر بیتنے والے تمام واقعات کاغذ پر لکھنے کی کوشش کی، قلم میں سیاہی غائب ہو گئی۔ کئی نئے بال پوائنٹ آزمائے مگر کوئی چل کر نہ دیا۔ دوسری بار انگلیاں اکڑ گئیں۔ تیسری بار آنکھوں سے روشنی غائب ہو گئی۔ خوفزدہ ہو کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ یوں بھی تین دن گزرنے کے بعد ایک دم پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی، جو حیرانی کا باعث ہوتی، لیکن گھر والوں کے حواس غائب تھے۔ بہن بھائی کو پڑھنے نہیں بھیجا جا رہا تھا کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ماموں اور والد دفتر نہیں جا رہے تھے کہ گھر میں کچھ نہ ہو جائے۔ اس صبح ناشتہ کرتے ہوئے ماموں ریاض نے کہا۔

''بھائی جان! آپ کو حکیم سعد اللہ یاد ہیں؟''

''ایں؟'' والد صاحب چونک پڑے۔ پھر کسی قدر پُرجوش لہجے میں بولے۔ ''بھئی خوب یاد آئے وہ تمہیں۔ واقعی، اس وقت وہ ہمارے بہترین مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔'' حکیم سعد اللہ مجھے بھی یاد تھے۔ ایک دین دار بزرگ جن سے ہماری قدیم شناسائی تھی۔ پہلے حکمت کرتے تھے۔ تجربے کے ساتھ ساتھ روحانیت بھی تھی۔ بیٹے جوان ہو کر عمدہ ملازمتوں پر لگ گئے تو مطب ختم کر دیا، مگر اب بھی فی سبیل اللہ خاص ضرورت مندوں کا علاج مفت کیا کرتے تھے۔ کافی عمر تھی۔ بھنوؤں کے بال بھی سفید ہو گئے تھے، مگر کمر سیدھی تھی، بینائی درست تھی، دانت بتیس موجود تھے۔ چہرے پر صحت کی سرخی تھی۔ ان کا بڑھاپا قابل رشک تھا۔

حکیم صاحب کی روحانیت کے تذکرے میں نے بھی بارہا سنے تھے بلکہ میرے ایک دوست نے تو ازراہ مذاق ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ یار یہ تمہارے حکیم صاحب بڑے عالم ہیں، ان کی گھوڑوں سے شناسائی نہیں ہے کیا؟ جواب میں، میں نے ہنس کر کہا۔

''ان کی ابا جان سے بھی شناسائی ہے۔''

شام کو چھ بجے ہم حکیم صاحب کے ہاں روانہ ہو گئے۔ بہت خوبصورت مکان بنا ہوا تھا۔ جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بیٹوں کی بیویاں، پوتے، پوتیاں۔ ان کا کمرہ الگ تھلگ تھا۔ جہاں ان کی ساری کائنات سجی ہوئی تھی۔ والد صاحب کا نام سن کر وہ خود ہی باہر نکل آئے۔

''اخاہ ...... بڑے بڑے لوگ آئے ہیں بھئی۔ محفوظ احمد! بڑے بے مروت انسان ہو۔ بخدا کئی دن سے بہت یاد آ رہے تھے۔ میں نے نعیم اللہ سے کہا تھا کہ کسی وقت خبر لیں تمہاری۔ کہاں غائب ہو؟ آؤ، اندر آؤ۔'' انہوں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئے۔ مگر وہ آگے بڑھ کر رکے۔ چونک کر باری باری ہم تینوں کی شکلیں دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ''کوئی اور ہے تمہارے ساتھ؟''

''جی نہیں کیوں؟'' والد صاحب نے پوچھا۔

''ایں ...... نہیں؟'' وہ کسی قدر اُلجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''آؤ ......'' پھر وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ ''فرید! ...... فرید میاں ...... !'' انہوں نے کسی کو آواز دی۔ نو سال کا ایک بچہ اندرونی دروازے سے داخل ہو گیا۔ ''میاں! باہر دیکھنا، کوئی آیا ہے کیا؟''

''جی بہتر نانا میاں!'' بچے نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر بتایا کہ کوئی نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے گردن جھٹک کر کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ اور چائے کے لئے کہہ دو۔'' بچے کے جانے کے بعد وہ مسکرا کر بولے۔ ''یہ پراسرار آمد باپ بیٹے اور سالے کی خالی از علت نہیں ہو سکتی۔ کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''جی سعد اللہ صاحب!''

''میاں! بے دھڑک بتاؤ کیا بات ہے؟'

''بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں ہم لوگ سعد اللہ صاحب!''

''اللہ رحم کرے۔ کیا بات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ والد صاحب نے پوری تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ سعد اللہ صاحب پوری توجہ سے سب کچھ سن رہے تھے۔ آخر تک تمام تفصیل جاننے کے بعد والد صاحب نے کہا۔

''ان کی والدہ کہہ رہی ہیں کہ گھر چھوڑ دیا جائے۔ اگر میں گھر کرائے پر......'' سعد اللہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش کر دیا۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے چاروں طرف پھونکیں ماریں اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''نہیں میاں! یہ بیکار بات ہے۔ اٹھو صاحب زادے ادھر آؤ۔'' میں خاموشی سے ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیوں کی طرف سے سیدھے کئے اور پھر انہیں ناک کے قریب کر کے سونگھنے لگے۔ پھر انہوں نے ناک سکوڑ کر جھٹکے سے میرے ہاتھ پیچھے ہٹا دیئے اور بولے۔ ''جاؤ بیٹھو۔'' میں خاموشی سے اپنی جگہ جا بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے یہی عمل ماموں ریاض اور والد صاحب کے ساتھ دہرایا۔ اس وقت انہوں نے کسی ناگواری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ بولے۔ ''نہیں میاں! گھر وغیرہ چھوڑنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ البتہ انہیں چھوڑ جاؤ۔ آج رات یہ ہمارے مہمان رہیں گے۔ صبح کو انہیں لے جانا۔ کوئی حرج تو نہیں ہے؟''

''نہیں حکیم صاحب! حرج بھلا کیا ہوگا؟'' والد صاحب نے کہا۔ اسی وقت ایک نوکر چائے لے آیا تھا حکیم صاحب ہنس کر بولے۔

''چلو میاں! کھاؤ پیو۔ پھر مذاکرات ہو جائیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں رہو آرام سے۔ گھر چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟''

چائے کے بعد ماموں میاں اور والد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے انہیں وہیں سے خدا حافظ کہا اور پھر مجھ سے بولے۔ ''جوتے اتار کر آرام سے بیٹھ جاؤ مسعود میاں! رات کو بات کریں گے۔ کچھ پڑھو گے؟ ویسے تمہیں یہاں اپنے مطلب کی کوئی کتاب نہیں ملے گی' مجبوری ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ کوئی تکلف مت کرو۔''

''جی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ایک خاص بات میں نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ حکیم صاحب اس کے بعد اس کمرے سے گئے نہیں تھے۔ ایک بار بچہ انہیں کسی کام سے بلانے آیا تو انہوں نے کہا۔

''ہم آ نہیں سکتے شکیل میاں! ساڑھے آٹھ بجے دو آدمیوں کا کھانا بھجوا دینا۔ اس سے پہلے مت آنا۔'' پھر وہ جائے نماز پر جا بیٹھے تھے۔ وقت بہت مشکل سے گزر رہا تھا۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا' پھر بعد میں حکیم صاحب کی ہدایت پر وہیں ایک دیوان پر لیٹ گیا۔ ساڑھے دس بجے حکیم صاحب اٹھے۔ انہوں نے پورے کمرے کے تین چکر لگائے اور پھر مجھ سے بولے۔

''اٹھو میاں! بیٹھ جاؤ۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ حکیم صاحب مجھ سے کچھ فاصلے پر میری طرف پشت کر کے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''جو کچھ کہو گے سچ کہو گے وعدہ کرو۔''

''جی سچ کہوں گا۔''

✦✣✦✣✦

''کہو وعدہ کرتا ہوں۔''

''وعدہ کرتا ہوں۔''

''ہوں......کیا قصہ تھا؟''

''میں ریس کھیلتا ہوں' جواء کھیلتا ہوں......کوئی ایسا عمل کرنا چاہتا تھا جس سے مجھے کوئی پراسرار قوت حاصل ہو جائے۔''

''یہی میرا اندازہ تھا۔ خیر' آگے کہو۔'' انہوں نے کہا اور میری زبان چل پڑی۔ میں نے انہیں سادھو کے ملنے کا واقعہ ہڈی کا حصول' اس کے بعد اس شیطان کا حکم' پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیاں' وہاں سے گرنے کا واقعہ اور پھر بعد کے سارے واقعات سنا ڈالے۔ میرا دل دہشت سے کانپ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے جب بھی یہ داستان دہرانے کی کوشش کی تھی' میرے اعضاء نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا اور میری بری حالت ہو گئی تھی۔ لیکن اس وقت میری زبان نے میرا ساتھ دیا تھا' میرے اندر خوشی کی لہر بیدار ہو رہی تھی۔

''اس کا حلیہ تو بتاؤ ذرا۔'' حکیم صاحب بولے۔

''قد بہت چھوٹا تھا۔ سر گنجا تھا۔ اوپری بدن ننگا اور گلے میں......'' دفعتاً میری زبان رُک گئی۔ کمرے کا منظر بے حد پُراسرار تھا۔ سامنے کی دیوار پر میرا اور حکیم صاحب کا سایہ پڑ رہا تھا اور میری نگاہ کئی بار ان سایوں پر پڑ چکی تھی' لیکن اچانک ہی مجھے ایک تیسرا سایہ متحرک نظر آیا۔ یہ ایک پتلی رسی کا سایہ تھا جو ہل رہی تھی اور اس کے سرے سے کوئی پھیلی پھیلی چیز بندھی ہوئی تھی۔ رسی تیزی سے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ لٹکی ہوئی شے میرے چہرے کے عین سامنے پہنچ گئی۔ آہ......وہ ایک بہت بڑی مکڑی تھی۔ اس کی آنکھیں مٹر کے دانوں کے برابر اور گہری سرخ تھیں اور......اور......وہ میرے چہرے کے عین سامنے جھول رہی تھی۔

دہشت سے میرا لہو میری رگوں میں منجمد ہو گیا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی تو میرا گلا بھنچ گیا۔ زبان اس طرح اکڑ گئی کہ میں اسے جنبش نہ دے پایا۔ حکیم سعد اللہ میری اس کیفیت سے بے نیاز میری طرف پشت کئے شاید میرے آگے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اپنے بدن کے لیس دار مادے سے بنے ہوئے تار میں جھولتی ہوئی مکڑی میرے چہرے کے سامنے آ کر رُک گئی تھی اور میں اس کا ننھا سا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہی منحوس سادھو تھا۔ کوئی اور اسے دور سے دیکھتا تو وہ مکڑی کے سوا کچھ نہ نظر آتا' لیکن میں اس کے چہرے کو پہچانتا تھا۔ وہ شیطانی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میرے کانوں میں حکیم سعد اللہ کی آواز اُبھری۔

''بولتے رہو میاں! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ایک بار پھر پوری قوت صرف کر کے بولنا چاہا' لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔ البتہ مکڑی نے اپنی آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا تھا۔ پہلے تو میں کچھ نہیں سمجھ پایا' مگر دوسری بار مکڑی نے اپنی منحوس آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا تب میری نگاہ پیتل کے اس اڑھائی فٹ لمبے گلدان پر پڑی' جو مجھ سے دو گز کے فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں صبح کے باسی پھول سجے ہوئے تھے۔ سعد اللہ صاحب نے پھر کہا۔

''مسعود میاں! مجھے اس کا پورا حلیہ بتاؤ۔ میں اس کا نقشہ بنا رہا ہوں۔ تمہاری طرف رخ نہیں کر سکتا۔''

سادھو نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں چمک بے پناہ ہو گئی تھی اور دو سرخ لکیریں میری پیشانی کی ہڈی میں جیسے سوراخ کرنے لگی تھیں۔ میں درد و کرب سے بے چین ہو گیا۔ اس وقت پیتل کا گلدان اپنی جگہ سے بلند ہو کر فضا میں پرواز کرتا ہوا خود بخود مجھ تک آ گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ کر سعد اللہ صاحب کو اس خطرے سے آگاہ کر دوں' جو انہیں پیش آنے والا تھا۔ مگر آہ...... یہ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میرے اعضاء اب میرے قبضے میں نہیں تھے۔ میرا ذہن طلسمی روشنیوں میں جکڑتا جا رہا تھا' جو میرے دماغ میں داخل ہو چکی تھیں۔ میرے قدم نہ چاہنے کے باوجود سعد اللہ صاحب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میرا رُواں رُواں فریاد کر رہا تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ میرے ہاتھ سر سے بلند ہو چکے تھے۔ سعد اللہ صاحب میری مسلسل خاموشی سے پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''میاں! کچھ منہ سے تو بولو۔ تم نے ہماری ساری محنت......'' یہ کہہ کر انہوں نے پہلو بدلا اور رخ تبدیل کر لیا۔ مگر میں

ان کے بالکل نزدیک تھا۔ میرے ہاتھ بلند ہو کر جھک چکے تھے اور کوئی تین کلو وزنی گلدان ان کے سر کا نشانہ لے چکا تھا۔ البتہ رخ اچانک تبدیل ہونے سے ان کا سر پہلی ضرب سے بچ گیا اور گلدان ان کے شانے پر پڑا۔ حکیم صاحب کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ میرا ہاتھ دوبارہ بلند ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب نے بے اختیار سر کا دفاع کرتے ہوئے کلائی سامنے کر دی اور گلدان کی ضرب سے ان کی کلائی چکنا چور ہو گئی۔ اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخے تھے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے دروازے کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ مگر میرے قدموں نے ایک لمبی زقند بھری اور میں دوبارہ ان کے قریب پہنچ گیا؟ حکیم صاحب کافی زور سے دروازے سے ٹکرائے تھے اور ایک زوردار دھماکہ ہوا ہوگا۔ مگر میں ہر احساس سے بے نیاز نہیں ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ حکیم صاحب نے دروازے کا سہارا لے کر اٹھنا چاہا' مگر اس بار گلدان ان کے سر پر پڑا تھا۔ ضعیف اور کمزور آدمی تھے۔ ہائے کی ایک مدھم سی آواز ان کے ہونٹوں سے خارج ہوئی اور اس کے بعد وہ بے سدھ ہو گئے' لیکن میرے ہاتھ نہیں رکے۔ گلدان کی مسلسل ضربیں میں ان کے جسم کے مختلف حصوں پر لگا رہا تھا۔ ان کے اہل خاندان نے ان کی چیخیں اور اندر ہونے والی دھاچوکڑی سن لی تھی۔ چنانچہ سب دروازے پر آ گئے اور باہر سے دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ پھر اس پر زوردار ضربیں پڑنے لگیں اور اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے اس منحوس مکڑی کو دیکھا' مگر اب اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ باہر سے لگنے والی ضربوں سے دروازے کی چٹخنی کے اسکرو اکھڑ گئے اور بہت سے لوگ بھرّا مار کر اندر داخل ہو گئے۔ ان میں عورتیں' بچے اور دو جوان آدمی بھی تھے' جو شاید حکیم صاحب کے بیٹے تھے۔ پھر سب بھیانک آوازوں میں چیخنے لگے۔ انہوں نے حکیم صاحب کا کچلا ہوا جسم دیکھ لیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کون کیا کہہ رہا تھا۔ میرے حواس قابو میں ہی نہ تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شاید مجھے مارا بھی جا رہا تھا' مگر بدن کو چوٹ لگنے کا احساس بھی نہیں تھا۔ پھر میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔

ہوش آیا تو ہسپتال کے ایک بستر پر تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا' جس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے۔ دیر تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہوش و حواس جاگے تو جسم کے مختلف حصوں میں درد ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ گزرا ہوا وقت یاد آیا اور ایک ایک چیز یاد آ گئی۔ میں وحشت زدہ انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس منحوس غلیظ جانور نے میرے ہاتھوں حکیم سعد اللہ جیسے نیک انسان کو قتل کروا دیا تھا۔ آہ...... اس کے بعد کیا ہوا تھا' وہ صحیح طور پر اب یاد نہیں آ رہا تھا۔ بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پھر دروازہ تھوڑا سا کھلا' کسی نے جھانک کر اندر دیکھا اور فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد پھر کھلا اور ایک زبردست جسامت کا مالک پولیس آفیسر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے چند کانسٹیبل اور اس کے بعد ایک ڈاکٹر' ایک اور نرس کے ساتھ......

پولیس آفیسر نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''دیکھئے ڈاکٹر صاحب! معائنہ کیجئے اس کا۔ ہم اسے لے جانا چاہتے ہیں۔''

ڈاکٹر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''بس ہوش میں آ جانے کا انتظار تھا۔ جسم پر کوئی ایسی چوٹ نہیں ہے جس کا باقاعدہ علاج کیا جائے۔ پھر بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔'' اس نے آلہ لگا کر میرے دل کی دھڑکنوں کا معائنہ کیا۔ جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولا اور میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے انچارج صاحب! بالکل ٹھیک ہے۔ تندرست آدمی ہے۔ کوئی بات نہیں' آپ اسے لے جا سکتے ہیں۔''

انسپکٹر نے اپنے ساتھی کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ میں ششدر تھا۔ خوف سے میرا دل بند ہوا جا رہا تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ ہوش و حواس اس وقت بالکل بحال تھے۔ سوائے جسم کے کچھ حصوں کے درد کے اور کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ انسپکٹر نے مجھے گردن سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''چل اوئے آگے بڑھ۔'' خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ کسی سے کچھ کہنے کے لئے الفاظ بھی نہیں تھے میرے پاس۔ بے چارگی کے انداز میں کمرے کے دروازے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر دل حلق میں آ گیا کہ باہر سب ہی موجود تھے۔ ماموں ریاض' والد صاحب اور والدہ' چھوٹی بہن اور بھائی۔ سب کے چہرے اس طرح مرجھائے ہوئے تھے' جیسے ان پر خزاں آ گئی ہو۔ والدہ صاحبہ مجھے دیکھ کر پچھاڑیں کھانے لگیں۔ والد صاحب نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ چھوٹی بہن دونوں

ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھی اور بولی۔
''بھائی جان!...... بھائی جان......!'' لیکن انسپکٹر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا سامنے کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں بی بی! خود کو سنبھالے رکھو۔ قریب آنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مجرم ہے' قاتل ہے' اس سے دور رہو۔''
بہن نجانے کیا کیا کہنے لگی۔ میرے کان ایک بار پھر سنسنانے لگے تھے۔ ماموں ریاض نے البتہ ہمت کر کے میرے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔
''فکر نہ کرنا مسعود میاں! ہم تمہاری ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ بالکل فکر مت کرنا۔ ہم زندہ ہیں' جو کچھ بھی بن پڑے گا ہم سے' ہم تمہارے لئے ضرور کریں گے۔'' ماموں ریاض کہتے رہے' لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ ماں اور بہن کی کیفیت دیکھ کر دل پھٹا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر ماں سے لپٹ جاؤں۔ ان کی آوازیں کانوں میں گرم سیسے کی مانند اُتر رہی تھیں۔ چھوٹا بھائی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہر شخص کی ایسی کیفیت تھی کہ تصور کرتا تو سینہ پھٹ جاتا۔ پھر وہ سب پیچھے رہ گئے۔ ماں کی آوازیں اب بھی میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔
''بچالو...... بچالو...... میرے بچے کو بچالو...... وہ بے قصور ہے' بے گناہ ہے۔'' مجھے ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور باقی سب لوگ پیچھے رہ گئے۔ اب میں انسپکٹر کے رحم و کرم پر تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم تھانے پہنچ گئے اور مجھے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ انسپکٹر چلا گیا اور میں لاک اپ میں زمین پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائے گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ اب اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ اس بھیانک صورتحال کو نہیں سمجھ پاتا۔ میں نے ایک قتل کیا تھا اور بڑی وحشت اور درندگی کے عالم میں کیا تھا۔ حکیم سعد اللہ میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اگر میں کسی سے کہتا کہ انہیں قتل کرنے والا میں نہیں تھا تو وہ لوگ ہنسنے کے علاوہ کچھ نہ کرتے۔ چنانچہ ایسی باتیں کرنا ہی حماقت تھی۔
دروازے کے سامنے موجود پہرہ دینے والا سنتری مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن جھکا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ دن گزر گیا۔ غالباً میں پچھلی ساری رات بے ہوش رہا تھا اور اس وقت دن کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ بہرحال شام ہوگئی۔ رات کو مجھے سلاخوں کے پیچھے سے روٹی اور سالن دیا گیا اور پانی کا ایک گلاس۔ ایک کانسٹیبل ہی نے یہ چیزیں رکھی تھیں اور خاموشی سے واپس مڑ گیا تھا۔ میں دن بھر کا بھوکا پیاسا تھا' لیکن ان چیزوں کی طرف رخ کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس طرح طرح کے خیالات جی میں آ رہے تھے۔ اب کیا ہوگا؟' اب کیا ہوگا۔ خاص طور سے ماں کی حالت سے میں بہت دل گرفتہ تھا۔ میری ماں میرے غم میں مر ہی جائے گی...... آہ' کیا یہ سب میرا ہی قصور ہے؟ کیا میں ایک ناگہانی مصیبت میں نہیں پھنس گیا ہوں......؟ لیکن اگر پس منظر میں نگاہ دوڑاتا تو سچ سچ سارا قصور اپنا ہی نظر آتا تھا۔ وہی ساری چیزیں ذہن میں آ جاتی تھیں۔ کائنات میں بسنے والے محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ اگر میری طرح ہر شخص ان آسان راستوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے تو کاروبار حیات معطل ہو جائے۔ یہ سب غیر فطری تھا۔ ناجائز تھا۔ اللہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے انحراف تھا اور اسی انحراف کی مجھے سزا ملی تھی۔ تھا تو میں اسی سزا کا مستحق اور اب بعد میں پچھتانے سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ پہرہ دینے والے سنتری نے جب کافی دیر بعد کھانا اسی طرح رکھے ہوئے دیکھا تو چہرے پر ہمدردی سجائے میرے پاس پہنچ گیا۔
''کھالے بابو! کھالے...... برا کام کرتے ہوئے کچھ نہیں سوچتے تم لوگ......جنون میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہو کہ اللہ کی بنائی ہوئی زندگی کو ختم کر دیتے ہو اور بعد میں پچھتاتے ہو۔ کھانا تو تجھے کھانا ہی پڑے گا۔ آج نہ سہی کل کھائے گا۔ یہ پیٹ کب پیچھا چھوڑتا ہے؟''
میں نے اداس نگاہوں سے سنتری کو دیکھا۔ حالات سے بے خبر انسان اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا تھا؟ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔
''بھائی اس وقت بھوک نہیں ہے۔ بعد میں کھالوں گا۔''

''تیری مرضی ہے مگر تو نے ایسا کیوں کیا؟''

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ گناہوں کی سزا ہے۔''

''ہاں اللہ سے ہمیشہ توبہ کرنی چاہیے۔'' سنتری نے کہا۔ کھانا اسی طرح رکھا رہا۔ رات ہو گئی اور میں زمین پر کمبل بچھا کر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں سر دے کر خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو کچھ ہوا تھا اس میں میرا عمل بھی برابر شامل تھا۔ اگر سوچ کا انداز یہ نہ ہوتا تو شاید یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔ نیند البتہ فراخ دل ہے۔ اس نے اپنی آغوش مجھ سے نہیں چھینی تھی اور رات کے کسی حصے میں میری آنکھوں میں آ بسی تھی اور اس کی مہربانی نے سوچوں کے دکھ سے نکال دیا اور اس وقت جاگا جب سورج کی کرنیں چاروں طرف پھیل چکی تھیں اور ایک روشن دان نکل آیا تھا' لیکن یہ روشن دان بڑا تکلیف دہ محسوس ہوا۔ آہ...... کاش اتنی طویل نیند آ جائے کہ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے جب میں نے ماموں ریاض کو دیکھا۔ کالے کوٹ میں ملبوس ایک صاحب کے ساتھ لاک اپ کے دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ماموں ریاض بہت خوش مزاج انسان تھے۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے عادی۔ کبھی ان کے چہرے پر سنجیدگی دیکھی ہی نہیں گئی تھی۔ سوائے ان پچھلے دنوں کے جب سے میں اس عذاب کا شکار ہوا تھا' لیکن اس وقت تو ان کی صورت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ جیسے اچانک بوڑھے ہو گئے ہوں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے میرے قریب آ گئے۔ کالے کوٹ والے صاحب نے کہا۔

''کہو میاں! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ مارا پیٹا تو نہیں کسی نے تمہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ہوں...... میرا نام ضمیر الدین ہے اور میں تمہارا وکیل ہوں۔ دیکھو میاں! مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔'' وکیل نے کہا۔

''مسعود میاں! ہم تمہاری ضمانت کی کوشش کر رہے ہیں۔ وکیل صاحب کو سب کچھ صاف صاف بتاؤ۔'' ماموں نے کہا۔

میں نے عجیب سی نگاہوں سے ماموں کو دیکھا اور اپنے ذہن کو ٹٹولا۔ زبان پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ دماغ آزاد تھا۔ یعنی جو چاہوں کہہ سکتا تھا' لیکن اب اس کیفیت سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی' کیونکہ جو کچھ ہو چکا تھا وہی اتنا تھا کہ کسی خوشی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام کہا۔

''میرا کچھ کہنا بے معنی ہے ماموں صاحب! میں نے عالم ہوش میں یہ سب کچھ نہیں کیا۔''

''تمہاری کیفیت کیا تھی۔'' ماموں ریاض نے پوچھا۔

''بس ہوش و حواس نہیں تھا۔ آپ کو اس کا اندازہ ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''یہ دورے تم پر کب سے پڑ رہے ہیں؟'' وکیل صاحب نے کہا۔

''یہ دورے نہیں ہوتے۔''

''تمہیں یہ دورے پڑتے ہیں۔ تمہیں اپنا ذہن تاریک لگتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بے قابو ہو جاتے ہیں۔ پھر تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا اور یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' وکیل صاحب بولے اور میں نہ سمجھنے والے انداز میں وکیل صاحب کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ بولے۔ ''یہاں کسی نے تمہارا بیان لیا ہے؟''

''نہیں۔''

''گڈ...... یہ بہت اچھا ہوا۔ تمہیں بیان میں یہی کچھ کہنا ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔''

''جی!'' میں نے کہا اور وکیل صاحب مجھے بتانے لگے کہ مجھے کیا بیان دینا ہے۔ میں خاموشی سے گردن ہلاتا گیا۔ پھر یہ دونوں چلے گئے۔ چلتے ہوئے ماموں ریاض نے مجھے پھر پرسکون رہنے کی تلقین کی۔ میں ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے خود کو سنبھال رہے تھے' لیکن گھر میں ایک کہرام مچا ہو گا۔ میں جانتا تھا۔

اڑھائی بجے کے قریب مجھے لاک اپ سے نکالا گیا اور انچارج صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہاں میں نے حکیم سعد اللہ کے بڑے بیٹے کو بھی دیکھا جو خود گورنمنٹ افسر تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔ پولیس انسپکٹر نے کڑک کر کہا۔

''سیدھا کھڑا ہو جا' یا لگواؤں چار ڈنڈے۔'' میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر نے مجھے چند گالیاں سنا کر اپنے نیک کام کا آغاز کیا پھر بولا۔ ''اوئے کیا موت پڑی تھی تجھ پر' کیا دشمنی تھی سعد اللہ جیسے اللہ والے سے تھے؟''

''مجھے ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔''

''پھر تو جنگلی کیوں بن گیا؟''

''میں نہیں جانتا صاحب! کچھ دن سے میں بیمار ہوں۔ اچانک میرا دماغ بھاری ہو جاتا ہے' پھر مجھے ہوش نہیں رہتا۔ ایسی کیفیت کئی بار ہوئی۔ میرے والد صاحب کے حکیم صاحب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ مجھے ان کے پاس علاج کے لئے لے گئے تھے۔ حکیم صاحب نے مجھے دیکھا اور میرے والد صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ان کے پاس چھوڑ جائیں۔ حکیم صاحب کے گھر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہمارے لئے چائے منگوائی تھی۔ پھر رات کا کھانا انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھلایا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے میری نبض دیکھتے رہے تھے۔ دو بار انہوں نے مجھے دواؤں کی پڑیاں بھی کھلائی تھیں۔ پھر رات کو میری وہی کیفیت ہوگئی اور اس کے بعد ہسپتال میں ہوش آیا۔''

پولیس انسپکٹر نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر سعد اللہ کے بیٹے نعیم اللہ کو۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ تو کیس ہی بدل گیا نعیم اللہ صاحب!''

''جھوٹ بکتا ہے یہ بدمعاش! اس نے میرے ابا کو دیوانوں کی طرح مارا ہے۔ سارے بدن کی ہڈیاں توڑ دی ہیں بدبخت نے۔ میں اسے آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ میرا نام بھی نعیم اللہ ہے۔ اسے پھانسی نہ دلوائی تو نام نہیں۔'' نعیم اللہ نے غیظ کے عالم میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم اس سے اصل بات پوچھ لیں گے۔'' انسپکٹر نے محرر سے بیان لکھنے کو منع کر دیا اور ایک کانسٹیبل سے کہا۔ ''مخدوم خاں! اسے بند کر دو۔ رات کو نو بجے ڈرائنگ روم میں لے آنا۔''

مجھے دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ شام کو پانچ بجے ماموں ریاض پھر آئے اور میرے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھ سے صورت حال پوچھی تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ میں تو ڈرائنگ روم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا' لیکن وہ سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ فوراً ہی چلے گئے۔ وہ دوبارہ نہیں آئے۔ رات نو بجے مجھے ایک اور کمرے میں لایا گیا تھا۔ انسپکٹر صاحب کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ ہنستے ہوئے بولے۔

''اوئے اصل بات اُگل دے شہزادے! ورنہ یہ ڈرائنگ روم دیکھا ہے نا۔ بڑے بڑوں کی زبان کھل جاتی ہے یہاں۔ او یار بشیر! دو چار نشان بنا دے اس کے منہ پر۔ وہ نعیم اللہ بھی سرکاری افسر ہے۔ اصل بات کیا تھی شہزادے؟''

''میں نے آپ سے ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا جناب!''

''عدالت میں بھی یہی بیان دے گا؟''

''جو سچ ہے ہر جگہ بتاؤں گا۔''

''اوہ جیتا رہ شیر! مگر سن' کل جب نعیم اللہ آئے یا اس کے گھر کا کوئی بندہ آئے تو یہی ظاہر کرنا جیسے تیری ٹھیک ٹھاک چھینٹی لگی ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے دو چار آوازیں نکال لینا۔ چلو بھئی' اس کا بیان لکھواؤ۔''

محرر نے میرا بیان لکھ لیا' مگر انسپکٹر صاحب کی یہ مہربانی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ البتہ دوسرے دن حقیقت واضح ہو گئی۔ ڈرائنگ روم کا عذاب روکنے کے لئے ماموں صاحب نے دس ہزار خرچ کیے تھے۔ اس دن سعد اللہ کے دوسرے صاحبزادے فہیم اللہ صاحب آئے تھے اور مجھے ان کے سامنے بلایا گیا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔

''جوڑ جوڑ توڑ دیا ہے ہم نے اس کا۔ مگر اس کا کہنا ہے کہ اس نے ہوش کے عالم میں یہ سب نہیں کیا۔''
''مار پیٹ سے کوئی فائدہ نہیں انسپکٹر صاحب! قانون اسے بھرپور سزا دے گا۔ آپ اسے آئندہ نہ ماریں۔'' پھر عدالت سے میرا مزید چند روز کا ریمانڈ لیا گیا۔ قتل اور وہ بھی ایسے وحشیانہ قتل کے ملزم کی ضمانت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ تھانے کے چند روزہ قیام میں انسپکٹر صاحب نے ماموں کی خوب کھال اُتاری۔ اس کے بعد مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ اس دوران میری ذہنی کیفیت نارمل رہی تھی۔ میں نے اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گھر تباہ کر دیا ہے۔ میرا گناہ مجھ تک ہی رہتا تو میں خوشی سے سب کچھ برداشت کر لیتا۔ مگر سب لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اب وہ لوگ مجھے بچانے کی کوشش میں روپیہ پانی کی طرح بہائیں گے اور نتیجہ جو ہوگا وہ سامنے تھا۔ دل خون کے آنسو روتا تھا' لیکن اس سادھو کے بارے میں' میں نے زبان بند کر رکھی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے کسی کو اس بارے میں بتا دیا تو وہ بھی اس گندی روح کا شکار ہو جائے گا۔ میرا مستقبل کسی حد تک میرے سامنے آ چکا تھا۔ زندگی کا خاتمہ۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جیل کی کوٹھری کی پہلی رات بڑی اذیت ناک تھی۔ رات کے نو بجے ایک اور قیدی کو اس کوٹھری میں بھیج دیا گیا' جہاں میں تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا' جو صورت سے ہی غنڈہ نظر آتا تھا۔ اس نے بس ایک نگاہ مجھے دیکھا تھا اور پھر خاموشی سے اپنا کمبل لے کر ایک گوشے میں جا پڑا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے خراٹے اُبھرنے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ لاک اپ میں بھی نیند آنے لگی تھی۔ پھر وہاں کے لوگوں کا رویہ بھی برا نہیں تھا' لیکن یہاں نیند اُڑ گئی تھی۔ رات نہ جانے کتنی بیت گئی۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ بس تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پہرہ دینے والے سنتریوں کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ساتھی قیدی کے خراٹے دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ جب یہ خراٹے ناقابل برداشت ہو گئے تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''بھائی! یہ خراٹے بند کر دو۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔'' خراٹے رک گئے۔ ساتھ ہی قیدی نے چہرے سے کمبل ہٹا دیا۔ وہ اپنی چمکدار سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مکروہ شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آہ ...... وہ ...... وہی ناپاک سادھو تھا۔ پیلے مدقوق بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے کمبل ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ پہلے میں نے اس قیدی کو دیکھا' وہ یہ نہ تھا۔ میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہنسنے لگا۔ پھر اس کی کریہہ آواز اُبھری۔

''کہو میاں جی! دماغ ٹھکانے آیا' یا نہیں؟''

''تم ...... ذلیل! کتے! شیطان! یہاں بھی آ مرے۔'' میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وہ ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ ''ہم کہاں نا ہیں جا سکتے میاں جی! پر لگے ہیں لیکن تمہاری دُم ابھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہے۔''

''تُو نے آخر' تُو نے آخر میری زندگی کیوں برباد کر دی ذلیل سادھو! میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

''اک جرا سا کام کہا تھا ہم نے تم سے۔ ہمارا کام کر دو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب بھی کچھ نہ بگڑا میاں جی! ہماری بات مان لو۔ ہمیں پھاگن دوار پہنچا دو۔ بھگوان کی سوگند سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تُو غلیظ' ناپاک کتے! اس پاک مزار پر جا کر کیا کرے گا؟''

''یہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا میاں جی! تم بس ہمارا کام کر دو اور پھر مزے کرو۔ ایسے عیش کرو گے کہ جیون بھر دعائیں دو گے ہمیں۔''

''مجھے کچھ بھی ہو جائے' میں تیرے ناپاک وجود کو اس پاک جگہ کبھی نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔''

''تو پھر ہم بھی تمہیں بتا دیں میاں جی! ایسا حال کر دیں گے تمہارا ہم کہ موت بھی تم سے گھبرائے گی۔ جو کہیں وہ کر دکھائیں گے۔''

''غلیظ! ناپاک کتے! میں تجھے فنا کر دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے اُچک کر اس کی گردن پکڑ لی اور اس کے منہ سے دلدوز چیخیں نکلنے لگیں۔ مجھ پر جنون سوار تھا۔ مجھے باہر سنتریوں کی چیخ و پکار بھی نہیں سنائی دی۔ وہ اندر گھس آئے تھے۔ اسے میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے' مگر اس میں ناکام تھے۔ پھر شاید میرے سر پر ضربیں لگائی گئی تھیں اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کب ہوش آیا تھا۔ سر پھوڑا بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار تاریکی چھا جاتی تھی۔ بری طرح چکر آ رہے تھے۔

حواس کسی قدر قابو میں آئے تو محسوس کیا کہ کسی بستر پر ہوں اور پیروں میں فولادی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ گزرے لحات یاد آنے لگے۔ سب کچھ یاد آ گیا۔ نہ جانے اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ بعد میں تمام صورت حال علم میں آ گئی اور اسے معلوم کر کے کیا بتاؤں کہ اندرونی کیفیت کیا ہوئی۔ وہ قیدی میرے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا' جس کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ مجھ پر ایک اور قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ جیل کے حکام سخت پریشانی میں گرفتار ہو گئے تھے اور بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ سنتریوں نے میرے سر پر زوردار ضربیں لگا کر قیدی کو مجھ سے چھڑایا تھا' مگر اس وقت تک اس کا دم نکل چکا تھا۔ میرا سر بری طرح پھٹا ہوا تھا اور جیل کے ہسپتال میں میرا علاج ہو رہا تھا۔ ہر آنکھ میں میرے لئے نفرت تھی۔ کئی دن تک جیل اور پولیس کے حکام میں گھرا رہا۔ ڈاکٹر تک مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کسی کے دل میں میرے لئے ہمدردی نہیں تھی۔ پھر میرا بیان لیا گیا۔ ایک پولیس افسر نے پوچھا۔

''غلام خان کو تم کب سے جانتے تھے؟''

''کون غلام خان؟''

''جسے تم نے قتل کر دیا۔''

''میں کسی غلام خان کو نہیں جانتا۔''

''پھر تم نے اسے کیوں قتل کیا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''اس سے پہلے کتنے قتل کئے ہیں؟''

''بیکار باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔'' میں نے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ سر کی دُکھن ناقابل برداشت تھی اور پھر یہاں موجود تمام لوگوں کے ناخوشگوار رویے نے بے حد بددل کر رکھا تھا۔ ایک نظر بھی ایسی نہیں تھی جس میں میرے لئے ہمدردی کے آثار ہوتے۔ اس کیفیت نے جو بےزاری دل و دماغ پر طاری کر رکھی تھی' اس کے تحت اس کے علاوہ اور کیا جواب دے سکتا تھا۔

پولیس افسر نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہوش و حواس تو اس طرح درست ہوں گے تمہارے کہ مر جانے کے بعد بھی یاد رکھو گے۔ تم نے دو قتل کئے ہیں۔ دو بے گناہوں کو قتل کیا ہے تم نے۔ تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے تلخ نگاہوں سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور کہا۔

''میرا جو انجام ہو رہا ہے پولیس آفیسر! وہ شاید بہت اچھا ہے۔''

''تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟'' اس نے کہا اور میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پولیس آفیسر مجھ سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا اور میں نے اسے اُلٹے سیدھے ہی جوابات دیئے۔ وہ دانت پیستا رہا تھا اور اس کے بعد اُٹھ کر چلا گیا تھا۔ بہرطور ہسپتال میں تقریباً ایک ہفتہ رہنا پڑا تھا۔ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں نے الگ ناک میں دم کر دیا تھا۔ پولیس کے جوان ہر وقت میرے کمرے کے سامنے رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر بھی آتا تو پولیس کی نگرانی میں۔ مجھے خطرناک اور جنونی قاتل قرار دیا گیا تھا۔ کوئی میرا درد نہیں جانتا تھا۔ کوئی میرے دل کی پکار نہیں سن سکتا تھا۔ میرا دل چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ جو ہوا ہے اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ لیکن اب تو جان بوجھ کر بھی کسی کو کچھ بتانے کو جی نہیں چاہتا

تھا۔ بس عجیب سی کیفیت تھی۔ بہت ہی عجیب۔
اس بار جس کوٹھڑی میں پہنچایا گیا تھا۔ اس میں سوائے میرے اور کوئی نہیں تھا۔ کوٹھڑی کی کھردری زمین پر لیٹتے ہوئے میں نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوا تھا اور اس قیدی کو ہلاک کرنے کی جو وجہ تھی' وہ میں نے اب تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا بھی تو کون یقین کرتا۔ یہ کہانی تو صرف ایک شخص نے سنی تھی اور وہ کسی اور کو سنانے کے لئے زندہ نہیں رہ گیا تھا۔ بے چارے حکیم سعد اللہ...... ان کا تصور ذہن میں آتا تو دل بری طرح دُکھنے لگتا تھا۔ ایک نیک آدمی کا یہ انجام جو میرے ہاتھوں ہوا تھا باعث خوشی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ آہ منحوس سادھو! کہاں سے تُو میری زندگی میں شامل ہو گیا۔ کیا قصور ہے میرا؟ کیا' کیا ہے میں نے؟
بس یہی تمام احساسات دل میں تھے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا۔ پھر تقریباً اس واقعہ کے چودہ دن بعد ماموں ریاض میرے پاس آئے۔ پولیس کے جوان مجھے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں لئے ہوئے جب ملاقات کی جگہ پہنچے تو میں نے دور ہی سے ماموں ریاض کو دیکھ لیا۔ میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ کوئی بھی تو کچھ نہیں جانتا تھا میرے بارے میں۔ ماموں ریاض بے چارے پہلے ہی کی مانند پریشان حال نظر آ رہے تھے۔ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے' پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ میری بھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ ماموں ریاض کی محبتوں کو میں جانتا تھا۔ ایک طرح سے وہ ماموں کے بجائے بڑے بھائی ہی کی حیثیت رکھتے تھے۔ والد صاحب کا رویہ بھی ان کے ساتھ اپنی اولاد جیسا ہی تھا۔ ماموں مجھے جتنا چاہتے تھے میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔
''کیا ہو گیا تجھے......؟ تجھے کیا ہو گیا مسعود؟ کیا کر ڈالا تُو نے یہ سب کچھ میرے بچے! کیا کر ڈالا تُو نے؟ کوئی وجہ بھی تو ہو ان ساری باتوں کی۔ آہ...... کیا نحوست نازل ہو گئی ہے ہمارے گھر پر......''
''ابا اور امی کا کیا حال ہے ماموں صاحب؟''
''سب زندگی کا بوجھ گھسیٹ رہے ہیں۔ سارا کیا دھرا چوپٹ ہو گیا ہے۔ بھائی صاحب بستر سے لگ گئے ہیں۔ باجی کا ذہنی توازن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یہاں آنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں تجھے یہ باتیں نہ بتاتا۔ مگر کیا کروں' مجبوری ہے۔ بتانا بھی ضروری ہے۔''
''ایک بات کہوں ماموں صاحب' یقین کر لیں گے؟''
''کہو مسعود! کہو میرے بیٹے۔'' ماموں صاحب نے درد بھرے انداز میں کہا۔
''ان تمام باتوں میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ماموں صاحب! میں بے گناہ ہوں ماموں صاحب! جو مجھ پر طاری ہو جاتا ہے وہی مجھ سے یہ سب کچھ کرا رہا ہے۔ میں اتنا برا نہیں تھا۔ یہ سب کچھ میرے گناہوں کی سزا ضرور ہے' لیکن حقیقت یہ ہے ماموں صاحب! کہ ان دونوں افراد کو میں نے ہوش و حواس کے عالم میں قتل نہیں کیا۔''
''آہ...... یہ بات ہم ایک ایک سے کہتے پھرتے ہیں' مگر کوئی نہیں مانتا اور اس دوسرے قتل کے بعد تو وکیل ضمیر الدین صاحب بھی بددل ہو گئے ہیں۔ وہ تو یہ کیس ہی لڑنے کو تیار نہیں۔ بس کچھ سفارشیں ہیں اور کچھ تعلقات جن کی وجہ سے وہ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ آئیں گے تمہارے پاس۔ تم سے بات کریں گے۔ دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔'' ماموں صاحب کے الفاظ سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ میں نے کہا۔
''ماموں صاحب! آپ میری جگہ گھر کا نظام سنبھالئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اب مجھے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ گھر کی بہت سی ذمہ داریاں آپ پر آ پڑی ہیں ماموں صاحب! لیکن ایک بات دل میں لے کر جایئے۔ امی اور ابا سے بھی یہی کہہ دیجئے گا کہ میں بے گناہ ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے عالم ہوش میں نہیں کیا۔ میں آپ سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔''
ماموں ریاض بری طرح رو پڑے تھے۔ بس اتنا ہی موقع مل سکا تھا ہم لوگوں کو بات کرنے کا۔ ویسے بھی میں ایک ناپسندیدہ مجرم تھا اور میری وجہ سے جیل حکام کو سخت عذاب میں گرفتار ہونا پڑا تھا۔ اس لئے میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ

سختیاں تھیں۔ سنتریوں نے ماموں صاحب کو شانوں سے پکڑ کر باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

''چلو بھئی وقت ختم ہو گیا۔ گھر نہ بناؤ اسے اپنا۔''

وہ لوگ ماموں صاحب کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور میں جالی کے پیچھے کھڑا بے بسی کی نگاہوں سے اپنے پیارے ماموں کی بے عزتی دیکھتا رہا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں۔ مگر شاید یہ بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ سر کے زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ اگر کوئی اور مجرم ہوتا تو اسے شاید ابھی ہسپتال میں ہی رکھا جاتا' لیکن ڈاکٹر بھی مجھ سے خوف زدہ تھے۔ یہاں تک کہ اب تو جیل کے سنتری تک میری سلاخوں کے پاس سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے اور دور ہی دور سے مجھے دیکھتے تھے یا رک کر ایسی نگاہوں سے مجھے تکتے تھے جیسے میں ابھی سلاخیں توڑ کر ان پر حملہ آور ہو جاؤں گا۔ کسی انسان کی بے قدری اس کے لئے کس قدر دلدوز ہو سکتی ہے' اس کا اندازہ کوئی صاحب دل ہی لگا سکتا ہے۔ بے بسی کے دن' بے کسی کی راتیں' جیل کی تاریک کوٹھری' تنہائی اور نفرت بھری نگاہیں۔ یہ ساری چیزیں اب میرے لئے تھیں اور میں اپنے گناہ کو کم نہیں سمجھتا تھا' کیونکہ میں نے لالچ میں آ کر زندگی کو اصول کے دھارے سے ہٹایا تھا اور بے اصولی اپنائی تھی۔ جادو سیکھ کر یا سفلی علم کا سہارا لے کر میں اپنے مستقبل کو بنانا چاہتا تھا۔ آہ یہ گناہ میرا تھا اور اس کی سزا بے حد طویل تھی۔ بے حد طویل' کئی بار رو رو کر خدا سے دعا مانگی تھی' توبہ کی تھی' لیکن شاید میں اپنے جرم کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ مجھے اپنے گناہ کا پوری طرح احساس نہیں تھا۔ میرے لئے ابھی بہت طویل سزا تھی۔

پھر دوسری کہانیاں جاری ہو گئیں۔ ماموں ریاض بے پناہ پیسہ خرچ کر رہے تھے۔ عدالت میں میرا چالان پیش کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر دوہرے قتل کا جرم تھا۔ حکیم سعد اللہ کا قتل اور اس کے بعد ایک قیدی غلام خان کا قتل۔ البتہ میرے وکیل ضمیر الدین صاحب نے اپنی مرضی کے خلاف میری بہت زیادہ مدد کی تھی۔ انہوں نے غالباً کچھ ایسے دلائل پیش کئے تھے' جن کی بنا پر مجھے پاگل اور خبطی قرار دے دیا جائے' لیکن وکیل سرکار انہی لوگوں میں سے تھا جو مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس نے جج سے میرے دماغی معائنے کا مطالبہ کیا اور جج صاحب نے حکم دیا کہ اعلیٰ قسم کے دماغی ہسپتال سے میرا معائنہ کرایا جائے۔ پولیس کے جوانوں کی نگرانی میں مجھے ہسپتال لے جایا گیا۔ تقریباً پانچ دن وہاں صرف ہوئے' میرا دماغی معائنہ کیا گیا۔ طرح طرح کے ایکسرے' مختلف طریقوں سے دماغی تجزیئے۔ میں عاجز آ چکا تھا ان تمام باتوں سے' لیکن جی رہا تھا۔ پھر پیشی ہوئی اور میرے دماغی معائنے کی رپورٹ پیش کر دی گئی اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ جج صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا' جو یہ تھا کہ میں دماغی طور پر ایک تندرست آدمی ہوں اور میرے دماغ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس کے بعد پانچ ساعتیں اور ہوئیں اور پھر مجھے اس دنیا سے رخصتی کا پروانہ دے دیا گیا۔ سزائے موت ہو گئی تھی مجھے۔ غالباً سب ہی کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا۔ عدالتی کارروائی کے دوران جس دن فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ ماموں ریاض کے ساتھ والد صاحب بھی تھے۔ وہ وہیں بے ہوش ہو گئے اور ماموں ریاض انہیں سنبھالنے لگے۔ میرے لئے دن کا تعین بھی کر دیا گیا اور اس بار مجھے جیل کی جس کوٹھری میں پہنچایا گیا وہ بہت ہی زیادہ تنگ و تاریک تھی۔ وہاں وحشتوں کا راج تھا۔ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہو چکا تھا اور یہ بڑی عجیب بات تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ زندگی کب ختم ہو گی یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن کیسی انوکھی بات ہے کہ میں جانتا تھا کہ فلاں دن' فلاں وقت مجھے اس دنیا سے رخصت کر دیا جائے گا۔ ان دنوں سوچیں بہت زیادہ جامع نہیں تھیں۔ بس اُڑے اُڑے خیالات تھے اور ماضی کی کہانیاں۔

یہ غالباً تیسرے دن کی بات ہے۔ میرا بھائی' بہن اور ماموں ریاض مجھ سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ سب کے سب زار و قطار رو رہے تھے۔ میں نے غصے میں کہا۔

''آپ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ آپ میں سے کوئی میرا اپنا نہیں ہے۔ کیوں یہاں آئے ہیں؟ چلے جایئے' چلے جایئے۔''

''بھائی جان......!'' میری بہن بلک بلک کر رو پڑی اور میں نے اسے خونی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

''میں کسی کا بھائی جان نہیں ہوں۔ میرا اب اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جاؤ اگر مجھ سے اپنا کوئی رشتہ ہی سمجھتے ہو تو میرا صرف ایک کام کر دینا۔ وہ یہ کہ اماں اور ابا کا خیال رکھنا۔'' میں نے ان لوگوں سے منہ موڑ لیا۔ وہ سب روتے اور بلکتے چلے گئے۔

✦✤✦✤✦

میں تو اب ان لوگوں میں سے تھا جن سے دنیا چھین لی جاتی ہے اور اب تو مجھے ساری باتیں بے کار لگتی تھیں۔ میں رات کو زمین پر لیٹ گیا۔ دوسرے دن پھانسی کی سزا دی جانی تھی مجھے۔ میں غور کرتا رہا۔ سنتری مجھے عبادت کی تلقین کرتے رہے۔ آج پہلی بار میں نے ان کی آنکھوں میں ہمدردی کے آثار دیکھے تھے۔ ایک سنتری نے مجھ سے کہا۔

''بابو! عبادت کرو اللہ کے حضور جا رہے ہو۔ جو کچھ کر کے جا رہے ہو وہ اچھا نہیں تھا لیکن توبہ قبول ہو جاتی ہے۔'' میں نے اسے کرخت نگاہوں سے دیکھا اور دوسری طرف رخ کر لیا۔ صبح قریب آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اعصاب میں ایک کھنچاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ذہن میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ سنتری آئے۔ انہوں نے مجھے کوٹھڑی سے نکالا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور مجھے شانوں سے پکڑ کر لے چلے۔ ایک ایک قدم منوں وزنی لگ رہا تھا۔ ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی گہرا گڑھا ہے جس میں' میں جا گروں گا۔ شانوں پر شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ پھر دفعتاً کسی نے میری گردن پر گدگدی کی اور میں چونک پڑا۔ سنتری مجھ سے دور تھے۔ پھر یہ کون ہے؟ عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر یوں لگا جیسے سر پر کوئی چیز چل رہی ہے' لیکن بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے اسے ٹٹول نہ سکا۔ تب ہی میرے کانوں میں آواز اُبھری۔

''میں ہوں میاں جی! پہچانا؟'' اور میں نے اسے پہچان لیا۔ بھلا اسے نہ پہچانتا۔ وہی منحوس آواز۔ میرے ساتھ چلنے والے سنتری اگر غور کرتے تو میرے سر پر بیٹھی مکڑی کو دیکھ سکتے تھے۔ ''نہیں میاں جی! یہ سسرے ہمیں نا ہیں دیکھ سکتے۔''

''اب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجا آ رہا ہے میاں جی! کہ نا؟'' اس کی آواز سنائی دی اور پھر باریک سا ٹمٹماتا ہوا قہقہہ۔ میں بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا۔ ''پھانسی ہو جائے گی اب تمہیں۔ تھوڑ مر جاؤ گے۔ دیکھا! تم سے کہا تھا نا ہم نے۔'' میں خاموشی سے قدم بڑھاتا گیا۔ ''جندگی بڑھیا ہے یا موت میاں جی! بولو جینا چاہو گے یا مرنا؟''

میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا تھا۔ میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''اب بھی زندہ رہنے کا کوئی امکان ہے؟''

''کیوں نا ہے۔ ہم جو ہیں۔''

''اب تُو کیا کرے گا؟ اب میری موت کتنی دور ہے؟'' میں نے کہا اور پھر اپنی مکروہ آواز میں ہنسا۔

''تم بات تو کرو میاں جی! ہم کا کریں گے یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو گا۔'' اس نے کہا۔

''کیا بات کروں؟''

''ہمارا کام کرو گے؟ دیکھو میاں جی! تمہارا راستہ کوئی نہ روکے گا۔ تم وہاں جا سکو گے جہاں ہمیں جانا ہے۔ آنکھیں بند کر کے چڑھتے چلے جانا پھاگن دوار۔ اور پھر ہمیں وہاں رکھ دینا۔ اس کے بعد دیکھنا مجا جندگی کا۔''

''مگر وہ پاک مزار ہے اور تُو گندا عامل۔''

''ہے رے اب بھی پاک ناپاک کے چکر میں پڑے ہو۔ مرجی ہے تمہاری۔''

''سن کمینے غلیظ سادھو! میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' وہی اتنا ہے کہ میں دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں۔ یقیناً میرے گناہ اتنے ہوں گے کہ میری یہ انتہا ہوئی۔ اب اس آخری وقت میں' میں تیرے سامنے یہ ناپاک اقرار کر کے اپنا ایمان نہیں کھونا چاہتا۔ موت میرے سامنے ہے۔ اب مجھے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں تھوکتا ہوں تجھ پر۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا' پھر بولا۔ ''جندہ تو تمہیں رہنا ہے میاں جی! میں سمجھا تھا کہ کس بل نکل گئے ہوں گے۔ موت کو سامنے دیکھ کر ہوش آ گیا ہو گا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میرے پاس بھی وقت ہے اور تمہارے پاس بھی۔ یہ کام تمہیں کرنا ہو گا۔ آج

نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں۔ ایسے نہیں چھوڑوں گا میاں جی! ایک دفعہ میں مر گئے تو کا فائدہ۔ مجا تو جب ہے کہ بار بار مرو۔ اس وقت تک مرتے رہو جب تک ہمارا کام کرنے کے لئے تیار نہ ہو جاؤ۔''

سنتری چونک چونک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں ان سے کچھ کہہ رہا ہوں۔ لیکن میں ان سے مخاطب نہیں تھا۔ آخری الفاظ کے بعد میں خاموش ہو گیا' مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں جیل کے پھانسی گھر پہنچ گیا۔ عجیب سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے سیڑھیاں چڑھائی گئیں۔ پھر میری آنکھوں پر کپڑا چڑھایا گیا۔ مجسٹریٹ' جیلر اور ڈاکٹر وغیرہ سب موجود تھے۔ عجیب پراسرار ماحول تھا۔ مجھ پر سکوت طاری تھا۔ پھر میری گردن میں پھندا فٹ کیا گیا اور پھر کچھ اور کیا گیا۔ مجھے اپنے پیروں تلے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی نرم چیز میرے پیروں کے نیچے آ گئی ہو۔ کسی نے مجھے نیچے گرنے سے روک لیا ہو۔ پھر ایک دھواں سا میرے اوپر چھا گیا اور دو ہاتھوں نے میری گردن سے پھندا نکال لیا۔ عجیب سا شور سنائی دیا۔ بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ کسی نادیدہ قوت نے میری کلائی پکڑی اور دوڑنے لگا۔ میں بے اختیار قدم اٹھا رہا تھا' بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ میں گھسٹ رہا تھا۔ پھر جیل کا دروازہ نظر آیا اور پھر دروازے پر کھڑے سنتری اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ ان کے ہاتھوں سے بندوقیں گر گئی تھیں۔ کسی نے ذیلی دروازہ کھولا اور مجھے باہر نکال لایا۔ جیل کے دروازے سے کچھ فاصلے پر املی کا ایک درخت نظر آ رہا تھا' جو بہت گھنا تھا اور اس کی موٹی موٹی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اٹھا کر ایک موٹی سی شاخ پر بٹھا دیا ہو۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ حالت خراب ہو رہی تھی۔ پھر اچانک میرے سر سے کوئی چیز لگی۔ دو پاؤں تھے جو لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وہ اسی شاخ سے آ ٹکے جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بعد ایک جسم بھی اس شاخ پر آ گیا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہی منحوس چہرہ میرے سامنے تھا اور وہی شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

''کیسی رہی میاں جی! بچ گئے پھانسی سے تم۔'' میری قوت گویائی ختم ہو گئی تھی۔ پورا جسم لرز رہا تھا۔ آہ' یہ سب کچھ خواب نہیں تھا۔ زندگی ختم ہو گئی تھی میری۔ سب کچھ ہو گیا تھا۔ پورے حواس کے عالم میں ہوا تھا' مگر میں بچ گیا تھا۔ میں زندہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''اور اب آگے تمہیں بچنا ہے میاں جی! پھانسی دینے والے مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ ساری جیل میں تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جاؤ گے ان کے پاس؟'' میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اُدھر دیکھو۔ تمہارے گھر والے تمہاری لاش لینے آئے ہیں۔ سارے کریا کرم کا بندوبست کر لیا ہے انہوں نے۔ سنو میاں جی اور کچھ نہیں کہیں گے تم سے۔ ہمیں بس اتنا کہنا ہے کہ ایک دن تمہیں ہمارا یہ کام کرنا پڑے گا۔ خود آؤ گے چل کر ہمارے پاس۔ ہم سے رو رو کر کہو گے...... مہاراج! ہم تمہیں پھاگن کے دوار لے چلنے کے لئے تیار ہیں۔ آؤ' ہمارے ساتھ چلو...... جب تک تم ہمارا یہ کام نہ کرو گے ایسے ہی دربدر پھرتے رہو گے۔ جہاں جاؤ گے' مصیبت تمہارے ساتھ ہو گی۔ جہاں ٹکو گے وہاں والے بھی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ کوئی تمہیں ساتھ رکھنے کو تیار نہ ہوگا۔ سب تم سے پناہ مانگیں گے اور پناہ تمہیں کہاں ملے گی؟ ہمارے پاس آ کر' ہمارا کام کر کے۔ کا سمجھے۔ ہمارا کام ای تھا کہ ہم تمہاری جان بچا کر یہاں تک لے آئے۔ روشنی میں نیچے اترے تو دھر لئے جاؤ گے۔ رات کو اُترنا اور گھر چلے جانا اور پھر سوچنا' کا سمجھے۔''

وہ اچانک میرے سامنے سے غائب ہو گیا۔ میں پتھرایا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں سن تھے۔ اپنا بدن اپنا لگتا ہی نہیں تھا اور اب اپنا وجود اپنا تھا بھی کہاں۔ مجھے تو سزائے موت ہو چکی تھی۔ جیل کی دنیا میں بھی یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی واقعہ تھا۔ اس سے پہلے بھلا ایسا کہاں ہوا ہوگا۔ مگر کچھ احساس تو دوسرے لوگوں کو بھی ہوگا۔ اب تو سمجھا جائے گا کہ میں ''بے گناہ'' تھا۔ کسی پراسرار جال میں پھنسا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کیسے ہوتا۔ ضمیر الدین صاحب نے یہ حوالے دیئے تھے' مگر وکیل سرکار نے ان باتوں کا خوب مذاق اُڑایا تھا۔ ضمیر الدین صاحب کے بارے میں نازیبا جملے ادا کیے تھے اس نے۔

''دوسرا قتل صرف اس لئے کیا گیا ہے جناب والا! کہ ملزم خود کو دماغی مریض ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس نے صرف اس بات کا یقین دلانے کے لئے ایک انسان کی جان لے لی۔ وہ بے رحم اور سفاک ہے۔ اسے صرف اور صرف موت کی سزا دی

جائے۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب! اس کا یقین آپ کو ضرور دلاؤں گا۔'' میں نے دل میں سوچا۔ دل و دماغ عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ بڑی مضحکہ خیز کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ خوف تھا کہ نیچے اُترا تو نہ جانے کیا ہو۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس طرف دیکھا' جہاں بے چارے ماموں ریاض' میرے چھوٹے بھائی اور پڑوس کی مسجد کے پیش امام اور مزید دو افراد کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے دل چاہا کہ درخت سے نیچے کود دوں' دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ انہیں بتاؤں کہ میں زندہ ہوں۔ مگر ہمت نہ ہوسکی تھی۔ پھر کچھ سپاہی باہر آئے۔ ماموں صاحب کو بلا کر اندر لے گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ماموں صاحب واپس آئے۔ عجیب شکل ہو رہی تھی۔ سب واپس چلے گئے۔ مجھے تو یہ پورا دن یہاں گزارنا تھا۔ حیران پریشان درخت پر بیٹھا رہا۔ دن کو بارہ بجے کے قریب ایک بار پھر میں نے ماموں ریاض کو دیکھا۔ اس وقت والد صاحب' والدہ صاحبہ' بھائی اور بہن بھی ساتھ تھے۔ صبر کیا۔ وہ لوگ اندر گئے۔ کافی دیر بعد باہر آئے اور پھر چلے گئے۔ میرا تمام دن بھوکے پیاسے گزرا تھا۔ پھر جب خوب تاریکی پھیل گئی تو میں نیچے اُترا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ گھر کا رخ بھول کر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ قانون آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا اور پھر سادھو کے الفاظ بھی یاد تھے۔ گھر والے تو صبر کر ہی لیں گے' مگر میں انہیں اپنی نحوستوں کا شکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آہ...... اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کہاں ٹھکانہ ہے میرا؟

دل و دماغ خوف کے زیر اثر تھے۔ قوت فیصلہ ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ شہر اجنبی نہیں تھا' لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا' جیسے پوری کائنات میں کوئی شناسا نہ ہو۔ انسانی شکل میں نظر آنے والا ہر وجود دشمن ہو۔ آہ! موت میری تاک میں اور زندگی ایک کمزور بے بس چڑیا کی مانند جو پرواز کے قابل نہ ہو اور جینے کی آرزو میں پھڑپھڑا رہی ہو۔ کون سی جگہ ہے جو میری پناہ گاہ بن جائے...... میری نگاہ ہر سائے میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر ہر سایہ خوف کا سایہ تھا۔ قدم کس طرف لے جا رہے ہیں' اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ پھر شاید غیب سے رہنمائی ہوئی۔ ریل کی سیٹی کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی کانوں سے ٹکرائی تھی اور میرے قدم رک گئے تھے۔ ریل...... ہاں' ایک راستہ یہ بھی تھا۔ کچھ فاصلے پر سٹیشن ہے' کیوں نہ یہاں سے نکل جایا جائے۔ کیوں نہ یہ شہر چھوڑ دیا جائے۔ ہوسکتا ہے یہاں سے دور جا کر زندگی کی آس بندھے۔

قدم پھر آگے بڑھے۔ رفتار تیز ہوگئی۔ دماغ پر نیند جیسی کیفیت طاری تھی۔ اسی عالم میں اسٹیشن پہنچا۔ بہت سی چیزوں کا احساس بھی نہ ہوسکا۔ بس ریل کے آگے بڑھنے کے جھٹکے سے جیسے آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد کے مناظر دیکھے۔ کھڑکی سے باہر روشنیاں رینگ رہی تھیں۔ اندر بلب کی ملگجی روشنی ان مسافروں کو نمایاں کر رہی تھی' جو کہیں دور سے آ رہے تھے اور دور جا رہے تھے۔ سب کے سب میری طرح نیند کے سحر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نہ جانے میں کیسے ان کے درمیان آیا تھا اور انہوں نے مجھے کیسی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

روشنیوں کے دوڑنے کی رفتار تیز ہوگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں اندھیرے کا خوف ہو اور وہ اس سے جان بچانے کے لئے بھاگ رہی ہوں۔ پھر اندھیرا تمام روشنیوں کو کھا گیا اور کھڑکی سے باہر گھور تاریکی کے سوا کچھ نہ رہا۔ میں نے اس اندھیرے سے خوف زدہ ہو کر آنکھیں بند کرلیں' لیکن جونہی پلکیں جڑیں میرے اختیار سے باہر ہوگئیں۔ کوشش کے باوجود آنکھیں نہ کھلیں۔ ذہن نے سوچوں کی گرفت سے آزادی کی جدوجہد کی اور اس کے حصول میں کامیاب ہوگیا۔ سارا بدن خوشگوار احساس کے ساتھ سو گیا اور نیند کی یہ عنایت اس وقت تک قائم رہی جب تک اجالے کے شہنشاہ نے تاریکیوں کو ملیامیٹ نہ کر دیا۔ باہر روشنی دوڑ رہی تھی اور ٹرین پٹریاں بدل رہی تھی۔ آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ غالباً ٹرین کسی اسٹیشن سے گزری تھی۔ لوگ جاگ گئے اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آہ...... رات بھر کا سفر طے ہو چکا تھا اور میں نہ جانے کتنی دور نکل آیا تھا۔ بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیا میری مشکلات کا خاتمہ ہوسکتا ہے؟ کیا مجھے ایک پُرسکون زندگی دوبارہ مل سکتی ہے؟ دل نے خود ہی جواب دے دیا...... ناممکن ہے۔ میں اپنے گناہوں کا پھل پا رہا ہوں۔ میں فطرت سے انحراف کا مجرم ہوں۔ وہ منحوس

سادھو میرا پیچھا کہاں چھوڑے گا۔ اس نے مجھے سکون کی دنیا سے بہت دور لا پھینکا ہے۔ میں ایک ایسا مجرم ہوں جو پھانسی کے تختے سے اتر کر بھاگا ہے۔ نہ جانے قانون کے رکھوالوں نے میرے فرار کا کیا جواز پیدا کیا ہوگا' لیکن یہ ایک سچ ہے کہ قانون چپے چپے پر مجھے تلاش کر رہا ہوگا۔ اپنے گھر واپس نہ جا کر میں نے بہترین فیصلہ کیا تھا۔ وہ لوگ میری وجہ سے بدترین مصیبتوں کا شکار ہو سکتے تھے۔ اب ایک یہی غم رہے گا انہیں کہ میں ان کے درمیان نہیں ہوں۔

دفعتاً مجھے ایک اور خیال آیا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ریل میں سفر کر رہا ہوں۔ بغیر ٹکٹ ہوں۔ رات تو گزر گئی۔ صبح کو ٹکٹ چیکر ضرور آئے گا۔ میرے پاس ٹکٹ کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں۔ نتیجے میں مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہاں یہ بھی انکشاف ہو سکتا ہے کہ میں دراصل ایک مفرور مجرم ہوں۔ آہ...... پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ مگر اب اس خیال سے دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ صرف ایک اور وہ یہ کہ میں خود ٹرین چھوڑ دوں۔ مگر کیسے؟ چلتی ٹرین سے تو نہیں اُترا جا سکتا۔ آہ...... جلدی کوئی اسٹیشن آ جائے۔ ابھی صحیح طور پر صبح نہیں ہوئی ہے۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے کا موقع مل جائے گا۔ جگہ کوئی بھی ہو' مجھے کیا لینا ہے۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ چاہئے۔ میں اُمید بھری نگاہوں سے باہر دیکھنے لگا۔ شاید قبولیت کا وقت تھا' دعا فوراً قبول ہوگئی۔ باہر عمارتوں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین کی رفتار سست ہوتی معلوم ہوئی۔ اسٹیشن آ گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بے صبری سے ٹرین کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر عالم پور کا بورڈ نظر آیا۔ مجھے اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے لئے کیا برا ہے۔ چنانچہ ٹرین رکی۔ میں جلدی سے نیچے اُتر گیا۔ ابھی پلیٹ فارم پر قدم رکھے ہی تھے کہ عقب سے کوئی میرے پاس آ گیا۔ مجھے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا اور میرا رنگ پیلا ہو گیا۔ تبھی ایک سرگوشی اُبھری۔

"سرفراز!" نہ جانے کس طرح گردن گھومی تھی' لیکن حالت بے حد خراب ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ اُبھرا۔ پُروقار نسوانی چہرہ۔ خاتون کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ آنکھیں گہری سیاہ اور بڑی بڑی تھیں۔ رنگ سفید۔ ایک عجیب سا چہرہ تھا جسے میں دیکھتا رہ گیا۔ میری قوت گویائی تو ختم ہی ہوگئی تھی۔ خاتون نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی اور بولیں۔

"صرف میں تھی سرفراز جسے پورا یقین تھا کہ ایک دن تم ضرور واپس آ جاؤ گے۔ میرے بچے غلطیاں معاف بھی کر دی جاتی ہیں۔ ابا جان آ رہے ہیں۔ ہم لوگ انہیں اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ دیکھو وہ سارے لوگ بابا جان کو اتار رہے ہیں۔" خاتون نے انگلی سے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں۔ "ان میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں ہے کہ ہمیں دوہری خوشیاں مل رہی ہیں۔" خاتون کی آواز رندھ گئی۔ مجھ کمبخت نے ایک بار پھر انہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہا' لیکن آواز نہ جانے کہاں گم ہوگئی۔ خاتون پھر بولیں۔ "آؤ سرفراز! براہ کرم آؤ۔ ابا جان بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ بہت دن کے بعد آئے ہیں۔ وہ سب تمہیں دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔" کچھ ایسا انداز تھا ان کا کہ میرے قدم خودبخود ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے اس طرح میری کلائی پکڑی ہوئی تھی جیسے میں بھاگ جاؤں گا اور پھر وہ مجھے لئے ہوئے اس جگہ پہنچ گئیں جہاں سب ایک بزرگ کو گھیرے ہوئے تھے اور معمر بزرگ ایک ایک کو گلے سے لپٹا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"ریحانہ...... ریحانہ کہاں ہے......؟ کیا وہ نہیں آئی؟"

جواب میں معمر خاتون آگے بڑھیں اور اس وقت وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ پھر ایک نوجوان لڑکی کی چیختی ہوئی آواز اُبھری۔

"ارے سرفراز بھائی! سرفراز بھائی!" اور اس کے بعد وہ سارے کے سارے مجھ پر حملہ آور ہو گئے۔ میں بھلا ان سب سے مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ میرا چہرہ ان کی غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب بھلا کون سننے والا تھا۔ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہو گیا۔ معمر بزرگ بھی آگے بڑھے۔ انہوں نے میرے سامنے کھڑے ہو کر میرا چہرہ غور سے دیکھا' پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر

مجھے سینے سے لگا لیا۔

''تو سرفراز میاں! تم آخر آ ہی گئے۔ بہت ہی اچھا فیصلہ کیا بیٹے! بہت ہی اچھا فیصلہ کیا۔'' میری عقل کھوپڑی سے دو فٹ اونچی اٹھ چکی تھی۔ کسی کی کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو۔ سارے کے سارے ایک ہی سُر میں بول رہے تھے۔ معمر خاتون نے ان سب کو روکا اور بولیں۔

''یہ اسٹیشن پر ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ گھر چلیں۔ چلو گھر چلیں۔''

''مگر یہ سرفراز بھائی یہ...... یہ...... یہ......''

''اسی ٹرین سے اترے ہیں چلو۔'' معمر خاتون نے اس دوسری لڑکی کے جواب میں کہا۔ جن صاحب کو نانا جان کہا جا رہا تھا انہیں تو سب بھول گئے۔ میرے ہی گرد جمگھٹا لگ گیا تھا۔ عجیب عجیب باتیں کی جا رہی تھیں میرے بارے میں۔ سارے کے سارے مجھے سرفراز سمجھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں انہیں اس قدر شدید غلط فہمی ہوئی تھی' لیکن میرے حق میں فی الوقت یہ بہتر تھا' کیونکہ اس غول میں' میں بآسانی اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ ٹکٹ چیکر بھی لاپروا سا آدمی تھا۔ اس نے گنتی بھی نہیں کی۔ بہرحال ایک طرح سے مجھے عارضی طور پر یہ سہارا مل گیا تھا۔ باہر آ کر میں نے معمر خاتون کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہا' لیکن معمر خاتون نے اب میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور ان بزرگ سے باتیں کرنے لگی تھیں' جو کہیں سے آئے تھے۔ بعد میں' میں نے ان لڑکیوں اور ان کے ساتھ موجود لڑکوں کو سمجھانا چاہا۔

''سنیئے بھائی!...... سنیئے بھائی صاحب!'' میں نے ایک نوجوان کو مخاطب کیا اور وہ مسکرا کر مجھے دیکھنے لگا' پھر بولا۔

''آپ سے تو ایسی کشتیاں ہوں گی کہ پٹخنیوں پر پٹخنیاں دی جائیں گی۔ سرفراز بھائی! آپ نے ہم سب کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم لوگوں پر کیا گزر چکی ہے۔''

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''ارے تو کیا یہیں کہیں گے؟ گھر نہیں چلنا ہے؟''

''سنیئے...... آپ کو...... آپ کو...... غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں سرفراز نہیں ہوں۔ آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ بعد میں آپ مجھے موردالزام ٹھہرائیں گے۔''

''سنا نادیہ! یہ سرفراز نہیں ہیں۔''

''ان کی تو ایسی کی تیسی۔ انہیں تو دس بار سرفراز بننا پڑے گا۔ چلئے جلدی سے' شرافت سے ورنہ میں لڑکی بہت بری ہوں۔'' اس خوب صورت سی لڑکی نے بے تکلفی سے کہا اور آستین چڑھانے لگی۔ سب ہنسنے لگے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ واقعی سر بازار اپنے آپ کی اس شدت سے تردید کرنا نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ بڑی قیمتی گاڑیاں آئی ہوئی تھیں۔ غول بیابانی ان گاڑیوں میں بھرنے لگا۔ اسی لڑکی نے جس کا نام نادیہ لیا گیا تھا' ایک نوجوان سے کہا۔

''آپ نے ان کے الفاظ سن لئے شاکر بھائی! ذرا ہوشیار رہیں' خطرہ ہے۔''

''فکر ہی نہ کریں۔ چار سو میٹر تک تو میں انہیں آگے نکلنے نہیں دوں گا۔ اس کے بعد بھی اگر یہ دوڑتے رہے تو پھر دیکھا جائے گا۔'' جس شخص کو شاکر کے نام سے پکارا گیا تھا اس نے کہا اور ایک بار پھر سب ہنسنے لگے۔

کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ ایسی شدید غلط فہمی ہوئی تھی انہیں کہ میں خود بھی حیران تھا' لیکن اس غلط فہمی نے مجھے کوئی خوشی نہیں دی تھی۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ اس غلط فہمی سے لطف اندوز نہ ہوتا۔ لیکن مجھ پر تو زندگی ہی کٹھن ہو گئی تھی۔ میں تو مصیبتوں کا مارا تھا۔ بھلا اس ماحول سے' ان الفاظ سے کیا لطف اندوز ہوتا۔ بس دل تھا کہ مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا اور ذہن طرح طرح کے خیالات کا شکار ہو رہا تھا۔ گاڑیاں جس عمارت میں داخل ہوئیں اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ نہایت خوش حال لوگ ہیں اور بڑی اچھی حیثیت کے مالک ہیں۔ آہ...... کاش ان لوگوں سے واقعی میرا کوئی تعلق ہوتا۔ چاہتا تو جھوٹ بول کر ان کے درمیان اپنے لئے جگہ بنا سکتا تھا۔ لیکن دل یہ بھی گوارہ نہیں کر رہا تھا اور میں

جھوٹ بول کر ایک اور گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے ہی زندگی بری طرح گناہوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی اور اس کا پورا صلہ بھگت رہا تھا۔

یہاں پہنچنے کے بعد تمام لوگ نیچے اتر گئے۔ معمر خاتون بزرگ کے ساتھ نیچے اُتری تھی' لیکن ان کی توجہ ان بزرگ سے زیادہ مجھ پر تھی۔ رکیں اور میرے قریب آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ لڑکے لڑکیوں کا غول مجھے ان کے پاس لے گیا۔ معمر خاتون نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا حلیہ بنا لیا ہے تم نے اپنا سرفراز! زندگی کھونے پر تلے ہوئے تھے۔ میں جانتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم واپس آ جاؤ گے' لیکن بیٹے بڑائی اسی میں ہے اور پھر شاید تمہیں علم نہ ہو کہ وہ نہ رہے جن سے تمہیں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ کیا تمہیں علم ہے کہ رحمان صاحب کا انتقال ہو گیا؟'' میری گردن بلاوجہ نفی میں ہل گئی تھی۔

''ہاں ہم سب بے سہارا ہو گئے ہیں سرفراز! ہم بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ہمارے سر سے سائبان سرک گیا ہے اور اب ......'' معمر خاتون کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ معمر بزرگ نے بھی میرے قریب پہنچ کر کہا۔

''چلو سرفراز میاں! تم بے شک بڑے ہو اور اب تو تمہیں اس خاندان کی سرپرستی کرنی ہے۔ بڑی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں تم پر۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے ہو۔'' ہم سب لوگ اندر داخل ہو گئے۔ خاتون نے ایک لڑکی کو حکم دیا کہ میرا لباس وغیرہ تیار کرے اور مجھے غسل خانے میں پہنچا دے۔ میں اس افتاد پر سخت حیران پریشان تھا' لیکن کیا کرتا۔ عارضی طور پر حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ البتہ میں ان معصوم لوگوں کو مناسب موقع پر صورت حال سے آگاہ کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا' جو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

لڑکی مجھے ساتھ لئے ایک وسیع کمرے میں پہنچی۔ جو ایسی ایسی آرائشی چیزوں سے آراستہ تھا' جو میں نے ہوش کے عالم میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ غسل خانے کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''جائیے اور اب اپنا حلیہ درست کیجئے۔ آپ کا لباس میں ابھی تیار کئے دیتی ہوں۔ یہاں باہر سٹینڈ پر مل جائے گا۔ جاتے ہوئے میں دروازہ باہر سے بند کر دوں گی تاکہ آپ فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے دیکھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں والی خوب صورت لڑکی تھی' جس کے چہرے پر شوخی اور معصومیت سجی ہوئی تھی۔ پھر میں باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ سفید ٹائلوں سے مرصع باتھ روم تھا' جس میں نہانے کے نئے نئے سامان موجود تھے۔ مجھے ان تمام چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا حق نہیں تھا' لیکن یہاں بھی تقدیر کے اس فیصلے پر شاکر ہو گیا' جو عارضی طور پر میرے لئے کیا گیا تھا۔ دل یہ سوچ کر کم از کم مطمئن تھا کہ میں ان لوگوں کو دھوکا دینے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ میں نے جس حد تک ممکن ہو سکا اس بات کی تردید کی تھی کہ میں سرفراز نہیں ہوں۔

غسل کیا' شیو کا سامان بھی موجود تھا۔ دل چاہا شیو کر لوں چنانچہ یہ بھی کر لیا میں نے اور جب باہر نکلا تو میرا لباس رکھا ہوا تھا۔ یہ حیران کن بات تھی کہ یہ لباس بھی میرے جسم پر بالکل درست تھا۔ سلک کا کُرتہ اور سلک کا ہی پاجامہ۔ یہاں تک کہ جو سلیم شاہی جوتے میرے لئے رکھے گئے تھے وہ بھی میرے پیروں پر فٹ آئے تھے۔ اس حیران کن اتفاق پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے سرفراز بالکل میرے جیسا ہو' ورنہ اس قدر شدید غلط فہمی اور وہ بھی اتنے بہت سے افراد کو ممکن نہیں ہو سکتی تھی' لیکن دل کے گوشوں میں ایک اور خوف کا تصور بھی اُبھر رہا تھا۔ کہیں یہ بھی اس کمبخت منحوس شیطان کی چال نہ ہو' جس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ میں کہیں بھی سکھ کا سانس نہیں لے سکوں گا' بلکہ جہاں بھی جاؤں گا اس کی نحوست میرا تعاقب کرتی رہے گی۔ دل کو یہ سوچ کر سمجھایا کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی۔ میں اپنے طور پر مدافعت نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرے اندر اتنی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اب خوف کے عالم میں مرنے سے کیا فائدہ ...... ہاں اپنے طور پر میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے میرا گناہ شدید سے شدید تر ہو جائے۔ جو کچھ کیا تھا اس کے صلے میں جو کچھ بھگت رہا تھا اس سے زیادہ کی میرے اندر ہمت نہیں تھی۔ اب تو میں کمرہ امتحان میں تھا اور اپنی تقدیر پر شاکر تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور باہر اچھے خاصے لوگ موجود تھے' جو مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے۔ ٹیبل پر ناشتے کا سامان موجود تھا اور کمرے میں تقریباً تمام ہی اہل خانہ موجود تھے۔ معمر خاتون مسلسل میری خاطر داری کر رہی تھی اور معمر بزرگ بھی۔ لڑکے لڑکیاں میرے اوپر ایک آدھ فقرہ چست کر دیتے تھے اور کمرے کا ماحول خوشگوار ہو جاتا تھا۔ خاتون نے کئی بار لڑکیوں اور لڑکوں کو ڈانٹ بھی پلائی کہ بہت زیادہ باتیں نہ کریں اور میرے مزاج کا خیال رکھیں۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ واہ! میں اور میرا مزاج۔ ابھی جب انہیں اس حقیقت کا یقین آ جائے گا کہ میں وہ نہیں ہوں جسے سمجھ کر وہ مجھے یہاں لائی ہیں تو مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ دنیا کا یہی انداز ہے اور دنیا اسی انداز میں جیتی ہے۔ ناشتے کے بعد معمر خاتون نے کہا۔

''ابا میاں! مجھے اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر سرفراز سے باتیں کر لوں۔''

''ہاں ہاں ..... کیوں نہیں اور میں بھی اب سونا چاہتا ہوں۔ سفر سے تھک گیا ہوں۔ تم اطمینان سے باتیں کر لو۔''

''آؤ سرفراز! میرے کمرے میں چلو۔'' معمر خاتون نے کہا اور میں خاموشی اور سعادت مندی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک خوبصورت کمرے میں لے آئیں۔ اندر پہنچ کر انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور پھر ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

''بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔'' میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور وہ خود بھی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

''سرفراز بیٹے! زندگی میں نجانے کیا کیا اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ غلطی ہماری نہیں ہے۔ لیکن بیٹے! تمہیں اس طرح سب کچھ چھوڑ کر نہیں چلے جانا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے مرحوم رحمان صاحب کا رویہ تمہارے ساتھ سخت ہو گیا تھا' لیکن بزرگ غلطیاں بھی تو کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا ان غلطیوں کی اتنی بڑی سزا دی جاتی ہے انہیں؟ یقین کرو رحمان صاحب کے دل پر تمہاری جدائی کا شدید غم تھا۔ وہ فریحہ کو اس عالم میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ فریحہ کو وہ سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ فریحہ کی جو کیفیت تمہارے پیچھے ہوئی میں اگر بتاؤں گی تو یہی سوچو گے کہ ماں ہوں' اپنی بیٹی کی وکالت کر رہی ہوں۔ مگر بیٹے! تم نے زیادتی کی ہمارے ساتھ۔ کچھ انتظار تو کر لیتے۔ کوئی فیصلہ صحیح بھی ہو سکتا تھا۔''

''میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں خاتون؟'' میں نے کہا اور معمر خاتون چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

''کیوں ..... کیا تم یہ بھول گئے کہ تم مجھے چچی جان کہتے ہو؟''

''جی ..... کچھ ایسے ہی حالات ہیں کہ میں اپنی مجبوریاں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ لیکن اس بات سے آپ کو آگاہ کر دینا بے حد ضروری سمجھتا ہوں کہ حقیقتاً میں سرفراز نہیں ہوں۔ میں زمانے کا ستایا ہوا ایک انسان ہوں اور میں آپ کو دھوکا دے کر یہاں اپنے لئے کوئی مقام بنانے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں۔'' معمر خاتون بے اعتباری کے انداز میں سنجیدگی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارا دل ابھی صاف نہیں ہوا۔ رحمان صاحب کی موت نے بھی تمہارے دل میں ہمارے لئے نرمی پیدا نہیں کی۔ خیر' جو کچھ تم کہہ رہے ہو' کہتے رہو۔ تمہاری سنگ دلی کا تھوڑا تھوڑا اندازہ تو مجھے تھا..... لیکن ..... لیکن اچھا ٹھیک ہے۔ فریحہ سے مل تو لو ایک بار اسے یہ بھی بتا دو کہ تم سرفراز نہیں ہو اور اس کے بعد ہم اپنی تقدیر پر شاکر ہو جائیں گے۔ جو کچھ بھی فیصلہ تم کرو گے ہمیں منظور ہوگا۔ میری بچی تمہارے جانے کے بعد کبھی مسکرائی نہیں ہے۔ کاش تمہیں ان حقیقتوں کا بھی احساس ہوتا۔''

''ٹھیک ہے خاتون! بالکل ٹھیک ہے۔ آپ میری بات نہیں مان رہیں' لیکن میں آپ سے صرف چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں کہ بعد میں آپ کو اگر حقیقتوں پر یقین آ جائے تو مجھے مجرم نہ سمجھئے گا۔ اس تمام کہانی میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

خاتون کے چہرے پر ناگواری کے آثار اُبھرے۔ انہوں نے گردن ہلائی اور آہستہ سے بولیں۔

''تمہاری انتہا پسندی کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں سرفراز! کیا تم اتنا تعاون کر سکتے ہو ہم سے کہ صرف چند روز

یہاں گزار لو۔ فریحہ سے ملاقات کر لو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ ہم سب پر احسان ہی ہوگا۔ اسے سمجھا دو۔ اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔" وہ اُٹھیں اور دروازہ کھول دیا۔ باہر سارا غول بیابانی جمع تھا۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"جی امی جان! کیا ہوا؟ یہ شرافت سے مان گئے یا پھر ہماری باری آ گئی؟"

"تم لوگ کوئی بدتمیزی نہ کرو۔ سمجھیں چلو اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"ایسے نہیں جائیں گے۔ اگر یہ شرافت سے مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم انہیں اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔" ایک لڑکی نے کہا اور وہ سب مجھ پر جھپٹ پڑیں۔

"نہیں نہیں ...... سنئے سنئے ...... میں چل رہا ہوں۔ میں چل رہا ہوں۔" میں نے بوکھلا کر کہا اور ہنستے' قہقہے لگاتے ہوئے یہ لوگ مجھے ایک طرف لے چلے۔

دل ہی دل میں دکھ بھی ہو رہا تھا۔ کاش میں اس گھرانے کا ایک فرد ہوتا۔ کیا خوبصورت زندگی ہوتی' لیکن میری نحوست بالآخر ان لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی ...... لڑکیاں مجھے لئے ہوئے ایک دروازے پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکا دے دیا اور اس کے فوراً بعد دروازہ باہر سے بند بھی کر دیا گیا تھا۔ عجیب سی صورتحال تھی۔ دل میں ایک میٹھا میٹھا سا احساس بھی جاگ رہا تھا' لیکن اس کا اختتام خوف کے دباؤ پر ہوتا تھا۔

گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ اعلیٰ درجے کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ دروازے' کھڑکیوں اور دیواروں کی مناسبت سے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک جانب ایک مسہری تھی' جس میں دو تکئے رکھے ہوئے تھے۔ مسہری کے بائیں جانب پھولوں کا ایک بہت بڑا خوبصورت گلدستہ نظر آ رہا تھا' جس میں تازہ پھول لگے ہوئے تھے اور اس کے اطراف میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کے انتہائی سرے پر بنی ہوئی کھڑکی کے سامنے ایک نسوانی پیکر موجود تھا' جس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ گہرے نیلے لباس میں ملبوس سیاہ چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ میں سکتے کی سی حالت میں کھڑا ادھر دیکھتا رہا اور پھر بمشکل تمام میری آواز اُبھری۔

"سنئے ......" نسوانی جسم میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی اور پھر اس نے اپنا رُخ تبدیل کر لیا اور آنسوؤں سے لبریز ایک حسین چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی یاسیت چھائی ہوئی تھی۔ میں سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں زندگی کے اس شعبے سے پوری طرح روشناس نہیں تھا' لیکن یہ سلگتا ہو حُسن میری آنکھوں کے راستے دل میں اُترتا چلا گیا تھا۔ ان حسین اور بڑی بڑی سی آنکھوں سے جن کے نقوش ان معمر خاتون سے کافی ملتے ہوئے تھے' آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سنئے! شاید آپ کا نام فریحہ ہے۔ یہاں سب لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ میں سرفراز ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا' لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں خاتون! کہ میرا نام سرفراز نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میرا چہرہ ان سے ملتا جلتا ہو کہ سب دھوکا کھا رہے ہیں' لیکن آپ کو دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ یہ غلط فہمی آپ کے لئے سب سے زیادہ بھیانک ہو سکتی ہے۔"

وہ آنسو بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "عامل پور کیوں آ گئے؟"

"تقدیر کا پھیر ہے۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ اچھا برا سوچ سکتی ہیں۔" اور ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ خاتون فریحہ بے اختیار ہو گئیں۔ دوڑ کر آگے بڑھیں اور میرے سینے سے سر لگا دیا۔

"معاف کر دو فرازی ...... مجھے معاف کر دو۔ میں اپنا تجزیہ نہیں کر پائی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم سے دور رہ کر میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ فرازی! اب مجھے معاف کر دو۔" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ میرے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ فریحہ کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا پھر بولی۔ "مجھے معاف نہیں کرو گے؟"

''اس کے کچھ امکانات ہیں کہ آپ میں سے کوئی سمجھ داری سے کام لے رے؟'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم سرفراز نہیں ہو؟''

''ہاں' میں سرفراز نہیں ہوں۔''

''پھر تم کون ہو؟''

''ایک تقدیر کا مارا۔''

''تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے ؟''

''کاش رہ سکتا۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کر رہی۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ایک درخواست قبول کرلو گے؟''

''حکم دیجئے۔''

''اگر میرے لئے تمہارے دل میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ مگر تمہارے آنے سے یہ سب کھل اُٹھے ہیں۔ امی بھی خوش نظر آ رہی ہیں۔ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان کے ساتھ کچھ وقت گزار لو۔ ابو کی موت نے ان سب کو نیم مُردہ کر دیا ہے۔ تمہاری وجہ سے کچھ خوشیاں مل جائیں گی۔ بات میری رہ جاتی ہے تو میں اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کرلوں گی۔ دوسروں پر کچھ ظاہر نہ کرو۔ صرف میری سزا قائم رکھو۔ صرف میری۔''

میں ہونٹ دانتوں میں دبا کر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ''میری دعا ہے فریحہ خاتون! کہ اس گھر کو کائنات کی ساری خوشیاں مل جائیں۔ میں ایک منحوس انسان ہوں۔ صرف اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ میری نحوست اس گھرانے کو لپیٹ میں نہ لے لے۔''

''ہاں ...... میں نے یہ الفاظ کہے تھے' میں نے تمہیں منحوس کہا تھا۔ تمہاری نحوست نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ میں ان الفاظ پر شرمندہ ہوں۔ بس غصے میں منہ سے نکل گئے تھے۔'' فریحہ بولی۔

''جی ......؟'' میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اور تم کہتے ہو کہ تم سرفراز نہیں ہو۔'' اس نے افسردگی سے مسکرا کر کہا۔

''خدا کا یہی حکم ہے تو یہی سہی ...... میں سرخم کرتا ہوں ...... لیکن خاتون فریحہ! آپ کو ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیا ......؟''

''بہتر ہے کہ دنیا کے سامنے بھی یہی ظاہر کریں کہ میرے اور آپ کے درمیان فاصلے ہیں تاکہ جب سچائی سامنے آئے تو آپ کی زندگی تباہ نہ ہو جائے۔ اس کے بعد بات بنائے نہیں بنے گی۔ کوئی ذریعہ نہیں ہوگا آپ کے پاس۔''

''ہاں تمہارے ان الفاظ کی وجہ جانتی ہوں۔ مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو' مجھے سزا دینا چاہتے ہو' فرازی! مجھ سے زیادہ تمہیں اس دنیا میں کون جانتا ہے؟ خیر' اپنے لئے مجھے ہر سزا قبول ہے۔ شاید وقت میری مشکل حل کر دے۔ مجھے منظور ہے۔''

میں نے بے چارگی سے گردن ہلا دی تھی۔ اس نے مجھے اُداس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور ہو سکے تو دوسروں کے سامنے میری توہین نہ کرنا۔''

''ہمیں کوئی درمیانی راہ نکالنی ہو گی فریحہ صاحبہ!'' میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی۔ میں بحالت مجبوری اس انوکھے ڈرامے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ موت کے جبڑوں سے نکلا تھا اور کوئی اور گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا' ورنہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتا۔ اب اسی روشنی میں عمل کرنا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آیئے فریحہ! باہر چلیں۔ آپ دوسرے لوگوں کو جو کچھ بتانا چاہیں' بتا سکیں۔''

''جی!'' اس نے گردن ہلا دی۔ ہم باہر آ گئے۔ شریر لڑکے اور لڑکیوں کا غول جیسے منتظر ہی تھا۔ انہوں نے اس مختصر وقت میں انتظام بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ سب میری آمد کی خوشیاں منا رہے تھے' مگر میرا دل رو رہا

تھا۔ وہ میں نہیں تھا‘ جس کے لئے خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ فریحہ بھی بجھی بجھی تھی۔ خوب ہنگامہ ہورہا تھا۔ البتہ ریحانہ بیگم ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے تنہائی میں کہا۔

’’لگتا ہے سرفراز میاں! تمہارے درمیان اختلاف دور ہوگیا ہے۔‘‘

مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔

’’یہ بات نہیں ہے چچی جان! ہم دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’ہم ایک ماہ تک اپنا تجزیہ کریں گے۔ الگ الگ رہ کر۔ یہ فیصلہ کریں گے کہ مستقبل میں ہمیں ایک دوسرے کے جذبات کا کس طرح خیال رکھنا ہوگا۔‘‘

’’بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘ ریحانہ بیگم نے کہا۔

’’اگر آپ اسے ہم دونوں کے درمیان رہنے دیں تو زیادہ اچھا نہیں ہوگا چچی جان!‘‘ میں نے عاجزی سے کہا۔

’’الگ الگ رہنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟‘‘

’’میرا مطلب ہے ہمارے درمیان تعاون اور مفاہمت رہے گی۔ بس قربت نہیں ہوگی۔‘‘

’’تم دونوں ہی سر پھرے ہو۔ مگر اب تم یہاں سے جاؤ گے نہیں۔‘‘

’’جی چچی جان!‘‘ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

’’ذاتی طور پر مجھے تم سے بے حد شکایت ہے۔‘‘

’’کیوں چچی جان؟‘‘

’’یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ رحمان اس طرح ہمارے درمیان سے چلے گئے تمہارا دل نہ پسیجا اور تم نے عادت کے مطابق ڈرامہ رچایا کہ تم سرفراز نہیں ہو۔ حالانکہ اس وقت تمہیں ساری رنجشیں بھول کر ہم سے افسوس کرنا چاہئے تھا۔ ہمارا سہارا بننا چاہئے تھا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ بچے مرجھا کر رہ گئے ہیں۔ اگر تمہیں اب بھی ضد تھی تو عامل پور کیوں اترے تھے؟‘‘

’’کاش میں آپ کو ساری حقیقت بتا سکتا چچی جان!‘‘

’’میں نے بڑی دعائیں کی ہیں تمہاری واپسی کے لئے۔ فریحہ اپنے رویے پر کتنا افسوس کرتی رہی ہے‘ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کوئی کسی کے دل میں نہیں داخل ہوسکتا۔‘‘

◆✤◆✤◆

سونے کا انتظام میں نے دوسرے کمرے میں کیا تھا۔ فریحہ کو بھی بتانا ضروری سمجھا تھا۔

’’محسوس نہ کرنا فریحہ! یہ ضروری ہے۔‘‘

’’تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے دوسروں کے سامنے رُسوا نہیں کرو گے۔‘‘

’’ہاں فریحہ! میں آپ کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔

’’جیسی تمہاری مرضی۔‘‘ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرا اور پھر تیسرا دن گزر گیا۔ حالات کسی قدر قابو میں آ گئے تھے۔ بڑی کوششوں سے مجھے یہاں کے حالات معلوم ہوئے تھے۔ رحمان صاحب کا گھرانہ تھا‘ جس کا وسیع کاروبار وغیرہ تھا۔ دو بیٹے شاکر اور عامر تھے۔ چار بیٹیاں تھیں جن میں فریحہ سب سے بڑی تھی۔ اس کی شادی سرفراز سے ہوئی تھی‘ جو دنیا میں تنہا تھا۔ چنانچہ اسے گھر داماد بنا لیا گیا۔ خودسر اور سرکش مزاج نوجوان تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ فطرتاً انتہا پسند تھا۔ فریحہ بھی خود پسندی کا شکار تھی۔ چنانچہ دونوں میں اختلاف تھا۔ پھر ایک دن رحمان صاحب نے طلب کر کے فریحہ کی شکایت پر برا بھلا کہا۔ فریحہ بھی باپ کے ساتھ تھی۔ سرفراز خاموشی

سے گھر چھوڑ کر چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ بعد میں فریحہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ رحمان صاحب بھی پشیمان تھے کہ بیٹی کا گھر بگڑ گیا۔ پھر اچانک رحمان صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ یہ کہانی تھی سرفراز کی۔

میں نے اس کی تصویریں دیکھیں اور ششدر رہ گیا۔ ایسا انوکھا ہم شکل شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ وہ لوگ کافی حد تک اس سلسلے میں بے قصور تھے۔ اصولی طور پر مجھے یہاں سے خاموشی سے نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر میری بزدلی مجھے روک رہی تھی۔ اول تو میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لباس بھی ان لوگوں کا دیا ہوا تھا۔ لباس تک سلامت نہیں تھا۔ اس عالم میں کیا فیصلہ کرتا۔ پھر باہر کا ہولناک ماحول! جس دن سے اس گھر میں داخل ہوا تھا باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ کئی بار نیت میں خرابی آئی تھی، مگر ضمیر زندہ تھا۔ میں اپنے لئے اس خاندان کو فنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس اُلجھن میں تھا کہ اس ڈرامے کو کتنا طویل کیا جا سکتا ہے۔ فریحہ نے مجھے طرح طرح سے رجھانے کی کوشش کی تھی، مگر میں نے خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ پھر ایک دن ڈراپ سین ہو گیا۔ شام کے پانچ بجے تھے۔ باہر لان میں چائے کا بندوبست ہو رہا تھا کہ ایک کار اور اس کے پیچھے ایک پولیس جیپ اندر داخل ہو گئی۔ سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ اس وقت سب ہی باہر موجود تھے۔ جیپ سے جس شخص کو ہتھکڑیوں سمیت اُتارا گیا، اسے دیکھ کر میرا دل اُچھل پڑا تھا۔ نہایت خراب حلئے میں وہ سرفراز تھا۔ سب دم بخود رہ گئے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت تھا۔ کار سے ایک عمر رسیدہ صاحب نیچے اترے اور نانا جان کے قریب پہنچ گئے۔

''اخاہ...... حامد حسین صاحب! آپ بھی یہاں موجود ہیں۔''

''ہاں...... بچی کا اصرار تھا۔ کچھ دن کے لئے آیا ہوں مگر...... یہ سب...... یہ سب؟'' نانا جان بولے۔

''بڑا پریشان کن مرحلہ ہے۔ ذرا انہیں دیکھئے، یہ کون ہیں؟''

اتنی دیر میں تمام لوگ اس سرفراز کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرے قدم اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ دل اندر سے چیخ رہا تھا، بھاگ جا...... قیامت آ گئی ہے...... بھاگ...... فوراً بھاگ...... مگر میں بھاگ نہ سکا۔

''چچی جان! میں سرفراز ہوں۔'' سرفراز مظلوم لہجے میں بولا۔ ساتھ کھڑے پولیس افسر نے اس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ رسید کر دیا۔

''تم سے بولنے کے لئے منع کیا گیا تھا۔''

''آپ بھی یہاں آ جائیے شاہ صاحب!'' نووارد نے کار کی طرف رخ کر کے کہا اور اس میں سے ایک اور صاحب نیچے اُتر آئے۔ سادہ لباس میں تھے، مگر حلئے سے پولیس افسر معلوم ہو رہے تھے۔ نووارد نے کہا۔

''یہ محکمہ پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں۔ میرے پرانے ساتھی۔ محکمہ پولیس نے اس شخص کو گرفتار کیا ہے اور پولیس کا خیال ہے کہ یہ ایک خطرناک قاتل ہے، جسے سزائے موت ہو گئی تھی۔ لیکن یہ تختہ دار سے فرار ہو گیا۔ پولیس کے پاس اس کا مکمل ریکارڈ موجود ہے، جبکہ اس شخص نے یہ بات تسلیم نہیں کی اور اعلیٰ پولیس افسران سے کہا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ رحمان عظیم کا داماد ہے، جو عامل پور کے رئیس ہیں۔ یہ بات شاہ صاحب کے علم میں آئی اور چونکہ شاہ صاحب یہ بات جانتے ہیں کہ عامل پور کا رہنے والا ہوں اور مرحوم رحمان میرے دوست تھے، چنانچہ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں بٹیا کی شادی کے وقت ملک میں موجود نہیں تھا، اس لئے اسے پہچانتا نہیں تھا۔ مرحوم رحمان کا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس بات کو نظر انداز کر دیتا۔ چنانچہ میں نے شاہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ میری مدد کریں اور وہ اپنے رسک پر صرف میری وجہ سے اس خطرناک مجرم کو لے کر یہاں آئے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کریں۔''

سب پر سکتہ طاری تھا اور میں خود بھی بت بنا کھڑا تھا۔ میرے اندر شدید کشمکش جاری تھی۔

''چچی جان! اس وقت پرانی رنجشوں کو ذہن میں نہ لائیں۔ میں موت کے دہانے پر ہوں۔ میری زندگی بچالیں۔ فریحہ!...... فریحہ مجھے معاف کر دو، مجھے بچاؤ۔''

اچانک ہی میرے ذہن میں شیشہ سا ٹوٹ گیا۔ ایک عجیب سا جذبہ دل میں اُبھرا اور اندر ہی اندر سارے فیصلے ہو

گئے۔ میں ایک دم آگے بڑھ آیا۔ تب پہلی بار مجھے دیکھا گیا اور اب ان سب لوگوں پر حیرت کے دورے پڑے۔ شاہ صاحب اور رحمان صاحب کے دوست بھی دنگ رہ گئے اور اصل سرفراز بھی۔ سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔

''وہ سچ کہتا ہے شاہ صاحب! جس کے دھوکے میں اسے پکڑا گیا ہے وہ میں ہوں۔ قدرت نے نہ جانے کیوں ہم دونوں کو ایک ہی شکل دے دی ہے۔ اسے چھوڑ دیں۔ تختہ دار سے مفرور قاتل میں ہوں۔'' شدید سنسنی پھیل گئی تھی۔ سرفراز کا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔ شاہ صاحب بہرحال پولیس والے تھے۔ فوراً سنبھل گئے۔ انہوں نے ساتھ آئے ہوئے پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ میرے گرد آ کھڑے ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا۔

''تم پورے ہوش وحواس کے ساتھ یہ اعتراف کر رہے ہو؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جی شاہ صاحب! بے ہوشی کے عالم میں تو اور ہی باتیں کی جاتی ہیں۔ اس بیچارے کو چھوڑ دیجئے۔ یہ خوش نصیب ہے' اپنے ساتھ بہت سے ہمدرد رکھتا ہے۔ میرا کیا ہے' مجھے تو موت نے گھیرا ہی ہوا ہے اور میں اس سے کہیں فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ کیوں اس بیچارے کے ہاتھوں میں آپ نے ہتھکڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ یہ سرفراز ہے۔ جس مجرم کی آپ کو تلاش ہے وہ میں ہوں...... اور میرا نام مسعود ہے۔''

شاہ صاحب کے ساتھ جو صاحب آئے تھے اور جن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سول جج ہیں' حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے چچی جان سے کہا۔

''یہ کیا قصہ ہے بھابی صاحبہ؟'' لیکن چچی جان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تھی۔ فریحہ دم بخود تھی۔ تمام ہی لوگ ابھی تک برے احوال میں تھے۔ شاہ صاحب نے کہا۔

''عجیب بات ہے' عجیب بات ہے۔ دونوں ایک ہی شکل کے مالک ہیں اور یہ کہتا ہے کہ اصل مجرم یہی ہے اور درحقیقت ہمیں مسعود ہی کی تلاش تھی۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو تھوڑی دیر کے لئے اندر چلیں۔ ذرا تفصیلی گفتگو ہو جائے۔ آئیے مسعود صاحب!'' شاہ صاحب نے خاصے مہذب لہجے میں کہا اور میں نے شانے ہلا دیئے۔ پولیس والے مجھے گھیرے میں لئے ہوئے تھے' لیکن میں تو خود ہی گھیرے میں آ گیا تھا۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس وقت بآسانی اپنے اس ہم شکل کو پھنسا سکتا تھا' کیونکہ اس وقت میں ایک مہذب گھرانے کی پناہ میں تھا' لیکن بس ضمیر کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میری کچلی ہوئی شخصیت کسی اور گھرانے کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری آرزو یہ تھی کہ سب آباد رہیں۔ میں برباد ہو گیا ہوں تو اپنی بربادی کے اثرات دوسروں پر نہ پڑنے دوں۔ ہم سب اندر آ گئے۔ شاہ صاحب نے ایک جگہ بیٹھنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''مگر مسعود صاحب! اگر آپ درحقیقت وہی ہیں' میرا مطلب ہے تختہ دار سے فرار ہونے والے قاتل تو آپ نے اس گھر میں پناہ کیسے لی؟ آپ کو سرفراز کے بارے میں علم کیسے ہو گیا؟''

میں نے بیگم صاحبہ اور فریحہ کی طرف دیکھا۔ عامر اور شاکر بھی تھے اور نانا جان بھی۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

''بس اسے لالچ سمجھ لیجئے۔ میں اس گھر میں پناہ لینے اور اس گھر کی دولت بٹورنے آیا تھا' لیکن حق' حق ہی ہوتا ہے۔ سرفراز یہ ہیں اور میرا نام مسعود ہے۔''

شاہ صاحب نے کچھ پوائنٹ نوٹ کئے۔ سرفراز کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور یہ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں منتقل کر دی گئیں۔ یہ سب ہی میرے سلسلے میں متاثر نظر آ رہے تھے۔ شاہ صاحب نے فوراً پوچھ لیا۔

''مگر مسعود صاحب! آپ کو تو ایک بہترین پناہ گاہ حاصل ہوئی تھی۔ اگر آپ یہ تسلیم کر لیتے کہ آپ مسعود نہیں ہیں اور یہ شخص بہروپیا ہے تو میرا خیال ہے فیصلہ کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ آپ نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو

کیوں گرفتاری کے لئے پیش کر دیا؟''
''چھوڑیئے شاہ صاحب! یہ کہانیاں مختلف ہیں۔ اب آپ صرف وہ قانونی فرائض سرانجام دیجئے جو آپ کو انجام دینے ہیں۔''
''جی ہاں بے شک۔ بہرحال آپ نے ایک اچھا تاثر چھوڑا ہے ہم پر۔ اس لئے بدترین مجرم ہونے کے باوجود ہم آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر مجبور ہیں۔ براہِ کرم کوئی ایسی کوشش نہ کیجئے گا جس سے ہمارے ہاتھوں آپ کو نقصان پہنچ جائے۔ ٹھیک ہے۔ اب ہمیں اجازت دیجئے۔ اگر آپ چلنا پسند فرمائیں تو چلیں۔ ورنہ آپ یہاں رکئے۔ ہم انہیں لے کر چلتے ہیں۔'' شاہ صاحب نے جج صاحب سے کہا اور جج صاحب بولے۔
''ہاں مجھے تو ابھی کچھ وقت رُکنا ہوگا۔ آپ بھی شاہ صاحب! اگر......''
''نہیں جناب! کسی خاطر مدارات کی گنجائش نہیں ہے۔ میں اپنی ڈیوٹی پر ہوں۔'' شاہ صاحب مجھے وہاں سے لے کر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔
''چچی جان! آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ میں نے یہ وقت یہاں کیسے گزارا ہے۔ فریحہ صاحبہ اس بات کی گواہی دیں گی کہ میں نے یہاں جو نمک کھایا ہے وہ حرام نہیں کیا اور ہر چیز کا احترام کیا ہے۔ سرفراز صاحب! آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔ چند الفاظ میں آپ سے بھی کہنا چاہتا ہوں۔ بے شک میں آپ کا ہم شکل ہوں اور چند روز میں نے یہاں گزارے ہیں' لیکن فریحہ کو میں نے ان کی غلط فہمی کے باوجود اپنے دل میں ایک سگی بہن ہی کا درجہ دیا ہے اور خدا کا شکر ہے اس تصور کو نبھایا ہے۔ میری ایک چھوٹی بہن ہے اور آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں کہ خدا اسے آبرومند رکھے۔ چچی جان! میرا پرانا لباس مل سکتا ہے؟''
چچی جان بری طرح رو پڑی تھیں۔ یہاں موجود ہر شخص جانتا تھا کہ میں نے یہاں کیسے زندگی گزاری تھی۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے ایک لمحہ بھی ان کی اس غلط فہمی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔
شاہ صاحب نے رسمی کارروائیاں کیں اور مجھے لے کر چل پڑے۔ میں بہت بڑا مجرم تھا' جو کچھ میں نے کیا تھا' معمولی بات نہیں تھی۔ کھلبلی مچ گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو تو صورت حال بھی معلوم نہیں تھی۔ مجھے لاک اپ میں ہی رکھا گیا' مگر میرے لئے سخت پہرہ لگایا گیا تھا۔ البتہ شاہ صاحب مجھ سے بہت متاثر تھے۔ میرا کیس بے حد انوکھا تھا۔ میں سزائے موت کا مجرم تھا۔ تختہ دار سے پھانسی دینے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آیا تھا۔ قانون کے لئے بے شمار اُلجھنیں تھیں۔ مجھے فوری پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی' کیونکہ اس سزا کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ ہاں مجھ پر از سر نو مقدمہ ضرور چلایا جا سکتا تھا۔ یہ تحقیق کرنی تھی کہ میرے فرار کے عوامل کیا تھے؟ اس سازش میں کون شریک تھا۔ سازش کیسے تیار ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے لئے تیاریاں ہونے لگیں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کے لاک اپ میں مجھے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ ایک ایس آئی اور دو کانسٹیبلوں کی مجھ پر مسلسل ڈیوٹی لگائی گئی تھی اور شاید انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ میرا ہر طرح خیال رکھیں۔ مجھے ہر سہولت دی جائے اور وہ لوگ عمل کر رہے تھے۔ عمدہ کھانا' ضرورت کی ہر چیز۔ شاہ صاحب خود مجھ سے ملے۔
''کہو مسعود! کیا حال ہے؟'' انہوں نے کہا۔
''ٹھیک ہوں شاہ صاحب!''
''جیل کی نسبت یہاں تمہیں آرام ہوگا' لیکن یہ عارضی ہے۔ اس کے بعد جیل جانا ہوگا۔''
''کیا فرق پڑتا ہے صاحب!''
''میرے لئے کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ کوئی ضرورت......کوئی بات۔''
''آپ کا بے حد شکریہ۔ ایک خیال دل میں ہے۔ پتہ نہیں آپ میری یہ مشکل حل کر پائیں گے یا نہیں؟''
''کہو کیا بات ہے؟''

''جب مجھے پھانسی دی گئی تھی شاہ صاحب! تو میرے اہل خاندان میری لاش لینے آئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں وہ لاش نہیں ملی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان سے کیا کہا گیا؟ اس کے علاوہ میری خواہش ہے کہ اب انہیں میرے بارے میں کوئی اطلاع نہ دی جائے۔ انہیں دوبارہ اس کیس میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر آپ یہ کام کر دیں تو میں آپ کا بڑا احسان مانوں گا۔''

شاہ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔ ''بہت مشکل کام ہے۔ میں ایک دو دن میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ ویسے اطمینان رکھو اس بارے میں پوری رپورٹ میں تمہیں دے دوں گا۔''

''بے حد شکریہ شاہ صاحب!'' وہ چلے گئے اور میں ٹھنڈی سانس لے کر لاک اپ کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ کیا سوچتا' کیا کرتا۔ سب کچھ بیکار تھا۔ ہاں' ایک خوشی ضرور تھی۔ کم از کم اس خاندان کو میں نے کسی الیے سے دوچار نہیں کیا۔ اس احساس سے دل کو سکون ملتا تھا۔

اس رات جو مجھے کھانا پیش کیا گیا۔ عمدہ قسم کی بریانی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دھو کر کھانے کا آغاز کیا۔ بریانی کی پلیٹ میں چاولوں کے ساتھ مرغ کا گوشت نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک بڑا ٹکڑا باہر نکالا۔ عجیب سی ساخت تھی اس کی' لیکن جونہی وہ چاولوں سے برآمد ہوا اچانک میں نے اسے کلبلاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ میری انگلیوں کی گرفت سے نکل کر میری کلائی پر چڑھ گیا۔ تب میں نے اسے دہشت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ گوشت کا ٹکڑا نہیں تھا بلکہ ربر جیسا انسانی مجسمہ تھا۔ چلتا پھرتا' متحرک مجسمہ۔ اس نے میری کلائی پر دوڑ لگائی اور کندھے پر آ گیا۔

دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بے شک بدترین حالات کا شکار تھا' لیکن انسان تو تھا۔ بدروحوں کے درمیان تو نہیں رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہمیشہ تو نہیں دیکھا تھا۔ بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ حواس معطل ہوئے جا رہے تھے۔ میرے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ میں نے پھریری لے کر اسے شانے سے جھٹکنے کی کوشش کی' لیکن اس نے میرا کان پکڑ لیا اور اس طرح گرنے سے محفوظ رہا۔ اس کی انگلیاں ننھے منے کانٹوں کی طرح میرے کانوں میں چبھ رہی تھیں۔ پھر اس کی منحوس آواز اُبھری۔

''مرے کیوں جا رہے ہو میاں جی! ہماری تمہاری تو پکی دوستی ہے۔ اب ہم سے گھبرایا نہ کرو۔''

''نیچے اُتر مردود! میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' میں نے دہشت سے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے...... رے...... رے! اچھل کود کرو گے تو سنتری تمہیں پاگل سمجھیں گے اور پاگلوں کو پاگل خانے رکھ کر مار لگائی جائے ہے۔ بات کرنے آئے ہیں ہم تم سے۔ آرام سے بیٹھو' بات کرو۔ سمجھ میں آیا یا نہیں؟'' اس نے کہا۔ اس کا کہنا درست تھا۔ میری چیخوں کی آواز سن کر باہر پہرہ دینے والا سنتری سلاخوں کے سامنے آ کھڑا ہوا اور مجھے گھورنے لگا' پھر بولا۔

''کیا بات ہے؟'' کیا بتاتا میں اسے اور بتاتا بھی تو وہ کیا کر پاتا۔ میں خاموش رہا۔ ''کھانا کھا لو۔ کچھ اور تو نہیں چاہئے؟''

''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے کان میں قہقہہ اُبھرا۔ پھر اس نے میرا کان چھوڑ دیا اور اچھل کر میرے سر پر چڑھ گیا۔ وہاں سے زمین پر کود گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ آپ تصور کریں' ایک مختصر ترین انسان میرے سامنے تھا' جو مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس کی حقیقت جانتا تھا۔

''ہاں میاں جی! عقل ٹھکانے آئی؟''

''کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے شیطان! میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے سب کچھ تو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ سارے کام ادھورے رہ گئے ہیں ہمارے۔ تو اگر ہمارا کام کر دے تو ہمیں بہت بڑی شکتی حاصل ہو جائے گی۔ سنسار میں سب کچھ کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم۔ ہمارے سارے دشمن پانی بھریں گے ہمارے سامنے۔ تو نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہے۔''

''تم کسی اور سے بھی تو یہ کام لے سکتے ہو۔''

''یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہمارے لئے بھی تو ایک ہی ہے' دوسرا کوئی ہوتا تو کچھ سوچتے۔''

''مگر کیوں؟''

''کہا نا تجھ سے' بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو خود ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم تو تیرے پاس نہ پہنچے تھے۔ جاپ کیا تھا ہم نے سو دن کا اور سوویں دن جسے ہمارے پاس آنا تھا' وہی ہمارے کام کا تھا۔ جیون میں ایک ہی جاپ کیا جاوے ہے' دوسرا نہیں۔ ہم بھی تجھ سے بندھے ہیں پاپی!''

''مگر میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''کرنا تو تجھے ہوگا للو! کام ہی تیرا ہے۔ آج نہیں تو کل کرے گا۔ کل نہیں تو پرسوں اور ہم تجھے سمجھائے دیتے ہیں۔ بے کار ضد کر رہا ہے۔ ہماری تیری دوستی پکی ہو جائے گی۔ ہمیں مہان شکتیاں حاصل ہو جائیں گی اور وہ تیرے کام بھی آئیں گی۔ سنسار میں جو تُو چاہے گا' ہم کریں گے تیرے لئے۔ تُو یہی چاہتا تھا نا کہ دولت تیرے قدموں میں ڈھیر ہو جائے۔ تُو جو چاہے سو کر سکے۔ ریس کورس میں گھوڑے تیرے اشارے پر دوڑیں۔ تُو جسے دیکھے وہ تیرا ہو جائے۔ ایسا ہی ہوگا للو! سوچ لے محل بنا دیں گے تیرے لئے۔ سونے چاندی کا ڈھیر لگا دیں گے تیرے سامنے۔ بے کار کی ضد کر رہا ہے۔ پورے سنسار میں تُو اکیلا دھرماتما ہے کیا؟ لوگوں کو دیکھ' چار پیسے کے لئے دوسرے کا گلا آسانی سے کاٹ دیتے ہیں۔ وہ گناہ نہیں کرتے کیا؟ تُو ہمارا کام نہیں کرتا' نہ کر۔ سڑ سڑ کر مر جائے گا۔ کچھ دن کے بعد تیرے اپنے بھی تجھے بھول جائیں گے۔ کوئی نام لیوا نہ ہوگا تیرا۔ کیا ملے گا تجھے؟ بول! کیا ملے گا؟''

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بولا۔ ''یہ نہیں سوچا تُو نے؟''

''تیرا کوئی نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھوریا چرن ہے ہمارا نام۔ پر تجھے نام سے کیا ہے؟''

''مجھے سوچنے کے لئے وقت دے بھوریا چرن ......! کچھ وقت چاہئے مجھے۔''

''ٹھیک ہے وقت لے لے۔ سوچیو اور ہمیں آواز دے لیجیو۔ جب بھی آواز دے گا ہم آ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بھوریا چرن! مجھے موقع دے۔ میں سوچنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔

دنیا کا عجیب ترین انسان میرے سامنے تھا۔ کچھ دیر وہ وہاں رکا اور پھر اس نے میری طرف ہاتھ ہلایا اور سلاخوں کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ یہ سلاخیں کسی عام انسان کا راستہ روک سکتی تھیں' شیطان کا نہیں۔ وہ ان کے درمیان سے آرام سے نکلتا ہوا آگے بڑھا اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ بھاگ کر اسے دیکھوں۔ کاش وہ کسی کی نگاہوں میں آ جائے اور اسے پکڑ لیا جائے۔ کچھ ہو جائے اس کے ساتھ' لیکن خود ہی اپنے خیال پر ہنسی آ گئی۔ اگر کسی نے دیکھ ہی لیا تو دہشت سے چیخیں مارتا ہوا بھاگ جائے گا۔ اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ جب بالکل دور چلا گیا تو میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بدن بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ میں زمین پر لیٹ گیا۔ سامنے ہی بریانی کی پلیٹ رکھی تھی' لیکن اب وہ میرے لئے ناپاک ترین تھی۔ وہ کمبخت پلیٹ میں گوشت کی جگہ چھپا ہوا تھا۔ سارے چاول غلیظ کر دیئے تھے اس نے۔ بھلا اب ان چاولوں کا ایک دانہ بھی کھایا جا سکتا ہے؟ کراہت ہو رہی تھی مجھے اس پلیٹ سے۔ سنتری تھوڑی دیر کے بعد پھر میرے سامنے آ کر رکا اور کہنے لگا۔

''کیا بات ہے؟ کھانا نہیں کھایا تم نے؟''

''کچھ طبیعت خراب ہے بھائی! کسی سے کہہ کر یہ چاول یہاں سے اٹھوا لو۔'' میں نے عاجزی سے کہا اور میری یہ عاجزی سنتری کو نرم کرنے کا باعث بن گئی۔ وہ میرے قریب رکا اور بولا۔

''کیا بات ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟''

"بدن ٹوٹ رہا ہے۔"

سنتری چند لمحات کے بعد واپس چلا گیا۔ پھر دو آدمی آئے اور چاول اٹھا کر لے گئے۔ اس سے زیادہ میرے جیسے کسی انسان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی جا سکتی تھی۔

درحقیقت بھوریا چرن کے جانے کے بعد میں اپنا تجزیہ کرنے لگا۔ خود مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میرے عقیدے میں کبھی بھی ایسی پختگی نہیں تھی۔ میں تو ایک بدکار انسان تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان اچھا تھا۔ ماں باپ' بہن بھائی نیک فطرت تسلیم کئے جاتے تھے۔ صرف میں ہی تھا جس نے اپنے خاندان کو بدنما بنا دیا تھا۔ لیکن میری یہ بدنمائی کہاں گم ہو گئی۔ میرے ذہن میں یہ عقیدہ کیوں جاگا؟

پیر پھاگن کا مزار بے شک میرے لئے بھی قابل احترام تھا۔ بہت بار گیا تھا ان کے مزار پر حاضری دینے' فاتحہ پڑھنے لیکن یہ صرف روایت کے طور پر کیا تھا میں نے۔ عقیدت اور احترام کا کوئی ایسا جذبہ نہیں پل رہا تھا میرے سینے میں جس کی بناء پر میں اپنا مستقبل یا زندگی داؤ پر لگا دیتا۔ یہ جذبہ میرے سینے میں پہلے سے نہیں تھا بلکہ اب پیدا ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں میں اس سے اتنی ضد کر رہا تھا۔ اگر اس سے تعاون کر کے' اس کے کہنے کے مطابق پیر پھاگن کے مزار پر حاضری کی کوشش جاری رکھی جاتی تو ہو سکتا ہے کامیابی ہی حاصل ہو جاتی اور اگر یہ کوشش ناکام بھی ہو جاتی تو پھر وہ شیطان اسے میرا قصور نہیں قرار دے سکتا تھا۔ میں بھی تو اس سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی شکتی' اس کی قوت پیر پھاگن کے مقابلے میں ناکام رہی ہے۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں اور یہ خیال نجانے کیوں میرے ذہن میں جڑ پکڑنے لگا تھا کہ اگر ایسی ہی کوئی بات ہے اور میں اس شیطان کے پتلے کو وہاں لے جانے میں ناکام رہتا ہوں تو پھر وہ مجھ سے کیا کہہ سکے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا...... اور اگر اس میں کامیاب ہو گیا تو کیا میں ایک گناہ عظیم کا مرتکب نہیں ہوں گا؟ ایک ناپاک روح کو ایک مقدس جگہ پہنچانے کا باعث نہیں بن جاؤں گا؟ ٹھیک ہے' مجھے گندی قوتیں حاصل ہو بھی گئیں تو کیا وہ میرے لئے کارآمد ہو سکیں گی؟ کیا مجھ سے میرا دین' میرا ایمان نہیں چھن جائے گا؟...... نجانے کیوں دل و دماغ میں شدید کشمکش ہونے لگی اور مجھے ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ گویا مجھ جیسے بدطینت انسان کے سینے میں ایمان کا جذبہ موجود ہے اور یہ خوشی بڑھتی چلی گئی۔ مجھے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے اس تصور نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی ہو۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسی نیک باتوں پر غور نہیں کیا تھا' لیکن آج نجانے کہاں سے بہت سے اقوال یاد آ رہے تھے۔ نیکیوں کے راستے مصیبتوں اور پریشانیوں سے گزرتے ہیں' لیکن ان کا اختتام خوشگوار ہوتا ہے جبکہ بدی کے راستے بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور تباہی کے غاروں پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ اگر مجھے اپنی بدنما زندگی میں کوئی نیک کام کرنے کا موقع ملا ہے تو میں اسے ہاتھ سے کیوں گنواؤں۔ اپنے آپ کو امتحان میں کیوں نہ ڈال دوں؟ شاید یہی میری برائیوں کا کفارہ ہو جائے...... ہرگز نہیں۔ مردود شیطان بھوریا چرن تیرا کام تو میں کبھی نہیں کروں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کیسی ہی مشکلات سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔

دوسرا دن حسب معمول تھا۔ صبح کا ناشتہ میں نے رغبت سے کر لیا تھا۔ کسی اور نے مجھ سے کوئی ملاقات نہیں کی تھی' لیکن دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب میری ملاقات آئی اور مجھے کچھ لوگوں کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ فریحہ' ریحانہ بیگم اور سرفراز تھے...... ان سب کی آنکھوں میں میرے لئے رحم اور ہمدردی کے آثار تھے۔ ریحانہ بیگم کی آنکھیں تو آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں۔ فریحہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور فراز صاحب بھی متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ گئے اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔

"تمہارا نام مسعود ہے نا......؟"

"جی سرفراز صاحب!"

"مسعود صاحب! بات بڑی عجیب سی ہے۔ کسی سے کہا جائے تو لوگ ہنسنے اور مسکرانے کے علاوہ کچھ نہیں کریں گے لیکن میرے دل میں آپ کا احترام فرشتوں جیسا ہے۔ بلاشبہ زمین پر نیک لوگ ہی امتحانات سے گزرتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں

آپ پر یہ برا وقت آ پڑا ہے' لیکن آپ نے اس برے وقت میں بھی مجھ پر جو احسان کیا ہے' میں اسے مرتے وقت تک نہیں بھول سکوں گا۔ آپ نے ہم دونوں میاں' بیوی کا مستقبل بچایا ہے اور اس سلسلے میں آپ نے جو اقدامات کیے ہیں' بلاشبہ کسی انسان کے لیے وہ ممکن نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ نے میری بیوی کی عزت محفوظ رکھی اس کے لیے تو میں آپ کو صرف دعائیں ہی دے سکتا ہوں کہ خداوند عالم آپ کے خاندان کے ایک ایک فرد کی عزت کا تحفظ کرے۔ دوسری بات یہ ہے مسعود صاحب کہ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہم لوگ آپ کے لیے مصروف عمل ہو گئے ہیں اور ہم نے آپ کے لیے جو فیصلے کیے ہیں ان سے آپ کو آگاہ کر دینا ضروری ہے تا کہ آپ مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے بلکہ انتہائی حد تک آپ کے لیے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم روپیہ پانی کی طرح بہا دیں گے اور ہر قیمت پر آپ کو آزاد کرا کر دم لیں گے۔"

فریحہ نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو اپنے دل میں اپنا بھائی تسلیم کیا ہے۔ مسعود صاحب! آپ میری عزت کے محافظ ہیں۔ میں اتنی ناشکری نہیں ہوں کہ آپ کو بھول جاؤں۔ ہم سب آپ کیلئے کوششیں کریں گے۔" ریحانہ بیگم کہنے لگیں۔

"مسعود بیٹے اپنے اہل خاندان کا پتہ بتاؤ۔ ہم ان سے مل کر ان کی مشکلات کا حل بھی تلاش کریں گے۔"

میں نے ریحانہ بیگم سے کہا۔ "نہیں آنٹی! آپ یہ سب نہ کریں۔ میرے بارے میں مناسب سمجھیں تو آپ شاہ صاحب سے ساری تفصیلات معلوم کریں۔ آپ کو علم ہو جائے گا کہ میرے خاندان کا مجھ سے دور رہنا کس قدر ضروری ہے۔ وہ لوگ بہر طور مجھے صبر کر لیں گے' لیکن میری وجہ سے اگر وہ مشکلات کا شکار ہوئے تو میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔"

"ہم جان کی بازی لگا دیں گے تم فکر مت کرو۔ ٹھیک ہے' کوئی بات نہیں۔ شاہ صاحب سے بات کر لیں گے ہم اور ہاں' یہ بتاؤ تمہارے لئے اور کیا' کیا جا سکتا ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"میری دعا ہے کہ آپ سب لوگ خوش رہیں۔ میں جس عذاب کا شکار ہوا ہوں اس سے مجھے نکالنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ بس ہو سکے تو میرے لئے دعا کر دیں۔"

"خیر یہ تمہارا اپنا خیال ہے۔ ہم کچھ کرنے کے بعد ہی تمہارے پاس واپس آئیں گے۔ آرام سے رہو اور اگر ہو سکے تو اللہ کے بعد ہم پر اعتبار کر لو۔ ہم تمہارے لئے یقینی طور پر وہ سب کریں گے جو ہمارے بس میں ہو گا۔"

وہ لوگ چلے گئے اور میں ان اچھے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ بھلا میں نے کیا' کیا تھا۔ میں تو اپنے ہی عذاب میں گرفتار تھا اور کیا ضروری تھا کہ وہاں اگر میں سرفراز کی حیثیت قبول بھی کر لیتا تو ان ساری مصیبتوں سے محفوظ رہ پاتا۔ ناممکن ہی تھا۔ ایک طرح سے ناممکن ہی تھا' کیونکہ بھوریا چرن مجھے ضرور تلاش کر لیتا۔

پتا نہیں وہ کم بخت تھا کیا چیز......! کالے جادو کا ماہر یا کوئی گندی اور خبیث روح اس کی قوتیں تو بے پناہ تھیں۔ جو شکلیں وہ اختیار کر لیتا تھا' وہ عام قوتوں والے لوگ تو نہیں اختیار کر سکتے تھے۔ پھر وہ کون سی ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا جو اسے امر کر دے۔ پیر پھاگن کے مزار پر پہنچنے کی آرزو اسے کیوں تھی؟ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دو مختلف چیزیں تھیں۔ ایک طرف ایک نیک اور مقدس انسان کا مزار اور دوسری طرف یہ غلیظ سادھو' جو کالا علم جانتا تھا۔ اپنے بارے میں تو میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے' مجھے کم از کم یہ گندا کام نہیں کرنا ہے۔ زندگی ایک بار ختم ہوتی ہے اور اس کے لیے کوئی بھی وقت متعین ہو سکتا ہے۔ پھر ایسی موت کیوں مرا جائے جس سے مرنے کے بعد روح بھی بے سکون رہے۔ زندگی بے سکونی میں گزر جائے تو کوئی بات نہیں' روح کا سکون تو ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اس فیصلے سے میں کافی حد تک مطمئن تھا۔ چند روز مزید یہاں رہنا پڑا اور پھر ایک دن جیل کی گاڑی آئی اور مجھے اس میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا۔ گویا جیل دوسرے شہر کی تھی' لیکن جیلوں سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں بھی غالباً میرے بارے میں رپورٹ دے دی گئی تھی کہ میں نے جیل میں بھی ایک قیدی کو قتل کر دیا تھا چنانچہ جیلر صاحب نے جو بہت سخت انسان معلوم ہوتے تھے' پہلے تو مجھے نصیحتیں کیں اور کہا کہ وہ ذرا مختلف

قسم کے آدمی ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں بآسانی توڑ دیں گے اور مجھے اس قابل نہیں چھوڑیں گے کہ میں کسی کو نقصان پہنچا سکوں' لیکن بہتر طریقہ یہی ہے کہ میں انسانوں کی مانند یہاں رہ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کروں۔ میں نے گردن جھکا کر جیلر صاحب سے کہا تھا کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

ان دنوں میرے دل میں ایک شدید آرزو بیدار ہورہی تھی۔ وہ یہ کہ کالے جادو کا توڑ بھی ہوتا ہے۔ قرآنی آیات' اللہ کا کلام ہر قسم کے جادو کو ختم کرنے کی قوتیں رکھتا ہے۔ اگر مجھے کوئی ایسا علم آ جائے کہ میں بھوریا چرن کو خود سے دور رکھ سکوں تو یہ میرے لئے بہت بہتر ہوگا۔ خود تو زندگی میں کچھ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ والدین نے بہت کچھ پڑھانے کی بہت کوشش کی تھی اور دین سے واقف کرانے کے لئے بھی کارروائیاں کی تھیں۔ مگر مجھ پر بچپن ہی سے شیطان سوار تھا اور میں نے ان کے کہے کو کبھی نہیں مانا تھا۔ آج اس بات کا شدید افسوس تھا۔ اپنے طور پر ہی کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی۔ چاہے باہر سے کسی کی مدد نہ ملتی' لیکن اس سے محروم تھا۔ یہ محرومی بعض اوقات بڑا دل دکھاتی تھی۔

جیل آنے کے تیسرے دن شاہ صاحب میرے پاس پہنچے۔ پولیس کی وردی میں تھے۔ ویسے یہ اپنے طور پر بھی بہت اچھے انسان تھے اور غالباً میرے کردار سے بھی بہت متاثر ہو گئے تھے۔ مجھ سے سلام دعا کی اور کہنے لگے۔

''جج صاحب بھی تم سے ملنا چاہتے تھے۔ کسی وقت آئیں گے تمہارے پاس' تمہارے بارے میں بہت سی باتیں ہوئی تھیں ان سے۔ ویسے تم نے جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی میں نے اسے پورا کیا ہے۔ لیکن تمہارے لئے کچھ افسوس ناک اطلاعات ہیں۔''

میرا دل مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ صاحب کو دیکھا اور بمشکل تمام کہا۔

''کیا اطلاعات ہیں شاہ صاحب...... ! جلدی بتایئے' خدارا جلدی بتایئے۔''

''وہاں تمہارے اہل خاندان محفوظ نہ رہے اور وہ بھی مصیبتوں کا شکار ہو گئے۔''

میں نے دونوں ہاتھ دل پر رکھ لئے اور دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ ...... کیا بات ہوگئی؟''

''تمہارے سلسلے میں اہل محلہ تمہارے گھرانے سے کافی بددل ہو گئے تھے اور آوازے کسا کرتے تھے اور برا بھلا کہا کرتے تھے۔ کیونکہ جو واقعات وہاں پیش آئے ہیں اور جن واقعات کے بارے میں مجھے معلومات حاصل ہوئی ہیں' وہ میرے لئے بھی عجیب ہیں۔ بہرطور میں تمہیں بتا رہا تھا کہ اہل محلہ سے تمہارے ماموں اور بھائی کا جھگڑا ہوا۔ تمہارے بھائی نے ایک نوجوان کو چاقو مار دیا اور وہ نوجوان ہلاک ہو گیا۔ تمہارا بھائی فرار ہو گیا اور تمہارے خاندان کو اہل محلہ نے وہاں سے نکال دیا اور تمہارے گھر کو آگ لگا دی۔''

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''تو محمود بھی قاتل بن گیا۔ وہ معصوم سا بچہ جس نے زندگی میں ہنسنے کھیلنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا وہ قاتل کی حیثیت سے فرار ہو گیا؟''

''ہاں ...... وہ مفرور ہے اور پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔''

''اور میرے والدین؟ میری ماں' باپ' بہن' ماموں؟''

''وہ لاپتہ ہیں۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پولیس نے بعد میں ان سے رابطے کی کوشش کی' لیکن وہ پولیس کو دستیاب نہیں ہو سکے۔ اخبار میں بھی ان کے بارے میں اشتہار شائع کیا گیا کہ وہ پولیس سے رابطہ قائم کریں' لیکن پولیس سے ان کا کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔''

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے تو یہی سوچ کر ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کی تھی کہ کہیں میری نحوست ان لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ براہ راست میری نحوست کا شکار ہو گئے تھے۔ آہ...... میں کتنا بدنصیب ہوں۔ اب نجانے کیا حال ہوگا ان کا۔ ایک بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن محمود...... آہ' میرا محمود...... میں درحقیقت اپنے بہن بھائی کو اپنی زندگی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کتنا بڑا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا تھا میرے گھر والوں پر میری وجہ سے

......شاہ صاحب میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''دیکھو میاں! بدقسمتی جب آتی ہے تو پوچھتی نہیں کہ آگے کیا ہوگا لیکن بالآخر ایسی قوتیں بھی ہیں جو انسان کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہیں تو سارے مشکل مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ میں تمہارا کیس خود دیکھ رہا ہوں اور بڑا عجیب محسوس ہو رہا ہے مجھے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے مسعود! بددل نہ ہونا۔ وقت کا انتظار کرنا۔ دیکھو تقدیر نے تمہیں پھانسی سے بچا لیا ہے جبکہ دنیا تمہاری موت کا یقین کر چکی تھی۔

✦✣✦✣✦

لیکن تم نے جو کچھ کہا ہے دوسرے لوگ اس پر یقین کریں یا نہ مجھے کچھ کچھ اس پر یقین آتا جا رہا ہے۔ خاص طور سے ان تحقیقات کے بعد...... میں نہیں کہتا کہ قانون میں تمہارے لئے لچک پیدا ہو سکتی ہے۔ تمہارا مقدمہ ازسرنو تیار ہو رہا ہے اور سرکاری وکیل اس سلسلے میں فیصلے کر رہے ہیں کہ اب تمہارے لئے کیا' کیا جائے۔ لیکن میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ تمہیں جس حد تک رعایتیں مل سکتی ہیں' ملیں۔ اس کے علاوہ میرا تم سے طور پر وعدہ بھی ہے کہ میں تمہارے والدین کو ذاتی طور پر تلاش کروں گا۔ اگر انہیں قانون کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوا تو کم از کم میں اس کا ذریعہ نہیں بنوں گا۔''

''شاہ صاحب! میں ابھی تو نہیں' اگر وقت ملا تو پھر کسی وقت آپ کو اپنی رودادِ غم سناؤں گا۔ آج تک میں نے اپنی یہ کہانی کبھی کسی کو اس لئے نہیں سنائی کہ لوگ مذاق اُڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کریں گے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کا حقیقتوں سے دور کا واسطہ بھی نظر نہیں آئے گا...... لیکن میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے شاہ صاحب! میں آپ سے بھی مدد مانگوں گا کہ میری اس سلسلے میں روحانی رہنمائی کی جائے۔''

''میرے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ لیکن تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے معاملے میں براہِ راست ملوث ہو چکا ہوں اور تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔''

''شکریئے کے الفاظ کے علاوہ مجھ جیسے نادار شخص کے پاس اور کیا ہو سکتا ہے شاہ صاحب!''

''میرا نام امتیاز عالم شاہ ہے۔ اگر کبھی کسی مسئلے میں میری ضرورت پیش آئے تو کسی سے کہہ دینا۔ ویسے میں جیلر صاحب سے بھی تمہارے سلسلے میں کچھ سفارشیں کروں گا۔ کم از کم تمہیں کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی' جس سے تم بددلی کا شکار ہو جاؤ۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

شاہ صاحب چلے گئے' لیکن میرے لئے آنسوؤں اور آہوں کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑ گئے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟ کیا کیا ہوتا رہے گا۔ کوئی امید ہے بہتری کی؟ کچھ ہو سکتا ہے میرے لئے ......؟ کوئی کچھ کر سکتا ہے؟ اس شیطان کے ساتھ کوئی تعاون کیا جا سکتا ہے؟ اس کی ناپاک خواہش کی تکمیل کیا مجھ سے ممکن ہے۔

مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ کمرۂ عدالت کے باہر میں نے ریحانہ بیگم اور سرفراز کو دیکھا۔ ان کے ساتھ بیرسٹر اشفاق فاضلی بھی تھے' جنہوں نے مجھ سے وکالت نامے پر دستخط کرائے اور بولے۔

''مجھ سے کچھ دیر پہلے رابطہ قائم کیا گیا۔ تم سے تمہارے کیس کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ آج مقدمے کی ساعت نہیں ہوگی۔ میں تاریخ لے لوں گا۔''

میں نے شکر گزار نگاہوں سے ریحانہ بیگم کو دیکھا اور آنسو بھرے لہجے میں بولا۔

''بیگم صاحبہ! آپ میرے لئے یہ زحمت کیوں کر رہی ہیں؟''

''ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مسعود......؟''

''ضروری ہے بیگم صاحبہ! خدا کے لئے یہ سب کچھ نہ کریں۔ مجھے میری تقدیر پر چھوڑ دیں۔ میرے سلسلے میں یہ سب کچھ آپ کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ خدا نہ کرے آپ کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔''

''تمہاری شرافت نے ہمیں خرید لیا ہے مسعود! ہم تمہارے مقروض ہیں۔ ہمیں ادائیگی کرنے دو۔''

''بیگم صاحبہ! ایک اور مشکل ہے۔ وہ میری زندگی سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ اگر آپ انسانیت کے رشتے سے کچھ کرنا چاہتی ہیں تو اس سلسلے میں کچھ کر دیجئے۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''میرے والدین میری وجہ سے دربدر ہو گئے ہیں۔ ڈی ایس پی امتیاز عالم شاہ صاحب کو اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اگر ان کا پتہ چل جائے تو انہیں سہارا دیں۔ میرے اوپر بہت بڑا احسان ہوگا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آواز رندھ گئی۔

ریحانہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''تم مجھے ان کے بارے میں تفصیل بتا دو مسعود اطمینان رکھو میں ان کا پورا پورا خیال رکھوں گی۔''

''امتیاز عالم صاحب سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ انہی سے معلوم کر لیجئے گا۔ ویسے بھی اس وقت سب کچھ بتانا ممکن نہیں ہے۔'' مسعود نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ ہم خود یہ سب کام کر لیں گے۔ تم مطمئن رہو اور اپنی طرف سے بھی پریشان نہ ہونا۔ ہم انتہائی حد تک کوشش کریں گے۔ ہمت سے کام لینا۔ باقی جو خدا کا حکم ہو گا وہی ہوگا۔''

مجھے واپس جیل لے آیا گیا۔ دوسرے دن نئے بیرسٹر صاحب سرفراز کے ساتھ جیل پہنچے۔ مجھ سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور میں نے انہیں تمام تفصیلات بتا دیں۔ سرفراز بھی حیران تھا۔ غالباً اسے پہلی بار اس ساری کہانی کا علم ہوا تھا۔ وہ ناقابل یقین سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، لیکن اس نے میری باتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا، بس خاموش رہا تھا۔ اشتیاق احمد صاحب نے تفصیلات مکمل کیں۔ ویسے بھی وہ میرا فائل حاصل کر چکے تھے جو ان کے پاس موجود تھا۔ بڑے قانون دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اطمینان دلایا اور کہا کہ وہ کوئی ترکیب نکالیں گے، جس سے میری یہ مصیبت ٹل سکے۔

وہ لوگ چلے گئے۔ میرے لئے روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی۔ یہ بے چارے اپنے طور پر کوششیں تو کر سکتے تھے، لیکن جس شیطان سے میرا واسطہ تھا اس کی چالیں انسانی چالیں نہیں تھیں اور اس کے سفلی علوم کے مقابلے میں ان نیک لوگوں کی کوششیں بے اثر ہی تھیں۔ ہاں، ان لوگوں کے ذریعے اگر میرے اہل خاندان کو کچھ سہارا مل جائے تو میرے لئے یہی کافی تھا۔

اپنی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا تھا، لیکن کبھی کبھی دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ بھوریا چرن کمبخت کہہ کر گیا تھا کہ جب بھی میں اسے آواز دوں گا وہ میرے پاس آ جائے گا اور آواز دینے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کے مکروہ فعل کے لئے آمادہ ہو چکا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے اندر کا یہ جذبہ خود میری سمجھ سے باہر تھا۔ جن مشکل ترین حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا ان سے گھبرا کر تو دنیا کا مکروہ سے مکروہ ترین کام بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں بھوریا چرن کی بات ماننے کے لئے اندر سے آمادگی ہی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ یہ بات خود میری سمجھ سے باہر تھی۔ آخر ان برے حالات میں جبکہ میں اپنے لئے نہ سہی، ماں باپ کے لئے بری طرح پریشان تھا۔ میں بھوریا چرن کی بات ماننے کے لئے کیوں نہیں تیار ہو رہا تھا، جبکہ میرے لئے اور کوئی سہارا بھی نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا اور میں اپنی عجیب و غریب کیفیات کا شکار رہا۔ پھر غالباً کچھ ہوا تھا شہر میں۔ بے شمار لوگ قیدیوں کی حیثیت سے جیل لائے جا رہے تھے۔ غالباً کوئی سیاسی ہنگامہ تھا جس کی وجہ سے بڑی افراتفری نظر آ رہی تھی اور جیلیں بھرتی جا رہی تھیں۔

پھر ایک شام ہم لوگوں کو تیار کیا جانے لگا۔ قیدیوں کو ہتھکڑیوں کے علاوہ بیڑیاں بھی پہنا دی گئیں اور انہیں ایک جگہ جمع

کیا جانے لگا۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ بعد میں مجھے دوسروں سے پتہ چلا کہ ہمیں کسی دوسری جیل میں منتقل کیا جا رہا ہے اور یہ فیصلہ ان سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے کیا گیا ہے جن سے جیلوں میں نفری بڑھتی جا رہی ہے۔ کئی گاڑیاں ہمیں لے کر چل پڑی تھیں۔ کہاں جا رہے تھے؟ کہاں تک سفر کرنا ہے؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ دوسرے قیدیوں کی طرح میں بھی خاموشی سے سر جھکائے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیلوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف جگہ بدل جاتی ہے۔ قید تو قید ہی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں کیا تردّد ہوسکتا تھا۔ البتہ سفر کافی طویل تھا اور بری طرح بھری ہوئی گاڑی میں اتنے لمبے سفر سے جوڑ جوڑ دکھ گیا تھا۔ بالآخر منزل آ گئی اور قیدی نیچے اُترنے لگے۔

نئی جیل کسی گرم علاقے میں تھی اور صحیح معنوں میں جیل تھی۔ کوٹھریاں انتہائی بوسیدہ دیواریں ٹوٹے پھوٹے پلستر سے آراستہ۔ فرش میں جگہ جگہ سوراخ جن میں حشرات الارض کا بسیرا تھا۔ اسی لحاظ سے یہاں کا عملہ تھا۔ سخت بدمزاج لوگ تھے۔ یقینی طور پر ایسے موسم کے ستائے ہوئے۔ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ باہر کا علاقہ سبزے سے خالی تھا۔ سیاہ ڈنٹھلوں والی بدنما جھاڑیاں البتہ وہاں نظر آتی تھیں۔ مچھروں اور دوسرے حشرات الارض نے زندگی حرام کر دی۔ نہ رات کو سکون کی نیند نصیب ہوتی تھی' نہ دن کو چین تھا۔ صبر آزما وقت گزرتا گیا۔ اس دوران کسی سے رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔

ہفتہ' مہینہ اور پھر تقریباً تین ماہ گزر گئے۔ زندگی سب کچھ جھیل لیتی ہے۔ جہاں ایک دن زندہ رہنے کا تصور نہ کیا جا سکے' وہاں تین ماہ گزر چکے تھے۔ میں زندہ تھا اور مجھ سے پہلے کے لوگ سالہا سال سے جی رہے تھے۔ ہاں طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا تھا۔ ہر چیز کو نفرت سے دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ جھلستے دن' جھلستی راتوں میں زندگی آگے بڑھتی رہی۔ میں وسیع و عریض جیل کے چپے چپے سے واقف ہوگیا تھا۔ اب نہ گھر والے یاد آتے تھے' نہ باہر کی رنگین دنیا سے کوئی دلچسپی تھی۔ بھوریا چرن بھی غائب تھا۔ کسی شکل میں وہ نہیں نظر آیا تھا۔ اس کے تصور کے ساتھ ہی منہ سے گالیاں اُبل پڑتی تھیں۔ بڑی تبدیلی محسوس ہوتی تھی خود میں۔ پھر ایک دن جیل کے مغربی کونے میں کیاریاں سنبھال رہا تھا کہ بیرونی دروازے سے ایک بڑا ٹرک اندر داخل ہوا۔ اس ٹرک میں قیدی لائے اور لے جائے جاتے تھے۔ ہمیں ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ ٹرک سے قیدی اتارے جانے لگے۔ منظر چونکہ بالکل سامنے تھا اس لئے بے دھیانی کے انداز میں قیدیوں کو اُترتے دیکھتا رہا۔ لیکن ایک قیدی کو دیکھ کر اچانک میرا پورا بدن لرز گیا۔ ہاتھ پاؤں بے چین ہو گئے۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر اسے دیکھا۔ آہ...... بینائی دھوکا نہیں دے رہی تھی یہ میرا چھوٹا بھائی ہی تھا۔ میرا چھوٹا بھائی محمود...... میرا محمود...... منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی' مگر سارا وجود مجسم آواز بن گیا تھا۔ قیدیوں کو آگے لے جایا گیا اور میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ بیرک آٹھ کی طرف جا رہے تھے۔ یہی میری بیرک تھی۔ سپاہی قریب آ کر رک گیا اور اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آرام ہو رہا ہے؟''

''نہیں...... نہیں صاحب!'' میں فوراً ہوش میں آ گیا۔ کام کرنے لگا۔ مگر اندر سے جو کیفیت ہو رہی تھی میرا دل جانتا تھا۔ محمود گرفتار ہوگیا۔ شاہ صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ محمود کے ہاتھوں بھی قتل ہوگیا ہے۔ وہ بھی قاتل ہے اور نہ جانے اسے کیا سزا ملی ہے؟ دل سینہ توڑ کر نکلا آ رہا تھا۔ نجانے دن کیسے گزرا' کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ رات کو بیرک میں آ گیا۔ کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ میرے ساتھی رئیس خان نے پوچھا۔

''کیا بات ہے مسعود؟...... طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔''

''کھانا کیوں نہیں کھایا؟''

''دل نہیں چاہا رئیس صاحب!''

''دل......؟ یہاں بھی دل ساتھ لائے ہو بھئی!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرایا۔

''نئے قیدی آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔''
''کونسی کوٹھڑیوں میں رکھے گئے ہیں؟''
''تقسیم ہو گئے ہیں۔''
''کچھ ادھر بھی تو لائے گئے ہیں۔''

''ہاں دو تین کوٹھڑیاں بھری نظر آ رہی ہیں'' رئیس خان نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور میری نظریں ادھر کا طواف کرنے لگیں۔ انہی میں سے کسی میں محمود تھا۔ محمود جسے ساری کہانی معلوم ہو گی۔ امی کے بارے میں' ابو کے بارے میں' میری بہن کے بارے میں۔ دل تڑپ رہا تھا۔ بیرک میں خاموشی طاری ہو گئی۔ بس کبھی کبھی سنتری کے بوٹوں کی آواز سنائی دیتی اور اس کے پاؤں نظر آ جاتے۔ اس کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دل میں خیال آیا۔ 'کیا محمود سزائے موت کا مجرم ہے......؟ قتل کے نتیجے میں اس کی توقع تو کی جا سکتی تھی۔ اسے کیا سزا دی گئی ہے؟ کیا میں ہمیشہ کے لئے اپنے بھائی سے محروم ہو جاؤں گا......؟ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ دنیا کیوں نہیں سمجھتی کہ یہ مجرموں کا گھرانہ نہیں ہے۔ ہم مصیبت زدہ لوگ ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہئے۔ ہم پر رحم کیا جائے۔ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ کیوں نہیں سمجھتی دنیا۔ کیا یہ کبھی نہ سمجھ پائیں گے کہ یہ سب کچھ ایک شیطان کا کیا دھرا ہے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ شیطان مجھے ایک گندے کام پر اُکسانا چاہتا ہے۔ وہ ایک مقدس مزار کی بے حرمتی کرانا چاہتا ہے میرے ہاتھوں۔ اپنے کالے جادو کو مکمل کرنے کے لئے وہ میرا سہارا طلب کر رہا ہے اور میں اپنے عقیدے کے مطابق اس گندی کوشش میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ میرے ساتھ رحم کیوں نہیں کیا جاتا؟ یہ سب اس شیطان کے آلہ کار کیوں بن گئے ہیں؟ یہ میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ اور اگر میں شیطنت پر اُتر آؤں تو پھر یہ روتے' پیٹتے پھریں گے۔ کیوں نہیں سوچا جاتا میرے بارے میں؟ کیوں نہیں کرتے یہ کچھ میرے لئے؟ سب اس شیطان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آج اگر میں برائی کے راستے اپنا لوں' اپنے دین کے راستے چھوڑ کر اس شیطان بھوریا چرن کا ساتھی بن جاؤں تو پھر یہ سب میرے تلوے چاٹیں گے۔ شیطنت کا راج کیوں قائم ہونے دیا جا رہا ہے؟ کیوں اُکسایا جا رہا ہے مجھے؟ اگر محمود کو پھانسی ہو گئی' اگر وہ سزا پا گیا تو میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاؤں گا۔ سن لو میری بات۔ اگر تم نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا تو میں تم سے تمہاری زندگی چھین لوں گا۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ میں بھی غلط راستوں پر نکل سکتا ہوں۔ روکو مجھے غلط راستوں پر جانے سے......' لیکن یہ دل کی خاموش چیخیں تھیں' جنہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس روئے زمین پر کوئی نہیں سنے گا میری بات۔ مجھے اپنی بات سنانی پڑے گی۔ ان لوگوں کو عمل کر کے پھر دکھانا پڑے گا۔ جذبات کے یہ بول ان کے کانوں تک نہیں پہنچیں گے۔ کبھی نہیں پہنچیں گے۔ عمل چاہئے عمل۔ آہ...... ورنہ میں محمود کو ہمیشہ روتا رہ جاؤں گا۔ اتنی بے بسی اچھی نہیں ہے۔ مجھے محمود کے لئے کچھ کرنا ہو گا...... کچھ کرنا ہو گا......

دل میں لہریں اُٹھنے لگیں۔ ہاتھ پاؤں میں اکڑن سی پیدا ہو گئی۔ رئیس خان گہری نیند سو رہا تھا۔ کمبخت کو پتہ نہیں یہ نعمت کہاں سے مل گئی تھی۔ وہ سو جاتا تھا تو اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی کاٹ دیا جاتا تو شاید اسے صبح ہی کو اس کا پتہ چلتا۔ اتنی گہری نیند سوتا تھا وہ...... میری آنکھوں میں نمی خشک ہو گئی تھی۔ ایک جلن سی پیدا ہو گئی تھی۔ ان آنکھوں میں۔ دماغ میں بھی کچھ سیاہ دھبے اُبھر آئے تھے' جو محسوس ہو رہے تھے۔ میں پوری سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اپنے لئے میں کچھ نہ کر سکا لیکن بھائی کے لئے ضرور مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ دماغ اس وقت عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ چنانچہ سازشیں جنم پانے لگیں اور جب صبح کی روشنی نمودار ہو گئی تو میرے ذہن میں پورا پروگرام بن چکا تھا۔ اس وقت میرے وجود میں ایک نیا انسان جاگ اٹھا تھا اور میں کم از کم اسے بھوریا چرن نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں راستے متعین کرتا رہا' فیصلے کرتا رہا اور میں نے اپنے وجود کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ آج میں ایک زیادہ ذہین اور خود مختار انسان تھا۔ کسی قسم کی بے کسی اور بے بسی کا کوئی احساس میرے ذہن میں نہیں تھا۔ رات کو معمول کے مطابق بیرک میں آ گیا۔ کھانا وغیرہ بھی کھا لیا تھا۔ رئیس خان نے تبصرہ بھی کیا تھا مجھ پر کہ کل کی نسبت آج میری کیفیت بالکل درست ہے اور میں نے قہقہہ لگا کر اس سے کہا تھا کہ بیماری روزانہ تو نہیں ہوتی۔

دن کی روشنی میں، میں نے محمود کو دیکھا اور اس بیرک کو بھی جس میں اسے رکھا گیا تھا۔ ہر احساس، ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ بیرکوں میں سناٹے پھیلتے چلے گئے۔ سنتری ڈیوٹی پر آ گیا اور جیل کی دنیا خاموش ہو گئی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس سناٹے میں ہزاروں آوازیں پوشیدہ ہیں۔ نجانے کتنے لوگ جاگ رہے ہیں۔ نجانے کتنے لوگ رو رہے ہوں گے، لیکن یہ رونا بے آواز ہوتا تھا۔ ان کے صرف دل روتے تھے۔

جیل کا اندرونی حصہ تاریک تھا، لیکن باہر روشنی تھی۔ رات کو ڈیوٹی والا سنتری بدستور بیرک میں گشت کرتا رہا تھا اور میں اب اپنے کام کے لئے تیار تھا۔ سنتری کے قدموں کی آواز مجھے اپنی کوٹھڑی کی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی تو میں ڈرامہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنے دانتوں سے اپنی کلائی کاٹ لی اور اس سے خون بہنے لگا۔ تب ہی میں اپنی جگہ سے کھسکتا ہوا سلاخوں والے دروازے کے نزدیک لیٹ گیا اور میرے حلق سے اذیت ناک کراہیں نکلنے لگیں۔ البتہ میں نے اتنا شور نہیں کیا کہ دوسرے قیدی بھی سن لیں۔ تدبیر کارگر ہوئی۔ سنتری میرے پاس آ کر رک گیا۔

''کیا ہوا......؟ کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی جانور نے کاٹ لیا ہے...... سانپ لگتا تھا...... اسی سوراخ میں جا گھسا ہے۔'' میں نے ایک سوراخ کی طرف اشارہ کیا اور کلائی اس کے سامنے کر دی۔ کلائی سے بہتے ہوئے خون اور میری گھٹی گھٹی آواز نے اس کے دل میں ہمدردی جگا دی اور اس نے جلدی سے چابی نکال کر تالا کھول دیا۔ غلطی کی تھی اس نے۔ یہاں انسانیت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قیمت اسے بھی ادا کرنی پڑی۔ جونہی اس نے میرے زخم کو چہرے کے قریب کیا، میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ گھبرا گیا۔ مگر بیکار تھا۔ میں نے پوری قوت صرف کر دی اور اسے منہ سے آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ پتہ نہیں بے چارہ مر گیا تھا یا صرف بے ہوش تھا۔ میں نے اسے بے سدھ پا کر آہستہ سے اپنی جگہ لٹا دیا اور پھر اس کے پاس موجود چابیوں کا گچھا اپنے قبضے میں کر لیا۔ باہر نکل کر میں نے تالا بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔

دوسرا سنتری اپنا چکر پورا کر کے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں نے بیرک کے موڑ پر اس کا استقبال کیا۔ جونہی وہ موڑ گھوما، میرا طاقتور گھونسا اس کی ناک پر پڑا اور ناک کی چوٹ بہت سے مسئلے حل کر دیتی ہے۔ میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اسے گرنے نہ دیا۔ وہی گر میں نے اس پر بھی آزمایا جس سے پہلے سنتری کو سنبھالا تھا۔ جب مجھے اس کے بے حس و حرکت ہو جانے کا یقین ہو گیا تو میں نے اسے ایک تاریک جگہ لٹا دیا۔ تقدیر شاید اس وقت میری طرف سے بے نیاز تھی، کیونکہ میں اپنی پہلی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے محمود کی کوٹھڑی تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔ میں چابیوں کے گچھے کی تمام چابیاں آزمانے لگا اور ایک چابی نے اس کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اندر چار قیدی تھے، جن میں ایک محمود تھا۔ وہ زمین پر آرام سے سو رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ دل میں پیار کے بہت سے پھول کھل اٹھے، لیکن یہ عمل کا وقت تھا۔ ابھی بہت مشکل مراحل تھے۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اس کے کان کے قریب ہونٹ لے جا کر سرگوشی کی۔

''محمود......! جاگو......محمود!......محمود!......''

اس کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ میں نے پھرتی سے اس کا منہ بھینچ لیا تھا۔ اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کافی مضبوط گرفت تھی۔ ایک مکمل مرد کی گرفت جو میرے ہاتھ کو منہ سے ہٹا سکتی تھی۔ میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ میرے الفاظ اس کی سماعت نے محسوس کر لئے۔ اس نے انہیں سمجھ لیا جس کا اندازہ اس کی گرفت کے ڈھیلے پڑ جانے سے ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

''ہوشیار ہو جاؤ محمود! یہ نہ سوچو میں یہاں کیسے آ گیا۔ یہ سب بعد میں معلوم ہو جائے گا تمہیں۔ خود کو سنبھالو، پوری طرح ہوشیار ہو جاؤ۔ ہمیں جیل سے فرار ہونا ہے۔ کیا تم جاگ گئے ہو؟''

اس نے گردن ہلا دی، اور میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے ہاتھ کا سہارا

دے کر کھڑا کیا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے قریب سوئے ہوئے قیدیوں پر ڈالی اور دوسری کھلے دروازے پر۔ پھر وہ گردن جھٹکنے لگا۔

''آؤ......'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور وہ بے آواز چلتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ اب وہ پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ باہر اس نے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے سنتری کو دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی رائفل اٹھالی۔ ساتھ ہی کارتوسوں کی پیٹی بھی۔ یہ میں نے نہ کیا تھا' نہ سوچا تھا۔ مگر اس سلسلے میں وہ مجھ سے آگے نظر آ رہا تھا۔ پھر ہم دونوں بے آواز قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے بیرک کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے' جس کے دوسری طرف موت بھی تھی اور زندگی بھی۔

جیل سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں تھا' جتنا ہم نے سمجھا تھا۔ لیکن میرے لئے نہ زندگی اتنی دلکش تھی نہ موت۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ کون نہیں جینا چاہتا۔ بس جو بیت رہی تھی اس نے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا۔ ہاں' اپنے بھائی کی زندگی کے لئے میں ہزار بار مرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ابھی اس دنیا میں کیا دیکھا تھا' جو کچھ ہوا تھا میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں زندگی سے محروم ہو جاؤں گا میرا محمود نہیں۔

''لاؤ' یہ رائفل مجھے دے دو'' میں نے سرگوشی کی۔

''نہیں بھائی جان! اسے میرے پاس رہنے دیں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ اس کے انداز میں بڑی پختگی تھی' جس پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ بیرک کے باہر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم بیرک کی دیوار سے لگ کر آگے بڑھنے لگے۔ سرچ ٹاور پر سنتری مستعد تھے۔ سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ کئی بار ہم اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ ایک جگہ دیوار تعمیر ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بات یاد آ گئی اور میں نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ میں نے تقدیر ہی کا سہارا لیا تھا۔ اگر محمود کو نہ دیکھتا تو شاید فرار کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ لیکن اب صرف میری ایک ہی آرزو تھی کہ محمود کو لے کر جیل سے نکل جاؤں۔ صحیح معنوں میں تو میں نے اب جرم کیا تھا۔ یعنی دو سنتریوں کو زخمی کر کے اور یہ جرم اپنے بھائی کی محبت میں کیا تھا۔ ورنہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب بھی ایک سنتری کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی' مگر وہ سو گیا تھا۔ ہم نے اسے دیکھ لیا تھا' مگر اس سے پہلے کہ میں کوئی فیصلہ کروں' محمود نے عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے سوتے ہوئے سنتری کو دبوچ لیا تھا۔ کچھ دھینگا مشتی ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ محمود نے دوسرے سنتری کی رائفل مجھے دے کر کہا۔

''اسے سنبھالئے بھائی جان!'' میں نے رائفل پکڑ لی۔ بس کچھ تقدیر ہی کا فیصلہ تھا کہ ہم اس ٹوٹی دیوار کے سہارے باہر نکل آئے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ لیکن وقت ہماری مدد کر رہا تھا۔ جیل سے باہر آ کر یقین نہیں آ رہا تھا۔ تا حد نگاہ گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دور تک ہمیں بہت محتاط ہو کر دوڑنا پڑا اور جب جیل کے ٹاور کی روشنی غائب ہو گئی تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب آبادی کی روشنیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔

میں نے محمود کو آواز دی تو وہ رک گیا۔ ''تھک گئے بھائی جان؟''

''بالکل نہیں...... مگر شہر میں داخل ہونا خطرناک ہوگا۔ ہمارے جسم پر قیدیوں کا لباس ہے۔''

''شہر میں تو داخل ہونا پڑے گا۔ وہیں کچھ بندوبست ہو سکتا ہے۔'' محمود نے کہا اور پھر بولا۔ ''آیئے' دیکھتے ہیں۔'' میں آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ رائفل اس نے اس طرح سنبھالی ہوئی تھی جیسے ضرورت پڑنے پر اسے بے دریغ استعمال کرے گا۔ اس کی نگاہیں دور دور تک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہم شہر میں داخل ہو گئے اور تاریک راستوں کا سہارا لیتے ہوئے بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جسے رہائشی علاقہ کہا جا سکتا تھا۔ ایک بنگلے کے سامنے محمود رک گیا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لے کر کہا۔

''آپ یہاں رکیں بھائی جان! ہوشیار رہیں۔ اوّل تو میں کسی ہنگامے کا موقع نہیں دوں گا۔ مگر کچھ دیر ہو جائے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کرنا مناسب ہوگا۔''

''مگر محمود......؟''

''صرف لباس کے حصول کی کوشش کروں گا اور کچھ نہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

میں بنگلے کے سامنے ایک درخت کے پاس پہنچ گیا۔ تاریکی کے باوجود محمود کی حرکات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے ہر کام میں بڑی مہارت کا احساس ہوتا تھا۔ اس مختصر وقت میں اسے سب کچھ کیسے آ گیا؟ وہ بنگلے میں داخل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے گردن اٹھا کر درخت کو دیکھا۔ اس کی پھیلی ہوئی شاخوں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔ وہاں سے میں بنگلے کے احاطے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ بنگلہ اندر سے تاریک تھا۔ مجھے کچھ نظر نہ آ سکا اور میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔ پھر میرے کانوں میں کچھ مدھم مدھم چیخوں کی آوازیں اُبھریں اور میں نے رائفل سنبھالی لیکن چیخیں دوبارہ نہ سنائی دی تھیں۔ کوئی دو منٹ کے بعد بنگلے میں کچھ روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی کسی کھڑکی کے شیشوں سے جھلکی تھی۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ جان آنکھوں میں سمٹی آ رہی تھی۔ بدن پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے؟ نہ جانے محمود......

وقت کس طرح گزرا' کوئی احساس نہ ہو سکا۔ مجھ پر لرزہ طاری رہا۔ پھر میں نے ایک سایہ بنگلے سے برآمد ہوتے دیکھا۔ کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ باقاعدہ گیٹ کھول کر باہر آیا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ محمود ہی تھا۔ مگر شلوار قمیض میں ملبوس۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل کے بجائے ایک سوٹ کیس تھا' جسے سنبھالے وہ باہر آیا اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں پھرتی سے درخت سے نیچے کود آیا تھا۔ محمود نے مجھے دیکھ لیا اور تیزی سے میرے قریب آیا۔ اس نے بغل سے ایک بنڈل نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''درخت کی آڑ میں جا کر لباس تبدیل کر لیں۔ یہ آپ کے لئے بالکل درست ہو گا۔''

''اوہ...... کیا بنگلے کے مکین......''

''نہیں...... ان کا خطرہ نہیں ہے۔''

باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے فوراً لباس تبدیل کر لیا۔ اس دوران محمود نے سوٹ کیس سے پشاوری چپل نکال لی تھی۔

''انہیں پہن کر دیکھئے...... خدا کرے یہ آپ کے پیروں میں آ جائیں۔ بس کام چل جائے۔ بعد میں بندوبست ہو جائے گا۔'' میں نے چپلیں پہنیں۔ بالکل ٹھیک آئی تھیں۔ محمود ہنس پڑا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے وہاں ہمارے ہی دو بھائی اور موجود ہیں۔ ان کے جسم اور پاؤں ہمارے جیسے ہیں۔''

''چوری کرنی پڑی محمود!'' میں نے تاسف سے کہا اور محمود ہنس پڑا۔

''نہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی۔''

''کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا؟''

''صرف اتنا کہ انہیں صبح تک بندھے پڑے رہنا پڑے گا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہے مگر ناک سے سانس لیتے رہیں گے۔ صبح کوئی نہ کوئی انہیں کھول دے گا۔'' محمود نے جواب دیا۔

''تمہاری رائفل۔''

''وہیں چھوڑ دی۔ آپ بھی پھینک دیں' بیکار ہیں اب یہ ہمارے لئے' اب ہم شریف لوگ ہیں۔''

''یہ سوٹ کیس ساتھ رکھو گے۔''

''ضروری ہے۔ آیئے' ریلوے اسٹیشن تک پیدل ہی چلنا پڑے گا۔ خدا کرے ابھی جیل میں ہمارے فرار کا اندازہ نہ ہوا ہو اور ہمیں یہاں سے نکل جانے کا موقع مل جائے۔'' ہم دونوں چل پڑے' ابھی تک تو تقدیر نے ساتھ دیا تھا اور مجھے حیرت ہو رہی تھی کیونکہ میں اپنی خوش بختی سے تو بالکل مایوس تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ابھی محمود کے بخت بالکل تاریک نہ ہوئے ہوں اور اس کی تقدیر سے میرا بھی کام چل رہا ہو۔ ریلوے اسٹیشن پہنچے لیکن ہمیں ٹرین کوئی سوا پانچ بجے ملی تھی اور یہ وقت جیسے

گزرا ہے اللہ جانتا تھا۔ آنکھیں وحشت زدہ تھیں۔ محمود نے ٹرین کے بارے میں معلومات حاصل کر کے دو ٹکٹ خرید لیے تھے۔ ٹرین صرف دو منٹ یہاں رکی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ پورے کمپارٹمنٹ میں ایک بھی شخص جاگتا نہیں ملا۔ ہمیں آسانی سے بیٹھنے کی جگہ بھی مل گئی تھی۔ طویل ترین جدوجہد کے بعد ان لمحات کو سکون کے لمحات کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''محمود بنگلے کے مکینوں نے تمہاری صورت دیکھ لی تھی؟''

''چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بھائی جان! ہمارے بارے میں تحقیقات کرنے والوں کو ہمارے سارے پروگرام کی تفصیل تو پتا چل جائے گی۔ ان کے پاس ہمارے فنگر پرنٹس بھی موجود ہیں' اس لیے ہر احتیاط بے کار تھی۔ ہم جیل سے فرار ہوئے' شہر میں داخل ہوئے' بنگلے میں چوری کی اور فرار ہو گئے۔ ہاں اصل احتیاط اب شروع ہو گی۔ میں نے لمبے سفر کا ٹکٹ خریدا ہے مگر دن کو نو بجے کے قریب قریب جو اسٹیشن آئے گا ہم وہاں اتر جائیں گے' اگر کوئی بہتر جگہ ہوئی تو کچھ قیام کریں گے ورنہ کسی اور ذریعہ سے آگے بڑھ جائیں گے۔'' اس کا کہنا درست تھا' میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔

''کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں بھائی جان!''

''اوہ! نہیں تو میں راتوں کو جاگنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ تم سو جاؤ محمود' اطمینان سے سو جاؤ میں جاگ رہا ہوں۔''

''تب میں سو رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور تھوڑا سا کھسک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چند لمحات میں سو گیا' یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی' وہ اسی طرح سو جاتا تھا کہ بستر پر لیٹا اور سو گیا۔ بعض اوقات یقین نہیں آتا اور ہم اس کے سونے کو مکر سمجھتے تھے۔ میں محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ماضی میرے سامنے سے گزرنے لگا۔ اس کے چہرے کی معصومیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ وہی نیند کے عالم میں کھل جانے والے ہونٹ اور ان سے جھانکتے ہوئے دو دانت۔ بالکل ایسا ہی دہانہ شمسہ کا تھا' شمسہ میری بہن...... آنکھوں کی کوریں بھیگ گئیں' کیا ہو گیا تھا یہ سب کچھ۔ کیسے منتشر ہو گئے تھے ہم سب۔ کیسے بے کل ہو گئے تھے میری وجہ سے۔ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں تو مجرمانہ ذہنیت کا حامل تھا۔ ابتداء ہی سے میرے پچھن بگڑے ہوئے تھے۔ مگر محمود...... اس نے اس مختصر وقت میں جس مہارت کا ثبوت دیا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ میں نے تو بس اتنا ہی کیا تھا کہ بیرک کے سنتریوں پر قابو پا لیا تھا۔ یہ سب کچھ بھی جوش محبت میں بیدار ہو جانے والے طوفانی جذبات کا نتیجہ تھا۔ عام حالات میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا' مگر محمود کا ہر قدم ٹھوس تھا' کہیں بھی وہ خوف کا شکار نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ اس نے بھی جذبات میں آ کر جرم کیا تھا' مگر اس کے بعد محمود کی کہانی تاریکی میں تھی۔ یہ مہارت اسے کیسے حاصل ہوئی؟ اسے ماں باپ کے بارے میں کیا معلوم ہے؟ دل میں لاکھوں سوالات مچل اُٹھے مگر وہ سو رہا تھا' اچھا ہے تھوڑی سی نیند لے لے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے ہمسفروں کو دیکھا' ان میں بظاہر کوئی مشکوک شخصیت نظر نہیں آتی تھی جس سے خطرہ محسوس کیا جاتا۔ اجالا پھٹنے لگا' لیکن وہ صرف اُجالا تھا' دن اور رات کا عمل' اس کا میری تقدیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساڑھے سات بجے ہوں گے جب ٹرین ایک جانے پہچانے نام کے اسٹیشن پر رُکی۔ بڑا شہر تھا' میں نے بے اختیار محمود کو جگا دیا اور اسے اس اسٹیشن کے بارے میں بتایا۔

''آیئے۔'' اس نے کہا۔ غالباً اسے بھی اس جگہ کی افادیت کا احساس ہو گیا تھا۔ ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

''محمود!'' میں نے آواز دی

''پیسوں کا کیا کریں؟''

''پیسے کافی ہیں بھائی جان! کوئی پندرہ ہزار روپے۔''

''ایں۔'' میں چونک پڑا۔

''مجبوری تھی بھائی جان! یہ بندوبست بھی وہیں سے ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے اس بنگلے سے کرنا پڑا۔ آپ یقین کریں ان کے پاس کوئی ساٹھ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات بھی تھے' مگر میں نے وہ انہیں واپس کر دیے۔ پیسے مجبوری تھے ورنہ ٹرین کے ٹکٹ ہی کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔'' میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ میرے قدموں میں لرزش تھی' مگر محمود مجھ سے

زیادہ خوداعتمادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہم نے ٹیکسی کو اشارہ کیا اور اس میں بیٹھ گئے۔ محمود نے ڈرائیور کو کسی عمدہ سے ہوٹل میں چلنے کے لیے کہا تھا۔ ہوٹل درمیانہ سا تھا' مگر ہمارے لیے بے حد مناسب۔ کمرہ بھی کشادہ تھا۔ ڈبل بستر لگا ہوا تھا۔ ملحقہ غسلخانہ تھا' پہلے میں نے غسل کیا اور یوں لگا جیسے نئی زندگی حاصل ہوئی' اس کے بعد محمود غسل خانے میں داخل ہو گیا' اس دوران میں نے ویٹر سے ناشتہ لانے کے لیے کہا تھا کہ ہمیں صرف چند لمحات کی مہلت ملی ہے۔ اس کے بعد پھر وہی تنگ و تاریک کوٹھریاں' عدالت اور آخری فیصلہ جسے ہماری موت پر ختم ہونا تھا۔ یہ عارضی لمحات ہمیں صرف دنیا کو دیکھنے کے لیے حاصل ہوئے ہیں۔ محمود کو جیسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ناشتہ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

''میری پسند کا آملیٹ' ہری مرچوں والا۔'' اس نے آملیٹ پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ میں خود بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا تھا۔ ہم نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ محمود کی نیت کا تو مجھے اندازہ نہیں' لیکن میرے دل میں ایک عجیب سی حسرت پیدا ہو رہی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کچھ دیر کے بعد آ کر کہے گا۔

''بس اٹھو۔ وقت ختم ......''

''اب آپ آرام سے سو جایئے۔'' محمود نے کہا۔

''نہیں محمود۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔''

''بیمار ہو جائیں گے رات بھر کے جاگے اور تھکے ہوئے ہیں۔''

''تمہیں نیند آ رہی ہے۔''

''آ تو نہیں رہی' بستر پر لیٹوں گا تو آ جائے گی۔''

''ابھی بیٹھو محمود۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں جاگنے کے بعد کیا ہوا؟ پتا نہیں۔'' محمود کے چہرے پر ایک دمغم آلود کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''آپ خوفزدہ ہیں بھائی جان!''

''ہاں محمود۔''

''مگر میرے خیال میں ہمیں ابھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ جادوگر نہیں ہیں کہ جادو کے زور سے پتا لگا لیں گے۔''

''میرے لیے کچھ دیر جاگ محمود۔''

''زندگی بھر جاگنے کے لئے تیار ہوں بھائی جان۔ میں تو بس آپ کے دل سے خوف دُور کرنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھ لیجئے مجھے خوف نہیں ہے' حالانکہ میں بھی قتل کا مجرم ہوں۔ میرے لیے سزائے موت کی پیش گوئی کر دی گئی ہے۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ محمود نے ایک ایک پیالی چائے اور بنائی اور پھر بولا۔ ''آیئے باتیں کریں گے۔''

''مجھے تمام صورت حال بتاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ اس وقت سے شروع کرتا ہوں جب آپ گرفتار ہو گئے تھے۔ سب پریشان تھے۔ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ہماری صرف ایک آرزو تھی' آپ کی زندگی بچ جائے۔ ابو کا فیصلہ تھا کہ اپنے تن کے کپڑے تک فروخت کر دیں گے آپ کی زندگی بچانے کے لئے۔ پاس پڑوس کے لوگ ہم سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ ہم پر آپ کا نام لے کر آوازے کستے تھے' لیکن فیصلہ کر لیا گیا کہ کان بند کر لئے جائیں۔ ہم پر برا وقت ہے' اس کے ٹلنے کا انتظار کیا جائے۔ چنانچہ ہم خاموش رہے۔ پھر وہ منحوس وقت آ گیا جب ......'' محمود افسردہ ہو گیا۔

''ہم مرجھا گئے تھے۔ ہم زندگی سے دور چلے گئے تھے۔ میں ان لمحات کے بارے میں اس سے زیادہ آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ کی جدائی کا وقت آ گیا۔ ہم آپ کی لاش لینے پہنچے۔ مگر ہم سے کہا گیا کہ لاش ابھی نہیں دی جا سکتی۔ خاصی بھاگ دوڑ کی ہم نے' مگر وہاں کچھ عجیب انداز تھا۔ ماموں ریاض نے تو اسی وقت کہا تھا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ کوئی ایسی ان ہونی ہوئی

جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ امی تو سجدے میں چلی گئی تھیں۔ رات کو تین بجے تصدیق ہوگئی۔ پولیس نے چاروں طرف سے ہمارے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ تب بڑے بڑے پولیس افسر اندر داخل ہوئے۔ چپے چپے کی تلاشی لی گئی۔ بہت منت سماجت کرنے پر ایک بڑے افسر نے بتایا کہ آپ کو پھانسی نہیں دی جاسکی۔ عین وقت پر آپ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ہم لوگ ایک بار پھر زندہ ہو گئے تھے۔ مگر اب نئی مصیبت کا آغاز ہوگیا۔ پولیس ہمارے ملنے جلنے کی بھی نگرانی کرتی تھی۔ کوئی کہیں جاتا اس کا پیچھا کیا جاتا۔ تقریباً ایک درجن چھاپے پڑے ہمارے گھر۔ آپ کو شکور خان یاد ہوگا۔''

''ہاں۔''

''وہ دکاندار لطیف کا بیٹا۔''

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔''

''غنڈہ سمجھتا تھا اپنے آپ کو۔ اکثر آوازے کستا رہتا تھا۔ اس دن ماموں ریاض بازار گئے تھے۔ اس نے ماموں ریاض پر آوازہ کسی تو وہ رک گئے۔ انہوں نے نرمی ہی سے کہا تھا کہ بھائی! کسی پر برا وقت آ جائے تو اس کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے۔ لطیف خان بھی بول پڑا۔ نہ جانے کیا کہا ماموں سے۔ وہ گھر واپس آئے' ہاکی لے کر گئے اور لطیف خان کا سر کھول دیا۔ میں ماموں کے پیچھے دوڑا تھا۔ لطیف خان تو زخمی ہوگیا مگر شکور نے ماموں پر حملہ کر دیا۔ پاس ہی سبزی فروش کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ٹھیلے سے چھری اٹھائی اور شکور کے سینے میں اتار دی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ صورت حال بگڑ گئی ہے۔ میں نے ماموں کے کان میں کہا۔

''ماموں! میں ڈاک بنگلے میں ملوں گا۔ موقع ملے تو مجھے صورت حال بتایئے گا۔'' اور اس کے بعد میں وہاں سے نکل گیا۔ پانچ دن میں ڈاک بنگلے میں چھپا رہا۔ چھٹی رات کو ماموں آ گئے۔ بڑی احتیاط سے آئے تھے اور کچھ خاص انتظامات کر کے آئے تھے۔ شکور مر گیا تھا۔ ماموں گرفتار ہو گئے تھے' مگر ان کی ضمانت ہوگئی تھی۔ پولیس میری تلاش میں تھی۔ ماموں نے کہا ہم گھر چھوڑ رہے ہیں۔ پہلے ناظم پور جائیں گے۔ اس کے بعد کہیں اور جانے کا فیصلہ کریں گے۔ ایک مہینے کے بعد میں ناظم پور میں شفیق خالو کے ہاں ان سے مل لوں اور اس وقت بس سے نکل جاؤں۔ وہ میرے لئے پیسوں وغیرہ کا انتظام کر کے آئے تھے۔ چند جوڑے کپڑے بھی لائے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور بس میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔ بس فرید پور جا رہی تھی۔ مگر میں جیسے ہی فرید پور اُترا پولیس میرے پیچھے لگ گئی۔ شاید فرید پور اطلاع دے دی گئی تھی اور میری تصویریں بھی بھیج دی گئی تھیں۔ پولیس کو چکمہ دے کر میں وہاں سے بھاگا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ریل میں بیٹھ گیا۔ ریل میں مجھے چاند خان مل گئے۔

''کون چاند خان؟''

''کوئی شناسا نہیں تھے۔ وہیں شناسائی ہوئی۔ بہت اچھے انسان تھے۔ پورا گروہ تھا ان کا۔''

''گروہ؟''

''ہاں...... جیب تراشوں کا گروہ۔''

✦✥✦✥✦

انہیں مجھ پر شبہ ہوگیا۔ مگر میں نے انہیں ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے اڈے پر میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس محبت سے پیش آئے وہ میرے ساتھ کہ پھر میں ان سے جھوٹ نہ بول سکا اور میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ وہ پولیس اسٹیشن گئے۔ وہاں میری تصویر موجود تھی۔ چاند خان نے مجھے وہاں سے ہٹا کر ایک خفیہ جگہ رکھا اور پھر وہ میری تربیت کرنے لگے۔

''تربیت؟'' میں نے پھر درمیان میں دخل دیا۔

''ہاں...... انہوں نے مجھے چاقو چلانا سکھایا' جیب تراشی سکھائی' پستول اور رائفل کا استعمال اور نشانہ بازی۔ زندگی

بچانے کے سارے گُر سکھائے انہوں نے مجھے تاکہ کہیں پھنس جاؤں تو اپنا بچاؤ کر سکوں۔ اس دوران وہ میرے لئے کچھ اور بندوبست بھی کر رہے تھے۔ کسی خاص جہاز کے کپتان سے ان کی دوستی تھی۔ وہ اس کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ مجھے جہاز سے نکال دیں۔ سنا ہے بحری جہازوں پر خفیہ نوکریاں بھی مل جاتی ہیں۔ مجھے چاند خان کے ساتھ کئی ماہ گزر گئے تھے۔ وعدے کے مطابق میں ناظم پور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال ستاتا تھا آخر میں نے چاند خان سے اجازت لے ہی لی۔''

''کیسی اجازت؟'' میں نے پوچھا۔

''ناظم پور جانے کی۔ اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار ان سے کہا تھا' لیکن انہوں نے کہا تھا کہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ ابھی جانا بہتر نہیں رہے گا۔ وہ لوگ ابھی ناظم پور نہ بھی گئے تو جہاں گئے' وہاں کے بارے میں بتا جائیں گے۔ چنانچہ میں جلد بازی نہ کروں۔ پولیس سرگرم ہے۔ بالآخر چاند خان نے اجازت دے دی اور اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا۔ ہم چھپتے چھپاتے ناظم پور پہنچے۔ میں نے شفیق خالو کے مکان کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ شفیق خالو نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ' میرا گریبان پکڑ لیا۔

''بدمعاش! آوارہ! خونی! تجھے میرے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' آپ کو معلوم ہے بھائی جان! میں نے ہمیشہ خالو کی عزت کی۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتے رہے تھے۔ میں خود حیران رہ گیا۔

''فوراً نکل جا یہاں سے' ورنہ پولیس کو بلا لوں گا۔'' خالو جان بولے۔

''خالو جان! میں ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔''

''اُلٹے قدموں نکل جا۔ ورنہ......''

''کیا امی ابو اور دوسرے لوگ یہاں آئے تھے؟'' میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ تو یہاں سے دفعان ہو جا۔''

''مجھے صرف ان لوگوں کے بارے میں بتا دیجئے۔ کیا وہ یہاں ہیں؟''

''دارالامان ہے نا یہ تو۔ تمہارے باپ کی جاگیر ہے۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔''

''کہاں گئے ہیں وہ؟ کچھ بتا کر گئے ہیں؟''

''جہنم میں گئے۔ چلو نکلو یہاں سے۔'' خالو مجھے دھکے دینے لگے۔ سر گھوما تھا بھائی جان! لیکن خود پر قابو رکھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت خالو جان' خالہ سے بھی نہ ملنے دیں گے۔ چنانچہ وہاں سے واپس نکل آیا' لیکن اسی رات گھر کی ایک کھڑکی سے اندر داخل ہو کر خالہ جان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر زار و قطار روئیں۔ خالو دوستوں میں گئے ہوئے تھے۔ تب انہوں نے مجھے بپتا سنائی۔

''کیا۔'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''خالو جان ویسے ہی تنگ مزاج انسان تھے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور پھر ابو سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ واقعات کی کچھ بھنک انہیں بھی مل گئی تھی۔ مگر جب یہ لوگ ان کے پاس پہنچے تو وہ ہمدردی سے پیش آئے۔ البتہ انہوں نے اسی وقت کہہ دیا کہ وہ انہیں پناہ نہ دے سکیں گے اور یہ لوگ جلد یہاں سے چلے جائیں' کیونکہ اس طرح وہ خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر پولیس تاک میں تھی۔ خالو کے ہاں چھاپہ پڑا اور پولیس نے انہیں بھی پکڑ لیا۔ تین دن تک لاک اپ میں رہے۔ شاید پولیس نے ان سے بھی ہمارے بارے میں پوچھا تھا۔ دس ہزار روپے دے کر جان چھڑائی اور امی وغیرہ کو گھر سے نکال دیا۔ یہ تھی خالو شفیق کی کہانی۔''

''خالہ نے کچھ بتایا کہ امی ابو کہاں گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں یہ پتہ نہیں تھا۔ کچھ موقع ہی نہیں ملا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''بس بھائی جان! خالو شفیق نے کچھ زیادہ ہی زیادتی کر ڈالی۔ جب میں خالہ کے پاس تھا تو انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ میں اندر ہوں۔ پولیس کو اطلاع دے کر انہوں نے مجھے گرفتار کرا دیا۔''

''اوہ......'' میں نے ایک سرد آہ بھری۔

''کھاتہ کھول لیا ہے انہوں نے اپنا بھائی جان!......قرض تو وصول کرنا ہے ان سے۔'' محمود نے سرد لہجے میں کہا۔

''اوہ......نہیں محمود!......نہیں بیٹے! ذہن ٹھنڈا رکھو۔ ہم تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ ہاں' چاند خان کے اس آدمی کا کیا ہوا جو تمہارے ساتھ تھا؟''

''ظاہر ہے اسے بھاگ جانا تھا۔ ورنہ چاند خان پر پورا کیس بن جاتا۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں پیش کیا گیا۔ بہت سی باتیں پوچھی گئیں اور ابھی میرا کیس چل رہا ہے۔ مجھے ریمانڈ پر جیل بھیجا گیا تھا۔''

میں خاموشی سے محمود کی صورت دیکھتا رہا۔ ماں باپ کا کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ دماغ میں بہت سے سوالات پیدا ہو گئے تھے اب کیا ہوگا؟ نہ جانے وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ کس حال میں گزارا کر رہے ہوں گے؟ اگر ان کا پتہ چل جائے تو ہم دونوں کر بھی کیا سکیں گے سوائے اس کے کہ ان کے لئے مصیبت بن جائیں اور اب تو جیل سے فرار اور سپاہیوں کو شدید زخمی کرنے کا جرم بھی عائد ہو گیا تھا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''چاند خان سے اس دوران تم نے رابطہ کیا؟''

''بالکل نہیں اور اُصولی طور پر درست بھی ہے۔ کوئی کتنا ایثار کر سکتا ہے۔ وہ جرائم کرتے ہیں مگر یہ تو گردن پھنسانے والی بات تھی۔''

''ہاں۔'' میں نے گردن ہلائی کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے' محمود بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''مجھے آپ سے اس طرح ملاقات کی اُمید نہیں تھی بھائی جان۔ آپ اس جیل میں کب پہنچے اور یہ سب کچھ کیا ہوا ہے؟''

''بس محمود بیٹے' تقدیر ہمارے ساتھ یہ کھیل کھیل رہی ہے۔ کیا بتاؤں کیا ہوا ہے' ہاں بس اتنا سمجھ لو کہ نہ مجھے جرم کی زندگی سے کوئی رغبت تھی نہ ہے' میں تقدیر کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہوں۔ قدرت مجھے زندہ بھی رکھنا چاہتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کب تک۔''

''پھانسی گھر میں کیا ہوا تھا؟''

''جو کچھ ہوا تھا اس میں نہ میرا ہاتھ تھا نہ کوشش۔'' میں نے گول مول جواب دیا' محمود کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا' یہ اس کا پیار تھا کہ اس نے مجھے مجبور نہیں کیا۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ کے خیال میں یہ لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟''

''امی ابو وغیرہ؟ میں نے سوال کیا۔''

''ہاں۔''

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ زندگی بہت پیاری ہوتی ہے' کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا ہوگا انہوں نے اپنے لیے اور یہ بہتر ہی ہے محمود' میری نحوست نے سب کو برباد کر دیا۔ محمود تو بھی میرے بیٹے ان حالات کا شکار ہو کر نہ جانے کیا سے کیا بن گیا' تیرا یہ حال بھی میری وجہ سے ہوا ہے۔ ہمارا ان سے دور رہنا ہی مناسب ہے' کم از کم انہیں تو سکون ملے۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی جان! ابھی آپ نے تقدیر کے بارے میں کہا تھا' تقدیر سب کی الگ الگ ہوتی ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میری تقدیر کا معاملہ تھا۔ خیر اب آئندہ کے لیے مجھے بتائیں کیا کیا جائے۔''

''میری بات مان لو گے محمود۔''

''کیوں نہیں بھائی جان!''

''وعدہ کر رہے ہو۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں بھائی جان۔'' محمود نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
''ہے محمود جان! ہے۔ چاند خان کس قسم کے آدمی ہیں' رواداری میں تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے یا خلوص سے؟''
''انہوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا بھائی جان! وہ بالکل بے لوث تھا۔ بے غرض تھا اور پھر خاصا وقت صرف کیا انہوں نے مجھ پر۔ بعد میں بھی میرے ساتھ مخلص رہے۔ میرے خیال میں اچھے آدمی ہیں بلکہ اچھے انسان ہیں آپ آگے کہیں۔''
''تو پھر تمہیں چاند خان کے پاس واپس جانا ہوگا۔ ہوسکتا ہے تقدیر ہمارا ساتھ دے جائے۔ اگر چاند خان تمہیں ملک سے باہر نکال سکتے ہیں تو اس وقت اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہوگی۔ کم از کم تم اس جال سے بچ کر نکل جاؤ۔ بعد میں جو کچھ ہو گا میں دیکھ لوں گا۔''
محمود کا چہرہ یک دم ست گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بولا۔ ''آپ کا حکم نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بھائی جان! آپ مجھے کنویں میں چھلانگ لگانے کے لئے بھی کہیں گے' خدا کی قسم لگا دوں گا' لیکن کچھ بات تو کرنے کی اجازت دیں۔''
''کیا......؟''
''آپ کے خیال میں ان حالات میں اپنی جان بچا کر باہر نکل جانا ایک خوشگوار عمل ہوگا؟ کیا میں سکون پا سکوں گا؟ کیا مجھے یہ احساس نہ ہوگا کہ میں نے آپ سب کو چھوڑ کر خود غرضی کا ثبوت دیتے ہوئے صرف اپنی جان بچالی؟''
میں محمود کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک جذباتی احساس ہے محمود! اور یہ ہمیں کچھ نہیں دے سکے گا۔ ہم الگ الگ رہ کر اگر زندگی پا سکتے ہیں تو اس میں جذباتیت کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔ پہلے تم اپنے طور پر باہر نکل جاؤ۔ میں اس دوران امی اور ابو کو تلاش کروں گا اور جیسے ہی کوئی موقع ملا میں امی اور ابو کے ساتھ اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کروں گا۔ کم از کم ایک طرف سے تو مطمئن ہو جاؤں۔ ہاں' اگر تم مصیبت کا شکار نہ ہوتے تو میں تم سے پوری پوری مدد لیتا' لیکن بیٹے! اگر پھنسے تو دونوں ہی پھنس جائیں گے۔ اس طرح کم از کم ایک تو محفوظ ہو جائے' تاکہ زیادہ ہمت سے کام کرنے کا موقع مل جائے۔'' محمود سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔
''اور اگر آپ مصیبت میں گھر گئے تو؟''
''میری صرف ایک بات سن لو محمود! میں کسی بھی مصیبت میں گھر جاؤں' ابھی مر نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ جو پراسرار قوتیں مجھے اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں وہ میری موت نہیں' زندگی چاہتی ہیں۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے محمود! مجھے ایک مکروہ عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے اور میں وہ عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ پہلے میں ان ناپاک قوتوں کو شکست دوں گا اور اس کے بعد اپنا کام کروں گا۔''
محمود نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ پھر وہ بولا۔
''بھائی جان! خدا کی قسم آپ کے ساتھ رہ کر زندگی کی ہر صعوبت جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔ جان بچا کر نہیں بھاگنا چاہتا' لیکن اگر یہ آپ کا حکم ہے کہ میں نکل جاؤں یہاں سے' تو کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ چاند خان سے دوبارہ ملاقات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پتا چل جائے گا کہ اب ان کا نظریہ کیا ہے؟ وہ اگر گھبرائے تو اللہ مالک ہے کچھ اور دیکھیں گے' سوچیں گے اور اگر آمادہ ہو گئے ہمارا کام کرنے پر' تو پھر میں آپ کے حکم کے مطابق ان سے فائدہ اٹھاؤں گا' لیکن ہوشیار رہنا بے حد ضروری ہے۔
''ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ محمود اور میں اس پروگرام پر متفق ہو گئے تھے۔ اپنے بھائی سے مجھے بے پناہ محبت محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ پہلے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے لیکن میں چونکہ اپنے مشاغل میں مصروف

رہتا تھا اور محمود کو صرف پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی' اس لیے بہت زیادہ قربت نہیں تھی' لیکن اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ محمود میرے لیے دُنیا کی سب سے قیمتی شے ہے۔ آنکھوں میں بار بار گزرا ہوا ماضی در آتا تھا۔ ایک پرسکون گھرانہ ہنستے مسکراتے لوگ' بے چارے ماموں ریاض' صرف نام کے ماموں تھے ورنہ ہمارے لیے تو وہ بڑے بھائیوں جیسے ہی تھے' رہن سہن کا وہی انداز' وہی سب کچھ۔ سب ہی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ہوٹل میں کافی وقت گزرا' کمروں میں محصور ہو گئے تھے۔ اخبار وغیرہ منگوا لیا کرتے تھے' لیکن کسی بھی اخبار میں ہم سے متعلق کوئی بھی خبر ہمیں نہ مل سکی۔ بالآخر جب کئی دن گزر گئے اور ہم نے اپنی تمام تھکن اتار لی تو پھر تیاریاں کرنے لگے۔ چاند خان دوسرے شہر میں رہتے تھے اور یہاں سے ہمیں وہاں تک کا سفر کرنا تھا۔ ہر طرح کا سفر ہی کیا' چار دیواری سے باہر نکلنا بھی عذاب ہی تھا۔ کسی بھی وقت مصیبت دوبارہ نازل ہو سکتی تھی۔ لیکن کیا کرتے البتہ حلیہ صرف تبدیل کیا تھا۔ پٹھانوں جیسے لباس پہنے تھے ہم دونوں نے۔ بازار سے کچھ خریداری بھی کی تھی اپنے لئے جس سے کچھ حلیہ بدلنے میں مدد ملی تھی۔ اپنے طور پر جس قدر ممکن ہو سکتا تھا کیا اور اس کے بعد ٹرین میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ مطلوبہ جگہ پہنچنے کے بعد میں محمود کے ساتھ چاند خان کے اڈے پر پہنچ گیا۔

بڑا سا مکان تھا۔ خاص قسم کا احاطہ۔ اندر بہت سے لوگ تھے۔ انہوں نے ہمیں اجنبی نگاہوں سے دیکھا' لیکن پھر کسی نے محمود کو پہچان لیا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ وہ لوگ محمود سے بڑی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ چاند خان اندر موجود تھے۔ اطلاع ملی تو باہر نکل آئے۔

میں نے چاند خان کو دیکھا۔ وہ چہرے ہی سے پُروقار اور کسی اچھے گھرانے کے فرد معلوم ہوتے تھے۔ محمود کو بڑے خلوص سے سینے سے لگایا اور پھر میری جانب دیکھا اور چونک کر بولے۔

''اوہو...... یہ مسعود ہیں۔ کیوں' میں نے غلط تو نہیں کہا؟''

''نہیں خان صاحب! بھائی جان ہی ہیں۔'' محمود بولا۔ چاند خان نے ہم دونوں کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اندر داخل ہو گئے۔

''شیروں کی جوڑی ہے۔ پنجرے میں کیسے رہ سکتی تھی۔'' وہ بولے۔ اندر ایک سجے ہوئے کمرے میں ہم دونوں کو بٹھایا گیا اور چاند خان نے باہر رخ کر کے کہا۔

''چلو شہزادوں کے کھانے پینے کے لئے کچھ لے آؤ۔'' پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''ایک بات کہوں محمود! یقین کر لینا میری بات پر۔ مجھے تمہاری واپسی کا یقین تھا۔ انتظار کر رہا تھا۔ کئی کام تھے آنے جانے کے مگر تین مہینے کے لئے سارے کام ملتوی کر دیئے تھے۔ سوچا تھا بس تم پر کام کروں گا۔ مگر یہ خیال بھی تھا کہ شاید مجھے ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔''

''وہ کیسے خان صاحب؟''

''بھئی تمہارے خالو نے غداری کی۔ پولیس سے مل کر تمہیں پکڑوا دیا۔ میرے آدمی نے مجھے اطلاع دی۔ کوئی طوفانی قدم تو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بس تیاریاں جاری رکھیں۔ بات جب آخری حد میں آ جاتی اور کوئی ذریعہ نہ رہتا تو کچھ کرتے۔ خبر مل گئی کہ تم جیل سے بھاگ گئے۔''

''کیسے خان صاحب؟'' محمود بولا۔

''تمہارا کیا خیال تھا' تم پکڑے گئے اور ہم چپ ہو کر بیٹھ گئے؟ دیکھو چند اتم حیات پور لے جائے گئے تھے۔ تھانے میں رہے۔ پھر چار پیشیاں ہوئیں تمہاری۔ اس کے بعد نئی آبادی جیل میں گئے۔ وہاں سترہ دن رہے۔ اس کے بعد دوسری جیل گئے اور منگل کی رات کو وہاں سے نکل گئے۔ ایک سنتری مار دیا تم نے اور ایک زخمی کر دیا۔'' چاند خان نے کہا۔ نہ صرف میری بلکہ محمود کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

''آپ کو سب معلوم ہے خان صاحب؟''

''معلوم رکھنا تھا بیٹے! ورنہ تم خطرے میں نہ پڑ جاتے۔ موقع کی تاک میں تھے بس۔ مگر مسعود میاں کی خبر نہ تھی۔''
''یہ اطلاعات آپ کو کہاں سے ملتی رہیں خان صاحب؟''
''میاں! ہر جگہ آدمی رکھنے پڑتے ہیں اپنے۔'' چاند خان بولے۔ اتنی دیر میں چائے کے ساتھ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں آ گئیں اور ہم نے بھی تکلف نہیں کیا۔ مصروف ہو گئے۔ چاند خان مخلص انسان تھے۔ میں نے سب سے پہلا سوال ان سے یہی کیا۔
''آپ نے اسے باہر بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا خان صاحب!''
''ہاں ...... اور لیگون ہارڈو آیا ہوا ہے۔ نو تاریخ کو واپس جا رہا ہے۔''
''لیگون ہارڈو؟''
''جہاز کا نام ہے۔ یونانی کمپنی کا ہے۔ کپتان ہمارا دوست ہے۔''
''کیا محمود کو یہاں سے نکالا جا سکتا ہے؟''
''امید تو ہے۔''
''تو خان صاحب! یہ کام کر دیجئے۔ یہ ہمارے خاندان پر احسان ہوگا۔ مجھ پر احسان ہوگا۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔
خان صاحب کچھ سوچتے رہے' پھر بولے۔ ''تمہارے لئے بھی بات کروں مسعود میاں!''
''نہیں خان صاحب! بس آپ اسے نکال دیں یہی کافی ہے۔''
''دیکھو میاں! اس وقت موقع اچھا ہے۔ ذرا اوپر نیچے کر لیں گے ہم اپنے دوست کو۔ باقی کام بعد میں دیکھے جائیں گے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ تم اپنے ماں باپ کی وجہ سے یہاں سے نہیں جانا چاہتے ہو۔ یہ ذمہ داری ہمیں سونپ دو۔ ہم ان کا خیال رکھیں گے۔ وعدہ کرتے ہیں تم سے۔''
''اس بے لوث محبت کا ہم کوئی جواب نہیں دے سکیں گے خان صاحب! ہاں دعائیں ضرور دیں گے آپ کو۔ ابھی صرف محمود کو یہاں سے نکال دیں۔ میں یہ ملک نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے ممنونیت سے کہا اور خان صاحب کچھ سوچنے لگے' پھر بولے۔
''خود ملنا پڑے گا کپتان سے۔ کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔ کیوں بھئی محمود! تیار ہو؟''
''ہاں خان صاحب! بھائی جان کا یہی کہنا ہے۔''
''کل صبح نکل چلیں گے۔ تیار رہنا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ امید تو ہے کہ کام ہو جائے گا۔ مسعود میاں! یہاں رکنا بھاگ مت جانا یہاں سے۔''
''جو حکم خان صاحب!'' میں نے گردن جھکا کر کہا۔
''اب ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے تمہارے پاس۔ کام فوراً شروع کر دینا ہے۔ تم دونوں بھائی آرام کرو۔''
خان صاحب اٹھ گئے۔ ہم دونوں وہیں رہ گئے۔ میں نے کہا۔
''کون سی دعا دوں خان صاحب کو۔ محمود! اگر یہ کام ہو جائے تو عرصہ دراز کے بعد مجھے ایک خوشی نصیب ہوگی۔''
''مگر آپ کو تنہا چھوڑ کر مجھے خوشی نہ ہوگی بھائی جان!'' محمود بولا اور میں نے اسے لپٹا لیا۔
'مجبوری ہے محمود بیٹے! مجبوری ہے۔ مگر وقت کے فیصلوں کا انتظار کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے ہماری دنیا پھر سے آباد ہو جائے۔ ہو سکتا ہے' میں اگر آزاد رہا تو چاند خان سے رابطہ قائم کرتا رہوں گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو' کسی فرضی نام سے یہاں اپنی خیریت بھیجتے رہنا۔ میں بھی چاند خان سے تمہارے بارے میں پوچھ لیا کروں گا اور یہیں سے تمہیں حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔''
دوسرے دن صبح صبح میں نے محمود اور چاند خان کو رخصت کر دیا اور محمود کے لئے دعائیں کرتا رہا۔ یہاں مجھے بڑی عزت

دی گئی۔ ہر شخص میرا خیال رکھتا تھا۔ چاند خان کو گئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ میں انتظار کرتا رہا۔ دس تاریخ کو وہ واپس پہنچے تھے۔ تنہا تھے اور خوش نظر آ رہے تھے۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ چاند خان نے کہا۔

''جہاز کو سمندر میں دھکیل کر ہی واپس آیا ہوں۔ مبارک ہو محمود نکل گیا۔''

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ محمود کی زندگی بھی موت سے ہم آغوش ہونے جا رہی تھی اور اگر ایسا ہو جاتا تو میں یہی محسوس کرتا کہ میں اس کا قاتل ہوں' لیکن خدا کا احسان ہوا تھا مجھ پر۔ میرے بھائی کی زندگی بچ گئی تھی۔ چاند خان نے مجھ سے کہا۔

''اور اب مسعود میاں! ذرا تم سے تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ محمود سے مجھے جو حالات معلوم ہوئے ان سے میری تسلی نہیں ہو پائی تھی۔ مگر چونکہ بچہ مصیبت کا شکار ہو گیا تھا اور مجھے اس کی زندگی کا خطرہ تھا اس لئے مجھ سے جو کچھ بن پڑا' کرتا رہا۔ اب ذرا تم سے اطمینان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کوئی ایسی مصروفیت تو نہیں تمہاری جو میری وجہ سے رک جائے؟''

''نہیں خان صاحب! میری مصروفیت ہی کیا ہے؟ محمود سے مل کر ماں باپ کے بارے میں کچھ اطلاعات ملی تھیں۔ چھوٹی بہن بھی ہے میری' ماموں بھی ہیں۔ جو بھائیوں کی طرح ہیں۔ مگر اب وہ سب نجانے کہاں گم ہو گئے ہیں۔''

''ویسے تمہارے خالو نے بڑی زیادتی کی۔ ذرا بھی رشتے داری نہیں نبھائی۔ مانتا ہوں کہ حالات خراب تھے' مگر رشتے دار ہی تو کام آتے ہیں۔ کسی سے کیا شکایت۔ جو کچھ ان سے بن پڑا وہ انہوں نے کر ڈالا۔''

''ہاں خان صاحب! بس ہم گردش کا شکار تھے بلکہ ہیں اور جب گردش کا شکار ہوتے ہیں یا مصیبت آتی ہے انسان پر تو لوگ کہتے ہیں کہ سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے' مگر آپ کے پاس آ کر اس حقیقت کو جھٹلانا پڑتا ہے۔''

''دیکھو میاں!...... ہم اپنی تعریفیں نہیں سننا چاہتے۔ گناہ گار بندے ہیں۔ برے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر ایک آدھ کام غلطی سے ہو جائے تو تم کیا سمجھتے ہو' ہمیں خوشی نہیں ہوتی اس کی؟...... مگر تمہارا کیا معاملہ تھا' یہ بتاؤ؟''

''بتا دوں گا خان صاحب! اطمینان سے بتا دوں گا۔ آپ بھی تھکے ہوئے ہیں آرام کر لیجئے۔''

''ہاں' ہاں...... ٹھیک ہے۔ ذرا تم سے لمبی نشست رہے گی۔ ساری تفصیل پوچھیں گے اور بالکل پروا مت کرنا کیلئے نہیں ہو تم۔ ہم تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔''

یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ حالانکہ دل کے گوشوں میں چور تھا۔ کم بخت لعنتی بھوریا چرن مکمل طور سے غائب تھا' لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا وہ بھی ایک حقیقت تھی۔ میرا تعلق جس سے بھی قائم ہوتا' اس پر مصیبت نازل ہو جاتی تھی۔ چاند خان بے شک دوسری لائن کے آدمی تھے' لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر یہاں زیادہ وقت رک گیا تو چاند خان بھی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔ عارضی طور پر بے شک ان کے ساتھ رہا جا سکتا ہے' مستقل نہیں۔ بہرحال اسی رات چاند خان میرے پاس آ گئے۔ ساتھ ساتھ ہی بستر لگوا دیئے تھے انہوں نے اور تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد حقہ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور بولے۔

''ہاں مسعود میاں! مجھے تمہاری داستان سننے سے بڑی دلچسپی ہے۔''

''خان صاحب! کچھ غلطیاں میری اپنی ہیں اور کچھ مصیبتیں نازل ہوئی ہیں مجھ پر۔'' میں نے خان صاحب کو ابتداء سے حالات بتانا شروع کر دیئے۔ وہ حیرت و دلچسپی سے میری کہانی سن رہے تھے۔ یہ کہانی سناتے ہوئے میرا دل لرز رہا تھا۔ مجھے وہ لمحات یاد آ رہے تھے جب میں نے حکیم سعد اللہ صاحب کو یہ کہانی سنائی تھی اور اس کے بعد سعد اللہ زندہ نہیں رہے تھے۔ بھوریا چرن کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ اس کی کہانی کسی کو سنائی جائے۔ مگر اس وقت میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان چاند خان کو سنا دی۔ ان کے چہرے پر سخت حیرت کے آثار تھے۔ میں خاموش ہوا تو وہ بھی بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔

''بڑی دردناک کہانی ہے۔ بڑی بات ہے کہ تم نے اپنا ایمان قائم رکھا۔ میں خود بہت برا انسان ہوں۔ پوری عمر ہیرا پھیری میں گزاری ہے میں نے۔ مگر اتنی ہمت سے میں کبھی کام نہ لے پاتا۔ تم نے ایک پاک بزرگ کے مزار پر ایک ناپاک وجود کو نہ پہنچا کر جو نیکی کی ہے' میرا ایمان ہے کہ اس کے صلے سے محروم نہ رہو گے۔ یہ کالے جادو والے ایسے ٹونے ٹوٹکے کرتے رہتے ہیں اور اس طرح سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ملعون کو کوئی بڑا ہی فائدہ حاصل ہوگا۔ ورنہ وہ اس طرح تمہارے پیچھے نہ پڑتا۔ ویسے نہ تو تمہیں کسی نے مشورہ دیا ہوگا' نہ ہی تمہیں اس کا موقع ملا ہوگا کہ اس سلسلے میں کچھ کرتے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کالے جادو کا توڑ بھی تو ہوتا ہے۔''

''مجھے ایسا موقع ہی نہیں ملا خان صاحب! نہ ہی میں نے اپنی یہ کہانی کسی کو سنائی۔ وہ منحوس سادھو یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کی کہانی معلوم ہو۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے خان صاحب!''

''میرا ایمان ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ یہی تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ دیکھو!'' چاند خان صاحب نے اپنا سینہ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ ان کی گردن میں چاندی کی موٹی زنجیر میں چاندی کا ایک تعویذ نظر آ رہا تھا۔ ''سارے جادو اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساری دنیا کے جادو اس تعویذ کے سامنے بے اثر ہیں۔ بہت پرانی بات ہے' مجھ پر بھی میرے دشمنوں نے جادو کر دیا تھا۔ کوڑھی ہو گیا تھا میں۔ سڑکوں پر گھسٹتا پھرتا تھا۔ پاگل ہو چکا تھا۔ لوگ مجھ سے گھن کھانے لگے تھے۔ پھر ایک مردِ حق کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ علیم الدین خان تھا ان کا نام۔ رتولی نامی جگہ ہے' وہاں ایک پرانی مسجد ہے جس میں ایک نامعلوم بزرگ کا مزار ہے۔ وہ مجھے اس مزار پر لے گئے۔ میں ایک مہینے تک مزار پر پڑا رہا۔ تب ایک صبح فجر کے وقت ایک قبر کے کتبے پر ایک تعویذ رکھا ملا۔ علیم الدین خان صاحب میرے ساتھ تھے۔ خوش ہو کر بولے۔

''لو میاں چاند خان! دلدر دور ہو گئے تمہارے۔ مشکل حل ہو گئی۔ یہ تعویذ گلے میں ڈال لو۔''

''کوڑھ ٹھیک ہوا۔ دماغ درست ہوا اور اب اللہ کا فضل ہے۔ مگر میں یہ تعویذ کسی کو دے نہیں سکتا۔ حکم نہیں ہے۔ تمہارے لئے بیکار ہے۔ ورنہ خدا کی قسم دل چاہتا ہے کہ تمہاری ہر مشکل حل کر دوں۔ مگر فکر مت کرو۔ میں تمہیں رتولی لے جاؤں گا۔ علیم الدین خان صاحب کی خدمت میں بھی بہت عرصہ سے حاضری نہیں دی۔ ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا خان صاحب! میری مشکلات کا حل ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''فکر مت کرو۔ یہ کام ضرور ہوگا۔'' چاند خان نے کہا۔ میرے دل میں ایک نئی روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ میں چاند خان کے ساتھ دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ مجھے خود بھی یقین آ گیا کہ چاند خان کیوں محفوظ رہے۔ منحوس بھوریا چرن اس تعویذ کی وجہ سے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ خاصی رات گئے خان صاحب آرام کرنے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔ میں بے حد خوش تھا کہ نجانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ میری نگاہیں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک چھت پر میں نے کچھ دیکھا۔ سفید چونے سے پتی ہوئی چھت پر سیاہ دھبے رینگ رہے تھے۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ متحرک تھے۔ میں چونک پڑا۔ سیاہ دھبے اتنے بڑے ہو گئے کہ پوری چھت ان میں چھپ گئی اور پھر وہ نیچے اترنے لگے۔ وہ ...... وہ مکڑیاں تھیں۔ مکروہ شکل کی منحوس مکڑیاں ...... جو لاکھوں کی تعداد میں تھیں۔ اپنے جسم کے لیس دار مادے سے تار بناتی ہوئیں وہ سب نیچے اتر رہی تھیں۔ میری طرف۔ ان کا نشانہ میں ہی تھا۔

میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔ مجھ پر ایسے ایسے مشکل وقت آئے تھے کہ اب کوئی مشکل' مشکل نہیں لگتی تھی بلکہ ہر لمحہ کسی نئے حادثے کا منتظر رہتا تھا۔ حادثہ نہ ہوتا تو سوچتا کہ اب کوئی زیادہ بڑا حادثہ ہوگا۔ اعصاب میں پختگی بھی پیدا ہو گئی تھی اور خوف ذرا کم ہو گیا تھا۔ لیکن انسان تو تھا۔ میری ساخت میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ خوف کے احساس کو ختم تو نہیں

کرسکتا تھا۔ میں نے چاند خان کو بھوریا چرن کی کہانی سنا تو دی تھی لیکن دل اس احساس سے دھڑکتا رہا کہ کہیں وہ کسی مشکل کا شکار نہ ہو جائے' بلکہ مجھے حیرت تھی کہ اب تک ایسا کیوں نہیں ہوا تھا۔ ہاں چاند خان نے مجھے وہ متبرک تعویذ دکھایا تھا اور میرے دل میں عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ آرزو بھی بیدار ہو گئی تھی کہ کاش اس مزار پر مجھے بھی زندگی کی نوید مل جائے ......مگر...... یہ مکڑیاں۔ شاید بھوریا چرن نے مجھے کوئی نئی سزا دینے کے لئے انہیں بھیجا تھا۔

میں دہشت بھری نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ جوں جوں وہ نیچے آ رہی تھیں' میرے دل و دماغ میں وحشت اُترتی آ رہی تھی۔ میں ان ننھی ننھی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ سرخ چمکتی ہوئی آنکھیں جو بھوریا چرن کی آنکھیں تھیں۔ کوئی فرق نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ ان آنکھوں میں نفرت تھی۔ غصہ تھا۔ وہ لاکھوں آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

مکڑیوں نے چھت سے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ کود کر زمین پر آ گئیں۔ کیفیت یہ تھی کہ کمرے کی پوری زمین ان کے منحوس جسموں سے ڈھک گئی تھی۔ تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ یہی نہیں' وہ دیواروں پر چڑھ گئی تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر چڑھ گئی تھیں۔ پردوں پر نظر آ رہی تھیں۔ ان کے ننھے ننھے منے منہ کھل رہے تھے' بند ہو رہے تھے۔ پردوں میں سوراخ ہونے لگے۔ دروازے کی لکڑیاں برادے کی شکل میں بکھرنے لگیں۔ آہ...... وہ ہر شے کو کھا رہی تھیں...... ہر چیز کو چاٹ رہی تھیں اور میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ میری آواز بند ہو گئی تھی۔ میرا بدن ساکت تھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ انہیں ماروں۔ بدن کو جنبش دی لیکن جسم مجھ سے باغی ہو گیا۔ اپنے اعضاء پر میرا قابو نہ رہا۔ مجھے بس سانس لینے کی اجازت تھی۔ سوچنے کی اجازت تھی۔ میں بدن نہیں ہلا سکتا تھا۔ تعویذ سے چاند خان تو بھوریا چرن سے محفوظ تھا' لیکن اس شیطان سادھو کو مجھ پر مکمل اختیار تھا۔ وہ چاہتا تو یہ مکڑیاں دیگر چیزوں کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑتیں۔ مجھے چاٹ جاتیں۔ میرے بدن میں سوراخ کر کے اندر داخل ہو جاتیں۔ میں انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ بھوریا چرن یہ کام کسی بھی وقت کسی بھی شکل میں کرسکتا تھا۔ مگر اسے میری ضرورت تھی۔ وہ مجھے کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچنے دیتا تھا۔

منظر بے حد بھیانک ہو چکا تھا۔ خونی مکڑیاں دروازے' کھڑکیوں کے فریم کھا چکی تھیں۔ پردے چٹ کر چکی تھیں۔ ڈیکوریشن کے لئے جو کچھ رکھا تھا' وہ کھا چکی تھیں۔ دیواروں کا رنگ نگل چکی تھیں۔ یہ کام انہوں نے چند منٹ میں کر ڈالا تھا اور مجھے اپنی مسہری نیچے ڈھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ آہ...... وہ اسے کھا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ میں فرش نشین ہو گیا تھا۔ میرے پلنگ کا بستر' گدا' تکیہ سب ان منحوس مکڑیوں کے پیٹ میں جا چکا تھا اور اب وہ میرے بدن پر رینگ رہی تھیں...... مجھے ان کی سرسراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ میرے پورے جسم پر چھا گئی تھیں۔ میری ناک' میرے منہ' میری پلکوں سے گزر رہی تھیں۔ آہ...... میں چیخ نہیں سکتا تھا۔ میں انہیں خود پر سے جھٹک نہیں سکتا تھا۔ میں بے بس تھا' مفلوج تھا۔ دہشت سے میرا وجود اینٹھ رہا تھا' مگر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ دماغی قوتیں اس سے زیادہ ساتھ کیا دے سکتی ہیں۔ میں پے در پے پیش آنے والے ناقابلِ یقین واقعات سے دوچار ہو کر کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو گیا تھا' لیکن یہ دہشت ناک منظر میرے حواس چھیننے میں کامیاب ہو گیا اور بالآخر خوف کی انتہا نے مجھے اس کربناک ہوش سے نجات دلا دی۔

''ہوش آنے ہی والا ہے۔'' یہ اجنبی آواز تھی۔

''بہت بہت شکریہ حکیم صاحب!''

''نسخہ مطب سے منگوا لینا۔ ترکیب استعمال لکھی ہوگی۔''

''بہت بہتر۔'' دوسری آواز چاند خان کے علاوہ کسی کی نہیں تھی۔ جی چاہا کہ آنکھیں کھولوں' لیکن ایک نشے کی سی کیفیت تھی۔ آنکھیں بند رکھنے میں زیادہ لطف آ رہا تھا۔ مگر بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ صبح ہو چکی تھی اور میری کیفیت کا حال دوسروں کو معلوم ہو چکا تھا۔ چاند خان شاید حکیم صاحب کو باہر چھوڑنے گئے تھے۔ یہ شخص بہت اچھا انسان تھا۔ اس دور میں بے لوث اتنی مدد کون کرتا ہے۔ حالانکہ مجھے کچھ اچھے لوگ ملے تھے۔ ریحانہ بیگم اور سرفراز نے مقدور بھر میرے لئے کیا تھا۔ وہ بے چارے اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے؟ پھر بھی ان کا کیا بہت کچھ تھا۔ مگر ان کے اس کرنے کا جواز تھا۔ وہ میری شرافت سے

متاثر ہوئے تھے۔ جس کے تحت ان کا گھرانہ ایک ایسے سے بچ گیا تھا۔ مگر یہ بھی ان کی نیک دلی تھی ورنہ اس دور میں لوگ کسی کا احسان بھی کہاں یاد رکھتے ہیں۔ وقتی اعتراف اور اس کے بعد اجتناب۔ کون کسی کے جنجال میں پھنسے۔

چاند خان واپس آ گئے۔ رات کے بھیانک واقعات یاد آ گئے تھے۔ پتہ نہیں دوسرے لوگوں کو اس بارے میں کیا معلوم ہے۔ اسی دوران چاند خان کی آواز سنائی دی۔

''چندا!...... آنکھیں کھولو مسعود میاں!'' اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ''کیسی طبیعت ہے اب؟''

''ٹھیک ہوں خان صاحب!''

''چائے منگواؤں تمہارے لئے؟''

''منگوا لیجئے۔'' میں نے کہا اور چاند خان خود ہی اٹھ کر باہر دوڑ گئے۔ خلوص کا وہی عالم نظر آ رہا تھا۔ پتہ نہیں رات کے واقعات ان لوگوں کے سامنے کس شکل میں آئے۔ چاند خان پھر میرے سامنے آ بیٹھے۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میرے کمرے کا کیا حال ہے خان صاحب؟''

''اماں کیا ٹڈی دل گھس آیا تھا کمرے میں؟ ...... کیا ہوا تھا؟ ...... بچپن میں ایک بار ٹڈی دل دیکھا تھا۔ درخت ننگے کر دیئے تھے۔ گھاس پھونس اور پودوں میں ڈنڈیاں رہ گئی تھیں۔ مگر یہ تو ٹڈی دل سے بھی بکٹ کوئی چیز تھی۔ اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ دروازے' کھڑکیاں' دیواروں کا چونا ہر چیز ...... سب کی عقل کھوپڑی سے باہر ہو گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''آہ ...... گویا وہ صرف میرا خواب نہیں تھا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''فضل خان صبح پانچ بجے اٹھنے کے عادی ہیں۔ پورے گھر کا چکر لگانے کی عادت ہے۔ پڑھ کر پھونکتے ہیں۔ تمہارے کمرے کے دروازے سے گزرے تو دروازہ ہی غائب دیکھا۔ ناچ کر رہ گئے۔ اندر گھسے تو واپس نکل بھاگے اور پھر سب کو جگا دیا۔ تمہارا کمرہ ایسے لگ رہا تھا' جیسے کوئی دو سو سال پرانا کھنڈر۔ تمہیں بے ہوشی میں اٹھا کر لایا گیا تھا۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے یہ کیا؟''

''کچھ نشان نہیں ملے خان صاحب؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''وہ مکڑیاں تھیں۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

''مکڑیاں؟'' خان صاحب حیرت سے بولے۔

''لاکھوں مکڑیاں جو چھت پر نمودار ہوئی تھیں اور پھر وہ نیچے اتر کر ہر چیز کھانے لگیں۔ بس انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''باہر کیوں نہ بھاگ آئے چندا!''

''میں مفلوج ہو گیا تھا۔ آواز تک بند ہو گئی تھی۔''

''ہوں ......'' خان صاحب نے گہری سانس لی۔ چائے آ گئی۔ پورا ناشتہ تھا۔ خان صاحب بولے۔

''ڈٹ کر ناشتہ کرو۔ حکیم صاحب نے کسی چیز کا پرہیز نہیں بتایا۔ اس کے بعد دوا کھانی ہو گی۔''

''آپ جانتے ہیں خان صاحب! مجھے دوا کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''چلو چلو ...... ناشتہ کرو۔ ارے لو بھئی کیا تکلف ہے؟''

''جی خان صاحب!'' میں نے کہا اور ناشتہ کرنے لگا۔ خان صاحب خود بھی میرے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے کہا۔ ''کچھ کہنا چاہتا ہوں خان صاحب!''

''ہاں کہو۔''

''میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی خان صاحب! جہاں خدا نے میرا ٹھکانہ بنایا ہوگا۔ آپ نے جو کچھ میرے لئے اور میرے بھائی کے لئے کیا ہے اس کا صلہ میں مر کر بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں اپنے محسن کی زندگی' صحت اور خیریت کا خواہاں ہوں۔ میں نے بتایا تھا کہ حکیم سعد اللہ صرف اس لئے شکار ہوئے کہ......''

''سمجھ گیا...... سمجھ گیا' کیا کہنا چاہتے ہو۔ دو باتیں ہیں میاں مسعود! پہلی بات تو یہ ہے کہ چاند خان برا دھندا کرتے ہیں' مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ ہماری نسل بری نہیں تھی۔ رگوں میں کسی چمار کا خون نہیں ہے۔ باپ دادا آن بان پر مرمٹتے رہے ہیں۔ کچھ تو سرخی ہمارے خون میں بھی ہوگی۔ وہ میاں کا جنا اگر اتنا ہی دلاور تھا تو مکڑیاں ہمیں کھا جاتیں۔ ہم بھی تو دیکھتے۔ اس سے یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ ہمیں مالی نقصان پہنچا سکتا ہے' جانی نہیں اور اس کی ہمیں پروا نہیں۔ ہم نے کون سا محنت سے کمایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے چندا! کہ ہمیں تمہارا نہیں ان ماں باپ کا خیال ہے جو لٹ گئے ہیں۔ ویران ہو گئے ہیں۔ راج دلارے! انسان بڑا کمینہ ہے۔ اسے جو کچھ مل جاتا ہے اسے وہ اپنی عقل کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ دینے والا جانتا ہے کہ وہ کسے کیا اور کیوں دے رہا ہے۔ ہم نے تمہیں رتولی لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ ہمارے لئے بھی ضروری ہے' کیونکہ ہمارے ذریعے کسی کی بہتری ہونے والی ہے۔ اگر ہم نے اس سے منہ موڑا تو ہمارا کیا بنے گا۔ یہ اللہ جانے۔ جو ہوا بھول جاؤ۔ ہم تو یہ تعویذ تمہارے گلے میں ڈال دیتے' مگر منادی ہے اس لئے مجبور ہیں۔''

''خان صاحب! میں......''

''جو بات تھی تمہیں بتا دی دلارے! ہماری حیثیت گھٹانا چاہو تو دوسری بات ہے۔''

''نہیں خان صاحب! خدا نہ کرے۔''

''اور ہاں' سنو اب زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ پرسوں اٹھارہ ہے۔ بس پرسوں نکل چلیں گے۔'' میں خاموش ہو گیا۔

✦✤✦✤✦

ماں باپ بچھڑ گئے تھے۔ بھائی نامعلوم راستوں پر نکل گیا تھا۔ پتا نہیں زندگی میں دوبارہ ملاقات ہو کہ نہ ہو' ابا اور اماں کا کیا حال ہوگا۔ ان کے دونوں بیٹے ان سے چھن گئے تھے۔ ماموں ریاض کے بارے میں یقین تھا کہ وہ انہیں سنبھال لیں گے۔ وہ نہ ہوتے تو باپ کی کمر ٹوٹ ہی گئی تھی۔

خان صاحب دن بھر مصروف رہے تھے۔ مجھے حکیم صاحب کی دی ہوئی دوائیں کھانی پڑی تھیں۔ رات کو خان صاحب واپس آ کر بولے۔ ''کل روانگی ہے مسعود میاں!''

''کل؟''

''ہاں...... کچھ کام تھے جن کی وجہ سے پرسوں کا ارادہ کیا تھا۔ وہ آج ہی ہو گئے اس لئے اب کل چلتے ہیں۔ اللہ کرے علیم الدین میاں جیتے ہوں۔ بڑے اچھے انسان ہیں۔ پہلے ان کے پاس چلیں گے پھر ان کے ساتھ مزار پر چلیں گے۔ تم دیکھ لینا ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔''

''جو حکم خان صاحب!''

رات کو خان صاحب نے کہا۔ ''میرے پاس سونا ہے تمہیں۔ دوسرے کمرے میں نہیں سونے دوں گا۔'' دل کے انتہائی گوشوں سے خان صاحب کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بڑی پُرسکون رات گزری' دل کو بڑی تقویت اور سکون رہا تھا۔

صبح بے حد خوشگوار تھی۔ خان صاحب نے آدمی بھیج کر ریل کے ٹکٹ منگوائے تھے۔ اب میں صرف ان کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ تیاریاں ہی کیا کرنی تھیں۔ دو جوڑے کپڑے خان صاحب کے سوٹ کیس میں رکھے اور دوپہر کو ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ سوچ کے دروازے بند کر لئے تھے۔ اب صرف ایک ہی لگن تھی کسی طرح اس بزرگ ہستی کے حضور پہنچ جاؤں' جس

کے فیض سے میری مشکل حل ہو جائے۔ انتظار کرتے رہے۔ خان صاحب معمولی آدمی نہ تھے۔ جو سامنے سے گزرتا' سلام کرتا گزرتا۔ ریل آ گئی۔ ہمیں بڑے احترام سے ریل میں بٹھایا گیا۔ خان صاحب پان کھانے کے عادی تھے۔ ریل چل پڑی تو پانوں کی ڈبیہ اور بٹوا نکال لیا۔ مسکرا کر بولے۔

''لو چندا! پان کھاؤ۔''

''خان صاحب! میں پان نہیں کھاتا۔''

''اماں کھالو۔ عید بقر عید پر تو سب کھالیا کرتے ہیں۔ اور سنو! ہنسو بری گھڑی گھڑیوں کی مہمان رہ گئی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ان واقعات کو یاد کر کے ہنسا کرو گے۔ مگر چاند خان کو مت بھول جانا اس وقت۔''

میں سسک پڑا اور خان صاحب نے میری گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ ''نہ...... نہ چندا!...... نہ...... مرد کی آنکھوں سے آنسو نہیں' شعلے نکلنے چاہئیں۔ نہ چندا! نہ۔ دشمن بھی مردوں کے ہی ہوتے ہیں۔ مرد ہو' مردوں کی طرح حالات سے مقابلہ کرو۔ بری بات چندا! بری بات۔'' خان صاحب کی محبت بھرے لمس کو محسوس کر کے نہ جانے کیا کیا احساسات جاگ اُٹھے تھے۔

سفر جاری رہا۔ رات ہو گئی۔ خان صاحب کھانا ساتھ لائے تھے۔ دستر خوان کھول کر بیٹھ گئے۔ اصرار کر کے کھاتے اور کھلاتے رہے۔ رات کو بارہ بجے انہوں نے کہا۔

''اب پاؤں پھیلا کر سو جاؤ زنارے! ہم جاگ رہے ہیں۔''

''نہیں خان صاحب! آپ سو جائیے۔''

''میاں! عمر بھر سفر میں نیند نہیں آئی۔ آج کیا خاک آئے گی۔ تم سو جاؤ۔ ہم کہہ رہے ہیں اور پھر ہمارا جاگنا ضروری ہے۔ ساڑھے چار بجے ریل منزل پر پہنچے گی۔ تمہیں تو اندازہ بھی نہ ہو گا۔'' انہوں نے ضد کر کے مجھے لٹا دیا۔ ٹرین کی ردھم خیالات کے ساتھ سفر کرتی رہی اور آنکھوں میں غنودگی گھل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سارے احساسات سو گئے۔

نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی سوتے ہوئے۔ نہ جانے کیا وقت تھا کہ اچانک قیامت ظہور میں آ گئی۔ اتنی تیز روشنی ہوئی کہ بینائی جاتی رہی۔ کوئی آتش فشاں پھٹا تھا یا زلزلہ آیا تھا کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ انسانی شور چاروں طرف سے اُبھر رہا تھا۔ لوگ بھیانک آواز میں چیخ رہے تھے۔ میرا چہرہ بھیگا بھیگا سا لگ رہا تھا۔ گہری نیند سے آنکھ کھل جانے کی وجہ سے سر دکھ رہا تھا۔ دوبارہ سو جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ سب کچھ بھول کر سب کچھ نظر انداز کر کے میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر نہ جانے کب جاگا تھا۔ تیز روشنی ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں میں سے سورج کی شعاعیں اندر آ رہی تھیں۔ گرمی لگ رہی تھی۔ پنکھا بند تھا۔ نہ جانے کیوں تبھی مجھے آواز سنائی دی۔

''رتنا...... او رتنا...... کب تک سوتا رہے گا رے۔ دس بج رہے ہیں رتنا! اُٹھ جا بھئی۔'' نہ جانے کون تھا۔ نہ جانے کسے آواز دے رہا تھا۔ مگر پھر میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت خاتون اندر آ گئیں۔ بھاری بھر کم معمر خاتون تھیں۔ ساڑھی باندھے ہوئے تھیں۔ ماتھے پر بندیا لگی ہوئی تھی۔ عمر چالیس سے اوپر ہی تھی۔ ''رتنا اُٹھ جا بیٹا۔ دیکھ کتنا دن چڑھ چکا ہے۔ اُفوہ...... پسینے میں بھیگ رہا ہے۔ نگوڑ ماری بتی دو گھنٹے سے گئی ہوئی ہے۔ ان بجلی والوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ ارے نکو اُٹھے گا یا نہیں؟'' خاتون نے میرے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور میں دم بخود رہ گیا۔

''رتنا...... میں؟'' میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''پانی لاؤں ٹھنڈا چاچی؟ ...... دو کٹورے بھر ڈال دو۔ نیند ایسے بھاگے گی جیسے ماما جی کے سر سے سینگ۔'' باہر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''رتنا! اُٹھ جا بیٹا۔ اتنی دیر سونا اچھا نہیں ہوتا۔'' عورت نے پھر کہا اور میں جلدی سے اٹھ گیا۔ ''جا' منہ دھو لے۔ میں مالتی سے ناشتہ بھجواتی ہوں۔ اب دوبارہ نہ لٹ جائیو۔'' معمر خاتون واپس مڑیں اور دروازے سے باہر نکل گئیں۔

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟ کیا ہے؟ ...... میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور رتنا

...... یہ عورت مجھے رتنا کیوں کہہ رہی ہے؟...... کیسا عجیب انداز ہے اس کا۔ محبت سے بھرپور' ایسا جیسے مجھے عرصے سے جانتی ہو۔ کون ہے یہ......؟ اور یہ جگہ کون سی ہے؟ یا خدا! یہ خواب ہے یا عالم بیداری۔ ابھی مسہری سے پاؤں لٹکائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ دروازے میں ایک جھری پیدا ہوئی اور ایک روشن چہرے نے اندر جھانکا۔ چمکتا ہوا سفید رنگ' بھورے بال' پُرکشش نقوش' حسین آنکھیں جن میں شوخی تھی۔ پھر ہنسی سنائی دی اور وہ اندر آ گئی۔ ہاتھ میں نقشین مراد آبادی کٹورہ تھا' جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

''رتن مہاراج! صبح ہو گئی۔ یہ میری طرف سے۔'' اس نے کٹورے کا پانی میرے چہرے پر ڈال دیا اور میں اچھل پڑا۔ پانی یخ ٹھنڈا تھا اور میرا چہرہ اور سینہ بھگو گیا تھا۔ میں بھبک کر مسہری سے نیچے آ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی اور غڑاپ سے باہر نکل گئی۔

آہ...... یہ خواب نہیں' حقیقت ہے۔ مگر اب...... اب یہ کیا حقیقت ہے؟ کیا ہو گیا میرے معبود!...... کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے سوچا۔ یوں احمقوں کی طرح کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ باہر نکلوں' کچھ اندازہ تو ہو۔ دروازے سے باہر نکل آیا۔ سامنے صحن تھا۔ باتھ روم کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ قدم اس طرف اٹھ گئے۔ میں اس پرانے طرز کے باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے مگر کپڑے اتارتے ہوئے میں بری طرح اچھل پڑا۔ یہ میرے کپڑے نہیں تھے۔ یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ سلک کا کرتہ' لٹھے کا پاجامہ۔ آہ...... کیا ہو گیا مجھے۔ کیا ہو گیا ہے۔

میں نے پانی کا نل کھول دیا۔ اس کے نیچے بیٹھ گیا۔ میری سوچ پرواز کرنے لگی۔ کب سویا تھا؟ کہاں سویا تھا کہ آنکھ یہاں کھلی۔ ذہن کے پردوں پر مٹے مٹے نقوش اُبھرنے لگے۔ کانوں میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ جو واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ریل کی آواز...... ریل...... چاند خان...... اماں کھا لو۔ عید بقرعید پر تو سب ہی...... سو جاؤ...... سو جاؤ...... چاند خان...... ارے ریل...... چاند خان...... رتولی...... میں وحشت زدہ انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پاگلوں کی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کی' مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ پانی شانے پر گر رہا تھا۔

''کون ہے اندر؟'' باہر سے آواز سنائی دی اور میں دروازے کو دیکھنے لگا۔ ''کون ہے اندر؟'' آواز دوبارہ سنائی دی۔

''میں ہوں مالتی!'' میرے منہ سے نکلا۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا تھا وہ...... وہ آہ! کیا ہے یہ سب کچھ؟''

''نہا رہے ہو رتنا؟'' باہر سے پوچھا گیا۔

''ہاں۔'' میں گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

''دروازہ باہر سے کیوں بند کرایا ہے؟''

''میں نے نہیں کرایا۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''سمجھ گئی۔ شیاما نے شرارت کی ہوگی۔ میں نے کھول دیا ہے۔'' وہی آواز سنائی دی۔ مگر اس بار میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میرا دل' میرا دماغ قابو میں نہیں تھا۔ اندر سے ایک ہی آواز اُبھر رہی تھی۔ پھر کچھ ہو گیا...... پھر کچھ ہو گیا...... میں چاند خان کے ساتھ رتولی نہیں پہنچ سکا اور چاند خان...... وہ نہ جانے کہاں گئے۔ میں ہوش میں ہوں اور نہ جانے کس طرح اس اجنبی جگہ آ گیا ہوں۔ اجنبی جگہ رتنا۔ کیا بے تکا نام ہے۔ آخر یہ لوگ مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہیں؟

''رتنا جی......!'' باہر سے پھر وہی آواز اُبھری اور میں چونک پڑا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ ''رتنا جی! کتنی دیر میں باہر آؤ گے؟'' مجھے بڑی زور سے غصہ آیا تھا مگر...... کیا مجھے غصہ آنا چاہئے؟ کیا میں اس پوزیشن میں ہوں؟

''آ رہا ہوں بس۔''

''ہم نے ناشتہ لگا دیا ہے۔'' باہر سے آواز اُبھری اور میں گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ کوئی پاگل ہے۔ کچھ نہ سوچنے دے گی۔ نکلا جائے مگر دماغ ٹھنڈا رکھنا ہوگا۔ نہ جانے کیا ہوا ہے۔ کیسے ہوا ہے۔ نل بند کر دیا۔ لباس پہنا' بال سنوارے اور

باہر نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں اس کمرے میں نہیں گیا جہاں خود کو سوتے ہوئے پایا تھا بلکہ ایک راہداری سے گزر کر بائیں ہاتھ کے ایک کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل تھی۔ اس پر ناشتے کا سامان سجا ہوا تھا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ناشتہ آگے سرکا لیا مگر...... میں اس کمرے میں کیسے آ گیا؟ میں کیسے جانتا تھا کہ ناشتہ اس کمرے میں لگا ہو گا؟...... میرے قدم اس طرف کیسے اٹھے؟ میں بھٹک کیوں نہ گیا؟...... یہ سب کچھ مجھے اجنبی کیوں نہیں لگ رہا؟...... یہ کیا ہے؟ بھوریا چرن کا کوئی نیا کھیل؟...... دماغ پر سناٹا طاری ہو گیا۔ چاند خان کہاں ہیں؟ ہم دونوں تو ریل میں سفر کر رہے تھے۔ چاند خان جاگ رہے تھے' میں سو رہا تھا۔ پھر وہ خواب جیسی کوئی آواز' تیز روشنی اور پھر میں دوبارہ سو گیا تھا۔ سب کچھ ایک خواب سمجھ کر...... اور اب......ضرور بھوریا چرن کوئی چال چل گیا۔ اس نے مجھے اس مقدس مزار پر نہیں پہنچنے دیا اور اب میں کسی ہندو گھرانے میں تھا اور یہ لوگ مجھے رتنا کہہ کر پکار رہے تھے۔ کون لوگ ہیں یہ؟...... وہ معمر خاتون...... وہ خوبصورت' شریر لڑکی...... آہ' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کسی خطرناک جال میں تو نہیں پھنس گیا......؟ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آنے والی؟ ......نہیں...... ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہو گا۔ حالات کا جائزہ لینا ہو گا۔

''چائے واپس لے گئی تھی۔ سوچا ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اب گرم کر کے لائی ہوں۔ ارے تم نے ناشتہ بھی شروع نہیں کیا۔ ابھی تک سو ہی رہے ہو کیا؟'' نوجوان عورت تھی۔ کالا رنگ تھا' مگر نقوش برے نہیں تھے۔ ''رتنا جی! ناشتہ کرو۔''

''کر رہا ہوں مالتی!'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور ایک بار پھر دل میں چونک پڑا۔ میں اتنے اعتماد سے مالتی کیوں کہہ رہا ہوں؟ کیسے جانتا ہوں کہ یہ مالتی ہے؟''

''کچھ اور لائیں تمہارے لئے؟''

''نہیں۔''

''لالہ سریش چندر جی آئے ہیں۔ گڑ کے شیرے ہیں نرے۔ چپک جائیں تو چھٹنے کا نام نہ لیں۔ بے چاری رما رانی ان کے سامنے جا پھنسی ہیں۔ اب کوئی کیسے نکالے انہیں؟''

''ہوں۔''

''ہم کہیں انہیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے اور...... ارے کچھ اور لائیں تمہارے لئے۔'' مالتی بھی جنونی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ کم بخت کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ بولے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں اور مالتی کی آواز بند ہو گئی۔ کتا بری طرح بھونک رہا تھا۔ مالتی نے پریشانی سے کہا۔

''یہ کتا کہاں سے گھس آیا؟''

''دیکھو باہر جا کر۔'' میں نے کہا۔

''ارے ہم دیکھیں؟ نہ رتنا جی!...... کتے سے ہماری جان نکلے ہے۔ دروازہ بند کئے دیں ہیں ہم۔ کہیں پاپی ادھر ہی نہ گھس آئے۔'' مالتی نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں ناشتے میں مصروف رہا۔ کتا خاموش ہو گیا تھا۔ مگر کچھ دیر کے بعد ایک تیز آواز سنائی دی۔

''مالتی!...... اری او مالتی! کہاں مر گئی؟'' مالتی اُچھل پڑی۔

''لو شروع ہو گئیں آوازیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''آئی رما رانی!...... وہ کتا......''

''یہ کشنا کہاں چھپی ہے؟...... اسے تلاش کر۔ آج یہ نہیں ہے یا میں۔ آخر یہ کرنا کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچا ہے اس نے۔ ارے ہمارے کام کے آدمی ہیں۔ ہزاروں کام نکلتے ہیں ان سے اور یہ ہے کہ......'' رما رانی اندر داخل ہو گئیں۔ یہ وہی معمر خاتون تھیں۔ رما رانی...... میں نے سوچا...... معمر خاتون اندر گھس آئیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور بولیں۔ ''رتنا! وہ یہاں تو نہیں آئی؟''

''نہیں چاچی!'' میں نے کہا۔

"جائے گی کہاں ...... آج چھوڑوں گی نہیں اسے۔" رمارانی باہر نکل گئیں۔ میری کیفیت اب کسی قدر بحال ہو گئی تھی۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اب دیوانگی سے کیا حاصل؟ سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی اور کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر اٹھا ہی تھا کہ وہی شوخ لڑکی اندر گھس آئی اور میری کمر پکڑ کر میرے پیچھے آ گئی۔

"آج بچا لیں رتنا جی! بس آج بچا لیں۔ بھگوان کے لئے۔ وعدہ کرتی ہوں' آگے کچھ نہیں کروں گی۔"

"ارے' ارے ...... میری کمر تو چھوڑو۔"

"کپڑے دھونے کی موگری ہاتھ آ گئی ہے۔ ایک بھی پڑ گئی تو اپنے جل ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ سچ مچ غصے میں ہیں۔ مار دیں گی۔"

"کون؟"

"چاچی۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"ارے بھگوان ان کا ناس کرے۔ کھٹیا کھڑی ہو ان کی۔ وہی آ مرے تھے' سریش چندر جی۔ آتے ہیں تو جاتے نہیں ہیں۔ سارا سارا دن اینڈتے رہتے ہیں یہاں اور ہم سب پر کرفیو لگ جاتا ہے۔ خاموش رہو ...... ہنسو بھی نہیں ...... اور سامنے آ جاؤ تو ایسے گھورتے ہیں جیسے گنڈیری نظر آ گئی ہو۔"

"پھر تم نے کیا' کیا؟"

"کتے سے جان نکلتی ہے ان کی۔ سنا ہے اٹھائیس انجکشن لگوا چکے ہیں۔ دو بار کتوں نے کاٹا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کندنی رنگ پر پسینے کے قطرے بے حد بھلے لگ رہے تھے۔ بے اختیار ہنستی رہی۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ بولی۔ "کتے کی آواز کا ریکارڈ لگا دیا تھا میں نے اور آواز تیز کھول دی تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر بے اختیار ہنسنے لگی تھی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ ریکارڈ میں انہی کے لئے لائی تھی۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ چاچی پکارتی رہ گئیں۔"

"تم نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا تھا؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اب جو ایسے کروں تو اتنی بڑی مر جاؤں۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ارے ادھر ہی آ رہی ہیں۔"

یہ تھا میرا نیا ٹھکانہ ...... مگر میں یہاں کیسے آ گیا ......؟ یہ لوگ مجھے رتنا کہہ کر کیوں پکارتے ہیں ......؟ میں ان کا شناسا کیسے ہوں؟ ...... بار بار تو ایک جیسے واقعات نہیں ہوتے۔ اگر سرفراز کا ہم شکل نکل آیا تھا تو کسی رتنا یا رتن کا ہم شکل تو نہیں ہو سکتا تھا ...... پھر یہ سب کچھ ...... آخر فیصلہ کیا کہ جو کچھ بھی ہے' صبر و سکون سے برداشت کروں۔ انتظار کروں کہ صورتحال معلوم ہو جائے۔ یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ میں رتولی نہیں پہنچ سکا۔ اب بھوریا چرن کوئی اور چال چل گیا۔ مگر اس نے اس بار کیا' کیا ہے؟ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے چاند خان کہاں گئے؟

رتنا ہی بن گیا۔ اپنی کیفیت پر البتہ سخت حیران تھا۔ مجھے اس گھر کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ میرا کمرہ کون سا ہے؟ عورت کو میں چاچی کہہ کر پکار رہا تھا۔ ایک اور نوجوان لڑکی سامنے آئی تو میں نے اسے رادھا کہا اور اس نے جواب بھی دیا۔ آہ ...... اس طلسمی کیفیت کا کوئی جواز نہیں تھا میرے پاس۔

دن بھر کوئی کام نہ کرنا پڑا۔ عجیب سا گھرانہ تھا۔ دو تین بار مردوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ البتہ رات ہوئی تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ قرب و جوار کی ساری عمارتیں جگمگا اٹھیں اور ہر طرف سے طبلہ' سارنگی اور ہارمونیم کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ یہ ناچنے گانے والوں کا علاقہ تھا اور رمارانی بھی انہی میں سے ایک تھیں ...... خدا تجھے فنا کر دے بھوریا چرن! ...... یہ کہاں لا پھینکا تو نے مجھے اس غلاظت خانے میں ...... دل بری طرح دکھنے لگا۔ کیا کروں؟ کیا یہاں پڑا رہوں؟ ...... یہاں ...... کشنا یاد آئی۔ معصوم' شوخ' الہڑ لڑکی۔ رادھا اس کی ہم شکل تھی۔ اور یہ سب ناچ گانے کا کاروبار کرتی تھیں۔ اس کا

عملی تجربہ بھی ہو گیا۔ شام سے پہلے اس گھر کی حقیقت نہیں کھلی تھی' لیکن جونہی شام ہوئی' ماحول بدل گیا۔ پاکیزگی گندگی میں تبدیل ہونے لگی۔ رادھا' کاشی اور شوخ و شریر کشنا رنگ بدلنے لگیں۔ زرق برق لباس' چہروں پر مصنوعی اشیاء کا نکھار اور پھر وسیع و عریض کمرہ' سفید براق چاندنیاں' طبلہ' سارنگی' ہارمونیم' ان کے عقب میں نکیلی مونچھوں والے سازندے...... سازوں کے سُر درست کرتے ہوئے۔

میں پابہ زنجیر نہیں تھا۔ یہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ لیکن کہاں؟...... ہر جگہ موت اور تباہی۔ کہیں امان نہیں تھی۔ بے بسی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدایا!...... یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ایسی جگہ بھی رزق لکھا تھا۔ خان صاحب یاد آئے...... میرے چاند! مرد کی آنکھوں میں آنسو نہیں شعلے نظر آنے چاہئیں۔ آہ' خان صاحب! یہ شعلے مجھے بھسم کر سکتے ہیں...... میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

''رتن جی!...... اے رتن جی!'' مالتی کی آواز سنائی دی اور وہ سامنے آ گئی۔

''کیا ہے مالتی؟''

''ہار نہیں لائے ابھی تک؟''

''ہار......؟''

''تیار کر رکھے ہوں گے رحیم خان نے۔ جاؤ' لے آؤ'' رما رانی کہہ رہی تھی۔ ''ذرا جلدی جاؤ۔ مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں اور ہاں' ذرا دیکھ کر لینا۔ رحیم خان سے کہنا اصلی چنبیلی لگایا کرے۔ بیچ میں سدا بہار ڈال دیتا ہے' لو پیسے رکھ لو۔'' مالتی نے سو روپے میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے علم تھا کہ زینہ کہاں ہے؟ ہار کہاں سے لانے ہیں؟ کیسے؟ آخر کیسے؟

سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔ بازار کی رونق عروج پر تھی۔ ''تر گلاب' موتیا' کڑاکڑ بول رہی ہیں ریوڑیاں...... لیلیٰ کی انگلیاں...... مجنوں کی پسلیاں......'' کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ زیادہ تر پان والوں' پھول والوں اور عطر فروشوں کی دکانیں تھیں۔ بلندیوں سے طبلے ٹھونکنے کی آوازیں' ہارمونیم کی ریں ریں کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ دکانوں پر بورڈ لگے ہوئے تھے۔ دور سے عبدالرحیم گل فروش کا بورڈ نظر آ گیا اور میں اسی طرف چل پڑا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟

''آؤ رتنا! بڑی دیر میں آئے آج۔'' عمر رسیدہ مگر کلف لگی نوکیلی مونچھوں والے رحیم خان نے ایک بڑا سا ہاروں کا پڑا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بیس ہیں پورے۔ گنتا تو نہیں ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے پھنسے پھنسے لہجے میں کہا اور سو روپے کا نوٹ رحیم خان کی طرف بڑھا دیا۔

''کل تم بیس روپے ہی چھوڑ گئے۔ میں نے آواز لگائی مگر تم نے سنا ہی نہیں۔''

''کل......'' میرا دل لرز گیا۔

''ہاں میاں! یہ بیس روپے کل کے اور بیس یہ لو۔ چالیس ہو گئے نا؟''

''ہاں...... رحیم خان! کل بھی میں ہی آیا تھا ہار لینے؟'' میں نے بمشکل پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' رحیم خان بولے۔

''کل میں ہی ہار لے گیا تھا نا؟''

''تو اور کون لے جاتا۔ کل تو کچھ ترنگ میں تھے پیارے!'' رحیم خان ایک آنکھ دبا کر مسکرائے۔

''کب سے لے جاتا ہوں میں یہ ہار؟''

''مہینوں ہو گئے۔ مگر بات کیا ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ پچھلے ہفتے سے کچھ کھوئے کھوئے سے ہو۔''

''میرے خدا!...... میرے خدا!......'' میرے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی اور رحیم خان چونک پڑے۔ وہ پھٹی پھٹی

آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ بولے۔

"کچھ نہیں۔" میں واپس چل پڑا۔ رحیم خان کی آواز کانوں میں گرم گرم سیسے کی طرح اُتر رہی تھی۔ "مہینوں سے...... مہینوں سے......" کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں مہینوں سے یہاں ہوں مہینوں سے...... مگر کیسے......؟ یہ میں ہی ہوں' کوئی اور نہیں ہے۔ مگر میں تو پچھلی رات میں چاند خان کے ساتھ ریل میں سفر کر رہا تھا۔ پھر میں مہینوں سے یہاں کیسے ہوں؟ یہ ماحول' یہ لوگ' یہ سب کچھ جانا پہچانا کیوں ہے؟ کیا ہوا ہے آخر میرے ساتھ؟ کیا ہوا ہے؟"

راستہ تک نہیں بھولا تھا۔ بے خیالی کے عالم میں آیا تھا' مگر انہی سیڑھیوں سے اوپر پہنچا تھا' جن سے اتر کر گیا تھا۔ حالانکہ ساری سیڑھیاں ایک جیسی تھیں۔ یہ تمام باتیں ذہن خراب کر رہی تھیں۔ اتنا اندازہ تو میں نے لگا لیا تھا کہ یہ سب کچھ بھوریا چرن نے کیا ہے۔ لیکن کیا' کیا ہے؟ یہ جاننا ضروری تھا۔ مالتی ہار لینے کے لئے کھڑی تھی۔ جلدی سے ہاروں کا پڑا لے کر چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم خان نے کہا تھا کہ مہینوں سے میں اس سے ہار لے جاتا ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ وہی کچھ ہم شکل والا معاملہ ہو سکتا ہے۔ رتنا نامی کوئی شخص میرا ہم شکل ہوگا' لیکن اتنے سارے ہم شکل؟ ...... ہر جگہ میرا ایک ہم شکل موجود ہے۔

مالتی آ گئی' بولی۔ "اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو رتنا جی......؟ بتی جلا دوں؟"

"رہنے دو مالتی اندھیرا اچھا لگ رہا ہے۔"

"کچھ چاہئے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں...... آؤ بیٹھو۔"

"اندھیرے میں......؟ نہ بابا! نہ ہمیں اندھیرا نہ اچھا لگے۔"

"تمہیں کوئی کام تو نہیں ہے؟"

"اسی وقت تو فرصت ملے ہے۔ اب بارہ بجے مہمان چلے جائیں گے تو بڑا کمرہ صاف کر کے سوئیں گے۔"

"روشنی جلا دو اور بیٹھو۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" مالتی نے لائٹ جلا دی اور پھر نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

"مالتی! آج کیا تاریخ ہے؟"

"انیس۔"

"مہینہ کون سا ہے......؟ معلوم ہے؟"

"ستمبر۔"

"ہیں......؟" میں اچھل پڑا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے؟"

"کا ہے رتنا جی؟"

"آج انیس ستمبر ہے؟"

"تو اور کیا؟"

"اوہ میرے خدا! ...... میرے خدا!" میرے منہ سے سرگوشی میں نکلا۔ میرے ہوش و حواس درست تھے۔ پاگل نہیں ہوا تھا' لیکن یہ مالتی کیا کہہ رہی تھی۔ یہ ستمبر کا نہیں' مارچ کا مہینہ تھا۔ چاند خان کا پہلے اٹھارہ مارچ کو رتولی جانے کا ارادہ تھا' لیکن اپنا کوئی کام ہونے کی وجہ سے وہ سترہ مارچ ہی کو رتولی چل پڑے تھے اور اس بات کو پانچ ماہ گزر گئے تھے۔ پانچ ماہ...... اگر یہ واقعی ستمبر کا مہینہ ہے تو میرے یہ پانچ ماہ کہاں کھو گئے؟

"مالتی! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ وعدہ کرو کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ بولو! وعدہ کرو گی مالتی؟"

''شکنتا کے بارے میں پوچھو گے؟''

''شکنتا؟''

''ہاں رتن جی!......شکنتا کے بارے میں بات کرو گے تو ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ رمارانی ہمارا سر گنجا کر دیں گی۔ پہلے بھی تمہاری وجہ سے پٹ چکے ہیں۔''

''شکنتا کون ہے؟''

''جانتے ہیں۔ آ گئے نا اسی پر۔ ارے ہاں' ہمیں سب پتہ ہے۔ سب ہمارے ہی دشمن ہیں۔''

''نہیں...... میں شکنتا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''لو...... پوچھے جا رہے ہو اور کہتے ہو نہیں پوچھوں گا۔ ویسے ہماری مانو تو رتن جی! شکنتا کے پھیر میں مت پڑو۔ وہ تم سے زیادہ پاگل ہے۔ تمہیں بھی بیچ چوراہے پر مروا دے گی۔''

''تم مجھے کب سے جانتی ہو مالتی؟''

''تمہیں......؟ جب سے تم یہاں آئے ہو۔''

''میں کب یہاں آیا تھا؟''

''ہولی جلی تھی جب تم یہاں آئے تھے۔ ٹھہرو' بتاتی ہوں۔'' وہ انگلیوں پر حساب لگانے لگی' پھر بولی۔

''پورے پانچ مہینے ہو گئے۔''

''پانچ مہینے سے میں یہاں ہوں؟''

''[illegible]''

''کب سے آیا تھا میں؟''

''انجنا پور گئی تھیں رمارانی سنکھ یاترا کو۔ وہیں تم کاشوکا کے مندر کنارے دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ رمارانی کو دیکھا تو ماں کہہ کر ان سے لپٹ گئے۔ جمعہ استاد نے تو لٹھ ہی دے مارا ہوتا تمہارے سر پر' مگر رمارانی کو اپنا رتن یاد آ گیا۔ جیتا ہوتا تو تمہارے برابر ہوتا۔ انہوں نے جمعہ استاد کو روکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ تم باؤلے ہو اور سچ مچ تم تھے بھی نرے باؤلے۔ نہ کھانے کا ہوش' نہ پینے کا۔ رمارانی کو رتن یاد نہ آتا تو بھلا تم یہاں لائے جاتے؟ مگر ان کے من میں ممتا کی گنگا بہنے لگی تھی۔ وہیں تو مرا تھا ان کا رتن۔ میرا مطلب ہے انجنا پور۔ گاڑی کے نیچے آ گیا تھا اور پھر رمارانی انجنا پور ہی میں اس کی ارتھ جلا کر آئی تھیں۔ مہینوں باؤلی رہی تھیں اس کے لئے۔ حالانکہ تم جانتے ہو رتن جی! ان جگہوں پر بیٹوں سے زیادہ پیار نہیں کیا جاتا۔ مگر اکیلے جو تھے رمارانی کے۔ تینوں لڑکیاں رمارانی کی بڑی بہن اوما رانی کی ہیں۔ چچی کہتی ہیں بچپن سے' مگر یہ سب کیوں پوچھے جا رہے ہو؟''

''تو میں رمارانی کا رتن نہیں ہوں۔'' میں نے کہا اور مالتی ہنس پڑی۔ ''بڑی سادہ سی عورت تھی۔ کہنے لگی۔

''لو...... جب رتن مر ہی گیا تو تم بھلا کیسے ان کے رتن ہو سکتے ہو......؟ مگر انہوں نے تمہارا نام رتن ہی رکھ ڈالا اور بڑے پیار سے تمہیں رتنا' رتنا کہتی ہیں۔''

''اور جب سے میں انہی کے پاس ہوں۔ مگر میں نے رمارانی کو اپنا نام نہیں بتایا تھا کیا؟''

مالتی پھر ہنس پڑی اور بولی۔ ''بتاتے کیسے......؟ منہ سے رال بہتی تھی۔ ہر وقت ناک بہتی رہتی تھی۔ کھانے پینے کا شوق نہیں تھا۔ مہینوں کے بعد تو بولے ہو۔ ورنہ پہلے ہم تمہیں گونگا ہی سمجھتے تھے۔ ویسے وید جی کے علاج نے تمہیں بڑا فائدہ دیا۔ مگر تم باؤلے کیسے ہو گئے تھے رتن جی؟''

میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا' جو انکشاف مجھ پر ہوا تھا وہ بہت سی حقیقتوں سے روشناس کرا رہا تھا۔ مگر یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ پانچ مہینے کھو گئے تھے میرے۔ پورے پانچ مہینے کیسے؟......آخر کیسے؟......کیا چکر چلایا تھا

اس خبیث بھوریا چرن نے؟ اس بار کیا چکر چلا دیا تھا۔ چاند خان صاحب کو تو وہ اس بزرگ کے دیئے ہوئے تعویذ کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا تھا' لیکن راستہ ضرور روکا ہوگا اس نے میرا اور کامیاب ہو گیا کمبخت۔ خدا اسے غارت کرے۔ پتہ نہیں بیچارے چاند خان پر کیا گزری ہوگی۔ کہاں کہاں مجھے تلاش کرتے پھرے ہوں گے۔ مگر میں پاگل کیسے ہو گیا؟...... بڑی اُلجھنیں باقی تھیں ابھی' لیکن کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں کسی رتن کا ہم شکل نہیں بلکہ دماغی خرابی ہوگئی تھی میرے اندر اور بھٹکتا پھر رہا تھا کہ رما رانی مجھے یہاں لے آئی۔ مگر میری دیوانگی کی وجہ کیا تھی؟ ایک سوال اور کیا میں نے مالتی سے۔

''مالتی! تمہارے اس شہر کا نام کیا ہے؟''

''ارے یہ بھی نہیں یاد تمہیں؟''

''بتا دو مالتی!...... بہت سی باتیں مجھے یاد نہیں۔''

''اب ہمیں باؤلا کر دو گے تم۔ شکتی نگر کا نام نہیں جانتے تم؟'' اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ تو وہی جگہ تھی جہاں چاند خان رہتے تھے۔ شکتی نگر۔

''یہ شکتی نگر ہی ہے نا؟'' میں نے بے یقینی کے انداز میں مالتی سے پوچھا۔

''باؤلا کر کے چھوڑو گے۔ لو ہم نہیں بیٹھتے تمہارے پاس۔ جا رہے ہیں۔ جسے دیکھو ہمارا مذاق اُڑا وے ہے۔'' وہ اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بھوریا چرن ...... صرف بھوریا چرن۔ بھلا اور کون ہو سکتا ہے ان واقعات کے پیچھے۔ مگر چاند خان صاحب آہ ...... اگر یہ شکتی نگر ہی ہے تو پھر مجھے فوراً چاند خان صاحب سے ملنا چاہئے۔ ان کی خبر لینی چاہئے۔ بے چارے تھک ہار کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ نجانے کس طرح مجھے ان سے الگ کر دیا گیا ہوگا۔

دل بے چین ہونے لگا۔ جی تو چاہا اسی وقت باہر نکل جاؤں۔ رستے تلاش کر ہی لوں گا۔ ویسے بھی شکتی نگر کے ان علاقوں سے اجنبی نہیں تھا جہاں چاند خان صاحب رہتے تھے۔ باہر نکلوں گا تو پتہ چل ہی جائے گا۔ اس دوران بھی اس طرف نہیں آنا ہوا تھا اور آنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

رات نجانے کس طرح گزاری۔ بارہ بجے کے بعد اس علاقے میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا اور ویسے بھی بس یہی لمحات ہوا کرتے تھے یہاں زندگی کے۔ مجھے اب پوری طرح یہ احساس ہو گیا تھا کہ بہت سی باتیں میری شناسا کیوں ہیں؟ لیکن یہ پانچ مہینے میری نگاہوں سے اوجھل کیسے رہے؟ روز اول ہی مجھے کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ میں کسی اجنبی جگہ آ گیا ہوں۔ مالتی کہتی تھی کہ میں پاگل ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ مگر ان پانچ مہینوں نے مجھے فائدہ بھی پہنچایا تھا۔ پولیس کی نگاہوں سے پانچ مہینے تک دور رہا تھا اور اب شاید میری تلاش میں اس قدر شدت بھی نہ رہ گئی ہو۔ آہ ...... خدا کرے چاند خان صاحب مل جائیں تو ...... تو ایک بار پھر ان سے درخواست کروں کہ مجھے رتولی لے جائیں۔ وہ کمبخت بھوریا چرن کب تک میرا راستہ روکے گا۔

رات ہی کو میں نے اپنے دل میں کچھ اور فیصلے بھی کئے تھے۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ میں پانچ ماہ تک ذہنی عدم توازن کا شکار رہا تھا اور یہ وقت عالم دیوانگی میں گزرا ہوگا' لیکن یہ بھی بڑی اچھی بات تھی۔ رما رانی نے یہ سب کچھ کیا تھا میرے لئے۔ بے لوث' بے غرض۔ وہ جو کچھ بھی تھیں' ماں کا جذبہ اُبھرا تھا ان کے دل میں۔ جانور تک اس جذبے میں کھوٹ نہیں رکھتے' وہ تو انسان تھیں۔ چنانچہ اب کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی جس سے پرہیز کرتا۔ اگر مجبوری ہی ہوئی تو کچھ وقت اور یہاں گزاروں گا اور ایک بار پھر خود کو حالات سے لڑنے کے لئے تیار کروں گا۔ ہاں' اگر تقدیر ساتھ دے اور چاند خان بددل نہ ہو گئے ہوں تو ایک بار پھر ان کے ساتھ بزرگ کے مزار پر جانے کی کوشش کروں گا۔

نہ جانے رات کے کون سے حصے میں نیند آ گئی تھی۔ مگر صبح جلدی جاگ گیا تھا اور جاگنے کی وجہ وہ سنگترہ تھا جو کھلی کھڑکی کے راستے اندر آیا تھا اور زور سے میرے سینے پر پڑا تھا۔ آنکھ کھلی تو چوٹ کا احساس ہوا۔ ٹٹول کر دیکھا تو سنگترہ ہاتھ لگا۔ یہاں تو ہر چیز سے خوف کھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سنگترہ پکڑے اُٹھ گیا۔ خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کھلی کھڑکی نظر آئی اور قدم اس طرف بڑھ گئے۔ کھڑکی کے آگے گلی تھی اور گلی کے دوسری طرف ایک عمارت اور عمارت میں اس جیسی ہی کھڑکی

اور کھڑکی میں ایک سفید ساڑھی۔ سفید چہرہ، گھٹاؤں جیسے بے پناہ بال جو پیچھے نہ جانے کہاں تک چلے گئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔ مجھے ہی مخاطب کیا گیا تھا اور ہندو طریقے سے مجھے یہ سلام کیا گیا تھا۔ مگر مجھے کیوں؟

اسی وقت عقب سے دروازہ پیٹا جانے لگا اور میں اچھل پڑا۔ دروازہ جس زور سے پیٹا جا رہا تھا اس میں بڑا ہیجانی انداز تھا۔ آہ..... شاید پھر کوئی مصیبت آ گئی۔ پھر کوئی نیا کھیل۔ سامنے والی لڑکی کچھ اشارے کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آخر میں وحشت زدہ انداز میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر دروازہ کھول دیا۔ کشنا تھی۔ دُھلی دُھلی نکھری کشنا۔

''دروازہ کیوں بند کیا تھا؟'' وہ غرائی۔ میں منہ کھول کر رہ گیا۔ ''بولو..... دروازہ کیوں بند کیا تھا؟''

''ک ک..... کیا ہو گیا؟'' میرے منہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔

''اندھے ہیں نا ہم سب..... کیوں، اندھے ہیں؟'' وہ مجھے دھکا دے کر اندر گھس آئی۔ بری طرح بھنائی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ بولی۔ ''کیا پھینکا تھا اس نے؟..... بتاؤ، کیا چیز نشانہ باندھ کر پھینکی تھی؟''

''یہ.....'' میں نے سنگترہ سامنے کر دیا۔

''سنگترہ۔'' اس نے میرے ہاتھ سے چھین لیا، پھر غرائی۔ ''تو یہ ہوتا ہے صبح ہی صبح۔ یوں جگایا جاتا ہے راج کمار جی کو اور راج کمار جی اب دروازہ بند اور کھڑکی کھلی چھوڑ کر سوتے ہیں۔ ارے تم پاگل ہو..... پاگل ہو تم۔ سارے کھیل اچھی طرح جانتے ہو اور بنے ہو پاگل۔ میں بتاؤں، پاگل چاچی ہے، سمجھے؟ پاگل ہم سب ہیں۔ تم ٹھیک ہو..... بالکل ٹھیک۔''

''م..... میں..... میں.....'' میرے حلق سے بمشکل نکلا۔

''چلو پھینکو اسے گلی میں۔ میرے سامنے پھینکو۔'' وہ مجھ پر جھپٹی اور میں کھڑکی کی طرف دوڑا۔ میں نے سنگترہ گلی میں پھینک دیا۔ سامنے والی کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔ کشنا میرے پیچھے تھی اور میں ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ اضطرابی انداز میں ہی ہوا تھا۔ دراصل سو کر جاگا تھا۔ حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ پھر جس ذہنی بحران سے گزر رہا تھا، اس میں قوت ارادی کچھ نہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ کشنا نے جو رویہ اختیار کیا تھا، اس سے مرعوب ہو گیا اور اسی کیفیت نے میری دیوانگی کا بھرم رکھ لیا۔ مگر یہ کشنا صاحبہ! ان کا انداز کیا کہہ رہا ہے؟ وہ اب بھی شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں کھولی تھی تم نے کھڑکی؟''

''میں نے نہیں کھولی تھی۔''

''ہوا سے کھل گئی ہو گی۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ہاں..... شاید۔''

''آنکھیں پھوڑ دوں گی تمہاری۔ ٹینٹوا دبا دوں گی سمجھے۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ رما رانی اچانک کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے شاید کشنا کے آخری الفاظ سن لئے تھے۔

''کیا ہوا؟..... کیا بات ہے کشنا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ جھٹکے دار لہجے میں بولی اور پلٹ کر جانے لگی۔ رما رانی نے اس کی آستین پکڑ لی تھی۔

''یہ تو مجھ سے بات کر رہی ہے۔ دماغ میں خشکی ہو گئی ہے کیا؟''

''وہ..... وہ شکنتا کیا سمجھتی ہے خود کو؟ بہت خوب صورت ہے وہ؟ سب کو پاگل بنا سکتی ہے؟ اس بے چارے پاگل کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟ اور یہ اس کے ایک اشارے پر کیسے ہوش میں آ جاتا ہے۔ اس کا ہر اشارہ کیسے سمجھ لیتا ہے۔ وہ سنگترہ پھینک کر اسے جگاتی ہے اور یہ کھڑکی پر پہنچ کر اس کے درشن کرتا ہے۔ پوجا کرتا ہے اس کی اور ہم اسے پاگل سمجھتے ہیں۔'' کشنا کا لہجہ عجیب تھا۔

✦✤✦✤✦

رما رانی نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر کشنا کی طرف اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔
''پاگل تو تم بھی ہو کشنا! کیا تم پاگل نہیں ہو؟'' کشنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رما رانی پھر بولیں۔ ''یہ کون سی جگہ ہے کشنا! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم نہ جانے کہاں کی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس میں یہ کوئی معیوب بات ہے......؟ منع کر سکتے ہیں ہم کسی کو......؟ لوگ ہم پر ہنسیں گے نہیں؟ جو کچھ وہ کہیں گے' اس کا اندازہ ہے تمہیں؟''
''وہ اور بات ہے چاچی!...... پر یہ ہمارا رتنا ہے۔''
''یہ...... یہ ہمارا کہاں ہے کشنا؟...... یہ ہمارا تو نہیں ہے۔ ترویدی جی کی بات بھول گئیں؟ کہتے تھے اپنا ماضی بھول گیا ہے۔ اسے ماضی یاد آیا تو ہمیں بھول جائے گا۔ روک سکو گی اسے؟...... رہ سکے گا یہ اس اجنبی ماحول میں؟...... اور اسے تم شکنجوں میں جکڑنا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہمارا ہے نہ شکنتا کا اور...... اور...... پھر کیوں دوسروں سے لڑتی ہو؟ جاؤ کشنا! ہوش سے کام کرو۔ مہمانوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔''
کشنا نے کچھ کہنا چاہا' مگر کہہ نہ سکی۔ ایک لمحے رکی' مجھے گھورا' پھر باہر نکل گئی۔ رما رانی خاموشی سے کھڑی مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کے چہرے پر غم کے تاثرات نظر آ رہے تھے' مگر وہ آگے بڑھ کر میرے سامنے آ گئیں۔
''کیوں رتنا!...... ٹھیک کہا نا میں نے؟...... تو ٹھیک ہو جائے گا' چلا جائے گا یہاں سے۔ ٹھیک ہوا تو سوچے گا کیسی بری جگہ آ گیا تھا۔ مگر میں تجھے اور کہاں لے جاتی رے؟...... ماں کہہ کر لپٹ گیا تھا تو مجھ سے۔ ارے باؤلے اماں کہہ کر تو کسی پتھر کی مورتی سے بھی لپٹ جاتا تو اس کی چھاتی دھڑک اٹھتی۔ میں تو گوشت پوست کی بنی ہوں۔ کیا کرتی اس سے۔ تیرے ساتھ دیوانی ہو گئی تھی۔ مگر یہ جگہ غلط ہے۔ ہم وہ نہیں جو دوسرے ہوتے ہیں۔ میں کیا کروں......؟ ہم تو وہ ہوتے ہیں جو پیدا ہوتے ہی برے کہلاتے ہیں۔ ہمیں ماں کہنا گناہ ہے۔ گناہ بن جاتا ہے کہنے والے کے لئے۔ ڈاکو کے گھر ڈاکو پیدا ہو جائے' شریف بن سکتا ہے۔ مگر یہاں تجھے جونہی ہوش آیا' یہاں سے چلا جائے گا...... تماشبین بن کر تو یہاں ہر کوئی آ سکتا ہے' بیٹا یا بھائی بن کر نہیں۔''
میں سکتے کے عالم میں تھا۔ یہ الفاظ میرے دل کو چھو رہے تھے۔ کتنا کرب تھا ان میں۔ کتنی انوکھی سچائی تھی۔
''دھت تیرے کی' باؤلوں کے ساتھ میں بھی باؤلی بن گئی۔ چل' منہ دھو' ناشتہ کر لے۔ مالتی...... ! اری او مالتی!...... رتنا جاگ گیا ہے۔ چل ناشتہ بنا اس کے لئے...... جا رتنا! منہ دھو لے۔''
رما رانی باہر نکل گئیں۔ میں ٹھنڈی آہ بھر کر کمرے سے باہر آیا اور غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ ناشتہ بڑی بے دلی سے کیا تھا۔ دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ رما رانی کے الفاظ نے دکھی کر دیا تھا۔ کبھی خواب میں بھی اس ماحول کو نہیں دیکھا تھا۔ ابتداء میں دوسرے برے راستے اختیار کئے تھے۔ یعنی ریس' سٹہ اور جواء وغیرہ۔ لیکن شناساؤں میں بھی کوئی ان راستوں کا راہی نہیں تھا۔ البتہ اگر ان ناچنے گانے والیوں کے بارے میں سنا تھا تو بہت برے انداز میں' لیکن ان کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ جواب میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں تو خود ہی اپنا نہیں رہا ہوں۔ کسی اور کا کہاں ہو سکتا ہوں؟...... مگر یہ شکنتا کون ہے؟...... کیسی عجیب تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے میری اس سے بھی شناسائی رہی ہو۔
ناممکن تو نہیں تھا...... پورے پانچ ماہ کا معاملہ تھا۔ کس کس سے' کیا رابطے تھے' کون جانتا تھا۔ چاند خان سے ملنے کے لئے دل بے تاب تھا۔ وہ مل جائیں تو کچھ ہمت بندھے۔ پتہ تو چلے کہ کیا ہوا تھا۔ یہ تو آسانی سے سمجھا جا سکتا تھا کہ بھوریا چرن نے رتولی جانے کا راستہ روک دیا تھا' مگر کیسے؟
لباس تبدیل کر لیا تھا۔ بظاہر کوئی پابندی بھی نہیں تھی کہیں باہر آنے جانے کی۔ جیب میں چالیس روپے پڑے ہوئے تھے۔ نیچے اترا اور چل پڑا۔ شکتی پور سے زیادہ واقفیت تو نہیں تھا۔ مگر چاند خان کے محلے کا نام معلوم تھا۔ تانگے چلتے تھے۔ ایک تانگے نے مجھے وہاں اتار دیا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ پیروں میں لرزش تھی اور اس وقت دل کو دھچکا سا لگا جب چاند خان کے

دروازے پر بڑا سا تالا لٹکا دیکھا۔ گم صم کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ ہوسکتا ہے سب لوگ کہیں گئے ہوں۔ کچھ فاصلے پر ایک پرچون کی دکان تھی۔ ایک بزرگ وہاں بیٹھتے تھے۔ پہلے بھی انہیں دور سے دیکھا تھا۔ ان کے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے جواب دیا۔

''وہ سامنے والے مکان میں چاند خان رہتے تھے۔'' میں نے اشارہ کر کے کہا۔

''ایں؟...... ہاں۔''

''کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟''

''چاند خان......؟'' بزرگ حیرت سے بولے۔

''جی۔''

''وہ تو...... وہ تو خلد آشیانی ہو گئے عزیزی! کہیں باہر سے آئے ہو؟'' بزرگ نے کہا۔

کیا بتاؤں' کیسا ساعت شکن دھماکہ ہوا تھا دل و دماغ میں۔ بزرگ کا جواب سمجھ میں نہیں آرہا تھا یا سمجھ کر نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ ہمت کر کے دوبارہ کہا۔

''کیا فرمایا آپ نے؟''

''آؤ میاں! بیٹھو۔ کہیں باہر سے آئے ہو۔ عزیز ہو ان کے؟''

''کیا ہوا انہیں؟...... میں سمجھا نہیں۔''

''جنت نشین ہو گئے وہ تو...... محلے کی عظمت تھے۔ بخدا پیشہ برا پایا تھا' مگر محلے کی ناک تھے۔ درویش صفت۔ امیروں کی جیب تراش کر غریبوں کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آدھی رات کو پہنچ جاؤ' چاند خان دامے درمے سخنے حاضر ہیں۔ مجال ہے کسی ضرورت مند کو......''

''انتقال ہو گیا ان کا؟'' میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ بزرگ بہت باتونی معلوم ہوتے تھے۔

''ہاں میاں! عرصہ ہوا' ریل کا حادثہ ہوا تھا۔ ستر افراد ہلاک ہوئے تھے اور بے شمار زخمی۔ خدا جانے ان میں سے کون کون......''

''ریل کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے وہ؟''

''ہاں عزیز! مگر کئی ماہ ہو گئے اس بات کو۔ تم کہیں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے؟''

''حادثہ کہاں ہوا تھا؟''

''انجنا پور جنکشن سے کوئی چھ کوس پیچھے۔ سنا ہے قیامت خیز حادثہ تھا۔ سنا ہے ریل کے ڈبے......'' اس سے آگے بزرگ نے کیا' کیا کہا سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ آہ...... وہی وقت تھا...... بالکل وہی وقت تھا۔ اس رات انہوں نے مجھے سلا دیا تھا۔ میں سو گیا تھا۔ پھر سورج چمکا تھا' کچھ شور سنا تھا میں نے اور اس کے بعد...... اس کے بعد میرے پانچ ماہ گم ہو گئے تھے۔ رمارانی نے مجھے انجنا پور میں ہی پایا تھا۔ یہی بتایا تھا مالتی نے۔ حالات سمجھ میں آرہے تھے۔ حادثے نے میرا دماغ الٹ دیا ہوگا اور چونکہ میرا کوئی وارث تو تھا نہیں اس لئے نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا ہوں گا اور پھر رمارانی......

''محترم!...... خان صاحب کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں رہتے تھے۔'' میں نے آواز پر قابو پا کر کہا۔

''ہاں...... بہت سے تھے۔ بہت سارے تھے۔ مگر جب بادشاہ ہی نہ رہا' رعیت کیا رہتی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' چلا گیا۔ اب تو تالا پڑا ہے کوئی چار مہینے سے۔ کوئی آتا ہی نہیں ادھر۔'' بزرگ نے جواب دیا۔

آخری امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ چاند خان صاحب کے بارے میں تو اندازہ ہو گیا تھا کہ بے چارے' میری ہی وجہ سے موت کی نیند جا سوئے۔ ذلیل بھوریا چرن اس تعویذ کی موجودگی میں خان صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا' لیکن ریل کا حادثہ بلاوجہ ہی تو نہیں ہوا ہوگا۔ ضرور اس میں اس کی بھی کوئی چال ہوگی۔ آہ...... کتنے لوگ مارے گئے میری وجہ سے۔ ان

سب کا خون میری ہی گردن پر تو ہے۔ اگر میں برے راستوں کا انتخاب نہ کرتا' اگر غلاظت کی تلاش میں قدم آگے نہ بڑھاتا' زندگی کو اس انداز میں گزارنے کی کوشش کرتا' جیسے اس دنیا میں رہنے والے نیک نام لوگ گزارتے ہیں تو یہ سب کیوں ہوتا۔ بہت بڑا گنہگار تھا میں...... نجانے کس کس کا قاتل۔ اپنے ہاتھوں سے بھی تو میں نے قتل کئے تھے۔ براہ راست میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ آہ...... گناہوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نجانے آگے کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ خان صاحب کے کسی ساتھی کا پتہ چل جاتا تو کم از کم اس سے رتولی کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا۔ ان صاحب کا نام بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا' جن صاحب کے پاس خان صاحب مجھے لے جا رہے تھے۔ کاش اس وقت توجہ ہی دے لیتا۔ خان صاحب سے وہ تمام تفصیلات پوچھ لیتا تو کم از کم کوئی صحیح اندازہ ہی ہو جاتا۔ یہی غنیمت تھا کہ رتولی کا نام معلوم تھا۔ وہاں جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن...... لیکن خان صاحب کے بغیر کیا کروں گا؟...... کیا کہوں گا کسی سے؟ کسے تلاش کروں گا؟...... کیا یہ سب ممکن ہے؟ ...... آہ! کیا یہ سب ممکن ہے......؟"

پھر دل میں ایک خیال اُبھرا۔ خان صاحب کے گھر کا جائزہ تو لیا جائے۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی ایسی نشاندہی ہو جائے جس سے کچھ اور تفصیلات معلوم ہوں۔ یہ خیال اچانک ہی دل میں پیدا ہوا تھا اور اتنی شدت اختیار کر گیا کہ دل بے اختیار خان صاحب کے مکان میں داخل ہونے کو چاہنے لگا۔ وہاں سے ہٹا تو بزرگ بولے۔

"ارے نہیں' نہیں میاں!...... ایسے کیسے جا سکتے ہو؟...... گنے کا رس منگواتا ہوں تمہارے لئے۔ دو گلاس پیو' دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بڑی بری خبر سنائی ہے ہم نے تمہیں' لیکن تعجب ہے' پانچ ساڑھے پانچ مہینے ہو گئے اس واقعہ کو تو...... تم نے خبر ہی نہ لی۔ آخر ان سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟"

ان باتونی بزرگ کو بڑی مشکل سے ٹالا۔ گنے کے رس سے معذرت کی۔ جھوٹ بولنا پڑا تھا اس سلسلے میں۔ انہوں نے چائے کی پیشکش بھی کر دی' لیکن بس جان چھڑا کر وہاں سے ہٹا تھا۔ دل پر ایک بار پھر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ احساس دل سے دور نہیں ہو رہا تھا کہ چاند خان جیسا مخلص آدمی میری وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوا۔

مکان کے قریب پہنچا۔ سامنے سے گزرا' بغلی سمت آ گیا۔ دوسرے مکانات میں گھرا ہوا تھا یہ مکان۔ البتہ چھ مکان آگے جا کر راستہ دوسری جانب مڑ جاتا تھا اور یہاں سے خان صاحب کے مکان کے احاطے کے پچھلے حصے میں پہنچا جا سکتا تھا' جسے میں نے دیکھا ہوا تھا۔ تنگ سی گلی تھی اور غیر آباد رہتی تھی۔ پھر احاطے کی دیواریں بھی اتنی اونچی نہیں تھیں کہ انہیں عبور نہ کیا جا سکتا۔ ویسے احاطے کے پچھلے حصے میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا' لیکن وہ بھی شاید اندر ہی سے بند تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور یہ جائزہ لینے کے بعد کہ کوئی میری جانب متوجہ نہیں ہے' احاطے کی دیوار چڑھ کر اندر کود گیا۔ جگہ جگہ گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کافی بڑی بڑی ہو گئی تھی۔ رات کی رانی کے پودے مرجھا گئے تھے۔ خان صاحب کو پھلواری لگانے کا شوق تھا۔ عقبی حصے میں طرح طرح کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ سب کے سب اسی طرح تھے' لیکن مرجھائے ہوئے۔ مکان پر ہولناک ویرانی برس رہی تھی۔

اس وقت جب میں یہاں تھا' خان صاحب کی موجودگی میں یہ مکان بڑا پُر رونق تھا۔ ان کے شاگرد ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ قہقہوں کی آوازیں اُبھرتی رہتی تھیں۔ خان صاحب کا انداز ان کے لئے بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ اب یہ ساری چیزیں موجود نہیں تھیں اور ایک عجیب سی ویرانی ہر شے پر چھائی ہوئی تھی۔ آگے بڑھا اور اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ مکان کا سارا سامان غالباً نکال لیا گیا تھا اور اب وہ خالی پڑا ہوا تھا۔

خان صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ وسیع و عریض کمرہ' کونے میں بچھا ہوا تخت' ایک جانب پڑی ہوئی مسہری' یہ چیزیں موجود تھیں۔ مسہری پر البتہ بستر نہیں تھا۔ دیواریں ننگی کر دی گئی تھیں۔ خان صاحب جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ ہر سرسراہٹ پر یہ احساس ہوتا تھا کہ اب کوئی آواز سنائی دے گی' لیکن کچھ نہیں تھا۔ جو تصور لے کر اس گھر میں داخل ہوا تھا' یہاں آتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بھلا اس ویران کھنڈر میں اب مجھے کیا مل سکے گا۔ کسی نے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ گردن جھٹکی۔ مایوسی نے دل

میں گھر کر لیا تھا۔ بھوریا چرن ابھی تک مجھ پر حاوی تھا۔ جو کچھ اس نے کہا تھا' وہ کر دکھایا تھا کمبخت نے کہ سکون سے نہیں جینے دے گا۔ سکون تو خیر کیا ہی ملتا' جینا بھی اتنا مشکل ہو گیا تھا کہ ناقابل بیان ہے۔ وہ کمرہ یاد آیا جس میں خان صاحب نے مجھے ٹھہرایا تھا اور جو ایک رات عجیب ہولناک حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ قدم اس جانب اٹھ گئے اور میں اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ بالکل ویسا ہی تھا۔ دروازے کھڑکیاں غائب' تھوڑے تھوڑے سے ٹکڑے دیواروں میں پھنسے ہوئے۔ کیسی ہولناک کہانی تھی اس رات کی۔

میں کمرے میں داخل ہو گیا اور چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک بار پھر میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ دل کے کسی گوشے میں یہ تصور نہیں تھا کہ بھوریا چرن یہاں نظر آ جائے گا۔ وہ اپنے منحوس وجود کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے' پاؤں پھیلائے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں' وہی ہولناک شکل۔ میں سکتے کے سے عالم میں اسے گھورتا رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے احساس ہوا کہ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے؟ لیکن دوسرے لمحے اس کی آواز سنائی دی۔

''آ جا...... آ جا...... تیرا ہی انتظار کر رہے تھے ہم۔ کیسی گزر رہی ہے؟''

میں اس کی آواز پہچانتا تھا۔ صورت تو میری نگاہوں کے سامنے ہی تھی۔ کچھ دیر تک منہ سے آواز ہی نہ نکل سکی' لیکن پھر سارے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور اب یہ تیرا مسکن ہے بھوریا چرن؟''

جواب میں اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ٹھوکتے بھی نہیں ہیں ایسی جگہوں پر۔ محل کھڑے ہوئے ہیں ہمارے لئے۔ یہی تو کمی ہے تیرے اندر بالک! سمجھا ہی نہیں تُو نے ہمیں۔ پہچانا ہی نہیں۔ ارے پاپی! ہم تو خود چل کر تیرے پاس نہیں گئے تھے۔ خود ہی تیرا من ہم سے ملنے کو چاہا تھا۔ بات کی تھی تُو نے ہم سے۔ ہم نے تو ساری سچائی سے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تُو ہمارا کام کر دے' ہم تیرا کام کر دیں گے۔ تجھ پر ہی مصیبت ٹوٹی تھی۔ کون سا ایسا دھرماتما تھا تُو؟ تھوڑا سا کام کر دیتا ہمارا۔ ہمیں وہ شکتی حاصل ہو جاتی جس کے لئے ہم برسوں سے کوششیں کر رہے ہیں اور اس کا تھوڑا سا حصہ تجھے مل جاتا...... مگر وہ تھوڑا سا حصہ بھی اتنا ہوتا کہ تیرے پرکھوں نے بھی خواب میں نہ دیکھا ہوتا۔ لیکن تُو بھی...... تُو بھی عجیب ہے۔ ساری رسی جل گئی' پر بل ہیں کہ کھلتے ہی نہیں۔ اب بھی سمے ہے۔ ارے ہم نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ اب بھی سمے ہے' مان لے ہماری بات۔ چھوٹا سا کام ہے اور صلہ جو ملے گا' بس کیا کہیں اس کے بارے میں تجھے۔ کیا کہہ سکتے ہیں تجھ سے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اتنا کھو چکا ہوں بھوریا چرن! کہ اب کھونے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ایک جذبہ ہے میرے سینے میں۔ وہ یہ کہ وہ گندا کام نہیں کروں گا جو تُو چاہتا ہے۔ اس جذبے کو نہیں کھوؤں گا بھوریا چرن! یہ جذبہ میرا ایمان بن چکا ہے۔ یہ جذبہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا چاہے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے۔ تُو زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کتے! میری جان ہی لے سکتا ہے نا مجھ سے......؟ مجھے اس جان سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے' جو بالکل ہی بے جان ہے۔ کوئی مقصد نہیں ہے میری زندگی کا۔ کچھ نہیں رہا میرے پاس۔''

بھوریا چرن کے ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں ابھری۔ پھر اس نے کہا۔

''جان لینا تو کب کی لے سکتا تھا۔ بہت مان ہے تجھے اپنے ایمان پر۔ بہت جذبے ہیں تیرے سینے میں۔ ارے پگلے! جان تو میں نے کسی کی بھی نہیں لی۔ تیرے ماتا پتا جیتے ہیں' تیری بہن زندہ ہے۔ تیرا بھائی جسے تُو نے سمندر پار بھگا دیا' جی رہا ہے اور تُو بھی جیتا ہی رہا ہے...... ریل کا حادثہ ہوا تھا۔ ارے خود تھوڑی ہوا تھا؟ انجن اتار پھینکا تھا ہم نے پٹری سے۔ پٹری ہی توڑ دی تھی۔ وہ سورما جو تیرے ساتھ تھا' بڑا بنتا تھا۔ تعویذ گلے میں ڈالے رہتا تھا۔ ٹھیک ہے' ہم اس تعویذ کی وجہ سے اس کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ مگر ریل کے پاس تو جا سکتے تھے۔ کیسی رہی؟''

میں خونی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ریل کے حادثے میں اس کا ہاتھ تھا' ستر آدمی مرے تھے صرف میری وجہ سے اور لاتعداد زخمی ہوئے تھے' میرا جنون عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں اس پر چھلانگ

لگا دی۔ یہ کتا اگر میرے ہاتھ آ جائے تو اپنے دانتوں سے اس کا نرخرہ ادھیڑ ڈالوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا اسے۔ نہیں چھوڑوں گا۔
خاصی اونچی چھلانگ تھی اور ایک لمحہ گزرنے والا تھا کہ میں اس پر جا پڑتا لیکن ...... لیکن ...... میرے اور اس کے درمیان نجانے کیا چیز حائل ہو گئی تھی۔ نجانے وہ کیا تھا ...... میں خلاء میں معلق رہ گیا ...... میں نے ہاتھ پاؤں مارے تو میرے ہاتھ پاؤں جیسے کسی لیس دار چیز میں جکڑتے چلے گئے۔ تب میں نے اس لیس دار چیز کو دیکھا۔ موٹی سی رسّی کی مانند بے رنگ جالے تھے۔ مکڑی کے جالے۔ لیس دار بدن سے چپک جانے والے۔ اتنے مضبوط کہ انہوں نے میرے جسم کا پورا بوجھ سنبھال لیا تھا۔

میں ان لیس دار جالوں میں لٹک کر بے بس ہو گیا۔ جتنے ہاتھ پاؤں چلے' اتنے ہی یہ جالے مجھ سے لپٹتے چلے گئے اور پھر یہ کیفیت ہو گئی کہ میں جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں' بھوریا چرن مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ اسی طرح پاؤں پھیلائے مجھ سے بے تعلق بیٹھا ہوا تھا۔ یہ گھناؤنے لیس دار جالے چھت سے لے کر زمین تک پھیلے ہوئے تھے اور بے رنگ ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ پھر ان جالوں پر کوئی شے متحرک نظر آئی۔ اس تحریک سے میرا بدن بھی جالوں میں لپٹا ہل رہا تھا۔ آہ ...... یہ مکڑیاں تھیں۔ دس گیارہ مکڑیاں جو ان جالوں پر نمودار ہوئی تھیں اور اپنی پیلی بدنما آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئیں مختلف سمتوں سے چلتی ہوئی میری سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان کا حجم کوئی ایک بالشت کا ہو گا۔ میں ان کے پورے جسم کو دیکھ سکتا تھا۔ بھوریا چرن نے کہا۔

''یہ میرے بیر ہیں ...... میری حفاظت کرتے ہیں ...... میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں' یہ میرے لئے جاگتے رہتے ہیں ...... تم ایسا کبھی مت سوچنا۔ میرا کچھ بھی نہیں بگڑے گا' تمہیں نقصان ہو جائے گا۔ اگر ہاتھی بھی میری طرف بڑھے تو یہ جالے اسے لپیٹ لیں اور وہ ہل نہ پائے۔ یہ بیر اسے آنکھ جھپکتے میں چٹ کر جائیں۔ یہ کالا جادو ہے بالک! کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ مگر کیا کروں' تیرے بھاگ ہی خراب ہیں ...... دھرم دھرم کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ ارے شکتی ہی دھرم ہے۔ مایا شکتی ہو یا کایا شکتی۔ اس کے بنا کچھ نہیں ہوتا۔ کیا دے گا تیرا دھرم تجھے۔ کیا بگاڑ لے گا تیرا دھرم میرا ......؟ میرا گیان مہان ہے۔''
''چاند خان پر تیرا جادو کیوں نہ چلا؟ ...... ان کا کچھ کیوں نہ بگاڑ لیا تو نے؟ ...... اس تعویذ کے پاس جاتے ہوئے تیری جان کیوں نکلتی تھی بھوریا چرن؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور وہ مکروہ ہنسی ہنس پڑا۔
''وہ کہاں جیتا ہے؟ ...... ساٹھ ستر اور لے مرا اپنے ساتھ۔'' اس نے کہا۔
''مجھے اس مزار پر جانے دے۔ پھر تیری شکتی دیکھوں گا۔''
''خطرناک راستے بند کرنا بھی عقل مندی ہے اور عقل بھی ایک شکتی ہوتی ہے باؤلے! اب بھی مان لے۔ میرا چھوٹا سا کام ہے۔ بہت چھوٹا سا۔ اس کے بدلے تجھے جو کچھ ملے گا' تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھاگن دوار پہنچا دے مجھے بس ایک بار ...... ایک بار ہی بھاؤنا ہے من میں۔ بدلے میں بتا دے کیا چاہئے۔ جیون بھر کا سکھ۔ شانتی' دھن دولت کے ڈھیر' سنسار جھکا دوں گا تیرے چرنوں میں ...... جو مانگے گا دوں گا۔ بول کے تو دیکھ۔''
''بھوریا چرن! اتنا کچھ ہے تیرے قبضے میں؟'' میں نے کہا۔
''اس سے بھی زیادہ بالک! ...... اس سے بھی زیادہ۔ بھوریا چرن نے جیون بھر کیا' کیا ہے۔ ساری عمر گیان لینے میں بتائی ہے۔ بڑے بڑے رشی منیوں کے چرنوں کی دھول پھانکی ہے اور اب سمے آ گیا ہے۔ سمے آ گیا ہے کہ ......'' وہ کسی خوش آئند خیال میں کھو گیا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''ہٹو رے ...... ہٹو اس کے پاس سے آ جا بچہ! نیچے اتر آ۔'' اور اچانک میں جالے کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ مکڑیاں واپس چلی گئی تھیں۔
''بھوریا چرن! اتنا کچھ ہے تیرے قبضے میں اور تو سیڑھیاں چڑھ کر بیر پھاگن کے مزار تک نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے تجھے کسی اور کا سہارا چاہئے۔'' میں نے طنزیہ کہا اور اس کا چہرہ آگ ہو گیا۔
''یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔''

جگہ ہے اور میں ہوش میں آ کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں وہاں سے نکلنا ضرور چاہتا تھا' لیکن یہ سوچ کر نہیں کہ وہ کوئی بری جگہ ہے۔ مجھ سے برا اس وقت اس روئے زمین پر کون تھا بلکہ یہ احساس تھا مجھے کہ کہیں ان کی اس چھ مہینے کی خدمت کا صلہ میں انہیں ان کی تباہی کی شکل میں نہ دوں۔ میرے منحوس قدم جہاں بھی پہنچیں گے' وہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ جہاں تک بھوریا چرن پر طنز کا معاملہ تھا' میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ اپنی تمام تر قوتوں کے باوجود ایک بزرگ کے مزار تک کا فاصلہ نہیں طے کر سکتا تھا' لیکن اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ باقی جو کچھ وہ کر سکتا ہے' ضرور کرے گا۔

انہی سوچوں میں گم آگے بڑھتا رہا۔ ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس خوف کا احساس بھی تھا کہ کہیں پولیس کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ جائے' دفعتاً ہی ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ گاڑی میرے قریب سے گزر رہی تھی۔ سست ہوئی اور پھر رک گئی۔ میں نے غور بھی نہیں کیا تھا' لیکن ابھی چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک شخص میرے پاس پہنچ گیا اور اس نے کہا۔ ''رتن جی ......''

میں نے چونک کر اسے دیکھا' بالکل اجنبی چہرہ تھا۔ میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تو اس نے انگلی سے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ بلاتی ہیں ......'' میں نے گاڑی کی طرف دیکھا۔ پچھلی کھڑکی سے شکنتا کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ وہی چہرہ جسے میں نے دیکھا تھا اور اس کے بعد کشنا کے عتاب کا شکار ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جھجک پیدا ہوئی' لیکن پھر اچانک ہی دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھا تو جائے یہ شکنتا کا کیا معاملہ ہے؟ آگے بڑھ کر قریب پہنچ گیا۔ شکنتا پچھلی سیٹ پر تھوڑا سا پیچھے کھسک گئی اور اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے کھڑکی سے صرف اس کا چہرہ دیکھا تھا' لباس نہیں دیکھا تھا۔ بہرطور میں جھجکتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا اور بیٹھنے کے بعد میں نے اس کا لباس دیکھا۔ سفید شلوار' سفید قمیص میں ملبوس تھی۔ بال ایک خاص انداز میں بنائے ہوئے تھے۔ گھٹنوں پر کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''چلو......'' ڈرائیور وہی آدمی تھا' جو مجھے بلا کر لایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی چمک تھی۔ درحقیقت اس کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالنے کی جرأت مجھے ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے نیند سے جاگ کر دیکھا تھا۔ نجانے کیا لگتی تھی وہ! دوسری بار ہلکی سی جھلک دیکھی تھی اور دل میں یہ احساس پیدا ہوا تھا کہ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اتنے خوبصورت چہرے کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ بس اس کے چہرے کی تفصیل میں جانا خوامخواہ ذہن کی بربادی ہے' لیکن اب اس کے قریب آ کر میں اس سے یہ معلوم کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ میرا اور اس کا کیا معاملہ ہے۔

''گردھاری جی! ایسے پتھرائے ہوئے کیوں بیٹھے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں ......؟'' میں نے چونک کر اس کی صورت دیکھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گ ...... گردھاری ...... ن ...... نہیں ...... م ...... میرا ......'' وہ بے اختیار ہنس پڑی اور پھر بولی۔

''بس متی کے مادھو ہو میرے! تمہیں اس سنسار میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی' ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔ جی چاہا کہ کہوں کہ واقعی اس دنیا میں میرا وجود سب سے زیادہ بے قیمت ہے' مگر کاش! میں اپنی مرضی سے اس دنیا میں آنے کا اعلان کر سکتا۔ گاڑی زیادہ دور نہیں گئی۔ ایک تنگ سی گلی میں مڑی اور گلی کے آخری سرے پر بنے ہوئے مکان کے سامنے جا رکی۔ اچھا خاصا مکان تھا۔ چھوٹی چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنا ہوا بڑا سا دروازہ تھا۔ جس سے گاڑی اندر داخل ہو سکتی تھی' سو ایسا ہی ہوا۔ ایک گیراج نما جگہ گاڑی رک گئی اور شکنتا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ میں ساکت بیٹھا رہا تو وہ ہنستی ہوئی دوسری سمت آئی اور اس نے میرا دروازہ کھول دیا۔ پھر بولی۔

''تشریف لائیے مہاراج! داسی آپ کی سیوا کرنا چاہتی ہے۔'' میں گھبرائے ہوئے انداز میں نیچے اتر گیا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ شکنتا نے میرا ہاتھ پکڑا اور تین سیڑھیاں عبور کر کے پیتل کی کیلوں لگے دروازے کے پاس پہنچ گئی جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوئے تو پتھروں ہی کے فرش کی ایک ڈیوڑھی نظر آئی اور اس کے دوسرے دروازے سے باہر نکلے تو بڑا سا صحن تھا' جس کے دونوں سمت درخت جھول رہے تھے۔ آگے ایک وسیع و عریض

دالان تھا اور دالان کے تین سمت کمروں کے دروازے‘ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شکنتا مجھے ساتھ لیے ہوئے اسی دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ بہت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ صوفے پڑے ہوئے تھے‘ میزیں تھیں اور بہت سا خوبصورت آرائش کا سامان‘ اس نے چھت میں لگا ہوا پنکھا چلا دیا اور مجھ سے بولی۔

”پدھاریئے۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ساتھ لائی ہوئی کتابیں ایک طرف رکھیں اور پھر میرے سامنے بیٹھ کر مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”یہاں آ کر حیرت نہیں ہوئی۔“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو کہنے لگی۔

”دیکھو میرے سامنے تم یہ مٹی کے مادھومت بنے رہا کرو اور کون سی زبان سے کہوں تم سے‘ باؤلے ہو گے کسی اور کے لیے‘ میرے لیے تم باؤلے مت رہا کرو۔ اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں۔“

”شش...... شکنتا‘ شکنتا جی! میں...... میں......“

”جی...... جی آگے کہیے؟“

”کیا کہوں......؟“

”اچھا! یہ بتاؤ کیا پیو گے؟“

”کک...... کچھ بھی نہیں۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے گھر آئے ہو۔“ وہ ہنسی اور پھر بولی۔

”تم ہو [illegible] سے میرے گھر......“

”یہ نہیں۔“ میں آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتا ہوا بولا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر اس نے کہا۔

”[illegible]! یہ میرا اصل گھر ہے۔ ٹھہرو تمہیں شربت تو پلا ہی دوں۔ مجھے بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا‘ ابھی آئی۔“ وہ اٹھی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ یہ سب کچھ بھی بے حد پراسرار تھا‘ عقل میں نہ آنے والا‘ شکنتا تو اس بازار کی لڑکی تھی اور رمارانی کے کوٹھے کے سامنے والے کوٹھے میں رہتی تھی۔ پھر یہ گھر یہ تعلیمی لباس‘ یہ کتابیں‘ ڈرائیور...... یہ سب کچھ کیا ہے؟ آہ! جتنے پراسرار واقعات ہیں‘ میری ہی تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں۔ نجانے یہ کیا نیا کھیل ہے‘ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا‘ لیکن شکنتا کے بارے میں جاننے کی خواہش بھی رکھتا تھا۔ ویسے بھی اس کے اندر ایک انوکھی کشش کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر کے بعد واپس آ گئی۔ ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے ہوئے تھی‘ جس میں شربت کے دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔

”حیران بیٹھے ہو۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”تم کون ہو شکنتا......؟“

”لوگ مجھے شکنتا کہتے ہیں‘ لیکن میں رتن کی رتنا ہوں۔ بہت بار جی چاہا کہ تمہیں یہاں لاؤں مگر گوپال جی گوپیوں کے بیچ سے نکلتے ہی نہیں۔ یہ آج کہاں بھٹک گئے تھے؟“

”میں......؟“

”تو اور کون......؟ ایک بات کہوں رتن جی۔“

”کہو۔“

”سپنا‘ موہنی اور سونیا بھی یہی کہتی ہیں اور میں بھی۔ تم پاگل نہیں ہو‘ پاگل بنے ہوئے ہو اور جانے کسے پاگل بنانے کے لیے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے۔“

”کیا......؟“

”تم نے یہ روپ دھارن کیوں کیا ہے؟“

''اس سے پہلے تمہیں کچھ بتانا ہوگا شکنتلا۔'' میں نے لہجہ بدل کر کہا اور وہ چونک پڑی۔ غالباً اسے میرا یہ بدلا ہوا لہجہ عجیب لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی' پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ''کیسی بات' کون سی بات؟''

''تم مجھے کب سے جانتی ہو؟''

''نجانے کب سے' شاید اس سے بھی پہلے سے' جب تم مجھے رمارانی کے ہاں نظر آئے تھے۔ یقین کرو رتن! جب میں نے تمہیں وہاں دیکھا تو لگا جیسے میرا کوئی سامنے والے گھر میں پہنچ گیا ہو' تم مجھے اس گھر کے لگے ہی نہ تھے۔ رادھا سے پوچھا تو رادھا نے بتایا کہ رماجی یاترا کو گئی تھیں' ہاں کسی مندر کے پاس تم انہیں مل گئے اور وہ تمہیں ساتھ لے آئیں۔ رادھا کی بات من کو جچی نہیں تھی' پر تم اپنے ہو کر اجنبی اجنبی سے لگے۔ سب لوگ کہتے تھے تم باؤلے ہو' پر میرا من کبھی نہ مانا۔ رتن بھگوان کی سوگند تم اتنے اپنے لگے ہو کہ کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ میرا تم سے پچھلے جنموں کا کوئی ناتا ہے۔''

''یہ جگہ جہاں تم اس وقت ہو اور شکنتلا تمہارا یہ روپ......؟''

''ہاں! تمہیں حیرت ہوئی ہوگی۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''رتن! جہاں تم رہتے ہو' وہاں کی باتیں اب تو سب کی سب جان گئے ہو گے۔ بڑی عجیب سی جگہ ہے وہ' میری ماں بملا وتی بہت سخت ہیں۔ میرے پتا جی کا نام مجھے بھی نہیں بتایا گیا۔ سنا ہے کہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بملا وتی سے اب ان کا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ مگر انہیں یہ معلوم تھا کہ میں ان کی اولاد ہوں۔ انہوں نے مجھے ساتھ لے جانا چاہا تو میری ماں بملا وتی نے صاف انکار کر دیا۔ بات بہت آگے بڑھی اور بہت جھگڑے بیچ میں آئے' پھر طے یہ ہوا کہ میں اپنی ماں کے ساتھ ہی رہوں گی' مگر ناچ گانے کا کام نہیں کروں گی۔ میرے پتا نے میرا خرچ سنبھال لیا' مجھے یہ گھر دیا اور میری پڑھائی کا بندوبست کیا۔ یہ بات میری ماں اور پتا کے بیچ طے ہو گئی تھی کہ میرے پتا کبھی اپنا سامنے نہیں لائیں گے اور مجھے بھی میری ماں سے دور نہیں کریں گے۔ ماں نے آج تک مجھے میرے پتا کا نام نہیں بتایا۔ میں نے چونکہ اپنے پتا کو دیکھا بھی نہیں ہے اس لیے میرے من میں ان کی کوئی تصویر نہیں ابھرتی۔ اپنے گھر میں پہلے یہاں آتی ہوں' لباس بدلتی ہوں اور پھر ماں کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ پتا نہیں آگے میرے ماتا اور پتا کے بیچ کیا منصوبہ ہے مگر یہ بات طے ہے کہ میری ماں مجھے ناچ گانے کے دھندے سے نہیں لگائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے پتا بھی میرے سامنے آ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ رتن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا رمارانی سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ رتن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے سپنوں میں بسایا ہے۔ سوگند کھا چکی ہوں کہ اس سے پہلے بھی تم میرے سپنوں میں تھے جب رمارانی کے پاس نہیں آئے تھے۔ مانو یا نہ مانو! بات کہانیوں جیسی ہے' پر ہے اور میں کسی بھی قیمت پر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟''

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی کہانی انوکھی تھی' بڑی عجیب' مگر ایسا بھی ہوتا ہوگا۔ مجھے اب اتنی واقفیت تو نہیں تھی اس ماحول اور اس دنیا کے بارے میں' شربت کا گلاس میں نے خالی کر دیا اور پھر بولا۔ ''اب اٹھو گی نہیں یہاں سے شکنتلا؟''

''ابھی نہیں۔''

''دیر ہو گئی تو تمہاری ماں پریشان نہ ہو گی؟''

''جو ہوتا ہے ہونے دو۔ بڑی مشکل سے تو یہ موقع ہے' مجھے تم اکیلے ہاتھ لگے۔ جب بھی ملتے ہو' کوئی نہ کوئی سر پر سوار ہوتا ہے اور پھر وہ کشنا' اسے تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آفت کی پڑیا ہے اور تم سے پریم کرتی ہے۔ مگر اس کا پریم میرے پریم جیسا نہیں ہے۔ اس کی ماں رمارانی تمہیں اپنے بیٹے جیسا مانتی ہے۔ اس طرح تم اس کے بھائی ہوئے۔ مگر یہاں رشتے نہیں ہوتے اور پھر منہ بولے رشتے...... ان کا تو کوئی بھاؤ ہی نہیں۔ رتن سے تھوڑا ہے' تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ رتن دیکھو میرا تمہارا جیون بھر کا سمبندھ ہو سکتا ہے۔ ہم تم ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ تم وہاں کے نہیں ہو جہاں رہتے ہو اور میں...... میں نے تو تمہیں اپنے بارے میں بتا ہی دیا۔ میرے پتا نے جو کچھ کیا ہے' میرے لیے کیا ہے' اس سے تمہیں یہ بات

معلوم ہو گئی کہ میں کوٹھے والی کبھی نہ بنوں گی اور جب پتا جی میرے سر پر ہاتھ رکھیں گے تو...... تو میں انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گی۔ ان سے کہہ دوں گی کہ اگر وہ مجھے عزت کی زندگی دینا چاہتے ہیں تو رتن کو میرا جیون ساتھی بنا دیں۔ نہیں تو میرے لیے کوٹھا بھلا ہے۔ شرط لگا دوں گی ان پر اور وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔'' وہ مجھے دیکھنے لگی۔

✦✦✦✦✦
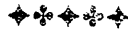
''چلو شکنتا! چلیں یہاں سے۔''

''رتن! تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔''

''کیا بتاؤں شکنتا! کیا بتاؤں تمہیں اپنے بارے میں۔''

''تم کون ہو......؟''

''ایک سوال میں تم سے ہی کرتا ہوں شکنتا!''

''کیا......''

''اگر مجھے اپنے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو...... تو میں یہاں کیوں ہوتا؟ کون اپنا گھر چھوڑ کر ایسی جگہ رہتا۔''

''تم...... تم پاگل تو نہیں ہو۔''

''میں پاگل ہو گیا تھا شکنتا! اب نہیں ہوں۔ مجھے ہوش ضرور آ گیا ہے' مگر یہ یاد نہیں کہ میں کون ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے؟ میرے ماتا پتا کون ہیں؟ میں اپنی کھوج میں ہوں شکنتا! ان لوگوں کو اپنے ہوش کے بارے میں بتانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیا دے گا اس سے بلکہ یہ ممکن ہے یہ جگہ بھی چھن جائے۔ میرے پاس تو کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے' کہاں جاؤں گا میں۔''

میری آواز بھرا گئی۔ شکنتا مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری باتوں پر یقین کر لیا تھا۔

''بھگوان کرے تمہیں سب کچھ یاد آ جائے' مگر خود کو اکیلا کیوں سمجھتے ہو' میں جو ہوں۔ سنو! میں روز کالج جاتی ہوں۔ یہیں سے جاتی ہوں' یہیں واپس آتی ہوں' تم روز یہاں آ جایا کرو۔ ہم کچھ وقت ساتھ گزاریں گے اور پھر وہاں جا کر تم مجھ سے اجنبی ہو جایا کرو۔ اس طرح میرے من کو شانتی رہے گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''خطرہ پیدا ہو جائے گا شکنتا! تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ ہاں کبھی کبھی ہم مل لیا کریں گے۔ میں خود یہاں آ جایا کروں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' شکنتا نے کہا۔

''میں چلوں۔''

''ہاں جاؤ۔ میں کچھ دیر کے بعد جاؤں گی تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔'' اس نے مجھے بڑی چاہت سے رخصت کیا تھا۔ میرے دل پر بڑے بوجھ تھے۔ انوکھی کہانیوں کے بوجھ' انوکھے واقعات کے بوجھ' خان صاحب کی موت' ریل کا حادثہ' منحوس بھوریا چرن سے ملاقات' اس کے الفاظ' اس کے کام کے سلسلے میں اپنی استقامت! یہ ساری باتیں ذہن منتشر کر رہی تھیں اور پھر شکنتا! انوکھی کہانی تھی اس کی۔

واپس آ گیا۔ کوئی اور نئی بات نہ ہوئی۔ شام ہو گئی' ماحول بدل گیا اور رشتے بدل گئے' چہرے بدل گئے۔ مہمانوں کے لیے ہار لینے نکلا تھا' ہار لے کر واپس آ رہا تھا کہ ساری جان آنکھوں میں سمٹ آئی' جو دیکھا نا قابل یقین تھا۔ کیا میں جو کچھ دکھ رہا ہوں درست ہے۔ کیا یہ ماموں ریاض ہی ہیں؟

آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ یہ ان صورتوں میں سے ایک صورت تھی' جو آنکھوں کی حسرت بن چکی تھیں۔ ماموں ریاض ہمارے ماموں ہی نہیں' دوست بھی تھے۔ اتنا اچھا وقت گزرا تھا ان کے ساتھ کہ اب یاد بھی کرتا تو یقین نہیں آتا تھا۔ مگر وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ تین اور آدمی بھی تھے۔ ایک لمبے تڑنگے نوابوں جیسے حلیے کے صاحب۔ باریک ململ کا کڑھا ہوا کرتا پہنے' سلک کی شیروانی' جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ دودھ جیسا سفید رنگ' تلوار کٹ سیاہ مونچھیں' سر پر کالی

ترچھی ٹوپی' چوڑی دار پاجامہ جس میں کلابتوں کے پھندنے والا ازار بند جس کا پھندنا گرتے سے نیچے' وارنش کا لوفر شوز جس کی "چرر چرر" شور کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ ہونٹوں پر ان کی دھڑی جمی ہوئی تھی۔ دوسرے بھی کسی حد تک ایسے ہی لباس میں ملبوس تھے۔ البتہ ماموں ریاض شلوار قمیض پہنے ہوئے صاف ستھرے نظر آ رہے تھے۔ مگر ان صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے ان کا انداز بھی مؤدبانہ نظر آتا تھا۔

دل نے پورا یقین کر لیا کہ یہ ماموں ریاض ہی ہیں۔ بدن میں پھریری سی آئی۔ پاؤں آگے بڑھے۔ جی چاہا دوڑ کر لپٹ جاؤں۔ اتنا روؤں کہ آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ بہہ جائیں۔ مگر عقل نے روکا...... اپنے بارے میں کچھ اندازہ ہے مسعود! ہاتھوں میں پھولوں کے ہار کے پڑے دبے ہوئے ہیں۔ ایک بری جگہ رہتا ہے۔ حرام کی کمائی پر جی رہا ہے۔ کیا لگ رہا ہے' اس کا علم ہے اور پھر...... اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہی سب کچھ نا جس سے بچنا چاہتا ہے...... آہ' مگر ماموں کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ پتہ تو لگے کہ وہ شکتی پور میں کب آئے؟ امی اور ابا کہاں ہیں؟ سب کیسے ہیں؟ انہیں محمود کے بارے میں بتاؤں۔ نہ جانے امی اور ابا کا کیا حال ہوگا۔

"رتنا......!" کسی نے مجھے پکارا اور میں چونک پڑا۔ گھوم کر دیکھا' مالتی تھی۔ "یہاں کھڑے سو رہے ہو۔ وہاں رما رانی انتظار کر رہی ہیں تمہارا۔"

"مالتی! تم یہ ہار لے جاؤ مجھے کچھ کام ہے۔"

"ارے لے کر جاؤ دوڑتے ہوئے۔ میں دوسرے کام سے جا رہی ہوں۔" مالتی نے کہا اور گردن جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ میں رک کر ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ وہ سامنے والے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ لوگ بیلاوتی کے مہمان ہیں۔ پہلے ہار دے آؤں' اس کے بعد آ جاؤں گا اور پھر کچھ سوچوں گا۔ تیزی سے آگے بڑھا' اوپر پہنچا تو شریر کشنا نظر آئی۔ زرق برق جوڑے میں ملبوس' پوڈر سے سجی ہوئی۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے سجے ہوئے۔

"گجرے لائے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں...... اس میں ہیں۔ یہ سنبھالو مجھے کچھ کام ہے۔" میں نے اسے پڑے دینے کی کوشش کی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"مجھے بھی کام ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

"کشنا! لے لو جلدی سے بڑا نقصان ہو جائے گا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"نہ رتن جی!...... آؤ' مجھے بھی کام ہے تم سے۔ مالتی نہیں ہے ورنہ تمہیں تکلیف نہ دیتی۔" وہ واپس مڑ گئی۔ رما رانی' رادھا اور لکشمی ہال کمرے میں تھیں جہاں طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے ساتھ گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ مجبوراً میں کشنا کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ کشنا نے پڑے کھولے' گجرے نکالے اور پھر موتیے کے پھولوں کا ایک ہار مجھے دے کر بولی۔

"اسے میرے بالوں میں سجاؤ۔"

"کشنا! میں......" میں نے پھر خوشامد کی۔

"باندھو رتن!...... پھول لگانے سے تم پتی نہیں بن جاؤ گے میرے۔ چلو لگاؤ۔" مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے ایسے نہیں چھوڑے گی۔ مجبوراً اس کے بالوں میں پھول سجائے۔ اس نے کلائی کے گجرے اٹھا کر مجھے دیئے۔ "انہیں میرے ہاتھوں میں سجاؤ۔"

"تم مجھ پر ظلم کر رہی ہو کشنا!"

"تم نے بھی تو ہم پر ظلم کر رکھا ہے نہ جانے کب سے۔ باندھو بھئی' دیر ہو رہی ہے۔" خاصی دیر لگی۔ اس سے پیچھا چھڑا کر میں پھر نیچے بھاگا۔ پوری گلی میں نظر دوڑائی۔ وہ لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ اطمینان ہوا کہ وہ بیلاوتی یعنی شکنتا کے کوٹھے پر ہیں۔ اب کیا کروں......؟ کیا اوپر چلا جاؤں؟...... مگر پھر...... پھر کیا کروں گا؟...... ماموں کے سامنے اس طرح نہیں جانا چاہتا تھا۔ نجانے کیا ہو جائے۔ ذرا بھی کسی کو اندازہ ہو گیا میرے بارے میں تو شاید اس بار پولیس مجھے گرفتار کرنے کی زحمت

بھی نہ کرے۔ دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی' کیونکہ اب میں صرف دو آدمیوں کا قاتل نہیں تھا بلکہ پولیس کے دو افراد بھی میرے ہاتھوں مارے جاچکے تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ پاگل کی حیثیت سے نجانے کیسے یہاں وقت گزارتا رہا تھا اور کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا۔ ابھی تک تو محفوظ تھا' لیکن کمینہ صفت بھوریا چرن کی ایک ہلکی جنبش مجھے پھر مصیبتوں میں گرفتار کرسکتی تھی۔ اس کا خوف تو لمحہ لمحہ رہتا تھا۔ میرے ساتھ جو بھی ہوگا' عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔ نجانے بے چارے ماموں ریاض کیا کر رہے ہیں اور کس طرح یہ لوگ اپنے آپ کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ماموں ریاض کی جو جھلک دیکھی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ بہت زیادہ بے کسی کا شکار نہیں ہیں۔ مگر کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ شکتی پور میں کیسے آنا ہوا؟...... کیا یہیں رہتے ہیں؟...... یہ ساری باتیں ذہن کے پردوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ فیصلہ کیا کہ جب وہ نیچے اُتریں گے تو ان کا پیچھا کروں گا۔ یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ کہاں رہتے ہیں؟ بعد میں سوچا جائے گا کہ کیا قدم اٹھانا ہے۔ اس بات پر دل جم گیا تھا۔

بہت دیر تک پوری گلی کے چکر لگاتا رہا۔ یہاں جو کچھ ہوتا تھا اب میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ ان لوگوں کے فوری طور پر نیچے آنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر رقص کی محفل میں جم گئے تو رات کے بارہ ہی بجیں گے۔ کچھ بھی ہو جائے' میرے لئے اس سے زیادہ قیمتی کام اور کیا ہوسکتا تھا۔ میں فتح محمد پنواڑی کی دکان پر رک گیا اور دکان کے قریب لگے ہوئے بجلی کے کھمبے کے نیچے جو ایک سیمنٹ کا تھڑا سا بنا ہوا ہوتا ہے اس پر بیٹھ گیا۔ فتح محمد کے ہاتھ برق رفتاری سے چل رہے تھے اور وہ پانوں کے انبار لگائے جارہا تھا۔ گاہک آتے' فتح محمد ان سے طرح طرح کی باتیں کرتا اور پانوں کی گلوریاں بنا کر انہیں پیش کر دیتا۔ اس کی چرب زبانی سننے کے قابل تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے گاہکوں کا توڑا ہوا تھا تو اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

''بھئی رتن لال جی! آج یہاں کیسے بیٹھے ہوئے ہو۔ اُداس اُداس سے۔ جھگڑا ہو گیا گھر میں کسی سے؟''

میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن جب اس نے بات کی تو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''میرا کس سے جھگڑا ہوگا بھائی فتو؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔ ویسے ایک بات اپنی کھوپڑی میں ایسی اٹکی ہوئی ہے کہ کھوپڑی کا بھوسہ نکل گیا ہے۔ سوچ رہے تھے کہ تم سے پوچھیں گے جب بھی ہاتھ لگو گے ضرور پوچھیں گے۔''

''کیا بھائی فتو؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! اُس دن جب تم ہم سے باتیں کر رہے تھے تو تمہارے منہ سے اچانک میرے خدا! نکلا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟ تم تو ہندو ہو نا۔''

میں حیران رہ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ ایسی کوئی بات ہوگئی ہے۔ یقیناً ہوا ہوگا ایسا ہی۔ مگر کیا جواب دیتا اس کو خوامخواہ ہنس پڑا؟

''فتح محمد! بہت گہرائیوں میں نہیں جاتے ...... بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پردے میں رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

'لو اور سنو۔ اماں کیا ہم کسی سے کہنے جارہے ہیں ......؟ یار ہو ہمارے بس ذرا یہ بتا دو کہ تمہارے منہ سے بھگوان' بھگوان کیوں نہیں نکلا؟''

''بتا دیں گے فتح محمد! کسی فرصت کے وقت بتا دیں گے۔''

''لو گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ فرصت نہیں ہے تمہیں' کیا کسی کا انتظار کر رہے ہو؟''

''ہاں ...... یہی سمجھ لو۔''

''کس کا؟'' فتح محمد نے کہا۔ شکر تھا کہ کچھ گاہک اس کی دکان پر آ گئے۔ میں اسے جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ گاہکوں میں اُلجھا تو میں آہستہ سے اس کی دکان پر سے اٹھ گیا اور اس کے بعد وہاں سے کافی دور چلا گیا۔ میری نگاہیں کوٹھے پر لگی ہوئی تھیں۔ وقت گزرتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اور گھومتے گھومتے پورا بدن تھک گیا تھا۔ اچانک ہی مالتی مجھے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔

''ارے تم نے تو مار ہی ڈالا رتن لال جی! ...... کہاں چلے گئے تھے؟ ...... چلو' رما رانی بلا رہی ہیں۔''

"کیا کام ہے؟" میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"لو..... تم بھی مجھے ہی ڈانٹ رہے ہو۔ اُدھر سے بھی ڈانٹ پڑ رہی ہے اور اِدھر سے بھی۔ اب کام تو تمہیں رما رانی ہی بتائیں گی۔ ہم کیا بتائیں؟"

"تم چلو..... میں آرہا ہوں۔"

"ساتھ چلو۔ یہی کہا ہے انہوں نے۔"

میں دانت پیستا ہوا مالتی کے ساتھ واپس چل پڑا۔ بہتر یہ تھا کہ کسی ایسی جگہ روپوش ہو جاتا' جہاں سے کوئی مجھے دیکھ نہ پاتا۔ خوامخواہ یہ لوگ ذہن خراب کر رہے ہیں۔

گھر واپس پہنچا تو رما رانی نے ایک کام میرے سپرد کر دیا۔ میں بھلا ان سے کیا کہتا۔ کوئی دس پندرہ منٹ مصروف رہنا پڑا اور اس کے بعد جیسے ہی کام ختم ہوا' میں مالتی سے کہہ کر وہاں سے نکل بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر میں ایک ایسی جگہ کھڑا انتظار کر رہا تھا' جہاں سے بیلا وتی کے کوٹھے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا۔

بارہ بج گئے۔ ساز و آواز کا کھیل ختم ہو گیا اور مہمان اُتر اُتر کر گلی سے باہر کھڑے ہوئے تانگوں کی جانب بڑھ گئے۔ کچھ کی اپنی موٹریں تھیں اور کچھ تانگوں وغیرہ میں آئے تھے۔ باقی پیدل ہی چل پڑے تھے۔ لیکن بیلا وتی کے زینے سے وہ لوگ نیچے نہ اُترے۔ میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ بیلا وتی کے کوٹھے سے دوسرے بہت سے مہمان نیچے اُترے تھے۔ پتہ نہیں وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کچھ اور وقت گزرا تو میری پریشانی انتہا کو پہنچ گئی اور اب میں اپنے قدم نہیں روک سکا تھا..... یہ کیا ہوا؟ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اندر پہنچا۔ سارا سامان سمٹ رہا تھا۔ ایک ہی انداز ہوتا تھا ان کوٹھوں پر زندگی کے آغاز کا اور اختتام کا..... بیلا وتی نے مجھے دیکھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائیں۔ "شکنتا موجود نہیں تھی۔ بیلا وتی نے نرمی سے کہا۔

"ارے رتنا تُو..... تُو..... آ..... آ..... کسی کام سے آیا ہے کیا؟"

"نہیں' نہیں..... وہ بیلا جی! ..... بیلا جی.....!"

"ارے یہ بملا جی کیا ہوتی ہے بھئی! چاچی جی کہتا تھا تُو مجھے' آج بملا جی کیسے کہہ رہا ہے؟ بھول گیا رے؟ ارے رتنا میں تیری چاچی ہوں' چاچی سمجھا؟"

"ہاں چاچی! وہ..... کچھ کام تھا آپ سے۔"

"رما رانی نے بھیجا ہے کیا؟"

"نن..... نہیں..... میں خود آیا ہوں۔"

"تو اندر آ..... ایسے اجنبیوں کی طرح باہر کیوں کھڑا ہے؟ آ بیٹھ۔ بڑی دیر میں آیا۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ معلوم کرنے آیا ہوں بملا جی!"

"پھر بملا جی؟"

"نن..... نہیں..... میرا مطلب ہے چاچی جی!" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا معلوم کرنے آیا ہے؟ اور آج یہ تُو کیسا بہکا بہکا سا ہے؟ ..... چل چھوڑ' کیا معلوم کرنے آیا ہے؟"

"وہ چار مہمان ایک ساتھ آئے تھے۔ ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

"چار مہمان....." بملا وتی نے ذہن پر زور دے کر کہا اور پھر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "یہاں تو چار چار کر کے بہت سے مہمان آئے تھے۔"

"نہیں..... وہ ایک صاحب تلوار مار کہ مونچھیں تھیں ان کی۔ کالی ٹوپی پہنے ہوئے تھے..... کرتا' شیروانی اور..... اور.....

"

''اوہو اچھا سمجھ گئی۔ ہاں' کہیں باہر سے آئے تھے۔ شاید مراد آباد سے۔'' بملا وتی نے کہا۔
''کب چلے گئے؟''
''وہ تو بہت دیر پہلے اٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے تھے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہوں گے۔ مگر تھے کوئی رئیس قسم کے آدمی۔''
''نام نہیں پتہ ان کا؟''
''پوچھا تھا نام' نہیں بتایا۔ کہنے لگے مسافر ہیں۔ ناموں میں کیا رکھا ہے؟ بس فن کے قدردان ہیں۔ فن دیکھنے آ گئے تھے۔ شکنتا کو بہت کچھ دیا ہے انہوں نے۔ اچھے صاحب حیثیت معلوم ہوتے تھے۔''
''یہ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ مراد آباد کے ہیں؟''
''بس یونہی انہوں نے خود ہی بتایا تھا۔ کہنے لگے کہ مراد آباد سے آئے ہیں آپ کی دھوم سن کر۔ ہم نے نام بھی پوچھا' مگر بتایا نہیں۔''
''وہ...... وہ ان کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔''
''ہاں...... سب ان کے مصاحب معلوم ہوتے تھے۔ کوئی اچھے خاصے نواب وغیرہ لگتے تھے۔ رئیس آدمی تھے۔''
''کیا وہ...... میرا مطلب ہے کہ واپس مراد آباد چلے [illegible]''
''لے' مجھے کیا معلوم؟ مگر تجھے ان کی کھوج کیوں [illegible]؟'' بملا وتی نے کہا۔
''نہیں چاچی! بس ایسے ہی عجیب سے لوگ تھے۔ نجانے کیوں جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کون ہیں۔''
بملا وتی نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔
''لے مجھے کیا معلوم تھا' پتہ چل جاتا تو نام پتہ بھی پوچھ لیتی ان کا...... اب اتنا تو تجھے پتہ ہی ہے' یہاں نجانے کون کون آتا ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خان ہوتے ہیں ان میں۔ مگر ہمیں ان کی تیس مار خانی سے کیا لینا۔ ہمیں تو بس اتنا ہی کام ہوتا ہے ان سے جتنی ضرورت ہو آ بیٹھ! کچھ کھائے پیئے گا؟''
''نہیں چاچی! بہت بہت شکریہ۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ دل رو رہا تھا۔ یقیناً ان دونوں لمحات میں سے کوئی لمحہ ان کے جانے کا ہوسکتا تھا جب مجھے گھر واپس جانا پڑا تھا۔ سب ہی پر غصہ آ رہا تھا۔ کشنا نے مجھے پھولوں میں اُلجھا لیا تھا اور مالتی مجھے بلانے آ گئی تھی۔ آہ...... بہت ہی برا ہوا۔ بہت ہی برا۔ بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ دل پر ایک بوجھ سا لئے واپس آیا اور اپنے کمرے میں آ کر پڑ رہا۔
یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا ماموں ریاض بھی ان کے ساتھ مراد آباد سے آئے تھے؟ مراد آباد...... مراد آباد...... لیکن وہ فوراً ہی مراد آباد چلے تو نہیں گئے ہوں گے۔ شکتی پور میں نجانے کہاں ٹھہرے ہوں گے۔ بہرحال شکتی پور بھی اتنی چھوٹی جگہ نہیں تھی کہ میں ایک ایک گھر میں جھانک کر انہیں تلاش کر سکتا۔ آہ میری بدنصیبی! میری بدنصیبی نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اگر ہمت کر کے ماموں ریاض سے مل ہی لیتا تو کیا ہو جاتا۔ جو ہونا ہے وہ تو ہر قیمت پر ہی ہوگا۔ ایک بار پھر وہ میرے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ جی چاہا کہ دیوانہ وار باہر نکل جاؤں۔ گلی گلی' کوچے کوچے میں ماموں ریاض...... ! ماموں ریاض ! ...... پکارتا پھروں۔ لیکن اس سے کیا ہوگا؟ شکتی پور میں زیادہ اچھے ہوٹل تو نہیں تھے۔ لیکن وہ نواب قسم کے آدمی تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ہوٹل ہی میں ٹھہرے ہوں۔ ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ فیصلہ کیا کہ ہوٹلوں کے چکر لگاؤں۔ معلوم کروں' لیکن نام پتہ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ دیوانگی ہی ہوتی۔ دیوانگی ہی تھی میری...... میں...... میں ماموں ریاض کو پھر سے کھو بیٹھا تھا۔
لیکن ماموں ریاض! آخر وہ یہاں کیسے آئے؟...... وہ تو ان چکروں میں کبھی نہیں تھے۔ یہ اندازہ تو ضرور ہو رہا تھا مجھے کہ وہ شوقین صاحب جو عجیب سا حلیہ بنائے ہوئے تھے۔ ماموں ریاض کو لائے ہوں گے اپنے ساتھ۔ ورنہ ماموں ریاض تو

بڑے نیک فطرت آدمی تھے۔ لیکن وہ مجبور کیسے ہو گئے؟ بہت سی باتیں ذہن میں چکرا رہی تھیں لیکن جواب کسی بات کا نہیں مل رہا تھا۔ بڑا دکھ ہوا تھا مجھے اپنی اس حماقت پر۔ زیادہ سے زیادہ یہ تو کیا جا سکتا تھا کہ ماموں ریاض کا پیچھا کر کے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا جاتا اور پھر ان سے ملتا۔

دل میرے مختلف سوالات کے جواب خود ہی دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے ماموں ریاض سے ملنے کے بعد صورت حال کچھ اور زیادہ پریشان کن ہو جاتی۔ وہ مجھے نہ چھوڑتے' گھر لے جاتے۔ امی اور ابا کے پاس لے جاتے اور...... پھر میں ان کے ساتھ رہتا اور وہ مصیبتوں کا شکار ہو جاتے۔ آہ...... جو کچھ ہوا بہتر ہی ہوا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ ماں باپ کو' بہن بھائی کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ یہ آنسو نہ جانے کب تک تکیہ بھگوتے رہے تھے اور میں بھیگے ہوئے تکیے پر رخسار رکھ کر سو گیا۔ آنسوؤں کی ٹھنڈک خواب آور بن گئی تھی۔

صبح دل بڑا بوجھل تھا۔ آنکھ تو نہ جانے کب کھل گئی تھی' مگر اٹھنے کو جی نہیں چاہا۔ بہت دیر تک اس طرح لیٹا رہا پھر مالتی اندر گھس آئی۔

''آج اٹھنا نہیں ہے کیا رتن جی! مسافر سو سو کوس دور نکل گئے اور ہمارے رتن جی ابھی بستر پر ہی لیٹے ہیں۔''

''جاگا ہوا ہوں مالتی!''

''بھوجن لگا دیں کیا؟''

''سب نے ناشتہ کر لیا؟''

''لو ناشتے کی بات کرتے ہو۔ رما رانی تو اب پھر نسوڑہ بھی پہنچ گئی ہوں گی' دوپہر بعد واپس آ جائیں گی۔''

''چاچی جی بھر نسوڑہ گئی ہیں؟''

''ہاں لکشمی بیٹا کو لے کر استاد جی کے ساتھ گئی ہیں' اٹھ جاؤ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔''

''رادھا اور کشنا کہاں ہیں؟''

''رادھا رانی بازار گئی ہیں' کشنا کے پاس مولسری آئی ہے۔''

''تم ناشتہ یہیں لے آؤ مالتی! میں منہ ہاتھ دھو لیتا ہوں۔'' اٹھ گیا' ناشتہ کیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے' کچھ نہ سوچ پایا تھا کہ کشنا اندر گھس آئی' مگر اس وقت اس کے چہرے پر شوخی نہیں تھی' آنکھوں میں پانی بھرا تھا' ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آہستہ سے بولی۔

''رتن!''

''ہوں!''

''رات کو شکنتا کے پاس گئے تھے؟''

''نہیں ......نہیں تو۔''

''جھوٹ مت بولو۔ بتاؤ گئے تھے۔ بتاؤ تم ان کے کوٹھے گئے تھے؟''

''ہاں مگر شکنتا کے پاس نہیں۔''

''تم سمجھتے ہو سب بے وقوف ہیں مولسری بتا رہی تھی کہ گئے تو تم شکنتا کے پاس تھے' لیکن بملا جی سامنے آئیں تو تم نے بہانے بنانے شروع کر دیئے کہ کسی کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہو۔ تم سمجھتے ہو تمہارے بہانے چل گئے اور وہ شکنتا خوب بگڑی ہے صبح سے کہ تم اس کے پاس آئے تھے تو اسے بتایا کیوں نہیں گیا؟ جانتے ہو مولسری کیا کہہ رہی تھی؟''

میں جانتا تھا کہ مولسری' شکنتا کی بہن اور بملاوتی کی بیٹی تھی اور اس وقت موجود تھی جب میں وہاں گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے کشنا کو دیکھتا رہا۔

''کہہ رہی تھی رتن جی بنے ہوئے پاگل ہیں۔ وہ یہاں بس ایسے ہی خود کو پاگل بتاتے رہتے ہیں اور کہہ رہی تھی...... کہہ

رہی تھی......؟"

"تم وہاں گئے ہی کیوں۔ پریم کرتے ہو شکنتلا سے...... جانتے ہو وہ کیا ہے؟ بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہے کچھ بھی نہیں ملے گا تمہیں اس سے مفت میں مارے جاؤ گے۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور تم بن رہے ہو۔ ہم سب کی گردنیں جھکا رہے ہو۔ کیا رکھا ہے اس میں' چتر زمانے بھر کی۔ رتن! میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔ میں بھی تو تم سے پریم کرتی ہوں۔ اتنی بری ہوں میں...... بولو اتنی بری ہوں۔ انسان تو ہوں۔ کوٹھے پر پیدا ہو گئی ہوں تو کیا ہے۔ ایک بار کہہ کر دیکھو سنسار چھوڑ دوں گی تمہارے لیے۔ آج مجھے بتا دو کیا کمی ہے مجھ پر۔ آج مجھے بتا دو رتن......" وہ سسکنے لگی۔ دلی رنج ہوا تھا مجھے۔ یہ ہنستی کھیلتی لڑکی ہنستی ہی اچھی لگتی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"کشنا! یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... رو نہیں کشنا! سنو۔ جو میں کہہ رہا ہوں سنو۔ سنو کشنا' رونا چھوڑ دو۔ میری بات سنو۔ کشنا! رمارانی میرے لیے ماں جیسی ہیں۔ انہوں نے مجھے ایسے وقت میں سہارا دیا ہے جب میں نہیں جانتا کہ ان کا سہارا نہ ہوتا تو میرا کیا ہوتا؟ ان کی قسم کھاتا ہوں میں' تمہاری قسم کھاتا ہوں کشنا کہ مجھے شکنتلا سے پریم نہیں ہے۔ اس کے دل میں جو کچھ بھی ہو' میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو کشنا! میں جھوٹ نہیں بولتا جو کہہ رہا ہوں سچ ہے۔ رات کو میں وہاں گیا تھا اور کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے جنہیں میں نے گلی میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے کچھ جانے پہچانے لگے تھے۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں کشنا! مگر ابھی رہنے دو۔ ایک بار پھر تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

کشنا اتنی خوش ہوئی میری بات سے کہ ناقابل بیان ہے۔ اس نے کہا۔ "بس! اب مجھے کوئی چنتا نہیں ہے۔ اب سب ٹھیک ہے۔ ہونہہ' اپسرا رانی خود کو نہ جانے کیا سمجھتی تھیں۔" بات ختم ہو گئی' معصوم سی کشنا کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ لیکن بہت سی باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کشنا کے دل میں میرے لیے کچھ اور تصور تھا۔ میرے اپنے ہی رشتے نہیں مل رہے تھے' نئے رشتے کیا قائم کرتا حالانکہ رمارانی نے مجھے بیٹا کہا تھا اور اس رشتے سے کشنا میری بہن ہوتی تھی' مگر اس جگہ رشتے نہیں تھے' یہاں کی دنیا تو کچھ اور ہی ہے۔ مگر کیا میں...... کیا میں اس دنیا میں گزارہ کر سکتا ہوں۔ کیا یہ سب کچھ درست ہے؟ کیا اسی طرح ایک محفوظ جگہ پا کر میں وقت گزارتا رہوں گا۔ کیا یہی زندگی ہے؟ کیا کروں آہ کیا کروں؟

کشنا چلی گئی تھی۔ شکنتلا کی طرف سے مطمئن ہو کر اس کے دل کو اطمینان ہو گیا تھا' مگر میں بے سکون تھا۔ مجھے کسی پل سکون نہیں تھا۔ میں کیا کروں۔ ماموں ریاض ایک بار پھر یاد آئے اور کچھ ہوتا نہ ہوتا ان سے ملاقات ہو جاتی تو ماں باپ اور بہن کی خیریت ہی معلوم ہو جاتی۔ اتنا سکون تو ہو جاتا۔ ان کے ساتھ نہ جانا ان کی کوئی بات نہ ماننا' مگر دل کو قرار تو مل جاتا۔ اس بے قراری سے کیسے نجات پاؤں۔ بملاوتی کے کچھ الفاظ یاد آئے۔ کوئی رئیس معلوم ہوتے تھے۔ شکنتلا کو بہت کچھ دے گئے ہیں۔ شکنتلا ہی کو کیوں؟ ان کا شکنتلا سے کیا تعلق؟ وہاں مولسری بھی تھی۔ گیتا بھی تھی۔ یہ دونوں بھی بملاوتی کی بیٹیاں تھیں۔ ہوسکتا ہے شکنتلا کو ان رئیس کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ اوہ...... ہوسکتا ہے یہ خیال دل میں جڑ پکڑ گیا۔ وقت معلوم کیا۔ کچھ دیر کے بعد شکنتلا اپنے کالج سے وہاں پہنچے گی جہاں وہ مجھے لے گئی تھی اگر وہاں پہنچ جاؤں تو وہ مل جائے گی۔ اس نے تو مجھ سے روز وہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے ہی منع کر دیا تھا۔

جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ نیچے بے رونقی پھیلی ہوئی تھی' یہاں تو شام کو زندگی بیدار ہوتی تھی۔ سورج ڈھلے دکانوں کی صفائی ہوتی' گلی میں چھڑکاؤ ہوتا اور جوں جوں اندھیرا اترتا' گلی روشن ہوتی جاتی تھی۔

میں تیز قدموں سے چل پڑا۔ طویل فاصلہ تھا۔ یہاں سے ایک تانگے نے بالآخر مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں وہ مکان واقع تھا۔ تانگے والے کو پیسے دے کر آگے بڑھا اور اس مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شکنتلا اندر موجود ہے۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ شکنتلا کی گاڑی بھی نظر آ گئی۔ سکون ہوا کہ وقت پر آ گیا ہوں۔ مگر یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے کسی حد تک علم تھا کہ یہاں کوئی باقاعدہ نہیں رہتا۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کا پٹ حسب معمول کھلا

ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی سے صحن میں پہنچا' مکان کا پراسرار سناٹا بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ دل کو خوف کا احساس ہوا۔ میں نے ہمت کر کے آواز دی۔

''شکنتلا جی ......شکنتلا جی ! کیا آپ موجود ہیں ......؟'' سامنے والا دروازہ فوراً کھلا اور ایک اجنبی شکل نظر آئی۔ یہ بھی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ کالی ساڑھی میں ملبوس غزالی آنکھوں والی جن میں مسکراہٹ تھی۔

''آیئے...... اندر آ جایئے۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔

''شش......شکنتلا دیوی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہیں آیئے نا۔'' اور میں صحن عبور کر کے دالان اور پھر اس کمرے میں داخل ہو گیا جس میں شکنتلا مجھے پہلے دن لے گئی تھی۔ یہاں چار لڑکیاں اور تھیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں آج یہاں آ گیا کہ جانے یہ لڑکیاں کون ہیں؟

''کہاں ہیں شکنتلا......؟''

''آتی ہے ......آپ بیٹھیے تو۔''

''آپ کون ہیں؟''

''سکھیاں ہیں اس کی۔''

''اوہ! کالج سے آئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں!'' وہ ہنس پڑیں۔ میں بری طرح جھینپ رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں گی یہ میرے بارے میں۔

''بیٹھیے نا......'' ان میں سے ایک لڑکی میرے بالکل قریب آ گئی اور اس نے میری طرف ہاتھ بڑھائے تو میں بوکھلا کر جلدی سے بیٹھ گیا۔

''شکنتلا سے کہہ دیں رتن آیا ہے۔''

''انمول رتن۔'' وہ لڑکی شرارت سے بولی۔

''نہیں صرف رتن!'' میں نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

''آپ صرف تو نہیں ہیں۔'' اس نے بدستور شرارت سے کہا۔

''کہہ دے نا......! میں پریشان ہو رہے ہیں۔'' ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔

''اچھا کہے دیتے ہیں۔'' وہ مجھے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں احمقوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ نگاہیں قالین پر جمی ہوئی تھیں۔ شکنتلا کسی دوسرے کمرے میں تھی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ ساری شریر لڑکیاں مجھے گھور رہی ہیں۔ بڑی بوکھلاہٹ محسوس کر رہا تھا' مگر کیا کرتا اب آ ہی گیا تھا۔ شکنتلا کو میرے آنے کی خبر تو تھی نہیں' اپنی کالج کی سہیلیوں کو ساتھ لے آئی ہو گی۔ کچھ دیر کے بعد وہ لڑکی واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت تھالی تھی' جس میں چاندی کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ چاندی کا ایک صراحی نما جگ بھی تھا۔

''ابھی آتی ہیں وہ۔ آپ بیٹھیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''کچھ مصروف ہیں۔'' میں نے گھبراہٹ میں کہا۔

''ہاں کپڑے بدل رہی ہیں۔''

''میں پھر آ جاؤں گا۔'' میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ارے نہیں......نہیں آپ بیٹھیے تو...... لیجیے یہ شربت پئیں۔'' لڑکی نے جگ کا مشروب گلاس میں انڈیل کر مجھے دیا۔

''نہیں......شکریہ۔''

''ارے واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے پیجیے......'' اس نے مشروب کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہلکا گلابی رنگ کا شربت تھا' مگر اس کے نچلے حصے میں کوئی گاڑھی سی سرخ شے بیٹھی ہوئی تھی۔ خوش رنگ ہونے کے باوجود اس سے ہلکا ہلکا تعفن اٹھ رہا

تھا۔ میری ناک نے سڑے ہوئے خون کی بو محسوس کی اور دفعتاً میرا دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ یہ سب کچھ...... کچھ اور ہے۔ میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ سب شرارت سے مسکرا رہی تھیں۔

''یہ کیا مذاق ہے؟ میں پھر آؤں گا۔ شگفتا سے کہہ دیں۔'' میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ مگر اس وقت شگفتا اندر داخل ہو گئی۔ غیر معمولی لباس پہنا ہوا تھا اس نے' بہت ہی زرق برق' جھلملاتا ہوا اور بہت حسین میک اپ کیا ہوا تھا۔ لباس ایسا تھا کہ میری آنکھیں جھک گئیں۔

''ارے کیا ہوا؟'' اس کی آواز ابھری۔

''شگفتا...... میں پھر آؤں گا۔''

''کیوں آخر...... ضرور تم نے شرارت کی ہو گی۔ رتن! یہ میری سکھیاں ہیں بڑی نٹ کھٹ۔ اگر انہوں نے کوئی بری بات کی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔'' شگفتا نے کہا۔

''تو...... ہم نے کیا کیا ہے؟ کیوں رتن جی! بتایئے ہم نے کیا کیا ہے؟'' وہ لڑکیاں بیک وقت بولیں۔

''نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بس میں پھر آؤں گا۔''

''ایسے نہیں جانے دوں گی۔ بیٹھو۔'' شگفتا بولی۔

''دراصل میں تمہارے پاس کچھ معلوم کرنے آیا تھا۔ پھر آؤں گا اس وقت میرا جانا بہتر ہے۔''

''نہیں رتن! ایسے نہیں جانے دوں گی۔ ارے تم شکل کیا دیکھ رہی ہو۔ چلو گانا شروع کرو۔ رتن جی آئے ہیں۔ چلو سنا نہیں تم نے۔'' وہ سب متحرک ہو گئیں' اس سے پہلے میں نے اس کمرے میں وہ ساز نہیں دیکھے تھے' ستار' سارنگی' طبلہ سب کچھ موجود تھا۔ لڑکیوں نے ساز سنبھال لیے۔ میرا دل سینے میں اینٹھ رہا تھا' یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ فضا میں ستار کی آواز ابھری اور پھر ساز ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ ایک عجیب سی طلسمی فضا پیدا ہو گئی' ان آوازوں میں ذہن کو معطل کرنے کی صلاحیت تھی۔ ماحول پر ایک نشہ آور کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ذہن جیسے سونے لگا۔ ہاتھ پاؤں مضمحل سے ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہوشربا آواز میں ایک انوکھا نغمہ شروع کر دیا تھا' جس کے بول سمجھ میں نہیں آ رہے تھے' لیکن آواز کا مدوجزر حواس گم کر رہا تھا' آنکھیں جیسے بند ہونے لگی تھیں۔ شگفتا نے مشروب کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''لو پیئو......'' اس نے مدہوش کن لہجے میں کہا۔

''کیا ہے یہ......؟''

''امرت...... پیو گے تو امر ہو جاؤں گا۔'' وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ گلاس میرے ہاتھ میں آ گیا اور میرا ہاتھ ہونٹوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک ناک پر اسی ناگوار بو کا بھبکا لگا۔ سڑے ہوئے خون کی بو...... اور سوتے ہوئے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھ کو کرنٹ لگا ہو۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ گلاس میرے ہاتھ سے نکل کر فضا میں بلند ہو گیا اور اس میں لبالب بھرا ہوا مشروب چھینٹوں کی شکل میں منتشر ہو گیا۔ یہ ساری چھینٹیں ان شوخ لڑکیوں کو بھگو گئیں۔ ایک دم ساز بند ہو گئے۔ آواز گم ہو گئیں' ماحول پر ہولناک سناٹا چھا گیا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں نے سامنے کا منظر دیکھا۔ جونہی ان لڑکیوں کے جسم پر مشروب کی چھینٹیں پڑیں' ان کی ہیئت بدلنے لگی۔ ان کے ہاتھوں سے ساز چھوٹ گئے اور پھر ان کے جسم عجیب سے انداز میں بل کھانے لگے۔ ہاتھ اور پاؤں مڑنے لگے' گردنیں ٹیڑھی ہونے لگیں۔ ان کے جسموں کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ مختصر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وہ سر گھٹنوں میں لے کر مزید سکڑنے لگیں۔ جسم کے کپڑوں کے رنگ ماند پڑتے جا رہے تھے۔ کوئی دو منٹ تک یہ کیفیت مسلسل جاری رہی اور پھر وہ بڑی بڑی مکڑیوں میں تبدیل ہو گئیں اور سوکھے سوکھے ہاتھوں اور

پیروں کی مدد سے مکروہ انداز میں چلتی ہوئی اندرونی دروازے میں گم ہو گئیں۔ پھر اچانک شکنتا اپنی جگہ سے اٹھی اور میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں، مگر وہ شکنتا کہاں تھی؟ لباس وہی تھا مگر چہرہ ......! یہ منحوس میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ آہ! یہ بھوریا چرن تھا۔ اس کی بھیانک پیلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ اس نے منہ سے کچھ کہا۔ ایک لمحے مجھے گھورتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے مڑا، اس کا زرق برق لباس لہریں لے رہا تھا اور اس کے قدم بھی اسی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جس میں وہ مکڑیاں داخل ہوئی تھیں۔ پھر وہ بھی اسی دروازے سے اندر چلا گیا۔

وسیع کمرے میں بھیانک سناٹا پھیل گیا۔ میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ یہ ہولناک کھیل معمولی نہیں تھا۔ اس کے باوجود کچھ دیر اعضا کو جنبش نہ دے سکا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس ہولناک خالی مکان میں دم گھٹ رہا تھا، لیکن ہاتھ پاؤں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد یہ کیفیت دور ہوئی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مکان سے باہر نکلا، گلی میں آیا اور پھر بھاری بھاری قدموں سے چلتا ہوا گلی کے سرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ مجھے انسانی خون پلانا چاہتا تھا۔ سڑا ہوا انسانی خون! جس میں اس نے ایک خوش رنگ مشروب شامل کر دیا تھا۔ مگر کیوں ......؟ اس سے اسے کیا حاصل ہوتا؟ کیا ماحول، کیا سماں پیدا کیا تھا اس نے۔ میں تو طلسمی جال میں پھنس ہی گیا تھا۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا۔ پیدل چلتا رہا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ ہوش درست ہوئے تو خود کو روشن گلی میں ہی پایا۔ اسی وقت شکنتا کی چھوٹی بہن پاروتی نظر آئی جو دوڑتی میری طرف آ رہی تھی۔

''رتن بھیا...... رتن بھیا!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور میں رک کر اسے دیکھنے لگا۔

''دیدی بلاتی ہے۔'' اس نے انگلی سے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میری نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ کھڑکی میں شکنتا کھڑی تھی، مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے ہاتھ سے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ شکنتا کے اس دوسرے ٹھکانے پر جو کچھ میں نے دیکھا تھا، اس سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہاں بھوریا چرن نے اپنا جال بچھایا تھا اور شکنتا سرے سے وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ میں شکنتا کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ پاروتی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ پتا نہیں بملاوتی گھر پر موجود تھیں یا نہیں ...... کیونکہ وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ شکنتا البتہ کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی، میں قریب پہنچا تو اس نے پاروتی سے کہا۔

''تو جا پاروتی، کھیل۔'' اور پھر اس نے مجھے اندر کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کہاں دھوپ میں مارے مارے پھر رہے ہو۔ گال دیکھو ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہے ہیں۔ شربت لاؤں ......؟''

''نہیں ......'' میں نے سہم کر کہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ایک شربت سے نمٹ کر آ رہا تھا۔

''کہاں گئے تھے دوپہر میں ......؟''

''بس ایسے ہی، تم کالج نہیں گئیں؟''

''تین دن کی چھٹی ہے، ہڑتال ہو گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''سب لوگ کہاں گئے؟''

''سو رہے ہیں اپنے کمروں میں۔ یہاں دن میں کون جاگتا ہے؟''

''تم جاگ رہی تھیں ......؟''

''ہاں ...... تمہارے پیروں کی چاپ سن لی تھی۔ پتا چل گیا کہ ہمارے راج کمار رتن آ رہے ہیں۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو سچ ہی نکلا اور پارو کو دوڑا دیا۔ کیسی رہی ......؟''

میں جواب میں مسکرا بھی نہیں سکا تھا۔ کیا بتاتا اسے کہ کیسی رہی؟ پھر میں نے کہا۔

''شکنتا! میں خود بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک بات معلوم کرنی ہے تم سے۔''

"کیا......؟"

"پچھلی رات کچھ لوگ تمہارے گھر آئے تھے جن میں ایک صاحب تلوار مارکہ مونچھوں والے تھے' کالی ٹوپی' شیروانی اور کرتہ پہنے ہوئے۔ بڑے شوق سے سنا ہے انہوں نے تمہیں' کچھ دیا بھی ہے' کچھ معلوم ہے کہ کیا نام ہے ان کا......؟"

"مراد آباد کے پاندان۔" شکنتا نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا مطلب......؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس اتنا ہی نام پتا چلا ان کا' کہنے لگے کہ نام سے کیا لینا ہے۔ تماشبین ہیں کچھ سننے آئے ہیں۔ من تو چاہا کہ انہیں خوب بہت سی گالیاں سناؤں' پھر ماتا جی کا خیال تھا' آنکھیں دکھائے جا رہی تھیں مجھے! ارے ہاں بس دیکھ لیا تھا مجھے جان کو آگئے' بلا کر چھوڑا' حالانکہ مولسری اور دوسری لڑکیاں گا رہی تھیں' مگر مراد آباد پاندان نے مجھے دیکھ جو لیا تھا۔ ماں نے بتایا کہ میں نے ابھی ناچنا گانا شروع نہیں کیا ہے' سیکھ رہی ہوں تو ایڈوانس دے کر چلے گئے۔ گھر والی کی گردن سے نیکلس اتار لائے ہوں گے' میری گردن میں ڈال گئے اور کہہ گئے کہ جب میں گانا شروع کروں گی تو میری آواز کی لے پر کھنچے چلے آئیں گے۔ ایسے باؤلے اکثر آتے رہتے ہیں' مگر تمہیں ان کے بارے میں معلوم کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

✦✦✦✦✦

"بس ایسے ہی' کچھ اور پتا نہیں چلا ان کا......؟"

"کس کی جوتی کو پڑی تھی جو پتا چلاتا۔ مگر تمہیں کیوں کھوج ہوئی؟ سمجھی! میری وجہ سے...... ہے نا......؟"

"ہاں......!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور شکنتا سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے رتن! بس کچھ دن ہی جاتے ہیں' جب میں یہ جگہ چھوڑ دوں گی۔ بملا وتی جی پریشان ہیں' ہیرا جو نکل رہا ہے ان کے ہاتھ سے' مگر میرے پتا جی انہیں میرے وزن کے برابر ہیرے تول کر دے دیں گے۔ کہہ دیا ہے انہوں نے بملا وتی جی سے اور پھر رتن ایک نئی مثال قائم ہو جائے گی' اس جگہ پیدا ہونے والی کوئی لڑکی شریفوں کی دنیا میں پہنچ جائے گی۔ ناک بھوں چڑھانے والوں کے منہ سیدھے ہو کر رہ جائیں گے۔ لوگ اس جگہ کو اندھا کنواں کہتے ہیں' جس میں کوئی بھی کہیں سے آکر گر تو سکتا ہے' نکل کر روشنی کی دنیا میں نہیں جا سکتا' میں تو ہر طرح سے خوش نصیب ہوں کہ باہر بھی جاؤں گی اور میرے من کا سکھ بھی مجھے مل جائے گا۔" اس نے محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی اس آواز نے مجھے دکھی کر دیا۔ کم از کم اس مسئلے میں وہ خوش نصیب نہیں ہے کیونکہ جسے اس نے اپنے من کا سکھ سمجھا ہے' وہ کانٹوں بھری سیج ہے' اس کی اپنی زندگی میں کوئی سکھ نہیں ہے۔ وہ کسی کا کیا سکھ بن سکتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس سے کہنا بیکار تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس رکا' اس کی باتیں سنتا رہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔

روشن گلی کا تاریک دن ہر گھر پر مسلط تھا۔ رما رانی شاید واپس آچکی تھیں' مجھے کوئی بھی نہ ملا اور میں نے اپنے کمرے میں آکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بستر پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا اور دماغ میں واقعات کا طوفان میل چل پڑا۔ اب تو رونے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا' اتنا رو چکا تھا کہ آنسو بے مقصد ہو گئے تھے۔ ماموں ریاض کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شام ہوئی' رات ہوگئی لیکن اب میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس سے زیادہ یہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی سے رشتہ قائم ہو جائے' کسی سے ٹوٹ جائے لیکن بھوریا چرن مجھے نہیں چھوڑے گا' کہیں نہیں چھوڑے گا۔ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا تھا۔ مجھے اپنے کام پر آمادہ کرنے کے لئے وہ ہر گر آزما سکتا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ تھے۔ ہر ایک کا اپنا معاملہ تھا۔ کسی کو بھی میری وجہ سے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ البتہ ایک اندازہ میں بار ہا لگا چکا تھا۔ بھوریا چرن نے اب تک صرف ان لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا تھا' جو میری کہانی سے یا اس سے واقف تھے یا جو میرے اس مسئلے کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ جن لوگوں کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا' وہ محفوظ رہتے تھے۔ پھر بھی خطرہ تو رہتا ہے۔ یہاں مجھے بہت سی پریشانیاں تھیں۔ ضمیر اس ماحول کو برداشت

نہیں کر رہا تھا۔ یہ لوگ کچھ بھی تھے میرے حق میں برے نہیں تھے۔ اگر میری وجہ سے انہیں نقصان پہنچا تو کچھ نہیں کر سکوں گا ان کے لئے۔ کشنا اور شکنتا کا معاملہ تھا۔ پولیس تھی' نہ جانے کیا کیا تھا۔ یہاں سے اب نکل جانا چاہئے۔ آخری فیصلہ کر لیا۔ بہت وقت گزارا تھا یہاں عالم بے ہوشی میں اور اس عالم بے ہوشی میں رما دیوی کے احسانات بھی تھے مجھ پر۔ جانے سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک کاغذ اور قلم تلاش کیا میں نے اور لکھنے بیٹھ گیا۔ میں نے لکھا۔

''رما رانی جی!

بڑے فخر سے' بڑے مان سے میں آپ کو ماتا جی کہہ سکتا ہوں۔ اس دن آپ نے کہا تھا کہ میں ہوش میں آؤں گا تو اس جگہ کو برا سمجھوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس وقت ہوش میں آ چکا تھا۔ سب کچھ جان چکا تھا۔ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ رما جی! اس دنیا کو میں نے بہت زیادہ نہیں دیکھا۔ جتنا دیکھا ہے' وہ مجھے بتاتا ہے کہ ماں کسی شکل میں ہو' ماں ہوتی ہے۔ میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں ایک مسلمان لڑکا ہوں اور اپنی غلطی کاریوں کے عذاب سے گزر رہا ہوں۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں میری نحوست میرے سرپرستوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ کئی بار کا تجربہ ہے اور اب میں اس گھر میں اپنی نحوستیں نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس لئے یہ گھر چھوڑ رہا ہوں۔ اگر میں ان نحوستوں کو شکست دے سکا تو ایک بار عقیدت کے پھول لے کر آپ کے گھر ضرور آؤں گا اور آپ کو بھری محفل میں ماں کہہ کر پکاروں گا۔ کیونکہ آپ اس قابل ہیں کہ آپ کو ماں کہا جائے۔
آپ کا بدنصیب...... رتن۔''

یہ کاغذ تہہ کر کے تکیے پر رکھا۔ باہر نکلا تو مالتی نظر آئی۔ میں نے اسے روکا۔

''مالتی! کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس؟''

''کتنے رتن جی؟''

''دو چار ہزار۔''

''یہ دو ہزار ہیں اور لا دوں؟''

''نہیں' بس کافی ہیں۔'' میں نے کہا اور پیسے جیب میں ڈال کر باہر نکل گیا۔ بہت افسردہ تھا۔ دنیا کے لئے یہ بہت بری جگہ تھی' لیکن مجھے یہاں بہت پیار ملا تھا۔ بڑی اپنائیت ملی تھی۔ دل دکھ رہا تھا اس جگہ کو چھوڑتے ہوئے۔ سیدھا ریلوے سٹیشن کا رخ کیا اور جو پہلی ٹرین آئی اس میں بیٹھ گیا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ یہ کہاں جا رہی ہے۔

ریل میں طرح طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیشہ ہی ہوتے تھے۔ یہ میرا پہلا سفر تو نہیں تھا۔ یہ سب مجھ سے کتنے مختلف ہیں۔ بے شک ان کے ساتھ مسائل ہوں گے' لیکن مجھ سے مختلف۔ یہ ان کا حل تو پا سکتے ہیں۔ میری مشکل کا کوئی حل تو دور دور تک نہیں ہے۔ میرے ذہن میں تو کوئی راستہ ہی نہیں آتا۔ نجانے میری انتہا کیا ہے؟ اب تو درد ہی دوا بنتا جا رہا ہے۔ اتنی مشکلیں آ گئی تھیں زندگی میں کہ آنے والی کسی مشکل کا خوف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہاں' اتنا ضرور کر سکتا تھا کہ کسی اور کو اپنی مشکل کا شکار نہ ہونے دوں اور یہ کر رہا تھا میں۔ ان مشکلات میں جینا سیکھ رہا تھا۔ مگر ان محبتوں کا کیا کرتا جو دل کے گوشے میں جا گزیں تھیں۔ ان پیاروں کو کیسے بھول سکتا تھا' جن کے ساتھ ہوش کی صبح ہوئی تھی۔ سچی بات ہے کہ اب تو زندگی سے دلچسپی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھ پر بہت سے مقدمے قائم تھے۔ ہو سکتا ہے اب تو مجھ پر کوئی انعام بھی رکھ دیا گیا ہو۔ گرفتار ہو جاؤں تو کچھ برا بھی نہ ہوگا۔ مگر وہ منحوس مجھے مرنے تو دے۔

آنکھوں میں غنودگی سی آ گئی۔ شاید کچھ نیند کے جھونکے بھی آئے تھے۔ قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے ہمدردی سے ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔

''نیند آوت رہے بیرا! لو لیٹ جاؤ' سو جاؤ۔ ہم جاگت رہیں۔''

''نہیں بابا جی! شکریہ۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔''

''نہ بیٹا! نہ۔ کاہے کی تکلیف۔ سفر ہے کتنا۔ کٹ جائے گا۔ لیٹ جاؤ۔''

6-B

''آپ مجھ سے باتیں کریں بابا جی! چپ چاپ بیٹھا ہوا ہوں اس لئے نیند کے جھونکے آنے لگے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تمہاری مرضی۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں بابا جی؟''

''بیکانری۔ ہمار بٹیا کی سسرال ہے ہواں۔ اُسے لینے جا دے ہیں۔''

''کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

''گاؤں ہمار رتولی ہے۔ سٹے کا کام کرتے ہیں ہواں۔ بیں گھر لگا رکھے ہیں۔ مولانا گزر کرا دیوے ہے۔'' معمر شخص نے کہا۔ مگر اس کے الفاظ میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ رتولی کا نام میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے کسی قدر بے صبری سے پوچھا۔

''آپ رتولی کے رہنے والے ہیں؟''

''ہاں بیرا! کیوں؟''

''کیا نام ہے آپ کا؟''

''امام بخش۔''

''بابا امام بخش! آپ تو وہاں کے رہنے والے ہیں۔ سب لوگوں کو جانتے ہوں گے۔''

''وہاں پُرکھوں سے آباد ہیں۔ پر اب نئی نگری بس گئی ہے ہواں۔ کچھ نئے لوگ آباد ہوئے ہیں۔''

''وہاں ایک نیک بزرگ رہتے تھے۔ بڑے سچے اور دیندار آدمی تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔''

''پرانے آباد تھے؟''

''ہاں...... بہت پرانے۔'' میں نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

''بڑے اچھے اچھے بزرگ آباد ہیں ہواں۔ ابراہیم نانا ہیں' حمید اللہ خان ہیں' علیم الدین خان مرحوم تھے۔ گلاب علی تھے۔ بے چارے ہندو مسلمانوں کے جھگڑے میں مارے گئے۔''

ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ایک نام شناسا تھا۔ سو فیصد چاند خان نے یہی نام لیا تھا۔ علیم الدین خان ...... آہ' یہی نام تھا۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''ہاں علیم الدین خان...... علیم الدین خان۔''

''فوت ہو گئے بے چارے۔ دمہ نے کر ٹلا۔ دمے کے مریض تھے اور پھر عمر بھی اسی سال ہو گئی تھی۔''

''انتقال ہو گیا ان کا؟'' میں نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

''لو...... آج کی بات ہے؟...... سات آٹھ سال ہو گئے۔ کوئی رشتے دار تھے تمہارے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ روشنی اندھیرا' روشنی اندھیرا...... یہی ہوا آج تک۔

''وہاں' وہاں ایک پرانی مسجد تھی۔ جس میں کسی نامعلوم بزرگ کا مزار تھا'' بالآخر میں نے کہا۔

''اسی پر تو جھگڑا چلا تھا۔ کم ذات ہریا لال نے سرکار سے آٹھ بیگھہ زمین خریدی تھی اور پرانی مسجد کی زمین بھی اسی زمین کے بیچ آ گئی تھی۔ ہریا لال وہاں آبادی کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے مسجد پر بھی نظر ڈالی اور مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ بس بھیا! لٹھ چلے' سر کھلے۔ چھ آدمی مارے گئے۔ چار مسلمان' دو ہندو۔ پولیس آ گئی۔ جھگڑا بہت بڑھا۔ پھر مقدمہ چلا اور فیصلہ ہریا لال کے حق میں ہو گیا۔ جس کی لاٹھی' اس کی بھینس۔ سرکار بھی انہی کی۔ وکیلوں نے کہا کہ مسجد پرانی ہے اور مسلمان اسے استعمال بھی نہیں کرتے اس لئے ہریا لال کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی زمینوں کو استعمال کرے۔ فیصلہ ہو گیا تھا۔ مگر مسلمان کافی عرصے تک ڈٹے رہے اور جب بھی ہریا لال نے مسجد کی طرف ہاتھ بڑھائے' مسلمان سر پر کفن باندھ کر آ گئے۔ خوب پکڑ دھکڑ رہی۔ آدھی بستی تو ایسے ہی خالی ہو گئی تھی۔ پھر ایک بزرگ کو خواب میں بشارت ہوئی۔ پرانی مسجد کے مزار کے

بزرگ نے کہا کہ زمین اللہ کی ہے۔ ہم خود یہاں سے ہٹے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ بزرگ کی بات سب نے مانی اور ہریا لال نے اپنا کام کر دکھایا۔ سو اب اس جگہ نئی نگری آباد ہو گئی ہے۔ سارے سسرے ہندو ہی آ کر آباد ہوئے ہیں ہواں۔ یہ ہے وہاں کی بات۔ پر علیم الدین خان صاحب کا تو سات آٹھ سال پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔"

میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ میرے دل میں ایک عجیب سی ہوک اُٹھ رہی تھی۔ یہی ہو رہا ہے...... شروع سے یہی ہو رہا ہے۔ بھوریا چرن ہر راستہ روک لیتا تھا۔ تقدیر اگر کبھی کچھ سامنے لاتی بھی تو بھوریا چرن کھیل ہی ختم کر دیتا۔ کیا اس کم بخت کا کوئی توڑ نہیں ہے......؟ وہ سب سے بڑا گیانی تو نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑے ہوں گے۔ سفلی علوم کے ماہر اور بھی بہت سے ہوں گے۔ کیا ان سب کو ایسی ہی قوتیں حاصل ہوتی ہیں؟ بھوریا چرن ایک انسان ہی ہے اور کالے جادو کا ماہر ہے۔ اسے اتنی بڑی قوت کیسے حاصل ہو گئی؟ اور اگر اس سے زیادہ طاقت والے سفلی علوم کے ماہر ہیں تو کیا انہیں بھوریا چرن کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ یا پھر اس کے سامنے ایسی قوتیں لے آئی جائیں جو مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ بھلا کالے جادو کا ایک ماہر قرآنی علوم کے سامنے کیسے ٹک سکتا ہے؟ اگر کسی بزرگ کی نظر واقعی ہو جائے مجھ پر تو کیا میری کشتی پار نہیں لگ جائے گی؟...... یہ خیال دل میں عجیب سے احساسات پیدا کرنے لگا۔ بے چارہ امام بخش سادہ نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"رتولی گئے ہو بھیا! کبھی؟"

"نہیں بابا جی! میں کبھی نہیں گیا۔"

"تو پھر علیم الدین خان کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"بس ایسے ہی۔ نام سنا تھا کسی سے اور اس مزار کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جہاں سے لوگوں کو بڑا فیض ملتا تھا۔"

"ارے ان کی کیا پوچھو ہو۔ رتولی سنبھالے ہوئے تھے۔ جو پہنچ جاتا' مراد پوری ہو جاتی تھی۔"

"یقیناً بابا جی! یقیناً۔ ویسے بابا جی! اور بھی ایسے مزار ہوں گے جہاں مرادیں پوری ہو جاتی ہوں گی؟"

"لو بھیا! بزرگوں سے دنیا خالی ہو گئی کیا؟ ارے ایک سے ایک پڑے ہوئے ہیں۔"

"آپ کو کسی ایسی جگہ کا پتہ معلوم ہے......؟ کوئی ایسے بزرگ جن کا بڑا نام ہو"

"کوئی کمی ہے ان کی؟ دلی جاؤ' نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ' اجمیر جاؤ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ' کلیر شریف جاؤ صابر رحمۃ اللہ علیہ اور پھر ہزاروں خدا کے نیک بندے ہر جگہ موجود ہیں۔ بھیا! کوئی منت ہے تمہاری؟"

"ہاں......" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ بابا امام بخش مجھے دیکھتے رہے۔ شاید سوچ رہے تھے کہ میں انہیں اپنی منت کے بارے میں بتاؤں گا اور پھر جب میں کچھ نہ بولا تو خود بھی خاموش ہو گئے۔

سفر جاری رہا۔ نہ جانے کب سو گیا۔ دن کی روشنی میں آنکھ کھلی تھی۔ گرمی لگ رہی تھی۔ ریل کے پنکھے نجانے کیوں بند ہو گئے تھے۔ بابا امام بخش بھی موجود نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے ان کا اسٹیشن آ گیا ہو۔ ریل کے پہیے رگڑ رہے تھے۔ شاید بریکیں لگ رہی تھیں۔

کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر خالی خالی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ سانسی کا اسٹیشن تھا۔ پتھر کی سِل پر یہ نام لکھا ہوا پڑھا تھا۔ ٹرین رک گئی لیکن بمشکل دو منٹ۔ پھر وسل ہوئی' ایک جھٹکا لگا اور ٹرین رینگنے لگی۔ میری نظریں کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر جمی ہوئی تھیں' جہاں اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے۔ آگے والے ڈبوں سے اس اسٹیشن پر اترے ہوئے لوگ ابھی اپنا سامان ہی سنبھال رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے انتہائی سرے سے میرا ڈبہ گزرا تو میں نے ایک برقع پوش عورت کو دیکھا جو شاید تنہا تھی۔ اس نے ایک وزنی ٹوکری سنبھالی ہوئی تھی' جو اچانک نیچے گر گئی۔ ٹوکری چٹائی کی بنی ہوئی تھی اور اس کا ہینڈل ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ سامان نیچے گرا تو عورت نے گھبرا کر اپنے برقع کا نقاب اُلٹ دیا اور اچانک بجلی سی چمک گئی۔ یہ سارا کھیل ایک لمحے کا تھا۔ میرے ڈبے نے پلیٹ فارم کا آخری سرا چھوڑ دیا۔ ٹرین رفتار پکڑنے لگی۔ مگر اس الٹے ہوئے

نقاب سے جو چہرہ نمودار ہوا تھا اس نے میرے پورے وجود کو لرزا دیا۔ وہ میری شمسہ تھی۔ میری چھوٹی بہن۔ آہ...... بھلا اپنے خون کو نہ پہچانتا؟ ...... کچھ لمحے تو حواس ہی معطل رہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو گئیں۔ مگر پھر ایک دم ہوش سا آ گیا۔ میں دیوانہ وار اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ممکن تھا کہ چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دیتا' مگر ہاتھ زنجیر پر جا پڑا تھا اور ذہن نے ساتھ بھی دیا تھا۔ چنانچہ پوری قوت سے کھینچ دی۔ لوگ چونک کر میری اضطراری حرکتوں کو دیکھنے لگے۔ کسی نے کچھ کہا بھی تھا' مگر میں دروازے پر پہنچ گیا اور آدھا نیچے لٹک گیا۔ لوگ چیخنے لگے تھے۔ مگر کسی کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

ٹرین کی رفتار فوراً ہی مدھم ہونے لگی اور پھر بس وہ اتنی مدھم ہوئی کہ مجھے زمین نظر آنے لگی تو میں نے چھلانگ لگا دی۔ پلیٹ فارم کافی دور ہو گیا تھا۔ پیچھے کیا ہوا' مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس میں بے تحاشا پلیٹ فارم کی طرف بھاگ رہا تھا۔ شمسہ...... آہ' وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ ...... وہ ٹرین میں تنہا کہاں سے آئی تھی؟ ...... شمسہ میری بہن ...... شمسہ ...... پیروں میں پنکھ لگ گئے۔ خاصا فاصلہ تھا' مگر میں نے برق رفتاری سے طے کر لیا اور پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا' مگر میں آنکھیں پھاڑے شمسہ کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ اب پلیٹ فارم پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً سامان سنبھال کر باہر نکل گئی ہو گی۔ چنانچہ میں اسٹیشن سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹکٹ چیکر اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ میں باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ہر طرف نظریں دوڑائیں مگر شمسہ نظر نہیں آئی۔ کچھ فاصلے پر دو تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک آگے تھا اور دوسرا اس سے کچھ پیچھے۔ تانگے والا نیچے کھڑا گھوڑے کے شانے سہلا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''ابھی ...... ابھی یہاں تم نے کسی لڑکی کو دیکھا؟'' میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا اور تانگے والا منہ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''ایک لڑکی برقع پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں ٹوکری تھی۔'' میں نے پھر کہا۔

''ہاں جی۔'' تانگے والا بولا۔

''کہاں گئی؟ ...... کدھر گئی؟'' میں نے پھر کہا۔

''ہمارے کو کیا معلوم جی؟''

''او تم کہہ رہے تھے' تم نے اسے دیکھا ہے۔''

''دیکھا تو ہے جی' مگر وہ کدھر گئی' ہمیں کیا معلوم؟''

''پیدل گئی ہے؟'' میرا سانس بحال ہوتا جا رہا تھا۔

''نہیں جی ...... سجو کے تانگے میں گئی ہے۔''

''اوہو ...... تو یہ کہو۔ چلو تم بھی چلو۔'' میں اس کے تانگے پر چڑھ گیا اور تانگے والا حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''عجیب بے وقوف آدمی ہو...... چلتے ہو یا میں تمہارا تانگہ لے جاؤں؟'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''ارے نہیں جی ...... مگر جاؤ گے ہاں؟'' وہ اچک کر تانگے پر چڑھ گیا اور اس نے گھوڑے کی لگامیں سنبھال لیں۔

''آگے بڑھو!'' میں نے غرا کر کہا اور تانگے والا گھوڑے کو ٹخٹخانے لگا۔ سڑک پتلی تھی۔ ناہموار تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی۔ جو زیادہ تر جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اس پر جگہ جگہ گھوڑوں کی لید نظر آ رہی تھی۔ دو رویہ دکانیں اور عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ بھدی' بدنما اور پلاستر سے محروم۔ مگر دور دور تک سناٹا تھا اور آگے جانے والا تانگہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے تانگے والے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ اچھل پڑا۔ میرے رویے اور انداز سے وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''کیا بات ہے جی؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''معاف کرنا دوست! وہ برقع پوش لڑکی میری بہن ہے۔ مجھ سے بچھڑ گئی ہے اور بہت دن کے بعد وہ مجھے نظر آئی ہے اس لئے میں پریشان ہو گیا ہوں۔ ذرا تانگے کی رفتار تیز کر کے سجو کے تانگے کو پکڑو۔ جتنے پیسے مانگو گے' دوں گا۔''

''اچھا جی۔'' اس نے ایک طرف اڑسا ہوا سانٹا نکال لیا اور پھر گھوڑے کو ہدایات دینے لگا۔

''یہ سڑک سیدھی گئی ہے؟''

''چوراہے تک جی۔''

''اوہ...... ذرا جلدی چلو کہیں وہ دور نہ ہو جائے۔'' میں نے بے چینی سے کہا اور تانگے والے نے پھر گھوڑے سے گفتگو شروع کر دی۔ مگر گھوڑے سے اس کے تعلقات زیادہ بہتر نہیں معلوم ہوتے تھے' اس لئے گھوڑا اس سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔ ہم چوراہے پر پہنچ گئے اور تانگے والے نے ایک جائز سوال کر دیا۔

''اب کدھر چلوں جی؟'' میں کیا جواب دیتا۔ بس آنکھیں پھاڑنے لگا۔ تانگے والے نے خود ہی یہ مشکل حل کر دی۔ ''وہ جا رہا ہے سجو کا تانگہ۔''

میں اُچھل پڑا۔

''کہاں؟''

''وہ...... اُدھر گیا ہے...... دُور ہے۔''

''تو چلو نا...... کہیں اوجھل نہ ہو جائے۔'' میں نے کہا اور تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگانے شروع کر دیئے۔ خدا خدا کر کے میں نے بھی سجو کا تانگہ دیکھا۔ وہ بھی اس لئے کہ اس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ پھر ہم اس تک اس وقت پہنچے جب وہ رک گیا۔ برقع پوش لڑکی کی ایک جھلک میں نے دیکھی۔ وہ ایک مکان کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھی۔ میں گہری سانس لے کر نیچے اتر گیا۔ تانگے والے کو میں نے ایک نوٹ دیا تو وہ بولا۔

''پھٹے نہیں ہیں جی؟''

''جاؤ بھائی! خدا کے واسطے جان چھوڑو۔'' میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔ شمسہ اس سامنے والے مکان کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور اسی دروازے کے دوسری طرف...... اس کے دوسری طرف یقیناً میرے ماں باپ ہوں گے۔ آہ...... آنکھیں ترس گئی تھیں ان کی صورتوں کو۔ اب تو ان کے چہرے بھی دھندلا گئے تھے۔ شمسہ میری روح' ماموں ریاض' امی' ابا' یہ بے چارے میری وجہ سے کس طرح دربدر ہوئے ہیں۔ سانسی اس شہر کا نام ہے۔ ہمارا یہاں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کن حالات کے تحت انہوں نے اِدھر کا رخ کیا ہو گا اور وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کیسے جاؤں گا ان کے سامنے؟ کیا ہو گا وہاں جا کر؟...... کیسے بلکیں گے وہ؟...... قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ بدن ڈھلکا جا رہا تھا۔ میں خود ان سے دور بھاگتا رہا تھا' مگر صرف یہ سوچ کر' میں ایک مجرم ہوں' قاتل ہوں اور منحوس بھوریا چرن مردود کی توجہ ان کی طرف نہ ہونے پائے۔ وہ اس سے بچے رہیں اور اب میں ان کے سامنے جاؤں تو...... تو کیا وہ مجھ سے سب کچھ نہ پوچھیں گے؟...... بتانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' کیونکہ میں نے جسے بھوریا چرن کے بارے میں بتا دیا' وہ بچ نہ سکا۔ کتنا مشکل ہو جائے گا ان کے سوالات سے بچنا اور ان کے پاس رکنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان سے ملوں گا' دل ہلکا کروں گا۔ بس اتنا کہوں گا ان سے کہ وہ میرے لئے دعا کریں۔ خدا سے میری مشکل دور کرنے کے لئے گڑگڑائیں۔ میں اس عذاب سے نکلا تو ان کی خدمت کروں گا۔ ورنہ وہ مجھے صبر کر لیں۔ ہاں' محمود کی خیریت انہیں ضرور بتا دوں گا۔ ماموں ریاض کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کس کے ساتھ شکتی پور گئے تھے۔

یہ سارے خیالات ان چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے دل میں آئے تھے۔ عجیب تشنجی کیفیت ہو رہی تھی۔ نہ جانے کس طرح دروازے کی زنجیر بجائی۔ ایک بار...... دوسری بار...... تیسری بار...... پھر دوسری طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ زنجیر ہلی اور میری روح میری آنکھوں میں آ گئی۔ اب ابا کا چہرہ نظر آئے گا۔ امی ہوں گی یا شمسہ...... مگر دروازہ کھلا تو ان میں سے ایک چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ وہ ایک باریش بزرگ تھے۔ لمبی سفید داڑھی' سفید کپڑے' چہرے پر نرمی تھی۔

''جی میاں! کس سے ملنا ہے؟'' انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ...... محفوظ......''

''میاں! یہاں ہم رہتے ہیں۔ نیاز اللہ ہے ہمارا نام۔ یہاں کوئی محفوظ نہیں رہتے۔''
''امی ...... شمسہ ......'' میری آواز رندھ گئی تھی اور نیاز اللہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔ کچھ عجیب سا انداز تھا ان کا' جیسے میری کیفیت پر غور کر رہے ہوں۔ میرے چہرے پر مایوسی کی گہری لہریں چڑھ گئی تھیں۔ آنسو تھے کہ آنکھوں میں اُمڈے آرہے۔ حلق بند بند سا ہوا جا رہا تھا۔ سارے تصورات چکنا چور ہو گئے تھے۔ یہ چند قدم کا فاصلہ تو میں نے خوابوں کے محل بنا کر طے کیا تھا۔ دل نے یقین کر لیا تھا کہ ماں باپ کا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ مگر یہ سب کچھ......
''کہاں سے آئے ہیں میاں؟ ...... سانسی کے رہنے والے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں؟'' بزرگ نیاز اللہ نے بدستور تیور سے پوچھا۔ میں ایک دم پھر چونک پڑا۔ اگر میرے ماں باپ اس گھر میں نہیں رہتے تو شمسہ یہاں کہاں سے آئی؟ ...... میں نے بزرگ کے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''جناب! یہاں ابھی میری بہن آئی ہے۔ شمسہ ہے اس کا نام۔ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے تھی۔ ہاتھ میں چٹائی کی بنی ایک ٹوکری تھی اور وہ میری بچھڑی ہوئی بہن ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر میں نے اسے دیکھا' لیکن دور نکل چکی تھی۔ میں نے زنجیر کھینچ کر ریل روکی اور نیچے کود پڑا۔ جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو وہ تانگے میں بیٹھ کر چل پڑی تھی اور بمشکل تمام میں دوسرے تانگے میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔''
نیاز اللہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''تمہاری بہن شمسہ؟''
''جی' جی ...... وہ ابھی ابھی برقع میں ملبوس ......''
''مگر وہ تو میری بیٹی عزیزہ ہے۔ اپنی خالہ کے ہاں گئی تھی۔ ایک ماہ کے بعد وہاں سے واپس آئی ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ اچھا' یوں کرو۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ آ جاؤ...... آ جاؤ...... جھجکنے کی ضرورت نہیں۔'' میں ہچکچایا تو نیاز اللہ صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دروازے سے اندر لے گئے۔
چھوٹا سا صحن' اس کے بعد برآمدہ جس کے اندر تین کمروں کے دروازے اور نجانے کیا کیا۔ برآمدے میں ایک تخت پڑا ہوا تھا جس پر دری اور سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف چوکی بچھی ہوئی تھی' جس پر جائے نماز تہہ کی ہوئی رکھی ہوئی تھی۔ جائے نماز پر ہزارہ تسبیح رکھی ہوئی تھی۔ بزرگ مجھے برآمدے میں لے آئے اور تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر انہوں نے آواز لگائی۔
''عزیزہ بیٹی! ...... عزیزہ! ...... ذرا باہر آؤ۔''
''آئی ابا جان! ...... کپڑے بدل رہی ہوں۔'' جواب ملا۔ بزرگ خود بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر تخت پر بیٹھ گئے۔ وہ بدستور میرا جائزہ لے رہے تھے اور میرے چہرے پر بکھرے حزن و ملال سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔
''میاں! کہاں سے آ رہے ہو؟''
''شکتی پور سے۔''
''اوہو...... اچھا...... مگر تمہاری بہن کیسے بچھڑ گئی تم سے؟''
ابھی ان کا سوال ختم ہی ہوا تھا کہ درمیانی دروازے سے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس اچھے خدوخال۔ عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال مگر یہ چہرہ شمسہ کا نہیں تھا۔ خدوخال بھی نہیں ملتے تھے۔ پھر نجانے کیا ہوا تھا؟ مجھے اس کے چہرے پر شمسہ کا دھوکا کیوں ہوا تھا؟ ...... آہ کچھ غلطی ہو گئی۔ یقیناً کوئی غلطی ہو گئی۔ میں نے شمسہ کو ہی دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے اس بے وقوف تانگے والے نے ...... مگر نہیں۔ لڑکی مجھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے واپس دروازے کے اندر جانا چاہا لیکن نیاز اللہ کی آواز اُبھری۔
''آ جاؤ بیٹی! آ جاؤ۔''

لڑکی ٹھٹکتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔ میری نگاہیں جھک گئیں۔ نیاز اللہ صاحب مسکرا کر بولے۔

''میاں! فیصلہ کرو یہ تمہاری شمسہ ہے یا ہماری عزیزہ؟''

میں جلدی سے تخت سے نیچے اتر گیا اور شرمندہ لہجے میں بولا۔ ''میں بے حد شرمسار ہوں۔ انتہائی معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔''

''ارے...... تو اٹھ کر کیوں کھڑے ہو گئے ہو بھئی؟ ہماری عزیزہ اگر تمہاری بہن شمسہ بن جائے تو ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''کیا بات ہے ابا میاں؟...... کون ہیں یہ؟''

''اسٹیشن سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں بلکہ تمہاری وجہ سے اپنا سفر کھوٹا کر چکے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں ابا میاں!''

''اسٹیشن پر آپ برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ آپ کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس کا ایک ہینڈل ٹوٹ گیا تھا۔ کیا ایسا ہوا تھا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''جی ہاں...... ایسا ہوا تھا۔'' لڑکی نے کہا اور میرے دل میں امید کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔ یہ خیال آیا ایک لمحے کے لئے کہ تانگے والے کی غلط رہنمائی سے میں یہاں آگیا ہوں...... ہوسکتا ہے شمسہ کسی اور سمت نکل گئی ہو۔ مگر ٹوکری کے واقعہ کا اعتراف اس بات کی ضمانت تھی کہ میری آنکھوں نے ہی دھوکا کھایا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور نیاز اللہ صاحب چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔

''پتہ نہیں کون ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

لڑکی حیران سی کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ ویسے ہی کیا حماقت ہوئی تھی کہ مزید یہاں رُکتا۔ نیاز اللہ کے پیچھے پیچھے ہی دروازے تک آیا۔ دروازہ کھلا تو سامنے ہی اس تانگے والے کی شکل نظر آئی جس کے مریل گھوڑے نے بمشکل تمام یہاں تک پہنچایا تھا۔ تانگے والا میری شکل دیکھتے ہی بولا۔

''نوٹ تڑالائے ہیں جی آپ کا۔ چھوٹے پیسے لے لیں۔''

نیاز اللہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ تانگے والے کی بات ایسی تھی کہ مجھے ہنسی آجاتی۔ مگر تقدیر میں تو آنسو ہی آنسو لکھے ہوئے تھے۔ ہنس نہ پایا اور تانگے والے سے کہا۔

''بھائی! میں نے تم سے چھوٹے پیسے واپس تو نہیں مانگے تھے۔''

''ایں......'' تانگے والا حیرت سے بولا۔ ''مگر نوٹ تو جی آپ نے ہمیں دس روپے کا دیا تھا اور یہاں تک کا بنتا ہے سوا روپیہ۔ باقی پیسے کا ہم کیا کریں؟'' تانگے والا معصومیت سے بولا۔

نیاز اللہ نے میری طرف دیکھا' پھر ہاتھ بڑھا کر تانگے والے سے پیسے لے لئے اور تانگے والا اطمینان سے واپس مڑ گیا۔ نیاز اللہ صاحب ہنستے ہوئے مڑے اور پیسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''یہ تو اپنا رزق اللہ ہی سے مانگتے ہیں میاں! کسی انسان سے بخشش لینے کی عادت ہی نہیں انہیں۔ مگر یہ تم تیار کہاں کے لئے ہو رہے ہو؟''

''جی میں جانا چاہتا ہوں اور ایک بار پھر آپ سے معافی مانگ رہا ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میری اس حرکت سے ناراض ہو جاتا۔ لیکن آپ نے...... خدا آپ کو اس کا اجر دے۔''

''ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر آپ تشریف کہاں لے جارہے ہیں؟...... آیئے اب آپ ہمیں ایسا گیا گزرا بھی نہ سمجھیں کہ ہم آپ کو ایک پیالی چائے بھی نہ پلاسکیں اور جہاں تک بات رہی آپ کی غلط فہمی کی تو میاں! غلط فہمی انسانوں ہی کو ہوتی ہے۔ اس میں برائی کی کیا بات ہے؟ بلکہ ہمیں تو افسوس ہے کہ آپ کا نقصان ہوا۔ نجانے کہاں تک کا ٹکٹ ہوگا' یہاں اُترنا پڑ

گیا۔ اب واپس جاؤ گے تو نیا ٹکٹ لینا پڑے گا۔"

میں نے جلدی سے جیب سے ٹکٹ نکال کر نیاز اللہ صاحب کے سامنے کر دیا تاکہ اپنی سنائی ہوئی کہانی کی تصدیق کر دوں۔ نیاز اللہ صاحب نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے واپس لا کر تخت پر بٹھا دیا۔ لڑکی ابھی تک اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ نیاز اللہ نے اس سے کہا۔

"عزیزہ بیٹی! تھکی ہوئی تو ہو گی' لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمیں ناشتہ کرائے بغیر تمہیں نیند نہیں آئے گی اور پھر اب تو ہمارے مہمان بھی آئے ہیں۔ چنانچہ ہو جائے ذرا جلدی سے تیاری۔ انڈے نعمت خانے میں رکھے ہیں اور تمہارے ہاتھوں کے بے مثال پراٹھے...... میاں! نامعلوم مزہ نہ آ جائے تو ہمارا ذمہ۔ اماں بیٹھو! تکلف پر تکلف کئے جا رہے ہو۔ میاں لکھنؤ کے ہو کیا؟...... بیٹھو بھئی بیٹھو...... کم از کم اپنا نام تو بتا دو۔"

کچھ ایسا عجیب لہجہ تھا ان کا' ایسی اپنائیت اور محبت تھی کہ حلق میں پھنسا ہوا گولا پھٹ بہا اور نجانے کس طرح آنسوؤں کے ساتھ سسکیاں اُبل پڑیں۔ عزیزہ جو دروازے کی جانب مڑنے ہی والی تھی' ٹھٹک کر رک گئی۔ نیاز اللہ بھی حیران رہ گئے تھے۔ مگر میں کیا کرتا۔ نجانے کیوں میں نے اس لڑکی کو شمسہ کے روپ میں دیکھا تھا اور میرا وجود تہہ بالا ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر نجانے دل میں کیا کیا آس لئے اس دروازے تک کا فاصلہ طے کیا تھا۔ برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو دیکھنے کی آس بندھی تھی لیکن۔

نیاز اللہ اور عزیزہ مجھے تعجب سے دیکھتے رہے۔ ان کے سامنے اس طرح روتے ہوئے سخت شرمندگی ہو رہی تھی لیکن بند ٹوٹ گیا تھا۔ بہہ نکلے نہ رک رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ پھر بھی برداشت نہ ہو سکا تو تیزی سے دروازے کی سمت [illegible] باہر نکل آیا۔ [illegible] سڑکوں پر بھاگنا بڑا عجیب سا تھا۔ خود کو سنبھالنا ضروری تھا۔ سامنے ہی [illegible] درخت تھا [illegible] جس کا تنا بے حد چوڑا تھا۔ اس کی آڑ میں رک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ویسے بھی سانسی بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ [illegible] بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی آس پاس لوگ نظر نہیں آئے اور یہاں مجھے کافی سکون ملا۔

درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آنسو خشک کئے۔ بھوریا چرن کے خلاف دل میں جو نفرت تھی وہ انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ کیا کروں اس کم بخت کا؟ کیا کروں؟...... ہمیشہ ایسی چوٹ دیتا ہے کہ دل سینے سے باہر نکل آئے۔ یقینی طور پر وہ بھی میرا نظری دھوکا تھا۔ میں نجانے کون سے بہتر راستے کی سمت سفر کر رہا تھا کہ اُدھر میری منزل ہو اور پھر رتولی کے اس ستے نے جو کچھ بتایا تھا وہ بھی میرے لئے باعث دلچسپی تھا۔ لیکن بھوریا چرن کم بخت مجھ پر بھرپور نگاہیں رکھے ہوئے تھا اور کہیں بھی میری دال گلنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ لڑکی شمسہ کی شکل میں دکھا کر اس نے مجھے ریل سے نیچے اتار دیا تھا...... خیر' بھوریا چرن! ایک وقت تو ایسا آئے گا جب میں تجھ پر حاوی ہو جاؤں گا۔ جو خیال تیرے دل میں ہے' اس کی تکمیل نہ کرنے کو تو میں نے اپنا ایمان بنا لیا ہے اور اس ایمان کو زندگی سے زیادہ قیمتی قرار دے دیا ہے۔ دیکھوں گا' اس جدوجہد میں زندگی کب اور کس طرف چلی جاتی ہے' لیکن پیر پھاگن کے مقدس مزار کی بے عزتی یا بے حرمتی اپنے پورے خاندان کی زندگی کی قیمت پر بھی نہیں دوں گا۔ ہاں بھوریا چرن! میں ایسا کبھی نہیں کروں گا...... تُو بھی دیکھنا کہ تیرا واسطہ ایک مسلمان سے پڑا ہے۔

دل میں نجانے کیا کیا تصورات آتے رہے۔ شہر میں رونق ہوتی چلی گئی۔ اب زیادہ لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو یہ سوچا تھا کہ کسی غلط تانگے کا تعاقب کر بیٹھا ہوں' لیکن جب نیاز اللہ صاحب کی بیٹی نے ٹوکری گرنے کے واقعہ کو بھی تسلیم کر لیا تو اس کے بعد کوئی شک نہیں رہ گیا تھا اور اب یہاں شمسہ کی تلاش بیکار ہی تھی۔ بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا' اس کے بعد سانسی شہر کا جائزہ لینے کے بارے میں سوچا اور وہاں سے چل پڑا۔ بس یونہی نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ کوئی تصور ذہن میں نہیں تھا۔ کھانے پینے کا بھی کچھ ہوش نہیں تھا۔ دل تھا کہ مسلسل رو رہا تھا۔

دوپہر ہو گئی اور سورج عروج پر پہنچ گیا۔ گرمی کافی تھی۔ میں ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھا۔ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اب یہاں رکنا بیکار ہے۔ ریلوے اسٹیشن جاؤں' اپنا حلیہ درست کر لوں گا اور سانسی سے

کہیں اور چل پڑوں گا۔ کہاں؟ ...... مراد آباد کا سفر بھی کیا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ممکن ہے ان صاحب کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے اور ان سے ریاض ماموں کے بارے میں۔ اب تو کوئی جگہ ایسی نہیں رہی تھی جہاں اعتماد کے ساتھ جا سکتا اور اپنے ماں باپ کو تلاش کر سکتا۔ کتنی عجیب و غریب بات تھی۔ میں نے خود ہی انہیں چھوڑا تھا۔ ان سے دور ہو گیا تھا۔ میں ان کی مشکلات میں ساتھ نہیں دے سکا تھا اور اب ...... اب میری آرزو تھی کہ وہ ایک بار مجھے نظر آ جائیں۔ اس کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں تھا میری زندگی میں۔ نہ سہی لیکن بہرحال جینا تو ہے۔

وقت کچھ اور گزرا تھا کہ میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ کوئی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چونک کر دیکھا تو نیاز اللہ صاحب تھے۔ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ؟'' میں نے حیران لہجے میں کہا۔

''ہاں میاں! ...... ہم ہی ہیں۔'' نیاز اللہ صاحب عجیب سے انداز میں بولے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہ دوبارہ بولے۔

''کسی کو اس طرح ذلیل کرنا خلاف انسانیت ہے اور خلاف مذہب بھی۔ ہم نے تھوڑی سی میزبانی کرنا چاہی تھی' مگر تم نے ہمیں اس قابل نہیں سمجھا' وجہ جان سکتے ہیں؟''

''نہیں جناب! میں آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''مسلمان ہو؟''

''الحمدللہ۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر گناہ کیا ہے تم نے۔ اس کا کفارہ ضرور ادا کرو۔''

''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں نیاز اللہ صاحب!''

''ان الفاظ سے کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اٹھو' ہمارے ساتھ چلو۔ ہمیں شرف میزبانی بخشو' جب چاہے' جہاں چاہے جانا۔ ہم بھلا راستہ کیوں روکیں گے۔''

''خدا آپ کو زمانے کی آفتوں سے محفوظ رکھے نیاز اللہ صاحب! میں نہایت منحوس انسان ہوں۔ انتہائی سبز قدم۔ جہاں میرے قدم رکتے ہیں' وہاں مصیبتوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔''

''خوب میاں! یہ نحوست وغیرہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ اپنی مخلوق سے بہت پیار کرتا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں۔ وہ کسی کو منحوس نہیں بناتا۔ خیر چھوڑو' کیا ہم ایک بار پھر اپنے غریب خانے پر چلنے کی درخواست کر سکتے ہیں؟''

''جو حکم!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ راستے میں نیاز اللہ نے کہا۔

''نام ابھی تک نہیں جانتے تمہارا۔''

''مسعود نام ہے میرا۔''

''ماشاء اللہ۔'' وہ بولے اور خاموش ہو گئے۔ فاصلہ طے ہوا۔ اندر عزیزہ موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر بڑے خلوص سے مسکرا دی۔

''آپ لے آئے انہیں ابا جان! میں ان سے ناراض ہوں۔''

''کیوں بھئی؟''

''یہ مجھے بہن سمجھ کر میرے پیچھے آئے تھے' لیکن مجھے دیکھ کر انہوں نے مجھے بہن نہیں تسلیم کیا۔ اتنی بری ہوں میں؟''

''انہی سے پوچھ لو۔ مسعود ہے ان کا نام۔''

''بول ہی نہیں رہی میں ان سے۔ یہ خود جواب دیں۔'' عزیزہ نے کہا۔

''جی جناب! کیا فرماتے ہیں؟'' نیاز اللہ بولے۔

''ذمے دار آپ لوگ ہیں۔ میرا قصور نہ ہوگا۔ جس نے مجھ سے خلوص برتا' جس کے دل میں میرا پیار پیدا ہوا' وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ یہاں تک کہ میرے گھر والے بھی۔ شمسہ میری بہن ہے' وہ سب مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔ میری ماں' میرے باپ' میرے ماموں ......سب میری نحوست کا شکار ہو گئے۔ آپ کو بہن کی شکل میں دیکھا' کچھ نظری دھوکا ہو گیا تھا۔ آپ کے پیچھے بہت سے ارمان لے کر آیا۔ یہ خیال تھا میرا کہ اب ماں باپ بھی نظر آ جائیں گے مگر......''

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بہن نہ نکلی۔ بہن جیسی تو ہو سکتی ہوں۔ جہاں تک آپ کے منحوس ہونے کا تعلق ہے تو میرا ایمان پختہ ہے۔ خدا اپنے بندوں کو منحوس نہیں بناتا۔ اس لئے آپ ہماری فکر نہ کریں۔''

''آہ......کاش !......کاش......''

''آپ کو علم ہے کہ ابا میاں سارا دن آپ کے پیچھے پھرتے رہے ہیں؟''

''ایں؟'' میں چونک پڑا۔

''ہاں مسعود میاں ! آج ہم بھی جاسوس بن گئے۔ تمہارا تعاقب کرتے رہے۔ یہ دیکھتے رہے کہ تم کہاں کہاں جاتے ہو اور جب تھک گئے تو تمہارے سامنے پہنچ کر تم سے یہاں آنے کی درخواست کر ڈالی۔''

''جس نے بھی مجھ سے اتنا پیار برتا ہے' وہ مشکلات کا شکار ہو گیا ہے۔ آپ بھی وہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔''

''یہ معاملہ ہمارا اور خدا کا ہے۔ اسے ہمارے اور اس کے درمیان رہنے دو اور تم غسل کر لو۔ جاؤ بھئی! ہم نے آج ناشتہ تک نہیں کیا۔''

''صبح کو میری صورت جو دیکھ لی تھی۔'' میں ہنس پڑا۔

''میں نے بھی دیکھی تھی' مگر میں ناشتہ بھی کر چکی ہوں اور دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہے میں نے۔ جایئے' وہ غسل خانہ ہے۔'' عزیزہ نے کہا اور میں گردن جھٹک کر غسل خانے کی طرف چل پڑا۔

''میری سسکیوں سے متاثر ہو گئے ہیں بے چارے......مگر میں کسی قیمت پر ان کے ہاں پڑاؤ نہیں ڈالوں گا۔'' میں نے فیصلہ کیا تھا۔

[illegible] دونوں باپ بیٹی گمبھیر ہو کر بیٹھ گئے۔ نیاز اللہ بولے۔

''پہلے ہمارے بارے میں سن لو ـــ ہمارا نام نیاز اللہ ولد ضمیر اللہ ہے۔ سانسی ہی میں پیدا ہوئے' پلے بڑھے۔ گو ہم نے آدھا ہندوستان دیکھا ہوا ہے لیکن قیام یہیں رہا۔ ہمارے والد ضمیر اللہ صاحب کے پاس کچھ زمینیں تھیں' جن سے کفالت ہوا کرتی تھی۔ بعد میں وہ زمینیں ہمیں منتقل ہو گئیں اور ہم ان کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ شادی ہو گئی۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے اکلوتے تھے۔ جس کی وجہ سے تنہا رہ گئے۔ پر خود ہی کچھ بزرگوں کی کرم فرمائی سے شادی وغیرہ کا سلسلہ ہوا۔ شادی ہو گئی مگر اہلیہ بہت عرصے تک ہمارا ساتھ نہ دے سکیں اور اپنی ایک نشانی چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ہم نے اپنی تمام تر محبتیں اپنی بیٹی عزیزہ کو سونپ دیں اور ہم باپ بیٹی زندگی گزارنے لگے۔ لیکن بیٹیوں کا ساتھ کچا ہوتا ہے۔ عزیزہ بیٹی کی شادی کی ہم نے اور بالکل ہی تنہا رہ گئے۔ تقدیر نے عزیزہ کے شوہر کو زندگی کی مہلت نہیں دی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عزیزہ صرف چھ ماہ سہاگن رہ کر بیوہ ہو گئیں اور اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بھی ڈھلتی ہوئی عمر کے پیش نگاہ زمینیں فروخت کر دیں اور کچھ ایسی جائیداد خرید لی جس سے کرایہ وغیرہ حاصل ہو سکے۔ سو اب یہاں یہ چھوٹا سا گھر ہے۔ ہم باپ بیٹی ہیں اور یاد اللہ ہے۔ بس اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مصرف نہیں۔ اس سے تمہیں یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہماری زندگی کیا ہے؟

✦✣✦✣✦

اس کے بعد ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھیں۔ یہ بے بسی' یہ یاسیت تم پر کیوں طاری ہے؟

دیکھو میاں! گریز نہ کرنا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ انسان ہی انسان کا دوست بھی ہوتا ہے اور دشمن بھی۔ لیکن ہمیں دوستوں میں تصور کرو۔ باقی رہا جہاں تک تمہارے وہم کا تعلق تو ہو سکتا ہے تمہارے تجربات تمہیں یہ احساس دلاتے ہوں۔ ہمارا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ ہاں، البتہ تمہیں ایک آزادی ضرور دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کچھ بتانے سے خود تمہیں نقصان پہنچے تو پھر ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ لیکن خواہش مند ہیں اس بات کے کہ تم ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری مشکل کا کوئی حل ہمارے پاس ہو۔ اس بات سے انکار نہ کرنا کیونکہ قدرت پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے راستے متعین کرتی ہے اور ان راستوں سے گریز کا مطلب ہے کہ پریشانیوں کو خود پر نازل رکھا جائے۔"

میں اس مخلص شخص کا چہرہ دیکھتا رہا۔ الفاظ تو سمجھ میں آنے والے تھے، لیکن میرے تجربات کچھ اور ہی کہتے تھے۔ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ عزیزہ نے کہا۔

"ابا میاں! یہ ہمیں اس قابل نہیں سمجھتے۔ آپ انہیں مجبور نہ کریں۔ کتنی کوششیں کر چکے ہیں آپ، انہوں نے ہمیں اپنا سمجھ کر ہی نہیں دیا۔ رہنے دیں ابا میاں! ہمارا فرض ہے کہ ان کی خدمت کریں اور جب تک یہ یہاں رہنا مناسب سمجھیں ان کی خاطر مدارات کریں۔ غیر واقعی کبھی اپنے نہیں ہوتے۔"

میں نے عزیزہ کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "عزیزہ بہن! آپ براہِ کرم ایسی باتیں نہ کریں۔ میں تو محبتوں کو ترسا ہوا انسان ہوں۔ میں تو اپنے بھرے پرے گھر سے محروم ہو چکا ہوں۔ میں کسی سے گریز کیا کروں گا؟ ...... ہاں، یہ میرا تجربہ ہے کہ جس نے بھی مجھ سے محبت کا اظہار کیا، مصیبت کا شکار ہوا۔ اگر آپ مصیبتیں خریدنا چاہتی ہیں تو مجھے اپنی زبان کھولنے پر اعتراض نہیں۔"

"ہاں میاں! ہم سے بات کرو۔ ہم مصیبتیں خریدنا چاہتے ہیں۔" نیاز اللہ بولے۔

"تو پھر مختصراً میری کہانی یہ ہے کہ اچھے بھلے گھر کا فرد تھا۔ دماغ میں خناس پیدا ہوا، تن آسانیاں اپنا لیں اور ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دولت کے حصول کا خواہاں ہو گیا۔ اس سلسلے میں کچھ ایسے راستے اپنائے جو ناجائز تھے۔ ایسے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا جو جنتر منتر سے دولت کے حصول کا ذریعہ پیدا کر دیتے ہیں اور ایک ایسے شیطان کے جال میں پھنس گیا، جس نے مجھے کچھ ایسے کاموں کے لئے مجبور کیا جو میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کے عتاب کا شکار ہوا اور مصیبتوں میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ والدین چھن گئے۔ خود دربدر ہوا۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اب نہ ماں باپ کا پتہ ہے، نہ بہن بھائیوں کا۔ اکیلا ہوں اور زندگی کی صعوبتوں میں گرفتار۔"

نیاز اللہ نے میرے ان مختصر الفاظ پر غور کیا، مجھے دیکھتے ہوئے پھر بولے۔ "ذرا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔"

میں نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے بڑھا دیا تو انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر میری ہتھیلیوں کو سونگھا۔ دیر تک سونگھتے رہے اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"اندازہ ہوتا ہے کچھ سفلی عمل کے زیر اثر ہو۔"

میں نے انہیں جس قدر مختصر تفصیل بتائی تھی وہ ایک طرح سے میرے لئے یوں اطمینان بخش تھی کہ اس میں بھوریا چرن کا براہِ راست تذکرہ اور اس کے عمل کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی اور یہ میں نے اس لئے کیا تھا کہ نیاز اللہ صاحب کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لیکن نیاز اللہ صاحب نے صحیح تجزیہ کیا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔"

"یہ کالا جادو ناپاک چیز ہے اور اس کے کرنے والے کم بخت انوکھی قوتیں حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات اگر کوئی چھوٹا موٹا عامل اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے عام قسم کے لوگ جو کاروباری طور پر یہ سب کچھ نہیں کرتے، اس چکر میں نہیں پڑتے۔ البتہ تم نے یہ تو سنا ہوگا کہ زہر کا تریاق زہر ہی میں ہوتا ہے اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اس کے مصداق ایک بات فوری طور پر میرے ذہن میں آئی ہے۔ اب دیکھو نا، تم نے کم از کم کچھ

حقیقتیں بتائیں تو میرے ذہن میں بھی کچھ خیال آیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیا؟" میں نے سوالی نگاہوں سے نیاز اللہ کو دیکھا اور نیاز اللہ صاحب مسکرا دیئے' پھر کہنے لگے۔

"راما نندی میرا بچپن کا دوست ہے۔ دوسری کلاس سے ہائی سکول تک ہم نے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اس کے' میرے راستے مختلف ہو گئے۔ وہ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا پورے سولہ سال کے بعد واپس آیا تو پاؤں زمین پر ہی نہیں تھے۔ جوگی بنا ہوا تھا۔ گھر والے پہلے ہی اس سے مایوس تھے۔ جو باقی رشتہ دار تھے جب وہ اس سے ملے تو وہ ان کے کام کا نہیں رہا' لیکن دوستی نہیں بھول سکا اور مجھ سے ویسے ہی ملتا رہا۔ کم بخت نے نجانے کیا کیا جنتر منتر سیکھ لئے ہیں۔ بڑے چکر چلاتا رہتا ہے۔ مالی حیثیت انتہائی مستحکم ہے' لیکن ویرانوں میں بسیرا کر رکھا ہے اور وہیں مستقل رہائش کر لی ہے۔ بڑا گیانی بنتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس سے ملواؤں؟ ہوسکتا ہے وہ تمہارے کام آ جائے۔"

"کیا وہ سفلی علوم کا توڑ جانتا ہے؟"

"بھئی نجانے کیا کیا توڑ پھوڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ باقاعدہ سادھو بن گیا ہے۔ مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ بلاوجہ لوٹتا نہیں' کچھ جانتا ہے بلکہ یہ کہو کہ بہت کچھ جانتا ہے۔ ہم چونکہ ہم مذہب بھی نہیں ہیں اور پھر ظاہر ہے میرا کوئی راستہ کبھی ایسا نہیں رہا' لیکن اس سے جب بھی میری ملاقات ہوئی ہے' بڑی محبت سے ملتا ہے۔ میرا خیال ہے صرف ایک میں ہوں جسے وہ اپنا دوست سمجھتا ہے' اپنا شناسا مانتا ہے۔ سینکڑوں بار پیشکش کر چکا ہے کہ اگر مجھے کوئی مشکل ہو تو اسے بتاؤں۔ مگر تم خود سمجھتے ہو کہ اس سے کسی مشکل کا حل مانگنا یوں سمجھ لو کہ بہت کچھ کھونے کے مترادف ہے' لیکن تمہارا مسئلہ بالکل مختلف ہے مسعود میاں! میری مانو تو اس سے مل لو۔ ہم اس سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ کم از کم تمہیں جو مشکل درپیش ہے اس کا کوئی حل تو دریافت ہو۔"

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ بالکل ایک نئی سوچ تھی۔ نیا انداز تھا۔ اب تک اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت کارروائی ہوئی تھی وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوئی تھی' جو میرے ہم مذہب تھے لیکن نیاز اللہ صاحب نے ایک نیا راستہ دکھایا۔ یعنی زہر کا توڑ زہر ہی سے حاصل کیا جا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ شخص جس کا نام راما نندی ہے' بقول نیاز اللہ کے ان کی دوستی کے ناتے کوئی ایسا طریق کار بتا دے جس سے میں بھوریا چرن سے محفوظ ہو جاؤں۔ لیکن اس شخص کے سامنے مجھے زبان کھولنا ہوگی۔ بہرحال یہ بھی کر کے دیکھ لیا جائے۔ میں نے سوچا اور نیاز اللہ صاحب سے رضا مندی کا اظہار کر دیا۔

اس رات میرے دل میں خوف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ دل میں سوچا ضرور تھا کہ عموماً ایک ہی بات ہوتی ہے۔ اگر میری بہتری کی کوئی راہ نکلنے لگتی ہے تو بھوریا چرن اپنا عمل شروع کر دیتا ہے اور میرے راستے روک دیتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں تھیں۔ ممکن ہے اس بار بھی ایسا ہی ہو' ہوتا ہے تو ہو جائے۔ میں نے تو نیاز اللہ سے منع کیا تھا۔ آخر کیا کروں؟ دنیا سے کنارہ کشی بھی تو نہیں ہو پاتی۔

حالات کچھ بھی ہوں وقت تو کسی طرح گزارنا ہی ہے۔ میں تو یہاں نہیں رُکنا چاہتا تھا' مگر یہ لوگ ہی جذباتی ہو گئے۔ رات کو کئی بار آنکھ کھلی' چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں' چھت پر مکڑیاں تلاش کیں' مگر کچھ نہیں ملا۔ صبح کو نیاز اللہ صاحب نے جگایا تھا۔

"اٹھو مسعود میاں' پونے گیارہ بج گئے ہیں۔"

"پونے گیارہ۔" میں اُچھل پڑا۔

"ہاں بڑی گہری نیند سوئے تھے' جگانے کو جی نہ چاہا' مگر اب بہت وقت ہو چکا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔" میں بوکھلایا ہوا سا اٹھ گیا۔ کسی کے گھر میں اتنی دیر تک سونا غیر مناسب بات تھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا' عزیزہ نے ناشتہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بتا دیجئے کہ دوپہر کا کھانا کس وقت پیش کیا جائے؟"

''میں شرمندہ ہوں۔ واقعی بہت دیر سو گیا۔''
''شرمندہ ہونے کے سلسلے میں آپ بے حد فراخ دل واقع ہوئے ہیں' مگر میرا یہ سوال آپ کو شرمندہ کرنے کے لیے نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''
''جو بھی ممکن ہو۔''
''آپ کی اپنی کوئی پسند؟''
''بھول گیا۔'' میں نے جواب دیا اور عزیزہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مجھے گھورنے لگی' پھر بولی۔
''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں بھی آپ سے بات کرنی ہوگی۔''
ساڑھے بارہ بجے نیاز اللہ صاحب میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں چلنے کے لیے تیار ہوں؟
''جی!'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ نیاز اللہ میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ انہوں نے ایک تانگے والے کو روک کر پوچھا۔
''کہو میاں داتا رام سوامی مٹھ چلو گے؟''
''منع کریں گے میاں جی سے بھلی کہی۔'' تانگے والے نے پراخلاق لہجے میں کہا اور ہم دونوں تانگے میں بیٹھ گئے۔
''شہر سے باہر کا علاقہ ہے' صرف وہی لوگ جاتے ہیں جنہیں راما نندی کے پاس جانا ہو' اس کا استھان سوامی مٹھ کہلاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو اس سے نفرت کرتے ہیں خاص طور سے پڑھے لکھے لوگ جن میں بے شمار ہندو شامل ہیں۔ مسلمان تو خیر اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ گندے علوم کرتا ہے۔ ویسے لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ مجھ پر نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے کیونکہ بہت سوں کو علم ہے کہ میں اس سے کبھی کبھی ملتا رہتا ہوں' مگر کیا کروں بچپن کا دوست ہے۔ بچپن کی معصوم یادوں کا ساتھی' مجھ سے بہت مخلص ہے اور کبھی اس نے میری دینی معاملات میں مداخلت نہیں کی بلکہ......''
نیاز اللہ صاحب اچانک خاموش ہو گئے' میں سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ گردن ہلا کر بولے۔ ''ایک واقعہ یاد آ گیا تھا۔''
''کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''بس زمینوں کا معاملہ تھا۔ ایک بنیا تھا مدن کشوری' کچھ نیت خراب ہو گئی تھی اس کی ہماری زمین کے ایک حصے پر' مقدمہ دائر کیا اور اپنا حق جتایا۔ ہم ایسی باتوں کے قائل نہیں تھے' اس سے ملے اسے سمجھایا کہ بددیانتی نہ کرے' مگر احمق شخص نہ مانا' خاصی رقمیں کھلا کر اس نے کچھ سرکاری اہلکاروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ہمیں کوڑی کوڑی کو محتاج کر دے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے حق میں گواہی دینے والوں کے ساتھ غنڈہ گردی بھی کی۔ ہم تو بخدا خاموش ہو گئے تھے' مگر کسی نے راما نندی کو پوری کہانی سنا دی۔ اس نے بھی سنا ہے کہ پہلے تو مدن کشوری کو سمجھایا' مگر وہ نہ مانا تو......''
''تو......؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
''برا کیا راما نندی نے۔ دیوالی کی رات کو ہانڈی اُڑائی اور مدن کشوری مر گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا سارا گھر تباہ ہو گیا۔ خدا گواہ ہے کہ ہمارے فرشتوں کو بھی اس کی کارروائی کا علم نہیں تھا ورنہ ہم اسے روکتے۔ پھر بھی ہم نے اس زمین کو اپنے تصرف میں نہ لیا بلکہ اسے ایک خیراتی ادارے کے حوالے کر کے اس سے دست کش ہو گئے۔''
''یہ ہانڈی اُڑانا کیا ہوتا ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
''گندے علم ہی کا ایک حصہ ہے۔ سفلی علم کے ماہر جادو کرتے ہیں اور کوری ہانڈیوں میں نہ جانے کیا الم غلم بھر کر اپنے دشمن کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ ہانڈی دشمن کے گھر جا گرتی ہے اور وہ جادو کے زیر اثر آ کر مر جاتا ہے۔ گویا یہ جادو کے میزائل ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔'' نیاز اللہ نے بتایا۔
تانگہ درختوں کے درمیان ایک کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں کے بعد کھیتوں کا سلسلہ تاحد نگاہ چلا گیا تھا۔ محنت کش کسان زمین سے سودا کر رہے تھے۔ زندگی رواں دواں تھی اور میں اس نئے مسئلے کے بارے میں سوچ رہا

تھا۔ فاصلہ کافی تھا بالآخر طے ہو گیا۔ سامنے لکھوری اینٹوں سے بنی عمارتوں کے کچھ کھنڈرات نظر آ رہے تھے۔ دُور ہی سے ہیبت ناک نظر آتے تھے۔ ایک عجیب سی ویرانی برس رہی تھی۔ وہاں کچھ لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔ گھوڑا اچانک رُک گیا اور داتا رام نے کہا۔

''یہیں اُترنا پڑے گا میاں جی!''

''آگے نہیں لے جاؤ گے داتا رام۔'' نیاز اللہ صاحب نے پوچھا۔

''یہ سسرا جناور آگے نا جائے گا' ڈرے ہے' جناور کی آنکھ ہم سے آگے دیکھ لیوے ہے میاں جی' کھال اُتار دو اس کی آگے نا جائے گا۔''

''چلو کوئی بات نہیں ہے لو یہ پیسے رکھ لو' رکو گے' ہمیں واپس بھی جانا ہے۔''

''جیسی میاں جی کی مرضی پیسوں کی کیا ہے بعد میں دے دیں۔''

''نہیں رکھ لو۔ انتظار کرنا چاہے کتنی دیر ہو جائے جتنے پیسے مانگو گے دوں گا۔''

''میاں جی کی باتیں جب بھی کہی غیروں جیسی کہی۔ ہم رُکے ہیں میاں جی تم جاؤ۔'' تانگے والے نے کہا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ نیاز اللہ صاحب بولے۔

''سانسی میں زیادہ تعداد اچھے لوگوں کی ہے۔ بُرے بس نمک کے برابر ہیں آؤ' ذرا سنبھل کر چلنا یہاں سانپ ہوتے ہیں' خیال رکھنا۔''

مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ سانپوں سے بچپن سے ہی ڈرتا تھا' مگر اب تو تجربہ ہی مختلف تھا۔ ایک اژدھا نہ جانے کب سے مجھ سے لپٹا ہوا تھا اور اس نے میرے سارے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ ہم ویران راستے عبور کرتے ہوئے کھنڈرات کے پاس پہنچ گئے۔ کچھ فاصلے پر ایک جوہڑ نظر آ رہا تھا جس کے کنارے کچھ لوگ آسن مارے بیٹھے ہوئے تھے۔

''یہ لوگ جاپ کر رہے ہیں۔ کچھ اس کے چیلے ہوں گے' کچھ ضرورت مند' ایسے لوگ عموماً یہاں رہتے ہیں۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم آگے بڑھ کر کھنڈرات میں داخل ہو گئے' جگہ جگہ ٹوٹی دیواریں' اینٹیں کے ڈھیر' کہیں کہیں جلی ہوئی راکھ کے انبار۔ ایک عجیب ماحول تھا۔ ویرانی تھی کہ منہ سے بول رہی تھی۔ خوردہ درخت اینٹوں کے ڈھیر سے ہی نکل پڑے تھے' لیکن ان کی شاخوں پر خاموشی تھی۔ ایک گول دروازے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں آ گئے اور یہاں ایک دبلے پتلے تنگ دھڑنگ آدمی کو نیاز اللہ صاحب نے آواز دے کر روکا۔ وہ قریب آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''راما نندی کہاں ہیں؟''

''اندر ہیں؟''

''ذرا انہیں بتاؤ' نیاز اللہ آیا ہے۔ ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ شخص خاموشی سے راہداری میں سیدھا چلا گیا۔ مگر نیاز اللہ صاحب وہیں رک گئے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک مضبوط بدن کا لمبا تڑنگا آدمی جس کا صرف زیریں بدن ڈھکا ہوا تھا' گلے میں ریٹھوں کی لمبی مالا پڑی ہوئی تھی۔ کسرتی بازوؤں پر کوڑیوں کے حلقے بندھے ہوئے تھے۔ سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور نہایت غلیظ نظر آ رہے تھے' تیزی سے آتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے وہی سوکھا آدمی دوڑ رہا تھا۔ قریب آ کر اس شخص نے سرد لہجے میں کہا۔

''آؤ نیاز اللہ...... آؤ!'' وہ واپس مڑا۔ عجیب سا انداز تھا۔ نیاز اللہ صاحب نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے۔ کوئی دس قدم آگے بڑھ کر اچانک وہ شخص ٹھٹک گیا۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کی بڑی اور کالی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ تیکھا پن تھا۔ ایک لمحہ وہ مجھے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ میری سمجھ میں اس کے سوا کچھ نہیں آیا تھا کہ وہ ایک پراسرار اور خطرناک آدمی ہے۔ جس جگہ سے ہم اندر داخل ہوئے تھے وہ کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ ایک دیوار میں سوراخ کر کے

اندر جانے کا راستہ بنایا گیا تھا۔ ناہموار اینٹوں کے درمیان سے سنبھل کر نکلنا پڑا تھا اور جس جگہ ہم پہنچے تھے وہ اس پورے کھنڈر سے زیادہ عجیب تھی۔ بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس کی چھت بے حد اونچی تھی۔ اس میں درمیان میں ایک ٹوٹا پھوٹا فانوس لٹک رہا تھا۔ جس میں چند شمعیں روشن تھیں۔ مگر ان کی روشنی ناکافی تھی اور ہال کے بیشتر حصے تاریک تھے۔ جگہ جگہ مرگ چھالے بچھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ بہت سی اینٹیں چبوترے کی شکل میں چنی ہوئی تھیں اور ان پر بھی ایک مرگ چھالہ بچھا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک کمنڈل رکھا ہوا تھا۔ قوی ہیکل شخص نے ایک دری نکالی اور اسے ہمارے لئے زمین پر بچھا دیا۔

''یہاں بیٹھو نیاز اللہ! یہ پاک صاف ہے اور زمین تو ہوتی ہی پاک ہے۔'' وہ بولا اور ہنس دیا۔

''میرے سامنے ہوش قائم رکھا کرو راما نندی۔'' نیاز اللہ غصیلے لہجے میں بولے۔

''اچھا بھائی گوشت خور' بگڑتا کیوں ہے بیٹھ جاؤ۔ یہ بچہ کون ہے؟''

''میرا بھتیجا سمجھ لو۔'' نیاز اللہ نے کہا اور مجھے دری پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئے۔ راما نندی نے ایک مرگ چھالہ ہمارے سامنے سے گھسیٹ لیا اور خود اس پر بیٹھ گیا۔ نیاز اللہ ہنس پڑے اور میری طرف رُخ کر کے بولے۔

''وہ چبوترہ دیکھ رہے ہو مسعود میاں۔ مہاراج ادھیراج کا استھان ہے۔ راج مہاراجے آ جائیں نیچے بیٹھیں گے اور مہاراج اس استھان پر' میرے سامنے ایک بار اوپر بیٹھ گئے تھے میں نے ڈاڑھی پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا بس اس دن سے مہاراج ہوش میں آ گئے ہیں۔

''کیا کرتا مسعود میاں یہ گوشت خور اس دن میری ڈاڑھی کے بہت سے بال اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا' بس اس دن سے میں اس کے بس میں ہوں۔''

''اسی دن سے۔'' نیاز اللہ نے طنزیہ کہا۔

''نا بھائی نا اس سے بھی پہلے سے ارے کیا کرتے' بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر پوکھر میں ننگے نہائے تھے۔ مگر یہ مسلی بہت چالاک ہے۔ ہم بیمار ہوئے اور ہمیں دھوکے سے بکری کی یخنی پلا دی۔ دھرم نشٹ کر دیا ہمارا اور خود ہمارے منگوائے ہوئے پھل بھی نہیں کھاتا۔ چلو بھتیجے چھوڑو تم کسی لمبے پھیر میں پڑے ہوئے ہو۔''

''اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں نند' تم سے طویل مشورہ کرنا ہے۔'' نیاز اللہ بولے۔

''ہاں ہاں ضرور۔'' راما نندی نے کہا۔

''تم نے کون سے پھیر کا ذکر کیا ہے؟''

''وہ ہماری بات ہے اسے جانے دو۔ مسعود میاں تم سناؤ کیا قصہ ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ نیاز اللہ کا کوئی بھائی بہن نہیں تھا' مگر پھر بھی اتنا کافی ہے کہ اس نے تمہیں بھتیجا کہا۔ اس لیے تم ہمارے بھی بھتیجے ہوئے جو کچھ تم نیاز اللہ کو بتا سکتے ہو وہ ہمیں بھی......'' راما نندی نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

ہال نما کمرے کے ایک تاریک گوشے میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی تھی۔ چار مدھم مدھم روشنیاں متحرک تھیں اور آگے بڑھتی آ رہی تھیں' ذرا سی دیر میں وہ عیاں ہو گئیں' لیکن انہیں دیکھ کر میں سہم گیا۔ وہ انسانی کھوپڑیاں تھیں جن کی ویران آنکھیں روشن تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آ گئیں۔ نیاز اللہ بھی منہ کھولے انہیں دیکھ رہے تھے۔ راما نندی نے بھیانک آواز میں کہا۔

''ست بھدویا...... ماترن تھا۔ نہ وجئی ماہوترا۔'' دونوں کھوپڑیاں رُک گئیں۔ سامنے کی سمت سے بلند ہوئیں اور پھر سیدھی ہو کر متحرک ہو گئیں' راما نندی قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا۔ پھر بولا۔ ''سسر د چاچا کو بھی نا پہچانو ہو اب یہ تمہارے پھیر میں نا آئے گا۔''

نیاز اللہ نے تعجب سے راما نندی کو دیکھا تو وہ زور سے ہنسا' پھر بولا۔ ''معاف کرنا نیاز اللہ یہ سسرے ڈیوٹی پر ہیں ان کا یہی کام ہے۔''

میں خود بھی ششدر تھا۔ راما نندی کے الفاظ اور اس کی ہنسی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ راما نندی نے ہاتھ آگے بڑھا کر ایک کھوپڑی اٹھالی۔ کھوپڑی کے نیچے کالے رنگ کا ایک خوب موٹا سا چوہا موجود تھا جو کھوپڑی کے اپنے اوپر سے ہٹتے ہی اچھل کر دوڑ پڑا تھا جبکہ دوسری کھوپڑی اسی مخصوص انداز میں آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی ہال نما کمرے کے دوسرے تاریخ حصے کی جانب جارہی تھی۔ راما نندی نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ارے بھائی اپنا سامان تو لیتا جا' غالباً الفاظ چوہے سے ہی کہے گئے تھے' مگر چوہا واپس نہیں آیا اور راما نندی نے گردن جھٹک کر کھوپڑی ایک طرف رکھ دی' نیاز اللہ تعجب سے بولے۔

''یہ کیا ہے راما نندی۔''

''سنسار باسیوں پر رُعب ڈالنے کے لیے دو سرونٹ......''

''مطلب......؟'' نیاز اللہ نے بدستور تعجب سے پوچھا۔

''ارے یار نیاز اللہ' یہاں بڑے بڑے گدھے آتے ہیں۔ بات بعد میں بتائیں گے پہلے جائزہ لیں گے کہ راما نندی جی کتنے پانی میں ہیں اور یہ کھوپڑیاں انہیں پانی کا چڑھاؤ بتادیتی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی انہیں یقین ہو جائے ہے کہ راما نندی جی کام کے آدمی ہیں۔''

''مگر تمہیں اس شعبدہ گری کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے تو ویسے ہی بہت کچھ سیکھ لیا ہے؟''

راما نندی مسکرا دیا پھر بولا۔ ''لمبی کہانی ہے جو کچھ کرنا ہوتا ہے بعد میں کرنا ہوتا ہے پہلے آدمی پر رعب ڈالنا پڑتا ہے اور اس کے لیے میں نے ایسے ہی بہت سے ملازم رکھ چھوڑے ہیں جو اپنی ڈیوٹیاں کرتے رہتے ہیں۔''

بات میری بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ دو موٹے تازے چوہوں کو انسانی کھوپڑیاں پہنا دی گئی تھیں اور ان کھوپڑیوں کی آنکھوں میں شاید فاسفورس کوٹیڈ کوئی چیز لگا دی گئی تھی جو اندھیرے میں ایک مخصوص انداز میں چمکتی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ راما نندی بولا۔

''ان بے وقوف نوکروں نے بات بیچ سے کاٹ دی۔ چلو نیاز اللہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ اب پوری بات 'الف' سے شروع کرے اور 'ے' تک ہمیں بتادے۔'' نیاز اللہ نے کہا۔

''مسعود میاں یہ آدمی کام کا ہے' مگر اس کے مسائل بھی بہرحال مسائل ہیں' تم اس کی شعبدہ گری پر توجہ مت دینا۔''

میں ان تمام باتوں سے خوب محظوظ ہوا تھا' مگر پھر سنجیدہ ہو کر میں نے کہا۔

''راما نندی جی میں نہایت سنجیدگی سے آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی کہانی سناتے ہوئے میں ایک خوف کا شکار ہوں۔ میں نے مختصر چچا نیاز اللہ صاحب کو اپنی داستان سنادی ہے' لیکن اس کا بہت سا حصہ میں نے انہیں نہیں بتایا جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روز اول ہی سے میں نے جسے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا وہ یقینی موت کا شکار ہو گیا' میں اپنے کئی پیاروں کو کھو چکا ہوں اور اب اس قدر دہشت زدہ ہوں کہ کسی کے سامنے یہ کہانی نہیں بیان کرسکتا۔ مجھے نیاز اللہ صاحب کی زندگی کا خطرہ ہے۔ آپ کی زندگی کا خطرہ ہے۔ مجھ پر تو جو بیت رہی ہے سو بیت رہی ہے' سو بیت ہی رہی ہے۔''

راما نندی چند لمحات سوچتا رہا' پھر اس نے کہا۔''

بھتیجے! جس جگہ تم بیٹھے ہو' وہاں ہمارا راج پاٹ ہے۔ کوئی آواز یہاں سے باہر نہیں جاسکتی اور کوئی مہا گرو یہاں اندر نہیں آسکتا۔ کتنا ہی بڑا گیانی ہو' اپنی اپنی حد ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ تم کہو گے' محفوظ رہے گا اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہمارا وعدہ ہے تم سے۔''

نیاز اللہ صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔

''اور تم مسلسل ہماری توہین کیے جارہے ہو میاں!...... زندگی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اور وقت جو کچھ بھی پیش کرے وہ اللہ کا حکم۔ نہ اس کے حکم میں کوئی ردوبدل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی کی زندگی کا اختتام ہوسکتا ہے۔ تم ہمارے ایمان

میں رخنہ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ سارے معاملات راما نندی سمجھتا ہے۔ اسے بتاؤ اور میرے سامنے بتاؤ۔ میں اپنی بربادی کا خود ذمہ دار ہوں گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"ٹھیک ہے...... آپ کا حکم مان رہا ہوں راما نندی جی! مختصراً میں نے نیاز اللہ صاحب کو اپنی بربادی کی داستان بتائی ہے' لیکن دوبارہ بتا رہا ہوں۔ میں نے ایک اچھے شریف خاندان میں جنم لیا تھا۔ میرے والد محفوظ احمد صاحب ایک نیک اور دیندار آدمی تھے۔ مگر میں بچپن ہی سے غلط صحبتوں کا شکار ہو گیا اور آسان ذرائع سے دولت کے حصول کی کوششوں میں مصروف رہا۔ مجھے کسی ایسے عامل کی تلاش تھی جو مجھے ان کوششوں میں مدد دے۔ تب مجھے بھوریا چرن ملا اور اس نے میرا کام کرنے کا وعدہ کیا' لیکن اس کے صلے میں اس نے بھی مجھ سے ایک کام کرنے کی شرط رکھی۔"

میں نے راما نندی کو پیر پھاگن کے مزار کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد کے واقعات سنائے کہ میرے گھر پر کیا بیتی۔ بعد میں حکیم سعد اللہ کے ساتھ کیا ہوا۔ لاک اپ اور جیل میں مجھ پر کیا گزری۔ بے چارے چاند خان کس طرح موت کے گھاٹ اترے۔ منحوس بھوریا چرن کیسی کیسی شکلوں میں مجھ پر نازل رہا اور اس نے زندگی کس طرح مجھ پر تلخ کر دی۔ میرے ماں باپ کیسے دربدر ہوئے اور میں کس طرح نیاز اللہ صاحب کے پاس پہنچا۔ راما نندی اور نیاز اللہ صاحب بڑی دلچسپی سے یہ ساری داستان سن رہے تھے۔ اس وقت نیاز اللہ صاحب کو میرے رونے اور سسکنے کی اصل داستان معلوم ہوئی تھی اور وہ بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ راما نندی نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیر تک خاموش رہا' سوچتا رہا۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ عجیب سی کشمکش کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو مسعود میاں؟"

"میں کیا چاہوں گا راما نندی جی! میرا خاندان بکھر چکا ہے۔ ماں باپ اور بہن بھائی نجانے کہاں بھٹک رہے ہیں اور میں جن حالات سے گزر رہا ہوں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ پولیس الگ میری تلاش میں ہو گی۔ میں کبھی یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ میں ان بے گناہ انسانوں کا قاتل نہیں ہوں۔ ان سارے حالات میں میری سوچ کیا ہو سکتی ہے۔ میں خود نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو صرف ایک کام ہو جائے۔"

"کیا؟" راما نندی نے پوچھا۔

"میرے ماں باپ' ماموں اور بہن بھائی اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں اور باعزت زندگی بسر کریں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے اپنے جرم کی پھانسی کی سزا ہو جائے۔ اگر ان لوگوں کو ایک باعزت زندگی مل سکے تو میں اس کے لئے ہزار بار موت قبول کر سکتا ہوں۔ بس اتنا ہو جائے کہ بھوریا چرن میرے اہل خاندان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"کیا تمہارے دل میں کبھی یہ بات آئی کہ تم بھوریا چرن کا وہ کام کر دو؟" راما نندی نے پوچھا۔

"بس اس وقت جب میں پہلی بار اس کام کے لئے پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ لیکن جب میں اوپر نہ پہنچ سکا اور میں نے وہ ہوشربا منظر دیکھا کہ پیر پھاگن کا مزار بلند سے بلند ہو گیا اور میرے نیچے زمین دور ہو گئی تو میرا ذہن بدل گیا اور اس کے بعد سے آج تک میں کسی بھی قیمت پر یہ کام کرنے کو تیار نہیں ہوا اور نہ مرتے دم تک اس کا یہ کام کروں گا۔"

راما نندی پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نیاز اللہ صاحب سے کہا۔

"نیاز! معاملہ بڑا گمبھیر ہے۔ میں بہت کچھ سمجھ چکا ہوں۔ وہ پاپی شنکھا ہے اور شنکھا کالے جادو کے بہت بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ علم ہو کہ سفلی علم رکھنے والے جو جنتر منتر پڑھتے ہیں ان کے لئے انہیں بہت سے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان مرحلوں کی ایک بڑی تفصیل ہے۔ شنکھا پانچویں درجے کا گیانی ہوتا ہے اور اس علم کے کل آٹھ درجے ہیں۔

آٹھواں درجہ کسی کو نہیں مل سکا۔ بڑے سے بڑے جادو کا ماہر چھٹے درجے تک پہنچا' مگر اس کے بعد وہ جی نہ سکا۔ ساتویں درجے پر صرف ایک گیانی پہنچا تھا' مگر وہ پتھر بن گیا اور زمین کی گہرائیوں میں اتر گیا' کیونکہ زمین اس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ سنکھا بھیروں پرم ہوتا ہے اور بھیروں اس کے سارے کام کرتا ہے۔ مہاراج بھوریا چرن بھیروں پرم ہیں۔ بھیروں کا نشان مکڑی ہوتا ہے۔"

"بھیروں کیا ہے؟" نیاز اللہ نے پوچھا۔

"چھوڑو نیاز! یہ کالے علم ہیں۔ تمہاری زبان گندی ہو جائے گی۔"

"اور تیری زبان جو گندی ہے۔"

"میرا تو دھرم ہی دوسرا ہے۔"

"تیرے دھرم کے لوگ بھی تو سارے تیرے جیسے نہیں ہوتے۔"

"مانتا ہوں مگر اس بے چارے کے من کی بات جتنی میں سمجھ سکا ہوں اتنی تم نہیں سمجھے ہو گے نیاز اللہ۔"

"مثلاً......؟"

"یہ موجودہ معاشرے کے غلط اصولوں کا شکار ہے جیسا کہ میں تھا۔ میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں' ان گہرائیوں میں نہ اترو۔ تمہیں اور اسے دونوں کو نقصان ہو جائے گا اور ہماری ان باتوں سے اور بہت سوں کا نقصان ہو گا۔ کالا جادو سیکھنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لو جیسے گھورے یا گندے کیچڑ میں پڑی سونے کی اشرفیاں۔ ہاتھ گندے ہوتے ہیں مگر اشرفیاں ہاتھ آ جاتی ہیں۔ ایمان کھونا پڑتا ہے' مگر سونا مل جاتا ہے اور جو وقت گزر رہا ہے وہ تیرے سامنے بھی ہے نیاز! اور میرے سامنے بھی۔ ایمان تو بہت سے کھو چکے ہیں۔ بس وہ کالا جادو نہیں جانتے۔ رشوت' چور بازاری' ڈکیتی اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب ایمان کے سہارے تو نہیں ہوتا۔ ان سارے دھندوں میں ایمان تو سلامت نہیں رہتا۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ وہ یہ سب کالے جادو کے سہارے نہیں کرتے۔ ان کا اپنا جادو دوسرا ہے' مگر انہیں کالے جادو کے بارے میں بتا دیا جائے تو وہ ضرور اسے سیکھ لیں گے تاکہ ان کا کام اور آسان ہو جائے۔ مگر میں تمہیں بھیروں کے بارے میں ضرور بتائے دیتا ہوں۔"

"چلو وہی بتاؤ۔"

"سارے کے سارے پیدا ہوتے ہیں...... پہلے کچھ کام کرنے ہوتے ہیں' اس کے بعد پہلا جاپ کرنا پڑتا ہے۔"

"اور اس سے؟"

"پہلے جاپ کے مکمل ہونے کے بعد "ہیر" قبضے میں آتا ہے۔ ہیر "اشیش" ہوتا ہے۔ من کھونے والا اور وہ من کے اندر بس جاتا ہے۔ مگر اس کا وجود باہر بھی ہوتا ہے اور تم اسے خبریں لانے کے کام میں لا سکتے ہو۔ دوسرے جاپ سے "ویر" ملتا ہے۔ تمہارا دوسرا غلام جب ہیر اور ویر تمہارے قبضے میں آ جاتے ہیں تو "بیر" کی باری آتی ہے۔ بیر بہت سے ہوتے ہیں۔ بارہ بیر بس میں کرنے کے بعد بھیروں جاگتا ہے۔ بھیروں ایک ہوتا ہے مگر سب کا میت' سب کے کام آنے والا۔ اسے بس میں کرنے والا شنکھا کہلاتا ہے اور شنکھا کے پاس بڑی طاقتیں ہوتی ہیں۔"

نیاز اللہ صاحب بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہے تھے۔ مجھے بھی یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ نیاز اللہ نے کہا۔

"تمہارا کون سا درجہ ہے؟"

راما نندی مسکرا دیا۔ "بتانا منع ہوتا ہے۔"

"اوہ اچھا...... تب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ مگر ایک بات ضرور بتاؤ۔"

"وہ کیا؟"

"یہ بھوریا چرن' پیر پھاگن کے مزار پر جا کر کیا کرنا چاہتا تھا؟" نیاز اللہ صاحب نے ایک نہایت اہم سوال کیا اور راما نندی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "وہ کھنڈولا بننا چاہتا ہے۔"

''کھنڈولا؟''

''چھٹی منزل کا شہنشاہ اور اس کے لئے کسی صاحب ایمان کے گھر کو گندا کرنا ہوتا ہے۔ مگر کوئی شنکھا اپنے پیروں سے چل کر کسی پاک بزرگ کے مزار پر جانے کی قوت نہیں رکھتا۔ ایسی کوشش کرے تو جل کر راکھ ہو جائے۔ ہاں کسی دوسرے صاحب ایمان کا سہارا لے کر وہ ایسا کام کر سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ شنکھا ایسا ہی چاہتا ہو گا۔''

دماغ کھل گیا تھا۔ ساری کہانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ بھوریا چرن کے الفاظ بھی یہی تھے۔ اس نے کہا تھا کہ تُو میرا کام کر دے، میں تیرا کام کر دوں گا۔ وہ کچھ بنا دوں گا تجھے کہ تُو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھوریا چرن میرے ذریعے پیر پھاگن کے مزار کو ناپاک کرنا چاہتا تھا اور جب میں پہلی بار اس کا پُتلا لے کر اس پاک مزار کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو میرا راستہ روکا گیا تھا۔ فاصلے طویل کر دیئے گئے تھے تاکہ یہ گناہ مجھ سے سرزد نہ ہو سکے۔ آہ...... یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ بہت ہی اچھا۔ اگر مجھ پر یہ مصیبتیں اس لئے نازل ہوئی ہیں کہ میں ایک مقدس بزرگ کے پاک مزار کو ناپاک بنانے کا مرتکب نہ ہو سکا تو ایسی لاکھوں مصیبتیں میں بھگتنے کے لئے تیار تھا۔ چاہے میرا پورا گھرانہ برباد ہو جائے۔ میری ماں، میرا باپ، میرے بہن بھائی سب لوگ اور خود میں کتے کی موت مارے جائیں لیکن یہ غلیظ کام میں قیامت تک نہیں کروں گا۔ میرے دل میں اب یہ عزم نئے سرے سے تازہ ہو گیا تھا اور روح کو بڑی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔

نیاز اللہ صاحب گردن جھٹک کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ پھر بولے۔ ''عجب کہانی ہے بھئی۔ ہمارے مذہب میں تو یہ سب کچھ نہیں ہے۔ سیدھے سادے عبادت کرو اور خدا کی خوشنودی حاصل کرو۔ نہ اس میں غلاظت کا کوئی کھیل ہے نہ دل کو گندا کرنے کا۔ ہمارے ہاں لاتعداد علوم ہیں لیکن سارے کے سارے انسانی بہتری کے لئے۔ خدا کے کلام سے کسی کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور خدا کے کلام میں وہ تمام قوتیں پوشیدہ ہیں جو ہزاروں جادوؤں میں نہیں۔ اب تم دیکھ لو راما نندی! کہ تم اپنی گندی قوتیں حاصل کرنے کے لئے بھی ایک پاک مزار کو گندا کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیا انوکھی بات ہے۔''

راما نندی نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک اور بات کا مجھے بڑے تاثر انگیز انداز میں احساس ہوا تھا۔ وہ یہ کہ راما نندی بے انتہا مخلص انسان تھا۔ حالانکہ وہ کالے جادو کا ماہر تھا اور جو تھوڑا سا تماشا میں نے یہاں دیکھا تھا اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ مکمل طور پر دنیا دار ہے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے میں دلچسپی رکھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک غیر مذہب سے اتنا مخلص ہے کہ اس کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اندر کی باتیں بتائی تھیں جو کوئی اور کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس طرح راما نندی کے کردار کا ایک بلند پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ راما نندی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''تو پھر نیاز اللہ! اب یہ بتاؤ کہ کیا کروں؟''

''بھئی میں تو کچھ بھی نہیں جانتا اس سلسلے میں۔ جو کچھ ان کے ساتھ بیتی تھی، میرے ذہن میں تمہارا ہی خیال آیا تھا اور پورے اعتماد کے ساتھ تمہارے پاس آ گیا اور یہ فیصلہ تم خود ہی کرو گے کہ یہ بچہ کس طرح مصیبتوں سے نکل سکتا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا، تم جانتے ہو گے۔''

راما نندی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تو پھر نیاز اللہ ایسا کرو کہ اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔''

میں نے سنسنی خیز نگاہوں سے راما نندی کو دیکھا، لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ نیاز اللہ صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

''کیوں میاں! کچھ دل ٹھکتا ہے اس بات پر؟'' میں چند لمحات خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''میں جس عذاب سے گزر رہا ہوں نیاز اللہ صاحب! آپ کو اب تو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ بے شک میں اپنی زندگی بھی چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ بھی جس کا اظہار میں آپ سے کر چکا ہوں۔ ماں باپ، بہن بھائی میرے دل میں کسکتے ہیں لیکن آج بھی اس بات پر میں بہت خوش ہوں کہ میں نے وہ گندا کام نہیں کیا اور آئندہ بھی میں ان سب کی

زندگی کی قیمت پر یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ اب اس روشنی میں جو بھی فیصلہ میرے لئے مناسب ہو وہ آپ کریں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری جان جا کر ہی میرے ماں باپ مجھے مل سکتے ہیں تو میں آج ہی اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہوں اور اگر مجھ پر سے یہ مصیبت کسی اور ذریعے سے ٹل سکتی ہے تو اس کے لئے کوشش کر لی جائے۔ آپ لوگوں کا احسان مند ہوں گا۔"

"تم میرے پاس کچھ روز رہو گے لڑکے اور تمہیں میرے احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔"

"اس سلسلے میں، میں واضح طور پر ایک بات کہہ دینا چاہتا ہوں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" راما نندی نے سوال کیا۔

"پہلی بار جب مجھے حکیم سعد اللہ کے پاس لے جایا گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے اپنے پاس رکھنے کے لئے کہا تھا اور پھر وہیں سے میری زندگی کا ایک بدنما دور شروع ہو گیا۔ حکیم سعد اللہ مجھ سے اس بارے میں تفصیلات معلوم کر رہے تھے اور میری آنکھوں کے سامنے منحوس بھوریا چرن ایک مکڑی کی شکل میں ہمرا رہا تھا اور پھر میرے ہی ہاتھوں حکیم سعد اللہ قتل ہو گئے۔ کہیں وہ کہانی پھر سے نہ شروع ہو جائے۔"

"ہو سکتی ہے...... ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر اب میں اس سے واقف ہوں۔ اس لئے ایسا نہیں ہوگا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے آپ کے پاس رکنے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے راما نندی جی!"

"تو بس ٹھیک ہے نیاز! آپ آرام کریں اور ایک دو ہفتے کے لئے اسے بالکل بھول جائیں۔ جو کچھ بھی بن پڑے گا' کروں گا اس کے لئے۔"

نیاز اللہ صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "راما نندی! بڑا وقت لیا ہے میں نے تمہارا اور بہت کچھ مانگ لیا ہے تم سے۔ سوائے دعا کے میں اور کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے۔ میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ خدا کا گنہگار بندہ۔ میری تو دعاؤں میں یہ بھی اثر نہیں ہے کہ وہ کسی کے کام جائیں۔ لیکن اس کے باوجود اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوں میں اور مسعود میاں! بھروسہ رکھنا تمہاری بہن اور میں تمہارے لئے دعائیں کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتری ہی کرے گا۔ اچھا تو راما نندی! پھر مجھے اجازت دو۔"

"ٹھیک ہے نیاز! کام بھی دیا تو نے ہمیں تو ایسا کہ پورے بھروسے کے ساتھ نہیں کر رہے' لیکن چنتا مت کرنا۔ راما نندی نے ہوش سنبھالنے کے بعد تیری صورت دیکھی تھی اور اگر مر بھی گیا تو تیری صورت آنکھوں میں ہوگی۔ چنتا مت کرنا۔ اس کے لئے جو کچھ ہم سے بن پڑے گا' کریں گے۔ مگر سنو! ایک بات کہے دیتے ہیں۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے اور جو کھو جائے اس کی ذمہ داری خود تم پر ہوگی۔"

"میں سمجھا نہیں راما نندی!" نیاز اللہ صاحب نے کہا۔

"میں سمجھا بھی نہیں سکتا تمہیں اس وقت۔" راما نندی نے کہا اور نیاز اللہ اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ تو جو کچھ بھی کرے گا' بہتر ہی کرے گا۔"

راما نندی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور نیاز اللہ واپسی کے لئے پلٹے۔ میں اور راما نندی انہیں باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔

❖❖❖❖❖

"تم اطمینان سے یہاں رہو۔ میں اسی تانگے میں واپس چلا جاؤں گا۔ کل پھر آؤں گا۔"

"نہیں نیاز اللہ! جب تک میں تجھے یہاں نہ بلاؤں' تو یہاں نہ آنا۔ یہ میری درخواست ہے تجھ سے۔" راما نندی نے کہا اور نیاز اللہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"ٹھیک ہے...... میں تیرے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اچھا' تو پھر میں چلتا ہوں۔ مسعود میاں! اجازت

ہے۔"

میں نے نیاز اللہ صاحب سے مصافحہ کیا اور اس کے بعد وہ چلے گئے۔ راما نندی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا۔ اس بار وہ کھنڈر میں واپس نہیں گیا تھا بلکہ ٹہلنے کے سے انداز میں دوسری جانب چل پڑا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "مسعود ہے نا تمہارا نام؟"

"ہاں۔"

"دیکھو مسعود! میں ایک بات پورے خلوص سے کہنا چاہتا ہوں تم سے۔ جو واقعات اور حالات میرے علم میں آئے ہیں' ان سے میں نے ایک اندازہ لگایا ہے۔ میری حیثیت ایک حکیم کی سی ہے' جو مریض دیکھتا ہے' اس کے مرض کی تشخیص کرتا ہے اور اس کے لئے دوا تجویز کرتا ہے۔ تم صاحب ایمان ہو۔ بے شک مانتا ہوں' حالانکہ میرے اور تمہارے دھرم میں اختلاف ہے۔ میرا دھرم کچھ اور ہے' تمہارا دھرم کچھ اور لیکن کیا تم اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرو گے کہ بعض اوقات صحت کے لئے مریض کو کڑوی دوائیں بھی دینا پڑتی ہیں۔"

"ہاں...... بے شک۔"

"اس کے علاوہ ڈاکٹروں کی اقسام ہوتی ہیں۔ کوئی ایلو پیتھک ہوتا ہے' کوئی ہومیو پیتھک اور کوئی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ میرا اپنا طریق علاج ہے۔ میں تو وہی کر سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں؟"

"مجھ پر اعتماد رکھنا میرا حق ہے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ بس میں تمہاری صحت چاہتا ہوں اور جو کچھ کروں گا اس کے لئے کروں گا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"آج سنیچر وار ہے۔ تمہیں منگل وار تک انتظار کرنا ہو گا۔ منگل کی رات کو تمہیں بہت سی مشکلوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس دوران تم یہاں رہو۔ جہاں من چاہے گھومو پھرو۔ کچھ فاصلے پر باغ ہے۔ اس میں پھل لگے ہوئے ہیں۔ کھیت بھی ہیں۔ مکئی پک رہی ہے۔ بھٹے بھون کر کھا سکتے ہو۔ میں تمہیں اپنے ہاں کی کوئی چیز نہیں کھلاؤں گا تاکہ تمہیں اس سے کراہت نہ ہو۔"

"آپ بہت عظیم انسان ہیں راما نندی جی!" میں نے متاثر ہو کر کہا اور راما نندی مسکرا دیا۔

"زندگی بہت تھوڑی ہوتی ہے مسعود میاں! انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ کچھ بھی کر لے' کچھ بھی پا لے مگر اسے مرنا ہو گا۔ جیون بھر کی محنت سے جو کچھ حاصل کیا ہے' چھوڑنا ہو گا۔ مگر اس کی فطرت میں طلب ہے۔ سب کچھ جان کر بھی وہ سب کچھ پانا چاہتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو سنسار کے سارے کام رک جائیں۔ مگر روح کی طلب بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے روح کی آسودگی کے لئے کرتا ہے اور روح کی آسودگی کے لئے محبت بھی بہت بڑی چیز ہے۔ نیاز اللہ اور میں ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہماری یہ محبت ہمیشہ بڑھی ہے کبھی گھٹی نہیں۔ میں اس کی ایک ایک جنبش کا احترام کرتا ہوں' اس سے پیار کرتا ہوں۔"

"یہ ایک مثالی دوستی ہے۔"

"ہاں...... تم کہہ سکتے ہو۔ تم سمجھ گئے نا میری بات؟ اور ایک بات میں تمہیں اور بتا دوں میاں! ڈرنا نہیں۔ بھور یا چرن جو کچھ بھی ہے میرے حلقے میں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہمارے بیچ معاہدے ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے نہیں لڑتے ورنہ نقصان دونوں کو ہو جاتا ہے۔ ہمارے بیر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور سارا کھیل بیروں کا ہوتا ہے۔ بیر ایک طرح سے ہمارے سپاہی ہوتے ہیں اس لئے تم ایک ایک کوس کے بیچ جہاں چاہو گھوم پھر سکتے ہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔"

''ٹھیک ہے راما نندی جی۔''

''اس کے علاوہ رات کو جب بھی آرام کرو اسی کھنڈر میں کسی چھت کے نیچے آ کر آرام کرنا۔ کھلی جگہ کبھی مت سونا۔''

''بہتر ہے۔''

''منگل کو ملوں گا۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جو مجھ سے کرنا ضروری ہو تو کسی آدمی سے کہہ دینا' وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔ یہاں ضرورت مند آتے رہتے ہیں۔ ان سے زیادہ مت گھلنا ملنا اور رات کو کسی جاپ کرنے والے کے پاس مت جانا۔ وہ لوگ جو جوہڑ کے کنارے بیٹھے ہوتے ہیں۔''

''میں خیال رکھوں گا۔''

''بس' اب میں جاؤں؟'' راما نندی نے پوچھا۔

''جی۔'' میں نے کہا اور راما نندی اندر کھنڈر میں چلا گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ دل و دماغ پر ایک سنسنی سی رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا' لیکن دل و دماغ اپنے بس میں کہاں ہوتے ہیں اور یہ ''بس'' ہے کیا چیز' سمجھنا مشکل ہے۔ کچھ نہ کچھ آ ہی گھستا ہے دماغ میں' اس کا راستہ کون روکے۔ چنانچہ تصور سے نیاز اللہ صاحب کو تانگے میں واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ دل نے دل کی کہ خدا خیر کرے۔ راما نندی تو مضبوط ہے' مگر نیاز اللہ بھی بھوریا چرن کی کہانی سے واقف ہو گئے ہیں۔ کہیں وہ کتا انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔

سارا دن وہیں گزار دیا۔ تانگے آ کر رکتے تھے اور ان سے مرد' عورتیں' بچے اترتے۔ راما نندی کے آدمیوں سے ملتے۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا' وہ واپس چلے جاتے۔ مجھے بھوک لگی اور میں باغوں کی تلاش میں نکل گیا۔ اس کے لئے مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ کوئی سو گز دور ہی چلا تھا کہ باغ نظر آ گیا۔ سامنے ہی ناشپاتیاں لگی ہوئی تھیں۔ بس شکم سیری کی بات تھی۔ چنانچہ اس پر زور رہ گیا۔ احساس ہوا کہ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کر رہا ہوں' لیکن اور کون سے اقدار نبھائے جا رہے ہیں جو اس سے بچتا۔ زندگی زخم تو بن گئی تھی اور یہ زخم ہمیشہ بے کل رکھتے تھے۔ رات کو راما نندی کی ہدایت کے مطابق کھنڈر کے ایک کمرے میں جا گھسا اور زمین پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرا دن — دوسری رات ...... پھر تیسرا دن۔ راما نندی ایک بار بھی نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کے چیلے چانٹوں سے ملتی رہتی تھی۔ جاپ کرنے والوں کو بھی دیکھتا تھا۔ رات میں کبھی باہر نہیں نکلا تھا۔ ہاں اپنی مخصوص آرام گاہ میں کبھی کبھی راتوں کو میں نے بڑی بھیانک آوازیں سنی تھیں۔

تیسرا دن بھی تمام ہوا۔ کل دن منگل کا تھا۔ اس وقت شام کے کوئی سات بجے تھے۔ ناشپاتیوں کا ڈنر لے کر پلٹ رہا تھا۔ کھنڈرات کے آس پاس لوگ نظر آ رہے تھے۔ سامنے ہی رنگین کپڑوں میں لپٹی ایک عورت اپنے بچے کو کندھے سے لگائے میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ اس نے میرے قدموں کی چاپ سنی تو رک گئی اور جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے آواز دی۔

''مہاراج! سنئے ...... مہاراج!'' میں رک گیا۔ اسے دیکھا' پچکے ہوئے گال' دھنسی ہوئی آنکھیں' پیلا چہرہ' چہرے پر عجیب سی ویرانی۔ اس کے کندھے سے جو بچہ لگا سو رہا تھا' وہ بالکل سوکھا ہوا تھا۔ میری انگلیوں کے برابر اس کی پنڈلیاں تھیں۔ باقی بدن بھی ایسا ہی تھا۔ سر بالوں سے صاف اور جسم کی نسبت بہت بڑا نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے میری گود سے اتار دو۔'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیوں؟''

''اترتا ہی نہیں ہے۔ میں اسے لئے لئے تھک گئی ہوں۔''

''کوئی اور نہیں ہے تمہارے ساتھ؟''

''کوئی نہیں ہے۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے لے لو' میں تھک گئی ہوں۔ ایک سال ہو گیا۔ پورا ایک سال۔ یہ میری گود سے نہیں اترتا۔'' میں چونک پڑا۔ عجیب سے الفاظ تھے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟...... کیا یہ بچہ بیمار ہے؟''

''سوکھے کی بیماری ہے اسے۔ مگر تم اسے لے لو نا۔'' وہ آگے بڑھ کر میرے پاس پہنچ گئی۔ میں کشمکش کا شکار تھا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں۔ اسی وقت بچے نے ماں کے شانے سے سر اٹھایا۔ پتلی گردن گھمائی اور اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور اس کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکلی۔ سیٹی بجا کر وہ شرارت سے مسکرایا۔ مگر وہ چہرہ...... وہ چہرہ کسی بچے کا نہ تھا۔ وہ ایک معمر آدمی کا چہرہ تھا...... اور وہ معمر آدمی بھوریا چرن کے علاوہ کوئی نہ تھا...... بھوریا چرن...... جس کا بدن ایک بیمار' مدقوق بچے کا بدن تھا' مگر چہرہ مکمل...... ! میرے پورے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسان ہی تھا۔ خوف تو فطرت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لاکھ سب کچھ جانتا تھا اور کافی حد تک ناقابل یقین مناظر کا عادی ہو گیا تھا' لیکن آپ خود تصور کریں' آبادیوں سے دور ایک ویران اور سنسان علاقہ جہاں چاروں طرف ہولناک سناٹا پھیلا ہوا ہو' وہ کھنڈر بھی یہاں سے خاصا دور جہاں کیسے ہی سہی کم از کم انسانی شکل کے لوگ نظر آ جاتے تھے۔ سامنے ہی ایک پراسرار عورت جس کے انوکھے الفاظ کہ یہ بچہ ایک سال سے میری گود سے نہیں اترا اور پھر سوکھے کیکڑے جیسے ہاتھ پاؤں والا بچہ جس کا سر بھوریا چرن کا تھا' مجھے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر خباثت اور شیطانی مسکراہٹ۔ پھر اس کی آواز اور اس کا انداز...... دہشت سے برا حال نہ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر بھوریا چرن کسی نہ کسی طرح میرے پاس پہنچ ہی گیا اور راما نندی کا عمل پورا نہیں ہوا تھا۔ سارے دن گزر گئے تھے۔ بس ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اگلے دن...... منگل تھا اور راما نندی نے کہا تھا کہ منگل گزر جائے تو میں ان مصیبتوں سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ راما نندی کیا کرنے والا تھا' لیکن ان دنوں تو تنکے کا سہارا بھی میرے لئے بڑی حیثیت رکھتا تھا۔

بھوریا چرن نے ایک بار پھر سیٹی بجائی اور عورت سے بولا۔ ''چل...... اتار دے مجھے اپنی گود سے۔''

عورت نے اس طرح اسے جھٹک کر پھینک دیا جیسے کسی بہت بڑی مصیبت سے چھٹکارا ملا ہو۔ بھوریا چرن زمین پر گر کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے چھوٹے چھوٹے بچے جو اپنے پیروں سے چلنا نہیں جانتے' کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا بھیانک چہرہ مسلسل مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''کھوسیاں جی! کیسے ہو؟...... ارے ہم سے بچ کر سنسار کے کون سے کونے کھدرے میں بھاگو گے۔ جہاں جاؤ گے ہمیں پاؤ گے۔ تم نے تو نہ بلایا ہمیں مگر ہم تمہاری کتنی خبر رکھتے ہیں۔''

دفعتاً ہی میرے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ دہشت تو پہلے ہی دل و دماغ میں منجمد تھی۔ ہاتھ پاؤں البتہ چند لمحات کے لئے ساکت ہو گئے تھے' لیکن اچانک ہی مجھے ہوش آ گیا اور دوسرے ہی لمحے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور اس طرح دوڑنے لگا کہ شاید کوئی گھوڑا بھی اس وقت میرا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا' لیکن میرے کان عجیب سی سرسراہٹیں سن رہے تھے اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بھوریا چرن اسی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل دوڑتا ہوا میرے پیچھے آ رہا ہے۔ حالانکہ میں اپنی اس رفتار کو ناقابل یقین کہہ سکتا ہوں۔ لیکن پھر چند ہی لمحے گزرے تھے کہ بھوریا چرن ننھے سے بچے کی شکل میں دوڑتا ہوا مجھ سے آگے نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے دونوں پاؤں زمین پر پھیلائے اور پھر میں نے دیکھا اس کے سارے بدن میں پاؤں ہی پاؤں نکل آئے۔ وہ مکڑی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا...... ان پیروں پر لمبے لمبے بال اُگ آئے تھے۔ بس اوپری بدن بھوریا چرن کا تھا اور اس مکڑی کا سائز بلاشبہ کوئی اڑھائی فٹ کے دائرے میں تھا...... بھوریا چرن کی خونخوار آنکھیں اب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے رخ تبدیل کیا تو وہ پھر میرے ساتھ دوڑنے لگا۔ لیکن اب وہ اپنے سارے ہاتھ پاؤں سے دوڑ رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس گم تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا ہو گا' لیکن کسی نہ کسی

طرح ان کھنڈرات تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

اور بالآخر کئی بار اسے چکمہ دے کر میں کھنڈرات کے نزدیک پہنچ گیا' جہاں مدھم مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ راما نندی کا علاقہ آ گیا تھا۔ وہ جوہڑ جس کے کنارے لوگ بیٹھے جاپ کیا کرتے تھے' قریب آ گیا تھا اور دفعتاً ہی میں نے جوہڑ سے کچھ فاصلے پر راما نندی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ساکت کھڑا تھا۔ پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھوریا چرن مکڑی کے روپ میں میرے قریب آتا جا رہا تھا اور چند ہی لمحات کے بعد وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں دہشت سے چیختا ہوا راما نندی کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ راما نندی نے میرا بازو پکڑ لیا اور بھوریا چرن کو دیکھنے لگا۔ بھوریا چرن بھی آن کی آن میں ہمارے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے نگاہیں اٹھا کر راما نندی کو دیکھا اور اس کے بعد اچانک سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے دو ہاتھ اور دو پاؤں ہی تھے اور وہ اپنے اس روپ میں نظر آ رہا تھا جس روپ میں اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یعنی جوگی کے روپ میں...... راما نندی خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر راما نندی کے ہونٹوں سے مدھم سی آواز نکلی۔

''اکھنڈ شنکھا......!''

بھوریا چرن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں اب راما نندی پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک اور منظر میں نے دیکھا...... اس کی آنکھوں سے سرخ دھاریاں بہنے لگیں۔ دونوں آنکھوں سے خون جیسی سیال شے بہہ کر نیچے گر رہی تھی اور اس کے پیر بھیگتے جا رہے تھے۔ راما نندی ساکت کھڑا ہوا تھا۔ چند لمحات کے بعد اس کے منہ سے پھر آواز نکلی۔

''پدم شنکھا......''

''چپ ہو جا رے...... چپ ہو جا رے۔ ارے او پاپی چھچھوندرے! کالے دھرم کا کھائے ہے اور دھرم ہی کا اپمان کرے گا۔ کیوں رے' تیری یہ مجال؟''

''پدم شنکھا......''

''ارے چپ شنکھا کے گھونسلے! کون سی بیڑی ہے رے تیری؟...... کون سی بیڑی ہے؟''

''تیسری بیڑی پدم شنکھا۔''

راما نندی نے جواب دیا۔

''اور باتیں ایسے کرے ہے جیسے کھنڈولا بن گیا ہو۔ کیوں رے' کھنڈولا ہے نا تُو؟''

''نہیں پدم شنکھا...... میں کھنڈولا کہاں۔ داس ہوں تیرا۔''

''ارے واہ رے' داس...... داس بنے ہے اور شنکھا کی برابری کرے ہے۔ شنکھا کے راستے روکے ہے۔ ارے تیرے کالے دھرم نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے راستے بند کرنا چاہتا ہے۔ ارے تیرے اپنے راستے نہیں بندھے تھے اس سے۔ اگر تُو اس کا دھرم خراب کر دیتا اور ہم کھنڈولے بن جاتے تو تیرا کیا نقصان ہوتا؟ ایک کھنڈولا سو شنکھا کی رکھشا کرتا ہے اور ایک شنکھا ہزاروں بیڑیوں کے کام آتا ہے۔ تُو اپنی بیڑ خراب نہیں کر رہا تھا رے تیسری بیڑی والے بول...... جواب دے...... اور تُو...... ارے او دھرم داس! تجھ سے کہہ رہا ہوں میں...... تُو اپنا دھرم خراب کرنے جا رہا تھا اس کے ہاتھوں...... جانتا ہے تُو یہ کل منگل کو کیا کرتا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یہ شنکھا کو دھوکا دے رہا ہے' شنکھا کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ مگر شنکھا اس سے بہت بڑا ہے۔ ارے بلا اپنے بیروں کو۔ ذرا پہلے ان کا حساب کتاب کر دیں۔ بلا رے...... بلاتا کیوں نہیں ہے؟...... ارے کہاں ہو تیسری بیڑی کے بیرو!...... کہاں ہو؟...... ذرا سامنے تو آؤ...... اپنے مالک کا کھیل دیکھو۔''

مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ راما نندی نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے بازو سیدھے ہو گئے تھے۔ دفعتاً ہی میں نے کچھ عجیب و غریب شکلیں دیکھیں۔ ان کے قد اڑھائی اڑھائی اور تین تین فٹ کے تھے اور چہرے غیر انسانی معلوم

ہوتے تھے۔ کالے سیاہ۔ کسی کے کان ہاتھیوں کے کان جیسے' کسی کی سونڈ لٹکی ہوئی' کسی کی زبان باہر نکلی ہوئی...... وہ سب کے سب بے لباس تھے اور اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے۔ عجیب سا منظر تھا۔ تعداد ان کی کوئی دس بارہ ہو گی۔ سارے کے سارے سامنے آ کھڑے ہوئے اور پھر ان کے منہ سے آواز نکلی۔

''اکھنڈ شنکھا...... پدم شنکھا......'' وہ سارے کے سارے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے اور انہوں نے دونوں ہاتھ آگے رکھ لئے۔ یہ منظر تھا عجیب وغریب' دماغ چٹخا دینے والا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں بند ہو چکی تھیں۔ زبان خشک تھی اور اب ہر احساس دل سے فنا ہوتا جا رہا تھا۔ خوف کی انتہا نے بدن کو پتھرا دیا تھا۔ کان سن سکتے تھے' دماغ بھی کام کر رہا تھا۔ کسی حد تک ان کی آوازیں سمجھ میں آ رہی تھیں' لیکن اعضاء اس طرح ساکت ہو گئے تھے کہ اگر کوشش بھی کرتا تو بدن کو جنبش نہ دے پاتا۔ یہ سب کیا جنجال تھا۔ بھوریا چرن کی آواز پھر اُبھری۔

''اس سسرے کے بیر بنے ہو۔ تم اس کے بیرو ہو۔ تم جو اپنی ہی بیڑی کاٹتے ہے' جو اپنا ہی کالا دھرم خراب کئے دیوے ہے۔ ارے تُو سن رہا ہے بڑے دھرم والے! کیا کرتا یہ تیرے ساتھ؟ جانتا ہے کیا کرتا یہ تیرے ساتھ؟ ارے او دیندار! اس کے جال میں پھنسا تھا تُو...... اس کے جال میں۔ یہ گندا خون جمع کر رہا ہے۔ ایسا گندا خون جس کے بارے میں تُو سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر کل منگل کو چاند نکلے یہ وہ خون تجھے پلا دیتا۔ تیرے شریر میں' تیرے بدن میں یہ ناپاک خون اتر جاتا اور تُو بھی ناپاک ہو جاتا اور اس طرح تُو ہمارے بڑے گہرے دوست پیر پھاگن کے مزار پر نہ جا سکتا تھا۔ کسی گندے آدمی کو مزار کے احاطے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ مہا تمن بیڑا سوچتا تھا کہ گندا خون پلا کر تجھے ہمارے لئے ناکارہ کر دے اور اس کے بعد ہم خود ہی تیرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مگر تیرے دھرم کا کیا ہوتا؟...... دھرم ہی کے ناتے تو تُو اب تک موت کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ ارے اگر ایسے ہی دھرم کھونا تھا تو ہم کیا برے تھے؟ تُو ہمارا کام کر دیتا تو تجھے بھی کچھ مل جاتا۔ ارے اتنا کچھ مل جاتا تجھے کہ سنسار میں تیرے لئے پھول ہی پھول ہوتے...... مگر تُو اس کے ہاتھوں دھرم کھو رہا تھا۔ پھر جانتا ہے کیا ہوتا؟ تُو دھوبی کا کتا بن جاتا۔ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔ کالے دھرم کو تُو مانتا نہیں اور اپنے دھرم سے دور ہو جاتا۔ یہی ارادہ تھا اس کا۔ ارے ایسا ہی اپنا دھرم خراب کرنا تھا تو اس کل کے بیڑے کے چکر میں کیوں پھنسا؟ مان لے ہماری...... اب بھی مان لے۔ لے چل ہمیں پیر پھاگن کے دوار اور پالے سارے سنسار کو۔ بول' اب بھی موقع ہے۔ مگر ٹھہر' پہلے تیرے اس مددگار کا کریا کرم کریں۔ پہلے اسے اس کے حال پر پہنچا دیں۔ ارے او بیرو! ...... او دھیرو! جاؤ اپنا کام کرو۔ جاؤ ڈوب مرو جوہڑ میں۔ چلو چلو...... ہم حکم دے رہے ہیں تمہیں۔''

زمین پر بیٹھی ہوئی عجیب وغریب مخلوق بین کرنے لگی...... وہ رو رہے تھے' پیٹ رہے تھے' اپنا سر دھن رہے تھے' بال نوچ رہے تھے اور راما نندی کو خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ راما نندی اب بھی خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ پھر خوب رو پیٹنے کے بعد وہ سارے کے سارے اُٹھے اور اس کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے اس کالے کیچڑ کے جوہڑ میں چھلانگیں لگا دیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خودکشی کر رہے ہوں۔ میں اب ایک خاموش تماشائی کی طرح یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔ راما نندی پتھرایا ہوا کھڑا تھا۔ ان عجیب وغریب لوگوں کے غائب ہو جانے کے بعد بھوریا چرن راما نندی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہاں رے تیسری بیڑی والے! ...... بول اب تیرا کیا کریں ہم؟ ...... چھوڑ دیں تجھے یا سزا دے دیں تجھے؟ ...... بول' کیا تھا تیرے پاس اپنے دینے کے لئے؟ ...... اس کا دھرم خراب کرتا تو صرف اس لئے نا کہ پھر یہ ہمارے کام کا نہ رہے؟ یہی منصوبہ تھا تیرا نا؟''

''ہاں پدم شنکھا!'' راما نندی نے جواب دیا۔

''پدم شنکھا! میرے بچپن کے دوست نے مجھ سے یہ کہا تھا۔''

''ارے بچپن کا دوست تجھ سے یہ کہتا کہ اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہو جا' تُو ہو جاتا' کیوں؟''

''ہاں بھوریا چرن! اگر وہ سچ مچ مجھ سے یہ بات بھی کہتا تو میں اس کی یہ بات بھی مان لیتا۔''

''یہی سننا تھا تیرے منہ سے ہمیں ...... یہی سننا تھا۔ ارے کالے دھرم کو بدنام کرنے والے! تیرا اس سنسار میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب بہک جائے' کب بھٹک جائے۔ ایں ...... ٹھہر ہم تیرا بندوبست کئے دیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر بھوریا چرن نے اپنے مختصر سے لباس میں ہاتھ ڈالا اور شاید چمڑے کی بنی ہوئی ایک گول سی بوتل نکال لی۔ راما نندی کے بدن پر کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ بھوریا چرن نے انگلی سے اس کو اس طرح جھٹکا دیا جیسے کسی چیز کے چھینٹے دیئے جاتے ہیں اور میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا کہ راما نندی کے پیروں میں لوہے کی ایک زنجیر جکڑ گئی ہے۔ بھوریا چرن نے دوبارہ یہی عمل اسی طرح دہرایا اور راما نندی کے دونوں ہاتھ بھی پیچھے جا بندھے۔ راما نندی چیخنے لگا۔

''چھوڑ دے بھوریا چرن! ...... چھوڑ دے پدم شنکھا! چھوڑ دے ...... مجھے شما کر دے۔ معافی چاہتا ہوں تجھ سے۔ آئندہ یہ کبھی نہیں کروں گا۔ ارے دال روٹی کھانے دے مجھے بھی پدم شنکھا! تیرا کچھ نہیں لوں گا میں۔ بھول ہو گئی مجھ سے ...... بھول ہو گئی۔''

''بھول ہو گئی تو بھگت باؤلے! یہ ...... یہ سسرا تو چٹ پٹ ہو جاتا ہمارے ہاتھوں اگر ہمارے کام کا نہ رہتا۔ ارے اس کی اوقات کیا ہے ہمارے سامنے۔ یہ بڑا میاں جی کا پلا بنا پھرتا ہے۔ ارے کیا ہے یہ؟ دو منٹ میں ٹھیک کر دیتے ہم اسے مگر ...... مگر جب ہم نے اسے اپنے کام کے لئے ٹھیک کر لیا تو پھر ٹھیک کر لیا۔ ہمیں یہی حکم ہوا تھا کھنڈولوں کی طرف سے' سمجھا؟ ...... کھنڈولا بننے کے لئے یہی ہمارے کام آ سکتا ہے اور سب کچھ بتا دیا تو نے اسے۔ بتا دے ہمارا کیا بگاڑ لے گا سسرا۔ دیکھ لیں گے' ہمارے سامنے کب تک سینہ پھلائے پھلائے پھرتا ہے۔ چل تو آ جا اپنی جون میں ...... آ جا اپنی جگہ۔''

''معاف کر دے بھوریا! ...... معاف کر دے۔'' راما نندی بری طرح تڑپنے لگا' لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہل پا رہا تھا۔ پاؤں نہیں ہٹا سکتا تھا وہ اپنی جگہ سے۔ اس کے دونوں پاؤں جکڑے ہوئے تھے اور شاید وہ زمین پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بھوریا چرن نے اسے دیکھا' کچھ منہ ہی منہ میں بدبدایا اور پھر راما نندی کی طرف پھونک مار دی ...... راما نندی کے بدن کی کیفیت سے ایسا ہی اظہار ہوا جیسے اچانک ہی وہ شعلوں میں گھر گیا ہو۔ اس نے بے اختیار چیخنا شروع کر دیا۔ ایسی بھیانک چیخیں تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ راما نندی دہشت سے چیخ رہا تھا اور اس کا بدن عجیب سے انداز میں رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ پہلے یہ رنگ پیلا ہوا' پھر نارنجی' اس کے بعد سفید ہو گیا ...... بالکل یوں لگا جیسے راما نندی جل کر راکھ ہو گیا ہو۔ سفید سفید راکھ ...... اب اس کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ پھر دفعتاً ہی اس کے بدن سے سفید سا دھواں خارج ہونے لگا اور بھوریا چرن نے شیشی کا ڈھکن کھول دیا۔ دھوئیں نے رخ بدلا اور پتلی لکیر کی شکل میں شیشی کے اندر داخل ہونے لگا۔ میرے ہوش و حواس گم تھے۔ آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور میرے وجود میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ یہ سب ...... یہ سب کچھ ...... یہ سب کچھ ایک انوکھے خواب کی مانند تھا۔ سارا دھواں سمٹ کر شیشی میں بھر گیا تو بھوریا چرن نے شیشی میں ڈاٹ لگائی اور اس کے بعد پوری قوت سے شیشی جوہڑ میں اچھال دی ...... کوئی آواز نہیں ہوئی تھی۔

وہ جو جوہڑ کے کنارے بیٹھے جاپ کر رہے تھے' نجانے کب اٹھ کر بھاگ گئے تھے۔ غالباً ان خوفناک چہروں اور خوفناک آوازوں نے انہیں ان کے جاپ سے چونکا دیا تھا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ کوئی بھی یہاں نہیں تھا سوائے بھوریا چرن کے جو میرے سامنے کھڑا مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھ لیا اپنے مددگار کا انجام ......؟ اب بول' تو کیا چاہتا ہے؟ ہاں بول' اب کیا کہے گا تو؟''

میں نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے لیکن آواز حلق سے باہر نہیں آ سکی تھی۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بھوریا چرن کو دیکھتا رہا۔ راما نندی کا یہ انجام میرے لئے بڑا ہی دردناک تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' کالے جادو کا ماہر تھا۔ ایک غلیظ ہندو ...... لیکن میرے لئے انسانیت کے تمام دروازے کھول دیئے تھے اس نے۔ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا تھا' میں نہیں جانتا تھا۔ بھوریا چرن کی زبانی یہ سن کر کہ وہ مجھے گندا خون پلا کر بھوریا چرن کے لئے ناقابل قبول بنا دینا چاہتا تھا' مجھے کراہت تو ہوئی تھی اور یقیناً میرا وجود کسی گندی اور غلیظ شے سے ناپاک ہو جاتا تو میں خوش نہ ہوتا۔ بے شک' بھوریا چرن کی مصیبت سے بچ جاتا' لیکن

اپنے ایمان ہی کے لئے تو میں نے اب تک یہ مصائب برداشت کئے تھے۔ مجھے یقینی طور پر اس کا وہ کھیل اچھا نہ لگتا' لیکن اس نے خلوص دل سے جتنا وہ جانتا تھا' کوشش کر ڈالی تھی۔ بھوریا چرن کی زبان میں سمجھ رہا تھا اور وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں آ گیا تھا' لیکن اس کے باوجود مجھے راما نندی کے اس انجام کا افسوس تھا۔ بھوریا چرن میرے قریب آیا اور اپنی اس مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''عقل آ رہی ہے۔ اب شاید سمجھے۔ ارے چنتا کاہے کرے ہے بٹوا!...... سنسار دے دوں گا تجھے۔ سارا سنسار دے دوں گا۔ بس ایک بار...... صرف ایک بار مجھے پیر پھاگن کے دوارے پہنچا دے۔ سمجھ رہا ہے نا؟ بول' تیار ہے؟''

''نہیں......''

جانے کس طرح میرے منہ سے یہ آواز نکلی اور بھوریا چرن ایک بار پھر سست گیا۔

''نہیں......؟''

''نہیں بھوریا چرن......!''

اچانک میری آواز صاف ہو گئی۔

''ارے کس کی نسل سے رے تُو؟...... کس کی نسل ہے؟...... ارے کب مانے گا پاپی؟...... کب مانے گا؟...... کتنا انتظار کرائے گا ہمیں؟...... دل نہیں بھرا تیرا؟...... ابھی دل نہیں بھرا؟ کچھ اور چاہئے تجھے؟ کچھ اور چاہئے؟''

''ہاں بھوریا چرن! مجھے کچھ اور چاہئے' سمجھا؟...... سچ سچ مجھے کچھ اور چاہئے۔ لیکن میں تیری اس خواہش کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا۔ بھوریا چرن! تُو آزما لینا اپنے آپ کو۔ موت دے سکتا ہے تُو مجھے' یہ کام تیرے لئے بہت آسان ہے۔ میں یہ بات جانتا ہوں لیکن میرے ارادے کو نہیں بدل سکتا۔ کوشش کر بھوریا چرن!...... کوشش کر۔''

بھوریا چرن اچانک ہی زمین پر بیٹھ گیا اور بری طرح اچھل کود کرنے لگا۔ بڑا بھیانک لگ رہا تھا وہ اس انداز میں بھی۔ غالباً یہ اس کے جنون کا انداز تھا۔ بہت دیر تک زمین پر لوٹتا رہا اور اس کے بعد سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''آخری بار...... آخری با کہہ رہے ہیں۔ مان لے...... دیکھ' مان لے۔ ورنہ نقصان اٹھائے گا۔''

''لعنت ہے تیری صورت پر بھوریا چرن!...... لعنت ہے تیری صورت پر۔ تُو مجھے کیا مجبور رکھ سکے گا۔ کوشش کر لے جتنی کی جا سکتی ہے تجھ سے۔ جتنی کوششیں تجھ سے کی جا سکتی ہیں کر لے اور اب میں چلتا ہوں۔''

''ہلنا مت اپنی جگہ سے...... کہہ دیا ہم نے' ہلنا مت۔''

وہ بولا اور دفعتاً ہی میرے پاؤں اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ بھوریا چرن کی قوتیں میرے اوپر کارگر ہو رہی تھیں' لیکن اس کا بس میرے دل و دماغ پر نہیں چل سکتا تھا۔ میرے ارادوں کو وہ نہیں تبدیل کر سکتا تھا۔ یہ میری مرضی پر ہی منحصر تھا کہ میں اس کی بات مانوں یا نہ مانوں۔ بھوریا چرن ایک بار پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں گھٹنوں میں اپنا سر دے لیا۔ دیر تک بیٹھا رہا اور اس کے بعد اچانک ہی اس کے ہاتھ پاؤں بڑھنا شروع ہو گئے۔ وہ پھر سے ایک مکڑی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کا چہرہ اور جسم جوں کا توں تھا۔ بس مکڑی کی طرح اس کے بدن میں ہاتھ پاؤں اُگ آتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک کالی مکڑی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور خونی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ مکڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میرے پاؤں تو پہلے ہی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ جیسے اس نے مجھے بھی کسی ان دیکھی زنجیر میں جکڑ لیا ہو۔ وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے اپنے آگے کے دو پاؤں میرے بدن پر رکھے۔

پورے بدن میں جھرجھری آ گئی تھی' لیکن کم بخت اعضاء ساکت ہو گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے جادو کے جال میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے پاؤں کچھ اور آگے بڑھے' میری رانوں تک پہنچ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے بدن پر چڑھ رہا تھا اور میرے پورے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ لیکن نہ ہاتھ اس قابل تھے کہ میں اسے اپنے آپ سے دور کر سکوں اور نہ پاؤں ساتھ دے رہے تھے۔ بس میں گردن جھٹک رہا تھا اور پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے چہرے کے بالکل قریب پہنچ گیا

اور پھر اس نے اچانک اپنا منہ میری گردن کے قریب کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے باریک نکیلے دانت میری گردن میں پیوست کر دیئے۔ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ بدن میں سوئیاں سی چبھیں لیکن میں اسے اس کے عمل سے نہ روک سکا...... نہ جانے کیا کر رہا تھا وہ کم بخت۔ چند لمحات وہ اسی طرح میری گردن سے چمٹا رہا اور پھر نیچے اتر گیا۔ گردن میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ مگر میں ہاتھ اٹھا کر گردن مسل بھی نہیں سکتا تھا۔ بھوریا چرن نے پھر روپ بدل لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''بہت کچھ جان لیا ہے تُو نے ہمارے بارے میں لڑکے! ہمارا کچھ نہ بگڑے گا۔ ضد کئے جا' نقصان اٹھائے جا۔ ہم پھر تجھ سے یہ کہہ کر جا رہے ہیں کہ جب بھی ہمارا کام کرنے کا من کر جائے' ہمیں آواز دے لینا۔ تجھ سے دور ہی کتنے ہوتے ہیں ہم' آ جائیں گے اور کھلی چھوٹ ہے تجھے جو من چاہے کر۔ ہمارے خلاف کچھ نہ کر پائے گا۔ ہم تجھ سے کہے دے رہے ہیں۔ ٹھیک ہے' جا دیکھ سنسار کو۔ کیسا ہے یہ۔ بڑا اچھا لگے گا تجھے۔ ہم پھر ملیں گے تجھے جب ضرورت ہوگی۔'' بھوریا چرن نے کہا اور رخ تبدیل کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی اس نے رخ تبدیل کیا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا بدن پھر سے متحرک ہو گیا ہو۔ اور پہلا کام میں نے یہی کیا کہ اپنی گردن کے اس حصے کو ملنے لگا۔ اس میں شدید سوزش ہو رہی تھی۔ نجانے اس کتے نے کیا کر دیا تھا۔ گردن کے اس حصے کو چھونے ہی سے ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ کچھ کچھ ذہن میں آتا جا رہا تھا۔ آہ...... بے چارہ راما نندی ختم ہو گیا میری وجہ سے اور پتہ نہیں نیاز اللہ صاحب کا کیا ہوا۔ خدانخواستہ کہیں وہ بھی اس کالے جادو کے ماہر کے عتاب کا شکار نہ ہو جائیں۔ بڑا غم ہو گا مجھے اگر ایسا ہو گیا تو۔ اپنی مصیبت میں تو گرفتار تھا ہی' نیاز اللہ صاحب کا خدشہ اور دل میں بیدار ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ یہاں رکنا تو اب بے مقصد ہی تھا۔ جوہڑ میں جا کر اس شیشی کو تو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ بس وقت نے نجانے کیا کیا بے تکی چیزیں سجائی تھیں جنہیں میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

میں کھنڈرات سے واپس چل پڑا۔ دل میں نیاز اللہ صاحب کا خیال بھی تھا اور اپنی تکلیف بھی بے چین کئے دے رہی تھی۔ چلتا رہا۔ بس بے دھیانی کا سا عالم تھا۔ حالانکہ کافی فاصلہ طے کر کے تانگے میں بیٹھ کر نیاز اللہ صاحب یہاں آئے تھے' لیکن میں چلا جا رہا تھا۔ نیاز اللہ صاحب کی خیریت مل جائے' بس اس کے بعد ان کی طرف رخ نہیں کروں گا۔ میری نحوستیں کسی بھی اس شخص کو نہیں چھوڑ سکیں گی جس کے دل میں میرے لئے محبت کا تھوڑا سا بھی جذبہ اُبھرے گا اور جو میری کہانی سے واقف ہو جائے گا۔ خدا کرے...... خدا کرے نیاز اللہ صاحب خیریت سے رہیں۔ خدا کرے اس بدبخت سادھو کے دل میں ان کا خیال نہ آئے۔ بس یہی دعا میرے دل میں تھی۔

نجانے یہ سفر کب تک جاری رہا۔ وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ نیم دیوانگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ بار بار گردن پر ہاتھ پہنچ جاتا۔ اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ گردن پر کیسا زخم ہے۔ ٹٹولنے سے کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔

نجانے کتنا سفر طے ہو گیا۔ پھر مجھے روشنیاں نظر آئیں۔ مدھم مدھم روشنیاں آبادی کا نشان دے رہی تھیں۔ میں شاید شہر کی حد میں داخل ہو گیا تھا۔ شہر میں داخل ہوا' لیکن یہ سب کچھ تو اجنبی اجنبی لگ رہا تھا...... یہ وہ جگہ...... تو نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے وہ آبادی تو نہیں تھی جہاں نیاز اللہ صاحب رہتے تھے۔ میں راستہ بھٹک کر کسی اور ہی سمت نکل آیا تھا۔ اتنے دن میں تھوڑا بہت اندازہ ان علاقوں کے بارے میں لگا چکا تھا۔ یقینی طور پر یہ نیاز اللہ صاحب کی بستی نہیں تھی۔ دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ صبح ہونے میں شاید تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ میں دیر تک دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ بھوک لگ رہی تھی اور چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ ویسے بھی راما نندی کے ساتھ قیام کے دوران کھانے پینے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ بس درختوں کے پھلوں وغیرہ پر اپنا گزارہ کرتا رہا تھا۔ اس وقت بھوک کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ آنسو خشک کئے۔ گردن کی تکلیف کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اپنی جگہ سے ہٹا اور کافی دور چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ روشنی سی نظر آئی۔ یہ کوئی چھوٹا سا جھونپڑا ہوٹل تھا' جہاں شاید نہاری پکائی گئی تھی اور تندور پر روٹیاں لگ رہی تھیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہی بھوک نے کچھ ایسی شدت اختیار کی کہ میرے قدم اس کی جانب بڑھ گئے۔ چند افراد کاموں میں مصروف تھے۔ غالباً صبح ہی صبح تمام تیاریاں کر لی گئی تھیں۔

گاہکوں کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ پیسے نام کی کوئی چیز میرے پاس موجود نہیں تھی' لیکن دل مچل رہا تھا۔ وہ کرنے پر آمادہ ہو گیا جو کبھی نہیں کیا تھا۔ میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔

''کھانا کھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تیار ہے بابو!...... بہت صبح گھر سے نکل آئے۔'' تھڑے پر بیٹھے ہوئے بھاری بھرکم شخص نے کہا۔

''مسافر ہوں بھائی!'' میں نے جواب دیا۔

''بیٹھو...... اندر بیٹھ جاؤ!'' اس نے نرمی سے اشارہ کیا اور میں اندر جا بیٹھا۔ ''رمضان دیکھ بابو کو۔'' اس شخص نے زور سے کہا اور ایک دُبلا پتلا آدمی میرے پاس پہنچ گیا۔

''بولو بابو......؟''

''کھانا لے آؤ بھائی!'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور وہ آوازیں لگانے لگا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ پیٹ کا دوزخ تو بھر جائے گا' مگر اس کے بعد جو بے عزتی ہوگی' اس کا احساس تھا۔ ان لوگوں کی نرمی کیا رخ اختیار کر جائے گی۔ آہ...... کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ مگر یہ لمحے بھی میری تقدیر میں لکھے تھے۔ پھولی ہوئی خمیری روٹیاں اور سرخ تار والی نہاری کیا لذت دے رہی تھی' بیان نہیں کر سکتا۔ کاش' کچھ پاس ہوتا' وہی دے کر ان لوگوں کو مطمئن کر سکتا۔

کھانا کھا لیا۔ دو روٹیاں ختم ہو گئیں۔ پتہ ہی نہ چلا۔ میں نے اسے اور کھانا لانے کے لئے کہا۔ چھ پلیٹ سالن اور بارہ روٹیوں تک تو کام چل گیا۔ حالانکہ میرے ہر بار کے آرڈر پر کھانا لانے والے کے چہرے پر حیرت پھیل جاتی تھی اور جب میں نے ساتویں پلیٹ مانگی تو وہ کسی قدر خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔

''یہ سب کہاں جا رہا ہے بابو؟''

''ایں......؟'' میں چونک پڑا۔

''دیکھنے میں تو معمولی لگتے ہو۔ کوئی پہلوان ہو کیا؟''

''اور کھانا لا سکتے ہو؟''

''ہمیں کیا...... دیگ کھا جاؤ پوری۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔ البتہ اس نے دیگ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کچھ کہا تھا اور وہ بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ اس بار وہ چھ روٹیاں اور سالن لے آیا۔ اس کے احساس دلانے سے میں بھی چونکا تھا اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں کتنا کھا چکا ہوں۔ مگر پیٹ...... یوں لگتا تھا جیسے کچھ نہ کھایا ہو۔ آہ! یہ نئی افتاد تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟...... لاکھ کئی دن کے بعد گوشت چکھا تھا مگر بارہ روٹیاں...... مجھے تعداد یاد تھی' مگر ہاتھ نہ رکے۔ میں ان روٹیوں کو بھی چٹ کر گیا۔ اب کیا کروں؟ میں نے کھانا لانے والے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں' مگر وہ کہیں کھسک لیا تھا۔ سامنے پانی کا بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ گلاس میں پانی انڈیل کر پیا اور پھر پانی پیتا چلا گیا۔ چند گلاس میں ہی جگ خالی ہو گیا تھا۔ نہاری کی دیگ کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے دیکھ لیا تھا اور اس کا دم خشک لگ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا' اور جیسے ہی بینچ کے پیچھے سے نکلا' وہ شخص بھی جلدی سے تھڑے سے نیچے اتر آیا۔

''اور پانی مل سکے گا بھائی؟''

''ہو...... ہو...... ہے......'' اس نے ٹینکی کی طرف اشارہ کیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ گلاس پر گلاس پیئے جا رہا تھا' مگر بھوک مٹی تھی نہ پیاس۔ جھلا کر گلاس رکھ دیا اور پھر آخری مرحلے سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا' مگر ایک عجیب چیز دیکھنے کو ملی۔ تھڑے پر بیٹھا ہوا شخص غائب تھا۔ بیرا تو پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ تندور پر روٹیاں لگانے والے بھی اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ایک لمحے کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا' مگر پھر ہنسی آ گئی۔ کام دوسرے انداز میں بن گیا۔ وہ لوگ شاید میری خوراک سے خوفزدہ ہو گئے تھے اور نہ جانے کیا سمجھ کر بھاگ نکلے تھے' مگر عزت رہ گئی تھی۔ میں خود بھی تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل پڑا اور اس جگہ سے بہت دور آ کر سکون کی سانس لی۔ مگر قصہ کیا ہے؟ یہ کوئی بیماری ہے؟ اتنے دنوں کی بھوک ہے

یا بھوریا چرن کا کوئی انعام؟ ...... آہ! آخری بات دل کو لگتی تھی۔ بھوک اب بھی کم نہیں ہوئی تھی اور گردن کی تکلیف کا بھی وہی عالم تھا۔

آبادی جاگتی جا رہی تھی۔ زندگی کے معمولات شروع ہو گئے تھے۔ ایک پلیا پر بیٹھ کر میں ان خوش نصیبوں کو دیکھنے لگا' جو اتنی صبح جاگ کر زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے عیش و آرام کو ترک کر کے' لیکن میری نسبت وہ کس قدر خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسی کسی مصیبت میں نہیں گرفتار ہونا پڑا تھا۔ آہ! کاش میرے ابتدائی اقدامات بھی درست ہوتے۔ میں بھی دنیا کے ان رہنے والوں کی مانند ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارتا اور انہی لوگوں کی مانند تلاش رزق میں نکل کھڑا ہوتا۔ آہ...... کاش! میں آسان ذرائع سے جائز اور ناجائز طریقوں سے دولت کے ڈھیر لگانے کے بارے میں نہ سوچتا۔ کیا حسین زندگی ہوتی۔ صبح سے شام تک محنت کی جائے اور اس کے بعد گھر کا رخ کیا جائے ...... پیارا گھر...... جہاں اپنے ہوتے ہیں۔ لیکن میں ایک بدنصیب تھا۔ بھائی بہن' ماں باپ' پیار کرنے والا دوست ماموں۔ لیکن سب سے دور' سب کے لئے عذاب کا باعث ...... کاش! تھوڑا سا سوچنے کا موقع مل جاتا اور میں اپنے راستے درست کر لیتا۔ مگر اب تو سب کچھ چھن گیا۔ سب کچھ...... ہاتھ تھا کہ مسلسل گردن پر مصروف تھا۔ گردن پھوڑا سی لگ رہی تھی۔ جو کچھ بھی ہو چکا تھا وہ بھی ناقابل یقین تھا۔ لیکن قابل یقین بات ہی کون سی تھی۔ لوگوں کو بتاتا تو سب حیرت زدہ ہی ہو جاتے۔ اب تک ایسا ہی ہوا تھا۔ بڑا عجیب معاملہ تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ بھوریا چرن کا یہ وار سب سے زیادہ سخت ہے۔ اب تک تو دنیا سے ہی چھپتا پھرا تھا اور دنیا کے لئے اپنے آپ کو نقصان دہ سمجھتا رہا تھا...... لیکن بات اب اپنی ہی ذات پر آ گئی تھی۔ یہ بھوک...... اس بھوک کا کیا ہوگا؟ ...... ناقابل یقین حد تک کھا پی کر آیا تھا۔ بھلا اتنی ساری روٹیاں اور اتنا سارا سالن جو میرے جیسی جسامت کے آٹھ دس آدمیوں کے لئے کافی ہو' میں اکیلا ہی چٹ کر گیا تھا۔ اتنا پانی پی گیا تھا کہ بے چارے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُٹھ کر بھاگ گئے۔ بھوک ...... پیاس نہ مٹی تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس عالم میں کیا جی سکوں گا؟ ...... دل یہ چاہ رہا تھا کہ کچھ کھاؤں لیکن ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ بے بسی کی نگاہوں سے وہیں پلیا پر بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا۔ سورج نکل آیا تھا۔ پھر نیاز اللہ صاحب کا خیال آیا۔ یہ بستی کون سی ہے آخر؟ ...... یہ نیاز اللہ صاحب کی بستی تو نہیں ہے۔ کوئی منظر وہاں کا سا نہیں ہے۔ نجانے کہاں نکل آیا ہوں؟

دل میں تجسس سا جاگا اور معلومات کرنے نکل پڑا اور پھر اس بستی کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ جگہ نہیں تھی۔ پتہ نہیں بے چارے نیاز اللہ صاحب کا کیا ہوا؟ ...... خدا انہیں محفوظ رکھے۔ میں ایک درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ آنکھوں میں نیند کا جھونکا سا محسوس ہوا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ نجانے کب تک سوتا رہا۔ جاگا تو شام ہو چکی تھی اور بھوک تھی کہ کم بخت پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ کیا کروں؟ ...... آہ! کیا کروں؟ ...... وہاں سے ہٹا اور آگے بڑھ گیا۔ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں پھلوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ ایک سمت گلے سڑے پھلوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ قدم رک گئے اور وہیں بیٹھ گیا اور ان گلے سڑے پھلوں کو اٹھا اٹھا کر کھانے لگا۔ لوگ مجھے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے' لیکن اب جو افتاد پڑی تھی' اسے گزارنا ہی تھا۔ یہ پھل میں اپنے معدے میں اُتارتا رہا اور خاصا بڑا حصہ صاف کر دیا' لیکن بھوک نہیں مٹی تھی۔ آہ ...... بھوک نہیں مٹی تھی۔

وہاں سے ہٹا اور تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھا۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ پورا دن گزر گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ مصیبت میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ جو کچھ ہوا' اسے ٹالنے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا۔ گزاروں گا ...... اس طرح بھی گزاروں گا بھوریا چرن! لیکن تیری بات نہیں مانوں گا ...... کسی قیمت پر نہیں مانوں گا کتے! ...... یاد رکھنا' یاد رکھے گا تُو بھی کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔ رات گہری ہو گئی تو سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر آدھی رات گزر گئی تو آنکھیں خود ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔

صبح و شام' دن رات میں سڑکوں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک اور کیفیت مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔ جس کا پہلا

نمونہ دیکھتے ہی میرا دل خون کے آنسو رو پڑا۔ یہ وہ تھی کہ بدن کے مختلف حصوں میں ننھے ننھے سرخ دانے نمودار ہو گئے تھے۔ پھر ان دانوں میں سوراخ سے باریک مٹی جیسی کوئی چیز باہر نکلنے لگی ...... یہ چیز ان سوراخوں کے اوپر جمع ہو جاتی۔ میں اسے صاف کرتا تو ایک ہلکی سی سوزش محسوس ہوتی اور اس میں لذت کا سا احساس ہوتا...... پتہ نہیں یہ کیا ہو رہا تھا۔ دانے پورے بدن پر پھیل گئے۔ وہی ہوتا۔ پہلے دانے نکلتے' پھر سوراخ ہو جاتے۔ دو تین دن کے بعد ان سوراخوں سے مٹی جیسی خشکی نکلنا بند ہوئی اور گاڑھا سیال نکلنے لگا۔ بدن پر سفید سفید نشان بننے لگے تھے۔ حواس معطل رہے۔ سب سے زیادہ بھوک نے نڈھال کر دیا تھا۔ لوگ مجھ سے دور بھاگنے لگے۔ وہ مجھ سے گھن کھاتے تھے۔ ویسے وہ مجھے کھانے پینے کی چیزیں دے دیا کرتے تھے۔ کئی بار ایسا ہو گیا تھا اور بدن کے سوراخوں سے نکلنے والا سیال' لباس کو بھگو کر سڑنے لگتا جس سے بدبو اُٹھتی تھی۔ پھر ایک دن میں ایسے ہی بیٹھا اپنی تقدیر پر غور کر رہا تھا کہ ایک سفید گاڑی میرے پاس آ کر رکی۔ بڑی سی وین نما گاڑی تھی۔ اس سے کئی افراد نیچے اُترے۔ ایک شخص ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

✦✤✦✤✦

''یہ ہے۔'' رہنمائی کرنے والے شخص نے کہا۔

''ہوں ...... پاگل بھی ہے؟'' دوسرے شخص نے پوچھا۔

''نہیں ......ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔'' دوسرا آدمی دو اور آدمیوں کو اشارہ کر کے میرے قریب آ گیا۔

''اٹھو......!'' اس نے کہا۔

''جی ......؟'' میں حیرت سے بولا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''مگر کہاں؟''

''ہسپتال ...... تمہیں علم نہیں ہے کہ تم کوڑھی ہو؟''

''کک ......کوڑھی ......؟'' میری آواز رندھ گئی۔ میں نے کوڑھ کا صرف نام سنا تھا۔ یہ علم تھا کہ یہ بہت خطرناک مرض ہے۔ مگر اپنے بارے میں خیال مجھے کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے جسم کی اس کیفیت سے یہ تصور میرے ذہن میں کبھی نہیں اُبھرا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ حلق میں ایک گولا سا آ پھنسا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔ تمہارا علاج ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر تمہارا اس طرح سڑکوں پر پڑا رہنا اچھا نہیں ہے۔ یہ یہاں کی میونسپلٹی کے رکن ہیں۔ انہوں نے ہمیں تمہارے بارے میں اطلاع دی اور ہم تمہیں لینے آ گئے آؤ ...... ہمارے ساتھ چلو۔'' میں خاموشی سے اٹھ کر گاڑی میں جا بیٹھا اور گاڑی چل پڑی۔ دل رو رہا تھا۔ یہ بھی ہونا تھا ٹھیک ہے' ہو جائے۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔

گاڑی کا سفر بہت طویل تھا۔ اس کا اختتام ایک شاندار عمارت پر ہوا تھا۔ مجھے اتار کر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی صاف ستھری جگہ تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک نرس آئی اور اس نے مجھے ایک لباس دیتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔''

میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ ایک دروازے کے قریب رک کر اس نے کہا۔

''یہ غسل خانہ ہے......اندر ایک بڑا ڈبہ رکھا ہے جس پر ڈھکن ہے۔ اپنا یہ لباس اتار کر اس ڈبے میں ڈال دینا اور غسل کر کے یہ لباس پہن لینا۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور غسل خانہ میں داخل ہو گیا۔ نرس کی ہدایت پر عمل کر کے میں دوسرے لباس میں باہر آیا تو نرس میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک اور بڑے کمرے میں داخل ہو گئی اور اس نے مجھے یہاں ایک جگہ بٹھا لیا۔ دو عورتیں اور تین مرد یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی میری طرح کوڑھی تھے۔ کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر میری طلبی

ہوگئی۔ اندر کئی ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا اور پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''مسعود احمد۔''

''باپ کا نام؟''

''محفوظ احمد۔''

''تمہارے اہلِ خاندان کہاں ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیوں؟''

''میں طویل عرصے سے ان سے بچھڑا ہوا ہوں۔''

''خاندان میں' والدین میں کوئی اور اس مرض کا شکار تھا؟''

''خدا نہ کرے' یہ بدنصیبی میرے حصے میں آئی ہے۔''

انہوں نے اس مرض کی ابتداء پوچھی۔ عرصے کے بارے میں معلوم کیا۔ مزید کیفیات پوچھیں تو میں نے بھوک کے بارے میں بتایا۔

''یہاں تم پیٹ بھر کر کھانا'' ایک ہمدرد ڈاکٹر نے کہا اور پھر مجھے اس ہسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ جنرل وارڈ تھا' بہت سے مریض تھے۔ بھیانک چہرے جذام کا شکار۔ انہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ مگر تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ میرے بہت سے ٹیسٹ ہوئے' ان کی رپورٹیں موصول ہوئیں تو ڈاکٹر کو حیرت ہوئی' کیونکہ ان کے خیال کے مطابق میرے خون میں کوڑھ کے جراثیم نہیں تھے۔ مجھے ڈاکٹروں کے بورڈ کے سامنے ان تمام رپورٹوں کے ساتھ پیش کیا گیا اور ڈاکٹروں نے انٹرویو لیا' مگر میں اس پناہ گاہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں کچھ سکون تھا۔ میں نے انہیں بھوریا چرن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا' مگر مجھے جنرل وارڈ سے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ میرا انوکھا مرض ڈاکٹروں کو دلچسپ لگا تھا اور وہ اس پر تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بھوک کی تکلیف کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اسپیشل وارڈ میں میرے ساتھ تین مریض تھے جن میں ایک معمر شخص جو کافی تعلیم یافتہ اور نمازی آدمی تھا' نام سلیم بیگ تھا اور دوسرا شہزادہ تھا' جس کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ تیسرا فرید شاہ تھا۔ سلیم پانچوں وقت کا نمازی' خوش اخلاق آدمی تھا اور اس سے میری زیادہ دوستی ہوگئی تھی' لیکن میں نے اسے بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

ڈاکٹروں نے پہلا تجربہ میری بھوک پر کیا اور انہوں نے مجھے کھانے کے انبار کے سامنے بٹھا دیا۔ مجھے کھانے کی کھلی چھٹی تھی۔ میں نے کھانا شروع کر دیا اور ڈاکٹروں کو چکر آ گئے۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے مجھے کھانے سے روکا۔ میرا وزن کیا' مگر وزن نارمل تھا۔ ان کے لئے یہ نہایت حیران کن بات تھی۔ ایک ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

''تم ہمیشہ اتنا کھاتے ہو؟''

''نہیں ڈاکٹر صاحب!...... اس مرض کے آغاز کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔''

''مزید کتنا کھا سکتے ہو؟'' دوسرے ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''کوئی انتہا نہیں ڈاکٹر صاحب!''

''اگر تمہیں علاج کے لئے ملک سے باہر جانا پڑے تو جاؤ گے؟''

''ہاں ...... جینا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!'' میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے مجھے تسلیاں دیں اور چلے گئے۔ اس رات بڑا بے چین تھا۔ طبیعت پر بوجھ طاری تھا۔ بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ باہر پرسکون سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دور بلندی پر کچھ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں ان روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ دل

میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ اس کائنات میں لوگ بڑے بڑے جرم کر لیتے ہیں۔ بعض تو آرام سے زندگی بسر کر جاتے ہیں۔ کیا میں اس دنیا میں سب سے بڑا مجرم ہوں؟...... کیا اللہ کے حضور میری توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں؟...... کیا میری توبہ کبھی قبول نہ ہوگی؟...... دل بہت دکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں حیرت اُبھر آئی تھی۔ اچانک دل دہل کر رہ گیا۔ کسی نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ پھر یہ ہاتھ کس کا ہے؟...... گھوم کر دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بدن پر کپکپی طاری تھی۔ اب تو اعصاب بھی کمزور ہو گئے تھے۔ کون ہے؟...... کیا بھوریا چرن......؟''

''رو رہے ہو بیٹے؟'' عقب سے آنے والی آواز نرم اور شفیق تھی۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر مجھے اپنے اس خوف پر شرمندگی ہوئی۔ آواز تو سلیم بیگ کی تھی۔ میرے خوف سے کپکپاتے بدن کو دیکھ کر سلیم بیگ سمجھا کہ میں رو رہا ہوں۔ میں نے گہری سانس لے کر رخ بدل لیا۔

''نہیں سلیم چچا!''

''ایسا ہی لگا تھا...... رات تو بہت گزر گئی ہے۔ کیا نیند نہیں آئی؟''

''ہاں...... طبیعت کچھ بے چین ہے۔''

''ایک بات کہوں بیٹے؟''

''جی چچا!''

''نماز پڑھا کرو...... ساری بے چینی دور ہو جائے گی۔ اللہ نے اپنی مخلوق کو خود سے قریب آنے کے بہت سے راستے کھولے ہیں اور ان میں سب سے افضل نماز ہے۔ جس میں تم اس کے حضور ہوتے ہو۔ تمہارا تصور اس کی حمد و ثناء میں ہوتا ہے اور جب خیال اس ذات باری کی طرف ہو تو کوئی اور خیال بے چین نہیں کرتا۔ نماز شروع کر کے دیکھو بیٹے! ایک تجربہ کر لو۔ تمہیں فائدے کا خود اندازہ ہو جائے گا۔''

دل کو ایک عجیب سا دھکا لگا تھا۔ سب کچھ کرتا تھا۔ نہ جانے یہ کیوں نہ کیا تھا۔

''نماز آتی ہے؟''

''بھول گیا ہوں چچا!''

''کوئی مشکل ہی نہیں۔ تھوڑی دیر میں یاد کرا دوں گا۔''

''میرے کپڑے...... بدن کا کوڑھ...... کپڑے تو خون اور پیپ سے گندے ہو جاتے ہیں۔''

''یہ مجبوری ہے...... بیماری بھی خالق کا تحفہ ہے۔ دل کی طہارت ضروری ہے۔ غلاظت تو ہمارے سارے وجود میں بھری ہے۔ روح سے بدن عاری ہو جائے تو اس غلاظت کا تعفن دیکھو نا قابل برداشت ہوتا ہے۔ بس روح طاہر ہے اس کی طہارت افضل ہے۔ دل سے ضرور پاک رہو وہ مجبوریاں معاف کر دیتا ہے۔ آؤ پھر...... بے چینی کے یہ لمحات اس کی یاد میں گزار دیں۔ دیکھو بے چینی کیسے بھاگتی ہے۔ فجر کی نماز دونوں ساتھ پڑھیں گے۔'' میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا اور سلیم بیگ مجھے طریقہ نماز سکھانے لگے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ بڑے عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔ ہم کس طرح وقت کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں۔ بچپن تھا۔ محمود بھی چھوٹا تھا۔ عید آتی تھی۔ امی دونوں بھائیوں کو تیار کرتی تھیں۔ ماموں ریاض انگلیاں پکڑے ہوتے تھے۔ ہم نماز پڑھنے جاتے تھے۔ ابو نماز کی تلقین کرتے تھے۔ چھوٹے تھے تو خوف سے نماز پڑھتے تھے۔ بڑے ہوئے تو سرکشی شروع کر دی۔ جمعہ کے دن غائب ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ابو نے کہنا چھوڑ دیا...... سلیم بیگ آیات الٰہی دوہراتے رہے اور میرا ذہن ماضی میں بھٹکتا رہا۔

''اب سو جاؤ...... فجر کے وقت جگا دوں گا...... جگا دوں نا؟''

''جی!'' میں نے کہا اور لیٹ گیا۔ سلیم بیگ صاحب بھی لیٹ گئے۔ نہ جانے کب نیند آئی تھی۔ پتہ نہیں سویا بھی تھا یا نہیں۔ سلیم بیگ نے جھنجھوڑا تو فوراً آواز دی۔

"ہاں چچا! جاگ رہا ہوں...... کیا بات ہے؟"

"بھول گئے......؟ فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ اُٹھ جاؤ بیٹے نماز افضل ہے نیند سے۔"

"جی چچا!" میں نے کہا اور اُٹھ گیا۔ نماز پڑھی اور پھر سلیم بیگ سے باتیں کرتا رہا۔

دو دن گزر گئے۔ کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر بھوک کی تکلیف سے نڈھال رہتا تھا۔ حالانکہ مجھے ایک وقت میں کم از کم چھ افراد کی خوراک دی جاتی تھی۔ کھاتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی' لیکن دل نہیں بھرتا تھا۔ تیسری دوپہر کچھ نئے ڈاکٹر آئے اور مجھے خصوصی طور پر ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ میری ساری رپورٹیں ان کے سامنے تھیں۔

"ہم تمہیں جرمنی بھیجنا چاہتے ہیں۔ تمہاری تفصیل وہاں بھجوائی جا چکی ہے اور وہ وہاں کے ڈاکٹر تم پر تجربات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تجربات تمہاری موت پر بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ تم کہتے ہو تم لاوارث ہو۔ اس لئے کسی اور سے تو تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ تم بتاؤ...... تیار ہو؟"

"جی......" میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

"تم سے اس بارے میں پوچھا گیا تھا اور تم نے آمادگی کا اظہار کیا تھا۔" پرانے ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا۔

"جی ہاں...... مجھے یاد ہے۔ مجھے کب جانا ہو گا؟"

"کچھ دن لگ جائیں گے۔ حکومت تمہاری روانگی کے انتظامات کرے گی۔ تمہاری موت کی تو محض ایک بات کہی گئی ہے۔ زیادہ امکانات تمہارے درست ہو جانے کے ہیں۔ تمہارے کوڑھ کے مرض کا تو یہاں علاج ہو رہا ہے' اصل مسئلہ تمہاری اس بھوک کا ہے اور جرمنی کے ڈاکٹر اسی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاید وہ تمہارے معدے کا آپریشن کریں۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم آمادہ ہو تو اس فارم پر دستخط کر دو۔" انہوں نے ایک فارم میرے سامنے کر دیا۔

"میں سوچنا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب!"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟...... ہم نے تمہارے لئے بڑی کوشش کی ہے۔" ڈاکٹر نے ناخوشگوار انداز میں کہا۔

"اگر میں آپ کو اس بھوک کی کہانی سنا دوں ڈاکٹر صاحب! تو آپ اسے محض ایک دلچسپ افسانہ کہیں گے۔ اس پر بھی یقین نہیں کریں گے۔ میرا علاج جرمن میں نہیں ہے بلکہ...... بلکہ اسی ملک میں ہے۔"

"بقراط بننے کی کوشش نہ کرو...... ہمیں کسی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جانا چاہتے ہو تو اس فارم پر دستخط کر دو۔"

"سوچنا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! اور یہ ضروری ہے۔"

"ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اسے سوچنے کا موقع ضرور دو۔" نئے آنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا اور مجھے واپس میرے کمرے میں بھجوا دیا گیا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' سچ کہا تھا۔ میری بیماری جو کچھ تھی' میں جانتا تھا۔ یہ بے چارے یا جرمنی کے ڈاکٹر کیا کر سکتے تھے۔ ہاں دل میں ایک خیال ضرور آ رہا تھا۔ بھوریا چرن سے اتنا دور نکل جاؤں تو شاید اس سے جان بچ جائے۔ لیکن سب یہیں رہ جائیں گے۔ ان سے ملنے کی آخری آس بھی ٹوٹ جائے گی...... یہ آس بھی زندگی تھی اور میں اس زندگی سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔

اس رات پھر بے چینیوں نے دل میں بسیرا کر لیا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھایا اور لیٹ گیا۔ سب سو گئے تھے۔ میں اٹھا' کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ تاریکیاں سامنے تھیں۔ بہت دور اونچی بلندیوں پر روشنی ٹمٹما رہی تھیں۔ ہوا کے دوش پر کچھ شور کی سی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر دوبارہ مجھ سے سوال کریں گے۔ کیا جواب دوں گا انہیں؟...... کیسے بتاؤں گا کہ میرا علاج تو بہت آسان ہے۔ اس گندی روح کو آواز دوں' وہ آ جائے گی۔ مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکال لے جائے گی۔ اس مکروہ خواہش پر سر جھکا دوں' ایمان کھو دوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سوائے اس کے کہ عاقبت کے لئے کچھ نہ ہو گا' بجز گناہوں کے انبار کے۔

"عرس ہو رہا ہے شاید۔" پیچھے سے آواز اُبھری اور میں چونک پڑا۔ نہ جانے کب سلیم بیگ میرے پیچھے آ کھڑے

ہوئے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پھر بولے۔ ''قوالیاں ہو رہی ہیں۔''
''کہاں......؟''
''مزار پر۔''
''کون سے مزار پر؟''
''یہ آوازیں نہیں سن رہے؟...... وہیں سے آ رہی ہیں۔''
''مزار کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ روشنیاں جو نظر آ رہی ہیں' مزار ہی کی تو ہیں۔''
''کس کا مزار ہے؟''
''بابا جلال شاہ کا......لوگ یہی کہتے ہیں۔ دیکھا تو کبھی نہیں ہے۔'' سلیم بیگ نے کہا۔
''کافی فاصلے پر ہے؟''
''ہاں ...... بہت دور ہے۔ دن میں تو نظر بھی نہیں آتا۔ رات کو بس روشنیاں نظر آ جاتی ہیں۔ اس وقت قوالیوں کی آوازیں بھی ہوا کے ساتھ آ رہی ہیں۔ ہوا کا رخ بدل جائے تو آواز بھی نہیں آئے گی۔''
''چلیں......؟'' میں نے بے اختیار کہا۔
''کہاں؟'' سلیم بیگ حیرت سے بولے۔
''عرس دیکھیں......قوالیاں سنیں۔'' میں نے کہا اور سلیم بیگ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ میں ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کچھ بولنا چاہتا تھا کہ اچانک ان کی سسکیاں اُبھرنے لگیں اور میں حیران ہو گیا۔
''ارے ارے......سلیم چچا!...... میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''
''کوئی بات نہیں بیٹے! بس ایسے ہی دل بھر آیا تھا۔ تمہارا دل چاہتا ہے نا سب دیکھنے کو مگر...... اللہ کا حکم...... وہ خود ہی سب کچھ جانتا ہے۔ بیٹے! ہمیں کوئی اپنے درمیان کہاں قبول کرے گا؟ لوگ ہم سے گھن کھاتے ہیں۔ ہم کیسے جا سکتے ہیں وہاں؟''
''ہم ان سے دور رہیں گے چچا!''
''نہیں بیٹے!...... ویسے بھی گیٹ بند ہو گا۔ چوکیدار اس وقت نہیں جانے دے گا۔''
''میرا دل چاہ رہا ہے چچا! میں جاؤں گا۔''
''ارے نہیں بیٹے ...... ! ممکن نہیں ہے۔ مزار شریف بہت دور ہے اور پھر باہر کیسے جاؤ گے؟ کمرے کے باہر بھی رات کی ڈیوٹی کے ڈاکٹر ہوں گے۔ سختی کریں گے۔''
''یہ کھڑکی زیادہ اونچی تو نہیں ہے۔ کود جاؤں گا۔''
''زخمی ہو جاؤ گے بیٹے!''
''زخمی تو میں ہوں چچا!''
''ضد سوار ہو گئی ہے تم پر...... مگر ٹھیک نہیں ہو گا بیٹے...... مناسب نہیں ہے۔''
''میں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کھڑکی پر چڑھ گیا۔ سلیم بیگ ''ارے ارے'' کرتے رہ گئے' مگر میں نیچے کود گیا۔ بس دل پر یہ طلب طاری ہو گئی تھی اور پھر میں کوڑھی نہیں تھا۔ میرا بدن مضبوط تھا۔ میں یہ فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ میں نے احاطے کی دیوار عبور کی اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ مجھے دوڑنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ رخ کا تعین کر لیا تھا اور اسی طرف دوڑ رہا تھا۔ ماحول پر دہشت ناک سناٹا طاری تھا۔ چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہسپتال کی عمارت بہت پیچھے رہ

گئی۔ راستے ناہموار تھے۔ کئی جگہ ٹھوکریں لگیں اور میں نے دوڑنے کی رفتار ہلکی کردی۔ اب یہ خوف نہیں رہا تھا کہ ہسپتال کے ملازم مجھے پکڑ لیں گے۔ پیچھے ایسے آثار بھی نہیں تھے۔ میرے اردگرد جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو۔

میں نے دوڑنا ترک کر کے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ اور آگے بڑھا تو کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اُبھریں۔ پھر اچانک کہیں گیدڑ رونے لگے۔ یہ آوازیں کبھی کبھی بالکل انسانی آوازیں لگتی تھیں۔ اچانک میرے حلق سے ایک خوفزدہ آواز نکل گئی اور میں رک گیا۔ کالے رنگ کا ایک ہولناک کتا مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک جھاڑی کی آڑ سے نکل آیا۔ کتا ہی تھا' لیکن اس کی جسامت ناقابل یقین تھی۔ قدوقامت میں وہ کسی گدھے جتنا لگتا تھا۔ آنکھیں رات ہونے کے باوجود چمک رہی تھیں اور خون میں ڈوبی محسوس ہوتی تھیں۔ جبڑے کانوں تک کھلے ہوئے تھے۔ اس نے غرانا شروع کیا اور ایسی پوزیشن بنالی جیسے مجھ پر چھلانگ لگانا چاہتا ہو۔ میرے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو گئے۔ خوف کے مارے میری گھگھی بندھ گئی۔ اصولاً مجھے پلٹ کر بھاگنا چاہئے تھا۔ مگر بھاگنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ کتا خوفناک آواز میں غراتا رہا۔ پھر وہ وحشت ناک انداز میں چیخا اور اس نے اگلے دونوں پنجے دبا کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میری آنکھیں خودبخود بند ہو گئیں۔ میں مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک لمحے میں وہ مجھے دبوچ لے گا۔ میری گردن اپنے انتہائی حد تک کھلے جبڑوں میں دبا لے گا اور اس کے بعد شاید میں دوسری سانس بھی نہ لے سکوں گا۔ مجھے اس کے بدن کی ہوا اپنے سر سے گزرتی محسوس ہوئی۔ وہ شاید میرے اوپر سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ چھلانگ کی غلطی ہو گئی تھی اس سے۔ مگر اس کے گرنے کی آواز نہیں سنی تھی میں نے۔ البتہ میرا پلٹنا فطری تھا۔ بس اسے بچاؤ کی ایک کوشش کہا جا سکتا تھا' لیکن پیچھے کچھ نہیں تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دور دور تک نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی متحرک شے نظر نہ آئی۔ دور دور تک وہی خاموشی' وہی سناٹا طاری تھا۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کتا نہیں بلکہ...... بلکہ میرا راستہ روکا جا رہا تھا۔ آہ...... میرا راستہ روکا جا رہا تھا۔ اس احساس نے مجھے ہمت بخشی۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میرا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا۔ بلکہ اس کوشش نے میری ہمت بندھا دی تھی۔ میرے دانت بھنچ گئے۔ دماغ میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک پھٹ پھٹ کی آواز سنائی دی۔

ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے سے کچھ گدھ نکل آئے تھے۔ ان کی لمبی گردنیں ہل رہی تھیں اور انہوں نے اپنے پَر چادر کی طرح پھیلائے ہوئے تھے۔ آسمان پر کھلے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ بھیانک لگ رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی اور وہ اس طرح قطار میں پھیل گئے تھے کہ دور تک کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے میری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے کسی پر گھیرا ڈال رہے ہوں...... میرے حلق سے ایک وحشیانہ دھاڑ نکلی اور میں خود ان کی طرف دوڑ پڑا۔ خوف اور جوش میں ڈوبی اپنی آواز خود مجھے بہت بھیانک لگی تھی اور اچانک وہ گدھ آگے بڑھنے سے رک گئے۔ پھر ان میں ابتری پھیل گئی اور وہ اپنے پیروں پر اچھلنے لگے۔ اسی طرح اچھلتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ جونہی میں ایک گدھ کے قریب پہنچا تو اس نے بھیانک چیخ ماری' پَر دبائے اور فضا میں پرواز کر گیا۔ یہ دوسروں کے لئے پروانہ تھا' کیونکہ اس کے اُڑتے ہی دوسرے گدھوں نے بھی زمین چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نیچے نہیں جھکے اور بلند ہو کر مختلف سمتوں کو پرواز کر گئے۔ خوف میرے رو ئیں رو ئیں میں سما گیا تھا' لیکن خوف کے ساتھ جوش بھی تھا۔ بدن اینٹھ رہا تھا' مگر قدم دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ اب شاید میں مزار کے قریب پہنچ رہا تھا' کیونکہ جھاڑیوں کے ایک اونچے سلسلے کے دوسری طرف سے روشنی چھن رہی تھی۔ ادھر سے کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انسانی آوازیں تھیں۔ وہ کچھ گا رہے تھے۔ نہ جانے کیا؟ آوازیں مبہم تھیں۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا جھاڑیوں کے دوسری طرف نکل آیا۔ روشنیاں مشعلوں کی تھیں' جو چند لوگوں نے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک حلقہ سا بنا رکھا تھا اور ان کے درمیان چند ملنگ رقص کر رہے تھے۔ وہ کچھ گاتے بھی جا رہے تھے' جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کے جسموں پر مٹیالے رنگ کی کفنیاں تھیں جو لہرے

لے رہی تھیں۔ وہ کسی قدر گہرائی میں تھے اور میں بلند جگہ۔ جہاں سے میں انہیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ مزار ابھی دور تھا اور یہ لوگ میرے درمیان میں تھے۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ مگر قریب سے دیکھنے پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ان میں سے کسی کی گردن اس کے شانوں پر موجود نہیں تھی۔ ان کے جسم رقصاں تھے۔ آوازیں بھی آرہی تھیں' مگر سب کے شانے گردنوں سے خالی تھے...... اس بھیانک منظر کو دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں' مگر قدم نہ روکے۔ اب مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ خوف اب دل میں ختم ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے چلنے سے جگہ جگہ ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ میں لڑکھڑا رہا تھا' مگر رک نہیں رہا تھا۔ ملنگوں کی آوازیں مجھے اپنے آگے آگے چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ سب مجھے اپنے ساتھ آگے بڑھتے نظر آئے۔ انہوں نے مشعلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ بے سر والے ناچ رہے تھے اور میرے آگے جلوس کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے رفتار تیز کی تو وہ بھی تیز چلنے لگے۔ آہ...... نہ جانے کون سی قوت مجھے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ اس منظر کو دیکھ کر دل کی دھڑکن بند ہو جانی چاہئے تھی۔ نہ جانے کتنی دور تک چلتا رہا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ بدن کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں اور اب نہ جانے کون چل رہا تھا؟...... وہ میں نہ تھا۔ آوازیں بند ہو گئیں۔ اب قوالی کی آوازیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ قوال گا رہے تھے۔

''من کی پیاس بجھانے آیا داتا ایک سوالی۔''

آنکھیں کھل گئیں۔ بے شمار خلقت تھی۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ خوب چہل پہل تھی۔ لوگ ہنس بول رہے تھے۔ سر کٹے ملنگوں کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ میں بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگا۔ انسانوں کے ہجوم کے درمیان تھا' جہاں تک پہنچا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر بہت سے لوگ دری بچھائے بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ عرس میں شرکت کرنے والوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ لنگر بانٹ رہے تھے۔ وہ میرے قریب آکر رک گئے۔

''کھانا لو گے؟''

''ہاں۔ ہاں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''برتن ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کھانا کیسے لو گے؟''

''رکابی دے دو ایک۔'' کسی ہمدرد نے کہا اور انہوں نے سلور کی ایک رکابی میں مجھے چاول دے دیئے۔ بھوک تو سانسوں کا حصہ بن چکی تھی۔ یہ تھوڑے سے چاول کیا حیثیت رکھتے تھے۔ میں انہیں کھانے لگا۔ دری پر بیٹھے ہوئے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں چاول کھا چکا تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''پانی چاہئے؟''

''دے دو بھائی!'' میں نے عاجزی سے کہا اور ایک نوجوان پانی لے آیا۔ اس نے جھک کر مجھے پانی دیا اور پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔

''تم کوڑھی ہو؟'' اس نے بے اختیار کہا۔

''ایں......'' میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر انہیں میرے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے ان سب کے منہ سے کوڑھی' کوڑھی کے الفاظ سنے تھے۔ پھر سب کھڑے ہو گئے۔ دری وہاں سے اٹھالی گئی اور وہ کسی اور سمت چلے گئے۔ مجھے دلی رنج ہوا تھا۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ اچانک چھ سات آدمی میرے پاس پہنچ گئے۔

''تم یہاں کیوں آبیٹھے؟...... کیا کوڑھ پھیلانا چاہتے ہو؟''

''نہیں بھائی!...... میں......''

''اُٹھو یہاں سے...... اُٹھو۔'' ایک آدمی گرج کر بولا۔

''چلو بھاگو یہاں سے۔'' دوسرے نے کہا۔ میں بادل نخواستہ اٹھ گیا تھا۔ رکابی اور پانی کا گلاس میں نے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ اسی شخص نے پھر چیخ کر کہا۔

''برتن اٹھاؤ اپنے۔ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے...... لاحول ولاقوۃ...... ابے چلا جا...... لگاؤں ایک ڈنڈا؟'' اس جوشیلے شخص نے کہا اور ایک موٹی سی لکڑی سے مجھے دھکیلنے لگا۔

''جا رہا ہوں بھائی!...... جا رہا ہوں۔'' میں نے صبر کرتے ہوئے کہا اور دونوں برتن اٹھا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ دل رو رہا تھا۔ کیا ناقدری ہے...... کیا عزت افزائی ہے...... واہ!...... مگر صبر ضروری تھا۔ اس جگہ سے دور نکل آیا۔ یہ مزار کا عقبی حصہ تھا۔ پتھر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ زمین ناہموار تھی۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ ہاں' بلندی سے روشنی ضرور آ رہی تھی۔ ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ خود پر غور کرنے لگا۔ عجیب سا دل ہو رہا تھا۔ کیا بقیہ زندگی یہی ہوگی؟...... کیا اب کبھی میری دنیا مجھے واپس نہیں ملے گی؟...... بہت دیر گزر گئی۔ پھر گھنگروؤں کی آواز سنائی دی۔ کسی کے قدموں کی چاپ تھی۔ گردن اٹھا کر دیکھا تو ایک ملنگ تھا۔ مگر اس کا سر اس کے شانوں پر موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا دبا ہوا تھا۔ جس پر رنگین کپڑے اور گھنگرو لگے ہوئے تھے۔ ڈنڈا ٹیکتے ہوئے گھنگرو بج رہے تھے۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یہاں نہ بیٹھو بھائی!'' میں نے کہا۔

''کیوں؟...... تیری جاگیر ہے کیا؟'' وہ بولا۔

''نہیں...... میں کوڑھی ہوں۔''

''میرا کیا ہوگا۔''

''اُدھر بیٹھا تھا...... ان سب نے مجھے دھکے دے کر بھگا دیا۔''

''وہ سب کوڑھی ہیں...... سنا تو نے...... وہ سب کوڑھی ہیں...... ان کے دلوں میں کوڑھ ہے۔ یہ دیکھ! یہ کیا ہے؟'' اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے۔ جن کی مٹھیاں بند تھیں۔ ''بتا' کیا ہے ان میں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''ہاتھ پھیلا۔'' اس نے کہا۔ میں نے ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔ ''کون سی مٹھی کا مال لے گا؟''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔''

''چاہئے...... جھوٹ مت بول...... بتا' کون سی مٹھی کھولوں؟'' ملنگ نے کہا۔

''یہ......'' میں نے ہتھیلی اس کے ایک ہاتھ کے سامنے کر دی اور اس نے مٹھی میں دبی چیز میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ ہلکی سی کالی سی کوئی چیز تھی جو میرے ہاتھ پر کلبلانے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ہے؟ ہاتھ چہرے کے قریب کر کے دیکھا اور حلق سے دھاڑ نکل گئی...... وہ سیاہ رنگ کا پہاڑی بچھو تھا۔ میں نے بے اختیار چیخ کر اسے ہتھیلی سے جھٹکنا چاہا' مگر وہ میری درمیانی انگلی میں اٹک گیا۔ میں نے پھر اسے جھٹکا اور اس نے میری انگلی میں کاٹ لیا۔ ایک ٹیس ہوئی اور میں نے ہاتھ پتھر پر دے مارا۔ بچھو میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے انگلی دبا لی' لیکن درد کی ٹیسیں میرے پورے ہاتھ میں پھیل گئیں۔ کالے پہاڑی بچھوؤں کے بارے میں' میں نے سنا تھا کہ پتھر پر ڈنک مار دیتے ہیں تو سنکھیا بن جاتا ہے۔ ہاتھی کو کاٹ لیں تو اس کا گوشت پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔ اسی کالے بچھو نے مجھے کاٹا تھا۔ درد تھا کہ خون کی روانی کے ساتھ شانے' سینے' کمر اور پھر پورے بدن میں پھیل گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں اس ناقابل برداشت تکلیف سے پاگل ہو گیا۔ اپنے حلق سے نکلنے والی چیخیں مجھے اجنبی لگ رہی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ میرا بدن زمین سے کئی کئی فٹ اونچا اچھل اچھل کر نیچے گر رہا تھا۔ سارے بدن میں درد کے انگارے دہک رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح اٹھا اور

اندھوں کی طرح دوڑ پڑا۔ نہ جانے کتنی دور دوڑا۔ نہ جانے کس چیز سے ٹکرایا اور سر میں چوٹ لگ گئی۔ مگر سر کی یہ چوٹ مہربان تھی۔ اس نے مجھے اذیت سے نجات دلا دی تھی۔ شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔

نہ جانے کب تک بے ہوش رہا...... ہوش آیا تو پرندے چہچہا رہے تھے۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ سر پر کسی درخت کا سایہ تھا اور بدن پانی میں بھیگا ہوا تھا۔ میں پانی میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑی پراسرار بڑی عجیب جگہ تھی۔ برگد کا عظیم الشان درخت مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر تھا' مگر اس کا پھیلاؤ کوئی پچاس گز کے دائرے میں تھا۔ اس کی ڈاڑھیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جس جگہ میں پڑا ہوا تھا یہاں گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کاہی لگے پتھر پھیلے ہوئے تھے اور ان پتھروں سے مدھم سے شرر شرر کے ساتھ پانی اُبل رہا تھا۔ یہ پانی گھاس کو بھگوتا ہوا نالیوں کی شکل میں بہتا دور نکل جاتا تھا۔ شاید ان پتھروں سے چشمہ اُبل رہا تھا۔ تاحد نگاہ کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ ہاں' پرندے بکثرت نظر آرہے تھے جو برگد کی شاخوں پر پھدک رہے تھے۔

اِدھر سے اُدھر پرواز کر رہے تھے۔ زمین پر بکھرے پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فضا میں خربوزوں کی تیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اجنبی نظروں سے ماحول کو دیکھتا رہا۔ گزرے واقعات یاد آنے لگے۔ ملنگ نے بدترین حرکت کی تھی۔ نہ جانے اس کی دوسری مٹھی میں کیا تھا؟ آہ...... اُس خطرناک بچھو کے کاٹنے کے بعد بھی میں زندہ ہوں۔ شدت تکلیف میں شاید مزار شریف سے دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا تھا۔ ورنہ وہ آس پاس ضرور نظر آجاتا۔ یہ تو آبادی سے دور کوئی ویران جگہ تھی۔ نہ جانے کون سی جگہ ہے...... اور میں اس سے کتنا دور نکل آیا ہوں...... ہاتھ میں اب تکلیف نہیں تھی۔ اس انگلی کو دیکھا جس میں بچھو نے کاٹا تھا۔ انگلی پر تو کوئی نشان نہیں تھا' لیکن کچھ اور نظر آیا اور جو نظر آیا اس نے ایک بار پھر دیوانہ کر دیا۔ کوڑھ میرے پورے بدن پر پھیل چکا تھا۔ ہاتھ پاؤں کی شکل بدلتی جارہی تھی۔ انگلیاں اور ہتھیلی خون اور پیپ سے بھری ہوئی تھیں...... مگر اس وقت ان زخموں پر کھرنڈ نظر آرہے تھے۔ کالے کالے کھرنڈ...... جیسے زخم اچانک سوکھ گئے ہوں...... میرے زخم ٹھیک ہو گئے تھے...... میرا کوڑھ سوکھ گیا تھا...... کسی کے الفاظ یاد آئے۔ زہر' زہر کا تریاق ہوتا ہے۔ کالے پہاڑی بچھو کے زہر نے مجھے کوڑھ سے نجات دلا دی تھی۔ دیوانوں کی طرح بدن کے ایک ایک حصے کو دیکھنے لگا۔ سب جگہ خاک ہی اُڑ رہی تھی۔ میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ دل عقیدت سے بھر گیا۔ میری لگن رنگ لائی تھی۔ چشمہ فیض سے مجھے صحت ملی تھی۔ آہ! میں ٹھیک ہو گیا تھا...... میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ آنسو بہے' ہچکیاں بندھ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے روٹھی ہوئی ماں نے اچانک مجھے کھینچ کر آغوش میں لے لیا ہو...... میری بے سکونی سکون پا گئی تھی۔ میں سجدہ ریز ہو گیا اور نہ جانے کب تک سجدے میں پڑا روتا رہا۔ دل کا غبار نکل گیا تھا۔ اُٹھا' کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کچھ فاصلے پر خربوزوں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ پیلے پھل بڑی تعداد میں لگے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ کر ایک پکا پھل توڑا اور اسے ہاتھ سے دبا کر بیج نکالے۔ پھر اس کا شیریں گودا کھانے لگا۔ پھل کا وزن کوئی ایک سیر ہو گا' مگر میں اسے پورا نہ کھا سکا۔ تب اس بھوک سے نجات کا اندازہ ہوا جس نے میری حیات کا ہر لمحہ عذاب ناک بنا دیا تھا۔ خوشیاں رگ رگ سے پھوٹ پڑی تھیں۔ اس ویرانے میں مجھے خوشیوں کا جو خزانہ حاصل ہوا تھا وہ سنبھالے نہ سنبھالا جارہا تھا...... میں فرط مسرت سے بے خود ہوا جارہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسرت کا اظہار کیسے کروں؟...... بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا' پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں کب تک رک سکتا تھا۔

انسان ہوں۔ حالات کچھ بھی ہیں' انسانوں میں ہی رہ سکتا ہوں۔ نہ جانے اب کیا ہو گا؟ بھوریا چرن مجھ سے غافل تو نہیں ہو گا۔ اسے علم ہو گیا ہو گا کہ میں اس کے دیئے ہوئے عذاب سے نجات حاصل کر چکا ہوں۔ آہ! اب تو اس منحوس کا تصور بھی مجھے خوف زدہ کر دیتا تھا۔ کیا یہ ویرانہ میرے لیے گوشہ عافیت ہے؟ کہیں یوں نہ ہو کہ یہاں سے نکلوں اور پھر کسی عذاب کا شکار ہو جاؤں' مگر یہاں بھی کیا کر سکتا ہوں؟ کب تک دنیا کو ترک کر کے یہاں پڑا رہوں گا۔ اللہ مالک ہے۔ اب جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔ یہاں سے چلا جائے۔ کسی بلند جگہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ دیکھوں تو سہی کہاں ہوں؟ آس پاس کچھ ہے یا نہیں؟ برگد کا وہ درخت ہی معاون ہوا اور اس پر چڑھنا مشکل نہ ثابت ہوا۔ کافی اونچا جا کر میں نے چاروں طرف نظریں

دوڑائیں۔ بہت دور کوئی شے متحرک محسوس ہوئی۔ غور سے دیکھا تو ایک بیل گاڑی نظر آئی جو ایک پگڈنڈی پر جا رہی تھی، لیکن یہ پگڈنڈی اسی سمت سے گزرتی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے میں اس تک پہنچ سکتا تھا۔ درخت سے اتر کر اس طرف چل پڑا اور کچھ دیر کے بعد پگڈنڈی پر جا کھڑا ہوا۔ بیل گاڑی دور سے آتی نظر آ رہی تھی۔ ایک سیدھا سادا سا آدمی اسے ہانک رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بیلوں کی رفتار سست کر دی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ قریب آ کر وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا دیئے۔

''جے رام جی کی مہاراج!......''

''کہاں جا رہے ہو بھائی......؟'' میں نے پوچھا۔

''نگر جا رہے ہیں مائی باپ!''

''مجھے بھی لے چلو گے ساتھ......؟''

''کاہے نا بیرا...... آؤ بیٹھ جاؤ'' میں اُچک کر بیل گاڑی میں بیٹھ گیا اور اس نے بیل ہنکائے۔ رفتار پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ بیل گاڑی ہانکنے والا کچھ خوف زدہ لگ رہا تھا۔ مجھے کچھ دیر کے بعد ہی احساس ہو گیا۔ نہ جانے کیا سمجھ رہا ہے بے چارہ! سچ بھی تھا ویرانے میں کوئی ملے تو ڈر لگتا ہی ہے۔

''کیا نام ہے تمہارا بھیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سندر لعل!''

''نگر میں رہتے ہو؟''

''نہ بھیا! نمبردار کی چاکری کریں ہیں۔ کچھا گڑھی گئے تھے نمبردار کی جورو کو چھوڑنے، وہاں اس کا میکہ ہے۔''

''نگر کتنی دور ہے یہاں سے؟''

''سات کوس۔''

''کتنی بڑی آبادی ہے؟''

''بہت لوگ ہیں بھیا! وہاں پہلے کبھی نا گئے کیا؟''

''نہیں۔''

''ایک بات پوچھیں بھائی! برا تو نا مانو گے۔''

''نہیں ضرور پوچھو۔''

''یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟''

''بس نگر تلاش کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں......؟''

''جی بھیا! ہم سمجھے ڈکیت لگ گئے۔ آدھا خون خشک ہو گیا ہمارا تو۔''

''نہیں سندر لعل! میں ڈاکو نہیں ہوں۔''

''معاف کر دینا بھیا! کیا نام ہے تمہارا؟''

''مسعود ہے میرا نام......'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میاں جی ہو...... نگر میں کوئی جان پہچان ہے کیا؟''

''کوئی نہیں۔''

''نگر رہو گے یا آگے جاؤ گے؟''

''آگے کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سیکری اور اس سے آگے آگرہ!'' سندر لعل نے جواب دیا اور میرا سر چکرا کر رہ گیا۔ میں اتنے فاصلے پر کیسے نکل آیا؟ میں تو کہیں اور تھا' یہاں سے نہ جانے کتنے فاصلے پر! مگر یہاں سیدھا کام ہی کونسا ہو رہا تھا۔ سندر لعل کو جب میری طرف سے یہ اطمینان ہو گیا کہ میں ڈاکو نہیں ہوں اور اسے مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے تو اس کے منہ سے باتوں کا سیلاب امڈ پڑا۔ نہ جانے کہاں کہاں کی کہانیاں سنا ڈالیں اس نے مجھے' یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ فاصلہ طے ہو گیا' نگر نظر آنے لگا تھا۔ اس کا اصل نام فتح پور تھا' مگر یہاں کے رہنے والے اسے نگر کہتے تھے۔ ہندو' مسلمانوں کی ملی جلی قدیم آبادی تھی اور دور اکبری سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ کچے پکے مکانات دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ پہلی شخصیت ایک مرد کی نظر آئی جس کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے۔ عمر ستر سال سے کسی طرح کم نہیں ہوگی' لیکن بدن سیدھا اور مضبوط' کمر پر چمڑے سے بنی ہوئی پانی سے بھری مشک لدی ہوئی تھی' مگر وہ بزرگ شخص بالکل سیدھا کھڑا تھا' جیسے اس کے لیے مشک کا کوئی وزن نہ ہو۔

''ارے! وسندر! آ گیا کھیا گڑھی سے۔'' کڑک دار آواز سنائی دی۔

''ہاں امام الدین چاچا! ابھی تو آئے ہیں۔''

''میری چیز لایا......؟''

''کاہے نا چاچا! بھول کر کھو پڑیا سسر تڑوانی تھی کیا۔ یہ کیا ہے؟'' سندر لعل نے گاڑی سے ایک پُوا نکالا جس سے حقے کے تمباکو کی بُو اُٹھ رہی تھی۔

''جیا رہ' پیسے لے لی جیو گھر سے۔ یہ کون ہے؟''

''مسافر......راستے میں مل گیا تھا۔ نگر میں کوئی پہچان نہیں ہے بے چارے کی۔''

''نہیں......تو کیا ہوا بھیا! ہم مر گئے کیا......ارے ہم جو ہیں پہچان والے۔ نام کیا ہے تمہارا بھیا؟''

''مسعود احمد......!'' میں نے کہا اور امام دین چونک پڑے۔ پھر انہوں نے سندر لعل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''ارے تو کہاں لے جا رہا ہے انہیں' ہمارے مہمان ہیں' مسلمان ہیں۔''

''لو فرق کر دیا نا چاچا ہندو' مسلمان کا' ارے ہندو ہو یا مسلمان' لائے ہم ہیں' مہمان تمہارے کیسے ہو گئے؟'' سندر لعل جھگڑنے لگا۔

''اتار......اتار یا چل ایسا کر ہمارے گھر پہ چھوڑ دے' ابھی یہ مشک ڈال کے آرہے ہیں۔ بھیا سنو! اس کی بات مت ماننا۔ ارے تم اب اس بنئے کے ہاتھ کا کھاؤ گے کیا؟ جاؤ یہ تمہیں ہمارے گھر پہنچا دے گا۔ ابھی آئے دومنٹ میں' یہ پانی کی مشک ڈال کے' جا رے سندر لعل جو کہہ رہے ہیں' وہی کریو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

سندر لعل نے ہنس کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے گھر کے سامنے بیل گاڑی روک دی۔ اور پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اندر چلے جاؤ بھیا جی! دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہاں بس امام دین ہی رہتے ہیں۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ ہندو' مسلمان کا کوئی فرق نا ہووے ہے' بس ہمارے نگر میں' کوئی مہمان آ جائے' جسے موقع ملے ہے' لے اڑے ہے۔ ہم بھی آئیں گے تمہارے پاس اور سنو یہ مت سمجھنا کہ تم امام دین ہی کے مہمان ہو۔ ہمارا بھی اتنا ہی حق بنے ہے۔ جو بھی خدمت ہو سکے گی' ہم کریں گے۔ ٹھیک ہی تو کہتے تھے چاچا امام دین' نگر میں بھلا تمہاری جان پہچان والا کوئی کیسے نہیں ہے۔ سارے کے سارے ہیں۔ دیکھنا تم جسے پتا چلے گا' دوڑا چلا آئے گا تمہارے پاس......''

''سندر لعل یہاں اس گھر میں امام دین چاچا کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔''

''نہیں بھیا اکیلے ہیں۔ شادی ہی نہ کری' بال بچے کہاں سے ہوتے۔ جاؤ اندر جا کر آرام کرو۔''

میں بیل گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس چھوٹے سے کٹیا نما مکان میں داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا احاطہ تھا۔ بس احاطہ ہی تھا۔ گھاس پھوس کی دیواریں' اندر ایک کچی مٹی سے بنا ہوا کمرہ' جس پر چھپر پڑا ہوا' کمرے کے سامنے بھی چھپر ڈال کر دالان بنا

لیا گیا تھا۔ دالان میں دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف ایک حقہ رکھا ہوا تھا۔ میں چار پائی پر بیٹھ گیا اور سندر لعل اندر آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''بس امام دین چاچا آتے ہی ہوں گے' سو ہم چلے جائیں گے۔ نمبردار کو بتا دینا ہے کہ مالکن میکے پہنچ گئیں۔''

''تمہاری یہ نگری بڑی عجیب ہے سندر لعل۔''

◆✣◆✣◆

''ارے کیا عجیب ہے بھیا! بس بھگوان کا دیا کھا رہے ہیں۔ اچھی گزر ہو جاوے ہے۔''

ابھی دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ امام دین چچا خالی مشک کندھے پر ڈالے ہوئے اندر آ گئے اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ہیں' ب تمی نا بات' جارے سندر تو اپنا کام کر۔ ہم گوشت پکائیں گے' بھاگے گا خوشبو سونگھ کر......''

''رام...... رام...... رام' چلے ہیں بھیا! یہاں تو خون خرابہ ہووے ہے!'' سندر لعل نے کہا اور ناک پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گیا۔ امام دین ہنسنے لگے تھے' پھر وہ بولے۔

''بھیا! سقے ہیں ذات کے' گھروں میں پانی بھرے ہیں اور اللہ روزی دے رہے ہے جو کچھ بھی ہے حاضر ہے تمہارے لئے۔ گوشت رکھا ہے ابھی پکا لیتے ہیں۔ کھانا پکا لیں پہلے' بعد میں باتیں کریں گے۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں امام دین چچا......''

''ارے کیسی باتیں کرو ہو۔ بیٹھو آرام سے منہ ہاتھ دھولو۔ وہ گھڑے میں پانی رکھا ہوا ہے اور وہ لوٹا رکھا ہے۔ جاؤ جاؤ مہمان ہو' بھلا ہم تم سے کام کرائیں گے......''

بڑا مخلص اور سچا انسان نظر آتا تھا۔ مشک ایک طرف رکھی۔ تمباکو کا پڑا جو سندر لعل ساتھ لایا تھا دیوار میں بنے ہوئے ایک طاق میں رکھا اور اس کے بعد سامنے ہی بنے ہوئے چولہے کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں تھوڑا سا سامان رکھا ہوا تھا۔ سلور کی ایک دیگچی میں اس نے ضروری کارروائیوں کے بعد مصالحے وغیرہ ڈالے اور پھر میرے پاس آ بیٹھا۔

''اکیلے ہیں۔ ماں' باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ نگر ہی میں پلے بڑھے۔ خاندانی سقے ہیں' وہی کام کر رہے ہیں۔ تم سناؤ بھیا! کہاں سے آ رہے ہو؟''

''بس امام دین چچا! لاوارث ہوں میں بھی...... نہ جانے کہاں کہاں سے بھٹکتا ہوا جنگل میں جا رہا تھا کہ بے چارہ سندر لعل اپنی بیل گاڑی پر مل گیا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ نگر کتنے فاصلے پر ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے اچھا ہوا۔ جب تک مرضی آئے' ہمارے ساتھ رہو۔ نگر بڑی اچھی جگہ ہے بھیا! وہ دیکھو تھوڑے فاصلے پر جو بلندیاں تمہیں نظر آ رہی ہیں نا' وہاں سلیم بابا کی مسجد ہے اور وہ ادھر جو لال رنگ کی پکی عمارتیں نظر آ رہی ہیں وہ رانی جودھا بائی کا محل ہے۔ اکبر بادشاہ کی بہت سی کہانیاں نگر میں پھیلی ہوئی ہیں اور سارے کے سارے تمہیں اسی کی کہانیاں سنائیں گے۔''

میں نے ان بلندیوں کی جانب دیکھا۔ مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ بڑا سا گنبد! سلیم الدین چشتی کا مزار بھی اسی مسجد میں ہے اور ان بزرگ کے نام سے بھلا کون واقف نہیں...... ایک بار پھر دل کو ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ امام دین سقے کے خلوص کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ویسے بڑی متاثر کن شخصیت تھی اور میں یہاں آ کر ایک عجیب سی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ انوکھا پن محسوس ہو رہا تھا مجھے اس گھر میں...... میں نے منہ' ہاتھ دھویا اور امام دین چچا نے جلدی سے ایک میلا سا تکیہ لا کر چار پائی کے سرہانے رکھ دیا اور بولے۔

''لیٹ جاؤ بھیا! حقہ پیو ہو...... بھر لیں؟''

''نہیں امام دین چچا! میں نہیں پیتا۔''

''ہم پئیں گے اور ساتھ ساتھ باتیں کریں گے۔'' وہ حقہ لے کر آگے بڑھ گئے۔ حقے کو غسل دیا' چلم بھری' اسے سقے

پر جمایا اور پھر ہاتھ میں اٹھائے میرے سامنے آبیٹھے۔ سادہ سادہ معصوم معصوم باتیں' پھر اچانک امام دین نے میرے چہرے اور بدن کے نشان دیکھے اور بولے۔ ''یہ کیا ہو گیا ہے بھیا۔''

''بس چچا! بیماری ہو گئی ہے۔ یہ نشان پڑ گئے ہیں۔''

''مولا شفا دے گا۔ ہم پانی پڑھ کر دیں گے۔ مولا کے کرم سے ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' انہوں نے خلوص سے کہا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ دو عورتیں ایک حلق پڑھاتے بچے کو لے کر آئیں۔ بچہ رو رو کر ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ دونوں عورتیں بے حد پریشان تھیں۔ ان میں ایک عمر رسیدہ تھی' دوسری نوجوان۔

''ارے ارے اسے کیا ہو گیا عیدن بہن۔''

''دیکھو تو امام بھیا! رو رو کر مرا جا رہا ہے۔ صبح سے دودھ کا ایک قطرہ نہیں پیا۔'' معمر عورت نے کہا۔

''دیکھیں ہیں' دیکھیں.....'' امام دین نے کہا۔ گھڑے کے پاس جا کر پانی نکالا' کلی کی اور بچے کے پاس جا بیٹھے۔ کچھ پڑھا اور تین بار بچے پر پھونک دیا۔ بچہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ میں ششدر رہ گیا تھا۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ امام دین سقہ کچھ ہے بلکہ بہت کچھ ہے۔ عجیب کردار تھا' انتہائی متاثر کن۔

امام دین نے کہا۔ ''جارے' کیوں ماں اور دادی کو پریشان کر رہا ہے۔ لے جاؤ عیدن بہن! سسرے کو نظر لگ گئی تھی۔ اب دودھ بھی پیئے گا۔'' دونوں عورتیں چلی گئیں اور امام دین چچا پھر میرے پاس آبیٹھے۔ ''نظر پتھر کو بھی کھا جائے ہے بھیا۔''

''آپ یہ علاج بھی کرتے ہیں چچا.....؟''

''ارے نہیں..... بھیا کی باتیں۔ ہم علاج کریں گے کسی کا' پڑھے نہ لکھے بس بسم اللہ پڑھ دے ہیں اور مولا عزت بنا دے ہے۔ پھر بھیا! بسم اللہ سے بڑا اور کیا ہووے ہے' بولو کچھ ہے۔ ہنڈیا جل رہی ہے شاید۔'' وہ جلدی سے اٹھ گئے۔

کچے پکے گوشت کی لذت ناقابل بیان تھی۔ طبیعت سیر ہو گئی تھی۔ کھا پی کر سو گیا۔ امام دین یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ دو چار گھروں میں مشک ڈال آئیں۔ کب واپس آئے' پتا نہ چلا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ جب آنکھ کھلی' امام دین چچا کچھ پکا رہے تھے۔ دالان میں لالٹین لٹک رہی تھی اور اس کی پیلی روشنی پھیل رہی تھی۔ اس وقت باہر سے آواز سنائی دی۔ ''چاچا جی..... امام دین چاچا!''

''آ جا رے گردھاری' آ جا بھیا کیا بات ہے۔'' دروازے سے دبلے پتلے بدن کا ایک آدمی دھوتی' کرتا پہنے اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی گڑوی تھی۔

''سندر لعل نے بتایا چاچا کے گھر مہمان آیا ہے۔ دودھ لائے ہیں اپنی گیا کا مہمان کیلئے' لو بابو پی لو..... خالص دودھ ہے' مکھن بھرا۔''

''جیتا رہ گردھاری۔ لے لو مسعود بھیا! بڑا اچھا آدمی ہے گردھاری۔'' میں نے پیتل کی گڑوی لے لی۔ گاڑھے دودھ سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ گردھاری چلا گیا۔ امام دین بولے......

''لاؤ دم کر دیں۔ سفید چیز ہے' کھلے آسمان تلے آئی ہے۔ دم کر دیں تو پی لو۔'' میں نے گڑوی آگے بڑھا دی اور امام دین نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا' پھر گڑوی مجھے دے کر بولے۔ ''لو پی جاؤ۔''

''نہیں چچا' دودھ بہت کافی ہے' اتنا نہیں پی سکوں گا۔''

''ارے جوان آدمی ہو بھیا' پی جاؤ..... چلو نا تو اس کٹورے میں پلٹ لو' باقی رکھ دو چائے بنا لیں گے!'' میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ کٹورہ لے کر دودھ الٹا مگر اچانک میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دونوں برتن میرے ہاتھ سے لرز گئے..... ''یہ کیا..... یہ.....'' کھلے کٹورے میں دودھ کے ساتھ پورا برابر لمبے لمبے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ گڑوی میں بھی یہی حال تھا' کیڑوں کی تعداد ایک دو نہیں تھی بلکہ وہ بیشمار تھے۔

''چاچا۔'' میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''کیا ہے۔'' امام دین نے اطمینان سے پوچھا۔

''یہ دیکھو' ذرا یہ دیکھو۔'' میں نے کہا اور کٹورہ آگے بڑھا دیا۔ امام دین چچا نے کٹورہ میرے ہاتھ سے لے کر دیکھا' پھر لالٹین اتار کر اس کی روشنی میں اسے غور سے دیکھا اس کے بعد گڑوی بھی میرے ہاتھ سے لے لی۔ ان کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے' پھر وہ آہستہ سے بولے۔

''سفلی۔''

''یہ کیا ہے چچا۔''

''ہے تو دودھ' مگر اس پر گندا عمل کیا گیا ہے۔ بہت دن ہو گئے ہم ہاتھرس گئے تھے وہاں ایک بنیا نا تھو رام رہتا تھا مالک نے بہت دیا تھا' مگر اولاد نہیں جیتی تھی۔ بچے ہوتے تھے پر جونہی انہوں نے ماں کا دودھ پینا شروع کیا ان کے ناک اور منہ سے ایسے ہی کیڑے نکلنا شروع ہو جاتے پھر وہ سوکھ سوکھ کر مر جاتے۔

کسی سیانے نے دیکھا علاج کیا' پتا چلا کسی دشمن نے ماں کے دودھ پر سفلی کرایا ہوا تھا۔ ہم نے وہ کیڑے دیکھے تھے۔ ایسے ہی ہوتے تھے پر اس سسرے گردھاری کو کیا سوجھی۔'' امام دین سوچ میں ڈوب گئے' پھر جوش میں آ کر بولے۔ ''ارے اس کی تو ایسی تیسی۔ آئیو ذرا۔''

''نہیں امام دین چچا' رہنے دیں۔''

''ارے تم آؤ میرے ساتھ' اسے ہمارے مہمان سے کیا دشمنی ہو گئی۔'' امام دین چچا گرج کر بولے' گڑوی میرے ہاتھ سے لی اور باہر نکلے' میں انہیں آوازیں دیتا رہ گیا۔ پھر خود بھی ان کے پیچھے نکل آیا۔ وہ غصے میں بھرے تیز تیز جا رہے تھے۔ راستے میں بھی میں نے ان کی خوشامد کی مگر وہ غصے میں ڈوبے ہوئے تھے نہ رکے اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ انہوں نے دروازے کی زنجیر زور سے بجائی تھی۔ دروازہ ایک عورت نے کھولا' امام دین کو دیکھ کر جلدی سے اوڑھنی سر پر رکھی پھر ادب سے بولی۔

''سلام چاچا۔''

''جیتی رہ جانکی' تیرا گھر والا کہاں ہے ذرا بھیج اسے۔'' امام دین نے کہا۔

''بدری کے کاکا تو کل سے آگرے گئے ہیں' تاریخ تھی نا ان کی' کل آویں کو کہہ گئے ہیں۔'' عورت نے بتایا۔

''ہیں گردھاری آگرے گیا ہے؟'' امام دین حیرانی سے بولے' میری طرف دیکھا پھر پریشانی سے بولے۔ ''گیا کس نے دو ہی تھی۔''

''میں نے چاچا۔'' عورت حیرانی سے بولی۔

''کسی کو دودھ بھیجا تھا۔''

''کسی کو نہیں......''

''چاچا۔ پر ہوا کیا؟''

''یہ یہ گڑوی تیری ہے۔'' امام دین نے گڑوی سامنے کر کے کہا۔

''نہیں چاچا ہماری نہیں ہے' پر ہوا کیا۔''

''ایں کچھ نہیں۔ کسی نے دودھ بھیجا تھا میرے ہاں۔ میں سمجھا گردھاری...... ارے ہاں گردھاری کے مقدمے کی تاریخ تھی کل مجھ سے مل کر تو گیا تھا' اچھا جانکی آرام کر۔ آؤ مسعود میاں۔'' وہ پلٹ پڑے' گڑوی کے ساتھ کٹورہ بھی راستے میں پھینک دیا' پھر بولے۔

''گردھاری ہی تھا میں نے خود دیکھا تھا' پر یہ بھی سچ ہے کہ اس کے مقدمے کی تاریخ تھی پھر کون تھا جو گردھاری کے

بھیس میں آیا تھا اور اور یہ سب کچھ کیا۔"
ہم گھر واپس آ گئے۔ امام دین سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے پھر وہ مجھے دیکھ کر بولے کوئی دشمن ہے تمہارا' کسی سے دولت جائیداد کا جھگڑا ہے یہ دودھ تمہارے لئے آیا تھا' کوئی ایسی بات ہے مسعود میاں۔
"نہیں چچا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
"پھر کیا بات ہے کچھ ہے ضرور۔" وہ پرخیال انداز میں بولے۔ میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی تھی۔ ایک اور معصوم شخص کو موت کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے بھی جسے اپنی کہانی سنائی تھی وہ عذاب کا شکار ہو گیا تھا۔ بے چارے نیاز اللہ کیلئے ہی دل رو رہا تھا۔ ان کا حال تو پتا بھی نہیں چل سکا تھا جبکہ راما نندی کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ امام دین البتہ بہت پریشان رہے اور طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ رات کا کھانا ٹھیک سے نہ کھایا گیا۔
میں تو اپنی سوچوں میں گم تھا' مگر امام دین میری وجہ سے پریشان تھے۔ رات کو میں سونے کی کوشش کرنے لگا' جنگل شاید زیادہ دور نہیں تھا' گیدڑوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بارہ بجے کے بعد اچانک بلیاں بھی رونے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی بلیاں گھس آئی ہوں صحن میں' چھت پر ان کی دھما چوکڑیاں گونجنے لگیں۔
"ارے تمہاری۔ کہاں سے آ ری اتنی ساری۔" امام دین لکڑی لے کر پورے صحن میں ہش ہش کرتے پھرے۔ میں خاموش لیٹا رہا تھا' دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے تھے۔ بلیوں نے ساری رات رت جگا گیا' پھر اذان کی آواز ابھری اور بے اختیار سلیم بیگ یاد آ گئے۔ وہاں ہسپتال میں نماز پڑھی تھی اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا تھا اٹھ گیا۔ امام دین وضو کر رہے تھے' مجھے دیکھ کر بولے۔
"نماز پڑھو گے؟"
"جی۔"
"جزاک اللہ۔ تو وضو کر لو۔" ہم دونوں نے نماز پڑھی اور امام دین چائے بنانے چلے گئے پھر اچانک میں نے ان کی آواز سنی۔ وہ صحن میں جھک جھک کر جگہ جگہ دیکھ رہے تھے۔
"کیا ہے چچا۔" میں نے پوچھا۔
ارے دیکھو تو۔ یہ سسری آنگن میں کیا مہا بھارت ہوئی ہے۔ ساری رات بلیاں روتی رہی ہیں' کئی بار بھگایا مگر سسریوں نے آنگن کو پانی پت بنا رکھا تھا' سارے میں خون بکھرا ہوا ہے۔" میں نے بھی صحن میں سرخ خون بکھرا ہوا دیکھا' مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ "برتن بھی خراب ہو گئے ہوں گے۔ دوبارہ دھونے پڑیں گے۔"
"میں دھوتا ہوں چچا۔"
"ارے نا بھیا۔ چار برتن ہی تو دھونے ہیں' مگر۔ کچھ ہے بھیا' ضرور کچھ ہے۔ لاؤ چائے تو بنائیں۔" نہ جانے کیا کیا جتن کر کے امام دین چچا نے چائے بنائی' ایک پیالہ مجھے دیا اور دوسرا خود لے کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔
"سفلی کیا ہوتا ہے چچا۔" میں نے پوچھا۔
"بھیا ہم ٹھہرے گنوار۔ بس نماز روزہ کر لیں ہیں' دعا درود پھونک دیں ہیں' مگر یہ سسر ہووے بکٹ ہے۔ یوں سمجھ لو مالک نے شیطان کو بھی طاقت تو دی ہے کہ جا سسرے بہکا میرے بندوں کو۔ اللہ والوں کے آگے اس سسرے کی نا چلے ہے' مگر سارے ہی تو پہنچے ہوئے نا ہووے ہیں۔ یہ سارے کام شیطان کے ہیں بھیا اور یہ کولہی چمار ایسے کام زیادہ کرتے ہیں' ان کا کون سا دین دھرم ہوئے ہے۔"
اس معصوم انسان کا علم درحقیقت اس سے زیادہ نہیں تھا۔ بہت زیادہ باتیں اس کیلئے نقصان کا باعث بن سکتی تھیں۔ بھوریا چرن پھر پاگل ہو رہا تھا اور یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا' چنانچہ میں خاموش ہو گیا۔
سورج نکل آیا۔ امام دین چچا نے مشک سنبھالی اور بولے۔ "چودہ گھروں میں پانی ڈالنا ہے۔ چلیں گے تم آرام کرو

واپس آ کر یہ خون صاف کریں گے اور پھر کچھ سوچیں گے' گھبراتا نہیں کہو تو سندر لعل کو بھیج دیں۔''

''نہیں چچا آپ جائیں۔'' میں نے کہا اور وہ چلے گئے۔ میں سوچ میں ڈوبا رہا' اب کیا کروں' یہاں زیادہ رکنا مناسب نہیں ہے۔ آج یہ ہوا ہے کہ کل کچھ اور ہوگا۔ یہ نیک انسان بھی میری وجہ سے اپنی نیکیوں کا شکار ہوجائے گا۔ نہیں اپنی مصیبت مجھے خود بھگتنا ہوگی۔ بہت سے لوگ میری وجہ سے موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ آہ۔ کیا تقدیر پائی ہے' کیا خودکشی کرلوں' میری موت سے نہ جانے کس کس کو فائدہ پہنچے گا۔ تقدیر میں ماں باپ کا دیدار نہیں ہے جو کھویا اپنے ہاتھوں سے کھویا۔ اپنے کئے کا کیا علاج۔ زندگی تو بہت سے رخ رکھتی ہے' وہ جو ہر جائز ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرلیتے ہیں بالآخر ایک دن شکار ہوتے ہیں بھوریا چرن کے نہ سہی کسی اور کے۔ آخر انسانیت کے راستے متعین کئے گئے ہیں' دنیا گزارنے کیلئے کچھ بتایا گیا ہے' کچھ ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ ہٹ جاؤ تو راستوں سے انجام تو ہوگا نا۔ دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آتے رہے۔ اچانک ایک نیا خیال آیا' دل ڈرا' مگر اس وقت تنہا تھا۔ لاؤ تجربہ تو کروں۔ آواز دی۔

''بھوریا چرن۔'' اس نے یہی کہا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں ہوتا' جب بھی اسے آواز دوں گا وہ آجائے گا۔ دوسری بار اسے پکارا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کہیں کوئی تحریک نہیں تھی' مگر دو ہی لمحوں کے بعد اچانک سی چیل کی آواز سنائی دی' صحن میں اس کا سایہ نظر آیا پھر وہ صحن میں آبیٹھی' بڑی مکروہ صورت تھی چونکہ میں کسی کا منتظر تھا اس لئے میری نگاہ چیل پر جم گئی۔ چیلیں عموماً اس طرح صحنوں میں نہیں اترتیں بلکہ بلند درختوں یا کہیں دیواروں پر بیٹھتی ہیں' مگر میرا اندازہ درست تھا چیل کی پشت سے ایک سوکھی ٹانگوں والا بڑا سا مکڑا نیچے اترا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا' چیل نے پنجے دبائے جسم تولا اور فضا میں بلند ہوگئی۔ مکڑا میری طرف بڑھ رہا تھا اور اس کا جسم بڑھتا جارہا تھا میں اسے دیکھتا رہا۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے وہ پورا قامت اختیار کرگیا۔ اس کے پاؤں بھی چار رہ گئے پھر وہ سیدھا کھڑا ہوگیا' وہ پیلی بدنما آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''بہت دن سے تو ملا نہیں تھا' میں نے سوچا ملاقات کرلوں۔'' میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''بڑی ہمت ہوگئی ہے میاں جی۔'' وہ طنزیہ بولا۔

''ہاں ہمت تو ہوگئی ہے بھوریا چرن تو نے کیا کچھ نہ کرلیا میرے لئے' مگر دیکھ لے زندہ ہوں' ٹھیک ہوں۔''

''بھوریا چرن باؤلا نہیں ہے میاں جی تم جیسے لونڈے تو اس کے جوتے چاٹیں' مگر اپنا کام تم سے ہی کراتا ہے' ہم نے بھی وچن ہار لیا ہے تمہارے لئے۔ شکتی حاصل کریں گے تو تمہارے ذریعے۔ ابھی کھیل شروع ہوا ہے آگے بڑھے گا' ہم ہوں گے تم ہوگے اور ہمارے بیچ آنے والے مرتے رہیں گے۔ باؤلے تم ہو میاں جی جو سوچ بھی نہیں سکتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہولیتے ہو' کوڑھ ٹھیک ہوگیا۔ تم جلال شاہ کے دوارے پہنچ ہی نہ پاتے پر ہم نے سوچا چلو بڑے دن سے کوڑھی پھر رہے ہو اب کچھ دن ٹھیک رہ کر سانس لے لو تاکہ کوئی نیا کھیل شروع ہو تو جان تو ہو تمہارے بدن میں کہیں مر مرا نہ جاؤ۔''

''راستے تو روکے تھے تو نے۔'' میں نے کہا۔

''ہم راستہ روکتے اور تم ایک قدم آگے بڑھ جاتے۔ آزمانا چاہتے ہو ہمیں میاں جی۔''

''وہ ملنگ کون تھے اور وہ؟''

''بیر تھے ہمارے جو من میں آیا کرتے رہے۔ ہم ہوتے تو وہ کرتے جو ہمارے من میں ہوتا۔ پر ہمیں تو تمہاری دوستی چاہئے اور ہم آہستہ آہستہ کوشش کررہے ہیں۔ سوگند بھدونا چھند کی اپنی پر آجائیں تو جس بستی میں تم قدم رکھو اسے موت میں لپیٹ دیں' دھرتی پھاڑ دیں' بیماریاں لگا دیں ایسی ایسی کہ حکیم وید سسرے سوچتے ہی رہ جائیں کہ یہ کیا بیماری ہے۔''

''تو بکواس کرتا ہے ناپاک کتے۔ مخلوق خدا تیری جاگیر نہیں ہے کہ تو جب چاہے اسے ختم کردے۔ زندگی لینا دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تو کیا اور تیری اوقات کیا۔'' میں نے طیش میں آکر کہا اور وہ مجھے گھورنے لگا' پھر اچانک مسکرا پڑا۔

''تم اپنی کہو میاں جی! دماغ ٹھیک ہوگیا ہو تو چلیں پیر پھاگن دوار؟''

''جاؤں گا وہاں' ضرور جاؤں گا' فاتحہ پڑھنے' چادر چڑھانے۔ بھلا تیرے گندے وجود سے وہ جگہ ناپاک کرنے جاؤں گا۔''

''بوڑھے ہو جاؤ گے مر جاؤ گے۔ مرتے سمے سوچو گے کہ سارا جیون کھو دیا ضد میں ورنہ راجاؤں کی طرح جیتے' محلوں میں رہتے' ماتا پِتا کو بھی عیش کرا دیتے مگر یہ سب تمہارے بھاگ میں نہیں ہے۔''

''تیرے دیئے ہوئے گندے علم کے ذریعے مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔''

''تو ٹھیک ہے میرا بھی کیا جا رہا ہے' میں بھی انتظار کروں گا۔ کوششیں کرتا رہوں گا' شکتی ایسے ہی تو نہیں مل جاتی۔'' اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو میرا پیچھا چھوڑ دے بھوریا چرن' آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے' بس ایک غلطی ہی تو ہوئی تھی مجھ سے میں بھٹک کر تیرے پاس جا نکلا تھا تو یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتا ہے۔''

''اندھی آنکھوں والے ہو تم۔ ہمارے ساتھ آؤ ہمارا کام کر دو تو تمہیں بتائیں کہ ہماری کیا مجبوری ہے۔ جاپ کر رہے تھے ہم اس سمے جب تم ہمارے پاس آئے' اس جاپ کے بیچ ایک کام کا آدمی آتا ہے' تم آ مرے عین اس سمے۔ ہم نے آنکھیں کھول کر تمہیں دیکھ لیا' بس مجبور ہو گئے۔ دوسرا کوئی اب یہ کام نہیں کر سکتا اور ہم جیون بھر کھنڈولے نہیں بن سکتے۔ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا' ہمارے پاس تو اب بھی بڑی شکتی ہے' مگر تم میاں جی بلاوجہ ضد کئے جا رہے ہو' جو شکتی تم چاہتے تھے اس سے کہیں بڑی شکتی مل رہی ہے تمہیں۔ ریس کے گھوڑے تمہارے اشارے پر دوڑیں گے' سندر ناریاں تمہارے لئے آنکھیں بچھا دیں گی' راجہ اندر بن جاؤ تم ان کے بیچ' جو کچھ ایک بار منہ سے مانگو گے تمہارے سامنے آ جائے گا۔ ماتا' پتا' بہن' بھائی کو راج دو گے اور کام اتنا سا۔ بولو اب بھی سمے ہے بات مان لو ہماری۔''

''مگر یہ قوتیں مجھے کیسے مل جائیں گی بھوریا چرن۔''

''ہمیں پھاگن دوار پہنچا دو' ہمیں مہان شکتی مل جائے گی اور ہم تمہیں ایک ایسی چیز دے دیں گے جس سے تمہارے یہ سارے کام بن جائیں گے۔''

''تم ہر وقت مجھ پر نگاہ رکھتے ہو بھوریا چرن۔''

''کیا مطلب؟''

''پچھلی رات تم نے میرے لئے کیڑوں بھرا دودھ بھجوایا تھا۔''

''مجبوری تھی۔ وہ باؤلا سقہ تمہارے لئے جھاڑ پھونک کر رہا تھا۔ اگر وہ دودھ پر پھونک نہ مار دیتا تو تم خاموشی سے دودھ پی لیتے اور دودھ پیتے ہی تمہارے من میں اس کیلئے نفرت پیدا ہو جاتی۔ یہ نفرت اتنی بڑھ جاتی کہ تم رات کو اسے جان سے مار دیتے اور پھر یہاں سے بھاگ جاتے' مگر اس سسرے نے پھونک مار کر سارا کام بگاڑ دیا۔ اصل بات پتا چل گئی۔''

''پیر پھاگن کے مزار پر تم خود نہیں جا سکتے۔''

''جا سکتے تو چلے نہ جاتے۔''

''وہاں جا کر تمہیں کیا مل جائے گا؟''

''یہ کالے منتر کے بھید ہیں مورکھ' تیری سمجھ میں نا آئیں گے۔ ایک شکتی بھنگ ہو گی تو دوسری شکتی جاگے گی' تاج مل جائے گا ہمیں۔''

''اور اس کیلئے تجھے کسی مسلمان کا سہارا چاہئے۔''

''ہاں گھر والا گھر کے دوار کھولے تو پھر گندی ہوا کے جھونکے کیسے رکیں گے۔''

''کون خوشی سے اپنے گھر میں گندگی کرتا ہے بھوریا چرن۔ میں مسلمان ہوں کوئی دھوکے سے مجھے گندا کر دے تو مجبوری ہے' مگر جان بوجھ کر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے پیر پھاگن کے تقدس کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے اور آئندہ بھی تیری

ساری حرکتیں برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں۔"

بھوریا چرن چونک پڑا۔ اچانک اس کے چہرے کی نرمی غائب ہوگئی' اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔ وہ مجھے گھورنے لگا' پھر بولا۔ "تب تو نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"یہ بتانے کیلئے کہ میں تیری بات نہیں مان رہا۔" میں نے کہا اور ہنس پڑا۔

"بڑا مذاق اڑا رہا ہے میرا۔ اتنی باتیں کیوں کیں تو نے مجھ سے' میرا قیمتی وقت کیوں برباد کیا۔" وہ غرایا۔

"تاکہ تجھے تکلیف ہو۔"

"تکلیف۔ تکلیف کا مزا دیکھنا چاہتا ہے تو' جاننا چاہتا ہے کہ تکلیف کیا ہوتی ہے؟"

"ہاں بھوریا چرن' جاننا چاہتا ہوں' مجھے بھی اب تکلیفوں کی عادت پڑ گئی ہے' سکون ہوتا ہے تو بے چینی ہوجاتی ہے۔ تو پھر اب کیا دے رہا ہے مجھے۔"

"نرکھ..... نرکھ دوں گا۔ اگنی میں جلا کر بھسم کردوں گا تجھے۔ ایسی آگ لگاؤں گا کہ جیون بھر نہ بجھے۔" اس نے پھنکارتے ہوئے کہا' اسی وقت باہر سے امام دین کی آواز سنائی دی۔

"ارے بھئی مسعود بھیا کیا کر رہے ہو' باہر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔ آجا سندر لعل اندر آجا۔"

"بھیا کو باہر نکالو۔" سندر لعل کی آواز سنائی دی اور پھر امام دین سندر لعل کے ساتھ اندر داخل ہوگئے' بھوریا چرن ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے مکڑے کا روپ دھار لیا اور تیز تیز دوڑتا ہوا ایک دیوار پر چڑھ کر غائب ہوگیا۔

"اچھے مہمان ہو بھیا جی' چوپال بھی نہیں آئے' کسی سے ملے بھی نہیں۔ ارے تم تو بیربانی (عورت) ہوگئے۔" سندر لعل نے کہا۔

"سندر لعل سیکری جا رہا ہے جاؤ بلند دروازہ دیکھ آؤ۔ چشتی صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھ آؤ۔" امام دین بولے۔

"ہاں چلو بھیا چار بجے واپس آئیں گے تو تمہیں ساتھ بٹھاتے لائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور فوراً باہر نکل آیا۔ کچھ دور پیدل چلے' پھر امام دین نے کہا۔

"ہم چلے کام کرنے' تم سیر کرو جب دل چاہے آجانا۔"

"آپ اجازت دیتے ہیں امام دین چچا۔" میں نے پوچھا۔

"ارے ہاں جاؤ بھیا۔ مرد بچے ہو کوئی چوڑیاں پہنا کر بٹھالیں گے ہم' جاؤ جب دل چاہے آجانا۔" امام دین نے کہا۔ دل کو اطمینان ہوگیا واپس یہاں نہیں آنا چاہتا تھا' مگر امام دین جیسے شخص کو دھوکہ بھی نہیں دیا جاسکتا تھا۔ یہ الفاظ کہہ دیئے تھے کبھی وقت نے موقع دیا تو ضرور آجاؤں گا اور یہ ضروری بھی تھا۔ بھوریا چرن امام دین کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ سندر لعل نے بیل گاڑی ایک درخت کے نیچے کھڑی کر رکھی تھی' میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس نے بیل ہانک دیئے۔

"نگر بڑی چھوٹی سی جگہ ہے بھیا۔ پسند تو نہ آئی ہوگی۔"

"یہاں تم جیسے بڑے لوگ رہتے ہیں سندر لعل جس کی وجہ سے یہ جگہ بہت بڑی ہوگئی ہے۔"

"ہم جیسے بڑے لوگ' لو بھیا کی باتیں۔ ارے مکھیا کی چاکری کریں ہیں بس نخرے اٹھائے ہیں تب روٹی ملے ہے اور ہم ہوگئے بڑے لوگ خوب کہی بھیا۔"

"سیکری کیوں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مکھیا کے چھورا کا کچھ کام ہے شام کو کچھ سامان لے کر پلٹیں گے۔ ویسے سیکری ہے ہی کتنی دور وہ رہی۔" سندر لعل نے کہا۔

ہم سیکری پہنچ گئے۔ فتح پور سیکری جہاں مغل تاریخ بکھری ہوئی ہے۔ عظیم الشان مسجد' رانی جودھا بائی کا محل' ہاتھی خانہ جھروکے جہاں سے نگر کا نظارہ ہوتا تھا۔ وہ بساط جس پر اکبر رانی کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا اور شطرنج کے خانوں پر مہرے کے

لباس میں باندیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ باندیاں ان کے اشاروں پر جگہ بدلتی تھیں۔ وہ سب کچھ یاد کر کے دل پر ایک عجیب سا احساس طاری ہو گیا۔ دنیا میں رہنے والوں نے اس طرح بھی زندگی گزاری ہے اور گزار رہے ہیں۔ سندر لعل نے مجھے نیچے ہی چھوڑ دیا تھا اور اپنے کام سے چلا گیا تھا' بہت سے سیاح تاریخ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی دیر تک' میں اس تاریخ کا ایک حصہ بنا رہا اور پھر مسجد کی طرف چل پڑا۔ بلند دروازہ دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ مغلوں نے تعمیر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور ہندوستان کو یادگار بنا دیا' جس کے نمونے نجانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں۔ ابھی بلند دروازے کی بلندیاں دیکھ رہا تھا کہ ایک بچہ پاس آ کھڑا ہوا۔

''کودے صاب۔''

''کیا؟'' میں اس کی بات سمجھ نہ سکا!

''اوپر سے باؤلی میں کودے۔'' اس نے بلند دروازے کی بلندیوں اور پھر اس کی پستیوں میں بنی چھوٹی سی باؤلی کی طرف اشارہ کیا جس کی تہ میں کائی کے دل چھائے ہوئے تھے۔

''اوپر سے کودو گے۔'' میں نے منہ پھاڑ کر پوچھا۔ کچھ سیاح میرے پاس آ کر کھڑے ہوئے تھے۔

''کودو! ان سیاحوں کے مقامی گائیڈ نے کہا اور بچہ دوڑتا ہوا ایک چھوٹے سے دروازے میں گھس گیا' پھر چند بار پلک جھپکی تھی کہ وہ بلند دروازے کی آخری بلندی کے جھروکے میں نظر آیا اور پھر اس نے بیبا کی سے اپنی جگہ چھوڑ دی' میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ آہ یہ ننھا سا وجود۔ آنکھیں کھولیں تو وہ سیاحوں سے اپنا محنتانہ مانگ رہا تھا' میں دل برداشتہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں قلاش تھا' اس شیر دل کو کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ سیڑھیاں عبور کر کے عظیم الشان مسجد میں داخل ہو گیا۔ صحن مسجد میں بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں بھٹکا بھٹکا آگے بڑھتا رہا' ایک سمت درگاہ حضرت سلیم چشتی نظر آئی۔ قدم اس جانب کھنچے چلے گئے' اندر داخل ہو گیا۔ درگاہ کے تقدس سے دل منور ہو گیا' مزار اقدس کے نزدیک دوزانو بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں حسرت ابھر آئی' دل میں ایک شکایت سی پیدا ہو گئی' پھر یہ شکایت آنکھوں سے برسنے لگی۔ اس سے قبل رونے کا مزا ایسا کبھی نہ آیا تھا جو اب آ رہا تھا۔ ہاں رونے میں بھی مزا ہے' شرط ہے کہ آنسو آنکھوں سے نہیں دل سے نکلیں۔ ان آنسوؤں کی آواز تھی کہ اتنا مطعون ہوں' اتنا برا ہوں مجھ پر توجہ ہی نہیں' پلیدوں کی ٹھوکروں میں گزر رہی ہے۔ کوئی سایہ نہیں ہے کوئی دیوار نہیں ہے اور بھی تو گنہگار ہوں گے میں ہی راندہ درگاہ کیوں ہوں' ہمت ٹوٹ رہی ہے جی نہ سکا تو مر جاؤں گا۔ یوں لگا کوئی سن رہا ہے' کوئی سوچ رہا ہے کسی نے ٹھنڈی سانس لی ہے۔ کسی نے فیصلہ کیا ہے۔ جانے کب تک بیٹھا رہا' لوگ آتے رہے' جاتے رہے پھر اٹھا اور باہر نکل آیا۔ چند قدم آگے بڑھا تو کالی داڑھی والے ایک درویش سے شخص نے پانی کا کٹورہ سامنے کر دیا۔

''تحفہ درگاہ ہے پیو۔'' میں نے عقیدت سے پانی کا کٹورہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ بے حد ٹھنڈا بے حد شیریں پانی تھا۔ وہ شخص دوسرے لوگوں کو بھی یہ پانی دے رہا تھا۔

مسجد میں ایک کنواں ہے جس کی گہرائیاں لامحدود ہیں' اس سے پانی نکالنا کاردار ہے لیکن اس سے جو پانی نکلتا ہے وہ بے مثال ہے۔ اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر ایک کو محسوس ہو جائے۔ دل سیر ہو گیا' کٹورہ واپس کر کے آگے بڑھ گیا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو جلدی سے وضو کرنے جا بیٹھا۔ نماز پڑھی اور پھر ایک وسیع دالان میں جا بیٹھا۔

بڑی ٹھنڈک تھی اور اس ٹھنڈک میں بڑی فرحت تھی' لوگ آس پاس سے گزر رہے تھے' جگہ جگہ کھڑے تھے' پھر کچھ قدم میرے قریب رک گئے' بہت سے لوگ تھے اور اس طرح رکے تھے میرے قریب کہ حیرانی ہوئی' تب ایک نرم آواز نے مجھے پکارا۔

''مسعود۔'' بدن کو جھٹکا لگا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گردن اٹھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آواز دینے والے کو دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ ریحانہ بیگم تھیں۔ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ بدن پر لرزش طاری ہو گئی تھی۔ قرب و جوار میں کھڑے لوگوں کو دیکھا' شاکر نادرہ' سرفراز اور فریحہ سب تھے۔ بھلا چہرے پر شناسائی کیوں نہ ابھرتی۔

''آپ۔ آپ۔'' میرے منہ سے لرزتی آواز ابھری۔
''یہ کیا حال بنا رکھا ہے مسعود۔ یہ چہرے کو کیا ہو گیا' یہ نشانات کیسے ہیں؟'' ریحانہ بیگم نے دل سوزی سے کہا۔
''امی' ابو' شمسہ' ماموں' ماموں۔'' میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔
''یہاں تمہارے ساتھ اور کون ہے۔'' ریحانہ بیگم نے پوچھا۔
''اکیلا ہوں۔''
''تو چلیں آؤ۔'' ریحانہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
''مگر۔''
''چلو جہاں ہم جا رہے ہیں۔ فتح پور سیکری آئے تھے' فاتحہ پڑھنی تھی پڑھ لی' اب آگے چل رہے ہیں۔ آ جاؤ کوئی بیکار بات مت کرنا۔'' ان کی گرفت میری کلائی پر سخت تھی۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ایک بار پھر میں نے پوچھا۔
''میرے ماں باپ کا کوئی پتا چلا۔''
''افسوس نہیں' لیکن ضرور پتا چل جائے گا ان شاء اللہ مل جائیں گے۔'' مسجد سے دور اس جگہ نکل آئے جہاں کاریں ریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی سی قیمتی ویگن میں سب بیٹھ گئے۔ ریحانہ بیگم نے مجھے اپنے پاس بٹھایا تھا۔ ڈرائیور نے ویگن سٹارٹ کر کے واپس موڑ دی اور وہ بلندی سے نیچے اترنے لگی۔ نیچے میں نے سندر لعل کو بیل گاڑی لئے کھڑے دیکھا اور بے اختیار کہا۔
''ذرا ایک منٹ کیلئے گاڑی رکوا دیں۔'' ریحانہ بیگم نے ڈرائیور کو حکم دیا اور ڈرائیور نے ویگن روک دی۔ نیچے اتر کر میں سندر لعل کے پاس پہنچ گیا۔
''سندر لعل مجھے کچھ لوگ مل گئے ہیں' میرے رشتے دار ہیں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ امام دین چچا سے کہہ دینا موقع ملا تو دوبارہ آؤں گا۔ انہیں میرا اسلام کہہ دینا۔''
''ٹھیک ہے بھیا سلام۔'' اس نے کہا اور میں دوبارہ ویگن میں جا بیٹھا۔ وہ سب خاموش تھے' مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کا انداز سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ویگن آگے بڑھ گئی۔
''آپ نے چچی جان بلاوجہ مجھے اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ سب لوگ میری وجہ سے پریشان ہو جائیں گے اور اور میں نے ایک ایک کا چہرہ دیکھا' نادیہ بولی۔
''امی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ رہی ہے۔''
''اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال ہے مسعود میاں تو اسے دل سے نکال دو' رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے ہیں۔ تم سے کتنا لگاؤ ہے اس کا بالآخر تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔'' ریحانہ بیگم نے کہا میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ ریحانہ بیگم بولیں' ''آگرے میں ہم بیرسٹر جلال غازی کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مجھے وہاں تھوڑا سا جھوٹ بولنا ہوگا جس کیلئے مجھے معاف کر دینا۔'' میرے ساتھ سبھی لوگ ریحانہ بیگم کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ریحانہ بیگم نے کہا۔'' تمہارا نام ارشاد ہے اور تم سرفراز کے بھائی ہو۔ بہت عرصہ قبل گھر سے نکل گئے تھے' اب اچانک ملے ہو اور ہم تمہیں ساتھ لے آئے ہیں۔''
''ارے خدا کی قسم۔ زبردستی چچی جان کیا بات سوجھی ہے' کیا دماغ پایا ہے۔ اس طرح میرا ان کے ہم شکل ہونے کا جواز بھی پیدا ہو گیا اور باقی مسئلے بھی حل ہو گئے۔ بھئی زندہ باد کمال ہے۔ واقعی کمال ہے۔'' سرفراز نے اچھلتے ہوئے کہا۔
''عجیب ہیں آپ لوگ۔ کیوں مجھ جنجال کو گلے لگا رہے ہیں۔ میں مصیبتوں کی جڑ ہوں۔ میں کسی کیلئے فائدہ مند نہیں ہوں۔ مجھ سے ہمدردی کرنے والوں کو صرف نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' میں نے آنسو بھری آواز میں کہا۔
''ہم ان فضولیات کے قائل نہیں ہیں مسعود میاں۔ اللہ پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں' تقدیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہتا ہے' اگر ہم پر کوئی مصیبت آنی ہے تو ضرور آئے گی۔ تمہارے ذریعہ نہ سہی کسی اور ذریعہ سے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔

ریحانہ بیگم نے کہا۔
''آپ سمجھتے کیوں نہیں۔'' میں نے الجھ کر کہا۔
''اب واقعی تم یہ اظہار کر رہے ہو کہ تم ہمیں کسی حیثیت سے قبول نہیں کر سکتے۔''
''یہ بات نہیں ہے خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے۔ مجھ پر تو یہ وقت آ پڑا ہے کہ کانٹے بھی دامن سے الجھ جائیں تو ان پر پیار آنے لگے۔ یہ سوچ کر کہ کسی نے روکا تو ہے۔'' میں نے اسی انداز میں کہا۔
''ہمیں کانٹوں کی بھی حیثیت حاصل نہیں ہے۔'' ریحانہ بیگم کی آواز بھی رندھ گئی۔
''او یار چھوٹے بھائی۔ اب بولنے پر مجبور ہوں۔ کیوں خوامخواہ ٹریجڈی کر رہے ہو۔ خاموش بیٹھ جاؤ' جب ہم پر تمہاری وجہ سے مصیبتیں پڑیں گی تو ہم خود سارے رشتے ختم کر دیں گے۔'' سرفراز نے کہا۔
''آپ کی مرضی' بعد میں مجھے برا نہیں کہیں۔''
''نہیں کہیں گے بس......!'' شاکر بھی چپ نہ رہا اور میں مسکرانے لگا' پھر میں نے کہا۔
''آپ لوگ یہاں کب پہنچے؟''
''آگرہ آئے ہوئے پانچ دن ہو گئے۔ اس سے پہلے کلیر شریف گئے تھے' صابر کلیریؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے۔''
''چند بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کرنے نکلے ہیں' کئی اور جگہ جانا ہے۔ تم یقین کرو مسعود ہم نے تمام کوششیں کر لیں تمہارے والدین کو تلاش کرنے کی' بے چارے امتیاز عالم شاہ صاحب نے تو باقاعدہ شہر شہر کی پولیس سے بھی مدد لی مگر وہ کسی گمنام جگہ جا بسے ہیں۔ کہیں مل کر ہی نہ دیئے۔''
''میرے جیسے بدنصیب بیٹے کے والدین ہیں وہ' گمنامی کی زندگی بسر نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔''
''خدا تمہاری مدد ضرور کرے گا بیٹے' حالانکہ امتیاز عالم شاہ صاحب تمہارے فرار سے خود بھی کافی پریشان رہے' لیکن انہیں تم سے ہمدردی بھی ہے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں ذاتی طور پر بھی کافی چھان بین کی اور بہت کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''
''کیا......؟'' میں نے پوچھا۔
''تمہارے خاندانی حالات' تمہارے خاندان کی شرافت' وہ حالات جن کا یہ خاندان شکار ہوا' تم شکار ہوئے۔ ان کا ذاتی خیال تھا کہ یہ ایک انوکھی کہانی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہارے اہل محلہ نے وہ تمام حالات بتائے جنہوں نے تمہاری ہنستی بستی دنیا اجاڑ دی۔ قانون کے تقاضے اپنی جگہ' انسانی بنیادوں پر انہیں تم سے آج بھی ہمدردی ہے۔''
''انہیں میرے فرار کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا......؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ جس دوسرے قیدی کو لے کر تم فرار ہوئے وہ تمہارا چھوٹا بھائی تھا۔''
''اور...... اور اب انہیں میری تلاش ہو گی۔''
''نہیں۔ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔''
''کیا......؟''
''ہاں اور شاید تم یقین نہ کرو کہ وہ آج بھی تمہارے والدین کو تلاش کر رہے ہیں' بہت متاثر ہوئے ہیں وہ تمہارے حالات سے۔ پراسرار علوم جاننے والوں سے رابطے بھی کئے ہیں انہوں نے۔''
''آپ لوگوں کو...... میری بے گناہی پر یقین ہے......؟'' میں نے سسک کر کہا۔
''خدا کی قسم پورا پورا...... ہم نے یہاں دور سے تمہاری ایک جھلک دیکھی تھی۔ نادیہ نے تمہیں پہچان لیا اور سب کو متوجہ کیا۔ ہمیں تمہاری تلاش ہمیشہ ہی رہی۔''
''آپ لوگ زمین پر بسنے والے فرشتے ہیں' اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں بلکہ ایک معصوم اور نیک سیرت انسان سے محبت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے ہمارا اجڑا دیار بس گیا ہے۔ سرفراز اور فریحہ کی زندگی پر بہار آ گئی ہے ورنہ ایک ماں کیلئے غمزدہ بیٹی سے بڑا دکھ اور کیا ہوسکتا تھا اور پھر تم نے...... تم نے وہ کیا جو بس فرشتے ہی کر سکتے ہیں۔ تم انکار کرتے رہے کہ تم سرفراز نہیں ہو اور ہم اصرار کرتے رہے۔ ہم نے تمہیں ہر طرح مجبور کیا' مگر تم نے ہماری غلط فہمی سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا ورنہ کیا کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ تم نے جس برے وقت کو انسانیت کے نام پر قبول کیا وہ بڑے دل گردے کا کام تھا۔''

''قطعی چھوٹے بھائی ورنہ ہم تو تباہ ہو چکے ہوتے۔'' سرفراز نے گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا چھوٹا بھائی کہاں ہے؟''

''خدا کے فضل سے محفوظ ملک سے باہر نکل گیا۔'' میں نے بتایا۔

''تم نے بھی ایسا ہی کیوں نہ کیا۔ تم بھی چلے جاتے۔'' ریحانہ بیگم نے کہا اور میں نے گردن جھکالی' پھر آہستہ سے بولا۔

''امی ہیں' ابو ہیں' شمسہ ہے۔ شاید کبھی مل جائیں۔'' ریحانہ بیگم رو پڑیں' نادیہ اور فریحہ بھی رونے لگے۔ شاکر اور سرفراز خاموش تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو گرتے رہے' پھر آ گرہ آ گیا۔

بیرسٹر جلال غازی کی رہائشگاہ بڑی خوبصورت تھی اور وہ خود بھی بڑے کروفر کے انسان تھے۔ گرجدار آواز' خان بہادر سٹائل کی مونچھیں' مجھ سے ملے' وہی کہانی انہیں سنائی گئی تھی جو راستے میں طے کی گئی تھی۔

''گھر سے کیوں بھاگے' ایں پڑھنے میں دل نہیں لگتا تھا۔'' انہوں نے اتنی کڑک دار آواز میں پوچھا کہ میں گھبرا گیا۔

''شروع سے پیری مریدی کے چکر میں پھنس گئے تھے صاحبزادے۔'' سرفراز جلدی سے بولا۔

''پیر بن گئے ہیں' ایں۔ بن گئے پیر' معرفت مل گئی ہوگی۔ گنڈے' تعویذ اور وہ پڑھے ہوئے پانی کی بوتلوں کا کاروبار شروع ہو گیا ہوگا۔ کس بھاؤ بیچتے ہو یہ سب کچھ! ایں......؟'' بیرسٹر صاحب بہت ٹیڑھے تھے۔

''ابھی کہاں جناب......؟ ابھی تو مبتدی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''عزیزی دین کا مطالعہ کرو' الف بے کی شد بد سیکھو' دین میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین دنیا ایک ساتھ گزارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سادھو بن کر جنگلوں میں پھرنا شیوہ اسلام نہیں سمجھے۔ دنیا کو نبھاؤ اور دیندار رہو' یہ تعلیم ہے اسلام کی۔ جذب کی منزل تو بہت دور کی بات ہوتی ہے۔ بہت دیر کی بات ہوتی ہے۔ یہ نشان کیسے پڑ گئے چہرے اور بدن پر۔''

''جی وہ......!''

''قاسم...... قاسم میاں۔ جاؤ حکیم جبار حسین کو بلا لاؤ۔ بچے کو دکھانا ہے' غضب خدا کا تباہ کر لیا اپنے آپ کو۔ الٹے سیدھے چلے کر کے تمام صحت خراب کر لی۔ اماں قاسم میاں' منہ دیکھ رہے ہو......''

''جی...... جاتا ہوں۔'' قاسم میاں ایک عمر رسیدہ ملازم تھے۔

''یہ حکیم جبار حسین......'' ریحانہ بیگم نے پوچھا۔

''حکیم ہیں بھائی صاحبہ۔ کلائی میں ڈور باندھ کر بیٹھ جائیں پردے کے پیچھے' پانچ پشتوں کی بیماریاں بتا دیں گے۔'' روایتیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک روپیہ لیتے ہیں مرض تشخیص کرنے کا' اس کے بعد شفا ہونے تک کچھ نہیں لیتے۔ دوائیں بازار سے منگواتے ہیں۔ صبح کو بازار سے ایک کلو گیہوں خرید کر لاتے ہیں' اہلیہ چکی میں پیستی ہیں تب روٹی پکتی ہے۔ زر و جواہر کے انبار سامنے ڈال دو ہنس دیں گے اور بے نیازی سے چلے جائیں گے!''

''سبحان اللہ۔ یہ قیام کائنات کے امین ہیں۔'' ریحانہ بیگم بولیں۔ سفید ڈاڑھی' دبلے پتلے بدن والے حکیم جبار حسین نے مجھے دیکھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں' ایک بار بھی نظر نہ اٹھائی۔ کچھ دیر کے بعد بولے۔

''گلاب کے تازہ پھول مل جائیں گے؟''

''کیوں نہیں۔ کتنے چاہئیں......؟'' بیرسٹر صاحب بولے۔

''بس ایک روزانہ درکار ہوگا۔'' حکیم صاحب نے جواب دیا۔ قاسم میاں فوراً ہی پھول توڑ لائے تھے۔ حکیم صاحب نے پتیاں الگ کیں اور ان کے نیچے کا حصہ میرے منہ میں رکھ دیا۔ ''ہر صبح ایک پھول کا یہ حصہ چبا لیا کیجئے رب العالمین شفا عطا کرے گا۔''

''بس......؟'' بیرسٹر صاحب بولے اور حکیم صاحب نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''آپ اسے بس کہہ رہے ہیں۔ ذرا ایک پھول تخلیق فرما دیجئے۔''

''اوہ......!'' بیرسٹر صاحب لرز گئے۔ میں بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔

حکیم صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کر کے باہر نکل گئے۔ سب اس جملے کے زیر سحر آ گئے تھے۔ کوئی ہے جو کسی ٹہنی پر گلاب کا ایک پھول اگا دے۔ میں بھی اسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر کے بعد بیرسٹر صاحب بولے۔ ''سنا آپ لوگوں نے۔ ایسے ہی جملے تو خود سے بیگانہ کر دیتے ہیں' مگر دنیا ضروری ہے۔''

''حکیم صاحب ولی معلوم ہوتے ہیں۔''

''ان کے سامنے نہ کہہ دیں۔ بے لگام آدمی ہیں جو منہ میں آئے گا کہہ دیں گے۔ میرا بڑا لحاظ کرتے ہیں' مگر یہ جملہ برداشت نہیں کریں گے' ہو چکی ہے ایک بار۔''

* * * * *

بیرسٹر صاحب بے حد عظیم انسان تھے۔ مجھے اس گھر میں بڑی محبت دی گئی۔ سرفراز نے مجھے کئی لباس دیئے۔ نادیہ نے میرے لئے سوٹ کیس تیار کیا۔ سب بڑے پیار سے پیش آ رہے تھے۔ فریحہ کی آنکھوں میں محبت تھی اور میں زندگی کی یہ دھوپ چھاؤں دیکھ رہا تھا۔ میں نے کیا ہی کیا تھا ان لوگوں کیلئے' تقدیر کے پھیر میں تھا' مسلسل صعوبتوں سے بدحواس ہو رہا تھا ورنہ شاید بہک جاتا جو مل رہا تھا اسے حاصل کر لیتا' خواہ انجام کچھ بھی ہوتا۔ بدحواسی نیکی بن گئی تھی' کیا کچھ نہیں تھا۔ صبح کو دروازے پر دستک ہوئی تو جاگ گیا۔ باہر آیا تو بیرسٹر صاحب ہاتھ میں گلاب کا پھول لئے کھڑے تھے۔

''صبح خیزی بہت سی بیماریوں کا علاج ہے اور بے تکلف میزبان بلائے جان۔ ہم نے سوچا علاج میں غفلت نہ ہو۔ چلو یہ دوا کھا لو اس کے بعد چاہو تو سو جاؤ' ورنہ ہمارے ساتھ چہل قدمی کرو......!'' نہایت احترام سے پھول لیا حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق اس کا وہ حصہ کھایا جہاں سے پتیاں اگتی ہیں اور بیرسٹر صاحب کے ساتھ چہل قدمی کرتا رہا۔ بہت سی باتیں ہوئیں' بڑی احتیاط برتنی پڑی۔ اتنے اچھے انسان سے مسلسل جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا' مگر اس میں کسی کی عزت چھپی ہوئی تھی۔ پانچ دن خواب کے سے عالم میں گزر گئے۔ وہ سب کچھ ملا تھا جو قصہ پارینہ بن گیا تھا۔ پیار' محبتیں' توجہ ہر ایک دلجوئی کرتا تھا۔ ان پانچوں دنوں میں صبح کا پھول بیرسٹر صاحب نے ہی پیش کیا تھا۔ پانچویں دن رخت سفر بندھ گیا۔ جے پور جا رہے تھے وہاں سے اجمیر شریف جانا تھا۔ بیرسٹر صاحب کے پورے خاندان نے سٹیشن پر رخصت کیا۔ یادوں کا' احسانات کا ایک بوجھ تھا' ایک انبار تھا کسی نے کمی نہیں کی تھی۔ سندر لعل نے بھی محبت دی تھی' چچا امام دین نے بھی اور پھر یہ لوگ۔

''جے پور سے اجمیر شریف چلیں گے۔ دربار خواجہ میں حاضری دے کر دہلی کا سفر کیا جائے گا۔ سلطان دہلی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے چہیتے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دے کر گھر واپس چلیں گے۔ اس لئے بتا رہی ہوں کہ تم یہ نہ سوچو کہ تمہیں کچھ بتایا نہیں جاتا۔''

ریحانہ بیگم نے کہا۔ میرے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی ہوئی تو نادیہ بول پڑی۔

''اب یہ کہیں گے کہ ان پر بڑے احسانات ہو رہے ہیں۔''

''نہیں...... میں یہ نہیں کہوں گا نادیہ صاحبہ......!'' میرے الفاظ مجھے خود شرمسار کر دیتے ہیں۔

''خدا کا شکر ہے۔ ویسے امی آپ ان کے یہ نشانات دیکھ رہی ہیں......؟'' نادیہ بولی۔

''ٹوکتے نہیں بیٹی۔ اللہ کا کرم ہے۔ ان تمام پاک بزرگوں کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے کے بعد ان کے وسیلے سے اللہ

سے دعا مانگنا مسعود میاں کہ تمہاری مشکل ٹلے۔ اللہ تمہیں کالے جادو کے اثر سے نکالے۔ تمہارے والدین، بہن بھائی کو ہر آفت سے محفوظ رکھے اور تمہیں ان سے ملائے۔ ہم سب بھی تمہارے لئے یہ دعا کریں گے!" ریحانہ بیگم نے کہا۔

"آپ کو یہ علم ہے چچی جان.....!"

"کیا.....؟"

"آپ نے کالے جادو کا تذکرہ کیا ہے.....؟"

"اس سے تم یہ اندازہ لگا لو کہ ہم نے تمہیں کتنا یاد کیا ہے۔ خدا خوش رکھے امتیاز عالم شاہ کو انہوں نے تو تمہارے لئے بڑی جانفشانی کی ہے۔ اتنے بڑے افسر رہے ہیں، کہتے تھے زندگی میں کبھی ایسے واقعات سے سابقہ نہیں پڑا لیکن مسعود کے بارے میں جتنی تفتیش کی ہے اس نے دماغ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نہ جانے کس کس سے ملے ہیں، اس سلسلے میں تصدیق کرتے پھرے ہیں کہ کالا جادو کیا ہوتا ہے، آخر میں صحیح کرتے ہوئے کہا۔ "ارواح خبیثہ کا وجود ثابت ہے اور علوم خبیثہ کا وجود ملتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں جتنی چھان بین کی اس سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ ایک جال میں جکڑا گیا ہے اور جو کچھ اس سے منسوب ہے اس میں اس کا اپنا عمل شامل نہیں ہے۔ ایک بار قسمیں کھاتے ہوئے بولے کہ اگر تم ان کے ہاتھ آ جاؤ تو وہ تمہیں گرفتار نہیں کریں گے اور زندگی میں پہلی بار قانون سے انحراف کریں گے۔ انہوں نے بارہا خلوص دل سے تمہارے لئے دعائیں کی ہیں۔"

ایسی باتوں پر دل رونے کو چاہتا تھا، مگر اب خود کو سنبھالنا سیکھ لیا تھا، خاموش ہو گیا۔

پتھروں کی زمین شروع ہو گئی، سنگلاخ پہاڑوں میں رانا سانگا سے لے کر چنبل کے ڈاکوؤں تک کی کہانیاں جھانک رہی تھیں۔

مان سنگھ، ہری چند ہاڑا، بھوپت اور پھولن دیوی، بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے، پھر جے پور آ گیا۔ راجاؤں کے شہر کی شان ہی نرالی تھی۔ ان لوگوں نے جو اعتماد دیا تھا اس نے زندگی سے دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ یہاں ایک دن قیام کیا پھر چھوٹی ریلوے لائن کے ذریعہ سفر کر کے دریائے فیض پہنچ گئے۔ خواجہ کا اجمیر صدیوں کی داستانیں سمیٹے نگاہوں کے سامنے تھا۔ تارا گڑھ کی بلندیاں اور اس کی پستیوں میں خواجہ کے عقیدت مند، ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ ہم بھی خواجہ کے گداؤں میں شامل ہو گئے اور فیض کے سمندر سے آب حیات پینے لگے۔

رات ہو گئی۔ سنگلاخ زمین پر خیمہ زنی کی گئی تھی۔ میرا خیمہ الگ تھا، قریب ہی دوسرے خیمے بھی تھے۔ زمین پر لیٹے لیٹے دل میں ایک خیال آیا۔ حالات بہتری کی طرف رخ کر رہے ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے دل کو کوئی نیا دھکا نہیں لگا تھا بلکہ بھوریا چرن کا گندا علم شکست کھا رہا تھا، اس کا سلسلہ ہسپتال سے شروع ہوا تھا۔ ہسپتال سے..... ہاں وہاں سے میں نے روشنی دیکھی تھی، بابا جلال شاہ کے مزار اقدس کی روشنی، مگر اس سے بھی پہلے ہاں اس سے بھی پہلے بزرگ سلیم بیگ نے مجھے نماز کی تلقین کی تھی اور میں نے نماز پڑھی تھی۔ آہ وہی وقت تھا جب میری تاریک آنکھوں نے روشنی دیکھی تھی۔ نماز نے میرے وجود کے اندھیروں کو نور بخشا تھا۔ یقیناً..... یقیناً یہی نور میری زندگی کی بہاریں واپس لا رہا تھا۔ کوڑھ کے مرض سے نجات ملی تھی، اس اذیت ناک بھوک سے نکات ملی تھی اور پھر۔ اس وقت سے مسلسل بھوریا چرن ناکام ہو رہا تھا۔ اس کے بیر میرا راستہ نہ روک سکے تھے۔ امام دین کے ہاں وہ مجھے ناپاک دودھ پلانے میں ناکام رہا تھا۔ پھر یہ لوگ ملے تھے اور اس کے بعد..... اس کے بعد میری ان آنکھوں نے مزار خواجہ کا دیدار کیا تھا۔ کچھ سنوائی ہوئی ہے کیا.....؟ کچھ سنوائی ہوئی ہے کیا.....؟ دل کچھ اس طرح خوشی سے بے قابو ہوا کہ خیمے سے باہر نکل آیا۔ رات بکھری ہوئی تھی۔ بہت دور مزار مقدس روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ قوالیوں کی تانیں ابھر رہی تھیں اور کچھ فاصلے پر کوئی شے متحرک تھی۔ غاؤں غاؤں کی ایک آواز سی ابھر رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ سردی سی لگنے لگی..... یہ کیا ہے.....؟

دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آنے لگے۔ بھوریا چرن کے خوف سے خود کو آزاد نہیں کر سکا تھا، مگر اس ناپاک سادھو کی

کیا مجال کہ اس پاک جگہ قدم رکھے۔ یہ کچھ اور ہے مگر کیا؟ دل میں شدید تجسس جاگ اٹھا۔ وہ بدبو جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اب سمجھ میں آنے لگی تھی۔ یہ سڑے گلے پھلوں کی بدبو تھی۔ دن میں اس جگہ پھل فروش ٹھیلے لگائے ہوئے تھے۔ گلے ہوئے پھل وہ یہیں پھینک گئے تھے۔ یہ بو انہی میں سے اٹھ رہی تھی اور وہ متحرک شے ممکن ہے کوئی چوپایہ ہو جو اس وقت یہ پھل کھا رہا ہو۔ اپنے ذہن میں یہ معمہ اس طرح حل کرلیا۔ ممکن تھا اس طرف سے لاپروا ہو جاتا لیکن ذہن تحقیق کا عادی ہو گیا تھا۔ سوچا قریب جا کر دیکھوں اور قدم آگے بڑھ گئے۔ میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ بو پھلوں کے اسی ڈھیر سے آ رہی تھی' مگر وہاں کوئی چوپایہ نہیں تھا بلکہ وہ کوئی انسان تھا جو یہ گلے ہوئے پھل کھا رہا تھا۔ شاید کوئی بھوکا فقیر تھا۔ ممکن ہے خواجہ کے لنگر سے محروم رہ گیا ہو' قریب جا کر اسے دیکھا اس کے بدن پر چیتھڑے جھول رہے تھے' بال اور داڑھی مٹی سے اٹے ہوئے تھے' چہرہ عجیب سا تھا۔ بڑے انہماک سے پھل کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پاس رکھی ہوئی چھڑی اٹھائی اور اسے بلند کر کے بولا۔

''ہش' ہش' بھاگ' بھاگ'' میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کوئی مجذوب تھا۔ خواجہؒ کے مقدس مزار کے احاطے میں' میں نے بیشمار قلندر' ملنگ اور مجذوب دیکھے تھے جو ہو حق کے نعرے لگاتے رہتے تھے' انہی میں سے کوئی تھا۔ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ دل خوش تھا' دل لگی سوجھی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''بھاگ بھاگ...... گندگی کرے گا۔'' مجذوب نے پھر لکڑی اٹھا کر کہا۔

''میں بھی پھل کھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چھونا مت ورنہ لکڑی سے ماروں گا۔''

''مجھے بھی کچھ پھل دے دو!'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''منع کر رہا ہوں' بھاگ جا۔ پھل کھائے گا گندا غلیظ کہیں کا! اتنا نہیں جانتا پہلے پھل چکھنا پڑتا ہے' پھر کھایا جاتا ہے۔ جا بھاگ ہش ہش!'' وہ ایک سڑی ہوئی نارنگی اٹھا کر کھانے لگا۔

''میں پھل چکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ گردن جھکائے جھکائے ہنس پڑا۔ بار بار ہنستا رہا۔ پھر بے تحاشا ہنسنے لگا' پھر بولا۔

''چکھ تو رہا ہے۔ جو کرتا رہا ہے' اس کا پھل چکھتا تو رہا ہے اور چکھے گا ابھی اور چکھے گا۔''

''میں دنگ رہ گیا۔ کیا رمز تھا اس کے جملے میں! دل میں عقیدت پیدا ہوگئی۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

''بہت پھل چکھ چکا ہوں' اب کھانا چاہتا ہوں۔''

''ایسے ہی کھانا چاہتا ہے۔ پہلے بیج بو' پودا لگا پھر اسے پروان چڑھا۔ جب وہ پھل دے تو پھل کھا۔ بھاگتا ہے یا ماروں پتھر؟'' مجذوب غصے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پاس پڑا پتھر اٹھا لیا تھا۔

''مجھ پر رحم کردو۔ مجھے پھل دے دو۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''مار رہا ہے۔ دیکھو! یہ مجھے مار رہا ہے۔ میں بھی ماروں گا' پھر نہ کہنا۔'' اس نے پیچھے رخ کر کے کہا۔ پھر جیسے کوئی آواز سن کر بولا۔ ''بھگا دوں؟ بھگاتا ہوں۔'' اس نے پتھر مجھ پر کھینچ مارا' نشانہ سر تھا' میں بے اختیار جھک گیا اور پتھر میرے اوپر سے نکل گیا۔

''غیروں سے رحم مانگتا ہے۔ بھاگ یہاں سے بھاگ!'' اس نے دوسرا پتھر اٹھا لیا اور یہ پتھر میری کمر میں لگا۔ اس کے بعد مجذوب نے مجھ پر پتھروں کی بارش کردی۔ بیشمار چوٹیں لگی تھیں' بھاگنا پڑا۔ وہ میرے پیچھے آ رہا تھا اور پتھر اٹھا اٹھا کر مار رہا تھا۔ سر بچا ہوا تھا ورنہ اٹھنا مشکل ہو جاتا' مگر اب بدحواسی طاری ہو گئی تھی۔ مجذوب میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ منہ سے ایسی آوازیں نکالتا جا رہا تھا جیسے کسی کتے کو بھگا رہا ہو۔ بہت دور نکل آیا۔ ساری روشنیاں پیچھے رہ گئیں' پھر ایک پتھریلی دیوار سامنے آگئی اور میں اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ عجیب ناگہانی پڑی تھی۔ خیمے دور رہ گئے تھے اور مجذوب تھا کہ پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ اتنا فاصلہ طے کیا تھا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ یقین تھا کہ وہ اب ادھر بھی آجائے گا' مگر وہ نہ آیا۔

دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جھانک کر ٹیلے کے دوسری طرف دیکھا۔ وہ شاید واپس چلا گیا تھا۔ تا حد نگاہ کوئی نہیں تھا۔ سانس بحال ہونے لگی تھی۔ مزید کچھ دیر انتظار کیا اور اس کے بعد وہاں سے نکل آیا۔ پتا نہیں اس بھاگ دوڑ میں کتنا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ مجذوب کی باتیں دل کو عجیب طرح سے متاثر کر رہی تھیں۔ ذرا سا غم کا احساس بھی تھا۔ وہ خوشی جو ایک تصور سے تھوڑی دیر پہلے ملی تھی' یعنی میں نے سوچا تھا کہ مصیبتوں کے لمحات ٹلنے لگے ہیں' کچھ بہتری ہو رہی ہے میری زندگی میں اور اس بات نے ہی اتنی خوشی بخشی تھی کہ اپنے خیمے سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ مجذوب کے الفاظ بڑی گہرائیوں کے حامل تھے۔ اس نے کہا تھا کہ پہلے پھل چکھا جاتا ہے اور اس کے بعد کھایا جاتا ہے اور اس کی تفصیل میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ برائیوں کا پھل واقعی چکھا جاتا ہے اور نیکیاں جب پھل دیتی ہیں تب وہ پھل کھایا جاتا ہے۔ کون سی نیکیاں کر لی تھیں میں نے بس برائیوں کے راستے پر نکلا تھا اور غلاظتوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

اب تو ہر چیز نگاہوں کے سامنے تھی' کوئی بات پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ بھوریا چرن بھی اپنے ہی جال میں جکڑ گیا تھا۔ غالباً اس کے کالے جادو کا یہ بھی ایک حصہ تھا کہ اس وقت جو بھی کوئی اس کے سامنے آئے اور اپنی غرض کا اظہار کرے تو وہ اپنی بھی غرض کا تبادلہ کرے اور یہ بدنصیبی ہی میری تقدیر میں لکھی ہوئی تھی۔ نجانے اب اور کتنے پھل چکھنے پڑیں گے۔ مجذوب کا کہنا تو کچھ اس انداز کا تھا جیسے ابھی میں نے کوئی مصیبت بھگتی ہی نہ ہو۔ آہ! کیا میں مزید مشکلات کا شکار ہو سکتا ہوں۔ کیا میرے اندر اب اتنی سکت ہے کہ میں اپنے کیے کا پھل چکھوں' اگر میری تقدیر میں لکھا ہے تو پھل کھانے کو کب ملے گا۔ دل عجیب سی دھن کا شکار تھا۔ بہرحال ان بیچاروں تک پہنچنا تو بے حد ضروری تھا جو مجھے اپنی محبت کے سہارے یہاں تک لے آئے تھے اور اس کے بعد مزید کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دل سے ریحانہ بیگم کیلئے دعائیں نکلنے لگیں۔ بس ذرا سی بددلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن میں یہ تکلیف بھی ہنسی خوشی برداشت کر لینا چاہتا تھا۔ کسی سے کہنا تو بے مقصد ہی ہوگا۔ کیا فائدہ کسی سے ان باتوں کا تذکرہ کرنے سے آگے بڑھتا رہا' جس راستے سے دوڑتا ہوا اس سمت آیا تھا اسی پر واپس جا رہا تھا' مگر نہ تو مزار اقدس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں نہ کوئی اور ہی روشنی تھی۔ بہت دیر تک چلتا رہا۔ پیر جواب دیتے جا رہے تھے' جسمانی قوتیں ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں لیکن وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا' پھر ایک جگہ رک کر میں نے ہراساں نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ کیا ہو گیا' کہاں نکل آیا ہوں میں' وہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا۔ کیا راستہ بھٹک گیا ہوں۔ ایسے کسی بلند ٹیلے کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جہاں چڑھ کر دور دور کا جائزہ لے سکوں۔ ایسا ہی کیا۔ کافی فاصلے پر ایک پہاڑی ٹیلہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی جانب بڑھ گیا۔ اس پہاڑی ٹیلے پر چڑھنا بھی بڑا مشکل ثابت ہوا۔ ٹھوس پتھر کا پہاڑ تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کہیں کہیں نظر آ جاتے تھے۔ اگر کٹاؤ نہ ہوتے تو پاؤں جمانا بھی مشکل ہو جاتا۔ خاصا بلند تھا' دور سے اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر کسی نہ کسی طرح بلندی پر پہنچ گیا۔ توازن سنبھالا اور دور دور تک دیکھنے لگا اور اس کے بعد نجانے کیوں دل ڈوبنے کا احساس ہوا۔ نگاہ کی حد تک اور آسمان کی بلندیوں تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ہوتا ہے کہ کہیں اگر روشنیاں ہو رہی ہوتی ہیں تو وہاں آسمان پر ایک سفیدی سی آ جاتی ہے جو ان روشنیوں کا پتا دیتی ہے لیکن یہاں تو جدھر نظر اٹھتی آسمان سیاہ ہی نظر آتا۔ آہ! کیا تقدیر پھر کالی ہو گئی ہے' خواجہؒ کے دربار میں آنے کے باوجود معافی نہیں ملی۔ پھل چکھنا ہے۔ اتنا فاصلہ تو طے نہیں کیا تھا۔ بے شک دوڑتا ہوا آیا تھا' پھر یہ سب کچھ نگاہوں سے کیوں اوجھل ہو گیا۔ کتنی دور بھگا دیا مجھے اس مجذوب نے خواجہ کے دربار سے......! ایک بار پھر دل میں گداز پیدا ہوا اور آنسو سسکیوں میں ڈھل گئے۔ پہاڑی ٹیلے کی بلندی پر بیٹھ کر ہی رونے لگا تھا۔ بہت رویا اور رونے سے دل درحقیقت ہلکا ہو گیا۔ پھر نیچے اتر آیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر وہیں پہاڑی ٹیلے کے دامن میں بیٹھ گیا۔ دن کی روشنی میں پھر کوشش کروں گا۔ دن کی روشنی پھوٹنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔ ساری رات ہی گزر گئی تھی۔ یہ بھی تقدیر کا لکھا تھا ورنہ خیمے سے باہر کیوں نکلتا۔ ایک لمحے کی خوشی تھی' دل ہی میں سمائے رکھتا' لیکن ایک طرح سے اچھا بھی ہوا تھا۔ کم از کم غلط فہمیوں سے نکل آیا تھا۔ ابھی میری زندگی کو قرار نہیں ہے' ابھی بیقرار ہوں میں بسر کرنی ہے۔ شاید مجھے زندگی کے آخری لمحے تک معافی نہ مل سکے۔ میری مشکل کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکے۔ سورج نے پہاڑوں سے جھانکا اور

اس کے بعد فضا میں اٹھتا چلا گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اس لق و دق صحرا میں زندگی بھی مشکل ہو جائے گی۔ پانی نہ خوراک' ایک بار پھر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دل تھا کہ سینے کا خول توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ مایوسی کے عالم میں چل پڑا۔ پھل چکھنا ہے مجھے' نجانے کون کون سے پھل چکھنے ہیں۔

سورج بلند ہوتا رہا۔ پتھریلے اور چٹانی راستے پر سفر کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ بہت دور نکل آیا۔ تھوڑی سی بلندی پر تھا نیچے کچھ گھاٹیاں اور گہرائیاں نظر آ رہی تھیں۔ دفعتاً ہی ایک قطار پر نظر پڑی۔ غالباً کچھ لوگ گاڑیوں اور خاص قسم کے رتھوں پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ میں فاصلے کا اندازہ لگانے لگا۔ کوئی قافلہ تھا جو ادھر سے گزر رہا تھا۔ اگر میں اس تک پہنچ جاؤں تو بہت سی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ پانی بھی مل جائے گا اور مزار شریف تک پہنچنے کا راستہ بھی دریافت ہو جائے گا۔ تیزی سے آگے بڑھنے لگا' پھر دوڑنے لگا اور یہ طویل فاصلہ ہزار دقتوں سے طے کیا۔ جو لوگ قافلے کے شریک سفر تھے وہ چہروں سے عجیب و غریب لگتے تھے۔ غالباً یہ خانہ بدوشوں کا کوئی قبیلہ تھا جو نقل مکانی کر کے کہیں جا رہا تھا۔ ان کے چہرے خشک اور خوفناک تھے۔ عورتیں اور مرد سبھی تھے۔ مجھے دیکھ لیا گیا' قافلہ رک گیا۔ میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ جو شخص سب سے پہلے نظر آیا وہ مجھے کڑی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے زبان باہر نکال دی اور اس شخص نے گردن ہلا کر پیچھے رخ کر کے کسی سے کچھ کہا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ سکے تھے' پھر ایک اور قوی ہیکل شخص گاڑی سے اتر کر میرے نزدیک پہنچ گیا اور اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''کون ہے یہ...... کیا ہے؟''

''مسافر ہے سردار۔ پیاس سے مر رہا ہے۔''

''بٹھا لو گاڑی میں سفر کرنا ہے۔'' سردار نے کہا۔ مجھے پانی بھی پیش کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دو آدمیوں نے سہارا دے کر مجھے گاڑی میں بٹھا دیا۔ میں نے پانی پی کر گہری گہری سانسیں لیں۔ میرے ساتھ ہی دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ بیل گاڑیوں پر مشتمل یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ بیلوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بڑا شور پیدا کر رہی تھیں اور یہ شور کانوں کو لگ رہا تھا۔ کسی قدر حواس بحال کر کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو بھائی؟'' اس شخص نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ عجیب سا وحشت ناک انداز تھا۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

اس رویے کے بعد ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی کہ کچھ اور پوچھوں' مگر مجبوری تھی۔ پہلے سے زیادہ عاجزی سے پوچھا۔ ''بس اتنا بتا دو بھائی کہ مزار شریف یہاں سے کتنی دور ہے اور کس طرف ہے؟''

''کون سا مزار؟'' اس شخص نے کہا۔

''وہ تو اجمیر میں ہے۔''

''اور یہ...... یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ تو پہاڑ ہیں۔ کوئی سو کوس دور بوندی ہے۔ کوٹہ بوندی!''

''اور اجمیر شریف......!''

''ارے وہ یہاں کہاں ہے رے! پاگل ہو گیا ہے کیا۔ سینکڑوں کوس ہے یہاں سے۔'' اس نے کہا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے صبر سے میں نے یہ الفاظ سنے تھے۔ پھل چکھنا تھا مجھے۔ خوامخواہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا' خوامخواہ۔ اس کے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی اور آگے بڑھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کہیں اتار دیں گے۔ اس کیلئے تیار تھا۔ سورج سر سے گزر گیا تھا۔ اندھیرے اتر آئے۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ پڑتی رہی تھی' چٹانیں تپ کر سرخ ہو گئی تھیں۔ سورج چھپا تو کچھ امن ہوا۔ خانہ بدوشوں نے مناسب جگہ دیکھ کر ڈیرے ڈال دیئے۔ چولہے جل گئے' دیگچیاں چڑھ گئیں۔ عورتیں کام کرنے لگیں' ننگ دھڑنگ بچے کلیلیں کرنے لگے۔ رات ہوئی تو موٹی موٹی دو روٹیاں اور ایک پیالے میں دال مجھے دی گئی۔ خدا کا شکر ادا

کر کے کھایا' پانی پیا اور صاف جگہ تلاش کر کے دراز ہو گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک آدمی میرے پاس آ گیا۔

''سردار بلاتے ہیں۔'' میں جلدی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ سردار وہی آدمی تھا جس نے مجھے پانی دینے کیلئے کہا تھا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''مسعود!''

''کہاں رہتا ہے؟''

''بہت دور رہتا تھا۔ زیارت کرنے آیا تھا' بھٹک کر ادھر نکل آیا۔''

''جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ جھوٹ تجھے مروا دے گا۔ تو ان لوگوں سے اجمیر کا پتا پوچھ رہا تھا۔''

''جھوٹ نہیں بول رہا سردار! میں خواجہ کے مزار پر تھا۔ راستہ بھول کر ادھر آ نکلا' پھر بہت سفر کیا ہے میں نے!''

''اتنا سب سفر پیدل......! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر اب بول کہاں جائے گا؟''

''کوئی بھی بوندی نظر آ جائے سردار۔ میں وہاں رک جاؤں گا۔''

''کیا کرے گا؟''

''بوندی چھوڑ دینا سردار...... یہاں چھوڑ دیا تو مر جائے گا سسرا۔'' ایک اور شخص نے کہا۔

''چار دن حرام کا کھائے گا' نہیں۔ بوندی لے چلیں گے تجھے مگر چھ جوڑیاں مالش کرنی پڑے گی روز...... تین وقت روٹی' پانی ملے گا۔''

''جو حکم سردار۔'' میں نے کہا۔

''اٹھائی گیری کی تو دونوں ٹانگیں توڑ کر کسی گھاٹی میں پھینک دیں گے سمجھا۔'' سردار آنکھیں نکال کر بولا۔

''جا سو جا......!'' وہ بولا اور میں گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ زمین پر لیٹ کر میں نے سوچا۔ اب کسی غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہئے۔ اسی طرح گزرنی ہے' بس دل کو یہ دھچکے لگتے رہیں گے اور دل تڑپتا رہے گا۔ ان کیفیات کو برداشت کرنا ہے۔ بیج ڈالنے سے پودا اگتا ہے تاکہ وہ پھل دے اور پھل کھانے کا موقع ملے۔ یہ دل ان کیفیات سے بے نیاز کیوں نہیں ہو جاتا' اپنا تماشائی کیوں نہیں بن جاتا میں...... آہ...... یہ قوت کہاں سے پیدا کروں؟ سوتا جاگتا رہا اور ایک بھیانک چیخ سن کر پوری طرح جاگ گیا۔ نسوانی چیخ تھی اور کہیں قریب سے آئی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ لوگ کسی کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ نسوانی چیخیں بہت بھیانک تھیں۔ ان میں وحشت پائی جاتی تھی' پھر بھاگنے والے کو پکڑ لیا گیا۔ میں خود بھی آگے بڑھ کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور یہ منظر دیکھنے لگا۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ سیاہ لباس میں ملبوس' خانہ بدوش عورتوں سے بالکل مختلف......! نرم و نازک نقوش' دبلا پتلا بدن' چمکدار آنکھیں' خانہ بدوشوں نے اسے بری طرح دبوچ رکھا تھا......!

''کیسے نکل گئی یہ؟'' سردار نے دھاڑ کر پوچھا۔

''دانتوں سے رسیاں کھول لیں سردار۔'' کسی نے جواب دیا۔

''حرام خور...... حرام کھانا چھوڑ دو۔ رسی ایسے باندھی جاتی ہے؟''

''وہ رو رہی تھی اور سردار سے کہہ رہی تھی کلائیاں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ میں نے رسی تھوڑی ڈھیلی کر دی تھی۔''

''جمنے۔'' سردار نے کسی کو آواز دی۔

''حکم......؟'' ایک آدمی لپک کر بولا۔

''گوری کی نگرانی کر! چار پانچ دن کی بات ہے۔ مال کھرا کرنا ہے اس کا۔''

''فکر مت کرو حکم' جمنے اسے آنکھوں میں قید رکھے گا۔''

''لے جا حرام خور کو۔'' سردار بولا اور جمنے لڑکی کی کلائی پکڑ کر کھینچتا ہوا لے گیا۔ میں سکتے کے سے عالم میں یہ سب کچھ

دیکھ رہا تھا۔ ایک معصوم لڑکی ان لوگوں کی قید میں ہے۔ نہ جانے کون ہے بیچاری..... اوپر سے سردار کے الفاظ میرے دل میں ہلچل مچا رہے تھے۔ مال کھرا کرنا ہے اس کا' کیا یہ لوگ لڑکیوں کی خرید و فروخت بھی کرتے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کے الفاظ سنے۔

''ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے سردار۔''

''کیا.....؟''

''لڑکی خوبصورت ضرور ہے مگر پاگل ہوگئی ہے۔ خریدار کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔''

''ہاں! یہ بات مجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔''

''کچھ دن انتظار کر لو حکم آگے بن کیسری ہے۔ یہاں رک جائیں اور کچھ دن گزاریں۔ کچھ ٹھیک ہو جائے تو!'' دفعتاً وہ چپ ہوگیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے سردار کو اشارہ کیا اور سردار چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تو یہاں کیا کر رہا ہے۔'' اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

''مم..... میں..... میں!'' میں گھبرا گیا۔

''کیا کر رہا ہے یہاں۔''

''ہنگامہ دیکھنے آ گیا تھا سردار..... کیا ہوگیا۔''

''صورت مٹالے اپنی جہاں مر رہا تھا' وہاں مرتا ہے یا.....''

سردار نے اپنی کمر کا خنجر کھینچ لیا۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے ہٹا اور اپنی جگہ آلیٹا' مگر رخ انہی کی جانب رکھا تھا۔ فوراً ہی احساس ہوگیا کہ میں ان کی نگاہوں میں مشکوک ہو چکا ہوں۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے اور کچھ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ''جہنم میں جائیں جو سوچ رہے ہیں' سوچتے رہیں۔ میں کیا کروں۔ جو ان کا دل چاہے کریں میرے ساتھ۔ ہاں لڑکی کے معاملے کو میں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ پہلے سے پاگل تھی یا اپنے اوپر پڑنے والی افتاد سے دماغی توازن کھو بیٹھی تھی' مگر میں اس کیلئے کیا کر سکتا ہوں۔ اول تو وہ پاگل ہے اور پھر ان کی سخت نگرانی میں۔ یہ لوگ بہت خونخوار معلوم ہوتے تھے۔ اگر لڑکی کیلئے کچھ کیا جائے تو بڑے خطرات مول لینا پڑیں گے۔ خوب سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا چاہئے۔ آدھی رات سے زیادہ جاگتا رہا' پھر نیند آ گئی۔ شاید ہی کچھ دیر سویا ہوں گا کہ کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھ جا.....'' بھور ہوگئی.....'' کسی نے کہا۔

''کیا ہے.....'' میں نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ارے جوڑیاں نا ملے گا کیا..... سردار نے کہا تھا تجھ سے۔ چل اٹھ راجکمار' نہیں تو لات پڑے گی کمر پر۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر مجھے بیلوں کی مالش کرنی پڑی۔ بیلوں کی پنڈلیوں میں تیل لگا کر پوری قوت سے اسے جذب کرنا ہوتا تھا۔ بدن چور چور ہوگیا۔ سورج نکل آیا تھا۔ صبح کو چائے کی قسم کا ایک پیالہ سیال جو دودھ کے بغیر تھا اور کسی خاص گھاس کو ابال کر بنایا گیا تھا اور جوار کی ایک بسکٹ نما روٹی دی گئی جو خوب وزنی تھی۔ اطمینان سے کھائی اور جب سارے بیل جت گئے تو خود بھی اچک کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ قافلہ چل پڑا۔ خدا کا شکر تھا کہ آج آسمان نے تعاون کیا تھا اور کالے بادلوں نے سورج کو چھپا لیا تھا' اس لئے آگ نہ برسی بلکہ دوپہر کے بعد ابر رحمت کے چند چھینٹے آسمان سے زمین پر اتر آئے اور بنجاروں میں زندگی دوڑ گئی۔ عورتوں اور مردوں نے کوئی سمجھ میں نہ آنے والا گیت شروع کر دیا اور طرح طرح کے سوانگ بھرنے لگے۔ یہ چند چھینٹے ہی ان کیلئے عنقا تھے' کیونکہ ان علاقوں میں بارش نایاب چیز تھی' مگر ان کا یہ گیت بھی بڑا بے تکا تھا اور اسی گیت کے دوران وہ پھر نکل بھاگی۔ ایک رتھ نما بیل گاڑی سے کودی تھی اور لڑکھڑاتی ہوئی سنگلاخ زمین پر دوڑ پڑی تھی۔ لینا' پکڑنا مچ گئی اور میں بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔ دن کی روشنی میں اس کا سراپا واضح ہوگیا تھا۔ نازک اندام' دراز قامت' جوانی کی دین سے مالا مال مگر ناقدری اور مصیبت کا شکار' کبھی بار لڑکھڑائی مگر سنبھل گئی۔ بالآخر بنجاروں نے جا لیا اور بری طرح دبوچ گیا' مگر وہ سخت

جدوجہد کر رہی تھی۔ انہیں کاٹ رہی تھی' جھنجھوڑ رہی تھی۔ بمشکل تمام وہ اسے قابو میں کر کے گاڑی تک لائے۔ سردار شاید ذمہ داروں کو برا بھلا کہہ رہا تھا' مگر کیا کہہ رہا تھا' یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ لباس اور حلیے سے وہ کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ جس تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا' اس سے ماڈرن بھی لگتی تھی۔ میرا دل ایک بار پھر اس کیلئے دکھنے لگا۔ کیا کروں' کیا کرنا چاہئے مجھے!

رات ہوگئی' صبح ہوئی اور بیلوں کی خدمت گزاری کرنی پڑی' لیکن یہ اندازہ آسانی سے لگا لیا تھا کہ اب مجھ پر بھرپور نظر رکھی جاتی ہے بلکہ رات کو دو آدمی خاص طور سے میرے پاس لیٹتے تھے تاکہ فرار نہ ہوسکوں۔ صبح کو میں نے اپنے ساتھ بیلوں پر کام کرنے والے ایک خانہ بدوش سے پوچھا۔

''یونڈی کب آئے گا؟''

''چکر بدل لیا ہے حکم نے۔''

''میں سمجھا نہیں......؟''

''آگے کسیری بن ہے' وہاں ڈیرہ پڑے گا' پھر یونڈی جائیں گے۔''

''وہاں ٹھہرو گے؟''

''ہاں!''

''کتنے دن؟''

''ہمیں کیا معلوم...... سردار جانے......'' وہ میرے پے در پے سوالات سے تنگ آ کر بولا۔ پھر کہنے لگا۔ ''یونڈی ابھی دور ہے۔ اکیلے مت بھاگ جانا' راستے میں مر جائے گا۔ پانی ملے گا نہ کھانا اور سردار بگڑ گیا تو ویسے ہی مر جائے گا۔'' وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے صبر وسکون سے یہ سب کچھ سنا تھا۔ میرے کون سے اپنے میرا انتظار کر رہے تھے۔ اچھا ہے کچھ وقت ان کے ساتھ گزر جائے۔ ہوسکتا ہے لڑکی کی مدد کرنے کا کوئی موقع نکل آئے۔ اس رات ہم بن کسیری پہنچ گئے۔ آبشار تھا جو کسی پہاڑ کے درمیان سے نکل پڑا تھا۔ بلندیوں پر شاید اس کی روانی تیز ہو' کیونکہ دور تک بکھرے ہوئے پہاڑی سلسلے سے آیا تھا۔ لیکن زمین پر وہ ایک پہاڑی کے درمیان سے نکلا تھا' تاہم پانی نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ درخت بھی تھے' گھاس بھی۔ خانہ بدوش پانی دیکھ کر دیوانے ہوگئے۔ خود سردار بھی پانی میں جا گھسا تھا۔ عورتیں کپڑے دھونے بیٹھ گئیں۔ اندھیرے ہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ جس جگہ پر لوگ رکے تھے' وہ میدان نما تھی اور یہ میدان بھی بہت وسیع تھا۔ یہاں سے فرار بھی ممکن نہیں تھا۔ انسان کتنی دور جاتا' تھوڑی دیر سے ہی اسے دیکھا جاسکتا تھا۔ یہاں بھی ان لوگوں نے مجھے نگاہوں میں رکھا تھا۔

رات کا کھانا کھایا تھا اور طبیعت پر کسل طاری تھی کہ سردار کچھ لوگوں کے ساتھ قریب آ گیا۔ کچھ خوشگوار موڈ میں تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے تعظیم دی تو وہ خوش ہوگیا۔ ''پانی سے ڈر لگتا ہے تجھے؟''

''نہیں سردار......!''

''نہایا نہیں تو؟''

''سردار کا نمک کھا رہا ہوں۔ اجازت کے بغیر کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''غلام کس نے کہا تجھے؟''

''جس پانی میں سردار تھے' میں اسے کیسے چھو سکتا تھا۔''

''یہ تو اچھا آدمی لگتا ہے۔ جا نہا لے اور پھر ہمارے پاس آ تجھ سے باتیں کریں گے یا پھر صبح نہا لینا۔ یہاں تو ہمارا ڈیرہ پڑے گا!''

''جو حکم سردار......!'' میں نے کہا اور سردار میرے پاس بیٹھ گیا۔ دوسرے آدمی بھی بیٹھ گئے تھے۔

''تو ہے کون...... کہاں رہتا ہے؟''

''زیارت کیلئے آیا تھا سردار...... راستہ بھٹک کر ادھر آ گیا۔'' میں نے بتایا۔
''یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اتنا لمبا فاصلہ کیسے طے کیا تو نے۔ خیر تو جانے تیرا کام' ایک بات بتا۔''
''جی سردار......!''
''پرسوں رات جب لڑکی بھاگی تھی تو ہمارے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ تو نے ہماری باتیں سنی تھیں۔ کیا سمجھا تھا تو ان سے؟''
میں نے سوچنے میں ایک لمحہ ضائع نہ کیا۔ اچھا موقع ملا تھا سردار کا اعتماد حاصل کرنے کا اور میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے...... چنانچہ میں نے فوراً کہا۔
''مجھے علم ہو گیا تھا کہ سردار اسے بیچنا چاہتے ہیں۔'' یہ الفاظ میں نے تانی سادگی سے کہے تھے کہ سردار کو حیرانی ہوئی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں کو دیکھا' پھر مجھ سے بولا۔
''تجھے حیرت نہیں ہوئی اس بات پر؟''
''سردار! میں دوسروں کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ یہ میری عادت ہے۔ میں مشکل میں تھا' راستہ بھٹک کر پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ نہ کھانے کو تھا نہ پینے کو' تم نے مجھ پر احسان کیا اور مجھے نئی زندگی مل گئی۔ تمہاری وجہ سے میں زندہ رہ کر آبادی تک پہنچ جاؤں گا اور پھر وہاں سے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ میں تو تمہارا احسان مانتا ہوں۔ ادھر ادھر کی باتوں میں کیوں پڑوں گا!''
''تو اچھا آدمی ہے۔ یہ ہمارا دھندہ ہے۔ ہم یہی سب کچھ کرتے ہیں اور اگر کوئی ہمارے راستے میں مشکل بنتا ہے تو پھر اس کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔''
''مجھے بوندی پہنچا دو سردار۔ میں تمہارا ہمیشہ احسان مند رہوں گا' باقی مجھے کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔''
''تجھے ایک اور کام کرنا ہے ہمارا؟''
''جو حکم سردار دیں۔''
''آج سے تو جوڑی مالش نہیں کرے گا بلکہ اس چھوکری کا خیال رکھے گا۔ تو بنجارہ نہیں ہے اس لئے وہ تجھ سے نہیں ڈرے گی۔ خوف اور گرمی سے وہ پاگل ہو گئی ہے' کچھ دن پہلے ٹھیک تھی۔ تو اسے تسلی دے۔ اس سے کہہ دے کہ تو اسے اس کے گھر پہنچا دے گا۔ اب کا خوف دور کر سکتا ہے' تیری وجہ سے وہ ٹھیک ہو جائے۔ یہ ضروری کام ہے ورنہ ہم اس کے دام کھرے نہ کر سکیں گے۔''
''میں کوشش کروں گا سردار۔'' میں نے کہا۔
''نیت مت خراب کرنا اس پر۔ تو اچھا آدمی ہے اس لئے کہہ رہا ہوں۔ کوئی گڑبڑ کی تو ہم تجھے خاموشی سے مار دیں گے' کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ کچھ دن لگ جائیں گے بوندی جانے میں' مگر صرف اس لڑکی کی وجہ سے تو جتنی جلدی اس کو سنبھال لے گا اتنی جلدی بوندی پہنچ جائے گا۔
کیا سمجھا؟''
''پورا قبیلہ ہے تمہارا سردار اور میں تنہا ہوں۔ تمہارا احسان مند ہوں۔ تمہارے حکم سے سر بھی نہیں ہلا سکتا۔ مجھے صرف حکم دو کہ مجھے یہ کام کرنا ہے' مارنے کی بات مت کرو۔''
''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے تو صرف تجھے بتایا ہے۔''
''مگر وہ پاگل ہے سردار۔ کیا تسلیاں دینے سے ٹھیک ہو جائے گی۔''
''ڈری ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے خوف سے پاگل ہو گئی ہو۔ زیادہ چالاک لگتی تو نہیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاگل بن رہی ہو۔ یہ بھید تو کھل سکتا ہے خاص طور سے تیرا خیال اسی لئے دل میں آیا ہے تو جو چاہے اس سے کہہ سکتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ تو اسے یہاں سے بھگا لے جائے گا۔ سارے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔ بس اصلیت پتا چل جائے۔ ہو سکتا ہے وہ پاگل نہ

ہو۔"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو سردار!"

چھوڑ دیا۔ اب چلتا ہوں' ارے او جمنے اس کا ڈیرہ لڑکی کے پاس لگا دے۔" سردار نے کہا اور قوی ہیکل جمنے نے گردن ہلا دی۔ لڑکی کو ایک رتھ میں رکھا گیا تھا۔ مجھے اس رتھ کے پاس سونے کی اجازت دے دی گئی اور پھر سارے خانہ بدوش آرام کرنے لگے۔ میں دم سادھے پڑا تھا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہو گیا۔ لڑکی کیلئے میرے دل میں صرف ہمدردی کے جذبات تھے۔ سردار سے میں نے جو باتیں کی تھیں ان میں منافقت تھی۔ میرے دل میں کچھ اور تھا اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے اس کا موقع مل گیا ہے۔ نہ جانے بیچاری کون ہے' نہ جانے ان لوگوں کے چنگل میں کیسے پھنس گئی۔ اگر ان لوگوں نے اسے فروخت کر دیا تو کیا بنے گا اس کا۔ ظاہر ہے انسانوں کو خریدنے والے انسان نہ ہوں گے۔ جان کی بازش لگا دوں گا اس کیلئے۔ جان پر کھیل کر اس کی مدد کروں گا۔ اگر اسی طرح جان جاتی ہے تو جائے۔ نیند آ گئی۔ صبح کو چھوٹے سے تالاب میں نہایا اور نئی زندگی پائی۔ پھر وہی ڈرامہ ہوا۔ لڑکی کسی طرح نکل بھاگی تھی۔ اسے کچھ فاصلے پر دبوچ لیا گیا۔ اسی وقت میں اسے دبوچنے والوں کے سامنے پہنچ گیا اور میں نے گرج کر کہا۔

"چھوڑ دو اسے' چھوڑ دو ورنہ۔" میں نے نزدیک پڑی ہوئی لوہے کی ایک سلاخ اٹھالی۔ سب چونک پڑے۔ انہوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور پھر ان میں سے دو نے خنجر نکال لئے' ایک نے کلہاڑا۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا اور میں سلاخ سنبھال کر سیدھا ہو گیا۔ اسی وقت جمنے دوڑتا ہوا آ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا۔ مجھے دیکھا اور میں نے اسے آنکھ مار دی۔ جمنے سمجھ گیا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"یہ سور ما ہم سے لڑکی کو چھڑا رہا ہے جمنے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اور تم خون خرابہ کرنے پر اتر آئے ہو۔ بے وقوفو' یہ اور لڑکی جائیں گے کہاں۔ کتنی دور جائیں گے۔ ایک کوس بھی نکل گئے تو پتا چل جائے گا۔ ہاتھ جوڑے واپس آ جائیں گے۔ جانے دو...... جانے دو......!"

"سردار کو جواب تو دے گا جمنے۔"

"مجھ سے زبان مت لڑاؤ۔ چلو جاؤ اپنا کام کرو۔" جمنے نے آنکھیں بدل کر کہا اور وہ ہمیں گھورتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔ لڑکی پھر اچھل کر بھاگی تھی اور میں اس کے ساتھ دوڑ پڑا تھا۔ جمنے کا کہنا بھی بالکل ٹھیک تھا' حالانکہ یہ اس نے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ ہم دونوں کافی دور نکل آئے اور وہ لڑکھڑانے لگی' پھر ٹھوکر کھا کر گرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال لیا۔

"چھوڑ دو۔ پیچھے ہٹ جاؤ' مر جاؤں گی مگر......" وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔ اس کے شروع کے الفاظ اس کی ذہنی صحت کا پتا دیتے تھے۔ بعد میں اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا اور اس نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

"اگر تم پاگل نہیں ہو تو مجھ پر غور کرو۔ میں خانہ بدوش نہیں بلکہ ان کا قیدی ہوں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور جان دے کر بھی تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے زمین پر لیٹ جاؤ جیسے بے ہوش ہو گئی ہو۔ وہ دور ہیں لیکن ہم دونوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ہم واقعی اس طرح یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے' وہ دوڑ کر ہمیں پکڑ لیں گے۔ اعتبار کر سکتی ہو مجھ پر۔" اس نے مجھے دیکھا اور دیکھنے کے اس انداز میں ہوش مندی تھی۔

"میرے ہاتھوں سے نکل جاؤ' کچھ دور اور دوڑو اور پھر زمین پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہیں اس طرح دیکھوں گا جیسے تمہاری بے ہوشی سے پریشان ہوں۔ وہ لوگ ہمارے پاس آئیں گے' ہم اس دوران باتیں کریں گے۔"

اس نے ایک دھاڑ ماری اور پھر میرے ہاتھ سے نکل کر دوڑنے لگی۔ کافی فاصلے پر جا کر وہ زمین پر گری اور بے سدھ ہو گئی۔ نیچے لیٹ کر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کے نام پر اگر تمہاری ماں اور بہن ہے تو اس کی لاج کے نام پر مجھے بچا لو۔ میری مدد کرو۔ مجھ سے دھوکہ نہ کرنا۔ دولت مانگو گے تو اتنی دلوا دوں گی کہ جیون بھر دولت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جو کہہ رہی ہوں' وہ پورا کروں گی۔ مجھے

بچالو مجھے ان بھیڑیوں سے بچالو۔"
"لڑکی میں مسلمان ہوں۔ میرے پاس سب سے قیمتی چیز میرا ایمان ہے۔ اپنے ایمان کی قسم تم سے دھوکہ نہیں کروں گا۔ اگر ایسی کوئی بات محسوس کرو تو اسے میری چال سمجھنا۔ ان لوگوں کو شبہ ہے کہ تم پاگل نہیں ہو۔ میں بھی ایک طرح سے ان کا قیدی ہوں اور سردار نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں تمہارے بارے میں معلوم کروں۔ میں نے مصلحتاً ان سے وعدہ کرلیا ہے کہ مجھے تمہارے قریب رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ہم دونوں کو ڈرامہ کرنا پڑے گا۔ مجھ پر میری ان سے کہی ہوئی باتوں پر شک نہ کرنا' انہیں مصلحت سمجھنا۔ وہ لوگ ادھر چل پڑے ہیں' کچھ دیر کے بعد یہاں پہنچ جائیں گے۔"
"آرہے ہیں وہ......؟"
"ہاں......!"
"کتنے فاصلے پر ہیں؟"
"دور ہیں ابھی۔"
"ہم نکل نہیں سکتے؟"
"ناممکن ہے۔ راستے سنگلاخ اور پرخطر ہیں۔ پیدل سفر ممکن نہیں ہوگا۔ موقع ملتے ہی کچھ کریں گے۔" وہ آسمان دیکھتی رہی' پھر بولی۔
"تمہارا نام کیا ہے؟"
"مسعود۔"
"میرا نام کوشلیا ہے۔ ماتا' پتا کوشل کہتے ہیں۔" وہ رکی' ایک سسکی سی لی پھر بولی۔ "کوشل کہتے تھے۔"
"بس اب خاموش ہوکر آنکھیں بند کرلو۔ میں تمہیں کندھے پر ڈال کر آگے بڑھتا ہوں۔" اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ بڑے نرم و نازک اور ہلکے پھلکے بدن کی مالک تھی۔ میں نے اسے آسانی سے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور خانہ بدوشوں کی طرف چلنے لگا۔ ابھی ان کا فاصلہ کافی تھا۔ لڑکی نے میرے کندھے پر جھولتے ہوئے کہا۔
"تمہیں مشکل ہورہی ہوگی۔"
"نہیں! تم بہت ہلکی ہو۔"
"تم ان کے قیدی کیسے بن گئے؟"
"تمہاری وجہ سے......"
"میری وجہ سے......؟"
"ہاں۔ میں بھٹکتا ہوا ان کی طرف آنکلا تھا۔ وہ بوندی نامی کسی بستی جارہے ہیں۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ مجھے بوندی چھوڑ دیں گے لیکن میں نے تمہارے بارے میں ان کی باتیں سن لیں اور وہ میری طرف سے مشکوک ہوگئے۔"
"میرے بارے میں؟" لڑکی نے کہنا چاہا' مگر میں نے آواز دبا کر اسے خاموش کردیا اور بتایا کہ وہ قریب آگئے ہیں۔ جمنے آگے آگے تھا۔
"ہاں چھوٹے سردار۔" میں نے خوشامدی لہجے میں کہا۔
"چھوٹے سردار۔" جمنے کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی نے کہا اور ہنس پڑا۔ ایک اور شخص بھی مسکرایا تھا۔ وہ شاید جمنے کا مذاق اڑا رہے تھے۔
"دانت کیوں نکال رہا ہے۔ موت آئی ہے۔ چلو اسے سنبھالو اور لے چلو۔" جمنے نے خونخوار لہجے میں کہا اور وہ دونوں جو ہنسے تھے' منہ بنائے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ دونوں نے لڑکی کو سنبھال لیا اور واپس چل پڑے۔ جمنے میرے ساتھ چل پڑا۔
"کچھ اندازہ ہوا بابو؟" اس نے کہا۔

''ابھی نہیں چھوٹے سردار۔''
''ہاں ہم دیکھ رہے تھے۔ بھاگ دوڑ ہی رہی۔''
''میں نے اس پر اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ دو چار بار ملوں گا تو مانوس ہو جائے گی۔''
''جتنی جلدی کام ہو جائے اچھا ہے۔ تمہیں بھی آزادی مل جائے گی۔''
''میں پوری کوشش کروں گا چھوٹے سردار۔''
''اونہیں بابا۔ میں چھوٹا سردار نہیں ہوں۔ اب یہ مت کہنا مجھے یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ پٹیں گے کتے میرے ہاتھوں سے۔'' ہم واپس چلتے رہے۔ کچھ دور چل کر وہ دونوں رک گئے اور جمنے کو گھورتے ہوئے بولے۔
''دوسرے بھی ہیں' فاصلہ بہت ہے' اب ان سے اٹھواؤ۔''
''ارے واہ سور ماؤ دھڑی بھر کی چھوکری کو اٹھاتے ہوئے کمر ٹوٹ رہی ہے۔ دانت خوب نکالتے ہو' چلتے رہو۔'' بالآخر کچھ دیر کے بعد سب واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ سردار تشویش بھری نظروں سے بے ہوش لڑکی کو دیکھ رہا تھا' پھر اس نے کہا۔
''یہ بار بار بھاگ کیسے نکلتی ہے آخر۔ کس کر ڈال دوسری کو۔ چوٹ چپینٹ لگ گئی تو اور بری ہوگی۔''
''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں سردار۔'' میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''آپ نے میری ڈیوٹی لگا دی ہے۔ میں جان سے زیادہ اس کی حفاظت کروں گا۔ اسے باندھیں نہیں۔ میں اس کے قریب رہوں گا۔ اس تبدیلی پر وہ چونکے گی اور مجھے اپنا کام کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔''
''سردار یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جمنے نے کہا۔

✦✤✦✤✦

''مصیبت بن گئی ہے سسری! جمنے میں تو سوچ رہا ہوں بونڈی چلیں، موریا لعل سے بات کریں، اس سے مال کھرا کر لیں۔''
''موریا لعل سسرا ایک نمبر کا چور ہے سردار۔ الٹا سیدھا مول لگائے گا۔ سو سو کیڑے نکالے گا۔ رسا چند جوہری ہے۔ ہیروں کا قدردان ہے صحیح بھاؤ وہ دے گا۔'' جمنے نے کہا۔
''پگلی کو خریدنے سے وہ بھی بھاگے گا۔''
''دو چار دن اسے موقع دے دو سردار، بھروسے کا آدمی ہے۔'' جمنے کو مجھ پر بھروسہ ہو گیا تھا۔ چھوٹے سردار جو کہا تھا میں نے اسے۔ اس لفظ نے اس پر نشہ طاری کر دیا تھا۔ سردار خاموش ہو گیا۔ جمنے بولا۔
''دیکھو ہیرا، یہ بھاگ گئی تو تیری گردن ماری جائے گی، تو ذمہ داری لے رہا ہے اس کی۔''
''پوری...... پوری...... سردار کا یہ کام نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ اسے کھلے میں رکھو۔ پیر میں زنجیر باندھ کر کسی درخت سے باندھ دو۔ میں اس کے پاس رہوں گا۔'' میری بات مان لی گئی۔ اسے بے ہوشی ہی کے عالم میں گھاس پر لٹا دیا گیا اور پاؤں میں زنجیر باندھ دی گئی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے پانی منگوایا اور سب وہاں سے چلے گئے۔
''پانی پی لینا میرے ہاتھ سے۔'' میں نے سرگوشی کی۔ کوشل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی آیا تو میں نے اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ جمنے نے مسکرا کر آنکھ دبائی اور پھر وہاں سے چلا گیا۔
''کالج کے ڈراموں میں کئی بار میں نے پاگل لڑکی کا رول ادا کیا ہے، آج وہ مہارت کام آ رہی ہے۔'' اس کا لہجہ یاس میں ڈوبا ہوا تھا۔
''خدا پر یقین رکھو، تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔''
''بھگوان کرے۔ نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہوگا۔ ماتا، پتا کی اکیلی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''
''ریاست اَلور کی! اَلور میں ہمارے نیل کے کارخانے ہیں۔ پورے ہندوستان میں ہمارے کارخانوں کی نیل بکتی ہے۔ تم نے شاید نیل کنٹھ کمپنی کا نام سنا ہو۔''
''ان کے قبضے میں کیسے آگئیں؟''
''الور کے 'دھرم سماج' کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کی ٹیم کے ساتھ رجنا پور کے تاریخی کھنڈرات دیکھنے آئی تھی۔ یہ بنجارے انہی کھنڈرات کے پاس خیمے لگائے ہوئے تھے۔ پوری ٹیم کے ساتھ خانہ بدوشوں کا طرزِ زندگی دیکھنے ان کی آبادی میں گئی۔ ان کی ایک عورت نے مجھے پتھر کے بنے ہوئے دو کڑے پیش کیے۔ مجھے خوشی ہوئی۔ دوسرے دن میں نے ساتھی لڑکیوں سے کہا کہ دوبارہ بنجاروں کی آبادی چلیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور میں اکیلی ہی چلی آئی۔ اس عورت کے لیے میں جوابی تحفہ لائی تھی۔ یہ اپنے خیمے اٹھا کر روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کی بیل گاڑیوں کے درمیان میں اس عورت کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی کہ ان میں سے کسی نے پیچھے سے کوئی تیز بو والی چیز ناک پر رکھ دی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ بس اس کے بعد سے اس کے قبضے میں ہوں۔ یہ خانہ بدوش آبادیوں میں جاتے ہیں، کھیل تماشے کرتے ہیں۔ راتوں کو چوریاں کرتے ہیں، بدبخت بچوں اور لڑکیوں کو اغوا بھی کر لیتے ہیں اور بردہ فروشی کرتے ہیں۔ یہ مجھے بھی بیچنا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں کتنے دن گزر گئے ہیں مجھے ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے، میں نے اپنے بچاؤ کے لیے پاگل پن کا ڈھونگ رچایا اور...... اور۔''
وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ کافی دیر خاموش رہی۔ پھر اچانک بے چین ہو کر رونے لگی۔
''تم...... تم کیا کر سکو گے، بولو کیا کر سکو گے اکیلے؟ مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ بہت کچھ سوچا تھا میں نے اپنی زندگی کے بارے میں لیکن اگر...... اگر کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی، خودکشی کر لوں گی میں! کرنی پڑے گی۔''
''میں تم سے حوصلہ رکھنے کی درخواست کرتا ہوں کوشل۔ ہمت پست ہوئی تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔''
''ہم ایسے بھی کیا کر سکتے ہیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس شام میں نے جمنے سے کہا۔
''چھوٹے سردار۔ میرا دعویٰ ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔''
''او یار! مجھے چھوٹے سردار نہ کہا کر۔'' جمنے بولا۔
''میرا دل چاہتا ہے تمہیں سردار کہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم سردار لگتے ہو۔ پھر اس وقت تو کوئی نہیں ہے ہمارے پاس۔''
''تو نے یہ دعویٰ کیسے کیا ہے؟''
''اس کی باتوں سے۔ وہ مجھے غور سے دیکھتی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے' مگر پھر خاموش ہو جاتی ہے۔''
''ایک بار اس کا ثبوت مل جائے، سارا کام ٹھیک ہو جائے۔ فٹافٹ اس کا کریا کرم کر دیں ہم۔ تیری بھی جان چھوٹے۔''
''مجھ پر اعتبار کر لو چھوٹے سردار۔ میں اس کی زبان کھلوا لوں گا۔''
''کیسے؟''
''ہمیں بھاگ نکلنے کا موقع دو۔ سنو چھوٹے سردار ایک بیل گاڑی دو مجھے، میں اس سے کہوں گا کہ میں اسے تمہارے چنگل سے نکال رہا ہوں، میں اسے لے کر بھاگوں، راستے میں اس کے دماغ میں طوفان ہوگا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ کہاں جائے گی اور وہ بول پڑے گی۔''
''یہ کیا ترکیب ہوئی؟''
''خود غور کر لوں۔ اس پر ہیجان طاری ہو جائے گا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرے گی۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ میں اس سے مخلص ہوں۔ بس زبان کھلی، اس کا کام ہوا۔''
''سردار نہیں مانے گا۔''

''حرج کیا ہے، کتنی دور جائیں گے ہم۔ دوسری گاڑیاں بھی تیار رکھنا۔ دیر تھوڑی لگے گی۔ بعد میں اسے واپس لے آئیں گے پھر سسری کیسے کہے گا کہ پاگل ہے۔'' میں نے کہا اور بات جمنے کی سمجھ میں آ گئی۔

''سردار سے بات کرلوں؟''

''ضرور کرلو۔'' جمنے نے آمادگی ظاہر کر دی۔ سردار نے بھی منظوری دے دی تھی۔ آج ہی رات یہ کام کرنا تھا۔ مجھے پورا موقع دیا گیا۔ میں نے دو طاقتور بیلوں کا انتخاب کرلیا۔ رات کو بارہ بجے میں نے انہیں گاڑی میں جوتا۔ چار گاڑیاں میں نے تیار دیکھی تھیں۔ اس کے بعد میں جمنے کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔

''تیار ہو چھوٹے سردار؟''

''ہاں!'' وہ آہستہ سے بولا۔ اس کی آنکھوں سے شبہ بھی جھانک رہا تھا اور یقین بھی دہری کیفیت کا شکار تھا۔ سردار بھی قریب ہی موجود تھا۔ پھر میں نے کوشل کو جھنجوڑ کر جگایا۔

''میں تجھے ان کے چنگل سے نکال کر لے جا رہا ہوں لڑکی، آ میرے ساتھ آ۔'' میں اس کا بازو پکڑ کر بیل گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''زبان سے ایک لفظ نہ بولنا کوشل، مضبوطی سے خود کو گاڑی میں بٹھائے رکھنا۔ میں خدا کا نام لیتا ہوں، تم بھگوان کو پکارو کہ وہ ہماری مدد کرے۔ سنبھل گئیں؟''

''ہاں۔'' اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ کانپ میں بھی رہا تھا مگر ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ ایک خوفناک قدم اٹھایا تھا میں نے......!

بنجارے میری ایک ایک حرکت سے واقف تھے۔ ان کی دانست میں، میں ان کے لیے کام کر رہا تھا اور یہ معلوم کر رہا تھا کہ کوشل صحیح الدماغ ہے یا نہیں۔ لیکن میں اس طرح کوشل کو ان کے چنگل سے نکال کر لے جا رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوں گے اور ہماری باتیں سن رہے ہوں گے۔ انہوں نے بیل گاڑیاں بھی تیار رکھی تھیں۔

''کیا تو مجھے اپنا پتا بتا سکتی ہے؟ اطمینان رکھ، میں تیرا ہمدرد ہوں، میں تجھے ان خانہ بدوشوں کے ڈیرے سے فرار کرا رہا ہوں۔ دیکھ لے سارے انتظامات مکمل ہیں، اب تو مجھے جلدی سے اپنا پتا بتا دے!'' کوشل پروگرام کے مطابق خاموش رہی۔

میں نے پھر کہا۔ ''اگر تو نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا تو پھر میں تیری مدد کر کے کیا کروں گا۔ اچھا چل راستے میں تو مجھے اپنے بارے میں بتا دینا۔'' میں نے بیل گاڑی سست روی سے آگے بڑھا دی۔ اس کی رفتار بہت سست تھی اور کوشل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اسی طرح بیلوں کو ہانکتا ہوا خاصی دُور نکل آیا۔ تب میں نے عقب میں دو چار گاڑیاں آتے دیکھی تھیں۔ زندگی موت کا معاملہ تھا۔ بنجارے دھوکے میں آ گئے تھے' لیکن جیسے ہی میں نے بیل دوڑائے انہیں احساس ہو جائے گا۔ وہ خونی ہو جائیں گے اور اس کے بعد زندگی موت کا ہی معرکہ ہوگا۔

''وہ لوگ پیچھے آ رہے ہیں......؟'' کوشل نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے۔ تم خود کو مضبوطی سے جما لو۔ تیار ہو؟''

''ہاں!'' اس نے کہاں اور میں نے بیلوں کو پہلا چابک رسید کر دیا۔ بیل اچھل پڑے۔ انہوں نے رفتار تیز کر دی۔ دوسرے اور تیسرے چابک پر وہ جھنجلا گئے اور پھر وہ سرپٹ ہو گئے۔ میرے لیے اب ایک ہی راستہ تھا وہ یہ کہ بیلوں کو جتنی تیز دوڑا سکتا ہوں دوڑاؤں، زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ وہ حقیقت حال سمجھ جائیں گے۔ مگر بالکل ہی دیر نہ لگی اچانک ہی نہوں نے خاص قسم کے ڈبے بجانے شروع کر دیئے جن کی آوازوں سے خوفزدہ ہو کر بیل تیز دوڑتے ہیں اور زمین پر پیچھے نے والی بیل گاڑیوں کی دھمک گونجنے لگی۔ اب تو میں بھی بیلوں پر پل پڑا۔ یہ مظلوم جانور سانٹوں کی تکلیف سے بے قابو ہو کر اپنی بساط سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگے مگر مجبوری تھی۔ خوفناک دوڑ شروع ہو گئی۔ وہ لوگ بھی دیوانے ہو گئے تھے اور بھرپور تعاقب کر رہے تھے' مگر میں نے فاصلہ کم نہیں ہونے دیا۔ میرے دانت بھنچے ہوئے تھے اور ہاتھ بیلوں کو نے کی مشین بنے ہوئے تھے، کوشل نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور مضبوطی سے بیل گاڑی کے دونوں سرے پکڑے ہوئے

تھے۔ بار بار اس کے منہ سے چیخیں نکل جاتی تھیں مگر بھنچی ہوئی آواز میں، خوف کے مارے اس کی بھی بری حالت تھی،۔ بن کسیری کا علاقہ پیچھے رہ گیا اور اب وہی سنگلاخ چٹانی میدان تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا، کبھی بادلوں کے ٹکڑے اس پر سے گزرتے تو تاریکی پھیل جاتی۔ بدن پسینے سے بری طرح بھیگ رہا تھا، ذہنی حالت سنبھالے نہ سنبھالی جا رہی تھی۔ بیل گاڑی کے پہیے کسی اونچے پتھر پر چڑھتے تو زوردار تڑاخا ہوتا اور ایسا جھٹکا لگتا کہ سنبھلنا مشکل ہو جاتا مگر بس دھن تھی، لگن تھی اور عمل جاری تھا۔ تعاقب کرنے والا جینے تھا جو ہمیں فرار کرا کر خود بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اگر وہ ہمیں حاصل کرنے میں ناکام رہتا تو نہ جانے سردار سے کیا سزا پاتا۔ اس لیے جب بھی پیچھے نظر جاتی وہ اسی طوفانی انداز میں بیل دوڑتا نظر آتا۔

وہ لوگ خوب شور مچا رہے تھے جس کی آوازیں ابھر رہی تھیں، پھر اچانک بیل چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ یہاں ان کی رفتار سست ہو گئی اور پیچھے آنے والی گاڑیاں قریب آنے لگیں، میں نے پھر بیلوں پر پوری قوت سے سانٹے برسانے شروع کر دیے۔ انہوں نے دُمیں اکڑا لیں اور یہ چڑھائی عبور کرنے لگے، ان کی کوشش سے فاصلہ پھر بڑھ گیا مگر اب وہ حواس کھوتے جا رہے تھے اور مجھے خطرہ ہو گیا تھا کہ وہ بیٹھ جائیں گے۔ مگر چڑھائی ختم ہو گئی اور ناہموار میدان آ گیا جس میں اونچی اونچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں،۔ یہ اس سفر کی سب سے خطرناک جگہ تھی۔ ابھی میں اس خدشے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک بیل گاڑی کا ایک پہیہ کوئی اڑھائی فٹ اونچا اُٹھ گیا، میں کوئی چھ فٹ اچھل کر نیچے گرا مگر اس سے تو جو چوٹ لگی وہ اپنی جگہ تھی اصل چوٹ اس وقت لگی جب کوشل میرے اوپر گری۔ پسلیاں بول گئی تھیں مگر بہتر ہوا تھا اگر وہ اس پتھریلی زمین پر گرتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ جس جگہ ہم گرے تھے وہاں ڈھلان تھی چنانچہ ہم دونوں لڑھکتے ہوئے کئی فٹ دُور چلے گئے۔ بیل البتہ گاڑی کو پتھر سے آگے گزار لے گئے تھے۔ ایک اور پتھر نے ہمیں مزید لڑھکنے سے روکا تھا۔ نیچے سے مسلسل ڈبہ کھڑکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پتہ چل رہا تھا کہ دوسری گاڑیاں بلندی عبور کر رہی ہیں۔ ہم دونوں سہمے ہوئے ساکت پڑے تھے۔ بیل گاڑی شاید آگے جا کر ڈھلان میں اتر گئی تھی کیونکہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ چاروں گاڑیاں طوفانی انداز میں سطح جگہ نمودار ہوئیں اور اسی رفتار سے دوڑتی آگے بڑھ گئیں۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ہی ہمیں چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ بہت سے لوگ بیک وقت چیخے تھے۔ نہ جانے کیوں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اب ماحول پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے چونک کر کوشل کو آواز دی۔ ''کوشل۔''

''ہوں!'' وہ آہستہ سے بولی۔

''زخمی تو نہیں ہو؟''

''نہیں!''

''وہ شاید دُور نکل گئے۔''

''ایسا ہی لگتا ہے۔''

''تاریکی کی وجہ سے انہیں یہ اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ ہم گاڑی سے نیچے گر پڑے ہیں۔''

''یقیناً وہ اسی گاڑی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم نے وہ انوکھی چیز دیکھی؟'' کوشل نے کہا۔

''نہیں دیکھی۔''

''اس کے گرنے کی آواز بھی نہیں سنی؟''

''نہیں، کہاں..... کیا چیز تھی؟'' میں نے سوال کیا اور کوشل خاموش ہو گئی۔

''کیا چیز تھی کوشل؟'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''تم مسلمان لوگ اس باتوں کو نہیں مانتے۔''

''وہ مٹھ تھی۔ بچپن میں، میں نے ایسی ہی ایک ہانڈی دیکھی تھی جو پرواز کرتے ہوئے آئی تھی۔ کرم چند بنئے کے گھر گری تھی اور کرم چند کا پورا گھرانہ ختم ہو گیا تھا۔''

''جادو کا میزائل؟'' میں نے کہا۔
''یہی سمجھ لو۔ مگر ہم لوگ اسے مانتے ہیں اور اس کی تباہ کاری کو تسلیم کرتے ہیں۔'' کوشل نے کہا۔
''مگر یہاں وہ کہاں ہے؟''
''وہ دیکھو ادھر اشارے کی سمت!'' میں نے اسے فضا میں دُور سے آتے ہوئے دیکھا تھا اور اسی جگہ وہ زمین پر گری تھی۔ میں نے کوشل کے اشارے پر اسی طرح دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ تب میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
''مگر اس کے یہاں آن کر گرنے کا کیا مطلب ہے؟''
''یہ بنجارے بڑے پُراسرار ہوتے ہیں، یقیناً ان میں کوئی کالے جادو کا ماہر ہوگا، اس نے ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر ہانڈی ہماری طرف بھیجی ہوگی۔'' کوشل نے کہا۔
اور میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اتنی جلدی یہ عمل ممکن تو نہیں تھا۔ پھر وہ ہمارا تعاقب تو کر رہے تھے، یہ ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ سکوت کچھ زیادہ طویل ہو گیا۔ بنجاروں کے ڈیرے سے میلوں دُور نکل آئے تھے۔ اس لیے وہاں کی تو کوئی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی مگر یہ گاڑیاں کتنی دُور نکل گئیں۔ ہماری گاڑی کے بیل ابھی تک ہاتھ نہیں آئے۔ میں اُٹھ گیا۔ جسم کے کچھ ''حصے'' چیخ رہے تھے۔ پتھروں پر گرنے سے چوٹیں آئی تھیں لیکن کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ کوشل بھی فوراً کھڑی ہوگئی۔
''تم ٹھیک ہو؟''
''ہاں مگر تمہارے ضرور چوٹیں آئی ہوں گی۔'' اس نے ہمدردی سے کہا۔
''یہاں سے چلو، وہ واپس پلٹیں گے۔''
''اور انہیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ ہم گاڑی میں نہیں ہیں۔ وہ ہمیں اسی راستے سے تلاش کریں گے۔'' کوشل بولی۔
میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف چل پڑا۔ اب پوری جدوجہد پیدل ہی کرنی تھی۔ کچھ دُور چل کر کوشل رُک گئی۔
''کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں۔ دیکھو یہ مٹھ کے ٹکڑے پڑے ہیں۔'' اس نے اشارہ کیا۔ ٹوٹی ہانڈی میں نے بھی دیکھی اس کے اردگرد بھی کئی چیزیں پڑی تھیں۔ سرخ سیندور، ہلدی، کپڑے کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں۔ زمین پر ثابت مونگ بکھری ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا الم غلم تھا۔
''نہیں آگے بڑھو۔'' کوشل نے اچانک مجھے پیچھے گھسیٹ لیا اور میں رُک گیا۔ ''اسے چھونا خطرناک ہوتا ہے۔ دورانِ پرواز اگر یہ کسی کے سر سے گزر جائے تو وہ بھی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ آؤ آگے بڑھیں یہاں سے۔'' میں کوشل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھے تمام چیزیوں سے اجنبی سمجھ رہی تھی۔ بے چاری کیا جانتی تھی کہ میں اب ان تمام غلاظتوں سے کتنا واقف ہو چکا ہوں۔ ہم لوگ کوئی بیس قدم آگے بڑھے تھے کہ اچانک کوشل کے حلق سے ایک دہشت بھری آواز نکل گئی، اس نے پوری قوت سے مجھے بھینچ لیا۔ میری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہمارے بیلوں نے کافی چڑھائی چڑھی تھی۔ اس کے بعد ہم نئی بلندیوں تک آئے تھے، پھر بیل گاڑی کا پہیہ پتھر پر چڑھ جانے کی وجہ سے گر پڑے تھے اور بیل گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر آگے اچانک ایک کٹاؤ آ گیا تھا۔ دُور سے احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ آگے راستہ نہیں ہے، میدان دُور تک پھیلا ہوا لگتا تھا مگر جو نیچے دیکھا تو سانس رُک گیا۔ کوئی دو سو فٹ گہرائی تھی اور نیچے نوکیلی چٹانیں منہ اٹھائے بلندیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب سے بھیانک وہ منظر تھا جسے ہم کھلی چاندنی میں بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے بیل گاڑی سمیت ساری گاڑیاں نیچے چور چور [illegible] تھیں۔ ان کے درمیان تعاقب کرنے والے تمام بنجارے خون میں ڈوبے بے سدھ پڑے تھے۔ کچھ زندہ بچ جانے [illegible] اپنے بچے کھچے بدن کو چٹانوں میں گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ ان کے منہ سے نکلنے والی اذیت بھری آوازیں بہت مدھم ہو [illegible] رہی تھیں۔ اب اندازہ ہوا تھا کہ ہماری بیل گاڑی اچانک دُور چل کر غائب کیوں ہوگئی تھی۔ ہم یوں سمجھے تھے کہ

آگے ڈھلان ہیں اور سارے بنجاروں کی گاڑیاں ہماری گاڑی کے تعاقب میں ڈھلان میں اُتر گئی ہیں۔ کوشل بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ سب، یہ سب مر گئے ہوں گے۔''

''شاید!'' میں آہستہ سے بولا۔

''ضرور یہ سب مٹھ کے نیچے سے گزر گئے ہوں گے!''

''اور ہم؟''

''ہم بچ گئے۔''

''اب کیا کریں؟''

''آگے چلو۔ میری ہمت بڑھ گئی ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہم زندہ بھی بچ جائیں گے اور...... اور میں ضرور اپنے گھر پہنچ جاؤں گی!'' میں نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے پھر مجھے زور سے پکڑ لیا۔ یہ...... یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تم نے ہی تو کہا تھا آگے چلو'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے، میری جان نکل گئی ہے۔ اِدھر سے آگے چلو، ہوسکتا ہے دوسرے بنجارے بھی چل پڑے ہوں۔ ہمیں کہیں سے نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ اوہ، دیکھو وہ کیا ہے؟''

''پھر کچھ نظر آ گیا؟'' میں نے کہا۔

''دیکھو تو۔ وہ دو لکیریں۔ اوہ بھگوان۔ وہ تو...... وہ تو ریل کی پٹریاں ہیں۔ دیکھو وہ ریل کی پٹریاں ہی ہیں۔'' میں نے بھی گہرائیوں میں چمکتی ہوئی ان پٹریوں کو دیکھ لیا۔ پہاڑ کے دامن سے کوئی نصف فرلانگ دُور یہ پٹریاں نظر آ رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور پھر دُور تک نگاہیں دوڑانے لگا۔ بہت فاصلے پر ایک ایسی جگہ نظر آئی جہاں سے نیچے اترنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ کوشل نے بھی ادھر جانے پر اتفاق کیا اور ہم چل پڑے۔ بنجاروں کا خوف تھا، تھکن تھی۔ جو حادثہ دیکھا تھا اس کا اثر تھا لیکن زندگی بچانے کی آرزو بھی تھی۔ چنانچہ تمام صعوبتوں کو بھول کر چلتے رہے اور پھر نئی ڈھلانوں کو عبور کر کے نیچے پہنچ گئے۔ یہ خوف ختم ہو گیا کہ اب بنجارے ہمارا تعاقب کریں گے۔ پٹریوں تک کا فاصلہ بھی طے ہو گیا اور ہم ان کے درمیان چلتے رہے۔

''کیا اس طرح ہم سفر کر کے کسی جگہ پہنچ سکتے ہیں؟'' کوشل بولی۔

''اللہ مالک ہے!''

''میں بہت تھک گئی ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے؟''

''بیٹھ جاؤں کچھ دیر؟'' میں نے گردن ہلا دی۔ ہم ریلوے لائن سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد کوشل لیٹ گئی، میں البتہ بیٹھا رہا۔ چاند اپنا سفر طے کر رہا تھا، کوشل نیم غنودہ ہو گئی تھی۔ میری پلکیں جڑنے لگی تھیں لیکن پھر ریل کی چنگھاڑ ابھری اور کوشل چیخ پڑی۔

''کیا ہو گیا۔ کیا وہ آ گئے؟'' اس نے دہشت سے پوچھا۔

''کون؟''

''بنجارے!''

''نہیں کوشل۔ ریل آ رہی ہے جاگو۔ اٹھ جاؤ'' میں نے کہا اور وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نیم خوابی کی کیفیت سے جاگی تھی، چکرائی چکرائی سی نظر آ رہی تھی۔ آنکھیں پھاڑنے لگی پھر اس نے بھی دُور سے اس تیز روشنی کو دیکھ لیا جو کسی پہاڑی سلسلے کے درمیان سے نکل رہی تھی۔ اس سے پہلے یہ پہاڑی سلسلہ ہماری نگاہوں میں نہیں آیا تھا۔ اب انجن کی روشنی کے ساتھ ساتھ اسے دیکھا تھا۔ میں کوشل کا ہاتھ پکڑ کر پٹری کے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور زور سے

زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ ریل آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھی اور پھر کچھ دُور جا کر وہ رُک گئی۔ میرے حلق سے خوشی کی آواز نکل گئی تھی۔ غالباً انجن ڈرائیور نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ایک کمپارٹمنٹ ہمارے سامنے ہی تھا۔ اندر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ غالباً ریل کے تمام مسافر سو رہے تھے۔ انتظار کرنا بے مقصد تھا۔ میں نے جلدی سے پہلے کوشل کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا اور پھر خود بھی ریل کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا، بہت ہی کم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بس کوئی دس بارہ افراد ہوں گے باقی پورا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ کوشل کو ایک سیٹ پر بٹھا کر میں خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پیشانی پر دونوں ہاتھ رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اب ہمارے بارے میں چھان بین کے لیے لوگ آئیں گے۔ معلومات کی جائیں گی کہ ہم کون ہیں اور یہاں کیوں بھٹک رہے ہیں۔ کیا جواب دوں گا میں، یہی سوچ رہا تھا لیکن پانچ منٹ، دس منٹ اور آدھا گھنٹہ گزر گیا کسی نے رُخ نہیں کیا تھا ہماری طرف نجانے کیوں ایسا ہوا تھا۔ معلوم تو کرنا چاہیے تھا اور پھر ریل کے مسلسل رُکے رہنے کی کیا وجہ تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ریل وہاں رُکی رہی اور میں شدید بے چینی کا شکار ہو کر کھڑکی سے بار بار باہر جھانکتا رہا، پھر کسی سوتے ہوئے مسافر نے گردن اٹھا کر کہا۔

''ارے یہ پنکھے کیوں بند کر دیئے، گرمی ہو رہی ہے۔'' اور اس کے بعد وہ کروٹ بدل کر سو گیا، کچھ دیر کے بعد ریل نے سیٹی دی اور پھر چل پڑی۔ کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی تھی، نجانے کیا ہوا تھا۔ کم از کم ریلوے کے ملازمین کو ہمارے ڈبے میں آ کر معلومات تو حاصل کرنی چاہئیں تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا تھا، کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ ریل آہستہ آہستہ کھسکنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کی رفتار تیز ہو گئی لیکن تقریباً بیس منٹ گزر جانے کے بعد وہ پھر رُک گئی۔ اس بار ہم نے روشنیاں بھی دیکھی تھیں۔ کوئی اسٹیشن آ گیا تھا۔ یہاں سے ایک دوسری ریل کراس کر کے مخالف سمت میں گئی اور اب بات سمجھ میں آ گئی کہ درحقیقت ریل ہماری وجہ سے نہیں رُکی تھی بلکہ شاید انجن سے ہمیں دیکھا ہی نہیں گیا تھا۔ کوئی کراسنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ریل کو اس ویرانے میں رُکنا پڑا تھا۔ یہ بھی تقدیر ہی تھی ورنہ ہم ہاتھ ہلاتے رہ جاتے اور کام نہ بن پاتا۔ کوشل سے بات ہوئی تو اس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اور یہی الفاظ کہے جو میرے ذہن میں تھے۔ یعنی یہ کہ اگر ہماری وجہ سے ریل رُکی ہوتی تو ریلوے کا کوئی نہ کوئی ملازم آ کر ہم سے ہمارے بارے میں معلومات ضرور حاصل کرتا۔ بہرطور اس اتفاق کو بھی تقدیر ہی سمجھ لیا، کوشل کہنے لگی۔

''سچی بات یہ ہے کہ تقدیر مسلسل ساتھ دے رہی ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد ریل اس اسٹیشن سے بھی آگے بڑھ گئی۔ کوئی دو تین منٹ یہاں رُکی تھی، لیکن تقدیر ساتھ دے رہی تھی البتہ رکاوٹیں بھی آتی جارہی تھیں کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ریلوے بابو صاحب ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے، انہیں دیکھ کر جان ہی نکل گئی کہ اب وہ ٹکٹ طلب کریں گے اور مصیبت آ جائے گی۔ اتنی جلدی امکان نہیں تھا لیکن ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔ بابو صاحب سوتے ہوئے لوگوں کو جگا جگا کر ٹکٹ طلب کر رہے تھے۔ بڑے اکھڑ مزاج آدمی تھے۔ مسافروں کے ساتھ ان کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ بہرطور سارے مسافر ٹکٹ دکھا رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ کوشل دَم سادھ کر خاموش بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے آثار تھے۔ وہی ہوا ریلوے بابو ہمارے پاس بھی آ پہنچے۔

''ٹکٹ۔'' انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا، کوشل نے اس وقت جرأت سے کام لیا اور آہستہ سے بولی۔

''ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔''

''کیا تم دونوں ساتھ ہو؟'' بابو صاحب نے مجھے اور کوشل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی۔''

''مگر ٹکٹ کیوں نہیں لیا تم نے، کہاں سے سوار ہوئے ہو؟''

''کیا بتائیں کہاں سے سوار ہوئے ہیں۔''

''کیوں کوئی کہانی سنانا چاہتی ہو؟'' بابو صاحب نے اکھڑپن سے کہا۔

''سنیے بابو صاحب! ٹکٹ نہیں ہے ہمارے پاس، آپ......آپ براہ کرم......''

''ہاں ہاں ٹکٹ بنانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کہاں سے سوار ہوئے ہو خود بتا دو ایمانداری سے اور ٹکٹ بنوالو، رقم ادا کر دو۔ ہمارا یہی کام ہے۔''

''ہمارے پاس رقم بھی نہیں ہے۔'' میرے بجائے کوشل نے کہا اور بابو صاحب نے سامنے کی ہوئی کاپی پیچھے کر لی اور گھورتے ہوئے تھے۔

''رقم بھی نہیں ہے، ٹکٹ بھی نہیں ہے تو پھر بیگم صاحبہ ٹرین میں سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم وہی کرو بابو جو زیادہ سے زیادہ کر سکتے ہو۔ تم ہمیں پولیس کے حوالے کر دو، درحقیقت ہم اتنے ہی پریشان حال ہیں کہ اگر تم ہمیں پولیس کی تحویل میں دے دو گے تو ہمیں زندگی کی مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔'' ٹی ٹی ہم دونوں کی صورت دیکھتا رہا۔ میرا تو دم ہی نکل گیا تھا پولیس کے نام سے۔ اگر واقعی ٹکٹ بابو صاحب نے ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا تو کوشل کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن، لیکن میرا جو کچھ ہوگا وہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بھلا ہندوستان کا کون سا گوشہ تھا جہاں کے پولیس اسٹیشنوں میں میرا ریکارڈ موجود نہ ہو۔ کئی انسانوں کا قاتل، ایک بدترین انسان، ایک مفرور ملزم، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور صابر ہو گیا جو ہونا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔ ٹی ٹی چند لمحات سوچتا رہا پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا، واپسی میں پلٹ کر اس نے پوچھا؟''

''تم جا کہاں رہے تھے؟''

''ہمیں اَلور جانا ہے۔'' کوشل نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ کمپارٹمنٹ سے نکل گیا تھا اس کے جانے کے بعد کوشل نے اطمینان کی گہری سانس لی اور کہنے لگی۔

''پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد میں اپنے پتا جی کا پتا ان لوگوں کو بتا دوں گی اور اگر ممکن ہو سکا تو انہیں اطلاع بھی کرا دوں گی۔ تم بالکل فکر مت کرو، پتا جی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ وہ فوراً ہی ہمارے پاس پہنچیں گے اور ہمیں چھڑا کر لے جائیں گے۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بے شک کوشل کا کہنا ایک طرح سے درست تھا۔ اس کے پتا جی بہت بڑے آدمی ہوں گے۔ وہ آئیں گے اور کوشل کو چھڑا کر لے جائیں گے لیکن اگر مجھے کسی نے پہچان لیا تو پھر مجھے بھلا کون چھڑا سکے گا۔ خیر جو تقدیر میں ہے وہ تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ میں زیادہ کیوں سوچوں اس بارے میں، چنانچہ خود بھی اطمینان سے بیٹھ گیا۔ صبح ہونے میں اب بہت زیادہ دیر نہیں رہی تھی، غالباً اس وقت سات بجے تھے جب اچانک وہی ٹکٹ کلکٹر صاحب آئے، ہم نے یہی سمجھا تھا کہ اب وہ ہمیں پولیس اسٹیشن لے جانے کی خوشخبری سنائیں گے، لیکن انہوں نے ایک پرچی ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''میں نے ٹکٹ بنا دیا ہے تم لوگوں کا اور پیسے اپنے پاس سے بھر دیئے ہیں، ویسے کوشش کیا کرو کہ مصیبتوں سے بچنے کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جس سے عزت پر حرف آ جائے۔''

''جی، آپ نے اپنے پاس سے پیسے بھر دیئے ہیں؟''

''کیوں انسان نہیں ہوں کیا، میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے، میں نہیں جانتا کہ دوسرا ٹکٹ چیکر تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اَلور تک کا ٹکٹ بنا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹے نہیں ہو، بہرحال میں نے تمہارے حصے کے پیسے بھر دیئے ہیں اور یہ کوئی احسان نہیں ہے، انسان کو انسان کے کام آنا ہی چاہیے۔'' ٹکٹ چیکر آگے بڑھ گیا۔ میں عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے پرچی پر نظر ڈالی اور کوشل نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے اس کا بیج نمبر دیکھ لیا ہے فکر مت کرو جتنی رقم اس نے ہمارے ٹکٹ کے سلسلے میں بھری ہے اس سے سو گنا زیادہ کر کے اسے یہ رقم واپس کر دوں گی۔'' میں عجیب سی نظروں سے کوشل کو دیکھنے لگا۔ جو احسان اس ٹکٹ چیکر نے مجھ پر کیا تھا

اس کا تصور کوشل کر بھی نہیں سکتی تھی۔
دن گزرنے لگا سفر جاری رہا، دو بار ٹکٹ چیکر نے ہمارے ٹکٹ چیک کئے۔ ہم بھوکے پیاسے تھے، بس ایک دو بار اسٹیشن پر میں نے اور کوشل نے اتر کر پانی پیا، کسی کی مدد بھی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کم از کم اتنی ہمت تھی کہ بھوکے پیاسے رہ کر سفر کر سکیں۔ کوشل اب مجھے بتانے لگی تھی کہ الور کتنے فاصلے پر ہے اور ہمیں کتنا سفر طے کرنا ہے۔ اس کے چہرے کی رونقیں واپس لوٹ آئی تھیں۔ اس نے کئی بار محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔ میری احسان مند تھی اور اب اسے مجھ پر یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی بھرپور مدد کی ہے اور اسے نجانے کہاں کہاں رُسوا ہونے سے بچا لیا ہے۔
رات کے آٹھ بجے تھے اس وقت، جب ریل الور کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اچھا خاصا اسٹیشن تھا۔ جدید پیمانے پر آراستہ، ہر طرح کی سہولتیں تھیں۔ ہم دونوں تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہوئے نیچے اترے اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کی جانب بڑھنے لگے۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد ریلوے گیٹ آیا، اس سے باہر نکلے تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ شہر میں اچھی خاصی رونق تھی حالانکہ ایسے علاقوں میں رات کو زندگی سات بجے ہی مدھم پڑ جاتی ہے لیکن ریاست الور کا شہر الور بڑا پُر رونق تھا، ایک تانگے میں بیٹھ کر کوشل نے تانگے والے کو جگن ناتھ کی حویلی چلنے کے لیے کہا اور تانگہ چل پڑا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جگن ناتھ جی اتنے مشہور تھے کہ تانگے والے بھی اس حویلی کے بارے میں جانتے تھے۔ تانگہ سفر کرتا رہا راستے میں اچانک کوشل کہنے لگی۔
"ایک بات کہوں مسعود، بُرا تو نہیں مانو گے؟" میں نے چونک کر کوشل کو دیکھا۔ عجیب سی التجا تھی اس کی آواز میں۔
"کیا بات ہے کوشل؟"
"دیکھو بالکل بُرا مت ماننا، یہ میں مجبوری کی حالت میں کہہ رہی ہوں، بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"کیا بات ہے؟"
"تم اپنا کوئی ہندو نام بتا دینا میرے گھر میں۔"
"کیوں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "بس فوری طور پر یہ کر لینا، اس کے بعد جو تمہارا من چاہے کرنا۔ بس کوئی بھی نام جیسے پرکاش، جیسے چندر جیسے کچھ اور، کوئی بھی ایک نام، دیکھو میں بحالت مجبوری یہ کہہ رہی ہوں، ذرا تھوڑی سی غلط بات ہو جائے گی اگر تم نے فوراً ہی اپنے آپ کو مسلمان بتا دیا تو......"
"مجھے یہیں اتار دو کوشل میں تمہاری حویلی نہیں جانا چاہتا، تم کیا سمجھتی ہو، مجھے تم سے کوئی لالچ ہے۔"
"مان گئے نا بُرا، ڈر رہی تھی اس بات سے، نام بدل دینے سے دھرم تو نہیں بدل جاتا، انسان تو سب انسان ہی ہوتے ہیں۔"
"میرا خیال ہے کوشل میں تمہارے ساتھ تمہاری حویلی نہیں جا سکوں گا۔"
"ارے ارے کیسی باتیں کر رہے ہو، اچھا چلو چھوڑو تمہاری مرضی میں، میں خود سنبھال لوں گی بس تم چپ ہی رہنا۔"
"مگر اب تم اپنے گھر آ گئی۔ میں راستے ہی میں کہیں اُتر جاتا ہوں۔"
"دیکھو میں تم سے التجا کرتی ہوں، بُرا مت مانو میری بات کا۔ نجانے کیوں مجھ کمبخت نے یہ بات کہہ دی۔ نہیں مسعود تم جاؤ گے نہیں دیکھو، دیکھو ذرا سی بات کو اتنا مت بڑھاؤ، تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"
"کوشل تم یقین کرو میں نہایت خوشی سے یہ بات کہہ رہا ہوں، میرا تمہارے ساتھ جانا واقعی اتنا ضروری نہیں ہے۔"
"تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ ورنہ، ورنہ میں نجانے کیا کر ڈالوں گی، بتائے دیتی ہوں تمہیں۔ میں پاگل ہوں۔"
"عجیب لڑکی ہو۔ مگر میں اپنا نام تبدیل نہیں کر سکتا، کوشل تم نہیں جانتیں مجھے مجھے......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ حقیقت تو یہی تھی میں نے بڑی حفاظت کی تھی، بہت حفاظت کی تھی اپنے نام کی ورنہ نجانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ کوشل گردن جھکائے خاموش بیٹھ گئی تھی۔ تانگہ کوئی بیس منٹ تک ہچکولے کھاتا رہا اور اس کے بعد ایک عظیم الشان اور خوبصورت حویلی کے

سامنے رک گیا۔ حویلی کا بڑا سا پھاٹک دیکھ کر کوشل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، وہ آہستہ سے نیچے اتری اور پھر دروازے کے پاس پہنچ کر دروازہ بجانے لگی۔ ایک آدمی نے چھوٹی کھڑکی کھولی تھی، کوشل نے اس سے کہا۔

''دھرمو چاچا! تانگے والے کو پیسے دے دو'' اس آدمی کا سر بری طرح گیٹ سے ٹکرایا اور اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''کوشل بیٹا، کوشل بیٹا۔''

''اندر مت بھاگ جانا، تانگے والے کو پہلے پیسے دو، پیسے ہیں تمہارے پاس؟''

''کک، کوشل بیٹا تت...... تم آ گئیں......'' دھرمو نام کا آدمی باہر نکل آیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوشل کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں میں آ گئی ہوں دھرمو چاچا! تم تانگے والے کو پیسے دو!''

''ایں...... ہاں۔ اچھا لے بھائی، لے سارے رکھ لے بھاگ جا۔ مالک مالک کوشل بٹیا آ گئیں مالک۔'' دھرمو چیختا ہوا اندر بھاگ گیا، تانگے والے کو اس نے جو کچھ اس کے پاس تھا سب دے دیا تھا۔ وہ یہ خوشخبری خود دینا چاہتا تھا۔

اندر سے پیتل کی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ساتھ ہی کوئی پھٹی پھٹی آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں البتہ کچھ نہیں آیا تھا۔

''یہ کیا ہے کوشل!''

''میرے لیے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔ رام کتھا کہی جا رہی ہے۔ کیرتن ہو رہی ہے۔ ہمارے دھرم میں کسی مشکل پڑ جانے پر یہ سب ہوتا ہے۔'' کوشل نے بتایا۔

دھرمو چوکیدار اندر پہنچ چکا تھا، اس کی آواز سن لی گئی تھی۔ ہم کوٹھی کے صدر دروازے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ اندر سے بیشمار عورتیں اور مرد نکل آئے۔ عورتیں سفید ساڑھیاں باندھے ہوئے تھیں، مرد اوپری بدن سے برہنہ، ہاتھوں میں چمٹے اور مجیرے لیے ہوئے تھے۔ وہ سب ہماری طرف دوڑے اور ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ وہ اچھل اچھل کر مجیرے بجا رہے تھے۔ پھر ایک بھاری بھرکم آدمی آگے بڑھا اس کے پیچھے ایک عورت روتی چیختی آ رہی تھی۔

''کہاں ہے میری کوشل، کہاں ہے۔ کہاں ہے میری بچی کہاں ہے؟'' معمر شخص نے ان اودھم مچانے والوں سے کہا۔

''بس کرو پنڈت جی! بس کرو۔ لالہ جی خاموش ہو جاؤ، بس کرو۔'' بمشکل تمام ہمیں ان کے نرغے سے نکالا جا سکا۔ معمر عورت جو کوشل کی ماں تھی، کوشل سے مل کر زار و قطار رونے لگی۔ غرض ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا۔ میں نے اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر پیچھے کھسکنا چاہا تو کوشل جیسے میرے ارادے کو سمجھ گئی۔

''نہیں عزت سے لے چلو!'' اس نے کچھ لوگوں کو اشارہ کیا اور وہ میرے گرد پھیل گئے۔

''آیئے مہاراج!'' اس وقت کچھ کہنا بیکار تھا، چنانچہ میں ان کے ساتھ اندر چل پڑا حویلی انتہائی شاندار تھی۔ وہ مجھے ایک عظیم الشان کمرے میں لے آئے اور یہاں بڑے احترام سے مجھے بٹھا دیا۔

''کچھ جل پانی مہاراج!'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں شکریہ۔'' میں نے کہا۔ دو تین منٹ کے بعد ایک شخص اندر آ گیا۔

''تکلیف کریں مہاراج!'' اس نے کہا۔

''کہاں؟''

''آیئے آپ کو کمرے میں پہنچا دوں، میرا نام سکھ چرن ہے، آپ کی سیوا کی ہدایت کی گئی ہے مجھے۔''

''میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں سکھ چرن۔''

''مہاراج ہماری گردن کٹ جائے گی، ہم پر دیا کریں۔'' اس نے عاجزی سے کہا، مجھے خاموش ہونا پڑا۔ یہ شخص مجھے ایک آراستہ کمرے میں لایا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

''وہ اشنان گھر ہے مہاراج نہالیں۔ میں باہر ہوں جب من چاہے آواز دے لیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور وہ باہر نکل گیا، اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے پر نظر ڈالی، اس کی آرائش کا کیا کہنا، جدھر نظر اٹھتی دولت کے کھیل نظر آتے۔ پھر غسل خانے کی طرف بڑھا، پانی دیکھ کر میری کیفیت بھی ان بنجاروں سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ پانی کے نیچے بیٹھا تو اس وقت اُٹھا جب تک بدن ٹھنڈا نہ ہو گیا، آنکھیں سرخ نہ ہوگئیں۔ نشے کی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ جھومتا ہوا باہر نکلا اور قیمتی مسہری پر دراز ہو گیا۔ باہر نہ جانے کیا کیا ہو رہا تھا، میں اس سے بے خبر تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر سکھ چرن ناک پر کپڑا رکھے اندر آ گیا۔''

''یہ کریم خان ہے سرکار، آپ کے لیے کھانا لایا ہے۔'' میں اُٹھ کر بیٹھ گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ نیا آنے والا قمیض پاجامے میں ملبوس ایک عمر رسیدہ آدمی تھا، چہرے پر داڑھی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ میں کچھ برتن تھے جو کپڑے میں بندھے ہوئے تھے، ایک ہاتھ میں پانی کی چھوٹی مٹکی اور گلاس تھا۔ سکھ چرن اسی طرح ناک پر کپڑا رکھے باہر نکل گیا۔

''حضور...... کریم خان ہے ہمارا نام۔ نانبائی ہیں۔ سیٹھ صاحب کا آدمی ہمارے پاس آیا تھا۔ کہنے لگا ایک مسلمان کے لیے کھانا تیار کرو اور ساتھ لے کر چلو، مرغیاں پلی ہوئی ہیں گھر میں، ایک مرغی ذبح کر کے جلدی جلدی بھون لی ہے اور چار روٹیاں پکا لائے ہیں۔ اس وقت تو حضور یہی ہو سکا ہے کل کے لیے حکم دے دیں جو ارشاد فرمائیں گے پکا دوں گا۔ پانی اور برتن بھی ہمارے ہیں اور الحمدللہ پاک صاف ہیں۔ بلا تامل نوش فرمائیے۔''

میں سکتے میں رہ گیا۔ گویا کوشل نے میرے جذبے کا احترام کیا اور یہ سب کچھ کر ڈالا۔ شرمندگی بھی ہوئی۔ ان حالات میں اتنی جلدی یہ سب کچھ کرنا متاثر کن عمل تھا، لیکن بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کیا ہی لذیذ مرغی تھی، کریم خان سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر سکھ رام کے ناک پر کپڑا رکھنے کا خیال آیا اور میں سمجھ گیا کہ اسے گوشت کا علم تھا۔ میرے نزدیک ایک بڑی بات تھی یہ۔ کھانے کے بعد میں نے کریم خان سے کہا۔

''کریم خان، تمہاری دُکان کتنی دُور ہے؟''

''اِک ذرا فاصلے پر، وہیں غریب خانہ بھی ہے۔ اسی میں دکان نکال لی ہے۔''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''بندہ پرور! اب تو الوری ہیں۔ اجداد کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔''

''لگتا ہے۔ بہر حال کریم خان کل دوپہر کو قورمہ اور نان کھلاؤ، وہیں دکان پر آ جائیں گے۔''

''جو حکم عالی جاہ...... جائیں...... اجازت؟''

''شکریہ کریم خان۔'' میں نے کہا اور کریم خان چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ سب کوشل کے ساتھ مصروف ہوں گے اور اس وقت میرے لیے سو جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ سونے کی کوشش کرنے لگا اور آرام دہ بستر پر نیند آ گئی۔ صبح کو خوب دیر سے جاگا تھا۔ یاد ہی نہ آیا کہ کہاں ہوں۔ پھر یاد آ گیا اور شرمندگی سی ہوئی مگر کیا کرتا۔ کوشل نے نہیں جانے دیا تھا۔ غسل خانے جا کر منہ ہاتھ دھویا، باہر نکلا تو کریم خان موجود تھا۔

''ارے کریم خان...... کیسے؟؟''

''ناشتہ لایا ہوں عالی نسب۔ یہ حلوہ پوری اور ترکاری ہے!''

''افوہ۔ اچھا ٹھیک ہے مگر دوپہر کو یہاں کچھ نہ لانا۔ میں خود آؤں گا۔''

''ہم نے بتایا تھا کشوری لعل کو۔''

''کشوری لعل کون ہے......؟''

''جگن ناتھ کے منیجر ہیں۔''

''کچھ کہا تو نہیں۔''

''بس یہی کہا کہ جیسا سیٹھ کہیں گے اطلاع دے دی جائے گی مگر یہ بھی کہا کہ فرمائش کا کھانا پکا لینا۔''

''تمہارا تو بڑا حرج ہوا ہوگا اس وقت؟''

''غلام زادہ دُکان پر ہے۔ ہمیں آٹھ گنا زیادہ اجرت ادا کی گئی ہے۔'' کریم خان چلا گیا۔ میں عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ کوشل میرے احسانات اتار رہی تھی۔ کیا احسان کیا تھا اس بے چاری پر، اپنا بھی تو مسئلہ تھا۔ میں بھلا کسی کے ساتھ کیا احسان کر سکتا تھا۔ ریحانہ بیگم اور سرفراز وغیرہ یاد آئے، کیا سوچا ہوگا بے چاروں نے میرے بارے میں۔ کیا سمجھ رہے ہوں گے۔

✦✣✦✣✦

خیر کیا کر سکتا ہوں، میں تو خود ایک مجبور انسان ہوں۔

باہر کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوشل نے کہا۔ ''میں اندر آ سکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر آ گئی۔ پیچھے اس کے ماں باپ تھے۔ جگن ناتھ نے مجھ سے ہاتھ ملایا ان کی بیوی نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''جیتے رہو بیٹے۔ بھگوان ماتا پتا کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔'' اس دُعا نے دل میں رقت پیدا کر دی۔ میرے ماں باپ کا کلیجہ جیسے ٹھنڈا ہوگا، میرا دل ہی جانتا تھا۔ سب بیٹھ گئے، جگن ناتھ نے کہا۔

''جو کچھ تم نے ہمارے لیے کیا ہے مسعود بیٹے اس کا شکریہ ادا کرنا تمہاری توہین کرنا ہے۔ ایک پریوار کو بچایا ہے تم نے، ایک خاندان کی لاج بچائی ہے۔ کوشل نے ہمیں پوری کہانی سنا دی ہے۔ کرنے کو تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، پورے ہندوستان میں ان بنجاروں کو تلاش کرایا جا سکتا ہے مگر...... چھوڑ دیا یہ خیال۔ بھگوان انہیں خود سزا دے گا!''

''جی یہی بہتر ہے!'' میں نے کہا۔

''تم سے ابھی تمہارے بارے میں ہم کچھ نہیں پوچھیں گے۔ ہمارے مہمان رہو۔ خوب آرام کر کے تھکن اُتارو، اس کے بعد تم سے تمہارے بارے میں باتیں ہوں گی۔''

''جی......'' میں نے کہا۔

''کوئی ایسا کام تو نہیں الجھا ہوا جس کی وجہ سے کوئی پریشانی ہو، اپنی خیریت کی اطلاع کہیں بھجوانا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔ کوشل کے ذریعہ میرا تعارف تو ہو چکا ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوں تمہارا احسان مانتا ہوں۔ دین دھرم بڑی چیز ہے، اس کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن انسانیت کا محسن سب سے عظیم ہوتا ہے۔ تمہیں مہمان تو ہمارا رہنا ہوگا مگر تمہارے لیے کھانے اور برتنوں کا اہتمام کریم خان کے حوالے کر دیا گیا ہے وہ ایک کھرا مسلمان ہے۔''

''مجھے اس سلسلے میں سب سے زیادہ شرمندگی ہے۔''

''مگر ہمیں تمہارے عقائد کا احترام کر کے خوشی ہوتی ہے۔''

''ایک درخواست کروں گا!''

''کھانا میں کریم خان کے گھر جا کر کھا لیا کروں گا!''

''کشوری لعل نے بتایا تھا۔ اگر تم اس میں خوش ہو تو ہمیں اعتراض نہیں ہے اور کوئی بات......؟''

''نہیں شکریہ!''

''اس وقت تک یہاں سے جانے کی بات نہ کرنا جب تک ہمارا دل نہ بھر جائے، میں تمہارا بڑا ہوں اور اچھے لوگ بڑوں کی خواہش کا احترام کرتے ہیں۔ اس خواہش کو جوابی احسان نہ سمجھنا بلکہ ہمارا پیار تصور کرنا۔''

''جی بہتر......''

''بس اب چلیں گے۔ کوشل سے باتیں کرو۔''

''وہ دونوں اُٹھ کر باہر نکل گئے، کوشل مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، حلیہ ہی بدل گیا تو ایک رات میں، چہرے پر شادابی اور آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی تھی۔

''جناب عالی......!'' اس نے کہا

''یہ بہت زیادہ ہے کوشل......!''

''ایک بات کہوں یقین کر لوں گے......؟''

''کہو......!''

''تم کون ہو، میں نہیں جانتی۔ کن حالات کا شکار ہو، مجھے نہیں معلوم۔ بتاؤ گے تو سن لوں گی نہ بتانا چاہو گے تو اصرار نہیں کروں گی، مگر میرے دل میں تمہارے لیے بڑا پیار ہے۔ عورت کی آبرو ہی اس کا مان ہوتی ہے اور آبرو کا رکھوالا اس کا سنسار۔ میں پڑھی لکھی اور آزاد خیال لڑکی ہوں۔ عشق نہیں کیا کسی سے، لیکن دل کسی کے پیار کی طلب سے خالی بھی نہیں ہے۔ ہاں ایک انتخاب تھا ذہن میں۔ تمہیں میری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے ہزار مواقع حاصل تھے مگر تم نے ایک عورت کو زندگی بخشی، اس کی لاج، اس کی جان بچائی ورنہ نہ جانے میرا کیا ہوتا۔ یہ عورت تمہارا احسان مانتی ہے اگر تم میرے دھرم کے ہوتے تو شاید تم میرے جیون کے مرد ہوتے مگر تم دھرم کے پکے ہو اور میں بھی اپنا دھرم نہیں چھوڑ سکتی۔ اس لیے ہمارے بیچ یہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا، ایک عورت کی حیثیت سے میں تمہیں کیا دوں؟''

''میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں نے تھوک نگلا اور اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولی۔'' فیصلہ مجھے کرنے دو گے؟

''پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو......'' میں نے بمشکل کہا۔

''اس وقت جب بھیڑیوں کے بیچ تھی تم نے اپنا سینہ کھول دیا تھا۔ آج محفوظ ہوں تو تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔''

''کیا......؟''

''ایک رشتہ ایک مان!''

''تم جذباتی ہو رہی ہو کوشل......''

''ہاں۔ ہو رہی ہوں، کیونکہ جذبات زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ غیر جذباتی لوگوں کو بھی تم زندہ سمجھتے ہو؟''

''کوشل! کیوں شرمندہ کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''بہت متاثر کیا ہے تم نے مجھے مسعود! تمہارا ایک کردار ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے نام بدل لو، تم نے میرا ساتھ چھوڑ دینا چاہا۔ تم احسان کر کے احسان وصول کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔ معمولی آدمی بنو تم...... ایسے غیر معمولی انسان کو میں کیا دے سکتی ہوں۔''

''کوشل! چھوڑو بھی۔ تم نے بھی تو مجھے خوب شرمندہ کیا۔ میرے کھانے کے لیے اہتمام کیا اور وہ بھی ایسے وقت جب سب لوگ تمہارے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔''

''ذکر مت کرو اتنی چھوٹی باتوں کا۔ میں تم پر نچھاور ہونا چاہتی ہوں۔ بس یہ میری آرزو ہے۔ مجھے ایک عورت کی حیثیت سے مانگنا چاہتے ہو تو مانگ لو، میں تمہاری ہر خوشی اپنی خوشی سے پوری کروں گی۔''

''ارے ارے۔ پاگل ہو گئی ہو کیا۔ کیا ہو گیا تمہیں؟'' میں بوکھلا کر بولا۔

''آ کاش بن گئے ہو تم میرے لیے۔ دھرتی ہوں میں تمہارے سامنے بولو۔ مسعود میں حاضر ہوں، یا پھر میرا فیصلہ مان لو!''

''کیا فیصلہ ہے تمہارا......''

''راکھی باندھوں گی تمہیں۔ بھائی بناؤں گی اپنا۔ دھرم سارے رشتوں کے آڑے آتا ہے، بہن بھائی کے رشتے کو

نہیں کاٹ سکتا۔ تمہیں ہمایوں بادشاہ یاد ہوگا؟ ایک ہندو رانی کو بہن بنا کر اس نے قول نبھایا تھا۔''
''تو جاؤ راکھی لے آؤ، میرا ہاتھ موجود ہے۔'' میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور کوشل نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی، آنکھوں سے لگایا اور بولی۔
''یہی میری راکھی ہے......!''
''مجھے قبول ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور وہ میرے سینے آ لگی۔ ''بڑی جذباتی ہو تم کوشل۔'' میں نے کہا اور میرے حلق سے سسکی سی نکل گئی، شمسہ یاد آ گئی تھی۔ کوشل خود پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے میری اس کیفیت کو محسوس کیا۔ رفتہ رفتہ وہ سنبھل گئی اور پھر شرمندہ نظر آنے لگی۔
''بس مذاق مت اُڑانا میری باتوں کا۔ یہاں سب ہی کے دل میں تمہارے لیے ایسے ہی جذبات ہیں۔''
''تم نے بڑھ چڑھ کر کہانیاں سنائی ہوں گی انہیں۔''
''ایک لفظ غلط نہیں کہا۔ ویسے یہاں بھی بڑے بھجن ہو رہے تھے اور ایک اور کام بھی ہوا ہے۔''
''کیا؟''
اتفاق سے سنت گیانی الور آ گئے تھے۔ پتا جی کے بڑے پرانے جاننے والے ہیں۔ بڑے میاں ہیں، ان کے بہت سے چمتکار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ وہ ہانڈی یاد ہے تمہیں؟''
''مٹھ؟'' میں نے کہا۔
''ہاں۔ وہ بنجاروں نے ہمارے لیے نہیں بھیجی تھی بلکہ گیانی مہاراج نے اُڑائی تھی ہمارے دشمنوں کو مارنے کے لیے، اور اس کے تو تم بھی گواہ ہو کہ وہ سسرے مر گئے تھے۔ سب لوگ مٹھ اُڑانے کا وہی وقت بتاتے ہیں، جب ہم نے مٹھ دیکھی تھی۔ گیانی مہاراج تین دن کے جاپ کے لیے بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اس بیچ میں واپس آ جاؤں گی۔''
''ویری گڈ۔ تین دن پورے ہو گئے۔''
''آج بارہ بجے ہو جائیں گے۔''
''کمال ہے۔ بہر حال میں ان جادو منتروں کا قائل ہوں۔ میں بھی ملوں گا ان سے، کسی مسلمان سے مل لیں گے وہ؟''
''ضرور ملیں گے۔ میں تو کہتی ہوں وہ جانتے بھی ہوں گے، تم ہی میری مدد کرو گے، تم دیکھ لینا وہ یہ بات بتا دیں گے......!''
''تب میں بھی ان سے کچھ پوچھوں گا اپنے بارے میں۔ ہو سکتا ہے وہی میری مشکل کا حل بتا سکیں۔ بارہ بجے نکلیں گے وہ اپنے جاپ سے؟''
''ہاں ٹھیک بارہ بجے۔ کوشل نے جواب دیا اور میرے دل میں تجسس بیدار ہو گیا۔'' میں بھی اس وقت گیانی کو آزمانا چاہتا تھا۔
کوشل چلی گئی مگر میں حیرتوں میں ڈوبا رہا۔ وہ سنت گیانی میرے لیے حیران کن تھے جنہوں نے جاپ کر کے کوشل کو اس مصیبت سے نکالا تھا۔ حالانکہ میں نے کوشل کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی، ان بنجاروں کو دھوکہ دینے کے لیے بہترین منصوبہ بنایا تھا جس میں کوئی معمولی سی لغزش میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی لیکن سنت گیانی۔ ویسے چند باتیں تسلیم کرنی پڑتی تھیں۔ مثلاً جمنے کا میرے منصوبے پر تیار ہو جانا، میری خواہش کے مطابق میرے لیے گاڑی مہیا کر دینا اور پھر وہ ہانڈی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔
بارہ بج گئے۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ سارے ملازم بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ عجیب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔

''ارے رُکو۔'' میں نے ایک ملازم کو روکا۔
''جی سرکار؟''
''کوشل دیوی کہاں ہیں؟''
''گیانی مہاراج کے کمرے میں۔
''ہاں مہاراج۔ٹھیک بارہ بجے۔سب وہاں جمع تھے۔انہوں نے اندر سے رمبھو کو آواز دی تھی؟''
''رمبھو کو؟''
''ہاں سرکار! رمبھو ہی اس وقت وہاں موجود تھا۔'' حالانکہ الگ الگ نوکر وہاں رہتے تھے۔مگر گیانی مہاراج جانتے تھے کہ اس وقت رمبھو وہاں موجود ہے۔ کہنے لگے رمبھو! کوشل کو اندر بھیج دو، رادے کرشن رادھے کرشن۔ مہاراج یہ بھی جانتے تھے کہ کوشل دیوی آ گئی ہیں۔ اتنا ہی یقین تھا انہیں۔شربت کا گلاس لے کر کوشل دیوی ہی اندر گئی تھیں۔''
''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی بڑے سرکار کو اندر بلایا گیا ہے۔''
''ذرا مجھے بھی وہاں پہنچا دو!''
''وہ سامنے سے بائیں طرف مڑ جایئے۔سامنے لوگ کھڑے نظر آ جائیں گے۔'' ملازم نے کہا اور میں آگے بڑھ گیا۔ یہاں مجھے عزت دی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے، مجھے انہوں نے جگہ دی۔ اسی وقت ایک ملازم اندر سے باہر آیا۔اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''صاحب! آپ کو گیانی مہاراج بلا رہے ہیں۔''
''مجھے؟'' میں اچنبھے میں رہ گیا۔
''جی مہاراج اچانک بولے، رمبھو باہر مسعود آ گیا ہے اسے اندر بلاؤ۔ آیئے مہاراج!'' وہ بولا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔گیانی مہاراج زمین پر مرگ چھالہ بچھائے بیٹھے تھے، ان کے سامنے جگن ناتھ جی، ان کی دھرم پتنی اور کوشل دو زانو بیٹھے تھے، ان کے چہروں پر عقیدت نظر آ رہی تھی مگر گیانی مہاراج کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میرے بدن کو کرنٹ لگا تھا وہ بھوریا چرن تھا، لمبے لمبے بال شانوں پر بکھرائے اُوپری بدن سے برہنہ اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ۔
''جے بھورنا مجنڈا۔ جے شو شمبھو۔آ بالک تیرے سر پر ہاتھ رکھوں۔آ۔آ گے آ۔'' میں اپنی جگہ کھڑا رہا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا میں۔
''مسعود بھیا! گیانی مہاراج بلا رہے ہیں۔'' کوشل نے کہا۔ میں دل میں نفرت کا طوفان لیے دو قدم آگے بڑھ گیا۔
''جے مجنڈا۔ جے شمبھو۔'' بھوریا چرن نے ہاتھ بلند کیا تا کہ میرے سر پر پھیرے لیکن میں سیدھا کھڑا رہا تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''تو کیا سمجھتا ہے بھوریا میں تیرے سامنے سر جھکاؤں گا۔'' سب چونک پڑے تھے۔کوشل گھبرا کر بولی۔
''مسعود بھیا! یہ گیانی مہاراج ہیں۔'' بھوریا چرن ہنسنے لگا تھا۔
''رہنے دو کوشل اس سے ہماری پرانی یاری ہے۔ ہمارے اس کے بیچ یہ چلتا ہے۔''
''آپ انہیں جانتے ہیں مہاراج؟'' جگن ناتھ نے پوچھا۔
''اچھی طرح۔ یہ بھی ہمیں جانتے ہیں بیٹھ جا تو لڑکے تجھ سے کچھ باتیں کریں گے، ٹھیک ہے سر نہ جھکا ہمارے سامنے۔''
''سب کے سامنے بھوریا چرن؟'' میں نے کہا۔
''ہاں جو باتیں کریں گے وہ سب کے سامنے کی جا سکتی ہیں۔''

''تو نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا ہے بھوریا۔ اس لیے نہیں بیٹھوں گا بول کیا کہنا چاہتا ہے؟'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ جگن ناتھ میرے انداز پر سخت بے چین ہو رہا تھا، وہ تو سنت گیانی سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ سنت گیانی نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا بہت بڑی بات تھی لیکن میں اپنی نفرت کو کیسے روک سکتا تھا۔ ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ بھوریا چرن نے مجھے انسانوں کی زندگی سے کتنا دُور کر دیا ہے مگر بھوریا چرن کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں تھی۔ اس نے کہا۔

''مت بیٹھ، مت بیٹھ مگر باؤلے تو ہمیشہ یہ بھول جاتا ہے کہ ہم نے قدم قدم پر تیری حفاظت کی ہے، تیرا کیا خیال تھا کیا تو ان جلتے پتھروں میں کتے کی موت نہ مرجاتا، آسمان کی دھوپ تجھے جلا کر بھسم نہ کر دیتی، یہ ہم ہی تو تھے جس نے بنجاروں کے من میں تیرے لیے دَیا ڈالی اور انہوں نے تجھے برداشت کیا ورنہ یہ بنجارے پتھر دل ہوتے ہیں، ہر طرح کے کام کر لیتے ہیں۔ یہ بھلا کسی کو اپنے بیچ آنے دیتے اور اس کے بعد اس لڑکی کے لیے ہم نے بھاگنے کے راستے آسان کئے اور تو بھی ان کے بیچ سے نکل آیا، ورنہ پاگل تھے نا سسرے کہ تیرا ہی سہارا لیتے۔ بیچنا چاہتے تھے وہ اسے کیوں ری کوشل جھوٹ کہہ رہے ہیں ہم، اسی لیے انہوں نے تجھے اغوا نہیں کیا تھا کہ تیرا سودا کر دیں؟ تو پاگل بن گئی تھی، ٹھیک ہے مگر ایک پاگل لڑکی بھی بیچی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ تجھ پر تشدد کر کے یہ قبول کرا سکتے تھے تجھ سے کہ تو پاگل نہیں ہے مگر ہم نے ان کے دماغ الٹ دیئے تھے اور انہیں اس بات کے لیے مجبور کر دیا تھا وہ اس باؤلے کا سہارا لیں۔ ہم نے سوچا چلو ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں۔ تو بھی بچ جائے اور کوشل بھی تیرے ساتھ یہاں تک پہنچ جائے۔ ہانڈی نہ مارتے سسروں پر تو وہ سیدھے تیرے پاس پہنچتے ایسے پہاڑ سے گر کر جان نہ جاتی ان کی۔ سمجھ رہا ہے تو؟''

بھوریا چرن نے اس طرح یہ ساری باتیں کہیں جیسے اس کی آنکھیں پورا منظر دیکھتی رہی ہوں۔ اس کا دماغ ان لوگوں کے دماغ کی ساری باتیں سمجھتا رہا ہو۔ یہ بلاشبہ اس کی ناپاک قوتوں کا کمال تھا لیکن کالے جادو کی یہ قوتیں بار ہا میرے سامنے آ چکی تھیں اور میں ان سے ناواقف نہیں تھا۔ بھوریا چرن نے جو کچھ کہا تھا اس سے مجھے خانہ بدوشوں کے چنگل سے نکل آنے کا موقع ضرور ملا تھا لیکن کیا دھرا بھی تو اسی کمبخت کا تھا۔ میں نے کہا۔

''ساری باتیں اپنی جگہ ہیں بھوریا چرن! مگر میرے تیرے درمیان جو چکر چل رہا ہے میں اس میں اتنا ہی اٹل ہوں جتنا پہلے دن تھا۔'' بھوریا چرن سپاٹ آنکھوں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں بھی تجھے بتا چکا ہوں بالک جتنا تو مجبور ہے اتنا ہی میں بھی مجبور ہوں۔ میرا کام تجھ سے ہی ہوگا اور میں تجھے چھوڑ نہیں سکتا۔''

''ناپاک کتے، میں تیری یہ خواہش تیری یا اپنی موت کے وقت تک پوری نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا اور جگن ناتھ غصے سے کھڑا ہو گیا، کوشل بھی بے چین ہو کر میرے پاس آ گئی، اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''بھیا، بھیا! تم سنت گیانی کی توہین کئے جا رہے ہو۔ یہ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ہم سب کے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

''معاف کرنا کوشل! میرے لیے بھی اس کی باتیں ناقابل برداشت ہی ہیں۔ میں تو پہلے ہی یہاں سے جانا چاہتا تھا تم نے، تم نے......''

''دیکھو بھئی جگن ناتھ اور تم بھی کوشل، اس کا اور میرا معاملہ میرے اور اس کے بیچ ہے، تم لوگوں نے اگر بیچ میں ٹانگ اڑائی تو میں بُرا مان جاؤں گا۔''

''میرا یہاں نہ رُکنا ہی بہتر ہے۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا، اب میرے لیے حویلی سے باہر جانا ہی زیادہ مناسب تھا لیکن چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کوشل دوڑتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

''کہاں جا رہے ہو مسعود بھیا! ابھی نہیں جانے دوں گی تمہیں، اتنے پکے رشتے کو ایسے توڑ رہے ہو۔''

''کوشل! مجھے مجبور مت کرو، وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم لوگ خود مجھے دھکے دے کر باہر نکالو گے، مجھے عزت سے یہاں سے چلے جانے دو۔ اب بات دوسری ہو گئی ہے۔''
''کیسی باتیں کرتے ہو مسعود بھیا! تم نے میرا جیون بچایا ہے، میری آبرو بچائی ہے، میں نے، میں نے تمہیں اپنا بھائی کہا ہے، اس کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم اپنے کمرے میں جاؤ تمہیں میری سوگند ہے بھیا، بڑے مان سے میں نے تمہیں اپنی قسم دلائی ہے۔ ابھی یہاں سے جانے کی بات نہ کرو۔ تم جانا چاہو گے تو ہم روکیں گے تو نہیں مگر ایسے نہیں ابھی نہیں۔ جو باتیں تمہارے اور گیانی جی کے بیچ ہوئی ہیں ان پر میں اور پتا جی خود حیران ہیں۔ ہم سنت گیانی مہاراج سے کچھ باتیں کر لیں، اندر جاؤ بھیا، قسم دلائی ہے میں نے بتا دو مجھے مان رکھو گے میرا؟''
''تمہاری ضد ہے کوشل! ورنہ جو میں نے کہا ہے وہ وقت آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔'' میں نے گردن جھٹک کر کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل پڑا، کوشل مطمئن ہو کر بھوریا چرن کی طرف چلی گئی تھی، کمرے میں آ کر میں اس شیطان سادھو کے بارے میں سوچنے لگا، کمبخت واقعی ناقابل شکست قوتوں کا مالک ہے جو کچھ اس نے بتایا اس کا ثبوت جا بجا موجود تھا لیکن وہ مجھے تسخیر نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے بھوریا چرن تو کہیں بھی میرے راستے میں آئے تجھ پر لعنت ہی بھیجتا رہوں گا۔ چلو ٹھیک ہے، کوشل کہہ رہی ہے تو تھوڑا وقت اور سہی۔ میں نے دل میں سوچا اور پھر دوپہر کو کریم خان کی طرف چل پڑا۔ کریم خان اپنی دکان پر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اچھا آدمی تھا مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور اندر بیٹھنے کی پیشکش کی، اس کے چھوٹے سے جھونپڑے نما ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا، کریم خان اپنے گاہکوں کو نمٹا کر میرے پاس آ بیٹھا تھا۔
''کچھ سمجھ میں نہیں آیا بھیا جی، آخر یہاں آپ نے قیام کیوں کیا ہے؟ اگر یہیں الور میں رہنا تھا تو اور بھی بہت سی جگہیں ہیں، ایک مسلمان کا ہندو کے گھر رہنا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ معاف کیجئے گا میں کسی خاص غرض سے کوئی بات نہیں کہہ رہا۔ بس یونہی ذرا سی ذہن میں کرید پیدا ہو گئی ہے۔''
''بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا، کریم خان صاحب آپ مطمئن رہیں۔''
''نہیں، نہیں اچھا خیر چھوڑیئے، یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے، مجھے یہ بتایئے گا کہ شام کو کیا کھانا پسند فرمائیں گے؟''
''جو کچھ بھی آپ پکائیں گے کھا لیں گے خان صاحب! بس اب اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''
''سری پائے پکا رہے ہیں بکرے کے، آپ کے لیے اور دیکھئے کیا لذیذ پکاتے ہیں، آپ بھی کیا یاد کریں گے؟''
''جی۔'' میں نے کہا
کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد ایک بار پھر حویلی چل پڑا۔ جی تو یہاں چاہ رہا تھا کہ یہاں سے چلا جاؤں لیکن بس کچھ اخلاقی پابندیاں لگ گئی تھیں۔ کوشل کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کر لوں گا اور اس کے بعد کسی اور خطے، کسی اور جگہ چلا جاؤں گا۔
''ایک تھوڑا سا وقت مجھے دو گے؟''
''کیوں نہیں جگن ناتھ جی۔''
''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گئے، بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر بولے۔
''دراصل بات بس اتنی سی ہے مسعود کہ ہم سنت گیانی سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے مشکل وقت میں کام آئے ہیں وہ۔ انہوں نے اپنے جادو منتروں سے ہمارے بہت سے بگڑے کام بنائے ہیں۔ انہوں نے بے شک ہمیں منع کر دیا ہے مگر ہمارے من میں یہ کرید پیدا ہو گئی ہے کہ تمہارے اور ان کے بیچ ایسا کونسا چکر ہے۔''
''جگن ناتھ جی میں آپ لوگوں کا بڑا احترام کرتا ہوں، ایک چھوٹا سا کام میرے ذریعے ہوا ہے اور اب تو یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اس کام میں، میں صرف ایک ذریعہ بنا تھا، اصل کھیل سنت گیانی ہی کا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان کیا چکر ہے، آپ کا پوچھنا مناسب نہیں ہو گا، نہ ہی وہ یہ چاہیں گے کہ آپ کو تفصیل بتائیں اور نہ ہی یہ پسند کروں گا، میں یہ چاہتا ہوں جگن

ناتھ جی کہ آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں، کوشل سادہ لوح لڑکی ہے بھائی کہا ہے اس نے مجھے، میری بھی ایک بہن ہے جو مجھ سے بچھڑ گئی ہے، بہن کے رشتے نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی ورنہ ایک چھوٹے سے احسان کا اتنا بڑا صلہ وصول کرنے کے لیے میں یہاں نہ رُک جاتا، سنت گیانی کے اور میرے مسئلے کو آپ رہنے دیں، اگر پتہ چل گیا تو آپ کو نقصان پہنچے گا، یقین نہ آئے تو یہ بات سنت گیانی سے پوچھ لیجئے۔"

"بھئی بڑا پریشان ہو گیا ہوں میں، بہرحال بقول تمہارے تم ذریعہ ہی سہی لیکن مجھے میری بیٹی کا منہ تو تم نے دکھایا ہے، سنت جی نے بھی میرے اوپر ہمیشہ کی طرح احسان کیا ہے، میں یہ بات اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی ایسی چھوٹی موٹی بات ہو تو میں اسے ختم کرانے کا ذریعہ بن جاؤں، بہرحال تمہاری مرضی۔"

جگن ناتھ سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا، ذہن پریشان تھا، خواہ مخواہ کی اخلاقی بندشیں باندھ لی تھیں اپنے پیروں میں، ورنہ نہ کوشل میری بہن تھی نہ اس ہندو گھرانے سے میرا کوئی واسطہ۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا پھر دروازے پر دستک ہوئی اور کوشل اندر آ گئی، عجیب سا چہرہ ہو رہا تھا اس کا۔ بڑا حسرت بھرا سا انداز تھا، میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"کوشل!"

"ہاں مسعود بھیا! کچھ کہنا چاہتی ہوں تم سے۔"

"کیا کوشل؟"

"بھیا گیانی جی اگر تم سے کچھ چاہتے ہیں تو ان کی بات مان لو، جو کام وہ کہہ رہے ہیں کر دو بھیا، میں بڑی اُمید سے آئی ہوں تمہارے پاس۔"

"سمجھتی نہیں ہو کوشل تم، میری پوری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اگر اس گیانی نے تمہیں کچھ تفصیل بتائی ہے تو تمہیں خود علم ہو گیا ہوگا، نہیں بتائی کوشل تو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش مت کرو، بہت مجبوری ہے، بڑی مجبوری ہے۔"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ تمہارے اور گیانی جی کے بیچ سمجھوتہ ہو جائے۔"

"بچوں کی سی باتیں مت کرو کوشل! خدا کے لیے مجھ سے کوئی ایسی بات مت کہو کہ مجھے انکار کر کے شرمندگی ہو۔"

"بہن کی ایک اتنی سی بات بھی نہیں مان سکتے۔"

"پستول ہوگا تمہارے پاس؟ لاؤ اور گولی مار دو۔ لکھ کر دے دیتا ہوں کہ خودکشی کی ہے، بس اپنا خون دے سکتا ہوں تمہیں لیکن لیکن یہ نہیں کر سکتا جو بھوریا چرن کہتا ہے۔"

"آخر ایسی کونسی بات ہے؟"

"یہ بھی تم اس سے پوچھو کوشل۔"

"کوئی ایسی بات ممکن نہیں ہو سکتی بھیا جس سے؟"

"نہیں، میں معافی چاہتا ہوں۔"

"میری اتنی سی بات نہیں مانو گے؟"

"جو کچھ میں تم سے کہہ چکا ہوں کوشل اس کے بعد تو میرے پاس کچھ کہنے کے لیے بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور کوشل کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ایسے ہی کہہ کر چلی آئی تھی گیانی جی سے کہ جو کام وہ نہیں کر سکے میں کر دکھاؤں گی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ......" لیکن وہ میری پوری بات سنے بغیر باہر نکل گئی، صاف لگتا تھا کہ ناراض ہو گئی ہے۔ پاگل تھی جانے بوجھے فضول دعوے کر آئی تھی۔ میرا خیال ہے اب وہ مجھے روکنے کی کوشش بھی نہیں کرے گی اور یہ درست ہے وہ بھوریا چرن کے ہم مذہب تھے، اس سے عقیدت رکھتے تھے، میرے تو وہ صرف احسان مند تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا کرتے

بے چارے۔ اب کچھ کر ڈالنا چاہیے۔

رات ہوگئی۔ دیر سے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، الور سے کہاں جاؤں، بھوریا تو ہر جگہ پہنچ جاتا ہے، اس سے کہاں محفوظ رہ سکتا ہوں، کچھ بھی ہے اس کوٹھی سے نکل جانا ضروری ہے۔ اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی پھر ایک آواز سنائی دی۔

''اندر حاضر ہو سکتے ہیں۔'' یہ کریم خان کی آواز تھی۔ میری اجازت پر اندر آ گئے۔ انتظار ہی کرتے رہے حضور والا کا۔ سری پائے پکنے کے بعد دیر تک رکھے رہیں تو بے مزہ ہو جاتے ہیں

''اوہ ہاں۔ میں بھول گیا تھا خان صاحب۔''

''مزید دیر نہ فرمائیں۔ ہم صبح کو برتن لے جائیں گے۔ اچھا اجازت۔'' وہ چلے گئے، میں نے سوچا کہ کھانا تو کھا ہی لیا جائے، اس کے بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔ دوبارہ نہ جانے کب کھانا ملے۔ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ آنے والے وقت کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ برتن کپڑے سے کھولے۔ خوب گرم سالن اور تازہ روٹیاں تھیں۔ سامنے رکھ کر پہلا نوالہ ہی توڑا تھا کہ یوں لگا جیسے کسی نے کلائی پکڑ لی ہو، کانوں میں ایک سرگوشی اُبھری۔

''نہیں۔ یہ دھوکہ ہے، اسے پھینک دو!'' رونگٹے کھڑے ہو گئے، پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں، کلائی آہستگی سے چھوڑ دی گئی تھی۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ اسی طرح سے کھلا جیسے کسی نے کھولا ہو، پھر خود ہی بند بھی ہو گیا، میں تھوک نگلتے ہوئے بند دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر کھانے پر نگاہ ڈالی اور میرے حلق سے چیخ نکل گئی اس سے پہلے بھی کھانا شروع کرتے ہوئے سالن کے برتن پر نگاہ پڑی تھی، بہت پُر روغن سالن تھا اور اس میں سری کا گوشت نظر آ رہا تھا مگر اب جو دیکھا تو برتن میں بدبودار پیلا پانی بھرا ہوا تھا اور اس میں نہایت کریہہ شکل کی مکڑیاں کلبلا رہی تھیں۔ دہشت بھری چیخ دوبارہ میرے منہ سے نکلی اور میں نے بے اختیار برتن پر ہاتھ مار کر اسے دُور پھینک دیا برتن اوندھا ہو گیا، پانی بہنے لگا اور بھیگی ہوئی زندہ مکڑیاں لمبے لمبے ہاتھ پاؤں سے چلتی ہوئی دیواروں کی طرف جانے لگیں۔ میں دہشت بھری نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ حواس گم تھے، بمشکل تمام اٹھا۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، گلا خشک تھا، لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آیا۔ آہ وہ یہاں موجود ہے، وہ شیطان مسلسل حملے کر رہا تھا۔ بھلا وہ مجھے کہاں جینے دے گا۔ نکل جاؤ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ کسی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے، میں باہر جانے والے راستے کے لیے آگے بڑھنے لگا، کئی کمرے درمیان میں آتے تھے۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ چلتے چلتے ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ ساتھ ہی ایک کان پھاڑ دینے والی نسوانی چیخ سنائی دی اور کمرے سے نکلنے والا مجھے پیٹ میں سے ڈھیر ہو گیا۔

''نہیں بھاگنے دوں گی پاپی، نہیں جانے دوں گی، ذلیل کمینے خون کر دوں گی تیرا۔ ہے بھگوان کوئی ہے۔ دوڑو، پکڑو۔ یہ بھاگ رہا ہے۔'' آواز کوشل کی تھی، اس نے مجھے دبوچ لیا تھا اور وہ انتہائی قابل اعتراض حالت میں تھی۔ اس کے لباس کے چند تار اس کے بدن پر جھول رہے تھے اور بس۔

چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ جگن ناتھ بھی تھے۔ گھر کے ملازم اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ کوشل چیخی۔

''اس نے مجھے لوٹ لیا پتا جی، اس نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے آستین کے سانپ نے مجھے ڈس لیا، ہائے پتا جی میں بن موت مر گئی، ہائے پتا جی۔'' کوشل بلک بلک کر رونے لگی، روشنیاں جلا دی گئیں، سب نے ہمیں دیکھا۔ ایک ملازم نے جلدی سے ایک چادر لا کر کوشل کو ڈھک دیا۔ جگن ناتھ تھر تھر کانپ رہا تھا، اس کے چہرے سے خوف برس رہا تھا، اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بمشکل تمام اس نے کہا۔

''کوشل کی ماں اسے اندر لے جاؤ۔''

''نہیں جاؤں گی۔ اس کے ٹکڑے کر دو میرے سامنے۔ میں اس کا خون چاٹوں گی، اسے، اسے...... میں نہیں جاؤں گی، چھوڑو، مجھے چھوڑو...''

''اندر چلو۔ تم لوگ اپنا کام کر جاؤ۔'' جگن ناتھ نے ملازموں سے کہا۔ تین نوجوان البتہ وہیں رُکے رہے ان کے چہروں پر بھیانک تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ میری تو قوت گویائی ہی سلب ہو گئی تھی، میں ساکت تھا۔ ''اندر گھسیٹ لاؤ اسے۔'' جگن ناتھ نے نوجوانوں سے کہا، وہ جیسے منتظر ہی تھے۔ ٹوٹ پڑے مجھ پر، جانوروں کی طرح مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔

''پارسا بنا تھا۔ راکھی بندھوا رہا تھا مجھ سے، ارے پاپی اتنی گہری چال چلی تو نے۔ تو راکھی کی ریت کیا جانے۔'' تیرا ستیاناس۔ کوشل روتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا کوشل؟'' کوشل کی ماں نے پوچھا۔

''غلطی میری تھی ماتا جی۔ ہائے میں خود اپنا شکار ہو گئی۔ ماتا جی! میں، میں اس کے پاس گئی تھی گرو جی کی بات منوانے۔ میں نے منتیں کی تھیں۔ اس نے صاف منع کر دیا تھا، میں واپس آ گئی۔ یہ اچانک میرے پاس آیا۔ دروازہ بجایا، اس نے، میں نے اسے دیکھ کر کھول دیا۔ میں خوش ہو گئی، میں نے سمجھا کہ شاید، شاید میری بات مان لے مگر ماتا جی یہ جنگلی، وحشی جانور۔ ماتا جی! اس نے مجھے بہت مارا ہے، ماتا جی! اس نے......'' کوشل بلکنے لگی اور اچانک یہ نوجوان بے قابو ہو گئے، وہ جنگلی کتوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے بالوں سے پکڑ کر مجھے گرا لیا اور لاتیں ہی لاتیں مارنے لگے۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر اور چہرہ بچا رہا تھا، میرے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ اسی وقت دروازے سے بھوریا چرن کی آواز ابھری۔

''ارے رے رے، رُک جاؤ، بس رُک جاؤ۔ مار ڈالو گے پاپی کو!''

''گیانی جی اس نے۔ اس نے۔'' جگن ناتھ کی آواز رُندھ گئی۔

''اس ناگ نے مجھے ڈس لیا ہے مہاراج! اس ناگ نے۔'' کوشل روتی ہوئی بولی۔

''ناگ تو ڈستا ہی ہے کوشل! وہ تو......'' یہ آخری الفاظ تھے جو میرے کانوں میں پڑے اور اسی وقت میری آنکھیں بند ہو گئیں، حواس نے ساتھ چھوڑ دیا۔

بھوریا چرن کا پورا جملہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بے ہوشی نہ جانے کتنی طویل تھی۔ ہوش نہ جانے کہاں آیا تھا۔ سینے پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی، چبھن سی ہو رہی تھی، پتہ نہیں کیا تھا۔ سب کچھ دفعتاً بازو میں شانے کے قریب کسی نے خنجر اُتار دیا، سینے پر دباؤ زیادہ ہو گیا، بازو کی تکلیف سے آنکھیں کھل گئیں، پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا اور خود اپنی مسلسل بھیانک چیخیں سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ میری انہی چیخوں سے میرے سینے پر بیٹھا خوفناک پرندہ بھی خوفزدہ ہو گیا۔ گدھ تھا اور میرے سینے پر بیٹھ کر ضیافت اُڑانا چاہتا تھا، اسی نے اپنی مڑی ہوئی تیز چونچ میرے بازو میں اُتاری تھی اور بازو بُری طرح اُدھیڑ دیا تھا۔ زخم سے خون کا فوارہ بلند ہو گیا اور میرے بُری طرح تڑپنے سے گدھ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس نے اپنی چھتری جیسے پَر پھیلائے اور صرف چند قدم کے فاصلے پر اُتر کر جا بیٹھا۔ وہ بھوکی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بازو کی تکلیف سے جان نکلی جا رہی تھی۔ حلق سے مشینی انداز میں کربناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ بے اختیار اُٹھ کر بھاگا اور گدھ خوفزدہ ہو کر دوبارہ اُڑ گیا۔ مجھے ٹھوکر لگی اور میں گر پڑا۔ پورے بدن میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے بدن کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ خون بُری طرح بہہ رہا تھا۔ شدت تکلیف سے دیوانہ ہو کر میں نے زخم پر منہ رکھ دیا، بہتا ہوا خون چوسنے لگا۔ گاڑھا نمکین خون جو بدن سے بہہ جانے کے لیے بے چین تھا۔

''کوئی ہے، کوئی ہے، میری مدد کرو، میری مدد کرو۔ میں مر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔'' میں نے آواز لگائی۔ گدھ مجھ سے زیادہ زوردار آواز میں چیخا اور پنجے دبا کر فضا میں بلند ہو گیا۔ میں جانوروں کی طرح اپنا بازو جھنجھوڑ رہا تھا۔ زخم کی اس جلن کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر بھاگتا رہا، گرتا رہا پھر ایک جگہ مٹی نظر آئی۔ میں نے مٹھی بھری اور اسے زخم سے لگا لیا۔ مٹی خون میں لتھڑ گئی مگر اس سے فائدہ ہوا تھا کچھ ٹھنڈک سی محسوس ہوئی تھی۔ منحوس گدھ لمبے لمبے چکر لگا کر بار بار میرے سر پر آ جاتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا، بس غلطی ہو گئی تھی اس سے ذرا دیر ہو گئی تھی۔ عالم بے ہوشی میں اسے اپنا

کام کر لینا چاہیے تھا۔ جگہ کے انتخاب میں غلطی ہوئی تھی اس سے آنکھوں پر چونچ مارنا چاہیے تھی یا پیٹ پر حملہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ بے چین تھا۔ میرے گر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ خون رُک گیا، میں مسلسل کراہ رہا تھا۔ بار بار چکرا رہا تھا۔ زمین گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں دُھندلاہٹ آ جاتی تھی لیکن سوچنے سمجھنے کی قوتیں باقی تھیں۔ گدھ سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ متحرک رہوں، اس نے اپنی زندگی کا یقین دلاتا رہوں۔ کافی آگے بڑھ آیا۔ چاروں طرف پتھروں کے انبار تھے، نہ جانے کونسی جگہ تھی۔ گدھ بہت دیر تک منڈلاتا رہا پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ جب وہ دُور نکل گیا تو میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''تھک گیا ہوں، مدد کرو میری، برداشت ختم ہو گئی ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب خودکشی کر لوں گا۔ ذمے دار میں نہیں ہوں گا۔ سن رہے ہو۔ ذمے دار میں نہ ہوں گا۔ خودکشی کر لوں گا بس...... بس...... بس۔'' جو منہ میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ پھر اُٹھ کر چل پڑا، خدا جانے کیا ہوا تھا کیسے یہاں آ گیا تھا۔ سب کچھ یاد تھا۔ مارا تھا ان لوگوں نے مجھے، کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ کچھ کہنا بیکار تھا۔ بالکل بیکار تھا۔ چلتا رہا بہت دُور نکل آیا اس جگہ سے۔ چند درخت نظر آئے۔ ان کے سائے میں ایک چشمہ تھا۔ درختوں کے نیچے گلے سڑے پھل پڑے ہوئے تھے۔ گول گول چھوٹے چھوٹے پھیکے اور بدمزہ۔ زخمی بازو تو سیدھا نہ ہو سکا، دوسرے ہاتھ سے پھل اُٹھا اُٹھا کر کھاتا رہا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑی اونچی چٹان تھی، اس کے دامن میں اینٹیں چُنی ہوئی تھیں۔ ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا۔ اس میں دروازہ تھا۔ دیکھتا رہا کوئی تجسس ذہن میں نہیں اُبھرا۔ بس ایک ہی خواہش تھی، زمین پر پڑے سارے پھل معدے میں اُتار لوں۔ حلق تک بھر لیا پانی کے چند گھونٹ لیے اور چشمے کے کنارے لیٹ گیا۔ زخمی ہاتھ پانی میں ڈال دیا، پھر زور سے چکر آیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور کوشش کے باوجود نہ کھلیں۔ مگر زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔ آنکھیں پھر کھلیں، ماتھے پر کچھ رکھا ہوا تھا۔ سینے پر وزن تھا، گدھ کا خیال آ گیا۔ پھر آ گیا۔ نیم مدہوشی کے عالم میں، میں نے سوچا۔

''شیں...... شیں...... ہو ہو...... ہا ہا میرے منہ سے آواز نکلی اور میں بے اختیار اُٹھ بیٹھا لیکن فوراً ہی کسی نے بھرپور دباؤ ڈال کر مجھے لٹا دیا اور ایک آواز سنائی دی۔

''نہیں میاں...... نہیں ہوش میں آؤ...... لیٹے رہو۔'' لیٹ تو گیا تھا مگر یہ آواز، اوہ گدھ نہیں ہے تو یہ کون ہے یہ......

اچانک ماتھے پر کوئی ٹھنڈی سی چیز آ گئی۔ آنکھیں بھی ڈھک گئی تھیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھی شے ہٹانے کی کوشش کی۔ گیلا کپڑا تھا۔ وہی نرم آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''بیٹے! آرام سے لیٹے رہو۔ دل و دماغ کو سکون دو۔ تم محفوظ جگہ ہو۔ کوئی خطرہ نہیں ہے تمہیں یہاں، بےفکر ہو جاؤ۔''

''یہ...... یہ کیا ہے۔ میری آنکھیں ہٹاؤ، اسے ہٹاؤ۔'' میں نے گیلا کپڑا آنکھوں سے ہٹا دیا۔ تب میں نے وہ چہرہ دیکھا۔ عمر رسیدہ شخص تھا۔ سفید داڑھی، چہرے پر چیچک کے دانے تھے، رنگ کالا تھا، پیشانی پر ایک گہرا نشان نظر آ رہا تھا۔

''کون ہو، کون ہو......؟''

''ایک بندۂ خدا ہوں میاں، فضل حسین ہے میرا نام......''

''مسلمان ہو......؟''

''الحمدللہ!'' فضل حسین نے کہا، میں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا، پتھروں کو چن کر ایک کمرہ سا بنایا گیا تھا۔ کشادہ اور ہوادار تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ''پانی پیو گے؟''

''ہاں...... ہاں۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ فضل حسین نے ایک آبخورے میں مجھے پانی دیا، کئی آبخورے پیے تب سکون ہوا تھا۔ میں فضل حسین کو دیکھنے لگا!

''میں نے تمہارے بازو کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی ہے۔ تمہیں شاید اس کی تکلیف کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے، خدا کے فضل سے بخار اب ہلکا ہو گیا ہے۔''

''میں اُٹھ کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''کوئی حرج نہیں ہے آؤ......'' بزرگ فضل حسین نے کہا۔ مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور پھر اس کٹیا سے باہر لے آئے۔

وہی نخلستان جیسی جگہ تھی جہاں ہوش کے عالم میں پہنچا تھا اور درختوں سے گرے ہوئے نامعلوم پھل کھائے تھے، باہر موسم بے حد خوشگوار تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

''تم یہاں تنہا رہتے ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

''بیٹھ جاؤ، بتاتا ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ فضل حسین بابا بولے۔ بالکل تنہا نہیں ہوں۔ ایک دنیا آباد ہے۔ یہاں چرند و پرند کی ہم نشینی ہے۔ خوب باتیں رہتی ہیں ان سے۔ پرندوں کی ڈاریں پانی پینے آتی ہیں، ان سے دوستی ہے۔

''کوئی انسان نہیں ہے؟''

''انسان......'' بابا فضل حسین ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

''کوئی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں...... اب تم جو آ گئے ہو......''

''تم یہاں کیوں رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا اور بابا فضل حسین ہنس پڑے۔ ''شکر ہے معبود کا، تم ٹھیک ہو گئے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب ہے؟''

''نہیں خوش ہو رہا ہوں، تین دن کے بعد ہوش میں آئے ہو۔ مگر جب ذہن میں تجسس جاگ اُٹھے تو...... خیر چھوڑ...... کہانی سناؤں۔ کہانی سننا چاہتے ہو۔ سن لو، تمہاری خوشی ضرور پوری کروں گا۔ میں یہاں کیوں رہتا ہوں۔ بس دنیا والوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میرا چہرہ دیکھ رہے ہو، بس کور چشم دنیا والے اس سے نفرت کرتے تھے، چار بھائی تھے ہم، تین خوبصورت تھے مجھے خدا نے یہ شکل دی تھی...... لوگوں نے اس کی رضا میں نکتہ چینی شروع کر دی۔ دلبرداشتہ ہو گیا۔ جھنجلاہٹوں کا شکار ہو گیا، خلق خدا سے اس کی نفرت کا بدلہ لینے لگا، تب ایک اللہ والے کی نظر ہو گئی۔ کہنے لگا فضل حسین جو یہ کر رہے ہیں وہی تم کر رہے ہو، یہ کور بینا ہیں مگر تم بینائی حاصل کرو۔ ان سے دُور ہٹ جاؤ۔ اللہ اپنے بندوں کو نقصان پہنچانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ بس میاں یہ گوشہ آباد کر لیا اور بہت خوش ہوں۔ کائنات کی سچائیاں یہاں نظر آتی ہیں۔ انسان بھٹک گیا ہے مگر اللہ کی مخلوق وسیع ہے۔ دوسرے بہت سے ہیں۔ ننھے ننھے پرندے میرے شانوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ معصوم ہیں مجھے محبت سے دیکھتے ہیں، سب سے شکایتیں ختم ہو گئیں۔''

''کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟''

''رازق سے اتنا فاصلے ہے تمہارا؟ اسے کیوں بھول گئے بیٹے! یہ درخت، یہ چشمہ، اللہ نے سب کچھ مہیا کر دیا ہے۔''

''یہ پھل کھا کر جیتے ہو؟''

''آہ...... بھٹک جانے والو نے دنیا خود پر تنگ کر لی ہے۔ اللہ کی یہ نعمت اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ شکر ہے اس معبود کا......!'' فضل حسین نے پُرتشکر لہجے میں کہا۔ پھر مسکرا کر بولے۔ ''میاں اب تمہاری باری ہے، ہمیں بھی تو کہانیاں پسند ہیں۔''

''میری کہانی موت کی کہانی ہے فضل بابا! میری کہانی سننے والا پھر کوئی اور کہانی سننے کے لیے زندہ نہیں رہتا۔''

''خوب! تمہاری کہانی کا آغاز کب سے ہوا ہے عزیزی؟''

''کیا مطلب؟'' میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔

''تمہیں یقین ہے کہ اس کائنات میں جتنی اموات ہوئی ہیں۔ تمہاری کہانی سن کر ہی ہوئی ہیں؟''

''ایسا نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں نے میرے بارے میں جان لیا ہے وہ...... وہ۔'' میں نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ بابا فضل حسین بول اُٹھے۔

''غلط مشاہدہ ہے بیٹے! موت زندگی کی طرح ایک ٹھوس سچائی ہے۔ کب آنا ہے، کب جانا ہے ہم نہیں جانتے۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''

''نہ پوچھو فضل بابا، میں ڈرتا ہوں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

''بتاؤ بیٹے! میں تمہارے دل سے خوف نکالنا چاہتا ہوں، مجھے اپنے بارے میں ضرور بتاؤ۔'' فضل حسین نے ضد کرنے والے انداز میں کہا اور میں انہیں دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اول سے آخر تک ساری باتیں انہیں بتا دیں۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ دیر تک آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ ''اس کے باوجود اپنی خوش بختی سے منحرف ہو؟''

''خوش بختی؟''

''ہاں بیٹے! ان مشکلات کے باوجود زندگی کی نعمت تمہیں حاصل ہے، ایمان کی دولت نہیں چھنی تم سے، ایک لمحے میں ایمان جاتا ہے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اپنے ایمان کے محافظ تم نہیں ہو، بخدا تمہارے ایمان کی حفاظت کی گئی ہے ورنہ ایک لمحہ درکار ہوتا ہے...... صرف ایک لمحہ! یقیناً کچھ ذمے داریاں تم سے منسوب کی گئی ہیں، کوئی کام کرنا ہے تمہیں، ضرور کوئی کام کرنا ہے۔ ایک سوال کروں بیٹے تم سے؟''

''ضرور۔''

''اسپتال میں تھے، کوڑھی ہو گئے تھے، نماز شروع کر دی تھی، سلیم کے کہنے سے کر دی تھی نا؟''

''ہاں۔''

''چھوڑ دی۔''

''ایں ہاں...... وہ...... بس حالات...... میں آپ کو بتا چکا ہوں؟'' میں نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔

''بیٹے! جو حالات تم نے سنائے ہیں ان میں کوئی ایسا مقام نہیں آتا جہاں تمہیں نماز پڑھنے میں دقت ہو۔ دراصل تم نے غور نہیں کیا۔ سوچا نہیں، ورنہ تم خود مجھے بتا رہے ہو کہ سکون کا آغاز کہاں سے ہوا، تمہیں نماز نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔'' آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا، گزرے ہوئے واقعات یاد آئے تو احساس ہوا کہ وہ لمحات واقعی بہتری کے آغاز کے تھے حالانکہ میں نے فضل حسین بابا کو اتنی تفصیل سے واقعات نہیں سنائے تھے، ہاں بس سرسری طور پر ان کے بارے میں بتایا تھا۔ میں سوچتا رہا......

فضل بابا بولے ''تاہم وقت ہے۔ جو گیا سو گیا، جو کل نہ کیا آج سہی۔ ابھی سے سہی۔ بازو کے زخم پر پٹی باندھ دی ہے، اس نیت سے چشمے پر جا کر غسل کرو۔ جاؤ بیٹے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔''

◆✣◆✣◆

میں اُٹھ گیا، چشمے پر جا کر غسل کیا اور پھر فضل حسین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''بھوک لگی ہے؟''

''ابھی نہیں۔''

''چلو دو زانو بیٹھ جاؤ۔ آنکھیں بند کرو، سانس کو ناک سے کھینچو اور سانس کی آواز میں کہو۔'' اللہ ہو...... اللہ ہو...... دیکھو اس طرح۔ بابا فضل حسین خود دو زانوں بیٹھ گئے اور پھر ان کا سانس چلنے لگا۔ ''اللہ ہو...... اللہ ہو......'' فضا میں ساز بجنے لگے۔ ذہن سحر میں ڈوب گیا، چاروں طرف سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ ''اللہ ہو...... اللہ ہو......'' کہ جانے کب...... نجانے کب کیسے، میرا سینہ بھی چلنے لگا، میں سانس کھینچ رہا تھا۔ اللہ کو پکار رہا تھا اور ایک بے خودی سی طاری ہو گئی تھی۔ یہ آواز میرے وجود میں طرب بن گئی تھی۔ کچھ ہوش ہی نہ رہا تھا، یہاں تک کہ بابا فضل حسین نے تھپکی دی۔ مغرب کا وقت ہو گیا ہے چلو نماز پڑھیں۔ ''میں آنکھیں کھول کر حیران نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔''

''کیا میں سو گیا تھا؟''

''نہیں جاگ رہے تھے، جو جاگتا ہے وہی پاتا ہے۔ وضو کر آؤ۔'' ہم دونوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد کچھ دیر دم کشی کی۔ فضل بابا نے اس عمل کا یہی نام بتایا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ان درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ درختوں سے

پھل برس رہے تھے۔ ہواؤں کے جھونکوں سے ڈالیاں ہل رہی تھیں اور پھل نیچے گر رہے تھے۔ کافی پھل سمیٹے اور کھانے لگے۔ لیکن میں ایک بار پھر حیران رہ گیا میں نے پہلے بھی یہ پھل کھائے تھے مگر اس وقت یہ پھیکے اور بدمزہ تھے مگر اب! مجھ کسی کے الفاظ یاد آئے۔'؟' پہلے پھل چکھو...... پھر کھاؤ۔''

رات کو ہم دونوں کٹیا میں لیٹ گئے۔ میں نے فضل بابا سے کہا۔''آبادی یہاں سے کتنی دُور ہے؟''

''انسانی آبادی تو بہت دُور ہے۔''

''پتہ نہیں ان لوگوں نے کیا کیا تھا۔ وہ شاید مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے، پھر زندہ کیوں چھوڑ دیا اور زندہ چھوڑا تو پھر یہاں اتنی دُور مجھے کیوں پھنکوایا۔ اس سے کیا مقصد تھا ان کا؟''

''چھوڑو میاں، جو بیتا سو کل، آج کی سوچو۔''

''آپ انہی پھلوں پر زندہ رہتے ہیں؟''

''دو بیج لگائے تھے ان کے۔ درخت بنے اور پھر دیکھو کیسے بکھر گئے۔ شکر نہ کرو گے؟'' میں خاموشی سے فضل بابا کو دیکھتا رہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ فضل بابا کے ساتھ اب دل لگنے لگا تھا۔ بہترین مشغلہ یادِ الٰہی تھا سب کچھ ذہن سے محو ہو جاتا تھا۔ نماز باقاعدگی سے جاری تھی۔ زندگی کا ایک معمول سا بن گیا تھا۔ فضل بابا کی باتوں میں بڑی گہرائی ہوتی تھی، ایک دن میں نے کہا۔

''فضل بابا میں نے ایک نشست میں ایک ہزار بار دَم کشی کی، تب کہیں جا کر رُکا۔''

''گن رہے تھے؟''

''ہاں! گن کر دَم کشی کر رہا تھا۔''

''دو بیج بوئے تھے میں نے۔ دو درخت اُگے تھے پھر درخت ہی درخت بکھر گئے۔ کتنے پھل کھا چکے ہو گے تم ان درختوں کے۔''

''اندازہ نہیں۔''

''واہ میاں مسعود! خوب اس کا مال بے حساب کھاؤ اور یاد نہ رکھو اور اس کا نام گن گن کر لو۔ اپنا حساب خوب یاد رکھو۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بے حساب دیتا ہے، اسے بے حساب یاد کرو۔''

''اللہ کو یاد رکھو، اس کے ساتھ پا لیا تو پھر کچھ دُور نہیں رہے گا۔'' اُنھوں نے مجھے تسلی دے کر کہا۔ بازو کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ جسم کی چوٹوں کا تو پہلے ہی احساس نہ رہا تھا حالانکہ کوئی علاج نہیں کیا تھا، کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تھا، اس دن ظہر کی نماز کے بعد کٹیا میں آرام کر رہا تھا، فضا میں دھوپ کے ساتھ حبس کی کیفیت تھی پھر بادل چھانے کا احساس ہوا اور اندھیرا سا ہونے لگا۔ موسم کا جائزہ لینے باہر نکل آیا۔ دیکھا تو آسمان پیلا ہو رہا تھا۔ گرد و غبار بلندیوں پر پہنچا نظر آ رہا تھا۔ غالباً آندھی چڑھ رہی تھی۔ فضل بابا بھی باہر نکل آئے۔

''آندھی چڑھ رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''خطرناک ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ فضل بابا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کسی سوچ میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔ پھر نجانے کیا سوچ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور زمین پر ایک گہری لکیر بنا دی۔ پھر وہیں کھڑے کچھ پڑھتے رہے۔ اس کے بعد لکیر سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر مجھ سے بولے۔

''اس حصار کے پیچھے رہنا۔''

''کیوں؟''

''دیکھو...... آندھی آ گئی۔'' وہ میری بات کے جواب کے بجائے بولے۔ گرد و غبار کا کالا طوفان نزدیک آ گیا۔ ہواؤں کی ایسی خوفناک گڑگڑاہٹ اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔ ایسی بھیانک آواز تھی جیسے زمین و آسمان ہل رہے ہوں،۔ ایسا اندھیرا

چھا رہا تھا کہ دن کی روشنی چھپ گئی تھی مگر پھر ایک احساس اور ہوا۔ ہم کٹیا سے باہر کھڑے تھے۔ ہواؤں کو دیکھ رہے تھے مگر یہ ہوائیں ہمارے جسموں کو نہیں چھو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کہیں اور سے انہیں دیکھ رہے ہوں۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے تھے نجانے کیا کیا ہو رہا تھا مگر ہم محفوظ تھے۔ پھر بادل گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔ ہم کٹیا میں آ گئے۔

''بڑی خوفناک آندھی تھی۔'' میں نے کہا مگر فضل بابا کسی سوچ میں گم تھے، وہ کچھ نہ بولے۔ بارش تیز نہیں تھی، اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر اتنا کہ ماحول نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ باہر سے عجیب سی گھنٹیوں کی آواز ابھرنے لگی۔ خاصی تیز آواز تھی اور قریب آتی جا رہی تھی۔ فضل بابا اٹھ کھڑے ہوئے، میں بھی یہ آواز سن کر حیران ہوا تھا۔ فضل حسین کے ساتھ باہر نکلنے لگا تو وہ بولے۔

''مسعود میاں! ہماری ہدایت یاد رکھنا جو لکیر ہم نے بنائی ہے اس سے باہر قدم نہ نکالنا۔ آؤ مل لیں اس سے۔'' میں حیران سا باہر نکل آیا۔ مدھم مدھم بوندیں پڑ رہی تھیں اور کٹیا سے کچھ فاصلے پر کالے رنگ کا ایک بڑے سینگوں والا بھینسا نظر آ رہا تھا۔ جس کی گردن میں لوہے کی لمبی لمبی دو گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ بھینسے کی پیٹھ پر کالا بھجنگ بھوریا چرن بیٹھا ہوا تھا، اس نے ہمیشہ کی طرح نچلے بدن پر ایک دھوتی نما کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ گردن میں کوڑیوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں، جن میں رنگین دھاگے لٹک رہے تھے۔ سر پر ایک بڑی سی انسانی کھوپڑی ٹوپی کی طرح پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی لکڑی تھی جس میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ سینے پر مالاؤں کے درمیان لکڑی کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا سنکھ منہ سے لگایا اور فضا میں ناقوس کی آواز ابھری، ساتھ ہی وہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کی جنبش سے اس کے گھنگرو بجانے لگا۔ فضل حسین بابا خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سنکھ منہ سے ہٹا کر اس نے ایک لمبی بھیانک تان لگائی اور بولا۔

''جے بھورنا مچنڈا...... جے کالی چنڈال۔''

''اللہ کا نام سب سے بڑا۔'' فضل بابا بولے۔

''کون ہو میاں جی...... ہمارے منہ کیوں لگ رہے ہو؟'' بھوریا چرن نے فضل بابا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے، کیا پریشانی ہے تجھے؟''

''سب جانتے ہو، انجان نہ بنو۔''

''تو ناپاک ہے، مردود ہے، غلیظ ہے، جا بھاگ جا، کسی پر زندگی تنگ کرنا اچھا نہیں ہوتا۔''

''ہمارا نوالہ چھین رہے ہو، اچھا نہ ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے، اسے ہمیں دے دو۔''

''مسلمان بچہ ہے بھوریا چرن اور مسلمان کے پاس ہے۔ کسی مسلمان نے کبھی ایسا کیا ہے؟ یہ میرا مہمان ہے۔''

''اسے مہمان نہ بناؤ، ہم شنکھا ہیں بھسم کر دیں گے، راکھ کر دیں گے۔ ہم سے ٹکرانا مت میاں جی۔''

''جا...... چلا جا یہاں سے غلاظت کے پتلے، تیرا کالا جادو محدود رہے گا، ہم تجھے بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، تھک گیا ہے یہ، اب خطرہ ہے کہ ایمان نہ کھو بیٹھے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیا دے دو گے اسے میاں جی، کیا کیا دے دو گے؟ اسے ہمارا کام کرنا ہے۔ ضرور کرنا ہے۔''

''اب تک نہ تو کیا بھوریا چرن۔۔ تجھے اب بھی اپنی اوقات پتہ نہ چلی، بہتر ہے بھاگ جا، کیا فائدہ جھگڑے سے ورنہ اپنے جیسے بہت سوں کی جان گنوائے گا۔''

''ٹھیک ہے میاں جی، پھر تماشا دیکھو۔'' بھوریا چرن نے کہا اور بھینسے کا رخ تبدیل کر دیا میں پتھرایا ہوا خاموش کھڑا تھا، وہ واپس نہیں گیا بلکہ کچھ دُور جا کر رُک گیا اور پھر بھینسے کا رُخ ہماری طرف ہو گیا اور وہ ہولناک آواز سے اپنے کھر سے زمین کریدنے لگا۔ بھوریا چرن کی سرخ آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ کالا بھینسا سر جھکائے پھنکار رہا تھا۔ وہ کھروں سے زمین کرید رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے قدموں کی دھمک اُبھری، زمین پر جیسے ڈھول بجنے لگے، فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے چند چھلانگوں میں وہ ہمارے قریب پہنچنے والا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ یہی تصور دل میں ابھرا تھا کہ بھینسے کی ایک ہی

ٹکر ہمارے جسموں کے پرخچے اڑا دے گی، پلک جھپکنے کا کھیل تھا اور پلک جھپکتے سب کچھ ہو گیا تھا۔ ایسی ہی آواز ابھری جیسے دو چٹانیں آپس میں ٹکرائی ہوں، بھینسا ہم تک نہیں پہنچ سکا تھا اور درمیان میں ہی کسی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ بھینسے کا سر پھٹ گیا، گردن ٹوٹ کر لٹک گئی اور بھوریا چرن اچھل کر دُور جا گرا۔ بھینسا لٹکی ہوئی گردن لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ کئی بار گرا، کئی بار اُٹھا، پھٹے ہوئے سر سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ ادھر بھوریا چرن اس طرح ساکت پڑا تھا جیسے مر گیا ہو، بھینسا آخری بار گرا تو پھر نہ اٹھا بلکہ اس کا لمبا چوڑا بدن کسی پھرکنی کی طرح زناٹے سے زمین پر گھومنے لگا۔ آپ نے ممکن ہے کبھی مکھی کو دیکھا ہو جو اُلٹی ہو جاتی ہے اور چونکہ وہ بدن کا کوئی حصہ زمین پر لگا کر اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس لیے بدن کی پوری قوت سے پھرکنی کی طرح گھومتی ہے تاکہ سیدھی ہو جائے، یہی کیفیت اس وقت بھینسے کے قوی ہیکل بدن کی تھی۔ اس کے بدن کے گھومنے سے بڑی بھیانک آواز پیدا ہو رہی تھی مگر دوسرا حیرت ناک منظر یہ تھا کہ اس طرح اس کا حجم چھوٹا ہوتا جا رہا تھا اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ وہ ایک فٹ سے زیادہ کا نہ رہ گیا، تب وہ رکا اس کی ہیئت بدل گئی تھی، پھر اچانک میں نے اسے ایک چیل جیسے پرندے کی شکل اختیار کرتے دیکھا، وہ دو پیروں پر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، دو تین بار وہ گرا اور پھر ایک کریہہ چیخ مار کر فضا میں بلند ہو گیا۔ کوئی پانچ فٹ اونچا اٹھ کر وہ نیچے گیا اور زمین پر دُور تک دوڑتا چلا گیا، دوبارہ بلند ہو کر گرا مگر تیسری کوشش کے بعد وہ پرواز کرنے میں کامیاب ہو گیا، بھوریا چرن اسی طرح ساکت پڑا تھا۔

دیر کے بعد میرے حواس بحال ہوئے، میں نے بابا فضل حسین کو دیکھا، ہونٹ ہل رہے تھے ان کے، جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں، ۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''مر گیا وہ......؟'' میرے بدن کو جنبش ہوئی تو شاید بابا فضل حسین سمجھے کہ میں بھوریا چرن کو قریب سے دیکھنے جا رہا ہوں، ان کے منہ سے یہ تیز آواز نکلی۔

''ہونہہ...... ہونہہ...... میں ساکت ہو گیا، بابا فضل حسین پڑھتے رہے، پھر بولے۔ ''مکاری کر رہا ہے کمینہ۔'' ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ بھوریا چرن اٹھ کھڑا ہوا، وہ بری طرح اچھل کود کرنے لگا، ہماری طرف بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے کچھ ٹٹولنے لگا، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا رہے ہیں اور وہ اس کے دوسری طرف آنا چاہتا ہے مگر نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بھوریا چرن رک گیا، ہمیں گھورتا رہا، پھر اس نے سانس کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے ''ہو ہو'' کی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں اور ہر آواز کے ساتھ اس کا قد بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کوئی دس فٹ لمبا ہو گیا اور پھر چوڑائی میں پھیلنے لگا۔ خوفناک آوازیں مسلسل اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بھیانک عفریت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کا مختصر لباس چیتھڑے ہو گیا تھا، یہ حجم حاصل کر کے وہ ایک بار پھر ہماری طرف بڑھا اور پھر دونوں ہاتھوں کی طاقت سے اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کرنے لگا جو اسے ہم تک پہنچنے سے روک رہی تھی۔

''کوئی شنکھا اس رکاوٹ کو نہیں توڑ سکتا بھوریا...... تو کوشش کر کر کے مر جائے گا۔'' بابا فضل حسین نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھوریا چرن بھیانک چیخیں مار مار کر دیوار سے زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگا، اچانک اسے درخت نظر آئے اور وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ آہ ایک کے بعد ایک بھیانک منظر نظر آ رہا تھا، مگر میں ایسے لاتعداد مناظر سے نہ گزر چکا ہوتا تو دل ساتھ نہ دے پاتا۔ اس کی حرکت بند ہو جاتی، میں نے دیکھا کہ بھوریا چرن نے درخت کے تنے سے ہاتھ لپیٹے اور اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا، پھر دوسرے اور تیسرے درخت کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا اور پھر سارے درخت اسی طرح اکھاڑ پھینکے۔ بابا فضل حسین نے کہا۔

''ہاں...... ایک شنکھا یہ کر سکتا ہے۔'' بھوریا چرن نے گھور کر انہیں دیکھا، پھر وہ پانی کے چشمے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس انسان نما دیو کو ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دیکھا، اس نے منہ پانی میں ڈال دیا اور چشمے کا پانی ختم ہونے لگا مگر اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی، اس نے کئی بار چشمہ خالی کیا مگر اس میں مزید پانی پھوٹ آتا اور چشمہ دوبارہ بھر جاتا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ اندازہ ہونے لگا کہ بھوریا چرن اپنے آپ کو اس کوشش میں ناکام محسوس کر رہا ہے۔ وہ تھک کر کھڑا ہو

گیا اور پھر اچانک اس نے چشمے کے پانی میں تھوک دیا، بابا فضل حسین کے منہ سے نکلا۔
''لعنت ہے تجھ پر، لعنت ہے، لعنت ہے تجھ پر ناپاک، اب بلاشبہ تو نے کامیابی حاصل کرلی۔'' یہ کہہ کر بابا فضل حسین خاموش ہو گیا۔ بھوریا چرن زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی جسامت کم ہونے لگی، کچھ ہی دیر میں وہ اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا لیکن اب وہ بے لباس تھا کیونکہ لباس تو پہلے ہی جسم بڑا ہونے کی وجہ سے اس کے جسم سے جدا ہو گیا تھا۔ اس نے زمین سے پتھر کا ایک ٹکڑا اٹھایا، ایک تکون بنائی اور اس کے بیچ پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہم سے کوئی آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا اس کا...... اس نے ہم دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے میاں جی! ہماری تمہاری خوب چلی مگر چھپ کر بیٹھ گئے ہو بزدلوں کی طرح...... ذرا باہر آؤ پھر دو دو ہاتھ ہوں؟'' بابا فضل حسین ہنس پڑے، پھر انہوں نے کہا۔
''حکم نہیں ہے بھوریا، ورنہ تجھ سے بات کرتے۔''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب نہ یہ پھل تمہیں ملیں گے اور نہ ہی پانی، بھوکے پیاسے بیٹھے رہو، دیکھوں میں بھی کہ کب تک بیٹھے رہتے ہو، بھوک سے مرو گے تو باہر نکلو گے۔''
''وہی بات ہے بھوریا چرن کہ شریف اپنی شرافت سے مرتا ہے اور ذلیل سمجھتا ہے کہ شریف اس سے ڈر گیا، ٹھیک ہے یہ بھی دیکھیں گے، یہ بھی دیکھ لیں گے...... چلو میاں یہ باؤلا کتا تو دانت مار کر خاموش ہو گیا ہے، اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو، آرام کرو۔''
''بابا فضل حسین میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے جھونپڑے نما حصے میں داخل ہو گئے، میرا دل لرز رہا تھا، بدن پر کپکپی طاری تھی، وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولے۔'' اطمینان سے آرام کرو، اگر ان ناپاک قوتوں کو ایسی ہی طاقت مل جائے تو دنیا کا سکون غارت ہو جائے، یہ کالے جادو کے ماہر اپنے جنتر منتر سے بے شک ناپاک قوتیں حاصل کر لیتے ہیں لیکن میاں، کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اللہ کا نام سب سے بڑا ہے۔ شیطان کو طاقت دی گئی ہے اور شیطان اپنی طاقت آزماتا پھرتا ہے لیکن بس محدود ہے وہ۔۔ اس سے آگے اس کے راستے بند ہیں، آرام کرو۔''
وقت کا صحیح طور پر اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ سارا بھیانک ڈرامہ نجانے کتنی دیر جاری رہا تھا۔ اب چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی تھی، میں سیدھا سیدھا لیٹ گیا، اندر کھانے پینے کا جو سامان موجود تھا، رات کو کھانے کے طور پر استعمال کیا، میں نے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت کھایا، دل پر خوف و دہشت طاری تھی، باہر بھوریا چرن علی الاعلان موجود ہے اور ہمیں بھوکا مارنے کی فکر میں ہے، کم بخت نے سارے درخت تباہ کر دیئے، چشمہ غلیظ کر دیا تھا اور اب اس کا پانی کسی بھی طور پینے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ آنے والا وقت اپنی آواز میں بتا رہا تھا کہ کیا لمحات آنے والے ہیں۔ بابا فضل حسین جائے نماز بچھا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ عشاء کی نماز میں نے پڑھی اور اس کے بعد میں پھر دراز ہو گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں باہر نکل کر دیکھوں کہ بھوریا چرن کوئی نئی کارروائی تو نہیں کر رہا ہے، کیا کیا پینترے نہیں بدلے تھے اس نے مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ایک بھرپھر دل کو ڈھارس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری دادرسی کی جا رہی ہو لیکن بہت زیادہ پُرامید نہیں تھا۔ نجانے کس وقت نیند آ گئی، جاگا تو دن چڑھ چکا تھا اور دھوپ خوب تیز پھیل گئی تھی، بابا صاحب ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے کہا۔
''بھوریا چرن موجود ہے؟''
''ہاں کتا تاک لگائے بیٹھا ہوا ہے۔''
''اب کیا ہوگا بابا صاحب......؟''
''کچھ نہیں میاں، وقت خود فیصلے کرے گا، میں نہیں جانتا کہ اب کیا ہوگا......؟''
''باہر نکل کر دیکھ سکتا ہوں میں اسے؟''

''ہاں ہاں، جو جگہ ہم نے قائم کر دی ہے اور تم سے درخواست کی ہے کہ اس سے باہر قدم نہ نکالنا بس وہیں تک رہنا، دس بار چاہو تو جا سکتے ہو۔''

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ بابا صاحب میرے پیچھے ہی تھے، بھوریا چرن اپنی مخصوص جگہ آنکھیں بند کئے دھونی رمائے بیٹھا ہوا تھا، اس کا بھیانک اور بد ہیئت چہرہ بڑی عجیب وغریب کیفیات کا حامل تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، میں نے بابا صاحب سے کہا۔

''اگر ہم اس جگہ سے باہر قدم نکالنا چاہیں تو کیا ہماری راہ میں بھی رکاوٹ ہوگی؟''

''بالکل نہیں...... مگر ایسا کرنا نہیں تم، جب تک میں نہ کہوں۔'' ہم بھوکے رہیں گے تو یہ بدبخت بھی تو بھوکا ہی مرے گا...... یہ اپنے لیے غلاظتیں ضرور حاصل کر سکتا ہے مگر یہ غلاظتیں اس کی شکم سیری نہیں کر پائیں گی۔''

یہ سارے رمز میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ بس دیکھتا تھا، دیکھتا رہتا تھا، کئی بار دل میں یہ خیال ابھرا تھا کہ کاش مجھے بھی ان تمام چیزوں سے آشنائی حاصل ہوتی، بھوریا چرن کو دیر تک دیکھتا رہا اور اس کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر واپس اپنی جگہ آگیا۔

بابا فضل حسین بھی خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گئے تھے۔ یوں پورا دن گزر گیا، پھر رات گزرنے لگی، پیاس شدید محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک بھی لگ رہی تھی مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ البتہ یہ محسوس کیا تھا کہ بابا صاحب نے کئی بار مجھے تشویشناک نگاہوں سے دیکھا ہے اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ تین دن گزر گئے، پورے تین دن، اب تو ہاتھ پیروں میں جان بھی نہیں رہی تھی۔ ہمارا دشمن ہمارے سامنے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ رات کو اگر وہ کچھ کھا پی لیتا ہو تو کھا پی لیتا ہو، دن میں کئی بار اس پر نگاہیں ڈالتے تھے اور اسے اسی طرح ساکت و جامد بیٹھے پاتے تھے۔ وہ بھی جان ہی کو اٹک گیا تھا کیونکہ بدترین شکست سے دوچار ہوا تھا، میں اپنی تمام ہمتیں کھو بیٹھا، تین دن بھوکا پیاسا رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بدن کی ساری قوتیں ختم ہو گئی ہوں۔ گلا خشک تھا، سر چکرا رہا تھا، آنکھوں کی بینائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی بابا فضل حسین کے چہرے پر نگاہ دوڑاتا تو اس پر تشویش کے آثار پاتا، اس وقت بھی وہ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کئے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے گردن اٹھائی میری طرف دیکھا اور پھر ان کی آواز ابھری۔

''مسعود میاں اُٹھ کر آؤ، میرے پاس آؤ، میں نے نجانے کس طرح اپنے لاغر اور بے جان جسم کو گھسیٹا، کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا، بہرطور کسی نہ کسی طرح بابا فضل حسین کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ان کے چہرے پر بھی مردنی چھائی ہوئی تھی، ہونٹ خشک تھے، آواز بھی نحیف ہو گئی تھی، کہنے لگے۔

''میں جانتا ہوں بڑا مشکل کام ہے، بہت مشکل ہے۔ میں تو شاید اسے اس طرح برباد کر دیتا کہ دوبارہ کسی کو للکارنے کی جرأت نہ ہوتی اسے، لیکن میں تم نوجوان ہو، تمہارے بدن کو ہر چیز کی ضرورت ہے، اس لیے کچھ اور سوچ رہا ہوں، دیکھو میاں کہنے کی بات نہیں ہے، نہ ہی احسان ہے کسی پر، بس کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو اپنے لیے وقت مانگتی ہیں اور جب وقت آتا ہے تب انسان کچھ بھی کرے، تکمیل خود بخود ہو جاتی ہے، میرا خیال ہے میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہوں گی، ظاہر ہے غذا اور پانی اللہ کا حکم ہے اور اس سے دُوری بہرطور بہت سی کمی پیدا کر دیتی ہے، میرا خیال ہے مسعود میاں بات ختم کر دینی چاہیے، لو یہ لوح رکھو، تمہارے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔ انہوں۔ نے اپنے لباس سے ایک سفید چھوٹی سی تختی نکال کر مجھے دی۔

''یہ میرا اثاثۂ حیات ہے، سامنے کی سمت رخ کر کے داہنے بازو پر باندھ لو، اس کے ساتھ ہی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے پورے غور سے سنو، ہوش وحواس ساتھ دے رہے ہیں۔''

''جی بابا فضل حسین۔'' میں نے کہا۔

''میں بے علم انسان ہوں مسعود میاں! بڑی کم معلومات ہیں مجھے، تمہیں کوئی علم نہیں دے سکتا، بس جو تھوڑا بہت جانتا

ہوں بتائے دے رہا ہوں۔ علم کی وسعت اس کائنات کے سارے سمندروں سے کروڑوں گنا زیادہ ہے۔ معرفت عطیہ الٰہی ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا، بس اس کی دَین ہے جسے چاہے اشارے کر کے دے دے، جو کچھ مل جائے اس پر شکر ضروری ہے اور اس کی ہوس سب کچھ چھین لیتی ہے، چنانچہ قناعت کرنا جو ملے، اسے امانت جاننا اور امانت میں اپنا حصہ نہیں ہوتا، ہاں صاحب امانت جو اجازت دے، بدی کو تلاش نہیں کرنا پڑتا، بدی خود بولتی ہے، جان لو تو تفریق نہ کرنا، دین دھرم کی کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور سب اسی مٹی کی تخلیق ہیں اور مٹی کا مالک آسمان والا ہے، ہوش و حواس ساتھ دے رہے ہیں......؟''

''جی......'' میں نے کہا

''ان الفاظ کو گم نہ کرنا...... یہ امانت کے طور پر دے رہا ہوں تمہیں۔ آنکھیں بند کر لو۔ ذہن کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر لو۔'' انہوں نے دوبارہ کہا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ فضل حسین بولے۔

''صاحب ایمان ہو، ایمان قائم ہے یہی تمہاری جیت ہے، وہ نہ مانگنا جو نہ ملے، کچھ طلب کیا جائے اور پاؤ تو دے دینا، دل وہ چیز ہے جو فیصلہ کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن سرکشی کرے تو تسلیم نہ کرنا......! اپنی طلب اپنی ذات کو پیچھے رکھنا تاوقتیکہ لکیر ختم نہ ہو جائے۔ تمہیں یہ لکیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کرنی ہے بس اس کے بعد تمام راستے کشادہ ہو جائیں گے، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

بابا صاحب خاموش ہو گئے۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولیں، دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ اور شاید آدھا گھنٹہ گزر گیا، پھر آنکھیں خود بخود کھل گئیں، پہلی نگاہ بابا صاحب پر ڈالی اور دہل کر رہ گیا وہ کروٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے، آنکھیں بے نور تھیں اور بدن ساکت...... گھبرا کر نبضیں ٹٹولیں مگر جسم سے روح کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا، وہ رخصت ہو گئے تھے، یقین نہ آیا، نہ جانے کتنی آوازیں دیں، انہیں ہلایا، جلایا اور دَم بخود رہ گیا۔ آہ...... بابا فضل حسین اب دنیا میں نہیں تھے۔ یہ کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا سب کچھ بھول گیا، سارا خوف دل سے نکل گیا نہ بھوریا چرن یاد رہا نہ بھوک پیاس...... بابا فضل حسین کے بچھڑ جانے کا غم تھا اور دل رو رہا تھا، بہت دیر اسی طرح گزر گئی، میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، چنانچہ اٹھا اس پتھروں سے چنی ایک کمرے کی عمارت کے بائیں سمت گیا، وہاں کدال پڑی ہوئی تھی، اٹھائی اور پتھروں میں سوراخ کرنے لگا۔ میری کدال نے چٹانیں شق کر دیں اور میں نے رکے بغیر ایک گہرا گڑھا تیار کر لیا، اس کے بعد بابا فضل حسین کے جسدِ خاکی کو اس میں اتار کر میں نے اسے بند کر دیا۔ پتھروں سے اسے اچھی طرح ڈھکنے کے بعد میں نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی، انہوں نے کہا تھا۔

''اب یہاں رکنا مناسب نہیں ہے مسعود میاں، یہاں سے چل پڑو اور چلتے رہو۔'' میں نے ایسا ہی کیا، اس جگہ پہنچا جہاں بھوریا چرن دھرنا مارے بیٹھا تھا، وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ شاید اکتا کر وہاں سے چلا گیا تھا، کوئی خاص خیال نہ آیا چلتا رہا، ساری رات سر سے گزر گئی، صبح کی روشنی میں ایک بستی کے آثار نظر آئے، قدم رک گئے۔ مسجد کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، دور سے کچھ مینار نظر آئے اور قدم اس طرف اٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ چلتا مسجد کے نزدیک پہنچ گیا، مسجد کے عین سامنے ایک جھونپڑا نما ہوٹل تھا، جہاں دو آدمی صفائی ستھرائی میں مصروف تھے، میں ان کے سامنے سے گزرا اور میں نے انہیں سلام کیا، دونوں چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

''مسلمان ہوں؟'' میں نے رک کر پوچھا۔

''جی...... جی ہاں۔'' دونوں بیک وقت بولے۔

''سلام کا جواب نہیں دیا۔''

''وغلطی ہو گئی، وعلیکم السلام۔''

''کیا کر رہے ہو؟''

''تیاریاں...... نمازی نماز سے فارغ ہو کر چائے پینے آتے ہیں، اس وقت تک ہم چائے تیار کر لیتے ہیں۔''

''اور تم نماز نہیں پڑھتے؟'' میں نے کہا اور وہ دونوں جھینپے جھینپے نظر آنے لگے۔ ''واہ دوستو، چراغ تلے اندھیرا۔ اللہ کے گھر کے سامنے رہتے ہو اور اللہ کے سامنے نہیں جاتے، بُری بات ہے۔ آؤ چلو نماز پڑھو'' وہ دونوں سب کچھ چھوڑ کر میرے ساتھ چلتے ہوئے مسجد میں داخل ہو گئے۔ بہت سے بندگانِ خدا نماز پڑھنے آ رہے تھے، میں وضو کرنے بیٹھ گیا، غذا اور پانی کو ترسا ہوا تھا مگر کسی چیز کی حاجت نہ ہو رہی تھی، وضو کرتے ہوئے کلی بھی کی تھی مگر پانی کا قطرہ حلق سے نہ اتارا، وہ دونوں میری تقلید کر رہے تھے، قریب کھڑے ہو کر نماز پڑھی، نماز کے بعد مؤذن صاحب نے کہا۔

''شیخ رحمت اللہ صاحب کے بیٹے عظمت اللہ کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے، جنازہ گیارہ بجے پڑھایا جائے گا، آپ لوگوں میں سے جسے وقت ملے شرکت فرمائیے۔'' میرے ساتھ نماز پڑھنے والے دونوں افراد میں سے ایک نے کہا۔

''ارے عظمت اللہ کی بیوی کا انتقال ہو گیا، ابھی پچھلے سال ہی تو شادی ہوئی تھی اس کی۔''

''ہاں مجھے خود حیرت ہے۔'' پھر ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔

''ہمارے ساتھ آئیے حضرت! ایک پیالی چائے پی لیجئے ہمیں خوشی ہوگی۔''

''نہیں میاں ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''شرمندہ نہ فرمائیے حضرت! ہماری چھوٹی سی خواہش پوری ہو جائے گی، ہم بہت غریب ہیں مگر یہ معمولی سی خدمت تو کر سکتے ہیں۔''

''اصرار کر رہے ہیں تو انکار نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا اور ان کے ساتھ مسجد سے باہر نکل آیا، ان میں سے ایک نے کہا۔

''ہمارا یہ ہوٹل بھائیوں کا ہوٹل کہلاتا ہے، ہم دونوں سگے بھائی ہیں، میرا نام شعبان ہے اور میرے بھائی کا نام رمضان ہے۔ ہم شادی شدہ ہیں اور بیوی بچے ہیں، ہماری گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے، بس اللہ کا احسان ہے۔'' میں ان کے ساتھ ہوٹل آ گیا، وہ جلدی جلدی تیاریاں کرنے لگے، لوگ آنا شروع ہو گئے اور بنچوں پر بیٹھ گئے۔

''چلو بھئی رمضان چائے پلاؤ۔'' آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''بس ابھی تیار ہوئی۔''

''شعبان میاں آج تو مسجد میں نظر آ رہے تھے، نماز شروع کر دی کیا؟'' ایک بزرگ نے پوچھا۔

''ہاں علیم چچا بس اللہ کا کرم ہے۔''

''میاں ہو گیا کرم، اور دلدّر دُور۔'' علیم چچا نے کہ، بہت سے لوگ آ کر بنچوں پر بیٹھ گئے تھے، ایک نے کہا۔

''اماں فضل بھائی یہ شیخ صاحب کی بہو کو کیا ہو گیا؟''

''کچھ پتہ نہیں پہلوان...... تین چار دن سے بڑی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا مگر بھائی بڑے آدمی ہیں، کون پوچھے، کون بتائے اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں یہ لوگ، ویسے دِل دُکھا، شادی کو سال پورا ہوا ہوگا۔''

''بال بچے کی خبر سنی تھی کچھ۔''

''ہو سکتا ہے؟''

''چکر تو لگانا چاہیے۔''

''ہاں ہاں بستی والے ہیں جائیں گے کیوں نہیں۔'' رمضان اور شعبان چائے بنا رہے تھے اور لوگ آ آ کر بیٹھتے جا رہے تھے مگر چائے کی پہلی پیالی رمضان نے مجھے لا کر دی تھی۔

''دوسرے مہمان بھی تو ہیں رمضان بھائی۔''

''سب کو دے رہا ہوں میاں صاحب! آپ لو۔'' میں نے چائے لی، صبر و سکون سے ٹھنڈی ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پھر شکر الحمدللہ کہہ کر چائے کا پہلا گھونٹ لیا، نہ جانے کتنے دن کے بعد یہ دودھ چینی کا سیال حلق سے اترا تھا مگر کوئی خاص بات

نہیں محسوس ہوئی، مالک نے سیری بخشی تھی خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ رمضان اور شعبان کچھ حیران نظر آ رہے تھے، دونوں خوب بھاگ دوڑ کر رہے تھے، گاہک تھے کہ ٹوٹ نہ رہے تھے، سورج خوب چمک اٹھا، رمضان نے شعبان سے کہا۔

''شعبان! سامان لاؤ...... ابراہیم بھائی کی دکان کھل گئی ہوگی، پتی اور چینی لے لینا، پہلے دودھ لے لینا کہیں ختم نہ ہو جائے۔''

''جاتا ہوں۔'' شعبان نے کہا اور کچھ برتن لے کر چلا گیا۔

''میاں صاحب! لو اور چائے پیو۔'' رمضان دو پیالی چائے لے کر میرے سامنے آبیٹھا، اس نے شیشے کی برنی سے کچھ بسکٹ بھی ایک پلیٹ میں رکھ لیے تھے۔

''بس میاں مہمان نوازی تو ہوگئی، یہ سب ضروری نہیں ہے۔''

''آپ کو ہماری قسم میاں صاحب! لے لو...... ہماری خوشی پوری کرو۔'' رمضان عاجزی سے بولا۔

''افوہ...... قسم بھی دے دی۔'' میں نے تھوڑے سے تکلف سے چائے لے لی۔

''پیٹ کے ہلکے ہیں میاں صاحب! جو دل میں آ رہا ہے کہے بغیر نہ رہ سکیں گے۔'' رمضان بولا۔

''کہو رمضان میاں۔''

''میاں صاحب! پہنچے ہوئے لگتے ہو، ایک نگاہ دیکھا تو دل نے کہا کہ جو کہہ رہے ہیں مان لو رمضان میاں...... اماں ابا نے زندگی بھر کہا بچو نماز پڑھا کرو، ٹال دیتے تھے مگر تمہارے کہنے سے یوں لگا جیسے کسی نے گلے میں رسی ڈال دی ہو، بندھے ہوئے مسجد پہنچے تھے اور پھر نقد سودا ہوگیا، جتنے گاہک اتنی دیر میں آئے ہیں، رات تک آتے ہیں، سودا بھی ختم ہوگیا اور منگوانا پڑا، یہی عالم رہا تو بھائیوں کا ہوٹل تو پکا بن جائے گا۔ کھانا بھی پکانے لگیں گے، وارے نیارے ہو جائیں گے ہمارے تو۔''

''مجھے ہنسی آگئی، میں نے کہا۔ ''جہاں تک پہنچا ہوا ہوں رمضان میاں خود جانتا ہوں۔ تم معصوم آدمی ہو اسی لیے ایسا سمجھ رہے ہو، میں خود بھی نماز کی نعمت سے محروم تھا۔ ایک اللہ والے نے کہا کہ نماز جاری کر دو بس اسی کی بات دل میں بیٹھ گئی، اس آبادی میں داخل ہوا تو اذان ہو رہی تھی، تم سے نماز کے لیے کہہ کر اپنا فرض پورا کیا، تم نے میری بات مان لی، یہ اللہ کا حکم تھا۔''

''تم کچھ بھی کہو میاں صاحب! اپنے دل پر بڑا اثر ہوا ہے، بڑی غربت ہے ہمارے ہاں، بس یوں سمجھ لو چھٹے پرانے میں بسر ہو رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا شدن خان شاہی باورچی کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ ابا کا نام شدن خان تھا۔ باورچی کا کام کرتے تھے نہ صرف جمال گڑھی میں بلکہ آس پاس کی بستیوں میں دھوم تھی۔ دُور دُور راجوں نوابوں کے ہاں کھانا پکانے جاتے تھے۔ ہمیں بھی کام سکھایا مگر پیاز کاٹنا اور دیگوں میں کرچھا ہلانا ہمیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ ابا نے سختی کی تو گھر سے بھاگ گئے، خوب خاک اڑائی اور جب کہیں کچھ نہ ملا تو واپس آ گئے۔ ابا کو گنٹھیا ہوگئی، کام دھندا ختم ہوگیا تھا، جمع پونجی چل رہی تھی، رشتے کی لڑکیوں سے شادی کر دی مگر کوئی دھندا نہیں جما۔ پہلے اماں مریں پھر ابا چل بسے۔ یہ ایک جگہ چھوڑ گئے تھے مسجد کینے، کام آ گئی، گھر والیوں کے ہار بُندے بیچ کر چار برتن ڈالے اور چائے بیچنے بیٹھ گئے۔ میاں صاحب کچھ نظر کر دو۔''

''ارے رمضان میاں تم غلط سمجھ رہے ہو، دعا ضرور کر سکتا ہوں تمہارے لیے اور میرے بس میں کچھ نہیں۔''

''ایک بات کہی تھی تم نے ابھی میاں صاحب۔''

''کیا؟''

''تم کہہ رہے تھے کہ اس بستی میں داخل ہوا تو اذان ہو رہی تھی، کہیں باہر سے آئے ہو؟''

''ہاں تمہاری اس بستی کا نام جمال گڑھی ہے؟''

''پکا، میاں کوئی رشتے دار رہتا ہے تمہارا؟''

''تم ہو تو سبھی دیکھ لو سب سے پہلے تم ہی ملے۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور رمضان جذباتی ہوگیا، گاہک چلے گئے تھے، ہم دونوں ہی تھے۔ اس وقت رمضان نے اپنی چائے کی پیالی رکھی اور نیچے بیٹھ کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لیے، وہ گلوگیر لہجے میں

بولا۔

''تین بچے میرے ہیں، دو میرے بھائی کے۔ تمہیں ہمارے بچوں کی قسم ہے میاں صاحب! ہمارے مہمان بن جاؤ، کچھ دن ہمارے ساتھ رہو، کچھ ملے یا نہ ملے ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ تمہاری برکت ضرور ہوگی۔ پانچ معصوم بچوں کی قسم دی ہے، انکار نہ کرنا دل ٹوٹ جائے گا۔''

میں ہکا بکا رہ گیا، عجیب صورتِ حال تھی، اب کیفیت یہ تھی کہ میں اس سے پاؤں چھڑا رہا تھا اور وہ کیکڑے کی طرح میرے پاؤں سے لپٹا جا رہا تھا۔ ''وعدہ کرلو میاں جی وعدہ کرلو، تمہیں میرے بچوں کی قسم۔''

''پاؤں چھوڑ رمضان...... اگر تم مجھے مہمان بنانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ کچھ عرصہ تمہارے ساتھ رہوں گا، وعدہ کرتا ہوں میں رمضان۔'' تب کہیں جا کر رمضان نے میرے پاؤں چھوڑے اور کُرتے کے دامن سے آنسو خشک کرتا ہوا بولا۔

''دل بڑا دُکھا ہوا ہے میاں صاحب! زندگی کی ساری خوشیوں سے دُور ہو گئے ہیں، کوئی عزت نہیں رہی بستی میں، سب حقارت سے دیکھتے ہیں۔ تم سے دل کی باتیں ہی کر لیں گے، جی خوش ہو جائے گا، ہمارے ہاں کون مہمان آئے گا۔''

''کچھ باتیں ضرور سن لو رمضان۔''

''جی میاں صاحب!''

''میں خود اتنا گنہگار انسان ہوں کہ میری نحوست سے بہت سوں کو نقصان پہنچا ہے۔ تم یہ بات کان کھول کر سن لو کہ میں ایک منحوس انسان ہوں، کل تم خود ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر سے نکالنے پر مجبور ہو جاؤ گے...... اپنے گناہوں سے توبہ کر رہا ہوں بس یہ سمجھ لو...... کوئی پہنچا ہوا آدمی نہیں ہوں، کل اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو مجھے الزام نہ دینا۔''

''چلو وعدہ...... آئی گئی خود ہمارے سر...... اب وعدے سے نہ پھر جانا۔'' وہ ایسے بولا کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

''خوب ہو رمضان میاں، اچھا ایک بات تو مان لو گے ہماری، جب تک ہمیں اپنے پاس رکھو ہم سے ہوٹل کے کام لینا، میاں صفائی کریں گے، گاہکوں کو چائے تقسیم کریں گے اور جو بھی کام ہوا۔''

''بالکل نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے، ہاں گلّے پر بیٹھ جانا، ہم منع نہیں کریں گے، بولو منظور۔'' میں ہنستا رہا، شعبان سودا لے کر آ گیا تھا، اس نے چائے کا پانی چڑھا دیا اور گاہک آتے جاتے رہے، پتا نہیں یہ معمول تھا یا واقعی اتفاق ہو رہا تھا۔ رمضان اور شعبان کو فرصت نہیں مل رہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے شیخ رحمت اللہ کے ہاں سے جنازہ آ گیا، بے شمار افراد تھے، کلمے کا ورد کرتے ہوئے آ رہے تھے، میں بھی تیار ہو گیا اور مسجد کی طرف چل پڑا، جنازہ صحن مسجد میں رکھ دیا گیا، لاتعداد غمزدہ چہرے نظر آ رہے تھے، کچھ لوگوں کی حالت بہت خراب نظر آ رہی تھی، دفعتاً میرے دل میں کلبلاہٹ ہونے لگی، یوں لگنے لگا جیسے کوئی میرے دل کو انگلیوں سے ٹٹول رہا ہو، پھر ایک سرگوشی سی ذہن میں ابھری اور میں اسے سننے لگا، آواز کس کی تھی سمجھ میں نہیں آئی لیکن الفاظ واضح تھے۔

''مسعود میاں آنکھیں کھلی رکھا کرو۔'' میں ششدر رہ گیا، کوئی آواز میرے منہ سے نہ نکل سکی، سرگوشی پھر ابھری۔ ''یہ کور بینا لوگ ہیں، یہ جس لڑکی کا جنازہ پڑھانے لائے ہیں وہ مری نہیں ہے زندہ ہے، تھوڑی سی کوشش سے اس کے دل کی دھڑکنیں بحال ہو سکتی ہیں، کسی سے رابطہ کرو اور اسے ترکیب بتاؤ......''

مجھے جو کچھ بتایا گیا اسے سن کر میرا سر چکرا کر رہ گیا، ہدایات اتنی واضح تھیں کہ کوئی وہم نہ رہ گیا تھا، بات اتنی عجیب تھی کہ عقل ساتھ چھوڑ رہی تھی، میں یہ کیسے کروں مگر وہ آواز...... وہ الفاظ...... آنکھیں بند کر لو، دل کے دروازے کھلے جاتے ہیں، ایک عجیب سا اعتماد دل میں پیدا ہو گیا، آگے بڑھا، نماز جنازہ کھڑی ہونے میں شاید کچھ دیر تھی، اس معمر شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر حسرت و یاس تھی۔ آنکھیں متورم تھیں، آنسو رُکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ کئی دوسرے لوگوں کے درمیان تھا، لوگ اسے سنبھالے ہوئے تھے، میں پُر اعتماد قدموں سے آگے بڑھا، اس کے قریب پہنچ گیا، میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور

بولا۔
''کچھ بات کرنی ہے آپ سے۔'' سب چونکے مگر کسی نے کچھ نہ کہا۔ معمر شخص نے روتی آنکھوں سے مجھے دیکھا، سسکی بھری اور بولا۔
''جی بھائی......!''
''ذرا ادھر آیئے۔'' میں نے اسے گھسیٹا، یقیناً بڑا آدمی تھا لیکن مصیبتیں پڑتی ہیں تو آدمی صرف آدمی ہوتا ہے چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔
''جی کہیے۔'' اس نے روتی آواز میں کہا اور دوسرے لوگوں سے کچھ دُور ہٹ آیا۔
''آپ لڑکی کے کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''باپ ہوں بدنصیب...... اکلوتی بیٹی تھی میری، ایک سال پہلے شادی کی تھی۔''
''خدا کا شکر ہے بڑے صحیح انسان سے ملاقات ہوئی، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی لڑکی مری نہیں ہے، زندہ ہے۔''
''ایں...... کیا مطلب ہے؟'' وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔
''جی وہ زندہ ہے میرا کہنا ہے جنازہ واپس لے چلیے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ اور سب لڑکی کے قاتل قرار پائیں گے، میں اپنی زندگی میں اس کی تدفین نہ ہونے دوں گا۔ آپ اسے قبر میں اتاریں گے تو میں اس قبر میں داخل ہو جاؤں گا اور آپ کو مجھ پر بھی مٹی ڈالنی پڑے گی۔''
''اس شخص کا منہ حیرت سے کھل گیا، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر دوسرے لوگ بھی قریب آ گئے، ایک نے کہا۔ ''کیا بات ہے چچا جان...... کیا کہہ رہے ہیں یہ......؟''
''ان سے پوچھو، ان سے پوچھو۔ یہ کون ہیں۔ کوئی جانتا ہے؟'' معمر شخص نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔
''کیا بات ہے۔ آپ کون ہیں؟''
''میں کوئی بھی ہوں لیکن آپ اس لڑکی کو زندہ دفنانے جا رہے ہیں، میری بات مان لیں لڑکی زندہ ہے، میں آپ کو ترکیب بتا سکتا ہوں کہ اس کی زندگی کیسے واپس لائی جا سکتی ہے۔''
سب اچنبھے میں رہ گئے۔ بات پھیل گئی، کچھ اور افراد قریب آ گئے، ایک شخص نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کوئی بری بات نہیں کہہ رہے خدا کرے ایسا ہو لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟''
''آپ کون ہیں؟''
''میں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹر للت رام بھلاّ، میں شیخ صاحب کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔''
''اگر آپ جنازے کو گھر لے چلیں تو میں وہ ترکیب بتا سکتا ہوں جس سے اس کی زندگی واپس لائی جا سکے۔''
''ایسا نہ ہو آپ؟''
''ہر سزا قبول کروں گا۔ مجھے رسیوں سے باندھ دیں تا کہ بھاگ نہ سکوں۔''
''کہرام مچ گیا، سب میرے ہی گرد جمع ہو گئے۔''
ایک نوجوان نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں جنازہ واپس لے جاؤں گا۔''
''یہ گناہ ہوتا ہے عظمت اللہ، میت کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہ کوئی پاگل لگتا ہے۔'' کچھ بزرگوں نے کہا۔
''ایک منٹ، ایک منٹ محترم! آپ کا اس بارے میں کیا مؤقف ہے اور آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر بھلاّ نے کہا۔ یہ مناسب وقت تھا کہ میں اپنے دل کی بات بتا دوں جو کچھ میرے دل میں ابھرا تھا وہ میرے لیے ایمان کی طرح مستحکم تھا اور مجھے نتائج کا کوئی خوف نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے جو کچھ مجھ سے کہا گیا تھا دہرایا دیا۔ ڈاکٹر بھلاّ منہ کھول کر رہ گئے تھے۔

دوسروں نے بھی میری بات سنی تھی۔ ڈاکٹر بھلّا نے کہا۔
''آپ لوگ خود فیصلہ کریں۔ یہ آپ کا مذہبی معاملہ ہے۔''
''میں لاش واپس لے جاؤں گا۔'' عظمت اللہ نے کہا اور چاروں طرف یہ آوازیں ابھرنے لگیں۔
''جنازہ واپس جائے گا، جنازہ واپس جائے گا۔ مجھے ایک طرح سے حراست میں لے لیا گیا تھا۔ لوگ میرا جائزہ لے رہے تھے، تمام لوگوں کو تو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے کیا کہا ہے لیکن اس انہونی کو مجھ سے منسوب سمجھ لیا گیا تھا۔ وہ جن کے دل کو لگی تھی مجھے آس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ لوگ اسے دیوانگی قرار دے رہے تھے، ایک شخص نے ڈاکٹر بھلّا سے کہا۔
''یہ کیا دیوانگی ہے؟''
''یہ دیوانگی ہی سہی لیکن اس شخص نے جو کچھ کہا ہے وہ قابل غور ہے اور طبی نقطہ نگاہ سے اسے ممکنات میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ شیخ رحمت اللہ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟'' بھلّا صاحب بولے۔
''بھئی اب میں مخالفت نہیں کروں گا۔ مگر یہ انوکھا انکشاف ہے اور اس نوجوان پر پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس نے تو متوفیہ کو دیکھا بھی نہیں۔''
''بلا وجہ دیر کی جا رہی ہے، آپ لوگ واپس کیوں نہیں چلتے۔'' عظمت اللہ نے بگڑ کر کہا۔
''ہاں...... چلو، جنازہ اٹھواؤ۔'' رحمت اللہ بولے۔
''میں کچھ دیر کے لیے اجازت چاہتا ہوں، کچھ ساتھی ڈاکٹروں کو لے کر ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر بھلّا نے کہا۔ جنازہ واپسی کے لیے اٹھ گیا، لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور میں سوچ میں ڈوبا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

✦✤✦✤✦

بالآخر جنازہ گھر واپس پہنچ گیا، محشر کا سا سماں تھا۔ جوان موت تھی، اندر سے بین کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ جنازہ واپس پہنچا تو عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ مردوں نے سمجھداری سے کام لیا، عورتوں کو کچھ نہیں بتایا۔ سب کو سختی سے ہٹا کر لاش ایک کمرے میں پہنچا دی گئی۔ مجھے بھی اسی کمرے میں لے آیا گیا تھا، اسی وقت ڈاکٹر بھلّا ایک لیڈی ڈاکٹر اور تین ڈاکٹروں کے ساتھ اندر داخل ہوگئے۔
مجھے جو ہدایات ملی تھیں، اس کے مطابق تمام انتظامات کئے گئے، سارا کام آناً فاناً ہوگیا۔ پوری بستی ہی اُمڈ آئی تھی۔ بات ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ لوگ شیخ رحمت اللہ کی کوٹھی کے سامنے جمع ہو رہے تھے، کمرہ خالی کرا لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بھلّا ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ موجود تھے۔ لیڈی ڈاکٹر مسز گھوش نے تیاریاں کر لی تھیں۔ میں، عظمت اللہ، رحمت اللہ اور ناظم حیات کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وقت چیختا ہوا گزر رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ سنسنی خیز تھا، پھر لیڈی ڈاکٹر کی آواز ابھری۔
''او مائی گاڈ۔ او مائی گاڈ!''
''کیا ہوا؟'' بھلّا کی کپکپاتی آواز ابھری۔
''یہ زندہ ہے۔ ٹھیک ہے۔''
''دل کی مالش کرو۔''
''میں کر رہی ہوں۔'' لیڈی ڈاکٹر مسز گھوش نے کہا۔
''کیا کہا ہے۔ کیا کہا ہے ڈاکٹر گھوش نے؟'' عظمت اللہ کی گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔
''وہ زندہ ہے۔ وہ ٹھیک ہے مگر براہ کرم خود پر قابو رکھیں۔ براہ کرم کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیں۔'' عظمت اللہ روتا ہوا اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ ناظم صاحب بازو پھیلا کر مجھ پر جھپٹے اور پگلے کی طرح مجھ سے لپٹ کر مجھے چومنے لگے۔ پھر بے ہوش ہو گئے۔ ہنگامہ کہاں رکتا۔ کوئی کمرے سے نکل گیا اور پھر تو وہ کہرام مچا کہ توبہ، ڈاکٹر پریشان تھے۔ ناظم حیات کو باہر نہیں لے

جایا جا سکا۔ عظمت اللہ نے بھی میری ہڈیاں کڑکڑائیں، عجیب جملے کہے جانے لگے میرے بارے میں، مجھے بھی خوشی تھی لڑکی کے بچ جانے کی بھی اور اپنے یقین کی پختگی کی بھی۔

پھر لڑکی ہوش میں آگئی۔ عورتوں نے حملہ کر دیا، مردوں کو ہٹنا پڑا۔ ہم سب باہر نکل آئے۔ خاندان کے بے شمار لوگ تھے۔ انہوں نے سب کو گھیر لیا تھا اور مجھے موقع مل گیا مگر میں بڑے دروازے سے باہر نہیں نکل سکا تھا کیونکہ وہاں پوری جمال گڑھی کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مجھے احاطہ کود کر بھاگنا پڑا اور کافی دُور آکر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے بعد بھائیوں کے ہوٹل کے سوا کہاں جا سکتا تھا مگر ہوٹل خالی پڑا تھا۔ سامان یونہی بکھرا ہوا تھا، دونوں بھائی غائب تھے۔ مجھے ہنسی آگئی، یقیناً وہ دونوں بھی وہیں موجود ہوں گے۔ ایک طرف پڑی چارپائی پر لیٹ گیا اور ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ دھوپ تیز تھی، گرمی بھی خوب پڑ رہی تھی مگر یہاں ٹھنڈک تھی۔ میرے بدن میں سنسنی ہو رہی تھی۔ وہ آواز کس کی تھی، کون میرے اندر بولا تھا، کس نے مجھے یہ اعتماد دیا تھا۔ کیا ہوگا اب کیا ہوگا۔ آئندہ مجھے کیا کرنا ہوگا کچھ نہیں جانتا تھا، کچھ آہٹیں ہوئیں اور میں نے گردن اٹھا کر دیکھا شعبان تھا۔

''ارے شعبان! تم آگئے۔'' میں نے شعبان سے کہا اور اس کے ہاتھ سے دیگچی گر گئی۔ دوسرے لمحے اس نے میری طرف چھلانگ لگائی، میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ پکڑ کر چومنے لگا۔ ''کیا ہو گیا تمہیں شعبان؟''

''آپ اللہ والے ہو میاں صاحب! قسم اللہ کی غلام بنا لو ہمیں اپنا! ہمیں بھی کچھ دے دو میاں صاحب۔''

''خدا سے ڈرو شعبان! کیا بچپنا ہے، کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''ہم وہیں تھے جی شیخ صاحب کی حویلی پر، تمہارے ساتھ ہی گئے تھے۔ وہاں تمہاری ڈھونڈ مچی ہوئی ہے، چاروں طرف۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے آسمان سے اترے تھے، آسمان میں اُڑ گئے، کوئی کچھ کہتا ہے، رمضان کو پکڑ رکھا ہے انہوں نے۔''

''رمضان کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟''

''بس میاں صاحب! وہ اس سے تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ جب مسجد میں تم نے شیخ صاحب کے سمدھی کو کچھ بتایا تھا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ آدمی کون ہے، کسی نے کہہ دیا کہ پاگل ہے، رمضان بگڑ گیا۔ اس نے کہہ دیا کہ پاگل نہیں درویش ہے، یہ بھی بتا دیا کہ تم ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے ہو، سب شیخ صاحب کی حویلی پر جمع تھے۔ سب کو پتہ چل گیا تھا کہ شیخ صاحب کی بہو ٹھیک ہو گئی ہے اور اب سب تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اس آدمی نے کسی کو بتا دیا کہ میاں صاحب رمضان کے مہمان ہیں، بس رمضان گھر گیا ان میں اور اس نے مجھے ادھر پھٹا دیا کہ موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔''

''موقع سے کیا فائدہ اٹھاؤ گے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''دس سیر دودھ پکڑ لایا ہوں، چینی بھی لے لی ہے، پتی رمضان لیتا آئے گا، دیکھنا میاں صاحب آج سارا دودھ لگ جائے گا بلکہ کم پڑ جائے گا کیونکہ اب ادھر مجمع لگے گا تمہاری وجہ سے! مگر میرے کو خطرہ تھا'' شعبان بولا۔

''کیا خطرہ تھا؟'' میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے پوچھا۔ ان معصوم لوگوں کی توقع شناسی پر مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔ ''سوچ رہا تھا کہ کہیں گھبرا کر نکل نہ جاؤ، ادھر سے اسی لیے تمہیں دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ ویسے ایک بات کہوں میاں صاحب؟''

''ضرور کہو شعبان!'' میں نے پیار سے کہا۔

''گھر والی نے چھ روزے رکھے تھے بڑی منتیں مرادیں مانی تھیں، برکت کے لیے۔ ہاں عید آئے، بقر عید آئے بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے کئی سال سے۔ تنگ آگئے تھے ہم تو۔ سن لی اللہ نے برکت کے لیے تمہیں بھیج دیا۔ قسم اللہ کی مہینہ بھر رک جاؤ تو عید بن جائے گی اس بار۔'' شعبان نے کا اور میرا دل دُکھنے لگا، کیا معصوم خواہش ہے! میں نے سوچا۔ دُور سے بہت سے لوگ اس طرف آتے نظر آئے تو شعبان جلدی سے بولا۔

''لو سنبھالو آ گئے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے چائے کے لیے پانی کا بڑا دیگچہ بھر کر چولہے پر چڑھا دیا' چائے کے لیے۔

ایک لمحے کو میں شعبان کی بات نہیں سمجھ پایا تھا مگر پھر اس کے سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے خود ان لوگوں کو دیکھ لیا جو کافی تعداد میں تھے اور اسی طرف آ رہے تھے۔ بوکھلاہٹ تو سوار تھی مگر کیا کرتا، بھاگ کر کہاں جاتا۔ اس کے علاوہ بھاگنا بے معنی تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی میرے ہاتھ چوم رہا تھا تو کوئی میرے پاؤں پکڑ رہا تھا، میں نے خود کو ساکت چھوڑ دیا تھا۔ انہیں روکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے رہے، پھر ان کے سوال شروع ہو گئے۔

''مرشد۔'' حضور، قبلہ! میری بیوی بیمار ہے۔ میاں صاحب! میرا ایک بچہ گھر سے بھاگ گیا ہے، گھر والی لبِ دم ہے۔ سرکار! ایک بیٹے کا سوال ہے۔ مرشد! سال بھر سے بیکار ہوں خدا کے لیے......!

شعبان کی آواز ابھری۔ ''کھاتے پیتے رہو بھائیو! میاں صاحب کی برکت والی چائے!'' یہ جملے تیر بہدف ثابت ہوئے۔ لوگ چائے پر ٹوٹ پڑے۔ خوب دھکم پیل ہونے لگی۔ رمضان کھڑا ہو گیا۔

پیسے اِدھر بھائیو! پیسے اِدھر، خبردار کوئی بے ایمانی نہ کرے، بخشش نہیں ہو گی۔'' رمضان کا گلہ بھر گیا۔ جب سب نے مجھے چوم چاٹ لیا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع ملا تو میں نے زور سے کہا۔

''آپ لوگوں کو جو کچھ میرے ساتھ کرنا تھا، کر لیا یا کچھ باقی رہ گیا ہے؟''

''مرشد! ہماری مراد پوری کر دو۔''

''یہ کفر آپ بک رہے ہیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔''

''ہم سمجھے نہیں مرشد؟''

''جس عقیدت کا اظہار آپ کر رہے ہیں، میں اس کے قابل نہیں ہوں کہ میں نے اس کا اظہار کیا۔''

''آپ اللہ والے ہیں مرشد!''

''آپ سب بھی اللہ والے ہیں۔ اللہ کے بندے ہیں۔ کوئی مراد پوری نہیں کرتا سوائے اللہ کے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کا محکوم ہے اور اس کی رضا کے بغیر کوئی جنبش نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا کسی اور سے مانگنا شرک ہے اور شرک ناقابلِ بخشش ہے۔ آپ لوگ اس گناہ سے توبہ کریں۔ میں اس کا سب سے زیادہ گناہگار بندہ ہوں۔''

''مگر آپ نے رحمت اللہ کی بہو کی جان بچائی ہے۔'' کسی نے کہا۔

''صرف اللہ نے۔ صرف اللہ نے، میں نے بس انکی ایک غلطی کی نشاندہی کر دی تھی۔''

''یہ معمولی بات تو نہیں ہے۔''

''آپ لوگ واقعی اگر مجھ سے کچھ چاہتے ہیں تو میں اللہ کے حضور آپ کے لیے عاجزی سے دعا کر سکتا ہوں۔ اللہ آپکی مشکلات دُور کرے۔ جس کی جو جائز حاجت ہو، وہ پوری کرے، جس کی بیوی بیمار ہے وہ شفا پائے، جس کا بیٹا گھر سے چلا گیا ہے وہ واپس آ جائے بس یہی میرے بس میں ہے۔ ایک وعدہ ضرور کریں مجھ سے، بولیں کریں گے؟''

''آپ حکم دیں میاں صاحب!''

''حکم نہیں درخواست کرتا ہوں۔''

''فرمائیے میاں صاحب!''

''یہ رمضان اور شعبان آپ کے بھائی ہیں۔ جمال گڑھی کے پرانے باشندے ہیں، ان کا خیال رکھیں۔ جس کے گھر کوئی تقریب ہو ان سے کھانا پکوائے اور انہیں معقول معاوضہ ادا کرے اور کسی کی حاجت پوری ہو تو جو کچھ ان کے لیے کر سکتا ہے، کرے۔''

''ایسا ہی ہوگا میاں صاحب!''

''تو پھر جائیے اور یقین رکھیے کہ آپ کی ضرورتیں اللہ تعالیٰ پوری کرے گا۔ جائیے آرام کیجیے۔'' لوگ منتشر ہونے لگے، سادہ دل لوگ تھے۔ اپنی عقیدت کا اظہار اسی طرح کر سکتے تھے، میں انہیں کیسے روکتا۔ کچھ دیر کے بعد مجمع صاف ہو گیا۔

''میاں صاحب! چائے لیجیے۔'' شعبان بولا۔ رمضان نوٹ اور ریزگاری جمع کر رہا تھا۔

''کیا کمایا میاں رمضان؟'' میں نے پوچھا۔

''حاضر ہے میاں صاحب!'' رمضان نے ساری کمائی میرے قدموں میں ڈھیر کر دی۔

''مبارکباد! اچھی آمدنی ہوئی ہے۔''

''میاں صاحب! پورے مہینے کی کمائی ایک دن میں ہوگئی ہے۔ اب تو سامان بھی نہیں ہے، کل خریدنا پڑے گا۔ میاں صاحب! اب کیا کہوں منہ سے آپ نے تو ہمارے دلدر دُور کر دیئے۔'' رمضان کی آواز بھرا گئی۔

''تم نے بھی تو ہمیں سیر کیا تھا رمضان میاں! نہ جانے کتنے وقت کے بعد ہمیں چائے اور پانی نصیب ہوا تھا۔''

میاں صاحب! گھر چلیں؟''

''ہوٹل بند کرو گے؟''

''کام بند کر دیں گے، اس ہوٹل میں دروازے ہی کہاں ہیں۔''

''ہماری رائے ہے سامان منگوالو۔ ہم گھر جا کر کیا کریں گے، یہیں ٹھیک ہیں۔''

''جیسا حکم!'' رمضان نے کہا۔ پھر وہ شعبان سے بولا۔ ''گھر جا شعبان! کھانا لے آؤ اور دودھ والے سے کہہ دیجیو زیادہ دودھ پہنچائے شام کے لیے!'' شعبان چلا گیا۔ رمضان میرے پاس بیٹھ گیا۔

''میاں صاحب! کمال کر دیا آپ نے! وہ تو وہ بے چاری زندہ ہی دفن ہو جاتی۔''

''یہ سب اللہ کی مرضی ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ شعبان کھانا لے آیا، موٹی موٹی روٹیاں، چٹنی، دال، اللہ کا شکر ادا کر کے کھائی اور وہیں چارپائی پر لیٹ گیا۔ لوگ آتے رہے۔ شام ہوگئی پھر دو افراد ہوٹل پر آ گئے۔ ملازم قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ چومے اور پھر کہا۔

''میاں صاحب! آپ کو زمیندار صاحب نے بلایا ہے، رات کا کھانا وہیں ہے۔''

''کون زمیندار صاحب؟''

''یہ رحمت اللہ کے منشی ہیں میاں صاحب! رمضان بولا۔

''رحمت اللہ نے بلایا ہے ہمیں۔'' میں نے پوچھا۔

''جی میاں صاحب!''

''ہماری طرف سے سلام کہنا اور شکریہ ادا کر دینا ان کا۔ کہنا ہم رمضان اور شعبان کے مہمان ہیں اور یہاں خوش ہیں۔ وہاں اب ہمارا کوئی کام نہیں ہے، اس لیے وہاں نہیں آ سکیں گے۔''

''ملازموں نے گھبرا کر مجھے پھر رمضان اور شعبان کو دیکھا۔ دونوں بیک وقت بولے۔ میاں صاحب کی مرضی ہے، ہم نے منع نہیں کیا۔''

''وہ ناراض ہوں گے۔'' ایک ملازم بولا۔

''نہیں میاں! ان سے کہہ دینا...... یہ ہماری مرضی ہے۔ بس جاؤ۔'' وہ چلے گئے تو رمضان نے کہا۔

''سخت مزاج ہیں رحمت اللہ خان صاحب، برا مان جائیں گے۔''

''مان جانے دو۔ تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔''

''شام ڈھل گئی۔ رمضان اور شعبان نے میرے لیے یہیں آرام کا بندوبست کر دیا تھا۔ چراغ جل گئے۔ پھر ناظم حیات جو رحمت اللہ کے سمدھی تھے اور لڑکی کے باپ تھے، کچھ لوگوں کے ساتھ میرے پاس آئے۔ انہوں نے بہت زیادہ عقیدت کا اظہار کیا اور کپڑے میں لپٹی کوئی چیز میرے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

''حضور! اسے قبول فرمائیے۔''

''کیا ہے؟''

''کچھ نذرانہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے، اس کا کوئی صلہ نہیں ہے۔ آپ یہ قبول کر لیں، مجھے خوشی ہوگی۔''

''آپ جب غم زدہ تھے تو مجھے معقول آدمی معلوم ہوئے تھے۔ کتنی رقم ہے اس میں؟'' میں نے پوچھا۔

''حضور! دس ہزار۔'' ناظم حیات نے کہا۔

''استغفر اللہ......! اتنے بڑے آدمی کی بیٹی کی زندگی کی اتنی معمولی قیمت! بڑی سستی ہے آپ کی بیٹی تو......''

''آپ حکم کریں حضور! دراصل سفر میں ہوں، میرا گھر دوسرے شہر میں ہے۔''

''بُرا نہ مانئے حیات صاحب! یہ بڑا ظلم ہے ہم پر آپ ہمیں ہماری محبت کا معاوضہ دینے آئے ہیں۔ ہم نے تو صرف خلوص سے یہ کام کیا تھا۔ جائیے دعا کیجئے ہمارے لیے کہ اللہ نے جس طرح آپ کی بگڑی بنائی ہے، اسی طرح وہ ہماری بگڑی بنائے۔ یہی ہماری اجرت ہوگی۔ ہم نے کیا ہی کیا ہے بس ایک اندازہ پیش کر دیا تھا۔ حاجت روا صرف وہی ہے۔ اپنے اندر خلوص پیدا کریں۔ کاغذ کے ٹکڑوں کے لین دین کو سب کچھ نہ سمجھ لیں۔'' حیات صاحب شرمندہ نظر آنے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے۔

''مجھے معاف کر دیں میاں صاحب! سخت شرمندہ ہوں۔ یہ صرف اظہار عقیدت تھا، کوئی معاوضہ نہیں تھا۔'' میں خاموش ہو گیا۔ حیات صاحب کچھ دیر بیٹھے پھر سلام کر کے چلے گئے، رات گئے تک رمضان اور شعبان ہوٹل میں رہے۔ انہوں نے یہاں میرے سونے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس دوران لوگ آتے رہے تھے۔ پھر میں نے ہی کہا۔

''تم لوگ اپنے گھر جاؤ، آرام کرو، صبح وقت پر ہوٹل کھولنا ہے۔'' میرے کہنے سے وہ چلے گئے۔ بستی سنسان ہو گئی تھی۔ کتے بھونک رہے تھے۔ کہیں سے چوکیدار کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ آج کا دن برسوں کی کہانی معلوم ہوتا تھا۔ جتنے واقعات گزر گئے تھے، وہ بہت زیادہ تھے۔ دل میں خوشی تھی کہ وہ لڑکی زندہ دفن ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اس آواز کا معمہ حل نہ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ اطلاع کس نے دی، کیا فضل بابا نے......!

''نہیں میاں مجھے گنہگار کیوں کرتے ہو، میں کہاں اور یہ منزل کہاں! تم مجھ سے افضل ہو بلکہ تمہاری وجہ سے مجھے منصب ملا اور پیغام رساں مقرر کیا گیا۔'' بابا فضل کی آواز میرے ذہن میں گونجی اور میں اچھل کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''بابا فضل!'' میرے منہ سے آواز نکلی۔

''ایمان کی سلامتی بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ ہم جو بوتے ہیں، سو کاٹتے ہیں۔ جو بیچتے ہیں، اس کا منافع کماتے ہیں۔ تم نے زندگی میں جو کچھ کیا، وہ بُرا تھا لیکن ایک مقصد کو تم نے اپنے وجود کا حصہ بنا لیا اور وہ تھا حق کا سودا! منافع تو ملنا ہی تھا۔ تم نے چکھے، اب کھاؤ مگر خود پر نازاں نہ ہو جانا، انکساری بلندیوں کا راستہ ہوتی ہے۔ اپنی طلب کو دشمن جاننا۔ نفس کی مانگ ہی کالا جادو ہے۔ اس گندے سحر کی گرفت میں نہ آنا، ضمیر بولتا ہے۔ اس کی آواز سچی ہوتی ہے، اس سے رابطہ رکھنا۔''

''بابا فضل...... آپ کہاں ہیں؟''

''تمہارے ذہن میں ہماری جگہ، اب ہواؤں میں فضاؤں میں نہیں ہے۔ یہ آخری آواز تمہارے سوال کا جواب ہے۔ غور سے سن لو...... شیطان کو اجازت ملی ہے کہ شر پیدا کرے اور اس نے شر کے لیے قوت مانگی ہے۔ اسے دی گئی لیکن یہ قوت حق کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ شیطان حق کے سامنے شرمندہ ہوگا۔ یوں منصب تقسیم کر دیئے گئے۔ خود کو درویش، ولی یا ابدال و قطب نہ جاننا کہ ان درجات کے لیے لاکھوں بار فنا ہونا پڑتا ہے۔ تم ایک رنگروٹ ہو، ایک ادنیٰ کارکن جسے کچھ کام دے دیئے

گئے ہیں۔ صرف اپنے کام کرنا کہ تم صرف ذریعہ ہو اور جو ہدایت ملے گی، اس کی پرکھ دی جائے گی تمہیں بس! نہ کچھ اس سے آگے ہے، نہ پیچھے۔''

''میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ نہ جانے کیوں پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ سسکیاں ہچکیاں بن گئیں۔ تنہائی میں رونا کتنا سکون بخش تھا مگر شاید تنہائی نہیں تھی۔

''میاں صاحب...... میاں صاحب! خدا کے لیے خاموش ہو جائیے۔ خدا کے لیے مجھے بتائیے آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' ایک ہمدرد ہاتھ میرے شانے سے آ لگا اور میں چونک پڑا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی اور پہچان لیا۔ عظمت اللہ تھا۔ متوحش نگاہوں سے اس کے آس پاس دیکھا۔ ایک عورت چادر اوڑھے قریب کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے...... تت...... تم! اور یہ......'' میں جلدی سے چارپائی سے نیچے اتر آیا۔

''ثمینہ ہے، میری بیوی! وہ جس کی تدفین کی جا رہی تھی۔''

''خدا کی پناہ! کیوں آئے ہو تم دونوں اور انہیں اس عالم میں۔''

''آپ نے میرا اجڑا ہوا گلزار بسا دیا ہے میاں صاحب...... سب اہل دل ہیں مگر جو آگ میرے اردگرد پھیل گئی تھی، میں ہی جانتا ہوں۔ مجھ سے کیا چھن گیا تھا، وہ مجھے معلوم ہے۔''

''اللہ نے فضل کیا میاں! اس کا شکر ادا کر۔''

''یہ اب ٹھیک ہیں۔ تنہائی ملی تو مچل گئیں کہ میں سلام کرنے ضرور جاؤں گی۔ ہم چھپ کر چلے آئے۔''

''وعلیکم السلام۔ اب جاؤ بی بی! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''میں اب ٹھیک ہوں جناب! آپ نے......''

''خدا کے لیے اس واقعہ کو مجھ سے منسوب نہ کرو، ہم نابینا ہیں، بینائی کا فقدان ہے ہمارے پاس۔ اوپر اوپر سے دیکھتے ہیں، اندر سے نہیں دیکھتے۔ جو تمہیں دنیا میں پہچانتا ہے، وہ جانتا ہے کہ تمہیں دنیا میں کیسے رہنا ہے، کیا کرنا ہے اور یہ سب کہانیاں ہوتی ہیں تمہیں سمجھانے کے لیے! بس انہیں سمجھ لو، سب ٹھیک ہے۔''

''وسیلہ تو آپ تھے میاں صاحب! فرشتہ رحمت تو آپ بنے میرے لیے، میری بیوی کی زندگی آپ نے بچائی، ورنہ ہم اسے زندہ قبر میں اتار دیتے۔''

''بچ گئی تمہاری بیوی! خدا تم دونوں کو خوش رکھے، میری طرف سے مبارکباد! اب جاؤ۔''

''میاں صاحب! ہم آپ کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیسی خدمت، رقم لائے ہو میرے لیے؟''

''نہیں میاں صاحب! ابو بہت شرمندہ ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے آپ کو کچھ دینا چاہا، آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔'' ثمینہ نے کہا۔

''اگر کچھ دن آپ ہمارے ساتھ گزاریں تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی۔''

''نہیں میاں! تمہارے والد نے بھی ہمیں طلب کیا تھا۔ ہم سے گزر نہ ہوگی تمہاری اونچی حویلی میں، یہ دو غریب بھائی......'' اچانک میں رک گیا۔ ایک خیال آیا میرے دل میں، میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''عظمت اللہ ہے تمہارا نام......؟''

''جی میاں صاحب......''

''عظمت اللہ! ہماری کچھ مالی مدد کر سکتے ہو؟''

''جی......!'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''ہاں، ہمیں کچھ رقم درکار ہے، دو گے ہمیں؟''

''آپ حکم کریں میاں صاحب! آپ حکم تو کریں۔''

''تو کل دن میں آ جانا، ہم حساب کر کے بتا دیں گے، اب جاؤ، خوب رات ہوگئی ہے۔ اس سے زیادہ باہر رہنا اچھا نہیں ہے تمہاری بیوی کے لیے۔ جاؤ میاں! حجت نہیں کرتے۔''

''صبح کو آؤں گا میں۔'' عظمت اللہ نے کہا۔

''ہاں ضرور...... ہم انتظار کریں گے۔'' میں نے کہا اور وہ دونوں سلام کر کے واپس چلے گئے، جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

صبح ہوگئی۔ مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔ اذان ہوتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ نمازی دوڑتے آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رمضان اور شعبان بھی آ گئے تھے۔ نماز پڑھ کر ہم ساتھ باہر نکلے۔

''ہمیں پتا تھا آپ یہیں ہوں گے۔ نیند آ گئی تھی آرام سے؟'' شعبان نے پوچھا۔

''ہاں! خوب آرام سے سویا۔ نماز ہمیشہ پڑھتے ہو؟''

''نہیں میاں صاحب! بس آج سے شروع کر دی ہے۔ پہلے غلطی ہو گئی تھی۔'' رمضان نے کہا۔

''ایک اچھی بات ہے، تم نے آج سے نماز شروع کی ہے، آج ہی سے اس کی برکتیں بھی دیکھ لینا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہوٹل آ کر رمضان اور شعبان جلدی جلدی کام کرنے لگے۔ چائے کے دور شروع ہو گئے تھے۔ لوگ مجھ سے بڑے احترام سے مل رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ دس بجے رحمت اللہ، اس کا سمدھی ناظم حیات اور بیٹا عظمت اللہ ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ تو جمال گڑھی کے سب سے دولت مند لوگ تھے۔ کبھی بھائیوں کے ہوٹل کے سائے سے گزرے بھی نہ ہوں گے۔ لوگ حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ تینوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ رمضان اور شعبان کے سانس پھول رہے تھے۔

''سب سے پہلے تو میں آپ سے معافی مانگتا ہوں میاں صاحب! بلاشبہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بڑی سادگی سے ملازموں کو بھیج دیا تھا آپ کو لینے کے لیے! آپ کی توہین مقصود نہیں تھی۔ بعد میں غلطی کا احساس ہوا، مجھے خود آنا چاہیے تھا۔'' رحمت اللہ نے کہا۔

''ہم نے برا نہیں مانا رحمت اللہ صاحب! آپ بلا وجہ اس بات کو اہمیت دے رہے ہیں۔ جن دونوں بھائیوں نے اس وقت ہمیں خلوص سے اپنے پاس خوش آمدید کہا، جب ہم اس بستی میں داخل ہوئے۔ ہم نے سوچا کہ جو دو چار روز یہاں گزارنے ہیں، وہ انہی کے پاس گزاریں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''ان لوگوں کا بھی احسان ہے مجھ پر!'' رحمت اللہ کے پاس کھڑے رمضان اور شعبان نے کہا اور دونوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''نہیں سرکار! نہیں بڑے سرکار...... ! ہم تو نمک کھاتے ہیں آپ کا، ہم تو رعیت ہیں آپ کی۔'' دونوں بیک وقت بولے اور میں ہنس پڑا۔

''واہ رحمت اللہ صاحب! آپ کی رعیت اس بے کسی کے عالم میں گزارہ کر رہی ہے۔ تن ڈھکتے ہیں تو پیٹ خالی رہ جاتا ہے، پیٹ بھرتے ہیں تو بدن کھل جاتا ہے۔ ایسے تو آپ کی بادشاہت نہ چل سکے گی۔''

''نہیں میاں صاحب...... میں کہاں کا بادشاہ! محبت ہے ان لوگوں کی جو اتنی عزت کر لیتے ہیں۔ آپ حکم دیں، میں ان کے لیے کیا کروں؟'' رحمت اللہ بولے۔

''قدیم باورچی خاندان ہے مگر حالات نے تباہ کر دیا ہے۔ بڑی مشکل سے گزارہ کر رہے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے کیا ہے یہاں! چائے بیچ کر جی رہے ہیں، کچھ کریں ان کے لیے۔''

''تم بتاؤ شعبان...... کیا چاہیے تمہیں؟''

''حضور، سرکار...... باپ، دادا سے حویلی کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ سب کچھ پکانا آتا ہے ہمیں، سارے صالحہ جات

ابا نے بتا دیئے ہیں مگر آپ شہر کے باورچی بلاتے ہیں۔ ہمیں کوئی کام نہیں ملتا۔"
"اب ملے گا۔" رحمت اللہ نے کہا۔ "اور کچھ بتاؤ۔"
"سرکار! دو چار بھانڈے مل جائیں، چمچہ، ڈوئی ہو تو کسی کے دوسرے کام بھی کریں۔" رمضان بولا۔
"اور کچھ۔" رحمت اللہ مسکرا کر بولے۔
"اور پر ٹمین کی چادریں پڑ جائیں تو ہوٹل بن جائے پورا۔" شعبان خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔
"عظمت اللہ! یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ انہیں جو ضرورت ہے، پوری کر دو۔" رحمت اللہ نے کہا۔
"جی ابو! ٹھیک ہے۔"
"اب آپ فرمائیے میاں صاحب! ہم آپ کی کیا خدمت کریں؟"
"بس رحمت اللہ صاحب! دعائے خیر کریں ہمارے لیے۔"
"میری آرزو ہے کہ آپ ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔"
"ایک شرط ہوگی اس کی۔"
"ارشاد فرمائیے۔"
"بہو کی زندگی بچ جانے کی خوشی کیجیے، شعبان اور رمضان سے کھانا پکوائیے، ہم بھی کھائیں گے۔"
"بہتر ہے۔" رحمت اللہ نے کہا اور پھر واپسی کے لیے اٹھ گیا۔ عظمت اللہ وہیں رک گیا تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو اس نے کہا۔
"حضور نے مجھے بھی طلب کیا تھا۔ حکم فرمائیے؟"
"میاں عظمت اللہ! بس یہی درکار تھا ہمیں، ہماری مانگ پوری ہوگئی۔"
"میرا یہی خیال تھا۔ میں تعمیل حکم کروں گا۔" عظمت اللہ چلا گیا۔ دولت کے کھیل دلچسپ ہوتے ہیں۔ کوئی بارہ بجے لاتعداد مزدور، معمار، سیمنٹ اور اینٹوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ عظمت اللہ ساتھ تھا۔ رمضان اور شعبان کے ہوٹل کا سارا سامان مزدوروں نے ہٹایا اور کام شروع ہوگیا۔ مزدور بے پناہ تعداد میں تھے۔ ہم ہوٹل کے سامان کے ڈھیر پر بیٹھے چراغ کے جنوں کو کام کرتے دیکھتے رہے۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ احاطے کی نیو کھودی گئی۔ سیمنٹ گھولا گیا اور اینٹوں کی دیواریں کھڑی ہونے لگیں۔ شعبان اور رمضان سحر کے عالم میں تھے، سکتے میں بیٹھے ہوئے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ عظمت اللہ نے ٹھیکیدار کو بتا دیا تھا کہ کیا بنانا ہے۔ سامان پر سامان چلا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ تندور بھی لگایا گیا، مالک کے بیٹھنے کا چبوترہ بھی بنایا گیا۔ ہر چیز قرینے سے کی جا رہی تھی۔ آخر میں چھت پر سیمنٹ کی چادریں بچھا دی گئیں اور اندر سے صفائی کی جانے لگی۔ عظمت اللہ خود ایک لمحے کے لیے وہاں سے نہ ہٹا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں مجھے خراج پیش کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔
"ملاحظہ فرمائیں میاں صاحب! کل یہاں ضروری فرنیچر اور برتن وغیرہ پہنچ جائیں گے۔ یہ چیزیں جمال گڑھی میں دستیاب نہیں تھیں۔ میرے آدمی خریداری کرنے گئے ہیں، صبح تک پہنچیں گے۔"
"تو پھر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس نعمت کے صلے میں اولادِ نرینہ کی نعمت سے نوازے۔" میں نے مسرور لہجے میں کہا۔
"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" میرے ساتھ شعبان اور رمضان بھی اپنے ہوٹل میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں بری طرح کانپ رہے تھے۔ ان کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ مزدور کام مکمل کر کے چلے گئے۔
"جو کمی ہو بتا دیں رمضان! پوری ہو جائے گی۔"
"رمضان نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز نہیں نکل سکی تھی۔ بالآخر عظمت اللہ چلا گیا۔ میں نے چارپائی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''چلو رمضان میاں! اب چائے ہو جائے۔ نیا ہوٹل مبارک ہو۔'' دونوں سسک سسک کر رو پڑے تھے۔ مجھے دلی مسرت ہو رہی تھی۔ اس حد تک میں نے بھی نہ سوچا تھا جو کچھ ہوا تھا، طلسم ہی لگتا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی تھی تو ان دونوں کا کیا حال ہوگا جن کا مستقبل سنور گیا تھا۔ بعد کے کچھ روز بڑے سحر خیز تھے۔ عظمت اللہ نے قول نبھایا تھا اور سب کچھ مہیا کر دیا تھا۔ یہ سب میری خوشی کے لیے ہو رہا تھا۔ پورا ہوٹل بن گیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ سب یہی کہتے تھے کہ میری آمد نے ان دونوں کی خوش بختی کے دروازے کھول دیئے۔ چار دن تک تو ہوٹل کا کام نہ ہو سکا۔ پانچویں دن افتتاح ہوا اور ہوٹل میں خوب بکری ہوئی۔ اسی دوران رحمت اللہ نے اس تقریب کا اہتمام کرلیا۔ رمضان اور شعبان نے وہاں کھانا پکایا۔ میرا وہاں بہترین استقبال کیا گیا تھا۔ بے شمار پھول پہنائے گئے، مجھے عورتوں اور مردوں نے، مجھے بہت عجیب لگا۔ بہرحال یہ ان کی خوشی تھی۔ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد بھی دو تین روز گزر گئے۔ پھر ایک دن میں نے ان دونوں سے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دو دوستو! بہت دن گزر گئے۔''

''آپ کہاں جائیں گے میاں صاحب؟''

''بس کہیں اور جانا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ آپ یہیں ہمارے پاس رہیں۔'' رمضان بولا۔

''نہیں میاں! یہ کیسے ممکن ہے، بس تمہارے ساتھ خوب گزری، اب آگے بڑھیں گے۔'' وہ لوگ حجت کرنے لگے مگر ان کی گفتگو درمیان میں رہ گئی۔ ایک موٹر ہوٹل کے سامنے آ کر رکی تھی۔ ہم سب ادھر دیکھنے لگے۔ موٹر سے ڈاکٹر بھلاّ اور دوسرے کچھ افراد نیچے اترے اور اندر داخل ہو گئے۔ وہ لوگ میرے سامنے آ کر رکے تھے۔

''یہ ہیں میاں صاحب!'' بھلاّ صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا اور کھادی کے کرتے اور ململ کی دھوتی میں ملبوس ایک بھاری بدن کے شخص نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''نمسکار مہاراج۔'' بھلاّ صاحب بولے۔

''مجھے پہچانا میاں جی!''

''کیوں نہیں، آپ ڈاکٹر بھلاّ ہیں۔''

''ہمیں کچھ وقت دیں گے میاں جی! کچھ کام ہے آپ سے!''

''بیٹھیے! کہیے کیا بات ہے؟'' وہ سب بیٹھ گئے۔ بھلاّ نے کہا۔

''ایک سوال ہے آپ سے مہاراج، آپ مسلمان ہیں۔ آپ کا دھرم تو کہتا ہے کہ انسان سب ایک جیسے ہیں۔ کوئی مشکل میں ہو تو دین دھرم سب بھول کر اس کی مدد کی جائے۔ کیا آپ دھرم کی یہ بات مانتے ہیں؟''

''سو فیصدی بھلاّ صاحب!''

''یہ سری رام جی ہیں۔ چندوسی کے رہنے والے ہیں۔ بڑی بپتا پڑی ہے ان پر۔ آپ کی سن کر آئے ہیں۔ اگر آپ انسانیت کے رشتے سے ان کی مدد کر دیں تو آپ کو دعائیں دیں گے۔''

''اگر میں کسی قابل ہوں تو حاضر ہوں۔ کیا مشکل درپیش ہے انہیں؟''

''یہاں سب کچھ بتانا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ چلنا ہوگا آپ کو۔'' بھلاّ صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے، چلتا ہوں۔'' شعبان نے آگے بڑھ کر مجھے روکنا چاہا لیکن میں نے اسے سمجھا بجھا کر اس سے رخصت لی اور میں ان لوگوں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گیا اور موٹر چل پڑی، ڈاکٹر بھلاّ کی کوٹھی بھی شاندار تھی۔ وہ لوگ میرا بڑا احترام کر رہے تھے۔ مجھے ایک بیٹھک میں لے آیا گیا۔ سری رام جی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ بھلاّ جی کپڑے بدل کر وہاں آ گئے۔ انگور اور دوسرے بہت سے پھل لا کر میرے سامنے رکھ دیئے گئے۔ بھلاّ صاحب نے کہا۔

''ہمارے ہاں کا پکا تو آپ نہ کھائیں گے میاں صاحب! پر یہ پھل پھول تو بھگوان کے پکے ہیں۔ ان میں کوئی کھوٹ

نہیں ہوتی۔ کچھ لیجئے، ہمیں خوشی ہوگی۔'' میں نے ایک سیب اٹھا لیا۔ بھلا صاحب نے کہا۔ ''علم بھی بھگوان کی دین ہے، میرا اندازہ ہے میاں صاحب کہ آپ کی عمر بہت چھوٹی ہے، اتنی چھوٹی سی عمر میں آپ کو اتنا بڑا علم کیسے حاصل ہو گیا؟''

''میں نے کسی علم کا دعویٰ کبھی نہیں کیا بھلا صاحب! ایک چھوٹی سی بات تھی۔ میرا ایک اندازہ جو درست نکلا، رحمت اللہ صاحب کی لڑکی بچ گئی۔ نہ میں نے اس وقت درویش ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور نہ اس کے بعد لوگوں کے سامنے جو اپنے سادہ لوحی سے یہ سمجھے تھے کہ میں کوئی فقیر یا بزرگ ہوں۔ اب لوگ ہی نہ مانیں تو میں کیا کروں؟''

''ماننا تو خیر میں بھی نہیں ہوں میاں صاحب! آپ نے جس اعتماد کے ساتھ وہ بات کہہ دی تھی، وہ بے مقصد نہیں تھی۔ صرف اندازے پر اتنا اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور پھر وہ سب کچھ بالکل سچ نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے پورا چیک اپ کیا تھا، نہ صرف میں نے بلکہ دوسروں نے بھی۔ آپ نے تو لڑکی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر آپ طب سے متعلق ہوتے تو بھی میں آپ کو ایک درویش حکیم کہتا اور اسے صرف حکمت نہ مانتا، خیر چھوڑیئے! ہم دوسری باتوں کی طرف بھٹک گئے، میں سیٹھ سری رام کا بھی فیملی ڈاکٹر ہوں۔ حالانکہ یہ چندوسی میں رہتے ہیں جو یہاں سے سو میل دور ہے، ان کے اہل خاندان کا علاج میں ہی کرتا ہوں۔ یہ کافی دنوں سے مشکل حالات کا شکار ہیں۔ اس بار میں خصوصی طور پر اتنا لمبا سفر طے کر کے ان کے پاس گیا اور انہیں آپ کے بارے میں بتایا۔ یہ فوراً ہی میرے پاس چلے آئے۔ میں نے دونوں کا سامنا کرا دیا ہے۔ اب یہ جانیں اور آپ......!''

''مگر ڈاکٹر صاحب! میاں جی تو کہتے ہیں کہ یہ پیر اور درویش نہیں ہیں اور صرف اندازے کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا۔'' سری رام نے کہا اور بھلا صاحب ہنس پڑے۔ پھر مجھ سے بولے۔

''آپ نے دیکھا کتنے سادہ انسان ہیں ہمارے سری رام جی! مہاشے جی ہم بے وقوف نہیں ہیں جو اتنی دور پہنچے تھے آپ کے پاس، درویش اپنے منہ سے خود کو کچھ نہیں کہتے، آپ اپنی مشکل بتائیں۔''

''معاف کر دیں مہاراج! بدھی الٹ گئی ہے اپنی۔ ایسی ہی کٹھنا پڑی ہے ہم پر...... بھگوان نے اتنا دیا ہے ہمیں کہ رکھنے کی جگہ کم پڑ گئی ہے، پر سنتان میں کمی کر دی۔ بڑی مان مرادوں سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ بھی بھگوان سورگ میں جگہ دے صالحہ اماں کو چلے میں بیٹھ گئی تھیں چالیس دن کے اور کہہ کر بیٹھی تھیں کہ سری رام تیرے لیے اولاد لے کر ہی اٹھوں گی اور ایسا ہی ہوا۔ ہمیں پاگل مت سمجھنا میاں جی۔ جو منہ میں آ رہا ہے، بک رہے ہیں۔ تم صالحہ اماں کو کیا جانو۔ ہمارے بچپن کا دوست ہے سلامت علی، ساتھ اٹھے، ساتھ پلے بڑھے، ساتھ پڑھے اور اب بھی آمنے سامنے رہتے ہیں۔ چندوسی میں ہماری محبت مشہور ہے۔ اس کے بال، بچے اپنے چاچا، تاؤ سے زیادہ ہمیں مانتے ہیں۔ صالحہ اماں اس کی ماں تھیں، اب سورگباش ہو گئی ہیں تو انہی کی دعا سے بھگوان نے بیٹی دی ہمیں۔ پالی پوسی جوان کی مگر......!'' سری رام جی کی آواز کپکپا گئی۔

''وہ خیریت سے تو ہے؟''

''بس میاں جی! کیا خیریت سے ہے، کیا بتائیں۔''

''سب کچھ بتاؤ سری رام جی! کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بھلا صاحب نے کہا۔

''جوانی آتے ہی مصیبت میں پھنس گئی ہماری اکلوتی بیٹی۔''

''کیا ہوا......؟'' میں نے کہا۔

''گووندا حرام خور چمار کی اولاد ہے، تیرہ سال کا تھا سو گھر سے بھاگ گیا تھا۔ واپس آیا تو کالی موری پر اڈہ بنا لیا اپنا اور چندوسی والوں کو پریشان کرنے لگا۔''

''وہ کہیں سے سفلی علم سیکھ آیا ہے۔ کالی موری چندوسی کے کنارے پر ایک ویرانہ ہے جہاں زمانہ قدیم میں کالی دیوی کا ایک مندر تھا جو ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس حرام خور نے وہیں اپنا ٹھکانہ بنایا اور گندے کام شروع کر دیئے۔ کسی کی پگڑی اچھالی، کسی سے مال اینٹھا۔ سارے کے سارے پریشان ہیں اس سے۔ ہماری بٹیا بھی اس کی نظروں میں آ گئی اور سسرا ہمارے پاس آ

کر بولا کہ پنڈت جی! ہمارا بیاہ کر دو اپنی بٹیا سے، من جو لگی، وہ تو ہم ہی جانتے ہیں۔ بھری سبھا میں کیچڑ پھینکی اس نے ہم پر، مگر جانتے تھے کہ وہ نہیں بول رہا، اس کا کالا جادو بول رہا ہے۔ برداشت کر گئے حالانکہ ایک اشارہ کر دیں تو سو پچاس مارے جائیں اس کی ذات کے۔ بہت سوں نے ہم سے کہا پر ہم نہ مانے۔ ہم نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ بات اس نیچ ذات نے کہی ہے، دوسروں کا کیا دوش ہے۔ دنگا فساد نہ کراؤ، بے گناہ مارے جائیں گے، گناہگار کا کچھ نہ بگڑے گا۔ بڑی مشکل سے لوگ مانے مگر وہ نہ مانا اور اپنی اَڑ پر لگا رہا۔ ہمارے گھر پر جادو ٹونے ہونے لگے، تجوریوں میں بچھو بھر گئے، سونے کے زیور سانپ بن گئے اور نہ جانے کیا کیا ہونے لگا۔"

"تجوریوں میں بچھو بھر گئے!" میرے بجائے بھلا صاحب بول پڑے۔

"ارے ہاں بھلا جی، ایک ہو تو بتائیں۔ روپیہ رکھا رہتا ہے تجوریوں میں ایک دن کچھ ضرورت پڑی تجوری کھولی ہاتھ ڈالا تو بچھو نے کاٹ لیا۔ جھانک کر دیکھا تو کوئی دس بیس بچھو ڈنک اٹھائے بڑے مزے سے اندر گھومتے پھر رہے ہیں۔ ارے بھیا وہ بچھو چڑھا کہ نانی ہی یاد آ گئی۔ دوسروں کو بتایا سب نے بچھو دیکھے، گواہی دلوا دیں گے۔ دھرم پتنی زیور پہن کر شادی میں گئی، عورتیں چیخیں مارنے لگیں، گردن میں سانپ لٹک رہا تھا۔ دھرم پتنی بے ہوش ہی ہو گئیں ڈر کے مارے۔ بعد میں زیور پھر زیور بن گیا۔ ایسے بہت سے کھیل ہوئے۔۔"

"اصل واقعہ بتاؤ سری رام جی۔" بھلا صاحب بولے۔

"وہی بتا رہے ہیں ڈاکٹر بھیا! تنگ آ گئے ہیں ہم تو۔ بات بہت لمبی ہے، میاں جی! پریشان تو نہیں ہو گئے؟"

"نہیں......!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہ پاجی ہم سے کہتا رہا کہ پوجاوتی اسے دے دی جائے ورنہ یہ گھر نرکھ بن جائے گا۔ اس بیچ کئی رشتے آئے ہوئے تھے ہماری پوجا کے۔ ہم نے سوچا اس کی شادی کر دیں تاکہ ہمیں نجات مل جائے۔ اس لیے ہم نے سوچ بچار کر کے پنڈت اوم پرکاش کے بیٹے ست پرکاش کا رشتہ منظور کر لیا۔ اوم پرکاش جی خود بھی یہی چاہتے تھے کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے۔ ہم نے بھی آمادگی کا اظہار کر دیا۔ وہ بھی بہت بڑے آدمی ہیں۔ چندوسی کے قریب ہی ان کا اپنا گاؤں ہے روپ نگر...... بہرحال بھیا! ساری باتیں طے ہو گئیں۔ روپ نگر سے ست پرکاش کی بارات آ گئی۔ ہم نے بھی دھوم دھام سے ساری تیاریاں کی تھیں اور آدمی لگا دیے تھے اپنے کالی موری پر کہ پاپی گوونداکوئی گڑبڑ نہ کرے۔ کہہ دیا تھا ہم نے اپنے آدمیوں سے کہ اگر گووندا کالی موری کے علاقے سے باہر نکل کر ہماری طرف آنے کی کوشش کرے تو لاٹھیاں مار مار کر اس کا بھیجا نکال دی جائے۔ ہمارے آدمی وہیں اس کی نگرانی پر لگ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ گووندا ایک لکیر کاڑھ کر اس کے بیچ کھڑا ہو گیا تھا اور وہیں کھڑا رہا تھا۔ ادھر یہ ہوا بھیا کہ بارات آئی، سب ٹھیک ٹھاک تھا، مہمان خوش تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں گووندا کی بدمعاشی معلوم تھی۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کالے جادو کا ماہر کہیں کوئی جادو نہ کرے، بڑی پریشانی تھی ہمیں بھی اور ہماری دھرم پتنی کو بھی! سارے کے سارے ہی گووندا کی وجہ سے پریشان تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ بھگوان کرے کہ یہ شادی آرام سے ہو جائے مگر کہاں میاں جی۔ "ہون کنڈ" تیار تھا۔ اگنی جل رہی تھی، پنڈت اشلوک پڑھ رہا تھا۔ پوجا کا پلوست پرکاش کے دامن سے باندھ دیا گیا تھا۔ پہلا پھیرا ہو گیا، دوسرا جو ہونے لگا تو اچانک ہی پوجا کی بھیانک چیخ ابھری اور پھر چاروں طرف سے چیخیں ابھرنے لگیں۔ ہم نے بھی دیکھا ست پرکاش، ست پرکاش نہیں رہا تھا بلکہ ایک ڈھانچہ بن گیا تھا۔ سوکھی ہوئی ہڈیوں والا انسانی ڈھانچہ! جس کے ہاتھ، پاؤں لٹک رہے تھے، وہ پوجا کا پلو اپنے ایک ہاتھ میں تھامے "ہون کنڈ" کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہا تھا۔ ست پرکاش کے پتا جی کی چیخیں ابھرنے لگیں اور پوجا بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ بڑی مشکل سے اس ڈھانچے کے ہاتھ سے پوجا کا پلو چھینا گیا۔ پوجا کو اٹھا کر اندر لے جایا گیا۔ اندر سارے کے سارے چیخ چلا رہے تھے اور ست پرکاش ایک ڈھانچے کی شکل میں "ہون کنڈ" کے کنارے کھڑا ہوا بھیانک انداز میں اپنی سوکھی ہوئی کھوپڑی ہلا رہا تھا۔ پھر کسی نہ کسی طرح پنڈت اوم پرکاش جی کو پتا چل گیا کہ معاملہ کیا ہے۔

بتانے والے بھلا کیوں زبان بند رکھتے، بس میاں جی عزت لٹی تھی، سولٹ گئی۔ گریبان پکڑ لیا پنڈت جی نے ہمارا، کہنے لگا کہ دھوکا کیا ہے ہم نے۔ اب بھلا بتاؤ ہم نے کیا دھوکا کیا۔ ایک گندے علم کا ماہر، ایک سفلی علم جاننے والا ہمارے پیچھے لگ گیا تھا تو اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ کہتے بھی تو کیا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس ڈھانچے کے ساتھ پوجا کے پھیرے کرا دو۔ جب سارے کام ہونے والے تھے تو یہ ہو گیا تھا۔ بھیا! عزت الگ لٹی، گالیاں الگ کھائیں، پنڈت اوم پرکاش اور ان کی پتنی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پھر یہ طے کیا انہوں نے کہ جو کچھ بھی ہے، ست پرکاش کے ڈھانچے ہی کو ساتھ لے جائیں۔ سوکھا ہوا ڈھانچہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ ویسے ان کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا۔ ہماری ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ بہرحال عجیب تماشا تھا۔ لوگ ڈھانچے کے قریب آنے سے ڈر رہے تھے۔ ماتا، پتا بھی دھاڑیں تو مار رہے تھے مگر قریب کوئی نہیں آ رہا تھا۔ ست پرکاش کو ایسی ہی شکل میں واپس لے جایا گیا اور پھر جو کہانی سنی، وہ یہ تھی کہ جیسے ہی ست پرکاش چندوسی کی سرحد سے باہر نکلا، اس کی اصلی شکل واپس آ گئی۔ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ اسے اپنا بدن تو واپس مل گیا لیکن اس کا دماغ ٹھیک نہیں رہا۔ آج بھی سنا ہے کہ وہ باؤلا ہے اور ادھر سے ادھر پھرتا رہتا ہے۔ بے چارے اوم پرکاش جی جگہ جگہ اس کا علاج کراتے پھر رہے ہیں۔ ہم سے تو دشمنی پڑی ہے ان کی، ہمارا نام سن کر تو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری پتا میاں جی! اس کے بعد بھی کچھ کہانی ہے۔ وہ یہ ہے ساری باتیں تمہیں بتا دینا ضروری ہیں۔ اب جب اتنی باتیں بتائی ہیں تو اور کچھ چھپانے سے کیا فائدہ......

میں دلچسپی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

سری رام جی نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ”جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ ہماری بربادی ہو گئی تھی، لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں مگر کسی کی زبان کون روکے۔ ہمارے ایک ماما جی رہتے ہیں گونا پور میں، شادی میں بھی آئے تھے، سب کچھ دیکھا اپنی آنکھوں سے، کوئی دو مہینے پہلے وہ ہمارے پاس آئے اور بولے کہ انہوں نے کالے جادو کے ایک ماہر سے بات کی ہے، اگر تم کہو تو اس سے پوجا کا علاج کرایا جائے۔ ہم تیار ہو گئے، اس مصیبت سے چھٹکارا تو ملے، بعد میں اس کی شادی بیاہ کا معاملہ دیکھا جائے گا۔ ماما جی، گنگولی پرشاد کو لے آئے۔ چالیس سال کا ایک لمبا تڑنگا آدمی ہے۔ آیا، پوجا کو دیکھا اور پاپی بدل گیا۔“

”بدل گیا؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں......!“

”وہ کیسے......؟“ میں پوری طرح اس کہانی میں دلچسپی لے رہا تھا اور مجھے یہ بہت عجیب لگ رہی تھی۔

”اس نے اس وقت تو کہا کہ وہ علاج کرے گا اور یہ علاج نہیں بلکہ گوونداسے جنگ ہوگی۔“ ہم نے اس سے کہا کہ روپے پیسے کی فکر نہ کرے۔ جو مانگے گا، وہ دیں گے اور وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا ”روپیہ پیسہ بعد کی بات ہے، پہلے گوونداکو دیکھنا ہوگا۔ اسے بڑے پریم سے ہم نے حویلی میں ٹھہرایا۔ اس نے ماما جی سے ایک ایسی بات کہی کہ ہمارے ہوش اُڑ گئے۔“

”کیا کہا......؟“

”اس نے کہا کہ پوجا کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ ماما جی نے اسے بتایا کہ ایک بار یہ کوشش ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ یہ شادی کسی ایسے سے کی جائے جو گوونداکا مقابلہ کر سکے۔ ماما جی نے اس سے پوچھا کہ ایسا کون ہو سکتا ہے تو وہ بولا کہ وہ خود......!“

”اوہ......وہ......وہ......“ میں نے کہا۔

”ہاں! پوجا بہت خوبصورت ہے میاں صاحب! بہت ہی سندر بچی ہے، وہ جو ایک بار دیکھتا ہے وہ اسے دیکھتا رہ جاتا ہے، وہ کمبخت بھی اس کے چکر میں پڑ گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ پوجا سے اس کی شادی کر دی جائے، وہ گوونداکو سنبھال لے گا۔“ اس بار ڈاکٹر بھلا نے کہا۔

”گوونداکے بارے میں کچھ اور معلوم ہوا......؟ میں نے پوچھا۔

''کیا......؟'' سری رام بولے۔
''اسے گنگولی کی آمد کے بارے میں معلوم ہے؟''
''ہاں......گنگولی کی یہ بات سن کر سری رام جی نے اسے فوراً گھر سے نکال دیا مگر وہ دو مہینے سے واپس نہیں گیا بلکہ اس نے بھی کالی موری سے کچھ فاصلے پر ایک پرانے برگد کے پاس اپنا استھان جما لیا ہے۔''
''ابھی تک وہیں ہے؟''
''ہاں......!'' سری رام ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ بھلا صاحب بے اختیار مسکرا پڑے۔ پھر بولے۔
''معافی چاہتا ہوں میاں صاحب! گستاخی ضرور ہے مگر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ سری رام جی آپ کو دیکھ کر چونکے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ آپ بھی نوجوان ہیں مگر آپ مسلمان ہیں اور خیر...... چھوڑیئے میری بات......تو یہ مسئلہ ہے۔''
''میں ہنسنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔'' آپ نے اس گفتگو میں بے جا رخنہ اندازی کی ہے بھلا صاحب! کچھ سوالات آئے تھے میرے ذہن میں جو میں سری رام جی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''
''پوچھیں مہاراج!'' سری رام بولے۔

''آپ کی بیٹی کا کیا حال ہے؟''
''خاموش رہتی ہے، دیواریں تکتی رہتی ہے، کچھ نہیں بولتی اس بارے میں......!''
''دوسرا سوال...... گوونداکے ماں، باپ اور دوسرے رشتے دار نہیں ہیں؟''
''سب ہیں مگر جب سے وہ واپس آیا، ان سے دُور ہو گیا ہے۔

✦✤✦✤✦

وہ خود بھی اس کے خلاف ہیں اور میرے آگے ہاتھ جوڑ کر روتے ہیں کہ ان کا کوئی دوش نہیں ہے۔''
''گنگولی دوبارہ آپ کے پاس آیا۔''
''آتا رہتا ہے۔ وہ بھی گندے علم کرتا ہے۔ شیطان ہے وہ پورا! ماما جی نے ایک اور مصیبت لا کھڑی کی ہے مگر کسی کو کیا کہیں۔''
میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کیا کہوں مگر اس وقت بابا فضل کے الفاظ یاد آئے۔
''جو ہے، اسے خرچ کرو۔ کسی تفریق کے بغیر کہ انسان یکساں ہے اور بے بس ہے۔'' تب میں نے کہا۔
''میں ایک بے وقعت آدمی ہوں۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نہ درویش ہوں، نہ عالم! لیکن کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کچھ نہ کر پاؤں تو مجھے ذمہ دار نہ سمجھیں......!''
بالکل نہیں میاں صاحب! کوشش ہی کی جا سکتی ہے۔'' بھلا صاحب بولے۔
''تب ٹھیک ہے...... میں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں سری رام جی......!'' میں نے فیصلہ کر لیا......!
اس فیصلے میں اس کہانی سے میری دلچسپی بھی شامل تھی جو کچھ میں نے سنا تھا وہ انوکھا لگا تھا مجھے۔ کالے جادو کے دو ماہروں میں ٹھن گئی تھی، بقول سری رام جی کے گنگولی بھی دو ماہ سے وہاں مقیم ہے۔ مگر میں کروں گا کیا؟ مجھے ان دونوں سے کس طرح نمٹنا ہوگا، زیادہ سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سری رام نے کہا۔'' تو پھر مہاراج دیر کس بات کی ہے؟''
''ہاں دیر کرنا بیکار ہے، کام جتنی جلدی شروع ہو جائے اچھا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں ملازم کو بھیج کر ٹرین کا وقت معلوم کرا لوں۔'' بھلا صاحب بولے۔
''ٹکٹ ہی منگوا لیں بھلا جی۔ وقت معلوم کرانے سے کیا فائدہ۔'' سری رام نے کہا۔
''کیوں میاں صاحب؟''

"جی ہاں ٹھیک ہے مگر مجھے رمضان کے ہوٹل پہنچا دیں وہیں سے ساتھ لے لیں۔"

"جو حکم۔" بھلا صاحب نے کہا۔ کچھ دیر کے بعد میں بھائیوں کے ہوٹل پہنچ گیا۔ رمضان شعبان کو بس اتنا بتایا تھا کہ میں جا رہا ہوں، دونوں منہ بسورنے لگے، بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ میرا جانا ضروری ہے بہت کچھ کہا انہوں نے اور اس وقت تک کہتے رہے جب تک بھلا صاحب کی کار مجھے لینے نہ پہنچ گئی۔

"چندوسی کے لیے ریل آدھے گھنٹے کے بعد مل جائے گی، ٹکٹ آ گئے ہیں۔" سری رام نے کہا اور میں تیار ہو گیا۔ اسٹیشن پر بھلا صاحب نے کہا۔

مجھے یقین ہے کہ سری رام کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، مجھے خبریں ضرور بھیجتے رہنا۔ جوں ہی مجھے فرصت ملی میں خود بھی آؤں گا۔ ریل آ گئی اور ہم دونوں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے، سری رام جی بڑے نیاز مند نظر آ رہے تھے میرے سامنے، بچھے جا رہے تھے۔

"ہماری عزت لٹ گئی ہے مہاراج! لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کسی کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے زبان نہیں۔ اگر ہمارا کام ہو جائے تو ہم آپ کے چرن دھو دھو کے پئیں گے۔"

"دیکھیں سری رام جی! اللہ کی کیا مرضی ہے۔"

"میاں جی! آپ کا کوئی نام تو ہوگا، کس نام سے پکاریں آپ کو؟" سری رام نے کہا اور میں ہنس پڑا۔

"جمال گڑھی میں رہ کر تو میں اپنا نام خود بھول گیا۔"

"کیوں مہاراج؟"

"وہاں کبھی کسی نے میرا نام نہیں پوچھا۔ سب میاں صاحب اور میاں جی ہی کہتے رہے۔ میرا نام مسعود ہے۔"

"ہم آپ کو مسعود میاں کہیں۔ ویسے ایک بات ہے مہاراج بہت چھوٹی سی عمر میں بھگوان نے آپ کو اتنا بڑا گیان دے دیا۔ آپ کی عمر کچھ بھی نہیں لگتی، اگر یہ داڑھی صاف کرا دیں تو لڑکے لگیں۔" سری رام کے ان الفاظ پر پہلی بار مجھے اپنے اس حلیے کا خیال آیا، نہ جانے کیسی صورت ہو رہی ہے، غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا، دل میں خیال آیا کہ آئینہ تو دیکھوں، مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ سری رام نے پھر کہا۔ "چندوسی میں ہم آپ کو سلامت علی کے گھر ٹھہرائیں گے، ہمارا بچپن کا یار ہے، ہر اچھے برے کا ساتھی۔ آپ کو بھی آسانی رہے گی، اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے ہے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔"

"اس کے بچے ہیں۔ فراست تو آپ کے برابر ہی ہوگا، جو کچھ آپ چاہیں گے وہاں آپ کی خوشی کے مطابق ہو جائے گا۔" چندوسی آ گیا۔ ایک تانگے میں بیٹھ کر میں اور سری رام چل پڑے۔ تھوڑی دیر سفر جاری رہا اور پھر ہم ایک علاقے میں آ گئے۔ بڑی سی عمارت بنی ہوئی تھی جس کا طرزِ تعمیر ہندووانہ تھا۔ سامنے ہی دوسری عمارت تھی اس کے بغلی دروازے پر ہم اتر گئے، غالباً احتیاط کے پیش نگاہ سری رام جی سامنے والے دروازے پر نہیں گئے تھے۔ البتہ سلامت علی کے گھر میں ان کا دخل کافی معلوم ہوا تھا، وہ مجھے اس دروازے سے اندر لائے، ایک شخص نظر آیا تو انہوں نے کہا۔

"شریف! بغلی بیٹھک کھول دو۔"

"کھلی ہوئی ہے لالہ جی......شریف نے کہا اور ہم اس طرف چل پڑے۔ شریف نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا۔

"سلامت کہاں ہے؟"

"اندر ہیں۔"

"بتا دو اور ہاں کسی اور کو میرے آنے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا ہے، سمجھ گئے؟"

"جی لالہ......"

"چائے بھی تیار کرا لو......" ملازم شریف گردن ہلا کر چلا گیا۔ بیٹھک بڑی آرام دہ تھی، دیوان پڑے ہوئے تھے،

ماحول خوب ٹھنڈا تھا۔ چند منٹ بعد ایک شخص اندر داخل ہو گیا۔ گورا چٹا رنگ، چھوٹی سی داڑھی، اچھی شخصیت تھی۔ اندر داخل ہو کر اس نے پہلے مجھے پھر سری رام کو دیکھا اور پھر مجھے سلام کیا، جس کا میں نے جواب دیا تھا۔

''مجھے مسعود کہتے ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ سری رام! تم جس کام سے گئے تھے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

''بھلا جی نے مسعود میاں جی کے بارے میں ہی بتایا تھا۔''

''اوہ...... اچھا معاف کیجئے مسعود میاں...... آپ تو بہت کم عمر ہیں لیکن میں خدا کی دین کا قائل ہوں۔ اللہ تو کسی کو بھی کسی بھی عمر میں کچھ دے سکتا ہے۔''

''سلامت کو سب کچھ معلوم ہے میاں جی، ان سے ساری باتیں کر کے گیا تھا، البتہ نئی بات اب کروں گا۔ سلامت! میں نے میاں جی کو تمہارے ہاں ٹھہرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ پوجا سے بھی میں انہیں تمہارے مہمان کی حیثیت سے ملاؤں گا، بعد میں مسعود میاں جی کے مشورے سے ہم کام کریں گے۔''

''بڑی خوشی سے، بلکہ یہ زیادہ بہتر ہے۔

''چائے پلاؤ اس کے بعد گھر جاؤں گا۔''

''شریف سے کہا ہے۔''

''ہاں......''

''بس تو آتی ہوگی۔'' سلامت علی نے کہا اور کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، اس دوران سلامت علی کئی بار مجھے چور نظروں سے دیکھ چکا تھا۔ بالآخر اس نے کہا وہ رحمت اللہ کی بیٹی کا کیا معاملہ نکلا جو بھلا نے بتایا تھا۔

''پوری جمال گڑھی میں چرچا ہے، دُھوم مچی ہوئی ہے میاں جی کی۔ بھگوان نے ایک زندگی کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیا۔''

''بڑی سنسنی خیز بات ہے۔ چائے آ گئی اور سری رام چائے پینے کے بعد مزید کچھ دیر رُکا پھر چلا گیا۔ سلامت علی البتہ میرے پاس بیٹھ گیا تھا کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ کا تعلق کہاں سے ہے مسعود میاں؟''

''اللہ کی بنائی ہوئی تمام انسانی آبادی سے......''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر والدین، گھر بار، عزیز و اقارب......''

''حکم ہے کہ انہیں بھول جایا جائے، خلقِ اللہ کی خدمت کی جائے۔'' میں نے کہا۔

''سبحان اللہ...... بہت بڑا کام ہے میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ کچھ وقت آپ کی خدمت کی سعادت مجھے ملی، میرے بچے بچیاں ہیں کچھ دعائیں ان کے لیے بھی کر دیں۔ ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''جی ضرور......''

''سری رام نے اپنی مشکل آپ کو بتا دی ہوگی، اس کی ذات برادری کا معاملہ ہے، وہ ہندو ہے اور اس کا گھرانہ مذہبی طور پر بہت کٹر ہے۔ غالباً لوگ اس بات پر اعتراض کریں گے کہ وہ ہندو ذات ہونے کے باوجود ایک مسلمان سے یہ کام کرا رہا ہے، یہ اس کی مشکل ہے، چنانچہ اس بات کو چھپانا پڑے گا کہ آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں۔ آپ کو اس پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''سلامت علی صاحب! اچھا ہے آپ نے یہ بات کہہ دی، مجھے زبان کھولنے کا موقع مل گیا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں کوئی عامل ہوں نہ درویش، نہ فقیر نہ پہنچا ہوا کوئی انسان۔ ہاں کسی بزرگ ہستی سے انسان کی مشکل میں کام آنے کا حکم ملا ہے اور روحانی رہنمائی کا وعدہ کیا گیا ہے، بس اسی کے سہارے کچھ کر لیتا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ انسان اگر مشکل میں ہو تو اس کے دین دھرم پر غور نہ کروں بلکہ جو کچھ مجھ سے بن پڑے کروں۔''

''جو داستان میں نے سنی ہے اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں، اگر رہنمائی ہوئی تو شاید کچھ ہو جائے ورنہ معذور ہوں۔ مجھے نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی بات کو منظرِ عام پر لانا ضروری نہیں ہے، اس سے میری بھی بچت ہے، اگر کچھ نہ کر سکا تو خوامخواہ کی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے گی، آپ میری بات پر حیران نہ ہوں سلامت علی صاحب، درحقیقت میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ سچائی پر مبنی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں، بس کچھ بزرگوں کا فیض ہو گیا ہے۔ دوسروں کی مشکلات حل کرنا چاہتا ہوں بزرگوں کی رہنمائی میں اور اگر کچھ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اپنی مشکلات کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔''

سلامت علی صاحب گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر انہوں کہا ''مسعود میاں! معمولی بات نہیں ہے اگر کسی صاحبِ علم کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے، کسی کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، یہ بات بھی عام لوگوں کے بس کی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کسی کو ہی یہ سعادت عطا کرتا ہے۔ درحقیقت سری رام میرا بچپن کا دوست ہے، اس کی فطرت جیسی بھی ہے اس کے خاندانی معاملات جو کچھ بھی ہیں، ہماری دوستی اس سے ہٹ کر ہے، ہمیں صرف اپنی دوستی سے غرض ہے اور اسی لیے میں سری رام کی ہر طرح کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میرے ذہن میں بس یہ خیال تھا کہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس بات سے بددل ہو جائیں کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں اسے چھپا چھپا کر رکھا جا رہا ہے، اسی لیے میں نے یہ بات کہہ دی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے کہا۔''سری رام کے پاس اور کچھ ہے یا نہیں ہے لیکن وہ دوستی کی دولت سے مالا مال ہے۔ انسان کو اگر ایک بھی مخلص دوست مل جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی حیات کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔ بہرحال میری جانب سے آپ مطمئن رہیں جس طرح بھی پسند فرمائیں، کام کریں میں کھل کر عرض کر چکا ہوں کہ اگر میری رہنمائی ہوئی تو میں سری رام کی مشکل میں اس کا پورا پورا ساتھ دینے کی کوشش کروں گا اور اگر ناکام رہا تو بس غم کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے مسعود میاں! یہ تو تقدیر کے معاملات ہوتے ہیں۔ اللہ نے اس بچی کی تقدیر میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہی ہو کر رہے گا، میں اس سلسلے میں ایک بات بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ یہ میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہوگا، چند ضروری باتیں اور کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سلامت علی صاحب! میں آپ کے بچوں کی مانند ہوں، اجازت نہ مانگا کریں مجھ سے، جو حکم ہو فرما دیا کریں۔

''اپنے اہلِ خاندان میں، میں آپ کو اپنے ایک دوست کے بیٹے کی حیثیت سے متعارف کراؤں گا اور بس ماضی کو گول مول رہنے دوں گا۔ یہ مجھے اس لیے کرنا ہے کہ سری رام کی خواہش کے مطابق آپ کو چھپانا ہوگا، گھر میں بھی کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کروں گا۔ آپ دوستوں ہی کی مانند دوسروں کے ساتھ پیش آیئے۔ میرے بیٹے بیٹیاں ہیں باقی تو چھوٹے ہیں لیکن ایک بیٹا فراست تقریباً آپ کی عمر کا ہے۔ اس سے دو سال چھوٹی بیٹی فرخندہ ہے۔ فرخندہ بہت شریر فطرت کی مالک ہے۔ عمر تو اچھی خاصی ہو گئی ہے اس کی لیکن طبیعت میں بچپن ہے۔ میری التجا ہے آپ سے کہ یہاں کسی کی کسی بات کا بُرا نہ منایئے۔ آپ بزرگ ہیں اور بزرگی صرف عمر کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ جسے اللہ کی مدد حاصل ہو جائے وہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ تو کہیں یوں نہ ہو کہ میرے کسی بچے کی گستاخی میرے لیے سزا بن جائے۔''

میں ہنس پڑا اور کہا۔

''آپ ان تمام باتوں کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔''

''بہت بہت شکریہ، ظاہر ہے آپ کے دل میں یہ نرمی نہ ہوگی تو پھر کسی اور کے دل میں کیسے ہوگی۔ میں اجازت چاہتا ہوں، اب ذرا آپ کا تعارف کرا دوں، اندر والوں سے تھوڑی دیر کے بعد سب آپ پر نازل ہو جائیں گے۔''

سلامت علی چلے گئے اور میں ٹھنڈی سانس لے کر ایک دیوان پر دراز ہو گیا، طرح طرح کا ماحول مل رہا تھا مجھے، بھانت بھانت کے لوگ میری زندگی میں آ رہے تھے اور ان کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا جن کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ حسرت سی بھی

طرح دل سے دُور نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً یہ انسانی قوت سے باہر کی بات ہے۔ میرے دل میں اگر کوئی تڑپ ہو سکتی تھی تو اپنے ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی اور کوئی نظریہ تو تھا ہی نہیں اب، پہلے بھی گناہ کے راستوں کی جانب قدم بڑھائے تھے لیکن سزا اتنی طویل تھی کہ چاروں طبق روشن ہو گئے تھے اور اب دل میں کوئی آرزو نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ایک بار بس ایک بار وہ اُجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے، بس ایک بار وہ سب پھر اکٹھے ہو کر قہقہے لگائیں، بس ایک بار اپنے ابو کی انگلی پکڑ کر عید کی نماز پڑھنے جاؤں، بس ایک بار واپس آ کر چھوٹے بہن اور بھائی کے سلام لوں اور انہیں گلے لگاؤں۔ بس ایک بار ماموں ریاض کی محبت بھری مسکراہٹیں اور قہقہے مجھے مل جائیں۔ بس اتنی ہی آرزو تھی میرے دل میں اس سے زیادہ کسی شے کا خواہشمند نہیں تھا، لیکن حکم تھا کہ ہر آرزو کو دل سے نکال دوں۔ پھل چکھ چکا ہوں، پھل کھانے کے لیے پھلوں کے انبار پر ٹوٹ نہ پڑوں ورنہ پھلوں کے انبار میرے سامنے سے ہٹا لیے جائیں گے اور پھر پھل چکھائے جائیں گے آہ! اب اس کی قوت نہیں تھی مجھ میں، چنانچہ صبر کرنا تھا اور یہ صبر بھی میرے امتحان کا ایک حصہ تھا، دل کو ڈھارس دی، سہارا دیا، تڑپتے ہوئے دل کو سمجھایا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہی سب کچھ سمجھا جائے جو نہیں ہو پا رہا اس کی طلب میں ابھی آگے قدم بڑھانا منع ہے۔ ذہن کو اداسی کا شکار نہ کیا جائے۔ سوچنا یہ ہے کہ آگے کیا کیا جائے۔ بھوریا چرن اس دوران مکمل طور پر غائب تھا اور یہ ایک خوشگوار احساس تھا جو دل کو بڑی تقویت دیتا تھا۔ ابھی تک تو میرا بدترین دشمن میرے سامنے آ آ کر مجھے خوفناک ذہنی حادثوں سے دوچار کرتا رہا تھا۔ اب اتنے عرصے سے اس کا سامنا نہیں ہو سکا تھا اور جو کچھ ہوا تھا وہ ایسا تھا کہ اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا، ہو سکتا ہے بھوریا چرن کی ناکامیوں کا دور شروع ہو گیا ہو اور اب، اب وہ میرے راستے اس انداز میں نہ روک سکے جس طرح روکتا رہا ہے، آہ اگر ایسا ہو جائے تو یقینی طور پر اُمید بندھ سکتی ہے، زندگی اور موت کا مالک معبود حقیقی ہے، کون جانے کون کب اس دنیا سے اٹھ جائے، محبتوں کا تصور تو حیات کے ساتھ ہے۔ آنکھیں بند ہو گئیں تو نہ کوئی طلب رہے گی اور نہ کوئی احساس۔ بس وہاں تو حساب کا معاملہ سامنے آ جائے گا اور سارے حساب چھبنے لگیں گے۔ ماں اور باپ اگر زندہ رہے اور اللہ کو یہ آرزو پوری کرنا مقصود ہوئی تو وہ سب کو زندہ رکھے گا ورنہ جانے والے چلے جائیں گے، روکنے والا بھلا کون۔"

نجانے کب تک ان احساسات کا شکار رہا، دروازے کے باہر آہٹیں سنائی دیں اور پھر سلامت علی کی آواز آئی۔

"بھئی آپ سب لوگ بیٹھک میں داخل ہو کر کیا کریں گے، میں مسعود میاں کو خود ہی یہاں بلائے لاتا ہوں، مسعود میاں، بھئی مسعود میاں، سو تو نہیں رہے ہیں؟"

"جی نہیں، حاضر ہو رہا ہوں" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر بہت سی خواتین و حضرات موجود تھے۔ ایک معمر خاتون سب سے آگے تھیں، ایک شوخ شریر سی چہرے والی نوجوان لڑکی ان کے پیچھے تھے، چھوٹے بڑے اور بہت بہت سے افراد تھے، وہ نوجوان بھی نظر آ رہا تھا۔ اسے ایک نگاہ میں دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ سلامت علی کا بیٹا فراست ہے۔ سلامت علی صاحب نے کہا۔

"مل لیجیے آپ حضرات ان سے یہ ہیں مسعود احمد۔" فراست نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "اور چونکہ میں اس سلسلے میں سب سے بڑا حق دار ہوں کہ آپ سے دوستی کروں، چنانچہ سب سے پہلے مجھ سے ملیے میرا نام فراست ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"بیٹے آپ کو اس طرح لایا گیا جیسے معاف کرنا چوروں کو لایا جاتا ہے، لیکن ان حضرت کی یہ عادت ہے کہ سب لوگوں کو چونکا دیتے ہیں، اب آپ دیکھیے آپ ان کے دوست کے بیٹے اور آپ کو اس طرح چھپا کر گھر میں لایا گیا ہے جیسے کوئی سونے کی مورتی مندر سے چُرا کر لاتا ہے، خیر چھوڑیے ان باتوں کو، آئیے ہمارے ساتھ۔ آپ کہاں غیروں کی طرح اس بیٹھک میں آ پڑے ہیں؟"

معمر خاتون نے کہا، آگے بڑھیں، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور یہ لمس، یہ لمس تو میرے دل کو چھوتا تھا، میرا سر دیر تک

جھکا رہا۔ فراست نے کہا۔

''اب سیدھے ہو جائیے حضور! امی کا ہاتھ تھک گیا ہوگا۔'' میں شرمندہ ہو کر سیدھا ہو گیا، سلامت علی منہ کھول کر رہ گئے تھے، پھر انہوں نے کہا۔

''یہ تم نے میرے دوست کے بیٹے کو فوراً ہی آڑے ہاتھوں کیوں لے لیا، چلو اب اگر ایسا ہی ہے تو اندر لے چلو۔''

''آؤ میاں آؤ۔ ویسے میرا نام جمیلہ ہے، یہ فرخندہ ہے، یہ شاہانہ ہے اور یہ......'' معمر خاتون نے نجانے کیا کیا نام مجھے گنا دیے۔ دوسرے لوگوں سے رشتے بھی بتا دیے مگر مجھے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ان کے ساتھ اندر داخل ہو گیا، مکان بہت کشادہ اور وسیع تھا۔ قدیم طرز تعمیر کا ایک حسین نمونہ جس میں اقدار کی جھلکیاں شامل ہوتی ہیں۔ بڑی محبت اور بڑی اپنائیت سے مجھے ایک اور بڑے کمرے میں لایا گیا جو زنانہ نشست کا کمرہ تھا، یہاں میری خاطر مدارت کا پورا پورا بندوبست کیا گیا تھا۔ فراست میرے پاس ہی بیٹھا تھا، اس نے کہا۔

''یوں لگتا ہے جیسے آپ کوئی مہم جو ہوں اور صحراؤں اور پہاڑوں میں آوارہ گردیاں کرتے رہے ہوں۔ حلیہ ہی ایسا بنا رکھا ہے آپ نے۔ اور یہ داڑھی دعوے سے کہتا ہوں یہ داڑھی باقاعدہ نہیں بلکہ بے قاعدہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اسے خصوصی طور پر چہرے کی زینت نہیں بنایا گیا ہے بلکہ یہ زینت صاحبہ خود بخود منظر عام پر آ گئی ہیں چنانچہ قبلہ ابا جان سے پہلی درخواست ہے کہ ان حضرت کو مہم جو سے ایک انسان بنانے کی اجازت مجھے دی جائے۔''

''دیکھو فراست جملوں کے استعمال میں احتیاط کیا کرو، بے تکلفی رفتہ رفتہ اچھی ہوتی ہے کوئی بھی کام ایسا نہیں ہوگا جو مسعود میاں کی مرضی کے خلاف ہو۔ آپ تمام لوگ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ یہ میرے بہت ہی محترم دوست کے بیٹے ہیں اور میں ان کی عزت اپنے دوست ہی کی مانند کرتا ہوں۔ بے تکلفی ایک مناسب حد تک ٹھیک ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔''

''خیال رکھا جائے گا۔ قبلہ ابا جان مگر دیکھیے نا یہ تو یہ ایک مخلصانہ پیشکش ہے۔ صاحب آپ ہی کچھ فرمائیے ہماری اس سلسلے میں کیا مدد کی جا سکتی ہے۔'' میں ہنس پڑا، پھر میں نے کہا۔

''آپ درست کہتے ہیں فراست! درحقیقت مہم جوئی کی زندگی ہی گزاری ہے میں نے، لیکن ایک درخواست ضرور کرتا ہوں آپ تمام حضرات سے وہ یہ کہ میری مہمات کی تفصیلات نہ پوچھیں کیونکہ میرے لیے۔

''اچھا اچھا بھائی پتا ہے آپ زمین میں دفن خزانوں کی تلاش میں نکلے ہوں گے اور ناکام ہو گئے ہوں گے، اب انسان اپنی ناکامیوں کو......'' فراست نے کہا اور سلامتی علی خان نے پھر اسے ڈانٹا۔

''فراست......'' فراست دانتوں میں زبان دبا کر خاموش ہو گیا تھا۔ میرے لیے ایک کمرے کا بندوبست کیا گیا۔ فراست نے اپنا ایک لباس مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''اس خاکسار کا لباس پہننے پر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا، غسل خانے میں شیو وغیرہ کا سامان بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ یہ درخواست کرتا ہوں کہ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔'' غسل خانے میں لگے آئینے میں، میں نے اپنا چہرہ دیکھا اور مجھے اسے خود پہنچاننے میں دقت ہوئی، بہرحال مصروف ہو گیا۔

لالہ سری رام جیسے بھی ہوں لیکن سلامت علی کے گھرانے کے بارے میں، میں یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ بہترین لوگ تھے۔ خوش اخلاق، محبت کرنے والے، زیادہ وقت نہیں گزرا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میں طویل عرصے سے ان کے ساتھ ہوں۔ شیو وغیرہ بنا لیا۔ فراست کا لباس میرے بدن پر بالکل درست تھا، ایک خوبی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ کہ دل بولنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر کوئی آ بیٹھا ہو، رہنمائی کر رہا ہو، جو کچھ کرتا اگر غلط ہوتا تو اندر سے منع کر دیا جاتا ورنہ خاموشی اختیار کی جاتی، کوئی سوال کرتا تو فوراً جواب ملتا تھا اس وقت بھی خاموشی تھی۔ میں نے خود ہی سوال کیا۔

''یہ سب کچھ برا تو نہیں ہے۔''

''نہیں کیونکہ اس سے خودنمائی کا احساس قتل ہوتا ہے۔ دوسروں سے مختلف حلیہ بنا کر خود کو منفرد ظاہر کرنے کا شوق پسندیدہ عمل نہیں ہے اس لیے سب ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھلا ہوا تھا، فراست اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا، پھر اس کے چہرے پر عجیب سی شگفتگی پھیل گئی۔ اس نے شرارت سے کہا۔

''آپ کون ہیں؟''

''سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک صاحب مسعود نامی بھی یہاں تھے، کہاں گئے؟''

''فراست صاحب نامی ایک صاحب نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یار خدا کی قسم انار کی طرح خوبصورت ہو، قندھاری انار کی طرح جسے اوپر سے دیکھ کر اس کے صحیح حسن کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ذرا آؤ تو میرے ساتھ۔ آؤ ذرا۔''

''اب تم مجھے نمائش کے لیے پیش کرو گے؟''

''ٹکٹ لگاؤں گا تم پر۔ رقم کماؤں گا، صدائیں لگاؤں گا کہ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔''

''چھوڑو فراست۔ مذاق نہ اڑاؤ بیٹھو۔''

''مسٹر پُراسرار ہم نے یہی نام دیا ہے تمہیں اور یہ نام تجویز کیا ہے فرخندہ نے، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بے حد پُراسرار ہو۔ ہم سے دوستی نہیں کرو گے؟''

''ہوئی نہیں ہے دوستی؟'' میں نے کہا۔

''خاک۔ ایک بات نہیں معلوم تمہارے بارے میں، کہاں سے آئے ہو، ابو کے کون سے دوست کے بیٹے ہو، یہ حلیہ کیوں بنا رکھا تھا وغیرہ وغیرہ۔'' فراست نے کہا۔

''فراست تم سے دوستی کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی لیکن میرے بارے میں تمہیں سلامت علی صاحب ہی بتائیں گے یہ میری مجبوری ہے ورنہ انکار نہ کرتا۔'' باہر سے فرخندہ کی آواز سنائی دی۔

''بھیا! ابو دونوں کو بلا رہے ہیں۔'' باہر بھی وہی کیفیت ہوئی تھی خود سلامت علی مجھے دیکھ کر ساکت رہ گئے تھے مگر کچھ بولے نہیں تھے۔ شام کو پانچ بجے فراست پھر ایک سوٹ لے کر آ گیا۔

''چلیے لباس تبدیل کر لیجیے، چلنا ہے۔''

''کہاں؟''

''چاچا سری رام کے ہاں۔ شام کی چائے وہاں ہے۔''

''یہ لباس رہنے دو فراست بس اتنا کافی ہے۔''

''جی نہیں، یہ نہیں مانی جا سکتی۔'' فراست نے مجھے دوسرا لباس پہنا کر چھوڑا، سب لوگوں کا پروگرام تھا اور سب تیار تھے، مجھے ہنسی آ رہی تھی، یہ خوب دلچسپ کام تھا جس میں یہ تفریحات بھی شامل تھیں۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا مجھے برا نہیں لگ رہا تھا۔ ہم سب سری رام کی حویلی میں داخل ہو گئے۔ سری رام ان کی دھرم پتنی اور کچھ اجنبی لوگوں نے ہمارا سواگت کیا تھا اور بڑی اپنائیت سے اندر لے گئے۔ میرے بارے میں بڑی مختصر گفتگو ہوئی تھی، جان بوجھ کر اس سے احتراز برتا گیا تھا مگر سری رام جی نے اتنا ضرور کہا تھا۔

''مسعود میاں! آپ سلامت کے دوست کے بیٹے ہی نہیں ہمارے بھی بہت کچھ ہیں، اس لیے آپ کو وعدہ کرنا پڑے گا کہ ہمارے ہاں روز آتے رہیں گے۔''

''ضرور سری رام جی۔'' میں نے جواب دیا۔ چائے پر پوجا وتی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ایسے دلکش چہرے کم نظر آتے ہیں۔ مومی رنگ، گہری دلکش آنکھیں، ستواں ناک، حسین تراش کے ہونٹ، بال گھٹاؤں جیسے اُمڈتے ہوئے پورا چہرہ تصویر

یاس، غم میں ڈوبا ہوا۔ ایک لفظ نہ بولی تھی بس خاموش آ کر بیٹھ گئی تھی۔
''یہ پوجا ہے ہماری بیٹی۔'' سرلا وتی جو سری رام کی دھرم پتنی تھیں، بولیں۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ چائے پر میں نے صرف چند پھل کھائے تھے، چائے کے لیے منع کرتے ہوئے میں نے کہا۔
''میں چائے یا ٹھنڈا نہیں پیتا۔''
''تو پھر یہ بادام لیجیے مہاراج۔'' سری رام فوراً بولے۔ بھلاّ جی کے ہاں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ان کے برتنوں میں پکی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔
''پوجا بہت خاموش رہتی ہے۔'' میں نے کہا اور پوجا نے چونک کر مجھے دیکھا۔
''ہاں کچھ......'' سرلا وتی بولیں۔
''کیا بات ہے؟''
''بھگوان جانے۔''
''آپ مجھ سے باتیں کریں پوجا، میں نے کہا اور وہ پھر مجھے دیکھنے لگی، پھر آہستہ سے بولی۔''
''آپ کچھ خیال نہ کریں مسعود جی! بس کچھ بیمار ہو گئی ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے خوبصورت آواز میں کہا۔
''آپ آتے جاتے رہیں گے تو یہ آپ سے بے تکلف ہو جائے گی۔'' سری رام بولے۔
''ضرور آؤں گا۔'' میں نے کہا اور پھر اتفاق سے میری نظر فراست اور فرخندہ پر پڑ گئی۔ دونوں مجھے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں شرارت کی بجلیاں کوندرہی تھیں۔ میں جھینپ گیا۔ کافی دیر ہم وہاں رُکے جب چلے تو سری رام بولے۔
''پھر کب آؤ گے مسعود میاں؟''
''کل!'' میں نے جواب دیا۔ گھر واپس آ گئے۔ سلامت علی نے موقع ملتے ہی مجھ سے کہا۔
''آپ نے ان کے ہاں چائے یا ٹھنڈا نہیں پیا؟''
''معافی چاہتا ہوں، یہ میرے لیے ممکن نہیں۔''
''یقیناً مجھے بھی خیال نہ رہا، آئندہ خاص احتیاط رکھی جائے گی۔''
''ویسے میرا خیال تھا کہ شاید سری رام اس بات کا بُرا منائے لیکن اس نے فوراً ہی بات سنبھال لی تھی۔ دراصل ہم لوگ تو بچپن کے دوست ہیں اور ہمیشہ ہی ساتھ رہے ہیں، اس لیے اتنی بے تکلفی ہو گئی ہے کہ میں نے کبھی سری رام کے ہاں کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہیں برتی اور نا ہی اس نے کبھی ایسا کوئی خیال کیا۔ حالانکہ وہ لوگ گوشت خور نہیں ہیں لیکن میرے ہاں کے برتنوں میں کھانے پینے میں اعتراض نہیں کرتے، خیر چھوڑو مسعود میاں تم نے پوجا کو دیکھا......؟''
''جی ہاں۔''
''پہلے ایسی نہیں تھی، اس کی فطرت میں شوخی تو خیر پہلے بھی نہیں تھی لیکن اب بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہے، ایک عجیب و غریب کیفیت ہے اس کی، ہوسکتا ہے تم سے بے تکلف نہ ہو۔ لیکن، لیکن کوئی اندازہ لگایا تم نے؟'' میں نے مسکرا کر سلامت علی کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی اس بچی سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں کہ اس کے لیے بے حد پریشان رہتا ہوں۔ سری رام ساری باتوں سے الگ بے حد اچھا انسان ہے اور بس یہ سمجھو کہ میرے لیے بھائیوں جیسا ہی ہے۔ ہم لوگ ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بڑا پیار ہے، خیر اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے، خدا کرے اس کی مشکل کا حل دریافت ہو جائے۔
سلامت علی صاحب نے اتنی باتیں کیں تو پھر میری زبان بھی کھل گئی۔ میں نے پُرخیال انداز میں ان سے کہا۔
''کیا آپ مجھے ایک بار پھر اس تمام صورتِ حال کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔''
''ہاں ہاں، چونکہ بھلاّ نے بات میرے سامنے ہی کی تھی اور مجھے یہ معلوم ہے کہ تمہیں کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے،

معاف کرنا مسعود آپ کے بجائے تم پر اُتر آیا ہوں، لیکن جس انداز میں تعارف کرایا تمہارا، اس میں تم سے گفتگو کرنا بھی ضروری ہوگیا ہے۔ دوست کے بیٹے سے اب اتنا زیادہ تکلف تو نہیں برتا جا سکتا۔"

"آپ نے بلاوجہ یہ بات سوچی، آپ مجھے فراست ہی کی طرح مخاطب کیجیے۔"

"ہاں میاں اس سے زیادہ انوکھی بات اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ سارے معاملات میں براہ راست شریک رہا ہوں، کیا بتاؤں تفصیل یہ ہے کہ......" وہ پوری کہانی دہرانے کے بعد بڑی افسردگی سے گویا ہوئے۔ "اب تم خود سوچو مسعود میاں! بے چارے سری رام کی کیا کیفیت ہونی چاہیے۔ باؤلا ہو کر رہ گیا ہے، مجھے معلوم ہے اس کے دل کا حال، عزت پر بن گئی ہے بے چارے کی اور انہی تمام واقعات سے پوجا بھی متاثر ہوئی ہے اور اب ہر وقت خاموش رہتی ہے۔ یہ ہے ان بے چاروں کی داستان، اب تم ہی کچھ کرو۔"

"سلامت علی صاحب! میں نے سری رام جی سے بھی سب کچھ عرض کر دیا تھا اور آپ سے بھی کہہ رہا ہوں کہ نہ ولی ہوں نہ درویش بلکہ ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں، بس کبھی کبھی کسی کام میں رہنمائی ہو جاتی ہے اور اس چیز نے ہمت بندھا دی ہے۔ پوجا کے سلسلے میں بھی اوپر سے ملنے والی مدد کا منتظر ہوں۔"

"یہ رہنمائی بھی کم تو نہیں ہے، درویشوں کا سایہ کسی کسی پر ہوتا ہے، مگر اللہ نے تم پر یہ عنایت کی ہے اور بزرگوں نے تمہیں اس قابل سمجھا ہے تو اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی، دل میں نجانے کیا کیا خیال آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ تم سے تمہارے بارے میں سب کچھ پوچھ ڈالوں۔ ذرا یہ تو پتا چلے کہ اس نوعمری میں یہ دولتِ عظیم کہاں سے ہاتھ آ گئی، لیکن تم نے راستہ روک دیا ہے اور ظاہر ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تو میں یہ پوچھ رہا تھا کہ پوجا کو دیکھ کر کوئی اندازہ قائم کیا تم نے۔"

"ابھی کچھ نہیں، میں ذرا ان کرداروں کو بھی دیکھ لوں جو یہ تمام چکر چلائے ہوئے ہیں، آپ مجھے کالی موری کا راستہ بتائیے۔"

"کک کیا مطلب ہے، کیا تم وہاں جاؤ گے؟"

"جی جانا پڑے گا" میں نے کہا۔

"خطرناک جگہ ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا اور پھر ایک مسلمان کے لیے، ویسے تم بہتر سمجھتے ہو۔" میں خاموش ہو کر سوچ میں ڈوب گیا۔ سلامت علی نے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ ایک بار پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی تکلیف نہ اٹھانا۔ سلامت علی چلے گئے لیکن اس کے بعد مجھے سوچنے کا ایک لمحہ بھی نہ ملا۔ فرخندہ اور فراست شاید کہیں چھپے ہوئے ان کے چلے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ فوراً ہی اندر گھس آئے۔ دونوں نے سنجیدہ چہرے بنائے ہوئے تھے اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ پھر فراست نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔"

"خدا آپ کو ہر مشکل وقت سے محفوظ رکھے۔"

"اللہ آپ کو بُری گھڑی سے بچائے۔" فرخندہ بولی۔

"آپ دونوں خیریت سے ہیں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں! لیکن آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔" فراست ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

"کیا میں خیریت سے نہیں ہوں؟"

"قطعی نہیں، جو کچھ ہماری ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا ہے وہ باعثِ تشویش ہے۔ عمر کا یہ دَور بڑا سنگین ہوتا ہے۔ جوانی دیوانی کہلاتی ہے اور عشق ذات نہیں پوچھتا مگر دوسرے پوچھ لیتے ہیں اور ایسے پوچھتے ہیں کہ بعض اوقات پورا شجرہ یاد آ جاتا ہے، سمجھانا ہمارا کام ہے اور سمجھنا سمجھ داروں کا۔ وہ ہندو کنیا ہے اور کالے جادو کے جال میں جکڑی ہوئی ہے۔ چندری کے ہندو پہلے بھی ایک دھوکا کھا چکے ہیں اور نتیجے میں چار اور تین، سات افراد مارے گئے تھے۔ اس لیے عزیز اَز جان ہوش و حواس قائم کرو تھوڑے کہے کو بہت جانو۔" فراست نے اس طرح کہا کہ مجھے بے تحاشا ہنسی آ گئی۔ میں دونوں کی شرارت سمجھ

گیا، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اس ننھی سی عمر میں خود کو بقراط سمجھ لینا دانشمندی نہیں ہے۔''
''آنکھ نے جو کچھ دیکھا لب پر آ گیا، بُرا نہ مانیئے گا۔''
''بہتر ہے۔ کوئی اور نصیحت؟''
''فی الحال یہ التجا مان لی جائے۔''
''بہتر ہے۔ دونوں بہن بھائیوں سے وعدہ ہے کہ ایسا کوئی وقت نہیں آئے گا۔''
''دراصل وہ بے حد خوبصورت ہے۔ ایک نگاہ دیکھنے والے کو مشکل سے سنبھلنا پڑتا ہے۔'' فراست بولا۔
''آپ لوگوں سے پوجا دیوی کے تعلقات نہیں معلوم ہوتے۔'' میں نے کہا اور فرخندہ اداس ہو گئی۔
''یہ بات نہیں ہے، وہ میری بہترین سہیلی تھی لیکن اب وہ کسی سے سروکار نہیں رکھتی، بالکل خاموش زندگی گزار رہی ہے۔'' فرخندہ نے کہا۔
''کیوں اس کی کیا وجہ ہے؟''
''تفصیل سے بتاؤں گا، ویسے ایمانداری سے بتائیں، آپ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے، کوئی تیر، تلوار کا حادثہ تو نہیں ہو گیا؟'' فراست بولا۔
''قطعی نہیں۔ آپ کو بتا چکا ہوں۔''
''اللہ کا شکر ہے چندوسی کے ایک مسلمان نے پہلے بھی ایک ہندو لڑکی کو پسند کیا تھا اور سارے بندھن توڑ کر اسے مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی تھی مگر پھر خوب ہندو مسلم فساد ہوا۔ مسجد کے وہ پیش امام شہید کر دیئے گئے جنہوں نے لڑکی کو مسلمان کیا تھا۔ لڑکے کے دو رشتے دار مارے گئے اور باقی دوسرے ہندو اور مسلمان مارے گئے۔''
''پوجا کالے جادو کے زیر اثر ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں۔ یہ کہانی میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا، باہر کوئی ہے اس لیے اجازت۔ دونوں باہر نکل گئے اور میں ان کی باتوں کو یاد کر کے مسکراتا رہا۔ دونوں شوخ، شریر اور زندگی سے بھرپور تھے۔ رات کو سری رام جی آ گئے۔ سلامت علی بھی ساتھ تھے، سری رام مسکرا کر بولے۔''
''آپ نے تو بالکل چولا بدل لیا میاں جی۔ میں تو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ پہچان ہی نہ سکا تھا مگر یہ اچھا ہوا۔ آپ کا آنا جانا کوئی انوکھی بات نہیں لگے گی۔ آپ نے پوجا کو دیکھا؟''
''ہاں۔ کیوں نہیں۔''
''کیا میری مشکل حل ہو جائے گی؟''
''آپ کو بھگوان پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ میں اپنے مسعود سے پُرامید ہوں۔'' میں نے کہا۔ بعد میں، میں ان سے کالی موری کے بارے میں تفصیلات پوچھتا رہا، جاتے ہوئے سری رام نے کہا۔
''کل آپ ہمارے گھر آئیں گے؟''
''کل نہیں آؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں جیسے ہی ضرورت پیش آئی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور سری رام خاموش ہو گیا۔ دیر تک وہ میرے پاس بیٹھا رہا پھر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کا ناشتہ ہوا، فراست کسی کام سے دوسرے شہر چلا گیا، سلامت علی دوپہر کے کھانے تک موجود تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کام سے جا رہے ہیں رات کو واپس آئیں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
''تم آرام کر کے شام کو نکلتے مسعود میاں! چلچلاتی، جھلسا دینے والی دھوپ پڑ رہی ہے۔''
''نہیں بس ایسے ہی چندوسی میں گھوموں گا۔'' کچھ دور جا کر وہ اپنے راستے چلے گئے اور میں رات کو اچھی طرح پوچھے

ہوئے کالی موری کے راستے پر۔ درحقیقت چیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔ گلیاں اور بازار ویران پڑے ہوئے تھے۔ تانگے والے گھنے درختوں کی چھاؤں میں گھوڑے کھول کر خالی تانگوں میں سو گئے تھے۔ میں چلتا رہا اور پھر بستی سے باہر ویرانوں میں نکل آیا۔ پن چکی کی مخصوص آواز پیچھے رہ گئی تھی اور اب بگولے نظر آرہے تھے جو گرم ہوا کے بھنور میں چکراتے ہوئے اس طرح گزر جاتے جیسے کوئی انسان ان میں چھپا ہوا ہو۔ کھیت کٹے پڑے ہوئے تھے، تاحدِ نگاہ کوئی انسان نہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ شمشان گھاٹ نظر آ گیا جس کے انتہائی سرے پر کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے۔ یہ کالی موری کے کھنڈرات تھے مگر فاصلہ بہت زیادہ تھا، درمیان میں جگہ جگہ درخت بکھرے ہوئے تھے جن کی چھاؤں میں لومڑیاں آرام کرتی نظر آجاتیں مگر ہلکی سی آہٹ پر وہ اچھل کر دوڑ پڑتی تھیں۔ جگہ جگہ جلی لکڑیوں کی راکھ اور جلی انسانی ہڈیوں کے ڈھیر نظر آرہے تھے پھر ایک درخت کی چھاؤں میں، میں نے ایک رنگین لباس متحرک دیکھا۔ کوئی انسان تھا۔ میں تیزی سے چل پڑا اور اس کے قریب پہنچ گیا، کچھ فاصلے سے ہی میں نے رونے کی آوازیں سن لی تھیں۔ آواز نسوانی تھی، حیرانی ہوئی، اس کے سامنے آ گیا۔ کوئی دیہاتی لڑکی تھی جس نے خوبصورت رنگین گھاگرا اور چولی پہنی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک پوٹلی سینے میں بھینچ لی تھی اور سہمی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ بے حد حسین لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی، حسین ترین نقوش دھوپ سے تمتما رہے تھے، کھلے ہوئے بدن کے حصے پسینے میں ڈوب گئے، وہ رو رہی تھی۔

''تم کیا کر رہی ہو؟''

''رستہ بھول گئے ہیں۔ ہمار مرد بچھڑ گیا ہے ہم سے، تم ڈکیت رہو، ہمکا لوٹو گے کا!'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں۔

مگر تمہارا مرد کیسے بچھڑ گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمکا کا معلوم۔ ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے دیکھو تم یہ سارے گہنے لے لو، ہم سے ہماری جان نہ لینا بس۔ یہ لو......!اس نے سینے سے لپٹی ہوئی پوٹلی پھینک دی اور وہ کھل گئی۔ اس میں سے بہت سے سونے اور چاندی کے زیورات گر کر جگمگانے لگے۔ میں نے ایک نگاہ انہیں دیکھا، پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرے پر لگاوٹ بھری مسکراہٹ تھی، میں چونک پڑا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم ہو سندر، ہمرے مرد سے کہیں اچھے، کڑیل جوان۔ آؤ چھاؤں میں آجاؤ۔ دھوپ میں بیمار پڑ جاؤ گے۔ آجاؤ نا، وہ ناز سے بولی اور بڑے بے ڈھنگے انداز میں درخت کی جڑ کے قریب پھیل کر نیم دراز ہو گئی۔ میں نے ایک دم چہرہ گھما لیا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عجیب دہری کیفیت کی شکار لڑکی تھی۔ کچھ لمحات کے بعد میں نے کہا۔

''دیکھو! سامنے چندوسی شہر ہے تم وہاں چلی جاؤ اور'' میں نظریں جھکائے ہوئے تھا مگر اس طرح بھی مجھے اس کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ پہلے تو غور نہیں کیا مگر دوسرے لمحے دماغ میں چھناکا سا ہوا۔ اس کے پیروں کے پنجے سامنے نہ تھے بلکہ پیچھے کی سمت مڑے ہوئے تھے، چھل پیری، چڑیل، میرے ذہن میں آیا۔

✦✤✦✤✦

دوسرے لمحے میں نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ کم بخت بے حد حسین تھی۔ کوئی بھی بری فطرت کا انسان اس کا یہ حسن جمال دیکھ کر فریب کھا سکتا تھا۔ وہ بدستور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً ہی کلام الٰہی کی ایک آیت ابھری اور بے اختیار میرے ہونٹوں تک آ گئی۔ آیت پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اس نے چیخ ماری اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سانس تیز چلنے لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کا کرے ہے رے؟'' اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پوچھا۔ میرا ورد جاری تھا۔ اچانک اس کا تمتماتا لال بھبھوکا چہرہ تاریک پڑنے لگا۔ پھر اس کی آنکھ میں گڑھا نمودار ہو گیا، ہونٹ مڑ گئے، رنگ کوئلے کی طرح سیاہ ہو گیا۔ اس نے دوسری زوردار چیخ ماری اور کہا۔

''ارے دیا رے دیا۔ یہ تو پاپی مسلّی ہے۔ ارے اوجھمبر دا...... رے جھمبر دا رے۔ ارے دیکھ ای سسروا مسلّی ہمکا مارے ہے، مارے جھمبر دا......'' وہ دہری ہو کر بل کھانے لگی۔ اسی وقت درخت کی ایک شاخ پر دو پاؤں نظر آئے اور دوسرے لمحے کوئی درخت سے نیچے کود گیا۔ یہ ایک کالے رنگ کا توانا آدمی تھا لیکن اس کا سارا بدن موجود تھا البتہ سر، شانوں پر موجود نہیں تھا۔ وہ سر کٹا تھا۔

''ارے دیکھ ای کا۔ دیکھ سسروا کو۔'' عورت چیخی اور کٹے سروالا میری طرف لپکا لیکن دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔

''اری رام دئی ری۔ جرا ہمار کھو پڑیا دیجو۔'' ایک آواز ابھری۔ چڑیل جو مسلسل بل کھا رہی تھی، رک گئی۔ اس نے ایک جھولی اٹھائی اور اس میں سے کچھ نکالنے لگی۔ یہ ایک انسانی سر تھا۔ کالا چہرہ، خدوخال موٹے اور بھدے! آنکھیں گہری سرخ، سر گھٹا ہوا، درمیان میں چوہے کی دم جیسی اٹھی ہوئی چوٹی۔ عورت نے انسانی سر اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور اپنے شانوں پر رکھنے لگا۔ مگر اس نے سر الٹا رکھ لیا تھا۔ اس کا سینہ سامنے تھا اور چہرہ دوسری طرف...... پھر وہ بولا۔ ''کون ہے ری رام دئی۔ ادھر کو تو ہونا رے۔''

''ہت تیرا ستیاناس......! ارے کھو پڑیا تو الٹی ٹانگ لئی ہے تے نے...... ادھر ناہیں ادھر۔'' عورت نے کہا اور مرد گھوم گیا۔ وہ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ دلچسپ تماشا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ مگر میں پر سکون تھا۔ اب ایسے خوفناک مناظر میرے لیے غیر اہم ہو گئے تھے اور میرے اندر ایک انوکھی قوت بیدار ہو گئی تھی جسے میں خود بھی کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ مرد مجھے گھورتا رہا پھر اس کی پھٹی پھٹی آواز ابھری۔

''کا بات ہے رے۔ کاہے ہمار جنانی کو ستائے ہے؟ ہمکا نا جانت ہے۔''

''تو بھی مجھے جان لے۔'' میں نے کسی غیر محسوس قوت کے زیر اثر کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ اس نے گھبرا کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''کوئی بکٹ رہے بھئی، بھاگ۔'' عورت کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا تھا۔ ایک آنکھ کی جگہ گہرا گڑھا نمودار ہو گیا تھا۔ دانت باہر نکل آئے تھے، بدن کے کھلے ہوئے حصوں سے ہڈیاں جھانک رہی تھیں مگر اس کے زیورات ویسے ہی تھے۔ دونوں پلٹ کر بھاگے۔ مرد الٹا ہی بھاگ لیا تھا۔ عورت اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ میں سکون سے دونوں کو دیکھتا رہا۔ چند قدم دوڑنے کے بعد ہی وہ دونوں غائب ہو گئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنی بے خوفی کا احساس ہوا۔ مجھے اس خوفناک صورتحال کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا بلکہ میں نے یہ سب کچھ بہت معمولی سمجھا تھا۔ فضل بابا کی سرگوشی ابھری۔

''اب بھی حیران ہو رہے ہو مسعود......؟ بار بار بھول جانا بری بات ہے۔'' یہ آواز میں نے صاف سنی تھی۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ آواز پھر ابھری۔ ''تمہیں سپاہی بنایا گیا ہے۔ اپنے فرائض ذمہ داری سے سرانجام دو اور تم جانتے ہو ایک سپاہی کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔ بس! اس کے بعد کسی کو آواز نہ دینا۔''

میں ساکت رہ گیا۔ اس سے زیادہ کھلے الفاظ اور کیا ہو سکتے تھے۔ مجھے آخری تلقین کی گئی تھی۔ دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ بے اختیار بیٹھ جانے کو جی چاہا اور میں بیٹھ گیا۔ درخت کے نیچے کافی ٹھنڈک تھی اور اس چلچلاتی دھوپ میں یہ ٹھنڈک بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ وہ الفاظ جو مجھ سے کہے گئے تھے، روح میں مسرت کی لہریں بیدار کر رہے تھے، ساتھ ہی ساتھ ایک سپاہی کی ذمہ داری کا احساس بھی دلا رہے تھے۔ مجھے بہت سے کام سرانجام دینے تھے۔ سب کچھ بھول کر ماضی میں جو کچھ ہوا تھا، وہ تو ایک ایسی کہانی تھی کہ اس پر ذہن دوڑایا جاتا تو ہوش و حواس ہی ساتھ چھوڑتے محسوس ہوتے۔ آہ! نجانے کیا کیا تصورات تھے، نجانے کیا کیا آرزوئیں تھیں لیکن کتنی باتوں کو اپنے ذہن میں دہراتا۔ کہا گیا تھا کہ پہلے پھل چکھوں پھر کھانے کا موقع ملے گا۔ شکر ہے کہ امتحان کا دور ختم کر دیا گیا تھا۔ جو گناہ کئے تھے، ان کی سزا شاید پوری ہو گئی تھی اور اب اس کے بعد

قرض چکانا تھا۔ ممکن ہے کبھی یہ قرض ختم ہوجائے اور اس کے بعد موسم بہار کا آغاز ہو۔ آہ! موسم بہار کے مہمانو......! میری آنکھیں شدت سے تمہاری منتظر ہیں لیکن ابھی پھل کھانے کا وقت نہیں آیا، ابھی قرض کی ادائیگی ہوجائے۔ چشم تصور سے ماں کو دیکھا۔ باپ اور بہن، بھائی کو دیکھا۔ ماموں ریاض بھی دل میں آئے اور ان سب کے تصور سے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ ان کے بارے میں خود سے کوئی سوال نہیں کیا تھا جبکہ سارے سوالات کے جواب اندر موجود تھے۔ یہی امتحان تھا اور یہی قرض ادا کرنا تھا۔ یہ پرچے حل ہوجائیں تو پھر اپنے آپ پر غور کروں۔ ہاں! اس وقت تک کے لیے سب کو بھلانا ضروری ہے اور یہ بات بھی مجھے ذمہ داریاں سونپنے والوں ہی کو بتانی پڑے گی کہ کب امتحان کا دور ختم ہوگا۔ مگر ابھی تو آغاز ہی ہوا ہے۔ نجانے کتنی دیر اس طرح گزر گئی۔ چلچلاتی دھوپ مسلسل حشر سامانیاں برپا کررہی تھی۔ اس کا احساس ہورہا تھا۔ کبھی کبھی چیلوں کی آواز آجاتی تھی۔ اچانک ذہن اس طلسم سے نکل آیا۔ میں بیٹھا کیوں ہوں، مجھے جائزہ لینا ہے کالی موری کے ان کھنڈرات کا جہاں ان جادوگروں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ سفلی علوم کے یہ ماہر بھی کیا انوکھی چیز ہیں۔ ایک باقاعدہ نظام ہے ان کا اور اب اس کے بارے میں مجھے مکمل طور پر معلوم ہوچکا تھا۔ بھوریا چرن کالے علم کا سب سے بڑا ماہر بننا چاہتا تھا اور اس نے اس کے لیے اپنی تمام تر کارروائیوں کے ساتھ مجھے بھی اس جنجال میں پھنسا دیا تھا۔ سب کو دیکھ لوں گا۔ سب کو دیکھ لوں گا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے خودی کے سے عالم میں آگے بڑھ گیا۔ بہت فاصلے پر بڑ کے درختوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ چلا گیا تھا۔ دور سے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بہت سے درخت سر جوڑے کھڑے ہوں۔ انہی درختوں کے دامن میں گنگولی نے اپنا ٹھکانہ بنایا تھا۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ اول تو یہ علاقہ ہی چندوسی کا ایک ایسا حصہ تھا جو بالکل بے مصرف تھا اور ادھر سے انسانوں کا گزر ہی نہیں ہوتا تھا۔ دوئم یہ کہ تیز دھوپ اور شدید گرمی نے ماحول کو آگ بنا رکھا تھا اور بھلا آگ کے اس سمندر میں جھلسنے کے لیے کون گھر سے باہر نکلے۔ بڑ کے درختوں کے نیچے بڑی گھنی چھاؤں تھی۔ میں نے وہاں کچھ چیزیں رکھی دیکھیں۔ برتن تھے، کالے رنگ کا ایک کمنڈل تھا، کچھ گدڑیاں سی پڑی ہوئی تھیں اور ایسی ہی نجانے کیا کیا چیزیں......! میں ابھی ان چیزوں کے سامنے ہی پہنچا تھا کہ درختوں کے عقب سے لمبے چوڑے جسم والا ایک سادھو نما شخص باہر نکل آیا۔ شکل وصورت عام سادھوؤں سے مختلف نہیں تھی۔ بکھرے ہوئے مٹی میں اٹے ہوئے بال، بڑھی ہوئی داڑھی، اس کے بدن پر ریچھ کی طرح لمبے لمبے سیاہ بال تھے۔ لباس بہت مختصر پہنا ہوا تھا۔ دھوتی ہی کا ایک پلو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا گیا تھا۔ لکڑی کی کھڑاؤں پہنے ہوئے تھا۔ کھٹ کھٹ کرتا ہوا بڑ کے درخت کے چوڑے تنے کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور اپنے بھنچے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں کو مزید بھینچ کر مجھے گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں بہت سفید تھیں اور پتلیاں بہت چھوٹی چھوٹی! ایک عجیب سی کیفیت ان آنکھوں میں پائی جاتی تھی۔ وہ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''کیا بات ہے، کون ہے تو اور ادھر کیوں آیا ہے؟''

''گنگولی ہے تیرا نام......؟''

''ہاں! گنگولی ہی ہوں۔ کیسے جانتا ہے مجھے......؟''

''گنگولی میں تجھ سے سری رام کی بیٹی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''سری رام نے بھیجا ہے تجھے......؟''

''اپنے کالے جادو سے معلوم کر۔''

''کالے جادو کا نام مت لے بے وقوف۔ اگر تو نے مجھے کالے جادو کی طرف لوٹا دیا تو تیرا کیا بنے گا؟''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ بس یوں سمجھ لے کہ میں اسی کام سے یہاں آیا ہوں۔ تجھے جس مقصد کے لیے بلایا گیا تھا، وہ پورا کرنے کے بجائے تو سری رام کی بیٹی کے چکر میں پڑ گیا۔'' میرے ان الفاظ پر گنگولی ہنس پڑا۔ بڑا مکروہ قہقہہ تھا اس کا! ہنسنے کے بعد وہ بولا۔

''دیکھا ہے اسے؟''

''ہاں دیکھا ہے۔''

''پھر بھی یہ بات کر رہا ہے۔''

''وہ تم لوگوں کی ملکیت تو نہیں ہے۔ آخر تم نے ایک شریف آدمی کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟''

''شریف آدمی...... ارے چھوڑ...... چھوڑ، اپنی کہہ! میرے پاس سوداگر بن کے آیا ہے یا بیچ کا آدمی؟''

''نہ میں سوداگر بن کر آیا ہوں، نہ بیچ کا آدمی، تو یوں کر گنگولی کہ اپنا یہ سازوسامان اٹھا کر یہاں سے بھاگ جا ورنہ کیا پتا نقصان اٹھا جائے۔'' اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ پھر ہنس پڑا اور بولا۔

''میاں جی ہو، یہ بات ہے۔ سوچا ہی نہیں تھا ہم نے اب تک، ارے میاں جی! کس پھیر میں پڑ گئے تم۔ جادو نگری ہے یہ...... جاؤ، جاؤ اپنا کام دیکھو، ہمیں ہمارا کام کرنے دو۔ جس شریف آدمی کی تم بات کر رہے ہو نا، وہ ضرورت سے زیادہ ہی شریف ہے۔ جاؤ...... جاؤ بھاگ جاؤ۔''

''دیکھ گنگولی یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ میں تجھے سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''اور اس کے بعد کیا کرو گے؟''

''اس کے بعد جو کچھ کروں گا، وہ تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

''ہمارے لیے کیا اچھا ہے، کیا برا یہ تم کیا جانو۔ جاؤ پہلے اپنی خیر مناؤ۔ ذرا یہاں سے واپس جا کر دکھا دو......''

''تُو تو میری بات نہیں مانے گا......''

''نہیں مانیں گے سمجھے، جاؤ چلے جاؤ۔ آگے بڑھو، دوپہر کا وقت ہے، آرام کرنے کا وقت، تم نے یہاں آ کر خوامخواہ ہمیں پریشان کر دیا۔ جاتے ہو یا پھر واپس بھجوائیں تمہیں۔'' گنگولی نے کہا اور میں پرسکون نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''سات دن دے رہا ہوں تجھے گنگولی! صرف سات دن! اور یہ سات دن بہت ہوتے ہیں۔ سات دن میں اگر تو یہاں سے نہ گیا تو اسی جگہ تجھے راکھ کر کے رکھ دوں گا۔'' گنگولی پھر ہنسا اور بولا۔

''ابھی غصہ نہیں آیا ہمیں، ابھی تو ہم اپنا کام کر رہے ہیں اور اچھی بات ہے ذرا میاں جی تمہارے کس بل بھی دیکھ لیں گے۔ چلو بس اب جاؤ، بات ہو گئی نا ہماری۔'' میرا انتظار کیے بغیر وہ مڑا اور واپس درخت کے پیچھے چلا گیا۔ میں چند لمحات سوچتا رہا اور پھر گردن ہلا کر وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ مجھے جو کہنا تھا، میں نے اس سے کہہ دیا تھا۔ ان سات دنوں کے اندر اندر اگر ان لوگوں نے اپنے ڈیرے نہ اٹھا دیے تو پھر جو کچھ بھی کر سکوں گا، ضرور کروں گا۔

دو قدم آگے بڑھا تھا کہ دفعتاً ہی ایک گہرا گڑھا نظر آیا۔ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ گڑھے کی چوڑائی کوئی آٹھ فٹ کے قریب تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ گڑھا موجود نہیں تھا، اب پڑ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن پھر دوسرے لمحے میں نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور گڑھا عبور کر گیا۔ دس بارہ قدم آگے بڑھا تھا کہ پھر ویسا ہی ایک گڑھا نظر آیا۔ میں حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ گڑھا تقریباً بارہ فٹ چوڑا تھا۔ آٹھ فٹ لمبی چھلانگ تو میں نے جس طرح بھی بن پڑا، لگا ڈالی تھی لیکن اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ خاصا چوڑا گڑھا ہے۔ دفعتاً ہی میرا ذہن جیسے مفلوج سا ہو گیا اور میں نے آنکھیں بند کر کے آگے قدم بڑھا دیے۔ میں اس گڑھے پر پاؤں جماتا ہوا اسے عبور کر گیا۔ جب تقریباً اندازے سے بارہ، چودہ فٹ آگے بڑھ گیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں اور پیچھے مڑ کر اس گڑھے کو دیکھنے لگا لیکن گڑھا پیچھے نہیں، آگے تھا اور اب میرے اندر ایک ایسی انوکھی قوت بیدار ہو گئی تھی جس کا میں خود کوئی تجزیہ نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ گڑھے میرا راستہ روکتے رہے لیکن میں انہیں بڑے اطمینان سے عبور کرتا رہا۔ اب تو میں چھلانگ بھی نہیں لگا رہا تھا۔ پیروں کے نیچے زمین نہ ہوتی لیکن میرے قدم آگے بڑھتے رہتے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ان کھنڈرات کے سامنے تھا جو کالی موری کے کھنڈرات کہلاتے تھے۔ میری ذہنی قوت اس وقت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ بس کام کی باتیں سوچ رہا تھا، دوسری کوئی بات ذہن تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ کالی موری کے

کھنڈرات دھوپ میں جل کر سیاہ ہو چکے تھے۔ غالباً شبنم کی نمی اور دھوپ کی تیزی نے انہیں یہ رنگ بخشا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور کھنڈرات میں ایک چوڑے در کو عبور کر کے اندر پہنچ گیا پھر میرے حلق سے آواز نکلی۔

''گووندا...... او گووندا! کہاں چھپا پڑا ہے؟ سامنے آ...... سامنے آ!'' میں اپنی آواز کی بازگشت محسوس کرتا رہا۔ پھر میں نے دوسری بار اسے آواز دی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کھڑبڑ کی آوازیں آنے لگیں لیکن جو چیز میرے سامنے آئی، وہ بڑی عجیب وغریب تھی۔ یہ ایک لمبا چوڑا بیل تھا جس کے پورے جسم پر کالے کالے دھبے پڑے ہوئے تھے لیکن اس کا چہرہ انسانی تھا البتہ اس چہرے پر دو سینگ اُگے ہوئے تھے۔ اتنے اونچے اونچے سینگ کہ کسی بیل کے سر پر اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے ہوں گے۔ وہ نتھنوں سے آوازیں نکال رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی پھنکاریں سی گونج رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنے دونوں پاؤں زمین پر مارے اور زمین کریدنے لگا۔ پھر اس نے بدن کو تھوڑا سا نیچے جھکایا اور اس کے بعد ایک طوفانی دھاڑ کے ساتھ میری جانب لپکا۔

اس کے لمبے چوڑے جسم کو دیکھ کر ایک لمحے میں یہ احساس ہوا تھا کہ اگر وہ مجھ پر آ پڑا تو میری ہڈیاں تک سرمہ بن جائیں گی لیکن میں نے دونوں ہاتھ سامنے کئے اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے گردن جھکا کر میرے سینے پر زوردار ٹکر مارنا چاہی لیکن اس کے دونوں سینگ میرے ہاتھوں میں آ گئے اور دوسرے لمحے میرے اور اس کے درمیان طاقت آزمائی شروع ہو گئی۔ میں پوری طاقت سے اس کے سینگوں کو داہنی جانب موڑ رہا تھا اور وہ اپنے جسم کی قوت صرف کر رہا تھا۔ زمین پر اس کے پیروں کے نیچے آنے والی اینٹیں چور چور ہوتی جا رہی تھیں لیکن وہ مجھے ایک قدم بھی پیچھے نہیں دھکیل پایا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی گردن پوری طرح موڑ دی اور اس کا قوی ہیکل جسم بڑی تیز آواز کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ میں نے اسے پٹخ دیا تھا۔ بہت زوردار آواز ہوئی تھی اور بیل گرنے کے بعد پھر نہ اٹھ سکا تھا اور ہاتھ، پاؤں مار رہا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس کا جسم چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک ہی مجھے پیچھے سے آواز سنائی دی۔

''کون ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟'' میں ایک دم گھوم گیا۔ تب میں نے ایک نوجوان آدمی کو دیکھا۔ باریک ململ کا کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے، چہرہ بھی خوبصورت تھا۔ میں اس کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ''تو گووندا ہے؟''

''ہاں! مگر تو کون ہے؟''

''ابھی تک تیرا دشمن نہیں ہوں، اگر تو میری بات مان لے۔'' وہ میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اچانک مسکرا پڑا اور بولا۔

''آ اندر آ جا...... آ جا وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ سے بات کروں گا اور تجھے کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گا۔ آ جا مرد بچہ ہوں، وچن دے رہا ہوں تجھے۔'' میں نے پلٹ کر بیل کو دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ اب وہاں موجود نہیں تھا۔ لمبا چوڑا بیل غائب ہو گیا تھا۔ گووندا نے کہا۔ ''وہ میرا بیر تھا، تجھے نقصان نہ پہنچاتا۔ بس ڈرا رہا تھا۔ یہ وقت ہم کالے جادو والوں کے لیے گیان کا ہوتا ہے اور ہم کسی سے ملتے نہیں۔ میں نے بیر اس لیے چھوڑے ہیں کہ ضرورت مند لوگ ہر وقت آ جاتے ہیں مگر تو نے میرا بیر ہی مار گرایا۔ چل آ جا اندر آ جا......!'' وہ واپس مڑ گیا۔ میں اس کے ساتھ کھنڈرات کے دوسرے حصے میں آ گیا۔ اندر ایک جگہ بالکل درست حالت میں تھی مگر وہاں کوئی چیز نہیں تھی بس چند پتھر پڑے ہوئے تھے البتہ جگہ بالکل ٹھنڈی تھی۔

''بیٹھ جا......!'' گووندا نے پھر کہا اور میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''میرا علم بتاتا ہے کہ تو مسلمان ہے۔''

''الحمدللہ!''

''یہاں کیوں آیا ہے؟''

''تجھ سے بات کرنے۔''

''کیا بات کرنے؟''

''تو پوجا وتی کا پیچھا چھوڑ دے۔''
''اوہ۔ تیرا اس سے کیا سمبندھ ہے؟''
''کچھ نہیں۔ بس وہ ایک انسان ہے۔''
''بس...... یا اور کچھ؟''
''نہیں بس یہی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''انسان تو میں بھی ہوں مورکھ! اگر بات صرف انسانیت کی ہے تو تجھے میرا بھی خیال کرنا چاہیے۔ میں بھی تو انسان ہوں۔''
''تجھے کیا تکلیف ہے گوونداـ تو اچھا خاصا ہے۔ جو کچھ میں نے تیرے بارے میں سنا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ تو نے گندے علم کا کاروبار کر رکھا ہے اور لوگوں کو تجھ سے نقصان پہنچتا ہے۔'' گوونداہنس پڑا۔ پھر بولا۔
''ایک طرف کی سن کر دوڑ پڑے مہاراج کمار گوونداپر! گوونداکے بارے میں بھی انہی لوگوں سے پوچھ لیتے جواب گراہ رہے ہیں مگر تمہیں کیا پڑی۔ خیر اب ہمیں بتاؤ ہمارے پاس کیسے آئے ہو؟ ایک بیر کو پچھاڑ مارنا کوئی کارنامہ نہیں، کسی خوش فہمی کا شکار مت ہو جانا۔ ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں، ابھی تک کسی مسلمان کو ہمارے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہمیں اس کے لیے مجبور مت کرو۔''
''میں صرف یہ چاہتا ہوں گوونداکہ تو پوجا کا پیچھا چھوڑ دے باقی تو جو کچھ کر رہا ہے، اس سے مجھے سروکار نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔
''واہ رے میاں مٹھو! جو پڑھایا گیا ہے تجھے، وہی بول رہا ہے۔ ارے کہاں سے پکڑا گیا ہے تجھے اور کس نے پکڑا ہے؟ کیا سری رام نے، اب وہ دوسرے دھرم والوں سے مدد لینے دوڑ پڑا ہے؟ ارے بھائی! ہمارے جیون کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے پوجا۔ پوجا کے لیے ہی تو ہم نے یہ ناٹک رچایا ہے سارا۔ تجھے معلوم تو کچھ ہے نہیں بس طوطے کی طرح پڑھا اور آ گیا ہمارے سامنے۔''
''تو پوجا کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے آخر......؟''
''عمر تو تیری بھی زیادہ نہیں ہے۔ پریم کیا ہے کبھی تو نے......؟''
''تو تو پوجا سے محبت کرتا ہے مگر کیسا عاشق ہے یار! تیری پوجا کا ایک اور دعویدار تجھ سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا ہے اور وہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ پوجا کو حاصل کر کے چھوڑے گا۔'' گوونداایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''وہ پوجا کے چرنوں کی دھول بھی نہ پا سکے گا۔ اس کے پاس ہے کیا۔ ایک لونا چمارن کا جاپ کر لیا ہے اس نے۔ بس یہی اس کا گیان ہے۔ جب چاہوں گا اس کا ناس کر دوں گا۔''
''تو ایسا نہیں کر سکتا گووندا۔ ابھی میں اس کے پاس بھی گیا تھا۔'' میں نے کہا اور وہ مجھے گھورنے لگا۔ پھر اس کا انداز بدل گیا۔
''دشمن کے پکے لگتے ہو میاں جی! دیکھو سمجھا رہے ہیں تمہیں۔ ہماری کہانی دوسری ہے، اس پھیر میں مت پڑو۔ ہو سکتا ہے تمہارے پاس گیان ہو۔ ہم سے جھگڑا مت کرو۔ ہم نے بڑی تپسیا کی ہے، بڑے دکھ اٹھائے ہیں ہم نے۔ ہمارا علم کالا ہے، ہم مانتے ہیں اور ہم تمہارے علم کا احترام کرتے ہیں۔ تم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتے۔ جہاں تک گنگولی کا معاملہ ہے تو لگتا ہے اب بات بڑھ گئی ہے۔ سری رام اپنی ہٹ میں اپنی بیٹی کو نقصان پہنچا دے گا۔ اس لیے...... اس لیے پہلے ہم گنگولی کو ٹھکانے لگائے دیتے ہیں۔ دیکھنا چاہو تو رات کو آ جانا۔ نہ آ سکو تو کل جا کر اس کا استھان دیکھ لینا۔ کل وہ تمہیں وہاں نہ ملے گا، جہاں ہے۔''
''اب تک تو نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''بس نہیں کیا، اب کرلیں گے۔ مگر اس کے بعد تم ہمارا سامنا مت کرنا۔ ہم تم سے بنتی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہارا علم ہم سے بڑا ہو۔ ہم کبھی کسی مسلمان کے علم سے نہیں ٹکرائے۔ اگر تم نے مجبور کیا تو مقابلہ کریں گے تمہارا۔ ہاریں یا جیتیں، یہ الگ ہے مگر جان لڑا دیں گے۔ جیتے جی ہار نہ مانیں گے۔ بس اب جاؤ۔ ہم نے تم سے کوئی بری بات نہیں کی ہے مگر سری رام کے جھگڑے میں مت پڑو۔''

''اگر گنگولی تجھ پر بھاری پڑ گیا گوونداتو......؟''

''تو ایک یار والی بات کہیں تم سے......؟''

''کہو......!''

''تم اپنا علم گنگولی سے لڑا دینا۔ جیتا مت چھوڑنا سسرے کو۔ ورنہ پوجا کو پریشان کرے گا۔'' اس نے دلسوزی سے کہا اور

جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چلا گوونداً......؟''

''بس مہاراج......اجازت دو......!'' اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ چند قدم چلا اور پھر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا۔ پھر اس کے چاروں طرف دیکھا مگر گوونداً نظر نہ آیا۔ میں دیر تک وہاں گم صم کھڑا رہا تھا۔ عجیب سی گفتگو کی تھی اس نے، بڑا عجیب لگا تھا وہ مجھے۔ نہ جانے کیسا احساس ہو رہا تھا۔ پھر وہاں سے واپسی کے علاوہ کیا کرسکتا تھا مگر راستے بھر گوونداً کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس جگہ سے بھی گزرا جہاں اس پچھل پیری کو دیکھا تھا مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بستی میں داخل ہوگیا مگر کالے جادو کے دونوں ماہروں سے یہ ملاقات بہت دلچسپ تھی۔ گوونداً نے جو دعویٰ کیا تھا، وہ بھی بے حد دلچسپ تھا اور بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ رات کو میں یہاں موجود نہ ہوں۔

سلامت علی صاحب کے مکان میں داخل ہوا تو سورج ڈھل رہا تھا۔ فرخندہ بیگم سامنے آگئیں۔

مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔ ''غضب خدا کا۔ یہ آپ کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہیں جناب! ذرا آئینہ دیکھئے چہرہ دھوپ سے کالا پڑ گیا ہے۔ میں کہتی ہوں یہ دھوپ میں باہر نکلنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی آپ کو۔ لو لگ جاتی تو کیا ہوتا۔ بیمار پڑنا ہے؟''

''بس یونہی آپ کا چندوسی دیکھنے نکل گیا تھا فرخندہ۔'' میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''سنئے مسعود صاحب۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہاں آپ کا کوئی سرپرست موجود نہیں ہے۔ جو چاہیں گے، کریں گے۔ کس سے پوچھ کر باہر نکلے تھے آپ؟'' فرخندہ سخت لہجے میں بولی۔

''کیا بکواس کر رہی ہے فرخندہ۔ دماغ خراب ہوگیا ہے۔ یہ تو مسعود میاں سے کس لہجے میں بات کر رہی ہے؟ ارے پاگل ہوگئی ہے کیا۔'' نہ جانے کہاں سے سلامت علی نکل آئے۔ انہوں نے فرخندہ کے الفاظ سن لیے تھے۔

''کوئی غلط کہہ رہی ہوں ابو۔ آپ ان کا چہرہ خود دیکھ لیں۔ آخر یہ دھوپ میں کیوں نکلے تھے۔'' فرخندہ بلا جھجک بولی۔

''تو کون ہوتی ہے۔ میں دماغ ٹھیک کردوں گا تیرا۔ معاف کردیں مسعود میاں، معاف کردیں۔ نہ جانے کس جھونک میں یہ بکواس کرگئی۔ آئندہ میں اسے سمجھا دوں گا۔'' سلامت علی پریشانی سے بولے۔

''نہیں سلامت علی صاحب۔ خدا کے لیے نہیں۔ آپ، آپ ان الفاظ اور لہجے کی قیمت نہیں جانتے۔ آہ! خوش نصیبوں کو یہ ڈانٹ ملتی ہے۔ مجھ سے میری یہ خوش بختی نہ چھینیں۔ آپ نے مجھے فراست کا درجہ دیا ہے۔ ہم بہن، بھائی کے درمیان نہ آئیں......!''

''اوہ! اچھا ٹھیک ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو......!'' سلامت علی شرمندگی سے کہنے لگے۔ فرخندہ اسی طرح تنی کھڑی تھی۔ اتنی پیاری لگی وہ مجھے کہ جی چاہا بڑھ کر پیشانی چوم لوں مگر یہ بھی حکم نہ تھا مجھے۔ اس نے پھر کہا۔

''چلیے غسل کیجیے۔ میں چائے تیار کراتی ہوں۔'' میں خاموشی سے اندر چل پڑا تھا اور سلامت علی سر کھجاتے رہ گئے تھے۔ غسل کرتے ہوئے میں گوونداکے کردار کے بارے میں سوچتا رہا۔ انوکھا کردار تھا۔ ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا مجھے۔ دن بھر کی لو اور تپش کے بعد شام ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ چائے وغیرہ پی لی گئی۔ سات بجے کے قریب سلامت علی میرے پاس آ گئے۔

''دوپہر کو کالی موری گئے تھے مسعود میاں......؟''

''جی ہاں۔ رات کو بھی جانا ہے۔''

''اوہ!'' وہ آہستہ سے بولے۔ یوں لگا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر رک گئے ہوں۔ چند لمحات خاموش رہے۔ پھر بولے۔ ''کیا بتاؤں مسعود میاں میں خود گھن چکر بن گیا ہوں۔''

''کیوں سلامت علی صاحب؟''

''تمہارا وہ احترام نہیں ہو رہا جو ہونا چاہیے بلکہ یہ بچے۔ ناواقفیت کی بنا پر اس قدر بے تکلف ہوگئے ہیں کہ مجھے خوف آنے لگا ہے۔ بیٹے! دراصل تمہارا تعارف اس انداز میں ہوا ہے کہ وہ تمہیں سمجھ نہیں پائے ہیں اور پھر تمہاری عمر بھی انہی کے لگ بھگ ہے اور پھر میں خود۔ بھلا یہ باتیں پوچھنے کی ہیں جو میں پوچھ رہا ہوں۔''

''آپ خود یہ ساری باتیں سوچ رہے ہیں جبکہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ ان لوگوں کی بے تکلفی مجھے اپنے گھر کا ماحول یاد دلاتی ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے میں بھی بھائی، بہن اور ماں، باپ والا ہوں۔''

''وہ لوگ کہاں ہیں؟'' سلامت علی نے بے اختیار پوچھا۔

''اللہ کی اسی زمین پر......! میں نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔ سلامت علی خاموش ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد پھر بولے۔ ''کالی موری رات کو بھی جاؤ گے؟''

''ہاں۔ شاید کچھ ہو جائے۔''

''کیا......؟'' وہ بولے اور میں نے انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھا تو وہ جلدی سے بولے۔ ''میرا مطلب ہے کہ تمہیں تو کوئی نقصان پہنچنے کا خدشہ نہیں ہے۔ افوہ بھئی! نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ بس اپنا بھی خیال رکھنا۔''

''جی بہتر!'' میں نے ادب سے جواب دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اس خوش بختی کو میں نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی جدا ہوگئے تھے مگر ان کی محبتوں کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آ جاتی تھیں۔ کبھی کسی شکل میں، کبھی کسی شکل میں۔ سلامت علی صاحب بھی بس میرے لیے فکرمند ہوگئے تھے۔ کھل کر کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ کالے جادوگروں سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد رات کا کھانا کھایا اور دل بے چین ہوگیا۔ کالی موری کا فاصلہ بھی زیادہ تھا، چل پڑنا چاہیے۔ فراست کے بارے میں سلامت علی صاحب نے بتایا تھا کہ وہ ایک کام سے بلند شہر گیا ہے اسی لیے وہ نظر نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں خاموشی سے گھر سے نکل آیا اور کالی موری کے فاصلے طے کرنے لگا۔ چھوٹے شہر تاریکی کے ساتھ ہی سنسان ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت چندوسی کی تھی حالانکہ ابھی رات کا آغاز ہوا تھا مگر گلیاں، بازار اس طرح سنسان اور تاریک پڑے تھے جیسے آدھی رات گزر گئی ہو۔ میں چلتا رہا۔ سڑکوں پر کتوں کا راج تھا۔ بھونک رہے تھے۔ لڑ رہے تھے، مگر کوئی مجھ پر نہیں لپکا تھا۔ شہر پیچھے رہ گیا۔ میری رفتار تیز ہوگئی۔ اس جگہ ذرا سی جھجک ہوئی جہاں چڑیل اور سر کٹا دیکھا تھا مگر اب خاموشی تھی۔ ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا کہ گنگولی کی طرف رخ کروں اور اسی طرف میں بڑھا۔ دونوں کے بارے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دونوں ہی سفلی علوم جانتے ہیں۔ اگر گوونداکا دعویٰ درست تھا تو ان کے درمیان جادو کی معرکہ آرائی زبردست ہوگی یا ممکن ہے کہ میرے آنے سے پہلے ہو چکی ہو۔ درختوں کے سلسلے کے پاس رک گیا۔ بس کچھ فاصلے پر گنگولی کا استھان تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ اچانک ایک سرسراہٹ سنائی دی اور میں چونک کر آنکھیں پھاڑنے لگا مگر آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔ ہوسکتا ہے

کوئی گیدڑ یا دوسرا جانور ہو۔ پھر اچانک درختوں کے دوسری طرف روشنی سی نظر آئی اور میں ادھر دیکھنے لگا۔ روشنی متحرک تھی۔ پھر وہ درختوں کے پیچھے سے نکل آئی۔ ایک مشعل روشن تھی لیکن اس سے شعلے نہیں نکل رہے تھے۔ غور سے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جو ایک ڈنڈے میں اُڑسی ہوئی تھی۔ روشنی اسی سے پھوٹ رہی تھی اور یہ مشعل گنگولی کے ہاتھ میں تھی۔ گنگولی اس وقت دن سے مختلف نظر آیا۔ وہ گلے میں بہت سی کھوپڑیاں ہار کی شکل میں پہنے ہوئے تھا۔ ان کھوپڑیوں کی آنکھوں کے گڑھے بھی روشن تھے۔ وہ تھرکتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سنبھل گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے میری آمد کا علم ہوگیا تھا۔ اب میں نے اپنے آپ کو چھپانا مناسب نہیں سمجھا اور گنگولی کے سامنے آگیا۔ گنگولی نے ہاتھ سیدھا کیا اور مشعل کے نچلے حصے کو ایک درخت کے تنے میں زور سے مارا اور درخت کا ٹھوس اور مضبوط تنا ایسا نہیں تھا کہ کسی معمولی ضرب سے اس میں سوراخ ہوجائے لیکن مشعل کوئی آٹھ انچ کے قریب درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی۔ گنگولی نے اسے چھوڑ دیا۔ آس پاس تیز روشنی پھیل گئی تھی۔

''ارے میاں جی تم کیوں اپنی جان گنوانے پر تلے ہوئے ہو، بار بار آجاتے ہو۔ یہ بھیروں کا استھان ہے، نجانے کون کون یہاں آتا جاتا ہے۔ کوئی گردن مروڑ لے گا۔ اب کیسے آن مرے......؟''

''بس گنگولی دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کیا کررہے ہو؟''

''ایسے کام نہ دیکھا کرو میاں جی تو ہی اچھا ہے۔ تم نجانے کیا کیا سوچ رہے ہو اپنے من میں، بالی سی عمریا ہے، کھانے پینے کے دن ہیں اور پڑ گئے ہو کالے جادو کے پھیر میں۔ اب تو آ گئے ہو، ادھر آئندہ مت آنا۔''

''دراصل گنگولی تجھ سے کئی باتیں کرنا رہ گئی تھیں۔ سو وہ کرنے چلا آیا۔''

''ارے شکر کرو کالی راتوں کا موسم ہے۔ نکلا ہوتا چاند تو تمہیں مزہ آجاتا یہاں آنے کا۔''

''کیوں چاند سے کیا ہوتا......؟'' میں نے سوال کیا اور گنگولی پھر ہنس پڑا۔

''سبھا لگی ہوتی ہے چاندنی راتوں میں، بیروں اور ویروں کی۔ سارے کے سارے اپنی اپنی کتھائیں کہہ رہے ہوتے ہیں، لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کو نوچتے ہیں، بھنبھوڑتے ہیں اور اگر بیچ میں کوئی آجائے تو اسے بھی چٹ کرجاتے ہیں۔''

''واقعی یہ تو اچھا ہوا گنگولی کہ چاندنی راتیں نہ ہوئیں۔ اچھا! تم ایک بات بتاؤ۔ تمہیں پتا ہے کہ گووندا سری رام جی کی بیٹی پوجا کو حاصل کرنے کے چکر میں ہے اور تمہیں اسی کے خلاف یہاں بلایا گیا تھا، تم خود پوجا کے چکر میں پڑ گئے اور تم نے یہاں ڈیرہ ڈال لیا۔ اس طرح ڈیرہ ڈالنے سے کیا تمہیں پوجا مل جائے گی؟''

''واہ میاں جی واہ! اچھی سوچی، جو یہ سارے باؤلے نہیں سوچ سکے۔ میاں جی! گووندا کا اور ہمارا ابھی تک آمنا سامنا نہیں ہوا۔ جانتے ہو کیوں......! ارے ہم نے بھی گووندا کو آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ نہ اس نے ہم پر وار کیا نہ ہم نے اس پر۔ ہم انتظار کررہے ہیں کہ گووندا سری رام کو پریشان کرے اور جب ان کی ناک میں دم آجائے تو وہ دوڑیں ہماری طرف اور ہم پوجا کو ان سے مانگ لیں۔ اگر ہم نے گووندا کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو پھر بھلا سری رام کو کیا پڑی کہ ہماری مانے۔ جب تک گووندا ہمیں نہیں چھیڑتا، ہم اسے نہیں چھیڑیں گے۔''

''اور اگر گووندا کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ تمہارا کیا ارادہ ہے تو کیا وہ تمہیں چھوڑ دے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو ہونا ہے میاں جی! جھگڑا تو رہے گا ہمارا اس سے...... اگر ہمارے من میں پوجا کو حاصل کرنے کا خیال نہ آجاتا تو ہم اس کام کے لیے تو آئے تھے۔ گووندا سے ہماری ٹکر ہوتی مگر تم نے اگر پوجا کو دیکھا ہے تو تمہیں بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ کیسی سندر ہے۔ بات ہم نے بیچ میں اس لیے چھوڑ دی کہ اب اگر جھگڑا ہو گووندا سے، تو پوجا کے لیے ہو۔''

دفعتاً ہی ایک عجیب سی آواز فضا میں ابھری اور ایک بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ گنگولی کی گردن میں

کھوپڑیوں کا جو ہار پڑا ہوا تھا، اس میں پروئی ہوئی کھوپڑیوں کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ منمناتی ہوئی آوازیں جو کچھ کہہ رہی تھیں۔ کوئی بھاری آواز، کوئی باریک آواز، کسی کھوپڑی کے منہ سے معصوم بچے جیسی آواز نکل رہی تھی، تو کوئی نسوانی آواز میں چیخ رہی تھی۔ ان کے الفاظ تو سمجھ میں نہیں آئے مگر گنگولی کے انداز سے یہ پتا چلتا تھا جیسے اسے کوئی خاص اطلاع ملی ہو۔ وہ اچانک ہی اچھل کر تھوڑے فاصلے پر پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ گیا اور اس نے اِدھر اُدھر گردن گھمانا شروع کر دی اور پھر ایک جانب کچھ دیکھنے لگا۔ میری نظریں بھی اسی طرف اٹھ گئی تھیں۔ مدھم تاریکی میں، میں نے بھی اس متحرک ہیولے کو دیکھ لیا جو اس سمت آ رہا تھا اور پھر وہ ہیولا میری نگاہوں میں روشن ہو گیا۔ کالے رنگ کے ایک بھینسے پر گوونداسوار تھا اور بھینسا اسی سمت بڑھ رہا تھا۔ گووندانے اپنے سر پر ایک پروں کا تاج پہن رکھا تھا لیکن جو چیز میں نے انوکھی دیکھی، وہ اس کے بہت سے ہاتھ تھے جو اس کے جسم سے لگے ہوئے تھے۔ ان ہاتھوں میں طرح طرح کے ہتھیار دبے ہوئے تھے۔ کسی میں لمبی سی ہڈی، کسی میں کلہاڑی، کسی میں نیزہ! وہ بھینسے کو دوڑاتا اس سمت آ رہا تھا۔ گنگولی پتھر سے نیچے اتر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے، زمین کی طرف چہرہ جھکایا اور چکر سے کاٹنے لگا۔ پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اس کے حلق سے ایک ہولناک چیخ نکلی۔ دوبارہ وہ اسی انداز میں چیخا اور پھر اس کا بدن بری طرح کانپنے لگا۔ ایک لمحے میں وہ دوبارہ ساکت ہو گیا اور پھر میری طرف گردن گھما کر بولا۔

''تو بھاگ جا یہاں سے، چل بھاگ جا یہاں سے...... اس حرام خور کو مستی آ گئی ہے آج، لڑنے آ رہا ہے ہم سے، جان بچانا چاہتا ہے میاں جی تو بھاگ جا یہاں سے۔'' یہ کہہ کر وہ خود درختوں کے پیچھے بھاگ گیا۔ البتہ میں اپنی جگہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک چوڑے تنے کی آڑ لے لی۔ اتنی دیر میں گوونداقریب پہنچ گیا۔ وہ بڑا پروقار نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے گنگولی کو بھی درختوں کی آڑ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کیے ہوئے تھے، گردن جھکائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے خوفناک نیلی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

''جے...... جے بھدرنا مچنڈا۔'' گنگولی نے کہا۔

''کالی کنتھوریا کلکتے...... کا باز! تجھے ہمارے بارے میں پتا کر لینا چاہیے تھا۔''

''کر لیا تھا پتا تیرے بارے میں گوونداابھدرنا مچنڈا ابھی کالی کا داس ہے اور جب بات من کے پھیر میں آ جائے تو سب کچھ جائز ہو جاتا ہے، ہو سکتا ہے ہم کالی کنتھوریا کو مان لیتے، پر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے لیے کنتھوریا کنٹھ کیا تھا۔ سو ہم بھی اسی کا بنس دہرا رہے ہیں۔''

''موت آئی ہے تیری تو میں بھدرنا بھینٹ دے دوں گا۔'' دفعتاً ہی گوونداکے ہاتھ سے ایک نیزہ سنسناتا ہوا نکلا اور گنگولی کے سینے میں جا لگا...... لیکن گنگولی کے سینے میں بڑا سا سوراخ ہوا اور نیزہ اس کے دوسری طرف سے نکل کر عقب میں موجود درخت میں پیوست ہو گیا۔ گنگولی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بھیانک آواز میں چیخا۔ ''جے بھدرنا مچنڈا۔'' اور پھر وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر ہاتھوں اور پیروں کے بل چکر لگانے لگا۔ اسی وقت گوونداانے اپنے بھینسے کو اس پر دوڑا دیا۔ شاید گنگولی کو اس کا احساس نہیں تھا، وہ خود بھی کوئی جادوئی عمل کرنے کو جا رہا تھا۔ اس نے غالباً یہ سوچا ہوگا کہ اب گوونداس پر کوئی دوسرا ہتھیار پھینک کر مارے گا اور وہ اس سے بچاؤ کرے گا مگر گوونداانے بھی چالاکی سے کام لیا تھا اور بھینسے ہی کو اس پر دوڑا دیا تھا۔ نتیجے میں گنگولی بھینسے کی لپیٹ میں آ گیا اور بھینسا اسے روندتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ گنگولی زمین پر جا پڑا تھا۔ گوونداانے کچھ فاصلے پر جا کر بھینسے کا رخ تبدیل کیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا ہتھیار جو کلہاڑی کی شکل میں تھا، گنگولی پر کھینچ مارا۔ نشانہ سچا تھا، کلہاڑا گنگولی کی گردن پر لگا اور گنگولی کی گردن کٹ کر کئی فٹ دور جا پڑی۔ اس کا دھڑ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے ایک سمت دوڑنے لگا۔ سامنے ایک لمبے تنے والا درخت نظر آ رہا تھا۔ گنگولی کے بے سر کا جسم درخت کے تنے پر پھرتی سے چڑھنے لگا۔ گوونداانے فوراً ہی بھینسے کو دوڑایا اور اس درخت کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے گنگولی کے جسم پر مختلف ہتھیاروں سے بے شمار وار کیے اور اسے نیچے گرا لیا لیکن میری آنکھوں نے اس ہولناک منظر کے ساتھ ساتھ ایک اور خوفناک

منظر بھی دیکھا۔ گنگولی کا کٹا ہوا سر آہستہ آہستہ میری جانب سرک رہا تھا۔ پھر وہ تقریباً چار فٹ اونچا بلند ہوگیا اور اس کے منہ سے ایک سرگوشی سی نکلی۔

''اپنا شریر مجھے ادھار دے دو میاں جی واپس کر دوں گا، اس پاپی گوونداکو نیچا دکھانے کے بعد! جلدی کرو، اپنا شریر مجھے دے دو۔ ہاتھ بڑھا کر میرے سر کو اپنے سر پر رکھ لو۔ ارے دیر ہو رہی ہے۔ اگر وہ پلٹ پڑا تو برا ہو جائے گا۔'' گنگولی کا سر آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا اور پھر میرے چہرے سے اس کا فاصلہ ایک فٹ سے زیادہ نہ رہ گیا۔ میں نے دایاں ہاتھ سیدھا کیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کٹے ہوئے سر کے رخسار پر رسید کر دیا۔ سر بہت دور جا کر گرا تھا اور گووندا اس کی جانب متوجہ ہوگیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں ایک گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری اور عقب میں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز گری ہو۔ توجہ ایک لمحے کے لیے بٹ گئی اور میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسری طرف گووندا نے گنگولی کے سر کو اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دوسرے نیزے میں پرو لیا تھا۔ اس کے مختلف ہاتھ اپنے ہتھیاروں سے گنگولی کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے گووندا کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہو۔ اس نے اپنا کام سرانجام دیا۔ گنگولی کا سر نیزے میں سنبھالا اور بھینسے کا رخ تبدیل کر دیا اور پھر بھینسا اسی جانب دوڑ پڑا، جدھر سے آیا تھا۔ میں سنسنی خیز نگاہوں سے جاتے ہوئے بھینسے کو دیکھتا رہا۔ بھوریا چرن بھی ایک بار اسی طرح بابا فضل کے مقابلے پر آیا تھا۔ کالا بھینسا، کالے جادو کے ماہروں کی خاص سواری معلوم ہوتا تھا۔ اور گووندا یقینی طور پر گنگولی سے بڑا جادوگر تھا۔ وہ اپنے قول میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو اب گنگولی کا وجود ختم ہوگیا تھا۔ عجیب لڑائی تھی۔ بے حد بھیانک، بڑی دہشتناک۔ فضا میں ایک عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ بغور جائزہ لینے کے بعد انکشاف ہوا کہ یہ بدبو گنگولی کے جسم کے ان ٹکڑوں سے اٹھ رہی تھی جو اب پانی کی طرح پگھل رہے تھے اور گٹر کے کالے پانی کی طرح زمین پر بہہ رہے تھے۔ بدبو ناقابل برداشت تھی۔ یہاں اب کچھ نہیں رہ گیا تھا چنانچہ واپسی کے سوا اور کیا کرتا۔ واپس پلٹا ہی تھا کہ پھر کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں۔ پھر ایک ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مسعود میاں۔ مسعود میاں مجھے، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مجھے بھی۔'' میں بری طرح اچھل پڑا۔ وہ چیخ اور کچھ گرنے کی آواز یاد آگئی۔ اس وقت ذہن میں ہیجان تھا اس لیے پوری توجہ نہیں دے سکا تھا لیکن یہ آواز...... یہ شناسا تھی۔ میں اس درخت کے پیچھے پہنچ گیا جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہ سلامت علی ہی تھے جو زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''آپ؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''معاف کر دینا مجھے۔ معاف کر دینا تمہارے پیچھے چلا آیا تھا۔ آہ! میرا بدن بیکار ہوگیا ہے، مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔''

''نہیں۔ آپ ٹھیک ہیں۔ آیئے میرا سہارا لے لیجئے۔'' میں نے ان کے جسم کا بوجھ سنبھالا اور انہیں کھڑا کر دیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔

''میں۔ میں اب چل سکتا ہوں۔ میں چل سکتا ہوں۔ یہ دیکھو میں!'' وہ دو قدم آگے بڑھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آیئے واپس چلیں۔'' سب کچھ چھوڑ دیا میں نے، اگر سلامت علی نہ ہوتے تو شاید میں گووندا کے پاس جا کر اسے مبارکباد دیتا مگر اب گھر واپس جانا ضروری تھا۔

''میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ نہ جانے تمہارے کس کام میں حرج ہوا۔ بس تجسس پیدا ہوگیا تھا۔ چھپ کر تمہارا پیچھا کیا اور...... آہ! میں نے یہ سب کچھ، اس سے پہلے میں نے یہ سب کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔''

''آئندہ خیال رکھئے سلامت علی صاحب۔ یہ جادو کی کالی دنیا ہے اور ایسے مناظر جان لے لیتے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے میرا کام کرنے دیں۔ اس میں مداخلت سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

''سخت۔ سخت شرمندہ ہوں۔ آئندہ کبھی...... مگر۔ میرے خدا یہ...... یہ سب......! یہ سب کیا تھا۔''

''آپ کے دوست سری رام کی ایک مشکل کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ گنگولی کا کھیل تو ختم ہو گیا ہے اور اب گووندا رہ گیا ہے، صرف گووندا۔ وہ بھی ختم ہو جائے گا اطمینان رکھیں۔'' میں نے کہا۔

✦✧✦✧✦

سلامت علی صاحب چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے ان کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ خود کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر خوف سے ان کا برا حال تھا۔ غلطی کی تھی انہوں نے ان جادوگروں کی زد میں آ سکتے تھے۔ میں نے انہیں سہارا دیا اور انتہائی مشکل سے یہ طویل سفر طے ہوا۔ ہم گھر میں داخل ہو گئے۔

''اب کیا کرو گے؟'' انہوں نے پوچھا اور میں مسکرا دیا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''میں جاؤں......؟''

''جی۔ آرام کیجیے۔'' میں نے جواب دیا۔ سلامت علی اندر چلے گئے اور میں اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو گیا۔ پھر نہ جانے کب تک بستر پر میں اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ دوسری صبح معمول کے مطابق تھی ناشتے پر سلامت علی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ فراست بھی نہیں ملا تھا۔ فرخندہ کچھ دیر کے بعد نظر آئی کچھ پریشان تھی۔

''کیا بات ہے؟''

''ابو کا بخار اور تیز ہو گیا ہے۔'' اس نے تشویش سے کہا اور میں چونک پڑا۔

''سلامت علی صاحب کو بخار آ گیا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔''

شدید بخار ہے۔ بے ہوشی طاری ہے۔ بحرانی کیفیت ہے اور نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہے ہیں۔ کبھی ''بھینسا بھینسا'' چیختے ہیں۔ کہتے ہیں ہٹ جاؤ سینگ مار دے گا۔ کبھی کہتے ہیں لے گیا لے گیا سر لے گیا......!'' فرخندہ نے بتایا...... اور میں نے گہری سانس لی۔ اس بات کا خدشہ تھا مجھے رات ہی کو ان کی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''فراست کہاں ہیں؟''

''کسی کام سے گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو ابو کے پاس چلیں۔''

''ہاں ضرور......!'' میں نے کہا۔ سلامت علی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کبھی آنکھیں کھول کر دیکھتے کبھی عجیب عجیب سا منہ بناتے کسی پر نگاہ نہیں جما رہے تھے۔ میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ چیخ پڑے۔

''ٹکر مار دی۔ سر پھٹ گیا۔ گردن کٹ گئی اور دیکھو وہ دیکھو گردن لے گیا۔''

''سلامت علی صاحب۔ مجھے دیکھیے میں کون ہوں۔'' میں نے کہا اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر گردن گھما کر مجھے دیکھا۔ میں نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دل میں ایک آیت کا ورد کیا اور وہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اتنی دیر میں فراست واپس آ گیا۔

''ڈاکٹر اشتیاق بھی گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے میں......''

''نہیں فراست، ضرورت نہیں ہے۔ بخار ابھی تھوڑی دیر میں اتر جائے گا۔'' میں نے کہا۔ فراست نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا اور پھر ماں کی طرف دیکھنے لگا سب پریشان تھے۔ فراست میرے ساتھ باہر نکل آیا پھر بولا۔

''کچھ دیر پہلے میں نے ٹمپریچر دیکھا تھا۔ تم یقین کرو ایک سو پانچ بخار ہے یہ بہت خطرناک ہے۔''

''نہیں ٹھیک ہو جائیں گے فکر مت کرو......!''

''مسعود ایک بات بتاؤ گے؟'' فراست عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ہوں۔ ضرور۔''

''پچھلی رات تم اور ابو کہاں گئے تھے۔'' فراست عجیب سے لہجے میں بولا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا

اس وقت میں جاگ رہا تھا۔ میں نے تمہیں اور ابو کو آتے ہوئے دیکھا اور پھر صبح کو...... امی نے بتایا کہ بخار رات ہی کو چڑھ آیا۔ وہ سردی سے کپکپا رہے تھے۔ مجھے گمان ہوا کہ فراست کسی بدگمانی کا شکار ہو رہا ہے۔ ایک لمحے سوچنے کے بعد میں اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر میں نے کہا۔

''رات کو میں کالی موری گیا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ سلامت علی صاحب میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ کالے جادو کی بستی ہے۔ بس وہاں پہنچ کر وہ ڈر گئے ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''گویا ہمارا اندازہ ٹھیک تھا۔ فرخندہ کہہ رہی تھیں کہ تم مانو یا نہ مانو مسعود اس ساحرہ کا شکار ہو گئے ہیں، ان کے انداز سے پتہ چلتا ہے۔''

''کیا......؟'' میں حیرت سے بولا۔

''اس کا حسن شیطانی صفات کا حامل ہے اس کی آنکھوں میں سحر ہے جسے دیکھ لیتی ہے وہ مصیبت میں پھنس جاتا ہے وہ ضرور جادوگرنی ہے۔''

''کون...... خدا کے بندے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بننے کی کوشش مت کرو، میں پوجا کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔'' فراست نے سرد لہجے میں کہا۔ میں حیران نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

''فراست، وہ ہندو ہے اور میں خدا کے فضل سے مسلمان، میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی رابطہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟'' فراست نے سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولا۔

''اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر تم کالی موری کیوں گئے تھے؟''

''تمہارے خیال میں کیوں جا سکتا تھا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی ہمارے ذہن میں تو صرف یہی آتا ہے کہ تم بھی اس کے حسن سے متاثر ہو گئے اور اس کے چکر میں مارے مارے پھر رہے ہو۔''

''میرا خیال تو یہ ہے کہ بلکہ تھا فراست کہ چونکہ سری رام جی اور سلامت علی صاحب کے انتہائی گہرے دوستانہ تعلقات ہیں بلکہ یہ بات بھی میرے علم میں آئی ہے کہ تمہاری دادی جان کی دعاؤں سے سری رام جی کے ہاں پوجا پیدا ہوئی تھی، ایسے حالات میں تم دونوں بہن بھائی کے بھی اس سے گہرے تعلقات ہوں گے، لیکن یوں لگتا ہے جیسے تم دونوں کے دل میں اس کے لیے کوئی کدورت ہے یا پھر یا پھر......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے مسعود صاحب، حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے بچپن ساتھ گزارا ہے۔ پوجا بہت حسین ہے اسے اپنے حسن پر ناز بھی تھا لیکن ہمارے لیے وہ صرف چاچا جی کی بیٹی ہے۔ ہم نے کبھی اسے نہ بہت زیادہ حسین سمجھا اور نہ کوئی مختلف شے مگر بس عجیب و غریب فطرت کی مالک ہے وہ اور پچھلے کچھ عرصے سے تو اس کی کیفیت عجیب ہی ہو گئی ہے، کسی کو منہ ہی نہیں لگاتی لیکن ہمیں ہمیں......''

فراست نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں کہو آگے کہو......''

''نہیں بس، فرخندہ کا یہ خیال تھا کہ تم اس میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہو۔''

''دلچسپی تو میں اس میں لے رہا ہوں فراست......''

''کیوں......؟''

''اس کے متعلق جو کہانیاں میں نے سنی ہیں وہ بڑی سنسنی خیز ہیں۔''

''کوئی خاص کہانی نہیں سنی ہوگی، سوائے ابو کی زبانی، ابو نے جو کچھ تمہیں بتایا ہوگا، بس اتنا ہی ہوگا اور ابو بھلا حقیقتیں

کیسے بتا سکتے ہیں کیونکہ معاملہ ان کے دوست سری رام کا ہے۔"

"اچھا کچھ اور حقیقتیں بھی ہیں؟"

"ہاں ہیں، بہت سے لوگ جانتے ہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ یہاں چندوسی میں تمہاری ملاقات ہوئی ہی کتنے لوگوں سے ہے۔"

"کیا کہانی ہے فراست مجھے بتاؤ......؟"

"کوئی طویل کہانی نہیں ہے، بس یوں سمجھ لو کہ گووندا اور اس کا خاندان ہندوؤں کی زبان میں نیچ ذات لوگوں کا خاندان ہے۔ گووندا کے ماں باپ سری رام کے نوکر تھے۔ گووندا خود بھی بچپن سے سری رام کی چاکری کرتا رہا تھا اور اسی دوران اسے پوجا سے محبت ہوگئی۔ پوجا بھی سب کچھ بھول کر کہ وہ نیچ ذات ہے یا اونچ ذات اس سے محبت کرنے لگی۔ اب یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی۔ دونوں جوان ہوگئے اور پھر سری رام جی کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔"

"اوہ تو تمہارا مطلب ہے کہ پوجا بھی گووندا کو چاہتی ہے؟"

"یقینی طور پر ایسے معاملات یکطرفہ نہیں ہوتے اور اس کے بعد جب سری رام جی کو یہ بات معلوم ہوگئی تو بس یوں سمجھو کہ گووندا کے خاندان پر عتاب نازل ہوگیا۔ ان کا ذریعۂ معاش ہمیشہ سے سری رام جی کی ملازمت تھا۔ سری رام جی نے انہیں اس سے محروم کردیا۔ وہ بھوکے مرنے لگے۔ گووندا کی ماں مرگئی۔ کچھ عرصے کے بعد باپ مرگیا، بس خاندان کے دوسرے لوگ باقی رہ گئے تھے۔ خود گووندا کی حالت بھی بہت زیادہ خراب تھی۔ سری رام جی نے جب اس سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ وہ پوجا کو چاہتا ہے تو اس نے سچائی سے اظہار کردیا تھا۔ نتیجے میں اسے چار دن تک بھوکا پیاسا سری رام جی کے گھر کے ایک بند کمرے میں رہنا پڑا اور جب سری رام جی نے یہ محسوس کیا کہ وہ بھوک سے مرجائے گا اور اپنی ضد نہیں چھوڑے گا تو اسے جوتے مار کر وہاں سے نکلوادیا کہ کہیں وہ ان کے گھر میں ہی نہ مرجائے۔ نجانے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں بے چارے گووندا نے، اور اس کے بعد وہ یہاں سے غائب ہوگیا تھا، پھر اس نے کیا کیا، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ واپس آیا تو وہ شیطان کے مقابلے میں شیطان بن چکا تھا۔ اب یہ دیکھو ناں مسعود کہ اونچی اور نیچی ذات کیا ہوتی ہے۔ ہمارے مذہب میں تو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس کے بعد اب گووندا نے سری رام جی کو صحیح طور پر سنبھال رکھا ہے۔"

"پوجا خود کچھ نہیں کہتی۔"

"نہیں وہ پاکباز خاتون بس خاموش رہتی ہیں ہر ایک سے ملنا جلنا بات کرنا چھوڑ دیا ہے۔ سری رام جی سے بھی کوئی شکایت نہیں کرتیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں، لیکن یہ سب دکھاوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی گووندا کی سازش میں شریک ہے۔"

"کمال ہے، کمال ہے۔" میں نے کہا اور اس کے بعد میں خاموش ہوگیا۔ یہ کہانی واقعی عجیب اور دلچسپ تھی اور اب میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ فراست تو کچھ دیر میرے پاس بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ ایسا کوئی احمقانہ تصور میرے ذہن میں موجود نہیں ہے، اور شاید اسے یقین بھی آگیا تھا لیکن اب میرے لیے ذرا الجھن کا مقام پیدا ہوگیا تھا۔ اونچ نیچ ذات کا معاملہ تھا۔ گووندا نے شیطانی علوم سیکھ لیے تھے اور اس کے ذریعے اب وہ طاقت حاصل کرچکا تھا لیکن مجھے اب اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے، دو محبت کرنے والے جن کا تعلق ایک دوسرے سے روحانی تھا، میری وجہ سے کسی عذاب میں گرفتار نہ ہوجائیں۔ یہ مجھے نہیں کرنا چاہیے اور جواب دینے والا ضمیر تھا، اور ضمیر میرے اس خیال سے غیر مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کسی بھی طرح اس کے اس مسئلے میں ٹانگ اڑانا مناسب نہیں ہے۔ اگر میں گووندا کو کوئی نقصان پہنچادوں تو یہ ظلم ہوگا۔ کیونکہ وہ ظلم سے مجبور ہونے کے بعد شیطانی حرکتوں پر اترا ہے، البتہ میں اس کی کسی شیطانی حرکت میں اس کا ساتھ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس مسئلے میں سری رام جی کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی گووندا کا کوئی ساتھ دیا جاسکتا ہے۔ مجھے ان دونوں کے معاملات سے الگ ہوکر چندوسی سے نکل جانا چاہیے۔

پابند تو تھا نہیں کسی کا، کوئی قید نہیں تھی میری مرضی تھی، جس مسئلے میں چاہتا ٹانگ اڑاتا اور جس میں نہ چاہتا نہ اڑاتا۔ یہ فیصلہ قطعی اور آخری تھا لیکن اب ایسی مصیبت بھی نہیں آئی تھی کہ میں فوراً ہی یہاں سے فرار ہو جاتا۔

کافی وقت یہاں گزرا، فراست تو پہلے ہی چلا گیا تھا، میں اپنی آرام گاہ میں خاصا وقت گزارنے کے بعد باہر نکلا تو فرخندہ نظر آ گئی۔ میں نے اسے روک کر سلامت علی صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے پرسکون لہجے میں بتایا کہ بخار اتر چکا ہے اور اب وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ بخار اتر جائے گا۔ فرخندہ اب خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں تیار ہو کر چل پڑا۔ گووندا سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ پچھلی رات ہی کو اس سے ملتا، اگر سلامت علی صاحب میرا پیچھا کرتے ہوئے وہاں نہ پہنچ جاتے۔ گھر سے نکل آیا، پیدل چلتا رہا۔ کالی موری کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں کالی موری کے کھنڈرات میں داخل ہو گیا۔ یہاں وہی لامتناہی سناٹا چھایا ہوا تھا اور کہیں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں گووندا کو تلاش کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور پھر میں نے اسے آواز دی۔ میرے آواز دینے پر وہ ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔ عجیب سا حلیہ بنا رکھا تھا۔ چہرے پر سنگین خاموشی طاری تھی۔ میں اسے دیکھ کر مسکرا دیا اور وہ سنجیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔

”تمہیں مبارکباد دینا چاہتا ہوں گووندا کہ تم نے نہ صرف اپنا قول نبھایا بلکہ اپنے دشمن کا خاتمہ بھی کر دیا......“

”وہ ہمارا دشمن نہیں تھا میاں جی۔ وہ، بس یوں سمجھ لیں کہ ہم نے یہ سب کچھ نہیں چاہا تھا۔ کالا جادو کرتے ہیں مگر کسی کا جیون نہیں لیتے، پر آپ نے ایسی بات کہہ دی تھی اور، اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔ سو ہم نے اس سے مقابلہ کیا اور وہ ہمارے سامنے شکست کھا گیا۔“

”مجھے اس کا علم ہے گووندا اور تمہاری کہانی بھی میرے علم میں آ گئی ہے۔ تم پوجا سے محبت کرتے ہو......“ گووندا کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے، اس نے کہا۔

”یہ کہانی، میاں جی! تمہیں چندوسی والوں ہی نے سنائی ہو گی لیکن چندوسی والے سری رام جی کے خوف سے ہمیشہ ادھوری کہانی سناتے ہیں۔ اگر پوری کہانی سننا چاہو تو میں تمہیں سنا سکتا ہوں۔“

”نہیں گووندا میں نے پوری کہانی ہی سنی ہے۔ مجھے علم ہو گیا ہے کہ سری رام جی نے تمہارے اہل خاندان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے اور اور تمہیں بھی کافی اذیتیں پہنچائی ہیں۔“

”اگر سن چکے ہو میاں جی تو پھر خود فیصلہ کر لو کہ ہمارا کیا قصور ہے۔ میں سری رام جی کے مظالم سے تنگ آ کر باہر نکل گیا۔ میرے اندر ہمت تھی، میں اگر چاہتا تو بے شمار دولت کما کر ایک امیر آدمی بن سکتا تھا لیکن سری رام جی جیسے ہٹ دھرم کبھی اس بات کو تسلیم نہ کرتے اور یہ نہ مانتے کہ، کہ ایک نیچ ذات ان کا برابر والا ہو سکتا ہے۔ بس اس خیال نے میاں جی دماغ گھما دیا اور پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایسی طاقتیں حاصل کی جائیں جن کے ذریعے سری رام جی کو مجبور کر دیا جائے۔ میں نے یہاں پر بھی دھوکہ نہیں کیا اور سری رام جی کو یہ سمجھا دیا کہ میرے پاس کالی قوتیں ہیں۔ وہ اگر سیدھی طرح نہ مانیں گے تو پھر میں بھی انگلیاں ٹیڑھی کر لوں گا۔ میاں جی سب کچھ کر سکتا تھا میں ان کالی قوتوں کو حاصل کرنے کے بعد لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں سری رام جی کو دھوکہ بھی دے سکتا تھا۔ پوجا کو ایسے نقصانات پہنچا سکتا تھا کہ اس کے بعد سری رام جی اسے اپنے ہاتھوں سے نکال کر گھر سے باہر ڈال دیتے، مگر، مگر میں پوجا کو اسی عزت کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں جس طرح لڑکیاں اپنے گھروں سے وداع ہوتی ہیں۔ یہ اس کی عزت کے لیے ہے میاں جی کیونکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ ورنہ میرے کالے جادو کے سامنے کیا سری رام جی اور کیا ان کی اوقات۔“ گووندا نے کہا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے گووندا، بہرطور میں تمہیں دعائیں ہی دے سکتا ہوں، اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔“

”میاں جی، دیکھو ہمارے کالے علم نے بتایا ہے کہ تم کالے علم کے خلاف عمل کرتے ہو۔ ہمارے ساتھ ایسا مت کرنا۔

اگر تم نے ایسا کیا تو یہ ایک مظلوم کے ساتھ اور ظلم ہوگا۔ بس اس کے علاوہ ہم تم سے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔“
گووندا نے کہا اور میں پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے کہا۔
”نہیں گووندا۔ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا مگر تم سے کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔“
”کہو مہاراج......“
”گووندا۔ میرا تجربہ زیادہ نہیں ہے لیکن ایک بات سب ہی جانتے ہیں محبت آسمانی جذبہ ہوتا ہے۔ تمہارے دین دھرم میں بھی اسے بھگوان کا روپ کہا جاتا ہے۔ بھگوان کے اس سندر روپ کو تم نے شیطان کی آغوش میں کیوں دے دیا؟“
گووندا میری صورت دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”جیون سے زیادہ پیاری ہے وہ ہمیں۔ بچپن سے ہماری ہے وہ۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سوا کچھ نہیں سوچا۔ بچپن میں بھی وہ کہتی تھی کہ گووندا ہم ہمیشہ ساتھ کھیلا کریں گے، چاہے بوڑھے ہو جائیں، چاہے مر جائیں۔ جوانی میں بھی اسے پوری امید تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ماتا پتا کی اکیلی ہے وہ اس کے لیے جیون دے دیں گے۔ وہ اس کے لیے اونچ نیچ کی ساری دیواریں گرا دیں گے اور ہمیں ایک کر دیں گے، مگر یہ نہ ہوا۔ سری رام جی اتنے کٹھور ہو گئے کہ انہوں نے ان پر بھی دیا نہ کی جنہوں نے جیون بھر ان کی سیوا کی۔ ہم نے اپنے ماتا پتا اپنے پریم کی بھینٹ چڑھا دیئے۔ میاں جی ہمیں یہ حق نہ تھا۔ ہزار بار مر جاتے ہم اپنے ماتا پتا کے لیے مگر۔ مگر سری رام جی نے۔ پھر ہم پر شیطان آ گیا اور، اور ہم شیطان بن گئے۔ سب کچھ کھو دیا ہم نے۔ جیون میں بس ایک آشا ہے، پوجا۔ نہیں میاں جی، اتنا بڑا بلیدان دینے کے بعد ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب...... پوجا ہماری ہوگی...... ورنہ کسی کی نہ ہو سکے گی۔ وہ بھی اس سنسار سے جائے گی ہم بھی جائیں گے۔ شیطان اب انسان نہیں بن سکتا میاں جی، ہمیں معاف کر دینا۔“ وہ مڑا اور واپس چلا گیا۔ یہ بات میں خود بھی جانتا تھا کہ شیطان انسان نہیں بن سکتا۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ مگر نتیجہ کچھ بھی ہو میرے لیے اب یہ معاملہ غیر اہم ہو گیا تھا۔ میں وہ نہیں کر سکتا تھا جو سری رام چاہتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میں واپس چل پڑا......
سلامت علی کی حویلی کا ماحول عجیب ہو رہا تھا۔ چچی جان یعنی بیگم سلامت علی سب سے پہلے نظر آئی تھیں، مجھے دیکھ کر یکدم ساکت ہو گئیں۔ پھر بے اختیار مجھے سلام کیا اور غڑاپ سے کمرے میں گھس گئیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ حیران حیران اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک ملازم کھانے کے لیے پوچھنے آیا تو میں نے کہا۔
”کھانا نہیں کھاؤں گا۔ فراست کہاں ہے؟“
”اندر ہیں۔“
”میرے پاس بھیج دو۔“ میں نے کہا اور ملازم چلا گیا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی فراست نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیا قصہ تھا۔ صورت حال معلوم کرنے کے لیے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر آہٹیں محسوس ہوئیں پھر فرخندہ اور فراست ایک ساتھ اندر آئے تھے۔ دونوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام کیا تھا۔ میں مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا، پھر میں نے کہا۔ ”یہ کوئی نیا ڈرامہ ہے؟“
”ہمارا قصور نہیں ہے۔ ہمیں بتایا ہی نہیں گیا تھا......“ فرخندہ نے کہا۔
”جو بدتمیزی ہوئی صرف اس خیال کے ساتھ ہوئی کہ آپ ابو کے دوست کے بیٹے ہیں اور پھر آپ ہمارے ہم عمر بھی ہیں۔“ فراست بولا۔
”کیا ہو گیا تم دونوں کو؟“
”ہمیں اصل بات پتا چل گئی ہے۔“
”کونسی اصل بات......؟“

''سری رام چچا، ابو کے پاس آئے تھے۔ ہم دونوں نے ان کی باتیں سنیں اور ہمیں سب معلوم ہوگیا۔ رات کو گنگولی مارا گیا نا.....؟''

''ہمیں معاف کردیجیے شاہ صاحب! ہم نے واقعی آپ کی شان میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔''

''ارے خدا تمہیں سمجھے۔ تم نے مجھے ایک اور نام دے دیا۔ آؤ بیٹھو کیا بات ہوئی سری رام جی اور سلامت علی صاحب کے درمیان.....'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ دونوں بڑے احترام سے میرے سامنے بیٹھ گئے۔ پوری طرح سنجیدہ نظر آرہے تھے۔

''چاچا جی ابو کے بخار کی سن کر آئے تھے، مگر ابو تو اسی وقت ٹھیک ہوگئے جب آپ نے کہا تھا کہ بخار ابھی تھوڑی دیر میں اتر جائے گا۔ ان کی بحرانی کیفیت بھی اسی وقت ٹھیک ہوگئی تھی۔ ابو نے چاچا جی سے کہا کہ سری رام میں تمہیں ایک ایسی خوشخبری سناتا ہوں کہ تم خوشی سے پاگل ہوجاؤ گے۔ ہمیں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی اور ہم دونوں نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں تب ہمیں معلوم ہوا۔''

''کیا معلوم ہوا.....؟''

یہی کہ آپ ایک نوجوان درویش ہیں اور جمال گڑھی میں آپ نے بہت کچھ کیا ہے جس کی بناء پر بھلا صاحب اور سری رام آپ کو وہاں سے بلا کر لائے اور پچھلی رات آپ کے عِلم سے گنگولی مارا گیا۔

''یہ غلط ہے۔ اسے گوونداا نے مارا ہے لیکن تم دونوں نے..... اوہ میرے خدا کیا چچی جان کو بھی سب کچھ معلوم ہوگیا ہے..... تبھی..... وہ بھی سلام کررہی تھیں..... تو یہ قصہ ہے۔''

''شاہ صاحب۔ آپ ہمیں معاف کردیں۔ فرخندہ نے کہا۔'' ہم نے انجانے میں بڑی گستاخیاں کی ہیں۔ میں نے تو نہ جانے کیا کیا بکواس کی ہے۔''

''میں نے کیا کم حماقتیں کی ہیں۔'' فراست بولا۔

''بھئی تم لوگوں نے خوب روپ بدلا ہے۔'' میں بدستور ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ اتنی چھوٹی سی عمر میں درویش کیسے بن گئے شاہ صاحب.....اور یہ سب کچھ آپ کو کیسے آگیا؟''

''چلو تم لوگوں کو یہ معلوم ہو ہی گیا تو میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں خوب غور کر کے مجھے جواب دینا۔''

''جی شاہ صاحب!''

''گووندا پوجا سے محبت کرتا ہے۔ پوجا بھی اسے چاہتی ہے۔ تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہوگا۔ سری رام جی اپنی جیسی کر کے ہار گئے اور اب وہ میرے ذریعہ گووندا کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہوگا؟''

''بالکل نہیں!'' فرخندہ نے فوراً کہا۔

''ہمارے مذہب میں تو اونچ نیچ نہیں ہے، جو صدق دل سے کلمہ پڑھتا ہے وہ دوسرے کلمہ گو کا ہم پلہ ہے اور پھر سری رام نے گووندا کے ساتھ کیا نہیں کیا۔ اب اگر اس نے مجبور ہو کر شیطانی طاقتوں کا سہارا لے لیا ہے تو سری رام چاچا بھاگتے پھر رہے ہیں۔''فراست بولا اور مسکرا خاموش ہوگیا۔ ان دونوں کے الفاظ نے مجھے ڈھارس دی تھی۔ شام کو سری رام جی پھر آگئے۔ میں سلامت علی کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا اور ہم کوئی گفتگو شروع بھی نہ کرپائے تھے کہ سری رام جی کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔ سلامت علی نے انہیں یہیں بلوالیا۔ سری رام جی ہاتھ جوڑے اندر آگئے تھے۔ آج ان کی کھیسیں نکلی ہوئی تھیں۔

''جے ہو مہاراج کی۔ اندھے ہیں، ہم کیا جانیں کہ کونسا روپ مہان ہے وہ سیوا نہ کر پائے آپ کی جو کرنی چاہیے تھی۔ آپ نے تو مشکل ہی ختم کردی ہماری۔ ہمارے آدمی دیکھ آئے سلامت، پاپی گنگولی کا ڈیرہ اجڑا پڑا ہے۔ بدبو پھیلی ہوئی ہے چاروں طرف..... سڑاند اٹھ رہی ہے، جے ہو مہاراج کی اب اس پاپی گووندا کا کریا کرم اور کردیں مہاراج، جان چھوٹ

جائے کمینے سے۔''

''کچھ کہنا ہے آپ سے سری رام جی، اچھا ہے آپ آ گئے۔''

''حکم دیں مہاراج حکم دیں۔'' سری رام مجسم نیاز بنے ہوئے تھے۔

آپ کا ذاتی معاملہ ہے ہم کسی بات پر زور نہیں دیں گے مگر پتا چلا ہے کہ آپ کی بیٹی بھی بچپن سے گوونداکو چاہتی ہے اور اب بھی ایسا ہی ہے۔''

''بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں مہاراج، بال ہٹ جانتے ہیں آپ، مگر ذات پات بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ریت رواج بھی کچھ ہوتے ہیں، ہم کھرے برہمن ہیں اور وہ سسرا اچھوت ہے، کوئی جوڑ تو ہو، کوئی میل تو ہو۔ ہمارے در کے ٹکڑے کھا کر جوان ہوا ہے۔ ہمارے برابر کیسے کھڑا ہو سکتا ہے۔ ذات برادری ہے ہماری، بھول کر بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتے۔''

''آپ نے اس پر سختیاں بھی بہت کی ہیں۔''

''غلطی بھی کی ہے ہم نے۔ رحم کھا گئے اس پر'' زندہ چھٹکوا دیا۔ بس اسی کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اسی وقت کھیل ختم کر دیتے تو اچھا تھا مگر سے گزر گیا، اب آپ ہی اسے ٹھکانے لگا سکتے ہیں مہاراج۔''

''نہیں سری رام جی، یہ کام ہم نہیں کرتے، ہمارا ہر قدم اللہ کے حکم سے اٹھتا ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان کی زندگی لینے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس کا عمل شیطانی ہے تو اسے قدرت سے سزا ملے گی۔ ہم اس کے جادو کا توڑ کر سکتے تھے مگر اس کا ایک مقصد ہے۔ وہ برائی کے راستے چھوڑ کر نیک راستوں پر آ سکتا ہے۔ ہمارے دین میں اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ انسان سب ایک جیسے ہوتے ہیں، نہ کوئی اچھوت نہ برہمن۔ وہ اگر چاہتا تو شیطانی طاقتوں کا سہارا لے کر بھی کا آپ کی بیٹی کو اٹھا لے جاتا لیکن بقول آپ کے نیچ ذات ہو کر بھی اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنے پیار کی بے حرمتی نہیں کی۔ وہ اب بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ نے اس کے کالے جادو کی تو تیں اب تو خود دیکھ لیں، میرے خیال میں اب ضد نہ کریں اسے اپنا لیں ورنہ وہ آپ کو آسانی سے تباہ کر سکتا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' سلامت علی نے کہا۔

''ہاں سلامت علی صاحب، بات ذات پات کی آ گئی ہے اور یہ تفریق ہمارے مذہب میں گناہ ہے۔ میں اس بنیاد پر کچھ نہیں کر سکتا، مجبوری ہے اگر کوئی شیطان، سفلی قوتوں کا سہارا لے کر کسی بے گناہ کو نقصان پہنچا رہا ہوتا تو دوسری بات تھی مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے۔''

ارے یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ سلامت انہیں سمجھاؤ، کیا میں، کیا میں اپنی بیٹی اس اچھوت کو، اس چمار کو دے دوں۔'' سری رام کلس کر بولے۔

''ایسا ہوتا نہیں ہے مسعود میاں۔'' سلامت علی بولے۔

''اللہ جانے، میں معذور ہوں۔''

''ڈر گئے ہو گووندا سے میاں جی، یہ کیوں نہیں کہتے۔'' سری رام بولے۔

''آپ کو سب کچھ کہنے کا اختیار ہے، سری رام جی۔''

''ارے بھائی، ہمارا کام کر دو۔ جو مانگو گے دیں گے۔ بیس ہزار، پچاس ہزار بولو کیا لو گے۔ سلامت انہیں سمجھاؤ۔'' سری رام بے حواس ہوتے جا رہے تھے۔

''یہ پیشکش آپ گووندا کو دیں، ممکن ہے وہ راضی ہو جائے۔ ویسے میری یہی رائے ہے۔ آپ چاہیں تو خاموشی سے کسی دوسرے شہر جا کر یہ کام خاموشی سے کر دیں، کچھ بھی کریں یہ ہوگا ضرور۔''

''ہوں، ٹانگ برابر چھوکرے ہو میاں جی...... باتیں لمبی کرتے ہو۔ بڑے آئے پیرنٹنڈن شاہ بن کر۔ ارے تم سن رہے ہو اس کی باتیں سلامت علی۔'' سری رام بگڑ گئے۔ میں مسکراتا رہا۔ سلامت علی دم بخود تھے۔ سری رام کھڑے ہو گئے۔

پھر بولے۔ ''میں جارہا ہوں سلامت، آگ لگادی ہے میرے من میں اس نے۔ اسے سمجھاؤ، نہ مانے تو...... تو...... تم جانو تمہارا کام۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ سلامت علی مسلسل خاموش تھے......! میں نے مسکرا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی محترم سلامت صاحب، کیا حکم ہے آپ کا۔'' سلامت علی خاموشی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''دوستی دنیا تک ہے۔ مسعود شاہ صاحب، اس کے بعد قبر میں جانا ہے۔ ایک ایسے کام کی حمایت کیسے کرسکتا ہوں، جس کی اجازت مذہب نہ دیتا ہو۔ آپ سب کچھ بہتر سمجھتے ہیں، میں بھلا یہ بینائی کہاں رکھتا ہوں۔ آپ کا فیصلہ بہتر ہے اب وہ جانے اور اس کا کام۔''

''شکریہ...... بیشک وہ ہمارے ہم مذہب نہیں مگر جیتے جاگتے انسان ہیں۔ خیر میرا فیصلہ اٹل ہے مگر اب یہاں میرا رکنا مناسب نہیں ہے۔ آپ کی دوستی میں رخنہ پڑے گا۔ سری رام میرے یہاں رہنے سے خوش نہیں ہوگا چنانچہ آپ مجھے اجازت دیجیے۔''

''ابھی...... اسی وقت۔''

''ہاں جب ایک کام کرنا ہے تو دیر مناسب نہیں ہے۔ آپ سری رام سے کہہ دیں کہ اس گفتگو کے بعد میں یہاں نہیں رکا۔'' میں نے کہا اور سلامت علی صاحب افسردہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا۔

''ہمیں تو خدمت کی سعادت حاصل ہی نہ ہوسکی۔ کم نگاہ تھے کہ آپ کو سمجھ ہی نہ سکے۔ بچے آپ کے جانے سے اداس ہوجائیں گے۔'' میں نے سلامت صاحب سے کہا کہ وہ فراست اور فرخندہ کو کچھ نہ بتائیں ورنہ وہ مجھ سے رکنے کی ضد کریں گے۔ انہیں دونوں کی وجہ سے میں جلدی وہاں سے چل پڑا۔ سلامت علی کو میں نے اسٹیشن تک چلنے کے لیے منع کردیا تھا اور خود تانگے میں بیٹھ کر چل پڑا تھا۔ چندوسی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر کہیں سے ایک ٹرین آکر رکی تھی۔ میں خاموشی سے اس میں سوار ہوگیا۔ سلامت علی نے انتہائی خوشامد کرکے کچھ پیسے دے دیئے تھے۔ مجبوری تھی کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، ٹکٹ وغیرہ خریدنے کے جھمیلے میں اس لیے نہیں پڑا تھا کہ کہیں فراست اور فرخندہ کو میری روانگی کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے اور وہ جذباتی ہوکر اسٹیشن دوڑ پڑیں۔ ٹرین کہاں سے آئی ہے کہاں جائے گی، کچھ پتا نہیں تھا، چند لمحات کے بعد اس نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ نچلے درجے کا ڈبہ تھا۔ معمولی قسم کے مسافر بھرے پڑے تھے۔ ایک مسافر نے اپنے قریب جگہ دے دی اور میں بیٹھ گیا۔ ٹرین کی آواز ذہن کو سلائے دے رہی تھی، رات کے بارہ بجے کے قریب ٹکٹ کلکٹر آگیا اور سوتے ہوئے مسافروں کو جگا جگا کر ٹکٹ مانگنے لگا۔ میں نے جیب سے پیسے نکال لیے اور ٹکٹ کلکٹر کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا، جب وہ قریب پہنچا تو میں نے پیسے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چندوسی کے اسٹیشن سے سوار ہوئے ہیں بھائی، یہ ریل جہاں جارہی ہے وہاں کا ٹکٹ دے دو۔'' ٹکٹ چیکر نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر سلام کرکے آگے بڑھ گیا۔ میں ہاتھ میں پیسے لیے منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے برابر ہی ایک میلے کچیلے سے کمبل میں منہ ڈھک کر سوتے ہوئے شخص نے کمبل کا کونہ سرکایا اور ''شی شی'' کا اشارہ کرکے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک بوڑھا باریش آدمی تھا، ہنس کر بولا۔

''آرام بڑی چیز ہے، منہ ڈھک کر سوئیے۔'' میں نہیں سمجھ سکا کہ اس نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ اس نے دوبارہ کمبل منہ پر ڈھک لیا تھا۔ میں پریشان نظروں سے دور پہنچ جانے والے ٹکٹ چیکر کو دیکھنے لگا تو اچانک باریش شخص نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑی زور سے مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور پھر کمبل میرے چہرے پر بھی ڈھک دیا۔ میرے بدن میں سناٹا سا پھیل گیا تھا۔ کمبل کی تاریکی میں ایک لمحے کے لیے گھٹن کا احساس ہوا اور پھر فنا ہوگیا۔ مدھم مدھم سے مناظر نگاہوں میں ابھرنے لگے۔ آہستہ آہستہ عجیب سی روشنی پھیلتی جارہی تھی۔ میں حیرانی سے اس روشنی کو دیکھنے لگا۔ ایک شخص ہاتھ میں جھاڑو لیے قریب آتا ہوا محسوس ہوا اور پھر مجھ سے کچھ فاصلے پر رک کر اس نے جھاڑو دینا شروع کردی۔ گرد اڑ رہی تھی۔ میں نے گرد سے بچنے کے لیے کمبل سر پر اوڑھ لیا اور چہرہ ڈھک لیا۔ جھاڑو کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔ جب وہ دور چلی گئیں تو میں نے چہرہ کھول

کر دیکھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ کافی فاصلے پر لال رنگ کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ غالباً مسجد تھی، اس کی سیڑھیوں سے نمازی نماز پڑھ کر نیچے اتر رہے تھے۔ دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا، چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ نہ ٹرین تھی، نہ ٹرین کے مسافر اور نہ ہی وہ کمبل پوش مسافر، لیکن کمبل میرے پاس تھا اور سو فیصدی وہی تھا جس میں مجھے چھپا لیا گیا تھا۔ دل کو احساس ہوا جیسے میرے پاس کائنات کی ساری دولت آ گئی ہو، مگر حیرانی اپنی جگہ تھی۔ یہ سب ہوا کیا۔ ہوش و حواس کے عالم میں ریل میں بیٹھا تھا اور سب کچھ غائب ہو گیا۔ یہ کونسی جگہ ہے اور...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دور سے ایک گھوڑا گاڑی نظر آئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ میرے قریب سے گزر کر وہ مسجد کے سامنے رک گئی۔ اس سے کچھ لوگ نیچے اترے اور کچھ سامان اتارنے لگے۔ پھر کچھ خواتین گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس سے بہت سے گدڑی پوش مرد عورتیں گھوڑا گاڑی کے پاس آ گئے اور ہنگامہ آرائی ہونے لگی، لیکن گاڑی سے اترنے والے چار آدمیوں نے انہیں دھکے دے کر پیچھے ہٹایا اور پھر شاید ان کے کہنے سے وہ قطار بنا کر بیٹھ گئے۔ میں دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ انہیں شاید کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ میرے پیٹ میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ شدید بھوک کا احساس ہوا مگر قدم اس طرف نہ اٹھ سکے۔ میں خاموشی سے ادھر دیکھتا رہا۔ اچانک ایک آدمی میری طرف بڑھا اور قریب آ گیا۔

''ناشتہ لے لو بابا جی۔ ادھر قطار میں آ جاؤ۔'' ایک دم سے دل میں انا جاگی۔ میں فقیر تو نہیں ہوں مگر ذہن نے فوراً ٹوکا۔ رزق ٹھکرانا گناہ ہے اور جھوٹی انا دشمنی۔ رزق کے لینے کے لیے بڑھنے والے ہاتھ انسان کے سامنے نہیں اللہ کے سامنے پھیلتے ہیں۔ اٹھا اور اس شخص کے ساتھ چل پڑا...... کمبل جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے جسم کا صاف ستھرا لباس چھپا رہا، فراست کے پہنے ہوئے کپڑے تھے، قیمتی اور خوبصورت۔ ان لوگوں نے دیکھ لیا تو کیا سوچیں گے۔ اس لیے کمبل اور سنبھال لیا۔ اس شخص نے مجھے بھی قطار میں بٹھا دیا۔ حلوہ پوریاں اور ترکاری تھی۔ یہ چیزیں بڑے بڑے تھالوں میں سجی ہوئی تھیں۔ ڈھاک کے پتوں کے دونے بنے ہوئے تھے۔ ایک شخص تھال سنبھالے ہوئے تھا۔ دو اس کے پیچھے تھے۔ دونوں جوان لڑکیاں جو قیمتی پوشاک پہنے ہوئے تھیں تھال کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایک لڑکی دونے اٹھا کر دوسری کو دیتی اور دوسری یہ دونے فقیروں کو دے دیتی۔ غالباً یہ خیرات دوسری لڑکی کے ہاتھوں تقسیم کرائی جا رہی تھی۔ تھال خالی ہوتا تو دوسرا تھال گھوڑا گاڑی سے آ جاتا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب پہنچتے جا رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں بے حد خوبصورت تھیں۔ میں نے ایک نگاہ ان پر ڈال کر جھکائی مگر اس سرسری نگاہ ہی سے مجھے ایک انوکھا احساس ہوا۔ میں نے کچھ دیکھا تھا...... اور جو کچھ دیکھا تھا ناقابل یقین تھا۔ گہرے کالے رنگ کا ایک ناگ ایک لڑکی کے جسم کے گرد بل ڈالے لپٹا ہوا تھا۔ وہ بہت لمبا اور پتلا تھا۔ اس کا نچلا حصہ لڑکی کی کمر سے لپٹا ہوا تھا اور باقی بدن بل کھاتا اوپر چلا گیا تھا۔ اپنے اس شبے کو یقین کی شکل دینے کے لیے میں نے جلدی سے گردن اٹھائی، اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ دونوں اب میرے سامنے تھیں۔ دونے لڑکی کے ہاتھ میں تھے اور وہ مجھے دینے کے لیے جھک رہی تھی۔ میں نے اس بار سانپ کو بخوبی دیکھ لیا، اس کا پھن لڑکی کے سر کے اوپر رکھا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک دم انسانی کمزوری کا غلبہ ہوا۔ لڑکی جھکی تو میں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

''سانپ، سانپ۔''

دونے لڑکی کے ہاتھ سے نیچے گر گئے اور ان کا سامان بکھر گیا۔ سب چونک پڑے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی متوحش ہو گئی تھیں۔

''کہاں ہے سانپ...... کیسا سانپ؟'' تھال سنبھالنے والوں نے کپکپاتے ہوئے بمشکل تھال سنبھال کر نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ......'' میں انگلی سے سانپ کی طرف اشارہ کر کے ایک دم کھڑا ہو گیا۔ سانپ کا اونگھتا ہوا سر جنبش کرنے لگا۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور اس کی ننھی سرخ چنگاریوں جیسی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔ ان میں کینہ توزی کی جھلک

تھی۔ میرا اشارہ چونکہ لڑکی کے جسم کی طرف تھا اس لیے ان لوگوں نے لڑکی کو بھی دیکھا۔ پھر ایک بولا۔

''پاگل لگتا ہے۔ اٹھا یہ رزق...... سب کچھ گرا دیا۔''

''تم لوگ...... تم لوگ۔'' میرے منہ سے نکلا۔ میرے چہرے سے کمبل سرک گیا تھا۔ دوسری لڑکی نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر سے دونے اٹھا کر تقسیم کرنے والی لڑکی کو دے کر بولی۔

''لو مہر، زمین پر گری چیزیں خراب ہو گئی ہیں اور دے دو۔'' میں شدت حیرت سے گنگ ہو گیا۔ یہ لوگ لڑکی کے جسم سے لپٹے سانپ کو دیکھ نہیں پا رہے یا......! اس بار دونے میرے ہاتھوں میں آ گئے تھے مگر میں نے کچھ پیچھے ہٹ کر انہیں لیا تھا۔ وہ آگے بڑھ گئیں مگر میں پاگلوں کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ یا الٰہی یہ کیا قصہ ہے۔ کالے سانپ نے لڑکی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور یہ لوگ نہ تو اس سے خوف کھا رہے ہیں اور نہ اسے کوئی اہمیت دے رہے ہیں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تقسیم کرنے والے آخری فقیروں کو بھی ناشتہ دے چکیں تو واپس پلٹیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا میں اسی طرح دونے پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس بار انہوں نے مجھے ہمدردی سے دیکھا تھا۔ سب گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئے اور کوچوان نے اپنی جگہ سنبھال لی۔

''ابے پیٹ بھرا ہوا ہے کیا پہلوان۔'' میرے برابر بیٹھے ہوئے فقیر نے للچائی ہوئی نظروں سے میرے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایں......! میں چونک پڑا۔

''میرے کو دے دے خلیفہ، کلن کا پیٹ چار پوریوں سے نہیں بھرنے کا۔ دے دے استاد اللہ تیرا بھلا کرے گا۔'' اس نے لجاجت سے کہا اور میں نے دونے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''ارے ارے، کھانے دے اسے کلن، اللہ تیرا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔'' قریب بیٹھی ایک عورت نے کہا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے جو جلدی سے نیچے گری ہوئی پوریاں اور حلوہ اٹھا کر بھاگے۔

''اے بی تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ اپنی خوشی سے دیا ہے اس نے، آئیں کہیں سے بی ہمدرد۔ کلن نے پوریوں کے نوالے بناتے ہوئے کہا۔ اسی وقت دوسرا فقیر چیخا۔

''لو اور ناشتہ آ رہا ہے کلن استاد......'' گھوڑا گاڑی پھر واپس آ رہی تھی۔ کلن نے سرگوشی میں کہا۔

''میاں بھائی۔ تیرے کو اگر ضرورت نہیں ہے تو میرے لیے لے لیجیو۔ اللہ تجھے خوش رکھے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' گھوڑا گاڑی کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اس بار اس سے عورتیں نیچے نہیں اتری تھیں بلکہ ایک بھاری جسامت کا دراز قامت شخص نیچے اترا تھا۔ اس کے جسم پر قیمتی شیروانی تھی، چوڑی دار پاجامہ، سیاہ وارنش کے پمپ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے ہی دونوں آدمی بھی نیچے اترے تھے جو پہلے تھال اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اس طرف بڑھنے لگے۔ کلن نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے لو، پھوٹ لے خلیفہ...... کوئی اور چکر ہے نکل لے، نکل لے۔'' وہ جلدی سے اٹھا اور پیچھے کھسک گیا۔

✦✤✦✤✦

شیروانی والا شخص پر وقار چال چلتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔ ان دونوں افراد نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ دوسرے فقیر ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے۔

''آپ ناشتہ نہیں کر رہے میاں صاحب۔'' پُر رعب شخص نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایل لو، کیسے ناشتہ کرے بے چارہ، وہ کالیا کلن جو چار سو بیسی کر کے اس کا ناشتہ لے گیا۔ بے چارے کو اور دے دو میاں جی بھوکا ہے۔'' عورت نے سفارش کی۔

''آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتا ہوں میاں صاحب، غریب خانے تک زحمت کرنی ہوگی۔''

''مم میں...... وہ...... وہ۔'' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''بعد میں آپ جہاں حکم دیں گے وہاں پہنچا دیا جائے گا، خدارا انکار نہ کیجیے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ میاں فتح محمد کوئی تانگہ کر کے میاں صاحب کو احترام سے گھر لے آؤ۔ وہ دیکھو، وہ خالی تانگہ گزر رہا ہے۔'' اس شخص نے ایک سمت اشارہ کیا، اور دوسرا آدمی تانگے کی طرف دوڑ گیا۔ میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ تقدیر کے فیصلے اہم ہوتے ہیں۔ ہر تحریک کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ آخر مجھے کسی کام کے لیے ہی یہاں بھیجا گیا ہے اور کام...... وہ تو شاید میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

تانگہ آ گیا، اس شخص نے مجھے اپنے سامنے تانگے میں سوار کرایا۔ دونوں ملازم نما آدمی بھی تانگے میں بیٹھ گئے اور شیروانی والے نے تانگے والے سے کہا ''ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔''

''جی سرکار عالی۔'' تانگہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے چلتا رہا۔ میں دونوں طرف بنی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی بڑا شہر تھا مگر میرے لیے اجنبی تھا۔ اپنا تجسس نہ روک سکا اور پوچھ بیٹھا۔

''یہ کونسا شہر ہے بھائی......'' میرے قریب بیٹھے دونوں ملازم چونک پڑے۔'' تانگے والا بے اختیار بول پڑا۔''

''دلی ہے بھائی میاں، کہیں باہر سے آئے ہو۔''

''تم تانگہ چلاؤ شیخ جی، میاں صاحب کا بھیجہ ٹلا ہے۔'' فتح محمد نے کہا اور دوسرا ملازم اسے گھورنے لگا۔

''تیری کترنی کبھی قابو میں نہیں آئے گی، فتے چپکا بیٹھ......''

''اماں تو مرچی کائے کو چبارے ہو، میں نے کیا کر دیا؟'' فتح محمد نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''بس تو چپکا بیٹھا رہ......''

''کمال ہے۔ عمر قید نہیں۔ کائے کو میرے اوپر حکم چلاتے رہتے ہو، تمہارا دبیل ہوں؟''

''لڑنا بری بات ہے بھائی تحمل سے کام لو......'' میں نے انہیں ٹوکا۔

''ابے لے، بول پڑے مرلی داس، میاں بھائی سب تمہارا کیا دھرا ہے۔'' فتح محمد نے کہا۔

''میرا؟''

''تو اور کیا میاں بھائی، وہ سانپ کاں سے نظر آ گیا تمہارے کو......''

''سانپ۔'' میں آہستہ سے بولا۔

''سن لو بندو خاں صاحب، میاں جی بھول گئے، اور سناؤ بڑے میاں صاحب کو سانپ کی کہانی۔''

''خدا کے لیے چپ رہو۔ گھر جا کر بات کر لینا۔'' دوسرے ملازم نے کہا۔

''یہ شہر دہلی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اماں تم کیا بارہ بنکی سے آئے ہو۔''

''ہاں، میں یہاں اجنبی ہوں۔''

''کاں کے رہنے والے ہو۔'' فتح محمد بولا۔

''چندوسی سے آیا ہوں۔''

''تو یہ نہیں پتا کہ دلی میں اترے ہو۔ ابے بھائی میاں کیا ہوائی جہاز سے گر گئے تھے۔''

''نہیں بس یونہی۔'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''دلی میں ہو پہلوان اور فتح پوری کی جمعہ مسجد پر بیٹھے تھے۔ اب سمجھ میں آ گئی مگر وہ سانپ کاں سے نظر آ گیا تمہیں۔''

فتح محمد بولنے کا مریض تھا......!

''وہ کون صاحب ہیں جو شیروانی پہنے ہوئے تھے؟''

''شیخ عبدالقدوس اچھے نواب بہت بڑی سرکار ہے۔ آدھی دلی ان کی ہے اللہ کے فضل سے۔'' فتح محمد بولا۔

وہ دونوں لڑکیاں کون تھیں......؟'' میں نے پوچھا۔
''ایک مہر النسا، شیخ صاحب کی چھوٹی بٹیا اور دوسری......''
''فتح محمد قسم کھا رہا ہوں اچھے نواب سے تیری شکایت ضرور کروں گا۔ رستے میں بک بک کیے جا رہا ہے یہ کوئی اچھی بات ہے۔'' ملازم بندو خان نے کہا اور فتح محمد برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔
میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی لیکن حالات کا کچھ اندازہ ضرور ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی میرے لیے معمہ بنی ہوئی تھی جس کے جسم پر میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں سانپ لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر دوسرے اس سے لاعلم تھے۔ کیوں آخر کیوں پھر ایک قدیم طرز کی شاندار حویلی کے احاطے کے سامنے تانگہ رک گیا۔ گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو گئی تھی۔ ہم تانگے سے نیچے اتر آئے۔ گھوڑا گاڑی کی سواریاں اندر چلی گئی تھیں۔ شیروانی والے شیخ صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے پاس ایک اور شخص کھڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر اچانک میرے دماغ میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ چہرہ، یہ چہرہ میں پہچان گیا تھا۔
یہ وہی نواب قسم کا آدمی تھا جسے میں نے اس وقت دیکھا تھا جب لوگ مجھے رتنا کہتے تھے۔ اسی شخص کے ساتھ میں نے ماموں ریاض کو شکنتا کے کوٹھے پر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور بعد میں یہ مجھے نہیں مل سکا تھا۔ مجھے اس کا نام نہیں یاد تھا مگر اتنا پتا چلا تھا کہ یہ لوگ الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ان لوگوں کا کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ آہ کیا ماموں ریاض بھی اس کے ساتھ ہیں۔ شیخ عبدالقدوس احترام سے آگے بڑھے اور بولے۔
''تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں قبلہ! دلی آرزو ہے کہ ایک مختصر وقت کے لیے مجھے شرف میزبانی بخشیں۔''
''آپ کو کوئی کام ہے ہم سے۔'' میں نے پوچھا۔
''اس حقیقت سے انکار کر کے جھوٹ بولنے کا جرم نہیں کروں گا۔'' شیخ صاحب بولے۔
''اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم آپ کے کسی کام آسکتے ہیں تو ہم حاضر ہیں۔ اگر آپ کا کام ہم سے نہ ہو سکے تو ہمیں مجرم قرار نہ دیجیے گا۔''
''وہ میری تقدیر ہوگی۔ آپ کے قدموں کی برکت ہی سے فیضیاب ہو لوں گا۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ پھر فتح محمد سے بولے۔ ''میاں فتح محمد! میاں صاحب کو مہمان خانے لے جاؤ اور عزت و احترام سے وہاں قیام کراؤ۔ تمہاری خدمات ان کے لیے ہیں، انہیں کوئی تکلیف ہوئی تو سزا پاؤ گے۔''
''جی سرکار۔'' فتح محمد نے خم ہو کر کہا۔ پھر میرے سامنے گردن جھکا کر بولے۔ ''آئیے میاں صاحب!'' میں شانے ہلا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ مہمان خانہ حویلی کے بغلی حصے میں تھا۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ بھی دوسری سمت سے تھا۔ اس طرف آم اور شریفے کے درختوں کی بھرمار تھی۔ تین چوڑی سیڑھیاں عبور کر کے ایک عریض دالان آیا اور فتح محمد نے دالان میں بنے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا۔
''سب سے بڑھیا کمرہ دے رہا ہوں میاں صاحب! تمہارے کو قسم اللہ کی نصیب کھل گئے تمہارے تو۔ ابھی چار دن پہلے نواب مینڈو گئے ہیں۔ اس کمرے سے جاتے ہوئے سو روپے دے گئے تھے میرے کو، کہنے لگے میاں فتح! جب بھی یاں سے نوکری چھوڑو، میرے پاس آ جائیو نہال کر دوں گا۔ ویسے بھائی میاں! کونسی بینٹی گھما دی تم نے ہمارے شیخ صاحب پر! بڑا دم بھر رہے ہیں تمہارا۔''
''تم واقعی بہت زیادہ بولتے ہو فتح محمد!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میاں صاحب! ہم تو یہ سوچیں ہیں کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور مردہ دلی کو دلی سے باہر نکال پھینکنا چاہیے۔ بالکل ٹھیک کہا ہے مرزا جی نے! میاں ہنس بول کر زندگی گزار لو۔''
''ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔ ایک بات بتاؤ فتح محمد! یہ شیخ صاحب کے ساتھ جو ایک صاحب کھڑے ہوئے تھے، وہ کون تھے؟''

"عتبن میاں!"

"میں ان کا نام نہیں جانتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اے وہ ہاں...... ایل لو...... میاں صاحب! وہ اچھے نواب کی بڑی بٹیا فخر النساء کے ممیا سسر ہیں۔ نام ہے ان کا الیاس خان الہ آبادی امرود...... پیار سے سب لوگ انہیں عتبن میاں کہتے ہیں۔ ایک بات بتاؤں پتے کی۔"

"بتاؤ!"

"بس میاں کھاؤ کماؤ ہیں۔ کبھی اس کے گھر جا پڑے، کبھی اس کے گھر جا پڑے۔ شیخ صاحب بٹیا کے سسرال کا خیال کرتے ہیں۔ اب کوئی بیس دن ہو گئے یاں پڑے ہوئے، کھا رہے ہیں، اینڈ رہے ہیں۔"

"الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔"

"ہاں! بڑی بٹیا کی سسرال الہ آباد میں ہے۔"

"ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"لو ان کے ساتھ اور کون ہوگا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا! بس یار دوست ہیں اور رنگ رلیاں......! اے کیا بتاؤں میاں صاحب!" فتح محمد کی بات ادھوری رہ گئی۔ بندو خان ناشتہ لے آئے تھے۔

"تم میاں باتیں منتھار رہے ہوگے۔ پتا ہے میاں صاحب نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔"

"اماں ہاں...... لو! بھول ہی گیا۔ تم بھی خدمت کر لو میاں صاحب کی۔ ایک سٹے کا نمبر مل گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔" فتح محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ناشتہ بڑے اہتمام سے لایا گیا تھا۔ میری بھوک پھر چمک اٹھی۔ میں خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ بندو خان نے فتح محمد کو کوئی کام بتا کر وہاں سے بھیج دیا تھا۔ خود بندو خان سمجھدار اور سنجیدہ آدمی تھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر وہ برتن اٹھا کر چلا گیا۔ مہمان خانے کا یہ کمرہ بے مثال سجاوٹ کا حامل تھا۔ مسہری بے حد قیمتی تھی، دوسری چیزیں بھی اسی معیار کی تھیں۔ میں گہری سانسیں لے کر ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس پر غور کر رہا تھا۔ چندوسی سے ریل میں بیٹھا تھا۔ کمبل پوش کے الفاظ سنے تھے اور بس! اس کے بعد یہ سب کچھ۔ وہ کمبل اب میرے پاس تھا۔ اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی تھی۔ مگر دل سے سوال کرتا تو جواب ملتا کہ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے اور یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے۔ مجھے اس مقصد کے سامنے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ البتہ دل میں رہ رہ کر الہ آباد کے الیاس خان کا خیال آ رہا تھا۔ اس شخص سے اگر ماموں ریاض کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے تو۔ باہر آہٹیں ابھریں۔ پھر شیخ عبدالقدوس اندر داخل ہو گئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

"مجھے گناہ گار نہ کیجیے میاں صاحب! آپ تشریف رکھیے۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے!"

"حکم فرمائیے۔"

"میاں صاحب! اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس نے آپ کو کیا دولت عطا کی ہے۔ آپ نے میری بچی کو دیکھ کر کچھ سانپ کا حوالہ دیا تھا، وہ کیا تھا؟ تانگے میں بیٹھ کر میرے ملازموں نے یہ تذکرہ کیا تھا اور میرا دل بے اختیار چاہا تھا کہ آپ کو غریب خانے پر زحمت دوں۔"

"وہ خاتون آپ کی صاحبزادی ہیں۔"

"جی! میری دو بیٹیاں ہیں۔ معبود کریم نے یہی دو بیٹیاں عنایت فرمائی ہیں۔ بڑی کے فرض سے سبکدوش ہو چکا ہوں، چھوٹی کے لیے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس مصیبت کا شکار ہو گئی۔"

"وہ مصیبت کیا ہے؟"

"آپ کے سوال کا جواب دینا میرا فرض ہے۔ حالانکہ میرا سوال تشنہ رہ گیا ہے۔ آپ نے اس وقت سانپ، سانپ کیوں کہا تھا؟"

''کیا آپ لوگ ان کے بدن سے لپٹے ہوئے سانپ سے خوف زدہ نہیں ہوتے؟''
''بدن سے لپٹے ہوئے سانپ سے......؟'' شیخ صاحب نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
''ہاں! اس کا پھن ان کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ نیلا، چمکیلا سانپ گہرا سیاہ تھا اور وہ ان کے پورے بدن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔'' میں نے کہا اور شیخ صاحب دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ ''وہ آپ کو نظر آیا تھا؟''
''آپ کو نظر نہیں آتا؟''
''نہیں! ہمیں یہ بصیرت نہیں ملی، حضرت! اب میں آپ کو پوری تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔ مختصر عرض کرتا ہوں۔ میں دہلی کا قدیم باشندہ ہوں، اجداد دور مغلیہ سے یہاں آباد تھے، یہ حویلی بھی اسی دور کی ہے۔ دہلی میں تھوڑی بہت جائیداد اور کاروبار ہے۔ اللہ کے کرم سے عزت سے گزر رہی ہے۔ اولاد نرینہ سے محروم ہوں اور یہی دو بچیاں سرمایۂ حیات ہیں۔ مہرالنساء میری چھوٹی بچی کا نام ہے۔ کوئی آٹھ ماہ پہلے وہ ایک خوش گفتار، ہنس مکھ اور زندگی سے بھرپور بچی تھی۔ اچانک ایک رات وہ خواب کے عالم میں ڈر گئی اور سانپ، سانپ چیخنے لگی۔ ہم سب جاگ گئے اور اسے بیدار کیا تو وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور دہشت زدہ نظروں سے چھت میں لٹکے ہوئے فانوس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ فانوس میں سانپ ہے۔ وہ نیچے لٹکا ہوا تھا اور اس پر گرنا چاہتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ تاہم اس وقت سارے ملازموں کو بلا کر بھاری فانوس اتارا گیا اور اس کے سامنے چکنا چور کر دیا گیا۔ سانپ کہیں نہیں تھا۔ اسے اطمینان تو ہو گیا تھا مگر وہ بدستور سہمی رہی۔ پھر دوسری صبح اس نے اپنی والدہ کو بتایا کہ وہ یہ سانپ کئی دن سے دیکھ رہی ہے۔ کبھی یہ اسے پائیں باغ کے کسی درخت کی جڑ میں بیٹھا نظر آتا ہے، کبھی پھولوں کے کسی کنج میں مگر پھر وہ غائب ہو جاتا ہے لیکن اس کی ننھی، چمکدار آنکھیں اسے نظر آتی رہتی ہیں۔ نذر نیاز کی گئی، صدقے اتارے گئے۔ جو ممکن تھا، کر لیا گیا مگر اسے افاقہ نہ ہوا۔ وہ ملول اور خوف زدہ رہنے لگی۔ دو تین بار اس نے سانپ کا تذکرہ کیا اور پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد بارہا اس سے سانپ کے بارے میں پوچھا گیا مگر اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اس تذکرے پر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ تمام صفات ختم ہو گئیں۔ پہلے وہ بلبل کی طرح چہکتی رہتی تھی، اب بالکل خاموش بلکہ ایک طرح سے نیند کے عالم میں رہتی ہے۔ بس کبھی کبھی وہ اس خول سے نکلتی ہے۔ اس سے کچھ پوچھا جاتا ہے تو رونے لگتی ہے۔ ساتھ ہی کچھ عجیب وغریب واقعات رونما ہوئے ہیں جو ناقابل فہم ہیں۔''
''وہ کیا......؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا اور شیخ صاحب کسی سوچ میں گم ہو گئے جیسے ان عجیب وغریب واقعات کو یاد کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کہا۔
''اس کے کمرے میں خوشبوئیں بکھری رہتی ہیں۔ گلدانوں میں ایسے ایسے حسین پھولوں کے گلدستے سجے نظر آتے ہیں جو شاید پورے ہندوستان میں کہیں نہ ملیں، دہلی تو کیا۔ شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ اس کے لباس کی الماری میں اطلس کا ایک ایسا جوڑا ملا جس میں ہیرے ٹنکے ہوئے تھے۔ وہ آدھی آدھی رات کو باغ میں چلی جاتی ہے اور وہاں بیٹھی رہتی ہے۔ بس ایک بار رات کا چوکیدار اسے دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا تھا دوسری صبح وہ بے ہوش ملا اور پھر پاگل ہو گیا۔ ایسے ہی کچھ اور واقعات!''
''انہوں نے سانپ کا تذکرہ دوبارہ نہیں کیا۔''
''نہیں! اس کے بعد نہیں۔''
''آپ لوگوں نے ان کے پاس کسی سانپ کو نہیں دیکھا؟''
''کبھی نہیں!''
''آج کل بھی نہیں؟''
''بالکل نہیں۔''

''آپ نے انہیں کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟''
''میرے خاندان کے بزرگوں نے منع کر دیا۔''
''کیوں......؟''
''ان کا کچھ اور خیال ہے۔''
''کیا......؟''
''مجھے منع کیا گیا ہے کہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہوں۔''
''آٹھ ماہ سے ان کی یہ حالت ہے۔''
''ہاں......لگ بھگ!''
''کوئی ایسا واقعہ جس کا رابطہ ان واقعات سے کیا جا سکے؟''
''ہاں!'' شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔
''بتایئے۔''

''دہلی سے کچھ فاصلے پر غازی آباد ہے۔ غازی آباد میں بھی میری زمینیں اور جائیداد ہے۔ وہیں ایک قدیم حویلی بھی ہے جو کوئی سو سال سے ویران پڑی ہے۔ ایک ہندو بنئے نے اس پر اپنا حق جتا دیا اور ہمارے درمیان مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ میں وہ مقدمہ جیت گیا۔ مقدمے کے دوران حویلی سیل کر دی گئی تھی۔ مجھے اس کا قبضہ دیا گیا اور چونکہ یہ تنازع عرصے سے چل رہا تھا اس لیے جب ہم قبضہ لینے گئے تو تمام گھر والے ساتھ تھے۔ مہر النساء بھی تھی۔ حویلی تباہ حال پڑی ہوئی تھی، جھاڑ جھنکاڑ سے بھری ہوئی۔ میں نے ایک کمرہ صاف کرایا اور ہم نے ایک رات وہاں قیام کیا تھا۔''

''جی۔ پھر......؟''
''بس! اس کے بعد ہی مہر النساء کی یہ کیفیت شروع ہو گئی۔''
''اس رات کے قیام میں کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔''
''بالکل نہیں۔ خوشگوار چاندنی رات تھی۔ بچے صاف ستھرے علاقے میں ساری رات آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔''
''آپ نے کسی عالم سے رجوع کیا؟''

''نہیں! دراصل میرا ذہن کچھ مختلف ہے۔ اس بارے میں، میں نے اپنے اہل خاندان سے اختلاف کیا ہے مگر اب۔ اور پھر میاں صاحب! آپ نے براہ راست مجھے متاثر کیا ہے۔ ایسے کام میں کرتا رہتا ہوں۔ اس کا صدقہ اتارتا رہتا ہوں، کھانا وغیرہ اس طرح تقسیم کرتا رہتا ہوں جس طرح آج آپ نے دیکھا۔''

''میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''آپ بہتر سمجھتے ہیں میاں صاحب! اللہ کا حکم ہوا ہے تو آپ میری مدد کریں۔ وہ بچپن سے اپنے پھوپھی زاد بھائی سے منسوب ہے۔ میری بہن، بہنوئی یورپ میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان طے ہے کہ ہم دونوں بچوں کی شادی کریں گے۔ سلطان میاں کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔''

''صاحبزادی اپنے منگیتر سے مطمئن ہیں؟''

''اس نے خالص مشرقی ماحول میں میری والدہ سے تربیت حاصل کی ہے اور مشرقی لڑکیاں صرف اتنا سوچتی ہیں جتنا انہیں بتایا جائے۔ اس کی اداسی اور غم آلود کیفیت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اسے اپنے مستقبل کا خیال ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ نہ میں عالم تھا، نہ درویش! ان حالات پر اپنا تبصرہ کیا کرتا۔ مجھے تو رہنمائی درکار تھی۔ سوچنے لگا کہ شیخ صاحب کو کیا جواب دوں۔ بالآخر کہا۔

''قبلہ شیخ صاحب! میں آپ سے اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں خود بھی ایک ناواقف انسان ہوں۔ ہاں اس

اعتراف سے گریز کر کے جھوٹ کا مرتکب نہ ہوں گا کہ میں نے مہرالنساء کے جسم سے ایک پتلا، لمبا سانپ لپٹے ہوئے دیکھا تھا جس کا پھن ان کے سر پر رکھا ہوا تھا، اسی لیے ناشتے کے دونے میرے ہاتھ سے گر گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ آپ سب لوگ بھی اسے دیکھ رہے ہوں گے مگر اللہ کا حکم! اگر اس نے مجھے یہ بینائی بخشی ہے تو اس کی کچھ وجوہ بھی ہوں گی۔ میں دہلی میں نووارد ہوں، چندوسی سے آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے خدا کے نیک بندوں سے فیض حاصل کرنے نکلا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس بارے میں، میں کوئی خدمت سرانجام دینے میں کامیاب ہوجاؤں۔ آپ کے در دولت پر چند روز قیام کا خواہشمند ہوں۔ دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ درکار نہ ہوگا۔ اگر بزرگان دین سے کچھ رہنمائی حاصل ہوئی تو یہاں ٹھہروں گا ورنہ آپ سے اجازت لے کر چلا جاؤں گا۔ خدارا مجھے ایک گناہ گار انسان کے سوا کچھ تصور نہ فرمایئے گا۔ ہوسکتا ہے صاحبزادی کی صحت یابی کی سرخروئی مجھے عنایت ہوجائے۔"

"سبحان اللہ۔ میاں صاحب! آپ کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ جسے عاجزی اور انکساری کی دولت مل جائے، اس سے زیادہ امیر کون ہوسکتا ہے ورنہ یہاں تو دو ٹکوں پر اچھلنے والوں کی بہتات ہے۔ آپ کا قیام میرے لیے بڑی ڈھارس کا باعث ہوگا۔ آپ یہاں قیام فرمایئے، میں آپ کا احسان مانوں گا۔ ویسے حضور! کوئی نام تو ہوگا آپ کا؟"

"جی! آپ مجھے مسعود احمد کہہ سکتے ہیں۔"

"جس شے کی حاجت ہو، ارشاد فرما دیجیے گا۔"

"شکریہ! مہرالنساء بیگم سے ملتے رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے ان کے لیے بھائی کا درجہ دیا جائے اور حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کی اجازت بھی!"

"سب کو ہدایت مل جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

"مہرالنساء پر کسی بھی وقت کوئی خاص کیفیت طاری ہو، مجھے ضرور اطلاع دیجیے گا۔"

"بہت بہتر۔ ویسے آپ چاہیں تو ابھی اس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ نور جہاں میری بھتیجی ہے اور مہر کے ساتھ رہتی ہے۔ اسے سب سے زیادہ مہر سے لگاؤ ہے میں اسے بھی ہدایت کردوں گا۔"

"ابھی کچھ توقف فرمایئے، بعد میں ان سے ملاقات کرلوں گا۔" میں نے کہا اور شیخ صاحب اٹھ گئے۔ رخصتی الفاظ ادا کر کے وہ باہر نکل گئے اور میں احمقوں کی طرح دروازہ دیکھتا رہ گیا۔ کیا میں اس سلسلے میں کچھ کرسکوں گا، مگر کیسے۔ میرا عمل کیا ہونا چاہیے۔ بابا فضل میں نابینا ہوں، میں کچھ نہیں جانتا۔

"آرام بڑی چیز ہے، منہ ڈھک کے سویئے۔" میرے کانوں میں آواز ابھری اور میں اچھل پڑا۔ آواز اتنی صاف تھی کہ کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا اور یہ آواز...... یہ آواز! میری نگاہ اس کمبل کی طرف اٹھ گئی۔ اس کمبل کا ان الفاظ سے گہرا تعلق تھا۔ مگر اس وقت پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس طرح آیا کہ میں خود کو اس سے باز نہ رکھ سکا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمبل کو بڑے احترام سے اٹھا کر مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ مسہری پر دراز ہوکر میں نے کمبل اوڑھ لیا۔ تاریکی پھیل گئی۔ سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا مگر میں صبر و سکون سے لیٹا رہا۔ پھر اچانک میری نظروں میں روشنی کا ایک نکتہ ابھرا۔ یہ نکتہ رفتہ رفتہ پھیل رہا تھا۔ پھر احساس ہی نہ رہا کہ میں کہاں ہوں، کس حال میں ہوں۔ میرے اطراف تیز روشنی تھی اور اس روشنی میں، میں بہت کچھ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔ میرے ذہن کے دریچے کھلتے جارہے تھے اور ان دریچوں جانے کیا کیا تھا۔

دروازہ زور زور سے پیٹا گیا تو میں جاگا اور آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مہمان خانہ ہی تھا۔ میں مسہری پر تھا اور دروازہ مسلسل پیٹا جارہا تھا۔ کمبل احترام سے تہہ کر کے میں نے ایک طرف رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ فتح محمد تھا۔

"اماں بھائی میاں روٹی نئیں کھاؤ گے کیا، ڈیڑھ بج رہا ہے۔ اماں گھوڑے بیچ کر سو گئے تھے کیا؟"

''نہیں فتح محمد! کھانا لے آئے ہو کیا؟''

''اماں کھانا لانے میں کونسی دیر لگے گی، ابھی لائے۔'' فتح محمد نے کہا اور چلا گیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ جو کیفیت طاری ہوئی تھی، وہ نیند نہیں تھی بلکہ کچھ اور تھا اور اس میں جو کچھ بتایا گیا تھا، اس نے مجھے بہت اعتماد بخشا تھا۔ کھانے کے بعد فرصت تھی۔ کچھ دیر آرام کیا پھر غسل کر کے لباس سلیقے سے پہنا۔ فراست کا دیا ہوا یہ لباس قیمتی تھا۔ مجھے وہ حلیہ بنانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی جو درویشوں اور گوشہ نشینوں کا ہوتا ہے۔ کہا گیا تھا۔

''وہ روپ ہوتا ہے، بہروپ نہیں۔ اور روپ ملتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ جذب کی وہ منزل عمر نا تمام کی گرفت میں نہیں ہاں کسی مرد حق کی نظر ہو جائے۔ سو جو بہروپ بھرتے ہیں، وہ جھوٹے ہوتے ہیں اور جھوٹ سے ہمیشہ خسارہ ہوتا ہے۔ سو دنیا کو دنیا داروں ہی کی طرح گزارنا بہتر ہے اور بہروپ بھرنا گناہ!'' تب میں نے سوچا کہ مجھے دوسرے لباس بھی درکار ہیں اور میرے ہاتھ، پاؤں مضبوط۔ کسی کے چھوٹے موٹے کام کے لیے اس کے در پر جانا پڑتا۔ رزق حلال کا حصول تو نہیں۔ اس کے لیے تو بساط بھر محنت کرنی ہوتی ہے۔ لیکن ابھی کچھ ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ اس کے بعد یہ سوچوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔''

شام کے چھ بجنے والے تھے۔ مہمان خانے سے نکلا اور حویلی کے باغ کی بہار دیکھتا ہوا درختوں کی آڑ میں دور نکل آیا۔ تب ایک برگد کا قدیم درخت نظر آیا جو کوئی سو سال پرانا ہوگا۔ اس کی داڑھیاں بے شمار تھیں اور نیچے آ کر زمین کی گہرائیوں میں اتر گئی تھیں مگر مجھے جس شے نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ ایک زنگ خوردہ کلسا تھا جو تانبے کا بنا ہوا تھا اور زنگ تانبہ کھا گئی تھی مگر کلسے میں سونا چمک رہا تھا۔ کلسا چمکدار سونے کی گنیوں سے بھرا ہوا تھا اور یہ مال تھا زمانہ قدیم کے ایک سود خور بنئے کا جس نے ہر اچھے برے ذریعے سے اسے جمع کیا اور یہاں دفن کر دیا مگر وہ اسے استعمال نہ کر سکا اور مر گیا اور اب اسے کسی کی ملکیت بن جانا چاہیے مگر میری نہیں۔ نہ ہی میرے دل میں اس کی طمع پیدا ہوئی تھی مگر میں نے پاؤں سے اس جگہ کو کرید کر دیکھا اور اندازہ ہو گیا کہ کلسا گہرائی میں ہے۔ پھر کچھ باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں اور گردن گھوم گئی۔ وہ دونوں اسی طرف آ رہی تھیں اور زیادہ دور نہیں تھیں۔ میں نے انہیں پہچان لیا اور انہوں نے مجھے مگر وہ خود میری طرف بڑھ آئی تھیں۔ اور اس وقت مہرالنساء سانپ کی گرفت میں نہیں تھی۔

''لو دیکھ لو یہی ہیں۔'' نور جہاں نے شوخی سے مسکرا کر کہا اور مہرالنساء نے اسے ٹہوکا دیا۔ ''مجھے کیوں پیٹ رہی ہو۔ خود ہی تو دیکھنا چاہ رہی تھیں مگر کمال ہے اس عمر میں فقیری! مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔ کیوں جناب شاہ صاحب! آپ کچھ بتائیں گے؟''

''کیا بتاؤں......؟''

''نہیں تو پہچان لیا ہوگا آپ نے؟'' نور جہاں نے مہرالنساء کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی ہاں!''

''اس وقت ہم نے بھی آپ کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر بعد میں آپ کی بڑی تعریفیں سنیں۔ وہ تعریفیں سچ ہیں یا کوئی اور قصہ ہے؟''

''قصہ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس وہی کہ اک محلے میں تھا ہمارا گھر۔ وہیں رہتا تھا ایک سوداگر یعنی مثنوی زہر عشق۔ یا پھر زیب النساء اور عاقل خان والا معاملہ۔'' نور جہاں بہت تیز اور شوخ تھی۔

''اتنی بے لگامی اچھی نہیں ہوتی نور جہاں!'' مہرالنساء نے واپس ہوتے ہوئے کہا۔

''سنو تو، ارے رکو تو۔'' نور جہاں نے کہا۔ مگر مہرالنساء تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ مجبوراً نور جہاں کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔ میں خاموشی سے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور دوبارہ اس وقت چونکا جب ایک درخت کے عقب سے

تالیاں بجنے کی آوازیں سنیں۔ دیکھا تو الیاس خان، فتح محمد کے ساتھ نظر آئے اور درخت کے عقب سے نکل کر میرے پاس پہنچ گئے۔

''سڑکوں پر بھیک مانگنے والے بھی بعض اوقات بڑے ذہین نکل آتے ہیں جیسے ہمارے شاہ صاحب! مگر تمہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نور جہاں سچ کہہ رہی تھی۔'' میں نے الیاس خان کو دیکھ کر سلام کیا۔ اس شخص سے میں بھی راہ رسم چاہتا تھا۔

''جیتے رہو، جیتے رہو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔'' الیاس خان مکارانہ سے بولا۔ صورت سے ہی شاطر آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''کیسے مزاج ہیں خان صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''میاں! ہم تو سدا بہار ہیں مگر تمہارا چکر ذرا سمجھنے سمجھانے کا ہے۔'' الیاس خان صاحب نے معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں خان صاحب!''

''خیر سمجھ تو سب کچھ گئے ہوگے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مگر سنو! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ بڑے چکر چلا چکے ہیں خود بھی جوانی کی عمر کا اندازہ ہے ہمیں! یہ عمر ایسے ہی کھیل کھیلنے کے لیے ہوتی ہے مگر کسی سمجھدار کو رازدار بنا لینا اچھا ہوتا ہے۔ کیا چکر ہے جان من؟'' الیاس خان نے ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا اور میں بھی مسکرا دیا۔

''گو آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن سمجھنا چاہتا ہوں۔''

''ملی بھگت چل رہی ہے، کس سے! نور جہاں سے یا مہر النساء سے؟''

''اوہ یہ بات ہے۔ نہیں خان صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کا یہ خیال غلط ہے۔''

''دیکھو میاں! جب آدمی بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرے تو اگلے کو بھی غصہ آسکتا ہے اور پھر یہ تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا فتح محمد سے، فتح محمد نے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہمارے بارے میں بھی پوچھ رہے تھے۔ تو یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ اس گھر میں ہماری رشتے داری ہے دور کی سہی۔ مگر آتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور پھر بیچارے اپنے شیخ عبدالقدوس اللہ میاں کی گائے ہیں بلکہ اللہ میاں کے بیل! ایک منٹ میں ہر ایک پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ ملی بھگت کی بات ہے اور کوئی کھیل کھیل رہے ہو۔ صورت سے بھی فقیر نہیں معلوم ہوتے، یہ سوٹ بھی بڑھیا پہنا ہوا ہے، حلیہ بگاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں لیکن یاروں سے یاری کرنا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ یہ فتح محمد تو باؤلا ہے، کہنے لگا کہ خان صاحب ذرا شاہ جی سے بات چیت کر کے سٹے کا نمبر معلوم کریں، اسی لیے پیچھے لگا آیا تھا۔ ہم نے تمہیں مہمان خانے میں دیکھا اور پھر اس طرف آتے ہوئے تب پتا چلا کہ صاحبزادے کوئی دوسرا ہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ رازدار بنا لو، فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔'' میں بدستور مسکراتا رہا۔ میں نے کہا۔

''خان صاحب! سٹے کا نمبر معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ......؟''

''پہلے تو یہی سوچا تھا کہ فتح محمد کی بات پر یقین کر لیں مگر اب جو کچھ سامنے آیا ہے، وہ کچھ اور ہے۔''

''ہوں! آپ سے اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں کرنی ہیں مجھے خان صاحب!''

''ابے دیکھا، بھائی فتے بھیا! اپنی عمر سے اونچی اڑان اڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہم نے بھی اچھے اچھوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ چلو بولو کیا بات ہے، کیا قصہ ہے، ہوسکتا ہے ہم کام آہی جائیں۔''

''تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''چل بے فتح محمد پھوٹ لے اور سن زبان بند رکھیو۔ ورنہ تو جانتا ہے الیاس خان کو۔''

''نہیں خان صاحب! ہم تو نوکر ہیں آپ کے جی! مجال ہے قسم اللہ کی کہ ادھر سے ادھر ہو جائیں، مگر ایک وعدہ کر لینا بھائی میاں! کچھ ہاتھ لگے تو اس میں تھوڑا سا حصہ ہمارا بھی ہونا چاہیے۔''

''اب جاتا ہے یا لگاؤں لات!'' الیاس خان نے کہا اور فتح محمد ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ الیاس خان ایک بینچ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''آؤ پہلوان! بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو۔ صورت شکل سے بھی، حلیے اور لباس سے بھی! کیا چکر تھا مہرالنساء سے کوئی معاملہ چل رہا ہے یا نورجہاں سے! ویسے آدمی ذہین ہو۔ سانپ والا قصہ سن لیا ہوگا کہیں سے اور عین موقع پر پوبارہ کردیے اور شیخ عبدالقدوس تمہیں یہاں لے آئے۔''

''خان صاحب! میں آپ کو جانتا ہوں۔'' میں نے کہا اور الیاس خان چونک پڑے۔ چند لمحات میرا چہرہ دیکھتے رہے پھر بولے۔

''فتح محمد سے پوچھا ہوگا میرے بارے میں؟''

''نہیں! میں نے آپ کو شکتی پور میں دیکھا تھا۔''

''کہاں......؟'' خان صاحب چونک کر بولے۔

''شکتی پور میں، شگفتا کے کوٹھے پر! آپ کے ساتھ چند افراد اور تھے اور آپ شگفتا بائی کے ہاں رقص و سرود دیکھنے گئے تھے۔'' الیاس خان صاحب نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دیکھتے رہے پھر ایک دم ہنس پڑے اور بولے۔

''تم وہاں کیا کررہے تھے شہزادے۔''

''آپ کے ساتھ جو افراد تھے، الیاس خان صاحب! میں ان کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ جہاں تک آپ کے اس خیال کا معاملہ ہے کہ میں یہاں مہرالنساء یا نورجہاں کے چکر میں آیا ہوں تو بہتر یہ ہوگا کہ اسے ذہن سے نکال دیجیے۔ میں کوئی فقیر یا درویش نہیں ہوں، ایک گناہ گار بندہ ہوں اللہ کا! بس کبھی کبھی نظر عنایت ہوجاتی ہے شہ داتاؤں کی اور حکم ملتا ہے کہ کسی کا کوئی کام کردیا جائے تو کوشش کرتا ہوں۔''

''یہ وہ کتے کی دم والی بات ہورہی ہے کہ بارہ برس نلکی میں رہی مگر ٹیڑھی کی ٹیڑھی! یعنی اب تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ یہ ہم نے اور تم پھر وہی رام کہانی سنا رہے ہو میں۔'' الیاس خان صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو یقین دلا دوں گا الیاس خان صاحب! لیکن ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو شکتی پور میں آپ کے ساتھ تھے۔''

''چلو ٹھیک ہے مگر تمہاری اس معلومات سے ہمارے اوپر کیا فرق پڑتا ہے، بھائی دنیا دار ہیں، کم از کم فقیر بن کر عشق و محبت کا ناٹک نہیں کھیلتے، جیسے تم کھیل رہے ہو۔ رنگین مزاج ہیں، شوق رکھتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں، کوٹھوں پر جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ پتا چل گیا تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا شہزادے! مگر تم ان لوگوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ان میں ایک صاحب میرے شناسا تھے۔ ان کے بارے میں آپ سے معلومات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا نام تھا......؟'' الیاس خان نے پوچھا۔

''ریاض......!'' میں نے جواب دیا اور الیاس خان سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے بولے۔

''اس دن ہمارے ساتھ رشید خان صاحب تھے، غلام علی تھا، فرید احمد تھے۔ ہاں...... ہاں! یاد آگیا۔ تم منشی ریاض کی بات کررہے ہو، بالکل ٹھیک ہے۔ فرید احمد کے ہاں منشی ہے وہ شخص! فرید احمد ذرا یار باش قسم کا آدمی ہے، نوکروں سے بھی دوستی ہی رکھتا ہے۔ کسی کام سے گئے تھے ہم لوگ شکتی پور، منشی ریاض بھی ساتھ تھا اور جب ہم گانا سننے گئے تو منشی ریاض کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی ریاض نہیں تھا ہمارے ساتھ......!'' میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیا منشی ریاض صاحب، فرید احمد کے ساتھ الٰہ آباد میں رہتے ہیں؟''

''ہاں بھئی فرید احمد الٰہ آباد کا ایک بڑا کاروباری ہے۔ منشی ریاض بہت عرصے سے اس کے ساتھ کام کرتا ہے۔''

''آپ کو کچھ اور بھی معلوم ہے اس شخص کے بارے میں.....؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا اور الیاس خان مجھے گھورنے لگے۔
''اے بے عقل کی بات کرو بھائی! کسی آدمی کے منشی کے بارے میں، میں اس سے زیادہ اور کیا جان سکتا ہوں؟''
''میرا مطلب ہے کہ منشی ریاض اس وقت بھی الٰہ آباد ہی میں ہیں۔''
''جب فرید احمد الٰہ آباد میں ہے تو منشی ریاض الٰہ آباد میں کیوں نہ ہوں گے مگر تمہارا اس شخص سے کیا تعلق ہے؟'' میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ الیاس خان کہنے لگے۔ ''اچھا! اب تو بتا دو کہ قصہ کیا ہے؟''
''اگر کوئی قصہ ہے بھی خان صاحب تو آپ اس میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟''
''تمہارے بھلے کے لیے سمجھے، تمہارے بھلے کے لیے! ہو سکتا ہے ہم تمہارے کسی کام آ جائیں ویسے سچ سچ بتا دو یہ روپ بدلا ہے ناں تم نے یا کچھ جانتے بھی ہو۔''
''ان باتوں کو جانے دیجیے الیاس خان صاحب! آپ اپنی بات کیجیے۔ سٹے کا نمبر معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ.....؟''
''چلو بے وقوف بنانا شروع کر دیا تم نے ہمیں! بتا سکتے ہو تم سٹے کا نمبر.....؟'' الیاس خان نے پوچھا۔
''نہیں! لیکن آپ کی خواہش پوری کر سکتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور الیاس خان چونک پڑا۔
''کیا مطلب.....؟''
''میں آپ کو سٹے سے حاصل ہونے والی رقم یہیں اور اسی جگہ دے سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ایک شرط ہو گی۔''
الیاس خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ غالباً بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''سٹے کا نمبر معلوم کر کے ظاہر ہے آپ سٹہ کھیلیں گے، اس سے آپ کو رقم حاصل ہو گی۔ وہ سب کچھ اگر یہیں مل جائے تو کیا حرج ہے؟''
''کیا آسمان سے دولت برسے گی؟'' الیاس خان کہا۔
''نہیں! زمین سے حاصل ہو گی، لیکن الیاس خان صاحب! آپ پر وہ دولت اس وقت حلال ہو گی جب آپ میرا بھی ایک کام کر دیں۔'' الیاس خان عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پھر کہا۔ ''میں آپ کو ایک چھوٹا سا خزانہ دے رہا ہوں لیکن اس کے بدلے جب آپ الٰہ آباد جائیں تو فرید احمد کے ہاں موجود منشی ریاض سے ملاقات کریں اور ان سے کہیں کہ ایک شخص کچھ عرصے کے بعد آپ سے ملنے آ رہا ہے، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس شخص کا آپ سے ملنا بے حد ضروری ہے، آپ اس کا انتظار کریں، اس کا نام مسعود احمد ہے اور اس کے باپ کا نام محفوظ احمد بتایئے الیاس خان صاحب، آپ میرا یہ کام کر دیں گے؟''
''یہ سب کچھ تو خیر میں کر ہی دوں گا مگر تم وہ دولت والی بات کیا کہہ رہے تھے؟''
''آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میرا یہ کام کر دیں گے؟'' میں نے پھر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا، آنکھوں میں امیدوں کی چمک آ گئی تھی۔ الیاس خان نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کر دیں گے بھائی! کر دیں گے چلو وعدہ کرتے ہیں۔ مگر وہ بات ادھوری رہ گئی۔''
''دولت کی ضرورت ہے؟''
''کس کو نہیں ہوتی؟'' الیاس خان نے کہا۔
''تمہاری ضرورت برگد کے اس درخت کے اس حصے کو کھود کر پوری ہو سکتی ہے جہاں اس کی سب سے چوڑی داڑھی زمین میں پیوست ہو گئی ہے۔''
''کیا مطلب.....؟''
''میاں! تانبے کا ایک کلسا گڑھا ہوا ہے جس میں سونے کی اشرفیاں بھری ہیں۔'' میں نے کہا۔

الیاس خان مجھے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔ ''کیوں بے تکی چھوڑ رہے ہو شہزادے! وہاں اشرفیاں گڑھی ہوئی ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو......'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''وہ تمہارے لیے ہیں۔ لیکن انہیں نکالنے کے لیے مناسب وقت کا تعین کرنا اور پالو تو میری بات کا خیال رکھنا۔ صلے میں مجھے بس وہی چاہیے جو میں نے تم سے کہا ہے۔''

✦✦✦✦✦

''اور اگر نہ پاؤں تو......؟'' وہ بولا۔

''مجھے اپنی پسند کے مطابق سزا دے لینا۔''

''کان کھول کر سن لو شہزادے! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش خطرناک ثابت ہوگی تمہارے لیے میرا نام الیاس خان ہے۔'' اس نے کہا اور میں مسکرا دیا۔ وہ چلا گیا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا اور پھر بستر پر دراز ہوگیا۔ دل کمبخت بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے، یہ سرکشی ضرور کرتا ہے۔ الیاس خان کے ٹل جانے سے نہ جانے کیا امنگیں جاگ اٹھی تھیں۔ ایک بار پھر وہ سارے چہرے آنکھوں میں آبسے تھے۔ ایک بار پھر اسی پر بہار زندگی کے خواب نظر آنے لگے تھے۔ ماموں ریاض نوکری کر رہے ہیں۔ محمود ملک سے باہر ہے۔ ہوسکتا ہے ابوان حالات کا شکار ہو کر صاحب فراش ہوگئے ہوں اور گھر کی ذمہ داریاں ماموں نے سنبھال لی ہوں۔ ایک بار، صرف ایک بار ان لوگوں کے سارے حالات معلوم ہو جائیں۔ اس کے بعد...... اس کے بعد۔

دروازہ زور سے بجا اور سارے خیالات چکنا چور ہوگئے۔ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ بندو خان صاحب تھے۔ سلام کرکے بولے۔ ''وہ حضور اچھے نواب نے سلام کہا ہے۔''

''شیخ صاحب......؟''

''جی! بلایا ہے۔''

''خیریت ہے؟''

''بٹیا کی طبیعت بگڑ گئی ہے، آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''رکو۔ چلتا ہوں۔'' میں نے کہا اور جلدی سے متبرک کمبل شانے پر ڈال کر بندو خان کے ساتھ چل پڑا۔ حویلی کے اس حصے میں پہلی بار داخل ہوا تھا جو قابل دید تھا۔ بندو خان میری رہنمائی کر رہے تھے۔ راستے طے کرتا ہوا اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔ مکمل خاموشی طاری تھی مگر ایک کمرے کے سامنے روشنی میں کئی افراد نظر آئے ان میں خواتین بھی تھیں جنہوں نے دوپٹے سر پر ڈال لیے۔ شیخ صاحب کراہتے ہوئے میرے قریب آگئے۔

''پھر...... پھر حالت بگڑی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا کیفیت ہے......؟''

''آپ کو طلب کیا ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔

''مجھے......؟''

''ہاں! نام لے کر...... کہا بلاؤ اس استاد اعظم کو۔ ذرا اس سے بات کرلوں۔ اس کی یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ میں نے پوچھا کسے تو جواب ملا مسعود کو اور میں نے آپ کو بلا بھیجا۔''

''خوب! مجھے انتظار تھا آیئے۔'' میں نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ حسین خواب گاہ تھی۔ ایک تپائی پر مہر النساء بیٹھی ہوئی تھی۔ دراز گھنے سیاہ بال چھتری کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ دروازے کی طرف پشت تھی اور رخ دوسری طرف تھا لیکن اچانک گردن گھومی اور چہرہ مڑ کر پیچھے ہوگیا۔ بڑا خوفناک انداز تھا۔ یعنی جسم کا رخ دوسری طرف تھا اور چہرہ مکمل میری طرف! مہر النساء کو شام کو بھی دیکھا تھا۔ سبک اور ملیح چہرہ، چمپئی رنگ، نرم و نازک نقوش، گہری سیاہ آنکھیں لیکن اس وقت

جو چہرہ نظر آیا، یہ شام والا چہرہ نہیں تھا۔ خدوخال بگڑے ہوئے تھے، آنکھیں شرربار تھیں اور ان میں نیلاہٹیں جگمگا رہی تھیں۔ رنگ میں تپش تھی۔

''السلام علیکم۔'' میں نے کہا۔ مگر وہ مجھے گھورتی رہی۔ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''کیا والدین نے سلام کا جواب دینا بھی نہیں سکھایا؟''

''وعلیکم السلام۔'' ایک کرخت مردانہ آواز مہر النساء کے منہ سے ابھری۔ میں مسکرا دیا۔ پھر میں نے کہا۔ ''جب ہم ایک دوسرے کی سلامتی کے خواہاں ہیں تو دشمنی کا تصور تو خودبخود مٹ جاتا ہے۔''

''اس دشمنی کی داغ بیل تو تم ڈال رہے ہو۔''

''میں نے تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا۔''

''یہاں سے چلے جاؤ۔''

''یہی مطالبہ میرا ہے۔''

''تم کون ہوتے ہو؟'' وہ مردانہ آواز میں بولی۔

''بندۂ خدا ہوں اور اس بچی کو مشکل سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''اللہ مالک ہے۔''

''سوچ لو۔''

''سوچنا تو تمہیں ہے غلام جلال، مسلمان کے بیٹے ہو، سب کچھ جانتے ہو، تمہیں علم ہے کہ وہ بچپن سے ایک نوجوان سے منسوب ہے۔ نیک والدین کی نیک اولاد ہے اور اس تصور سے دور نہیں ہوسکتی جو بچپن سے اس کے ذہن میں ہے۔ تم اسے کیوں پریشان کر رہے ہو؟''

''بہت کم وقت رہ گیا ہے جب اس کے دل میں میرے سوا کوئی تصور نہیں ہوگا۔''

''یہ تصور نہیں، تسلط کہلائے گا اور اس سے ایک خاندان بدترین المیے کا شکار ہو جائے گا۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''یہ بات شرافت کے منافی ہے۔''

''جو کچھ بھی ہو۔''

''میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''نہ مانوں تو۔''

''خود ذمہ دار ہوگے۔ تم نے مجھے بلایا ہے اور اب جب میرا اور تمہارا آمنا سامنا ہو گیا ہے تو پھر فیصلہ ہی ہو جانا چاہیے۔''

''میں تمہیں فنا کردوں گا۔''

''یہ الفاظ کفر کے مترادف ہیں۔ آؤ ذرا تمہاری قوت کا جائزہ لے لیا جائے۔'' میں آگے بڑھا اور میں نے مہر النساء کے چھتری کی طرح بکھرے بالوں کا کچھ حصہ اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ شیخ صاحب کے ساتھ کچھ دوسری چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ نہ جانے کون کون اندر آ گیا تھا مگر میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں نے شانے پر پڑا کمبل مہر النساء پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی مہر النساء تپائی سے نیچے آ رہی۔ مگر فوراً ہی کمبل کے ایک کھلے ہوئے حصے سے ایک کالے ناگ کا پھن برآمد ہوا اور وہ برق کی سی تیزی سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے پھن اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا مگر میں غافل نہیں تھا۔ میں نے پینترا بدل کر ایک زوردار تھپڑ اس پھن پر رسید کیا اور سانپ اچھل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ کمرے میں ڈری ڈری چیخیں ابھر رہی تھیں۔ سانپ

ایک لمحے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر وہ ادھر ادھر رینگنے لگا جیسے نکل بھاگنے کی راہ تلاش کر رہا ہو۔ میری نظر اس کھلی کھڑکی پر پڑی جو کمرے کی پشت پر تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے، سانپ دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا جیسے اسے نظر نہ آرہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کھلی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اسے پھینکتے ہوئے میں نے کہا۔

''بہتر یہ ہوگا غلام جلال کہ آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، اس میں میرا قصور نہیں ہوگا۔''

میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کیے اور واپس پلٹا۔ پھر میں نے کمبل سمیٹ کر تہہ کیا اور اسے شانے پر ڈال لیا۔ مہرالنساء بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''انہیں مسہری پر لٹا دیں۔'' میری ہدایت کی تعمیل کی گئی۔ عورتیں کمرے میں رہ گئیں۔ شیخ صاحب میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ ان کا بدن کپکپا رہا تھا اور منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ ''خود کو سنبھالیے شیخ صاحب!''

''آپ..... مسعود صاحب! آپ تو میرے لیے امداد غیبی ثابت ہوئے۔ سخت شرمسار ہوں کہ آپ کو وہ مقام نہ دے سکا جو ہونا چاہیے تھا۔ آہ! میں آپ کو آپ کے شایان شان تعظیم نہ دے سکا۔'' شیخ صاحب نے کہا۔

''گناہ گار نہ کریں شیخ صاحب! مجھے اور کیا درکار تھا۔ بڑی عزت دی ہے آپ نے مجھے! اللہ آپ کو عزت بخشے۔''

''آپ اس کا نام بھی جانتے تھے شاہ صاحب! وہ کون تھا اور......؟''

''ابھی خاموشی اختیار کریں۔ جوانی سرکش ہوتی ہے۔ اگر اس نے مزید سرکشی کی تو اسے نقصان پہنچانا پڑے گا لیکن آپ اطمینان رکھیں، ہم فیصلہ کر کے ہی واپس جائیں گے۔ اجازت ہے؟'' شیخ صاحب میرے ساتھ اٹھنے لگے تو میں نے انہیں روک دیا اور خود باہر نکل کر خاموشی سے مہمان خانے کی طرف چل پڑا۔ مجھے یہی کرنا تھا اور اسی کی ہدایت کی گئی تھی مجھے۔ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب تک لیٹا اس بارے میں سوچتا رہا۔ غلام جلال کا نام بھی مجھے بتایا گیا تھا ورنہ میں اس کو کیا جانتا البتہ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے بعد غلام جلال کا قدم کیا ہوگا۔ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں شاید کامیاب ہوگیا تھا مگر یہ رات سونے کے لیے نہیں تھی۔ پھر دروازہ بجایا گیا تھا۔ دروازہ کھولا تو اندھیرے میں کوئی کھڑا نظر آیا لیکن جو کوئی بھی تھا، کالی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ میں اسے پہچان نہ پایا کہ اس کی آواز ابھری۔

''پیر و مرشد! میں الیاس خان ہوں۔''

''الیاس خان! اندر آجاؤ۔'' میں نے کہا اور الیاس خان اندر داخل ہوتے ہی جھک کر میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

''معاف کردیں مرشد! معاف کردیں شاہ صاحب! بڑی گستاخیاں کی ہیں آپ کی شان میں۔ معاف کردیں۔ آپ تو اللہ والے ہیں۔ میں نے بڑی بدتمیزی کی آپ سے۔''

''خدا کے بندے! اٹھو کیوں مجھے گناہ گار کر رہے ہو۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں......؟''

''مجھے وہ مل گیا جو آپ نے بتایا تھا۔ دلدر دور ہوگئے میرے تو...... بڑا مقروض تھا مرشد! عزت پر بنی ہوئی تھی۔ قرض خواہوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ اب آپ کی عنایت سے عزت سے جی سکوں گا۔ اتنا عاجز آگیا تھا اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں چڑھ جانے والے قرض سے کہ دو ہی صورتیں رہ گئی تھیں میرے لیے یا تو جرم کروں یا خودکشی! مگر مرشد! آہ آپ کتنے رحم دل ہیں۔ میری بدتمیزی کو نظر انداز کر کے آپ نے مجھے نئی زندگی دے دی۔'' الیاس خان کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ تیکھا پن تھا، نہ اکڑفوں! مجسم نیاز بنا ہوا تھا۔

''چلو تمہارا کام بن گیا۔ ہمیں بھی خوشی ہوئی مگر ہماری وہ شرط قائم ہے۔''

''حضور! میرے ساتھ ہی الہ آباد چلیے، غلاموں کی طرح خدمت کروں گا۔ سارے کام کروں گا جو آپ حکم دیں گے۔''

''ہمیں بس اپنا پتا بتا دو۔ ہم آئیں گے تمہارے پاس، ابھی یہاں کام ہے۔''

''آپ مجھے بس حکم دے دیں، خود لینے آجاؤں گا دوبارہ آپ کہیں تو ریاض صاحب کی بھی خدمت کروں۔''

''جو تمہارا دل چاہے کرنا، ہمیں پتا بتا دو۔'' میں نے ہنس کر کہا اور الیاس خان نے مجھے الہ آباد میں اپنا پتا ذہن نشین

کروایا۔ اس کے بعد وہ نہ جانے کیا کیا اول فول بکتا رہا تھا۔ بمشکل تمام ٹلا۔ صبح کو جا رہا تھا۔ یہ سونا چاندی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ انسان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما کر دیتی ہے۔

سورج کی کرنوں نے پپوٹے چیرنے شروع کر دیئے۔ نیند ایسی ٹوٹی تھی کہ آنکھ کھولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دفعتاً ہی حواس جاگے اور ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ دل ہی دل میں لاحول پڑھتا ہوا اُٹھ گیا۔ نہ جانے آنکھ کیوں نہیں کھلی تھی۔ غسل خانے جا کر وضو کیا اور قضا پڑھنے بیٹھ گیا۔ غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ جائے نماز بچھانے سے پہلے دروازہ کھول دینا چاہیے تھا۔ نماز شروع ہی کی تھی کہ دروازہ بجایا جانے لگا۔ جو شخص بھی دروازہ بجا رہا تھا نہایت احمق تھا۔ اسے جواب نہ ملنے پر رُکنا چاہیے تھا۔ مگر وہ ہاتھ ہٹانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سخت غصہ آیا مگر کیا کرتا۔ خدا خدا کر کے سلام پھیرا اور غصے سے دروازے کی طرف بڑھا، اندازہ ہو گیا تھا کہ فتح محمد کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''شکر ہے اللہ کا زندہ ہو۔ ہمیں تو اندیشہ ہو گیا تھا کہ چل بسے۔ اماں کیا ازار بند نکل گیا تھا؟''

''فتح محمد، تم نہایت بے وقوف انسان ہو۔''

''لو اول لو، ماں بھائی جی یہ تو سب ہی کہتے ہیں تم نے کونسی نئی کہی، کچھ خبر بھی ہے بسنت کی؟''

''کیا ہوا بندۂ خدا؟''

''بھائی پھوٹ لیے نہار منہ، خبر دینے آئے ہیں۔''

''کون؟''

''الیاس خاں، منہ اندھیرے بستر ابغل میں دبا کر نکل لیے۔ اللہ خیر کرے اچھے نواب کو دبی زبان سے بتا تو دیا ہے، کچھ بولے نہیں، بس اتنا کہا کہ فتح محمد انہیں جاتا تھا مگر قسم اللہ کی دال میں کچھ کالا ضرور ہے ورنہ وہ...... دو دن پہلے سے کہتے ہیں جانا ہے۔ ناشتے کے بعد جانے کا فیصلہ کرتے ہیں پھر سوچتے ہیں کھا کر جائیں گے۔ مگر اس مرتبہ تو وہ چپ چاپ نکل لیے۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔''

''اماں کچھ ہاتھ لگ گیا، لے کر نکل لیے بھائی کے سُسرال کا مال سمجھ کے۔''

''کیا تمہیں ایسی باتیں کرنی چاہئیں فتح!'' میں نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

''اماں تو کونسی کسی غیر سے کر رئے ہیں، تم اتے شریف آدمی ہو کہ دل کی کہہ لیتے ہیں۔ پر ایک بات ہے بھائی میاں، غریب کا کوئی نئیں ہوتا، گھٹنے پیٹ کی طرف ہی مڑتے ہیں۔ کل تم نے بھی انہیں سٹے کا نمبر بتاتے ہوئے ہمیں بھگا دیا۔ اماں ان کی کیا ہے خود بھی گھر کے کھاتے پیتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر سے مارتے کھاتے رہتے ہیں۔ اماں بھائی میاں ہمیں بھی کچھ دے دو بڑے غریب آدمی ہیں۔ بال بچوں کو دُعا دیں گے۔''

''میں نے انہیں سٹے کا نمبر نہیں دیا فتح محمد!'' میں نے کہا۔

''اماں ہم سے اُڑ رہے ہو۔ اُڑتے کبوتر کے پر گن لیتے ہیں، ہم بھی تاڑ میں لگے رئے تھے ان کی، رات کو برگد کی جڑ میں تعویذ گاڑتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا ہم نے۔''

''تعویذ گاڑتے ہوئے......؟'' میں حیرت سے بولا۔

''قسم اللہ کی برگد کی جڑ میں گڑھا کھود رئے تھے۔ پھر برابر بھی کر دیا۔ جب چلے گئے تو ہم نے قریب جا کر بھی دیکھا مٹی برابر کی گئی تھی۔ تعویذ کی بات نہ ہوتی تو کھود کر دیکھتے۔''

''اوہ۔'' میں نے گہری سانس لی بات سمجھ میں آ گئی تھی، باہر سے آواز آئی۔

''فتح محمد، او فتے لگ گئے باتیں بنانے میں۔''

''لو وہ آ گئے نصیحت علی خاں، اب نصیحتیں کریں گے۔''

''اماں آ رہا ہوں بندو خاں پوچھ رہا تھا کہ......''

''ناشتے کی پوچھنے آئے تھے تم...... اور یہاں جم گئے...... لو چلو ناشتہ رکھو سنبھال کر۔'' بندو خاں خود ناشتے کی ٹرے لے آئے تھے۔ فتح محمد نے جلدی سے ٹرے سنبھال لی۔ ''ناشتے کے بعد رحیم الدین کے پاس چلے جانا۔''

''اور کچھ......؟'' فتح محمد نے پوچھا۔

''اور یہ کہ میاں صاحب کا بھیجہ مت کھایا کرو۔''

''بہت بڑھ بڑھ کر بولنے لگے ہو بندو خاں صاحب...... برابر کے عہدے ہیں ہمارے تمہارے۔ حکم مت چلایا کرو میرے پر......!''

''عہدے برابر ہیں فتح محمد، مگر عمر تم سے زیادہ ہے سمجھے۔'' بندو خاں مسکرا کر بولے اور پھر کہنے لگے۔ ''اچھا یوں کرو تم میاں کو ناشتہ کراؤ، میں رحیم الدین کے پاس چلا جاتا ہوں۔'' اچھا چلتا ہوں۔'' بندو خاں مسکرا کر باہر نکل گئے۔ فتح محمد نے گردن ٹیڑھی کی، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور اس کے بعد میرے لیے ناشتہ لگانے لگا۔ میں نے اسے بھی ناشتے کی پیشکش کی تو وہ کہنے لگا۔''

''نہیں میاں صاب، آپ کرلو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں پوچھا، مگر شکایت یہی کرتے رہیں گے غریب آدمی کی بھی سننی چاہیے، اصل ضرورت ہماری ہے ان کا کیا ہے، سٹہ لگائیں گے، مال کمائیں گے، عیاشی کریں گے، یہاں تو بارہ بچوں کا معاملہ ہے۔'' میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا پھر میں نے کہا۔

''برتن لے جاؤ......'' وہ شاید مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ برتن اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں تھوڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا اور اس کے بعد خود بھی باہر نکل آیا۔

حویلی کے ملازم اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مالی کیاریاں دُرست کر رہا تھا۔ دُوسرے لوگ اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ صفائی کرنے والا، صفائی کر رہا تھا، میں ٹہلتا ہوا دُور تک نکل آیا اور اتفاق سے ہی اس وقت برگد کے اسی درخت کے قریب پہنچ گیا، جس کی جڑ سے الیاس خاں کا کام بنا تھا، یونہی نگاہ اس کی جڑ پر جا پڑی اور بس، قدرت نے یہ عطیہ عطا فرما دیا تھا، جس کا احساس اس وقت پھر ہوا، آنکھوں نے ان گہرائیوں میں دیکھا، کلسا غائب تھا لیکن مٹی میں چند اشرفیاں نظر آ رہی تھیں، دس بارہ سے کم نہیں ہوں گی، فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ وہ اشرفیاں ہیں جو مٹی میں مل جانے کی وجہ سے الیاس خاں کو نظر نہیں آ سکیں، ویسے بھی اس نے یہ کام رات میں کیا تھا اور یقینی اَمر ہے کہ افراتفری کے عالم میں کیا ہوگا، چنانچہ یہ اشرفیاں رہ گئیں۔ دل خوش ہوگیا بیچارے فتح محمد کے کام آ سکتی ہیں۔ یہ بتا دوں گا اسے پھر وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر چلا تھا کہ فتح محمد نظر آ گیا، میں اسے دیکھ کر مسکرایا اور وہ بھی مسکراتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ابھی اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چھوٹا آدمی تھا، چھوٹی طبیعت کا مالک، میرے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی پاگل ہو جاتا اور پھر خواہ مخواہ کہانی عام ہو جاتی، دُوسروں کو پتا چلتا تو نجانے کیا کیا قیاس آرائیاں ہوتیں۔ ٹہلتا ہوا حویلی کے عقبی حصے میں جا نکلا اور اس وقت پیچھے سے مہر النساء، نور جہاں کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی، دونوں تیز تیز قدموں سے میری طرف آ رہی تھیں، نور جہاں نے مجھے سلام کیا۔ مہر النساء البتہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی رُک گیا، سلام کا جواب دے کر میں نے ان دونوں کی خیریت پوچھی، اور مہر النساء کہنے لگی۔

''مسعود صاحب، ہم مہمان خانے میں آپ کی قیام گاہ تک گئے تھے۔ آپ اس طرف چہل قدمی کے لیے نکلے ہوئے تھے۔''

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے مہر النساء؟'' میں نے سوال کیا۔

''بہت عرصے کے بعد میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کر رہی ہوں اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں بھی جینے والوں میں شامل ہوں، مطلب یہی ہے کہ جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی میں صحیح الفاظ میں تو ان لوگوں کو نہیں بتا سکتی تھی لیکن، لیکن زندگی سے بیزار تھی۔ میں آہ کاش میری یہ کیفیت مستقل ہو، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اور اسی لیے آپ کے پاس پہنچی تھی۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے، میری یہی دُعا ہے۔''

''اب جبکہ مہر النساء نے آپ کو، آپ کے نام سے مخاطب کیا ہے مسعود صاحب، تو میں بھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی، براہ کرم آپ ہماری گستاخی کا برا نہ مانئے گا۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ ہماری ہی عمر کے ہیں، اور اگر ہم آپ کو کسی احترام کے نام سے پکاریں تو بڑا مضحکہ خیز لگے گا۔''

''کوئی حرج نہیں ہے نور جہاں صاحبہ آپ کو میرا نام معلوم ہے، بس اتنا کافی ہے۔ آپ مجھے میرے نام سے پکار لیجیے۔''

''بے حد شکریہ، دراصل مہر النساء چاہتی ہیں کہ اگر آپ کسی بھی طرح یہاں قیام کے لیے کچھ وقت نکال سکیں تو ان کا خوف دُور ہو جائے۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی ہیں اور شیخ صاحب سے بھی، انہوں نے یہی کہا ہے۔ اوہو دیکھیے وہ شیخ صاحب آ گئے۔'' نور جہاں ایک دَم بولی اور میری نظریں بھی اس جانب اُٹھ گئیں، شیخ عبدالقدوس ادھر ہی چلے آ رہے تھے۔ سلام کر کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگے۔

''یہ اچھا ہوا کہ یہ لڑکیاں خود ہی آپ کے پاس آ گئیں مسعود میاں، کیا انہوں نے اپنا مقصد بتایا آپ کو؟''

''جی جی، مہر النساء صاحبہ کا کہنا ہے کہ اگر میں یہاں کچھ عرصے قیام کروں تو ان کے دل سے خوف نکل جائے گا، لیکن اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے، آپ کے سامنے کچھ حقیقتیں عرض کر دوں۔ میں بے شک ابھی کچھ وقت یہاں ہوں، لیکن جاؤں گا تو ایک ایسا اطمینان بخش حل چھوڑ جاؤں گا جس کے بعد یہ خطرہ موجود نہ رہے گا۔ اس سے زیادہ قیام ظاہر ہے کسی بھی طرح میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔''

مہر النساء اور نور جہاں اس اطمینان کے بعد واپس لوٹ گئیں کہ ابھی میں یہاں قیام کروں گا۔ نور جہاں واقعی بڑی شوخ و شریر تھی، نجانے کیا کیا مہر النساء کے کان میں بدبداتی رہی تھی، لیکن مہر النساء سنجیدہ لڑکی تھی۔ بہرحال شیخ صاحب بھی چلے گئے اور میں واپس اپنی آرام گاہ میں آ گیا۔ اب یہاں قیام کرنا واقعی ایک مشکل اَمر تھا۔ دِل میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیا عمل ہو جس کی بنیاد پر مہر النساء مکمل محفوظ سمجھی جائے، اور میں یہاں سے الٰہ آباد کا رُخ کروں۔ وہاں ہو سکتا ہے ماموں ریاض کے ساتھ ساتھ امی، ابو اور بہن بھی مل جائیں، آہ کیا ایسا ہو سکے گا۔ کیا میری زندگی میں ایک بار پھر وہی دن لوٹ آئیں گے۔ بس حسرتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ نجانے کیوں تقدیر پر اتنا بھروسہ نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے میری لٹی ہوئی دُنیا واپس کر دے۔

شام کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں نے خود فتح محمد کو اپنے پاس بلایا اور وہ میرے قریب آ گیا۔

''لگتا ہے فتح محمد کچھ ناراض ہو گئے ہو مجھ سے۔''

''کیا لے لیں گے میاں جی آپ سے ناراض ہو کر ہم نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ بس شکایت ہے ہمیں تم سے۔''

''فتح محمد دیکھو، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ الیاس خان کو میں نے کوئی نمبر وغیرہ نہیں بتایا، وہ وہاں کیا کر رہا تھا، یہ وہ جانتا ہے لیکن میرے علم نے مجھے بتایا ہے کہ برگد کے اسی درخت پر، اس کے نیچے نظر آنے والے مٹی سے ڈھکے ہوئے گڑھے میں کوئی ایسی چیز موجود ہے، جو تمہارے کام آ سکتی ہے۔''

''ایں......'' فتح محمد نے منہ پھاڑ کر کہا۔

''ہاں فتح محمد تم بھی اسی وقت جب الیاس خاں نے درخت کی جڑ میں گڑھا کھودا تھا وہاں پہنچنے کے بعد وہ گڑھا کھودنا اس کی مٹی کو اچھی طرح تلاش کر لینا، ممکن ہے تمہیں اس میں کوئی ایسی چیز مل جائے جو تمہارے لیے کارآمد ہو۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اگر واقعی کچھ مل جائے تو اسے اپنے پاس پوشیدہ کر کے

برابر کر دینا سمجھ رہے ہو ناں۔''

''ابھی چلا جاؤں۔'' فتح محمد نے کہا۔

''ابھی تمہیں وہاں دیکھ لیا جائے گا اور جو کچھ تمہارے ہاتھ لگا وہ اس گھر کے مالکوں کی ملکیت ہوگا تم اسے اپنے قبضے میں

نہیں لے سکو گے۔"
"اماں تو کیا الیاس کو بھی وہاں کچھ مل گیا تھا؟" فتح محمد نے پوچھا۔
"اب یہ تو مجھے نہیں معلوم، الیاس خاں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی مگر تم یہ کام احتیاط کے ساتھ کر لینا، بعد میں مجھ سے یہ مت کہنا کہ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔"
"ارے بھائی میاں تم نے تو دل ہولا دیا ہے قسم اللہ کی، اب میرے کو صبر کیسے آئے گا، اب کیا کروں پیارے بھائی، بس......بس، خدا جانے رات کس وقت ہوگی۔"
"جاؤ جاؤ سکون سے اپنا کام سرانجام دینا، جلد بازی کی تو جو نقصان اُٹھاؤ گے اس کے خود ذمہ دار ہو گے۔"
"نہیں، نہیں، میاں صاحب جو آپ نے کہہ دیا ہے وہی کروں گا قسم اللہ کی۔" فتح محمد نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ بس اس کے بعد کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا......لیکن یہاں اس حویلی میں ٹھسے رہنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ رات کو دل میں یہ آئی کہ یہاں دہلی میں جو مقدس مزارات کا شہر ہے۔ کیوں نہ مزارات کی زیارتیں کروں اور کچھ نہیں تو کم از کم دل کو سکون ہی ملے گا۔ زیادہ تو نہیں سن سکا تھا، لیکن تھوڑی بہت باتیں کانوں تک پہنچی تھیں کہ دہلی میں بڑے بڑے جید بزرگوں کے مزارات ہیں، اب مجھے ان تمام چیزوں سے دلچسپی ہو گئی تھی۔
دُوسرے دن صبح معمول کے مطابق جاگا۔ ناشتہ فتح محمد لایا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ زبان بند تھی۔ چہرے پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا مقصد ہے کہ فتح محمد کا کام ہو گیا۔ اس نے ناشتہ میرے سامنے رکھا، حیرت انگیز طور پر خاموش تھا، میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔
"فتح محمد!" اور وہ اس طرح اُچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"کتنی تھیں؟" میں نے سوال کیا۔
"تیرہ۔" وہ بے اختیار بولا اور پھر چونک کر کہنے لگا۔ "کیا میاں صاحب کیا؟"
"کام ہو جائے گا تمہارا؟" میں نے پوچھا اور فتح محمد ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحات سوچتا رہا پھر جلدی سے آگے بڑھا اور جھک کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔
"قسم اللہ کی، زندگی بھر غلام رہوں گا آپ کا میاں صاحب، دن پھیر دیے آپ نے میرے، معاف کر دیجیے مجھے معاف کر دیجیے، رات کو یہ سوچ رہا تھا بلکہ ساری رات سوچتا رہا تھا کہ آپ سے قبول کر ہی نہیں دوں گا چپ لگا جاؤں گا مگر......مگر غلطی تھی گستاخی تھی میری، معاف کر دیجیے۔"
"ارے فتح محمد ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ بھئی ہم بھلا کس سے کہنے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے اب تم جانو اور تمہارا کام۔"
"میاں صاحب آپ نے، آپ نے......"
"بس بس بیکار باتوں سے گریز کرو۔ اچھا ہاں ذرا ہمیں یہ بتاؤ یہاں کون کون سے بزرگوں کے مزارات ہیں اور کہاں سے کہاں جانا ہوگا ہمیں......؟"
"مزارات! اے لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دلی کی کسی بھی سڑک پر نکل جاؤ، کسی چلتے پھرتے سے پوچھ لو، وہ سارے کے سارے مزاروں کے پتے بتا دے گا۔ پہلے تو حضرت سلطان جی ہی ہیں ان کے دربار میں جاؤ، میاں صاحب مزا آ جائے گا۔ قسم اللہ کی کیا جگہ ہے۔ اس کے بعد فتح محمد تمام بزرگوں کے نام گنانے لگا اور میں نے انہیں ذہن نشین کر لیا۔ فتح محمد بولا......"
"جانے کا ارادہ ہے کیا......؟"
"ہاں فتح محمد، جی چاہتا ہے۔"

''تو پھر موٹر نکلوا لو شیخ صاحب کی، ڈرائیور سارے میں گھما دے گا۔''
''نہیں فتح محمد، میں پیدل ہی جاؤں گا۔''
''تمہاری مرضی ہے میاں صاحب۔'' فتح محمد بولا۔ آج اس نے ایک بھی فضول بات نہیں کی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ پھر ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں وہاں سے باہر نکلا، فتح محمد سے کہہ دیا تھا کہ اگر شیخ صاحب پوچھیں تو بتا دے کہ میں سیر کرنے نکلا ہوں، شام تک واپس آ جاؤں گا۔ دہلی کی سڑکوں پر آ گیا۔ پتے پوچھتا رہا، روایتوں کا شہر تھا، وقت کتنا ہی گزر جائے دلی کی قدیم روایتیں کبھی دم نہیں توڑیں گی۔ اس کی اداؤں میں فرق نہیں آئے گا۔ ایک جگہ رُک کر ایک شخص سے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کا پتہ پوچھا اور اس نے حیرت سے منہ کھول دیا۔
''اماں نئے لگتے ہو، دلی میں کہیں باہر سے آئے ہو۔''
''یہی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ سر ہی پڑ گیا، مجھ سے پوچھے بغیر تانگہ روکا اور مجھے سوار ہونے کا اشارہ کیا۔
''کیوں؟''
''اماں آ جاؤ تکلف نہ کرو، ہمارے سلطان جی کی زیارت کو آئے ہو، چلو ہم پہنچا دیں ان کے کنے۔'' لاکھ منع کیا نہ مانا، تانگہ چل پڑا اور وہ مجھے راستوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ''یہ ببر کا تکیہ ہے، یہ مٹکوں والے پیر کا مزار ہے اور یہ نیلی چھتری۔ یہاں سے تانگہ دائیں ہاتھ کو مڑ گیا۔ یہ بائیں ہاتھ والی سڑک ہمایوں کے مقبرے کو جاتی ہے۔ میرے راہنما نے بتایا...... بالآخر درگاہ شریف پہنچ گئے۔ وہ اسی تانگے میں واپس چلا گیا۔ اس کی محبت نے دل پر بڑا اثر کیا تھا، اندر داخل ہو گیا۔ زیارت سے دل شاد ہو گیا۔ فاتحہ خوانی کی اور بہت دیر تک یہاں رُکا رہا۔ اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال آگے بڑھنا تھا۔ وہاں سے نکلا، کوٹلہ، پرانا قلعہ شیر منڈل پھر مہرولی اور پھر قطب صاحب، دوپہر کا وقت تھا، تیز دُھوپ پڑ رہی تھی، ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گرمی اور دُھوپ کی وجہ سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہواؤں کے مرغولے ریت کو بلند کرتے اور بعض جگہ بھنور کی شکل میں بلند ہوتے اور چکراتے دُور نکل جاتے۔ بچپن کی کچھ باتیں یاد آ گئیں۔ اکثر دوپہر کو کھیلنے نکل جاتا تھا ایسے ہی جھکڑ چل رہے ہوتے، اماں دیکھ لیتیں تو کہتیں۔
''ایسی دوپہر میں گھر سے نہ نکلا کرو چرباؤلے اُٹھا لے جاتے ہیں۔''
''یہ کیا ہوتا ہے۔'' میں نے پوچھا تو ماں نے مجھے چرباؤلے دکھائے، ہوا کے بھنور جو ریت کو رول کرتے ہوئے انسانوں کی طرح چلتے نظر آتے تھے۔
''ان میں کیا ہوتا ہے۔''
''جنوں کی سواری، جن اِن پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے ہیں اور اگر کوئی ان کے راستے میں آ جائے تو انہی میں لپٹ کر چلا جاتا ہے اور جن اُسے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ بچپن کی باتیں شاید عمر کے آخری حصے تک یاد رہتی ہیں اور انہیں بھلانا ناممکن ہوتا ہے۔ ان بگولوں کو دیکھ کر دل میں وہی خوف طاری ہو گیا جو بچپن میں ہو جایا کرتا تھا۔ اس خوف میں بھی ایک لذت کا احساس ہوا۔ ماں یاد آ گئی تھی اور یہ یاد تو اب ایک ایسی کیفیت اختیار کر چکی تھی جسے الفاظ میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک چرباؤلے کی زد میں آ گیا۔ اچانک ہی ہوا کا ایک زوردار جھکڑ عقب میں نمودار ہوا، اِس جھکڑ نے ایک وسیع دائرے کی شکل اختیار کر لی۔ گہری اور گاڑھی مٹی کئی فٹ اُونچی بلند ہوئی اور چکراتی ہوئی اس برق رفتاری سے میری جانب بڑھی کہ میں اس کی لپیٹ سے نہ نکل سکا۔ یوں لگا جیسے زمین سے پاؤں اُکھڑ گئے ہوں۔ بڑا شدید دباؤ تھا ہوا کا۔ میں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور تیز ہواؤں کا یہ زوردار جھکڑ مجھے زمین سے بلند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمام محسوسات جاگ رہے تھے اور کسی بھی قسم کے وہم کا گمان نہیں تھا بس میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب زمین پر گرا تب گرا...... سنبھلنے کی کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ ہوا کا یہ جھکڑ پلک جھپکتے مجھے میری جگہ سے کافی دُور لے گیا اور اس کے بعد میں گر پڑا۔ گھٹنوں میں چوٹ لگی تھی۔ باریک باریک پتھروں کے ٹکڑے ہتھیلیوں میں چبھ گئے تھے اور میں گرد کی وجہ سے آنکھوں میں کڑواہٹ محسوس کر رہا تھا۔

ہوا کا یہ تیز جھکڑ مجھ پر سے گزر گیا۔ کئی فٹ دُور لا پھینکا تھا اور اب وہ مجھ سے آگے نکل گیا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مٹی چبھنے لگی۔ بمشکل تمام شانے سے کمبل اُتار کر ایک سمت رکھا اور قمیض کے دامن سے آنکھیں صاف کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں اس قابل ہوگئی تھیں کہ زمین نظر آ سکے۔ مسکراہٹ آ گئی تھی چہرے پر اور بدستور ماں کی ہدایت یاد کر رہا تھا، پھر زمین پر ہاتھ لگا کر اپنے آپ کو سنبھالا اور سیدھا کھڑا ہو گیا، لیکن دماغ کو جو خوفناک جھٹکا لگا تھا اس نے آنکھیں تاریک کر دیں۔ جو منظر نظر کے سامنے آیا تھا اس پر یقین کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، چند لمحات تک جھنجناتے ہوئے دماغ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد کا ماحول دیکھا۔ خدا کی پناہ یہ وہ جگہ ہی نہیں تھی جہاں اب سے چند لمحے پیشتر موجود تھا۔ یہ تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی ایک انتہائی بوسیدہ اور وسیع عمارت، ٹوٹی پھوٹی دیواریں، بڑے بڑے جھروکے، عجیب سے فصیل نما ستون اور جگہ جگہ لکھوری اینٹوں کے ہیبت ناک ڈھیر، کہیں ٹوٹے ہوئے دروازے تو کہیں محرابیں۔ کہیں چبوترے جو صاف ستھرے اور کشادہ اور کہیں کچھ منبر نما جگہ، کوئی ایک بات جو سمجھ میں آئی ہو نگاہوں کا دھوکا تو ہو نہیں سکتا اور اگر دماغ کی کوئی خرابی ہے تو ان باتوں کو محسوس کرنے کی قوت ذہن میں کیسے موجود ہے۔ لیکن کچھ بھی نہیں تھا۔ جنوں کی سواری گزر رہی تھی اور میری ماں کے کہنے کے مطابق جن مجھے یہاں اُٹھا لائے تھے۔ بھلا اس کے علاوہ اور کیا سوچ سکتا تھا۔ بچپن کی حدود سے گزرا تھا اور ماں کی ہدایات پر غور کیا تھا تو یہی سوچا تھا کہ ماں دُھوپ سے بچانے کے لیے یہ الفاظ ادا کر کے خوف زدہ کرنا چاہتی ہے تاکہ دُھوپ مجھ پر اثرانداز نہ ہو، لیکن وہ کہانی اس وقت مجسم تھی۔ جو بادلوں میں سفر کرنے والی جنوں کی سواری کے بیچ آ گیا تھا اور انہوں نے مجھے یہاں لا پٹخا تھا۔ کیا اسی بات پر یقین کر لوں مگر جگہ کونسی ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ کیا واقعی سچ ہے۔ ایک انوکھا سچ، اب کسی شبے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اُٹھا، کمبل احترام سے اُٹھا کر شانے پر ڈالا، اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ ٹوٹی عمارت کہاں ہے کچھ اندازہ تو ہو۔ آس پاس ٹوٹی دیواریں، جھاڑیاں اور ویران اور ہیبت ناک مناظر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اینٹوں سے بنے ہوئے اس چبوترے کی جانب بڑھ گیا جس کی سیڑھیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے بلندی پر کھڑے ہو کر کچھ اندازہ ہو سکے۔ چبوترے پر پہنچا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

دُور تک ویران میدان بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے جن میں جگہ جگہ چھدرے درخت سنسان کھڑے ہوئے تھے۔ پتھریلے چبوترے کے ایک گوشے میں ایک کنواں نظر آیا جس کے کنارے اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ وہاں پانی کا ایک ڈول رکھا ہوا تھا اور رسّی کا لچھا بہت بڑا نظر آ رہا تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کنواں بہت گہرا ہے، لیکن جگہ، یہ جگہ کونسی ہے، دفعتاً ہی قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور سمت کا اندازہ کر کے دہشت زدہ سا اس طرف مڑ گیا۔ تین در ایک ساتھ بنے ہوئے تھے اور ان کے دُوسری طرف اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اس طرف کا حصہ سالم نظر آ رہا تھا۔

آنے والے انہی دروں سے برآمد ہوئے تھے۔ تینوں دروں سے ایک ایک فرد باہر نکلا تھا۔ شانوں سے لے کر ٹخنوں تک کے سفید لباس میں ملبوس چہروں پر داڑھیاں تھیں اور یہ چہرے عام انسانوں جیسے ہی تھے۔ میں ان کے مخصوص لباس سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ کون ہو سکتے ہیں۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ میری یہاں موجودگی سے واقف ہیں اور میرے ہی لیے اندر سے نکل کر آئے ہیں۔ بہر طور انسان تھے، خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں انہیں دیکھنے لگا اور وہ تینوں قدم بڑھاتے ہوئے میرے نزدیک پہنچ گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا، لیکن میں نے فوراً ہی انہیں سلام کیا تھا۔ سلام کا جواب تینوں نے دیا اور اس کے بعد اس شخص نے جس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا تھا مدھم لہجے میں کہا۔"

"اندر چلو تمہیں طلب کیا گیا ہے۔" میں کچھ اور سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن ان میں سے دو میرے عقب میں آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ سے میرے شانوں کو دھکیلا، خاصا طاقتور دھکا تھا۔ میں کئی قدم آگے بڑھتا چلا گیا اور اس کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ خاموشی سے ان کی ہدایت پر عمل کروں، ان کا انداز سخت تھا۔ وہ لوگ مجھے لیے ہوئے درمیان کے بڑے در سے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں چھت تھی اور یہ جگہ خاصی وسیع تھی، اس کے دُوسری جانب ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے

روشنی چھن رہی تھی اور یہ روشنی قدرتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ دُوسری طرف بھی کوئی کھلی جگہ موجود ہے۔ وہ لوگ مجھے اسی دروازے کی سمت لے چلے اور پھر میں اس دروازے سے بھی دُوسری طرف نکل گیا۔ تب میں نے اس کھنڈر نما عمارت کا وہ صحیح وسالم حصہ دیکھا جو بہت خوبصورتی سے بنا ہوا تھا۔ غالباً عمارت کا بیرونی حصہ ٹوٹ پھوٹ کر تباہ و برباد ہوگیا تھا لیکن یہ اندرونی حصہ بالکل دُرست تھا اور یہاں بڑے بڑے دروازے نظر آ رہے تھے۔ کچی زمین تھی اور اس پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اسی گھاس سے گزار کر مجھے ایک بڑے دروازے تک لایا گیا اور پھر وہاں دو آدمی رُک گئے۔ البتہ ان میں سے ایک مجھے اسی طرح لیے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس پر دری اور چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ہی بڑا سا گاؤ تکیہ لگائے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ سر پر صافہ بندھا ہوا تھا۔ شانوں پر خاص طریقے سے چادر ڈالی گئی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے سفید لباس میں ملبوس تھا۔ براق داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی۔ سرخ و سفید چہرے کے ساتھ بڑی پُر رعب شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کے دونوں سمت نیم دائرے کی شکل میں دس بارہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کچھ فاصلے پر ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے لانے والے نے بڑھنے کا اشارہ کیا اور اس شخص نے گردن اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر انگلی سے ایک سمت اشارہ کر دیا۔ مجھے ایک الگ گوشے میں بٹھا دیا۔ لیکن معمر شخص سے میرا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس وسیع و عریض کمرے میں اور بھی دروازے تھے۔ ایک دروازے سے چند افراد اندر داخل ہوئے اور پھر ایک اور دروازے سے جو شخص اندر آیا وہ میرے لیے بڑا حیران کن تھا۔ ایک خوبصورت سی شکل کا نوجوان جس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جس کی تیز نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ معمر شخص کے قریب آ کر وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کے برابر ہی ایک اور کالی داڑھی والا شخص آ کر بیٹھ گیا تھا۔ معمر شخص نے گردن اُٹھا کر گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر کالی داڑھی والے شخص کو اور اس کے بعد اس کی آواز اُبھری۔

''ثابت جلال اپنے بیٹے غلام جلال سے پوچھو کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس پر غلام جلال نے اپنے آپ کو زخمی کرنے کا الزام لگایا ہے۔'' جس شخص کو ثابت جلال کہہ کر پکارا گیا تھا، اس نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر پاس بیٹھے ہوئے نوجوان کو لیکن غلام جلال کا نام سن کر میں خود چونکا تھا، میری جس قدر رہنمائی ہوئی تھی اس میں غلام جلال کا نام تو شامل تھا لیکن اس کی صورت سے آشنائی نہ ہو پائی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے ساری حقیقت کا اندازہ ہوگیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی دل سے خوف بالکل ختم ہوگیا تھا۔ نوجوان لڑکے نے مجھے گھورتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا۔

''ہاں معزز قاضی صاحب، حقیقت یہی ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے زخمی کیا۔''

''اے شخص تیرا نام کیا ہے......؟'' جس شخص کو قاضی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اور جس کی سفید داڑھی اس کے سینے پر لہرا رہی تھی اس نے کرخت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''میرا نام مسعود احمد ہے اور میرے والد کا نام محفوظ۔''

''ہم تجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ غلام جلال سے تیرا کیا اختلاف تھا اور اس جھگڑے کی بنیاد کیا تھی۔ کیا تجھے اس بات کا علم تھا کہ غلام جلال ہمارے قبیلے سے ہے اور کیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ ہمارے قبیلے کے ایک نوجوان کو زخمی کرنے کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔''

''معزز قاضی صاحب نہایت احترام کے ساتھ تفصیل عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' میں نے بے خوفی سے کہا۔

''ملاحظہ فرمایا آپ نے قاضی محترم یہ شخص کتنا سرکش ہے۔ اس کا انداز گفتگو ایسا ہے جیسے یہ ہمیں گردانتا ہی نہ ہو......'' ثابت جلال نے کہا۔

''تمہیں خاموش رہنے کا حکم دیا جاتا ہے ثابت جلال۔'' باریش بزرگ نے کہا اور سیاہ داڑھی والا ثابت جلال خاموش ہوگیا۔ باریش بزرگ نے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

''غلام جلال نے ایک ایسی پاکباز لڑکی پر تسلط قائم کرلیا تھا جو بچپن سے ایک نوجوان سے منسوب تھی اور اسے چاہتی

تھی۔ اس نے اس کے اہل خاندان کو خوفزدہ کر رکھا تھا اور وہ نیک مسلمان گھرانہ غمزدہ اور پریشان تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی مگر اس نے مجھے ضرر پہنچانا چاہا اور میں نے اپنے دفاع کے لیے اسے جھٹک دیا۔ یہ سانپ کی شکل میں مجھے ڈسنا چاہتا تھا۔ یہ دیوار سے جا ٹکرایا اور زخمی ہو گیا۔ کیا یہ میرا قصور ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے غلام جلال۔"

"ہاں قاضی محترم۔ وہ دوشیزہ میرے جی کو بھا گئی تھی۔"

"وہ تجھے کہاں ملی تھی؟"

"اسی بوسیدہ حویلی میں، یہ حویلی اس کے باپ کی ملکیت ہے۔ وہ چاندنی رات میں کلیلیں کر رہی تھی اور اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔"

"گویا وہ شیخ عبدالقدوس کی بیٹی ہے۔"

"درست ہے قاضی محترم۔"

"مگر یہ تو گناہ کبیرہ ہے۔ اوّل تو شیخ عبدالقدوس ایک دیندار اور خدا ترس انسان ہے۔ مسلمان ہے، سخی اور پابند احکامات الٰہی ہے۔ دوم وہ دوشیزہ نسبت رکھتی ہے۔ تجھے یہ لازم نہ تھا غلام جلال کہ اس پر فریفتہ ہوتا اور اسے گمراہ کرتا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ یہ شخص بے قصور ہے اور جو کچھ ہوا اس میں غلام جلال کی نادانی تھی۔ چنانچہ ثابت جلال تجھ پر لازم ہے کہ اسے ہرجانہ ادا کرے اور وہیں پہنچائے جہاں سے اسے لایا گیا ہے۔"

"قاضی محترم میرا بیٹا غمزدہ ہو جائے گا۔" ثابت جلال نے کہا۔

"تو کیا تو چاہتا ہے کہ کوئی غیر شرعی فیصلہ کیا جائے۔" دوسرے احتجاج پر تو بھی سزا کا حق دار ہوگا۔ تیرا فرض ہے کہ تو اپنے بیٹے کی نگرانی کرے، اگر اسے نافرمانی کا مرتکب پایا گیا تو اس کے لیے سزائے موت تجویز کی جائے گی۔

"قاضی کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔" ثابت جلال نے کہا اور قاضی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ ان کے ساتھ بقیہ افراد بھی اُٹھ گئے تھے۔ ثابت جلال نے ایک تھیلی ہرجانے کے طور پر مجھے دی جو مجھے لینا پڑی۔ پھر وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ حویلی کے بیرونی صحن میں ایک گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔

"یہ جانتا ہے تجھے کہاں جانا ہے۔ اس پر سوار ہو جا۔" میں نے رکاب پر پاؤں رکھا اور گھوڑے کی پشت پر بیٹھنا چاہا مگر دُوسری سمت جا گرا۔ بڑی خفت ہوئی تھی مگر معاملہ دُوسرا ہی تھا، جگہ ایک دم بدل گئی تھی۔ وہی دُھوپ، وہی ہوائیں، وہی ماحول جہاں سے میں ہواؤں کا قیدی بنا تھا۔ واپس چل پڑا اور شیخ صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔ یہاں کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اپنی آرام گاہ میں آ کر میں اس پورے واقعے پر غور کرنے لگا۔ کیا کچھ عطا ہو گیا تھا مجھے۔ جنوں کی نگری پہنچ گیا تھا۔ ان کی عدالت میں حاضری ہوئی تھی اور مقدمہ جیت گیا تھا۔ جو کچھ ظہور پذیر ہوا تھا اس کے بعد مہر النساء بالکل محفوظ ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب شیخ صاحب کی حویلی میں قیام بے معنی تھا۔ یہ لوگ خدشے کے پیش نگاہ مجھے اجازت نہیں دیں گے اور میرے دل کو اب الٰہ آباد کی لگن لگی ہوئی تھی۔ ثابت جلال نے ہرجانے کی جو تھیلی دی تھی اس میں ضرورت کے لیے بہت کچھ تھا، چنانچہ حویلی کے مکینوں سے غائبانہ معذرت کر کے ایک بار پھر وہاں سے نکل آیا۔ کمبل شانے پر موجود تھا لیکن چند جوڑے لباس درکار تھے جو بازار سے خریدے انہیں یکجا کر کے ایک سوٹ کیس میں رکھا اور اسٹیشن پہنچ گیا۔ الٰہ آباد جانے والی ریل کے بارے میں معلوم کیا اور جب ریل آئی تو اس میں بیٹھ گیا۔ اب دل والدین میں اُلجھ گیا تھا۔ ایک عجیب ہوک اُٹھ رہی تھی۔ کانوں میں ان کی آواز اُبھر رہی تھی۔

✦✤✦✤✦

ریل میں بہت سے مسافر تھے مگر میں سب سے لاپروا اس وقت اس تصور میں کھویا ہوا تھا۔ آہ کاش الیاس خان نے میرا پیغام ماموں ریاض کو دے دیا ہو۔ آہ کاش وہ اسے مل گئے ہوں۔ نہ جانے یہ سفر کیسے طے ہوا، نہ جانے یہ سفر کتنا طویل

تھا۔ الہ آباد اسٹیشن کا بورڈ نظر آیا اور میں مختصر سامان سمیٹے نیچے اُتر آیا۔ بڑا تاریخی شہر تھا اور زمانہ طالب علمی میں اس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں مگر اس وقت دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ اس احساس نے خوف چہرے پر جمع کر دیا تھا کہ ماموں ریاض اسی شہر میں ہیں اور ماں باپ کے بھی یہاں ہونے کے امکانات ہیں۔ آہ کیا انہیں دوبارہ دیکھنا نصیب ہو جائے گا۔ کیا میری تقدیر ایسی ہے۔ باہر تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک تانگے والے سے کہا۔

''حویلی شاہ پور چلو گے؟''

''بیٹھو بھیا جی۔ تین روپے ہوں گے۔'' میں تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگہ سفر کرنے لگا۔ کوئی پچاس منٹ کا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ ایک جگہ تانگہ رُک گیا۔ ''اب کہاں چلوں؟''

''حویلی کہاں ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''کونسی حویلی......؟''

''حویلی شاہ پور۔''

''یہی محلہ ہے بھیا جی۔ حویلی تو کہیں نہیں ہے۔'' تانگے والے نے کہا اور میں نے نیچے اُتر کر کرایہ ادا کر دیا۔ گھروں میں دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک دکاندار سے وہ پتہ پوچھا جو الیاس خان نے بتایا تھا۔

''الیاس خان وہ سامنے والے گھر میں رہتا ہے۔'' دکاندار نے خوشگواری سے بتایا۔ بڑی صحیح جگہ پہنچا تھا مگر گھر دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا تھا۔ شیخ عبدالقدوس تو بڑے کر و فر کے آدمی تھے اور الیاس خان ان کی بیٹی کا سُسرالی رشتے دار، ظاہر ہے شیخ صاحب نے بیٹی کسی معمولی گھر میں تو نہ بیاہ دی ہوگی۔ یہ گھر تو بہت معمولی تھا۔ میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دی تو ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھولا۔

''جی فرمایئے......''

''الیاس خان صاحب یہیں رہتے ہیں......؟''

''جی ہاں۔''

''میں دہلی سے آیا ہوں، ان کا شناسا ہوں، مجھے یہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔ اگر وہ موجود ہوں تو انہیں بتا دیجیے کہ شیخ عبدالقدوس کے ہاں سے مسعود آیا ہے۔''

''اوہو تم شیخ صاحب کے ہاں سے آئے ہو۔ بیٹا ایک منٹ رکو، ذرا بیٹھک کھول دوں۔''

بزرگ اندر چلے گئے۔ پھر بڑے احترام سے مجھے اندر لے گئے۔ مجھے بٹھا کر بولے۔ ''جوتے وغیرہ اُتار لو میں لوٹے میں پانی لے آتا ہوں، منہ ہاتھ دھو لو۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے پہلے کھانا کھائیں گے پھر باتیں ہوں گی۔ آرام سے بیٹھو بیٹے یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔''

''الیاس خان موجود ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں مگر آ جائے گا۔ اوہو میرا بھی کیسا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ستر سال عمر ہو گئی ہے کیا کروں۔ بیٹے میں الیاس خان کا باپ ہوں۔ جمال احمد خان ہے میرا نام۔ وہ گیا ہوا ہے آ جائے گا۔ ابھی آتا ہوں۔ بزرگ باہر نکل گئے کچھ دیر کے بعد لوٹے میں پانی لے آئے۔ میں نے بھی تکلف ختم کر دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کھانا آ گیا۔ بزرگ میرے ساتھ خود بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ ارہر کی دال تھی، پیاز اور لیموں کی چٹنی۔ باہر سے گرم گرم روٹیاں آ رہی تھیں۔ دستک ہوتی اور بزرگ اُٹھ کر روٹیاں لے لیتے۔ کھانے میں لطف آ گیا تھا۔ پھر جب برتن وغیرہ سمٹ گئے تو بزرگ میرے پاس آ بیٹھے۔''

''ہاں میاں صاحب سناؤ دلی کی داستانیں۔ شیخ صاحب کیسے ہیں۔''

''بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے کچھ دن وہاں قیام کیا تھا۔ میرا شیخ صاحب سے کوئی رشتہ نہیں، ایک غرض سے وہاں مقیم تھا۔ وہیں الیاس خان صاحب سے شناسائی ہوئی تھی۔ دعوت دے آئے تھے مجھے۔''

''میاں محبتوں کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں۔ تم اتنا فاصلہ طے کر کے یہاں آئے اتنا ہی کافی ہے۔ تو الیاس خان دلی میں تھا......؟''

''جی......؟'' میں نے بزرگ کو دیکھا۔

''ایں ہاں مجھے پتا نہیں تھا۔ خیر چھوڑو...... دراصل علیم الدین خان میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ ان کے بیٹے جمیل الدین خان سے شیخ عبدالقدوس کی بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں مگر شیخ صاحب ایسے وضع دار آدمی ہیں کہ بیٹی کی سُسرال کے کتے کی بھی عزت کرتے ہیں۔ یہ الیاس اسی حوالے سے وہاں پہنچ جاتا ہے حالانکہ کسی کو زیر بار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اچھا میاں سفر سے تھک گئے ہوگے، آرام کرو، سو جاؤ، شام کو باتیں ہوں گی۔ دروازہ چاہو تو اندر سے بند کر لو...... اچھا خدا حافظ'' وہ باہر نکل گئے۔ یہ کمرہ بھی شاید مہمان خانے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ان چند باتوں سے ہو گیا تھا۔ حالانکہ شیخ صاحب کی حویلی میں کچھ اور ہی سنا تھا الیاس خان کے بارے میں، مگر وہ نوکروں کی بات تھی جو بس اتنا جانتے ہوں گے کہ الیاس خان بڑی بٹیا کے سُسرال والے ہیں مگر الیاس خان...... وہ جو کچھ لایا ہے وہ اس گھر کی تقدیر بدل سکتا ہے، اس نے آغاز کیوں نہیں کیا۔ الیاس خان رات کے کھانے پر بھی نہیں تھا۔ بزرگ شرمندہ شرمندہ نظر آتے تھے۔ میرے اصرار پر انہوں نے بتایا۔

''بس میاں تقدیر کا کھوٹا ہوں...... بری صحبتوں میں رہتا ہے وہ، حالانکہ میرا اکیلا بیٹا ہے، ایک بہن ہے اس کی جو ہماری غربت کا شکار ہو کر کنواری بیٹھی ہے۔ مگر وہ توجہ نہیں دیتا۔ بالا خانے میں برے دوستوں کی صحبت ہے اور......''

مجھے بے حد افسوس ہوا تھا۔ میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ بزرگ سے کچھ نہ کہا رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور پھر الیاس خان اندر داخل ہو گیا۔ نشے میں دُھت تھا، قدم لڑکھڑا رہے تھے، چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''پیر و مرشد آپ آ گئے۔ میرے مرشد......'' وہ میرے پاؤں چومنے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔

''تم اتنے گرے ہوئے ہو الیاس خان، ایک بوڑھے باپ کے بیٹے، ایک جوان بہن کے بھائی ہو کر تمہیں شرم نہیں آتی۔ وہ کہاں ہے جو تمہیں ملا تھا۔''

''آپ نے میری تقدیر بنا دی ہے۔ میری عزت بنا دی ہے۔ ایک بار پھر لوگ مجھے جھک جھک کر سلام کرنے لگے ہیں۔ کملا وتی نے میرے لیے ناچنا شروع کر دیا ہے۔ گلنار مجھ پر جان چھڑکنے لگی ہے۔ پیر و مرشد خوش آمدید...... خوش آمدید۔'' وہ نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ اسی وقت بزرگ اندر آ گئے۔

''اسے لے جاؤں مسعود میاں۔ اب یہ صبح ہی کو ہوش میں آئے گا۔'' وہ الیاس خان کا بازو پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ مجھے سخت دُکھ ہوا تھا۔ اس گھر کی کسمپرسی کا عالم آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ الیاس خان کے چند جملوں سے مکمل صورت حال میرے علم میں آ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اشرفیوں سے بھرا وہ کلسا کہاں گیا۔ دفعتاً ہی مجھے ایک عجیب احساس ہوا، ایک فاش غلطی کا احساس، برگد کی جڑ میں مدفون وہ خزانہ مجھے نظر آیا تھا، اس کی کہانی بھی مجھے پتا چل گئی تھی۔ لیکن وہ خزانہ میری ملکیت کہاں سے ہو گیا۔ مجھے یہ حق کہاں تھا کہ میں اسے اپنی مرضی سے کسی کو دے دوں۔ یہ جانے بوجھے بغیر کہ یہ کہاں استعمال ہوگا پھر الیاس خان کی شخصیت کسی حد تک میرے علم میں آ گئی تھی جو شخص سٹہ کھیلتا ہو وہ اچھا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارے میں تو مجھے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا مگر میں نے یہ سب سوچے بغیر اسے کلسے کا پتا بتا دیا صرف اس لیے کہ میری اس سے ذاتی غرض تھی۔ میں اس کے ذریعے ماموں ریاض کا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم اس سنگین غلطی کا احساس ہوا تھا یہ تو...... یہ تو بالکل غیر مناسب بات تھی۔ مجھے بے اختیار ہو کر یہ قدم نہیں اُٹھانا چاہیے تھا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب کیا کر سکتا تھا۔ دل بڑا بے چین رہا۔ رات بھر سکون سے سو نہ سکا، علی الصبح جاگ گیا، نماز پڑھی اس دوران جمال احمد خان

صاحب وہاں آ گئے۔ مجھے دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

"نماز پابندی سے پڑھتے ہو بیٹے؟"

"کوشش کرتا ہوں محترم۔"

"اللہ قبول کرے۔ جوانی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔ نیک والدین کی اولاد ہو۔ ہم اس خوشی سے محروم ہیں ہمارے صاحب زادے خراٹے بھر رہے ہیں۔"

"ایک نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں محترم انکار نہ کیجیے گا۔" میں نے کہا اور ہرجانے کی تھیلی سے مٹھی بھر اشرفیاں نکال کر انہیں پیش کر دیں۔ باقی اس لیے رہنے دی تھیں کہ مجھے ضرورت تھی۔

"یہ کیا ہے......؟" بزرگ لرز کر بولے۔

"ایک ناچیز نذرانہ...... اپنی بہن کے لیے آپ کے بوجھ میں حصہ بٹانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بیٹے ہمارا تو صحیح تعارف بھی نہیں ہے۔ اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔"

"آپ نے فرمایا تھا کہ محبتوں کے رشتے سب کچھ ہوتے ہیں، مجھ سے یہ رشتہ توڑ رہے ہیں؟"

"مگر بیٹے......"

"انکار نہ کریں اور انہیں محفوظ رکھیں۔" بڑے جتن کے بعد جمال احمد نے یہ اشرفیاں قبول کی تھیں۔ ہم ناشتہ کر چکے تھے جب الیاس خان کی صورت نظر آئی، مجھے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا۔

"رات کو بھی آپ کی خدمت میں حاضری دی تھی مرشد مگر اس وقت......"

وہ باپ کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"ہوش میں نہ تھے۔" جمال احمد خان نے کہا اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

"ساری رات آپ کو خواب میں دیکھتا رہا۔ اس وقت بھی یہ دیکھنے آ گیا تھا کہ رات کی وہ کیفیت بھی تو خواب نہیں تھی۔ مرشد آپ کے آنے سے نئی زندگی ملی ہے مجھے بھی اور میرے دوستوں کو بھی۔ مرشد آپ دیکھیے گا کہ یہاں آپ کا کیسا استقبال ہوتا ہے۔ وہ لوگ تو مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ آپ کو لینے دہلی چلا جائے سب غائبانہ مرید ہو گئے ہیں آپ کے۔"

"کون لوگ......؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"وہ فرید خان، نواب دلبر، رحمت یار خان، بڑی مشکل سے باز رکھا اور یقین دلایا کہ مرشد یہاں ضرور آئیں گے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اور اللہ والے جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔"

"تم نے سب کو بتا دیا ہمارے بارے میں......"

"وہ میرے بہترین دوست ہیں مرشد، آپ نے کیا میرے ابا کو اس دولت کے بارے میں بتا دیا جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔"

"نہیں......" میں نے افسردگی سے کہا۔ یہ ساری باتیں سن کر مجھے افسوس ہو رہا تھا، سب کچھ میری حماقت کے سبب ہوا۔ میں نے کہا۔ تم نے میرا کام بھی کیا الیاس خان۔

"بھلا بھول سکتا تھا۔"

"ماموں ریاض ملے......؟"

"منشی ریاض آپ کے ماموں ہیں۔"

"ہاں......" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہاں وہ مل گئے۔"

''میرے بارے میں انہیں بتایا؟'' میں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھا۔
''آپ کا پیغام دے دیا تھا انہیں......''
''کچھ بولے...... کچھ کہا انہوں نے......؟''
''نہیں خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ اچھا۔''
''اچھا......؟'' میں حیران رہ گیا۔ ''اور کچھ نہیں کہا انہوں نے، کچھ خوشی نہیں ہوئی انہیں اس خبر سے......؟''
''اندازہ تو نہیں ہوتا تھا۔''
''تم نے انہیں وہی سب کچھ بتایا تھا جو میں نے کہا تھا۔''
''من وعن......؟'' الیاس خان نے کہا اور میرا دل ڈوبنے لگا، ایسا کیوں ہوا، اس کی کیا وجہ ہے۔ ماموں ریاض کو کوئی خوشی نہیں ہوئی میرے بارے میں سن کر...... کیوں آخر کیوں۔
''اس وقت وہ کہاں ہوں گے......''
''فرید خان کے ساتھ ہی ملیں گے۔''
''مجھے وہاں لے چلو، الیاس خان مجھے فوراً وہاں لے چلو'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔
''بس ذرا ناشتہ کرلوں اتنی دیر میں آپ تیار ہو جایئے۔'' الیاس خان بولا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ایک ایک لمحہ شاق گزر رہا تھا، ہزاروں پریشان کن خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ آہ کیا ہوا ہے ایسا کیوں ہوا کچھ دیر کے بعد الیاس خان تیار ہو کر آ گیا اور میں اس کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔
ماموں ریاض مجھ سے اس قدر بے گانہ ہو گئے۔ انہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی میرے بارے میں سن کر۔ کیوں؟ کیا انہیں الیاس خان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ یا پھر وہ لوگ۔ وہ لوگ میری وجہ سے اس قدر پریشان ہوئے ہیں کہ ان کے دلوں میں میرا کوئی مقام نہیں رہا، وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ کیا امی بھی، ابو بھی اور میری بہنیں۔ حلق میں گولا سا اٹک گیا۔ الیاس خان نے تانگہ روک لیا تھا۔
''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔'' الیاس خان نے کہا۔
''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''یہی کہ منشی ریاض آپ کے ماموں ہیں۔''
''ہاں بس یونہی۔''
''آپ کا پورا خاندان ہوگا مرشد۔''
''ہاں ہے۔''
''کہاں کے رہنے والے ہیں آپ؟''
''الیاس خان میں خاموش رہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور الیاس خان نے گردن ہلا دی تانگہ دوڑتا گیا۔ الیاس خان نے تانگے والے کو ایک پتا بتایا تھا مگر میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ الٰہ آباد کے گلی کوچے نگاہوں سے گزرتے رہے مگر میں نگاہ بھر کر انہیں نہیں دیکھ سکا، دماغ بجھا ہوا تھا۔ دل میں آرزوؤں کی کسک تھی۔ ماں باپ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں ماموں ریاض کے ساتھ ہیں بھی یا نہیں۔ ویسے اُمید تو یہی تھی کہ وہ بھی ماموں ریاض کے ساتھ ہوں گے۔
ماموں ریاض بچپن ہی سے امی کے ساتھ تھے۔ مشکل حالات میں وہ کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ آہ! کاش وہ سب یہاں ہوں۔
بہت فاصلہ طے ہو گیا پھر تانگہ ایک بہت بڑے مکان کے سامنے رُکا اور الیاس خان نیچے اُتر گیا۔ اس نے تانگے والے کو پیسے دیے اور میں نیچے اُتر آیا۔ وسیع و عریض مکان کا احاطہ پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ لکڑی کا بڑا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اندر

کی عمارت احاطے کی بلند دیواروں میں چھپی ہوئی تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ الیاس خان نے اسے کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ ''آیئے مرشد بے دھڑک چلے آیئے۔'' وہ بولا۔

''کیا یہ فرید خان کا گھر ہے؟'' میں نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یہ نواب دلبر کی حویلی ہے۔''

''یہاں کیوں آئے ہو۔''

''سب یہیں ملیں گے۔''

''ماموں ریاض بھی۔''

''ہاں۔'' وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ میں جھجکتے قدموں سے آگے بڑھا۔ احاطے کی یہ دیوار بعد میں بنوائی گئی تھی۔ اندر کی عمارت بوسیدہ تھی۔ وسیع احاطے میں جگہ جگہ جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے تھے۔ ٹوٹی دیواروں کے ڈھیر نظر آرہے تھے، سامنے ہی ایک بڑا دروازہ تھا جسے کھول کر الیاس خان نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''یہاں خواتین نہیں ہیں؟''

''نہیں۔'' الیاس خان بولا۔ ہم دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے کہ ہمیں دو افراد نظر آئے۔ وسیع ہال میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے میز پڑی ہوئی تھی جس پر خالی بوتل اور خالی گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ چونک کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے ان دونوں کو بھی پہچان لیا تھا۔ یہ بھی اس وقت موجود تھے جب میں نے ماموں ریاض کو دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے الیاس خان کو دیکھنے لگے۔

''مرشد ہیں۔'' الیاس خان بولا۔

''کون مرشد۔'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کمال ہے مرشد کو نہیں جانتے، میں نے بتایا تھا تمہیں کہ آنے والے ہیں۔''

''ارے وہ! ارے تو یہ ہیں وہ۔ معاف کیجئے گا محترم ہم پہچان نہیں سکے تھے۔'' وہ آگے بڑھے اور میرے ہاتھ پکڑ پکڑ کر چومنے لگے۔

''مرشد یہ فرید خان صاحب ہیں اور یہ رحمت یار خان میں نے آپ کو بتایا تھا۔''

''اوہ ہاں۔ فرید خان صاحب ہمیں منشی ریاض صاحب سے ملنا ہے۔''

''کام سے گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ملوا دیا جائے گا آپ سے مرشد۔'' فرید خان نے کہا اور بور ''آپ تشریف رکھیے۔''

''شکریہ۔ کب تک آجائیں گے۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''ہمیں آپ کی آمد کا علم نہیں تھا عالی حضور، ورنہ انہیں نہ جانے دیتے۔ چند کاموں سے گئے ہوئے ہیں واپسی میں کچھ دیر لگ جائے گی۔ آپ تشریف رکھیں، رحمت تم نواب صاحب کو خبر دے دو۔'' رحمت یار خاموشی سے اُٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ فرید خان بار بار مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک رحمت یار تھا دوسرا یقیناً نواب دلبر ہوگا، یہ شخص ان سب میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ گہری سرخ آنکھیں، نکیلی مونچھیں، بلند و بالا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، موٹے ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی اس کے دو دانت سونا چڑھے تھے۔

''تو یہ ہیں تمہارے مرشد الیاس خان۔'' نواب دلبر نے کہا۔

''ہاں یہی ہیں۔''

''ہمیں تو اب بھی یقین نہیں آیا۔'' وہ بولا۔

''کیا مطلب؟''

''سکھا پڑھا کر لائے ہو گے کونسا مشکل کام ہے۔''

''تم لوگوں نے انہیں سمجھایا نہیں، پہلے بھی انہوں نے ایسی ہی باتیں کی تھیں، برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، اب مرشد کے سامنے بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ میری غلطی یہی ہے کہ دوبارہ تم لوگوں کے پاس آ گیا اور سب کچھ ایمانداری سے تمہارے حوالے کر دیا۔''

''نواب دلبر یہ تمہاری زیادتی ہے۔'' رحمت یار بولا اور دلبر نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا زیادتی ہے تو کی کیئے دیتے ہیں مگر بڑے چھوٹے سے ہیں مرشد ابھی تو ان کے گلی ڈنڈا کھیلنے کے دن ہیں۔ خیر ہمیں کیا یاروں کا کہنا ہے مان لیتے ہیں، اماں کچھ خاطر مدارت کرو ان کی، الیاس خان اندر لے چلو انہیں یہاں چورا ہے پر کیوں بٹھا رکھا ہے۔''

''الیاس خان تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔'' میں نے کہا۔

''یہ سب آپ سے ملنا چاہتے تھے مرشد۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آئے تو ان سے ضرور ملاؤں گا۔''

''مگر میں صرف منشی ریاض سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ان سے بھی مل لینا میاں خان پریشانی کی کیا بات ہے، ہم بھی اتنے بُرے نہیں ہیں۔'' نواب دلبر تمسخرانہ انداز میں بولا۔ مجھے بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ سب کچھ غلط ہوتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ بُرے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کا اندازہ مجھے پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ ابتدا ہی سے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ مجھے کسی بہتر جگہ نہیں ملے تھے۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر نظر آنے والے لوگ اچھے تو نہیں ہوتے۔ میں اتنا فیاض ہو گیا کہ زیرِ زمین نظر آنے والا خزانہ الیاس خان کے سپرد کر دیا۔ اپنی ملکیت کی طرح اور پھر۔ آہ بڑی غلطی ہوگئی اس کا احساس تو پہلے ہی ہو گیا تھا۔

''چلیے مرشد۔'' الیاس خان نے کہا۔

''میں واپس جانا چاہتا ہوں ماموں ریاض مل جائیں تو بعد میں مجھے ان سے ملا دینا۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے کہاں میاں خان۔ مہمان آتے اپنی مرضی سے ہیں جاتے میزبان کی مرضی سے ہیں۔ اب تم لوگ آنکھیں پھاڑ رہے ہو، لے چلو انہیں اندر۔'' اس بار نواب دلبر کا لہجہ سخت تھا، وہ کھڑے ہو گئے۔ الیاس خان کے انداز میں جھجک نظر آ رہی تھی اس نے کہا۔

''چلیے مرشد۔''

''گویا تم لوگ میرے ساتھ سختی پر آمادہ ہو۔''

''اماں ہم سے بات کرو خان، ہمارا نام ہے دلبر، چھری کا کھیل کھیلتے ہیں اور پکے دوزخی ہیں۔ جنت تو ہمیں ملنے کی نہیں بے گناہ ہی اتنے کیے ہیں۔ تم جانو ہو ایک قتل کی سزا بھی موت ہے اور دس قتل کی بھی، سمجھ گئے ہو گے۔ سو پچاس گناہ اور کریں گے سو بھی دوزخ میں جائیں گے۔ یہ بے چارے کچے ہیں تم سے ڈر رہے ہیں، اُٹھو اور اندر چلو ورنہ چھری بھونک دیں گے اور انتڑیاں نکال کر انگنی پر لٹکا دیں گے۔'' اس نے نیفے سے چھری نکال لی۔ مجھے اُٹھنا پڑا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے الیاس خان۔''

''آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی مرشد، بلکہ ہم تو آپ کو آسمان پر بٹھا دیں گے۔ خلقت آپ کے پاؤں چومے گی۔ آپ دیکھیں تو سہی۔ نواب صاحب آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔'' الیاس خان بولا۔

''اور تم ہمیں دھوکا دے کر یہاں مجرموں کے درمیان لے آئے۔ خیر حساب ہو جائے گا بعد میں۔'' اُٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ اندر آ گیا باہر سے بُرے حال نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے بہت بہتر تھی۔ مجھے کافی اندر ایک کمرے میں لایا گیا یہاں خوب روشنی تھی، کچھ قدیم فرنیچر بھی پڑا ہوا تھا۔ نواب دلبر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''ہاں میاں خاں، کہانی یہ ہے کہ یہ الیاس خان دلی گیا، واپس آیا تو سونے کے ڈھیر لایا تھا۔ ہم لوگ پرانے ساتھی

ں اچھے خاندانوں کے تھے مگر وہ پرانی بات ہے۔ وقت نے جو دکھائی دیکھنی پڑی اور جو کرایا کرنا پڑا، اب تو وضع کی
تیں بھول گئے ہیں، جہاں سے جو کچھ مل جائے ہے سارے مل کر کام چلا لیویں ہیں۔ سو جب الیاس خان گنتیوں کے
لے کر آیا تو سیدھا ہمارے پاس پہنچا، دوستوں میں یہ معاہدہ ہے مگر اس نے کہانی بڑی عجیب سنائی۔ ہمیں تو خیر ایک
ر یقین نہیں آتا مگر یہ سب لٹو ہو گئے کہ ایسے میاں صاحب مل جائیں تو پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔ ہم بھی چپ
کہ چلو تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو مگر یہ تمہیں پکڑ ہی لایا بھائی جی، پہلے تو یہ
تم ہو کون۔ تم نے ہمیں شکتی پور میں دیکھا تھا؟''
''ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''کہاں؟''
''شکنتا نامی طوائف کے کوٹھے پر۔''
''تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''
''کچھ کر رہا تھا تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔''
''یہی تو کانٹے کی بات ہے، یہیں سے تو پول کھلتی ہے، ایسے شوقین درویش کہاں ملتے ہیں۔ چلو مان لیا مگر وہ گنتیاں
سے آئیں، کیا سچی مچی تم نے وہ خزانہ بتایا تھا؟''
''ہاں۔''
''تب تو پیارے اور بھی خزانے معلوم ہوں گے تمہیں؟ کیوں؟''
''کچھ نہیں معلوم مجھے۔''
''وہ کیسے معلوم ہو گیا جو الیاس خان کو دیا تھا۔''
''تمہیں بتانا ضروری نہیں ہے۔''
''گویا شرافت سے کام نہیں نکلے گا، تمہاری مرضی ہے میاں خاں۔ آؤ ہم تمہیں اپنا خزانہ دکھائیں۔ لے کر آؤ مرشد کو۔''
دلبر نے کہا۔
''میری جدوجہد بیکار تھی، اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک بار پھر دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ جو کیا ہے اس کا خمیازہ شروع ہو گیا
اب نقصانات کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ جانا پڑا۔ بڑی پُراسرار حویلی تھی۔ کمرے در کمرے سب کے سب ویران پڑے
۔ ایک کمرے میں قید خانے کا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک الماری کے پیچھے تھا جسے دو آدمیوں نے پوری قوت سے سرکایا
ب وہ دروازہ نمودار ہوا تھا، الماری سرکانے سے جو جگہ پیدا ہوئی تھی اس میں کواڑ کھلا تھا اور گہری تاریکی تھی، رحمت یار
نے میرا ہاتھ پکڑا، الیاس خان نے ماچس نکال کر تیلی جلائی اور مجھے وہ زینہ نظر آ گیا جو نیچے جاتا تھا۔ بارہ سیڑھیاں تھیں،
کے بعد کوئی لامحدود جگہ جو تاریک پڑی تھی۔ نواب دلبر پہلے ہی نیچے اُتر گیا تھا۔ پھر اس نے ایک شمعدان میں لگی لمبی لمبی
ں روشن کر دیں۔ شمع دان ایک بلند اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے روشنی پھیل گئی تھی۔ یہاں ایک بیڈ پڑا ہوا تھا اور
ں کچھ آرام کرسیاں پڑی ہوئی تھیں مگر یہ تہہ خانہ وسیع لگتا تھا۔ روشنی بہت دُور تک نہیں جا رہی تھی۔''
''بٹھا دو انہیں!'' دلبر نے کہا اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا، دُوسرے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ ''تو میاں مرشد۔ اصل بات
ہی جانو ہو بیرا۔ ہم سے جو کچھ کہا گیا ہے ہمیں تو وہی معلوم ہوگا!''
''تم اچھا نہیں کر رہے نواب دلبر۔''
''زندگی بھر نہیں کیا اب کیا کریں گے۔ مگر تم نیکی کر لو!''
''کیا چاہتے ہو؟''
''خزانہ۔ خزانے۔ سٹے کے نمبر۔ ڈربی کی ریس میں انعام۔ سترہ تاریخ کو بمبئی میں ڈربی ہو رہی ہے۔ گھوڑوں کے نمبر

بتاؤ۔ سِکّے کے دو چار نمبر بتادو۔ کوئی خزانہ دبا پایا ہو تو وہ بتادو۔ ہماری ضرورت پوری ہو جائے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔''

''منشی ریاض کہاں ہیں؟''

''ان سے بھی ملا دیں گے۔''

''مجھے ان سے ملا دو۔''

''ہمارا کام ہونے کے بعد۔''

''تمہارا کوئی کام میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''بس وہ خزانہ مجھے زمین میں دفن نظر آ گیا تھا، میں نے الیاس خان کو بتا دیا۔''

''زمین میں خزانوں کی کیا کمی ہے۔ تمہیں سیر کرا دیں گے چندا۔ یہاں بڑے بڑے راجوں مہاراجوں کے محل دو محلوں کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ کہیں تو کچھ ملے گا۔ ویسے چندا یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔ ہم بڑے سر پھرے ہیں، زمین میں چھپے خزانے دیکھ سکتے ہو تو اس تہہ خانے کے فرش کے نیچے بھی جھانک لینا، چار بندوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے نظر آ جائیں گے تمہیں۔ ان سے لگی ہوئی تھی ہماری۔ گلا دبا کر یہیں قبرستان بنا دیا سسروں کا۔ پوچھ لینا ان سے ساری رام کہانی سنا دیں گے تمہیں۔ پانچویں تم ہو گے ہماری نہ مانی تو ویسے بھی تم اللہ والے ہو یہاں دفن ہو گئے تو برکت رہے گی کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو!''

''مذاق سمجھ رہے ہیں میاں صاحب ہماری بات کو۔ چلو تھوڑا سا آرام کرنے دو۔ دو تین دن کے بعد دیکھیں گے۔''

''نہیں نواب دلبر، ایسے نہیں کام ہوتا ہے۔'' الیاس خان بولا۔

''ابے رحمت یار۔ فرید خاں۔ یہ الیاس خان کچھ زیادہ نہیں بولنے لگا ہے، کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں۔ میاں چار گنتیوں پر اکڑ رہے ہو تو حساب کتاب کر لو۔ لاکھوں خرچ کر چکا ہوں تم پر۔ تمہیں جو کرنا تھا وہ تم کر چکے اب ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ آؤ۔'' نواب دلبر نے سخت لہجے میں کہا اور اس بار الیاس خان کچھ نہ بولا۔ وہ سب سیڑھیاں عبور کر کے باہر نکل گئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

میرے بدن میں ٹھنڈی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ دماغ پر ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا، جو کچھ ہوا تھا وہ ہونا چاہیے تھا، بلکہ یہ تو کم ہے اس سے زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ پھل چکھنے کے دور سے گزر رہا تھا، پھل کھانے کی اجازت ملی تھی مگر میں نے باغ لٹانے شروع کر دیے تھے۔ مجھے اس کا حق کہاں پہنچتا تھا۔ اس غلطی کا احساس تو پہلے ہی ہو چکا تھا نہ جانے کیوں میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب میرا کوئی محاسب نہیں ہے، یہی غلطی کی تھی۔ اب؟ کچھ ذہن میں نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا۔ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ شمعیں روشن تھیں ان کی لو لرز رہی تھی، ماحول بڑا ہولناک ہو گیا تھا۔ آہ۔ الفاظ نہیں تھے میرے پاس۔ اب تو معافی بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ فرش پر لیٹ جانے کو جی چاہا اور میں نے اس پر عمل کر ڈالا۔ تھک گیا تھا، شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ دماغ کو خالی کر دیا تھا میں نے اس عالم میں، کافی دیر گزر گئی۔ شمعیں آنکھوں کے سامنے تھیں پلکوں پر پیلی روشنی پڑ رہی تھی۔ مگر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُٹھ کر شمعیں بجھا دیتا، جیتا جاگتا انسان تھا، اندھیرے سے ڈرتا تھا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا، شمع دان اُٹھایا اور اس وسیع تہہ خانے کے دُوسرے گوشے دیکھنے لگا۔ بہت بڑے حصے میں تھا، خالی پڑا ہوا تھا سوائے ان چند چیزوں کے فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا تھا اور چار ایسے نشانات صاف مل گئے تھے جن سے نواب دلبر کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ یعنی اس نے چار انسانوں کو ہلاک کر کے یہاں دفن کر دیا تھا۔ مگر میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا، وہ کیا اور اس کی اوقات کیا، میں تو خود سے ڈر رہا تھا جو کیا تھا اس سے دہشت زدہ تھا۔

بہت وقت گزر گیا کوئی آواز نہیں تھی۔ احتیاطاً چند شمعیں بجھا دی تھیں، بس ایک روشن رہنے دی تھی۔ زیادہ وقت گزارنا پڑا تو تاریکی میں رہنا پڑے گا۔ نواب دلبر تو کئی دن کی بات کر گیا تھا۔ شاید رات ہو گئی۔ تہہ خانے میں اس کا تعین تو نہیں کیا جا

سکتا تھا بس وقت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، فرش سے اُٹھ کر بیڈ پر جا لیٹا بستر سے بدبو اُٹھ رہی تھی، مگر اس پر پڑا رہا۔ پھر اچانک سرسراہٹیں سنائی دیں اور میں اُچھل کر اُٹھ بیٹھا۔ نگاہیں دروازے پر ہی تھیں مگر کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ آوازیں پھر سنائی دیں۔ سمت کا بھی اندازہ ہو گیا پھرتی سے پلٹا اور تاریکی کی عادی آنکھوں نے اس انسانی سائے کو دیکھ لیا جو ایک گوشے میں نظر آ رہا تھا، میں ششدر رہ گیا۔ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا۔ دروازہ تو بند ہے۔ ہمت کر کے آواز دی۔

''کون ہے؟''

''ہم ہیں۔'' جواب ملا۔

''کون؟''

''ارے ہم اور کون تمہارے پاس ہمارا ایک کمبل ہے۔''

''کیا؟'' میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔

''ریل میں تھے تم۔ ہمارا کمبل لے گئے تھے۔ واپس نہیں دیا تم نے۔'' یہ وہی آواز تھی جس نے کہا تھا۔ ''آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کر سوئیے اور اس کے بعد کمبل میرے چہرے پر ڈھک دیا تھا۔ کمبل ہٹا تو میں دہلی میں تھا۔ وہی آواز تھی مگر کمبل۔ واقعی میں دیوانہ ہو گیا تھا، اپنی لگی میں سب کچھ بھول گیا تھا، کمبل میں الیاس خان کے گھر پر ہی چھوڑ آیا تھا اور وہ کمبل۔ وہ تو میری رہنمائی کرتا تھا اسے میں نے ہر لمحہ ساتھ رکھا تھا، اس سے مجھے ہمیشہ مدد حاصل ہوئی تھی اس نایاب چیز کو میں اس طرح چھوڑ آیا تھا۔''

''ہمارا کمبل واپس دو گے بھائی۔ ہمیں ضرورت ہے۔''

''اس وقت وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''کہاں گیا؟''

''میں اسے وہاں بھول آیا ہوں جہاں میں تھا۔''

''تم ایک اچھے امانت دار نہیں ہو بھائی، ارے واہ ہمارا کمبل ہی کھو بیٹھے۔ یہ کوئی بات ہوئی۔''

''معافی کا کوئی راستہ ہے میرے لیے، جو غلطی ہوگئی ہے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے کسی طرح؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''راستے مشکل سے ملتے ہیں۔ نظر آ جائیں تو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے، بھول بھلیاں ہیں سب بھول بھلیاں ہیں۔ سورج تو بڑا روشن ہے ایک دھبے کو سورج سمجھ لینا دانشمندی تو نہیں ہے، جو دانشمند نہیں وہ کچھ نہیں ہے۔''

''معافی کا کوئی راستہ ہے میرے لیے۔'' میں چیخ کر بولا۔

''ارے ہمیں کیا معلوم، ہم پر کیوں بگڑ رہے ہو، ایک تو ہمارا کمبل کھو دیا اُوپر سے بگڑ رہے ہو۔''

''دیکھو، انسان ہوں، گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں، بہت تھک گیا ہوں، بھٹک جاؤں گا، مجھے سہارا دو۔ مجھے سہارا چاہیے ورنہ راستہ بھول جاؤں گا۔''

''ہمیں کچھ نہیں معلوم ہمارا کمبل دے دو۔''

''سہارا چاہیے مجھے سہارا چاہیے مجھے سہارا دو۔''

''سہارا دینے کا کام ہمارا نہیں ہمارے بھائی کا ہے۔'' انسانی ہیولا غائب ہو گیا۔ مجھ پر دیوانگی سوار ہوگئی تھی، جنون طاری ہو گیا تھا، میں چیختا رہا مگر اب میری آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر میں خاموش ہو گیا۔ دماغ بند بند سا ہو گیا تھا۔ میں نے تند نظروں سے چاروں طرف دیکھا، آگے بڑھا، اکلوتی شمع سے ساری شمعیں روشن کر دیں۔ تبھی میری نظر شمع دان کے اسٹینڈ پر پڑی۔ وزنی فولاد کا بنا ہوا تھا، کوئی تین فٹ لمبا اور ٹھوس شمع دان اس پر سے اُتار کر میں نے ایک طرف پھینک دیا۔ وزنی اسٹینڈ اُٹھا کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ نیچے گری ہوئی شمعیں روشن تھیں اور مجھے دروازہ نظر آ رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر کھڑے ہو

کر میں نے اسٹینڈ ہاتھوں میں تولا اور پھر پوری قوت سے اسے دروازے پر مارا۔ لکڑی تڑخنے کی آواز سنائی دی اور دروازے میں سوراخ ہو گیا۔ میرے ہاتھ مشینی انداز میں چلتے رہے اور تہہ خانہ میں دھماکے گونجتے رہے۔ میں نے دروازے کے پرخچے اُڑا دیے تھے جب اس کے دونوں کواڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو میں نے اس اسٹینڈ سے الماری پر وار شروع کر دیے، الماری ٹوٹ تو نہیں سکی مگر کھسک ضرور گئی۔ تھوڑی سی جگہ بنی تو میں نے اس میں ہاتھ ڈال کر اسے مزید سرکایا اور اتنی جگہ بنا لی کہ باہر نکل آؤں

اور میں باہر نکل آیا۔ اتنے زوردار دھماکے ہوئے تھے، اتنی آوازیں ہوئی تھیں مگر کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی موجود نہیں ہے، اچھا ہی تھا ورنہ۔ نہ جانے میری دیوانگی کہاں تک جاتی۔ راستہ تلاش کرتا باہر نکل آیا، آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ خاموش چاندنی تاحدِ نگاہ بکھری ہوئی تھی۔ لوہے کا اسٹینڈ پھینک دیا، دماغ تاریک ہو رہا تھا، اس عمارت سے باہر نکل آیا اور آگے بڑھ گیا۔ چلتا رہا بے مقصد۔ کوئی منزل نہیں تھی۔ نہ جانے کونسی قوت سیدھے راستے پر لے آئی، چونک کر دیکھا تو الیاس خان کے مکان پر کھڑا تھا، یقین نہیں آیا، کسی راستے کا تعین نہیں تھا، نہ جانے یہاں تک کیسے پہنچا تھا، اگر حواس کے عالم میں ہوتا تو راستہ تلاش کرنا ناممکن تھا۔ لیکن بے حواسی رہنما بن گئی تھی اب کیا کروں۔ اس مکان سے میرا کیا واسطہ ہے۔ مجھے اب دوبارہ یہاں نہیں آنا چاہیے مگر یہاں میرا کمبل تھا۔ دُوسرا سامان تھا اور پھر الیاس خان۔ آہ کچھ بھی ہو جائے الیاس خان ہی مجھے ماموں ریاض کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو وہ میرا بدترین دُشمن ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے راندۂ درگاہ ہونا پڑا ہے۔ وہ بھی ان کا شریک کار ہے اس نے بدعہدی کی ہے مجھ سے۔ حالانکہ رات بہت ہو گئی تھی مگر دستک دینا پڑی۔ دُوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ جمال احمد خاں صاحب تھے چونک کر بولے۔

''رے بیٹے آپ۔ آ جاؤ۔ الیاس کہاں ہے؟''

''گھر نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''صبح ہی کے گئے ہوئے ہیں؟''

''ہاں آپ کے ساتھ ہی گیا تھا۔''

''وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ دوستوں نے تو اسے تباہ کیا ہے۔ آؤ میاں اندر آؤ۔ آرام کرو اس کا کیا انتظار کرنا۔'' میں اندر داخل ہو گیا، مجھے بہرحال اس کا انتظار کرنا تھا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو بیٹے تو بتا دو۔''

''نہیں بے حد شکریہ۔'' میں نے کہا اور وہ چلے گئے۔ میں اس کمرے میں داخل ہو گیا جو میری آرام گاہ تھا۔ سب سے پہلے میں اپنے سامان کی طرف لپکا۔ مجھے کمبل کی تلاش تھی۔ مگر کمبل موجود نہیں تھا۔ سارا سامان اسی طرح موجود تھا سوائے کمبل کے۔ کمبل کہاں گیا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کمبل کسی نے غائب کر دیا ہوگا کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ اس وقت پوچھ گچھ بھی نہیں کر سکتا تھا بہرحال صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ نیند کا تو اب تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جاگتا رہا، سوچتا رہا۔ رات شاید آخری پہر میں داخل ہو گئی تھی۔ دروازے پر ہولے ہولے دستک ہوئی اور میں اُچھل پڑا۔ الیاس خان۔ میرے ذہن میں گونجا۔ اندر سے سارا وجود کھول اُٹھا۔ آنکھوں سے شرارے اُبل پڑے۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا، کہیں اندر اس دستک کو نہ سن لیا جائے، اس سے پہلے ہی الیاس خان کو چھاپ لینا ضروری تھا۔ برق رفتاری سے ننگے پاؤں باہر نکلا دروازے پر پہنچ گیا، آہستہ سے زنجیر کھولی وہی تھا۔ اس نے اندر قدم رکھا تو میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈالا دوسرے سے منہ بھینچ لیا تاکہ وہ چیخ نہ سکے اور اس طرح دبوچے ہوئے اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ الیاس خان کچھ نہ سمجھ سکا تھا، میں نے اسے فرش پر لا پٹخا۔ پوری زندگی میں مجھ پر یہ کیفیت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی جو اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ الیاس خان نے پلکیں پٹپٹا کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔

''تم۔'' اس کے منہ سے سرسراہٹ نکلی۔
''ہاں الیاس خان۔ تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ میں تمہارے قید خانے سے نکل آؤں گا''
''نہیں مجھے یقین تھا۔'' وہ بولا۔ اور پھر سہارا لے کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
''میں نے ان لوگوں سے بھی کہہ دیا تھا۔''
''تم نے میرا برسوں کا مجاہدہ ختم کر دیا الیاس خان۔ صرف تم ہو جس نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا۔ نہ جانے کیا کیا جتن کئے تھے میں نے، نہ جانے کیا کیا مگر تم نے الیاس خان۔ تم نے!''
''کچھ کہنا چاہتا ہوں سن لو گے؟'' وہ بولا اور میں اسے گھورتا رہا۔ ''صدیوں کے بعد جاگا ہوں۔ برسوں کے بعد آنکھ کھلی ہے، بے ہوش تھا یا سو گیا تھا تمہاری وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ ایک اور بات بھی سن لو۔ سزا چاہتا ہوں، ہر قیمت پر سزا چاہتا ہوں۔ بدترین سزا بہتر ہے وہ موت ہو۔ تمہارا احسان ہوگا اتنا کچھ کھو چکا ہوں کہ ہوش میں آنے کے بعد جینا مشکل ہوگا۔ بے حد مشکل۔ تمہیں بہلا نہیں رہا یہ سب کچھ کہہ کر رعایت نہیں مانگ رہا بلکہ کچھ سن لو۔ ایک تھکا ہوا بے بس انسان ہوں۔ میرا اختتام ہو چکا ہے۔ آخری باتیں کہہ رہا ہوں تم سے۔ وہ لوگ تمہیں نہیں جانتے مگر میں جانتا ہوں۔ نواب دلبر نے جو کچھ کیا وہ اس کا قدم تھا مجھے اس کی خبر نہیں تھی جو کچھ ہوا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا مگر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہوا کو قید نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی بھول ہے۔''
''میں فضول کہانیاں نہیں سننا چاہتا الیاس خان۔''
''سن لو۔ خدا کے لیے سن لو۔ اس کے بعد میں مر جانا چاہتا ہوں، تم نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو میں خودکشی کر لوں گا، دل اُکتا گیا ایک دم سے۔ دُنیا بہت بُری ہے، میرے تصور سے بھی زیادہ بُری۔ میں خود بھی اتنا ہی برا ہوں۔ ایک بُرے انسان سے دُنیا کو چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں۔''
میں الیاس خان کو گھورنے لگا، اس کا لہجہ عجیب تھا جیسے۔ جیسے وہ سچ بول رہا ہو، جیسے وہ فریب نہ کر رہا ہو وہ کہنے لگا۔
''جتنی برائیوں کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ مجھ میں موجود ہیں۔ بوڑھا باپ ہے جوان بہن ہے مگر میں نے کبھی ان کے بارے میں نہیں سوچا۔ اپنے تعیشات میں مگن رہا۔ میرے گھر والے فاقے کرتے رہے اور میں اعلیٰ درجے کے کھانے کھاتا رہا۔ میری بہن کے پاس دو جوڑے کپڑے بھی نہ تھے اور میں طوائفوں کو تحفوں سے خوش کرتا رہا، یہ سب کچھ کیا ہے میں نے۔ آج تک یہی کیا ہے مگر نہ جانے کیسے ہوش آ گیا نہ جانے کیسے۔''
''الیاس خان۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔'' میں نے غرا کر کہا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ سسک کر روتے ہوئے بولا۔
''خدا کے لیے مسعود صاحب، خدا کے لیے آپ کو اللہ نے بڑا بنایا ہے، میری سن لیجیے دل ہلکا کرنا چاہتا ہوں، بڑا بوجھ ہے سینے پر۔ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ نواب دلبر ہم پر حاوی ہے۔ حالانکہ ہم بچپن کے دوست ہیں۔ وہ بگڑا ہوا رئیس ہے۔ پہلے اس کے پاس بہت کچھ تھا مگر عیاشیوں میں گنوا بیٹھا، ہم تینوں ہمیشہ سے اس کے شریک تھے جب اس کے اپنے پاس سب کچھ ختم ہو گیا تو ہم چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگے۔ جوا، سٹہ کھیلنے لگے، ہمیں پیسہ درکار تھا جس کے حصول کے لیے سب کوششیں کرتے تھے، ہر وہ جگہ تلاش کرتے تھے جہاں سے کچھ ہاتھ لگ جائے۔ سب یہی کرتے تھے میں اکیلا نہیں تھا۔ میں نے اپنے گھر میں چوری کی، ماں باپ کو رُلایا، میں رشتے داروں سے قرض لیتا رہا جسے میرے والد ادا کرتے رہے، بے چارے شیخ عبدالقدوس صاحب سے بھی میں نے بہت کچھ لیا۔ وہ مجھے صرف اس لیے یہ رقم دیتے رہے کہ میں ان کی بیٹی کا سسرالی رشتے دار تھا۔ ہم سب جو بھی حاصل کرتے اسے یکجا ہو کر خرچ کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ نے مجھے جو قیمتی خزانہ دیا وہ میں نے لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ دنگ رہ گئے۔ پھر میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتایا یہ سنا... اور وہ بضد ہو گئے کہ آپ کو لینے دلی چلا جائے، میں نے انہیں منشی ریاض کے بارے میں بتایا اور یقین دلایا کہ آپ منشی

ریاض سے ملنے ضرور آئیں گے۔ اس دن سے سب آپ کا انتظار کر رہے تھے مگر میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ یہ سلوک کرے گا۔ اس نے آپ کو قید کر دیا اور اس وقت میرے ضمیر پر ضرب پڑی۔ مجھے احساس ہوا کہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے کے ساتھ یہ سلوک میری وجہ سے ہوا۔ بعد میں، میں ان سے لڑ گیا، میں نے کہا کہ انہوں نے غلطی کی ہے، اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا ہمارا اور میری آنکھیں اچانک کھل گئیں۔ میں اسی احساس میں ڈوبا ہوا اس وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ راستے بھر میں یہ سوچتا رہا تھا کہ اب کیا کروں، کچھ کرنا تو میرے بس میں نہیں ہے مگر خودکشی تو کر سکتا ہوں۔"

میں خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا۔ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ یہ تو اللہ جانے مگر اب میں اس کا کیا کروں۔ اب میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں۔ غصہ اُتر گیا تھا میں نے اسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔

"میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی تھی الیاس خان مگر تم نے!"

✦✤✦✤✦

"مجھے احساس ہے مسعود صاحب۔"

"اگر دل میں واقعی سچائیاں اُتر آئی ہیں تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"تم خودکشی کر لو۔ اس الیاس خان کو ختم کرو جو بُرا انسان تھا۔ اسے فنا کر دو ایک باپ کا سہارا بن جاؤ۔ ایک جوان بہن کے محافظ بن جاؤ۔ محنت مزدوری کر کے اس بُرے انسان کی برائیوں کا کفارہ ادا کرو۔ خود کو مٹا کر ایک اور گناہ نہ کرو۔ اس بوڑھے شخص کو جوان بیٹے کی موت کا داغ نہ دو، جو بے کس ہے بلکہ اس کے ناتواں بدن کو اپنے طاقتور جسم کا سہارا دو۔ ہو سکتا ہے اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔"

وہ گردن جھکائے آنسو بہاتا رہا، یہ آنسو مکر کے آنسو نہیں تھے، میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اب وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"اسی عمارت میں گئے ہیں۔"

"تم اب تک انہی کے ساتھ تھے؟"

"ہاں ان سے قطع تعلق کر کے آیا ہوں۔"

"وہ یہ تو نہ سوچیں گے کہ تم نے مجھے وہاں سے نکالا ہے؟"

"نہیں میں تو اسی وقت سے ان کے ساتھ تھا مگر میں نے دعویٰ کیا تھا کہ آپ وہاں قید نہیں رہ سکیں گے، نواب دلبر ہنسنے لگا تھا۔ وہ مجھے بھی وہیں لے جا رہا تھا مگر میں واپس آ گیا۔"

"نواب دلبر تمہارے لیے خطرہ تو نہیں بن جائے گا؟"

"اس میں میرے مقابل آنے کی ہمت نہیں ہے مرشد۔"

"تو پھر میری ہدایت کے متعلق کیا خیال ہے۔"

"مرشد۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔"

"تو اسے میری طرف سے سزا سمجھ کر قبول کر لو!"

"آپ کا دل صاف ہو جائے گا میری طرف سے؟"

"ہاں مگر بعد میں تم مجھ سے سٹے کا نمبر مت مانگ بیٹھنا۔" میں نے کہا۔

"نہیں مرشد۔ حرام کا پیسہ اب میرے لیے حرام ہے۔ میں محنت کی کمائی کر کے اپنے ماں باپ کو کھلاؤں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں مرشد جو کر چکا ہوں وہ اب نہیں کروں گا۔ مرشد میرے حق میں دُعا کریں۔ اللہ مجھے زندگی دے تو اب اسے میرے گناہوں کے کفارے کے لیے وقف کر دے پھر سے، گناہوں کی دلدل میں پھنسوں تو مجھے موت دے دے۔" اس کے الفاظ سچائی کا اظہار کر رہے تھے میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب کچھ اور پوچھوں تم سے الیاس خان۔''
''پوچھیں مرشد۔''
''منشی ریاض سے واقعی ملے تھے؟''
''ہاں۔ وہ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔''
''ان سے میرا تذکرہ کیا تھا۔''
''ہاں۔''
''اور ان پر وہی ردعمل ہوا تھا جو تم نے بتایا تھا۔''
''بالکل وہی۔''
''وہ فرید خاں کے پاس کام کرتے ہیں۔''
''بالکل یہی بات ہے۔''
''مجھے ان سے ملا سکتے ہو۔''
''آپ اسے میری ذمہ داری پر چھوڑ دیں مسعود صاحب، میں کل ہی انہیں یہاں لے آؤں گا۔''
''وہ فرید خاں کے پاس رہتے ہیں؟''
''نہیں اس کے ساتھ نہیں رہتے۔''
''پھر؟''
''ان کا کوئی اور گھر ہے۔ شام کو چھٹی کر کے چلے جاتے ہیں۔''
''تم ان کا گھر جانتے ہو؟''
''نہیں۔''
''کل مجھے وہاں پہنچا سکتے ہو جہاں وہ کام کرتے ہیں۔''
''فرید خاں کے گھر پر رہتے ہیں وہ۔''
''وہیں سہی۔''
''مرشد۔ فرید خاں کے گھر پر ان سے ملنا دُرست نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو آپ کے نکل آنے کا پتا چل چکا ہوگا۔ وہ [illegible]ں کی طرح آپ کو تلاش کریں گے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔''
''کیا......؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''مرشد، میں نے نواب دلبر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ کچھ لینے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا جو اس نے [illegible]ار کیا ہے۔ اس کے لیے آپ کی خدمت کی جاتی۔ آپ کی محبت حاصل کی جاتی مگر اس نے کام ہی دُوسرا شروع کر دیا۔ میں [illegible] یہ بھی کہا تھا اس سے کہ اس کا وہ قید خانہ مرشد کو نہ روک سکے گا اور وہ اپنی رُوحانی قوتوں سے کام لے کر وہاں سے نکل [illegible]یں گے۔ اس پر فرید خان نے کہا تھا کہ ایسا ہوا تو نواب دلبر کی گردن میں پھانسی کا پھندہ فٹ ہو جائے گا کیونکہ وہ مرشد کو [illegible]چار لاشوں کے بارے میں بتا چکے ہیں جو تہہ خانے میں دفن ہیں اور جنہیں نواب دلبر نے قتل کیا ہے۔''
''اوہ۔ ہاں۔'' میں چونک پڑا۔
''نواب دلبر اس بات پر پریشان ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ واپس پرانی گڑھی گیا تھا۔''
''پرانی گڑھی؟''
''اسی حویلی کا نام ہے وہ رہتا الگ ہے، پرانی گڑھی اس کے پرکھوں کی ملکیت ہے اور جائیداد میں بس وہی باقی رہ گئی [illegible]، باقی سب وہ ختم کر چکا ہے۔ ان باتوں کے بعد وہ اُٹھ گیا اور اس نے سب سے کہا کہ پرانی گڑھی چلیں، کہیں کچھ ہو ہی نہ

جائے، میں اس سے اختلاف کر کے چلا آیا تھا۔"
"تب تو اس وقت اس کی جان ہی نکلی ہوئی ہوگی۔"
"یقیناً مرشد۔"
"ہوں تو پھر یوں کرنا الیاس خان کہ تم مجھے دُور سے فرید خاں کا گھر دکھا دینا۔ میں اس وقت منشی ریاض سے ملوں گا جب وہ فرید خاں کے گھر سے نکلیں گے اور اپنے گھر جائیں گے۔"
"جو حکم مرشد۔" "مگر آپ خود کو محفوظ رکھیں۔"
"اطمینان رکھو۔" میں نے کہا اور الیاس خان نے گردن جھکا لی۔ میں نے خود ہی کہا۔ "اور اب تم جاؤ آرام کرو۔ اس نئی زندگی پر سب سے پہلی مبارک باد میں تمہیں پیش کرتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر رو پڑا۔ میرے ہاتھ چومے اور باہر نکل گیا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ جمال احمد خاں کا بڑھاپا سنور جائے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔ دیر تک ان کی خوشیوں کا اندازہ لگاتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اُداسیوں میں ڈوبتا چلا گیا، میری خوشیاں کہاں ہیں مجھے خوشیاں کب ملیں گی مجھ پر یہ نحوستیں کب تک طاری رہیں گی، وہ میری تقدیر کی صبح کب ہوگی۔ الیاس خان نے کہا تھا کہ منشی ریاض، فرید خاں کے ساتھ نہیں رہتے، ان کا کوئی گھر ہے۔ اسی گھر میں مجھے میرے ماں باپ اور بہن نظر آئیں گے۔ آہ! ماموں ریاض انہی کے لیے تو نوکری کر رہے ہوں گے آہ! صبح کب ہوگی کب صبح ہوگی۔
صبح ہوگئی دروازے سے الیاس خان اندر داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ آنکھیں سرخ اور مغموم تھیں۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "جلدی جاگ گئے الیاس خان۔"
"جی!" وہ آہستہ سے بولا۔
"خیریت۔"
"جی ہاں ناشتہ کر لیجیے۔"
"آ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "تم بھی ناشتہ کر لو۔"
"میں نے چائے پی لی ہے ابھی کچھ نہیں کھاؤں گا۔"
"کب چلو گے۔"
"بتا دوں گا ابا آ رہے ہیں۔" وہ بولا۔ اسی وقت جمال خان صاحب اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے سرد نگاہوں سے الیاس خان کو دیکھا اور وہ گردن جھکا کر باہر نکل گیا۔
"ناشتہ کریں میاں۔" جمال خان صاحب بیٹھتے ہوئے بولے اور میں نے ٹرے سامنے سرکا لی۔ "آج یہ کوئی ناٹک کر رہا ہے، ضرور کوئی چکر ہے۔" وہ پُر خیال انداز میں بولے۔
"کیا بات ہے؟"
"صبح میں جاگا تو یہ وضو کر چکا تھا۔ رات کو کس وقت آیا اور کیسے اندر داخل ہوا پتا نہیں۔ وضو کے بعد باقاعدہ نماز پڑھی پھر ماں کے پاس جا بیٹھا اور انہیں دیکھتا رہا۔"
"خوب مگر یہ ناٹک کیسے ہوا؟"
"وہ اور نماز۔ میرے خیال میں تو اسے نماز آتی بھی نہیں، بھائی مجھے تو شبہ ہوگیا اور میں نے فوراً احتیاطی تدابیر کر ڈالیں۔"
"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔
"تم نے جو عنایت کی ہے اس نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ سچ جانو بیٹے! ہمارے ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے ہیں۔ میری اہلیہ نے تو اتنے سجدے کیے ہیں کہ گنے نہ جا سکیں، بیٹی کے چند رشتے ہیں جن پر اس لیے غور نہیں کیا تھا کہ پاس پلے

کچھ نہیں تھا، ہاں یا نا کرتے تو کس برتے پر۔ مگر اب مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اسے پتا نہ چل گیا ہو اس لیے میں نے تمہارے عطیے کو محفوظ کر دیا۔''

''میرا ناقص علم کچھ اور کہتا ہے محترم بزرگ۔''

''کیا؟''

''صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا ہے، ایک گزارش بھی ہے آپ سے۔''

''کیا بیٹے؟''

''وہ اگر نیکیوں کی طرف واپس آئے تو اسے سہارا دیں ماضی کو بھول جائیں، اسے طعنہ نہ دیں۔''

''آہ! مجھے اگر بیٹے کا سہارا مل جائے تو، تو کاش ایسا ہو جائے۔'' جمال احمد خان آبدیدہ ہو گئے۔ بہت دیر تک وہ میرے پاس بیٹھے رہے تھے۔ پھر جب اُٹھنے لگے تو مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا۔

''وہ جمال احمد صاحب یہاں ایک کمبل تھا کسی کی امانت ہے وہ نظر نہیں آیا۔ ذرا چچی جان اور بہن سے پوچھ لیں دُھوپ لگانے کو تو نہیں ڈالا۔''

''کمبل، اچھا پوچھے لیتا ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد وہ واپس آئے اور بولے۔ ''نہیں میاں کمبل یہاں سے کسی نے نہیں اُٹھایا۔ کہاں گیا، کہاں جا سکتا ہے۔'' وہ پریشانی سے بولے اور دل ہولنے لگا، نہ جانے کمبل کہاں گیا۔ جمال احمد پھر باہر نکل گئے نہ جانے کیسے تفتیش ہوئی مگر کمبل نہیں ملا، وہ پریشان اور شرمندہ تھے اور میں۔''

الیاس خان نے دوپہر کے کھانے کے بعد تیاری کر لی، اس بارے میں میری اس سے بات ہو گئی تھی اور طے ہو گیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ پھر ہم تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ کافی فاصلہ طے ہوا تھا اور پھر فرید خان کا مکان آیا تھا، شاندار مکان تھا، فرید خان کھاتے پیتے گھر کا فرد تھا۔ منصوبے کے مطابق الیاس خان مجھے چھوڑ کر فرید خان کے مکان میں چلا گیا، یہاں اس کا آنا جانا تھا اور چونکہ اس کی ابھی ان لوگوں سے باقاعدہ نہیں ٹھنی تھی اس لیے کوئی مشکل بھی نہیں تھی، دس منٹ کے بعد وہ واپس آ گیا۔

''وہ رات سے غائب ہے واپس نہیں آیا۔ یقیناً وہ پرانی گڑھی میں ہوں گے اور آپ کے نکل جانے سے خوفزدہ ہوں گے۔ خیر منشی ریاض اندر موجود ہیں۔ کام میں لگے ہوئے ہیں پانچ بجے چھٹی کر کے نکلیں گے۔''

''کچھ کہا تو نہیں تم نے اُن سے۔''

''بالکل نہیں آپ نے منع کیا تھا۔''

''ہاں یہ اچھا کیا۔''

''اب کیا حکم ہے مرشد؟''

''الیاس خان تم واپس جاؤ جس نئی زندگی کا تم نے آغاز کیا ہے اسی پر ثابت قدم رہنا ہی ذریعۂ نجات ہے۔ برائی بہت خوبصورت ہوتی ہے مگر اس کی انتہا بے حد بھیانک، اس کے برعکس نیکیوں کا سفر مشکل ترین لیکن منزل نہایت سکون بخش۔''

''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن مرشد ابھی میں آپ کے پاس رُکنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''مرشد ان سوّروں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہوں نے آپ کی تلاش شروع کر دی ہوگی۔ ان کے بہت سے گرگے ہیں وہ انہیں بھی استعمال کریں گے۔''

''اور تم میری حفاظت کرو گے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں

مرشد میں تو خود ایک کمزور انسان ہوں۔ لیکن میں ان لوگوں کو جانتا ہوں اگر کوئی نظر آیا تو آپ کو ہوشیار تو کر سکتا ہوں۔''

تمہارا شکریہ الیاس خان میری نصیحت ہے کہ ان لوگوں سے تصادم کی کیفیت نہ اختیار کرنا، اب تم ایک ذمے دار شخص ہو، تمہارے شانوں پر جوان بہن اور بوڑھے ماں باپ کا بوجھ ہے۔ بہت مشکل ہے تمہارے ماں باپ کو اپنی خوش بختی پر یقین آئے مگر انہیں یقین دلانا تمہارا فرض ہے۔ جاؤ دوست خدا تمہاری حفاظت کرے

''آپ مرشد؟''

''میں آ جاؤں گا میری فکر مت کرو!'' بمشکل تمام میں نے اسے روانہ کیا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو فرید خان کے گھر کے دروازے کو دیکھنے لگا، اندر ماموں ریاض موجود تھے۔ میرے ماموں ریاض جنہیں معلوم تھا کہ امی ابا کہاں ہیں۔ آہ! میں انہیں دیکھ سکوں گا ان سے مل سکوں گا۔ میری امی، میرے ابا، میری بہن دل میں سرور اتر آیا تھا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ماموں ریاض کے سامنے نہیں آؤں گا۔ ان کے گھر تک ان کا پیچھا کروں گا اور پھر سب کے سامنے ایک دم جاؤں گا، کیا کیفیت ہوگی ان کی۔ کیا ہوگا۔

بدن اینٹھ رہا تھا، اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے کہ جانے کتنے عرصے کے بعد پانچ بجے اور پھر، پھر میں نے فرید خان کے گھر کے دروازے سے ماموں ریاض کو نکلتے دیکھا۔ ہاں وہ ماموں ریاض ہی تھے!

کھوئے کھوئے سے، مضمحل مضمحل سے، شیو بڑھا ہوا تھا، ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا تھیلا تھا جس میں کوئی چیز محسوس ہوتی تھی، لباس بھی بہت معمولی تھا، ان کی پریشان حالی کا صاف احساس ہوتا تھا۔ آہ! نہ جانے کیسی زندگی گزار رہے ہیں یہ لوگ، ظاہر ہے ابو تو کچھ کرنے کے قابل نہ رہے ہوں گے، ان سب کی کفالت کا بوجھ ماموں پر ہوگا، دل بے اختیار ہو رہا تھا، جذبات مچل رہے تھے، خواہش ہو رہی تھی کہ سب کچھ بھول کر دوڑوں اور ان سے لپٹ جاؤں، اتنا روؤں کہ عرصہ کے رکے ہوئے سارے آنسو بہہ جائیں لیکن خود کو سنبھالا، احتیاط ضروری ہے، مجھے ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔

ماموں ریاض کافی دور نکل گئے تھے۔ میں چل پڑا، خیالات کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا، سونے کے چند سکے میرے پاس موجود تھے، یہ ان کے کام آئیں گے اس کے بعد، اس کے بعد جس طرح بھی بن پڑا میں ان کے حالات بدل دوں گا آہ......

یہ تو میرا فرض ہے، میری تو ابتدا یہیں سے ہونی چاہیے تھی مگر یہ تقدیر میں نہیں تھا، اگر امی، ابو اور شمسہ وہاں موجود ہوئے جہاں ماموں جا رہے ہیں تو مجھے دیکھ کر ان پر کیا گزرے گی، کیا کیفیت ہوگی، کہیں یہ لوگ بھی مجھ سے بددل نہ ہوں، مجھے اپنی پریشانیوں کا ذمہ دار سمجھ کر مجھ سے نفرت نہ کرنے لگے ہوں۔ یہ احساس مجھے الیاس خان کے ان الفاظ سے ہوا تھا جن میں اس نے ماموں ریاض کے بارے میں بتایا تھا کہ میرے پیغام کا ان پر کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔ خیر اگر ایسا ہوا بھی تو کیا بالآخر میں انہیں خود سے راضی کر لوں گا، اپنی کہانی انہیں سنا کر بتاؤں گا کہ میں نے اپنے گناہوں کا کیا کفارہ ادا کیا ہے۔ ان سوچوں نے، ان احساسات نے اس سفر کی طوالت کا احساس ختم کر دیا تھا جو ماموں ریاض نے رکے بغیر طے کر لیا تھا۔ یہ بہت طویل سفر تھا، نہ جانے کتنی سڑکیں، گلیاں، بازار، محلے عبور کر آئے تھے وہ، آبادی خال خال رہ گئی تھی جس جگہ وہ پہنچ گئے تھے وہاں کھیت بکھرے ہوئے تھے اور ان کھیتوں کے دوسرے سرے پر کچھ بوسیدہ مکانات دور دور نظر آ رہے تھے غالباً یہاں بجلی نہیں تھی، کھمبے بھی نہیں لگے ہوئے تھے، ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں سے چند میں ملگجی مدھم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں چونک ان روشنیوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ کتنا فاصلہ پیدل طے کیا گیا ہے کہ چلتے چلتے رات ہو گئی اور پھر یہ آبادی عجیب سی ہی یہاں رہتے ہیں یہ لوگ اتنی دور اور ایسی جگہ جو زندگی کی سہولتوں سے محروم ہے! اس کی وجہ بھی غربت ہی ہو سکتی تھی۔ دل سے کم، کتنی بے بسی کا شکار ہیں یہ لوگ، کیا بیت رہی ہے ان پر......

ماموں ریاض ایک دروازے پر رک گئے، ایک لمحے رکے رہے پھر اندر داخل ہو گئے۔ میرا دل بند بند سا ہو گیا۔ منزل آ گئی تھی وہ جگہ آ گئی جس کی مجھے صدیوں سے تلاش تھی۔ قدم من من بھر کے ہو گئے نہ جانے کتنی مشکل سے یہ بقیہ راستہ طے کیا تھا، ان مکانوں کو قریب سے دیکھا۔ زمانہ قدیم کے بنے ہوئے تھے، دیواروں میں ایک اینٹ سلامت نہیں تھی اس کے باوجود مضبوط تھے جس دروازے میں ماموں ریاض داخل ہوئے تھے، اس کی زنجیر بجائی اور دھڑکتے دل کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کون کھولے گا شمسہ، امی، ابو...... یا ماموں ریاض...... کس سے کیا کہوں گا، کیا وہ لوگ مجھے ایک نگاہ میں پہچان لیں گے، مشکل ہو جائے گا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد زنجیر دوبارہ بجائی پھر تیسری بار بہت زور سے لیکن کوئی جواب نہیں ملا، جگہ شاید بہت بڑی ہے، یہ لوگ دروازے سے دور ہوتے ہوں گے یا کوئی اور یہاں آتا نہ ہوگا......؟ یا ماموں ریاض اکیلے...... اس خیال سے دل لرز گیا اگر ماموں ریاض یہاں اکیلے ہیں تو امی، ابو...... ایک دم بے چینی طاری ہو گئی، زور زور سے زنجیر بجانے لگا پھر دروازے کو زور سے اندر دھکیلا تو دروازہ کھل گیا، بے صبری سے اندر قدم رکھ دیا، گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، جگہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''ماموں ریاض۔'' میں نے آواز لگائی اور میری آواز گونج کر رہ گئی۔ دل پر وحشت چھانے لگی تھی۔ اس بار پہلے سے زیادہ زور سے چیخا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ''یہاں کوئی ہے۔'' میں نے پھر حلق پھاڑا اور اس بار روشنی کی ایک مدھم سی کرن ابھری۔ یہ کرن کسی دروازے کی جھری سے ابھری تھی۔ اسے دیکھ کر میں اندھوں کی طرح اس طرف لپکا بہت مدھم کرن تھی لیکن اس کی نشاندہی میں، میں دروازے تک پہنچ گیا۔ اس دروازے کو بھی دھکا دے کر میں نے کھول دیا اور دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں زیادہ تاریکی نہیں تھی۔ گول سا بڑا صحن نظر آ رہا تھا جس کی زمین اینٹوں سے بنی ہوئی تھی لیکن وہی کیفیت یہاں بھی موجود تھی۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں درمیان میں کیاریوں جیسی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جن میں درخت اُگے ہوئے تھے۔ بہت اونچے اونچے چار درخت نظر آ رہے تھے جو اوپر جا کر آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے تھے اور انہوں نے اس صحن پر سایہ کر لیا تھا لیکن چونکہ آسمان پر ابھی تھوڑی بہت مدھم مدھم روشنی تھی اس لیے یہ صحن زیادہ تاریک نہیں ہوا تھا۔ روشنی کی وہ کرن جس نے دروازہ اجاگر کیا تھا، اس دروازے کے عین سامنے ایک اور دروازے سے ابھر رہی تھی اور ایک چھوٹی سی کھڑکی سے اس کی روشنی باہر چھن رہی تھی۔ خوف و دہشت کا ایک ہولناک احساس میرے وجود پر طاری ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اور کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ شاید یہ خوف کا احساس تھا جو میرے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ ماموں ریاض کہاں گئے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے اور دل چاہ رہا تھا کہ بیٹھ جاؤں، سانس بے حد تیز ہو گیا تھا۔ اس حالت میں کئی منٹ یہاں کھڑے کھڑے گزر گئے، نہ جانے کس طرح میں نے ایک بار پھر اپنے حلق سے آواز نکالی اور ماموں ریاض کو پکارا لیکن جواب ندارد۔ دل کے کسی گوشے میں یہ احساس ابھر رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ کچھ ہو گیا ہے، کوئی ایسی بات جو آنے والے وقت میں میرے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ آہ یہ کیا ہوا، سوچا تو کچھ تھا اور ہو کچھ رہا تھا، کیسے کیسے احساس لے کر یہ طویل اور تھکا دینے والا سفر کیا تھا۔ کیا کیا امیدیں باندھیں تھیں۔ کیا ہونے والا ہے۔ آخر کیا ہونے والا ہے۔

لرزتے قدموں سے اس دروازے کی جانب بڑھا جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر دروازہ زور زور سے بجایا۔ میرے ہاتھوں سے پیدا ہونے والی آواز کئی گنا زیادہ ہو کر پھیل رہی تھی۔ اس میں ہوا کی شائیں بھی شامل تھی۔ درختوں کے پتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج رہے تھے اور ماحول پر ایسا دہشت ناک سناٹا پھیلتا جا رہا تھا کہ دل کی دھڑکنیں چیخ اٹھیں۔ میرے زور زور سے دروازہ بجانے سے یہ دروازہ بھی اندر کو دب گیا اور میں نے کسی انوکھے جذبے کے تحت اندر قدم رکھا۔ اس بار میں ایک وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا تھا جس کی قدامت کا اندازہ اس میں موجود اشیاء سے ہوتا تھا۔ گرد کی ایک دبیز اور بدبودار تہہ اس کے فرش پر جمی ہوئی تھی۔ اونچی چھت کے درمیان میں ایک بہت بڑا جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف جالے لگے ہوئے تھے اور ایک طرف آتش دان میں مدھم مدھم سی زرد روشنی ہو رہی تھی۔ اسی آتش دان کے اوپر ایک شمع روشن تھی۔ میں نے اس کمرے کی فضا میں ہلکی ہلکی گرمی محسوس کی اور میرا بدن ایک بار پھر دہشت سے لرز اٹھا کیونکہ اچانک ہی کمرے کی روشنی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کوئی سات فٹ کے فاصلے پر آتش دان کے اوپر رکھی چند شمعیں خود بخود روشن ہو گئی تھیں۔ یہ شمعیں پرانے قسم کے ایک شمع دان میں لگی ہوئی تھیں۔ سفید سفید لمبی لمبی خدا جانے ان شمعوں کو روشن کس نے کیا تھا، میں اب شدید دہشت کا شکار ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر میں ان شمعوں کے قریب پہنچ

گیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ پہلے تو صرف ایک ہی موم بتی جل رہی تھی لیکن اب یہ شمعیں کس نے روشن کیں۔ وہ نادیدہ ہاتھ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے جنہوں نے یہ حرکت کی تھی۔ موم بتیوں کے شعلے بالکل سیدھے اوپر اٹھ رہے تھے جیسے ہوا سے محفوظ ہوں۔ میں غیر ارادی طور پر ان پر پھونکیں مارنے لگا اور ایک بار پھر میری آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ میری پھونکوں سے کسی نہ کسی شعلے کو بجھ تو جانا چاہیے تھا لیکن وہ جنبش بھی نہیں کر رہے تھے۔ دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ پورا بدن پسینے میں ڈوب گیا اور اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ فریب نظر تھا۔ ماموں ریاض حقیقت نہیں تھے بلکہ کوئی خوفناک دھوکا تھے جس کا تعاقب کرتا ہوا میں اس ہولناک مکان میں پہنچ گیا ہوں لیکن اس دھوکے کی بنیاد کیا ہے، یہ سب کچھ، یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے، بہت عرصے تک میں اس سے محفوظ رہا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میری ایک حیثیت بن گئی تھی آہ...... اس کے بعد اس کے بعد یہ سب کچھ، یہ سب کچھ، کیا کروں، کیا کرنا چاہیے مجھے، بے شک شدید ترین حالات کا شکار رہ چکا تھا، ان حالات میں رہنے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن کچھ عرصے سے، صورتحال ذرا مختلف ہو گئی تھی اور اب یہ سب کچھ میرے لیے بڑا دہشت ناک تھا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ دروازہ در دروازہ، ایک کے اندر ایک۔ ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ماموں ریاض کا تصور تو اب دل سے نکلتا ہی جا رہا تھا۔ میری تقدیر میں بھلا یہ روشنی کہاں ہے، میں تو تاریک اندھیروں کا مسافر ہوں، مجھے انہی تاریکیوں میں زندگی بھر کا سفر کرنا ہے، ان خوشیوں سے بھلا میرا کیا واسطہ جو انسان کی زندگی میں آتی ہیں مگر اب یہ نیا جال، نیا فریب کیا معنی رکھتا ہے۔ آہ! پچاس بار غور کر چکا تھا اس بات پر کہ غلطی ہوئی ہے مجھ سے اور میری اس غلطی نے مجھ سے میرا سائبان چھین لیا ہے، وہ کمبل جو میرے لیے ایک بزرگ کا عطیہ تھا، مجھ سے چھن گیا، بکھر گیا تھا۔ صاف کہہ گیا تھا کہ میں اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا تھا، میں نے اسے چھوڑ دیا، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہوا تھا اس میں میری غلطی نمایاں تھی لیکن اب کیا کرنا چاہیے۔ اپنی اس غلطی کو تسلیم کر کے کیا کروں، پھر موت کی آرزو کرنے لگوں یا زندگی کی جانب رخ کیے رہوں جیسا بھی ہو جو کچھ بھی ہو گزاروں اسی میں گزاروں۔ زندگی کتنی قیمتی شے ہے کوئی جینے والوں سے پوچھے جو کسی بھی طور مرنا نہیں چاہتے۔ میں بھی مرنا نہیں چاہتا ہوں ہاں بے شمار بار دل اس دنیا سے اکتایا، اپنے آپ سے اکتایا لیکن جب موت کو گلے لگانے کی آرزو کروں گا تو نہ جانے کیا احساس ہوگا دل میں، کافی دیر تک میں اسی طرح اس پراسرار کمرے میں کھڑا سوچوں میں گم رہا اور اس کے بعد میں نے سوچا کہ کم از کم یہاں کا تھوڑا سا جائزہ اور لے لوں اور اس کے بعد اس گھر سے باہر نکل جاؤں جہاں میں صرف ایک دھوکے کے تعاقب میں آیا تھا۔ سامنے ہی جو کمرہ نظر آ رہا تھا اس کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ میں اس دروازے کے رنگ کو دیکھ رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مدت سے نہیں کھولا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے دوسری طرف تاریکی ہی تاریکی ہو کیونکہ روشنی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے میں واپس پلٹا۔ ایک شمع ہاتھ میں اٹھائی اور دوبارہ دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور ایک لمحے میں دروازہ کھل گیا۔ شمع کی روشنی میں مجھے ایک اور بڑا اور وسیع کمرہ نظر آیا۔ یہاں بھی فرش بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر صدیوں سے انسانی قدموں کا گزر نہ ہوا ہو۔ دیواریں پلاسٹر کے بغیر تھیں اور ان سے ٹوٹی پھوٹی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ایک سمت ایک زینہ سا بنا ہوا تھا جو اوپر جا کر چھت میں گم ہو گیا تھا۔ یہ کمرہ پہلے کمرے سے بھی زیادہ پراسرار تھا۔ ابھی میں یہیں کھڑا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً ہی مجھے اوپر قدموں کی سی آہٹ سنائی دی اور میرا دل دہشت سے اچھل پڑا۔ میرے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ماموں ریاض، ماموں ریاض کہاں ہیں آپ، ماموں ریاض کیا آپ یہاں اس گھر میں موجود ہیں۔" اپنی آواز کے کھوکھلے پن کا خود بھی احساس ہوا تھا، جسے پکار رہا تھا اب اس کی موجودگی سے مایوس ہو گیا تھا لیکن کوئی اوپر ہے ضرور۔ یہ مکان خالی نہیں ہے، یہاں یقینی طور پر زندگی ہے۔ آہ کوئی نظر تو آئے، کوئی دکھائی تو دے اس سے پوچھوں کہ مجھے اس طلسم خانے میں لانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر میں یہاں کیوں آیا ہوں بس دماغ پر ایک دھندسی طاری ہوئی اور میرے قدم ان سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ گیارہ سیڑھیاں تھیں اور اس کے بعد لکڑی کی بنی ہوئی چھت۔ اوپر پہنچا شمع کی روشنی نے ایک

اور دروازہ اجاگر کیا لیکن اس دروازے کے دوسری جانب روشنی تھی، یقینی طور پر وہاں کوئی موجود تھا۔ کچھ سرسراہٹوں کی سی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا۔ یہ دلچسپ بات تھی کہ یہاں کوئی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ یہ دروازہ بھی میرے دھکا دینے سے کھل گیا اور وہاں مجھے تیز روشنی نظر آئی۔ یہ روشنی بالکل نیچے لگی ہوئی شمعوں کی جیسی روشنی تھی۔ یہاں بھی پانچ شمعیں جو بہت لمبی لمبی تھیں، روشن تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے انہیں ابھی ابھی روشن کیا گیا ہو کیونکہ ان کا موم پگھلا نہیں تھا لیکن کمرے کے منظر میں کچھ ایسی انوکھی باتیں تھیں جنہیں دیکھ کر میرا دل اینٹھنے لگا، اعصاب میں عجیب سی کھنچاوٹ پیدا ہوئی۔ سامنے ہی ایک تابوت جیسی شے رکھی ہوئی تھی اور سرسراہٹوں کی آوازیں وہیں سے آ رہی تھیں۔ کمرہ روشن تھا لیکن میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمع پھینکی نہیں اور آہستہ آہستہ اس تابوت کے قریب پہنچ گیا۔ میرے خدا، میرے خدا میں نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ تابوت خاص قسم کا بنا ہوا تھا۔ اس کے کنارے اونچے اونچے تھے اور اس کے اندر ایک لاش نظر آ رہی تھی۔ ایک انسانی لاش جس کی بے نور آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور یہ چہرہ، یہ چہرہ ماموں ریاض کا چہرہ تھا۔ ہاں میں اس چہرے کو صاف پہچانتا تھا۔ ماموں ریاض ہی تھے لیکن جو چیز مجھے ایسی نظر آئی جو میرے حواس کو بالکل ہی بے قابو کر رہی تھی وہ ماموں ریاض کی لاش سے چمٹی ہوئی لاتعداد پیلی پیلی مکڑیاں تھیں جو ان کے جسم پر ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں اور جگہ جگہ ان کے کھلے جسم میں اپنے پنجے جمائے ان کا خون چوس رہی تھیں۔ آہ ماموں ریاض...... ماموں ریاض...... میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ شمع میرے ہاتھ سے چھوٹ کر کھلے ہوئے تابوت میں جا گری۔ مکڑیاں ایک دم منتشر ہونے لگیں۔ ان کی تعداد بے پناہ تھی، ان کا سائز بھی مختلف تھا۔ شمع گرنے سے ان میں سے کچھ مکڑیاں جل بھی گئی تھیں۔ وہ ایسے انداز میں اوپر کی جانب لپکیں جو بے حد لرزہ خیز تھا۔ میں بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا لیکن پاؤں کسی چیز میں الجھ گیا اور میں چاروں شانے چت نیچے گر گیا۔ دفعتاً ہی مجھے ایک دھماکہ سا سنائی دیا اور اس کی وجہ بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ وہ دروازہ جس سے میں اندر داخل ہوا تھا، زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا تھا، ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی اگر ہوا چلتی تو شمعوں کے شعلے بھڑکتے۔ اس کا مقصد ہے کہ کسی نادیدہ شیطانی قوت نے یہ دروازہ بند کیا ہے۔ میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن جسم جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ آن واحد میں لاتعداد سفید اور پیلی مکڑیاں میرے جسم تک پہنچ گئیں اور میں اپنے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر ان کے نوکدار پیروں کی گردش محسوس کرنے لگا۔ وہ میرے جسم سے چمٹ رہی تھیں، جسم کے کھلے ہوئے حصوں میں باریک باریک سوئیاں سی چبھنے لگیں اور درد کی شدت سے میرے حلق سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں، اعصاب اچانک ہی قابو میں آ گئے تھے۔ میں نے جوش وحشت میں ان مکڑیوں کو ہاتھ مار مار کر دور کرنا چاہا مگر بے سود ان کی نوکیلی ٹانگیں میری کھال میں پیوست ہو رہی تھیں اور وہ اپنے باریک باریک دانت میرے جسم میں چبھو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ میری گردن تک پہنچ گئیں اور اس کے بعد انہوں نے میرے چہرے پر چڑھنے کی کوشش کی۔ ایک خوفناک دھاڑ میرے منہ سے نکلی اور میں نے ایک دم کروٹ بدل کر زمین پر ہاتھ ٹکائے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جسم میں انتہائی خوف کے عالم میں قوتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ میں نے بہت زور زور سے ہاتھ اور پاؤں جھٹک جھٹک کر ان مکڑیوں کو نیچے گرایا اور اس کے بعد دروازے کی جانب دوڑ لگائی۔ پوری قوت سے میں نے دروازے کو پکڑ کر کھینچا۔ دروازہ کھل گیا لیکن میں باہر نکلتے نکلتے ایک بار پھر گر پڑا تھا۔ چند مکڑیاں جو میرے لباس پر چڑھ گئی تھیں، میرے ساتھ ہی باہر آ گئی تھیں۔ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ مکڑیوں نے میرے جسم کے کھلے حصوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیا اور وہاں پہنچ کر مجھے کاٹنے لگیں۔ میں بار بار چیخ رہا تھا اور ان مکڑیوں کو چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر نیچے پھینک رہا تھا، ساتھ ہی میں انہیں پاؤں سے مسلتا بھی جا رہا تھا۔ یہ ایک بے حد گھناؤنا کام تھا لیکن اس وقت زندگی بچانا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ مکڑیاں اپنا کام کر رہی تھیں مگر میری کوششوں سے ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ آخری مکڑی بھی میرے پاؤں کے نیچے آ کر مر گئی۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہی میں اس راستے کی طرف دوڑا جہاں سے اندر داخل ہوا تھا۔ سامنے ایک دروازہ کھلا نظر آیا اور میں اس میں گھس گیا مگر وہ ایک کمرہ تھا اور اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہاں سے نکل کر ایک راہداری میں بھاگا جو آگے جا کر دوسری طرف گھوم گئی تھی لیکن دوسری طرف مڑ ہی رہا تھا

کہ سامنے بند دیوار آ گئی اور بمشکل دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر ٹکرانے سے بچا۔ آہ وہ راستہ کہاں گیا جہاں سے اندر آیا تھا، کہاں گیا وہ راستہ...... وہاں سے پلٹا اور پھر جہاں تک بھاگ سکا، بھاگا لیکن جہاں پہنچتا راستہ بند ملتا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر ایک تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ گہرا گھپ اندھیرا تھا، پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً غسل خانہ تھا، میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا، ایک جگہ پانی کی دھار گر رہی تھی پانی ہلکا گرم تھا مگر پیاس اتنی شدت کی تھی کہ میں نے منہ کھول دیا۔ پانی کے کئی گھونٹ حلق سے اتارے مگر یہ پانی ہلکا نمکین تھا اور اس میں پانی جیسا پتلا پن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک عجیب سی بو ایک عجیب سی سڑاند...... میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا، دونوں ہاتھوں کا چلو بنایا، پانی اس میں لیا اور اسے انگلیوں سے مسل کر دیکھنے لگا، ایک عجیب سی چکنی تھی اس میں مگر تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، اس سڑاند سے الٹی آ رہی تھی، پیٹ اور سینے پر ایک دم بڑا بھاری پن پیدا ہو گیا تھا، میں کراہتا ہوا وہاں سے بھی نکل آیا، کوئی شیطانی جال تھا جس میں میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔ آہ کیا ہے یہ سب کچھ۔ کہاں جاؤں کئی جگہ روشنی نظر آئی، اس سے پہلے یہ روشنی نہیں تھی مگر اس طرف رخ کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ادھر کلیجہ تھا کہ حلق کے راستے باہر نکل آنا چاہتا تھا۔

''راستہ کہاں ہے...... کوئی ہے اس منحوس گھر میں۔ ارے کوئی ہے، ماموں ریاض، ابو، امی، شمسہ...... کوئی ہے، کوئی ہے۔'' میری آواز گھٹ گئی، متلی آ گئی تھی اور میری حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی، سر چکرا رہا تھا، آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ رہے تھے لگ رہا تھا یہی آخری وقت ہے، مر جاؤں گا۔ آہ پھر وہی سب کچھ آہ...... آگے بڑھا، رخ ایک روشنی کی طرف تھا نہ جانے وہاں کیا ہے، نہ جانے وہاں کیا ہے۔ کھلا ہوا دروازہ تھا، چوکور کمرہ تھا، کھردرا فرش دیواریں، کارنس پر مدھم سی شمع۔

سامنے ایک دروازہ ابھی تھا، نقشہ بدل گیا تھا اس گھر کا میرے داخل ہونے کے بعد۔ کیسے، آخر کیسے۔ روشنی میں ہاتھ پر نظر پڑ گئی، ایک اور چیخ حلق سے بلند ہو گئی، دونوں ہاتھ سرخ ہو رہے تھے انگلیاں ایک دوسرے سے چپک گئی تھیں، خون، آہ خون، پورا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا، وہ دھار جو نہ جانے کہاں سے گر رہی تھی پانی کی نہیں خون کی دھار تھی اور...... اور میں نے کئی گھونٹ خون پیا تھا۔ اس بار تو یوں لگا جیسے آنتیں حلق کے راستے باہر نکل رہی ہوں۔ بری طرح متلی ہو رہی تھی اور مجھے بیٹھ جانا پڑا تھا۔ آنکھیں بند کر لی تھی تاکہ حلق سے نکلنے والی آلائش نظر نہ آئے۔ سر بالکل خالی ہو گیا تھا۔ جب حالت کچھ بہتر ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے نظر آنے والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ بے نور سی آنکھوں سے کمرے کے ماحول کو دیکھا، وہی کمرہ تھا جہاں تابوت دیکھا تھا اور اس تابوت میں ماموں ریاض کی لاش نظر آئی تھی مگر اب وہاں مکڑیاں نہیں تھیں، فرش صاف پڑا تھا۔ مکڑیاں یقیناً دوبارہ تابوت میں جا گھسی تھیں۔ ماموں ریاض مر گئے۔ میں نے دل میں سوچا۔ بے اختیار قدم آگے بڑھے، تابوت میں جھانکا، لاش موجود تھی مگر مکڑیاں نہیں تھیں، ایک بھی مکڑی نہیں تھی، البتہ ماموں ریاض کی لاش خون سے عاری تھی بالکل زرد، بے رونق، سرد......! تابوت میں جھکا دونوں ہاتھ نیچے کئے ان کے شانوں کو مضبوطی سے پکڑا اور اوپر اٹھایا بالکل ہلکا جسم تھا مگر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ماموں ریاض نے پاؤں اٹھایا ہو۔ یہ صرف احساس نہیں تھا ایسا ہوا تھا میرے ہاتھوں کے سہارے وہ تابوت سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا اور پھر جلدی سے انہیں چھوڑ دیا۔ یہ ماموں ریاض نہیں تھے بلکہ اب یہ چہرہ مکروہ صورت بھوریا چرن کا چہرہ بن چکا تھا۔ وہ سو فیصد بھوریا چرن تھا، اس کی شکل نامعلوم سے انداز میں کسی مکڑی کی شکل سے مشابہ تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی اسی طرح مڑے مڑے تھے۔ اب اسے میرے سہارے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اچھل کر تابوت سے باہر نکل آیا۔

''کیسے ہو میاں جی......؟'' اس نے چہکتی آواز میں پوچھا۔

''بھوریا چرن'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''پہچان لیا نا......؟ ہاہا...... چلو اچھا ہے ہم تو سمجھے بھول گئے ہو گے ہمیں، بہت سے بیت گیا تھا۔''

''ماموں ریاض کہاں ہیں بھوریا چرن......؟''

''سب مل جائیں گے میاں جی...... سب مل جائیں گے، اب کیا رہ گیا ہے مگر تم بھی دھن کے پکے نکلے۔''

''وہ کیسے بھوریا چرن......''

''ہمارا کام ہی کر کے نہ دیا۔''

''اب بھی نہیں کروں گا بھوریا چرن۔ اب بھی نہیں کروں گا۔''

''اب......؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''ہاں تو کیا سمجھتا ہے ہار مان لی میں نے تجھ سے، تو پاگل ہے بھوریا چرن۔''

''ڈوب مرو میاں جی کہیں چلو بھر پانی میں...... ڈوب ہی مرو تو اچھا ہے اب تم ہو کیا میاں جی ذرا اس پر تو غور کرلو۔''

''میں تو کبھی کچھ نہیں تھا بھوریا چرن مگر تو دیکھ لے آج تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔''

''مقصد میں تو ہم ایسے کامیاب ہوئے ہیں میاں جی کہ جانو گے تو جی خوش ہو جائے گا تمہارا......''

''اچھا...... کیا تو کھنڈولا بن گیا......؟''

''ہم تو کھنڈولے نہ بنے...... پر تم بھی دھرماتما نہ بن سکے۔ یہ ہے تمہارا دھرم، جیون بھر کشٹ اٹھائے، پر ایک غلطی کری اور مارے گئے۔'' اس نے مسرور لہجے میں کہا اور میں اسے گھورنے لگا۔ ''اب تم ہم میں سے ہو میاں جی...... نام اور بدل لو اپنا......! دھرم داس رکھ لو یا کالی چرن، مسعود احمد تو نہ رہے اب تم۔'' وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اور میں اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا، کیا کہہ رہا ہے، یہ کیوں کہہ رہا تھا، اتنا عرصہ دور رہا تو دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب اس سے جان چھوٹ گئی جو ذمہ داری مجھے دی گئی ہے اگر اسے پورا کرلوں تو شاید اس کرب کی زندگی سے نجات پالوں مگر...... اور اب اسے برا بھلا کہہ لوں تو کیا ملے گا۔ کم از کم معلومات ہی حاصل کروں، کچھ سمجھ میں ہی آئے۔

''تم کس مقصد میں کامیاب ہوئے ہو بھوریا چرن۔''

''ہا...... بھاگ ہوتے ہیں منش کے شنکھا ہے تو من میں آئی کہ کھنڈولے بنیں مگر بھاگ میں نہیں تھا، ملا بھی تو تم جیسا پاگل دھرم کے پیچھے بھاگنے والا، ارے پاپی تو دھرم داس بننے تو نہیں آیا تھا، ہمارے پاس برے کاموں کے لیے ہی تو آیا تھا ریس کے گھوڑے، سٹے کے نمبر، دولت کے انبار، ابلاؤں کی قربت یہی سب مانگنے آیا تھا تو ہم سے، ہم نے کب منع کیا تھا تو ہمارا کام کر دیتا تو ہم تجھے وہ دیتے کہ جیون بھر مزے کرتا، دھرم ضرور بھرشٹ ہوتا تیرا مگر دھرم داس تو ہی بتا کیا تیرے ہی دھرم میں یہ سب جائز ہے ریس میں دوڑے ہوئے گھوڑوں کے کھیل سے جو دولت ملتی ہے وہ نیک کمائی ہے پھر تیرے من میں نیکیاں کیوں پھوٹ پڑیں...... ہمارا ستیاناس مار دیا تو نے اور اس کے بعد جو کچھ تو کرتا رہا وہ مرے پر سو درے تھے، طرح طرح کے لوگوں سے دہائی دی تو نے اور ہمیں نقصان پہنچایا، تو کیا سمجھتا تھا چھوڑ دیتے ہم تجھے۔''

''تو تم میرے پیچھے لگے رہے۔'' میں نے کہا۔

''پہلے تو یہی سوچا تھا ہم نے کہ ایک دن راستے پر آجائے گا مگر اس مُسلے نے کھیل بگاڑ دیا۔''

''کس نے......؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے اسی فضل نے۔''

''بابا فضل کی بات کر رہے ہو۔''

''ہاں اس نے جیون دان دے کر تیری رکھشا کی نہ صرف رکھشا کی بلکہ بلکہ......!''

''بلکہ......؟'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''رستے کھول دیے تیرے تو نے جو گناہ کیے تھے اپنے دھرم کی نگاہ میں اس نے انہیں دھونے کے لیے اپنی قربانی دے دی اور تو بچ گیا، تیری گھٹنائیں دور ہونے لگیں مگر ہمارے لیے مشکل پیدا ہو گئی۔''

میرے حلق میں گولا سا آ پھنسا۔ بڑا روح فرسا انکشاف تھا، بابا فضل نے میری مشکلات دور کرنے کے لیے جان کا

نذرانہ دیا تھا، اتنا بڑا ایثار کیا تھا انہوں نے اتنا بڑا ایثار...... بھوریا چرن میری کیفیت سے بے نیاز بولا۔

''ہماری بھی کچھ مشکلیں ہوتی ہیں، کچھ بھید بھاؤ ہوتے ہیں اگر تو مہان بن جاتا اگر تیرے ہاتھوں کالے جادو والوں کو نقصان پہنچتا تو وہ ہمارے حساب میں لکھا جاتا۔ ہمیں جواب دینا ہوتا اس کا اور ہمارے درجے کم ہوتے جاتے۔ مصیبت گلے پڑ گئی تھی ہمارے تو، لینے کے دینے پڑ گئے تھے، اپنا کام بھولنا پڑا تیری تاک میں لگے رہے، تجھے دیکھتے رہے، تیرے راستے روکنے تھے ہمیں اور ہم کامیاب ہو گئے۔ چولہے میں جا گھسی تیری مہانتا۔'' وہ پھر ہنس پڑا۔

✦✧✦✧✦

''وہ کیسے بھوریا چرن۔'' میں نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''بتائیں گے سسر۔ سب کچھ بتائیں گے، تجھے بھی تو کچھ دکھ ہو، تو بھی تو ہماری طرح کلسے۔''

''بتاؤ بھوریا چرن۔''

''دیوتا بن رہے تھے مہاراج مہان پرش بن رہے تھے، سنسار کو دکھوں سے دور کرنے جا رہے تھے، اپنے دین دھرم کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔''

''تم جانتے ہو......؟''

''کیوں نہیں ہمیں سب سے پہلے دشمنوں سے ہوشیار رہنے کی سکھشا دی جاتی ہے اس کے لیے دوسرے دھرموں کے بارے میں جاننا ہوتا ہے۔''

''میرے دین کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''

''جتنا جانتے ہیں نا تجھ سے زیادہ ہے۔ تیرے دھرم میں ایک نکتہ ہے، سب سے بڑی چیز ایک نکتہ ہے۔''

''کیا ہے......''

''سسر تو ہم سے پوچھے گا کیوں بتائیں تجھے۔''

''اس لیے کہ تم نے میرے دین کو جاننے کا دعویٰ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہم جانتے ہیں نکتے کی بات بالکل ٹھیک کہی ہم نے، تیرے دھرم میں واسناؤں کی گنجائش نہیں، نفس کی موت کو پہلے تو جو حاصل ہے اور جو نفس کے جال میں پھنسا ڈوب گیا، تجھے ڈبونا ضروری ہو گیا تھا ہمارے لیے دھن کے چکر سے تو نکل گیا، اسے تو پتہ، تیری تجھے مت پڑنیں کر سکتی تھیں اور ہمارا کام اس سے تک نہیں بن سکتا تھا جب تک تو ایسے کسی پھیر میں نہ پڑے۔ سو ہم لگے رہے تیری تاک میں اور موقع مل گیا ہمیں، بڑا دین دیال بنا ہوا تھا تو اور لوگوں کے بڑے کام آ رہا تھا، ہم نے حساب کتاب لگایا اور کام میں مصروف ہو گئے، باؤلے وہ مٹکا جو تجھے درخت کی جڑ میں نظر آیا تھا کسی کا دبایا ہوا خزانہ نہیں تھا وہ تو ہم نے سونے کی مہروں سے بھر کر وہاں گاڑ دیا تھا سو تجھے وہ نظر آ گیا، وہیں پر ہمارا کام بن گیا، تو وہ نکتہ بھول بیٹھا، تجھے بتایا گیا تھا یاد ہے نا تجھ سے کہا گیا تھا کہ پہلا کام انسانوں کے کام آنا ہے، دوسرا کام اپنے نفس کو مار کر اپنی منزل کی تلاش۔ اس کے بغیر مہانتا مکمل نہیں ہوتی، اگر تو اپنی خواہشوں کے جال میں پھنس گیا تو کچھ نہیں حاصل کر سکے گا اس سنسار میں۔ بول یہی بتایا گیا تھا ناں تجھے سو یوں ہوا کہ تو نے دیکھا اس آدمی الیاس خان کو اور تجھے یاد آ گئے اپنے ماماجی۔ ارے ہم نے سوچا کہ اس سے بڑھیا موقع ملنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ماماجی کے پھیر میں تو لمبے سے لمبے پھیر میں پڑ سکتا ہے اور بات بن گئی بھیا ہماری۔ سونے کا وہ مٹکا تو نے الیاس خان کو دے دیا اس لیے کہ وہ تیرے ماماجی کا پتا تجھے بتا دے، بس کام تو وہیں سے ہو گیا تھا ہمارا۔ تو خود سوچ دھرتی تو بہت بڑی ہے نہ جانے کتنے خزانے بھرے ہوئے ہیں اس دھرتی میں اور سب کے سب آ جاتے تیری آنکھوں میں کیونکہ تجھے آہستہ آہستہ روشنی مل رہی تھی تو تو بہت بڑا بن جاتا بھائی مگر راستے روکنا ہی تھے سو تو نے وہی کیا جو ہم نے چاہا اور نکل گیا تو ان پابندیوں سے جو تجھ پر قائم کی گئی تھیں بس ایک کے بعد ایک، ہمارا کام بنتا رہا اور پھر بن گئے ہم تیرے ماماجی۔

''تم!'' میں خوف سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

''ہاں رے اس سے تو یہی سب کچھ کرنا تھا، لگا لائے تجھے اپنے پیچھے ہم اور سب کچھ بھول گیا تو جو کچھ تجھے دیا گیا تھا اسے بھول کر تو پڑ گیا اپنے ماماجی کے پھیر میں، ماتا پتا کے جال میں اور یہی ہم چاہتے تھے اور یہ جگہ اب جہاں تو آیا ہے، کہلاتی ہے بیر منڈل۔ یہاں سارے کے سارے ہمارے بیر رہتے ہیں۔ وہ مکڑیاں جو تیرے ماماجی کی لاش سے چمٹی ہوئی تھیں، تیرا کیا خیال ہے مار دیں تو نے، ارے جا باؤلے بیر کہیں مرتے ہیں وہ تو اپنا کام کر رہے تھے ہمارے کہنے سے اور پھر ہم نے وہ خون تیرے شریر میں اتار دیا جو ہم نے سات پورن ماشیاں منتر پڑھ پڑھ کر تیار کیا تھا۔ سترہ آدمیوں کا خون جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور جن پر سات پورن ماشیاں منتر پڑھا تھا ہم نے، کالے جادو کا وہ سب سے بڑا منتر جس سے بڑا منتر اور کوئی نہیں ہوتا اور جو ایک شنکھا ہی کو معلوم ہوتا ہے بس وہ خون پانی سمجھ کر پی لیا تو نے اور تیرے اندر سے سب کچھ صاف ہو گیا، کچھ نہیں ہے اب تیرے پاس، سمجھا، تو ایک کورے مٹکے کی طرح ہے جو اندر سے خالی ہے اور کورا ہے۔ یقین نہ آئے تو آزما لے اپنی کسی بھی بات کو۔ ارے پاگل تیری ساری تپسیا ایک لمحے میں ختم ہو گئی، اس طرح کم از کم ہمارا ایک کام تو بنا، ایک کام سے تو فارغ ہوئے ہم، نہ تو اپنے دھرم کا رہا اور نہ اس سنسار کا...... اب جا بھاڑ چولہے میں ہمارا کام کر دیتا تو بہت کچھ مل جاتا نہیں کیا تو ہمارا کیا بگاڑ لیا ہم شنکھا تو ہیں نا مگر تو کیا ہے، تو کیا رہ گیا اب اگر کہے تو کتا بنا کر باہر نکال دیں تجھے یہاں سے۔ بول کیا کریں تیرے ساتھ......؟'' میں بھوریا چرن کو دیکھتا رہا جو کچھ اس نے بتایا تھا، دل میں اتر رہا تھا۔ کمبخت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا، نہ جانے کیا کیا جتن کئے اس نے اپنے کام کے لیے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کا کہنا بالکل درست تھا۔ ایک نکتہ صرف ایک نکتہ ہی تو اصل حیات ہوتا ہے۔ بڑے بڑے عالم دین، بڑے بڑے ولی، درویش، قلندر اپنے آپ کو تیاگ کر کچھ حاصل کرتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے آگے سر جھکا دیا، اپنی محبتوں کے ہاتھوں دیوانے ہو گئے تو پھر کیا باقی رہ گیا۔ عام انسان بھی تو یہی سب کچھ کرتا ہے۔ میرا تو آزمائشی دور تھا اور میں اس امتحان میں نامکمل رہ گیا۔ میں نے وہ نعمتیں ٹھکرا دیں جو مجھے دی گئی تھیں، اتنی ساری نعمتیں دے کر صرف ایک ہدایت کی گئی تھی مجھے کہ اپنی خواہشوں کا غلام نہ بنوں، وہ نہ مانگوں جن کا دینا ابھی آسمانوں میں منظور نہیں ہوا ہے لیکن کر ڈالا میں نے وہ سب کچھ ماموں ریاض کے چکر میں پڑ کر وہ سبل بھی وہیں چھوڑ آیا جس نے میری آنکھوں کو روشن کر دیا تھا، جس نے میرے دل و دماغ کو منور کر دیا تھا۔ بھوریا چرن قہقہے لگانے لگا۔ پھر بولا۔

''اور اب جا مر اس سنسار میں۔ جا دیکھوں آگے تو کیا کرتا ہے، چھوڑوں گا نہیں تجھے پاپی، ہتھیارے تو نے میرے راستے روکے ہیں، میں سنسار کے سارے راستے تجھ پر بند کر دوں گا، چل بھاگ رے یہاں سے اب تو مٹی کا ڈھیر ہے میرے لیے کچھ نہیں رہا۔''

میں گردن جھکائے وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ اندر سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ درحقیقت خالی ہو چکا ہوں اور اب کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ ایک بار پھر یہ دنیا میرے لیے امتحان گاہ بن گئی تھی اور اس بار میں نے خود کو اس امتحان میں ڈالا تھا، بلاشبہ یہی ہوا تھا یہی سب کچھ ہوا تھا آہ...... میں نے اپنے ہاتھوں اپنے منصب گنوا دیئے تھے، یہ میرا گناہ تھا صرف میرا گناہ اس میں کسی کا قصور نہیں تھا، مجھے تو جگہ جگہ سمجھایا گیا تھا، مجھ سے کہا گیا تھا کہ پہلے پھل چکھوں پھر کھانے کو ملے گا۔ بھوریا چرن نے بالکل درست کہا تھا میرا مذہب سچا ہے، انہیں چھوٹ ہے جو کچھ نہیں جانتے لیکن جو واقف ہوں ان پر ذمہ داری ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا مگر میں نے اپنی خواہشوں کو اول قرار دیا، اس بار سارے راستے کھلے ہوئے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ باہر گہری رات چھا چکی تھی نہ جانے کیا بج گیا تھا، چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا، جگہ جگہ درخت بکھرے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھتا رہا کچھ سوچے بغیر اب تو کچھ سوچنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر دریا کا شور ابھر رہا تھا۔ آواز میرے کانوں تک آ رہی تھی مگر احساس کچھ نہیں تھا۔ تھک گیا تو جہاں تھا وہیں لیٹ گیا، وہیں سو گیا، خوب گہری نیند آ گئی تھی۔ صبح کو اس وقت جاگا جب کہیں دور سے اذان کی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے اعضاء میں تھرتھری سی پیدا کر دی۔ بے اختیار اٹھ گیا، دماغ

کھویا کھویا سا تھا، دل کچھ چاہ رہا تھا، اعضاء کچھ طلب کر رہے تھے مگر کیا...... یاد نہیں آ رہا تھا۔ کھڑا ہو گیا اسی جگہ کھڑا ہو گیا، دونوں ہاتھ نیت کے انداز میں بندھ گئے مگر اب کیا کروں آہ...... اب کیا کروں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا، کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا، بہت کوشش کی مگر سب کچھ بھول گیا تھا، جھکا پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سجدے میں گر پڑا، آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، بلک بلک کر رونے لگا، بھول جانے کا غم تھا، یاد کرنا چاہ رہا تھا مگر یادداشت ساتھ چھوڑ چکی تھی، سارے آنسو بہہ گئے، آنکھیں خشک ہو گئیں تو اٹھ کھڑا ہوا، کانوں میں ایک آواز ابھری۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے

اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

میری عمر ہی کیا ہے آہ...... چند لمحے میری بخشش کا ذریعہ تو نہیں بن سکیں گے مگر یہ زندگی جو ایک سزا ہے، یہ تو میرے لیے مزید گناہوں کا باعث بن جائے گی...... مزید گناہ نہیں اور گناہ نہیں اور گناہ نہیں اس سزا کو ختم ہو جانا چاہیے، برائی میرے لیے نہیں ہے، میں برائی کے قابل نہیں ہوں اور گناہ کرنے کے لیے مجھے اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے، مرجانا چاہیے...... مجھے مر جانا چاہیے...... ہاں مجھے مرجانا چاہیے۔ میں نے وحشت ناک نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر میری سماعت نے مجھے اس شور کی طرف متوجہ کیا جو مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میرے قدم تیز و تند دریا کی طرف بڑھ گئے۔ میں عالم بے خودی میں اس طرف چل پڑا۔ وسیع و عریض چوڑا پاٹ میرے سامنے تھا۔ پانی برق رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہا تھا، مٹیالی لہریں جھاگ اڑا رہی تھیں۔ [illegible] اور پھر پانی نے میرا وزن سنبھال لیا، ایسی پٹخی لگائی کہ سر نیچے، [illegible] پھر روشنی دھندلی روشنی پھر ایک آواز۔

"[illegible]......"

"[illegible]......"

"[illegible] رہے۔"

"[illegible] رے دیکھ بٹو...... اوکا ہوس آئے رہے۔"

"[illegible] رہیں کاکا...... ابھو آت رہیں۔"

"[illegible] کا [illegible] ہے جانکی۔"

"[illegible] پھپٹا رہا ہے۔"

"[illegible]...... اب آئی سسروا کو ہوس...... اری جانکی دودھ گرم کر لئی ہے کا؟"

"ہاں کاکا...... ہنڈیا چولہے پر رکھی ہے۔"

"پھر دو کٹورے ماں...... ویدجی اے ہی کہہ گئے تھے، جاری جلدی کر......"

یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ ہوش میں تھا، سوچ رہا تھا کہ اب کہاں ہوں، یہ بھی یاد آ گیا کہ دریا میں کود کر جان دینا چاہی تھی۔ یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ موت نے قبول نہیں کیا ہے۔ یہ بھی یاد تھا کہ مسعود احمد نام ہے میرا اور بھوریا چرن بھی یاد تھا۔

"کہاں ہوس آئی کاکا" ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"نا آئی۔

جانکی ہی بولت رہی۔" دوسری آواز نے کہا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اتنی دیر میں ایک لڑکی بڑا سا کٹورا لیے اندر آ گئی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نوجوان مجھے دیکھ کر مسکرا دیا پھر بولا۔

''جاؤ کا کا دودھ کی کھس بو پڑتے ہی ہوس آ گئی انجائی کو۔ چل بوا دودھ پی لے۔'' اس نے سہارے سے مجھے اٹھاتے ہوئے کہا۔ سخت بھوکا تھا۔ لڑکی نے کٹورا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنی اوڑھنی کا ایک حصہ گرم کٹورے کے نیچے رکھ دیا۔ باقی اوڑھنی اس کے شانوں پر تھی اور اسے یہی اس طرح جھکنا پڑا تھا کہ اس کا چہرہ میرے عین سامنے آ گیا تھا۔ دودھ کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے اسے دیکھا سانولا سلونا چہرہ سادہ سے نقوش، انیس بیس سال کی عمر، جوانی کی تمازت سے تپتے ہوئے سانس، کاجل بھری آنکھوں میں دوڑتی زندگی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر آنکھیں ''جھکیں'' چہرے کا رنگ بدلا پھر آنکھیں اٹھیں، کڑے انداز میں مجھے دیکھا، پرکھا اور پھر جھک گئیں۔ ہونٹ آہستہ سے کپکپائے جیسے انہوں نے کچھ کہا ہو۔ مگر بے آواز۔ میں کچھ بدحواس ہو گیا مگر گرم دودھ کے دو بڑے گھونٹوں نے سنبھال لیا، آنتیں تک جل گئی تھیں۔

''دودھ پیوت ہے کہ نا؟'' کاکا پھر بولا۔

''ہرے سب ڈکوس گئی سسر۔'' نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ لڑکی نے جلدی سے کٹورا میرے ہاتھ سے لے کر اپنی اوڑھنی سنبھال لی اور پھر کٹورا لیے باہر نکل گئی۔ میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ بہت سی لڑکیاں دیکھی تھیں، شگفتہ نے مجھ سے اظہار عشق کیا تھا، کشنا میری دیوانی تھی، یہ لڑکی ان کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی مگر نہ جانے دل اس کی طرف مائل کیوں ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکل گئی تو اس کی جگہ کا جائزہ لیا، کچی مٹی کی دیواروں سے بنا کمرہ تھا۔ چھت پھونس کے چھپر سے بنی ہوئی تھی۔ تین چار پائیاں کل کائنات تھیں جن میں سے ایک پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا، وہ غالباً اندھا تھا، یہی احساس ہوا تھا۔

''ہاں بھائی ٹیسو رام۔ اب بولو جمنا ماں کا کر رئے تھے۔'' نوجوان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جمنا میں؟''

''ارے تو اور کا۔ کا اندر مہاراج کے رتھ ماں سیر کر رئے تھے۔''

''نہیں بس کنارے پر تھا پاؤں پھسل گیا۔''

''بھلے پھسلے بوا۔ اور ہم نا نکالتے تو......''

''مر جاتا'' میں نے کہا اور ایک بیکس مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''لیو کاکا۔ بو مرن لیے گرے تھے جمنا ماں۔''

''کاہے مٹوٗ۔ جیون بھاری ہو گیا کا۔''

''ہاں چاچا۔''

''دکھی لاگو ہو۔ ارے ناتھو رے۔ مہمان بنا لو اپنا اسے جی بہل جائے تو جان دینا۔''

''ارے ای کہاں جائے رہے اب کاکا۔ ہم محنت کری ہے اس پر، ایسے کاہے جانے دیں گے سسروا کو۔''

''بس ٹھیک ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔

دھوبیوں کی آبادی تھی۔ جمنا گھاٹ پر آباد تھی۔ بستی کا نام تھا پوریا۔ کوئی سو گھر تھے پوری بستی میں۔ بوڑھے شخص کا نام راگھو تھا۔ بیٹے کا ناتھو اور لڑکی کا نام جانکی تھا۔ ناتھو گھاٹ پر چھپوٗ رام کر رہا تھا کہ میں بہتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا اور اس نے مجھے نکال لیا۔ جانکی کی نگرانی میں پیٹھ پر لاد کر مجھے اپنے جھونپڑے میں لے آیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا شہر تھا جہاں سے یہ لوگ بیل گاڑیوں پر گھروں کے کپڑے دھونے لاتے تھے اور پھر وقت پر انہیں ان کے مالکوں کے پاس پہنچا دیا کرتے تھے۔ سادہ سی زندگی۔ جو روکھا سوکھا ملا کھا لیا اور خوش۔ کیا عجیب بات ہے بس اسے تقدیر ہی کہا جا سکتا ہے۔ نمود ہوتی ہے اور کوئی طلب نہیں ہوتی کہ کون کہاں پیدا ہو۔ لیکن اس کے بعد کی کہانیاں انوکھی ہوتی ہیں۔ سادگی کی حد یہ تھی کہ مجھ سے میرا نام تک نہ پوچھا گیا اور ناتھو نے مجھے ٹیسو کہا تو سب اس نام سے پکارنے لگے۔ یہ بستی بڑی اچھی لگی تھی۔ میں یہاں رہ پڑا۔ کہاں جاتا، کیا طلب کرتا جو مانگا وہ گناہ بن گیا۔ اور اب یہ سوچا تھا کہ کچھ نہیں مانگوں گا جو ملے گا قبول کر لوں گا۔ بھول جاؤں گا سب کو۔ کوئی فائدہ نہیں کسی کو یاد کرنے سے، وہ بھی مجھے بھول گئے ہوں گے۔ صبر کر لیا ہوگا، مجھے خدا کرے محمود اپنی کوشش میں

کامیاب ہو جائے، خدا کرے اس کا ماں باپ سے رابطہ ہو جائے۔ خدا کرے میری بہن شمسہ اپنا مستقبل پالے، میں تو ان کا قاتل تھا۔ اب کیا کروں گا ان کے پاس جا کر۔ جو چھن گیا تھا وہ نہیں ملا تھا۔ آہ جب بھی وقت ملتا جب دوسروں کی نظروں سے محفوظ ہوتا قبلہ رو کھڑا ہو جاتا، ہاتھ باندھ لیتا پھر سجدے میں چلا جاتا لیکن جو چھن گیا تھا یاد نہ آتا۔ ایسے لمحوں میں ذہن سو جاتا تھا۔

''راکھو بابا۔ میں کپڑے دھوؤں گا۔''

''کا ہے کو؟''

''اس بستی میں رہوں گا میں۔''

''رہو بٹوا!''

''تمہارا کھاتا رہوں۔''

''سو کا ہے۔''

''ٹھیک تو کہے ہے کاکا۔ وئی مٹی ہو جاوے گی۔ کام کرنے دے اسے۔'' ناتھو نے کہا اور وہ میرا استاد بن گیا۔ میں اس کے ساتھ کپڑے دھونے لگا۔ اس کا کام بڑھ گیا تھا۔ ایک دن جانکی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''کچھ معلوم ہے تجھے ٹیسوا۔''

''کیا؟''

''کاکا اور بھیا ہمارے بیاہ کی بات کر رہے تھے۔ کاکا کہہ رہا تھا کہ چھورا بڑھیا ہے، کام بھی کرے ہے۔ جانکی کے ساتھ پھیرے کرا دیں اس کے چوکھا رہے گا۔''

میرے ہاتھ رک گئے۔ میں عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جانکی مجھے اچھی لگتی تھی، اس کی قربت سے ایک نشہ سا چھایا رہتا مجھ پر۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھی، مجھے چاہتی تھی جس کا صاف اظہار ہوتا تھا مگر وہ میری ہم مذہب نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا، مجھے اپنا نام یاد تھا، اپنا مذہب یاد تھا اور مجھے اس سے محبت تھی۔ جو کچھ مجھ سے چھن گیا تھا وہ میری بدقسمتی تھی لیکن باقی سب ـــ کیا..... کیا خود کو بھول جاؤں۔

جانکی نے کہا۔ ''کیا سوچنے لگا۔''

''کچھ نہیں جانکی۔''

''سپنے دیکھ رہے ہوں گے۔''

''ہاں!''

''سب کچھ بھلا دوں گی تجھے۔ سب کچھ۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر میں بہت بے چین ہو گیا تھا۔ اس رات میں بہت بے کل تھا۔ ساری رات بے کلی میں گزری۔ صبح کو اٹھا۔ دل کی بے چینی کسی طور دور نہیں ہو رہی تھی۔ ایک گوشہ تلاش کیا اور بے بسی سے کھڑا ہو گیا، ہاتھ باندھ لیے پھر سجدے میں گر گیا۔ بہت دیر گزر گئی، چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اٹھا تو..... ناتھو پر نظر پڑی۔ وہ اچنبھے سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ ''کیا تو مسلمان ہے؟''

پورا وجود مجسم آواز بن گیا۔ رُواں رُواں پکارنے لگا۔ ''ہاں، ہاں، ہاں۔'' اور یہ کہتے ہوئے جو سکون ملا تھا اس کی قیمت کائنات کے سارے خزانے نہیں تھے۔ یہ الفاظ میری گمشدہ بینائی تھے۔

''مسلمان ہے تو۔'' ناتھو نے اس بار کڑک کر پوچھا۔

''ہاں میں مسلمان ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔'' میں نے عجیب سی کیفیت میں کہا۔

''ہم کا دھوکا کاہے دیت رہے تے۔ ہمارے سامنے ٹیسو کاہے بنا رہے۔''

''نہیں ناتھو۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں بنا۔ میں تو مصیبت کا مارا ہوں ناتھو میں نے تو..... میں نے تو.....''

''ہمار بہنیا سے بیاہ کرنے لاگا تھا تے۔ ارے ہم سب کی آنکھن ما دُھول جھونک رہے رے۔''
''ناتھو، تم لوگوں نے جمنا سے مجھے اس وقت نکالا جب میں بیہوش تھا۔ میں تو خود اپنی زندگی ختم کرنے کے لیے دریا میں گرا تھا، میں کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کیسے کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے ناتھو، تم جانتے ہو کہ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ کل جانکی نے مجھے بتایا کہ تم لوگ ایسا سوچ رہے ہو۔ میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ اپنے اُوپر احسان کرنے والوں کو میں کبھی دھوکا نہ دیتا۔ اگر میں تمہیں حقیقت نہ بتاتا تو کم از کم یہاں سے چلا جاتا۔''
''اور جانکی سے بیاہ نہ کرتا۔''
''کبھی نہیں ناتھو، کبھی نہیں۔'' ناتھو میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ ان سچائیوں پر غور کر رہا تھا، بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''بڑی بکٹ بات ہوگئی رہے ٹیسوا۔ جانکی تیرے سپنے دیکھن لاگی رہے اس نے اپنی سکھیوں کو بھی بتا دیا ہے۔ اب بات برادری مانکل جئی ہے تو ہم پر کرپا کر بیرا۔ کرپا کر ہم پر رے۔ تو یہاں سے چلا جا، چپ چاپ چلا جا۔ سب سوچیں گے کہ تے بھاگ گیا۔ ہم کہہ دئی ہے کہ تے ہمارے روپے لے کر بھاگ گیا۔ ہماری عجت بچ جئی ہے۔ لوگ تو کا برا بھلا کہہ کر کھاموس ہو جئی ہے۔ تیرا کچھ نا بگڑے گا۔ ہماری مان لے، ہماری عجت بچا لے بیرا۔'' ناتھو نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
''میں جا رہا ہوں۔ ابھی جا رہا ہوں ناتھو میرے بھائی۔ تیری عزت مجھے زندگی سے زیادہ پیاری ہے۔ ابھی چلا جاتا ہوں میں۔ ابھی زیادہ وقت بھی نہیں گزرا ہے۔'' میں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ الگ کئے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ میں نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا تھا۔
بستی بہت چھوٹی تھی۔ میں آخری مکان سے بھی گزر گیا، آگے کھیت بکھرے ہوئے تھے اِکا دُکا لوگ نظر آ رہے تھے کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں نے رفتار تیز رکھی تھی کسی رُخ کا تعین نہیں کیا تھا۔ رُخ کدھر کرتا، کہاں جاتا۔ بس چل پڑا تھا، ناتھو اور دُوسرے دھوبی کسی بستی کا تذکرہ کرتے تھے کہتے تھے کوئی بڑا شہر ہے جہاں سے وہ کپڑے لاتے ہیں اور دھو کر ان کے مالکوں کو پہنچا دیتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی اس شہر کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ چلتا رہا اس وقت صرف ناتھو رام کی عزت پیش نگاہ تھی اور کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ اب ویران جنگلوں کے سوا کچھ نہیں تھا، درخت نظر آ رہے تھے، پرندے پرواز کر رہے تھے، آسمان شفاف تھا، دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جب پیروں نے جواب دے دیا تو ایک درخت کے نیچے پناہ لی اور زمین پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند تو نہیں آئی تھی البتہ نقاہت نے غنودگی طاری کر دی تھی، بدن کو سکون ملا۔ پچھلے کچھ دن آرام سے گزارے تھے اس لیے برداشت کی قوت میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ سورج ڈھلے اُٹھا اور پھر چل پڑا۔ شام جھلک آئی اور پھر میں نے سیاہ رنگ کی ایک عمارت دیکھی۔ ٹوٹی دیواریں، بکھری ہوئی زمینوں کے ڈھیر، ایک بڑا سا گنبد۔ قدم اسی جانب بڑھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ کوئی قدیم مسجد تھی۔ سیڑھیاں تک سلامت نہیں تھیں۔ بڑا سا صحن تھا جو میری طرح اُدھڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف پتے بکھرے تھے۔ دل میں عقیدت کا ایک جذبہ اُبھر آیا۔ پیار اُبھر آیا یہ سب مجھ سے رُوٹھے ہوئے تھے۔ گناہ گار تو تھا میں لیکن......لیکن مجھے پیار تھا اس احساس سے پیار تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے یہ صحن صاف کرتا۔ قمیض اُتاری اور صحن کی صفائی میں مصروف ہو گیا۔ وسیع و عریض صحن کو صاف کرتے کرتے اتنی دیر ہوگئی کہ رات ہوگئی۔ سوکھے پتے سمیٹ کر میں نے مسجد کے پچھلے حصے میں پھینکے اور وہاں ایسے پتوں کے انبار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی باقاعدگی سے صحن صاف کر کے یہ پتے یہاں پھینکتا ہو۔ نہ جانے کون، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ زیادہ غور بھی نہیں کیا۔ اب کوئی کام نہیں تھا۔ سیڑھیوں کے پاس آ کر ایک جگہ صاف کی اور لیٹ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی، دن بھر پیاس کی شدت بھی رہی تھی کہیں سے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ بس چلتا رہا تھا اور یہاں آ کر اس مسجد کے پاس کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ بھوک پیاس بے شک تھی لیکن اسے رفع کرنے کا کوئی ذریعہ سامنے نہیں آیا تھا۔ لیٹے لیٹے ایک بار پھر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور شاید سو گیا۔

نجانے کتنا وقت گزر رہا تھا عالم ہوش میں نہیں تھا کہ دفعتاً کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ شاید ان آہٹوں سے نہیں جاگا تھا کہ بلکہ کسی نے پاؤں پکڑ کر جھنجوڑا بھی تھا۔ چونک پڑا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ تین چار آدمی نزدیک کھڑے ہوئے تھے۔ چاند نکلا ہوا تھا اور مسجد کا پورا ماحول روشن تھا ان میں سے ایک نے کہا۔

''یہ سونے کی جگہ نہیں ہے میاں صاحب، یہاں کیوں سو رہے ہو، راستہ ہے گزرگاہ ہے۔'' میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اس ویرانے میں اس وقت مسجد میں آنے والے کون ہیں، جن لوگوں نے مجھے جگایا تھا، وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ سفید لباسوں میں ملبوس پاکیزہ نورانی چہرے والے بزرگ، نوجوان اور چھوٹی عمر کے لوگ جوق در جوق مسجد کی جانب آ رہے تھے اور اندر مسجد میں بڑا اہتمام تھا، میں پُرشوق انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اس وقت یہ اجتماع کیوں ہوا ہے۔ یہ تجسس میرے دل میں جاگ اُٹھا تھا۔ لوگ صفیں بنا کر بیٹھے تھے، میں بھی ایک سمت بیٹھ گیا۔ سامنے ہی ایک منبر لگایا گیا تھا، پہلے یہاں موجود نہیں تھا، غالباً یہاں آنے والے اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان آدمی سے جس کی داڑھی سیاہ تھی اور رنگ سفید تھا مدھم لہجے میں پوچھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

''درس، کیا تم درس میں شرکت کے لیے نہیں آئے؟'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلا دی تھی، پھر میں نے ایک معمر شخص کو دیکھا ٹخنوں تک چغہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر سفید عمامہ تھا۔ براق سفید داڑھی جو سینے تک لٹکی ہوئی تھی۔ بھنویں تک سفید تھیں، وہ منبر کی جانب بڑھے اور پھر منبر پر جا بیٹھے اور اس کے بعد انہوں نے وہاں موجود تمام لوگوں کو سلام کیا سب نے بلند آواز میں جواب دیا اور معمر بزرگ کہنے لگے۔

''اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج تو مسجد پوری بھری ہوئی ہے سبھی آ گئے ہیں۔''

''جی امام صاحب، آج ایک عجیب واقعہ بھی ہوا ہے۔'' ایک شخص نے کہا۔

''کیا؟''

''ہمارے آنے سے پہلے ہی کسی نے مسجد کا صحن صاف کر دیا ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو صحن صاف ملا تھا۔''

''ہوگا کوئی بندۂ خدا، خدا کے بندے کہاں موجود نہیں ہوتے۔''

''ایک اجنبی شخص کو ہم نے سیڑھیوں کے پاس پڑے پایا، سو رہا تھا۔ غالباً اسی شخص نے صحن صاف کیا ہوگا۔''

''کہاں ہے وہ......؟'' جن بزرگ کو امام صاحب کہہ کر پکارا گیا تھا انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کسی کے بتائے بغیر ان کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ فاصلہ کافی تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان آنکھوں سے روشنی کی ایک لکیر نکل کر آگے بڑھی ہو اور مجھ تک پہنچ گئی ہو۔ اس روشنی نے میرا احاطہ کر لیا تھا اور اس کے بعد مجھے امام صاحب کی گونج دار آواز سنائی دی تھی۔

''آگے آؤ۔ کون ہو تم؟'' مجھے یوں لگا جیسے کچھ نادیدہ ہاتھوں نے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اُٹھا کر کھڑا کیا ہو۔ قدم بھی خود بخود ہی آگے بڑھے تھے۔ درمیان میں آنے والوں نے مجھے امام صاحب تک پہنچنے کا راستہ دیا تھا اور میں وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ جونہی میں امام صاحب کے قریب پہنچا، انہوں نے عمامے کا لٹکتا ہوا حصہ بائیں ہاتھ میں پکڑ کر ناک پر رکھ لیا۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کڑی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''کون ہے تو، اور یہاں کیا کر رہا ہے؟'' میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہیں نکل سکی تھی، امام صاحب کہنے لگے۔

''کیا تو نے اس مسجد کا صحن صاف کیا تھا؟'' میرے منہ سے تو آواز نہ نکل سکی البتہ گردن ہل گئی تھی۔

''کیا تجھے علم نہیں ہے کہ یہ مسلمانوں کی مسجد ہے؟'' میں نے امام صاحب کو دیکھا ان کی نگاہیں مجھ پر گڑھی ہوئی تھیں میری آنکھوں میں نجانے کیا کیا کیفیات تھیں، وہ چونک کر بولے۔

''مسلمان ہے تو......؟''

''ہاں، ہاں......'' میرے حلق سے جیسے رُکی ہوئی بے شمار آوازیں نکل گئیں۔
''مگر تیرے جسم سے تو بدبو اُٹھ رہی ہے، ایک ایسی بدبو جو کبھی کسی مسلمان کے جسم میں نہیں ہوتی۔ ایسا کیسے ہوا، نہیں نوجوان تو صاحب ایمان نہیں ہے، یہ بدبو جو تیرے بدن سے اُٹھ رہی ہے، کسی ایمان والے کے جسم سے نہیں اُٹھ سکتی، یہ تو، یہ تو غلاظت کی بو ہے، براہ کرم صحن مسجد سے باہر نکل جا، یہاں درس الٰہی ہوگا اور اس کے بعد نماز تہجد، تجھ جیسے کسی بے ایمان شخص کو ہم اپنے درمیان جگہ نہیں دے سکتے۔ براہ کرم باہر نکل جا اس سے پہلے کہ تجھے مسجد کے صحن کو ناپاک کرنے کی سزا دی جائے۔ یہ سزا تجھے صرف اس لیے نہیں دی جائے گی کہ تو نے کسی بھی جذبے کے تحت سہی، صحن مسجد کو صاف کیا ہے مگر تجھے اپنے درمیان جگہ نہیں دیں گے ہم۔'' میں بلک بلک کر رو پڑا میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا۔
''سارے زمانے کا ٹھکرایا ہوا ہوں میں، میں ایک بدنصیب انسان ہوں، مجھے سہارا چاہیے، میں قصوروار ہوں، لاکھوں گناہ کیے ہیں میں نے، تائب ہو رہا ہوں۔ میری مدد کرو، خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' تمام لوگ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے تھے کسی نے چیخ کر کہا۔
''اس ملحد کو دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دو، اس بدنما شخص کو مسجد میں داخل ہونے کی سزا دو، آخر یہ یہاں آیا کیوں ہے نکالو اسے، نکالو اسے۔''
امام صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''ایمان والو! ایمان والوں جیسی باتیں کرو، وہ جو کچھ بھی ہے اس نے کوئی دُشمنی نہیں کی ہے، کوئی بھولے سے اگر خدا کے گھر میں داخل ہوگیا ہے تو خدا کے گھر سے اسے دھکے دے کر نہیں نکالا جا سکتا، کیسی باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟''
چاروں طرف سناٹا چھا گیا، لوگ خاموش ہوگئے کسی کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلی، امام صاحب نے کہا۔
''اور تو کہتا ہے کہ تو مسلمان ہے، مگر کیا یہ بتا سکے گا کہ یہ بدبو تیرے جسم میں کیسے داخل ہوئی؟''
''یہ میرے گناہوں کا پھل ہے۔ یہ میرے گناہوں کا پھل ہے، میری مدد کرو، میری مدد کرو۔'' میں گڑگڑا کر بولا۔
''گناہوں کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، مگر یہ کیسا گناہ ہے جس سے تیرے جسم میں کفر کی بو بس گئی ہے۔ خدا کے لیے ہمارے ان لمحات کو ضائع نہ کر۔ ہم نے اپنے طور پر جو انتظام کیا ہے اور جس مقصد کے لیے کیا ہے اس کی تکمیل کرنے دے تو باہر جا، تیرے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور یہ دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ جب بھی بارگاہ ایزدی میں تیری توبہ قبول ہوگئی تجھے تیری مشکلات کا حل مل جائے گا لیکن تو جا یہاں سے۔ یہاں سے چلا جا، فوراً چلا جا۔ ہم اپنی عبادت میں تیری مداخلت پسند نہیں کرتے، اسے راستہ دو......'' امام صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب مجھے ان کے درمیان جگہ نہیں ملے گی۔ پھر یہاں رُکنا بے مقصد ہی ہے۔ نڈھال اور مضمحل قدموں سے وہاں سے واپس پلٹا تو امام صاحب نے کہا۔
''سیدھے راستے پر چلے جانا کافی دُور جا کر تجھے ایک درخت نظر آئے گا اس درخت میں پھل ہوں گے۔ ان پھلوں سے تو اپنی شکم سیری کر سکتا ہے بس اس سے زیادہ اور تیری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔'' میں نے کچھ نہ سنا نجانے کیسے کیسے خیالات دِل میں آرہے تھے، جو کچھ ہوا تھا اس پر غور بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ بس یہ احساس تھا کہ میرے جسم سے ایک ایسی بو اُٹھنے لگی جو کسی مسلمان کے جسم میں کبھی نہیں پیدا ہوتی اور اس بو کی وجہ میں جانتا تھا، بھوریا چرن نے میرے وجود میں کفر اُتار دیا تھا۔ یہ کفر میرے دل پر تو اثر انداز نہیں ہوسکتا تھا، میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکا تھا لیکن جسم غلیظ ہوگیا تھا اور بقول امام صاحب اس جسم سے وہ بو اُٹھ رہی تھی جو ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، آہ جو کچھ ہوا ہے، جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں کافی حد تک میرا قصور ہے بلکہ قصور ہی میرا ہے، بلاشبہ انسان کو اس کی حیثیت سے زیادہ مل جائے تو وہ بھول جاتا ہے اپنے آپ کو کھو جاتا ہے، لیکن ایک لمحہ صرف ایک لمحہ ایسا آتا ہے جس کے بعد ساری عمر کی توبہ بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے، جو ہوگیا تھا وہ ہوگیا تھا، بے عزت کر کے ہر جگہ سے نکالا جا رہا تھا، پوریا بستی سے بھی اور اب اس مسجد سے بھی، آہ یہ سب کچھ میرے لیے ازحد ضروری تھا،

گناہوں کی سزا میں جس قدر تذلیل ہو کم ہے۔ وہاں سے بھی چل پڑا کوئی منزل تو تھی نہیں بس چلتا رہا اور پھر کسی شہری آبادی کے آثار نظر آئے تھے، اُجالا پھیل رہا تھا۔ قدم اس طرف بڑھ گئے بستی کے پہلے مکان سے سنکھ بجنے کی آواز سنائی دی، اس کے بعد پیتل کا گھنٹہ کئی بار بجا اور پھر ایک موٹی بھدی آواز سنائی دی۔

بھجن قسم کی کوئی چیز تھی، لیکن اس کے بول بڑے دل ہلا دینے والے تھے اور ان کا مفہوم میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

جب تک ہنس رہیو چولا میں، چولا جب تک بنو ریو، (جسم میں جب تک رُوح رہی، جسم برقرار رہا)

اڑ گیو ہنس رہ گئی ماٹی بولن ہارو کدر گیو، (رُوح جسم سے نکل گئی تو بس مٹی کا بدن رہ جاتا ہے، اور جب تک چراغ میں تیل رہتا ہے چراغ جلتا رہتا ہے، تیل ختم ہوا چراغ کی بتی جل گئی، تب پھر اس روشنی کو پیدا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟)

بھجن کے ان الفاظ نے ذہن کے نجانے کون سے گوشوں کو چھو لیا تھا۔ دیر تک وہیں کھڑا ان الفاظ پر غور کرتا رہا جب گردن گھمائی تو اُوپر سے برہنہ جسم کے مالک، دھوتی باندھے ہوئے، ماتھے پر تلک لگائے، ایک بھاری بدن کے شخص کو دیکھا، چہرے پر شوخی سی چھائی ہوئی تھی، دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے گھور رہا تھا، مجھ سے نگاہ ملی تو گردن مٹکاتے ہوئے بولا۔

''آج بھی رہ گئے مہاراج، آج بھی کامیابی نہیں ہوئی تمہیں۔''

''جی!'' میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھینس کھولنے آئے تھے نا پنڈت کاشی رام کی، ارے بہت دن سے تم ہماری بھینس کی تاک میں ہو اور ہم تمہاری تاک میں، آج ملاپ ہو ہی گیا، ارے دیا کرو مہاراج دیا کرو۔ غریب آدمی ہیں، اس بھینس کے علاوہ اس سنسار میں اپنا کوئی نہیں ہے، ارے اسی کے دُودھ پر اپنا جیون گزار رہے ہیں، کیا کرو گے اسے لے جا کر۔'' ہنسی آ گئی، میں نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں پنڈت جی، میں نے تو آپ کی بھینس دیکھی بھی نہیں بھلا اسے چرانے کا خیال کیسے آتا میرے دل میں۔''

''تو پھر کیا یہاں پوجا کر رہے ہو کھڑے ہوئے۔'' وہ کسی قدر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''آپ بھجن گا رہے تھے، اسے سننے کھڑا ہو گیا تھا۔''

''ارے ارے ارے، بھجن سننا ہے تو بیٹھ کر سنو بھیا، ایسے کیوں کھڑے ہو، جیسے بھینس چرانے آئے ہو، آؤ آؤ تمہیں اور بھی بہت سے بھجن سنائیں گے، ایک تم ہو کہ ہمارا بھجن سن کر چلتے چلتے رُک گئے اور ایک وہ ہے جو کہتی ہے کہ بھینس کی اور ہماری آواز میں کوئی فرق ہی نہیں ہے، ذرا آؤ بتاؤ اسے، کیا بھجن گاتے ہیں ہم'' اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور احاطے سے اندر لے گیا۔ چھوٹا سا مکان تھا بڑا سا دروازہ، اسی چھوٹے سے احاطے کے ایک گوشے میں بھینس بندھی ہوئی تھی، اس کے آگے کھانے پینے کا سامان پڑا ہوا تھا، ایک طرف بانوں سے بنی ہوئی جھلنگا چارپائی جو بیٹھنے کے لیے تھی اور کاشی رام جی نے مجھے اسی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود مجھ سے کچھ فاصلے پر پتھر سے بنی ہوئی ایک سل پر بیٹھ گئے اور اس کے بعد انہوں نے لہک لہک کر پھر سے اپنا بھجن شروع کر دیا۔ کافی زوردار آواز میں گا رہے تھے، آواز میں ذرہ برابر دلکشی نہیں تھی لیکن بول مست کر دینے والے تھے پھر کاشی رام جی اس وقت چپ ہوئے، جب اندر سے ایک دھاڑ سنائی دی۔

''کسے پکڑ لائے تم صبح ہی صبح۔ اور کیوں بھینس کی طرح ڈکرائے جا رہے ہو، میں کہتی ہوں تمہاری کھوپڑی بالکل ہی خراب ہو گئی ہے...... ارے تو کون ہے رے؟'' میں نے اور کاشی رام دونوں ہی نے چونک کر اس بھیانک آواز کو سنا تھا اور گردن موڑ کر دیکھا تھا، چہرہ تو اتنا بھیانک نہیں تھا، لیکن آواز اور جسامت خوفزدہ کر دینے والی تھی، سفید دھوتی باندھے، ماتھے پر تلک لگائے، آنکھیں نکالے کھڑی، وہ ہم دونوں کو گھور رہی تھی۔ کاشی رام اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور خاتون آگے بڑھ کر ہمارے سامنے پہنچ گئیں، پھر ایک پوز بنا کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے بولیں۔

''یہ تم دونوں صبح ہی صبح کیا کر رہے ہو؟''

''ارے وہ، دیورانی، دیورانی جی، یہ بے چارہ مسافر ہے، بھجن سن کر کھڑا ہو گیا تھا کہنے لگا کہ من کھنچ رہا ہے، یہ بھجن سن

کر، اب سب تیرے جیسے ہی تو نہیں ہوتے کہ کاشی رام کی آواز پسند ہی نہ آئے اب اس سے پوچھ کیا حال ہوا ہے اس کا میرا بھجن سن کر۔"

"اور جو حال میں کروں گی اس کا وہ کون دیکھے گا پنڈت جی۔" خاتون نے کہا اور اِدھر اور اُدھر کوئی چیز تلاش کرنے لگی، اصولاً تو مجھے بھاگ جانا چاہیے تھا، لیکن کاشی رام جی میرے سامنے آ گئے۔

"دیکھو دیومتی، گھر کی بات گھر تک رہنی چاہیے، بے چارہ باہر سے آیا ہے، کیا سوچے گا ہمارے بارے میں۔ ارے پربھو بھیا یہ دیومتی جی ہیں دیورانی، پرنام کرو انہیں۔ کہنے کو تو ہماری دھرم پتنی ہیں، مگر...... مگر اصل میں یہ ہمارے دھرم پتی ہیں، سمجھ رہے ہو نا، ارے پرنام کر لو انہیں پرنام کرو۔"

"کون ہو تم، کیوں آئے ہو یہاں؟"

"بس وہ دیوی جی، میں، میں۔"

"تو اور کیا، صورت سے نہیں لگتا تمہیں، کچھ شرم کرو دیومتی، بھگوان نے صبح ہی صبح تمہارے گھر مہمان بھیجا اور تم اس کے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو۔"

"اور تم بڑا اچھا سلوک کر رہے ہو اس کے ساتھ اپنی پھٹے ڈھول جیسی آواز سے اسے بھجن سنائے جا رہے ہو، کاشی رام جی بھینس نے دُودھ دینا چھوڑ دیا ہے، جب سے تم نے یہ بھجن وجن گانے شروع کیے ہیں۔"

"ہرے رام ہرے رام، سن رہے ہو پربھو بھیا، بھینس نے دُودھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اچھا اب تو جا، زیادہ باتیں نہیں کرتے، پتنی ہے، پتنی ہی رہ، میری ماتا بننے کی کوشش مت کر جا مہمان کے لیے بھوجن تیار کر، اری جاتی ہے یا نہیں۔" کاشی رام جی غرّائے اور خاتون کچھ ڈھیلی پڑ گئیں، اس کے بعد مڑیں اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں۔ کاشی رام انہیں جاتے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے رازداری سے کہا۔

"ایسا بھی کبھی کبھی ہی ہوتا ہے، پتا نہیں کیوں تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت میرے چہرے پر کیسے تاثرات تھے؟" کاشی رام کا انداز عجیب سا تھا، میں کچھ نہیں سمجھ پایا تھا، میں نے آہستہ سے کہا۔

"سمجھا نہیں کاشی رام جی۔"

"ارے بھائی یہ دیومتی ہے میری دھرم پتنی، مگر دیومتی ہی نہیں دیونی بھی ہے، تم نے دیکھا، ایک ہاتھ کسی پر پڑ جائے تو بھگوان کی سوگند گھنٹوں بیٹھا گال سہلائے، وہ تو کبھی کبھی میری دھونس میں آ جاتی ہے، پر کبھی کبھی ہی ایسا ہوتا ہے، اس سے بھی ایسا ہی ہوا ہے، میں یہی تو پوچھ رہا تھا تم سے کہ میں نے کیسا چہرہ بنایا تھا جس کی وجہ سے یہ ڈر کر اندر چلی گئی، ایسا کم ہی ہوتا ہے، ارے بیٹھو، بس اب سب ٹھیک ہو گیا ہے، اب ہمت نہیں پڑے گی اس کی، تو تمہیں میرا بھجن پسند آیا؟"

"ہاں کاشی رام جی۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے، کچھ دن ہمارے مہمان رہو، ارے لیکن یہ صبح ہی صبح تم آئے کہاں سے ہو؟"

"مسافر ہوں، بس اس بستی میں نکل آیا، دراصل یہاں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں، کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"نوکری...... کیسی نوکری؟"

"صرف ایسی نوکری کاشی رام جی، جس میں دو روٹیاں اور بدن ڈھکنے کے لیے لباس مل جائے......"

"لو تو پھر تم کون سی غلط جگہ آئے، سیدھے نوکری کے پاس چلے آئے...... نوکری مل گئی تمہیں۔" کاشی رام جی بولے۔

"جی......؟" میں نے حیرانی سے منہ پھاڑ کر کہا۔

"جی......" کاشی رام نے گردن جھکا کر مسخرے پن سے کہا۔

"کاشی رام جی اگر...... اگر مجھے واقعی نوکری مل جائے تو میں ہر قسم کی نوکری کر لوں گا۔"

"دیکھ پربھو بھیا بات اصل میں یہ ہے کہ ہم تو بڑے اچھے آدمی ہیں لیکن عورتیں عام طور سے بُری ہوتی ہیں اور دھرم

پتنیاں بن کر تو وہ بہت ہی بُری ہو جاتی ہیں، بس یوں سمجھ لو کہ دھرم پتنی بن کر دھرم کے علاوہ اور سب کچھ ہوتا ہے ان کے پاس، تو ایسا کرتے ہیں پربھو جی کہ ہم تمہیں نوکر کہہ کر اپنے گھر میں رکھ لیتے ہیں، روٹی اور کپڑے کی تو بالکل چنتا مت کرنا۔ خرچ کے پیسے بھی لے لیا کرنا ہم سے، کوئی مشکل بات نہیں، مگر ذرا ان دیومتی کو برداشت کرنا ہوگا۔ بھینس کے کام کرنا آتے ہیں تمہیں......؟''

''آپ فکر نہ کریں، میں بھینس کا کام تمام کر دوں گا۔'' میں نے کہا......

''ارے ارے ارے، نا بھیا نا، اس بھینس پر تو جیتے ہیں ہم، کچھ نہیں کھاتے پیتے بس دُودھ پیتے ہیں اور جیتے ہیں۔ تھوڑی سی گھر کی صفائی ستھرائی، بازار کا سودا سلف اور کوئی کام نہیں ہے، رسوئی میں وہ اپنے علاوہ اور کسی کو نہیں جانے دیتی، پکاتی کھاتی بھی اپنا ہی ہے، بچہ دچہ کوئی نہیں ہے ہمارے ہاں، بس یہ کام ہوگا تمہارا اور اس کے بعد مزے ہی مزے...... ہم تمہیں بھی بھجن سکھا دیں گے پربھو بھیا۔''

✦✦✦✦✦

میں عجیب سی نظروں سے کاشی رام جی کو دیکھتا رہا، انہوں نے اپنی بیوی کے خوف سے میرا نام پربھو رکھ لیا تھا اور اب مجھے اسی نام سے پکار رہے تھے، ویسے سیدھا سچا آدمی معلوم ہوتا تھا، کام بھی میرے سپرد کر دیا تھا، اس کے نتیجے میں اگر روٹیاں مل جائیں تو کوئی ہرج تو نہیں ہے ویسے بھی اب کون سا میرا اسلیکشن رہ گیا تھا کہ یہ کام کروں اور وہ کام نہ کروں۔ زندگی اگر تھوڑی سی سکون سے گزر جائے تو کیا ہرج ہے اب تو کوئی بات بھی اپنے بارے میں سوچنا مضحکہ خیز لگتا تھا۔ یہ کروں، وہ کروں، سب بے کار ہے بس زندگی کی سانسیں پوری ہو جائیں، موت اپنی مرضی سے مجھ تک پہنچ جائے بس یہی میری زندگی کا مصرف رہ گیا ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی بے کار ہے، کوئی مجھے پربھو کے نام سے پکارے یا مسعود کے نام سے، جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں رہ گیا تو ان ناموں میں بھی کیا رکھا ہے، ٹھیک ہے مسعود احمد ٹھیک ہے، اب وقت جو کچھ کہہ رہا ہے وہی مناسب ہے۔''

میں نے کاشی رام سے کہا......''آپ کی دیا ہے مہاراج۔ دیا ہے آپ کی۔ میں تیار ہوں......''

''ارے تو پھر بات ہی کیا رہ گئی مگر ذرا ناشتہ کر لینا اس کے بعد بتائیں گے یہ بات اسے، پہلے سے پتا چل گئی تو سوچے گی کہ گھر کے نوکر کی، خاطر مدارت ہو رہی ہے اور ناشتہ اُٹھا کر لے جائے گی کھا پی لینا، بعد میں بتائیں گے اسے کہ تم کون ہو اور ہم کون ہیں......'' میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔ دونوں کردار دلچسپ تھے، دونوں خاصے پرلطف میاں بیوی معلوم ہوتے تھے۔ چلو اچھا ہے ذہن بٹانے میں آسانی ہوگی اب دل پر لدے ہوئے اس بوجھ کو کہاں تک اپنے آپ پر لادے رکھوں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جیسے بھی گزرے وقت کی آواز ہے، وقت جو کچھ کہے گا وہی سب سے مناسب ہوگا، کچھ دیر کے بعد کاشی رام کی دھرم پتنی نے ناشتہ لا کر رکھ دیا، گرم پوریاں اور آلو کی بھاجی۔ بہت بھوکا تھا پل پڑا کاشی رام جی کوئی بھجن گنگنانے لگے تھے۔

''آپ ناشتہ نہیں کریں گے پنڈت جی......؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈٹے رہو...... ڈٹے رہو پربھو مہاراج...... بھگوان نے اپنے بھاگ میں بس بھینس لکھ دی ہے اسی پر گزارا کر رہے ہیں۔'' پنڈت جی نے کہا پنڈتائن مزید گرم پوریاں لے کر اندر داخل ہوئی تھیں، پنڈت جی کی پشت ان کی جانب تھی اور وہ اس وقت یہی الفاظ ادا کر رہے تھے، پنڈتائن کچھ اور سمجھیں، پوریاں بڑی زور سے سامنے رکھی ہوئی تھالی میں پٹخیں اور غرائے ہوئے لہجے میں بولی۔''آج فیصلہ ہو ہی جائے پنڈت جی، اب دُوسروں کے سامنے بھی تمہاری زبان کھلنے لگی ہے، میں بھینس ہوں، بھینس پر گزارہ کر رہے ہو تم......؟''

''ہرے رام، ہرے رام، ارے کیا بک رہی ہے، کون بھینس کیسی بھینس، ارے پربھو بھیا گڑبڑ ہو گئی۔ ذرا سمجھاؤ ان دیوی جی کو ہم کیا کہہ رہے تھے، ارے دیوانی، ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ناشتہ واشتہ نہیں کرتے بلکہ ویدی جی نے پیٹ کی

بیماری ٹھیک کرنے کے لیے ان بند کر دیا ہے اور بھینس کے دُودھ پر گزارہ ہے۔''

''پنڈت جی کسی اور کو چڑاؤ، تمہارے منہ سے کئی بار یہ بات سن چکی ہوں۔'' پنڈتائن نے غرّا کر کہا۔

''ارے پربھوجی اب پوریاں منہ میں ٹھونسے جا رہے ہو یا کچھ بولو گے بھی، ذرا بتاؤ تم ان پنڈتائن کو کہ بات کس کی ہو رہی تھی ان کی یا بھینس کی......؟''

''جج جی ہاں، جی ہاں...... جی ہاں، جی ہاں......''

''جی ہاں جی ہاں ارے بھائی میں ان پوریوں میں سے ایک بھی پوری نہیں چھوڑوں گا، میری جان تو چھڑا دے تو، پنڈتائن بھگوان کی سوگند، میں تمہیں بھینس نہیں کہہ رہا تھا بلکہ بلکہ، ذکر ہو رہا تھا ناشتے کا، میں نے کہا بھائی اپنے بھاگ میں بس بھینس کا دُودھ لکھا ہے اس پر گزارہ کر رہے ہیں۔ ہرے رام تو تو ہواؤں سے لڑتی ہے۔''

''پنڈت جی زبان سنبھال کر بات کیا کرو اپنی، میں بھی کسی ایسے ویسے گھر کی نہیں ہوں۔ تم سے کھرے تھے میرے پتا، کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟''

''کھرے پنڈت کی بیٹی اور کیا......'' کاشی رام نے جلدی سے کہا اور مجھے ہنسی آنے لگی۔ پنڈتائن بکتی جھکتی اندر چلی گئی تھیں اور پنڈت جی سینے پر پھونکیں مار رہے تھے پھر انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''پربھو جی تم بھی بس اپنے گن کے پکے ہو، ناشتہ کئے جا رہے ہو، میری کوئی مدد نہیں کی تم نے، اب تین دن تک اس کا منہ پھولا رہے گا، ویسے چلو اچھا ہے تم سے ذرا اطمینان سے باتیں ہو جائیں گی......''

پنڈت جی کافی دلچسپ آدمی تھے، میرا بھی جی لگنے لگا پنڈتائن نے بس آ کر برتن اُٹھائے تھے اور پنڈت جی ان کا چہرہ دیکھتے رہے تھے، دیر کے بعد پنڈت جی نے کہا۔

''تو پھر پربھو بھیا آؤ ہمارے ساتھ، گھر کے پچھواڑے ہم نے اپنی دُکان کھولی ہوئی ہے، آ جاؤ آ جاؤ، وہیں بیٹھ کر تمہارے ساتھ ساری باتیں کریں گے۔''

''گھر کا یہ پچھواڑا ایک چوڑی گلی تھا اور یہاں پنڈت جی نے واقعی اپنے بیٹھنے کے لیے ایک بڑے سے کمرے جیسی جگہ بنا رکھی تھی، ایک چھوٹا سا ڈیسک رکھا ہوا تھا وہاں پر چادر بچھی ہوئی تھی، دری چاندنی تھی، پنڈت جی ڈیسک کے پیچھے بیٹھ گئے اور میں ان سے تھوڑے فاصلے پر...... پھر میں نے ان سے پوچھا......؟''

''آپ کیا کرتے ہیں پنڈت جی......؟''

''بڑے مہان ہیں ہم بس بھگوان جس کام سے دو روٹی دے دیتا ہے وہی کر لیتے ہیں، جیوتش ودیا بھی جانتے ہیں حالانکہ ستاروں سے ہماری کبھی نہیں بنی، ہمیں دیکھ کر ہمیشہ اُلٹے سیدھے ہو جاتے ہیں اور مجال ہے جو کبھی صحیح بات بتا دیں، مگر ایک بات ہے ان کا اُلٹا سیدھا پن بھی اپنے کام آ جاتا ہے ہم بھی لوگوں کو ان کے ہاتھوں کی ریکھائیں دیکھ کر اُلٹی سیدھی باتیں ہی بتا دیتے ہیں۔ بس جیسے ستارے ویسی بات، کام چل جاتا ہے اس کے علاوہ بھی کسی کے گھر میں بھجن کیرتن ہوں تو بھلا پنڈت کاشی رام کے بغیر کیسے ہو سکتے ہیں، دچھنا بھی ٹھیک ٹھاک ہی مل جاتی ہے، کتھا کہہ دی، کام چل گیا، شادی بیاہ کی مہورتیں نکال دیں جس کا جو کام ہوا کر ڈالا، ویسے اپنا صحیح دھندہ جیوتش ہی ہے......اور پھر پربھوجی نمک کھا چکے ہو اپنا اس لیے وشواش ہے کہ نمک حرامی نہیں کرو گے۔ بتا چکے ہیں ہم تمہیں کہ ہمیں جیوتش ویوتش نہیں آتی، کہو کیسی رہی......؟'' پنڈت جی ہنسنے لگے، پھر بولے...... ''اب تین دن تک تو تم عیش کی اُڑاؤ، مہمان کہہ ہی دیا ہے ہم نے تمہیں، اس میں ساری برائیاں ہیں مگر سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ جو بات ایک بار کہہ دی جائے، اس میں منہ پھلا لے سو پھلا لے، کوتاہی نہیں کرتی، تین دن تک تو مزے سے ہمارے مہمان رہو اور چوتھے دن جب اس کا منہ بگڑے تو کام دھندہ شروع کر دینا۔''

میں پنڈت جی کی باتوں پر ہنستا ہی رہا تھا۔ پھر میں نے ان کے پاس بیٹھ کر یہ بھی دیکھا کہ ان کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اِکا دُکا لوگ ہاتھ دکھانے بھی آ جاتے ہیں اور پنڈت جی پوری کہکشاں زمین پر اُتار کر اس کا جائزہ لے کر اس شخص

کے ستارے نکالتے ہیں اور پھر ان ستاروں کے بارے میں ایسی باتیں بتاتے ہیں اپنے گاہکوں کو کہ نہ خود پنڈت جی کی سمجھ میں آئیں نہ ان کی سمجھ میں آئیں۔ بحالت مجبوری وہ بے چارے پنڈت جی کی فیس ادا کر کے اپنی جان چھڑا کر چلے جاتے تھے۔ اگر پنڈت جی کی دی ہوئی ہدایات میں سے کچھ باتیں واقعی کارآمد ثابت ہو گئیں تو بس پنڈت جی کا بول بالا۔ دن بڑا دلچسپ گزارا تھا شام کو پنڈت جی کو کتھا کہنے کہیں جانا تھا مجھ سے کہنے لگے۔

''چلو میرے ساتھ چلو، کتھا میں بڑا مزاہ آتا ہے اپنی کتھا بھی بس ایسی ہی ہوتی ہے لوگوں کو کبھی کبھی اعتراض بھی ہو جاتا ہے، بھئی دیکھو نا اب پڑھے لکھے تو ہیں نہیں جو رامائن کا ہر صفحہ کھنگال ڈالیں گیتا کو ایک ایک لفظ کر کے پڑھ لیں جو جی میں آتی ہے سنا دیتے ہیں پبلک کو، کچھ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اور کچھ تحقیقات کرنے نکل جاتے ہیں۔ ایک دو دفعہ ایسا بھی ہوا کہ تحقیقات کرنے والوں نے گلا پکڑ لیا مگر تجربہ ہے ہمارا زبانیں بند کرنا آتا ہے چلو گے کتھا میں؟''

''پھر کسی دن چلوں گا پنڈت جی، آج رہنے دیجئے۔''

''اچھا ٹھیک ہے تمہارے آرام کی جگہ بتا دیتے ہیں۔'' پیپل کا ایک درخت جو پنڈت جی کے گھر کے صحن کے ایک گوشے میں تھا میری رہائش گاہ قرار دیا گیا۔ اس کے نیچے بانوں کی چارپائی بچھا دی گئی ایک لٹیا رکھ دی گئی۔ بس اس کے علاوہ اور کیا درکار تھا لیکن اسی شام میں نے یہاں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ شروع کر دیا، صحن میں پیپل کے درخت کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جھاڑو لے کر ان کی صفائی پر تل گیا اور پنڈتائن کے چہرے کی لکیروں میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ میں نے پورا صحن صاف کر دیا تھا اور رات ہونے پر چارپائی پر جا لیٹا تھا۔ دماغ کو ایک عجیب سی بند بندی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا اور میں ہر احساس کو ذہن سے جھٹک کر آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈت جی کے گھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا دن گزر گیا۔ بڑے دلچسپ دن تھے، میں ابھی تک محدود تھا اور میں نے باہر جا کر کچھ دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا جو کچھ دیکھ چکا تھا وہی کافی تھا، چوتھے دن پنڈتائن، ساڑھی کا پلو کمرے کے گرد اڑسے پنڈت جی کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''ایک دن کا مہمان، دو دن کا مہمان، تین دن کا مہمان، کیا تمہارا یہ مہمان ہمارے لیے بلائے جان نہیں ہو گیا۔'' انہوں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے ارے بکے جا رہی ہے یہ بات پیچھے بھی تو کی جا سکتی تھی۔''

''میں عورت ہوں کھری، جو کہتی ہوں سامنے کہتی ہوں کب تک یہ مہمان رہے گا ہمارے ہاں؟''

''یہ مہمان ہے کہاں پنڈتائن میں نے تو اسے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا ہے، دو روٹی کھائے گا سال سوا سال میں ایک دو جوڑی کپڑے بنا دیں گے اور بس۔'' پنڈت جی نے کہا اور پنڈتائن اس بات سے خوش ہو گئیں۔ انہوں نے اس حقیقت سے مجھے بخوشی قبول کر لیا تھا کیا برا تھا ویسے بھی کون سے تیر مار رہا تھا بس بیکار زندگی کا بوجھ جسے کہیں بھی رہ کر گھسیٹا جا سکتا تھا۔ اب تو آرزوئیں بھی مرتی جا رہی تھیں۔ کب تک زندہ رکھتا اپنے آپ کو کیسے زندہ رکھتا صحن کی جھاڑو اس کے بعد بھینس کی دیکھ بھال اس کے لیے کٹی کرنا، سانی بنانا، اسے نہلانا۔ پھر گھر کی ساری صفائی بازار کا سودا سلف لانا۔ یہ میری ذمہ داری بن چکی تھی ویسے ذمہ داری معمولی نہیں تھی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھتا تو شام ہی ہو جاتی تھی اب تو پنڈت جی کا ساتھ بھی مشکل ہی سے ملتا تھا۔ البتہ وہ جب بھی

مجھ سے ملتے ان کی آنکھوں میں تاسف کے آثار نظر آنے لگتے تھے میرا حلیہ خراب سے خراب تر ہو گیا تھا پنڈت جی نے ایک شام مجھ سے کہا۔

''ایسے تو تیری ارتھی نکل جائے گی پربھو، مر جائے گا تو تو کام کاج کرتے کرتے یہ آج کل کچھ زیادہ ہی کام ہونے لگا ہے دیکھا تو نے عورتیں ایسی ہوتی ہیں، شادی مت کریو کبھی بالک یہ ہماری ہدایت ہے تجھے ورنہ اس سے زیادہ کام پڑ جائیں گے مگر کچھ کرنا پڑے گا تیرے لیے کچھ کرنا پڑے گا، تجھے اتنا کام کرتے دیکھ کر تو ہمیں بڑا ہی افسوس ہوتا ہے۔''

''نہیں پنڈت جی ایسی کوئی بات نہیں۔ کاموں میں تو جی لگ جاتا ہے اور دن گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔''

''انگ انگ جو ٹوٹ جانا ہوگا اس کی بات بھی نہیں کرے گا ویسے آدمی تو شریف ہے پربھو، اس میں کوئی شک نہیں ہے سوچیں گے تیرے لیے سوچیں گے کہ کیا کریں؟''

پنڈت جی اگر سوچ رہے ہوں تو سوچ رہے ہوں۔ میں کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ یہاں رہ کر دل و دماغ کو ایک عجیب سا سکون ملا تھا میں نے ساری سوچیں بھی ذہن سے نکال ڈالی تھیں۔ وہ رشتے وہ ناتے جن کی تڑپ نے دل کو مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈبو دیا تھا سب کچھ بھلا دیا تھا میں نے صبح جاگتا اور اپنے کاموں کا آغاز کر دیتا۔ پنڈت جی کے بھجن سننے کو ملتے اور پنڈتائن کی جھڑکیاں اور گالیاں، انہوں نے سب کچھ بھول کر بس ایک مالکن کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک بے حد بدمزاج مالکن کا، ہر کام میں کیڑے نکالتی تھیں۔ بات بات پر جھڑکیاں سناتی تھیں لیکن مجھے کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری تذلیل ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے یہی چیز میرے لیے باعث نجات بن جائے مگر پنڈت کے انداز میں اب سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈتائن سے عموماً ڈرے ڈرے رہتے تھے۔ کچھ کہنے کی مجال نہیں ہوتی تھی کوئی ایسی ترکیب سوچ رہے تھے شاید جس سے بقول ان کے میرا کلیان ہو سکے۔

پھر ایک چھٹی کا دن تھا غالباً کوئی ہلکا پھلکا تہوار بھی تھا۔ پنڈتائن نے صبح ہی صبح مجھ سے سارے گھر کی صفائی کرائی تھی اور میرے سر پر کھڑے ہو کر ایک ایک چیز کی نگرانی کرتی رہی تھیں۔ پنڈت جی بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔

''پربھو، تو نے اپنا ہاتھ نہیں دکھایا کبھی مجھے؟''

''ہاتھ؟'' میں نے پنڈت جی کو دیکھا۔

''ہاں دیکھیں تو سہی تیری ریکھائیں کیا کہتی ہیں؟''

''بس بس، دماغ مت خراب کرو اس کا پنڈت جی اس کی ریکھائیں جو کچھ کہتی ہیں وہ تمہیں کبھی نہیں معلوم ہوگا، بیکار اس کا من خراب کرو گے کام کرنے دو اسے۔''

''اری بھاگوان کچھ پتا تو چلنا چاہیے کہ کون کتنے پانی میں ہے، میں تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چوری کی لکیر ہے یا نہیں۔''

''چوری کی؟''

''تو اور کیا گھر کھلا رہتا ہے کسی دن بھینس لے کر نکل گیا تو بتا کیا تو مجھے دوسری بھینس خرید کر دے سکے گی؟'' پنڈتائن ہولی کر خاموش ہو گئیں، پنڈت جی نے ایک آنکھ دبائی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سامنے کر لیا، کان سے پینسل نکال کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگے اور پھر ایک دم اُچھل پڑے۔

''ہے بھگوان، ہے بھگوان یہ میں نے کیا کیا۔'' پنڈتائن قریب ہی کھڑی ہوئی تھیں چونک کر بولیں۔

''ہائے رام کیا ہو گیا؟''

''اری تیرا ستیاناس، تو نے اپنے ساتھ میری بھی لٹیا ڈبو دی۔'' پنڈت جی انتہائی خوف زدہ لہجے میں بولے، پنڈتائن کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا، قریب آ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

''کیا ہو گیا کیا ہو گیا؟''

''بس یہ سمجھ لے جو ہو گیا وہ بہت بُرا ہو گیا اور...... جو ہو چکا ہے اس سے آگے کچھ نہیں ہونا چاہیے، ہے پربھو جی ہے معاف کر دیں ہمیں شما کر دیں غلطی ہو گئی پربھو جی غلطی ہو گئی جو کچھ ہوا اس کی غلطی ہو گئی۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پنڈت جی کو دیکھنے لگا تو پنڈت جی اپنی پتنی کی جانب رُخ کر کے بولے۔ ''پربھو مہاراج کا ہاتھ تو دیکھ ذرا، نظر تو ڈال ایک اس پر سات ستارے جگمگا رہے ہیں ان کی ریکھاؤں میں یہ دیکھ ایک دو تین'' وہ پینسل سے اشارہ کر کے ستارے گنوانے لگے اور پنڈتائن میرے ہاتھوں میں ستارے تلاش کرنے لگیں جبکہ مجھے خود ان ستاروں کی جھلک

کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔
''ایسے لوگ مہان ہوتے ہیں سات پورنیاں ہیں ان کی ریکھاؤں میں اور کسی بھی سے ساتوں پورنیاں ان کا گھیرا کر سکتی ہیں اور ایسے لوگ اچانک ہی دیوتا بن جاتے ہیں پربھو مہاراج! آپ تو دیوتا ہیں، ہمارے لیے ہمارے بھاگ بھی بدل دیں پربھو مہاراج جے بھگوتی جے بھگوتی۔ پنڈت جی دونوں ہاتھ جوڑ کر اوندھے ہو گئے، پنڈتائن کے چہرے پر بھی کسی قدر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے، انہوں نے آہستہ سے کہا۔''
''مجھے کیا معلوم تھا یہ تو ہیں ہی ایسے مگر مگر یہ سات پورنیاں ارے تمہاری ایسی تیسی، مجھے بھی اُلو بنا رہے ہو تمہاری جیوتش اور میں اسے مان لوں کبھی کوئی بات سچ بھی کہی ہے تم نے۔'' پنڈت جی سیدھے ہو کر پنڈتائن کو گھورتے ہوئے بولے۔
''دیکھ دیورانی ساری باتیں مان لیں میں نے تیری جیون بھر تیری مانتا رہا ہوں مگر مگر اس بات میں تو نے کوئی برائی نکالی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''
''کیوں اسے بہکا رہے ہو کام کاج سے بھی جائے گا سُسرا۔'' پنڈتائن نے کہا۔
''تیری مرضی ہے۔ سوچ لے دیکھ لے جتنا اسے ستائے گی بعد میں اتنا ہی نتیجہ بھگتنا ہوگا تجھے، اب تو جانے اور تیرا کام، مجھے ضرور شما کر دیں مہاراج بلکہ پورن مہاراج، پورنیاں آپ کا گھیرا ضرور ڈالیں گی، کسی بھی دن کسی بھی سمے، یہ میں کہے دیتا ہوں مگر اس سمے آپ صرف دیورانی کی طرف رُخ کریں گے جو آپ کے ساتھ زیادتی کرتی ہے میرا کوئی دوش نہیں ہوگا اس میں۔''
''لو میں کونسی زیادتی کرتی ہوں گھر کے کام کاج ہی تو کرا لیتی ہوں، ٹھیک طریقے سے، نہ کریں ہم کونسا کہتے ہیں ان سے ہم خود کر لیا کرتے تھے اپنے یہ کام، ارے واہ سات پورنیاں گھیرا ڈالیں گی دیکھیں گے کیسے گھیرا ڈالیں گی؟'' پنڈتائن نے کہا۔ لیکن سہمی ہوئی سی لگ رہی تھیں پنڈت جی کا چہرہ دیکھ رہا تھا، پنڈت جی بولے۔
''بس سمجھ لے تیرا کام بن گیا، خود تھوڑا بہت کام کر دیا کر بلکہ ہماری بھینس سنبھال لے تو گھر کے کام کاج سے تو چھٹی مل گئی پنڈتائن سامنے کی بہادر ہیں اندر جا کر جب سوچیں گی تو حلیہ خراب ہو جائے گا کیا سمجھا'' اور پنڈت جی کا کہنا کافی حد تک دُرست ہی ثابت ہوا، پنڈتائن کی زبان ایک دم بند ہو گئی تھی مجھے خود بھی گھر کے کام کاج سے دلچسپی تھی اپنی پسند سے سارے کام کر لیتا تھا لیکن اب پنڈتائن نے میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیا تھا اور عموماً مجھ سے دُور ہی دُور رہنے لگی تھیں۔ پنڈت جی کے اس ناٹک پر مجھے اکثر ہنسی آ جاتی تھی مگر میں خود گھر کے کاموں میں اُلجھ کر اپنا ذہن بٹائے رکھتا تھا، پنڈت جی سچے جیوتشی تھے یا نہیں میں نہیں جانتا تھا، دال روٹی البتہ کما لیا کرتے تھے اور لوگ ان کے پاس آتے رہتے تھے۔
مگر پورن ماشی کی رات عجیب واقعہ ہوا، پورے چاند کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا پنڈت جی پوتھی سجائے بیٹھے تھے، پنڈتائن کسی بات پر ان سے اُلجھ رہی تھیں کہ اچانک صحن میں عجیب سی روشنی پھیل گئی۔ اتنی روشنی کہ پورا گھر جگمگانے لگا۔ دھنک کے سات رنگوں میں بٹی ہوئی سات حسین دوشیزائیں نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے غیر مانوس ساز تھے اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ، میں نے آنکھیں پھاڑ کر پنڈت جی کو دیکھا کہ یہ شاید میرا وہم ہو۔ مگر پنڈت جی اور پنڈتائن کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں اور دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے۔
میں نے پریشان نظروں سے ان عورتوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھی، انہوں نے جگمگاتے ہوئے لباس پہن رکھے تھے۔ سب کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پیپل کے درخت کے نیچے میرے چاروں طرف دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔ اپنے ساز انہوں نے سامنے رکھ لیے اور پھر فضا میں ان سازوں کی آوازیں اُبھرنے لگی۔ ایک ایسا سحر انگیز نغمہ پھوٹنے لگا کہ دل کھنچ جائے۔ کچھ دیر سازوں کی آواز اُبھرتی رہی۔ پھر ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ کچھ گا رہی تھیں۔ سُر حسین تھے، آوازیں درد بھری لیکن بول نامعلوم۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بس دماغ سوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پنڈت کاشی رام اور دیومتی جی بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ دیر تک یہ نغمہ جاری رہا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے ساز بلند کیے اور وہ ان کے

ہاتھوں سے غائب ہو گئے۔ پھر اچانک ان کے ہاتھوں میں چراغوں سے جگمگاتی چاندی کی تھالیاں آ گئیں۔ تھالیوں میں سات سات چراغ روشن تھے۔ وہ تھالیاں کندھے تک بلند کیے میرے گرد رقص کرنے لگیں۔ رقص کا یہ انداز بھی بے حد دلنشین تھا۔ ایک ایک میرے سامنے آتی تھالی کو میرے سر سے چھوتی پیروں تک لے جاتی، پھر دوسری کے لیے جگہ خالی کر دیتی۔ یہ شغل بھی خوب دیر تک جاری رہا۔ چاند آدھے سے زیادہ سفر کر چکا تو انہوں نے اپنا یہ مشغلہ ختم کر دیا اور پھر میں نے آخری حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ اچانک زمین سے بلند ہونے لگیں، ان کے پیروں نے زمین چھوڑ دی۔ ساتوں کی ساتوں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ پیپل کے درخت سے اُونچی ہو گئیں اور اُونچی۔ پھر اور اُونچی یوں لگ رہا تھا جیسے سات قندیلیں فضا میں اُوپر اُٹھتی چلی جا رہی ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ٹمٹماتے ہوئے مدھم ستاروں کی مانند ہو گئیں پھر یہ ستارے بھی ڈوب گئے۔

میں خود بھی اس انوکھے منظر میں اتنا کھو سا گیا تھا کہ باقی سب میری نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ پنڈت کاشی رام اور ان کی دھرم پتنی بھی یاد نہیں رہے تھے۔ جب سب کچھ نظروں سے دُور ہو گیا تو مجھے وہ دونوں یاد آئے اور میری نظریں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔ پنڈتائن تو اوندھی پڑی ہوئی تھیں اور پنڈت جی کو جاڑا چڑھا ہوا تھا۔ بالکل ایسے ہی کانپ رہے تھے وہ جیسے سخت سردی لگ رہی ہو۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور پنڈت جی کی طرف چل پڑا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا پنڈت جی سمٹتے جا رہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

''یہ سب...... یہ سب کیا تھا پنڈت جی......؟'' میں نے پوچھا۔

''شما...... شما...... شما کرو مہاراج۔ اندھے ہیں ہم۔ اندھے ہیں۔ تم تو دیوتا ہو۔ ہے مہاراج...... ہے بھگوتی ہمیں شما کر دو...... شما کر دو ہمیں۔'' کاشی رام جی میرے پیروں کی طرف لپکے۔

''ارے...... ارے کاشی رام جی...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ......؟'' میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''جے بھگوتی۔ شما کر دو ہمیں۔ اسے بھی شما کر دو۔ ہم نے تو ٹھٹھول کیا تھا ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم سچ مچ پورن بھگت ہو۔ ہے پورن بھگت ہمیں شما کر دو۔ اری اُٹھ اندر چل۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے مہاراج...... اسے معاف کر دو...... ہم سنسار باسی کیا جانیں کون کس رُوپ میں ہے۔''

''میری بات تو سنیں پنڈت جی......!'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

''بس ایک بار مہاراج...... ہم سچے جیوتشی نہیں ہیں۔ ناٹک کرتے ہیں پیٹ بھرنے کے لیے۔ دیوتی۔ اری اُٹھ جا کم بخت۔ اری اُٹھ جا ورنہ ماری جائے گی۔'' پنڈت جی دہشت کے عالم میں بے ہوش پنڈتائن کو جھنجوڑنے لگے۔ وہ میری کچھ نہیں سن رہے تھے بس اپنی کہے جا رہے تھے۔

''میں پانی لاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پانی لینے چل پڑا۔ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ پانی لایا پنڈتائن کو خوب نہلایا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ ہوش میں آئیں۔ مجھے دیکھ کر چیخ ماری اور پنڈت جی سے لپٹ گئیں۔

''ارے ارے۔ گرائے گی کیا۔ ہتھنی کی ہتھنی ہو رہی ہے۔ اری سیدھی ہو چل اندر چل......'' پنڈت جی نے اُنہیں دھکا دیا وہ خود میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ بمشکل تمام وہ پنڈتائن کو سنبھالے اندر داخل ہو گئے۔ پھر انہوں نے دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا۔ میں بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں میں تو خود ان سے سمجھنا چاہتا تھا۔ پھر کچھ نہ بن سکا تو واپس آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ انوکھا منظر بار بار آنکھوں میں آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھیں اور یہ سب کچھ کیا کر رہی تھیں۔ پیپل کے پتوں کو تکتے تکتے نیند آ گئی...... اور پھر گہری نیند نے سب کچھ بھلا دیا۔

صبح کو ہمیشہ جلدی آنکھ کھل جاتی تھی۔ عادت پڑ گئی تھی اس کی۔ پنڈتائن دُودھ دوہنے کی بالٹی ایک مخصوص جگہ رکھ دیا کرتی تھیں اور میں جاگ کر پہلا کام یہی کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جاگ کر ادھر ہی رُخ کیا مگر دُودھ کا برتن اپنی جگہ موجود

نہیں تھا اور اسے نہ پا کر مجھے رات کے واقعات ایک دم یاد آ گئے تھے۔ میں اُچھل پڑا آنکھیں زور زور سے بند کر کے کھولیں۔ رات کے واقعات خواب نہیں تھے۔ پنڈت جی خوفزدہ ہو کر اندر جا گھسے تھے اور انہوں نے دروازہ بند کر لیا تھا اور شاید اسی خوف کے عالم میں آج دُودھ کا برتن بھی اپنی جگہ نہیں پہنچا تھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آگے بڑھ کر بند دروازے کے قریب پہنچ گیا مگر قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

''پنڈت جی...... چاچی جی۔ دُودھ کی بالٹی دے دیں۔'' میں نے آواز لگائی مگر اندر خاموشی ہی رہی۔ دروازے کو دھکیل کر میں اندر داخل ہو گیا۔ پہلے بھی اندر آ چکا تھا۔ دُوسری اور تیسری بار بھی آواز دینے پر جواب نہیں ملا تو یہ خیال گزرا کہ دونوں گھر میں نہیں ہیں۔ رسوئی سے دُودھ کی بالٹی لے کر بھینس کے پاس آ گیا اور اپنا کام مکمل کر کے دُودھ گرم کر کے چولہے پر رکھ دیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ دُودھ کا ایک گلاس پی کر باہر نکل آیا۔ احاطہ صاف کیا۔ پنڈت جی اور پنڈتائن نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ انتظار کرتا رہا۔ دس بجے پھر بارہ۔ پھر ایک اور دو...... اب بات پریشانی کی تھی۔ کہاں گئے وہ دونوں پہلے تو سوچا تھا کہ ہوسکتا ہے کسی کام سے نکل گئے ہوں مگر اب تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ اچانک دِل میں خیال آیا کہ کہیں وہ خوفزدہ ہو کر گھر سے بھاگ تو نہیں گئے۔ اس تصوّر سے خود حیرت زدہ رہ گیا۔ گھر ان کا تھا۔ ان کے بغیر تو یہاں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہ ایسا ہی ہوا ہے اب انہیں کہاں تلاش کروں۔ وہ اس گھر کے مالک ہیں، اگر میری وجہ سے خوفزدہ ہوئے ہیں تو مجھے گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ کہاں چلے گئے۔ انہیں کہاں تلاش کروں۔ ہوسکتا ہے کسی سے پوچھنے سے پتہ چل جائے۔

[illegible] میں دُھوپ چلچلا رہی تھی۔ انتہائی گرم دن تھا مگر اس خیال کے بعد گھر میں بیٹھے رہنا بھی ممکن نہیں تھا، چنانچہ [illegible] نے مزاج پوچھا۔ اندر تو پھر بھی پیپل کی وجہ سے اَمن تھا مگر باہر......
[illegible] جو پنڈت جی کے گھر کے سامنے والے میدان میں سر نیہوڑائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میلے [illegible] بیٹھے ہوئے تھے بالکل خاموش۔ حیرانی سے آگے بڑھا اور ابھی ان سے چند قدم دُور [illegible] اُچھل اُچھل کر کھڑے ہونے لگے۔ تب میں نے انہیں بغور دیکھا اور میرے بدن میں خون کی گردش رُک گئی۔ آہ وہ انسان نہیں تھے۔ لاتعداد بھیانک صورتیں میرے سامنے تھیں۔ چھوٹے بڑے قد، چیتھڑوں میں لپٹے، پتلی ٹانگیں، سوکھے ہاتھ، گنجے سر اور بڑی کھوپڑیاں۔ گول آنکھیں ہیبت ناک انداز میں پھٹی ہوئیں۔ دہشت کے عالم میں پلٹا اور دروازے سے اندر گھس جانا چاہا مگر...... دروازہ...... وہاں تو کوئی دروازہ نہیں تھا۔ پنڈت جی کا گھر ہی غائب ہو گیا تھا۔ پیچھے وسیع میدان نظر آ رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ پنڈت جی کا مکان کہاں رہ گیا۔ آہ پھر گڑبڑ شروع ہو گئی۔ پھر کسی نئی مصیبت نے میری طرف رُخ کیا۔ اب کیا کروں کیا پوری بستی ہی غائب ہو گئی۔ کیا...... مگر سامنے کے رُخ پر بہت دُور مکانات نظر آ رہے تھے اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اب ان کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھوں۔ لرزتے دل کو سنبھال کر آگے بڑھا اور وہ اس طرح اَدب سے پیچھے ہٹ گئے جیسے مجھے راستہ دینا چاہتے ہوں۔ میں ان کے بیچ سے نکل کر آگے بڑھا تو پورا مجمع میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ مارچ پاسٹ کرتے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ دم ہی نکلا جا رہا تھا۔ خوف کے عالم میں سوچنے سمجھنے کی قوتیں گم ہو گئی تھیں۔ دفعتاً ٹھوکر لگی اور گرنے سے بچنے کے لیے کئی قدم دوڑنا پڑا۔ شیطانی گروہ پیچھے رہ گیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ ایک دَم دوڑ لگا دی تھی مگر خدا کی پناہ۔ انہوں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک اور ہولناک آوازیں سن کر گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ مگر جب میں ان گھروں کے درمیان سے گزرا تو ہر گھر سے دہشت بھری چیخیں اُبھرنے لگیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دُوسروں کو بھی نظر آ رہے تھے۔ کون ہیں یہ کون ہیں۔ یقیناً یہ بھیانک وجود انسان نہیں تھے۔ میں دوڑتا ہوا ایک بازار میں پہنچ گیا۔ دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ دُھوپ اور گرم ہوا کی وجہ سے خریداری تو نہیں ہو رہی تھی مگر دکاندار دُکانوں میں موجود تھے۔ انہوں نے حیرانی سے اس جلوس کو دیکھا اور پھر ان کا بھی دہی حشر ہوا۔ بہت سوں نے دُکانوں کے شٹر گرائے اور بہت سے دکانوں سے اُتر کر بھاگے۔ میں نے رفتار سست کی تو میرے پیچھے دوڑنے والوں کی رفتار بھی سست ہو گئی۔ وہ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ دوڑنا ترک کر کے سست قدمی اختیار کی مگر

ان سے پیچھا چھڑانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔
پھر کسی طرح پولیس کو خبر ہوگئی۔ جونہی بازار ختم ہوا اور ایک بڑی سڑک آئی میں نے سامنے سے پولیس کی دو گاڑیاں آتے ہوئے دیکھیں۔ پولیس کو دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی۔ اب آئی میری شامت۔ میں نے سوچا اور رُک گیا۔ پولیس گاڑیاں تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچ گئیں اور ان سے لاٹھی بردار پولیس والے نیچے کودنے لگے۔ دونوں گاڑیوں سے پولیس افسر بھی نیچے اُترے تھے۔
''ارے۔ کون ہو تم اور......'' ایک افسر نے کڑک کر مجھے اور پھر میرے پیچھے مجمع کو دیکھتے ہوئے کہا مگر پھر وہ صرف انہیں دیکھتا رہ گیا۔ میرا تعاقب کرنے والے ہولناک بھوتوں نے بولنا اور منمنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ دبی دبی آواز میں ہنسنے بھی لگے۔ ان کی صورتیں اور حلیے ہی کونسے کم بھیانک تھے کہ انہوں نے ایک اور عمل بھی شروع کر دیا وہ دُور تک پھیل گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنی کھوپڑی شانوں سے اُتار کر دُوسرے کی طرف پھینکی اور دُوسرے نے اسے گیند کی طرح لپک لیا۔ پھر اس نے وہ کھوپڑی تیسرے کی طرف پھینک دی پھر وہ سب کے سب ہی یہ کھیلنے لگے۔
دوپہر کا وقت ہُو کا عالم۔ اور یہ بھیانک کھیل۔ پولیس کے جوانوں نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ کھیل دیکھا پھر حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے جدھر منہ اُٹھا دوڑ پڑے۔ افسر جہاں تک ممکن ہوسکا دلیری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک چیختا ہوا ایک پولیس گاڑی کے نیچے گھس گیا اور دُوسرا جان توڑ کر مخالف سمت بھاگا۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور اسی پولیس افسر کی طرف دوڑ پڑا۔ میں اس کے ساتھ نکل جانا چاہتا تھا مگر افسر کچھ اور ہی سمجھا۔ اس نے مجھے اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر بُری طرح چیخنا شروع کر دیا۔
''ہرے، ہرے، مر گیا رے، ہرے، مم، میں ہرے بچاؤ...... ہرے بچاؤ...... بچاؤ۔ رام دیال...... ہرے راموورے، ہوئے ہوئے ہوئے۔'' وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور میں چونکہ اس کی سیدھ میں دوڑ رہا تھا اس لیے اس سے اُلجھ کر میں اس کے اُوپر ہی گرا تھا۔ افسر ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخا اور ساکت ہوگیا مگر میں چوٹوں کو بھول کر پھر اُٹھ گیا تھا۔ نگاہ پیچھے بھی اُٹھی تھی۔ وہ اپنے اپنے سر دُوسروں سے مانگ کر اس طرح شانوں پر رکھ رہے تھے جیسے ٹوپیاں پہن رہے ہوں، اور پھر وہ مستعدی سے دوبارہ میرے پیچھے لگ گئے۔ میں پولیس افسر کو بھول کر پھر دوڑ پڑا تھا۔ آبادی ختم ہوگئی اور کچھ دُور جا کر سڑک بھی ختم ہوگئی۔ آگے کچا راستہ آ گیا تھا اور اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ اس عالم میں حرکت قلب بھی بند ہوسکتی تھی۔ نکلا تھا پنڈت جی اور پنڈتائن کو ڈھونڈنے اور یہاں یہ آفت گلے پڑ گئی تھی۔
میں نے ایک لمحے کے لیے رُک کر کھیتوں پر نظر دوڑائی، کھیتوں کے بیچوں بیچ مجھے ایک پگڈنڈی نظر آئی تو میں اس پگڈنڈی پر ہوگیا۔ لیکن صاحب کہاں، میرے جاں نثار بدستور میرا تعاقب کر رہے تھے، وہ کھیت روندر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی گردنیں شانوں سے اُتار کر مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں پکڑ لی تھیں تاکہ کہیں وہ گر نہ جائیں اور وہ میرا پیچھا کر رہے تھے۔ کھیتوں کا سلسلہ تو تاحد نگاہ چلا گیا تھا۔ چیخیں کھیتوں میں بھی سنائی دیں۔ یہ ان غریب کسانوں کی چیخیں تھیں جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے، عورتیں بھی چیخی تھیں، مرد بھی چیخ رہے تھے مگر میرا پیچھا کسی طرح جاری رہا تھا۔ بہت فاصلہ طے ہوگیا اور اب میرے دوڑنے کی قوت بھی جواب دے گئی تھی۔ کہاں تک دوڑتا سانس بُری طرح پھول گیا تھا، چہرہ سرخ ہوگیا تھا، بمشکل تمام میں نے خود کو زمین پر گرنے سے بچایا اور ایک جگہ بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ وہ سب پھر میرے گرد مجمع لگا کر اکٹھے ہوگئے اور عجیب وغریب انداز میں اُچھلنے کودنے لگے۔ پھر شاید کچھ اور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد بیلوں کی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دی تھیں اور میں نے ایک بہت ہی خوبصورت رتھ دیکھا۔ یہ رتھ آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ ساز وسامان سے سجا ہوا تھا اور بڑی خوبصورتی سے اسے بنایا گیا تھا۔ رتھ قریب آ گیا اور رتھ سے ایک رتھ بان نیچے اُترا۔ یہ اچھی خاصی شکل وصورت کا مالک تھا پیلے رنگ کی دھوتی اور کرتا پہنا ہوا تھا۔ گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں، بڑی بڑی مونچھیں بڑی بڑی آنکھیں ماتھے پر تلک، میرے سامنے آ کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور نیچے جھک کر بولا۔

"رتھ حاضر ہے مہاراج جہاں بھی چلنا ہو رتھ میں بیٹھ جایئے ہمیں آگیا دیجئے ہم لے چلیں گے آپ کو......"
"بھاگ جاؤ میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ، یہاں سے، لے جاؤ یہ رتھ مجھے نہیں بیٹھنا اس میں، میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ......" رتھ بان نے خوفزدہ سی شکل بنائی۔ گردن خم کی اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا واپس رتھ میں جا بیٹھا اور اس کے بعد اس نے بیلوں کو واپس ہانک دیا۔ کچھ دیر کے بعد یہ رتھ میری نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا لیکن وہ مجمع پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا، میں نے تھک ہار کر ان سے کہا۔
"آخر تم کون لوگ ہو، کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو، کیوں لگے ہوئے ہو میرے پیچھے؟" ان میں سے ایک خوفناک شکل کا شخص آگے بڑھا اس کی گردن شانوں پر رہی تھی۔ اس نے منمناتی آواز میں کہا۔
"بیر ہیں مہاراج آپ کے، ایک سو اکہتر ہیں پورے، ہمیں آپ کی سیوا کا حکم دیا گیا ہے، کہا گیا ہے کہ ہر سمے آپ کی سیوا میں رہیں۔"
"اور اس طرح مجھے دوڑاتے رہو......"
"مہاراج آپ کا ساتھ تو دینا ہی تھا آپ چلے سو ہم چلے، آپ دوڑے سو ہم دوڑے، ہم تو بیر ہیں آپ کے، آپ کی پرجا ہیں مہاراج، آپ کی پرجا ہیں ہم۔"
"کیا تم اپنی یہ صورتیں گم نہیں کر سکتے؟" میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"کر سکتے ہیں۔" اس شخص نے معصومیت سے جواب دیا اسے شخص کہنا اس کے لیے عجیب سا بے شک لگتا ہے لیکن میں کیسے جانتا کہ وہ کیا ہیں جس کے دو ہاتھ دو پاؤں سر گردن آنکھیں سب کچھ ہوں بس ذرا ہیئت بدلی ہوئی ہو، میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی چونک تک پورا مجمع نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں منہ پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ سب کے سب یہیں موجود ہیں لیکن بس آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ آہ کیا کروں میں کیا کروں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، اتنا دوڑا تھا کہ بھوک لگنے لگی تھی، ایک گلاس دُودھ ہی تو پیا تھا۔ بھلا اس سے کیا بھلا ہوتا، میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ادھر اُدھر دیکھا اور اسی وقت وہ شخص پھر نمودار ہو گیا۔
"بھوجن لگا دیتے ہیں مہاراج۔" اس نے میرے اندر کی آواز سن لی تھی، آہ بڑا خوفناک وقت آپڑا تھا مجھ پر۔ میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ دفعتاً ہی میں نے اپنے سامنے ایک قالین کھلتے ہوئے دیکھا بڑا خوبصورت قالین تھا وہ اور وہیں پڑی زمین پر کھل گیا تھا اور پھر قالین پر بے شمار پھل اور کھانے پینے کی دُوسری اشیاء سجنے لگیں۔ میں حیران نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پورا قالین کھانے پینے کی چیزوں سے بھر گیا تھا، ہنسی بھی آرہی تھی اپنے آپ پر اور اپنے ان بیروں پر جو نجانے کہاں سے میرے بیر بن گئے تھے۔ میں بڑی پریشانی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہ شخص اب بھی میرے سامنے اس طرح ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا جیسے میرے دُوسرے حکم کا انتظار کر رہا ہو۔ یہ سارے کے سارے بڑی انکساری کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن جو چیز حقیقت ہی نہ ہو اسے تسلیم کرنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے، میں تو انہیں حقیقت ہی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ سب کالا جادو تھا سب کالا جادو اور یہ سب جو میرے سامنے آ کر سجا تھا یہ بھی کالے جادو ہی کے زیر اثر تھا۔ حرام اور ناپاک چیز میں اسے اپنے شکم میں نہیں اُتار سکتا، آہ جو غلاظت میرے وجود میں داخل ہو گئی ہے وہی کونسی کم ہے کہ میں اپنی بھوک کا شکار ہو کر مزید غلاظت اپنے وجود میں اُتار لوں۔ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"اُٹھا لو، اس سب کو اُٹھا لو مجھے نہیں چاہیے یہ سب کچھ، سمجھے اُٹھا لو، ورنہ میں اسے اُٹھا کر پھینک دوں گا۔" میں نے جھک کر قالین کے دونوں سرے پکڑے اور اسے اُلٹ دیا۔ ساری چیزیں اوندھی ہو گئی تھیں اور سہما ہوا بیر پیچھے ہٹ گیا تھا، اس نے مایوس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا دُوسرا کوئی میرے سامنے نہیں تھا لیکن ان سب کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب موجود ہیں۔ بہرحال یہ کھانا پھینک دیا گیا اور میری نگاہیں سامنے کھیتوں میں ان پھوٹوں پر پڑیں جو خودرو تھیں، کھیتوں میں اُگ آئی تھیں، بھوک واقعی لگ رہی تھی، جو واقعات پیش آئے تھے اب ان میں ایڈجسٹ ہوتا جا رہا

تھا، آگے بڑھا، ایک پھوٹ توڑی اور اس کا چھلکا دانتوں ہی سے اُتار کر اسے آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ پھوٹ نے شکم سیر کر دیا تھا لیکن جس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا اس سے چھٹکارے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ دل میں سوچا کہ یہاں سے آگے بڑھوں اور چند قدم آگے بڑھائے لیکن اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے اُوپر اُٹھتا چلا جا رہا ہوں اور میں زمین سے خاصا اُونچا اُٹھ گیا، میرے منہ سے بوکھلاہٹ بھری آوازیں نکل رہی تھیں۔

''ارے ارے، یہ کک..... کون، کون کیا کیا ہے؟'' جواب میں مجھے آواز سنائی دی۔

''ہم اپنے کندھوں پر آپ کو لے کر چل رہے ہیں مہاراج آپ تھک گئے ہیں دھرتی پر سفر نہیں کر سکیں گے، بیٹھے رہیں، بیٹھے رہیں، ہم آپ کو گرنے نہیں دیں گے۔''

''نیچے اُتارو مجھے، میں کہتا ہوں مجھے نیچے اُتارو.....'' میں نے کہا اور مجھے نیچے اُتار کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ میری وجہ سے پریشان تھے اور میں ان کی وجہ سے پریشان تھا۔ ان بیروں کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ دل کی حالت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ سخت پریشان ہو رہا تھا۔ نیچے اُترا اور ایک لمحے کھڑا رہا۔ پھر چند قدم آگے بڑھا لیکن جیسے ہی پیر آگے بڑھایا پاؤں کے نیچے کوئی لجلجی سی شے محسوس ہوئی۔ دُوسرا پاؤں آگے بڑھایا تو اس کے نیچے بھی بالکل ایسا ہی لگا۔ پھر یہ ہوا کہ میں قدم نہیں بڑھا رہا تھا لیکن آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے پیروں کے نیچے اس ذریعے کو دیکھا جو مجھے آگے بڑھا رہا تھا تو ایک بار پھر میرے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی۔ وہ بڑی بڑی مکڑیاں تھیں اتنی بڑی کہ میرے پاؤں بآسانی ان کے جسموں پر ٹکے ہوئے تھے اور وہ اپنے بے شمار قدموں سے مجھے آگے بڑھا رہی تھیں۔ میں نے خوفناک چیخ کے ساتھ چھلانگ لگائی لیکن جہاں گرا تھا وہاں بھی ایک مکڑی کی پشت پر ہی گرا تھا۔ اس کے پاؤں میرے وزن سے پھیل گئے لیکن رفتہ رفتہ وہ پھر پاؤں جما کر کھڑی ہو گئی، دُوسرا پاؤں آگے بڑھایا تو پھر وہی مکڑی آ گئی، میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''آہ مجھے آزاد کر دو، مجھے آزاد کرو میں، میں تھک گیا ہوں، میں تنگ آ گیا ہوں۔'' سامنے ہی ایک درخت نظر آ رہا تھا اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، میں مکڑیوں سے پاؤں اُتار کر جہاں بھی قدم رکھتا ایک نئی مکڑی نمودار ہو جاتی اور میرا پاؤں اس کی پشت پر ہی پڑتا۔ میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ بھلا اس لجلجی اور منحوس شے پر کیسے سفر کرتا، کس عذاب میں گرفتار ہو گیا آہ کس عذاب میں گرفتار ہو گیا ہوں۔

◆❖◆❖◆

میں نے بے بسی سے درخت کی جانب نظر اُٹھائی تو ایک بار پھر ایک دہشت بھری کیفیت کا سامنا کرنا پڑا، ہاں وہ درخت تھا تو درخت ہی لیکن اس کی دو شاخیں جو سامنے کی سمت پھیلی ہوئی تھیں وہ انسانی بازوؤں کی شکل رکھتی تھیں اور اس کا تنا انسانی جسم کی کیفیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تنے کے اس حصے پر جہاں سے بقیہ شاخیں مختلف سمتوں کو تقسیم ہو جاتی تھیں بھوریا چرن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ بھوریا چرن جو مسکرا رہا تھا، ایک طنز بھری شیطانی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ یہ بھی نظر کا واہمہ نہیں تھا بلکہ ایک حقیقت تھی جو روشن دوپہر میں چلچلاتی دُھوپ میں میرے سامنے عیاں ہو گئی تھی۔ پھر مجھے بھوریا چرن کی وہی مخصوص مکروہ آواز سنائی دی۔

''کیسے ہو میاں جی، کیا حال چال ہیں تمہارے؟'' میں نے نفرت بھری نگاہوں سے بھوریا چرن کو دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا بلکہ شدید غصے کے عالم میں اس پر تھوک دیا۔ بھوریا چرن ہنسنے لگا پھر بولا۔

''اب تو تمہارا۔ یہ تھوک بھی بڑا قیمتی ہو گیا ہے کبھی کسی پر تھوک کر دیکھ لینا مہاراج مگر بڑے بے ایمان ہو تم، بہت ہی ناشکرے اگر یہ سب کچھ کسی اور کو مل جاتا تو چرن دھو دھو کر پیتا بھوریا چرن کے، ہمارے کسی دھرم والے کو یہ شکتی مل جاتی مہاراج تو نجانے کیا کر ڈالتا وہ۔ گرو مان لیتا ہمیں اپنا۔ مگر تم تو ہو ہی برے خون والے گرو، پر تھوک رہے ہو۔ ارے سات پورن ماشیاں بنائی ہیں ہم نے تمہارے لیے۔ سات پورنیوں کو ستر انسانوں کا خون دے کر جگایا ہے اور وہ ساری کی ساری اب تمہاری سیوک بن گئی ہیں۔ ایک سو اکہتر بیران کے قبضے میں ہوتے ہیں اور یہ سارے کے سارے تمہارے اُوپر بلیدان

ہونے کو تیار ہیں۔ دیکھ لیا تم نے، کس کی مجال ہے کہ تمہاری طرف اُنگلی اُٹھا جائے۔ لڑ مریں گے یہ سُسرے تمہارے لیے اور وہ سات پورنیاں جو اس باؤلے جیوتشی کے گھر میں اُتری تھیں۔ سات اپسرائیں ہیں کسی کو مل جائیں تو وہ آکاش پر قدم رکھنے کی کوشش کرے، آکاش باسی بن جائے، مگر تم تھوک رہے ہو ہمارے اُوپر، یہ ہے ہمارے دیئے کا انجام......"

"بھوریا چرن میں ان ساری چیزوں پر لعنت بھیجتا ہوں کمینے کتے، لعنت بھیجتا ہوں میں تیرے اس دیئے پر۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا۔

"تو ہم نے کیا کس لیے ہے یہ سب کچھ میاں جی، من کی شانتی چھینی ہے ہم نے تمہاری سمجھے، من کی شانتی چھین لی ہے اب کیا کرو گے بڑی قوتوں کے مالک بن گئے ہو کسی بستی میں قدم رکھو گے تو لوگ پوجا کریں گے تمہاری، چرنوں میں آنکھیں رگڑیں گے مگر تمہارے من کی شانتی کہاں ہے، تم نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھینا ہمیں کھنڈولا نہ بننے دیا تو ہم نے بھی تمہارے من کی شانتی چھین لی۔ بڑے دھرم داس بنے پھرتے تھے ایں۔" بھوریا چرن نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

"دیکھو بھوریا چرن دیکھو دیکھو۔"

"ارے کیا دیکھیں، دیکھ لیا سب کچھ، تم نے جو کچھ کیا اس کے نتیجے میں ہم نے تمہارا دھرم بھرشٹ کر دیا اب بھاگتے پھرو سارے سنسار میں، دھرم دھرم چیختے چلاتے...... کچھ نہ ملے گا جب تک تمہارے بدن میں ہمارے پہنچائے ہوئے خون کا ایک ذرّہ بھی باقی ہے ذرا واپس آ کر دیکھ لو اپنے دھرم میں ... یا چرن ہے ہمارا نام، شنکھا ہیں، کھنڈولا بنا دیتے تو کیا بگڑ جاتا مہاراج اس وقت بھی یہی شکتی دے دیتے ہم تمہیں سمجھے اور اس شکتی کے ذریعے گھوڑے تمہارے اشارے پر دوڑتے، جواء تمہارے اشارے پر ہوتا، نجانے کیا کیا ہو جاتا تمہیں مگر تقدیر کی بات ہے بھاگ کے پھیر ہیں۔ تم اس قابل ہی نہیں تھے، اس قابل ہی نہیں تھے۔"

"مگر بھوریا چرن اب میں کیا کروں؟"

"بھاگتے پھرو پاگلوں کی طرح اتنی بڑی طاقت ہے تمہارے پاس مگر تم اسے استعمال نہیں کر سکتے مہاراج سمجھے کیونکہ تم نے مانا ہی نہیں ہے من سے، انہیں۔ جب انہیں استعمال کرو گے تو بات دُوسری ہو جائے گی اور تم بڑے مہان بن جاؤ گے سمجھے مگر تم ایسا کبھی نہیں کر سکو گے کبھی نہیں۔ من کی شانتی نہیں ملے گی تمہیں یہی ہمارا فیصلہ ہے، یہی بھوریا چرن کا بدلہ ہے۔" بھوریا چرن نے اپنے شاخوں جیسے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور اس کے بعد اس کے نقوش درخت میں معدوم ہوتے چلے گئے، وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا اس کے دیئے ہوئے بیر اور پورنیاں اب میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ پنڈت کاشی رام نے تو صرف اپنی بیوی کو ڈرانے کیلئے اور یہ سمجھانے کیلئے کہ میں بڑا مہان ہوں، سات پورن ماشیوں کا اور پورنیوں کا ذکر کیا تھا مگر کمبخت بھوریا چرن نے وہ ساری بلائیں میرے اُوپر نازل کر دی تھیں وہیں بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر سوچنے میں مصروف ہو گیا، اب تو آنکھیں بھی آنسوؤں سے خشک ہو گئی تھیں اگر میرے دل کا طبی تجزیہ کیا جاتا تو شاید وہ دُنیا کا طاقتور ترین دل نکلتا کیونکہ اتنا کچھ برداشت کر لینے کی اہلیت تھی اس میں ان تمام مصیبتوں کے باوجود اس کی دھڑکنیں قائم تھیں مگر کچھ سکون بھی ہوا تھا۔ پتہ چل گیا تھا کہ یہ سب کیا ہے بھوریا چرن انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اس نے مجھ پر سخت محنت کی تھی چنے کا بے جادو کی ساری قوتیں صرف کر دی تھیں۔ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے دھرم کے کسی شخص کیلئے یہ سب کچھ کر دیتا ... سے سات پورنیوں اور ایک سو اکہتر ناپاک غلاموں کی قوت مل جاتی تو وہ نہ جانے کیا کر ڈالتا مگر مجھ پر یہ سب کچھ ترس تھا، میرے لیے یہ بیکار تھا بلکہ ناقابل برداشت تھا۔ میں تو اسے سزا سمجھتا تھا اب تو اس سزا پر دل دُکھنے لگا تھا، مظلومیت کا حساس ہوتا تھا کیا میں اس کائنات کا سب سے بڑا گناہگار ہوں، دُوسرے لوگ بھی تو گناہ کرتے ہیں، میں نے تو اس کے بعد سے صرف کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیشہ پچھتاتا رہا ہوں لیکن انسان ہوں کہاں تک برداشت کروں، بھوریا چرن نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ میں بے سکون ہو جاؤں اندر کی کیفیت مجھے ان قوتوں سے فائدہ اُٹھانے سے باز رکھے اور بیرونی طور پر سب کچھ میرے قبضے میں ہو آہ...... نہ جانے مستقبل میں اس ایمان کو قائم رکھ سکوں گا یا نہیں۔ بھاڑ میں جائیں

پنڈت کاشی رام میں تو خود ایک مجبور انسان ہوں کیا کر سکتا ہوں میں نے نفرت بھری نظروں سے اس درخت کو دیکھا اور دفعتاً میرے دل میں ایک خیال آیا میں نے گردن ہلائی اور آواز دی۔

''میرے بیرو کہاں ہو تم......؟''

''یہیں ہیں مہاراج ہم کہاں جائیں گے۔'' سارا مجمع پھر نمودار ہو گیا اب انہیں دیکھ کر میرے دل میں خوف نہیں اُبھرا تھا۔

''اس درخت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔'' میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا اور وہ سب بھرا مار کر درخت کی سمت لپکے سب نے مل کر درخت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا پھر اس کی شاخیں توڑنے لگے ایک ایک پتہ کچل ڈالا انہوں نے تنا اُدھیڑ پھینکا وہ کیڑوں کی طرح اس سے لپٹ گئے تھے، پھر وہ اسی وقت سیدھے ہوئے جب درخت ننھی ننھی لکڑیوں میں تبدیل ہو چکا تھا، اس درخت میں مجھے بھوریا چرن نظر آیا تھا مگر میں خود بھی جانتا تھا کہ اس طرح بھوریا چرن ہلاک نہیں ہو جائے گا وہ شنکھا ہے ہزاروں رُوپ دھار سکتا ہے، بس ایک نفرت تھی اس کے خلاف جو دل میں اُبھری تھی اور یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہ بیر سچ مچ میرے اشارے پر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ سب اپنے کام سے فارغ ہو کر دوبارہ میرے گرد جمع ہو گئے، میں نے اس بیر کو دیکھا جو سب سے پیش پیش رہتا تھا۔

''آگے آ......'' میں نے کہا اور وہ آگے بڑھ آیا۔ ''کیا نام ہے تیرا۔'' ''کھتوری مہاراج۔''

''میں کون ہوں؟''

''ہمارے مالک۔''

''کیا نام ہے میرا؟''

''پورن بھگت۔''

''غلط، میرا یہ نام نہیں ہے۔''

''ہمیں نام سے کیا لینا مہاراج...... ہمیں تو کام بتاؤ۔''

''بھوریا چرن کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا اور بیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''چلے گئے یہاں سے۔''

''کیا تو بھوریا چرن کو مار سکتا ہے۔''

''وہ شنکھا ہے سوامی، شنکھا شریر کہاں ہوتا ہے وہ تو ہوا ہوتی ہے اور ہواؤں پر ہمارا بس نہیں ہے۔''

''اگر بھوریا چرن میرے سامنے ہو تو تم لوگ اس کی مانو گے یا میری۔''

''تمہاری مہاراج...... ہم تمہارے داس ہیں۔''

''رتھ لاؤ میرے لیے۔'' میں نے کہا اور کھتوری نے گردن ہلا دی ذرا سی دیر میں رتھ میرے سامنے آ گیا، میں رتھ میں جا بیٹھا اور کھتوری نے رتھ سنبھال لیا۔ ''چلو۔'' میں نے کہا اور اس نے بیل ہانکنے شروع کر دیئے، پیچھے وہ سب ٹیڑھے میڑھے چل رہے تھے، دل میں ایک لمحے کیلئے خیال آیا کہ اس طاقت سے تہلکہ مچا سکتا ہوں سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے مجھے جو چاہوں سامنے لا سکتا ہوں، بہت بڑی طاقت حاصل ہو گئی ہے مجھے مگر نہ جانے کیوں آنکھوں میں نمی آ گئی۔ بے اختیار آنسو نکل پڑے، آنکھوں نے دل کو احساس دلایا تھا کہ یہ سب کیا ہے کالا جادو ہے یہ جسے کرنے والے کافر ہوتے ہیں ان کی بخشش کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ سب کچھ کھونے کے مترادف ہے اور جو کھو گیا اسے دوبارہ نہیں حاصل کیا جا سکتا دل میں گرم گرم لہریں دوڑنے لگیں اعضا میں تناؤ پیدا ہو گیا اور میں نے رتھ سے باہر چھلانگ لگا دی لیکن میرے بیروں نے مجھے زمین پر نہیں گرنے دیا تھا وہ زمین پر لیٹ گئے تھے اور میں ان کے اُوپر گرا تھا لیکن میں پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا، میں نے دیوانوں کی طرح ان پر لاتیں برسانی شروع کر دیں اور وہ اِدھر سے اُدھر لڑھکنے لگے، رونے اور چیخنے لگے مگر کسی نے احتجاج نہیں کیا تھا۔ میں نے کھتوری کے

ہاتھ سے سانٹا لیا اور بیلوں پر پل پڑا، بیل ڈکرا کر بھاگے اور کھتوری اُچھل کر سر کے بل نیچے گرا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔
"بھاگ جاؤ تم سب بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ۔" میں سانٹا لے کر ان پر پل پڑا اور وہ سب بھاگنے لگے کچھ دیر میں وہ بہت دُور نکل گئے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔
"بھوریا چرن...... بھوریا چرن کتے تو نے میرے خون میں گندگی گھول دی ہے مجھ سے میرا دین چھین لیا ہے مگر میرا دین میرے دل میں ہے کبھی نہیں چھوڑوں گا اسے۔ کر لے جو تجھ سے کیا جا سکے، میں مسلمان پیدا ہوا ہوں مسلمان مروں گا بھوریا چرن...... کتے۔" میری آواز ویرانوں میں گونجتی رہی، حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا آواز پھٹ رہی تھی گلا دُکھ رہا تھا چیختا رہا پھر تھک کر خاموش ہو گیا وہاں سے چل پڑا اب میرے گرد سرسراہٹیں نہیں تھیں میرے بیر بھاگ گئے تھے میں نے جوان سے کہا تھا۔
چلتا رہا، چلتا رہا پھر ایک بستی آئی لوگ نظر آئے مگر میں نہ رُکا اور چلتا رہا، گھاس، پھونس، پتے جو ملتا کھا لیتا پھر کچھ کھنڈرات نظر آئے ایک ویرانہ تھا اور یہاں کالی کیچڑ اور جوہڑ بھی تھا کچھ جانی پہچانی جگہ محسوس ہوئی پھر یاد آیا یہ تو نیاز اللہ کی بستی تھی عزیزہ رہتی تھی یہاں اور یہ جگہ کیا نام تھا اس کا ہاں شاید رامانندی یہی نام تھا اس کا بھوریا چرن نے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ بے چارہ رامانندی اچھا انسان تھا۔
چاروں طرف بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا کھنڈرات پر خوفناک خاموشی طاری تھی، سناٹا چیختا محسوس ہو رہا تھا اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میری نظریں جوہڑ کی طرف اُٹھ گئیں، کیچڑ جگہ جگہ سوکھ گئی تھی اور اس پر حشرات الارض رینگ رہے تھے میرے منہ سے آواز نکلی۔
"کھتوری...؟"
"بھگت پورن۔" کھتوری میرے نزدیک ظاہر ہوا۔
"دُوسرے کہاں ہیں؟"
"تم سے دُور نہیں مہاراج۔"
"بلاؤ سب کو۔"
"ہم تو یہیں ہیں بھگت۔" ان کا پورا ریوڑ نمودار ہو گیا۔
"اس جوہڑ میں ایک شیشے کی بوتل ہے جس میں رامانندی کی لاش ہے اسے تلاش کر کے لاؤ۔" میں نے کہا اور وہ سب جوہڑ کی طرف دوڑ پڑے پورے جوہڑ میں بھونچال آ گیا مکھیوں اور مچھروں کے غول کالے بادلوں کی طرح اُٹھے اور چاروں طرف پھیل گئے سخت تعفن پیدا ہو گیا تھا کچھ دیر جوہڑ میں ہلچل رہی پھر ایک بیر وہ بوتل نکال لایا۔
"یہ رہی بھگت۔"
"کھول اسے۔" میں نے بوتل کو ہاتھ لگائے بغیر کہا اور اس نے بوتل کھول دی، بوتل سے دُھواں نکلنے لگا پھر یہ دُھواں زمین پر جم گیا اور کچھ دیر کے بعد وہ رامانندی کی شکل اختیار کر گیا۔ رامانندی کھڑے کھڑے جھول رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں پھر وہ گرتے گرتے سنبھلا اور آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔
"چلا گیا۔" اس نے سرگوشی کے عالم میں پوچھا۔
"کون؟"
"نظر نہیں آ رہا۔"
"کسے کہہ رہے ہو۔"
"شنکھا...... شنکھا...... وہی بھوریا چرن۔"
"تم ٹھیک ہو رامانندی۔" میں نے پوچھا مگر رامانندی نے اب ان بیروں کو دیکھا جو آہستہ آہستہ جوہڑ سے نکل کر جمع ہو

رہے تھے۔
''یہ کون ہیں......؟ تم کون ہو؟'' پہلے اس نے مجھ سے اور پھر ان سے پوچھا۔
''سیوک ہیں پورن بھگت کے۔'' کستوری بولا۔
''پورن بھگت...... ایں...... ارے...... اوں...... اوہ...... جے بھگوتی جے پورن مہاراج۔'' رامانندی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے مگر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اس نے آنکھیں مسل مسل کر کئی بار مجھے دیکھا پھر حیران لہجے میں بولا۔
''تم...... مہا بھگت، تم وہی ہو نا...... مسعود احمد...... وہ نیاز اللہ...... معاف کرنا مجھے نہ جانے کیوں میری بات کا برا مت ماننا وہ دراصل تمہاری صورت کا......'' وہ بار بار ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔
''رامانندی میں مسعود ہی ہوں آؤ اندر چلو آؤ پریشان نہ ہو۔'' میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھنڈرات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''ارے وہ مگر تم...... پورن بھگت...... یہ......'' اس نے بیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ سارے کے سارے پھر میرے پیچھے لگ گئے تھے۔
''تم کہاں آ رہے ہو چلو بھاگ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں میرے قریب مت آنا جاؤ۔'' میں گرجا اور وہ خوف زدہ ہو کر ایک دُوسرے کو دھکیلتے ہوئے بھاگنے لگے۔ رامانندی سخت پریشان تھا میں اسے لیے ہوئے کھنڈرات میں آ گیا رامانندی سخت اُلجھا ہوا نظر آ رہا تھا کھنڈرات میں جہاں وہ رہتا تھا وہاں کی حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
''یہ سب تمہارا کالا جادو ہے، رامانندی...... تم شاید صورت حال کو سمجھ نہیں پائے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کئی ماہ سے اس شیشی میں بند جوہڑ میں پڑے ہوئے تھے طویل عرصے کے بعد تم اس سے نکلے ہو۔''
''کئی ماہ سے۔'' رامانندی گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔
''ہاں کئی ماہ سے بیٹھ جاؤ میں تمہیں پوری تفصیل بتاتا ہوں، بیٹھ جاؤ پریشان مت ہو۔'' وہ بیٹھ گیا تب میں نے اسے شروع سے اب تک کی ساری کہانی سنائی اور وہ میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔ آخر تک کی کہانی سننے کے بعد بھی وہ دیر تک کچھ نہیں بولا تھا۔
''اس کے بعد رامانندی تم مجھے بتاؤ گے کہ اب میں کیا کروں......؟'' میں نے پوچھا لیکن وہ اس کے بعد بھی دیر تک کچھ نہ بولا اور سوچتا رہا پھر کئی گہری گہری سانسیں لے کر اس نے خود کو سنبھالا اور بولا۔
''کالے جادو کے سولہ درجے ہیں ابتداء نرٹھ سے ہوتی ہے نرٹھ پہلا جاپ ہے اس میں گندی اور غلیظ چیزوں سے شریر کو بھنگ کیا جاتا ہے اور اس طرح کالا علم سیکھنے والا خود کو کالی قوتوں کے حوالے کر دیتا ہے، دُوسرا درجہ سگت کہلاتا ہے اس میں کمال حاصل کرنے کے بعد کیڑے مکوڑوں کا کاٹا اُتارا جاتا ہے اسی طرح جاپ ہوتے رہتے ہی۔ آٹھویں گنتھ میں لونا چماری اور نویں میں کالی دیوی سے واسطہ پڑتا ہے پورنیاں گیارہویں درجے میں آتی ہیں اور جسے پورنیوں کا اختیار حاصل ہو جائے وہ کالے جادو کا گیارہواں ماہر ہوتا ہے۔ سات پورنیوں کے ایک سو اکہتر بیر ہوتے ہیں جو پورن بھگت کے غلام ہوتے ہیں بارہواں درجہ بھیروں ستوترن ہوتا ہے وہاں سے شنکھا کا سفر شروع ہوتا ہے اور پھر شنکھا پاٹ ہوتے ہیں ایک شنکھا ہی پورن جاپ کر کے اپنا جاپ کسی اور کو دے سکتا ہے کوئی دُوسرا ایسا نہیں کر سکتا مگر تمہیں جو قوت حاصل ہو گئی ہے وہ بہت بڑی ہے تم اس سے نچلے درجے کے سارے دیر داسیوں کو نیچا دکھا سکتے ہو مگر تمہارا معاملہ دُوسرا ہے۔''
''اس نے دھوکے سے میرے ساتھ یہ کیا۔''
''ہاں مگر بہت بڑا کام کیا ہے اسے سترہ انسانوں کی بلی دینا پڑی ہوگی۔''

''تم اب ٹھیک ہو راماننڈی۔''

''ہاں میں ٹھیک ہوں مگر اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔''

''وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔'' راماننڈی نے کہا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ راماننڈی کیا ان بیروں سے میں اپنے ماں باپ اور بہن کا سراغ لگا سکتا ہوں، کیا یہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔''

''بھول کر بھی ایسا مت کرنا۔''

''کیوں؟''

''ان سے تم کالے کام لے سکتے ہو صرف کالے کام۔ اگر کوئی ایسا کام لیا ان سے جو کسی طور کالے علم سے تعلق نہ رکھتا ہو تو یوں سمجھ لو وہ شے باقی نہیں رہے گی۔ تمہارے ماتا پتا کا پتہ لگا کر یہ تمہیں خبر دیں گے مگر بعد میں انہیں مار دیں گے۔ ریت ہے کالے جادو کی یہ برائی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے کسی نیک اور ضرورت کے کام کیلئے نہیں۔ مثال کے طور پر تم ان سے اپنے کسی دُشمن کو مروا تو سکتے ہو کسی بیمار دوست کیلئے دوا نہیں منگوا سکتے ہو۔''

''لعنت ہے اس علم پر...... اپنے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''راجہ بن جاؤ، محل بنوا لو، دولت کے ڈھیر لگا لو، سندر ناریاں اُٹھوا لو یہ سب خوشی سے سارے کام کریں گے۔''

''ایک بار پھر لعنت ہے اب بتاؤ میں اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں؟'' میں نے کہا اور راماننڈی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

''بہت مشکل ہے ایک طرح ناممکن ہے۔''

''راماننڈی دل چاہتا ہے راماننڈی یہ سب قبول کر لوں دل چاہتا ہے وہی بن جاؤں جو بنا دیا گیا ہوں۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور راماننڈی چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر وہ آہستہ سے بولا۔

''مسعود جی من کیا چاہتا ہے۔''

''کیا بتاؤں میں کیا بتاؤں۔''

''میں ایک مشورہ دوں۔''

''بولو۔''

''بڑے کشٹ اُٹھائے ہیں تم نے اپنا دھرم بنائے رکھنے کیلئے اب اسے کھونا اچھا نہیں ہوگا مگر تمہاری اس بات کو میں مانتا ہوں وہی بن جاؤ جو بنا دیئے گئے ہو۔'' میں اُلجھی ہوئی نظروں سے راماننڈی کو دیکھنے لگا۔

''نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔''

''بڑے کانٹے کی بات کہہ رہا ہوں بھوریا چرن نے تمہیں اتنا بڑا جاپ دے کر تم سے من کی شانتی چھینی ہے نا۔''

''ہاں یہی اس کتے کا مقصد ہے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''اور تمہارے من کی شانتی چھن گئی ہے اگر تم اپنا من شانت کر لو تو پھر اس کے من کی شانتی چھن جائے گی وہ سوچے گا کہ یہ تو بات اُلٹی ہو گئی اور پھر وہی کچھ اپائے کرے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ......''

''سنسار چرنوں میں جھکا لو، ہنسو، بولو، خوش رہو تمہاری خوشی اسے بھسم کر دے گی وہ تمہیں خوش ہی تو نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''مگر کالے جادو سے کام لے کر میں اپنے لیے جو کچھ کروں گا راماننڈی وہ مجھے میرے دین سے دُور سے دُور تر کر دے گا۔''

''اپنے لیے کچھ نہ کرنا یہ تو اسے جلانے کیلئے ہوگا۔ کسی کنواری کو پریشان نہ کرنا، کسی کو نقصان نہ پہنچانا بس ایسے کام کر لینا

جس سے اسے پتہ چلے کہ تم خوش ہو من کے بھید تو کوئی اور ہی جانتا ہے باقی سب عمل کے بھید ہوتے ہیں اور تمہارے عمل کے بھید ہی سامنے آئیں گے۔'' میں رامانندی کی بات پر غور کرنے لگا کچھ سمجھ میں آ رہی تھی کچھ نہیں آ رہی تھی وہ بے چارہ میرے دین کی نزاکتوں کو کیا جانے بس ایک معمولی سی لغزش اور...... کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے میرے پاس آخر کروں بھی تو کیا کس سے رہنمائی حاصل کروں اور بھوریا چرن وہ تو میرے سلسلے میں ہمیشہ ہی کامیاب رہا تھا، بڑا عجیب سا دل ہو رہا تھا۔ میں نے رامانندی سے کہا۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے رامانندی۔''

''مجھے کہیں منہ چھپانا ہے مسعود جی ہاں اگر تم اپنے ساتھ رکھنا چاہو تو مگر میں مجبور نہیں کروں گا۔''

''میرے ساتھ مگر بھوریا چرن تمہیں دیکھ لے گا۔''

''کچھ بگاڑ نہ پائے گا تمہارے ساتھ میرا جیون محفوظ رہے گا ورنہ مجھے خطرہ ہے۔''

''ٹھیک ہے رامانندی مگر تمہیں میرے ساتھ تکلیفیں رہیں گی۔''

''اُٹھالوں گا جیون تو بچا رہے گا۔'' میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی تھی رامانندی نے کہا۔ ''اب یہاں سے نکل چلو مہاراج مجھے اندیشہ ہے کہ وہ یہاں نہ آ جائے۔''

''چلو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی اور ہم دونوں کھنڈرات سے باہر نکل آئے جوہڑ کے پاس سے گزر کر ہم دُور نکل آئے میں نے رامانندی سے نیاز اللہ صاحب کے بارے میں کہا۔

''چلو گے ان کے پاس۔''

''دل تو چاہتا ہے مگر......؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے بھوریا چرن کو ان کی طرف متوجہ مت کرو کہیں نقصان نہ اُٹھا جائیں ویسے اگر تم چاہو تو خاموشی سے انہیں کچھ بتائے بغیر ان سے ملے بغیر ان کی کچھ مدد کر دو۔''

''اوہ...... نہیں رامانندی نیاز اللہ صاحب ایسے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فقر و فاقے کی زندگی گزار کر اپنا ایمان قائم رکھا ہے۔ یہ غلط دولت ان پر مسلط کر کے میں ان کی ایماندارانہ زندگی کو داغدار نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک کہتے ہو یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے پھر یوں کرتے ہیں کہ بستی کا رُخ ہی نہیں کرتے کوئی دُوسری سمت اختیار کرتے ہیں، آؤ اس طرف چلیں۔'' راستے میں میں نے رامانندی سے کہا۔

''ہمیں اب کرنا کیا چاہئے رامانندی۔''

''وقت اور حالات کے ساتھ دیکھنا ہوگا شنکھا تمہیں افسردہ، ملول اور پریشان دیکھنا چاہتا ہوگا تمہیں اس کے برعکس کرنا ہے تا کہ اسے احساس ہو کہ اس نے جو محنت کی وہ بیکار گئی اور پھر کیا سمجھے۔''

''ہاں سمجھ رہا ہوں۔''

''بیروں کو بلاؤ سواری کیلئے کچھ منگوالو دُور جانا ہوگا ہمیں۔'' رامانندی نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''واہ رامانندی دو قدم چل کر ہی بھول گئے میرے ساتھ رہ کر تمہیں کافی پریشانی اُٹھانی پڑے گی میں اس علم کی قوت سے اپنے لیے کوئی آسائش کبھی حاصل نہیں کروں گا سوچ لو۔''

''اوہ ہاں سچ مچ بھول گیا تھا کوئی بات نہیں چلو رامانندی تم سے پیچھے نہیں ہے۔'' رامانندی نے کہا اور ہم چل پڑے کوئی منزل ذہن میں نہیں تھی بس قدم اُٹھ رہے تھے نہ جانے کس طرف......!

رامانندی کا ساتھ بڑا سکون بخش تھا تنہائی سے نجات مل گئی تھی اس سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا۔ کسی بھی قدم کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ ہم نے آبادی کا رخ نہیں کیا تھا۔ جان بوجھ کر ویرانوں کی سمت چل پڑے تھے۔ رامانندی نے کہا۔

''بھوریا چرن سے کہیں بھی ملاقات ہوسکتی ہے اس کے بیروں نے اسے میرے بارے میں بتا تو دیا ہوگا۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟''

''ہاں بالکل بیر اسے سب کچھ بتاتے رہتے ہیں ان کی حیثیت رپورٹروں جیسی ہوتی ہے پھر وہ تو شنکھا ہے۔''

''تمہارے خیال میں وہ زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔؟'' میں نے پوچھا اور رامانندی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''تمہارا تو وہ کچھ نہیں بگاڑے گا ویسے یقین کرو مسعود جی تم تقدیر کے دھنی ہو تمہارے بارے میں کچھ باتیں میری سمجھ میں آج تک نہیں آئیں۔''

''کیا؟''

''پوری کہانی مجھے معلوم ہے تم عام جوانوں کی طرح زندگی کی آسائشیں چاہتے تھے اور اس کے لیے تم نے دین دھرم کے سارے رشتے توڑ کر ہر ناجائز طریقے سے طاقت حاصل کرنا چاہی۔ بھوریا کو ایک کچے دماغ والے مسلمان لڑکے کی ضرورت تھی جو ایک مقدس مزار کو ناپاک کرکے اس کے غلیظ وجود کو پاک قدموں میں پہنچادے۔ تم نے ایسا نہ کیا اور کھنڈولا بننے سے رہ گیا۔ چلو اس سے اس نے سوچا تھا کہ تمہیں خوب پریشان کرکے اپنے کام کے لیے مجبور کرلے گا مگر تم اس کے جال میں نہیں آئے۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہیں ختم کردیتا اس نے دوسرے کام شروع کردیئے اس نے تمہیں پورنا بنادیا۔ آدھا جیون لگ جاتا ہے کسی کو پورنا بھگتی کرتے ہوئے۔ تب پورنیوں کا حصول ہوتا ہے مگر اس نے تمہیں کالی شکتی دیدی۔''

''اس طرح وہ میرے دل کا سکون چھیننا چاہتا تھا۔''

''انہیں محسوس یہ کرنے کے لیے وہ تمہیں ملی کتے کا روپ بھی دے سکتا تھا۔ اس نے یہ کیوں نہ کیا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے رامانندی؟''

''میرا جیون بھر کا تجربہ کہتا ہے مسعود جی پورے جیون کا تجربہ کہتا ہے کہ کوئی مہان شکتی تمہارے پیچھے ہے۔ کوئی ایسی قوت جو اس کا دماغ پلٹے ہوئے ہے۔ وہ تمہارے لیے برے کام کررہا ہے مگر الٹے...... سیدھے کام وہ نہیں سوچ پارہا۔''

''ایسی کوئی قوت ہوسکتی ہے۔ میں نے ایک مقدس مزار کی بے حرمتی کرنے سے گریز کیا تھا کیا مجھے وہاں سے فیض مل رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ بزرگ مجھے اس گندی گرفت سے کیوں نہیں بچاتے۔''

''میرا کچھ اور خیال ہے مسعود میاں۔''

''کیا......؟''

''ماں ہے نا تمہاری......؟'' رامانندی نے سوال کیا اور میرے قدم رک گئے اعصاب پر جیسے بجلی سی گر پڑی میں نے رامانندی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں......!'' میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز بھری۔

''تو پھر عیش کرو، تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔'' بات سمجھ میں آگئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ''اتنے عرصہ سے اس سے دور ہو اس کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ کبھی خالی نہیں رہ سکتے۔ وہ کچھ نہیں جانتی ہوگی تمہارے بارے میں مگر کہتی ہوگی کہ بھگوان تمہیں زندہ سلامت رکھے۔ اور بھگوان تمہیں زندہ سلامت رکھے گا۔ تمہارے دشمن کے دماغ الٹے کرتا رہے گا۔''

دل ڈوب گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں حسرت ویاس کلیجہ کاٹنے لگی۔ بالکل سچ تھا ایک لفظ جھوٹ نہیں تھا ماں کی دعائیں آفات سے بچائے ہوئے تھیں باقی جو کچھ تھا وہ کیے کی سزا تھی مگر زندگی ماں کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی مرہون منت تھی۔

''ارے ارے۔ مسعود جی سنبھالو خود کو ارے نہیں بھائی روتے نہیں ہیں ملیں گے۔ سب ملیں گے تمہیں بھگوان کے ہاں

اندھیر نہیں ہے اور پھر تم تو...... تم تو اپنی معصومیت کے شکار ہو رہے ہو۔ تم اتنے شکتی مان ہونے کے باوجود اس شکتی کو کالی شکتی سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ کچھ ہوگا ضرور کچھ ہوگا تمہارے لیے...... مگر ارے...... ارے...... ارے...... ارے......" دفعتاً راما نندی کا حلق بند ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا رگیں ابھر آئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا میں پریشان ہو گیا۔ اپنی کیفیت بھول کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگا نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا میں اس کے قریب بیٹھ گیا پھر میں نے اسے آواز دی۔

"راما نندی، راما نندی کیا بات ہے بتاؤ تو سہی کیا بات ہے کیا ہو گیا راما نندی......؟"

راما نندی نے آنکھیں بھینچ کر گہری گہری سانسیں لیں اور بولا۔ "کچھ نہیں مسعود جی کچھ نہیں، یار عجیب سی بات ہو گئی ہے پتہ نہیں پتہ نہیں میرا کیا بننے والا ہے، پتہ نہیں، بیٹھو یار تم بھی جذباتی ہو گئے اور میں بھی نہ بچ سکا، کچھ ایسی بات ہو گئی، جو بڑی عجیب ہو سکتی ہے۔"

"آخر کیا۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا، بھوریا چرن کا خوف بہر طور دل پر سوار تھا اس کم بخت کے تصور سے کب جان چھوٹ سکتی تھی اور کچھ نہیں تو راما نندی کی زندگی ہی اس کے لیے تکلیف دہ ہو سکتی تھی راما نندی اس کا اظہار بھی کر چکا تھا کہ بھوریا چرن اسے نہیں چھوڑے گا لیکن اطراف پرسکون نظر آ رہے تھے اور بظاہر بھوریا چرن کہیں قرب و جوار میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ راما نندی نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور کہنے لگا۔

"کالا جادو سیکھنے کے لیے سب سے پہلا کام دھرم کو کھونا ہوتا ہے۔ دھرم کو ناس کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے گندے گندے کام شروع کیے جاتے ہیں اور دھرم دیوتا کا نام بھی زبان پر آنے نہیں دیا جاتا یہاں تک کہ عادت پڑ جاتی ہے کالا جادو بھگوان کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف ہی تو ایک گندی کوشش ہے جو طاقت شیطان کو مل گئی ہے اسی طاقت کا ساتھی تو بننا ہوتا ہے اور جب انسان شیطان کا ساتھی بن جائے تو پھر اللہ کا نام یا بھگوان کا نام اس کی زبان پر کبھی نہیں آتا یہاں تک کہ اس کا دل پتھر کی مانند سخت ہو جاتا ہے بھگوان اسے یاد ہی نہیں رہتا میں نے بھی تو یہی سب کچھ کیا تھا، بھگوان کے نام سے اپنا من ہٹا لیا تھا اور نجانے کتنا عرصہ ہو گیا کہ میں نے بھگوان کا نام نہیں لیا ہمارے کالے جادو کے دھرم میں اگر اس کا کوئی پاپی دھرم ہے تو بھگوان کا نام لینا سخت منع ہے بلکہ کالے جادو کا تھوڑا بہت علم اس وقت آتا ہے جب بھگوان کے نام سے دوری اختیار کر لی جائے۔ آج تمہاری ماں کا ذکر کرتے ہوئے میرے منہ سے بار بار بھگوان کا نام نکل گیا۔ یقین کرو یہ نام میں نے نجانے کتنے عرصے سے نہیں لیا۔ یہ تو مجھ ایسے بھول گیا تھا جیسے...... جیسے بس کیا بتاؤں تمہیں...... لیکن تذکرہ ایک ماں کا تھا اور بھگوان کی سوگند ماں بھگوان ہی کا دوسرا روپ ہوتی ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ بھگوان پھر سے میرے من میں آ گیا۔ بار بار میرے منہ سے اس کا نام نکل رہا ہے۔ آہ اس طرح تو میں بھی تمہارا ساتھی ہی بن گیا۔ مسعود بھیا میں بھی تمہارا ساتھی ہی بن گیا کالے جادو کا گیان تو اب ٹوٹ ہی جائے میرا میں خود بھی اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کیا پایا میں نے اس سے۔ ابھی تو مکمل بھی نہیں ہوا تھا چھوٹے موٹے کام کر لیتا تھا اور اس کے بعد جو ہڑ میں جا پڑا۔ نجانے کب تک پڑا رہتا۔ اگر تمہارے ہاتھوں نہ نکلتا، کیا ملا مجھے اس کالے جادو سے۔ آج بھگوان میرے من میں پھر سے زندہ ہوا ہے تو اب میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ مسعود میں کبھی بھگوان کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بھی اپنے گناہوں سے توبہ کروں گا میں بھی اپنے پاپوں کا پرائشچت کروں گا۔ لو بھیا ایک نہیں دو کھیل شروع ہو گئے، اور یہ کھیل خود بخود نہیں شروع ہوا۔ ماں بیچ میں آ گئی ہے، میری ماں نہیں ہے مگر میں تمہیں بھیا کہتا ہوں۔ ماں اپنے اس دوسرے بیٹے کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل کر لے، ماں صرف مسعود تیرا بیٹا نہیں ہے ایک بیٹا راما نندی بھی ہے اس کے لیے بھی ہاتھ اٹھا لے ماں، اس کے لیے بھی ہاتھ اٹھا لے۔" راما نندی ایسا بلک بلک کے رویا کہ میرا دل پانی پانی ہو گیا، میں خود بھی ماں کو یاد کر کے رونے لگا تھا لیکن راما نندی نے کچھ ایسی آہ و زاری کی کہ اپنا سارا دکھ بھول گیا اور اسے دلاسے دیتا رہا۔ ہم دونوں بہت دیر تک روتے رہے تھے۔ راما نندی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"میری ماں اس سنسار میں نہیں ہے میں نے تیری ماں کا سہارا طلب کر لیا ہے مسعود بھیا...... بھیا ہے تو میرا جیون

واردوں گا تجھ پر بس اور کیا کہوں، میں ہوں ہی کس قابل۔'' بہت دیر تک ہم جذبات میں ڈوبے رہے راماننندی نے کہا۔

''چلو چلیں آگے بڑھیں بھوک لگ رہی ہوگی تمہیں بھی میں بھی بھوکا ہوں۔ بھگوان کا دیا کھائیں گے۔ لعنت ہے اس کالی شکتی پر جس کے ذریعے ہمیں سب کچھ مل سکتا ہے مگر ایسا نہیں کریں گے ہم۔ چلو چلتے رہو، چلتے رہو۔'' اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ دن گزر گیا شام ہوگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک بستی کے آثار نظر آئے تھے اور شام کے جھٹپٹے کے بعد جب سورج ڈوبا تو بستی کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔ ''اللہ اکبر اللہ اکبر، اللہ اکبر۔'' مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ اذان ہو رہی تھی۔ قدم رک گئے راماننندی بھی اس آواز کو سننے لگا، میرے دل میں بھی عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں پھر آگے بڑھنے لگا، دور سے مسجد کے مینار نظر آرہے تھے۔ اس پر لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور غالباً روشنی بھی کردی گئی تھی مگر صرف مینار پر باقی مسجد بھی قدرتی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ بے خودی طاری ہوگئی قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ مسجد کے قریب پہنچا تو راماننندی نے شانے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

''اندر مت جا مسعود..... تو گندا ہے۔''

''ایں.....'' میں چونک پڑا۔ راماننندی کو دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر رک گیا۔ گردن ہلائی اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پہنچ گیا پھر حسد بھری نظروں سے نمازیوں کو دیکھنے لگا۔ چند ہی لوگ آئے تھے ممکن ہے اس بستی میں مسلمانوں کی آبادی کم ہو۔ اندر نماز شروع ہوئی تو بے اختیار کھڑا ہوگیا۔ نیت بندھی تو میں نے بھی نیت باندھ لی ایک بار پھر ذہن پر زور ڈالا اندر قرأت ہورہی تھی مگر میرا منہ بند تھا۔ ذہن بند تھا پاک کلام گندے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ سجدے میں پڑ گیا تب تو میں سجدے میں ہی رہا تھا۔ نماز ختم ہوئی نمازی شاید باہر نکل گئے تھے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سجدے سے سر ابھارا تو دو تین افراد کو قریب کھڑے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے سلام کیا تو اسے جواب دیا۔

''مسجد میں تو بہت جگہ ہے آپ لوگ باہر نماز کیوں پڑھ رہے تھے۔'' اس شخص نے سوال کیا۔

◆ ❖ ◆ ❖ ◆

میں نے تھوک نگل کر ادھر ادھر دیکھا کیا جواب دیتا اس بات کا لیکن گردن گھمائی تو ایک انوکھا منظر دیکھا۔ راماننندی بھی سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ تب ایک لرزتی ہوئی بوڑھی آواز ابھری۔

''آپ لوگ چلیں ہم پوچھ لیں گے۔''

''مسافر معلوم ہوتے ہیں امام صاحب ہوسکتا ہے لباس صاف نہ ہوں اس لیے اندر نہ آئے ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو اس کے گھر کے اس احترام کا جذبہ وہ قبول کرے۔ میاں انہیں اٹھاؤ، سجدے اتنے طویل مناسب نہیں ہوتے۔'' میں نے حکم دینے والے کو دیکھا تقریباً اسی سال کی عمر کے سفید ریش انسان تھے۔ بھنوؤں کے بال بھی سفید تھے ڈھیلے سفید چغے اور عمامے میں ملبوس تھے۔ میں راماننندی کے قریب پہنچا اور اسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اچھا خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مگر راماننندی کی سجدہ گاہ بھیگی ہوئی نظر آرہی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

میری عقل چکرا گئی۔ راماننندی کو کیا ہوگیا۔ اسی وقت نمازیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''مسافروں کے لیے کھانا لے آؤں امام صاحب.....؟''

''نہیں میاں خانہ خدا کے مہمان ہیں۔ اس کے ہاں کیا کمی ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ گھر میں جو پکا ہے ان کے سامنے رکھ دوں گا۔'' لوگ معلوم کر کے چلے گئے۔ امام صاحب ہمارے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بغور ہمارا جائزہ لے رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔ جو کچھ پوچھوں گا تفسیر احوال کیلئے پوچھوں گا۔ جس بات کا جواب دینا ناپسند ہو نہ دینا برا نہیں مانوں گا مگر جھوٹ نہ بولنا۔ خانہ خدا کے سامنے ہو۔

''نہیں امام صاحب آپ کچھ نہ پوچھیں جواب نہ دے سکیں گے۔''

''خدائے قدوس کی قسم بغرض تجسس نہیں انسان سے محبت مجبور کر رہی ہے۔ کہ تم سے احوال دریافت کروں۔ عمر میں تم

سے کہیں زیادہ ہوں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ کسی مشکل میں مشورہ کر لینا ضروری ہے حل نکل آتا ہے۔ مجھے بتاؤ بچو...... حلیے سے مشکل کا شکار معلوم ہوتے ہو کیا بات ہے؟"

"ہماری داستان طویل ہے۔"

"عشاء تک فراغت ہے مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہارے نام کیا ہیں۔"

"میرا نام مسعود احمد ہے اور ان کا راما نندی ہے۔"

"راما نندی......" امام صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور پھر گہری نظروں سے راما نندی کو دیکھا پھر بولے۔ "جیل سے فرار ہوئے ہو؟"

"نہیں......" راما نندی نے جلدی سے کہا۔

"کسی قانونی مشکل میں ہو......؟"

"نہیں۔" راما نندی ہی بولا۔

"الحمدللہ پھر احوال کہو۔ تم بتاؤ میاں خاموش کیوں ہو......؟ پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔" زبان کھل گئی۔ میں نے اول سے آخر تک داستان امام صاحب کو سنا دی اس میں راما نندی کا پورا ذکر بھی آ گیا تھا۔ امام صاحب خاموشی سے سنتے رہے تھے۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک خاموش رہے تھے۔ پھر وہ راما نندی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"عزیزی تمہاری داستان تو معلوم ہو گئی۔ مگر تم سجدے میں کیوں پڑے ہوئے تھے۔ تم کسے سجدہ کر رہے تھے؟"

"ارے جس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔ وہ جس کا کہا آپ بول رہے تھے۔ میں اسے سجدہ کر رہا تھا۔ میرے گناہوں نے بھگوان سے تو میرا رشتہ توڑ دیا امام جی...... مگر میں اس کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں جس کی باتیں آپ لوگوں کو سنا رہے تھے۔ میں کالے دھرم سے نکل کر اس کے سائے میں آنا چاہتا ہوں۔" راما نندی نے روتے ہوئے کہا۔ اور امام صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ......" انہوں نے کہا...... راما نندی سہما سہما کھڑا ہو گیا تھا میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تو امام صاحب نے مڑ کر کہا۔ "نہیں تم یہاں رکو...... تمہیں یہیں رکنا ہوگا۔ مسعود میاں جانا نہیں یہاں سے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے تاکید کرتا ہوں۔ یہ نا آشنا ہے کہتا ہے بھگوان سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے ارے باؤلے نام بدل لینے سے کچھ نہیں ہوتا افکار نہیں بدلنے چاہئیں وہیں سے کفر کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں افکار بدل کر نام بدلو تو بری بات ہے سچ کو کچھ بھی کہہ لو سچ رہتا ہے آؤ۔" انہوں نے راما نندی کا ہاتھ پکڑا اور اسے مسجد میں لے گئے۔

میں ڈبڈبائی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا اپنے بارے میں اندازہ ہو رہا تھا وہ لامذہب مجھ سے بہتر ہے وہ اندر جا سکتا ہے اور میں...... وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بہت دیر گزر گئی۔ رات ہو گئی پھر وہ واپس آ گئے۔ میں نے مسجد سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا راما نندی کا لباس بدل گیا تھا۔ اس نے شاید امام صاحب کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس کے ہاتھوں میں کھانے کے برتن تھے۔

"کھانا کھا لو مسعود میاں۔" امام صاحب بولے اور میں نے راما نندی کو بغور دیکھا۔ امام صاحب مسکرا کر بولے...... "ہم نے ان کا نام سرفراز رکھا ہے خدا کے فضل سے یہ مشرف بہ اسلام ہو گئے ہیں۔"

"اوہ اور میں......؟"

"کھانا کھا لو۔"

"میرا کیا تعین ہے امام صاحب......"

"کھانے کے بعد پوچھ لینا......"

"نہیں میں آپ کا یہ حکم نہیں مان سکوں گا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''سنو، ناآگہی کی معافی ہے اور جو آشنا ہوتے ہیں ان پر امانتوں کا بوجھ ہوتا ہے اس نے ہندو گھرانے میں جنم لیا اور وہی سیکھا جو دیکھا تھا!''

''تم نے بھی وہی سیکھا جو دیکھا تھا اور تمہارا دیکھا وہ تھا جو مکمل تھا۔ تمہارا سنا وہ تھا جو حقیقت تھا۔ فرق صرف آشنا نا آشنا کا ہوا۔ مساجد میں عالم دین کتابوں میں وہ بتاتے ہیں جو نجات کی سمت تعین کرتا ہے اور جان کر بھٹکنا بدترین ہے۔ تم نے سلے سے منہ موڑا، بار بار ایک بار نہیں جب تم اس پر بھروسہ کرتے تھے تو خود قدم کیوں بڑھائے تمہیں تو سمت دی گئی تھی اور وہی سمت تمہیں آگے لے جا رہی تھی رخ بدل لیا تم نے کوئی کیا کرے۔ بار بار رخ بدلتے ہو۔ اب انتظار کرو اپنی طرف چلنے والی ہواؤں کا۔ ہوا کے صحیح رخ کا اندازہ ہو جائے تو اس سمت چل پڑنا۔''

''گویا اب میں تنہا ہوں......'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تمہارے ساتھ تو یہ ہے۔ سانسوں کی آخری حد تک۔ موت کے ہوش چھین لینے سے پہلے تک۔ اور میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ ہاں قبولیت تک انتظار کرنا ہوگا۔''

میں سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''شکریہ میں چلتا ہوں۔''

''کہاں......؟''

''پتہ نہیں......''

''کھانا نہیں کھاؤ گے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''یہ برتن گندے ہو جائیں گے۔''

''ہم انہیں دوبارہ استعمال نہیں کریں گے۔''

''میں یہ نقصان نہیں کرنا چاہتا......'' میں نے کہا اور امام صاحب خاموش ہو گئے میں پلٹا تو رامانندی بے قرار ہو کر بولا۔

''ایک منٹ مسعود ایک منٹ، میں امام صاحب سے اجازت لے لوں۔ امام صاحب میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''اللہ کے احکامات کی تعمیل کرنا بس اس کے سوا کچھ نہیں۔'' امام صاحب نے کہا اور کھانے کے برتن واپس لے کر اندر چلے گئے۔ میں نے رامانندی سے کہا۔

''راما......! وہ معاف کرنا سرفراز تمہارا میرے ساتھ چلنا اب مناسب نہیں ہوگا ہم اسے عطیہ الٰہی کہتے ہیں تمہیں جو عطا ہوا وہ بہت قیمتی ہے۔ بہتر ہے کہ امام صاحب کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کر کے دینی معلومات حاصل کرو وہ گریز نہیں کریں گے۔''

''آؤ......'' رامانندی نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں ہچکچایا تو اس نے میرے بازو پر گرفت مضبوط کر لی اور پھر مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ رخ بستی کی طرف تھا۔

کافی دور چلنے کے بعد اس نے کہا تمہیں چھوڑ دوں گا میں۔ ابھی تو میرے اور تمہارے درمیان نیا رشتہ قائم ہوئے دیر بھی نہیں ہوئی۔

''نہیں رامانندی بڑا دلچسپ واقعہ ہو گیا ہے۔'' میں نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟''

ایک مصرع ہے کہیں سنا تھا۔ اس وقت بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔

''میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔''

''خدا نہ کرے تم کافر کیسے ہو گئے۔''

''اب بھی یہ سوال کر رہے ہو۔ امام صاحب نے مجھے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ وہ برتن جن میں میں

کھانا کھاؤں گا نا قابل استعمال ہو جائیں گے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا مسعود...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پتہ نہیں کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دین کی بات ہے میں نہیں بول سکتا مگر دماغ کچھ الجھتا ہے میں نے تو وہ سارے کرم کیے تھے جن سے کالا جادو آتا ہے گندے اور غلیظ عمل...... سچ معنوں میں تو پاک میں ہوں جبکہ تم نے نہ کالا جادو کیا اور نہ اس کی خواہش کی۔ میں کیسے پاک ہو گیا......؟"

"نہیں میں امام صاحب کی بات سے متفق ہوں۔ گناہ کبیرہ، اور گناہ صغیرہ کا فرق ہے باریک نکتے ہیں کوئی عالم ہی سمجھا سکتا ہے مجھے جگہ جگہ اپنی غلطیوں کی گواہی ملتی ہے بابا فضل نے مجھے کچھ نصیحتیں کی تھیں انہوں نے کہا تھا کہ عمل کا ایک راستہ ہوتا ہے۔ تمہارے نفس کی خواہش تحریک شیطانی ہوتی ہے اس سے بچنا۔ محبتوں کے جال میں پھنس کر فرض کو نہ بھولنا۔ مجھے ایک کراماتی کمبل ملا تھا جسے مجھے ہر وقت ساتھ رکھنا تھا مگر رشتوں کے جال میں پھنس کر ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا اور کمبل گم ہو گیا۔ میں نے اپنی طاقت کے زعم میں کچھ ایسے عمل بھی کیے جن کے بارے میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ شیطان کے بچھائے ہوئے جال ہیں۔ مجھ سے ایسی غلطیاں بار بار ہوئی ہیں۔"

"امام صاحب نے تمہیں توبہ کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"ہاں کروں گا مگر قبولیت کا وقت نہ جانے کونسا ہو گا تم جس رشتے کی بات کر رہے ہو افسوس وہ قائم نہیں ہو سکا۔"

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اب اور کیسے سمجھاؤں۔ بتا تو چکا......" میں نے کہا۔

"یعنی دین کا رشتہ......؟"

"ہاں۔"

"میں اس رشتے کی بات کہاں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر......؟" میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"اوہ نہیں میرے بھیا...... ماں کا رشتہ قائم ہوا ہے میرے اور تیرے درمیان میں نے ماں سے کہا تھا کہ اپنے دوسرے بیٹے کے لیے بھی ہاتھ اٹھا لے اس نے ضرور میرے لیے دعا کی ہو گی اور دیکھ لے مسعود مجھے ماں کی دعا سے کیا مل گیا۔ کل ماں نے مجھ سے بھیا کے بارے میں پوچھا تو کیا جواب دوں اسے۔"

میں خاموش ہو گیا ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ بازار کھلے ہوئے تھے ایک نانبائی کی دکان پر بیٹھ کر اس نے کھانا طلب کیا اور سرگوشی میں مجھ سے بولا۔ "تمہیں میری قسم مسعود خاموش رہنا۔"

میں نے خاموشی سے کھانا کھا لیا تھا اپنی کیفیت کا خود اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کیا ہو رہا ہے مجھے شکایت ہے بغاوت ہے صدمہ ہے نہ جانے کیا ہے نہ جانے اس وقت میری سوچ کیا ہے۔

"اب بستی چھوڑ دیں کیا خیال ہے......؟ رامانندی بولا۔ نہ جانے کون سی بستی ہے۔"

"کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے ریلوے اسٹیشن کا پتہ پوچھ لیتے ہیں کہیں بھی نکل چلیں گے۔"

"تھکن ہو گئی ہے۔ رات گزار لیں کل چلیں گے۔"

"ضرور ٹھیک ہے وہ سامنے پیپل کا درخت ہے اس کے نیچے چبوترہ بنا ہوا ہے رات گزارنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔" ہم دونوں چبوترے پر جا لیٹے پیپل کی جڑ میں ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا جس کے پاس مٹھائی کے دونے پڑے ہوئے تھے رامانندی نے مجھے بتایا...... "یہ گوبردھن پوجا کا سامان ہے صبح جلدی اٹھ جائیں گے یہاں سے ہو سکتا ہے ہندوؤں کو اعتراض ہو۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تم اب تک الجھے ہوئے ہو......؟

''ٹھیک ہو جاؤں گا......''

''کوشش کر کے سو جاؤ نیند سکون دے گی۔''

''ہاں'' میں نے کہا سر کے نیچے ایک اینٹ رکھی اور کروٹ بدل لی۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

''سو گئے نندی......؟''

''یار مجھے سرفراز کہو......؟''

''سو گئے سرفراز......''

''کیا بھوریا چرن کو ان حالات کے بارے میں معلوم ہوگا......؟''

''ہو سکتا ہے......''

''اس پر کیا اثر ہوگا؟''

''اللہ جانتا ہے مجھے اب بالکل پروا نہیں ہے بڑا سکون ملا ہے مجھے مسعود بیان نہیں کر سکتا بھوریا چرن کا پدم معلوم ہے تمہیں؟''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''شناختی نشان......''

''مکڑی......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جب مکڑی دیکھو تو ہوشیار رہنا۔ اس کے بیر اسی شکل میں ہوتے ہیں۔''

''ہاں میرا راستہ پڑ چکا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ آنکھوں میں غنودگی تیرنے لگی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیند بھگانے لگا۔ سو گیا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا رامانندی کی گہری گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اٹھا رامانندی کو ایک نگاہ دیکھا اور پھر بلی کی طرح دبے قدموں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بستی کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس منہ اٹھا کر چل پڑا تھا اور رفتار تیز رکھی تھی تاکہ رامانندی مجھے تلاش نہ کرے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

سڑکوں اور گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ بستی کے آخری سرے پر پہنچا تھا کہ سیاہ رنگ کا ایک قد آور کتا مجھ پر جھپٹ پڑا۔ بہت خونخوار کتا تھا اور بہت غصہ ور معلوم ہوتا تھا اچانک ہی غرا کر حملہ آور ہوا تھا میں بوکھلا گیا۔ قریب تھا کہ کتا میری ٹانگ پکڑ لے لیکن اچانک ہی کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ اور پھر اس کی بھیانک چیخیں ابھرنے لگیں۔ میں نے اسے درمیان سے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں چیر دی گئی تھیں پھر اس کے جسم کی چندھیاں چندھیاں کر کے پھینک دی گئیں۔ اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ میرے بیر تھے...... میرے محافظ......

بڑا شاک لگا تھا...... یہ کالی قوتیں مسلسل میرا ساتھ دے رہی تھیں اور دوسری طرف کچھ نہیں تھا۔ ادھر میں صرف ملعون و مطعون تھا۔ اچانک سارے بیر ظاہر ہو گئے۔

''چندنا جی...... کوئی حکم......؟'' ایک نے آگے بڑھ کر کہا میری رگیں کھنچنے لگیں۔ دماغ میں خون کی گردش تیز ہو گئی سب چھٹے گئے۔ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔

''نہیں۔''

''سیوا نہ کرنے دو گے؟''

''نہیں...... تم جاؤ...... روپوش ہو جاؤ۔''

''جے چندنا......'' وہ سب غائب ہو گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا حواس درست کرتا رہا پھر کیفیت کچھ تیز ہوئی تو برق رفتاری سے چلتا ہوا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ رفتار ہیجان کے عالم میں پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی بستی پیچھے رہ گئی آگے جنگل کا سلسلہ

شروع ہوگیا تھا۔ میں تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا آگے بڑھتا رہا۔ راستے کا کوئی علم نہیں تھا۔ بس قدم اٹھ رہے تھے جنگل ختم ہوگیا میدان نظر آنے لگے اکا دکا خودرو درخت آجاتے تھے۔ چلتا رہا بہت دیر کے بعد کہیں دور سے گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر ایک تیز روشنی جس کے عقب میں ننھی ننھی روشنیاں ٹمٹماتی گزر رہی تھیں ریل تھی جو کچھ دیر کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ چلتے چلتے تھک گیا تھا رات ابھی خاصی باقی تھی۔ جگہ کیا تلاش کرتا جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا تھکن کے مارے برا حال ہو رہا تھا نیند کے جھونکے بھی آرہے تھے چنانچہ لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دماغ کو آزاد چھوڑ دیا تھا اس لیے نیند آنے میں وقت نہ ہوئی اور سکون کی وادیوں میں پہنچ گیا۔ صبح کو پرندوں کی چہچہاہٹ اور جنگلی خرگوشوں کی بھاگ دوڑ سے آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد آس پاس کے مناظر دیکھے بس وہی ویرانہ جو میری تقدیر کی مانند تھا۔ تاحد نگاہ کچھ نظر نہیں آتا تھا سوائے ٹیلی فون کے تاروں کے ان کھمبوں کے جو فاصلے فاصلے سے لگے ہوئے تھے اور ان کے بیچ تاروں کا رابطہ تھا۔ پتہ نہیں آبادی کتنے فاصلے پر ہے لیکن یہ کھمبے کسی آبادی کی جانب میری رہنمائی کرسکتے ہیں اٹھا تو چکر سا آگیا۔ احساس ہوا کہ بھوک اور پیاس نے نڈھال کر رکھا ہے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ بھلا اس بے آب وگیاہ ویرانے میں کھانے کا کیا تصور ہوسکتا ہے قدرتی طور پر بھی یہاں کچھ نہیں تھا۔ بس جگہ جگہ بدنما جھاڑیاں اگی نظر آرہی تھیں کہیں کہیں بڑے بڑے جھاڑ تھے جو بعض جگہ خاصے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے یہی فیصلہ کیا میں نے کہ ان تاروں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہوں۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے حلق خشک ہونے لگا لیکن بے کار تھا سب کچھ بے کار تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک جھاڑ اگا ہوا تھا اس کے پیچھے سے گزر کر دوسری سمت پہنچا تو آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک دری بچھی ہوئی تھی جس پر سفید چادر بچھی تھی چادر کے کونے وزنی پتھروں سے دبے ہوئے تھے۔ درمیان میں پھل خشک میوے اور گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے میں ساکت رہ گیا دور دور تک نظریں دوڑائیں لیکن کیا مجال کہ کسی انسانی وجود کا احساس بھی ہوجائے۔ ساری چیزیں تروتازہ تھی اور اعضاء چیخ رہے تھے کہ لپک اور شکم سیر ہوجا لیکن یہ سب آیا کہاں سے دوسرے لمحے اندر سے مایوسی کی ایک گھٹی سانس نکلی اور یاد کرنے پر یاد آیا کہ یہ سب کہاں سے آسکتا ہے بھوکا پیاسا تھا میری خواہش کو میرے بیروں سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا ذرا سی دیر کے لئے ذہن کی کیفیت ڈانواں ڈول ہوئی اور دل نے کہا کہ پیٹ جو طلب کررہا ہے اسے نظر انداز مت کر ساری باتیں اس کے بعد شروع ہوتی ہیں چنانچہ پہلے اس مسئلے سے نمٹا جائے اور اس کے بعد سوچا جائے کہ آگے کیا کرنا ہے دو قدم آگے بڑھا تو کانوں میں آواز ابھری کہ توبہ تیرے ساتھ ہے تو تنہا نہیں ہے۔ توبہ کے دروازے اس لمحے تک کھلے رہیں گے جس لمحے تک تیری سانس تیرے بدن میں ہوگی۔ آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اس کے بعد رخ تبدیل کرلیا تیز رفتاری سے وہاں سے دور نکل آیا۔ کافی دور جانے کے بعد جب ایک پتھر سے ٹھوکر لگی تو ایک دم سے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک بڑا سا برتن تھا جس میں کھانے پینے کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے پلٹ کر حیرانی سے اسی جھاڑ کو دیکھا اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی میں وہاں سے دور نہیں نکلا لیکن یہاں تو جھاڑ کا نام ونشان نہیں تھا وہ جھاڑ تو بہت پیچھے نظر آرہا تھا مگر پھر برتن میں نے دانت پیسے اور ایک زوردار لات سامنے رکھے ہوئے برتن پر دے ماری۔ اس میں رکھی ہوئی اشیاء زمین پر لڑھک گئیں اور میں وہاں سے آگے دوڑنے لگا۔

لیکن اس بار میں نے آنکھیں بند نہیں کی تھیں سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ سانس چڑھ رہی تھی بہت دور نکلنے کے بعد جنون میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی تو میں نے ایک اور جھاڑی کو دیکھا جو خاصی سرسبز تھی اور اس میں لیموں جیسے گول گول پھل لگے ہوئے تھے۔ قدم خود بخود رک گئے ایک لمحے کے لئے ذہن نے کچھ سوچا دوسرے لمحے میں اس جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے پھلوں کو دبا کر دیکھا رسیلے تھے اندر سے کیسے ہوں اللہ بہتر جانتا ہے دو پھل توڑے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ان کی خاصیت کیا ہے۔ وہ کیسے پھل ہیں انسانی صحت کے لئے مضر تو نہیں ہیں یہ سب کچھ سوچے سمجھے بغیر میں نے ایک پھل کو دانتوں سے کاٹا زیادہ سخت نہیں تھا اندر کسی قدر کھٹاس اور کڑواہٹ تھی لیکن لیموں نہیں تھے تاہم ان میں بڑے ریشے موجود

تھے میں نے پورا پھل چبالیا پھر دوسرا اور اس کے بعد جھاڑی سے پھل توڑ توڑ کر کھاتا رہا یہ بھی اپنے آپ کو سزا دینے کے مترادف تھا اگر کچھ ہو جاتا ہے ان پھلوں کے کھانے سے تو ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے لیکن معدہ پوری طرح پُر ہو گیا تھا۔ بھوک اور پیاس دونوں کی شدت مٹ گئی تھی۔ بدن کو توانائی کا احساس بھی ہو رہا تھا آگے بڑھنے کی ہمت بھی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ آگے بڑھنے لگا۔ دوپہر تک کے سفر کے دوران دوبارہ ریل گزرتے دیکھی اس کا مطلب ہے کہ فاصلے پر ہی آگے آبادی ضرور مل جائے گی۔ مناظر بدل رہے تھے زمینوں پر کچھ متعدد نشان نظر آئے جو چونے سے بنائے گئے تھے۔ پھر ٹائروں کے نشان بھی نظر آئے اور اس کے بعد ایک باقاعدہ پگڈنڈی مزید کچھ دور چل کر اس پگڈنڈی پر ایک جیپ دیکھی۔ گزرگاہ وہی تھی چنانچہ ادھر سے ہی گزرا...... مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیپ خالی تھی اس کے آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ حیران کن بات تھی یہاں اس ویرانے میں یہ جیپ کون چھوڑ گیا۔ پھر ایک دم ہنسی آ گئی یہ بھی شاید میرے بیروں کا احسان تھا ان کا رتھ جدید ہو گیا تھا ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا مضبوط جسم کا مالک کوئی تینتیس چونتیس سالہ شخص تھا جو ہاتھ میں موبل آئل کا ڈبہ سنبھالے آ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور رفتار تیز کر دی تھی۔ شاید سوچ رہا تھا کہ کہیں جیپ لے کر نہ بھاگ جاؤں قریب پہنچ کر اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بھائی ادھر سے گزر رہا تھا کہ یہ جیپ کھڑی ہوئی دیکھی حیران ہو رہا تھا کہ اس کا مالک کہاں گیا۔''

''ریڈی ایٹر خشک ہو گیا تھا یار مصیبت بن گئی۔ دور دور تک پانی کا پتہ نہیں تھا بہت دور جا کر ایک نالی سے پانی ملا...... لعنت ہے'' اس نے گردن جھٹکی اور جیپ کا بونٹ کھولنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی تھی وہ بولا ''بعض اوقات ایک چھوٹی سی حماقت اتنی بڑی مصیبت بن جاتی ہے کہ بس مزا آ جاتا ہے۔ حالانکہ پانی کا گیلن ساتھ رہتا ہے مگر حماقت ہو گئی۔ جانتے ہو کیا؟'' اس نے ریڈی ایٹر میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا......؟'' میں نے پوچھا۔

سائٹ سے چلتے ہوئے میں نے گیلن نکال کر شمسو کو دیا اور کہا کہ پانی بھر لائے وہ گیلن لے کر ادھر گیا اور میں جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ یاد ہی نہ رہا کہ شمسو کو پانی لانے کے لئے بھیجا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ موبل آئل کا یہ خالی ڈبہ گاڑی میں پڑا رہ گیا ورنہ گئے تھے اس نے ریڈی ایٹر فل کیا۔ اور اس کا ڈھکن لگا کر بانٹ گرا دیا پھر چونک کر بولا مگر تم کہاں گھوم رہے ہو کیا تیمری سے آ رہے ہو۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی بولا ریل میں بیٹھ گئے ہوتے سوا روپیہ لگتا ہے سانسی کا، سانسی ہی جا رہے ہوتا؟

''ہاں'' میرے منہ سے نکلا۔

''چلو میں چھوڑ دوں گا آؤ بہت دیر ہو گئی۔'' میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''کہاں رہتے ہو، سانسی میں......''

''نہیں''

''اچھا تلیری میں رہتے ہو گے سانسی میں کہاں جانا تھا؟''

''پہلی بار جا رہا ہوں۔''

''سانسی پہلی بار جا رہے ہو؟''

''ہاں!''

''کیوں جا رہے ہو؟'' اس کے انداز میں تمسخر تھا۔

''کسی نوکری کی تلاش میں۔'' نہیں ایک خیال کے تحت جلدی سے کہا۔

''سانسی۔ اور نوکری کی تلاش میں۔ کسی نے مشورہ دیا تھا؟''

''کسی نے نہیں۔''

''اچھا خود ہی چار روٹیاں پکوا کر چل پڑے ہوگے۔ چاروں کھا گئے یا کوئی بچی ہے۔ بھلے آدمی سانسی میں نوکری کہاں ملے گی تمہیں۔ کسی سے بات ہوئی ہے؟''

''نہیں!''

''کمال کے آدمی ہو۔ کسی سے پوچھ تو لیا ہوتا۔ کیا نام ہے۔''

''مسعود احمد''

''میرا نام شاہد علی ہے۔ کنسٹرکشن کا کام کرتا ہوں۔ ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں یار۔'' بے تکلف آدمی تھا میں نے اس سے اس کی مصیبت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اماں کچھ منہ سے تو بولو۔ یہی بات سن کر پریشان ہو گئے ہوگے وہ خود ہی بولا۔

''ہاں ایسا ہی ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے دنیا کے کام ایسے ہی چلتے ہیں۔ کیا کام جانتے ہو؟''

''کچھ نہیں!''

''سبحان اللہ۔ سبحان اللہ اماں کیا آدمی ہو۔ کوئی کل سیدھی نہیں لگ رہی کچھ پڑھے لکھے ہو۔''

''ہاں۔''

''شکر ہے۔ شکر ہے۔ کتنی تنخواہ میں کام چل جائے گا کوئی آگے پیچھے ہے یا۔''

''اکیلا ہوں۔''

''مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ تمہیں نہیں انہیں جو تمہارے کوئی بھی نہیں ہیں۔ ورنہ بھوکے مرتے بے چارے۔ بار برامت ماننا میری بات کا۔ مگر تم تو بہت ہی سیدھے آدمی ہو مجھے وہ شیخ چلی یاد آ رہے ہیں جو چار روٹیاں باندھ کر نوکری تلاش کرنے چل پڑے تھے۔ ان کا کام ہوا ہو یا نہ ہوا ہو تمہارا کام ہوگیا۔ بس یوں سمجھ لو تمہیں نوکری مل گئی اب پیسوں ویسوں کی بات مت کرنا۔ ذرا اطمینان سے بیٹھیں گے تو یہ مسئلہ بھی حل کرلیں گے ان دنوں تو میں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں فی الحال تم یوں کرو کہ میری مصیبت میں شریک ہو جاؤ، دونوں مل کر مصیبتیں بھگتیں گے، ساتھ کھائیں گے ساتھ پئیں گے، یار یقین کرو، میں ہنس بول رہا ہوں تمہارے ساتھ، مگر جو مجھ پر بیت رہی ہے میرا دل ہی جانتا ہے۔''

یہ آدمی واقعی اچھا معلوم ہوتا تھا، فوراً ہی میں نے اپنے خیالات میں ذرا سی تبدیلی پیدا کی تھی نوکری کا تذکرہ یہی سوچ کر کیا تھا کہ جو کچھ گزر رہی ہے وہ تو گزر ہی رہی ہے کم از کم کچھ حلال کی کھاؤں، بیچارے پنڈت جی کے ہاں گھر کے کام کاج کی نوکری کی تھی تو وہ گھر ہی چھوڑ بھاگے تھے اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان پر اور مجھ پر کیا مصیبت پڑنے والی ہے لیکن یہ دوسری نوکری جو مجھے مل رہی تھی وہ پہلے سے کسی مصیبت زدہ کے ہاں کی نوکری تھی، دل تو چاہ رہا تھا کہ اس سے اس کی مصیبت کے بارے میں پوچھوں لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی پھر اس نے خود ہی کہا۔

''یار کچھ منہ سے تو پھوٹو، سانسی ابھی یہاں سے کافی دور ہے اور میں بہت زیادہ تیز گاڑی نہیں چلا سکتا کچھ گڑبڑ ہے اس کے انجن میں۔''

''آپ نے اپنی کسی پریشانی کا تذکرہ کیا تھا۔ کیا بات ہے؟''

''ہاں ہاں اس وقت یہی مسئلہ میری زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ بس یار ایک انوکھی مشکل میں مبتلا ہو گیا ہوں، اللہ سے دعا کرو کہ مجھے اس مصیبت سے گزارے، ہوا یہ ہے کہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ کنسٹرکشن کا کام کرتا ہوں اور عمارتیں وغیرہ بنواتا ہوں، ہمارے ایک جاننے والے ہیں بڑی پرانی شناسائی ہے بس یوں سمجھو کہ اللہ نے پیٹ بھی بھر دیا ہے اور تجوریاں بھی، ایک باغ خریدا تھا انہوں نے اسی علاقے میں جدھر سے ہم لوگ گزر رہے تھے، بڑا پرانا باغ پڑا ہوا تھا، موصوف کو وہاں فارم ہاؤس بنانے کی سوجھی، ایک عمارت، ٹیوب ویل اور ایک طویل رقبے میں احاطہ بنوانے کا ارادہ کیا اور اس کا ٹھیکہ مجھے دے دیا،

پیسے بھی لے لیے میں نے ان سے اور اس کے بعد سارے کام ختم کرا کے اس طرف چل پڑا مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ باغ آسیب زدہ ہے۔'' شاہد علی بولتے ہوئے رک گیا۔ میں خاموشی سے اس کے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''باغ کا کٹوانا ضروری تھا اور ایسے بھی پرانا باغ تھا سارے درخت سوکھے پڑے ہوئے تھے، کوئی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہیں تھا یہاں تک کہ مالی بھی نہیں اور اس کی وجہ یہی تھی کہ باغ آسیب زدہ مشہور تھا درختوں پر پھل نہیں آتے تھے اور اس کا مالک بھی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ کسی ہندو کا باغ تھا۔ بہرطور میں نے کام شروع کرا دیا۔ درخت کٹوانے میں بھی دو ڈھائی مہینے لگ گئے۔ اور پھر مصیبت آ گئی، مصیبت ایسے آئی کہ بس کیا بتاؤں یار۔ پتہ نہیں تم میری باتوں کو مذاق سمجھو یا سچ۔ ایک بہت پرانا درخت تھا وہاں بستی کے آس پاس کے لوگوں کا کہنا تھا کہ اصل میں یہی درخت آسیب زدہ ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی آسیب وغیرہ دیکھے نہیں تھے۔ مگر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جس سے مجھے بھی شبہ ہونے لگا کہ لوگوں کا کہنا غلط نہیں ہے، میں نے درخت کی کٹائی شروع کرا دی اور اس دن دوپہر کا وقت تھا۔ مزدور جڑیں کھود رہے تھے کہ درخت کی جڑ میں انہیں ایک عجیب و غریب صندوق جیسا ملا، پتھر کا صندوق تھا مزدوروں نے اس پر کدالیں مارنا شروع کر دیں اور اس صندوق کا ڈھکن کھول دیا مجھے اطلاع ملی تو میں فوراً ہی متوجہ ہو گیا بے شمار بار ایسی کھدائیاں کراتے ہوئے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں کوئی خزانہ وزانہ مل جائے۔ اس وقت بھی جب مجھے پتہ چلا کہ درخت کی جڑ میں ایک صندوق برآمد ہوا ہے تو میں نے لگائی دوڑ اور پہنچ گیا وہاں...... مزدوروں کو ہٹا کر میں نے اس چوکور گڑھے میں جھانکا۔ گڑھے میں کسی خاص درخت کے پتے بچھے ہوئے تھے جن میں خاص بات یہ تھی کہ وہ تروتازہ تھے حالانکہ درخت پرانا اور سوکھا ہوا تھا مگر وہ پتے بالکل ہرے تھے اور ان پتوں پر پتھر کی ایک مورتی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس مورتی کو غور سے دیکھا ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کے بہت سے بت دیکھے تھے میں نے مگر وہ مورتی ان میں سے کسی کی نہیں تھی۔ ایک عجیب سی شکل کی تھی وہ میں نے وہ مورتی نکال لی اور مزدوروں سے پورا کنواں کھدوا دیا۔ اس لالچ میں کہ شاید یہ کوئی نشانی ہو خزانے کی۔ مگر کچھ نہیں ملا وہاں بڑی مایوسی ہوئی مزدوروں نے وہ درخت بھی گرا دیا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔

کھدائی کراتے ہوئے بہت سی چیزیں ملی تھیں مجھے۔ کمبخت کام کی کوئی چیز آج تک نہیں ملی لیکن اس بار جو مصیبت گلے پڑی ہے اللہ ہی اس سے نکالے۔''

وہ جیسے خود ہی اپنی کہانی میں کھو گیا۔ میں خاموشی سے اس کے آگے بولنے کا انتظار کرنے لگا وہ سوچ میں ڈوب کر خاموش ہو گیا تھا پھر کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہ درخت گرا دیا گیا۔'' میں نے بتایا۔

''کونسا درخت؟''

''جس کے نیچے سے مورتی نکالی گئی تھی۔''

''معاف کرنا۔ زیب النساء کا خیال آ گیا تھا۔ ہاں تو وہ مورتی جو اس پتھر کے صندوق سے نکلی تھی میرے پاس ہی تھی۔ میں نے اسے بس یونہی جیب میں رکھوا لیا تھا۔ پھر میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ شام کو گھر چل پڑا درخت کا واقعہ میرے کاموں کی وجہ سے بھول ہی گیا تھا۔ گاڑی سے اترا تو مورتی نظر آ گئی۔ اسے اٹھا لایا اور اپنی خواب گاہ کے کارنس پر رکھ دیا۔ زیب النساء کے ساتھ کھانا کھایا بچوں سے باتیں کیں دو بچے ہیں میرے بیٹی بڑی ہے بیٹا چھوٹا دونوں دوسرے کمرے میں سوتے ہیں۔ رات کو ہم میاں بیوی اپنے کمرے میں معمول کے مطابق سو گئے۔ کوئی پونے ایک بجے سوئے تھے وہ اس وقت ڈھائی بجے تھے جب ایک دھماکہ سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی میری بیوی زیب النساء کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ میں اچھل پڑا۔ کمرے میں مدھم روشنی جل رہی تھی اور زیب النساء فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے مسہری سے چھلانگ لگائی اس کے قریب پہنچ گیا۔ زیب النساء پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں لیکن وہ ہوش میں تھی

اور بار بار انگلی سے کارنس کی طرف اشارہ کررہی تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا بڑی مشکل سے میں اسے اٹھا کر مسہری پر لایا۔ پانی پلایا دلاسے دیئے تو اس کی کیفیت بحال ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ واش روم گئی تھی باہر نکلی تو مدھم روشنی میں اس نے کارنس پر کوئی تحریک دیکھی۔ وہ سمجھی کوئی چوہا کسی طرح اوپر چڑھ گیا مگر پھر اس نے غور سے دیکھا تو وہ مورتی مل رہی تھی جسے میں لایا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مورتی اٹھ کر بیٹھ گئی پھر اس کے باریک پاؤں نیچے لٹکے اور اتنے لمبے ہوئے کہ زمین تک پہنچ گئے اس کے بعد اس نے گھور کر زیب النساء کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے دروازہ کھول اور باہر نکل گئی زیب النساء دہشت سے چیخ کر میری طرف بھاگی اور لباس میں الجھ کر گر پڑی۔ یار میں اسے اس کا وہم سمجھ سکتا تھا مگر دونوں باتیں اس کے بیان کی تصدیق کرتی تھیں۔ مورتی کارنس سے غائب تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا......!''

✦✤✦✤✦

میں یہ اعتراف کرنے میں شرم نہیں محسوس کرتا کہ خود میری بھی سٹی گم ہوگئی تھی۔ ایسے واقعات سے کبھی واسطہ تو نہیں پڑا تھا لیکن دوسروں سے قصے بہت سنے تھے۔ اتنی بھی ہمت نہیں ہوسکی کہ کھلے دروازے سے باہر جا کر دیکھتا۔ زیب النساء نے جو کچھ بتایا تھا، وہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس ہورہا تھا۔ ثبوت کے طور پر کارنس سے مورتی بھی غائب تھی۔ زیب النساء سے تسلی کے الفاظ بھی نہیں کہہ سکا۔ وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی، ساری رات نہ خود سوئی، نہ مجھے سونے دیا۔

صبح کو اس نے کہا۔ ''تم چلے جاؤ گے شاید اور میں خوف سے مرتی رہوں گی۔''

''کام ضروری ہیں ورنہ میں نہ جاتا۔ تم ہمت رکھو۔ وہ جو کچھ بھی تھا، چلا گیا۔ اب خوف بیکار ہے۔''

''بچے اسکول چلے جائیں گے، میں تنہا رہوں گی۔'' بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھایا بجھایا اور پھر جیپ لے کر چل پڑا۔ سائٹ پر پہنچا تو وہاں دوسری مصیبت انتظار کررہی تھی۔ مزدوروں نے کام نہیں شروع کیا تھا بلکہ وہ باغ سے بہت فاصلے پر بیٹھے میرا انتظار کررہے تھے۔ حالانکہ عام حالات میں وہ کام شروع کردیتے تھے۔ سب میرے گرد جمع ہوگئے۔

''کیا بات ہے......؟''

''ہم یہاں کام نہیں کریں گے ٹھیکیدار! یہ بھوت باغ ہے، ہمارا ایک آدمی زخمی ہوگیا۔''

''کیسے......؟'' میں نے پوچھا اور مزدور مجھے تفصیل بتانے لگے۔ یہاں کام کرنے والے مزدوروں نے اپنے لیے ایک گوشے میں آرام گاہ بنا رکھی تھی۔ پہلے کسی نے ایک مزدور کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کس نے کیا۔ ابھی دوسرے مزدور اس پر حیرت کررہے تھے کہ ایک اور مزدور کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنا لباس اتار پھینکا اور بھیانک آواز میں چیخ چیخ کر گانا شروع کردیا۔ وہ ناچ بھی رہا تھا۔

''صاحب! میں اپنے بچوں کی قسم کھاتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ منجو کی زبان کوئی آٹھ انچ باہر نکل آئی تھی اور آنکھیں اتنی تیز روشنی دے رہی تھیں کہ اس روشنی میں آس پاس دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ ناچتا رہا اور پھر ہماری وہاں رکنے کی ہمت نہیں پڑی۔ منجو وہیں رکا رہا اور ہم سب وہاں سے بھاگ آئے۔ صبح کو وہ زخمی حالت میں واپس آگیا۔ اس نے کہا کہ یہاں کام بند کردو ورنہ سب مارے جاؤ گے۔ ہم کام نہیں کریں گے ٹھیکیدار! ہمارا حساب کردو۔'' میں نے مزدوروں کو سمجھایا۔ ان سے کہا کہ وہ بیشک کچھ دن کے لیے کام بند کردیں مگر وہ نہ رکے اور کام بند کرنا پڑا۔ میرا ہزاروں روپے کا سامان وہاں پڑا تھا، ہزاروں خرچ ہوچکے تھے۔ بڑا پریشان ہوگیا میں! پھر یہ سوچا کہ شہر سے مزدور لے کر آؤں گا۔ کام تو شروع کرانا ہی ہے۔ جو بن پڑا، کیا اور پھر زیب النساء کے خیال سے واپس چل پڑا۔ دھڑکتے دل سے گھر میں داخل ہوا۔ دل بری طرح پریشان تھا مگر زیب النساء کو پرسکون دیکھ کر اطمینان ہوا۔ بچوں کے بارے میں پوچھا تو زیب النساء نے بتایا کہ اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر سوگئے ہیں۔

''تم ٹھیک ہو......؟''

"ہاں......!"

"کھانا پکایا ہے؟"

"ہاں!" اس نے کہا۔ عجیب ٹھہرا ٹھہرا لہجہ تھا۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف بول رہی تھی۔ ہمارے درمیان بہت محبت ہے، ایک دوسرے کے مزاج سے آشنائی رکھتے ہیں۔ اس نے میری واپسی کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ بہت عجیب سا لگا۔ وہ کھانا لینے چلی گئی تھی۔ پھر وہ ٹرے لیے اندر داخل ہوگئی۔ ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی، واپس مڑی اور دروازہ بند کر دیا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آنے والا عمل تھا۔ میں نے گردن جھٹکی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ سالن کی قاب سے ڈھکن اٹھایا تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ بہت سی مردہ چھپکلیاں پیلے رنگ کے بدنما شوربے میں تیر رہی تھیں۔ میں نے بے اختیار چیختے ہوئے قاب اٹھا کر پھینک دی۔ پھر وحشت زدہ نظروں سے زیب النساء کو دیکھا اور میرا سانس بند ہونے لگا۔ وہ سیدھی کھڑی تھی۔ اس کے دانت ایک ایک انچ لمبے ہوگئے تھے، آنکھوں کا رنگ سرخ تھا اور ان کی پتلیاں غائب ہو چکی تھیں۔ سر کے بال اس طرح بار بار سیدھے ہو رہے تھے جیسے سانپ کلبلا رہے ہوں۔ اس کی یہ ہیبت ناک صورت دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ اٹھا، اعصاب بے جان ہوگئے۔ بولنے کی کوشش کی مگر آواز نہیں نکلی۔ دہشت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ دیر مجھے گھورا پھر زمین پر پڑی چھپکلیوں کو دیکھنے لگی۔ پھر آگے بڑھ کر ان کے قریب بیٹھ گئی اور الٹی ہوئی قاب سیدھی کر کے چھپکلیاں چن چن کر اس میں رکھنے لگی۔ میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر میں نے محسوس کیا جیسے وہ اونگھ رہی ہے۔ بار بار اس کے سر کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ وہیں فرش پر سیدھی سیدھی لیٹ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہوگئی ہو۔ اس کے چہرے میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں اور وہ اپنی اصلی صورت میں واپس آ گئی تھی۔ میرے اعصاب بھی آہستہ آہستہ سنبھلنے لگے اور میں اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ اسے چھوڑ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری بیوی تھی، میرے بچوں کی ماں تھی۔ صرف اپنی ہی زندگی بچانا تو مقصود نہیں تھا۔ وہ جس عذاب میں گرفتار ہوئی تھی، اسے بھی دیکھنا تھا۔ قریب پہنچا۔ اب اس کی صورت بالکل ٹھیک ہوگئی تھی، سانس چل رہی تھی اور اطراف میں پڑی ہوئی مردہ چھپکلیاں بڑا گھناؤنا منظر پیش کر رہی تھیں لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور زیب النساء کی گردن اور پاؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن مجھے پسینہ آگیا۔ حالانکہ وہ ایک نرم و نازک جسم کی مالک، پھول جیسے وزن والی عورت تھی لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن ٹھوس پتھر سے تراشا گیا ہو۔ میں اسے جنبش بھی نہ دے پایا۔ میری دہشت اور خوف انتہا کو پہنچا ہوا تھا کہ دفعتاً ہی زیب النساء نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا جسم اس کے جسم سے بالکل قریب تھا اور میرا چہرہ اس کے چہرے کے سامنے! جونہی اس کی آنکھیں کھلیں، ہونٹ بھی اوپر اٹھ گئے اور لمبے لمبے دانت باہر جھانکنے لگے۔ اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی اور میں نے بندر کی طرح الٹی چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد میرا اس کمرے میں رکنا ممکن نہ رہا۔ ساری محبت، سارے جذبات اپنی جگہ لیکن جو منظر تھا، وہ ایسا ہولناک تھا کہ میں ہی کیا، کوئی بھی ہوتا وہاں نہ ٹک سکتا تھا۔ دوڑتا ہوا بچوں کے کمرے میں آیا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اس کے بعد دروازہ ہی اندر سے بند کر لیا تھا۔ میرا دل سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ جو بپتا مجھ پر پڑی تھی، وہ ایسی تھی کہ حال خراب سے خراب تر ہوگیا تھا۔ بچوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کے جسموں پر ہاتھ رکھے اور یہ سوچنے لگا کہ یہ کیا مصیبت آگئی اور اب اس مصیبت سے چھٹکارہ کیسے ممکن ہے۔ یہ ساری باتیں، یہ ساری کہانیاں، جن بھوت، کالے علم، سفلی علوم! ان کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن گزری پہلی ہی بار تھی حالانکہ اس آسیب زدہ باغ کی کہانیاں مجھے سنائی گئی تھیں لیکن میں نے تو شاید سنجیدگی سے کوئی بات سنی ہی نہیں تھی اور اب یہ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ بہت خوفناک تھا یہ سب! چلیں ٹھیک جہنم میں جائے۔ جو رقم پھنس گئی ہے، وہ بھی غرق ہو جائے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں ہوتا لیکن میرا گھر، میری بیوی، میرے بچے اس مصیبت سے کیسے چھٹکارہ حاصل کیا جائے۔ قرب و جوار میں لوگ رہتے تھے۔ اگر کسی کو صورتحال بتاتا تو پتا نہیں لوگوں پر کیا اثرات ہوتے۔ تاہم کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ بڑی مشکل سے ہمت کی۔ سوتے ہوئے بچوں کو جگایا، ساتھ لیا اور کمرے سے باہر

نکل آیا لیکن سامنے ہی زیب النساء نظر آ گئی۔ عجیب اداس اداس سی کھڑی تھی۔ بالکل مناسب حالت میں، مناسب کیفیت میں۔ میں نے خوف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس نے بوجھل لہجے میں بچوں کے نام لے کر انہیں پکارا اور دونوں بچے اس کے پاس پہنچ گئے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور تعجب سے بولی۔ ''آپ......آپ کب آئے، آ گئے آپ......؟''

''ہیں...... ہاں......!'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اس کے پوچھنے کے انداز میں بالکل مصنوعی پن نہیں تھا۔ صورتحال پر غور کرنے لگا۔ زیب النساء بچوں کے ساتھ میرے قریب آ گئی اور بولی۔ ''خیریت تو ہے؟ رنگ پیلا پڑ رہا ہے آپ کا......کیا ہو گیا تھا آپ کو......؟ کیا بات ہے، جلدی کیسے آ گئے۔''

''تمہاری وجہ سے زیب النساء! تمہاری وجہ سے۔ تم کہاں تھی اور کیا کر رہی تھیں؟''

''بس! دوپہر کا کھانا کھایا، بچوں کو سلایا اور خود بھی اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ گہری نیند آ گئی تھی۔ کچھ آوازیں سنیں تو آنکھ کھل گئی۔ باہر آ کر دیکھا تو آپ تھے۔''

''ہوں...... ہاں......! میں جلدی آ گیا'' میں نے نجانے کس طرح اپنے دل و دماغ پر قابو پا کر کہا۔ جو کچھ مجھ پر بیت چکی تھی، وہ تو ایک الگ کہانی تھی لیکن اگر زیب النساء کو ساری کہانی سنا دیتا تو اس کا تو خوف کے مارے دم ہی نکل جاتا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے، وہ اس کے علم میں بالکل نہیں ہے۔ خاموشی ہی مناسب سمجھی۔ بعد میں زیب النساء کی کیفیت خاصی بہتر رہی اور اس طرح رات ہو گئی۔ بچوں کو آج ہم نے اپنے کمرے میں ہی سلا لیا تھا۔ زیب النساء نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا۔

بس یونہی! پچھلی رات والے واقعہ سے میں بھی کافی متاثر ہو گیا ہوں۔ ویسے جو کام میں کر رہا ہوں، وہ بھی کچھ دن کے لئے رک گیا ہے۔ میرا خیال ہے اب چند روز تک میں جاؤں گا نہیں۔'' زیب النساء میری مزاج شناس تھی۔ بیوی تھی، طویل عرصے کی رفاقت تھی۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔''

''نہیں......کوئی خاص بات نہیں ہے زیب النساء! بس رات کے واقعہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ آخر وہ سب کیا تھا۔ اس کے بعد تمہیں تو کوئی احساس نہیں ہوا؟''

''نہیں! کوئی خاص بات نہیں لیکن بس دماغ گم گم سا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے دن بھر جیسے پورے وجود پر کوئی بوجھ طاری رہا ہے۔ ایسا انوکھا بوجھ جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکتی۔''

میں اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا تھا لیکن دل میں ہزاروں وسوسے جنم لے رہے تھے۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مصیبت باقاعدہ مجھ سے منسلک ہو گئی ہے اور چونکہ ان واقعات کا اس سے پہلے کوئی اندازہ نہیں تھا اس لیے یہ بھی نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ ان سے چھٹکارہ کیسے حاصل ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے لیکن ذہن پر جو بوجھ طاری تھا، وہ سونے میں رکاوٹ بن رہا تھا جبکہ تھوڑی دیر کے بعد زیب النساء سو گئی تھی۔ بچے پہلے ہی گہری نیند سو رہے تھے۔ میں پریشانی کے عالم میں بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ ٹھیکے کا مسئلہ بھی درمیان میں تھا۔ جو وعدہ کیا تھا اس فارم ہاؤس کو مکمل کرنے کا، اس میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ شہر سے مزدوروں کو تلاش کرنا اور وہاں تک لانا اور پھر اس کے بعد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ شہری مزدور بھی فرار ہو جائیں۔ کیا کروں؟ کیا ٹھیکہ کینسل کر دوں لیکن ساٹھ، ستر ہزار روپے نقصان اٹھانا پڑے گا اور بھی بہت سے ایسے معاملات تھے جو اس ٹھیکے کو کینسل کرنے کی وجہ سے پیدا ہو سکتے تھے۔ انہی سوچوں میں گم تھا۔ رات کے تقریباً سوا دو بجے تھے۔ زیب النساء کو میں نے گہری نیند سوتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اچانک ہی میں چونک پڑا۔ وہ اس طرح اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے کسی نے اسے مشینی انداز میں اٹھا دیا ہو۔ منہ کھول کر اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے دونوں ہاتھ سیدھے کئے، اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور جس چیز نے میری زبان بند کر دی، وہ اس کا چہرہ تھا جو انگارے کی طرح روشن ہو کر چمکنے لگا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، سر کے بال چھتری کی مانند کھڑے ہو گئے تھے۔ وہی کلبلاتے بال جیسے کچھ سانپ لہرا رہے

ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ ہاتھ سیدھے کئے ہوئے دروازے کی جانب بڑھنے لگی اور پھر میرے خوف میں اس وقت مزید اضافہ ہوگیا جب میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ ہلائے بغیر دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی ہے یا پھر دروازہ جو اندر سے بند تھا، خود بخود کھل گیا۔

زیب النساء رات کی تاریکی میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میرا بدن کانپنے لگا، پورا جسم پسینے سے تر ہوگیا تھا۔ اعصاب کہہ رہے تھے کہ ہوش وحواس سے عاری ہوجاؤں، گہری نیند سو جاؤں تاکہ اس خوف سے نجات مل جائے لیکن بیوی تھی، آخر میرے بچوں کی ماں! پورا مستقبل میرے سامنے تھا۔ نجانے کونسی قوت نے مجھے بھی اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ جھانک کر باہر دیکھا۔ زیب النساء آگے جارہی تھی۔ میرے مکان کا احاطہ بہت وسیع ہے اور اس کا آخری گوشہ کافی فاصلے پر ہے۔ آخری گوشے پر بھی میں نے ایک کمرہ بنا رکھا تھا جس میں کاٹھ کباڑ بھرا رہتا تھا۔ یہ کاٹھ کباڑ عموماً کنسٹرکشن کے سامان سے تعلق رکھتا تھا۔ زیب النساء کا رخ اسی کمرے کی جانب تھا۔ کمرے کے بالکل قریب ایک بڑ کا درخت تھا جس کا سایہ پورے کمرے پر رہتا تھا۔ زیب النساء بڑ کے اس درخت کے قریب پہنچ گئی اور پھر میں نے اسے درخت کی جڑ میں کچھ ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ جاؤں چنانچہ احاطے کی دیوار کا سہارا لیتا ہوا بالکل بلی جیسے قدموں سے چل کر اتنے قریب پہنچ گیا کہ وہاں سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے سکوں۔ وہ اسی طرح زمین کھود رہی تھی جیسے بلی اپنے پنجوں سے زمین کھودتی ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ دیر کے بعد میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی شے دیکھی۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ویسے بھی سامنے کے حصے پر ہمیشہ ایک بلب تو [illegible] روشن رہتا تھا۔ یہی میری ہمیشہ کی عادت تھی۔ ان دونوں روشنیوں میں نے جو منظر دیکھا، وہ اس کی حرکت بند کردینے کے لیے کافی تھا۔ بعد میں اس مورتی کو میں کیسے نہ پہچانتا جسے میں خود مصیبت بنا کر اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ یہ وہی مورتی تھی جو کارنس سے غائب ہوئی تھی۔ زیب النساء نے اسے درخت کی جڑ میں ایک اونچی جگہ پر رکھا پھر تقریباً چار فٹ پیچھے ہٹی اور گھٹنوں کے بل ہاتھ اسی طرح سیدھے کئے ہوئے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس نے ایک عجیب وغریب عمل شروع کردیا۔ سامنے کے ہاتھ اس نے زمین پر لگائے اور خود اس کے ساتھ جھکتی چلی گئی۔ پھر سیدھی ہوئی اور پیچھے کی سمت جسم کو موڑنے لگی۔

اس کے بعد اسی انداز میں اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ وہ ہاتھ سیدھے کرکے سر نیچے جھکا کر زمین سے لگاتی اور پھر اسی طرح پیچھے ہوکر اپنا سر عقب میں زمین پر لگاتی۔ میں اسے اس عالم میں دیکھتا رہا۔ دل رو رہا تھا لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

زیب النساء کے اس انداز میں جنبش کرنے کی رفتار تیز ہونے لگی اور پھر اتنی تیز ہوئی کہ اس پر نگاہیں جمانا مشکل ہوگیا۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہورہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی۔ اس انداز میں جنبش کرنے سے اس کی ہڈیوں کی جو کیفیت ہوسکتی تھی، مجھے اس کا احساس تھا۔ فطرتاً نازک طبع تھی لیکن اس وقت، اس وقت......! اس وقت میں دونوں ہاتھ دل پر رکھے اسے دیکھتا رہا اور میری آنکھوں میں نمی پیدا ہوگئی۔ بڑے پریشان کن حالات تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک زیب النساء وہی عمل دہراتی رہی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کی رفتار مناسب ہوگئی۔ میں نے اسے مورتی کو اٹھا کر واپس اس کی جگہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ اس کام سے فارغ ہوکر غالباً واپس پلٹی تو میں جلدی سے دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔ دل کی جو کیفیت ہورہی تھی، اس کا اندازہ بس خدا ہی کو تھا۔ کسی سے کیا کہہ سکتا تھا۔ بستر پر آکر لیٹ گیا مگر جسم جیسے ہوا میں اڑا جارہا تھا، دماغ قابو میں نہیں تھا۔ آہ......! کیا ہوگیا، یہ کیا ہوگیا زیب النساء کو، کچھ بتانا بیکار ہی تھا۔ وہ جس کیفیت میں تھی، اس سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ایسے عالم میں وہ اپنے ہوش وحواس سے عاری ہوتی ہے لیکن دوسرے دن میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کردیا۔ اس طرح تو وہ ہلاک ہوجائے گی اور میرے بچے ماں سے محروم ہوجائیں گے۔ کیا کروں، کسی سے کوئی مشورہ کروں، واقعات چونکہ ایسے انوکھے تھے کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے بلکہ بعض اوقات تو الزام لگانے سے بھی

نہیں چوکتے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میری بیوی مجھے ناپسند کرتی ہے اور اس نے یہ کھیل مجھ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شروع کیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں! بھلا کہنے والی زبان کو کون روک سکتا ہے۔ سانسی کے بہت سے علاقوں میں، میں نے ایسے بورڈ دیکھے تھے جن پر جادو ٹونوں اور سفلی علم کا توڑ کرنے کے دعوے تحریر تھے۔ ظاہر ہے میری معلومات اس سے زیادہ تو تھی نہیں چنانچہ میں نے ایسے لوگوں سے رجوع کرلیا۔ ایک صاحب ملے۔ کوئی سنیاسی باوا تھے جن کا تجربہ ستر سال تھا اور عمر چالیس سال......! بہرحال جو کچھ بھی تھا، انہی سے رجوع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھ سے کچھ رقم طلب کی اور یہ دیکھا کہ میرا مسئلہ کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک تجربہ کیا اور اس تجربے نے مجھے کافی متاثر کیا۔ پھر میں نے ساری صورتحال سنیاسی باوا کو بتائی اور انہوں نے اپنا حساب کتاب بنا کر بل میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ بل کی مجھے پروا نہیں تھی۔ میں نے ان سے یہ کہا کہ اگر وہ میری بیوی کو بالکل ٹھیک کردیں اور اسے مصیبت سے نکال دیں تو میں انہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔ سنیاسی باوا میرے ساتھ میرے گھر آگئے۔ میں نے انہیں وہ درخت دکھایا جس کی جڑ میں وہ خوفناک مورتی دفن تھی۔ جو پہلے وہاں سے برآمد ہوئی اور اس کے بعد میرے گھر کے کارنس سے غائب ہوگئی۔ سنیاسی باوا نے عمل کے ذریعے اس مورتی کو باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ لکڑی کی ایک چھڑی سے انہوں نے درخت کی جڑ کے گرد ایک دائرہ قائم کردیا اور مجھ سے کچھ چیزیں طلب کرنے کے بعد مجھے واپس کردیا۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ چیزیں دینے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر بند ہوجاؤں اور اپنی بیوی پر نظر رکھوں۔

بچوں کو اسکول بھیج دیا تھا۔ بیوی کو ان صاحب کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔ بس یہ کہہ دیا تھا کہ میرے ایک شناسا ہیں جو کچھ عمل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ سنیاسی باوا نے حکم دیا تھا کہ انہیں ان کے کام میں مداخلت کرکے پریشان نہ کیا جائے۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے پھر ڈھائی گھنٹے گزر گئے اور اس کے بعد میں برداشت نہ کرسکا اور باہر نکل آیا لیکن جیسے ہی صحن میں قدم رکھ کر درخت کی طرف دیکھا، ہوش و حواس رخصت ہوگئے۔ سنیاسی باوا بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور ان کا پورا لباس دھجی دھجی ہو رہا تھا۔ سر کے بال جگہ جگہ سے نچے ہوئے تھے، چہرے اور جسم کے مختلف حصوں میں خون کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ کئی جگہ بری طرح نیل پڑے ہوئے تھے۔ ایک آنکھ رخسار تک بالکل کالی پڑ چکی تھی۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جلدی سے پانی لے کر آیا اور سنیاسی باوا پر انڈیلنے لگا۔ میرے پیچھے ہی پیچھے زیب النساء بھی آگئی تھی۔ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا ہوگیا۔ یہ تو...... یہ تو یوں لگتا ہے جیسے کسی سے لڑائی ہوگئی ہے ان کی......؟"

"ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ آپ کے ہی دوست ہیں نا جو آپ کے ساتھ آئے تھے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"ہاں......!"

"مگر یہ یہاں کر کیا رہے تھے؟"

"خدا جانے......!"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ......! آپ کو یہ معلوم نہیں کہ یہ یہاں درخت کے پاس بیٹھے ہوئے کیا کر رہے تھے؟" زیب النساء حیرت سے بولی۔

میں نے گہری نگاہوں سے زیب النساء کو دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر بالکل سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"آپ مجھے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"نہیں سوچ رہا ہوں کہ یہ واقعی ہوا کیا...... ہوش ہی میں نہیں آرہا یہ تو؟" زیب النساء اور پانی لے آئی اور بمشکل تمام تھپڑ مار مار کر ہم نے سنیاسی باوا کو ہوش دلایا۔ وہ اٹھے، متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ مجھ پر نظر پڑی، میری بیوی کو دیکھا اور اس کے بعد اس بری طرح بھاگے کہ اپنا ایک جوتا بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ دروازے سے ٹکرائے تھے، گرے تھے اور

اٹھ کر پھر اسی طرح بھاگ لیے تھے۔ زیب النساء کو ہنسی آ گئی۔
اس نے کہا۔ ''یہ کوئی تماشا کرنے آئے تھے یہاں......؟''
''پتا نہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ سنیاسی باوا کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، اس نے ان کے ہوش درست کر دیئے ہیں۔ آئے تو تھے رقم کمانے کے لیے لیکن مار کھا کر گئے ہیں۔ بس میرے دوست یہ ہے میری کہانی......! سانس آ گیا ہے اور میں اپنے گھر پہنچنے والا ہوں۔ اس تمام مصیبت کو مجھ پر نازل ہوئے خاصے دن گزر گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے رجوع کر چکا ہوں، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا کروں۔ جس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں، میں جانتا ہوں اور جی جانتا ہے۔ وہاں باغ پر چند لوگوں کو اس سامان کی نگرانی پر رکھا ہوا ہے جو کافی قیمتی ہے اور وہاں موجود ہے۔ شمسو میرا ملازم ہے۔ ذہنی طور پر بالکل غیر حاضر رہتا ہوں۔ کبھی کبھی وہاں چلا جاتا ہوں۔ کالے جادو کے ماہروں، مولویوں اور عالموں کے لیے نجانے کہاں کہاں چکر لگا چکا ہوں۔ کیفیت وہی ہے۔ وہ راتوں کو اٹھتی ہے، درخت کی جڑ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور عمل کرتی ہے۔ اب تو بچے بھی اس سے خوف زدہ رہنے لگے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر یہ کیفیت زیادہ عرصے تک رہی تو کہیں بچوں کو کچھ نہ ہو جائے۔ جہاں تک تمہاری ملازمت کا تعلق ہے، یقین کرو میں خلوص دل سے تمہیں اپنے گھر رکھنے کے لیے تیار ہوں۔ جو مانگو گے دے دیا کروں گا، بچوں کا خیال رکھنا ہوگا، گھر کی چھوٹی موٹی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں گی لیکن اول تو راستہ بھی کاٹنا تھا۔ پھر تم نے مجھ سے خود ملازمت کی فرمائش کی ہے۔ چنانچہ تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ یہ نہ کہو کہ میں نے تمہیں دھوکے میں رکھا لیکن اس صورتحال میں فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم اس گھر میں ملازمت کر سکو گے یا نہیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور کہا۔ ''اگر آپ واقعی مجھے ملازم رکھنا چاہتے ہیں تو میں خلوص دل سے آپ کے گھر ہر طرح کی خدمت سرانجام دینے کے لیے حاضر ہوں۔'' شاہد علی نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا، دیکھتا رہا پھر ایک دم ہنس پڑا۔ دیر تک ہنستا رہا۔ جیپ آبادی میں داخل ہو گئی تھی۔
میں نے اس سے کہا۔ ''آپ ہنس کیوں رہے ہیں شاہد صاحب! مجھے بتایئے؟''
''بس ہنس رہا ہوں یار! کسی بات پر، میرا خیال ہے تم نے میری کہانی کو صرف کہانی سمجھا ہے اور مجھے ایک کہانی گو، لیکن مجھے وہ سنیاسی باوا یاد آ رہے ہیں جن کا تجربہ ستر سالہ تھا اور عمر چالیس سال! لیکن اس ستر سالہ تجربے نے انہیں بڑی مار کھلوائی۔ اگر تم بھی کسی کہانی کو غلط سمجھ رہے ہو تو دیکھو سب کچھ تمہارے اپنے حساب میں ہوگا مجھ پر دھوکا دہی کا الزام مت لگانا۔''
''آپ مطمئن رہیں شاہد صاحب! ایسا بالکل نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا اور اس نے عجیب سے انداز میں گردن اور شانے ہلائے۔ پھر بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میرے لیے تو اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک ایسا شخص وہاں میرے ساتھ موجود ہو جو ان تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد جیپ ایک وسیع و عریض احاطے والے مکان کے سامنے کے حصے میں رک گئی۔ دروازہ عام مکانوں جیسا تھا لیکن اس کے پیچھے بڑا وسیع احاطہ تھا۔ جیپ کو کھڑا کر دیا گیا اور اس کے بعد شاہد علی مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دستک دینے پر دروازہ زیب النساء نے ہی کھولا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ نرم اور دلکش خدوخال کی مالک خاتون تھیں۔ چہرہ بالکل زرد پڑ رہا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے چھائے ہوئے تھے، لباس بھی سلیقے سے پہنا ہوا تھا، سر پر دوپٹہ بھی اوڑھے ہوئے تھیں۔ مجھے دیکھ کر جھجکیں تو شاہد علی نے کہا۔
''نہیں زیب النساء ان سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا تعارف اندر چل کر کراؤں گا۔ آؤ مسعود اندر آ جاؤ۔'' میں خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ زیب النساء چند قدم آگے چل رہی تھی۔ احاطہ عبور کر کے ہم سامنے والے چھوٹے سے برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں چارپائیاں اور مونڈھے بچھے ہوئے تھے۔
شاہد علی نے کہا۔ ''آؤ ابھی یہیں بیٹھتے ہیں۔ بھئی زیب النساء آج تو تم ہمارے مہمان کی خاطر کرو پھر ہمارے یہ مہمان

تمہاری خدمت کریں گے۔'' بات پتا نہیں زیب النساء کی سمجھ میں آئی تھی یا نہیں لیکن وہ خاموشی سے اندر چلی گئی اور میں نے شاہد علی کی طرف دیکھا۔

''اب سے چند روز پہلے اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ چہرہ گلاب کی مانند کھلا ہوا رہتا تھا لیکن جو کچھ ہوگیا ہے، بس کیا بتاؤں۔ دیکھو مسعود! ایک بار پھر کھلے دل سے کہہ رہا ہوں کہ تمہاری یہاں آمد میرے لیے بہت ہی خوشی کا باعث ہے لیکن ان حالات کی ذمہ داری تمہیں خود قبول کرنا ہوگی۔ وہ دیکھو سامنے وہ کاٹھ کباڑ والا کمرہ ہے اور اس کے برابر جو درخت نظر آرہا ہے، اس کی جڑ میں وہ مورتی پوشیدہ ہے۔''

میں نے گردن ہلائی، کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر کے بعد زیب النساء چائے اور اس کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ لے کر آگئی تھی اور میں شاہد علی کے ساتھ چائے پینے میں مصروف ہوگیا تھا۔ شاہد علی باہمت انسان تھا۔ جن حالات سے گزرا تھا۔ وہ سخت پریشان کن تھے۔ اس کے باوجود وہ ہنس بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس دوران اسے کتنے دلچسپ تجربات ہوئے ہیں۔ جن بھوت اتارنے والے، سفلی عمل کا توڑ کرنے والے اور نہ جانے کون کون سے اور انہوں نے نہ جانے کیا کیا کیا۔ اس نے مجھ سے بھی چند باتیں پوچھیں اور میں نے محتاط جواب دے دیئے۔ اس کے بچے بھی ملے۔ پھول جیسے تھے مگر سہمے سہمے...... رات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ گھر کے عقبی حصے میں ایک کمرہ ہے جسے میرے لیے درست کردیا جائے گا۔ آج رات اندر کسی بھی کمرے میں گزارہ کرلوں۔

''اگر میں یہیں، اسی برآمدے میں سو جاؤں تو کوئی حرج ہے؟ یہاں یہ چارپائی موجود ہے۔''

''یہاں برآمدے میں......؟''

''ہاں......!''

''بالکل حرج نہیں ہے مگر تمہیں الجھن نہیں ہوگی۔'' وہ لفظ خوف استعمال نہیں کرسکا تھا۔

''نہیں! میں یہاں خوش رہوں گا۔''

''تمہاری مرضی ہے۔ مجھے تو اور ڈھارس ہوجائے گی۔'' چارپائی پر دری، چادر بچھادی گئی۔ تکیہ رکھ دیا گیا۔ اس دوران کئی بار زیب النساء سامنے آئی تھی۔ ایک پاکیزہ چہرہ تھا اور آنکھوں میں شرافت اور حیا نظر آتی تھی۔ کوئی جنبش مشکوک نہیں تھی۔

رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں پھر شاہد علی اندر چلا گیا اور میں چارپائی پر دراز ہوگیا۔ مکمل خاموشی چھاگئی۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نہ جانے کیا کیا خیالات دل میں آتے رہے کہ جانے کتنی رات ہوگئی۔ پھر اچانک میں چونک پڑا۔ اندر کا بند دروازہ کھلا اور میں نے زیب النساء کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ چہرہ الاؤ کی طرح دہک رہا تھا، زبان باہر نکلی ہوئی تھی، چلنے کا انداز بے حد بھیانک تھا۔ میری طرف رخ کیے بغیر وہ آگے بڑھ گئی۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ دروازے سے کوئی اور باہر نکلا۔ شاہد علی کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے لمحے وہ میری طرف لپکا اور میرے پاس آگیا۔ بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن آواز ہچکیوں کی شکل میں نکل رہی تھی۔

''حوصلہ رکھو...... حوصلہ رکھو۔ بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ وہ انگلی سے زیب النساء کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ مجھے اس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

''ہاں! میں نے دیکھ لیا ہے۔ تم آرام سے بیٹھو، میں اسے قریب سے دیکھتا ہوں۔'' میں وہاں سے آگے بڑھا۔ اس وقت دل میں کوئی احساس، کوئی خیال نہیں تھا بس ہمت تھی۔ احاطہ طے کرکے زیب النساء کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ زمین کھود رہی تھی۔ پھر اس نے مورتی نکال لی، اسے سامنے رکھا اور اس کے سامنے دوزانو ہوگئی۔ میں نے اس مورتی کا حجم بڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ایک انسانی جسم کے برابر ہوگئی مگر اس کی نگاہ مجھ پر تھی۔ ایک نہایت مکروہ شکل ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''یہ کسے ساتھ لے آئی ہے تو......؟'' زیب النساء نے گردن گھمائی، میں کھڑا تھا مگر وہ حواس میں کہاں تھی۔ ''کا ہے آیا ہے مورکھ! موت گھیرن لاگے رہے گا۔''

''کون ہے تو......؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''اٹھ ری ہمارے سامنے سے! ہم ای کا بتائیں کہ ہم کون ہیں۔ سسر والونا چماری کے کنٹھ کونا جانے۔ اٹھ جرا ای کا بتائی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زیب النساء سامنے سے سرک گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر سامنے کیا اور دفعتاً اس کی انگلیاں لمبی ہونے لگیں۔ لمبی اور لچکدار......! ان کے سرے سانپوں کے منہ بن گئے جن کی زبانیں لہرا رہی تھیں۔ یہ لمبے سانپ میری طرف بڑھ رہے تھے مگر پھر اچانک اس کے حلق سے چیخ کی سی آواز نکلی، انگلیاں غائب ہوگئیں۔ اس کا بازو کندھے کے پاس سے کٹ گیا تھا اور اس سے خون کا فوارہ بلند ہوگیا تھا۔ اس نے حیرت سے اپنے بازو کو دیکھا۔ پھر قہقہہ لگا کر بولا۔ ''تو ای بات رہے۔ ٹھیک ہے رہے۔ بات مکابلے کی رہے تو مکابلہ ہوئی ہے پر تیری بیڑ کا رہے ہمکا بتائی دے؟''

مجھے علم نہیں تھا کہ اس کا بازو کیسے کٹا لیکن اپنے قرب و جوار میں بے شمار سرسراہٹیں میں بخوبی سن رہا تھا اور ان کے بارے میں اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ وہ کون ہیں۔ میرے ایک سو اکہتر بیر۔ البتہ شاید وہ بدروح ان کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ کٹے ہوئے بازو پر رکھا اور خون کی سیاہ دھار بند ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے دوسرا بازو برآمد ہوگیا۔ اس نے دونوں بازوؤں کو جنبش دی اور انہیں عجیب انداز میں لہرانے لگا۔ دفعتاً فضا میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ بلند ہوئی اور پھر لاتعداد پرندے غوطہ لگا کر میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی چونچیں لمبی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے نوچ کر پھینک دیتے لیکن چٹ چٹ، پٹ پٹ کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور وہ فضا میں پھٹنے لگے۔ ان کے خون کے چھینٹوں سے زمین کا یہ حصہ میں اور زیب النساء سرخ ہوگئے۔ پرندے گھبرا کر اونچے اٹھنے لگے اور لونا چماری کے خادم نے غرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

''بھیروں......!'' اسی وقت میرے سامنے زمین پر سیاہ رنگ کا ایک ریچھ جیسا انسان برآمد ہوگیا۔ اس کا چہرہ گول اور بہت خوفناک تھا۔ شکل کسی بن مانس سے ملتی جلتی تھی۔ پہلے وہ چاروں ہاتھ، پاؤں سے چلتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا اور اس کے پیروں سے چہرہ ملنے لگا۔ پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ''ارے دیکھ ای حرام کھور کا۔ کون رہے اے۔''

''پورنا ہے دھیرکٹ پورنا ہے۔ کاہے مرنے جاؤ ہو'' بھیانک ریچھ کے حلق سے انسانی آواز ابھری۔

''ہیں۔ کا۔ ارے کا......؟'' خبیث روح کی آواز بلند ہوئی۔ اس کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا۔

''کوڑی بیروں کا مقابلہ کردگے دھیرکٹ......؟''

''نارے نا! بھول ہوگئی۔ جے پورن بھگت! ہمیں کا معلوم تھا کہ...... کہ......! اری اٹھ انجائی کھڑی ہوجا۔ اری اٹھ!'' یہ الفاظ اس نے زیب النساء سے کہے تھے۔

زیب النساء کھڑی ہوگئی۔ ''ہم جات ہیں پورنا! اب کبھو نہ آئی ہے رے۔ ہمکا پتا نہ رہے جات ہے پورنا!'' وہ جھکا اور سجدے کی سی کیفیت میں آگیا۔ پھر اس کا اور اس کے طلب کئے ہوئے بھیروں کا بدن وہیں تحلیل ہوگیا۔ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ جو کچھ کیا تھا، بھوریا چرن کے بیروں نے کیا تھا۔ البتہ کام ہوگیا تھا۔ میں نے زیب النساء سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے پلٹ پڑا۔ مگر یہاں ایک اور مشکل انتظار کر رہی تھی۔ شاہد علی صاحب نے یقیناً یہ مناظر دیکھے ہوں گے چنانچہ اس کے نتیجے میں وہ اوندھے ہوگئے تھے۔ اس کے پاؤں چارپائی پر تھے اور خود وہ زمین پر لٹک رہے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں سیدھا کیا۔ پیچھے پیچھے زیب النساء وہاں آگئی۔

''ارے انہیں کیا ہوا......؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے شاہد علی کو سیدھا لٹاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ بس! ایسے ہی ٹہلنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ سو گئے ہیں شاید۔''

''اس طرح غافل ہو کر سوتے ہیں۔ جگا دو انہیں، اندر پہنچا دو۔'' وہ حضرت جاگتے تو کیا، بڑی مشکل سے انہیں اندر پہنچایا

گیا۔ میرے باہر نکلنے کے بعد زیب النساء نے دروازہ بند کرلیا تھا۔ میں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نگاہیں اس درخت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جہاں تھوڑی دیر قبل ایک معرکہ ہو چکا تھا مگر میں نے کیا کیا، بلکہ جو کچھ ہوا، میرے نام پر ہوا۔ اس میں بھی بھوریا چرن کا ہاتھ ہے۔ سامنے ہی کچھ نظر آیا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لمبے لمبے ہاتھ، پاؤں والی بھیانک مکڑی تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔ چارپائی کے نزدیک آ کر وہ رکی۔ اگلے ہاتھ اوپر اٹھائے، پچھلے پیروں سے کھڑی ہوگئی۔ پھر اس کا قد بڑھتا چلا گیا۔ آج میں نے ایک خاص بات پر غور کیا۔ بھوریا چرن انسان نما مکڑا تھا۔ صرف اضافی پاؤں اس میں اور مکڑی میں تفریق کرتے تھے ورنہ شکل وصورت، جسمانی ہیئت سب مکڑی جیسی تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑا مجھے گھورتا رہا پھر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

''تجھ سے دو باتیں ہوجائیں۔ بول کرے گا۔''

''کیوں نہیں بھوریا چرن!'' میں نے بے خوفی سے کہا۔

''تیرا ہمارا کیا رشتہ ہے؟''

''نفرت کا۔ نظریات کا۔ دین، دھرم سے اختلاف کا!''

''ہمارا کوئی دین، دھرم کہاں ہے رے۔ ماتا، پتا کا دھرم ہوگا۔ پیدا ہوئے تو نام بھوریا رکھ دیا۔ کسی مسلے کے گھر پیدا ہوتے تو تیرا جیسا کوئی نام ہوتا۔ اصل نام تو ہوش آنے کے بعد ملتا ہے۔''

''وہ کیسے......؟''

''کرموں سے۔ کرم ہی سارے راستے بتاتے ہیں۔ ہم نے گیتا پڑھی، رامائن پڑھی پھر برہمنوں کو دیکھا۔ خوب غور سے دیکھا۔ پنڈت کتھاؤں کا پاٹ کرتے ہیں، نرکھ اور سورگ دکھاتے ہیں۔ اپنے سورگ انہوں نے اپنے گھروں میں بنا رکھے ہیں۔ میں نے ان کے سورگ دیکھے، ان سے سبق لیا۔ جب کرم نرکھ اور سورگ بناتے ہیں تو وہ ایسے کیوں نہ ہوں جن کا نتیجہ فوراً ملے۔ ہمارے لیے مرن یگ اور، اپنے لیے سارا جیون سورگ ہی سورگ! سو ہم نے بھی اپنا سورگ تلاش کرلیا۔ کالا جادو سیکھا۔ جس طرح ایک پتی ہزار پتی بن کر لکھ پتی بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ پھر کروڑ پتی اور ارب پتی بن کر اس کا من چاہتا ہے کہ اب وہ سارے سنسار کا پتی ہو، اسی طرح طاقت کے ہر کھیل میں ہوتا ہے۔ میں نے بھی سارے کھیل کھیلے، شنکھا تک بنا اور پھر کھنڈولا بن کر مہان شکتی حاصل کرنا چاہی مگر دھوکا کھا گیا۔ تجھے پرکھ لینا چاہئے تھا مجھے۔ دیکھ لینا چاہئے تھا کہ تو اندر سے کیا ہے۔ تو اوپر سے تو ٹھیک تھا۔ میرے کام کا تھا مگر اندر سے دوسرا نکلا۔ میں مارا گیا مگر تو آج بھی اتنا ہی باؤلا ہے۔ ارے پاپی! اس سنسار میں صرف طاقت کھیل رہی ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھ! جو شکتی مان ہے، اس نے اپنی سورگ دھرتی پر اتار لی ہے۔ اس میں عیش کر رہا ہے اور تو! اتنی بڑی شکتی لے کر نوکریاں کرتا پھر رہا ہے۔ تو نے دیکھا وہ لونا کا بھیروں تجھے دیکھ کر دم دبا کر بھاگ گیا۔ پورنیوں کے بیروں نے اسے چک گھنی بنا کر بھگا دیا۔ یہ تیری اپنی شکتی ہے۔ ابھی تو تو نے اس کے چمتکار ہی نہیں دیکھے۔ اسے استعمال کرے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ میں نے تیرے لیے بڑا کام کیا ہے کہ اگر تو خود کرتا تو تیرا آدھا جیون لگ جاتا۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے مگر تجھے پکی پکائی مل گئی، اس لیے قدر نہیں کر رہا۔ میں تجھ سے ایک بار پھر بات کرنے آیا ہوں۔''

''وہ کیا بھوریا......؟''

◆✣◆✣◆

''ایک نیا کھیل کھیل لے تو...... تیری آتما شانت ہوجائے گی۔''

''کیا کھیل ہوگا وہ......؟''

''تو پورنا بن گیا ہے، میرے ساتھ رہ کر جاپ کر...... شنکھا میں تجھے بنا دوں گا پھر تو کھنڈولا بن جا۔ جب کھنڈولا بن جائے تو کھنڈولا شکتی مجھے دان کر دینا۔ جیسے میں نے تجھے پورنا شکتی دی۔ میں کھنڈولا بن جاؤں گا تو شنکھا رہ جائے گا۔ میرا چیلا

بن کر ساتھ رہنا۔ ہم دونوں مل کر سنسار کو ٹیڑھا کر دیں گے۔ دیکھ بالکا...... اب تو تیتر ہے، نہ بٹیر۔ اپنے دھرم سے نکالا جا چکا ہے اور پورن لاگ تیرے شریر میں رینگ رہا ہے۔ جب تک یہ پورن لاگ تیرے شریر میں ہے، اپنے دھرم سے تو تیرے سارے ناتے ٹوٹ گئے مگر یہ شکتی ابھی تیری ہے۔ اندر سبھا کی سات پورنیاں تیری داسیاں ہیں۔ باؤلے! وہ سات کنواریاں ہیں جو تیرے ساتھ اپنی سہاگ پوجا کا انتظار کر رہی ہیں۔ تیری اور تک رہی ہیں اور تو انہیں بھول کر اس چارپائی پر پڑا ہوا ہے۔ تجھے ایک آسانی ہے۔''

''وہ کیا......؟''

''ابھی تو مسلمان بنا ہوا ہے، بنا رہ، کوئی حرج نہیں ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو تجھ پر شک نہ ہوگا جس طرح دھرم ہوا کرتا ہے، کرتا رہ، کوئی نہیں سوچے گا تو شنکھا ہے اور جب تو کسی مسلمان لڑکے سے کہے گا کہ وہ تیرا اتنا سا کام کر دے کہ تیرے تِلّے کو کسی مزار تک پہنچا دے تو وہ تجھے مسلمان سمجھ کر انکار نہ کرے گا۔ تو کھنڈولا بن جائے گا اور میں تجھے بتاؤں گا کہ تو اپنی شکتی مجھے کیسے دے سکتا ہے۔''

میں بھوریا چرن کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ''تو قابلِ رحم ہے بھوریا چرن۔''

''کیسے؟''

''تیری زندگی بھی اسی کوشش میں گزر گئی۔''

''ہاں! مجھے بڑا گھاٹا ہوا ہے۔''

''جو تو تیں تجھے حاصل ہیں بھوریا! تو انہی میں خوش کیوں نہیں رہتا۔'' میں نے پوچھا۔

''وجہ ہے اس کی۔''

''کیا؟''

''بتا دوں تجھے؟''

''بتانے میں کوئی حرج ہے؟''

''حرج تو بہت بڑا ہے۔''

''کیا؟''

''تو کھنڈولا شکتی مجھے کبھی نہ دے گا۔''

''کھنڈولا شکتی میرے پاس کہاں ہے، مگر وہ جاپ کبھی نہیں کر سکوں گا کہ میں شنکھا بن جاؤں کیونکہ...... کیونکہ میرا دل ایک مسلمان کا دل ہے۔'' میں نے آہ بھر کر کہا۔

''ہاں! یہیں تو مار کھائی ہے میں نے...... تیرا دل ہی تو قبضے میں نہیں آیا۔ تو اگر تیار ہو جائے تو تیرے سارے جاپ میں کروں تیرے لیے اور تجھے شنکھا شکتی دے دوں۔ مگر اس کے بعد تجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔''

''تو وجہ بتا رہا تھا بھوریا چرن۔''

''دل سے تو مسلمان ہے نا؟''

''ہاں!''

''اپنے دھرم کی سوگند کھا سکتا ہے کہ اگر اس شرط پر تو کھنڈولا بن جائے تو وہ شکتی اپنے قبضے میں نہیں رکھے گا، مجھے دے دے گا!''

''میری قسم پر تو یقین کر لے گا؟''

''ہاں! کر لوں گا۔''

''جب میں اپنے دین ہی سے ہٹ جاؤں گا تو وہ قسم میرے لیے بے معنی ہو جائے گی۔''

''تو باؤلا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو......تو......سن باؤلے! کھنڈولا امر ہوتا ہے۔ وہ اپنا شریر بدل سکتا ہے۔ جب اس کے بدن کی طاقت ختم ہونے لگتی ہے تو وہ اپنی پسند کا کوئی بھی شریر تلاش کرسکتا ہے۔ اپنی آتما اس شریر کو دے کر دوبارہ جی سکتا ہے۔ اس طرح اسے صدیوں کا جیون مل جاتا ہے۔ یہ ہے کھنڈولا شکتی جو نہ شنکھا میں ہے اور نہ کسی اور کالی شکتی میں! تجھے ایک بات اور بتاؤں؟''

''ضرور بتا۔''

''مذاق اڑا رہا ہے میرا......؟''

''نہیں......تو بتا۔''

''پورنا شکتی سے تو اپنے ماتا، پتا کو پا سکتا ہے۔ تیرے بیر تجھے ان کے پاس لے جاسکتے ہیں، انہیں تیرے پاس لا سکتے ہیں مگر......تجھے اس کے لیے ایک کام کرنا ہوگا۔ میں نے تجھے پورنا بناتے ہوئے یہ نکتہ اپنے پاس رکھا تھا۔''

''کیا؟'' میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''پاگل سمجھتا ہے مجھے۔ اس پچ بڑا وقت خرچ کیا ہے میں نے تجھ پر! ایسے ہی میں نے تجھے پورنا بھگت نہیں بنالیا۔ اپنے ماتا، پتا کے سوا سنسار میں کچھ نہیں مانتا۔ اپنوں کی کوئی آرزو تیرے من میں نہیں ہے اور میں نے تیری اس بات پر خاص نگاہ رکھی ہے۔ پورنا شکتی میں یہ تھوڑا میں نے اپنے پاس رکھا ہے۔ بیروں کو بلا کر دیکھ لے۔ ان سے پوچھ لے، سارے کام کردیں گے تیرے، یہ نہ کرپائیں گے۔ اس کے لیے تجھے ایک جاپ کرنا ہوگا اور وہ شکتی تجھے اس سے ملے گی۔''

''وہ جاپ کیا ہے؟''

''بتادوں گا تجھے! بتادوں گا پہلے اور بہت سی باتیں ہیں۔ ویسے سب تیرے کام کی ہیں۔ جاپ تجھے وہ طاقت دے دے گا کہ تو اپنے ماتا، پتا کو اپنے پاس بلالے یا خود ان کے پاس پہنچ جا۔ ان کے سامنے تو مسعود احمد ہی بنے رہنا۔ بہن کی شادی ایسے کرنا جیسے کسی راج کماری کی شادی ہوتی ہے۔ ماتا، پتا کو راج کرادینا۔ سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہوگا اور جب تیرا یہ کام ہوجائے تو پھر تو میرا کام کردینا۔ بول راضی ہے؟''

''وہ جاپ کیا ہوگا؟''

''ایسے نہیں بالک......! پہلے ہاں یا نہ میں جواب دے۔ کہیں تو مٹھی میں آ ہماری، تیری بھی تو کوئی کل رہے ہمارے ہاتھ میں......! اسی کل کو گھماتے رہے ہیں ابھی تک تو نے ہمارے پھیر میں پڑ کر اپنے دھرم کی شکتی حاصل کرلی تھی اور آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ تیرے ماما کا چکر دے کر ہم نے بڑی مشکل سے تیری وہ شکتی توڑی اور تجھ سے تیرے من کی شانتی چھیننے کے لیے تجھے اتنی بڑی شکتی دان کی۔ کچھ تو ہمارے ہاتھ رہنے دے۔''

''اگر تو مجھے یہ بتادے کہ مجھے یہ جاپ کیسے کرنا ہوگا تو میں تجھے جواب دے سکتا ہوں۔''

''بتا بھی دیں تجھے تو اکیلے کچھ نہ کرسکے گا۔ ہماری ضرورت تو رہے گی تجھے! اچھا سن ایک پائل کی کھوپڑی حاصل کرنا ہوگی۔ تجھے اس کھوپڑی پر جاپ کرنا پڑے گا۔''

''پائل کی کھوپڑی......؟''

''ہاں......!''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہ لوگ جو ماں کے پیٹ سے پیروں کے بل پیدا ہوتے ہیں، پائل کہلاتے ہیں۔''

''انسان......؟'' میں نے کہا۔

''تو اور کیا بلی، کتے......'' وہ ہنس پڑا۔

''یہ کھوپڑی مجھے کہاں سے ملے گی؟''

''سنسار میں ہزاروں پائل مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی کھوپڑی کاٹنی ہوگی۔ پائل میں تجھے تلاش کر دوں گا۔''
مجھے چکر آ گیا۔ کسی انسان کا خون! اس کی کھوپڑی کاٹنی ہوگی اور...... اور...... ! ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ اس کے بعد مجھے میرے ماں، باپ ملیں گے۔ بالکل ہی بے دین ہو کر...... ! سخت غصہ آ گیا۔ دیوانوں کی طرح اٹھا اور ایک زوردار لات بھوریا چرن کو رسید کر دی۔ وہ بے خبر بیٹھا تھا، اچھل کر دور جا گرا۔ خاصی چوٹ لگی تھی اسے! میں آگے بڑھا تو وہ اچھل کر سیدھا ہو گیا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر اچانک اس کے گال پھول گئے۔ وہ سانسیں کھینچنے لگا اور اس کے بدن میں غبارے کی طرح ہوا بھرنے لگی۔ اس کی آنکھیں غضبناک ہوتی جا رہی تھیں مگر اس وقت میرے بیر ظاہر ہونے لگے۔ لنگڑے لولے، ٹوٹے پھوٹے...... ! وہ روتے پیٹتے میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان کے بین کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔
''شما کر دے شنکھا! معاف کر دے شنکھا...... ! اسے نقصان نہ پہنچا۔ ہم سب ختم ہو جائیں گے۔ ہم تیری پھلواری ہیں شنکھا...... ! ہمیں نہ اجاڑ۔'' سب دہائی دے رہے تھے، رو پیٹ رہے تھے اور کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔
عجیب منظر تھا۔ بھوریا چرن اپنے بدن میں مسلسل ہوا بھر رہا تھا اور پھولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا قد بھی بلند ہو گیا تھا اور بدن کا پھیلاؤ بے پناہ ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح وہ کیا کرے گا مگر میرے بیروں کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ بُری طرح بے چین تھے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کبھی زمین پر گرتے بھوریا چرن کے پیروں پر سر رگڑتے۔ پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے۔
بھوریا چرن کا حجم اتنا بڑھ چکا تھا کہ اب وہ بہت بڑا گولا نظر آنے لگا تھا۔ کمبخت پھٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔ دفعتاً میرے سارے بیر دھاڑتے ہوئے مجھ پر آ گرے۔ اتنی بڑی تعداد تھی کہ میں ان کے نیچے دب کر رہ گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا ان کے جسموں سے سخت سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ میں انہیں پرے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پوری فوج نے حملہ کیا تھا۔ انہیں ہٹانا ممکن نہیں ہوا اور میرے حواس جواب دینے لگے۔ خاص طور سے ان کے جسموں سے اُٹھنے والی بدبو نے مجھ سے ہوش چھین لیے تھے۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی۔ اندر کا دروازہ بند تھا۔ اسی جگہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اُٹھا۔ پورا بدن دُکھ رہا تھا۔ رات کے سارے واقعات یاد آ گئے پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ مردود کہاں گیا۔ بڑا عجیب لالچ دیا تھا اس نے۔ بڑی مشکل سے چلتا ہوا چارپائی تک آیا اور بیٹھ گیا۔ بھوریا چرن کی ساری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کیسا انوکھا تصور تھا۔ کمبخت دائمی زندگی چاہتا تھا۔ ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ کم از کم میرا دل تو نہیں تسلیم کرتا تھا۔ موت اور زندگی تو صرف ایک ہی طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے انسان کو بہت کچھ دے دیا ہے اور اسی بہت کچھ نے انسان کو حقیقتوں سے بہت دُور کر دیا ہے۔ کالا جادو ہو، پیلا جادو ہو یا سائنس کا جادو، ٹھیک ہے اس سے کچھ بھی کر لو مگر نمود، اور موت، یہ اس نے اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں۔ جسے بھیجا جائے وہی آتا ہے اور جسے بلایا جائے اسے جانا پڑتا ہے۔ اگر دائمی زندگی ممکن ہوتی تو یہ افراسیاب اور سامری بھی سوئٹزرلینڈ یا سنگاپور میں عیش کر رہے ہوتے یا ان جیسے دُوسرے نمرود، شداد اور فرعون بھی۔ مگر سب غائب ہو گئے۔ جدید سائنس ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیش کرتی ہے۔ سائنس سے تو بہت کچھ ملا ہے۔ مگر دینے والے ہاتھ کوئی اور ہی ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ دربار خواجہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے ایک سوالی بیٹھا نعرے لگا رہا تھا۔ خواجہ دس ہزار چاہئیں۔ خواجہ دس ہزار ہی لوں گا۔ ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔ دس ہزار دے دے خواجہ...... ! ایک دولت مند آدمی نے اس سوالی کو دیکھا، سنا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ واپسی میں اس نے پھر اسے وہی نعرہ لگاتے ہوئے سنا۔ ہنسا اور بولا۔ ''تو کب سے ایک ہی رَٹ لگائے ہوئے ہے۔ کیا تو احمق نہیں ہے۔ یہ رقم تجھے آخر ملے گی کہاں سے۔ مگر میں تجھے یہ رقم دے سکتا ہوں۔ لے اور بھاگ جا بلاوجہ یہاں سر کھپا رہا ہے۔'' اس نے جیب سے دس ہزار نکال کر سوالی کو دے دیئے۔ اس نے رقم گنی جیب میں رکھی زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔
''واہ خواجہ...... خوب دلائی۔ بڑے موذی سے دِلائی......'' اور بھاگ گیا۔ تو حیات دائمی ایک تصور تو ہو سکتا ہے چشمۂ حیواں اور آب حیات دلکش افسانے تو ہو

سکتے ہیں مگر ان تک انسانی پہنچ ممکن نہیں۔ اور پھر کائنات کی تخلیق کا ایک ایک پہلو رمز رکھتا ہے۔ زندگی تو ایک روشن صبح ہے جدوجہد اور ضروری امور نمٹانے کے لیے اور سوت دن بھر کی تھکن کے بعد سکون بخش اور تھکن اُتارنے والی رات۔ کوئی کب تک جاگتا رہے گا۔ آخر تھکے گا اور نیند کی خواہش کرے گا۔ نہ جانے یہ حیات دائمی کی ہوس کیوں جنم لیتی ہے۔

دروازے پر ہونے والی ہلکی سی آواز نے خیالات کا طلسم توڑ دیا دیکھا تو زیب النساء بیگم تھیں۔ جھانکا اور غڑاپ سے اندر ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد دونوں میاں بیوی نمودار ہوئے۔ زیب النساء کے ہاتھوں میں ٹرے تھی جن سے تازہ کباب، پراٹھوں اور انڈے کی خوشبو اُڑ رہی تھی۔ بڑے احترام سے ناشتہ میرے سامنے رکھا گیا اور شاہد علی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''حضور، مرشد۔ ناشتہ تناول فرمالیجیے؟''

''اے بھائی، اے بھائی، ہوش میں آ میرے بھائی، بے کار باتوں سے گریز کر، یہ کیا ہو گیا'' میں نے شاہد علی کو دیکھتے ہوئے کہا، وہ نیچے جھکا اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''پہچان نہیں سکا تھا مرشد، میری آنکھوں میں بھلا اتنی بینائی کہاں، معاف کر دیجیے، اگر کوئی گستاخی ہوئی ہے تو، آپ نے تو ہم پر احسان کر ڈالا......''

''دھت تیرے کی۔ اس کا مقصد ہے کہ یہاں سے بھی آب و دانہ اُٹھ گیا'' میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''حضور مسعود شاہ صاحب ناشتہ کر لیجیے'' اس بار زیب النساء نے کہا۔

''آیا تو تھا آپ کی خدمت کرنے، اگر ذرا عزت مل جاتی تو آپ کو محبت سے بھائی کہنا شروع کر دیتا، لیکن یہاں بھی رزق راس نہیں آیا۔ میاں شاہد علی کوئی نوکری دو گے ہمیں، یا اپنا راستہ ناپیں۔''

''حضور کے قدموں کی برکت کو تا حیات حاصل کرنے کیلئے تیار ہوں، میری مجال کہ ایسے مرشد کامل کو نوکری دوں، حضور کہیں نہیں جانے دوں گا اب آپ کو، کہیں نہیں جانے دوں گا اور اگر آپ نے جانے کی بات کی تو سر پھوڑ لوں گا آپ کے سامنے، جان دے دوں گا۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کر ڈالا، آہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح سر راہ بھی کوئی مل جاتا ہے، حقیقت ہے کہ پہچاننے والی نگاہ ہونی چاہیے۔''

''تو تم نے مجھے پہچان لیا......؟''

''اب بھی نہ پہچانوں گا حضور، جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اس کے بعد بھی اندھا بنا رہوں، آپ کی شان میں گستاخی کروں۔''

''اچھا بھائی تمہاری مرضی، نوکری نہیں دو گے نا تم ہمیں؟''

''حضور کیا نوکری چاہتے ہیں اور پھر میری مجال کہ نوکری دوں۔ وہ بولا اور میں ہنس پڑا۔ بھی سب کچھ ہو رہا ہے، کہیں بھی میرا آب و دانہ نہیں ہے، اب یہ حضرت مجھے مرشد بنا بیٹھے ہیں، مرے پر سو دُرّے، یہاں بھی گناہوں کا بوجھ اُٹھاؤں، مرشد کہلواؤں، ایک لمحے کے لیے تو جی چاہا کہ کوئی ہرج نہیں ہے، بیٹھ جاؤں دھونی مار کر اور گزاروں عیش سے، اب یہ دُنیا اپنی پسند ہی سے کسی کو عزت دے سکتی ہے تو کیا کروں آخر، مجمع لگا لوں اپنے گرد، لوگوں کے مسائل حل کروں، کھاؤں پیوں، عیش کروں، لیکن......لیکن کیا یہ بھی کوئی زندگی ہوگی۔ فریب اور جعلسازی، گندے علوم کا سہارا لے کر ان تمام لوگوں کی طرح پیٹ بھرنا، جو ایمان کو بیچ دیتے ہیں، نہیں ایسا نہیں کروں گا، اس کے لیے شاہد علی کا گھر ہی کیا ضروری ہے۔ یہ جو گندی رُوحیں میرے اردگرد بکھری ہوئی ہیں انہیں اشارہ کر دوں تو کیا سے کیا نہیں بنا دیں گی یہ، نہیں۔ ایسے نہیں جیوں گا، کچھ بھی ہو جائے، بھوریا چرن تو نے اپنے جیسی ہر کوشش کر لی، مگر جوتے ہی کھائے میرے ہاتھوں اور عزم ہے میرا کہ تیری دی ہوئی کسی شے کو کبھی قبول نہیں کروں گا اور تجھے جوتے ہی مارتا رہوں گا'' کباب کی خوشبو ناک میں پہنچی تو بھوک چمک اُٹھی، میں نے مسکراتے ہوئے ناشتہ اپنے سامنے سرکا لیا اور کہا......

''دیکھو بھائی شاہد علی تم مجھے ملازم بنا کر یہاں لائے تھے، دھرم ایمان سے میں بھی ہوں اور یہی بننا چاہتا ہوں، جو کچھ

تم کہہ رہے ہو وہ صرف تمہارا اپنا معاملہ ہے، میں نے تم سے اس دھوکے میں کچھ نہیں طلب کیا، سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میں مرشد کامل ہوں، بزرگ ہوں، پیر ہوں، فقیر ہوں، اب بھی تم سے یہی الفاظ کہتا ہوں، ایک عام آدمی ہوں بھائی، دو روٹیوں کا دھندا دے دو مجھے، محنت کر کے کماؤں گا کھاؤں گا اور خوش رہوں گا، یہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے......"

"شاہ صاحب آپ ناشتہ تو کیجیے، ہماری خوش بختی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے اور یقیناً تم لوگ میرے ساتھ ناشتے میں شریک نہیں ہوگے......"

"ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے۔" زیب النساء نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور میں ناشتے پر پل پڑا۔ کیا عمدہ ناشتہ ملا تھا طویل عرصے کے بعد، گھریلو قسم کا، خوب کھایا، ڈٹ کر کھایا اور پھر ہنستا ہوا بولا۔

"آخر تم پر مصیبت کیا نازل ہوئی ہے......؟"

"شاہ صاحب کیا اب آپ یہ خوشخبری ہمیں نہیں دیں گے کہ وہ مصیبت ہم پر سے ٹل چکی ہے۔" شاہد علی نے کہا، اور میں کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں شاہد علی، میری چند باتیں گرہ سے باندھ لو، بالکل بے فکر ہو کر اب اپنے باغ میں کام شروع کراؤ، جو مصیبت تھی وہ واقعی ٹل گئی ہے۔ وہ ایک گندی اور خبیث رُوح تھی جس نے تمہارے ہاتھوں نجات پائی۔ اب یہ پتہ نہیں کہ اسے وہاں قید کس نے کیا تھا لیکن آزادی اسے تمہارے ہی ہاتھوں ملی اور اس کے بعد وہ جو گندگی نہ پھیلاتی کم تھا لیکن بھاگ گئی اور اب وہ تمہاری جانب رُخ نہیں کرے گی۔ مزدوروں کو نئے سرے سے اکٹھا کرو، میرے خیال میں اب وہاں کوئی ایسا واقعہ رُونما نہیں ہوگا......"

"اور زیب النساء......؟"

"وہ بھی اس کے زیرِ اثر تھی، ظاہر ہے وہ تمہارے گھر تک پہنچ چکا تھا اور اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا اب نہیں آئے گا، اطمینان رکھو......"

"اور اس کے باوجود آپ یہ کہہ رہے ہیں حضور شاہ صاحب کہ میں آپ کی خدمت نہ کروں آپ کے لیے۔ آپ کے ہے......"

"بس بس اس سے آگے کی باتیں رہنے دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی ہم نے تو یہی سوچا تھا کہ یار چلو تھوڑے بہت عرصے یہاں کی نوکری میں زندگی گزار لو، مگر ہماری تقدیر میں ہی نہیں ہے......"

"یہ سب کچھ آپ کا ہے شاہ صاحب، آپ کی برکت رہے گی تو مجھے بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ملے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ اب بھلا اس سے زیادہ کیا کہتا اس سے لیکن طے یہ کر لیا تھا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل بھاگوں گا، میں ان ڈرامہ بازیوں میں نہیں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ یہی ہوا حالانکہ بعد میں بھی دونوں میاں بیوی نے مجھے آرام سے رہنے کی پیشکش کی، اندر بڑے اہتمام سے میرے لیے کمرہ سجایا، سب کچھ خاموش آنکھوں سے دیکھتا رہا اور اس کے بعد جیسے ہی شاہد علی اپنی گاڑی لے کر باہر تھا میں بھی پیچھے ہی پیچھے نکل آیا اور اس کے بعد میرے لیے یہ ضروری تھا کہ یہ بستی چھوڑ دوں، سفر کے لیے ظاہر ہے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا تو میں پیدل چلتا رہا اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک چھوٹی سی پگڈنڈی سے ایک بس اُچھلتی کودتی آگے بڑھتی نظر آئی میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تو بس رُک گئی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔"

"کہاں جا رہی ہے یہ بس؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے......؟"

"جہاں یہ بس جا رہی ہے۔" میں نے بس کے کنڈیکٹر کو جواب دیا۔

"تو پھر نکالو ڈھائی روپیہ۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ پیسے تھوڑے بہت میرے پاس موجود تھے، میں نے ڈھائی

روپیہ نکال کر بس کنڈیکٹر کو دے دیا اور جب اس نے مجھے ٹکٹ دیا تو مجھے پتہ چلا کہ بس کہاں جا رہی ہے۔ بس جلیسر جا رہی تھی۔ جلیسر کیا ہے، کون سی جگہ ہے، وہاں کی آبادی کتنی ہے، کتنا بڑا شہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا لیکن کوئی ہرج بھی نہیں تھا۔ اب تو ساری دُنیا ہی وسیع ہے میرے سامنے، جلیسر تک کا سفر طے ہوا، راستہ کچا ہی تھا اور مزہ آ گیا تھا۔ سفر کرتے ہوئے بدن کی چولیں ہل گئی تھی۔ شام کو تقریباً ساڑھے سات بجے بس نے جلیسر پر اُتارا۔ اچھی خاصی آبادی تھی۔ ٹھیک ٹھاک ہی شہر تھا، میں نیچے اُتر کر احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، نہ کوئی پتہ، نہ کوئی ٹھکانہ لیکن خدا کی زمین وسیع ہے بس جدھر منہ اُٹھا چلتا چلا گیا۔ اور پھر میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے گزر گزر کر ایک ہی سمت جا رہے تھے، کچھ ایسا انداز تھا ان کا، جیسے کسی خاص جگہ جا رہے ہوں، چنانچہ میں پیچھے پیچھے چل پڑا اور تھوڑے ہی فاصلے کے بعد مجھے ایک جگمگاتی جگہ نظر آئی۔ یہ کوئی بہت بڑی عمارت تھی، جس میں خوب صورت گنبد بنے ہوئے تھے، وسیع و عریض احاطے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے جو پتھر کی سل پر ایک کتبہ نظر آ رہا تھا جس پر کچھ اشعار کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔"

"درگاہ سیّد ابراہیم شاہ صاحب۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، میں تو راندۂ درگاہ تھا، پتہ نہیں اس درگاہ کے احاطے میں مجھے جگہ ملے گی یا نہیں۔ لوگ جوق در جوق آگے بڑھ رہے تھے، ویسے کوئی باقاعدہ میلہ وغیرہ نہیں تھا۔ بس درگاہ کے اندر روشنیاں ہو رہی تھیں اور درگاہ شریف کے مجاور اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ سیاہ رنگ کے لباسوں میں ملبوس، لمبے لمبے بالوں والے، میں ذرا فاصلے پر ہی رُک گیا۔ اطراف میں نیچی اُونچی جھاڑیاں اُبھری ہوئی تھیں اور ان جھاڑیوں کے آس پاس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر مکمل خاموشی طاری تھی۔ بڑا وقار، بڑا جلال تھا درگاہ شریف کا...... میرے دل سے دُعا نکلی کہ کسی بھی بزرگ کے طفیل میری مشکل حل ہو جائے...... آہ میری مشکل حل ہو جائے۔

میں وہیں بیٹھا رہا، رات کو تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک لوگ درگاہ شریف میں آتے جاتے رہے، پھر درگاہ کے دروازے بند ہو گئے اور تمام لوگ واپس چلے گئے، بس احاطے کے دُوسری جانب مجاور نظر آ رہے تھے، جو اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے، میں جھاڑیوں کے پاس خاموش بیٹھا پیاسی نگاہوں سے درگاہ شریف کا کتبہ دیکھتا رہا اور میرے ذہن میں نجانے کیا کیا تصورات اُبھرتے رہے۔ درگاہ شریف کے بائیں حصے میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے کبھی کبھی کوئی باہر نکل آتا تھا اور کسی کام سے شہری آبادی کی جانب چل پڑتا تھا۔ میرے ذہن میں نجانے کیا سمائی۔ آہستہ آہستہ اُٹھا اور چھوٹے دروازے کی جانب چل پڑا، ابھی میں چھوٹے دروازے سے کوئی دو گز کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں چونک کر رُکا۔

چھوٹے دروازے کے عین سامنے طباق جیسے چوڑے پھن کا مالک بھنورے کی سی رنگت لیے خوب موٹے چمکدار جسم کا سانپ پھن پھیلائے کنڈلی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ننھی چمکدار آنکھوں میں نفرت کی سرخی جھلک رہی تھی۔ میرے قدم رُک گئے۔

"راستہ بند ہے؟" میں نے پوچھا اور پھر گردن جھکائے وہاں سے پلٹ پڑا۔ یہ تو ہونا چاہئے تھا۔ اپنے گندے وجود کو میں اس پاک درگاہ میں کیسے لے جا سکتا تھا۔ میں تو غلاظت کی پوٹ تھا۔ بے دلی سے وہاں سے پلٹا اور ایک گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ درخت کے موٹے تنے سے میں نے پشت لگا لی تھی۔ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اپنی حالت زار پر رونا آ رہا تھا مگر اتنے آنسو بہہ چکے تھے کہ اب ان کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک پتھر کا ایک ٹکڑا سینے پر آ کر لگا اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کالے بھجنگ رنگ کا ایک لمبا تڑنگا آدمی میرے سامنے بے لباس کھڑا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی کے باوجود اس کی آنکھیں گہری سرخ چمک رہی ہیں۔

"تخت شاہی تیرے باپ کا ہے۔ ہماری سلطنت پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہے بھولتو کہیں کا، ہٹ جا اِدھر سے نہیں تو کھوپڑی رنگین کر دوں گا۔" اس نے جھک کر دوسرا پتھر اُٹھا لیا۔

"ہٹ جاتا ہوں، ہٹ جاتا ہوں۔ مگر کہاں جاؤں۔ بتا تو دو۔"

''ابے ہٹ وہاں سے غلیظ ناپاک، تجھے تو میں ایسی جگہ پہنچاؤں گا جہاں تیری ننک چٹی ہو جائے پٹ پٹی کا ترنگا۔'' میں درخت کے نیچے سے ہٹ گیا۔ وہ شخص میری جگہ جا بیٹھا اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں کچھ فاصلے پر کھلے آسمان تلے جا بیٹھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بدن دُکھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تو لیٹ گیا۔ آنکھیں بند ہوگئیں مگر نیند نہیں آئی تھی۔ اچانک قریب ہی سرسراہٹ سنائی دی اور میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر دَم ہی نکل گیا۔ اس خوفناک شخص کا چہرہ دو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں، دفعتاً اس نے میرے منہ پر تھوک دیا اور پھر قہقہے لگاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ ایک بار پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر تھوک کی نمی تھی مگر میں نے اسے صاف نہیں کیا۔ یہ چہرہ اسی قابل ہے۔ میں نے دل میں سوچا رات نہ جانے کیسے گزری، پھر صبح ہوگئی، شاید سو گیا تھا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا چند لوگ میری طرف آرہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

''کھانا کھاؤ گے میاں صاحب۔'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں، بھائی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لو ہاتھ دھولو۔'' دُوسرے نے پانی سے بھرا لوٹا سامنے کر دیا۔ ہاتھ دھوئے۔ پوریاں، حلوہ اور ترکاری تھی۔ کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ انہوں نے مجھے پانی پلایا اور پھر برتن اُٹھا کر چلے گئے۔ درگاہ کی طرف سناٹا تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ دُھوپ چلچلانے لگی، درخت میرے سامنے تھا مگر دوبارہ اس کے نیچے جانے کی ہمت نہ کرسکا۔ پھر درگاہ کے عقبی حصے سے شور اُٹھا۔ بچوں کا شور تھا۔ میں نے دن کی روشنی میں اسی بے لباس شخص کو دیکھا۔ بے تحاشا دوڑتا آرہا تھا۔ دس بارہ بچے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور پاگل ہے۔ پاگل ہے کا شور مچا رہے تھے۔ وہ اسے پتھر بھی مار رہے تھے۔ دفعتاً وہ میرے قریب آ کر رُک گیا اس نے غور سے مجھے دیکھا پھر ہنس پڑا۔ بچے کچھ فاصلے پر آ کھڑے ہوئے تھے اور شریر نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اس نے بچوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اسے بھی مارو...... یہ بھی اپنا بھائی ہے، مارو۔ ہی ہی ہی۔'' بچوں نے میری طرف بھی پتھر اُچھالنے شروع کر دیئے۔ وہ ہنستا ہوا درخت کے تنے کے پیچھے جا چھپا تھا۔ کئی پتھر میرے بدن کے مختلف حصوں پر لگے اور ایک سر پر آنکھ کے بالکل قریب اور پیشانی پھٹ گئی۔ خون بھل بھل کر کے بہنے لگا اور میں نے زخم پر ہاتھ رکھ لیا۔ بچے خون دیکھ کر ڈر گئے اور سب وہاں سے بھاگ گئے۔ میں پیشانی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ خون زمین پر گرتا رہا مگر دُوسری آنکھ سے میں نے کچھ اور بھی دیکھا۔ میرے خون میں زندگی تھی، ہاں میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ خوب اچھی طرح۔ وہ ننھی ننھی مکڑیاں تھیں جو میرے خون میں کلبلا رہی تھیں اور خون سے نکل نکل کر اِدھر اُدھر رینگ رہی تھیں۔ مگر چند انچ چلنے کے بعد وہ چرمرا کر رہ جاتی تھیں۔ جب تک خون ہوا سے خشک نہ ہوگیا یہ تماشا جاری رہا۔ بچے تو غائب ہوگئے تھے مگر وہ درخت کے پیچھے موجود تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر میرے پاس آبیٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے کئے ہوئے تھے۔ وہ سرگوشی کے عالم میں بولا۔

''ایک سو بہتر کہاں گئے، ایں...... ایک سو بہتر کہاں گئے۔ کچھ پتہ ہے ان کا......؟'' میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ آنکھ پر رینگ کر آنے والا خون صاف کیا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''ہاتھ دکھاؤں اپنے، دیکھ۔'' اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے۔ ان میں پتھر دبے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں پتھر میرے سر پر دے مارے اور میرے حلق سے دل خراش چیخیں نکل گئیں۔ دو گہرے زخم اور لگے تھے اور ان سے خون اُبل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بھاگ گیا۔ مجھے زور سے چکر آیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔

ہسپتال کے بستر پر ہوش آیا تھا۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ نرسیں آجا رہی تھیں، کچھ دیر کے بعد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ ہسپتال ہے۔ پھر ایک نرس نے گزرتے ہوئے مجھے ہوش میں دیکھا اور زور سے چیخی۔

''سسٹر مہوترا۔ تیرا پیشنٹ ہوش میں آگیا۔''

''میں ڈاکٹر کو بتا دوں۔'' دُوسری آواز آئی۔ کچھ دیر کے بعد ایک نرس ہی آئی۔ اس نے پورا بازو کھول کر ایک انجکشن

لگایا اور بولی۔

''کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''تمہارے سر میں زخم کیسے لگے۔ کس نے مارا ہے؟''

''بچوں نے۔''

''کسی کی رپورٹ کراؤ گے۔''

''نہیں سسٹر۔ وہ بچے تھے۔''

''او کے، میں ڈاکٹر کو بول دوں۔ تمہیں پولیس والے لائے تھے۔ وہ تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں۔'' پولیس والوں کو میں نے کوئی خاص بیان نہیں دیا ابھی تک میں ان سے خوفزدہ رہتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے اسپتال سے رُخصت کر دیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں، چھوٹے بازار، چلتا رہا۔ درگاہ کے سامنے سے گزرا اور ایک آہ بھر کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں میری جگہ نہیں تھی۔ میں ناپاک تھا کسی کا کیا قصور۔ مجھے خود اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ مارے مارے پھرنے کی عادت ہوگئی تھی۔ تانگے چل رہے تھے، بسیں بھی نظر آرہی تھیں مگر میں پیدل چل پڑا۔ کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوئی تھی حالانکہ کافی خون بہا تھا۔ لباس پر بھی جمے ہوئے خون کے دھبّے نظر آرہے تھے۔ اس راستے سے ہٹ گیا جس پر لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ بہت دُور نکل آیا ایک کھیت نظر آیا جس میں کچریاں بکثرت پڑی ہوئی تھیں۔ کھیت میں گھس کر بہت سی کچریاں اُٹھائیں اور کنارے بیٹھ کر کھانے لگا۔ پیٹ کا جہنم سرد کرنے کے بعد وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ جنگل بیابان، درخت اُڑتے ہوئے پرندے، دوڑتے ہوئے ہرن۔ کہیں کہیں چھوٹے درندے بھی نظر آجاتے تھے۔ وہ بھی کوئی درندہ ہی تھا۔ زمین کے سوراخ سے نکلا تھا۔ مجھ سے دس گز کے فاصلے پر رُک کر غرّانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھوک تھی۔ پھر اس نے وحشیانہ انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن دوبارہ زمین پر نہ آسکا۔ فضا میں ہی اس کی چندھیاں بکھر گئی تھیں۔ خون اور ہڈیوں کا ملغوبہ زمین پر آرہا۔ پھر وہی خاموشی...... یہ منظر دُوسری بار نگاہوں میں آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ درندے کو ہلاک کرنے والا کون ہے۔ مگر ایک تیز ٹیس کے ساتھ ایک اور احساس ذہن میں جاگا تھا۔ وہاں درگاہ شریف کے پاس یہ پلید نہ آسکے تھے۔ اس شخص کو پتھر مارنے سے نہ روک سکے تھے اور...... اور...... اس نے کہا تھا کہ ''ایک سو کھتّر کہاں گئے۔ کچھ پتہ ہے ان کا۔'' ظاہر ہے یہ گندے اس جگہ نہ جاسکے تھے۔ ورنہ جس طرح بھی سہی انہوں نے بھوریا چرن تک سے مجھے بچایا تھا۔ اس خیال نے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات پیدا کر دیئے بعد کے سفر میں میں انہیں محسوس کرتا رہا۔ پھر دو دن اور دو راتوں کے بعد ایک بہت بڑا شہر نظر آیا۔ پتہ چلا کہ اس کا نام ہاتھرس ہے۔ یہاں کچھ وقت گزارا اور پھر ریل میں بیٹھ گیا کچھ عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ ہر عمل سے رغبت ختم ہوتی جارہی تھی۔ خاموش رہنے کو جی چاہتا تھا۔ جس ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا اس میں ایک ہندو خاندان بھی سفر کر رہا تھا۔ ایک فربہ جسم کا مالک معمر شخص ایک معمر خاتون دو نوجوان لڑکیاں، ایک نوجوان لڑکا۔ دو ملازم قسم کے لوگ۔ معمر شخص نے کئی بار مجھے دیکھا تھا لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر ٹکٹ چیکر آگیا۔

''میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے بھائی۔'' میں نے اسے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں، اگلے اسٹیشن پر پولیس موجود ہے۔'' ٹکٹ چیکر نے بھی اطمینان سے کہا۔

''ارے ارے، کیسی باتیں کرتے ہو بھائی، آدمی آدمی کو دیکھنا چاہئے، لو کتنے پیسے بنتے ہیں تمہارے، ٹکٹ مجھ سے لے لو۔'' اسی معمر شخص نے کہا اور جیب سے نوٹ نکال کر ٹکٹ چیکر کو دے دیئے، ٹکٹ چیکر نے مجھ سے پوچھا۔

''کہاں جاؤ گے......؟'' میں نے گھبرا کر معمر شخص کو دیکھا تو معمر شخص نے جلدی سے کہا۔

''دِلّی......'' اور اس کے بعد ٹکٹ چیکر میرا ٹکٹ بنا کر چلا گیا۔ میں شکر گزار نگاہوں سے معمر شخص کو دیکھنے لگا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور میرے قریب آبیٹھا، کہنے لگا۔

''بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا تھا سوامی مہاراج، ایسی جانی پہچانی صورت لگ رہی تھی کہ بتا نہیں سکتا، پھر یاد آیا کہ میں نے تمہیں کہاں دیکھا تھا۔'' میں سوالیہ نگاہوں سے اس شخص کو دیکھنے لگا، وہ بولا.....''

''ڈاکٹر بھلا جی کو جانتے ہو نا.....؟'' میں نے یاد کیا تو ڈاکٹر بھلا مجھے یاد آ گیا۔ وہ شخص جس نے اس لڑکی کو مردہ قرار دے دیا تھا جو بعد میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ میں نے گردن ہلائی تو معمر شخص مسکرا کر بولا۔

''بھلا میرا جوائی ہے۔ میری بیٹی بیاہی ہے اس سے اور ان دنوں میں بھی وہیں موجود تھا جب تم نے ایک لڑکی کے زندہ ہونے کی بات کی تھی اور وہ زندہ ہو گئی تھی۔ بھلا نے مجھے پوری کہانی سنائی میں نے اس سے کہا کہ بھائی ذرا مجھے بھی اس مہان پُرش کی صورت دکھا دے، سو اس نے دُور ہی سے مجھے تمہیں دکھایا تھا۔ کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ تم وہ نہیں ہو.....؟''

میں آہستہ سے ہنس دیا پھر میں نے کہا۔ ''آپ کا نام کیا ہے مہاراج.....؟''

''اوم پرکاش۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''آپ نے صرف اتنی سی بات پر میرا ٹکٹ بنوا لیا۔''

''اس کا ذکر مت کرو، بھلا مجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کیا کہ اتنا بڑا کام کرنے کے بعد بھی تم نے فقیروں کی طرح ان لوگوں کی دولت ٹھکرا دی، میری مراد فقیروں سے یہ ہے کہ وہ فقیر جو کسی کی دولت پر نگاہ نہیں کرتے، ہاتھ پھیلانے والے فقیروں کی بات نہیں کر رہا میں.....''

''دولت۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں مہاراج میں جانتا ہوں، بھلا آپ جیسوں کے لیے یہ کاغذ کے ٹکڑے کیا حیثیت رکھتے ہیں، بھگوان نے آپ کو دُوسری ہی شکتی دی ہے، ویسے میں نے آپ کا دلی کا ٹکٹ بنوا لیا ہے، آپ کو کہیں اور تو نہیں جانا.....؟''

''نہیں! بس یہی کہہ سکتا ہوں پرکاش جی مہاراج کہ دُنیا سچ مچ ہی گول ہے، دلی بھی آ چکا ہوں ارے اب پھر دلی جا رہا ہوں۔ چلیں ٹھیک ہے، تقدیر جہاں لے جائے، وہی جگہ غنیمت ہے۔''

''گویا آپ دلی نہیں جا رہے تھے، پھر کہاں جانے کا ارادہ تھا؟''

''آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا، بس ریل میں بیٹھ گیا تھا۔ سوچا تھا کہ جدھر ریل جائے گی، چلا جاؤں گا۔'' اوم پرکاش جی ہنس پڑے۔ پھر بولے..... ''تو پھر ایسا کریں کاشی جی چلیں، بڑی بڑھیا جگہ ہے، میں اپنے اس چھوٹے سے خاندان کے ساتھ کاشی ہی جا رہا ہوں، وہاں تھوڑے دن رہوں گا اور اس کے بعد واپس چلا آؤں گا، میرا اصلی گھر آگرے میں ہے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ، میں آپ کے ساتھ جا کر کیا کروں گا۔''

''آپ کی مرضی ہے، دیکھ لیں کاشی جی بھی اگر کوئی خاص کام نہیں ہے تو، سنسار کو دیکھنا چاہیے۔'' اوم پرکاش جی بولے۔

''اوم پرکاش جی آپ کو پتہ ہے کہ میرے پاس ریل کا ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نہیں تھے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے ساتھ گھومنے پھرنے چلوں؟''

''دیکھو مہاراج، نام کیا ہے آپ کا، خیر نام کچھ بھی ہو بات یہ ہے کہ ہر چیز پیسے ہی سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس وقت مجھے آپ سے عقیدت ہو گئی تھی، مگر وقت ہی نہیں مل سکا، کہا تو تھا میں نے اپنے داماد سے کہ مجھے ملا بھی دو۔ مگر اس نے بتایا کہ آپ کسی اور کام سے جا رہے ہیں۔ میری خوشی ہو گی کہ اگر آپ میرے ساتھ بنارس چلیں۔'' میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر آہستہ سے کہا۔

''بھلا جی نے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میرا دھرم کیا ہے۔''

''بتایا تھا، کہا تھا آپ مسلمان ہیں؟''

''اوہ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو معلوم ہے مگر اس کے باوجود آپ مجھے اپنی مقدس یاترا پر لے جا رہے ہیں۔'' اوم

پرکاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، انہوں نے کہا۔
”میں نے آٹھ سال لندن میں پڑھ کر گزارے ہیں۔ تین سال تک ذاتی طور پر ریسرچ کرتا رہا ہوں۔ دین دھرم کے بارے میں بس ایک ہی بات پتہ چلی۔“
”کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
”سارے دھرم انسان پر انسان کے حق کے بارے میں بتاتے ہیں۔ وہ جو سب سے بڑا ہے کسی انسان سے کچھ نہیں مانگتا، نہ اسے ضرورت ہے۔ دھرم کے ساتھ اگر صورتیں الگ الگ ہو جاتیں تو ہم مان لیتے کہ سارے دھرم الگ الگ ہیں۔ مگر صورتیں تو ایک جیسی ہیں پھر بات کیا ہے تم بھی اپنے پیدا کرنے والے کو پکارتے ہو۔ اسے پیار سے اللہ کہتے ہو، ہم اسے بھگوان کہہ کر بلا لیتے ہیں۔ اسے برا تو نہ لگتا ہوگا۔“

✦✦✦✦✦

’میرا نام مسعود احمد ہے...... اوم پرکاش جی۔“
”تو پھر چل رہے ہو کاشی ہمارے ساتھ۔“
”آپ سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ ضرور چلوں گا۔“
”کوئی بھی سوگند لے لو۔ ہم نے یہی سوچا تھا کہ وہ جو سنسار کے لیے جیتے ہیں کسی جگہ کے نہیں ہوتے ان کے لیے تو سارا سنسار ایک جیسا ہے، تمہارے ساتھ سے ہمیں خوشی ہوئی۔“
میں خاموش ہو گیا۔ اوم پرکاش جی بڑے گیانی تھے۔ بہت اچھی باتیں کرتے تھے انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ایک بات کہوں مسعود جی۔“
”جی!“
”تمہارے بارے میں ان میں سے کسی کو نہیں بتاؤں گا، ان سب کے بارے میں تمہیں بتا دوں۔ وہ میری دھرم پتنی ہیں۔ اوم پرکاش نے مجھے سب کے بارے میں بتایا پھر بولے۔ ”اگر میں انہیں بتا دوں کہ تم کون ہو تو جینا حرام کر دیں گی تمہارا۔ کیونکہ انہیں میں نے اس لڑکی کی کہانی سنا دی تھی اور یہ بہت متاثر ہوئی تھیں۔ خاص طور سے ہماری دھرم پتنی۔“
”جی......!“ میں ہنس کر بولا۔
دلی آ گئی یہاں سے دوسری ٹرین پکڑنا تھی مگر اوم پرکاش جی کے ایک دوست یہاں ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ اس خاندان کو ساتھ لے گئے۔ مجھے انہوں نے حیرت سے دیکھا تھا کیونکہ میرا حلیہ کسی معزز انسان کا سا نہیں تھا اور خود مجھے اس کا احساس تھا۔
”یہ سادھو سنت آدمی ہیں۔ ان کے حلیے پر نہ جانا مادھولال۔“ اوم پرکاش نے کہا۔
”اوہ۔ سادھو!“ مادھولال نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ بنیا قسم کا آدمی تھا شاطر اور چالاک۔ اس کے گھر دو دن رکے۔ یہاں سے آگے جانے کا بندوبست کرنا تھا۔ گھر جا کر جب اطمینان سے بیٹھنے کا موقع ملا تو مادھولال نے کہا۔
”سنت جی مہاراج۔ آپ اتنی چھوٹی سی عمر میں سنت کیسے بن گئے؟“ اوم پرکاش نے چونک کر اسے دیکھا اور میرے بجائے خود بول پڑے۔
”عمر کا گیان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”ہے!“ مادھولال پرزور لہجے میں بولا۔
”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”صرف ایک بات۔ ان دنوں گلی کوچوں میں سادھو ہی سادھو نظر آتے ہیں۔ گیروا کپڑے پہنے، ہاتھ میں کمنڈل پکڑا اور خود کو سادھو کہلانا شروع کر دیا۔ ایسے ناکارہ نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ دھرم کا مذاق اڑانے والی

بات ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جس کے پاس گیان شکتی ہوتی ہے اسے ہی سنت کہلانے کا حق ہوتا ہے۔"

"مگر میں نے تو گیروا کپڑے نہیں پہنے مادھولال جی۔ کمنڈل بھی میرے پاس نہیں ہے۔"

"آ جائے گا کچھ عرصے بعد۔"

"آپ گیان شکتی کسے کہتے ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی چمتکار دکھائیں مہاراج۔ کچھ تو دیا ہوگا آپ کو تیاگ نے۔" مادھولال نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔

ادم پرکاش جی نے بے چین ہو کر کہا۔ "تم کچھ غلط باتیں نہیں کر رہے مادھولال؟"

"جیون چھوڑ کر معافی۔ تم وں گا سنت مہاراج سے مگر جاننا چاہتا ہوں انہیں کتنا گیان ملا ہے۔ کوئی چمتکار دکھایئے مہاراج۔" رات کا وقت تھا اور ہم لوگ اس وقت مادھولال جی کی حویلی کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے اور یہ چھت بہت بڑی تھی۔ مجھے بھی نہ جانے کیا سوجھی، دراصل ان باتوں میں مزا آ رہا تھا اور کچھ دیر کے لیے دل بہل گیا تھا۔

"بیکار باتیں مت کرو مادھولال تم میرے......!"

"آپ خود بتایئے مادھولال جی۔ کیا چمتکار دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے اوم پرکاش کی بات کاٹ کر کہا۔

"کوئی بھی۔ کچھ بھی۔"

"آپ کی مرضی" میں نے کہا اور پھر پہلی بار میں نے اپنے بیروں کو پکار کر کہا۔ "سنو، سامنے نہ آنا ورنہ مادھولال جی مر جائیں گے۔ یہ میرے میزبان ہیں بہت بڑے ساہوکار ہیں یہ، اور پھر مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے میں ان پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنا چاہتا ہوں۔ تنے پھول برساؤ ان پر کہ مادھولال جی پھول جیسی چیز سے پریشان ہو جائیں، آیئے اوم پرکاش جی ہم ذرا پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔" میں نے اوم پرکاش کا ہاتھ پکڑ کر انہیں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہی ہوگا جو میں نے کہا ہے، اور میرے منہ سے ان الفاظ کو نکلے ہوئے کچھ لمحات ہی گزر رہے تھے کہ دفعتاً فضا سے پھولوں کی بارش شروع ہوگئی۔ طرح طرح کے پھول، موتیا، گلاب، گیندا اور نجانے کیا کیا۔ یہ پھول ہزاروں کی تعداد میں مادھولال جی پر آ آ کر گر رہے تھے اور مادھولال جی پریشان ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔ حویلی کی وسیع و عریض چھت کا گوشہ گوشہ پھولوں سے لدتا چلا جا رہا تھا۔

مادھولال جی کے منہ سے ارے ارے ارے...... کی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ بے وقوفوں کی طرح ادھر گردن گھما رہے تھے، پھول برستے رہے، صرف وہ جگہ خالی رہ گئی تھی جدھر میں اور اوم پرکاش جی کھڑے ہوئے تھے۔ ورنہ حویلی کی ساری چھت پر منوں پھولوں کے انبار لگتے جا رہے تھے، مادھولال جی آدھے بدن سے پھولوں سے ڈھک گئے، تو انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہنا چاہا، لیکن حلق سے آواز ہی نہیں نکل پا رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے، خود اوم پرکاش جی پر سکتہ طاری تھا دفعتاً مادھولال نے گھبرا کر کہا۔

"ارے بھائی رُکو تو سہی، میں پھولوں میں دب کر مر جاؤں گا، ارے رُکو، ارے رُکو" لیکن رُکنے والے جانتے تھے کہ کس کے حکم پر رُکنا ہے، بھلا وہ کیوں رُکتے، پھول مادھولال جی کے شانوں تک پہنچ گئے تو میں نے ہی دونوں ہاتھ اُٹھائے اور کہا۔

"بس کرو، ورنہ مادھولال جی کی سمادھی انہی پھولوں میں بن جائے گی۔ بہت بڑے ساہوکار ہیں یہ، بہت بڑے آدمی ہیں اب ایسا کرو، ہماری طرف سے انہیں کچھ بھینٹ دے دو۔ سونا، چاندی بس یہی چیزیں انسان کو زیادہ پسند ہوتی ہیں۔"

میرے بیروں کو پہلی بار مجھ سے کوئی حکم ملا تھا، سو تھال کے تھال پھولوں پر آ کر سجنے لگے اور اوم پرکاش جی نے آنکھیں بند کر لیں ان سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ مادھولال جی کے چاروں طرف ان تمام اشیاء کے انبار لگ گئے۔ میں نے سوچا کہ کہیں ان چیزوں کو دیکھ کر ان کا دَم ہی نہ نکل جائے چنانچہ ہنس کر ہاتھ اُٹھائے اور کہا۔ "بس کرو۔ بس کرو۔ اگر پھولوں کی طرح ان کی چھت سونے چاندی سے بھی بھر گئی تو حویلی ہی بیٹھ جائے گی، بس جاؤ تمہاری چھٹی۔" اور سونے چاندی کی آمد بند ہوگئی۔

اوم پرکاش جی نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور یہ سب کچھ دیکھا۔ مادھولال پتھرائے ہوئے کھڑے تھے، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہمارے دو دن کے قیام کا یہ معاوضہ آپ کے لیے میرے خیال میں کافی ہوگا مادھولال جی، اب پھولوں سے باہر نکل آیئے۔ کیا فائدہ کہ آپ یہیں کھڑے کھڑے مر جائیں۔" مادھولال جی نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نہیں نکل سکی اوم پرکاش جی آہستہ سے بولے۔

"مسعود۔ مسعود یہ سب کچھ۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا جو آ گیا ہے وہ واپس نہیں جا سکتا، باقی باتیں آپ جانیں اور آپ کے دوست۔ مجھے اب ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں ہے......" میں نے کہا اور اس کے بعد ہم بمشکل تمام مادھولال جی کو نیچے لانے کے لیے سہارا دے کر چل پڑے۔

پھولوں پر چلنا ان کیلئے مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ آپ کو بیٹھنے کیلئے کوئی دُوسری جگہ چاہئے ہوگی مادھولال مہاراج!"

"نیچے نیچے چلو۔" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولے۔ ہم سب نیچے آ گئے۔ "مجھے کہیں بٹھا دو۔ دوسروں کو۔ بھگوان کیلئے دُوسروں کو کچھ نہ بتانا۔"

نیچے بھی بہت بڑا صحن تھا۔ یہاں بھی پھلواری لگی ہوئی تھی۔ ایک جگہ بیٹھ کر مادھولال جی نے کچھ دیر سانس درست کی۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے گر پڑے۔ "شما کر دیں مہاراج۔ شما کر دیں۔ بڑی بھول ہوگئی مجھ سے۔ بڑی بھول ہوگئی؟"

"کوئی بات نہیں مادھولال جی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ارے اب ان پھولوں کا کیا ہوگا۔ کیا بتاؤں گا میں دُوسروں کو؟"

"اب یہ آپ کا کام ہے مہاراج۔"

"اور وہ۔ وہ جو اُوپر ہے۔ ارے باپ رے۔ وہ تو کروڑوں کا مال ہے۔ کروڑوں کا۔"

"اب وہ آپ کا ہے۔ یاد کر لیا کریں گے اپنے دوست اوم پرکاش کو، کہ انہوں نے آپ کو کروڑوں کا مالک بنا دیا۔" میں نے کہا اور مادھولال نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ "کوئی سونے کی جگہ مل جائے گی اوم پرکاش جی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"میں بتاتا ہوں۔" مادھولال جی ایک دم کھڑے ہوئے اور گرتے گرتے بچے۔ بڑی مشکل سے وہ ہمیں ساتھ لے کر آئے اور ایک کمرے تک پہنچا دیا۔ "یہ کمرہ آپ کیلئے ہے مہاراج۔ اوم پرکاش جی کے اہل خاندان کیلئے الگ انتظام کیا گیا تھا۔" میں چلتا ہوں۔ مادھولال بولے اور باہر نکل گئے۔ اوم پرکاش البتہ میرے پاس بیٹھے رہے تھے، گم صم اور خاموش۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے زبان کھولی۔

"اور آپ کے پاس ٹکٹ خریدنے کے پیسے بھی نہ تھے۔" میں ہنسنے لگا۔ "مگر اب کیا ہوگا۔"

"کیوں اوم پرکاش جی؟"

"اُوپر جو کچھ ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ واقعی کروڑوں کی دولت ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔ اس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔"

"اس کے تو دن پھر گئے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

''چمتکار دیکھ لیا اس نے اب ان ساری چیزوں کو واپس ہو جانا چاہئے، آپ ایسا ضرور کریں مسعود جی، یہ تو۔ یہ تو مناسب نہیں ہوگا، میں محسوس کر رہا تھا کہ خود اوم پرکاش جی کی حالت بہتر نہیں ہے۔ ان دولت کے متوالوں کو یہی سب کچھ دُنیا کی سب سے بڑی چیز محسوس ہوتی تھی لیکن کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کائنات کی سب سے بڑی دولت کیا ہے ماں باپ کی قربت، بہن بھائیوں کا ساتھ، ایک پرسکون جدوجہد سے پُر زندگی جس میں صبح کو تلاش رزق کیلئے گھر سے باہر نکلنا اور اس کے بعد ضرورتیں پوری ہو جانے کی حسرتیں لے کر واپس لوٹنا ہی اصل زندگی ہے، ساری خواہشیں پوری ہو جائیں تو پھر کس حساب میں جیا جائے، جو چھن گیا ہو اس کو پانے کی آرزو اور اس آرزو کی تکمیل ہی کائنات کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ اوم پرکاش جی بھی چلے گئے اور میں نجانے کب تک سوچوں کے دھارے پر بہتا رہا۔ میں نے سوچا کہ جلد بازی میں یا ان واقعات سے متاثر ہو کر میں نے یہ دُوسرا عمل غلط تو نہیں کر ڈالا۔ ایک عمل کیا تھا تو کمبل چھن گیا اور اب اس عمل سے نجانے کیا کیا چھن جائے گا۔ مگر کیا کروں کیسے جیئوں، یہ تنہا سوچیں، یہ بے یقینی، یہ نا طلب قوتیں، ان سب کا کیا کروں۔ کتنا لڑ سکتا ہوں، موت کیلئے تو تیار ہوں، اگر یہ سب کچھ نا قابل معافی گناہ ہے تو مجھے موت چاہیے۔ نہیں جیا جا رہا اس طرح۔ ہر آنکھ میں گناہگار بن کر۔''

''بیروں۔'' میں نے آواز دی۔ ''سامنے نہ آنا، مجھ سے بات کرو۔'' اور بے شمار آوازیں میرے کانوں میں اُبھرنے لگیں۔ وہ نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

''سنو سنو، میری بات سنو، جو کچھ تم نے میرے کہنے سے چھت پر لا پھینکا ہے اسے واپس اُٹھا لو۔ جہاں سے لائے ہو وہاں واپس پہنچا دو۔''

''نہیں پورنا، نہیں بھگت، وہ پورنا دان ہے تیری پہلی مانگ ہے وہ واپس نہ کر۔ ہماری بھینٹ سویکار کر۔ نہیں بھگت ایسا نہ کر۔ یہ ہماری موت ہوگی۔'' آوازیں آئیں اور میں خاموش ہو گیا۔

دُوسری صبح بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ حویلی کے رہنے والے بری طرح بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ بڑی مشکل سے اوم پرکاش جی ہاتھ لگے تھے۔

''کچھ ہو گیا کیا؟''

''وہی جو ہونا تھا۔'' اوم پرکاش جی آہستہ سے بولے۔

''کیا؟''

''پوری حویلی میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ چھت پر پھولوں کے انبار سب کو پاگل بنائے ہوئے ہیں۔ سب اُوپر جا رہے ہیں اور نیچے آ رہے ہیں۔''

''مادھو لال جی کیا کر رہے ہیں۔'' اوم پرکاش نے فوراً جواب نہیں دیا کچھ دیر سوچ کر بولے۔

''تقریباً پاگل ہو چکا ہے۔ ساری رات چھت سے سونے چاندی کے تھال اُتارتا رہا ہے۔ حویلی کے نیچے قید خانے میں اس نے وہ سارے تھال چھپا دیئے ہیں۔ خود یہ سب کچھ کیا ہے اور تھک کر نڈھال ہو گیا ہے۔ میرے کمرے میں بھی آ گھسا تھا۔ میرے پیروں سے لپٹ کر بھوں بھوں روتا رہا ہے۔ کہتا ہے کہ آدھی دولت میں لے لوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے باہر نکالا۔ اب دُوسرے کمرے میں دری بچھائے لیٹا ہے اور سر پر برف کی تھیلیاں رکھوا رہا ہے۔''

''اوہ۔ یہ تو برا ہوا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے پاگل ضرور ہو جائے گا۔ ویسے یہ بہت بڑی سزا ہے اس کے لیے اور...... اور مجھے اس سے بڑی عبرت حاصل ہوئی ہے۔ آپ سے بھلا کیا چھپا سکوں گا مسعود صاحب۔ آپ جو کچھ ہیں میری توقع سے کہیں بڑی بات ہے، میں تو حیران ہوں کہ ایسی مہان شخصیت مجھے کیسے مل گئی۔ آپ آکاش سمان ہیں مسعود صاحب دُوسروں کو آپ یہ سب کچھ دے سکتے ہیں اور خود ریلوے کے بابو سے کہتے ہیں کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ رات مجھ پر بھی کٹھن گزری ہے اس دولت کے بارے میں سوچتا رہا ہوں جو چھت پر پڑی ہوئی تھی۔ لالچ بھی آیا دل میں۔ مگر...... اب آپ کے بارے میں سوچتا ہوں۔

آپ نے سب کچھ ٹھکرا رکھا ہے تو اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ ضرور کچھ وجہ ہوگی۔"

میں نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اوم پرکاش جی بولے۔ "کاشی چلو گے میرے ساتھ۔"

"کیوں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔"

"ضرور چلوں گا۔"

"دراصل میں نے اپنے بیٹے کو ریلوے اسٹیشن بھیج دیا ہے۔ ٹکٹ لینے کیلئے، ہمیں فوراً چلنا ہے۔ اس پاگل خانے میں میرا دَم گھٹ رہا ہے۔ میں فوراً یہاں سے نکل چلنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اب ایک ایک کر کے یہ سب پاگل ہو جائیں گے۔ چمتکار دیکھنا چاہتا تھا مادھو لال۔ دیکھ بیٹا۔ اب خوب دیکھ چمتکار۔" اوم پرکاش جی نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

پنڈت اوم پرکاش جی کو اپنا ایمان بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ بال، بچوں کے ساتھ مقدس یاترا کو نکلے تھے اور یہاں پڑے جا رہے تھے دولت کے پھیر میں۔ مادھو لال نے آدھی دولت کی پیشکش کر دی تھی اور یہ آدھی دولت اتنی تھی کہ اوم پرکاش جی نے ساری عمر نہیں کمائی تھی۔ انہیں پارس پتھر ملا تھا مگر یہ پتھر ان کے بجائے مادھو لال کو چھو گیا تھا۔ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ تقدیر کو انہیں اس مصیبت سے نکالنا تھا کہ ان کے بیٹے کو بنارس کے ٹکٹ مل گئے۔ بارہ بجے ریل روانہ ہونے والی تھی۔ مادھو لال تو واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ کسی سے مل ہی نہیں رہا تھا۔ رخصت ہوتے ہوئے ہم مادھو لال کے اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جسے وہ بند کئے بیٹھا تھا۔

"پتا جی...... دروازہ کھولیے۔" مادھو لال کے بیٹے نے آواز لگائی۔

"ابے کیوں بار بار آ جاتا ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اوم پرکاش چاچا جا رہے ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہیں......؟"

"بنارس۔"

"کہاں ہیں؟"

"یہ کھڑے ہیں دروازے پر۔" مادھو لال کا بیٹا بولا۔

"تو بھاگ جا یہاں سے، بات کروں گا میں ان سے۔" مادھو لال کا بیٹا تو نہ گیا مگر مادھو لال دروازے پر آ گئے تھے۔

ان کی آواز ابھری۔ "اوم پرکاش! آدھی لے لو۔ تمہیں بھگوان کا واسطہ، آدھی لے لو۔"

"میں جا رہا ہوں مادھو لال! جیتا رہا تو واپسی میں تم سے ملوں گا۔"

"میں الگ کر لوں گا۔ دھرم ایمان سے آدھی تمہاری......" مادھو لال بولا اور اوم پرکاش جی وہاں سے پلٹ آئے۔ کچھ دیر کے بعد ہم لوگ اسٹیشن پہنچ گئے اور پھر ریل ہمیں لے کر چل پڑی۔ اوم پرکاش میرا بڑا احترام کر رہے تھے۔ ویسے حالت ان کی بھی زیادہ بہتر نہیں تھی۔

"مسعود جی۔ بھگوان نے یہ سونا چاندی بھی کیا چیز بنائی ہے۔ اس کے سارے کھیل نیارے ہیں مگر ساتھ ہی اس نے منش کو صبر بھی دیا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہنسی ہنسی میں دھن دولت کے انبار لگا کر پھینک دیتا ہے اور ایک وہ جو ان پھینکی ہوئی چیزوں کو اٹھا کر پاگل ہو جاتا ہے۔"

"ہاں اوم جی۔ ملتا کسی کو کچھ نہیں ہے۔"

"وہ کونسی شکتی ہے مسعود جی جو انسان کو دھن دولت سے نفرت کرا دیتی ہے۔"

"ایمان...... اللہ پر ایمان! جو کچھ اس کائنات میں ہے، اس کا ہے۔ اسے اپنا سمجھنا حماقت ہے۔ جو سامنے آ جائے،

اسے اس کا سمجھ کو دیکھو۔ اپنا سمجھ کر نہیں، تمہارا کچھ بھی نہیں ہے۔ جب تمہاری سانسیں تمہاری اپنی نہیں تو اور کیا چیز ہوگی۔ لالچ اور ہوس سے دوسروں سے چھین کر جو چاہو اکٹھا کرلو، اسے کہیں لے جاؤ تو مانیں۔ سب کچھ رہ جائے گا اور تم ہاتھ پسارے چلے جاؤ گے۔"

''اوم پرکاش! سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر میرے ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''ایسے کچھ بول اور بول دو مہاراج......! میرا بھلا ہوجائے گا۔''

''کیوں اوم پرکاش جی۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''نیک دل سے تیرتھ یاترا کو نکلا تھا کہ یہ کھیل سامنے آ گیا۔ غلطی میری بھی نہ تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا اور اب من ادھر ہی اٹکا ہوا ہے۔ مادھو لال تو کروڑ پتی بن گیا اور...... چولہے میں جائے سب کچھ! ارے کیا کروں گا میں سونے چاندی کا، سب دوسروں کے کام ہی آئے گا۔'' اوم جی خود کو سمجھا رہے تھے۔ سفر جاری رہا۔ ان پر کیا بیت رہی ہے، میں نہیں جانتا تھا میرے اپنے ہی تفکرات کیا کم تھے۔ اب تو درد حد سے گزر چکا تھا، دوا کی حاجت ہی ختم ہوتی جارہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دوں۔ خود کچھ نہ کروں۔ کوئی کچھ کرتا ہے تو کرنے دوں۔ آنکھیں بند کر کے سو جانے کو جی چاہتا تھا۔

بنارس آ گیا۔ مندروں کی دنیا! ہندو، مسلمان کی ملی جلی آبادی، یاتریوں کے ہجوم۔ عقیدت مندوں کے ڈیروں کے درمیان اوم پرکاش جی نے بھی ڈیرہ جما لیا۔ دولت مند انسان تھے۔ جیسا چاہتے، بندوبست کر سکتے تھے مگر بڑی عقیدت سے آئے تھے اس لئے سارے کام وہی کرنا چاہتے تھے جو ان کے دھرم کے مطابق ہوں۔ مجھے ساتھ تو لے آئے تھے مگر اب شاید سوچ رہے تھے کہ میرا کیا کریں۔ وہ خود اپنے مخصوص انداز میں پوجا پاٹ کرنا چاہتے تھے۔ ایسے میں میرا ساتھ چھوڑنا ضروری تھا۔ بولے۔ ''مسعود میاں! تمہارا جہاں جی چاہے سیر کرو، ہم پوجا کریں گے۔ ڈیرہ تمہارا ہے۔ جیسے من چاہے رہو، شام یہاں بتا دیا کرو۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں اوم پرکاش جی! میں اپنی جگہ تلاش کرلوں گا۔'' میں نے انہیں اطمینان دلا دیا۔ پھر میں ڈیرے سے چل پڑا۔ کاشی واقعی ہندو دھرم کی بڑی مقدس جگہ ہے۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ آئے ہوئے تھے بلکہ شاید نیپال، سری لنکا اور بھوٹان کے یاتری بھی تھے۔ طرح طرح کے چہرے، طرح طرح کے نقوش! عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، نوجوان لڑکیاں، طرح طرح کے سوانگ اور روپ!

رات کے کوئی دس بجے تھے۔ ایک پرانے مندر کے قریب بیٹھا میں آنے جانے والے یاتریوں کو دیکھ رہا تھا۔ چار آدمی ایک لمبے تڑنگے شخص کے پیچھے بڑی عقیدت سے چلتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔ لمبے تڑنگے شخص کے سر کے بال کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے سر سے پاؤں تک دھوتی جیسا لباس لپیٹا ہوا تھا، بازو کھلے ہوئے تھے، سینے تک داڑھی تھی، آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا۔ مجھ سے چند قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ چاروں آدمی بھی میری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ وہ شخص پلٹ کر میرے قریب آ کھڑا ہوا اور میں بھی کسی قدر گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''آپ یہاں مہاراج...... آپ یہاں کب آئے؟''

''آج......'' میں نے بدستور گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ میں اسے بالکل نہیں پہچان سکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر کہا۔

''مجھے میرے بہت پرانے دوست ملے ہیں، کچھ دیر ان سے بات کروں گا۔ آپ لوگ اپنے استھان پر جائیں اور آرام کریں، کل پھر ملیں گے۔'' وہ چاروں ہاتھ جوڑ کر جھکے اور واپس چلے گئے۔ جب وہ دور نکل گئے تو اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کالی شکتی والے! یہ بھگوان دوار ہے، یہاں تیرا کیا کام......؟''

''تم کون ہو، میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔''

''ساگر سروپ ہے ہمارا نام! تو ہمیں کیا پہچانے گا۔ ہم نے تجھے اوش پہچان لیا ہے۔''

''کیا جانتے ہو میرے بارے میں۔''

''تیرے شریر سے کالی بساندھ اٹھ رہی ہے۔ تیری پہچان کے لیے یہ کافی ہے۔''

''اوہ! میں سمجھا کچھ اور جانتے ہو تم میرے بارے میں۔'' میں نے گہری سانس لے کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا کر رہا ہے یہاں......؟''

''یاترا!'' میں نے کہا اور ہنس پڑا۔

''بھسم ہو جائے گا۔''

''کیوں......؟''

''کالی گندگی لے کر تو بھگوان کے چرنوں میں جائے گا۔''

''تم بڑے گیانی معلوم ہوتے ہو۔ فوراً کالی شکتی کو پہچان لیا۔ اس سے آگے بھی کچھ جانتے ہو یا اتنا ہی......؟'' وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''اپنے دونوں ہاتھ سامنے کرو۔'' اس نے کہا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ تھوڑی بہت روشنی ہر جگہ سے چھن رہی تھی۔ وہ میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیر تک وہ میرے ہاتھوں پر نظریں جمائے رہا۔ پھر اس کے منہ سے ایک چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ارے اوہ...... اوہ......'' اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور پھر ہاتھ آگے بڑھا کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے پھر آہستہ سے بولا۔

''جیوتش ودیا پر وشواس رکھتے ہو؟''

''خود بولتے رہو ساگر سروپ جی! ہم سے کچھ نہ پوچھو۔''

''ہم نے تھوڑا سا جیوتش کا علم سیکھا ہے۔ تمہاری ریکھاؤں میں جو نظر آرہا ہے، وہ عجیب ہے۔ کچھ کہہ سکو گے؟ کچھ پوچھیں بتاؤ گے؟''

''اگر بتانے کی بات ہوئی تو!''

''ہندو دھرم سے نہیں ہو۔'' وہ میرے ہاتھوں پر نظریں جما کر بولا۔

''آگے چلو!''

''وقت کے مارے ہو، مگر شکتی مان ہو۔ بڑا دل رکھتے ہو مگر دکھوں سے بھرا......! کالا جادو جانتے ہو مگر...... مگر......! کرتے نہیں ہو۔''

''اور!''

''حیرانی کی بات ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والی تمہاری ریکھائیں عجیب ہیں۔ ریکھاؤں میں سارے جیون کی کہانی نہیں ہوتی۔ ستاروں کی چال بدلتی رہتی ہے، ریکھائیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں مگر سب سے زیادہ ایک بات حیران کر رہی ہے۔''

''کیا......؟''

''تمہارا دھرم کیا ہے......؟''

''کیا کالا جادو صرف ہندو جانتے ہیں؟''

''نہیں جو بھی شیطان سے قریب ہو جائے، جو اسے دیوتا مان لے، دھرم کی قید نہیں ہوتی لیکن شیطان کا ایک ہی دھرم ہوتا ہے یعنی شیطانیت! نہ پھر ہندو، ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، مسلمان! وہ سب شیطان کے چیلے ہوتے ہیں۔''

''تم خود کیا ہو؟''

''صرف انسان! بچپن سے گیان دھیان سے دلچسپی تھی۔ سب کچھ چھوڑ کر اس کی کھوج میں لگ گیا۔''
''کیا پایا......؟''
''شانتی......صرف شانتی!''
''جیوتش سیکھی؟''
''ہاں! ایک مہان آتما مل گئی تھی، اس نے اپنا گیان دے دیا۔''
''اور......!'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دیا۔
''میری ایک بات پوری نہیں کی۔ اپنی پوچھے جا رہے ہو۔''
''میں کچھ بھی نہیں ہوں، دو کوڑی کا انسان ہوں، کالا جادو نہیں جانتا۔ بس اس کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ راستے کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ تلاش کرتا رہوں گا اس وقت تک جب تک موت نہ آ جائے۔''
''اتنا انتظار کیوں کرتے ہو؟''
''پھر کیا کروں......؟''
''سورج کا سفر! دوڑنا پڑے گا۔ کرنوں کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔ رک گئے تو کبھی منزل نہ پاؤ گے اور پہنچ گئے تو فیصلہ ہو جائے گا۔ منزل کتنی دور ہے، کوئی نہیں جانتا مگر چلنا پڑتا ہے، دوڑنا پڑتا ہے، وہیں فیصلہ ہو جائے گا۔''
''سورج کا سفر......؟''
''ہاں!''
''کیسے......؟''
''میں بتا سکتا ہوں۔''
''بتاؤ!''
''ایسے نہیں۔ گرو ماننا پڑے گا، گرو دچھنا دینا پڑے گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا......'' میں نے پوچھا۔
''محنت سے کمائی کر کے چار لڈو۔ جب ہو جائیں، اسی جگہ آ جانا۔ انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ عجیب سا آدمی تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بہت بڑا ہو مگر چھوٹا بنتا ہو۔ سورج کا سفر، گرو دچھنا، محنت کی کمائی سے، محنت کی کمائی سے۔ کہاں سے کماؤں؟''
رات ہو گئی۔ بہت دور نکل آیا تھا۔ اوم پرکاش کا ڈیرہ کہاں ہے، یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ساگر سروپ یاد تھا۔ وہ جو کچھ کہہ گیا تھا، جی کو لگ رہا تھا۔ ایک سنسان گوشہ دیکھ کر وہیں پڑ رہا۔ وہاں صبح ہو گئی۔ کوئی دس بجے تھے۔ میں نے ایک ادھیڑ عمر مرد کو دیکھا ٹین کا صندوق سر پر رکھے، اس پر بستر رکھا ہوا تھا ساتھ میں اسی کی عمر کی عورت تھی جو دو وزنی تھیلے لٹکائے ہوئے تھی۔ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے قریب سے گزرا تو گردن گھما کر مجھے دیکھا اور صندوق سے بستر گر پڑا۔ اس نے صندوق بھی بستر پر پھینک دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ عورت نے تھیلے زمین پر پٹخ دیئے۔
''اب آگے ناہیں بڑھو گے کا؟'' عورت غصے سے بولی۔
''ارے چپ! آگے کی بچی...... کھپڑیا پچک کر سڑا ہوا خربوزہ بن گئی اور تے کہے ہے آگے بڑھو۔'' مرد جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''اور پکڑ دیا پائی پائی داتن سے۔ یاترا کو آویں کی کا جرورت تھی؟ گھر کو ہی کاسی جی بنا لیتے۔''
''اور ریل کا کرایہ تے جیسے تیرے میکے سے آیا تھا۔ وہ سسر پندرہ روپے مانگ رہا تھا۔ ہم نے آٹھ لگا دیئے تب بھی نہ مانے۔'' مرد نے کہا اور پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ''ارے بھائی اور بے بھائی! ارے ذرا ادھر آنا

میرے بھائی! ارے مزدوری کرے گا کیا رے۔ یہ سامان اُٹھا کے ذرا تلسی نواس پہنچا دے بھیا! ایک بکس اور ایک بستر ا ہے رے بھائی!''

''ارے ارے تمہاری کھوپڑیا تے بگیا مچی کھر بوجا بن گئی ہے۔ مجدورلاگے ہے تمہیں کا'' عورت نے مرد کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ایں؟'' مرد مجھے دیکھنے لگا مگر میرے ذہن میں چھناکا ہوا تھا۔ مزدوری، محنت کی کمائی۔ یہ محنت کی کمائی ہی ہوگی۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کتنے پیسے دوگے؟''

''ارے چار روپے دیں گے پورے!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گردن ہلا دی اور پھر وزنی بکس بستر اٹھا کر سر پر رکھ دیئے۔ عورت نے دونوں تھیلے میرے بازوؤں میں لٹکا دیئے تھے۔ میں چل پڑا اور پھر انہیں تلسی نواس مندر پہنچا دیا۔ بہت سے یاتری یہاں موجود تھے۔ مرد نے سامان ایک جگہ رکھوا دیا اور پھر انٹی سے مڑے تڑے نوٹ نکالے اور گھگھیا کر بولا۔ ''ارے تین روپے لے لے بھائی تیرا بھلا ہوگا۔''

''بھگوان تمہیں سیدھا کرے۔ نکالو پانچ روپے اور اسے دو۔'' عورت جھلا کر بولی۔

''اری او ساہوکارنی! پانچ روپے کا ہے کے رہی۔''

''یہ تھیلے جو اٹھائے ہیں اس نے!'' ''تے یہ سامان نہیں کیا...... ارے لے بھائی! ایک روپیہ اور لے۔ تو جا اس ساہوکارنی کو تو ہم دیکھ لیں گے۔'' مرد نے ایک روپیہ اور دے کر جان چھڑائی۔ میں چار روپے لے کر پلٹا تو اپنے عین سامنے اوم پرکاش جی کو کھڑے پایا۔ وہ تند نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مزدوری......!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کیوں......؟''

''میری بھی ضرورتیں ہیں اوم پرکاش جی! آیئے یہاں کہاں؟''

''مجھے دکھ ہوا ہے مسعود میاں! میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے، بتا نہیں سکتا اور تم......!''

''دوسرے لوگ کہاں ہیں؟''

''وہ موجود ہیں۔ رات کو بھی ڈیرے پر واپس نہیں آئے؟''

''بس! آپ کی کاشی دیکھ رہا ہوں۔''

''ایسے......؟'' وہ شکایتی انداز میں بولے۔

''ہاں! اپنا اپنا انداز ہے۔'' میں نے کہا۔ دوپہر ڈھلے تک اوم پرکاش کے ساتھ رہا پھر موقع پا کر دوبارہ نکل بھاگا۔ وہ لوگ پوجا پاٹ میں مصروف تھے، مجھے موقع مل گیا۔ تلاش کر کے میں نے ایک دکان سے لڈو خریدے۔ دو روپے کے مل گئے تھے۔ ایک فقیر نے ہاتھ پھیلایا تو بچے ہوئے دو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پھر اس جگہ پہنچ گیا جہاں ساگر سروپ ملا تھا۔ بے شمار لوگ ادھر سے ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ ایک شخص ٹاٹ کی بوری سر پر رکھے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تبھی مجھے ''شی شی!'' کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا۔ ساگر سروپ نے بوری اُتار کر بغل میں دبائی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ آؤ چلیں یہاں سے!'' ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ پھر وہ کافی دور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ''لڈو لے آیا بیٹا......؟''

''ہاں...... یہ ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ گرو بھگتی کر۔ ایک لڈو ہمارے منہ میں رکھ۔'' انہوں نے کہا اور میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ انہوں نے ایک لڈو اٹھا کر میرے منہ میں رکھا اور بولے۔ ''اب ہمارے چرن چھو کر ماتھے سے لگا۔ ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے دوزانو بیٹھ جا۔''
''کیا......؟'' میں حیرت سے بولا۔
''ہاں! یہ گرو کا احترام ہے۔''
''نہیں ساگر سروپ جی! یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔ کچھ ہو یا نہ ہو مگر یہ نہیں ہوگا۔'' میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور ساگر سروپ مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ پھر مسکرا کر بولے۔
''مسلمان ہے۔ مسلمان ہے تجھ سے تیرا دھرم کون چھین سکتا ہے بھلا۔ سب سسرے بے وقوف ہیں، پاگل ہیں۔ آ یہاں بیٹھ جا میں تجھے بتاؤں سورج کا سفر کیا ہے۔ آ بیٹھ جا! تو فولاد ہے، تجھے کوئی آسانی سے نہیں توڑ سکتا۔'' میں بیٹھ گیا۔
''میرے ساتھ چلنا ہوگا تجھے۔''
''کہاں......؟''
''زیادہ دور نہیں۔ بس کسی بھی ایسی جگہ جہاں رکاوٹیں نہ ہوں۔ جو بتاؤں وہ کرنا ہوگا۔''
''میرے حکم نہ ماننے سے آپ ناراض تو نہیں ہوئے ساگر جی!''
''نہیں! تیرا دھرم پتا چل گیا۔ مسلمان کسی کو وہ تعظیم نہیں دیتے جو ان کے رب کے لیے مخصوص ہے۔ اس پر تو لاکھوں گردنیں کٹی ہیں، اتنا مجھے معلوم ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ دے۔ کیا کہتا ہے چلیں......؟''
''جیسا آپ پسند کریں۔''
''تو نے لڈو کھلایا ہے بھائی! اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔'' ساگر سروپ ہنستے ہوئے اٹھ گئے اور پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ ساگر سروپ نے کہا تھا کہ کچھ دور جانا ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہم آبادیوں کو پیچھے چھوڑ آئے۔ جنگل شروع ہو گئے۔ جھٹپٹا ہوا، چڑیوں کا شور، بندروں کی خوں خوں ابھرتی رہی۔ پھر رات ہو گئی۔ نہ وہ رکے نہ میں! نہ وہ تھکے نہ میں اور جب چاند نکلا تو ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بدشکل ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف ابھری ہوئی ناہموار زمین، سوکھے درخت، مکمل خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔
''یہ جگہ ہے۔'' ساگر سروپ نے کہا اور رک گیا۔ چاروں طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''سورج وہاں سے بلند ہوگا۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا تھا۔
''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''
''راستہ چاہتا ہے نا......؟''
''ہاں! راستہ چاہتا ہوں۔''
''سورج تجھے راستہ بتائے گا۔ اجالا ہونے سے پہلے تیار ہو جانا، اپنے بدن کو ہوا کا بدن بنا لینا، کسی سے مدد نہ مانگنا پھر جب سورج سر ابھارے گا تو اس کی کرنیں زمین کی طرف لپکیں گی۔ جو کرن پہلے زمین کو چھوتی ہے، وہ سرتاج ہوتی ہے۔ اس کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہزار رنگ تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر دوڑتی ہے، دور تک سورج کا پیغام لے جانے کے لیے! اس دن کی بادشاہی اسے ملتی ہے۔ تجھے سرتاج کرن کے ساتھ ساتھ دوڑنا ہوگا۔ اس کی رفتار کے ساتھ۔ کرن کھو گئی تو تیرا مستقبل بھی کھو جائے گا اور تو نے اس کا ساتھ دے لیا تو منزل پر پہنچ جائے گا۔ وہاں تجھے تیرا مستقبل مل جائے گا۔ بس یہی بتانا تھا تجھے!''
''یہ سب کیا ہے؟''

"بھگوان ہی جانے!" ساگر سروپ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"مجھے تو یہ کہانی لگتی ہے۔"
"یہ سچی کہانی ہے۔"
"پہلے میں نے یہ کرن کہانی نہیں سنی۔"
"بہت سوں نے نہ سنی ہوگی، تو ہی کیا لیکن یہ کرن سب کے لیے ہوتی ہے۔ سورج کی اس کرن کو پکڑ لیا جائے تو سارے کام بن جاتے ہیں۔ تو نہیں جانتا، بہت سے نہیں جانتے مگر پنکھ پکھیرو جانتے ہیں۔ وہ پرواز کرتے ہیں، اس کرن کے ساتھ......! تو کیا سمجھتا ہے پنکھ پکھیرو بھگوان کے داس نہیں ہوتے، سب اسے جانتے ہیں، سب اسے پہچانتے ہیں، اس کی پوجا کرتے ہیں، اس کی عبادت کرتے ہیں، اسے سانچی مانتے ہیں۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے اسے یاد کرتے ہیں۔ کرن کے ساتھ دوڑنے میں کچھ رہ جاتے ہیں، کچھ پار لگ جاتے ہیں۔ جو رہ جاتے ہیں، وہ دوسری صبح پھر جاگ جاتے ہیں اور کرن کے پیچھے دوڑتے ہیں۔"
"کرن کہیں جا کر رکے گی؟"
"ہاں! کرنوں کا ملاپ ہو جائے گا، دھوپ پھیل جائے گی۔"
"وہاں میں کیا کروں گا؟"

✦✧✦✧✦

"یہ میں نہیں جانتا۔ اب میں چلتا ہوں۔" ساگر سروپ نے کہا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ ساگر سروپ مجھ سے کچھ کہے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔ میں اب اس سے کیا کہتا، خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس وقت تک جب تک وہ چاندنی میں مدغم نہ ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ یقیناً آبادی سے بہت دور نکل آئے تھے۔ چاندنی کے سوا کہیں روشنی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے ایک جگہ منتخب کی اور بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر خود کو امتحان میں ڈالا تھا مگر یہ انوکھا امتحان تھا، انوکھی کہانی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ساگر سروپ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ایک دو بار یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں یہ بھی بھوریا چرن کی کوئی چال نہ ہو۔ کیا یہ ہو سکتا ہے، نہ جانے دل کیوں نفی میں جواب دے رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہے، یہ کھیل ضرور کھیلوں گا۔ ایک مناسب جگہ منتخب کر کے لیٹ گیا۔ دل میں بہت سے وسوسے تھے۔ اگر سو گیا تو سوتا نہ رہ جاؤں۔ جاگتا رہا تو صبح تک نیند سے نڈھال ہو جاؤں گا۔ پھر کیا کروں...... بچپن کی ایک بات یاد آ گئی۔ ماں نے بتائی تھی۔ امتحان دے رہا تھا، رات کو دیر تک پڑھتا تھا۔ ماں نے کہا۔
"اتنی دیر پڑھنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔"
"اور امتحان......؟"
"سال بھر پڑھو تو آخری دنوں میں یہ مشکل نہ اٹھانی پڑے۔"
"اب تو پڑھنا ہی ہوگا۔"
صبح کا سہانا وقت اس کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے۔"
"صبح آنکھ نہیں کھلتی۔"
"ایک کام کیا کرو۔ رات کو جب سویا کرو تو اپنے ہمزاد کو ہدایت کر دیا کرو کہ وہ تمہیں اس وقت جگا دے۔ دیکھ لینا اس وقت جاگ جاؤ گے۔"
"ہمزاد کیا ہوتا ہے؟"
"بس ہوتا ہے۔" ماں شاید خود بھی اس کی تشریح نہیں کر سکتی تھی۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا مگر پھر تجربہ کر ہی ڈالا۔ میں نے ہمزاد کو حکم دیا کہ مجھے صبح پانچ بجے جگا دے اور پہلے ہی دن اس وقت آنکھ کھل گئی۔ جب گھنٹہ پانچ بجے کا اعلان کر رہا تھا۔

اس کے بعد بارہا یہ تجربہ کیا اور کامیاب رہا۔ بہت عرصے کے بعد ہمزاد کا خیال آیا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ مجھے ساڑھے چار بجے جگا دے اور پھر کھردری زمین پر لیٹ کر نیند کی خوشامدیں کرنے لگا۔ نیند چپکے سے آنکھوں میں آبسی تھی۔ یقیناً وہ ساڑھے چار بجے کا وقت ہی ہوگا، جب جاگ گیا تھا۔ سوتے ہوئے کروٹ بھی نہ بدلی تھی۔ اتنی گہری نیند آئی تھی مگر اس نیند نے تھکن اتار دی تھی۔ اٹھ گیا، آنکھیں مل کر صاف کیں۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ دل میں آج کے آنے والے وقت کا خیال آیا اور دل ہولنے لگا۔ میں یہ عمل کرسکوں گا یا نہیں! خود کو پرعزم کرنے لگا۔ اجالا آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ ماحول روشن ہوگیا اور میں اس کھلاڑی کی طرح تیار ہوگیا جو اسٹارٹنگ پوائنٹ پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ ساگر سروپ نے سورج کی سمت بتا دی تھی۔ میں نے اچھل اچھل کر پاؤں کھولے اور ادھر نظریں جما دیں۔ سورج کا یہ کھیل زندگی میں دیکھنا تو کجا سوچا بھی نہیں تھا مگر کیا اہمیت تھی اس کھیل کی......!

سورج بلند ہوا۔ کرنوں کا سیلاب امڈ آیا اور میری نظریں زمین کا طواف کرنے لگیں۔ سرتاج کرن زمین کو چھوتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے چھلانگ لگا دی۔ اس کے رخ کا اندازہ ہوگیا تھا۔ دانت بھنچ گئے، مٹھیاں بند ہوگئیں اور میں دوڑنے لگا۔ تیز ہوا نے کان بند کر دیئے، بدن کا رواں رواں دوڑ رہا تھا۔ اس وقت اسے انسانی قوت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں گم ہوگئی تھیں بس بصارت زندہ تھی اور میں کرن پر جیسے سواری کئے ہوئے تھا۔ شاید اس رفتار سے کسی انسان کو دوڑتے ہوئے کبھی نہ دیکھا ہوگا کیونکہ دیکھنے والا اس جگہ کون تھا۔ کچھ لمحات کے بعد ہی اپنی خام خیالی کا احساس ہوا۔ میں تنہا نہیں تھا۔ یقیناً میں تنہا نہیں تھا، بہت سے پرندے میرے سر پر سفر کر رہے تھے۔ بہت سے چوپائے بھاگ رہے تھے۔ یہ کائنات کی سب سے حیرت ناک دوڑ تھی جو ہر صبح ہوتی ہے مگر انسانی آنکھ نہ اسے دیکھتی ہے، نہ سمجھتی ہے۔ پھیپھڑے پھٹ گئے تھے، بدن ٹوٹ گیا تھا مگر ہمت ساتھ دے رہی تھی۔ اندازے ختم ہوگئے تھے۔ یہ تصور بھی نہیں کرسکا تھا کہ کتنا فاصلہ طے ہوا ہے۔ بس سرتاج کرن تھی اور میں......! ساری کائنات دوڑ رہی تھی۔

پھر اچانک سرتاج کرن گم ہوگئی۔ دوسری کرنوں نے اسے آلیا تھا اور اسے گود میں اٹھا کر گم ہوگئی تھیں۔ دھوپ پھیل گئی۔ سامنے ہی ایک تیز رفتار ندی کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب درخت اور گھاس نظر آرہی تھی۔ سرتاج کرن کے گم ہوتے ہی میرے پیروں کی رفتار سست ہوگئی۔ اعصاب نے بریک لگائی، بدن کو کئی جھٹکے لگے اور میں چکرا کر گر پڑا...... نیچے گھاس تھی۔ بدن کئی بار تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ یوں لگا جیسے بدن سے روح نکل گئی ہو اور میں بے جان ہوگیا۔ سکون ایک لامتناہی سکون! خاموشی سناٹا اور یہ سناٹا بڑا فرحت بخش تھا۔ آہ......! موت کتنی حسین ہے۔ شاید میں مر گیا...... بس پھر میں مر گیا...... مگر موت جیسی حسین شے اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ مجھے جگا دیا گیا۔ بتایا گیا کہ میں زندہ ہوں، زیر امتحان ہوں اور امتحان اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ ایک ننھا سا خوش رنگ پرندہ میرے سر پر بیٹھا آہستہ آہستہ میری پیشانی پر چونچ مار رہا تھا۔ میرے بدن کو جنبش ہوئی تو وہ پھر سے اڑ گیا۔ زندگی کے احساس نے پوری طرح بیدار کر دیا۔ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ندی کا شور مسلسل اٹھ رہا تھا، سیبوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ درخت نظر آئے جن پر سیب جھول رہے تھے۔ آسانی سے اٹھ گیا۔ سیب توڑے اور انہیں چبانے لگا۔ خوب پیٹ بھر گیا پھر ندی سے پانی پیا۔ شام جھک رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد تاریکی نیچے اتر آئی۔ دل میں کوئی خیال نہیں تھا۔ پرندے نظر آرہے تھے کسی انسانی وجود کا نشان نہیں تھا لیکن کچھ دیر کے بعد کھنکارنے کی آواز ابھری اور میں سہم گیا۔

''آؤ!'' کسی نے کہا اور میں آنکھیں پھاڑنے لگا ''رکتے کیوں ہو آگے بڑھو......'' آواز نے کہا۔

''کون ہے...... کہاں ہو تم......؟'' میں ڈری ڈری آواز میں بولا۔ ''جستجو...... صرف جستجو! قدم آگے بڑھاؤ۔'' لہجہ کرخت تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر قدم بڑھاؤں۔ بہرحال! چند قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ ''بڑھتے رہو، رکتے کیوں ہو۔'' کہا گیا تب مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے آگے آگے چل رہا ہے۔ میں نے قدموں کی چاپ سے قدم ملا دیئے اور مجھے ایک ایسے خطے میں لایا گیا جہاں درخت ایک دائرے کی شکل میں تھے یہاں انتہائی دلفریب خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ کچھ نظر

نہیں آ رہا تھا لیکن احساس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں رک گیا۔

''یہ ہے؟'' کسی نے کہا۔

''کیا نام ہے؟''

''مسعود احمد!''

''کیا جرم ہے؟''

''گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا۔''

ایک آواز ابھری۔

''اعتراض ہے۔''

''کیا......؟''

''وہ ملعون جانتا تھا۔ سمجھتا تھا۔ توبہ کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔''

''یہ فیصلہ روزِ حشر کا ہے۔''

''اس فیصلے کا یہاں ذکر کہاں۔''

''تو یہ اجتماع یہاں کیوں ہے؟''

''ہمارا فرض ہے۔''

''کیسے؟''

''ایک مسلمان کو مدد درکار ہے، ارواحِ خبیثہ کے خلاف!''

''مسلمان؟ رگوں میں دوڑتی غلاظت کے باوجود''

''یہ غلاظت اسے دھوکے میں ملی ہے۔''

''اس کا عمل کیا رہا۔''

''چند غلطیاں......!''

''توازن کیا ہے؟''

''کفارے کا پلڑا زمین سے لگا ہوا ہے۔''

''میزان درست ہے۔''

''پوری جانچ پڑتال کے ساتھ!''

''اس کے ساتھ تعاون مشیتِ ایزدی سے انحراف کا گناہ تو نہ ہوگا۔''

''قاضی صاحب فیصلہ کریں گے۔''

''مختصر تفصیل!'' نئی آواز نے کہا۔

''ابتداء...... نوجوانی کی سرکش عمر، رزقِ حرام کی طلب اور اس کی جستجو میں ایک سفلے کے پاس پہنچنا مگر پھر بے لوث خدمت اور ایک مزارِ پاک کو آلودہ نہ کرنے کا عزم جس کے نتیجے میں مصیبتوں کے پہاڑ اٹھائے پھرا ہے یہ!''

''مگر اسے موقع ملا۔''

''وہاں اس سے غلطی ہوئی۔ یہ دوسرا گناہ تھا۔''

''اس کے بعد......؟''

''خباثت سے مسلسل جنگ! اس کی قوتوں کے حصول کے باوجود ان سے مسلسل انحراف! صعوبتوں کی مسلسل برداشت، غیر دینی امور کو قبول نہ کرنا، بھٹکنا مگر سنبھلنا، کبھی زیر نہ ہونا، آپ کے لیے کچھ حاصل نہ کرنا۔ پلڑا بہت نیچے ہے۔''

''سزا مکمل ہے۔''

''اس کا فیصلہ کیسے ممکن ہے۔ ہاں! سفارش کی جاتی ہے، اس کی ایک اہم وجہ ہے۔''

''بتائی جائے۔''

''ہر خوف، ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کر اس نے خود کو مسلمان کہلوایا ہے۔ کبھی کسی مصلحت یا زندگی کے خوف نے اسے نام بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔

کوئی احساس اس سے اس کا دین نہیں چھین سکا۔''

''آہ...... یہ قابل غور ہے۔''

''فرض بھی ہے۔ باطل قوتیں اسے مسلسل زیر کر رہی ہیں لیکن یہ ثابت قدم رہا اور اس کی مدد ہم میں سے ہر صاحب دین پر فرض ہو گئی۔ ہمیں اس کے لیے دعا کرنی ہو گی کہ باطل قوتیں اس سے دور ہو جائیں۔ اپنی بساط کے مطابق اس کی رہنمائی ہم پر واجب ہے۔''

''دعا کرو! ہاتھ اٹھاؤ!'' اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ میرا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا، دماغ ساکن تھا صرف سن رہا تھا۔ میں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ پھر آمین کی گونج سنائی دی۔ پھر ایک آواز نے کہا۔

''اے شخص! عمل افضل ہے اور سب کو ہدایت [illegible] ئی۔ بے عمل پتھر ہوتے ہیں کہ ہل نہیں سکتے اور ہوا اور پانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہر ذی روح کو عمل دیا گیا تو ہماری عد[illegible] میں آیا اور فیصلہ حقائق کی بنیاد پر تیرے حق میں ہوا لیکن عمل صرف تجھے کرنا ہو گا۔ اس کے عوض ولایت نہ مانگنا، درویش نہ سمجھ بیٹھنا خود کو کہ یہ عمل صرف تیری ذات کی فلاح کے لیے ہے اور اس کا نتیجہ تیرے لئے بہتر ہو گا۔ سات جادوگرنیاں [illegible] پر مسلط کر دی گئی ہیں اور سترہ جادو تیرے وجود میں اتار دیئے گئے ہیں۔ ان سے چھٹکارا تیری ذمہ داری ہو گی۔ تجھے ان سات جادوگرنیوں کو ہلاک کرنا ہو گا اور صرف انسان رہ کر جب تک وہ عمل کریں گی اور تو ان کا شکار ہو گا، انسانوں کی مانند لیکن ہوش کے لمحات نہ کھونا، وہیں خود کو سنبھالنا اور حالات سے فرار حاصل نہ کرنا بلکہ ان میں شامل ہو جانا۔ تجھے ان کی صورتیں نہیں دکھائی جا سکتیں لیکن ایک رعایت ہو گی۔ ان کے ہاتھوں میں سات انگلیاں ہوں گی۔ بس! یہی ان کی پہچان ہے اور اس عمل کے لیے جو مشکلات تجھے پیش آئیں گی، ان میں تجھے مدد ملے گی۔ ان کا وعدہ ہے اور اس پر غور نہ کرنا نہ ہی اس کا تعاقب جو تیرا مددگار ہو۔ نہ ہی انحراف کرنا ان سے جو تیری قربت کے طالب ہوں اور یہ اس سفلے کا عمل ہی ہو گا جواب شروع ہو گا لیکن وہ تیرے طلسم سے واقف نہ ہو گا کہ اس سے زیادہ تحفظ تیرے لئے ممکن نہیں۔ بس اب جا! رات گہری ہو گئی ہے۔''

مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ میں مسلسل لرز رہا تھا، دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، اعصاب چیخ رہے تھے۔ خاموشی سے وہاں سے پلٹا اور واپس چل پڑا۔ جس سمت سے یہاں تک آیا تھا، وہ یاد تھی۔ سب کچھ ذہن میں گونج رہا تھا۔ ذہن اسے جذب کر رہا تھا نہ جانے کب تک چلتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ ہو گئی تو تھک کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر لیٹ گیا، پھر سو گیا۔ پھر کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

''ہم سے ناراض ہو گئے ہو مسعود میاں۔'' جھنجوڑنے والے نے کہا اور میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ اوم پرکاش تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر پر ایک درخت کی چھاؤں تھی۔ دن نکھرا ہوا تھا۔ آوازیں ابھر رہی تھیں۔ یاتری آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ وہی جگہ تھی۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' اوم پرکاش نے پھر پوچھا۔

''بس یہیں تھا۔''

''ڈیرے کا رخ بھی نہ کیا؟''

''بھول گیا تھا۔''

''ڈیرہ ہی بھول گئے تھے!''

''ہاں!''

''اور ہمیں۔''

''نہیں اوم پرکاش جی! آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''آؤ چلو، سب یاد کررہے ہیں۔'' میں اوم پرکاش کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد ڈیرے پر پہنچ گیا۔

''ارے یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ کپڑے چیکٹ ہوگئے ہیں، بالوں میں دھول اٹی ہوئی ہے۔ ست پرکاش! انہیں اشنان کراؤ۔'' اوم پرکاش کی دھرم پتنی نے کہا۔

''رہنے دیں چاچی! ٹھیک ہوں۔''

''ارے واہ! کیسے ٹھیک ہے۔ میں نے کپڑے منگوائے ہیں تمہارے لئے، جاؤ ست پرکاش کے ساتھ چلے جاؤ۔'' ست پرکاش نے میرے لئے لائے ہوئے کپڑے سنبھالے۔ پہلے ایک حجام کے پاس لے گیا، داڑھی بنوائی، بال بنوائے۔ یہاں سب کچھ تھا۔ ایک تالاب میں نہایا پھر کپڑے پہنے اور بال وغیرہ سنوار کر تیار ہوگیا۔ ست پرکاش مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''بڑے سندر لگ رہے ہو مہاراج! مگر کیا کریں۔ عمر میں ہمارے جیسے ہو، پر دوست پتا جی کے ہو اس لئے بے تکلفی سے بات بھی نہیں کرسکتے۔'' میں صرف مسکرادیا۔ ہم واپس آگئے۔ اوم پرکاش جی نے بھی مجھے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ باقی دن ان کے ساتھ گزارا۔ شام کو سب مندر چلے گئے۔ اوم پرکاش نہیں گئے تھے۔ کہنے لگے۔

''تمہاری وجہ سے رک گیا ہوں مسعود جی۔ سوچا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کروں۔''

''کہئے اوم پرکاش جی۔''

''سوچتا ہوں

اپنے ساتھ آنے پر مجبور کر کے میں نے غلطی تو نہیں کی ہے۔ تم مسلمان ہو اور یہاں ہر جگہ مندر پھیلے ہوئے ہیں اور پھر تم مسلمان بھی عام نہیں ہو، گیان دھیان والے ہو۔ اپنے دھرم کے عالم ہوگے۔ مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے اس بارے میں۔ پر من کی سچی بات بتاؤں۔ یہ سب کچھ میں نے جان کر نہیں کیا۔''

میں مسکراتی نظروں سے اوم پرکاش کو دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ ''آگے کہیں اوم پرکاش جی!''

''جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہاں میں نے تم سے ملنا چاہا تھا مگر تم کہیں اور چلے گئے تھے بعد میں نظر آئے تو بے اختیار میرا من چاہا کہ تمہیں ساتھ لے چلوں اور میں نے فوراً ہی بول دیا۔ میرا کوئی مطلب نہیں تھا۔''

''میں جانتا ہوں اوم پرکاش جی! آپ بھی یہ جان لیں کہ جو ہوتا ہے، اس کی ڈور کہیں اور سے ہلتی ہے۔ ہم سب تو کٹھ پتلیاں ہیں جو اس ڈور سے بندھے ناچتے ہیں۔ جسے جہاں سے جو ملنا ہوتا ہے، ملتا ہے۔ مادھولال کو دولت کی ہوس کی سزا ملنا تھی، ملی۔ آپ کو یہاں یاترا کر کے سکون ملا اور مجھے بھی کچھ ملا ہی ہوگا۔''

''تم تو مہان ہو۔ سنسار باسیوں کو دھوان دینے والا خود بوجھ اٹھا کر چار روپے کمائے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔''

''وہ چار روپے کتنے قیمتی ہیں، مجھ سے پوچھئے اوم پرکاش جی! اور پھر کس شکل میں کیا مل جاتا ہے۔ ہم چھوٹے دماغ والے کیا جانیں۔''

''میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ ان مندروں سے الجھتے تو نہیں ہیں؟''

''نہیں اوم جی! یہ کمزور لوگ اپنے عقیدوں سے اپنی تسکین کرتے ہیں۔ کسی کو بھلا کیا اعتراض! ویسے آپ کا خوب ساتھ رہا۔ بڑی محبت ملی آپ سے، بہت خیال رکھا آپ نے میرا......! کیا اب مجھے اجازت دیں گے؟''

''جانا چاہتے ہو؟''

''جانا تو ہوگا......آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں......!''

''تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟ دل کبھی تم سے ملنے کو چاہے تو کہاں تلاش کرسکتا ہوں۔''

''یہی سب سے مشکل جواب ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اوم پرکاش نے اداسی سے کہا۔ پھر بولے۔ ''کب جاؤ گے؟''

''کسی بھی دن، کسی بھی وقت!''

''سچ کہتا ہوں مسعود! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ تم مہان ہو مگر مجھے تمہاری ذات سے پیار ہوگیا ہے۔ بھگوان تمہیں خوش رکھے۔'' اوم پرکاش خاموش ہوگئے۔ پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے آرام کے لیے ایک جگہ تلاش کر لی اور سونے لیٹ گیا مگر سونے کہاں سوچنے کا بہت بڑا سہارا ملا تھا۔ بہت سے خیالات دل میں آرہے تھے۔ محنت کی کمائی کے چار لڈوؤں نے کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ راستہ ایک ہندو جوگی نے دکھایا تھا۔ کوئی بھی ہو جو نیکی کا سفر کرتا ہے، اسے روشنی ضرور ملتی ہے۔ میرا علم تو صفر تھا۔ میں کیا جانوں کہاں کیا چھپا ہے۔ بہر حال اب جو ہدایات ملی ہیں، انہیں سمجھنا ہے، ان پر عمل کرنا ہے۔ اب چوک نہیں ہونی چاہئے ورنہ کچھ باقی نہ رہے گا۔ ان ہدایات کو دل سے لگا لینا چاہئے۔

عمل افضل ہے۔ اس پر غور نہ کرنا نہ ہی اس کا تعاقب جو تیرا مددگار ہو۔ جو تیری قربت کے طالب ہوں، ان سے انحراف نہ کرنا۔ ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ سات جادوگرنیوں کو ہلاک کرنا ہے۔ یہ سات پوزنیوں کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ آہ......! کوئی تدبیر بنے، کچھ ہو۔ کیا ہونا چاہئے۔ محنت کی کمائی، چار لڈو! اس سے گریز کرتا رہا ہوں۔ کتنا عرصہ گزر گیا کسی نہ کسی پر انحصار کرتا رہا ہوں۔ پہلے رزق حلال کی تلاش افضل ہے۔ خود کو ادھر سے ادھر کٹی پتنگ کی طرح دوڑاتے رہنا، کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ عمل بے شک طویل ہوگا لیکن کرنا ہے، مجھے عمل کرنا ہے۔ آغاز کہیں سے ہو جائے۔ ملازمت کسی مناسب جگہ، اس کا تذکرہ اوم پرکاش جی سے بھی ہوسکتا ہے مگر بات نہ بن سکے گی۔ وہ مجھے دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کہیں دور یہ کوشش کرنا ہوگی۔ یہیں بنارس میں ہی سہی، کیا حرج ہے۔ یہ تو مندروں کی دنیا ہے، یہاں سے آگے تو پورا شہر پھیلا ہوا ہے۔ ہاں زیادہ دور جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس آخری احساس نے سکون بخشا تھا۔ پھر سو گیا تھا۔ صبح بہت جلدی آنکھ کھل گئی۔ صبح بنارس نگاہوں کے سامنے تھی۔ دل کو بہت خوشگوار کیفیت کا احساس ہوا تھا۔ کچھ سو رہے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔ میں اس خوشگوار صبح کا لطف لیتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ آج سے نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا، اس شہر میں تقدیر آزمانا چاہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ یہاں نظر آتے تھے۔ اس وقت بھی یاتری زندگی کی مصروفیات میں لگے ہوئے تھے۔ انسانوں کی ایک چوپال کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ لوگوں کے ساتھ میں بھی چونک پڑا۔ ایک لڑکی دوڑتی آرہی تھی۔ رخ اسی طرف تھا اور اس وقت میں بری طرح بوکھلا گیا جب وہ قریب آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

''رتنا...... رتنا جی...... رتنا جی!'' کچھ اور لوگ بھی میرے پاس آگئے۔ سفید ساڑھی میں لپٹی ایک معمر خاتون میرے پاس آگئیں۔ انہوں نے بھی میرا بازو پکڑ لیا اور روتے ہوئے دلدوز لہجے میں بولیں۔

''ہمیں نہیں پہچانتے رتنا! جو کوئی بھی ہو۔ ہمارا ساتھ تو رہا ہے۔ اسے دیکھو کون ہے یہ! دیکھو اسے یہ کون ہے؟'' میرا دماغ ایک دم جاگ اٹھا اور میرے منہ سے نکلا۔

''رما رانی......''

''جب بھی ملتے ہو، مندروں کے پاس ملتے ہو۔ دیوتا ہو، کنہیا ہو، کون ہو؟ مگر تم جیون دیتے نہیں لیتے ہو۔ اسے نہیں پہچانا تم نے......؟'' اب میں نے چونک کر خود سے لپٹی نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ کشنا تھی۔ سرخ و سفید، شوخیوں سے بھرپور! مگر اس وقت اجڑی ہوئی، چہرے پر وحشتیں بکھری ہوئیں، دبلی پتلی۔

''ہمارے نہیں ہو، حکیم ہی بن جاؤ...... مسیحائی کر دو ہماری! اسے موت سے بچا لو۔'' رما رانی کی آواز میں سسکیاں بھری ہوئی تھیں۔

''یہ کشنا...... کشنا ہے۔''

''میں رما ہوں جسے تم نے چند روز ماں کہا تھا۔ جس کی چھاتی سے لپٹ گئے تھے اور اس کے سینے میں تمہارا پیار جاگ

اٹھا تھا۔"

"آپ لوگ یہاں کہاں......؟"

"کچھ وقت دے دو گے ہمیں! بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ تم یہاں مل جاؤ گے مگر یہ جانتی تھی۔ بار بار یہاں آجاتی تھی۔ اس کا یقین سچا تھا۔ انہیں تھوڑا سا وقت دے دو۔ اس پیار کی قیمت کے طور پر جو میں نے تمہیں دیا تھا۔ میری محبت تم پر ادھار ہے رتنا......" رمارانی سسکنے لگیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں رمارانی! میں نے نمک کھایا ہے، آپ کا مجھے بتائیے کیا کروں۔"

"کوئی اور ہے تمہارے ساتھ......؟"

"ایں......نہیں کوئی نہیں۔" میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

"تو آؤ...... یہاں سے چلو......آؤ۔" رمارانی نے کہا۔ میں احمقوں کی طرح قدم بڑھانے لگا۔ کوئی بات جو سمجھ میں آرہی ہو، میرے پیچھے دو لڑکیاں آرہی تھیں۔ وہ رادھا اور لکشمی تھیں۔ کشنا مضبوطی سے میرا بازو پکڑے ہوئے تھی اور میری کھوپڑی ہوا میں معلق تھی۔

یہ احساس بھی تھا کہ لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی مجھے اس طرح پکڑے ہوئے ہے جیسے اسے میرے بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔ کچھ دور تو بوکھلاہٹ کے عالم میں چلتا رہا پھر کچھ سنبھل کر میں نے کشنا سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور کہا۔ "کشنا......! خود کو سنبھالو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں، دیکھو لوگ کیسے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

"چلے جاؤ گے۔ بھاگ جاؤ گے۔ کھو جاؤ گے۔ پھر نہیں ملو گے، مجھے پتا ہے۔ نہیں چھوڑوں گی میں......! نہیں چھوڑوں گی۔" اس کی آواز میں خوف تھا، تشویش تھی، دہشت تھی۔ میرا دل کٹنے لگا۔ وہاں شکتی پور میں بھی مجھے علم ہو گیا تھا کہ کشنا مجھے چاہتی ہے مگر کہانی ہی عجیب تھی۔ میں اس چاہت کی پذیرائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دماغی خرابی بتا کر انہوں نے مجھے جو چاہا سمجھ لیا یا بتا دیا مگر عالم ہوش میں تو یہ ممکن نہیں تھا۔ رمارانی نے بڑا پیار دیا تھا۔ سب محبت کرتے تھے مگر وہ ایسی جگہ تھی جہاں کوئی غیرت دار ایک لمحہ گزارنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ کشنا بہت شوخ، بہت معصوم تھی۔ عام لڑکیوں سے کسی طور مختلف نہیں تھی لیکن طوائف زادی......! ان ساری باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا تو بھی میں کیا کرتا......کوئی عقل میں آنے والی بات تھی؟

تانگوں کے اڈے پر آگئے۔ دو تانگے کئے گئے اور ہم چل پڑے۔ تانگے میں بیٹھ کر مجھے اس انوکھی گرفتاری پر ہنسی آگئی۔ رمارانی میرے پاس بیٹھی تھیں۔

"اکیلے آئے ہو بنارس......؟"

"نہیں...... کچھ لوگوں کے ساتھ!" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے اپنے ہیں؟" رمارانی نے سوال کیا۔

"نہیں!" میں نے گردن ہلائی۔

"تمہارے اپنے کہاں ہیں؟" پوچھا گیا۔

"پتا نہیں!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"طبیعت کیسی ہے؟" رمارانی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

"بھٹک ہی رہے ہو تو ہمارے پاس رہنا کیا برا تھا۔ کوئی تکلیف تھی وہاں؟"

"نہیں رمارانی!"

"پھر کیوں چلے آئے؟" رمارانی نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"اپنوں کی

تھی۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔
''نہیں ملے......؟'' پوچھا گیا۔
''نہیں!'' میں نے سسکی لے کر جواب دیا۔
''ہمیں اپنا سمجھ لو۔ کوئی کمی نہیں پاؤ گے۔ اب تو شکتی پور بھی چھوڑ دیا ہے ہم نے، یہیں بنارس میں رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔'' رما رانی کا لہجہ اداس تھا۔
''گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ آ گیا۔'' رما رانی نے تانگے والے کو اشارہ کیا۔
اسٹیشن کا وسیع و عریض مکان نظر آ رہا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی مکان نہیں تھا۔ ہاں ایک میدان نظر آ رہا تھا اور اس کے دوسرے سرے پر باقاعدہ آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ سب تانگے سے اتر گئے۔ دونوں تانگے والے پیسے لے کر چلے گئے۔ کشنا نے اسی طرح مجھے پکڑا ہوا تھا۔ اندر پہنچ کر رما رانی نے اسے پیار سے پکارا۔
''کشنا......! رتنا مل گیا تیرا......؟''
''یہ...... یہ پھر بھاگ جائے گا۔'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔
''نہیں ری...... یہ اب کہیں نہیں جائے گا۔''
''چلا گیا تو......؟'' وہ اسی طرح بولی۔
''کہاں نہیں جائے گا مگر تجھے دیکھ کر یہ کیا سوچ رہا ہوگا کیا حلیہ بنا رکھا ہے تو نے...... سر مٹی سے اٹا ہوا ہے، چہرے پر نشان پڑے ہوئے ہیں، چوٹی گوندھ، منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل! رتنا کے کپڑے نکال...... یہ بھی خود کو سنوارے۔''
کشنا کے چہرے پر تبدیلیاں نظر آئیں۔ وہ خجل سی محسوس ہوئی۔ پھر اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی آئی، چلے نہ جانا۔''
''نہیں کشنا۔ میں تو رما رانی کے پاس بیٹھا ہوں۔''
''ماں......! میں ابھی آئی۔'' وہ مڑی اور اندر چلی گئی۔ رما رانی نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئیں۔ یہاں بید کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔
''تمہارا ایک ایک کپڑا سنبھال کر رکھا ہے اس نے، ہفتے پندرہ دن کے بعد اسے نکالتی ہے، دھوتی ہے، استری کرتی ہے اور اس کے بعد احتیاط سے صندوق میں رکھ دیتی ہے۔ کہتی ہے رتنا آئے گا تو کیا پہنے گا، ہم تو برباد ہو گئے رتنا! سب کچھ ختم ہو گیا ہمارا، سب کچھ!''
میں نے اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ رما رانی جس طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہوں، ان کا مذہب کچھ بھی ہو لیکن انہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ ان کے الفاظ میں آج تک نہیں بھول سکا تھا۔ ساری صورتحال تو اس وقت ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی جب میں نے دیوانگی سے فرزانگی میں قدم رکھا تھا۔ ریل کے حادثے نے دماغی توازن الٹ دیا تھا اور بھٹکتا ہوا رما رانی کو مل گیا تھا۔ نجانے کس جذبے کے تحت ہونٹوں سے ماں کا لفظ نکل گیا تھا اور رما رانی نے اپنا سینہ میرے لیے کھول دیا تھا۔ بہت اچھی خاتون تھیں وہ......! مگر بدقسمتی سے طوائف تھیں۔ سارے واقعات مجھے یاد آ گئے۔ اب کیا کروں؟ رما رانی میرے احساسات سے بے خبر اپنی کہانی سنا رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔
''تمہارے آنے کے بعد تو یوں لگا جیسے ہمارے گھر پر جھاڑو پھر گئی ہو۔ کشنا تمہیں یاد کر کر کے کئی دن تک روتی رہی، کھانا پینا چھوڑ دیا اس نے! جس طبیعت کی مالک تھی، اس کا تو تمہیں اندازہ ہو ہی چکا ہوگا۔ کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی اور جب کمرے سے باہر نکلی تو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شکنتا نے تمہیں کہیں گم کر دیا ہے۔ پھر ایک دن اس دیوانگی کے عالم میں شکنتا کے گھر پہنچ گئی۔ پیتل کا گلدان لے کر اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ جسم پر بھی بہت سے وار کیے اور شکنتا ان

زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئی۔ اسے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا مگر تین دن کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ ہم پر مقدمہ چلا۔ اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ دماغی مریضہ ہے، سارا دھن دولت ختم ہو گیا۔ برے حال ہو گئے ہمارے، ادھر دشمنی الگ پڑ گئی تھی۔ دماغی مریضہ کی حیثیت سے عدالت نے اسے بری تو کر دیا لیکن ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ بہت برا تھا۔ کسی نے ہمیں ہمارے گھر میں نہ رہنے دیا۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ جو کچھ پیسے بچے تھے، انہیں سنبھال کر نجانے کہاں کہاں پھرتے رہے لیکن دشمنوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہمیں کسی کوٹھے پر آباد نہیں ہونے دیں گے۔ تب میں نے سوچا کہ جان ہے تو جہان ہے۔ جو بھاگ میں لکھا ہے، وہ تو ہو ہی جائے گا۔ بنارس آ گئے اور یہاں یہ ٹوٹا پھوٹا گھر خرید لیا لیکن وہ تمہیں تلاش کرتی رہی۔ مندروں میں، ویرانوں میں! اب یہی کیفیت ہے۔ کبھی کہیں سے پکڑ کر لاتے ہیں اسے، کبھی کہیں سے پکڑ کر لاتے ہیں مگر اس کی لگن سچی تھی، اس کے راستے پاک تھے، اس نے تمہیں پا لیا۔ جو سنے گا، حیران رہ جائے گا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس طرح ہمیں یہاں مل جاؤ گے۔“

رما رانی اپنی کہانی سنا رہی تھیں اور میں دنگ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا، میری وجہ سے......! مگر میں انہیں کیا جواب دے سکتا ہوں، ان کی محبت کا! کشنا کو کیا سنبھال سکتا ہوں میں......! میں تو خود ہی غموں کا مارا تھا۔ کشنا تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہاتھوں پر میرے کپڑے رکھے اندر داخل ہوئی۔ بڑے پیار، بڑے اہتمام سے اس نے ان کپڑوں کو استری کر کے اپنے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا۔ کپڑے گرم گرم تھے۔ اس نے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”جاؤ رتنا! نہا لو، کپڑے بدل لو۔ دیکھو تو سہی کیسے میلے بال ہو رہے ہیں۔ میں استری کر رہی تھی اس لیے دیر لگ گئی۔ تم نہا لو، میں بھی ابھی نہا کر آتی ہوں۔“ وہ واپس چلی گئی۔ اس کے انداز میں وہی معصومیت، وہی شوخی تھی۔ رما رانی کہنے لگیں۔

”فیصلہ کچھ بھی کرو رتنا! ابھی اس کا دل رکھ لینا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک اس کا دماغ ٹھیک نہ ہو جائے۔ اگر برا نہ مانو تو یہ بات کہوں کہ خود غرضی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ ہم سے محبت نہ کر سکو لیکن کم از کم ہمارا قرض ہی چکا دو۔“ میں نے رما رانی کو دیکھا، خاموشی سے کپڑے اٹھائے اور اس طرف بڑھ گیا جہاں مجھے نہانا تھا۔ راستے میں مالتی ملی، مسکرائی اور بولی۔

”آ گئے رتنا جی! چلو تمہیں نہانے کی جگہ بتا دوں۔“

سب ہی موجود تھے۔ غسل کیا، لباس پہنا اور اس دوران نجانے کیا کچھ سوچتا رہا۔ وہ سب کچھ کرنا ہے مجھے جو دل میں ٹھان لی ہے۔ ٹھیک ہے رما رانی اب کوٹھے پر نہیں ہیں اور یہ جگہ بہتر ہے۔ جیسے بھی گزار رہی ہوں، وہ جانیں اور ان کا کام۔ لیکن مجھے یہاں اب کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کرنا چاہیے جس سے رزق حلال ملنے کی امید بندھ جائے۔ رہائش کے لیے اگر رما رانی کا گھر ہو تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ جہاں تک معاملہ کشنا کا ہے تو بے شک رما رانی کا قرض ہے مجھ پر، اتاروں گا اسے۔ کشنا کو بہتر راستے پر لاؤں گا اور کسی وقت بتا دوں گا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ سب کچھ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کشنا کو میں احترام کا درجہ تو دے سکتا ہوں لیکن اس سے آگے تو میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں ان راستوں پر چلنے کے قابل ہوں۔ یہ فیصلہ کر لیا تھا دل میں اور یہ سوچا تھا کہ اب ثابت قدمی سے یہاں وقت گزاروں گا اور اپنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کروں گا۔ بس! اب ماضی کی بہت سی باتیں دل میں رکھنے یا دماغ میں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے عمل کی دنیا میں آنا تھا اور یہی میرے حق میں بہتر تھا۔ چنانچہ رما رانی، لکشمی، رادھا، مالتی سب ہی سے گھل مل گیا۔ کشنا کے چہرے پر جیسے ایک دم سے نئی زندگی پھیل گئی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ کچھ وقت پہلے وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ غسل خانے سے نکلی تھی تو جیسے نیا چہرہ چہرے پر سجا کر لے آئی تھی۔ رما رانی نے اسے دیکھا اور ماں کی آنکھوں میں آسودہ مسکراہٹیں کھلنے لگیں۔ مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھا تم نے......؟“ میں نے خاموشی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ میرے لیے درحقیقت بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایک طرف رما رانی کی محبت اور ان کے کئے ہوئے احسانات تھے اور دوسری طرف اپنی انوکھی زندگی! فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ رات کو رما رانی مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگیں۔ کشنا میری یہاں موجودگی سے مطمئن ہو گئی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ رادھا اور لکشمی کی مسکراہٹیں بھی جوں کی توں تھیں۔ رما رانی نے کہا۔

''رتنا......! تمہیں یہ تو معلوم ہو چکا ہوگا کہ تم کون ہو، تمہارا گھر کہاں ہے، کیا واقعہ ہوا تھا تمہارے ساتھ جس کی بناء پر تمہارا ذہنی توازن الٹ گیا تھا۔''

''ریل کا حادثہ ہوا تھا رما جی! اور اس حادثے نے مجھے نجانے کس کس سے دور کر دیا۔''

''اکیلے سفر کر رہے تھے......؟''

''نہیں! کچھ عزیز بھی ساتھ تھے۔''

''تو ان کا کیا ہوا......؟''

''مر گئے۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''تو کیا اب تم اکیلے رہ گئے ہو؟''

''ایک طرح سے یہی سمجھ لیں رما جی۔'' میں نے کہا۔

''تو رتنا! ہمارے ساتھ رہو، کیا

ہے۔ دیکھو بیٹا! انسان انسان ہی ہوتا ہے۔ سنسار میں اس کی حیثیت کچھ بھی ہو، روتا ہوا ہی آتا ہے اور ہاتھ، پاؤں پسارے چلا جاتا ہے۔ کچھ بھی نام دے لو اسے لیکن ہوتا وہ انسان ہی ہے۔''

''ہاں رما جی! اس میں کوئی شک نہیں ہے مگر میں......! میں مسلمان ہوں۔''

''تب......'' رما رانی نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں مسلمان ہوں۔''

رما رانی عجیب سے انداز میں مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اپنا دھرم بدل لو مگر......مگر انسانیت کا دھرم تو ایک ہی ہوتا ہے۔ تھوڑا سا سمے گزار لو ہمارے ساتھ! کشنا کو جیسے چاہو بہلا لینا اور پھر...... اور پھر!'' رما رانی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میں نے بے قرار ہو کر کہا۔

''نہیں رما جی! آپ فکر نہ کریں۔ کشنا جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جائے گی، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''تو تمہیں یہاں سے جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم سے جو پرہیز کرنا چاہو، کر لینا۔ بھاجی، ترکاری تیار ہوتی ہے، وہ کھا پی لینا۔ دھرتی پر جو کچھ ہوتا ہے، وہ تو سب ہی کے لیے ہوتا ہے۔''

''کھا چکا ہوں رما رانی جی! اب کیا پرہیز کروں گا لیکن آپ کے حالات تو ویسے ہی بگڑے ہوئے ہیں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی ہیں۔ مجھے ایک اجازت ضرور دے دیجئے گا۔

''میں کہیں نوکری کروں گا، اپنے لیے رزق کماؤں گا۔ آپ کی بھی جو سیوا ہو سکتی ہے، وہ کروں گا۔ مجھے اس سے آپ نہیں روکیں گی رما جی!''

رما رانی نے گردن جھکا لی۔ کہنے لگیں۔ ''ٹھیک ہے مگر کشنا کو سمجھا لینا۔''

''ہاں کیوں نہیں!'' ایک حد تک اطمینان ہوا تھا۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی مل گیا تھا۔ اوم پرکاش جی سے یہ سب کچھ کہنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رزق حلال کا جو مزہ چکھا تھا، اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا لیکن اب راستے اور پرخطر ہو گئے تھے۔ احتیاط اور شدید ہو گئی تھی۔ کشنا کی محبتیں عروج پر تھیں۔ اب وہ مجھ سے باقاعدہ سمجھداری کی باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پوچھا۔

''کیوں چلے گئے تھے رتنا......؟''

''بس کشنا......! جی چاہا تھا۔''

''کیا شکنتا نے کہا تھا کہ یہ گھر چھوڑ دو؟''

''نہیں کشنا......! شکنتا سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔''

''سچ......!'' وہ خوش ہو کر بولی۔
''ہاں!'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''اور مجھ سے......؟''
''تم سے تو بڑا لگاؤ ہے مجھے کشنا! لیکن تم نے اپنی جو حالت بنالی ہے، مجھے اچھی نہیں لگتی۔''
''تمہاری ہی وجہ سے تو ایسا ہوا۔ تم چلے گئے تو مجھے ایسا لگا جیسے سنسار میں سورج چھپ گیا ہو، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے! کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔''
''اب خود کو سنبھالو، یہ ساری باتیں بری ہوتی ہیں۔''
''تم اگر میرے ساتھ رہو تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''میں تمہارے ساتھ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزار سکتا کشنا! دیکھو نا میں مرد ہوں اور مرد گھروں میں چوڑیاں پہن کر تو نہیں بیٹھتے۔''
''پھر کیا کرتے ہیں۔'' وہ ہنس کر بولی۔
''وہ باہر نکلتے ہیں، عورتوں کے لیے روزی کماتے ہیں اور پھر شام کو گھر واپس آتے ہیں اور اگر کوئی مرد ایسا نہیں کرتا تو پھر وہ مرد، مرد نہیں کہلاتا۔ تم نے کوٹھا چھوڑ دیا ہے، وہ جگہ بری تھی کشنا! وہاں مرد، مرد نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مرد جو کوٹھوں پر رہتے ہیں عورتوں کے غلام ہوتے تھے، یہ اچھی بات ہے کہ اب ہم یہاں بنارس میں ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں نوکری کروں اور تم سب کے لیے روزی کماؤں؟''
کشنا کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ''نوکری کرنے کے لیے تو تمہیں شہر جانا پڑے گا۔''
''اور اگر تم واپس نہ آئے تو؟''

✦✤✦✤✦

''نہیں......! میں ہر شام اپنا کام کر کے اس طرح گھر واپس آؤں گا جس طرح پرندے اپنے گھونسلوں میں بسیرا کرنے کے لیے واپس پلٹتے ہیں۔''
وہ متاثر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''اگر تم وعدہ کرتے ہو تو ٹھیک ہے۔''
یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔ میں کسی کے لیے بھی اپنے مقصد کو قربان نہیں کر سکتا تھا۔ جو ہدایات دی گئی تھیں، ان میں پہلا مرحلہ یہی تھا کہ کم از کم میں کسی کے شانوں پر نہ پڑا رہوں۔ اب تک تو ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ کبھی رمضان کے ہوٹل پر تو کبھی کسی کے گھر......! یہاں سے نکلا تو وہاں جا بیٹھا، وہاں سے نکلا تو دوسری جگہ جا بیٹھا۔ کئی بار ہاتھ، پاؤں چلانے کی کوشش کی تھی لیکن راستے بند ہو گئے تھے۔ ایک دلچسپ بات جو اب تک میں نے محسوس کی تھی، وہ یہ تھی کہ اس وقت کے بعد جب مجھے سورج کے ساتھ سفر کر کے ایک منزل پر پہنچنا پڑا تھا اور وہاں میرے لیے عدالت لگی تھی، میرے بیروں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں کہیں بھی ہوتا، ان کی چاپ سنتا رہتا، ان کی حرکتیں میرے ذہن تک پہنچتی رہتیں لیکن اس عدالت سے واپسی کے بعد یہ بیر میرے گرد نہیں چکراتے تھے۔ دل میں خیال تو آیا تھا کئی بار۔ لیکن انہیں آواز دینے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ جو غلطیاں کر چکا تھا، انہی سے بمشکل تمام جان بچی تھی۔ اب کوئی اور حماقت کر کے اپنے لیے مزید مشکلات نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ صبر کرنا تھا، انتظار کرنا تھا۔ صبر اور انتظار یہی دو چیزیں مجھے میری منزل تک پہنچا سکتی تھیں اور میں اپنی زندگی کے اس سفر میں لاتعداد مصیبتیں اٹھانے کے باوجود منزل کی طلب سے اپنے آپ کو دور نہیں کر پایا تھا۔ بہر حال کسی بھی شخصیت کو، کسی بھی واقعے کو اپنے آپ پر مسلط کرنے سے راستے رک جاتے ہیں۔ بے شک، رما رانی مجھے یہاں تک لے آئی تھیں لیکن اگر وہ میرے راستے کی رکاوٹ بنتیں اور مجھے یہاں سے باہر نکلنے کا موقع نہ ملتا تو بحالت مجبوری ایک بار پھر دھوکا دے کر یہاں سے نکلنا پڑتا لیکن اب کشنا بھی تیار تھی اور رما رانی نے بھی مجھے نوکری تلاش کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے حالات بھی بہتر نہیں

تھے۔ چنانچہ میدان عبور کر کے اس آبادی میں اور اس آبادی سے بنارس کی سڑکوں پر پہنچ گیا۔ بنارس معمولی جگہ نہیں تھی۔ ہندوستان میں بہت بڑی حیثیت کا حامل ہے یہ شہر اور شاید تقدیر میری رہنمائی بھی کر رہی تھی۔

شام کے تقریباً چار بجے تھے۔ میں نے ایک شخص کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے، ادھر ادھر ہاتھ مار کر سہارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آس پاس کوئی اور موجود نہیں تھا۔ سنسان سی جگہ تھی۔ جگہ جگہ درخت کھڑے ہوئے تھے۔ ایک لمحے میں، میں نے محسوس کیا کہ اگر یہ شخص کوئی سہارا پانے میں ناکام رہا تو یقینی طور پر زمین پر گر پڑے گا۔ لوگ اس کی جانب متوجہ نہیں تھے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے اس شخص کو سنبھال لیا۔ پورا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ مسلمان لگتا تھا لباس سے، چہرے مہرے سے! ہاتھوں میں بید کی چھڑی تھی اور اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے ڈوبتی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ ''م...... میں......! میں دل کا مریض ہوں۔ میری شیروانی کی جیب میں میرے گھر کا پتہ رکھا ہوا ہے۔ اس وقت میری حالت بہت خراب ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو......!''

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر تانگے آتے جاتے نظر آ رہے تھے لیکن وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ بڑی پریشانی کے عالم میں، میں اسے سہارا دیتے ہوئے ایک درخت کے نیچے لے آیا۔ اس کے سینے پر ہلکی ہلکی مالش کی اور پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ اتفاق کی بات یہ کہ تھوڑے فاصلے پر ناریل کا ایک درخت نظر آیا۔ پانی اور تو کہیں موجود نہیں تھا۔ ناریل کے درخت کے قریب پہنچا۔ درخت کو زور زور سے ہلایا، پتھر اٹھا کر اوپر مارے، تب دو ناریل ٹوٹ کر نیچے گر پڑے اور اس کے بعد انہیں توڑ کر اس شخص کے منہ میں پانی ڈالنا میرے لیے مشکل نہ ثابت ہوا۔ ناریل کا پانی شاید اکسیر ثابت ہوا تھا اس کے لیے! ایک دم اس کی کیفیت بحال ہونے لگی۔ اس نے درخت کے تنے سے گردن ٹکا دی اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میرے دل میں انسانیت اور ہمدردی کا سمندر موجزن تھا۔ یہ شخص صورت ہی سے کوئی نیک انسان معلوم ہوتا تھا۔ جب اس کی کیفیت کافی بہتر ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔

''اب براہ کرم مجھے اپنا پتہ دے دیجئے، میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں۔'' اس شخص نے لرزتے ہاتھ سے شیروانی کی جیب میں رکھا ہوا ایک کاغذ نکالا اور بولا۔

''زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اس کاغذ پر میرا پتہ دیکھ لو۔'' میں نے پتہ دیکھا اور اس کے بعد اس سے کہا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑے فاصلے پر جا کر تانگہ لے آؤں۔'' اس شخص نے ممنونیت کے انداز میں گردن ہلا دی۔ میں نے کاغذ پر ایک بار پھر اس کا نام اور پتہ دیکھا۔ نام تھا مہتاب علی اور محلہ شیر خان کے مکان نمبر ایک سو ستائیس میں رہتا تھا۔ کچھ فاصلے سے گزرتے ہوئے تانگے والے کو اشارہ کیا اور اس کے بعد تانگہ لے کر اس کے پاس آ گیا۔ مہتاب علی کو میں نے تانگے کی پچھلی نشست پر سوار کرایا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ مہتاب علی نے آہستہ سے کہا۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے تمہیں! لیکن انکار نہیں کروں گا کیونکہ انسان ہی انسان کی مدد کا طالب ہوتا ہے اور انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ مجھے میرے گھر پہنچا دو، اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔''

''آپ بالکل اطمینان سے بیٹھے رہیں، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔'' تھوڑی دیر کے بعد تانگہ مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔ میں نے سہارا دے کر مہتاب علی کو نیچے اتارا، تانگے والے کو اپنی جیب سے پیسے ادا کئے اور اس کے بعد اس شخص کو سہارا دیتے ہوئے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی بجانے کا اشارہ کیا اور چند لمحات کے بعد ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر عجیب سے انداز میں پیچھے ہٹ گئی اور میں اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔ فوراً ہی ایک معمر خاتون اور ایک آٹھ نو سالہ بچی میرے پاس پہنچ گئے۔

''کیا ہوا، کیا ہو گیا۔ خدا خیر کرے۔ ارے کیا طبیعت خراب ہو گئی آپ کی......؟''

''اندر چلو...... اندر چلو۔'' مہتاب علی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔ ''میری حالت اب بہتر ہے۔ کمزوری بے پناہ ہو گئی ہے۔ تم بیٹھو میاں! بیٹھ جاؤ یوں سمجھو کہ آج تم مسیحا بن کر میرے پاس پہنچے ورنہ اس کمبخت منحوس

علاقے میں نہ تو کوئی تانگہ ملتا اور نہ کوئی سہارا......!''
''مگر... مگر......!''
''بس بی بی! اگر مگر سے کیا فائدہ! دورہ پڑ گیا تھا مجھے ایک بار پھر، لیکن...... لیکن مسیحا کچھ فاصلے پر ہی موجود تھا۔'' معمر عورت نے میرا شکریہ ادا کیا۔ نوجوان لڑکی بھی نگاہوں کے سامنے تھی اور چھوٹی بچی بھی! سب کے سب سہمی ہوئی نگاہوں سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اجازت مانگی تو اس نے کہا۔
''میاں! اگر کوئی بہت زیادہ مصروفیت نہ ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ یوں بھی مریض کی تیمارداری انسانی فریضہ ہے اور پھر تم تو اس وقت......!''
''آپ بار بار مجھے یہ الفاظ کہہ کر شرمندہ کر رہے ہیں۔''
''تو کچھ دیر رک جاؤ میں...... میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، دل چاہ رہا ہے۔''
''کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ معمر شخص نے عورت سے کہا۔ ''جاؤ بھئی اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری دوا لے آؤ اور مجھے دوا پلا دو اور ذرا مہمان کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ میاں نام کیا ہے آپ کا......؟''
''مسعود احمد میرا نام......!''
''اللہ تعالیٰ زندگی عطا فرمائے، صحت دے، ترقی دے، بلندی دے۔ بڑی مدد کی ہے تم نے ہماری مسعود بیٹے! کہاں رہتے ہو؟''
''بس! یہیں ایک جگہ ہے، نام وغیرہ نہیں جانتا اس کا چونکہ بنارس آئے ہوئے بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس سے واقفیت حاصل نہیں ہے۔''
''اوہو اچھا...... اچھا! کہیں اور سے آئے ہو......؟''
''جی......!''
''اللہ تعالیٰ خوش رکھے۔ یہاں آنے کا کوئی مقصد تو ہوگا بیٹے......؟''
''جی ہاں! بس...... بس تلاش رزق میں نکلا ہوا ہوں۔''
''کوئی نوکری ملی......؟'' مہتاب علی نے پوچھا۔
''نہیں......! لیکن مل جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ! کوشش کر رہا ہوں۔'' مہتاب علی خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔
''کس کے ساتھ رہتے ہو یہاں؟''
''ایسے ہی کچھ شناسا ہیں۔''
''میاں! دیکھو یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہارے قرض چکا رہے ہیں۔ بعض قرض ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی بھر چکائے جائیں تو ادا نہیں ہوتے لیکن وہی مسئلہ ہے کہ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر کچھ اور وقت دے سکو ہمیں تو ہم تم سے کچھ اور باتیں کریں۔ لو چائے آ گئی، ذرا چائے پیو۔'' چائے کا سامان ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔ بیگم صاحبہ جو مہتاب علی کی بیوی تھیں، محبت بھرے انداز میں چائے بنانے لگیں اور پھر انہوں نے ایک پیالی بڑے اہتمام سے مجھے پیش کی اور میں نے شکریہ ادا کر کے قبول کر لی۔ نوجوان لڑکی چلی گئی تھی لیکن چھوٹی عمر کی لڑکی وہیں بیٹھی ہوئی عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
''اس کا نام رخسانہ ہے۔'' مہتاب علی نے اپنی بیٹی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''اور ان کا نام ابو......؟''
''سنا نہیں تم نے مسعود احمد ہے۔''

ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ باد　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔

❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔

❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔

❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔

❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔

❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**

❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

"ہم انہیں کیا کہیں۔" لڑکی نے پوچھا۔
"تمہارا کچھ کہنا ضروری ہے کیا......؟"
"تو نہ کہیں کیا......؟" لڑکی بولی۔
"نہیں......نہیں بھئی! ہم بھلا تمہیں کہاں روکیں گے۔ مسعود میاں! بس اللہ نے مجھے دو بیٹیاں عطا کی ہیں، بیٹے سے محروم ہوں اور یہی وجہ ہے کہ سڑکوں، میدانوں اور ویرانوں میں تنہا پھرتا رہتا ہوں۔ بس ایسے ہی اجنبی سہارے مجھے سنبھالے ہوئے ہیں یا پھر اللہ کا سہارا ہے۔ خیر یہ کوئی غم ناک گفتگو نہیں ہے۔ تعارف کرا رہا تھا اپنا! دل کی تکلیف ہوگئی ہے کافی عرصے سے، کبھی کبھی ایسی حالت ہوجاتی ہے۔ دو تین بار ہوچکی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ عجیب وغریب کیفیت ہے۔ اسے باقاعدہ دل کا دورہ بھی نہیں کہا جاسکتا چونکہ تین دوروں یا دو دوروں میں تو انسان کبھی کا آسمان پر پہنچ چکا ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے میری یہ کیفیت کئی بار ہوچکی ہے۔ علاج کررہا ہوں۔ کبھی کبھی تو بالکل ٹھیک ہوجاتا ہوں اور کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے مرض پھر سے واپس آگیا۔" میں خاموشی سے مہتاب علی کی صورت دیکھتا رہا اور چائے پیتا رہا۔ انہوں نے خود چائے نہیں پی تھی۔ بیگم صاحبہ نے میری پیالی خالی ہونے کے بعد اسے دوبارہ بھرنے کے لیے کہا لیکن میں نے معذرت کرلی۔
"ہاں تو بیٹے! کیا تم ہماری تھوڑی سی خدمت قبول کرو گے؟"
"جی......میں سمجھا نہیں!"
"کل دن میں آسکتے ہو کسی وقت......؟"
"جی ہاں! کیوں نہیں۔"
"یہ پتہ یاد رہے گا......؟"
"اگر یاد نہ رہا تو اسے لکھ کر اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ تلاش کرتا ہوا آجاؤں گا۔ کوئی حکم ہے میرے لیے......؟"
"حکم نہیں بیٹے! التجا ہی سمجھو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میں تمہاری ملازمت کے لیے کوشش کروں تو......؟" میں مسکرانے لگا۔ مہتاب علی فوراً بولے۔
"دیکھا نا وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ تم سوچ رہے ہو کہ ایک اتنے بڑے احسان کا صلہ چکانا چاہتا ہوں میں! ایسی بات نہیں ہے۔"
"بخدا میں بھی یہ نہیں سوچ رہا۔"
"تو پھر کیا حرج ہے میاں! تم انسانی محبت سے مجبور ہوکر مجھے اپنا وقت برباد کرکے یہاں تک لائے۔ کیا تمہارے خیال میں میرے دل میں انسانی محبت نہیں جاگ سکتی، جو کچھ کرسکتا ہوں، اگر تم اسے قبول کرلو تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔"
"یہ میری ضرورت ہے مہتاب علی صاحب! آپ حکم دیتے ہیں تو حاضر ہوجاؤں گا۔ ویسے بھی آپ کی دوبارہ خبرگیری کرنا چاہتا تھا۔ آپ فرمائیے کس وقت حاضر ہوجاؤں؟"
"میاں! کل گیارہ بجے......ہم اس کیفیت میں اپنی ملازمت پر تو نہیں جاسکیں گے لیکن کچھ حالت بہتر ہوگئی تو تمہارے ساتھ ضرور چلیں گے۔ باقی تفصیلات تمہیں کل دن ہی میں بتائی جائیں گی۔" مہتاب علی بولے۔ اس کے بعد میں نے ان سے اجازت طلب کرلی۔ راستے ذہن میں رکھے تھے۔ کشنا کے گھر کے سامنے چوپال لگی ہوئی تھی۔ مالتی، رما رانی، رادھا لکشمی سب ہی باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کشنا بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر سب خوشی سے کھل اٹھے۔
"رتنا آگیا......رتنا آگیا" آوازیں ابھریں۔
"گھر میں سانپ نکل آئے ہیں کیا، سب لوگ باہر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔
"اس باؤلی نے ناک میں دم کررکھا تھا۔ اسے ابھی تک تم پر بھروسہ نہیں ہے۔ کہتی تھی کہ تم نہ آؤ گے۔"
"اسے میں سمجھا لوں گا۔" میں نے کہا اور سب کے ساتھ اندر گیا۔ نئے حالات کے تحت ان لوگوں میں ضم ہونے میں

کوئی حرج نہیں تھا۔ کشنا کو سمجھایا۔ رمارانی کو بتایا کہ نوکری کی کوشش کر رہا ہوں، مل جائے گی، امید پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے حالات بہتر ہو جائیں گے۔"

رمارانی غمزدہ ہو گئیں۔ "کیا کچھ نہیں تھا، ہمیں بھلا روپے پیسے کی کمی تھی مگر اور پھر ایک طرح سے اچھا ہوا، صدیوں کی ریت تو ٹوٹی۔ ایک بیسوا کبھی شریف زادی بنی وہ بھی پورے پریوار کے ساتھ......! عادی ہو جائیں گے، سے بھی بیت ہی جائے گا۔ رڑکھی سوکھی کھا کر اور اگر ایسا ہو گیا تو سب ہی کا جیون سنور جائے گا۔ یہاں ہمیں کون جانتا ہے اسی لیے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ پیٹ بھرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔" رمارانی کے خیالات بہت بدل گئے تھے۔ میں پھر جذباتی ہوا تھا لیکن دل ہی دل میں توبہ استغفار کر لی تھی۔ اسی جذباتیت نے تو اس منزل پر لا ڈالا تھا۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے مہتاب علی صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں بھی ایک محترمہ دروازے پر موجود تھیں اور جیسے ہی میں اس دروازے کے سامنے رکا، انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ رخسانہ تھی۔ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور معصوم لہجے میں بولی۔

"ایک ایک منٹ گن رہی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں ہمارے بھیا جی وعدہ خلافی نہ کر ڈالیں۔ ہم ذرا وعدے کے پابند آدمی ہیں۔ ابا جی نے ہمیشہ یہی سکھایا ہے کہ بیٹا جب کسی سے کوئی وعدہ کرو تو اسے اپنا ایمان بنا لو۔ ہم تو وعدے کو ایمان بنا لیتے ہیں بھیا جی! آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

رخسانہ کی معصوم باتوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ میں نے پیار سے کہا۔ "بھئی بہت اچھی خاتون ہیں بلکہ یوں سمجھ لیں کہ آپ تو بیٹھے بٹھائے ہماری استاد بن گئیں۔ ایسا سبق سکھایا ہے ہمیں کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

"اور کبھی وعدہ خلافی نہیں کریں گے؟"

"جی بالکل! آپ سے وعدہ کیا جاتا ہے۔"

"تو پھر پہلا وعدہ یہ کیجئے کہ اندر جا کر کسی کو نہیں بتائیں گے کہ ہم نے آپ سے اس طرح گفتگو کی ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ سب سے ادب و احترام سے پیش آیا جائے۔ کسی بڑے سے ضرورت سے زیادہ باتیں نہ کی جائیں مگر ہم کیا کریں۔ یہاں تو بس تین بڑے ہی بڑے ہیں۔ نہ کوئی ہمارے برابر کا ہے اور نہ کوئی ہم سے چھوٹا! بڑوں سے ہنس کر بات کی جائے تو گستاخی ہو جاتی ہے اور چھوٹوں کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اب بتائیے رخسانہ کرے تو کیا کرے۔ آیئے بھیا جی! اندر آیئے۔ کان دروازے پر لگے ہوں گے۔ گیارہ بج رہے ہیں اور ابا میاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ دروازے پر رکیں۔"

"کیسی طبیعت ہے مہتاب علی صاحب کی؟"

"اللہ کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ اب آ جائیے نا کہہ دیا جائے گا کہ ہم نے آپ کو باتوں میں لگا رکھا تھا۔" رخسانہ کی شوخ و چنچل باتوں نے جی خوش کر دیا تھا۔ مہتاب علی صاحب کی حالت کافی بہتر ہو رہی تھی۔ چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، تیار تھے، چھڑی کرسی کے ساتھ لگی رکھی تھی، جوتے پہنے ہوئے تھے۔ سلام دعا ہوئی۔ کہنے لگے۔

"بس میاں! ویسے تو تمہاری خاطرداری ہم پر فرض ہے لیکن چلنا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے حاجی صاحب کہیں نکل جائیں۔ ان کے جانے سے پہلے ان تک پہنچنا ضروری ہے۔ ویسے ان کا ملازم آیا تھا، ہم نے اپنی بیماری کی اطلاع دے دی ہے۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ چلو راستے میں باتیں ہوں گی۔ اچھا بھئی ہم چلتے ہیں اور واپس یہیں آئیں گے اور دوپہر کے کھانے میں آپ کو کیا انتظام کرنا ہے، اس کی ہدایت تو آپ کے پاس موجود ہے ہی، آج کی بات تو نہیں ہے۔" مہتاب علی نے اپنی بیگم سے کہا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولے۔

"نہیں میاں! ظاہر ہے مہمان میزبانوں سے تکلف کی باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے لیکن

میزبان سمجھتے ہیں کہ کس چیز کی کیا ضرورت ہے۔ اب آؤ دیر ہو جائے گی، تانگہ بھی تلاش کرنا ہوگا۔"

میں مہتاب علی صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایسے بہت سے کرم فرما، محبت کرنے والے مجھے زندگی میں مل چکے تھے اور ایسے لوگوں سے محروم نہیں رہا تھا۔ بہرحال یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس دنیا میں صرف نفرتیں ہی میری ہم رکاب نہیں رہی تھیں بلکہ محبتوں کا توازن بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جینا کس قدر مشکل ہوتا، اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ تانگہ تھوڑی دیر کے بعد ہی مل گیا اور مہتاب علی صاحب نے اسے پتا بتا دیا۔ تانگہ آگے بڑھا تو مہتاب علی صاحب نے کہا۔

"ہم نوکری کرتے ہیں حاجی فیاض احمد صاحب کے ہاں اور یہ حاجی فیاض احمد صاحب بنارس میں تلے اور زری کے کام کے سب سے بڑے تاجر ہیں۔ یوں سمجھ لو سولہ کارخانے ہیں ان کے جن میں بنارسی کپڑا اور بنارسی ساڑھیاں وغیرہ تیار ہوتی ہیں ہندوستان بھر میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اللہ نے خوب نوازا ہے زر و جواہر سے اور جواہر پارے بکھیر دیئے ہیں انہوں نے پورے ہندوستان میں! لیکن طبیعت کے ایسے نیک اور نفیس کہ آج بھی اپنے ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور کوئی تکلف نہیں ہوتا لیکن چونکہ خود اپنے بازوؤں سے کمایا ہے اور خاندانی ورثہ منتقل نہیں ہوا ہے، اس لیے خود تو نیک نفس اور ملنسار آدمی ہیں لیکن اہل خانہ کا ان کی کمائی سے خانہ خراب ہو گیا ہے۔ خصوصاً صاحبزادی درشہوار موجودہ دور کی عکاسی کرتی ہیں اور چونکہ حاجی صاحب کی بیگم نے ان کے نزول کے بعد حاجی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ اول سے آخر تک ہیں اور اس سے آگے اولاد کا تصور نہ کیا جائے۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بھی قناعت کر لی اور درشہوار بری طرح بگڑ گئیں۔ میں اپنے مالک کی بیٹی کی برائی نہیں کر رہا۔ بچی بہت اچھی ہے۔ نیک طبیعت اور اچھے عادات و خصائل کی مالک! لیکن بس طبیعت میں غرور ہے۔ مت جھتا اپنے ہم پیشہ لوگوں سے ہے اس لیے عام لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ساری باتیں اس لیے کہہ دی ہیں میاں مستقبل میں ہو سکتا ہے تقدیر یاوری کرے اور تمہارا واسطہ انہی لوگوں سے پڑے۔ جہاں تک رہا بیگم فیاض کا معاملہ تو یوں سمجھ لو کہ وہ نہ تیتر ہیں، نہ بٹیر! جب کبھی خاندانی کیفیت ابھر آتی ہے تو وہ انسان ہوتی ہیں اور جب زمانے کے رنگوں میں رنگی ہوئی ہوں، تب ان کی رنگینیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ تمہیں یہ سب کچھ بتانا اس لیے ضروری ہے کہ ہم کریں گے آج تمہاری نوکری کے لیے بات چیت اور اللہ کی ذات سے امید تو یہی ہے کہ نوکری مل جائے گی۔ دیکھو میاں! ابھی اسی وقت اس تانگے میں اپنی پسند بتا دو۔ ہم تو حاجی صاحب سے یہ کہیں گے کہ ہمارا اپنا بچہ ہے، کوئی بھی جگہ دے دی جائے لیکن اگر تمہاری کوئی پسند ہو تو۔"

میں نے حیرانی سے مہتاب علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں مہتاب صاحب! مجھے صرف ملازمت چاہیے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں، کوئی پسند نہیں۔"

"خدا خوش رکھے۔ ویسے بھی مذہب نے رزق حلال کے لیے محنت کو افضل قرار دیا ہے۔ لوگ تو تن آسانی تلاش کرتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر حصول رزق میں پسینہ نکل آئے تو یوں سمجھ لو موتیوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ بہرحال مسرت ہوئی۔"

جس حویلی کے ساتھ تانگہ رکا تھا، وہ اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ بنارس کے کسی رئیس کی حویلی ہے لیکن بنارس کے یہ رئیس جو سادہ سے کرتے، پائجامے اور دو پلی ٹوپی میں ملبوس تھے، کسی بھی طرح اس حویلی کے مالک نظر نہیں آتے تھے۔ دور ہی سے لپکے آئے تھے اور مہتاب علی کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"میاں مہتاب! کیوں پریشان کرتے رہتے ہو تم مجھے! بار بار بیمار پڑ جاتے ہو اور میں کہتا ہوں کہ تم آئے کیوں۔ میں...! میں تو خود آنے والا تھا تمہارے پاس، نجانے کس سے دل لگا بیٹھے ہو۔ میں کہتا ہوں اس عمر میں دل کا روگ پالنا ضروری تھا کیا......؟" مہتاب علی صاحب نیاز مندی سے مسکرائے اور بولے۔

"اس بچے کو لے کر حاضر ہونا ضروری تھا حاجی صاحب! ورنہ نہ آتا۔"

"اماں! تو بچے کو بھیج دیا ہوتا۔ کون ہے یہ۔" انہوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے انہیں سلام کیا۔ حاجی صاحب

مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔

''کون ہیں یہ مہتاب میاں......؟''

''بس یوں سمجھ لیجئے عزیز ہے میرا، نوکری کا خواہشمند ہے۔''

''اچھا...... اچھا! کہاں کس کارخانے میں لگنا ہے، کوئی کام جانتے ہیں یہ یا کوئی اور نوکری دینا چاہتے ہیں آپ......! ارے ہاں میاں! ذرا ایک بات تو بتاؤ گاڑی چلانا آتی ہے؟''

''جی!'' میں نے جواب دیا۔

''بس ٹھیک ہے اور کوئی حکم جناب مہتاب علی صاحب۔''

''نہیں حضور! بس آپ کی نوازشوں کے سائے میں پروان چڑھ رہا ہوں۔''

''مصرع ثانی بھی عرض کر ڈالیے!'' حاجی صاحب نے ظرافت سے کہا اور مہتاب علی مسکرانے لگے۔ تب حاجی صاحب نے مڑ کر کسی کو آواز دی اور ایک دبلا پتلا سا آدمی قریب آ گیا۔

''گاڑی کی چابی کہاں ہے۔'' حاجی صاحب نے پوچھا۔

''یہ ہے سرکار!'' اس شخص نے چابی نکال کر حاجی صاحب کے حوالے کر دی۔

''پیٹرول ہے گاڑی میں......؟''

''ٹنکی بھری ہوئی ہے۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' حاجی صاحب بولے اور پھر چابی مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''تو میاں! آپ اپنی ملازمت کا آغاز یوں کریں کہ سب سے پہلے ان مہتاب علی کو ان کے گھر پہنچا دیں۔''

''ایک اور ہے۔'' مہتاب علی بولے۔

''ارشاد۔''

''یہ بنارس کے گلی کوچوں سے واقفیت نہیں رکھتے، اس میں قباحت ہوگی۔''

''میاں! جسے جہاں جانا ہوگا، راستہ خود بتائے گا۔ آپ جائیے۔'' راستے میں مہتاب علی حاجی صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے تھے۔ گھر جا کر وہ لنچ بھی کینسل کرنا پڑا تھا جس کی ہدایت مہتاب علی کر آئے تھے۔ پھر میں واپس حاجی صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا۔ حاجی صاحب نے ایک معقول تنخواہ کی پیشکش کی تھی، بہت سی مراعات سے نوازا تھا۔ صبح آٹھ بجے یہاں پہنچنے کی ہدایت کی تھی، واپسی کا کوئی تعین نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ بور نہیں تھا۔ دل خوشی سے منور ہو گیا تھا۔ دو تین جگہ کے کام سونپے گئے تھے اور میں نے خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے تھے۔ سورج چھپے چھٹی دی گئی اور واپسی میں حاجی صاحب نے کچھ رقم جیب میں ٹھونس دی۔

''نہ یہ قرض ہے نہ بخشش نہ انعام! یہ فرض ہے جو آج میں پورا کر رہا ہوں۔ کل تم پورا کرنا اور جسے کچھ دو، اسے ہدایت کرنا کہ جب وہ صاحب استطاعت ہو تو اسے کسی اور کو واپس کر دے۔ ضد یا ردوقدح کر کے میرے اصولوں کو مجروح نہ کرنا۔ جو مجھے کسی اور نے دیا تھا، وہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔'' میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی تھی۔

رمارانی کے سامنے وہ پیسے رکھ دیئے۔ ''ارے یہ کیا ہے۔''

''میری کمائی......!'' میں نے کہا۔ رمارانی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے مجھے عجیب سے انداز میں دیکھا اور خاموشی سے وہاں سے چلی گئیں۔ میں ان کی کیفیات سمجھ نہیں پایا تھا۔ کھانے کے بعد البتہ انہوں نے کہا۔

''تمہاری حیثیت اتنی معمولی ہے رتنا۔''

''سمجھا نہیں رمارانی!''

''مجھے تو تمہاری پیشانی جگمگاتی نظر آتی ہے۔ لگتا ہے دھرتی پر پاؤں مارو گے تو دولت ابل پڑے گی۔'' میں مسکرا دیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں دھرتی پر پاؤں مارنا نہیں چاہتا رما رانی۔''

''سادھوؤں، رشیوں، منیوؤں اور دیوتاؤں جیسی باتیں کرتے ہو، سنسار طاقت کی زبان سمجھتا ہے اور سنسار میں سب سے زیادہ طاقتور دولت ہوتی ہے۔ ایک بار دولت کے ڈھیر لگا دو، جیون بھر کے لیے دیوتا اوتار بن جاؤ۔ سوچنا میری بات پر۔ وہ باؤلی تمہارے لیے سولہ سنگھار کر رہی ہے۔''

میں ان کے جانے کے بعد ان کی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دولت کے انبار میرے پیروں تلے تھے مگر حلال کی کمائی کے چار لڈو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ سوچا پھر بھی ان سے بات کروں گا، مطلب پوچھوں گا ان باتوں کا! البتہ جس باؤلی کے سولہ سنگھار کے بارے میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا، وہ رات گئے میرے کمرے میں گھس آئی۔ کشنا تھی اور شعلۂ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ سرخ رنگ کا لباس، دمکتے ہوئے گہنے، پھولوں کے مہکتے ہوئے ہار! ہونٹوں پر نشہ آلود مسکراہٹ اور آنکھوں میں انوکھا خمار...... ! بوجھل بوجھل ارمان بھرے احساسات سے لڑکھڑاتی ہوئی۔

''رتنا...... !'' اس کی نغمہ بار آواز ابھری۔

''تمہیں کیا ہو گیا کشنا......''

''دلہن بنی ہوں تمہارے لیے! ماں نے اجازت دے دی ہے۔ مجھے اپنے چرنوں میں سویکار کر لو۔ ہمارا پریم امر ہو جائے گا۔ آج پورن ماشی ہے رتنا! بڑی رات ہے۔ آج کی رات اور بڑی ہو جائے گی۔ مجھے سویکار کر لو رتنا!'' اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''ارے...... ارے کشنا! تمہیں کیا ہو گیا'' میں نے جلدی سے پاؤں سکوڑ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ مگر اچانک میری مٹھی بندھ گئی۔ میری نظریں اس کے مہندی رچے ہاتھوں پر جم گئیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سات سات انگلیاں تھیں۔

سات انگلیاں جو میری آنکھوں کا دھوکا نہیں تھیں، میری نگاہوں کے سامنے تھیں اور مجھے ان سات انگلیوں سے ہوشیار کر دیا گیا تھا۔ دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ کشنا اور سات انگلیوں والی! کیا یہ پورنی ہے......؟ بھوریا چرن کی جادوگرنیاں! مگر میں کیا کروں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کشنا کی نگاہیں مجھ پر نہیں تھیں۔ وہ جیسے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں اور انداز میں بے پناہ بے خودی تھی۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کیا کروں۔ بہرطور میں نے اسے سنبھالا، بستر پر بٹھا دیا اور خود اس سے کئی فٹ دور ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بات اب آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ کشنا کا یہ عمل کس مقصد کے تحت ہے۔ مجھے آگاہ کر دیا گیا تھا اور

اگر سب کچھ جاننے کے بعد کسی اور لغزش کا شکار ہو جاؤں تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ جو فیصلہ مجھے دیا گیا تھا، اس پر عمل کر کے ہی میرے جرم کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن اس سے متعلق وہ سب رما رانی، رادھا، لکشمی، مالتی، اگر میں...... ! اگر میں اس ہدایت پر عمل کر ڈالوں تو ان سب کے سامنے کیا کہوں گا...... اندر سے دل نے چیخ کر کہا۔ تجھے سب کی پڑی ہے، اپنی سوچ! جو غلاظت تیرے وجود میں اتار دی گئی ہے، اسے کم کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس سے گریز کیوں کر رہا ہے۔ جلدی کر، اس سے پہلے شیطان سے نجات حاصل کر، جلدی کر جلدی کر...... ! آواز تیز ہوتی چلی گئی اور میرے حواس پر چھا گئی۔ میں نے خونی نگاہوں سے کشنا کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''داسی ہوں تمہاری...... جیون وار دوں گی تم پر! سنسار میں اتنا اونچا کر دوں گی کہ کوئی تمہارے چرنوں کی دھول بھی نہ پا سکے، مہان ہو جاؤ گے۔ مہان ہو جاؤ گے...... مجھے سویکار کرو رتنا جی! مجھے سویکار کر لو۔'' اس نے دونوں بازو میری جانب پھیلا دیئے۔ حسن و جمال کی ایک ایسی تصویر جسے دیکھ کر آنکھیں بچھانے کو جی چاہے، خوب صورتی کا ایسا بے مثال مرقع کہ مصور اس کی صحیح تصویر نہ بنا سکے، میری نگاہوں کے سامنے تھا لیکن اب میری کیفیات میں نمایاں تبدیلیاں رونما

ہونے لگی تھیں۔ بدن میں چنگاریاں دوڑنے لگی تھیں، پورے وجود میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی اور اس کیفیت نے مجھے سہارا دیا۔ آنکھوں میں خون اترتا محسوس ہو رہا تھا، ہر شے سرخ سرخ نظر آ رہی تھی اور ذہنی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے جسم کو تھوڑا سا پیچھے سرکا لیا جیسے مجھے اپنے قریب جگہ دینا چاہتی ہو۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سیاہ لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے، سر پر زیورات سجے ہوئے تھے۔ میری انگلیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ میں نے اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لیا اور اس کے چہرے سے پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے تھے اور میرے ہاتھ اس کے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی گردن کے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ تب اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور میں نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گردن پر رکھ دیئے اور پھر میرے ہوش و حواس پر تاریکی سی چھانے لگی۔ میں نے درحقیقت کوئی خون نہیں کیا تھا، کبھی نہیں کیا تھا۔ جتنے الزامات مجھ پر عائد کئے گئے تھے، ان میں میرا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ صرف بھوریا چرن کا عمل تھا لیکن اس وقت......! اس وقت میں پہلا خون کرنے جا رہا تھا۔ اگر اس وقت کوئی کمزوری دکھائی تو کبھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔ جو کرنا ہے، کر ڈالنا چاہئے۔ دیر کرنا کسی طور مناسب نہ ہوگا۔ وہ اسی طرح نڈھال ہو گئی تھی جیسے اسے یقین ہو گیا ہے کہ اب......

اب...... اب......! میں پوری طرح اس سے متاثر ہو گیا ہوں لیکن جیسے ہی میری انگلیوں کی گرفت اس کی گردن پر سخت ہوئی، اس نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں اور درحقیقت دیکھنے کے اس انداز میں ایک دوسری ہی کیفیت تھی جیسے اسے میری نیت کا احساس ہو گیا ہو۔ اب ان آنکھوں میں خمار نہیں تھا بلکہ خوف تھا، تیزی تھی، تندی تھی۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھے لیکن میں نے دانت کچکچا کر اس کے نرخرے کو دبوچ لیا اور بدن میں جتنی قوت تھی، ایک لمحے میں ہاتھوں میں منتقل کر دی۔ میری انگلیاں جیسے موم سے گزر رہی تھیں۔ میں نے اتنی قوت سے اس کا گلا دبایا کہ اس کی زبان باہر نکل آئی، آنکھیں ابل پڑیں۔ اس کا بدن صرف ایک لمحے کیلئے پھڑپھڑایا اور اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں بے رونقی دیکھی۔ زبان ہونٹوں سے کئی انچ باہر نکل آئی تھی، منہ کھلا ہوا تھا۔ چہرے پر دہشت منجمد ہو گئی تھی لیکن میری انگلیاں اس طرح اس کی گردن میں پیوست تھیں جیسے کوئی شکنجہ پوری قوت سے کس دیا جاتا ہے۔

مجھے ایک دم یہ احساس ہوا کہ اگر میں ان انگلیوں کو اس کی گردن سے ہٹانا بھی چاہوں تو یہ میری قوت سے باہر ہے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اب اس کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ چہرہ آہستہ آہستہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا البتہ جسمانی کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ رفتہ رفتہ میری کیفیت بھی اعتدال پر آنے لگی۔ اس یقین کے بعد کہ کشنا مر چکی ہے، میں نے اپنے ہاتھوں پر توجہ دی۔

انگلیوں کو بمشکل تمام اس کی گردن سے جدا کیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے گردن چھوڑنے پر وہ بستر پر گر پڑی تھی۔ ایک بے جان وجود میرے سامنے تھا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت یہ پہلا خون تھا۔ دل میں ایک لمحے کیلئے بہت سے وسوسے، بہت سے احساسات جاگ اٹھے۔ کہیں وہ حقیقت میں کشنا نہ ہو۔ رما رانی نے اس کی جو کیفیت بتائی تھی، اس میں دیوانگی کا خصوصی طور پر تذکرہ تھا اور پھر اتنے دن سے میں خود بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ کشنا محبت میں پاگل ہو گئی تھی اور اس کے اندر کوئی بھی کیفیت، کسی بھی وقت پیدا ہوسکتی تھی۔ یہ جانا بوجھا خون میں نے پوری طرح ہوش و حواس کے عالم میں کیا تھا۔ یعنی یہ کہ مجھے اندازہ تھا کہ میں ایک انسانی خون کر رہا ہوں لیکن اندرونی طور پر جو احساسات میرے ذہن میں موجود تھے، ان کا تعلق صرف میری ذات سے تھا۔ کیا یہ واقعی پورنی ہے اور اگر نہیں ہے تو کیا صرف اس بنیاد پر میں نے اس کا خون کر ڈالا ہے کہ اس کے ہاتھ میں سات انگلیاں تھیں۔ اس سے پہلے کبھی کشنا پر اتنا غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اول تو میں نے اسے اتنی گہری نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی جب میں رما رانی کے ہاں رتنا کی حیثیت سے مقیم تھا اور اب بھی اتنے دنوں میں ایک بار بھی میرے ذہن میں یہ تصور نہیں جاگا تھا کہ اسے بھرپور نگاہ سے دیکھوں۔ ہوسکتا ہے یہ انگلیاں...... ہوسکتا ہے یہ انگلیاں...... دفعتاً میرے دل کو دہشت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ نگاہیں چونکہ کشنا پر ہی جمی ہوئی تھیں اور

اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اس لئے اس کے پپوٹوں کی وہ جنبش میری نگاہوں سے نہ بچ سکی۔ اچانک ہی اس نے پلکیں کھول دی تھیں۔

ایک لمحے کیلئے میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میرا دل دہشت سے لرزنے لگا۔ کیا میں اسے ہلاک کرنے میں ناکام رہا ہوں، کیا میرے ہاتھوں کی قوت نے بھرپور طریقے سے میرا ساتھ نہیں دیا؟ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس کی کھلی آنکھیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ پھر اس نے زبان بھی منہ کے اندر کرلی اور ہونٹ بند کرلئے لیکن اس کے بعد اس کے اٹھنے کا جو انداز تھا، اس نے مجھے کسی حد تک مطمئن کردیا کہ یہ سب...... یہ سب کالا جادو ہے، گندے اور غلیظ اجسام! کشنا نے مسہری پر ہاتھ نہیں جمائے تھے بلکہ اس کا آدھا دھڑ مشینی انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر مسہری سے بھی کھڑی ہوگئی تھی وہ! اس کے دونوں ہاتھ سیدھے تھے۔ گردن بالکل تنی ہوئی تھی، آنکھیں سامنے جمی ہوئی تھیں اور میں اس کی آنکھوں کی زد سے الگ تھا۔ پھر وہ اسی انداز میں دروازے کی جانب مڑی اور میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ وہ قدم نہیں اٹھا رہی تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز اسے دھکیلتی ہوئی لے جارہی ہو۔ اس کا رخ دروازے کی جانب تھا۔ دروازہ بند تھا لیکن جیسے ہی وہ دروازے کے قریب پہنچی، دروازہ کھل گیا۔

✦✤✦✤✦

میں نے پھرتی سے آگے قدم بڑھا دیئے۔ اب کم از کم دل کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ باہر مکمل طور پر سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔ رما رانی، لکشمی اور تمام افراد اپنی اپنی جگہ آرام کی نیند سو رہے تھے، اس ڈرامے سے بے خبر جو میرے کمرے میں ہو رہا تھا۔ میں کشنا کا پیچھا کرتا ہوا صحن میں آگیا۔ تب میں نے وہاں بہت سے سوگواروں کو دیکھا۔ ٹوٹے پھوٹے سوگوار گردنیں جھکائے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان ایک عجیب سی شے لکڑی کے تختوں پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس شے کو دور ہی سے پہچان لیا، یہ ارتھی تھی۔ ویسی ہی جیسے ہندو اپنے مردوں کو لے جانے کیلئے تیار کرتے ہیں۔ بانس لگے ہوئے تھے، درمیان میں چارپائی جیسی جگہ تھی۔ کشنا اس طرح آگے بڑھتی ہوئی ارتھی تک پہنچ گئی اور سوگواروں نے سر اٹھا دیئے۔ ان کے حلق سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں۔ کسی نے بھی گردن موڑ کر میری جانب نہیں دیکھا تھا۔ کشنا ارتھی پر بیٹھی اور پھر پاؤں سیدھے کرکے لیٹ گئی۔ تب سارے سوگوار کھڑے ہوگئے۔ ان سب نے ارتھی اپنے کاندھوں پر اٹھائی اور مخصوص انداز میں لڑکھتے چلتے آہستہ آہستہ کچھ کہتے دروازے کی جانب بڑھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ارتھی دروازے سے باہر نکل کر غائب ہوگئی۔ غائب ہونے کی بات میں نے اس لئے کی کہ جب وہ دروازے سے باہر نکل گئے تب میں نے ہمت کرکے قدم آگے بڑھائے۔ میں اب ان واقعات کا اس قدر عادی ہوچکا تھا کہ کسی بھی مسئلے میں بہت زیادہ خوف و دہشت پیدا نہیں ہونے پاتی تھی۔ دروازے سے باہر جھانکا تو دور دور تک کسی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں پوری جگہ سنسان پڑی ہوئی تھی اور کہیں بھی کسی کا پتا نہیں تھا۔ دل کو بڑا سکون محسوس ہوا۔ بڑا اطمینان ہوا کہ جو کچھ ہوا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ سات پورنیوں میں سے ایک پورنی ختم کردی تھی میں نے...... حسب سابق یہ بھی ایک انتہائی انوکھا تجربہ تھا میرے لئے۔ اس کا مطلب ہے کہ پورنیاں ایسی شکلوں میں بھی میرے سامنے آسکتی ہیں جو میرے لئے باعث احترام ہوں، قابل قدر ہوں۔

میں ان سے اتنا متاثر ہوں کہ ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ ہاں یہی تو کہا گیا تھا مجھ سے کہ لغزش کی گنجائش نہیں ہے۔ لغزش ہوئی تو بیڑا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غرق ہوجائے گا۔ یہ تو ایک مہلت دی گئی تھی مجھے میرا حساب کتاب کرکے اور میں اپنے پہلے قدم میں کامیاب رہا تھا۔ تب دل میں خوشی کی ایک لہر جاگی۔ آہ کاش...... آہ کاش! میرا یہ قدم درست ہو اور میرے مستقبل کے راستوں کو استوار کرسکے۔ اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ یہاں کا ماحول بڑا بھیانک ہو رہا تھا۔ ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ ایک ایک لمحہ خوف و دہشت کا حامل تھا لیکن اپنے آپ کو اس خوف سے آزاد کیا اور بستر کی چادر جھاڑ کر دوبارہ بچھائی۔ پھر اس پر لیٹ گیا۔ دروازہ پہلے ہی اندر سے بند کرلیا تھا۔ لیٹنے کے بعد بھی خیالات کے ہجوم سے کہاں

چھٹکارا ملتا۔ اب صبح کو رمارانی کا سامنا ہوگا۔ کشنا کی تلاش کی جائے گی لیکن میں اس میں بہت سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ یہ تو میری خوش بختی تھی کہ وہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے پھر دفعتاً ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور اس خیال نے مجھے چونکا دیا۔ کیا وہ واقعی کشنا تھی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اصل کشنا اپنی جگہ موجود ہو اور پورنی یہ روپ دھار کر میرے پاس پہنچی ہو۔ مجھے ورغلانے کیلئے، مجھے مزید گندا کرنے کیلئے تاکہ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بھوریا چرن کی غلاظت میں گرفتار ہو جاؤں۔ اگر ایسا بھی ہے تو میرے خیال میں یہ ایک اچھی بات تھی۔ اس طرح کم از کم ضمیر کو سکون ملے گا۔ کاش! وہ کشنا نہ ہو۔ کاش! وہ کشنا نہ ہو...... میں نے سوچا اور اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی تھی لیکن غنودگی نے طبیعت کسی قدر بحال کر دی تھی۔ صبح کو میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ معمول کے مطابق اپنی ملازمت پر چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے صبح ہی صبح اس بات کا انکشاف نہ ہو کہ کشنا گھر میں موجود ہے یا نہیں......! بے شک میرے دل میں یہ تجسس باقی رہے گا لیکن اچھا ہے سوچنے کیلئے پورا دن مل جائے گا۔ چنانچہ معمول کے مطابق تیاریاں کیں اور اس کے بعد باہر نکلا۔ میں جانتا تھا کہ میرے لئے ناشتہ تیار ہوگا۔ مالتی فوراً ہی مجھے ناشتے کی خبر دے گی۔ دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی سے کسی حیرت کا اظہار نہیں کروں گا اور اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔

کمرے سے باہر نکلا لیکن سامنے کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ ایک عجیب سی خاموشی، ایک عجیب سا سناٹا محسوس ہوا جیسے سب اپنے اپنے کمروں میں ہوں۔ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس وقت تو زندگی کے معمولات ہنگاموں سے پُر ہوا کرتے تھے۔ سب ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوا کرتے تھے۔ کیا ہوا ان لوگوں کو؟ کہیں رات کے واقعات کا پتا تو نہیں چل گیا۔ رمارانی اس بات سے ناواقف نہیں تھیں کہ کشنا سولہ سنگھار کر رہی ہے۔ انہیں یقینی طور پر علم ہوگا کہ یہ سولہ سنگھار کس کیلئے کئے جا رہے ہیں۔ رمارانی کے کمرے ہی کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دی مگر دستک ہی سے دروازہ تھوڑا سا اندر دب گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر نظر ڈالی اور آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہاں تو جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ جو کچھ نظر آیا، اسے دیکھ کر تو دماغ پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ کمرہ بالکل سنسان اور ویران پڑا ہوا تھا۔ دیواروں پر مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے، اندر سے سیلن کی بو آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کمرہ طویل عرصے سے نہ کھولا گیا ہو۔ سامان نام کی کسی چیز کا کوئی نشان نہیں تھا حالانکہ صرف چند گھنٹے پہلے، میں نے اس کمرے کو جگمگاتا ہوا دیکھا تھا۔

باقی باتیں تو اپنی جگہ لیکن دیواروں پر لگے ہوئے جالے، ادھڑا ہوا پلاسٹر اور پھیلی ہوئی ویرانی ناقابل یقین تھی۔ ایک دہشت بھری چیخ کے ساتھ دروازہ دھڑ سے بند کیا اور پیچھے ہٹ کر دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ دل میں اب یہ احساس جاگ رہا تھا کہ وہاں بھی کچھ نہیں ہوگا اور یہی ہوا۔ پوری عمارت آسیب زدہ محسوس ہو رہی تھی۔ کسی بھی کمرے میں زندگی کے آثار موجود نہیں تھے، کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ اپنے کمرے کی جانب آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور خوف زدہ انداز میں وہاں سے پلٹا اور بھاگتا ہوا عمارت سے باہر نکل آیا۔ نہ جانے کیوں اس وقت مجھ پر خوف و دہشت کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ عمارت سے نکلنے کے بعد بھی دیر تک دوڑتا رہا اور پھر اس میدان کے دوسرے سرے پر آ کر دم لیا جس کے دوسری جانب یہ عمارت تھی۔ سر چکرا رہا تھا، ذہن میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ یہ سب...... یہ سب کھیل تھا، یہ سب کالا جادو تھا، یہ سب سفلی علم تھا جس کی بنیاد پر وہ میری نگاہوں کے سامنے آئے تھے، اس کا مقصد ہے کہ رمارانی، رادھا، لکشمی جتنے بھی کردار سامنے آئے تھے، وہ اصل نہ تھے، وہ حقیقت نہ تھے بلکہ وہ سب جادوئی حیثیتوں کے حامل تھے۔ اُف میرے خدا...... میرے خدا......! دل چاہا کہ کسی جگہ بیٹھ کر اپنے آپ کو معتدل کروں لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی۔ تب خود کو سنبھال کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کیفیت میں حاجی صاحب کی حویلی پہنچوں گا تو کیا میری اس کیفیت کو شناخت نہ کر لیا جائے گا۔ بہرحال ایک تانگے میں بیٹھا اور اسے حاجی صاحب کی حویلی کا پتہ بتا دیا۔ سارے راستے اپنے آپ کو معتدل کرنے کی کوشش میں مصروف رہا تھا اور کچھ دیر کے بعد اس میں کامیابی بھی نصیب ہو گئی تھی۔ حاجی صاحب کے ہاں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ خود حاجی صاحب میرے ساتھ دو تین جگہ گئے، حویلی واپس آئے۔ ان کے کارخانے میں نے دیکھے، بہت بڑا کام تھا۔ شام کو ایک اور شخصیت

سے ملاقات ہوئی۔ دیونما انسان یا انسان نما دیو تھا۔ شاندار لباس میں ملبوس، رنگ چمکدار سفید۔ حاجی صاحب نے جیبی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''مسعود میاں! ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ عظیم میاں کو مبارک پورہ پہنچا دو۔ گاڑی واپسی میں ساتھ لے جانا، صبح کو آ جانا۔ دوسری گاڑی موجود ہے۔'' میں نے گردن خم کر دی۔ عظیم میاں صاحب تھے۔ میں نے ادب سے پچھلا دروازہ کھول دیا اور عظیم میاں اندر بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے خود ہی کہا۔

''عظیم میاں! راستہ بتاتے جانا۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ حویلی سے نکل کر کچھ دور ہی پہنچا تھا کہ عقب سے عظیم میاں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''روکو...... روکو......!'' اور میں نے بریک لگا دیئے۔ ویسے عظیم میاں کی آواز بڑی عجیب تھی۔ ایسی خوفناک جسامت پر یہ آواز ناقابلِ یقین

تھی۔

''جنابِ عالی......!'' میں نے کہا۔

''تمہیں نظر تو آتا ہے نا......؟'' عظیم میاں بولے۔

''جی......!'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''مم...... میرا مطلب ہے دیکھ تو سکتے ہو نا؟'' عظیم میاں بدستور گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''میں سمجھ نہیں پایا جناب......؟''

''ماموں میاں نے یہ کیوں کہا تھا کہ راستہ بتاتے جانا یعنی وہ جیسے اندھے کو سڑک پار کرائی جاتی ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے عجیب سی نظروں سے عظیم میاں کو دیکھا۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہے تھے۔ آواز کے ساتھ عقل بھی چربی کی تہوں میں پھنسی معلوم ہوتی تھی۔ بہر حال حاجی صاحب کے شناسا تھے بلکہ حاجی صاحب کو ماموں میاں کہہ رہے تھے، اس لئے احترام کرنا تھا۔ میں نے کہا۔ ''وہ دراصل مجھے بنارس کے راستے نہیں معلوم۔ آپ جہاں تشریف لے جا رہے ہیں، وہاں کے راستے بتا دیجئے۔''

''اچھا...... اوہ! میں تو ڈر گیا کہ نہ جانے ماموں میاں نے......! بعض اوقات بے وقوفی کی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ میرے گھر کا راستہ تو بہت آسان ہے، یہاں سے چھپن ٹولہ چلو۔ اس کے بعد گوبھی بازار سے نکلتے ہوئے بانس منڈی پھر مبارک پورہ......! سیدھا سا پتا ہے۔''

''خوب، آگے بڑھوں......؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ایں......! نہیں...... گاڑی ہی میں چلو......'' وہ جلدی سے بولے اور میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ عظیم میاں دلچسپ شخصیت تھے۔ سیدھی سڑک پر گاڑی کی رفتار میں نے سست ہی رکھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگے۔

''تمہارا نام کیا ہے......؟''

''مسعود کہہ سکتے ہیں آپ!''

''گاڑی بڑی اچھی چلاتے ہو۔ دراصل مجھے تیز گاڑیاں چلتے دیکھ کر بڑا ڈر لگتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی، خوامخواہ سڑکوں پر ایسے دوڑے جا رہے ہیں جیسے پیچھے سے آفت آ رہی ہو، دل اچھل اچھل پڑتا ہے۔ کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا......! کیا کہہ سکتا ہوں میں تمہیں؟''

''مسعود......!'' میں نے دوبارہ بتایا۔

''بڑے اچھے آدمی لگتے ہو۔ ماموں میاں بھی بہت اچھے ہیں۔ تم ان کے پاس نوکری کرتے رہنا، تنخواہ میں بڑھوا دوں گا......''

''بہت بہت شکریہ عظیم میاں! حاجی صاحب آپ کے ماموں ہیں؟''
''ہاں...... ہاں......! کیوں کیا ہوا؟'' وہ حیران لہجے میں بولے۔
''نہیں کچھ نہیں ہوا۔''
''اماں! سیدھے ہاتھ پہ کیوں نہیں مڑے، سیدھے کہیں اور جا رہے ہو کیا؟''
''جی۔'' میں نے گاڑی سائیڈ میں کر کے اسے بریک لگاتے ہوئے کہا۔
''چھپن ٹولہ نہیں چلو گے کیا۔ وہیں سے تو ہمارے گھر کا راستہ آتا ہے۔''
''وہ سیدھی سڑک جو مڑ رہی تھی، اس پر جانا تھا......؟''
''تو اور کیا......؟''
''جی بہتر!'' میں نے گاڑی کو تھوڑا سا آگے بڑھایا، سڑک سنسان دیکھ کر موڑا اور واپسی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس سیدھی سڑک پر مڑتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اب جدھر بھی مڑنا ہو، آپ ذرا مجھے پہلے بتا دیجئے۔''
''کہیں نہیں مڑنا بس سیدھے گوبھی بازار سے بانس منڈی کی طرف مڑیں گے۔''
''گوبھی بازار اس سڑک پر آتا ہے......؟''
''ہمیشہ سے یہیں ہے کوئی تبدیلی تھوڑی ہوئی ہے۔'' عظیم میاں نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ عظیم میاں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''درشہوار نے تمہیں تو نہیں ڈانٹا کسی بات پر؟''
''جی؟'' میں نے سامنے نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا۔
''بہت ڈانٹتی ہے۔ میری جگہ اگر وہ ہوتی تو غلط سمت گاڑی لے جانے پر تمہاری جان کو آجاتی۔ ویسے تو اس میں ساری باتیں بہت اچھی ہیں بس یہی ایک خرابی ہے۔ بس ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتی ہے۔ اماں دیکھو اب اس وقت بھی کوئی بات تھی آخر بگڑنے کی مگر...... مگر خیر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔''
عظیم میاں کی کوئی بات ابھی تک تو میری سمجھ میں نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ وہ عقل سے کچھ پیدل معلوم ہوتے تھے اور احمقانہ گفتگو کرتے تھے۔ بہر طور دلچسپ آدمی تھے۔ محترمہ درشہوار کا تذکرہ میں نے دوسری بار سنا تھا۔ ابھی تک حقیقی معنوں میں میری ان سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ مہتاب علی نے بھی خصوصی طور پر انہی کی طرف سے ہوشیار کیا تھا لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میری شخصیت کیا ہے۔ میں تو اپنی ذات میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ دل میں جو احساس بیٹھ گیا تھا، وہ یہی تھا کہ میری جس قدر ذلت ہوگی اسی قدر میرے گناہوں میں کمی واقع ہوگی اور بخشش کے راستے آسان ہو جائیں گے۔
بہر حال گوبھی بازار اور اس کے بعد عظیم میاں کے بتائے راستوں پر چلتا ہوا ان کے گھر تک پہنچ گیا۔ انہیں وہاں اتارا اور واپس پلٹ پڑا۔ اب صحیح معنوں میں مشکل وقت آ گیا تھا۔ سوچ تو دن بھر ہی ذہن پر طاری رہی تھی اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ جہاں تک رزق حلال کا تعلق تھا تو میرے خیال میں یہ نوکری میرے لئے انتہائی مناسب تھی۔ اس سے پہلے جو کچھ بھی کرنے کی کوشش کی تھی، اس میں واقعات بدل گئے تھے مگر حاجی صاحب کا گھرانہ کافی بہتر نظر آ رہا تھا۔ پھر ایک پورنی کی ہلاکت کے بعد میرے اندر کچھ اعتماد بھی بیدار ہو گیا تھا۔ ان کا نظر آ جانا شرط ہے، میں اپنی انتہائی کوششیں صرف کر کے گلوخلاصی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا...... پھر ذہن میں مہتاب علی آئے...... وہی ایک گوشۂ عافیت تھا۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ اگر مجھے وہاں پناہ مل جائے تو بڑا ہی اچھا ہو۔
ہمت کر کے مہتاب علی کے گھر کی جانب چل پڑا۔ گاڑی ان کے دروازے کے سامنے روک دی اور اسے مقفل کر کے مہتاب علی کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ مہتاب علی صاحب نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہو گئے۔
''آجاؤ، آجاؤ۔ اوہو! گاڑی میں آئے ہو......؟ خوب...... خوب! آؤ اندر آؤ میاں! تکلف کیسا'' وہ مجھے اندر لے گئے۔ رخسانہ صاحبہ دوڑتی ہوئی آئیں اور بڑی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ مہتاب علی صاحب نے بیٹھنے کی

پیشکش کی اور بولے..... ''کل سے میں بھی اپنے کام پر آ رہا ہوں۔ بہت سے معاملے گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ ذرا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے حاجی صاحب کے اخراجات کا۔ انہوں نے مجھے پرائیویٹ طور پر اپنا خزانچی مقرر کیا ہے۔ وہیں اس حویلی میں میرا ایک چھوٹا سا دفتر بنا ہوا ہے۔ باہر کے کام باہر ہوتے ہیں لیکن سارے حسابات کی آخری جانچ پڑتال میرے سپرد ہے۔ ویسے میاں مسعود! ذرا بے تکلفی سے بتانا وہ جگہ کچھ مشکل تو محسوس نہیں ہو رہی؟ ویسے تو سب ہی لوگ بہت اچھے ہیں، بس ذرا درشہوار اور جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ کبھی کبھی بیگم صاحبہ بھی اوقات سے باہر ہو جاتی ہیں۔ بس انہی دونوں کی طرف سے تھوڑا سا تردد ہے ورنہ باقی تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا..... ''آپ اس بارے میں بالکل مطمئن رہیں مہتاب علی صاحب! میں ایسی باتوں پر غور نہیں کرتا۔ ویسے بھی ابھی تک میری بیگم صاحبہ یا درشہوار سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی ہے لیکن اگر کوئی ایسی ویسی بات بھی ہوئی تو ملازمت بہرحال ملازمت ہوتی ہے۔''

مہتاب علی صاحب پرخیال نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رخسانہ کی طرف رخ کر کے بولے۔ ''رخسانہ بیٹی! جاؤ بھائی آئے ہیں، کچھ خاطر مدارت کا بندوبست کرو۔''

''نہیں مہتاب علی صاحب! براہ کرم پہلے میری ایک مشکل سن لیجئے گا اس کے بعد خاطر مدارت کی بات کریں۔''

''ارے تو پہلے کیوں نہ بتایا؟''

''ہمت کر رہا تھا۔'' میں نے کہا اور مہتاب علی صاحب عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر خاموشی سے میرے بولنے کے منتظر رہے۔ تب میں نے کہا۔ ''میں کوئی پناہ گاہ چاہتا ہوں مہتاب علی صاحب! اور بے تکلفی سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کیلئے مجھے آپ ہی کا سہارا درکار ہوگا۔ کوئی ایسی جگہ جہاں میں رات کو سو سکوں، ممکن ہو تو مجھے عنایت کر دیں۔ کوئی صلہ دینے کی بات نہیں کروں گا۔ کیا دے سکتا ہوں میں آپ کو..... ! لیکن اگر کوئی خدمت سونپی گئی تو اسے پورا کرنا میں اپنی خوش بختی سمجھوں گا۔ دراصل اب میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔''

مہتاب علی صاحب نے شاید اس لفظ ''اب'' پر چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ صاحب ظرف انسان تھے۔ ایک لمحے خاموش رہے پھر بولے۔

''مسعود میاں! بات دراصل یہ ہے کہ بہت سی باتیں دل میں ہوتی ہیں لیکن انہیں زبان پر لانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم صرف چار افراد ہیں اس گھر میں اور ویسے بھی بدقسمتی سے دوسرے عزیز واقارب سے محروم ہیں۔ تفصیل میں جانا بیکار ہی ہوگا۔ یوں سمجھو کہ یہ گھر کسی نئی آواز کو ترسا ہوا ہے۔ اگر ہمیں یہ سعادت حاصل ہو جائے تو یہ تو ہماری خوش بختی ہے۔ تم سونے کیلئے ایک چارپائی کی جگہ کی بات کرتے ہو، میں کہتا ہوں میرے گھر کے کسی بھی فرد سے پوچھ لو، وہ تمہیں دل میں بٹھانے کو تیار ہو جائے گا۔ میاں! اس سے اچھی کوئی بات اور کیا ہو سکتی ہے جو تم نے اس وقت کہی۔ میں تم سے یہ سوال بالکل نہیں کروں گا کہ اچانک ہی تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کیونکہ یہ استفسار، تفتیش

حال تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔''

''دراصل میں..... !'' میں نے کہنا چاہا مگر مہتاب علی نے مجھے روک دیا اور بولے۔ ''نہیں! تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے بس وہ ضرور بتا دینا جو تمہاری مشکل ہو اور اب ذرا اجازت دو یہ خوشخبری دوسروں کو بھی سنا دوں۔'' مگر محترمہ رخسانہ ان سے پہلے اندر دوڑ گئی تھیں۔

میں گہری سانس لے کر سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس بات پر کئی بار غور کر چکا تھا کہ یہ دنیا مجھ پر بہت تلخ نہیں ہوئی تھی۔ مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے تو سہارا دینے والے بھی ملتے رہے تھے۔ اس طرح صورتحال متوازن رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دو ہی صورتیں ہوتیں یا تو زندگی ختم کر لیتا یا بھٹک جاتا اور ایمان کھو بیٹھتا لیکن بھوریا چرن کی وجہ سے جتنی صعوبتیں اٹھانی پڑی تھیں، اتنے ہی بے لوث محبت کرنے والے بھی ملے تھے۔

مہتاب علی کی بیگم کے ساتھ ان کی دوسری بیٹی بھی آ گئی تھی۔
''جی خوش کر دیا تم نے مسعود میاں......! خدا تمہیں خوش رکھے بیٹے! ہم بے لوث، بے غرض لوگ ہیں۔ محبتوں کو ترسے ہوئے، ہمیں بس اپنائیت دے دینا، اس سے زیادہ ہماری طلب کبھی کچھ اور نہ ہوگی۔ تم سے وعدہ......! سر آنکھوں پر رہو مگر اپنوں کی طرح، کوئی تکلف نہ کرنا۔ اس گھر کا ہر گوشہ دیکھ لو جو پسند آئے، وہ تمہارا۔''
''چچی جان...... کوئی رسمی جملہ عرض نہ کر پاؤں گا بس اعتماد کا طلب گار ہوں۔ جو جگہ آپ میرے لئے مخصوص کریں گی، وہ مجھے پسند ہوگی۔''
''بھئی یہ قابل بحث مسئلہ نہیں ہے۔ بغلی کمرہ مسعود میاں کیلئے مناسب ہے۔ اس کا راستہ اندر بھی ہے اور باہر بھی بس اسے ٹھیک کرا دیں۔''
''فرحانہ...... جاؤ رخسانہ کے ساتھ وہ کمرہ درست کر دو۔'' اس کے بعد باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ضرورتوں کی تکمیل ہوئی تھی اور اس کے بعد مجھے تنہائی مل گئی تھی۔ بہت بڑے واقعے سے گزرا تھا مگر سکون تھا بلکہ خوشی تھی، البتہ یہ نہ سمجھ پایا تھا کہ رما رانی اور دوسرے لوگ کیا تھے۔ کشنا تو پورنی تھی۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی تھی جب اس کے بیر اس کی ارتھی اٹھا کر لے گئے تھے مگر وہ...... کیا سب کچھ جال تھا، فریب تھا؟ آہ! اگر ایسا تھا تو کتنا انوکھا فریب تھا۔ کس طرح میرے جذبات سے کھیلا گیا تھا۔ کیسا انوکھا انتخاب کیا گیا تھا۔ سچ تو ہے بھوریا چرن تو میرے ہر پہلو سے واقف ہے۔ میری اس زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہ میں ہے، وہ آئندہ بھی ایسے کردار منتخب کر سکتا ہے جن کا مجھ سے گہرا تعلق ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔ ہمیشہ محتاط رہنا ہوگا۔
دوسری صبح مہتاب علی نے دروازہ بجا کر جگایا۔ اٹھ جاؤ مسعود میاں! ساڑھے سات بج گئے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ ناشتہ تیار تھا۔ خود مہتاب علی بھی تیار تھے۔ بولے۔ ''تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔''
''جی...... چلیں......!''
''تمہیں یہ نوکری ناپسند تو نہیں ہے؟''
''بالکل نہیں مہتاب علی صاحب۔''
''میاں چچا جان کہہ لیا کرو، ہم بھی کیا یاد کریں گے۔'' مہتاب علی خوش دلی سے بولے۔
''بہتر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''ورنہ وہ محترمہ طنز کریں گی ہم پر...... بہت خوش تھیں اس بات پر کہ تم نے انہیں چچی جان کہہ کر مخاطب کیا۔ ہمارا خطاب بھی ضروری ہے۔''
''یقیناً......!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہم حویلی پہنچ گئے۔ یہاں کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ حاجی صاحب سامنے ہی نظر آئے۔ ہم گاڑی سے اترے تو ہمارے پاس پہنچ گئے۔ سلام کا جواب دے کر مہتاب علی سے مخاطب ہوئے۔ ''جی فرمایئے...... کوئی کام ہے؟''
''دفتر جانا چاہتا ہوں، چابیاں مرحمت ہو جائیں۔''
''کیا جلدی ہے......؟ چہرہ دیکھ رہے ہو آئینے میں، نقاہت سے بھرپور ہے۔''
''محبت کی نگاہ ہے ورنہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' تھوڑی دیر تک ردوقدح ہوتی رہی۔ اس کے بعد مہتاب علی کو دفتر کی چابیاں مل گئیں۔ میں گاڑی صاف کر کے اس کا تیل پانی چیک کرنے لگا تھا۔
پورے ایک ہفتے کے بعد مس درشہوار کی زیارت ہوئی تھی۔ ساتھ میں بیگم صاحبہ بھی تھیں۔ کار کے قریب آئیں اور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔ ''ڈرائیور کہاں ہے......؟''
''جی! میں حاضر ہوں۔''

''نور کہاں ہے......؟''

''حاجی صاحب کے ساتھ گیا ہے۔''

''تم نئے ڈرائیور ہو......؟'' یہ سوال بیگم صاحبہ نے کیا۔

''جی ہاں......!''

''ہوں...... چلو......!'' دونوں خواتین میں درشہوار بلاشبہ خوبصورت تھی۔ حسن کے معیار پر مکمل مگر چہرے ہی مغرور اور نخوت سے بھرے معلوم ہوتے تھے۔ ہونٹ حسین تراش کے مگر مسکراہٹ سے عاری!

''کہاں جانا ہے بیگم صاحبہ......؟'' میں نے پوچھا اور ایک جگہ کا نام لے دیا گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر درشہوار کی آواز ابھری۔ ''اس سے پہلے تانگہ ہانکتے رہے ہو؟''

''جی......؟''

''یہ گاڑی چلا رہے ہو یا تانگہ......! کار اس رفتار سے چلائی جاتی ہے؟''

''ٹھیک چلا رہا ہے شہوار......! تیز رفتاری اچھی نہیں ہوتی۔''

''میں نے آپ کو ساتھ چلنے کی دعوت کب دی تھی؟''

''اب تو میں چل ہی رہی ہوں۔''

''تو پھر کار میں چلئے...... تانگے میں نہیں......! تیز چلاؤ گاڑی۔'' کڑک کر کہا گیا۔ میں نے رفتار تیز کر دی اور تیز اور تیز......!

''ارے بھیا! ارے بیر...... ارے ارے...... ارے......! خدا تمہیں نیکی دے۔ ارے مارو گے کیا......! ارے آہستہ کرو۔'' بیگم صاحبہ کا دم نکلنے لگا اور میں نے رفتار سست کر دی۔ مگر شکر ہے کوئی اور فرمائش نہیں ہوئی اور منزل آگئی۔ نیچے اترتے ہوئے درشہوار صاحبہ نے کہا۔ ''لباس روزانہ تبدیل نہیں کرتے؟''

''جی نہیں......!''

''یہ تمہارا کالر سیاہ ہو رہا ہے بالکل...... جب کبھی میرے ساتھ چلو تو اتنے صاف رہو کہ اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔''

دونوں ماں، بیٹیاں اندر چلی گئیں اور میں مسکرانے لگا۔ تو یہ ہیں مس درشہوار......!

حاجی صاحب کی حویلی اور مہتاب علی کا گھر، رخسانہ خاموش طبع اور شرمیلی فرحانہ......! ان تمام لوگوں کا ساتھ تھا۔ زندگی ایک ٹھہراؤ اختیار کرنے لگی تھی۔ کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ مہتاب علی صحت مند ہو گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر انسان کو زندگی میں ایک ایسا سہارا درکار ہوتا ہے جو اس کیلئے غیر متوقع ہو اور اگر اسے کوئی ایسا سہارا مل جائے تو اس کے وجود میں بہت سی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ میں ان کیلئے ایسا ہی سہارا ثابت ہوا ہوں۔ ایک اور دلچسپ شخصیت عظیم میاں کی تھی۔ حاجی صاحب کی مرحوم بہن کے بیٹے تھے۔ حاجی صاحب کی آنکھوں کا تارا......! حاجیانی بھی انہیں بہت چاہتی تھیں اور وہ درشہوار کو چاہتے تھے۔ کسی رازدار کیلئے بے چین تھے۔ ایک دن مجھ سے بولے۔ ''تم نے محبت کی ہے؟''

''کس سے عظیم صاحب؟''

''کسی لڑکی سے......!''

''نہیں...... کیوں؟''

''یار......! کسی ایسے تجربے کار آدمی سے ملاؤ جو بہت سی محبتیں کر چکا ہو۔''

''کیا کریں گے؟''

''بس! اس سے محبت کرنے کے طریقے سیکھوں گا۔''

''آپ کو نہیں آتے؟''

''بالکل نہیں آتے...... پریشان رہتا ہوں۔ کبھی شہوار سے کچھ کہتا ہوں تو وہ ناراض ہوجاتی ہے۔ کوئی استاد مل جائے تو کچھ مشورہ کروں اس سے!''

''آپ مس درشہوار سے محبت کرتے ہیں؟'' میں نے کہا اور عظیم میاں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہوں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔''تت...... تمہیں کیسے معلوم......؟''

''جی......!'' میں حیرانی سے بولا۔ ابھی انہوں نے میرے سامنے درشہوار کا نام لیا تھا۔ بہر حال مجھے ان کے بارے میں اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا چنانچہ میں نے بھی لطف لینے کی غرض سے کہا۔''آپ کی آنکھوں سے پتا چلتا ہے۔''

''ایں! کیا آنکھوں سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ کون کس سے محبت کرتا ہے؟''

''کیوں نہیں!''

''ابے تو تم خود ہی اچھے خاصے تجربہ کار ہو۔ پیارے بھائی! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ تھوڑی بہت معلومات تو تمہیں ضرور ہوں گی اس بارے میں کہ محبت کیسے کی جاتی ہے، حالانکہ ماموں میاں اور ممانی جان مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ درشہوار سے میری شادی ہوجائے مگر ماموں میاں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بیٹی کی خواہش کے بغیر وہ اس کی شادی کہیں نہیں کریں گے، ہاں! اگر میں درشہوار کو اس شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی اور ماموں میاں میری شادی کردیں گے۔''

''افسوس! میں اس سلسلے میں بالکل واقفیت نہیں رکھتا ورنہ آپ کی مدد ضرور کرتا۔''

''تو پھر کسی ایسے آدمی کو تلاش کرو جو اس سلسلے میں کارآمد ہو۔ ویسے وہ نوشاد آدمی تو اچھا ہے مگر مجھے پسند نہیں۔ ہمیشہ میرا مذاق اڑاتا ہے۔''

''کون نوشاد؟''

''رشتہ دار ہی ہے ہمارا...... بڑا یار باش آدمی ہے مگر ہے چار سو بیس! میں اس کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ ہمیشہ الٹے سیدھے مشورے دیتا ہے مجھے۔ آدمی ویسے بہت اچھا ہے۔ تو تم میرے لئے کوشش کرو۔ اگر کوئی تجربہ کار آدمی مجھے دے سکو تو میں تمہیں انعام بھی دوں گا۔''

''جی بہتر ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

میں نے جواب دیا مگر ہنسی آئی تھی مجھے! کچھ دل بھی لگ گیا تھا یہاں اور وقت اچھا خاصا گزر رہا تھا۔ پھر ایک دن درشہوار صاحبہ اپنی چند دوستوں کے ساتھ پکنک منانے کیلئے تیار ہوئیں۔ ہم دونوں ڈرائیوروں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ گاڑیاں تیار رکھیں اور بچوں کو پکنک پر لے جائیں۔ ایک اور گاڑی بھی تھی جس میں کچھ نوجوان تھے۔ بزرگوں میں کوئی نہیں تھا۔ بہر طور تیاریاں ہوئیں اور ایک پُرفضا مقام پکنک کیلئے منتخب کرلیا گیا۔ بلاشبہ عمدہ جگہ تھی لیکن میں اس سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ میری حیثیت ایک ڈرائیور کی تھی۔ درشہوار کی وہی کیفیت تھی۔ ناک چڑھی ہوئی، پیشانی پر بل......! پکنک کے مقام پر بھی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بہرحال ہم لوگ سیر و سیاحت کرنے لگے۔ کچھ فاصلے پر ایک بہت گہرا گڑھا تھا جو نیچے سے گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ کچھ سوکھے ہوئے درخت اس گڑھے میں اُگے ہوئے تھے اور کافی گہرائی تھی اس میں۔ اتفاق سے میں وہیں موجود تھا جب درشہوار اپنی تین دوستوں کے ساتھ پہنچ گئی۔ بھلا پکنک پر عظیم میاں کیوں نہ ہوتے۔ میں نے انہیں عجیب وغریب انداز میں درشہوار کے پیچھے لگے ہوئے دیکھا تھا۔ درشہوار کو شاید کوئی شرارت سوجھی۔ عظیم میاں زیادہ فاصلے پر نہیں تھے، میں بھی دور نہیں تھا، اس نے اچانک ہی عظیم میاں کی طرف دیکھا، اپنی ساتھی لڑکیوں سے کچھ کھسر پھسر کی اور ان کی جانب متوجہ ہوکر شاید انہیں آواز دی۔ عظیم میاں سر کے بل تو نہیں پہنچے تھے البتہ فوراً ہی اس کے قریب آگئے تھے۔ میں اتنے فاصلے پر تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ درشہوار، عظیم میاں سے کہنے لگیں۔ ''عظیم صاحب عشق و محبت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟'' اس براہ راست سوال پر عظیم میاں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی

آنکھوں سے درشہوار کو دیکھنے لگے۔ پھر تھوک نگلتے ہوئے آہستہ سے بولے...... "کچھ نہیں...... میرا مطلب ہے کچھ نہیں!"

"اوہ! تو پھر آپ سے پوچھنے سے کیا فائدہ؟"

"نہیں......نہیں آپ ضرور پوچھئے، میں جواب دوں گا۔"

"یہ میری دوست ہما ہے۔ آپ اسے جانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔"

"اس کا کہنا ہے کہ محبت کرنے والے جان پر کھیل جاتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟"

"بالکل...... بالکل!" عظیم میاں نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"میں نہیں مانتی۔ یہ کہتی ہے کہ اگر کوئی محبوبہ کسی محبت کرنے والے کو کوئی حکم دے تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتا ہے۔"

"بالکل...... بالکل۔" عظیم میاں اسی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔

"میں نہیں مانتی اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ اس گڑھے میں کود جائیں تو کیا آپ کود جائیں گے؟" درشہوار بولی اور عظیم میاں گڑھے میں جھانکنے لگے۔ پہلے بوکھلائی ہوئی نظروں سے درشہوار کو دیکھا پھر ادھر ادھر...... پھر بولے۔ کیوں نہیں......!

"تو کود جایئے۔"

"اچھا! کوشش کرتا ہوں۔" وہ بولے، آنکھیں بند کیں اور گڑھے میں کود گئے۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے گڑھے میں جھانکا۔ عظیم میاں گھاس کے ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔ سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ میں نے ملامت آمیز نظروں سے درشہوار کو دیکھا۔ سب ہی ساتھی لڑکیاں چیخنے لگیں، تمام لوگ جمع ہو گئے اور شوروغوغا ہونے لگا۔ عظیم میاں جیسے گوشت کے تودے کو اتنے گہرے گڑھے سے نکالنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے کیا کیا جتن کئے گئے تھے تب کہیں عظیم میاں باہر کھینچے گئے۔ بے ہوش تھے، خوب چوٹیں لگی تھیں، ساری پکنک ایسی تیسی میں مل گئی۔ فوراً ہی واپسی کی تیاریاں کی گئیں۔ اصل بات صرف وہ لڑکیاں جانتی تھی یا میں اور درشہوار کو شاید اس کا احساس تھا۔ حویلی آئے، عظیم میاں اسپتال لے جائے گئے، ہوش میں آ گئے پھر پٹیاں بندھوا کر واپس حویلی لے آئے گئے۔ عجیب سی فضا ہو گئی، سب پریشان تھے۔ درشہوار نے ایک لمحے کیلئے عظیم میاں کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس وقت بھی وہ کمرے میں ان کے پاس تھی جب کوئی اور نہیں تھے۔ مجھے ایک دوا دے کر اندر بھیجا گیا اور جب میں اندر داخل ہوا تو درشہوار کی آواز سنائی دی۔ "وعدہ کرتے ہیں؟"

"ہاں......!"

"آپ کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ پاؤں پھسل گیا تھا۔" عین اس وقت درشہوار نے مجھے دیکھا اور چونک پڑی پھر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

✦✣✦✣✦

"تم جانور ہو بالکل!" وہ گرجی۔

"یہ دوا بھیجی ہے حاجی صاحب نے! یہ تینوں گولیاں انہیں کھلا دیں۔"

"گدھوں کی طرح منہ اٹھائے گھس آئے۔ تم نے اندر آنے کی جرأت کیسے کی؟" نہ جانے کیوں مجھے ترس آ گیا۔ میں نے اسے گھورا اور آہستہ سے بولا۔ "گولیاں لے لیجئے۔"

"میری بات کا جواب دو!"

"آپ بہری ہیں کیا...... یہ گولیاں بھیجی گئی ہیں میرے ہاتھ! آپ یہ انہیں کھلا دیں یا آپ باہر نکل جائیں، میں کھلا دوں گا۔" درشہوار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ مجھے گھورتی رہی پھر مڑی اور اس کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے عظیم میاں کو گولیاں کھلائیں اور پھر باہر نکل آیا۔ عجیب سا ماحول ہو گیا تھا۔ حاجی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ آج

واپس نہ جاؤں، نہ جانے کس وقت عظیم میاں کی وجہ سے میری ضرورت پیش آ جائے۔ میں نے گردن جھکا دی۔ پکنک سے تو تھوڑی دیر کے بعد ہی واپسی ہوگئی تھی۔ سارا مزا کرکرا ہوگیا تھا پکنک پر جانے والوں کا!

وقت گزرتا رہا، رات ہوگئی۔ عظیم میاں کو تیز بخار ہوگیا تھا اور اہل خانہ شدید تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ سب ان کے کمرے میں جمع تھے۔ میں باہر موجود تھا اور آج کے واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک ملازمہ نے میرے قریب آ کر کہا۔ ''اندر آؤ...... تمہیں بلایا گیا ہے۔''

میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ ملازمہ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر اس نے کہا۔ ''اندر جاؤ۔'' دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر تیز روشنی تھی اور اس روشنی میں مجھے ایک عجیب الخلقت شے نظر آئی...... چہرہ درشہوار کا تھا مگر اس کے پورے بدن پر بال اُگے ہوئے تھے۔ بہت سی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ بدن کا انداز بدلا ہوا تھا۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ایک بہت بڑی مکڑی کھڑی ہوگئی ہو......! وہ اپنی منحوس پیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

بھوریا چرن میرا پرانا دوست، یہ بھوریا چرن ہی کا رُوپ تھا مگر اس کی جھلک صرف ایک لمحے کیلئے نظر آئی، اس کے بعد وہ صرف درشہوار رہ گئی۔ اپنی اصل شکل میں آ گئی تھی، شعلۂ جوالا بنی ہوئی اور آنکھوں میں سخت طیش کے آثار۔ پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ڈرائیور تمہاری موت تمہیں اس جگہ لائی ہے، سمجھے۔ تمہارے لیے میں نے صرف یہی فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں مر جانا چاہیے۔ میں نے زندگی میں کسی کو زخمی بھی نہیں کیا لیکن تم نے مجھے قتل جیسے بھیانک اقدام پر مجبور کر دیا ہے اور اب تم خاموشی سے مر جاؤ، بالکل خاموشی سے۔'' اچانک درشہوار نے پستول مجھ پر تان لیا۔ یہ پستول پہلے سے اس کے ہاتھ میں چھپا ہوا تھا۔ میں ساکت کھڑا اسے گھورتا رہا۔ ابھی تو میرے ذہن سے یہ تاثر ہی ختم نہیں ہوا تھا کہ میں اسے بھوریا چرن کے رُوپ میں دیکھ چکا ہوں، وہ کچھ اور ہے کچھ اور......

درشہوار کا کچھ اور خیال تھا، شاید وہ سوچ رہی تھی کہ پستول دیکھ کر میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگوں گا۔ دہشت سے میرا رنگ بدل جائے گا اور میں نہ جانے کیا اول فول بکنے لگوں گا۔ لیکن میں اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔

''تم سمجھ رہے ہو میں گولی نہیں چلا سکتی۔'' اس نے کہا۔ میں پھر بھی چپ رہا تو وہ پھر بولی۔ ''تمہیں موت کا خوف نہیں ہے اپنی دلیری کا سکہ جمانا چاہتے ہو مجھ پر۔'' اب وہ سو فیصدی درشہوار تھی۔ اگر وہ بھوریا چرن کا رُوپ ہے، اگر وہ پورنی ہے تو دیکھ لوں گا اسے۔ اس وقت سنبھلنا ضروری ہے۔

''آپ نے مجھے بلایا ہے۔'' میں نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔'' اس نے کہا۔

''کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''جو کچھ میں نے کہا ہے وہ تم نے نہیں سنا؟''

''سن لیا ہے۔''

''تم نے مجھے بہری کہا تھا؟''

''اُس وقت کہا تھا۔''

''میرے بارے میں تمہیں علم ہے کہ میں کون ہوں؟''

''اب ہوگیا ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔''

''مجھے تو...... مجھے تو تم پاگل لگتے ہو۔''

''میں واپس جا سکتا ہوں۔''

''زندہ نہیں جا سکتے سمجھے۔ تم نے اپنی حیثیت سے تجاوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں لوگ میری صورت دیکھ کر ہکلانے لگتے ہیں اور...... اور تمہاری یہ جرأت...... تمہیں معافی مانگنا ہوگی۔''

''مجھے حاجی صاحب نے یہاں بھیجا تھا۔ ان کے حکم کی تعمیل مجھ پر فرض تھی۔''

''میرا حکم ان سے افضل ہے۔''

''شاید...... مجھے بتایا نہیں گیا۔''

''آج سن لیا ہے۔''

''سن تو لیا ہے لیکن اس پر عمل کرنے کا حکم حاجی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔''

''اوہ...... تم...... تم...... شاید تم مرنا ہی چاہتے ہو...... میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی بالکل نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے معلوم ہے تم...... وہاں تم...... پکنک پر ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔''

''پیچھا؟''

''بالکل پیچھا کر رہے تھے۔ تم اس وقت وہاں کیوں موجود تھے جب عظیم صاحب گڑھے میں گرے تھے۔''

''مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دینے والے ہیں۔''

''تم نے ہماری باتیں چھپ کر سنی تھیں۔''

''جی سنی تھیں۔''

''اور اب تم وہ تمام باتیں حاجی صاحب کو بتانے کیلئے بے چین ہوگے، یہی بات ہے نا۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا یہ باتیں تو عجیب تھیں مگر ان میں معصومیت تھی۔ اس گفتگو سے اس کی فطرت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک خودسر مغرور لڑکی تھی، ذہنی طور پر اس قدر برتر نہیں تھی جتنا ظاہر کرتی تھی۔ پھر مجھے جو کچھ نظر آیا کیا وہ صرف میرا واہمہ تھا۔ کوئی غلط فہمی ہوئی تھی مجھے...... مگر سوچنے کا وقت نہ ملا۔ اس نے پھر اپنا سوال دُہرایا تھا۔

''جی نہیں...... میں کسی کو کچھ بتانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

''سچ بول رہے ہو......؟'' اس نے مشکوک انداز میں کہا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر نہ بھی بول رہے ہو تو تم میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اوّل تو ویسے بھی تمہاری بات پر کوئی تفتیش نہیں کرے گا پھر خود عظیم بھائی گواہی دیں گے کہ وہ خود گڑھے میں گرے تھے۔ تمہارے لیے میں اس سے بھی زیادہ گہرا گڑھا کھود دوں گی۔ میں کہہ دوں گی کہ یہ شخص مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔''

''جی بہتر۔''

''تو اب یہاں کیوں مر رہے ہو؟''

''آپ مجھے قتل کرنا بھول گئیں شاید۔'' میں نے کہا۔

''دفعان ہو جاؤ، میں دو کوڑی کے نوکروں کو منہ نہیں لگاتی۔'' اس نے جھلا کر کہا اور میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی ذہن پر چسپاں نہیں ہوا تھا مگر اس کے کمرے میں داخل ہو کر مجھے اس کی جو شکل نظر آئی تھی اس نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ اس وقت تو میرے ذہن میں دُور دُور تک بھوریا چرن کا تصور نہیں تھا پھر درشہوار مجھے ایسی کیوں نظر آئی۔

یہ رات یونہی گزری۔ عظیم میاں کی وجہ سے سب پریشان تھے لیکن صبح کو وہ بہتر ہو گئے اور پھر بتدریج ٹھیک ہونے

لگے۔ شام تک وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ شہاب علی کو بھی ساری صورت حال معلوم تھی۔ ان میں چچی جان اور فرحانہ بھی حاجی صاحب کی کوٹھی میں آئے تھے اور دیر تک رہے تھے۔ بہرحال یہ ڈرامہ ختم ہو گیا۔ آج دن میں دو بار درشہوار نظر آئی تھی وہی انداز تھا، وہی پُرغرور تنی ہوئی گردن تھی۔ مجھے اس وقت کے واقعہ کی حقیقت پر خود شک ہو گیا، مگر نہ جانے ایسا کیوں ہوا تھا۔ رات کو معمول کے مطابق واپس آ گیا۔ کھانا وغیرہ کھایا اور آرام سے سو گیا۔ پچھلی رات بے چین رہا تھا اس لیے نیند آ گئی۔ رات کے دو بجے تھے جب آنکھ کھل گئی، پُرسکون نیند ٹوٹ گئی۔ نہ جانے کیوں...... ذہن پوری طرح جاگ گیا تھا۔ چھت کو گھورتا رہا پھر بغلی کھڑکی کی طرف نگاہ اُٹھ گئی اور بری طرح اُچھل پڑا۔ کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا تھا۔ خدوخال واضح نہیں تھے مگر آنکھیں روشن تھیں۔ یہ آنکھیں کینہ توزی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ ان میں نفرت تھی اور یہ آنکھیں، یہ درشہوار کی آنکھیں تھیں، اُچھل کر بیٹھ گیا۔ ''کون ہے؟'' میرے حلق سے آواز نکلی اور آنکھیں فوراً غائب ہو گئیں۔ جھپٹ کر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ یہ کھڑکی مکان کے عقب میں گلی میں کھلتی تھی۔ پرانے طرز کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان سے گزر کر کسی کا اندر آنا ناممکن تھا مگر وہ چہرہ، وہ آنکھیں...... گلی کے انتہائی سرے پر ایک سایہ نظر آیا جو فوراً غائب ہو گیا تھا۔ یقیناً کوئی بھاگتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا مگر کون...... کیا درشہوار......؟ ان آنکھوں کو میں بھول نہیں سکتا تھا مگر درشہوار۔

واقعات مسلسل پُراسرار تھے۔ میرا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ مہلت نہیں مل رہی تھی۔ سات پورنیوں میں سے ایک ہلاک ہو چکی تھی اور وہ سب کچھ رمارانی، رادھا اور کشنا...... ابھی تک میری عقل کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ صبح کو سب کچھ معمول کے مطابق ہوا۔ ذہن میں کرید تھی، زیادہ تر درشہوار کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی آنکھیں غور سے دیکھیں اور شبہ نہ رہا یہی آنکھیں میری نگراں تھیں مگر کیوں...... درشہوار کیا واقعی مجھ سے خوف زدہ ہو گئی تھی اور مجھے ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے اس نے سمجھداری سے کام لیا ہو، اگر وہ اپنے کمرے میں واقعی مجھے گولی مار دیتی تو میرے قتل کا الزام اس پر آتا اور اب وہ میری تاک میں ہو۔ اس خیال پر مجھے ہنسی آ گئی۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتی ہے تو ضرور کر دے۔ یہ ناپاک زندگی ختم ہو جائے۔ میں تو دل سے چاہتا تھا، یہ بے مقصد زندگی مجھے بوجھ لگتی تھی۔ خود اپنا خاتمہ کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شام کو کسی کام سے دُرشہوار کے کمرے کے سامنے سے گزرا۔ کھلے دروازے سے اندر نگاہ گئی تو اُچھل پڑا، وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ جائے نماز پر بیٹھی وہ مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔ آگے بڑھ گیا اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ میرا وہم تھا صرف وہم...... لیکن اس رات پھر اُلجھ گیا۔ کھڑکی بند کر کے سویا تھا۔ ٹھیک دو بجے تھے، آنکھ کھلی۔ کھڑکی سے وہی آتشی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ پورے ہوش و حواس کے عالم میں، میں نے وہ آنکھیں دیکھی تھیں۔ برق کی سی تیزی سے میں نے پلنگ سے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی اور اسی تیزی سے وہ چہرہ وہاں سے غائب ہوا لیکن آج میں نے دیر نہیں کی۔ گلی طویل نہیں تھی پھر بھی وہ آدھی گلی عبور کر چکی تھی اور اس کے جسم کو دیکھ کر مجھے شبہ نہ رہا وہ درشہوار ہی تھی، سو فیصدی وہی تھی۔ دماغ گھوم کر رہ گیا یہ کیا اسرار ہے۔ حاجی صاحب کے گھر سے یہاں تک طویل فاصلہ تھا۔ وہ اتنی رات کو یہ فاصلہ عبور کر کے آتی ہے اور کھڑکی سے مجھے گھورتی ہے۔ کیوں...... آخر کیوں...... کیا چاہتی ہے وہ۔ اسے نماز پڑھتے دیکھ کر بھرم قائم ہوا تھا مگر اس وقت سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا تھا۔

مہتاب علی صاحب سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ''اَرواحِ خبیثہ سے متعلق کچھ معلومات ہیں آپ کو چچا جان؟''

''نہ ہونے کے برابر...... کیوں۔''

''ویسے ہی مجھے کچھ دلچسپی ہے۔''

''ارے...... اس دلچسپی کی کوئی وجہ۔''

''کوئی خاص نہیں، بس کچھ مشاہدات۔''

''مثلاً۔''

''صرف ایک سوال...... کوئی مسلمان لڑکی خواہ وہ کسی بھی حیثیت کی مالک ہو، ایک خبیث رُوح کی شکل میں نظر آئے،

اس کی حرکات وسکنات پُراسرار ہوں، مگر بعد میں وہ نماز پڑھتی نظر آئے تو کیا کوئی گندی رُوح اس میں حلول کر سکتی ہے۔''

''مسلمان لڑکی۔'' شہاب علی کچھ سوچنے لگے پھر بولے۔''اس سلسلے میں میرا ایک سوال ہے۔''

''جی۔''

''تم نے خبیث رُوح کا تعین کیسے کیا۔''

''ایک ایسی شکل جس کے بارے میں علم ہو کہ وہ کالے جادو سے تعلق رکھتی ہے۔''

''کسی مسلمان لڑکی پر جن کا سایہ ہوسکتا ہے۔ اس پر سفلی عمل کر کے اسے معطل کیا جا سکتا ہے، اگر اس پر کسی جن کا سایہ ہو تو مختلف اشکال بن سکتی ہیں۔ بھیانک، خوفناک، دُوسروں کو ڈرانے کیلئے، دُور رکھنے کیلئے لیکن وہ کوئی ایسی شکل نہیں اختیار کرسکتی جس کے بارے میں علم یقینی ہو کہ اس کا تعلق کالے جادو سے ہے۔ اگر کسی بدبخت مسلمان نے ایمان کھو کر کالا جادو سیکھ لیا تو وہ دائرۂ اسلام سے تو اسی وقت خارج ہو گیا۔ نماز جیسی پاکیزہ شے کا تو تصور ہی اسے ہلاک کر دے گا۔ یہ تو اللہ سے رابطہ ہے اور محال ہے کہ کوئی باطل قوت اللہ سے رابطہ کر سکے۔ اسی لمحے فنا ہو جائے گی، ہاں کوئی غلیظ قوت اس پر عارضی طور پر اثرانداز ہوسکتی ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ بہرحال سفلی علوم کے ذریعے کسی کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔'' میں حیرانی سے مہتاب علی کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ ایک ناواقف انسان تھے۔ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن اس وقت مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے تمام سوالات ان کے سینے میں اُتر گئے ہوں اور یہ جواب کسی اور کی زبان سے ان کے ہونٹوں سے پھوٹا ہو۔ اس جواب سے نہ صرف میری تشفی ہوئی تھی بلکہ اس جواب نے مجھے نئی فکر دی تھی، ہوشیار کیا تھا اور اب مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

عظیم میاں ٹھیک ہو گئے کوئی کہانی نہیں بنی۔ درشہوار سے کئی بار واسطہ پڑا، کچھ کھسکی ہوئی ہی لگتی تھی۔ مجھ سے تو کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اگر اسے کبھی ڈرائیور کی ضرورت پیش آتی تو وہ دُوسرے ڈرائیور کو ترجیح دیتی تھی۔ بحالت مجبوری مجھے برداشت کر لیتی تھی۔ وہ بھی اگر دوسرے ساتھ ہوں تو، اکیلے وہ کبھی میرے ساتھ نکلتی تھی لیکن میں اب بھی پریشان تھا۔ وہ مسلسل مجھے گھورتی تھی۔ کئی بار راتوں کو وہ مجھے نظر آئی، اس وقت جب اس کے آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی تدبیر ایسی نہیں ہو سکی جس سے میں اسے پکڑ سکوں حالانکہ کئی راتیں میں نے مہتاب علی کے گھر کے پچھواڑے گلی میں گزاریں۔ ان راتوں میں وہ نہیں آئی۔ مجھے تجسس تھا۔ کئی بار میں نے اسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ بہرحال وقت بہتر گزر رہا تھا۔ کم از کم یہاں عزت سے گزارہ ہو رہا تھا اور رزق حلال مل رہا تھا۔

مہتاب علی کے رشتے داروں کے ہاں ایک شادی کا اہتمام ہوا۔ بہت قریبی رشتہ تھا۔ ہم سب گھر والوں کے ساتھ وہاں مصروف ہو گئے۔ دن رات کا آنا جانا تھا۔ حاجی صاحب نے ان دنوں مجھے حویلی ہی میں رہنے کی ہدایت کر دی تھی اور میرے لیے انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس وقت اتفاق سے درشہوار کو میرے ساتھ حویلی آنا پڑا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ کار میں آ بیٹھی۔

''گھر چلو۔'' اس نے کہا۔''اور سنو راستے سے یہ دوا لینی ہے...... بازار سے گزرنا۔'' اس نے ایک پرچہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے پرچہ لے کر رکھ لیا اور کار آگے بڑھا دی۔ پھر بازار پہنچ کر میں نے کار ایک ڈرگ اسٹور کے سامنے روکی اور دوا لینے اُتر گیا۔ دوا لے کر واپس آیا تو وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ ''تم'' اس نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

''جی؟'' میں حیرانی سے بولا۔

''دُوسرا ڈرائیور کہاں مر گیا۔''

''کسی اور کام سے گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم نے بتایا کیوں نہیں کہ یہ تم ہو۔''

''کس طرح بتاتا۔''

''کیا مطلب؟''

''میڈم مجھے حکم ملا تھا آپ کو گھر لے جاؤں۔ آپ گاڑی میں آ بیٹھیں۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب میں آپ سے یہ کہتا کہ یہ میں ہوں آپ میرے ساتھ نہ بیٹھئے۔''

''بکواس مت کرو...... گاڑی آگے بڑھاؤ۔''

''جی......!'' میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غصے سے کھول رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو۔''

''جی صرف ڈرائیور۔''

''اور اس دن تم نے مجھے بہری کہا تھا۔''

''میں اس کیلئے آپ سے معافی مانگ چکا ہوں۔''

''مگر یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی میں، نہ جانے کیوں میں نے تمہیں معاف کر دیا ورنہ...... ورنہ۔'' میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد حویلی آ گئی۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ میں خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ مجھے ہدایت ملی تھی کہ اس کے بعد میں حویلی میں آرام کروں۔ حویلی کے دوسرے مکین شادی والے گھر میں تھے۔ میں اپنی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ بستر پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تقریباً پون گھنٹہ گزر گیا پھر دروازے پر دستک سنائی دی اور میں چونک پڑا۔

''کون ہے؟''

''جمیلہ ہوں بھیا۔''

''کیا بات ہے جمیلہ۔'' میں نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ جمیلہ گھر کی ملازمہ تھی۔

''چھوٹی بٹیا نے کچھ دوائیں منگوائی تھیں تم سے، وہ کہاں ہیں۔''

''ارے...... وہ تو گاڑی میں ہی رہ گئیں۔''

''منگوا رہی ہیں۔ گاڑی سے نکال کر انہیں پہنچا دو، کچھ طبیعت خراب ہے اس لیے شادی والے گھر سے آ گئیں۔ مجھ سے یہی کہلوایا ہے۔''

''ابھی پہنچاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ گاڑی کی چابی تکیے کے سرہانے تھی۔ پلٹ کر چابی نکالی اور باہر آ گیا۔ ملازمہ جا چکی تھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے روشنی میں مجھے دیکھتے ہی بکنا جھکنا شروع کر دیا تھا اور میں اسے اس کی منگوائی ہوئی دوائیں دینا بھول گیا تھا۔ وہ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر رکھی رہ گئی تھیں۔ گاڑی سے دوائیں نکال کر میں اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندازہ تھا کہ وہ کیا کہے گی۔ دروازہ آہستہ سے بجایا اور اندر سے آواز سنائی دی۔

''آ جاؤ۔'' میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ وہ رات کے لباس میں ملبوس مسہری پر نیم دراز تھی اور مسکرا رہی تھی۔ ایک لگاوٹ بھری مسکراہٹ۔

''آگے آؤ'' اس نے کہا اور میں آگے بڑھ گیا۔ ''میری طرف دیکھو۔'' اس کی نشہ آلود آواز اُبھری۔ میں نے نظریں اُٹھائیں اور جھکا لیں وہ کچھ عجیب نظر آ رہی تھی۔

''جی۔'' میں گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ ہاتھ میں کیا ہے۔''

''دوائیں۔''

''یہاں رکھ دو...... آؤ بیٹھو۔'' میں نے اس کے اشارے پر دوائیں رکھ دیں اور پھر واپسی کیلئے مڑا مگر نہ جانے کب، نہ جانے کیسے وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے سامنے آ گئی۔ مجھے احساس تک نہ ہوا تھا۔ ''کہاں جا رہے ہو۔''

''مجھے کہاں جانا چاہیے۔''

''چلے جانا...... گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔ آؤ کچھ دیر بیٹھو آؤ نا۔'' اس نے کہا اور میرے دماغ میں غصے کا طوفان اُمڈ آیا۔ میں نے اسے زور سے جھٹکا دیا مگر اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا تھا۔ ''امر کر دوں گی، سنسار میں تمہارے جیسا کوئی نہ ہوگا۔ سب تمہارے پیروں تلے بچھ جائیں گے، بس مجھے سویکار کر لو...... مجھے سویکار کر لو۔'' اس نے کہا اور میرا دل دہشت سے دھڑک اُٹھا۔ پورنی...... دُوسری پورنی ایک مسلمان لڑکی کے رُوپ میں؟ میری نگاہیں بے اختیار اس کے ہاتھوں پر پڑیں مگر اس کے ہاتھوں میں صرف پانچ پانچ اُنگلیاں تھیں۔ صرف پانچ اُنگلیاں...... میں ایک دم سنبھل گیا بڑی ڈھارس ہوئی تھی۔ اس نے پھر کچھ کہا اور مجھے گھسیٹنا چاہا مگر میرا زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ چیخ کر نیچے گر پڑی۔

مجھے اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ پورنی نہیں ہے اس لئے ہمت بڑھ گئی۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جانتا یہ سب کیا ہے لیکن...... لیکن مجھ میں ہمت ہے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی...... تم مجھے زیر نہیں کر سکتیں۔ میں مالک کا وفادار کتا ہوں، میں رزق حلال کھاؤں گا سمجھیں۔''

''مجھے سویکار کر لو...... مجھے......'' وہ پھر اُٹھ گئی مگر اس بار میں نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ مگر ایسے نہیں جیسے میں نے کشنا کی گردن دبوچی تھی۔ میں نے گردن پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ جب اس کا بدن بے سدھ ہو گیا تو میں نے اسے اُٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا۔ سانس پھول گیا تھا، بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک آہٹ سی ہوئی اور میرا رُواں رُواں کانپ گیا۔ [illegible] ...... اب ایک دم گھوم کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بڑی مشکل سے گردن گھمائی اور آنے والے کو دیکھا۔ [illegible] تھا۔ [illegible] تھا۔ [illegible] شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے تھا وہ۔

''پورنی مار دی رے [illegible] نمک کے وفادار کتے۔ ارے تے نے مالک کی بٹیا مار ڈالی اور خود کو کہے ہے نمک کا وفادار کتا! ارے وہ پورنی نا ہے ہوشیار۔ تورے مالک کی لونڈیا ہے۔''

''بھوریا چرن۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''چھوڑیں گے نا تجھے حرام کھور۔ جیون کھراب کر دیا ہے تے نے ہمارا۔ تیرے جیون کو شانتی نا لینے دیں گے ہم وچن دیا ہے ہم نے بھی اپنے آپ کو۔''

''یہاں کیوں آیا ہے۔''

''تیرا رزق حلال بھنڈ کرنے...... ہم تو رہیں ہی تیری ناک میں ہیں۔ سات پورنیوں میں سے ایک مار دی تے نے۔ ارے بدنصیب کسی سے پوچھ تو لیتا پورنی کا ہووے ہے۔ سارا جیون تیاگ دیں ہیں رشی منی ایک پورنی پانے کیلئے۔ ہم نے توکا سات دے دیں اور تے ان کا مارت ہے۔ ان کا دیا نہ کھائے ہے نہ پیئے ہے۔ کبھی مانگ تو سنسار میں کچھ ان سے۔ مہاراجہ بنا دیں گی تجھے، پر تیرا نصیب ہی بھنڈ ہے۔ کتے جیسی درگت ہوگئی تیری پر اب بھی دھرم کی لاٹھی اُٹھائے ہوئے ہے۔ ایک پورنی مار دی تے نے۔ ہم سمجھ گئے کسی نے توکا بھٹکائی دیا تب ہم نے یہ سوچا کہ اب توکا سبق دئی ہیں۔ ہم نے تیرے مالک کی لونڈیا کو بگاڑا اور تے سمجھا او پورنی ہے۔ اب بیٹا آگے دیکھ ملے گا توکا رزق حلال...... سب مار مار کر تیرا بھرکس نہ نکال دیں تو ہمارا نام نا ہے۔ کھا رزق حلال......!'' وہ مڑا اور باہر نکل گیا۔

میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ تیزی سے دروازے سے نکل کر دیکھا وہ غائب ہو چکا تھا۔ واپس درشہوار کے پاس آیا۔ میرا اندازہ دُرست نکلا تھا۔ آہ بھوریا چرن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں پورنیوں کی پہچان جانتا ہوں، وہ یہ بات نہیں جانتا تھا۔ درشہوار گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے سنبھال کر لٹایا۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ خدایا تیرا شکر ہے۔ اللہ تیرا احسان ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ اس وقت باہر شور سنائی دیا اور پھر دروازے سے بہت سی آوازیں اُبھریں۔ حویلی کے ملازم تھے۔

''کیا بات ہے...... کیا شور تھا ڈرائیور صاحب......'' ایک ملازم نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''شور، کہاں......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''چھوٹی بٹیا کیوں چیخ رہی تھیں۔''
''وہ تو ایک بار بھی نہیں چیخیں۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے لیکن وہ شاید بے ہوش ہوگئی ہیں۔''
''بے ہوش؟'' بہت سی آوازیں
اُبھریں۔
''ہاں۔''
''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔'' ایک معمر ملازم نے پوچھا۔
''یہ دوائیں لے کر آیا تھا۔''
''اس وقت۔''
''ہاں میں تو اپنے کمرے میں تھا۔'' جمیلہ نے کہا تھا کہ چھوٹی بی بی دوائیں منگوا رہی ہیں۔ میں گاڑی سے دوائیں لے کر یہاں آیا تو انہیں بے ہوش دیکھا۔
''مگر ہم ان کے شور کی آوازیں سن کر آئے ہیں۔''
ملازم عورتیں درشہوار کے پاس آ کر اسے ٹٹولنے لگیں۔ ملازموں کو مجھ پر شک ہوگیا تھا۔ معمر ملازم حیات خان نے دو ملازموں سے کہا کہ وہ شادی والے گھر جا کر درشہوار بی بی کے بے ہوش ہونے کی اطلاع دیں اور حاجی صاحب کو بلا لائیں۔ وہ دونوں چلے گئے تو ملازم عورتوں کو درشہوار کی خبر گیری کرنے کیلئے کہا اور مجھ سے بولا۔
''آؤ...... باہر آ جاؤ......'' میں باہر نکل آیا۔ تب وہ مجھ سے بولا۔ ''ڈرائیور صاحب برا مت ماننا۔ میں بیس سال سے اس گھر کا نمک کھا رہا ہوں۔ بڑا فرض ہے مجھ پر۔ اس حویلی کی حفاظت کا کام مجھے ہی دیا گیا ہے۔ ڈرائیور صاحب، ہمیں چھوٹی بٹیا کی چیخیں سنائی دیں۔ ہم یہاں پہنچے تو وہ ہمیں بے ہوش ملیں اور تم ان کے کمرے میں، ہمیں تم پر شک ہوگیا ہے۔ اس لیے جب تک مالک نہ آ جائیں تم ہمارے ساتھ رہو گے کہیں جاؤ گے نہیں۔''
''میں کہیں نہیں جا رہا حیات بابا۔''
''اپنے کمرے میں چلو۔'' حیات خان نے کہا اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ حیات خان نے دُوسرے ملازموں کی ڈیوٹی لگائی۔ کچھ کو میرے کمرے کے سامنے میری نگرانی کے لیے چھوڑا کچھ کو باہر ڈیوٹی پر لگا دیا اور پھر خود کمرے میں آ گئے۔
''جی حیات بابا......!'' میں نے انہیں بیٹھتے دیکھ کر کہا۔
''کچھ نہیں ڈرائیور صاحب۔''
''آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟''
''وہ بس......! ذرا بڑے مالک آ جائیں۔''
''آپ فوراً باہر چلے جایئے۔ اس کمرے کے دروازے کے باہر بیٹھ کر آپ اپنا حق نمک ضرور ادا کریں، مجھے اعتراض نہیں۔''
''تم برا مان گئے ڈرائیور صاحب۔ دراصل......!''
''حیات خان، فوراً باہر نکل جاؤ۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا اور حیات خان اُٹھ گئے۔ مجھے ان کا یہاں رُکنا بہت بُرا لگا تھا۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اور پھر میں اس بارے میں سوچنے لگا۔ بڑی خطرناک چال چلی تھی بھوریا چرن نے۔ خدانخواستہ اگر میں اسے پورنی سمجھ کر ہلاک کر دیتا۔ بڑا رحم ہوا تھا مجھ پر، اوّل تو مجھے پورنیوں کی اہم شناخت بتا دی گئی تھی۔ دوئم مہتاب علی سے ہونے والی گفتگو نے مجھے سوچنے کا موقع دیا تھا۔

بستر پر لیٹ گیا۔ سوچتا رہا پھر نیند آ گئی۔ صبح ہی آنکھ کھلی تھی۔ رات کے واقعات یاد آئے اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اندازہ لگانے کیلئے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ مگر بہت دُور کچھ فاصلے پر جمیلہ کی جھلک نظر آئی تھی۔ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر فارغ ہوا تھا کہ جمیلہ تیزی سے آتی نظر آئی۔ میرے قریب پہنچ کر بولی۔

''بڑے مالک بلا رہے ہیں ڈرائیور صاحب......!'' حاجی فیاض صاحب اپنے کمرے میں تھے۔ ایک سمت حیات خان کھڑا ہوا تھا۔ میرے سلام کا جواب دے کر حاجی صاحب بولے۔

''مسعود میاں۔ رات کو کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی حیات خان کو۔ تم سے کچھ بدتمیزی کر بیٹھے ہیں۔''

''درشہوار بی بی کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''ٹھیک ہے، کوئی بات بھی نہیں تھی دراصل وہ زیادہ رش سے گھبرا جاتی ہے۔ اعصابی دباؤ کا شکار ہوگئی تھی۔ سب بالکل ٹھیک ہے۔''

''جی!''

''حیات خان رات کے واقعے پر شرمندہ ہیں تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔ ان کا شک دُور ہوگیا۔''

''جی ڈرائیور صاحب ہم شرمندہ ہیں۔''

''میں نے آپ کی وفاداری کا بُرا نہیں مانا۔''

بات ختم ہوگئی، شادی کے ہنگامے ابھی باقی تھے۔ وہ دن گزر گیا دُوسرے دن دوپہر کو درشہوار نے مجھے بلایا۔ اس وقت بھی تمام لوگ وہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے دو چکر لگائے تھے اور آخر میں مجھے شام کو درشہوار کو لے کر جانا تھا جس کیلئے ہدایت کردی گئی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''جی چھوٹی بٹیا؟''

''یہ پتہ رکھ لو مسعود۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں چلے جانا، میری دوست صفیہ تمہارے ساتھ یہاں آ جائے گی۔ شام کو سے ہمارے ساتھ جانا ہے۔''

میں نے کاغذ لے لیا۔ ''پڑھ سکتے ہو......؟''

''جی ہاں!''

''کوئی پڑھنے سمجھنے [illegible] جانا۔''

''جی بہتر......!'' میں بیٹھا تو اس نے مجھے پھر پکارا۔

''سنو......!'' اور میں رُک گیا۔ ''جلدی ہے جانے کی......؟''

''جی نہیں۔''

''مجھ سے بات کرنا پسند کرو گے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ درشہوار کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''حکم دیجئے......؟''

''میں نے تم سے بہت بدتمیزی کی ہے۔ بہت سختی سے پیش آئی ہوں تمہارے ساتھ، مجھے اس پر شرمندگی ہے۔ میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں مسعود......!''

''نہیں چھوٹی بی بی۔ آپ میرے مالک کی بیٹی ہیں۔''

''مگر تم فرشتہ صفت انسان ہو۔ مسعود میری کیفیت کے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔''

''جی؟''

''پلیز مجھے بتاؤ، مجھے ایک ایک لمحہ یاد ہے۔ مجھے یاد ہے میں تم سے کیا کہہ رہی تھی۔ میں بہت بے باک ہوگئی تھی مسعود۔ مگر خدا کی قسم میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی انجانی قوت میرے وجود میں داخل ہوگئی ہو۔ وہی مجھ سے یہ سب کہلوا رہی ہو۔ میں اس کے ہاتھوں بے بس ہوگئی تھی۔ کیا تم میری باتوں پر یقین کر سکو گے؟''

''کیوں نہیں۔ آپ سچ کہہ رہی ہوں گی۔''

''اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا مگر مسعود تم نے مجھے بچا لیا۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے۔''

''اب آپ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں! وہ شرمندہ لہجے میں بولی، پھر اس نے کہا۔ ''تم نے کسی سے اس کا تذکرہ تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''آئندہ بھی مت کرنا، تمہارا احسان ہوگا مجھ پر۔''

''آپ بالکل اطمینان رکھیں۔''

''تم بہت شریف انسان ہو، تم نے میرا ہر راز راز رکھا ہے۔ بس میری طبیعت بہت چڑچڑی ہے۔ نہ جانے کیوں ہر بات پر بہت جلد غصہ آ جاتا ہے۔ لوگ بھی تو مجھے چڑاتے ہیں۔ تم عظیم کے بارے میں جانتے ہو؟''

''کیا......؟''

''مجھے اس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حاجی صاحب کی عقل خبط ہوگئی ہے، وہ گوشت اور ہڈیوں کا پہاڑ۔ عقل سے عاری انسان میری تقدیر کا مالک بنایا جا رہا ہے۔ مجھے ساری زندگی کے عذاب میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ کیسے دماغ پر قابو رکھوں، یہ تصور ذہن میں آتا ہے تو خون خرابہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھو نا کیسی زبردستی ہے، میرے سانس بھی مجھ سے چھینے جا رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ اس دُنیا سے چلا جائے یا میں۔''

''میرا خیال ہے حاجی صاحب آپ پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کریں گے۔''

''ارے تم انہیں نہیں جانتے، بڑے عجیب وغریب انسان ہیں وہ۔''

''خدا کرے ایسا نہ ہو۔''

''میرا دل ہلکا ہوگیا ہے تم سے معافی مانگ کر، مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا گیا تھا۔''

''کیا......؟''

''اس بے وقوف حیات خان نے تم پر شک کیا تھا، میں نے خود بھی اسے خوب ڈانٹا ہے، کچھ ضرورت سے زیادہ ہوشیار بنتا ہے وہ۔''

''وفادار ہے۔''

''جانوروں سے زیادہ، ارے ہاں مسعود تم کتنے لکھے پڑھے ہو؟''

''ضرورت کے مطابق۔''

''لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتا ہوں۔''

''پھر ڈرائیور کیوں ہو؟''

''یہ بھی کام تو ہے۔''

''تم نے اپنی خوشی سے اپنایا ہے؟''

''حاجی صاحب نے حکم دیا تھا۔''

''میں ان سے بات کروں گی، اب تم جاؤ ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔'' میں باہر آ گیا، مجھے خود بھی خوشی تھی۔
شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے، زندگی معتدل ہو گئی مجھے درشہوار سے ہونے والی گفتگو یاد بھی نہ رہ گئی تھی لیکن حاجی صاحب نے مجھے بلایا۔
''مسعود تم کھاتے وغیرہ دیکھ سکتے ہو۔ کاروباری پارٹیوں سے مل سکتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔
''آپ جو حکم دیں گے کروں گا۔''
''نہیں میرا مطلب ہے تم پڑھے ہوئے ہو نا۔''
''جی ہاں۔''
''کمال ہے اس بات پر غور نہیں کیا تھا میں نے، مہتاب علی بھی خوب ہیں کل میں تمہیں دفتر لے جاؤں گا۔'' دوسرے دن وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر لے گئے۔ اپنے منیجر نوشاد مجید کو بلایا اور مجھے اس سے ملواتے ہوئے کہا۔ ''نوشاد میں انہیں تمہارا اسسٹنٹ بنا رہا ہوں، انہیں پورا کام سکھاؤ۔ تم بہت دنوں سے ایک اسسٹنٹ کی فرمائش کر رہے تھے۔ نوشاد کوئی 35 سال کی عمر کا خوش شکل آدمی تھا، بعد میں وہ خوش مزاج بھی ثابت ہوا۔ اب میں اس کے ساتھ ہی بیٹھتا تھا۔ دفتر کے بہت سے کام میں نے سنبھال لیے تھے۔ میری تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور سب سے زیادہ مہتاب علی اس بات سے خوش ہوئے تھے۔ کوٹھی سے اب کوئی رابطہ نہیں رہا تھا اس لیے ادھر بالکل جانا نہیں ہوتا تھا البتہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ
مہربانی سے ہوا ہے۔ اس دن حاجی صاحب خاص طور سے دفتر آئے انہوں نے نوشاد سے کہا۔
''نوشاد..... دو رانی مہاوتی کی ساڑھیاں بالکل تیار ہو گئی ہیں۔''
''جی حاجی صاحب..... رگھبیر نے مجھے آج ہی خبر دی ہے۔''
''تم نے دیکھ لیں؟''
''ابھی نہیں۔''
''کل صبح کارخانے چلے جاؤ، آخری نگاہ ڈال کر انہیں پیک کرا دو، اور پھر بھٹنڈہ چلے جاؤ، رانی صاحبہ کا آدمی دو بار آ چکا ہے اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔''
''جی حاجی صاحب۔''
''بلکہ مسعود کو بھی ساتھ لے جاؤ، ایسے کاموں سے ان کی واقفیت ضروری ہے۔''
''بہت بہتر۔'' حاجی صاحب کے جانے کے بعد نوشاد نے کہا۔ ''چلو اچھا ہے سیر و تفریح بھی ہو جائے گی، بہت دن سے بنارس سے باہر جانا نہیں ہوا۔''
''جی نوشاد صاحب۔''
''یار ایک تو تمہاری یہ سعادت مندی سے مجھے چڑ ہے۔ میں تمہیں دوست بنانا چاہتا ہوں مگر تم صرف ماتحت بننے پر تلے ہوئے ہو۔''
''ماتحت تو میں ہوں نوشاد صاحب۔''
''گویا دوست نہیں بن سکتے؟''
''یہ آپ کی مہربانی ہے۔''
''تو برادرم یہ مہربانی قبول کر لو۔ ویسے دورے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں، ہمارا مال تو پورے ہندوستان میں سپلائی ہوتا ہے مگر ایسی رانیوں اور راجکماریوں کے آرڈر بھی آتے رہتے ہیں جو چاہتی ہیں کہ ان کے لباس پورے ہندوستان میں منفرد ہوں اور یہ ڈیزائن صرف ان کیلئے بنائے جائیں۔ آنکھیں بند کر کے قیمت دیتی ہیں، ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے جو عیش ہوتے ہیں وہ منافع میں۔''

✦✥✦✥✦

''مگر نوشاد صاحب رانیاں اور راجکماریاں اب اس دور میں۔''

''کیوں......؟''

''ریاستیں تو ختم ہو چکی ہیں۔''

''ریاستیں ختم ہو گئی ہیں راجہ رانیاں تو نہیں ختم ہوئے۔ وظیفے ملتے ہیں اور انہیں ملتے ہیں کہ وہ اب بھی راجہ رانیاں ہیں۔''

''اوہ...... یہ معاملہ ہے۔''

''اور بھی بہت کچھ ہے جان من' تم چلو تو۔'' نوشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوسرے دن میں بھی نوشاد کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ مہتاب علی کو اپنے جانے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ساڑھیاں بلاشبہ خوبصورت تھیں۔ تمام تیاریاں ہو گئیں اور میں اور نوشاد چل پڑے۔ ریل کے سفر کے دوران نوشاد نے کہا۔

''ہم شکتی پور اُتریں گے۔''

''کہاں......؟'' میں چونک پڑا۔

''شکتی پور' وہاں سے گاڑی لے کر بھٹنڈہ جائیں گے۔''

''ریل بھٹنڈہ نہیں جاتی۔''

''جاتی ہے لیکن شکتی پور میں ہمارا سپلائر بھگوتی پرشاد رہتا ہے۔ یہ آرڈر اسی کے توسط سے ملا ہے' اسے بھی ساتھ لے جانا ہو گا۔''

''اچھا۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''اور پھر یار! ...... وہاں اپنے کچھ اور رشتے دار بھی رہتے ہیں' تمہیں بھی ان سے ملائیں گے۔'' نوشاد نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ میں اس کی بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ شکتی پور پہنچ گیا۔ بڑی یادیں وابستہ تھیں یہاں سے' حاجی فیاض کے ایجنٹ بھگوتی پرشاد نے بڑا اچھا خیر مقدم کیا۔ سارے انتظامات کئے اور کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شام کو نوشاد نے مجھ سے تیار ہونے کے لئے کہا اور بولا۔ ''بہت عمدہ سے کپڑے پہن لو' بڑی مہمان نوازی ہو گی۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ پھر ہم چل پڑے' مگر جب تانگہ اس بازار میں داخل ہوا جہاں میں رتنا کی حیثیت سے کافی وقت گزار چکا تھا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ مجھے یہاں آنے کی اُمید نہیں تھی رمارانی کشنا سب یاد آ گئے۔

''یہاں کہاں؟'' میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہیں تو اپنے رشتے دار رہتے ہیں۔ یار سارے رشتے دل کے ہوتے ہیں اور میاں اپنی ایک دلدادہ ہے لکشمی۔''

''لل...... لکشمی؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں بہنیں تو دو تین ہیں' مگر لکشمی سے اپنی چھنتی ہے۔''

''وہ اب یہاں کہاں؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ایں...... کیا؟''

''نہیں کچھ نہیں۔''

''گھبرا رہے ہو کچھ۔''

''ہاں۔''

''اماں زندگی کے مزے لوٹو' جو نہیں دیکھا وہ دیکھو' اسی کا نام زندگی ہے۔'' ہم تانگے سے اُتر گئے۔ میرے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ لکشمی اس بازار میں ایک ہی تھی' کشنا کی بہن اور بنارس میں جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد یہاں کچھ نہیں ہونا چاہئے

لیکن کوٹھا آباد تھا' نہ جانے کس کیفیت میں' میں اُوپر پہنچا اور سب سے پہلے مالتی نے مجھے دیکھا۔

''ارے رتنا تو آ گیا' رما جی ...... اپنا رتنا آ گیا۔ رتنا آ گیا رما جی ......'' مالتی چیختی اندر دوڑ گئی۔ نوشاد بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میرا حلق بند ہوا جا رہا تھا۔ رما رانی آئیں' راندھا اور لکشمی بھی آ گئیں۔ رما رانی نے میرا سر سینے سے لگا لیا تھا۔

''میرا دل کہتا تھا رتنا تو ایک بار ضرور آئے گا۔ آسانی سے نہیں بھولے گا ہمیں۔'' ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ مجھے فوراً ہی کوئی قدم اُٹھانا تھا' ورنہ ایک بار پھر مشکلات کا شکار ہو جاتا۔ نوشاد الگ سر کھجا رہا تھا۔ میں نے رما رانی سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''نوشاد صاحب یہ سب کچھ ...... یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''ایں ...... اماں تم بتاؤ' میں کیا بتاؤں' تم تو ہم سے بھی پرانے کھلاڑی نکلے۔'' نوشاد نے کہا۔

''یہ مجھے رتنا کہہ رہی ہیں۔''

''ہیں ......'' نوشاد کے بجائے رما رانی بولیں۔ پھر ان کے چہرے پر بڑا کرب اُبھر آیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ''تم ...... آپ ...... رتنا ...... رتنا۔''

''پر ...... ان کا نام رتنا تو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ یہ مسعود احمد ہیں' ویسے رما جی آپ کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔'' نوشاد نے کہا۔

''ہاں! ایسا ہی ہوا ہے' معافی چاہتی ہوں۔'' رما نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آیئے آپ لوگ اندر آیئے۔''

''لکشمی تم کیسی ہو؟ ذرا تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ رما جی آپ کی محفل سج گئی۔'' نوشاد نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر ہے مگر آیئے۔'' رما رانی نے کہا۔ نوشاد لکشمی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ مجھے بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ بری طرح گھبراہٹ سوار تھی' مجھ پر تو دوہری بیت رہی تھی۔ ان لوگوں سے رابطے تھے اور پھر بنارس میں جو کچھ ہوا ...... مالتی البتہ بگڑ گئی۔

''ارے بہت بن رہے ہو رتنا جی ...... ہم نا پہچانیں گے تمہیں' ہم ...... بھاگ گئے ٹھیک ہوتے ہی' کشنا کا حال بھی پوچھا تم نے؟''

''کیوں بک بک کر رہی ہو مالتی ...... اگر یہ وہ بھی ہیں تو رتنا تو نہیں تھے۔ ہم نے نام رکھ دیا تھا ان کا رتنا' اس وقت یہ بیمار تھا اب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ جا تو اپنا کام کر۔'' رما رانی نے اسے ڈانٹا۔

''ارے اچھے ٹھیک ہو گئے ...... واقعات ہی بھول گئے۔''

''چل تو باہر چل' بکے جا رہی ہے۔'' رما رانی مالتی کو باہر لے گئیں۔ رادھا رہ گئی تھی' اس نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''کشنا ...... جب سے تم گئے ہو بیمار ہے۔ چپ رہتی ہے' اندر اندر گھٹتی ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے' علاج ہو رہا ہے مگر اس کا علاج تمہارے پاس ہے' ملو گے اس سے؟''

''ہو سکتا ہے میری صورت کسی رتنا سے ملتی ہو۔'' مگر میرے سلسلے میں آپ لوگوں سے بھول ہو رہی ہے۔ میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ ہاں مجھے یہ احساس ضرور ہو رہا ہے کہ میں نے ...... میں نے بنارس میں آپ لوگوں کو ضرور دیکھا ہے۔''

''کاشی جی میں؟''

''ہاں۔''

''وہاں تو ہم کبھی نہیں گئے۔'' رادھا اداس لہجے میں بولی۔

جب تک یہاں رہا شدید گھٹن کا شکار رہا۔ کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ فریب تھا بھوریا چرن کا جال تھا۔ وہ سب ارواح خبیثہ تھیں' مگر کتنی خوفناک کوشش تھی اس کمبخت کی۔ واپسی میں نوشاد نے بھی بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ لکشمی یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ میں رتنا نہیں ہوں۔

بھگوتی پرشاد نے دوسرے دن انتظامات کیے۔ ہم شام کی گاڑی میں بیٹھ کر بھٹنڈہ چل پڑے۔ رات کو وہاں پہنچے' یہاں

بھی ٹھہرنے کا انتظام ایک گھر میں کیا گیا تھا۔ صبح کو رانی صاحبہ سے اجازت لے کر ان کی خدمت میں حاضری دینا تھی۔ جس گھر میں قیام کیا گیا تھا وہ پرانے طرز کا اور بہت وسیع تھا۔ لق دق احاطہ جس کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ قطار میں بنے ہوئے کمرے۔ احاطے میں املی کے بے شمار درخت' جس کمرے میں' میں اور نوشاد ٹھہرے تھے وہ بھی بہت بڑا تھا۔ عقب میں ایک بہت بڑی کھڑکی تھی' جس میں سلاخیں نہیں تھیں' بس پٹ لگے ہوئے تھے۔ کھانے وغیرہ کا انتظام ایک مسلمان ہوٹل سے کیا گیا تھا۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے۔ موضوع وہی رما رانی تھیں۔

''ضرور کوئی ایسی شخصیت تھی جو بالکل تمہاری ہم شکل ہو۔'' نوشاد نے کہا۔

''ایسا ہی لگتا ہے۔''

''لکشمی کہہ رہی تھی کہ اس کی بہن کشنا' رتنا کی جدائی سے پاگل ہوگئی ہے۔ وہ اسے چاہتی تھی۔ ویسے یار تمام بہنوں میں سب سے زیادہ حسین تھی وہ...... یہ واقعی تعجب ہوا ہے۔''

''ہاں ...... بعض اوقات بڑے عجیب واقعات ہوتے ہیں۔ بہت دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر نوشاد سو گیا۔ میں کھلی کھڑکی سے باہر تاریک رات میں جھانک رہا تھا۔ میرا بستر کھڑکی کے عین سامنے تھا۔ املی کا ایک گھنا درخت تھوڑے ہی فاصلے پر نظر آ رہا تھا' جس کا پھیلاؤ بے حد وسیع تھا۔ اس کی مناسبت سے اس کا تنا چوڑا تھا۔ میں بے خیالی کے عالم میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کشنا بار بار دماغ میں اُبھر رہی تھی۔ وہ سب تو جعلی تھے جو بنارس میں ملے تھے' لیکن کمبختوں نے کسی بات میں بھی تو شک نہ ہونے دیا۔ سب کچھ بالکل وہی تھا' سوائے اس آخری رات کے۔ مگر میں کشنا کیلئے کیا کرتا۔ اگر اس سے مل بھی لیتا تو کیا ہوتا سوائے دل پر بوجھ لینے کے۔

اچانک میرے خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جو کچھ دیکھا تھا' کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا' کوئی وہم نہیں تھا۔ املی کے درخت سے ایک سفید سایہ آہستہ آہستہ بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے اُتر رہا تھا۔ میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ کوئی انسان ہی تھا' مگر کون...... اس نے زمین پر قدم جمائے اور پھر اس کا رُخ کھلی کھڑکی کی طرف ہوگیا۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑنے لگی...... کچھ دیر کے بعد پُراسرار سفید سایہ کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ اس پر چڑھ رہا تھا۔ میں پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا' جب کہ باہر مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سے آنے والے کو یقیناً اس تاریک کمرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا ہوگا' لیکن وہ کون ہے؟ کوئی چور یا پھر کچھ اور۔ کچھ اور کا خیال مجھے اس لئے آیا تھا کہ وہ میرے سامنے املی کے درخت سے نیچے اترا تھا۔ دل چاہا کہ نوشاد کو جگا دوں' مگر ایسا نہ کر سکا۔ نوشاد کرے گا بھی کیا سوائے شور مچانے کے۔ سایہ کھڑکی کے راستے اندر آ گیا۔ میں سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی عورت ہے اور درحقیقت اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا' وہ نوشاد کے پلنگ سے ٹکرائی اور اس پر ڈھیر ہوگئی۔

''ٹٹ ٹوٹ گیا۔ ٹوٹ گیا۔ بچاؤ بچاؤ۔'' نوشاد چیخا اور اس کے ساتھ ہی سایہ بھی چیخ پڑا۔ نسوانی چیخ کے ساتھ ہی آواز بھی ابھری۔

''نہیں۔ بھگوان کے لئے نہیں۔ نہیں۔''

''ایں۔'' اس بار نوشاد کی آواز سنبھلی ہوئی تھی۔

''چھوڑ۔ مجھے چھوڑ دو۔ تمہیں بھگوان کا واسطہ۔''

''کک کون ہو تم؟'' نوشاد گھگھیا کر بولا۔ اسی وقت میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر روشنی جلا دی۔ غالباً پچیس واٹ کا نہایت دھندلا اور پرانا بلب یہاں لگا ہوا تھا' جس کی مدھم روشنی بھی نہایت بدنما تھی۔ نوشاد نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور لڑکی اندھوں کی طرح دوڑی۔ اس بار وہ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا اور اس کا چہرہ مزید دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو۔ تمہیں دعائیں دوں گی۔''

میں نے لڑکی کو بغور دیکھا۔ چیتھڑے جھول رہے تھے اس کے بدن پر۔ سفید لباس مٹیالا ہو رہا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ نقوش بے حد جاذب نظر' آنکھیں بڑی بڑی مگر خوف میں ڈوبی ہوئی' بال گھنے اور سیاہ مگر بری طرح الجھے ہوئے۔ عمر بیس' بائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ نوشاد بھی اپنے پلنگ سے نیچے اتر آیا تھا۔ وہ لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں پکڑا کہاں ہے اور مگر۔'' نوشاد نے چھت کی طرف دیکھا پھر میری طرف۔ ''یہ ٹپکی کہاں سے ہے؟''

نوشاد کے لہجے میں تمسخر تھا۔ مجھے یہ بے رحمی محسوس ہوئی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم اگر جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ جس کھڑکی سے تم آئی ہو دل چاہے تو اس سے ورنہ یہ دروازہ سامنے ہے۔''

''تم...... یہاں رہتے ہو؟''

''ہاں۔''

''مجھے کچھ کھانے کو دو گے۔ کوئی بھی چیز' میں دو دن سے بھوکی ہوں۔ پیاسی بھی ہوں۔ کوئی بھی چیز دے دو چاہے وہ اتنی سی ہو۔ سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی ہو تو کھا لوں گی بس اتنا سا ہو۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

''کچھ انتظام کرو نوشاد۔''

''ایں ہاں ابھی لو۔'' نوشاد نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی نے خوف بھری نظروں سے دروازے کو دیکھا' پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''وہ کسی کو پتہ تو نہ دے گا۔ وہ انہیں خبر تو نہ کر دے گا؟''

''کسے......؟''

''انہیں انہیں' وہ سب لونا چماری کے داس ہیں۔ لونا چماری مجھے بھی...... وہ میرے خون سے نہائے گی۔ پہلے میری گردن کاٹ دے گی' پھر اسے اوپر لٹکا دے گی۔ اس طرح میرے شریر کو بھی' میرا خون اس پر گرے گا اور وہ منتر پڑھتی جائے گی۔ ہائے رام۔ ہائے رام۔'' وہ رونے لگی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

''سنو۔ سنو۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ میرا دوست ہے۔ بس تمہارے لئے کھانے کو لائے گا۔ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا وہ۔''

''دو دن ہو گئے۔ پورے دو دن۔ پہلے میں ایک سوکھے نالے میں چھپی رہی' وہاں کچھ لوگ نظر آئے تو بھاگ کر یہاں آ گئی۔ املی کے پیڑ پر چڑھ گئی۔ مگر میں نے انہیں دیکھا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بڑی بھوکی ہوں میں' میں نے سوچا اس گھر میں رسوئی ہو گی' کچھ کھانے کو مل جائے تو۔'' اس نے سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

''لونا چماری کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟ پوچھے جا رہے ہو۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔'' اس نے جھلا کر کہا۔ بڑی پیاری لگی وہ اس انداز میں۔

میں خاموش ہو گیا۔ بڑا ترس آ رہا تھا اس پر' مگر اس کی کہانی بڑی عجیب تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ اس نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا' پھر دروازے کی طرف' پھر دہشت زدہ نگاہوں سے مجھے۔ مگر آنے والا نوشاد ہی تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پتوں سے بنے دونے تھے' جن میں سے ایک میں پوریاں اور کچھ لڈو رکھے ہوئے تھے' دوسرے میں ترکاری تھی۔

''پوریاں بس تین ہیں۔ تھوڑی سے لڈو کھا لینا' کام چل جائے گا۔'' نوشاد نے یہ چیزیں آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور اس نے بلی کی طرح انہیں جھپٹ لیا۔ پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''پانی۔ پانی نہیں ملا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ بھی آ جائے گا تم کھاؤ۔''

''بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ بھگوان کرے کبھی بھوکے نہ مرو......'' وہ پوریاں ٹٹولنے لگی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی' مگر

بڑی ناقدری کی شکار جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا وہ نوشاد کو معلوم نہیں تھا' مگر میں اس کی کہانی میں اُلجھا ہوا تھا اور نوشاد اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ اس نے ایک سالم پوری منہ میں ٹھونس لی تھی اور دوسری ہاتھ میں دبا رکھی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ بولتی بھی جا رہی تھی۔ ''بس ان کا خطرہ ہے' وہ مجھے جگہ جگہ کھوجتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو میں بہت تیز دوڑتی ہوں ورنہ ان کے ہاتھ آ جاتی۔ بھگوان کرے۔'' اچانک دروازے کا پٹ زور سے کھلا اور وہ دہشت سے چیخ پڑی۔ اس کے ساتھ ہی بجلی سی کوند گئی' ایسی نپی تلی چھلانگ لگائی اس نے کہ سیدھی کھڑکی سے باہر جا کر گری۔ اس طرح دروازہ کھلنے سے ہم دونوں بھی اچھل پڑے۔ ہماری گردنیں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔ بھگوتی پرشاد تھا۔ پانی کا برتن سنبھالے اندر گھس آیا اور احمقوں کی طرح منہ کھول کر ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اور نوشاد نے بیک وقت کھڑکی کی طرف دوڑ لگائی اور باہر جھانکنے لگے' لیکن باہر بیکراں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ میرے ساتھ نوشاد بھی کھڑکی سے باہر آ گیا اور ہم اسے تلاش کرنے لگے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ''تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی تھا جو تمہارے لئے پانی لایا ہے۔ اگر تم درخت پر چڑھ گئی ہو تو نیچے آ جاؤ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔'' آدھے گھنٹے تک جھک مارتے رہے اور بھگوتی پرشاد ہمیں کھڑکی میں کھڑا جھانکتا رہا۔ اس کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ میرے ذہن میں شدید جھلاہٹ پیدا ہو گئی۔ غصے کے عالم میں' میں اس کھڑکی سے اندر داخل ہو گیا۔

''تم انسان ہو یا گدھے؟'' میں نے بھگوتی پرشاد سے کہا۔

''پپ۔ پتہ نہیں۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''یوں بیل کی طرح ٹکر مار کر اندر آتے ہیں۔''

''نہیں جی۔ وہ۔''

''پاگل' احمق' گدھا!'' نوشاد بھی غرّایا۔

''اب میں کیا کروں؟'' بھگوتی پرشاد بولا۔

''دفع ہو جاؤ۔''

''پپ۔ پانی چھوڑ جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' نوشاد پاؤں پٹخ کر بولا اور بھگوتی پرشاد پھرتی سے باہر نکل گیا۔ ''بہت برا ہوا یار! وہ سب کچھ ایسے ہی چھوڑ گئی۔ کیا حسین لڑکی تھی' نہ جانے کس سے خوفزدہ تھی؟'' میں گہری سانس لے کر پلنگ پر آ بیٹھا۔ سخت ذہنی اذیت کا شکار ہو گیا تھا۔

''کچھ بتایا تھا اس نے......'' نوشاد نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس وہ خوفزدہ تھی کسی سے۔ کہہ رہی تھی کچھ لوگ اس کی تلاش میں ہیں' افسوس وہ کچھ کھا بھی نہ سکی۔''

''غلطی مجھ سے ہوئی تھی۔ کھانے کے لئے بھگوتی کو جگانا پڑا تھا۔ یہ کھانا اس کے پاس بچا ہوا رکھا تھا۔ میں نے اس سے پانی لانے کے لئے کہا اور کھانا لے کر آ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے تھے اس لئے اس سے کہہ دیا تھا' مگر وہ تھی کون؟''

''کچھ نہیں معلوم مجھے۔'' میں نے کہا۔

''اس وقت میں ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میں ایک اونچے سے درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ شاخ کی موٹی لکڑی میرے وزن سے چرچرا رہی ہے۔ پھر وہ ٹوٹ گئی اور میں نیچے گرنے لگا اور عین اسی وقت وہ میرے اوپر آ گری۔ میں نے سوچا تھا کہ درخت میرے اوپر آ گرا' مگر یار بڑی یاد آ رہی ہے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔'' نوشاد خود ہی مجھ سے بے تکلف ہوا تھا۔ میں نے کبھی اس سے بہت زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ رما

رانی کے کوٹھے پر گیا تھا' تب بھی میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ بہرطور میں نے لڑکی کے سلسلے میں اس سے بہت زیادہ گفتگو نہیں کی۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا بولا۔

''یہ کھڑکی بھی بند نہیں کی جا سکتی' کیا تمہیں نیند آ جائے گی مسعود؟''

''سونا تو ہے نا' ورنہ صبح کو طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ویسے میں کہنا چاہتا تھا کہ ۔ کہ یہ ہی اچھا ہوتا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔ خیر' خیر جو چیز تقدیر میں نہیں ہوتی انسان کتنی ہی کوشش کرے.....'' نوشاد جملہ ادھورا چھوڑ کر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ مجھے اس ذہنیت سے نفرت تھی' کچھ لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں' حالانکہ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا' میری تو خیر سوچیں ہی مختلف ہوتی تھیں اور حیران کن بات یہ تھی کہ عام زندگی میں بھی مجھے ایسے ہی واقعات کا سامنا کرنا پڑتا تھا' جو عام واقعات نہیں ہوتے تھے۔

اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ ''لونا چماری' خون کا غسل۔'' یہ ساری باتیں بے مقصد نہیں تھیں' اسے قید رکھا گیا تھا' یقینی طور پر اس نے کوئی ایسا منظر دیکھا ہوگا جس کی بنا پر اس کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہو۔ نہ جانے کس کی اولاد تھی؟ نہ جانے کون تھی؟ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور بالآخر نیند آ گئی۔ دوسری صبح خوب دیر تک سویا تھا۔ جاگا تو نوشاد نظر نہیں آیا۔ کھڑکی پر نگاہ پڑی۔ املی کے درختوں کو دیکھا۔ رات کا منظر نگاہوں میں اجاگر ہو گیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ زمین کھڑکی سے زیادہ نیچے نہیں تھی۔

لڑکی کا خیال مسلسل دل میں آ رہا تھا کہ کہیں خوفزدہ ہو کر وہ دوبارہ کسی املی کے درخت پر تو نہیں جا بیٹھی۔ جائزہ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نیچے اتر کر املی کے اس درخت کے پاس پہنچ گیا' جس سے میں نے اسے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچی زمین پر قدموں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ مگر وہ کوئی دھوکا ہوتی' کوئی بری روح ہوتی تو قدموں کے یہ نشانات یہاں نہ ہوتے۔ میں ان نشانات کی کھوج کرنے لگا۔ نشانات درخت سے کھڑکی تک آئے تھے اور اس کے بعد جب وہ واپس کھڑکی سے کودی تھی تو وہ زیادہ گہرے تھے۔ میں ان کا جائزہ لیتے ہوا آگے بڑھتا رہا' لیکن پھر تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر وہ نشانات گم ہو گئے تھے' کیونکہ زمین سخت تھی اور اگر تھوڑے بہت نشانات اس پر بنے بھی ہوں گے تو ہوا نے انہیں مٹا دیا تھا۔ املی کے بہت سے درخت یہاں موجود تھے جن کی شاخیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں بھرپور نگاہوں سے ان شاخوں کے درمیان جھانکنے لگا۔ ایک ایک درخت کے نیچے پہنچا۔ آوازیں بھی دیتا رہا' پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آیا۔ مجھے اس سلسلے میں مکمل طور پر مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ابھی واپس کھڑکی کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ نوشاد کی آواز سنائی دی۔

''لو تم بھی وہی کر رہے ہو جو میں دو گھنٹے تک کر چکا ہوں۔ نہیں بھائی اب وہ املی کے کسی درخت پر نہیں ہے' اس عمارت سے بھاگ چکی ہے۔''

میں نے کسی قدر شرمندہ سے انداز میں نوشاد کی صورت دیکھی اور گردن جھٹک کر بولا۔ ''بہرطور میں اس کے لئے غمزدہ ہوں۔''

''غمزدہ تو ہم بھی ہیں پیارے بھائی' مگر اب کیا کیا جائے۔ آؤ اندر آؤ۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے بالکل۔ میں نے بھی اخلاقاً تمہاری وجہ سے ناشتہ نہیں کیا۔ بہت دیر سے ناشتہ رکھا ہوا ہے۔'' کھڑکی ہی کے راستے ہم دونوں اندر آئے تھے اور پھر نوشاد نے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر آگے رکھ لی تھی' چائے وغیرہ بھی موجود تھی جو اب اتنی گرم نہیں رہی تھی' لیکن ہم نے وہ ٹھنڈی چائے ہی پی لی۔ میں نے چونک کر بھگوتی پرشاد کے بارے میں پوچھا تو نوشاد نے بتایا کہ وہ محل جا چکا ہے اور ساری باتیں کر کے ہی واپس آئے گا۔

''بھنڈہ کیسی جگہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس بہت بڑا شہر نہیں ہے' پھر بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ ذرا ان معاملات سے نمٹ لیں' ایک دو دن گھومیں گے۔ رانی مہ وتی سے ملاقات کے بعد ہی فرصت ہو سکے گی۔''

''جادو ٹونوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے نوشاد صاحب!؟''
''بھیا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ حالانکہ لوگ طرح طرح کی کہانیاں سناتے ہیں' کوئی ان حسین چڑیلوں کی داستانیں سناتا ہے جو راہ گیروں پر عاشق ہو جاتی ہیں اور راہ گیروں کے عیش ہو جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ بارہا ویرانوں میں ان چڑیلوں کی تلاش میں نکلے' لیکن اتنے بدقسمت ہیں کہ وہ بھی ہمیں دیکھ کر بھاگ جاتی ہیں۔ کیوں تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ کیا رات کی لڑکی پر کوئی شک کر رہے ہو......؟''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں' ویسے وہ املی کے درخت سے اتری تھی......''
''کیا......؟'' نوشاد نے چونک کر پوچھا۔
''ہاں رات کو پوری کہانی میں تمہیں نہ سنا سکا۔ آنکھ کھل گئی میری' پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا کہ میں نے اسے املی کے درخت سے اترتے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد وہ کھڑکی سے اندر آ گئی۔''
''ڈرا رہے ہو؟'' نوشاد نے خوفزدہ سی ہنسی کے ساتھ کہا اور مجھے بھی ہنسی آ گئی۔
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
''اماں قسم کھاؤ کیا وہ چڑیل تھی۔'' نوشاد نے پرخوف لہجے میں پوچھا۔
''نہیں نوشاد صاحب! چڑیل تو بالکل نہیں تھی وہ۔''
''ہاں ہو تو نہیں سکتی۔ ہم کو ہمیں چڑیلوں کا تجربہ بھی تو نہیں ہے۔ ابے نکلو یار یہاں سے۔ تم نے واقعی وحشت زدہ کر دیا۔ ویسے بھی یہ گھر بھوت گھر معلوم ہوتا ہے۔ آؤ باہر بیٹھیں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''اور اگر بھوت یہ ساز و سامان اٹھا کر لے گئے تو مصیبت نہیں ہو جائے گی؟''
''بھئی میں سچ بتا رہا ہوں اب مجھے اس ویران جگہ سے ڈر لگنے لگا ہے اور مجھے مزید خوفزدہ نہ کرو تم۔''
''اور اگر وہ رات کو ہمارے کمرے میں رہ جاتی تو......''
''تو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بھوتنی ہے کم بخت' سنا ہے بھوتیاں اور چڑیلیں ایسے ہی درختوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ ارے باپ رے۔ میں تو تم سے پہلے اسے املی کے درختوں پر تلاش کرتا پھرا ہوں یہ سوچ کر کہ کہیں وہ کسی شاخ پر سو نہ رہی ہو' پتہ نہیں کس سے خوفزدہ تھی۔ کوئی بات ہی نہیں ہوئی تم سے......''
''کوئی خاص بات نہیں' بھوکی تھی بے چاری۔ میں نے باتیں کرنے کی کوشش کی تو جھلا گئی۔ کہنے لگی میں بھوکی ہوں اور مجھ سے بولا نہیں جا رہا اور تم سوال ہی سوال کئے جا رہے ہو۔''
''تو پھر چڑیل نہیں ہو گی استاد وہ۔ بھلا ان بھوت پریتوں کو کھانے پینے سے کیا دلچسپی اور اگر ہو بھی تو ان کے لئے کیا مشکل' جہاں سے جو دل چاہے حاصل کر لیں۔ ارے باپ رے پتہ نہیں۔ کم بخت بھگوتی پرشاد کب واپس آئے گا۔ آؤ کم از کم دروازے پر تو بیٹھتے ہیں۔'' نوشاد واقعی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میں صرف اس کی وجہ سے باہر نکل آیا ورنہ بھلا اس قسم کی باتوں میں خوف سے کیا تعلق۔ بھگوتی پرشاد بھی ساڑھے بارہ بجے کے قریب آیا تھا اور کھانے پینے کا انتظام کر کے لایا تھا۔
''جیتے رہو میرے لال' جیتے رہو۔ کم از کم کام کی باتیں کر کے آتے ہو۔ چلو یہ کھانے کا بنڈل مجھے دے دو' ہمارے لئے لائے ہو نا......؟''
''ہاں میں تو محل میں کھا کر آیا ہوں۔''
''اچھا۔ اچھا ابھی سے کھا بھی لیا؟'' نوشاد نے کہا۔
''دیوان کالی داس نے مجبور کر دیا تھا اور کہا تھا کہ کھانا کھا کر جاؤ۔''
''اچھا ملاقات ہو گئی ان لوگوں سے؟''
''ہاں دیوان کالی داس ہی سے ملاقات ہو گئی۔ ساڑھے چار بجے ہمیں محل پہنچ جانا ہے مع سامان' پھر دیوان کالی داس کی

نگرانی میں یہ ساڑھیاں سجائی ہوں گی' پھر رانی مہاوتی ساڑھے چھ بجے ان کا جائزہ لیں گی اور اپنی پسند کا اظہار کریں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کام آج ہی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"بھئی بھگوتی پرشاد! اس گھر کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے ہمارے ٹھہرنے کے لئے ...... اگر بعد میں بھی اس گھر میں ٹھہرنا پڑا تو کم از کم میں تو نہیں رکنے کا' واپس چلا جاؤں گا۔"

"کیوں اس گھر میں کیا ہو گیا؟" بھگوتی پرشاد نے نوشاد کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا رات کو ہمارے کمرے میں سوتا تو پتہ چلتا کہ اس گھر میں کیا ہو گیا؟ چڑیلیں گھس آئی ہیں املی کے درختوں سے نیچے اتر کر۔" نوشاد نے کہا۔

"نا نوشاد جی مہاراج ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہم بہت سی بار یہاں اکیلے سو چکے ہیں تم تو دو ہو۔"

"تو خود بھی کسی بھوت سے کم نہیں ہے۔ خیر دیکھا جائے گا ہم تو ویسے بھی چڑیلوں سے خاصی انسیت رکھتے ہیں۔" نوشاد نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری' لیکن میں نے اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس لڑکی کی بے بسی کا احساس اس وقت بھی میرے دل میں موجود تھا۔ بے چاری کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی اور اسے خوفزدہ ہو کر بھاگنا پڑا تھا۔ نہ جانے کیا قصہ تھا اس کا؟ ساڑھے چار بجے سب لوگ تیار ہو گئے' سامان بڑی خوبصورتی سے پیک کیا گیا اور ہم اسے لئے ہوئے محل چل پڑے۔

زمانہ قدیم میں محلوں کا کیا تصور ہوتا ہو گا' وہ ایک الگ بات تھی' مگر میں نے محل وغیرہ کم ہی دیکھے تھے۔ یہ محل بھی' بس محل کیا تھا البتہ اسے ایک حویلی کہا جا سکتا تھا' وہی پرانی طرز کی تعمیر کی ہوئی' بہت خوبصورت اور صاف ستھری' ذرا ملازمین وغیرہ بھی زیادہ تھے۔ ویسے یہ سچ تھا کہ ریاستیں بے شک ختم ہو گئی تھیں' لیکن ان کی باقیات آج بھی اسی شان و شوکت کی حامل تھی۔ حویلی میں ملازموں کی جیسے پوری فوج موجود تھی۔ چاروں طرف سے نکل رہے تھے۔ ہمیں فوراً ہی خوش آمدید کہا گیا۔ ملازمین نے ہمارا سامان اٹھایا اور اس کے بعد ایک بہت ہی خوبصورت ہال میں پہنچا دیا گیا۔ گہرے سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا' دیواروں پر بہت ہی خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں' سنگی مجسمے سجے ہوئے تھے' قد آدم تصویریں یقینی طور پر اس خاندان کے پرانے بزرگوں کی تھیں۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس پہلے محل کا جائزہ لیا جو میں نے دیکھا تھا' لیکن نوشاد کے اشارے پر ہم لوگ جلدی جلدی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دیوان کالی جی ابھی ہمارے پاس نہیں آئے تھے۔ لیکن اس وقت جب ہم ساڑھیوں کو بڑے خوبصورت انداز میں سجا رہے تھے' دروازہ کھلا اور دیوان جی اندر آ گئے۔ نوشاد نے انہیں گردم خم کر کے تعظیم دی تھی۔ میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ بھگوتی پرشاد میرا ساتھ دے رہا تھا۔ نوشاد کہنے لگا۔

"حضور ہم آپ کے حکم کے مطابق وقت پر پہنچ گئے ہیں۔"

"میں نے رانی صاحبہ سے بات کر لی ہے' وہ بس شام کو ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جائیں گی۔"

میں نے اس آواز کو سن کر گردن گھمائی اور اتفاق سے اس وقت کالی داس نے بھی میری طرف دیکھا۔ کالی داس ہی تھا' بالکل کالی رنگت' اتنا کالا کہ شاید اندھیرے میں نظر بھی نہ آئے' بڑی بڑی مونچھیں جو اس کے رخساروں سے بھی نکلی ہوئی تھیں' بہت خاص قسم کا لباس پہنے ہوئے' آنکھیں گہرے سیاہ چہرے پر بالکل سفید سفید نظر آ رہی تھیں' لیکن چہرہ پر رعب۔ اس نے مجھے دیکھا اور دفعتاً ہی میں نے اس کے چہرے پر ایک تغیر محسوس کیا۔ اس کی تیز آنکھیں میرا جائزہ لینے لگیں۔ بس ایک نگاہ دیکھنے کے بعد میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا' لیکن دماغ میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر چونکنے کا سا انداز تھا' نہ جانے کیوں نہ جانے کیوں ......؟ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں بلکہ خاموشی سے ہمیں کام کرتے دیکھتا رہا۔ نوشاد سے اس کی مسلسل باتیں ہو رہی تھیں۔

"مہاراج! آپ بھی ایک نظر ڈال لیں اور ذرا ہمیں بتائیں کہ ہم نے جو محنت کی ہے' وہ رانی صاحبہ کو پسند آئے گی یا نہیں ......؟"

"یہ میرا کام نہیں ہے' تم اپنا کام کرو خاموشی سے۔" دیوان کالی داس کی آواز بھی بڑی بھرپور تھی۔ میں نے اپنے کام

سے فراغت حاصل کر کے ایک بار پھر دیوان کالی داس کو دیکھا اور مجھے پھر اسی کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں شک کے سے تاثرات تھے' ویسے کالا رنگ ہونے کے باوجود اسے بھیانک شکل کا مالک نہیں کہا جا سکتا تھا' لیکن نہ جانے وہ مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا۔ جب ہم نے اپنا کام کر لیا تو کالی داس کہنے لگے۔

''اب تم باہر جا کر آرام سے بیٹھو یا ابھی کچھ کام باقی ہے؟''

''آپ کا جو حکم مہاراج! جیسا آپ کہیں ویسا کریں گے۔'' نوشاد نے کہا۔

''تو پھر آؤ باہر آ جاؤ' میں یہاں تالا لگوائے دیتا ہوں۔ تم بیٹھو' کھاؤ پیو اور اس کے بعد ٹھیک ساڑھے چھ بجے رانی مہاوتی جی یہاں پہنچ جائیں گی۔''

ہمارا کام ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں باہر نکل آئے۔ دیوان کالی داس نے ملازمین کو حکم دیا کہ ہمیں آرام سے بٹھایا جائے اور ہماری خاطر مدارت کی جائے۔ جس کمرے میں یہ سامان سجایا گیا تھا' وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک جگہ ہم بیٹھ گئے اور ملازمین نے ہمارے سامنے پھل وغیرہ لا کر رکھ دیئے۔ نوشاد نے کہا۔

''کہو لطف آ رہا ہے یا نہیں؟'' میں نے چونک کر نوشاد کو دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔

''یہ دیوان کالی داس تھا......؟''

''صورت سے نہیں لگتا تھا۔'' نوشاد نے کہا اور ہنس پڑا۔ بھگوتی پرشاد بولا۔

''نہیں مہاراج! ایسی باتیں نہ کہیں اگر کسی کے کانوں تک پہنچ گئیں تو شامت آ جائے گی ہماری۔ بے شک اب ریاستیں نہیں رہیں لیکن ان لوگوں کی شان و شوکت وہی ہے' ذرا سی دیر میں گردنیں اتروا دیا کرتے ہیں۔''

''تو میں نے کیا کہہ دیا بھگوتی پرشاد' مہاراج ایک بات ہی تو کہی ہے' ویسے یہ سمجھ لو مسعود کہ کالی داس جی کا نام ان کی پیدائش کے بعد ہی کالی داس رکھا گیا ہوگا۔ ظاہر ہے نام تو پیدائش کے بعد ہی رکھے جاتے ہیں' لیکن سوچنے والوں کو ذرا بھی دقت پیش نہیں آئی ہوگی۔ ان کی شکل دیکھی اور فوراً ہی کالی دیوی کا تصور ذہن میں آ گیا۔ سو کالی داس مہاراج کالی داس بن گئے۔''

''تمہاری مرضی ہے جو دل چاہے کہے جاؤ' اپنی بات کے ذمہ دار خود ہو گے۔'' بھگوتی پرشاد پھر بولا۔

''ابے تو یہاں کون سن رہا ہے' تیری تو جان ہی نکلی جا رہی ہے۔'' نوشاد نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر ایک بڑا سا خوبصورت سیب اٹھا کر اسے دانتوں سے کترنے لگا۔

میں کچھ بے چین سا تھا' کیا بات ہے؟ آخر کیا بات ہو سکتی ہے؟ کالی داس کا انداز چونکا ہوا کیوں تھا؟ وہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے میری ذات پر کوئی شک ہو؟ مگر نوشاد سے اس بارے میں کیا کہنا' ویسے بھی وہ غیر سنجیدہ اور لاابالی سا آدمی تھا۔ رانی مہاوتی کو ساڑھے چھ بجے ہی آنا تھا' مگر وہ پونے چھ بجے آ گئیں اور ملازم ہمارے پاس دوڑے ہوئے آئے تھے اور انہوں نے کہا۔

''ہوشیار ہو جاؤ' رانی جی آ رہی ہیں۔''

کئی افراد تھے' ان کے بیچ رانی مہاوتی آ رہی تھی۔ میں بھی' نوشاد اور بھگوتی پرشاد کے ساتھ کھڑا ہو کر اس شان و شوکت کو دیکھنے لگا۔ کچھ خادمائیں' کچھ خادم ساتھ میں کالی داس بھی تھا' جو الگ ہی نظر آ رہا تھا۔ مہاوتی دراز قامت اور نہایت خوبصورت عورت تھی۔ سرخ و سفید سیب جیسی رنگت' بال گھٹاؤں جیسے اتنے کہ یقین نہ آئے۔ چہرے پر ایک انوکھا بانکپن اور آنکھوں میں بجلیاں سی کوندتی ہوئیں۔ بڑے وقار سے ایک ایک قدم رکھتی ہوئی وہ آگے آئی اور میں نے محسوس کیا کہ کالی داس آہستہ سے کچھ بدبدا رہا ہے' جس کے جواب میں رانی مہاوتی نے خصوصاً مجھے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر گڑی رہی تھیں اور مجھے یوں لگا جیسے کچھ انگلیاں میرے چہرے کو ٹٹول رہی ہیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ چہرہ ٹٹول کر دیکھوں' لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ وہ بالکل قریب آ گئی اور میں نے اس سے نظریں ملائیں۔ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ کر

ماتھے سے لگا دیئے۔ اس کی پُرشوق نظریں مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کالی داس نے کہا۔
''دروازہ کھولو بھگوتی۔''
''جی مہاراج!'' بھگوتی پرشاد نے نوشاد کو دیکھا اور نوشاد نے دروازہ کھول دیا۔ رانی بھی جیسے سنبھل گئی۔ پھر پہلے وہ اور اس کے بعد ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ رانی ہماری لائی ہوئی ساڑھیاں دیکھنے لگی۔ مگر اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔ وہ بار بار میری طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ پھر اس نے کہا۔
''تمام ساڑھیاں بہت اچھی ہیں' بڑی خوبصورت' ہمیں پسند آ گئیں۔ کالی داس؟''
''جی رانی جی۔'' کالی داس دو قدم آگے بڑھ گیا۔
''ہمیں تمام ساڑھیاں پسند آ گئی ہیں۔ ان سب کو سنبھال کر رکھوا اور تاجروں کو ان کی منہ مانگی قیمت ادا کر دو۔ تمہارا نام بھگوتی پرشاد ہے نا۔'' رانی مہاوتی نے بھگوتی پرشاد کی جانب انگلی اٹھا کر کہا اور بھگوتی پرشاد دونوں ہاتھ جوڑ کر جھک گیا۔
''جی مہارانی جی!''
''بھگوتی پرشاد یہ لوگ بہت اچھی ساڑھیاں بناتے ہیں۔ میں ان سے کچھ اور کام کرانا چاہتی ہوں اور اس کام کے ڈیزائن میں بنوا کر ان کے حوالے کرنے کی خواہش مند ہوں' تم لوگ ساڑھیوں کی قیمت اور اپنا انعام وصول کرو' ان میں سے ایک آدمی کو میرے پاس چھوڑ دو' وہ یہاں ہمارا مہمان رہے گا اور بعد میں ہمارا نیا حکم لے کر واپس پہنچے گا۔ اس آدمی کو یہاں چھوڑ دو' اس کے لئے یہاں قیام کا بندوبست کر دیا جائے گا۔'' رانی مہاوتی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھگوتی پرشاد نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر جھک گیا۔
''جو حکم مہارانی جی۔''
مہاوتی تیزی سے اٹھی اور پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کا حکم آخری حکم تھا اور اس میں کسی ردوقدح کی گنجائش نہیں تھی' سین میں ساکت رہ گیا تھا۔ کالی داس نے ہم تینوں سے کہا۔
''تم لوگ احتیاط کے ساتھ یہ ساڑھیاں پیک کروا دو اور تم میں سے ایک بھگوتی پرشاد تم میرے ساتھ چلے آؤ اور ان کی قیمتوں کی بات کر کے مجھ سے رقم وصول کر لو' آؤ۔ تم دونوں براہ کرم یہ کام کر ڈالو۔'' دیوان کالی داس جی بھی بھگوتی پرشاد کو لے کر باہر نکل گئے اور نوشاد نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔
''یار یوں سمجھ لو تقدیر چمک گئی۔ حاجی صاحب تو اتنے خوش ہوں گے کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتے' مگر یہ کمینہ' بھگوتی پرشا ان ساڑھیوں کی قیمت کیا مانگے گا' یار کہیں یہ گڑبڑ نہ کر جائے۔''
''کیا اسے ان کی قیمتوں کا اندازہ نہیں ہے؟''
''خیر ایسی بات نہیں۔ آدمی تو وہ بہت سیانا ہے اور مجھ سے زیادہ کاروباری گر جانتا ہے۔ لیکن کہیں بیچ میں ٹانکا نہ لگا جائے۔ چلو اسے بھی سنبھال لیں گے۔ ویسے اسے قیمتیں معلوم ہیں' وہ ہمارا مستقل ایجنٹ ہے' یہ بات تو رہی اپنی جگہ۔ یار ذرا یہ ساڑھیاں اٹھواؤ' دیر کرنا مناسب نہ ہوگا۔'' نوشاد میرے ساتھ ساڑھیاں اٹھوانے میں مصروف ہو گیا۔
پھر بولا۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ تو جو ہے سو ہے مگر تم نے رانی صاحبہ کی نظروں میں کچھ محسوس کیا؟''

✦❖✦❖✦

''کیا......؟'' میں نے سوال کیا۔
''ساڑھیاں کم دیکھ رہی تھیں، تمہیں زیادہ دیکھ رہی تھیں۔'' نوشاد آنکھ دبا کر بولا۔
''بیکار باتیں ہیں۔'' میں نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا اور نوشاد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر بولا۔ ''نہیں بھائی یہ رانیاں، مہارانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، کسی کی تقدیر ساتھ دے جائے تو سمجھ لو کہ وارے نیارے ہو جاتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اب جب تم واپس بنارس آؤ گے تو نہ جانے کیا بن کر آؤ گے۔''

''نوشاد میں یہاں نہیں رکنا چاہتا۔''

''ارے باپ رے۔کیسی خوفناک باتیں کر رہے ہو۔ بھلا رانی صاحبہ کا حکم اور اس کی تعمیل نہ ہو۔ انہوں نے پوچھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ تم رکنا چاہتے ہو یا نہیں۔اور پھر حماقت کی باتیں مت کرو، میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ راج محلوں کی کہانیاں ذرا مختلف ہوتی ہیں اور تقدیر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ ہوسکتا ہے یہ میری غلط فہمی ہی ہو لیکن چانس لینے میں کیا حرج ہے۔''

''کیا یہ نہیں ہوسکتا نوشاد کہ تم یہاں رک جاؤ۔''

''آہ کاش! ایسا ہوسکتا' مگر جسے پیا چاہے وہی سہاگن، ہمیں بھلا کون پوچھتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے بہرطور تمہیں یہاں رہنا ہوگا بس ذرا احتیاط رکھنا، بس ان لوگوں کے دماغ پھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ دولت اچھے اچھوں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اس دنیا کا باسی نہیں سمجھتے۔ بس تھوڑی سی احتیاط، رانی صاحبہ کے احکامات کی تعمیل اور پھر یار یہ تو خوش بختی ہے۔ کتنی حسین ہیں وہ، عمر کتنی ہی ہو لیکن کیا شان ہے، کیا انداز ہیں، چلو بھیا عیش کرو، ہماری طرف سے پیشگی مبارکباد۔''

میں الجھا ہوا تھا' ویسے تو مجھے کوئی ایسی خاص پریشانی نہیں تھی۔ رانی صاحبہ مجھے لقمۂ تر سمجھ کر نگل تو نہیں جائیں گی لیکن بس الجھن تھی۔ ایسی کیا بات پائی ہے انہوں نے مجھ میں اور بات اگر رانی صاحبہ ہی کی ہوتی تو چلو مان لیتا کہ نوشاد کا کہنا درست ہے' لیکن اس سے پہلے مہاراج کالی داس نے بھی مجھے چونک کر ہی دیکھا تھا۔ کیوں، آخر کیوں؟

کام ختم ہوگیا۔ نوشاد اور بھگوتی پرشاد چلے گئے۔ کالی داس نے مجھے محل کے خادموں کے حوالے کر دیا۔ حویلی یا محل کے بغلی حصے میں بنے ہوئے مہمان خانے میں مجھے جگہ دے دی گئی تھی۔ ہر طرح کا خیال رکھا گیا، پھل، سبزیاں وغیرہ کھانے میں دی گئیں۔ میرے دماغ میں بہت سے خیالات تھے' مگر بے سکونی نہیں تھی۔ وہم میں اُلجھ کر سکون برباد کرنے سے آج تک تو کچھ حاصل نہیں ہوسکا تھا اب میں نے ہر طرح کے حالات میں جینا سیکھ لیا تھا۔

رات خوشگوار گزری، دوسرا دن بھی گزر گیا، کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو قابل ذکر ہوتی۔ شام کو کالی داس آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''تم حاجی فیاض الدین کے آدمی ہو نا؟''

''جی دیوان جی۔''

''رانی مہاوتی تمہیں کچھ ڈیزائن دینا چاہتی ہیں، بہت بڑا کام ہوگا، تمہیں اس کے لئے کئی دن رکنا پڑے گا۔ کوئی جلدی تو نہیں ہے تمہیں؟''

''نہیں۔''

''ارے جب سے آئے ہو اندر گھسے رہتے ہو، تم مہمان ہو قیدی نہیں۔ محل بہت بڑا ہے گھومو پھرو۔ اس جگہ رہنا پسند نہ ہو تو جہاں چاہو بندوبست کر دیا جائے۔''

''نہیں دیوان جی۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''مسعود۔''

''ایں......'' کالی داس چونک پڑا۔

''مسعود احمد۔'' میں نے اسے دوبارہ نام بتایا۔ اس کے چہرے پر پھر شک کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر وہ بولا۔

''مسلمان ہو؟''

''جی بالکل۔''

''اچھا......'' وہ حیرت سے بولا۔ مجھے دیکھتا رہا پھر ایک دم واپس پلٹ آیا۔ کچھ سوچ کر دروازے میں رکا۔ میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ''یہاں داسیاں باندیاں بھی بہت سی ہیں، کسی کو کسی سے ملنے پر پابندی نہیں۔ ہنسی خوشی سے گزارو۔ تم

مہاوتی کے مہمان ہو، کسی ایرے غیرے کے نہیں۔ میں تمہارے پاس سندری کو بھیجتا ہوں، تمہیں پسند آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں دروازے کو گھورتا رہ گیا۔ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ اس دنیا میں رہنے والے کیا تمام لوگ میری ہی طرح پراسرار واقعات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ کیا سبھی کو زندگی میں قدم قدم پر ایسے انوکھے واقعات پیش آتے ہیں۔ کبھی سنا تو نہیں، یہاں تو طویل عرصہ سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد دروازے سے ایک سندری داخل ہوئی۔ سندری ہی تھی۔ بڑا جاذب نگاہ چہرہ تھا۔ اندر آ گئی اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی۔ "میرا نام سندری ہے۔"

"جی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیسی ہوں؟" وہ شوخی سے بولی۔

"جی......؟" میری گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مسعود۔"

"سچ بتا دو نا!" وہ ناز بھرے انداز میں بولی۔

"تعجب ہے، تم میری بات کو جھوٹ کیوں سمجھ رہی ہو۔" میں نے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

"آؤ باہر چلیں۔ باہر بڑی سندر ہوا چل رہی ہے۔ تمہیں پھول پسند ہیں؟"

"پھول کسے پسند نہیں ہوتے۔"

"اور پھول وتی۔" وہ پھر اسی طرح کھلکھلا کر ہنسی اور آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی۔ "آؤ میں تمہیں پھول کنڈ لے چلوں...... آؤ نا......!" میں نے آہستہ سے اس سے ہاتھ چھڑا لیا' مگر اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرے اس طرح ہاتھ چھڑانے پر اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا' مگر کچھ بولی نہیں۔ میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ وہ مجھے محل کے عقبی حصے میں لے آئی جہاں گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا، ہر طرف ہریالی تھی، جگہ جگہ حوض، فوارے بنے ہوئے تھے، ان کے گرد سنگی مجسمے ایستادہ تھے۔ نہایت حسین سنگی مجسمے جنہیں بڑی مہارت سے تراشا گیا تھا۔ یہ سب مختلف شکلیں رکھتے تھے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان مجسموں نے باغ کا حسن بڑھا دیا تھا۔ محل کے عقبی حصے میں یہ علاقہ بے حد خوبصورت تھا۔ ابھی مدھم مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی لیکن شام تیزی سے جھکتی چلی آ رہی تھی۔ ہوا چل رہی تھی اگر موسم اور ماحول کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو یہ جگہ انتہائی حسین کہی جا سکتی تھی، عجیب و غریب خوشبوئیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں، ایک موڑ مڑنے کے بعد میں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین سا تھا۔ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، پھول جیسے دیواروں میں لگائے گئے تھے، کہیں بلند، کہیں پست، کہیں اونچے، کہیں نیچے۔ سب کے رنگ مختلف تھے اور پھول کے بیچوں بیچ مجسمے اس طرح آویزاں تھے جیسے کوئی پھولوں کے درمیان چلتے چلتے رک گیا ہو۔ ایک چوکور حوض اس طرف بنا ہوا تھا جس کے کنارے بیٹھنے کی جگہ بھی تھی۔ اسے مجسموں کا علاقہ کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔ شوقین لوگ ایسے سنگی مجسمے آویزاں کرتے ہیں' لیکن اتنی تعداد میں نہیں۔ بہرحال عام لوگ راجہ اور رانی بھی تو نہیں ہوتے۔

سندری مجھے لئے ہوئے اس سمت آ گئی۔ حوض کے پاس رک کر اس نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "یہ ہے ہمارا پھول کنڈ......"

"بہت خوبصورت جگہ ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"راجہ چندر بھان جی پھولوں کے رسیا ہیں، بس یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے اس حصے کو پھولوں سے آراستہ کرنے کے لئے اتنی دولت خرچ کی ہے کہ اس سے ایک گاؤں بسایا جا سکتا تھا۔"

''راجہ چندر بھان جی؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے سندری کو دیکھا۔
''مالک ہیں ہمارے، اس محل کے مالک ہیں۔ رانی مہاوتی جی انہی کی تو دھرم پتنی ہیں۔ یہ میں اس لئے بتا رہی ہوں کہ تم بنارس سے آئے ہو، جانتے نہ ہوگے بھنڈا کے بارے میں۔''
''ہاں ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''بیٹھو...... بیٹھ جاؤ نا۔ تم مجھے کچھ عجیب سے لگ رہے ہو، گھبرائے گھبرائے سے۔ کیا مجھ سے پریشان ہو؟''
''نہیں...... نہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''میں نے ہاتھ پکڑا تھا تمہارا، تم نے ایسے چھڑا لیا جیسے، جیسے......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔
''راجہ چندر بھان جی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''
''لو آئے ہوئے سے ہی کتنا بیتا ہے تمہیں۔ ویسے بھی وہ بیمار ہیں۔''
''او اچھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر بولی۔ ''بہت کم بولتے ہو تم۔ ویسے کیا تم سچ مچ مسلمان ہو؟''
''کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''نہیں میرا مطلب ہے، میں نے مسلمان نہیں دیکھے۔ شروع ہی سے یہاں پلی بڑھی ہوں۔ اسی محل میں پیدا ہوئی، اسی میں پروان چڑھی اور یہیں رہتی ہوں۔''
''مسلمانوں کے سینگ نہیں ہوتے، جیسے تم لوگ ہوتے ہو، ویسے ہی ہم۔''
''ہاں اب تو یہی اندازہ ہوتا ہے مجھے۔'' وہ بات بات پر ہنسنے کی عادی تھی۔ پھر بولی۔
''اچھا اب یہ بتاؤ کیا پیو گے؟''
''کچھ نہیں......''
''واہ ایسا خوبصورت موسم، چاروں طرف بکھرے ہوئے پھول، میں دارو منگواتی ہوں تمہارے لئے......؟''
''سنو، سنو رک جاؤ، ایسی کوئی شے ہم مسلمان نہیں پیتے۔ یقینی طور پر اس محل میں رہ کر تمہیں یہ بات بھی معلوم نہیں ہوئی ہوگی۔''
''تو پھر میں کیا کروں تمہارا۔ ادھر دیوان کالی داس جی ہیں جو کہتے ہیں کہ مہمان کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس کا دل بہلاؤ، اس سے باتیں کرو، وہ جو چاہے اس کی ہر سیوا کرو اور تم ہو کہ ٹھیک سے بول بھی نہیں رہے مجھ سے۔'' اس نے ادا سے منہ بنایا اور میں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔
''نہیں سندری جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس یہ جگہ بہت پیاری ہے، مجھے بڑی پسند آئی اور کیا باتیں کروں آپ سے۔'' وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔
''اچھا رکو، میں ابھی آتی ہوں۔ گھبراؤ گے تو نہیں۔''
''نہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
''جانا بھی نہیں یہاں سے، میں یہ گئی اور وہ آئی۔'' وہ پھر ہنسی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کی دھندلاہٹیں پھیل گئی تھیں۔ پھولوں کے رنگ ماند پڑتے جا رہے تھے۔ بڑا طلسمی ماحول تھا۔ ہر طرف ایک پراسرار اداسی فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے، اچانک ہی کچھ ہو جائے گا۔ پھولوں کا سکوت، ان کے درمیان خاموش کھڑے مجسمے۔ سب کسی انہونی بات کے منتظر تھے یا پھر اس ماحول نے یہ احساس میرے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عجیب سے حالات تھے۔ وہ لڑکی یاد آئی جو املی کے درخت سے اتری تھی اور میرے دل پر ایک عجیب سا نقش چھوڑ گئی تھی۔ رجناوتی تھا اس کا نام۔ باتیں بڑی عجیب تھی اس کی۔ ہو سکتا ہے

پاگل ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ اچانک اچھل پڑا۔ ''شی'' کی ایک آواز سنائی دی۔ بالکل ایسی آواز جیسے کوئی کسی کو مخاطب کرتا ہے۔ آواز صاف سنی تھی، وہم نہیں تھا۔ دوسری بار وہ آواز دو مرتبہ سنائی دی۔

''شی۔ شی......'' میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ یقیناً کوئی رازداری سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا' مگر کون۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر خاموشی، پھولوں اور پتھریلے مجسموں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا۔

اچانک کچھ فاصلے پر روشنی ابھری اور میرے حلق سے آواز نکل گئی۔ اس روشنی میں، میں نے دو انسانی سائے دیکھے تھے۔ میں نے ان پر نظریں جما دیں۔ وہ روشنی کے پاس سے ہٹ گئے اور کچھ دیر کے بعد مجھے ان سایوں کا راز معلوم ہوگیا۔ محل کے ملازم تھے جو جگہ جگہ لوہے کے پول میں لگے ہوئے کاربائیڈ کے شیشے والے لیمپ روشن کرتے پھر رہے تھے۔ یہ لیمپ رنگین شیشوں والے تھے اور ان کے روشن ہونے سے اس جگہ کا حسن بڑھنے لگا تھا۔ ملازم اپنا یہ کام کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرے۔ انہوں نے رک کر مجھے دیکھا پھر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ خدایا...... خدایا یہ سب کیا ہے۔ یہ محل، یہ حویلی کوئی حقیقت ہے یا ویسا ہی کوئی طلسم جیسا میں نے رمارانی کے سلسلے میں دیکھا تھا۔ وہاں بھی تو ایک دنیا آباد تھی۔ سب کچھ تھا۔ مکمل زندگی تھی لیکن پورنی کی ہلاکت کے بعد وہاں جھاڑو پھر گئی۔ سب کچھ طلسم ثابت ہوا۔ دھوکا ثابت ہوا۔ اصل لوگ اپنی جگہ تھے' مگر یہاں ذرا مشکل ہے۔ نوشاد حقیقت تھا، بھگوتی پرشاد جی حقیقت تھے۔ اس بار میں تنہا نہیں تھا...... پھر...... پھر......!

رات کی تاریکیوں نے اس ماحول کو نگلنا چاہا' مگر ان روشنیوں نے رات کا منصوبہ ناکام بنا دیا بلکہ رنگین شیشوں نے اس ماحول کو اور خواب ناک بنا دیا تھا اور اب ہر چیز کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ''شی شی'' کی آواز دوبارہ ابھری اور میرے اعصاب تن گئے پھر ایک سرگوشی ابھری۔

''ادھر...... اس طرف...... اس طرف......! بائیں سمت......!'' میں بے اختیار بائیں سمت گھوم گیا۔ میری بائیں سمت پھولوں کے درمیان سنگ مرمر کا ایک بے جان مجسمہ ایستادہ تھا۔ پتھریلا اور ساکت۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ میرے پاس آجاؤ...... سنو جلدی کرو ورنہ سندری آجائے گی۔'' آواز مجسمے سے ہی ابھری تھی۔

لاکھ خود کو سنبھالا، ہمت کرنے کی کوشش کی لیکن پورے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ میں دہشت بھری نظروں سے اس مجسمے کو دیکھنے لگا۔ اس کے پتھریلا ہونے میں کوئی شک نہیں تھا' مگر وہ بول رہا تھا۔

بھنڈہ میں داخل ہوتے ہی جن واقعات سے سابقہ پڑا تھا، وہ احساس دلاتے تھے کہ سنسنی خیز واقعات نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ آہ! کیسی آرزو تھی دل میں، کیسا جی چاہتا تھا کہ کچھ وقت ایسا گزر جائے جس میں کچھ نہ ہو۔ جیسے دوسرے لوگ زندگی گزارتے ہیں، ویسے ہی میں بھی گزاروں۔ سادہ سادہ عام لوگوں جیسی زندگی......! لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا، ہر طرح کی کوشش کرلی تھی۔ ملازمت اس لئے کررہا تھا کہ محنت کی روٹی ملے۔ کبھی کسی کے در پر جا پڑتا تھا، کبھی کسی کے! پیٹ بھر جاتا تھا مگر دوسروں کے رحم و کرم کی وجہ سے......! ان دنوں جی کچھ خوش تھا مگر تقدیر کو یہ گوارہ نہیں تھا۔ پھر کسی جال میں آپھنسا تھا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ عام آدمی مجسمے کی آواز پر اس کے پاس جانے کا تصور بھی نہ کرتا بلکہ خوف سے بے ہوش ہوجاتا مگر میں......!

آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ نوجوان آدمی کا بت تھا، پتھریلا بے جان! پھر اس کے ہونٹوں سے آواز ابھری۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے! بھاگ جاؤ! یہ کال نگر ہے، کایا جال پڑ گیا ہے تم پر......! ایک بار جال اوڑھ لیا تو پھر کبھی نہ جاسکو گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے، بھاگ جاؤ!''

''تم کون ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

''بھاگ جاؤ! جلدی بھاگ جاؤ۔ دیکھو وہ آگئی۔'' مجسمہ خاموش ہوگیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سندری آرہی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ چھ، سات لڑکیاں تھیں۔ مجسمہ خاموش ہوگیا تھا۔

''تم کون ہو......؟ مجھے بتاؤ، وہ ابھی دور ہیں۔'' میں نے سوال کیا مگر مجسمے کی آواز دوبارہ نہ سنائی دی۔ مجھے اندازہ ہوگیا

تھا کہ وہ اب نہ بولے گا۔
سندری قریب آ گئی۔ دوسری لڑکیاں کچھ فاصلے پر رک گئیں۔ وہ بہت خوبصورت جھلملاتے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے پیروں میں بجنے والے زیور تھے اور ہاتھوں میں پھلوں اور میووں کے تھال! میں انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے پھولوں کے درمیان گھاس کے فرش پر چاندنی بچھا دی، تھال سجا دیئے۔ سندری بولی۔
''آؤ بیٹھو! کیسی لگی یہ جگہ......؟ کیا یہ سنسار کا سورگ نہیں ہے؟ تم نے کہیں ایسا دیکھا؟''
''یہ مجسمے کس نے بنائے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''سنگ تراش نے! جس طرح چندر بھان مہاراج نے یہاں پھول لگوائے ہیں، اسی طرح مجسمہ سازوں نے یہاں یہ بت تراشے ہیں۔ کیسے لگے تمہیں......؟'' سندری نے پوچھا۔
''بالکل جیتے جاگتے!'' میں نے کہا اور وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اپنی مخصوص ہنسی جو ذہن کو گرفت میں لیتی تھی۔ کم بخت بڑے پراسرار طریقے سے ہنسنا جانتی تھی۔ انسان کے ذہن پر نغمگی کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی تھی اور ذہن اس کی گرفت میں جانے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ ہنس کر بولی۔ ''اصلی ہی تو ہیں۔''
''کیا مطلب؟'' میں نے سوال کیا۔
''بس! پتھر کے بت بنانے والوں نے انہیں اصلی جیسا ہی بنایا ہے۔ آؤ بیٹھو، ہوا میں پھیلی خوشبو لگ رہی ہے تمہیں...... آؤ نا!'' اس نے ناز سے میرا ہاتھ پکڑا اور میں نے اس سے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آگے بڑھا اور چاندنی پر جا بیٹھا۔ سامنے رکھے ہوئے میووں کے تھال میں سونے کے گلاس اور سونے ہی کی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے سامنے دوزانو بیٹھ کر ان گلاسوں میں کوئی رنگین مشروب انڈیلا اور مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں، قطار بنا کر بیٹھ گئیں۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بربط تھا تو کسی کے ہاتھ میں طنبورہ......! ایک خوبصورت نغمے کی دھن چھیڑ دی گئی۔ ماحول ویسے ہی رنگینیوں سے رنگا ہوا تھا۔ خوشنما اور خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے پھول، آسمان پر مدھم مدھم دھندلاہٹیں، ستاروں کی ٹمٹماہٹ، نیچے رنگین شیشوں سے ابلتی ہوئی روشنی کی شعاعیں جو مخصوص زاویوں سے ان لڑکیوں کو سحر انگیز بنا رہی تھیں۔ سامنے سندری اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، ایک انسان پر قدرتی طور پر سحر طاری کرنے کیلئے کافی تھیں لیکن صرف اس انسان پر جس کا واسطہ زندگی میں پہلی بار کسی سحر سے پڑا ہو، میں تو سحر زدہ تھا ہی ایسے ایسے وار ہوئے تھے مجھ پر کہ سنبھلنا ممکن نہیں تھا۔
پتا نہیں کون کون سی قوتیں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھیں جو میں بال بال بچ جاتا تھا۔ یقینی طور پر ان قوتوں کا تعلق نہ میری قوت ارادی سے تھا، نہ میری ذہنی پاکیزگی سے! بس یوں لگتا تھا جیسے کوئی مجھے بچا لیتا ہو اور جب بھی یہ خیال دل میں آتا، بڑی ڈھارس ملتی، بڑا سہارا ملتا۔ نجانے کیا کیا کچھ یاد آ جاتا۔ درشہوار ہی کا معاملہ تھا۔ اس سے پہلے کشنا کا معاملہ تھا۔ انسان ہی تھا ایک لمحہ بھٹک جانے کیلئے کافی ہوتا لیکن بچایا گیا تھا۔ مجھے بچایا گیا تھا اور اس وقت اس وقت بھی ماحول کا یہ سحر میرے حواس پر فطری طور پر نہیں چھایا تھا اور میں مسلسل خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ نغمے کی دھن آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ سندری نے گلاس اٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ امرت جل ہے۔ میرے ہاتھ سے پی لو اور امر ہو جاؤ۔'' میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں سندری کہ میں مسلمان ہوں۔''
''دین دھرم سارے کھیل کایا کے کھیل ہیں۔ انسان تو ہو، اس سے، اس ماحول میں جب بھگوان نے تمہیں یہ سب کچھ دے دیا ہے تم دین دھرم کے جال میں الجھے ہوئے ہو۔ تھوڑی دیر کیلئے سب کچھ بھول جاؤ۔ یہ نغمہ سنو، اسے اپنے دل میں اتارو، امرت جل پیو اور امر ہو جاؤ...... میں تمہاری ہوں۔'' اس نے جھک کر اپنی پیشانی میری پیشانی سے ٹکرائی اور گلاس میرے ہونٹوں کے نزدیک لانے کی کوشش کی۔ میں نے آہستہ سے اس کے گلاس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سندری! تمہاری بدقسمتی ہے یا میری کہ میں اپنے دین کو نہیں بھول سکتا اور میرے دین میں یہ سب کچھ جائز نہیں ہے۔'' وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

''تو میں کیا کروں، مجھے بتاؤ میں کیا کروں......؟'' اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

''خود کو ناکام تصور کرلو سندری! اور اگر ہوسکے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ سب کیوں کررہی ہو؟'' سندری نے ہونٹ سکوڑ کر گلاس واپس تھال میں رکھ دیا اور بولی۔

''میں کیوں کرتی یہ سب کچھ! بس مجھے تو حکم دیا گیا تھا کہ مہمان کا جی خوش کروں، اسے بہلاؤں اور ذرا بھی اداس نہ ہونے دوں۔ میں تو یہی سوچ رہی تھی کہ امرت جل کے دو گلاس پی لو تم تو میں تمہیں ناچ دکھاؤں۔''

''جن لوگوں نے یہ سب کچھ کیا ہے سندری! انہیں واپس جاکر یہ بتادو کہ بدقسمتی سے ایک مسلمان ان کے جال میں پھنسا ہے اور اسے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ نہ امرت جل پی کر امر ہونا چاہتا ہے، نہ رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہو کر اپنا ایمان کھونا! بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا تم سے!'' میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ خوف تھا کہ کہیں اس کی ضد پر کوئی قدم بہک نہ جائے چنانچہ یہاں سے چلے جانا ہی زیادہ اچھا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور مہمان خانے کے قریب پہنچ گیا۔ پلٹ کر نہیں دیکھا تھا' لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب بری بری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ہنسی آگئی۔ کم بخت ایک کے بعد ایک مصیبت گلے آپڑتی ہے۔ بھلا اس میں بھی کوئی شک کی بات تھی کہ یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ ایک گہری چال تھی، کوئی گہرا جال تھا اور اس کارروائی کے عقب میں ہوسکتا ہے بھوریا چرن وہیں بیٹھا ڈوریاں ہلا رہا ہو۔ امکانات تھے اس بات کے! مکمل طور پر امکانات تھے۔

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ یہاں کا ماحول بدل گیا تھا۔ غالباً بستروں پر نئی چادریں بچھائی گئی تھیں، کچھ اور چیزیں بھی لاکر رکھی گئی تھیں۔ ایک طرف ایک فریم دیوار پر ٹنگا ہوا تھا اور اس فریم میں ایک تصویر آویزاں تھی۔ یہ تصویر ایک عجیب و غریب چہرے کی تھی۔ قدیم طرز کا کوئی راجپوت یا ایسا سورما جو جنگ و جدل میں حصہ لیتا رہا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون کی آمیزش تھی اور یہ آنکھیں درحقیقت بڑے جاندار رنگوں سے بنائی گئی تھیں۔ بالکل اصلی اور گھورتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک لمحے کیلئے ذہن اس تصور میں بھی الجھ گیا کہ یہ تبدیلیاں کیوں رونما ہوئی ہیں۔ بہرحال سب کچھ ہوسکتا تھا، سب کچھ......! میں بھلا کر ہی کیا سکتا تھا۔ دروازہ بند کرلیا۔ یہ احساس دل میں تھا کہ ہوسکتا ہے سندری پھر اندر آجائے اور مجھے پریشان کرنے کی کوشش کرے حالانکہ میں نے اب وہ راستہ تو نہیں چھوڑا تھا کہ وہ میری جانب رخ کرے لیکن اندازہ یہ ہوتا تھا کہ اس کی ڈور بھی کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔

کافی وقت گزر گیا سندری نے دروازہ نہیں بجایا اور پھر میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مدھم مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، پوری طرح اندھیرا نہیں تھا۔ یوں ہی اتفاقیہ طور پر تصویر پر نظر جا پڑی اور میں لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ نظر کا دھوکا نہیں تھا، آنکھوں کی کوئی خرابی بھی نہیں تھی اور نہ ہی ذہن کا کوئی انتشار......! لیکن فریم میں لگی ہوئی تصویر بے شک بدل گئی تھی۔ یہ تصویر اب مجھے کچھ اور ہی شکل میں نظر آئی تھیں۔ آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بستر سے کود کر تصویر کے نزدیک آیا۔ رانی مہاوتی کی تصویر تھی۔ وہ سورما تصویر کے فریم سے غائب ہوگیا تھا' جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ پھر گہری سانس لے کر اپنے بستر کی جانب آگیا اور اس کے بعد بھلا نیند آنکھوں میں کہاں آتی۔ کبھی کبھی پلکیں جھپک جاتیں پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کی جانب دیکھنے لگتا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تبدیلیاں بلاوجہ رونما نہیں ہوئی تھیں۔ ایک بار پھر پلکوں پر جھپکی سی آگئی اور اچانک ہی تصویر کا تصور ذہن میں آیا تو چونک کر اسے دیکھا۔

اف میرے خدا...... میرے خدا! میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ تصویر پھر بدل چکی تھی اور اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو یہ تصویر کالی داس کی تھی۔ ہاں...... دیوان کالی داس کی! فریم میں بار بار تصویریں بدل رہی تھیں اور

اب یہ بات دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ تصویریں نہیں تھیں۔ یہ وہ خبیث روحیں تھیں جو تصویری شکل میں آ کر میرا جائزہ لے رہی تھیں، مجھے دیکھ رہی تھیں، میرے بارے میں اندازے لگا رہی تھیں۔ دل چاہا کہ دروازہ کھول کر باہر بھاگ جاؤں، کس طلسم خانے میں آ پھنسا۔ نوشاد اور بھگوتی پرشاد تو جا چکے تھے اور مجھے اس عذاب میں گرفتار کر گئے تھے۔ کیا کروں، کیا کروں یا تو لاپروا ہو کر آنکھیں بند کرلوں اور گہری نیند سو جاؤں۔ زیادہ سے زیادہ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ بھلا اس عالم میں نیند آسکتی تھی؟ آہ کیسے اس طلسم خانے سے بھاگ جاؤں۔ اگر یہ سب کچھ چھوڑ کر چلا جاتا ہوں تو حاجی صاحب کے کام میں مداخلت ہوتی ہے۔ رانی مہاوتی آخر ہیں کیا چیز......! اندازہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب دیوان کالی داس نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھا تھا اور اس کے بعد میرے یہاں قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ڈیزائن لینے کیلئے بھگوتی پرشاد بھی ہوسکتا تھا، نوشاد بھی! لیکن اشارہ میرے لئے کیا گیا تھا۔ گویا اب یہ طے شدہ بات تھی کہ پھر کوئی جال مجھ پر ڈالا جا رہا تھا۔ باغ میں سجے ہوئے مجسمے کے الفاظ یاد آئے۔ ''یہ کال نگر ہے، کال نگر......!'' میں اس کی بات سے پوری طرح متفق ہو گیا۔ بستر پر بیٹھ کر نجانے کتنی دیر سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟ خاموشی سے بھاگ بھی سکتا تھا لیکن دل نے ڈھارس دی اور کہا کہ مسعود! دیکھ تو سہی آگے کیا ہوتا ہے؟ تیرا آج تک کسی نے کیا بگاڑ لیا جو اب بگاڑ لے گا۔ ذرا ان رانی مہاوتی جی کا کھیل بھی دیکھ لے۔ ان تمام تصورات کے ساتھ ایک بار پھر نظر اس فریم پر ڈالی لیکن وہاں ہر بار کوئی ایسا منظر نظر آتا تھا جو دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ اس بار تصویر کا فریم خالی تھا۔ سب جا چکے تھے، سب جا چکے تھے۔ میرے حلق سے ایک ہذیانی سا قہقہہ نکل گیا۔ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اجازت ہو تو اب سو جاؤں؟'' اور اس کے بعد میں نے بستر پر لیٹ کر کروٹ بدلی اور آنکھیں مضبوطی سے بھینچ لیں۔ غالباً کوئی ایسا عمل خود بخود ہو گیا تھا جس نے مجھے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا اور نیند بھی ایسی پرسکون کہ صبح کو سورج کی روشنی ہی نے جگایا۔ کرنیں کمرے کے مختلف کونوں کھدروں سے رینگتی ہوئی اندر آگئی تھیں اور مجھے دیکھ رہی تھیں۔ منتظر تھیں کہ میں اپنی جگہ سے اٹھوں اور زندگی کے پراسرار معاملات پھر سے جاری ہو جائیں۔ پہلی شکل سندری ہی کی نظر آئی تھی۔

''جاگ گئے مہاراج......؟''

''ہاں سندری......! تم ٹھیک ہو؟''

''خاک ٹھیک ہوں۔ تم میری کوئی بات مانتے نہیں ہو، سب میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''رانی مہاوتی جی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ چونک پڑی۔

''کیوں......؟''

''میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کب تک رہنا پڑے گا۔ میں جانا چاہتا ہوں۔''

''اوہ......!'' اس نے گہری سانس لے کر کہا جیسے وہ مطمئن ہو گئی ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''کوئی جلدی ہے؟''

''سندری! میں جانا چاہتا ہوں۔''

''مہاوتی جی تو صبح ہی صبح کہیں گئی ہیں۔ دیوان جی بھی ان کے ساتھ ہی گئے ہیں۔ ان سے پوچھے بنا تمہارا جانا اچھا نہیں ہوگا۔''

''تمہیں پتا ہے کب تک آجائیں گے؟''

''مالک، نوکروں کو بتا کر نہیں جاتے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شام تک ضرور آجائیں گے۔ تم یہاں کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے دین کی پوجا کرو پجاری...... ہونہہ!'' اس نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

چلچلاتی دوپہر تھی، دھوپ حد سے زیادہ تیز، ماحول بڑا سنسان تھا۔ دن کی روشنی میں میں نے ان مجسموں کو دیکھا تھا، چھو کر دیکھا تھا سب کے سب انسانی ہاتھوں کی تراش معلوم ہوتے تھے۔ کوئی شبہ نہیں تھا اس بات میں مگر پچھلی رات کی بات بھی

وہم نہیں تھی۔ میں نے اس مجسمے کو بھی دیکھا تھا' جو مجھ سے بولا تھا' مگر وہ صرف پتھر تھا۔ دور تک نکل گیا۔ واقعی یہ عمارت بڑے وسیع احاطے میں تھی۔ جگہ جگہ تعمیرات تھیں۔ سرخ پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک جھروکے سے آواز ابھری۔

''سنو...... سنو...... ! ارے...... ادھر ادھر!'' میں رک گیا۔ یہ اندازہ فوراً ہو گیا تھا کہ آواز جھروکے سے آ رہی ہے' مگر جھروکا اونچا تھا۔ میں اس میں نہیں جھانک سکتا تھا۔ ''سیدھے چلتے ہوئے دائیں سمت مڑ جاؤ۔ دروازے سے اندر آ جاؤ، وہ گہری نیند سو رہا ہے۔'' آواز پھر ابھری۔

''کون ہو تم......؟''

''ڈرو مت، تمہارے جیسا انسان ہوں۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ہمت کرو، اندر آ جاؤ، ڈرو مت! اس وقت کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آؤ جلدی کرو، آ جاؤ۔''

''آ رہا ہوں، تمہیں بھی دیکھ لوں۔'' میں نے طنزیہ آواز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا کہنا درست تھا۔ آگے چل کر بائیں طرف مڑا تو دروازہ نظر آ گیا۔ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے دھکا دیا تو کھل گیا۔ دوسری طرف ایک وسیع چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس کے تین طرف کمرے تھے۔ چبوترہ بھی سرخ پتھر سے بنا ہوا تھا۔ ان کے بیچوں بیچ پیپل کا درخت تھا جو باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ ایک گوشے میں پیپل کے سوکھے پتوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ان کے قریب جھاڑو بھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ کمرہ بھی اس عمارت میں دائیں سمت کا ہو سکتا تھا۔

کمرہ اختتامی دیوار کے ساتھ تھا، چنانچہ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ باہر سے لوہے کی مضبوط کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بہ آہستگی اس کنڈی کو کھولا اور پھر آہستہ سے دروازے کے کواڑ کو دھکا دیا۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر تاریکی نہیں تھی، روشندان سے دھوپ پڑ رہی تھی۔ دھوپ نے کمرے کو روشن کر دیا تھا۔ کمرہ چونکہ کسی قدر بلندی پر تھا اس لئے اس شخص نے مجھے دیکھ لیا تھا جسے میں باہر سے نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ ایک توانا آدمی تھا۔ اچھے قد و قامت کا مالک! مگر اس کے پیروں میں زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک زنجیر کمر سے بھی بندھی ہوئی تھی اور یہ تمام زنجیریں موٹے آہنی کڑوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

''کون ہو تم......؟''

''اگر تمہاری آنکھوں میں روشنی ہے تو مجھے دیکھ لو۔ غور سے دیکھو، کون ہوں میں؟'' اس نے کہا۔

''میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''نہیں جانتے...... کیوں......؟'' وہ حیرت سے بولا۔ میں نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا حلیہ بہت خراب تھا۔ کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہے تھے، چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں پر زخموں کے کھرنڈ تھے۔

''تمہاری بات کا کیا جواب دوں میں......؟''

''بے وقوف...... ! میں چندر بھان ہوں...... چندر بھان!''

''کیا......؟'' میں اچھل پڑا۔

''اس نے مجھے بیمار مشہور کر دیا ہے۔ لوگ مجھے بیمار سمجھتے ہیں۔ بھگوان کی سوگند میں پاگل نہیں ہوں۔ میں تمہارا مہاراج ہوں۔ میں تمہارا مہاراج ہوں سمجھے! میں تمہارا ان داتا ہوں۔ میں تمہارا مہاراج ہوں سمجھے......!''

''تم چندر بھان ہو...... مہاوتی کے شوہر......؟''

''ہاں! میں وہی بدنصیب ہوں۔ سنو میری مدد کرو۔ بس ایک بار...... صرف ایک بار مجھے یہاں سے آزادی دلا دو، جیون بھر تمہارا احسان مانوں گا۔ ارے بھائی! ایک بار، بس ایک بار!'' اس کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ وہ امید بھری نظروں سے مجھے

دیکھ رہا تھا۔

✦✣✦✣✦

سمجھ میں آنے والی تو خیر کوئی بات تھی ہی نہیں۔ یہاں آنے کے بعد جو کچھ دیکھا تھا، ان میں سے ایک دو باتیں ہی سمجھ میں آئی ہوں تو آئی ہوں، ورنہ کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔ چندر بھان کی کمر سے بندھی ہوئی زنجیر اور اس کے پیروں میں پڑے ہوئے زنجیروں کے کڑوں کو دیکھا۔ موٹے موٹے لوہے کے کڑے تھے جن میں انتہائی مضبوط زنجیریں باندھ کر انہیں دیواروں میں لگے ہوئے کڑوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے ان کڑوں اور زنجیر کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جن سے ان کڑوں کو توڑنے کی کوشش کی جائے اور پھر یہ منظر انتہائی حیران کن تھا کہ چندر بھان مہاراج یہاں پر قیدی تھے اور رانی مہاوتی ان کے نام پر اس شاندار محل میں راج کر رہی تھی۔ وہ عورت تو مجھے ایک نگاہ میں ہی پراسرار لگی تھی اور اب اس کے بعد جو واقعات پیش آئے تھے، انہوں نے کوئی شک نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”مگر چندر بھان جی! میرے پاس تمہاری زنجیروں کو توڑنے کیلئے تو کوئی چیز نہیں ہے۔“

”بھگوان کیلئے...... بھگوان کیلئے کچھ بھی کرو۔ جو تمہارا من......!“ چندر بھان نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً اس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔ اس کی نگاہیں میرے عقب میں کھلے ہوئے دروازے پر جم گئیں۔ میں نے بھی تیز روشنی میں ایک سایہ سا محسوس کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو حلق سے ایک دہشت بھری آواز نکل گئی۔ لمبے چوڑے بدن کا مالک تھا وہ، انسان کہنا اس کو غلط تھا۔ ہاں انسان نما چیز ضرور تھی۔ خوفناک لمبے لمبے بال اس کے پورے چہرے، گردن اور کھلے ہوئے بازوؤں پر نظر آ رہے تھے۔ باقی جسم پر لباس تھا، آنکھیں بے حد خوفناک اور ضرورت سے زیادہ بڑی بڑی! ناک کے بارے میں بھی کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھی تقریباً کانوں تک ہی پھیلی ہوئی تھی اور دہانہ بہت چھوٹا! وہ خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ غراتا ہوا دو قدم آگے بڑھا اور میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ میری آنکھوں سے ٹکرائی، دفعتاً وہ اس انداز میں پیچھے ہٹ گیا جس انداز میں آگے بڑھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اور وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے حلق سے خونخوار غراہٹیں نکلنے لگیں اور وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا اچھلنے لگا۔ اس نے اپنی موٹی انگلی سے میرے سینے کی جانب اشارہ کیا اور پھر اس انگلی کو کھلے ہوئے دروازے کی جانب لے گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ باہر نکل جاؤ۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ انوکھی مخلوق انسان ہے بھی یا نہیں......! پھر اس کے حلق سے ایک چنگھاڑ سی نکلی اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگا۔ سر کے بالوں کے گچھے کے گچھے اس نے اکھاڑ کر پھینک دیئے۔ جسم کے بالوں کو بھی نوچنے لگا۔ اس کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں اور وہ ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ کبھی اس طرف کی دیوار سے ٹکراتا اور کبھی دوسری طرف کی دیوار سے! پھر وہ زمین پر گر کے زمین پر لوٹنے لگا۔ جگہ جگہ سے اس نے اپنا جسم کاٹنا شروع کر دیا اور میں نے اس کے جسم سے خون ابلتا ہوا دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پر یہ کس قسم کا دورہ پڑ گیا ہے لیکن ایک اندازہ میں نے ضرور لگا لیا تھا کہ وہ شدید غصے کے عالم میں مجھ سے باہر نکل جانے کیلئے کہہ رہا تھا اور اپنی بوٹیاں چبائے جا رہا تھا البتہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا تھا۔ بالکل گونگوں کا سا انداز تھا۔ شاید وہ گونگا تھا۔ چند لمحات کے بعد چندر بھان ہی نے کہا......“

”دیر کر دی، دیر ہو گئی اب......! اب ساری بلا مجھ پر ہی آئے گی۔ تم سے یہ کچھ نہیں کہہ رہا مگر...... مگر مجھ سے بدلہ لے گا۔ جاؤ...... جاؤ باہر نکل جاؤ، پتا نہیں اس نے تم پر حملہ کیوں نہیں کیا؟ اپنا غصہ کیوں ضبط کر رہا ہے۔“

”یہ گونگا ہے......؟“

”ہاں......!“

”کون ہے یہ......؟“

''آ......آ......آ......!'' چندر بھان کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اپنے الفاظ کو آہوں میں تبدیل کر کے رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''جاؤ...... جاؤ نکل جاؤ۔ ہو سکے تو دوبارہ مجھ مظلوم کی طرف رخ کرنا۔ کسی کو میرے بارے میں بتا دینا۔ لوگوں سے کہہ دینا کہ چندر بھان...... چندر

بھان!'' دفعتاً ہی نیچے لیٹا ہوا آدمی ہولناک آواز میں چیخا۔ یہ آواز اس کمرے میں اس طرح گونجی تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے چندر بھان کی طرف چھلانگ لگائی اور چندر بھان بھی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا مگر اس شخص نے چندر بھان پر بھی حملہ نہیں کیا۔ پھر میری جانب مڑا اور دروازے کی جانب اشارہ کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اب وہاں رکنا حماقت تھی، ظاہر ہے اس بھونچال سے مقابلہ کرنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور پھر مقابلہ کس بنیاد پر کرتا۔

کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا مجھے، ایک اور انوکھی چیز دیکھی تھی میں نے یہاں، اور پھر میں حیران دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر کا منظر وہی تھا۔ چلچلاتی دھوپ، سنسان اور ویران راستے! وہ میرے پیچھے پیچھے آیا تھا اور اس نے میرے باہر نکلتے ہی یہ دروازہ بھی بند کر دیا تھا جبکہ چندر بھان کے کمرے کا دروازہ وہ پہلے ہی بند کر آیا تھا۔ میں ایک لمحہ کھڑا اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر گردن جھٹک کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ لعنت ہے...... لعنت ہے اس زندگی پر! جو کچھ بھی نظر آتا ہے، ایسا ہی نظر آتا ہے جس کا سر پیر سمجھ میں ہی نہ آئے۔ وہاں سے واپس پلٹ پڑا اور ادھر ادھر گھومنا بیکار سمجھ کر اپنی رہائشگاہ میں آ گیا۔ دیر تک اس سارے قصے کے بارے میں سوچتا رہا اور اس کے سوا اور کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ مہاوتی پُراسرار اور خطرناک عورت ہے۔ وہ کیا ہے اور کیا کر رہی ہے، اس کے بارے میں ظاہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی ان سارے گورکھ دھندوں کے بارے میں میری کوئی معلومات۔ حالانکہ طویل عرصے سے اس جال میں پھنسا ہوا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ حاجی صاحب نے مجھے اس لئے تو یہاں نہیں بھیجا کہ مہاوتی کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔

مہاوتی بس حاجی صاحب کی ایک پارٹی تھی اور حاجی صاحب نے اسے ساڑھیاں فروخت کی تھیں جن کا معاوضہ انہیں مل گیا تھا۔ اگر آج شام تک مہاوتی مجھے وہ ڈیزائن نہیں دے دیتی اور حاجی صاحب کیلئے نیا آرڈر نہیں دے دیتی تو میں یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔ حاجی صاحب سے کہہ دوں گا کہ وہاں کچھ ایسے عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے میں وہاں نہیں رک سکا۔ حاجی صاحب اچھے آدمی ہیں، اس بات کا برا نہیں مانیں گے۔ بہرحال میں اپنی جان تو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ سب کچھ ہو رہا تھا، سب کچھ! پورے سکون کے ساتھ کر رہا تھا لیکن نقطۂ نظر بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اپنی ذات کے ساتھ بھلا اس وقت تک کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جب تک کہ ماں، باپ اور بہن، بھائی نہ مل جائیں۔ ان کیلئے ہی تو زندگی لٹا دی تھی۔ جو کھو گیا تھا، اسے پانے کی آرزو میں ہی تو جی رہا تھا۔ اگر یہ آرزو ختم ہو جائے اور دل اس بات کا یقین کر لے کہ اب وہ زندگی میں کبھی نہیں آئیں گے تو پھر ایک لمحے بھی میرے لئے جینا بیکار تھا۔ کیا فائدہ اس طرح تنہا جینے سے۔ ملنے کو تو بہت کچھ مل جائے گا لیکن سب سے بڑی طلب ماں، باپ کی تھی۔ سب سے بڑی حسرت انہی کی تھی اور اس حسرت، اس کسک کو دل میں دبائے جہاد کر رہا تھا اپنے آپ سے اور کوششیں کر رہا تھا کہ مجھے میری کھوئی ہوئی ہستی واپس مل جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس کے بعد ایک معمولی انسان کی حیثیت سے اپنے ماں، باپ کے قدموں میں زندگی بسر کرنا دنیا کی سب سے بڑی عبادت سمجھوں گا۔

شام ہو گئی۔ سورج کی قہر سامانیاں ختم ہو گئیں اور جب سورج چھپا تو نجانے کہاں سے بند ہوائیں چل پڑیں اور ماحول پر ایک فرحت انگیز کیفیت طاری ہو گئی۔ سندری دوبارہ میرے پاس نہیں آئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے روٹھ گئی ہو۔ میں لعنت بھیجتا تھا ایسی سندریوں پر لیکن شام کو جب میرے لئے کھانے پینے کی چیزیں آئیں اور میں انہیں کھانے میں مصروف ہو گیا تو کھانا لانے والے ملازم نے کہا۔

''مہاراج! آپ تیار ہیں۔ کالی داس جی نے کہا ہے کہ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ کو رانی مہاوتی جی

سے ملنا ہے۔"

"رانی جی آ گئیں؟"

"ہاں......!"

"ٹھیک ہے تم بھی انہیں میرا یہ پیغام دے دو کہ میں فوراً ہی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کھانے سے جلدی جلدی فراغت حاصل کی اور انتظار کرنے لگا کہ رانی مہاوتی مجھے بلائیں۔ آنے والا کالی داس ہی تھا۔ وہی کالا بھجنگ جو اب مجھے انسان سے زیادہ شیطان معلوم ہونے لگا تھا۔ خصوصاً اس وقت سے جب سے میں نے اسے تصویر سے غائب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر، پھر وہ بولا۔

"آیئے مہاراج......! رانی مہاوتی آپ کو ڈیزائن دینا چاہتی ہیں۔" میں خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ مختلف غلام گردشوں اور راہداریوں سے گزار کر وہ مجھے محل کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ بڑے سے چوبی دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وسیع وعریض کمرہ تھا جس میں شاندار اور قیمتی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ رانی مہاوتی ایک بہت قیمتی اور چوڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے، چہرے پر وہی پروقار کیفیت جسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ کوئی کسی رانی ہی کے سامنے ہے۔ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں۔

"آؤ......آؤ آگے آؤ، رک کیوں گئے؟ کالی داس! ہمارے مہمان کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تمہارے گھر میں؟"

"کوشش تو یہی کی ہے مہارانی کہ آپ کے مہمان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔" کالی داس کے لہجے میں ایک تمسخر چھپا ہوا تھا۔

"ان کی خاطر مدارت بھی کی......؟"

"ہاں......! مگر سندری کہتی ہے کہ یہ سندرتا کو پسند نہیں کرتے۔" کالی داس نے جواب دیا۔

"تم بھی بدھو ہو نرے کالی داس جی! جس کے چرنوں میں اندر سبھا سجتی ہو، اسے سندری کی سندرتا سے کیا لگاؤ ہوگا، مگر پورن بھگت ہمیں بھگتی کا سبھاؤ نہیں دے رہے۔ کیوں پورن مہاراج؟" رانی نے دل موہ لینے والی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ رانی جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہم سے بولو گے نہیں مہاراج......؟"

"حکم دیجئے رانی جی!" میں نے کہا۔

"اپنے بارے میں بتاؤ گے نہیں؟"

"کیا......؟"

"ایک مسلمان کے ہاں نوکری کر رہے ہو، نام بھی مسلمانوں جیسا، روپ بھی ان کا سا، ایسا کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔"

"کوئی مسلمان پورن نہیں ہو سکتا یا کوئی پورن مسلمان نہیں رہ سکتا۔" رانی نے کہا۔

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں رانی جی! مجھے یہاں بہت وقت گزر چکا ہے۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"آپ ایسے کہاں جائیں گے پورن مہاراج! ہمیں کچھ دیتے جایئے۔ ایسے ہی تھوڑی روکا ہے آپ کو! چلیں ٹھیک ہے آپ کی بات ہی سہی۔ دیکھئے ہمیں ایسے سو دوشالے بنوانے ہیں، بنارسی کڑھائی میں یہ ڈیزائن بنوا دیں ہمیں! دکھاؤ کالی داس! سورج لیکھا دکھاؤ پورن مہاراج کو!" کالی داس نے گردن جھکائی۔ ایک طرف بڑھا پھر پلٹا اور اس کے بعد اس نے ایک سرخ دوشالا کھول دیا۔ دوشالے پر جگمگاتے تاروں سے کچھ نشان کڑھے ہوئے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ ان تاروں سے کچھ لفظ لکھے

ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے رانی جی! آپ یہ مجھے دے دیں۔''

''اس کے بدلے آپ ہمیں کیا دیں گے؟'' رانی نے مسکرا کر پوچھا۔

''یہ آپ کو واپس مل جائے گا دیوی جی!''

''نہیں آ رہے یہ ہمارے قابو میں شمبھو مہاراج! آپ ہی آیئے۔ پورن جی پردہ کر رہے ہیں ہم سے......!'' کمرے میں بنے ہوئے دوسرے دروازے سے ایک کریہہ المنظر بوڑھا باہر نکلا۔ دبلا پتلا بانس کی طرح سوکھا، ہاتھ، پاؤں بے ترتیب! ویسے بدن ننگا، نیچے دھوتی باندھے ہوئے وہ بھی نہایت مختصر! گردن میں باریک باریک سانپ مالاؤں کی طرح پڑے ہوئے جو کلبلا رہے تھے، زبانیں نکال رہے تھے۔ داڑھی، مونچھوں اور سر کے بال کیچڑ میں لپٹے ہوئے، بدن سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''جے مہا کالی!'' اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''جے مہا کالی!'' اس بار اس نے گرجتی آواز میں کہا۔ میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا تو وہ کڑک کر بولا۔

''سارے دیاس یہاں سے شروع ہوتے ہیں، یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ جے مہا کالی! کیا تو کالی داس نہیں ہے؟''

''مجھے جانے دیں رانی جی!'' میں نے کہا۔

''شمبھو مہاراج سے بات کریں پورنا!'' وہ بولی۔

''میرا نام مسعود احمد ہے۔''

''نام مسعود احمد ہے پھر پورنیاں کیسے مل گئیں تجھے؟ اوہو سمجھا دیکھ یہ ایک' اس نے ہاتھ اٹھا کر نیچے کیا اور کالے رنگ کا ایک لکڑی کا ٹکڑا گر پڑا۔ دو تین چار وہ گنتا رہا اور چھ ٹکڑے زمین پر آ گئے سات......! اس نے ہاتھ اٹھایا مگر کوئی ٹکڑا نیچے نہ گرا۔ سات...... سات...... سات......! وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر نیچے گراتا رہا' مگر ساتواں ٹکڑا نیچے نہ گرا۔ ''ارے ساتویں کہاں گئی، ساتویں کہاں گئی۔ ساتویں کہاں ہے......؟ ساتویں نہیں ہے۔'' اس نے آخری الفاظ مہاوتی کو مخاطب کر کے کہے۔

''کھوج لگائیں مہاراج......!'' مہاوتی پریشان لہجے میں بولی اور شمبھو زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے آسن جما لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تب میں نے اس کی گردن میں پڑے ہوئے باریک باریک سانپوں کے بل کھلتے دیکھے۔ ان میں سے دو اس کی ناک کے دونوں نتھنوں میں گھسنے لگے، دو کانوں کی طرف بڑھ گئے اور کانوں کے سوراخ تلاش کر کے ان میں بدن سمیٹنے لگے۔ بھیانک منظر تھا۔ سانپوں کے چپے بدن اس کی ناک اور کانوں کے سوراخوں میں گم ہوتے جا رہے تھے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سارے سانپ غائب ہو گئے۔ میں اکتائی ہوئی سانسیں لے رہا تھا اور رانی اور کالی داس بدستور مسکراتی نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد شمبھو مہاراج نے آنکھیں کھول دیں۔ خوفناک سرخ آنکھیں! پھر انہوں نے منہ کھولا اور بے چین سانپ بلبلاتے ہوئے ان کے منہ سے باہر آنے لگے۔ کچھ رینگتے ہوئے ان کی گردن تک پہنچ گئے، کچھ اس کوشش میں نیچے گر پڑے تو شمبھو مہاراج نے انہیں خود اٹھا کر گردن میں ڈال لیا۔ پھر وہ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ ''کچھ پتا نہیں چل رہا ساتویں کہاں ہے۔''

''نہیں پتا چل رہا مہاراج......؟'' مہاوتی بولی۔

''بڑا بگڑا ہوا کھیل ہے مہاوتی! یہ خود ہی بتائے تو پتا چلے۔ اس کا شروع بھی پتا نہیں چلتا۔ شنکھا بھی نہیں ہے یہ کہ کھنڈولا بن جائے' مگر پورنا ضرور ہے، ساتوں پورنیاں رکھنی ہوتی ہیں، مگر ساتویں کہاں گئی؟ بول رے پورنا! ساتویں کہاں گئی ورنہ شمبھو ہے میرا نام......!''

''بتا دو پورنا مہاراج! بتا دو۔'' کالی داس بولا۔

''رانی مہاوتی! میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے احتجاج کیا۔

''تم بھی تو ضد کر رہے ہو پورنا! بتا دو شمبھو مہاراج کو! نہیں تو مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے۔''
''آپ مجھے جانے دیں۔ میں جا رہا ہوں۔'' میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اسی وقت شمبھو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
''رک جا پورنا......! رک جا۔'' اس نے گلے سے ایک سانپ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔
''میں جا رہا ہوں اور اب میں محل میں نہیں رکوں گا۔ سمجھے تم لوگ!'' میں نے کہا اور شمبھو نے سانپ مجھ پر اچھال دیا۔ سانپ میری گردن میں آ پڑا۔

اس سے خوف زدہ ہونا اور چھٹکارا پانا فطری کوشش تھی۔ میں نے اسے مٹھیوں میں جکڑ لیا' مگر اس نے دوسرا سانپ پھینکا جو میری کلائیوں پر آ کر پڑا اور اس نے میری دونوں کلائیوں پر بندش کر لی۔ میرے حلق سے دہشت بھری چیخیں نکلیں اور میں نے بدحواسی کے عالم میں دروازے کی طرف چھلانگ لگائی لیکن ایک اور سانپ نے میرے پیروں کو بھی جکڑ لیا۔ میں اوندھے منہ نیچے گرا اور پوری قوت سے سانپوں کے جسموں سے قائم کی ہوئی بندشوں سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا لیکن ان گھناؤنی لچکدار رسیوں نے مجھے ایسا جکڑا کہ میں ہل بھی نہ سکا اور ادھر سے ادھر لڑھکنے لگا۔ شمبھو نے کچھ اور پھینکا اور گردوغبار کا ایک بڑا مرغولہ میرے گرد چھا گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں، جدوجہد رک گئی اور بدن ساکت ہو گیا۔ کھانسی اٹھ رہی تھی۔ عجیب سی گرد تھی۔ میں نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں اور کھانستا رہا۔ کچھ دیر کے بعد احساس ہوا کہ گرد کم ہو گئی ہے۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ دھندسی چھائی ہوئی تھی پھر وہ دھند بھی چھٹ گئی۔ ایک نگاہ میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ منظر بدل گیا ہے۔ نہ محل ہے، نہ بھٹنڈہ، نہ کالی داس ہے، نہ شمبھو! بلکہ ایک اجاڑ جنگل ہے، سوکھے ہوئے پتوں سے بے نیاز درخت کھڑے ہوئے ہیں۔ چند گز کے فاصلے پر بدنما چٹانوں اور پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ایک اونچے ٹیلے کے دامن میں ایک سیاہ غار کا دہانہ منہ کھولے مجھے تک رہا ہے۔ سانپ بدستور میرے بدن سے لپٹے ہوئے ہیں اور میں ان کی قید میں ہوں۔ ان سانپوں سے مجھے دہشت بھی ہو رہی تھی، گھن بھی آ رہی تھی۔ بے چینی سے پورے بدن کا زور لگایا تو دوسری طرف لڑھک گیا تب ادھر کا منظر نظر آیا۔ لاتعداد بیر گردن نیہوڑاتے گھٹنوں میں سر دیئے، اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ میرے بیر تھے۔ پورنیوں کے بیر......! ان سے کوئی دو گز کے فاصلے پر درخت کے ایک کٹے ہوئے تنے پر بھوریا چرن پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوا تھا اور بھوریا چرن کے پیروں کے پاس ایک نسوانی بدن رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ میں پتھرا گیا۔ یہ سب کچھ بہت سنسنی خیز تھا' مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر بھوریا چرن اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آ کر میرے پاؤں چھوتا ہوا بولا۔
''پائے لاگوں مہاراج دین دیال...... بڑے دھرم دیوتا ہیں آپ! مان گئے آپ کو۔'' اس کی آواز میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

''بھوریا چرن تم......؟''
''کتا ہے آپ کا...... کیڑا ہے آپ کے سامنے رینگنے والا......!''
''کیوں کیا حال ہے؟''
''بس حال نہ پوچھو مہاراج! ہم نے بڑے بڑے دھرم دیال دیکھے ہیں مگر تم جیسا دھرم کا باؤلا نہیں دیکھا......''
''سچ کہتے ہو بھوریا چرن......!''
''نہیں! جھوٹ بول رہے ہیں کیا؟''
''تمہارا شکریہ تم نے مجھے یہ اعزاز اپنے منہ سے دیا ہے۔ یہی تو میں چاہتا ہوں بھوریا چرن کہ لوگ مجھے میرے دین کیلئے پاگل سمجھیں۔''
''ستیاناس ہو تمہارا! کتے کی موت مر جاؤ۔ ہمارا کریا کرم کیوں کر دیا تم نے۔ ارے سارا جیون ختم کر دیا تھا۔ کھنڈولا بننے کیلئے کتنی محنت کی تھی، سب خاک میں ملا دی۔ خیر ہم تو خاک میں ملے ہی ہیں' مگر تمہارا بھی کریا کرم ہی کر کے چھوڑیں گے

سمجھے! دیوانے، پاگل، پاپی! اب بھی مان لے ہماری بات، اب بھی مان لے۔ تیرے ذریعے ہمارا ایک اور ایسا کام ہو سکتا ہے جو سارے بگڑے ہوئے کام بنا دے۔ اگر تو ہمارے رنگ میں رنگ جائے تو اب بھی سن لے، خود بھی عیش کرے گا اور ہمیں ہماری منزل مل جائے گی۔ بتائے دے رہے ہیں تجھے، تو ہے مسلمان کا چھوکرا، مسلمان بنے رہنا۔ ہم انکار نہیں کریں گے، مسلمانوں میں گھس جانا، دین دیوتا بن جانا، لوگوں کے کام نکالتے رہنا اور سب کو دھوکا دیتے رہنا۔ ایک ایسا لڑکا تلاش کر لینا جو ہمارا کام کر دے۔ ارے ہم اب بھی اسی پھیر میں پڑے ہوئے ہیں کہ کبھی تجھے عقل آجائے اور تو ہمارا یہ کام کر دے۔ وہ سارے وعدے جو ہم نے تجھ سے کئے ہیں، اب بھی پورے کریں گے ہم! اب بھی پورے کریں گے۔ مان لے ہماری بات، سنسار میں عیش ہی عیش کرے گا تو......!'' میں ہنس پڑا اور میں نے کہا۔

''تم بھی دھن کے پکے ہو بھوریا چرن! مگر تم نے یہ کہہ کر میری روح خوش کر دی ہے کہ تو نے مجھ جیسا دین کا متوالا نہیں دیکھا۔ ایمان نہیں چھوڑوں گا بھوریا چرن! کبھی ایمان نہیں چھوڑوں گا۔ عہد ہے ہزاروں بار۔ مارنا چاہتے ہو تو تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ تم کتنے کی موت کہہ رہے ہو، میں کہتا ہوں کہ تم ان سانپوں کو حکم دو جو میرے بدن سے لپٹے ہوئے ہیں کہ یہ مجھے آہستہ آہستہ ڈسیں، اپنا زہر میرے جسم میں اتار دیں۔ میرے جسم میں آگ لگ جائے، پانی بن کر بہہ جاؤں۔ میں خوشی سے تیار ہوں اس کیلئے لیکن مروں گا اپنے ہی دین کا نام لیتے ہوئے۔ سمجھے بھوریا چرن! میں بھی تمہیں ایسا ٹکرایا ہوں کہ تمہیں مزہ آ گیا ہے اور ابھی اور بھی بہت سے مزے آئیں گے۔''

''بیٹا! مزے تو تجھے بھی آئیں گے۔ تو کیا سمجھتا ہے۔ ٹھیک ہے ڈٹا رہ اپنے دھرم پر۔ اس دھرم پر جس کے نام پر تو عبادت بھی نہیں کر سکتا سمجھا۔ تجھ سے بھی تو بہت کچھ چھن گیا ہے۔ اتنا کچھ چھن چکا ہے تجھ سے کہ تو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ تو بھی تو اب لکیر ہی پیٹ رہا ہے۔ بہت شوق ہے نا تجھے لکیر پیٹنے کا تو پیٹتا رہ......''

''بہت بڑی بات ہے بھوریا چرن! میرے لئے یہ بھی بہت ہی بڑی بات ہے کہ لکیر ہی میرے ہاتھ میں ہے۔'' بھوریا چرن نے غصے سے آگے بڑھ کر کئی لاتیں میرے جسم کے مختلف حصوں پر ماریں اور میں قہقہے لگاتا رہا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں لاتیں اور گھونسے مجھے مارتا رہا اور میں پٹتا رہا اور ہنستا رہا۔ پھر وہ خود ہی تھک گیا اور دور ہٹ کر خونخوار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے خوفناک غراہٹیں نکلنے لگی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت تھک گیا ہو......!

''نہیں مرے گا تو، نہیں مرے گا۔ مر گیا تو پھر مزہ ہی کیا آئے گا۔ کیا سمجھا؟ بول مانے گا میری بات......؟''

''کون سی بات بھوریا چرن......؟''

''دیکھ ادھر دیکھ! وہ کون ہے سامنے......!''

''مجھے نظر نہیں آ رہی، کوئی عورت ہے۔''

''سندری ہے یہ سندری! مہاوتی کی نوکرانی پائل ہے۔ سمجھ رہا ہے۔ یاد آ گیا تجھے؟ کیا کہا تھا میں نے پائل کیلئے۔ دیکھ وہ چھری بھی رکھی ہے

برتن بھی! گردن کاٹ اس کی اور اس کا خون پی لے۔ بس اتنا ہی کرنا ہے تجھے، اتنا ہی کرنا ہے۔ اس کے بدن کا سارا خون پی لے، بات بن جائے گی۔''

''ناممکن! تیری ایک بھی ناپاک خواہش پوری نہیں کروں گا بھوریا چرن!''

''حرام خور...... ناشکرے!'' بھوریا چرن نے دانت کچکچا کر ایک لات میرے پیٹ پر رسید کی اور کہا۔ ''اتنا کچھ اگر ہم کسی اور کو دے دیتے تو جیون بھر تلوے چاٹتا ہمارے...... اس چمار شمبھو نے تجھے ناگوں سے باندھ دیا ہے۔ چرنوں کی دھول بھی نہیں ہے تیری وہ۔ اپنے بیروں کو حکم دے تو مہاوتی کے محل کو پھونکوں سے اڑا دیں وہ! ایک ایک کو کچا چبا جائیں مگر تیرا دھرم چلا جائے گا ان سے کوئی کام لے کر۔ یہی بات ہے نا......؟'

''ہاں! یہی بات ہے بھوریا چرن......!''

''تو پھر ہم کیا کریں۔ جا پڑ گھور پاتال میں، تیرا ستیاناس!''

''مجھے ان سے چھٹکارا کیسے ملے گا بھوریا چرن......؟''

''بیروں کو پکار یا مجھ سے وعدہ کر کہ اس پائل کا خون پی لے گا......!''

''نہیں بھوریا چرن! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جیوں گا ہر طرح کے حالات میں جیوں گا۔ ان سے رابطہ کر کے تو میں اپنے ماں، باپ سے بھی مل سکتا تھا جن سے ایک بار ملنے کی آرزو میں، میں جی رہا ہوں مگر ان سے کام لینے کا مطلب ہے کہ میں نے انہیں قبول کر لیا۔ ایسا میں کبھی نہیں کروں گا بھوریا چرن! کبھی نہیں......!'' بھوریا چرن کچھ چونک سا پڑا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ہنسا۔ پہلے آہستہ سے پھر زور سے اور پھر وہ قہقہے لگانے لگا۔ ہنستا ہوا بولا۔

''ارے واہ...... ارے واہ......! یہ ہوئی نا بات، بڑھیا بات! یہ ہوئی نا...... میری اس کھوپڑی میں ہی نہیں آئی تھی۔ تو نے خود بتائی ہے۔ تو نے خود ہی بتائی ہے۔ تیرے ماتا، پتا، بہن، بھائی......! ارے واہ!''

''کیا بک رہا ہے......؟''

''بتاتا ہوں...... بتاتا ہوں۔'' وہ خوشی سے اچھلتا ہوا بولا۔ ''اب تیرے ماتا، پتا ہی تجھے میری بات ماننے پر مجبور کریں گے۔ وہی تجھ سے میرا کام کرائیں گے۔ تو نے خود ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔''

''تو ہے ہی بھنگی بھوریا چرن! میں تو ان کے قدموں کی خاک ہوں۔ میرا ایمان تو بہت کمزور ہے ان کے مقابلے میں تو کیا اور تیری اوقات کیا......! تو ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

''سے بتائے گا بالک......! اب جیون ان کیلئے نرکھ بن جائے گا تیری وجہ سے۔ صرف تیری وجہ سے اور...... اور تجھے بھی دکھائیں گے ہم، اب دوسرا راستہ پکڑیں گے ہم، چلتے ہیں۔ چل ری تو یہاں کیا کرے گی مر کر...... ارے بھاگ جاؤ تم بھی سب! رے کیوں سر پھوڑ رہے ہو اس ترکھی سے، چلو جاؤ، بھاگ جاؤ۔'' اس نے بیروں سے کہا اور وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ آہیں بھرتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ بھوریا چرن نے سندری کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ وہ شاید بے ہوش تھی۔ پھر اس نے میری طرف رخ کر کے تھوکا اور سندری کو کندھے پر لادے آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میرا دل گھبرانے لگا، دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ کیا مجھ سے غلطی ہوگئی، کیا مجھے اس سے اپنے ماں، باپ کا تذکرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ آہ! کیا غلطی ہوگئی...... خدا...... ان کا حامی و ناصر ہو۔ خدا انہیں اپنے تحفظ میں رکھے۔ آنکھوں کی کوروں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ عقب سے کچھ آہیں ابھریں پھر سرگوشیاں......! ''چلا گیا؟''

''ہاں چلا گیا......!''

''آؤ......!''

میں چونک پڑا۔ یہ کون ہو سکتا ہے، سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن وہ دونوں سامنے آ گئے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ شمبھو اور کالی داس تھے۔ دونوں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ پھر شمبھو بیٹھ گیا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اور تو کہتا ہے تو کچھ نہیں ہے۔'' میں نے آنکھیں بھینچ بھینچ کر آنسوؤں سے صاف کیں اور آہستہ سے کہا۔

''ہاں وہ شمبھو۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

''من تو چاہتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر پہلے تیرے سر میں مار کر اسے کچل دیں پھر اپنے سر میں مار کر خود بھی ختم ہو جائیں۔ تیرے بیر بیٹھے ہوئے تھے، ایک اشارہ کرتا انہیں تو وہ تباہی مچا دیتے یہاں، تجھے کھول دیتے۔ تو نے ایسا بھی نہیں کیا۔''

''تو نے دیکھا شمبھو، میں نے ایسا نہیں کیا۔''

''کیوں۔ آخر کیوں؟''

''اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔ نہ تمہارے کالے جادو پر یقین رکھتا ہوں، نہ اس سے کوئی مدد لینا چاہتا ہوں۔ میرے دین میں یہ سب ناپاک ہے، غلیظ ہے۔ مجھے ہمیشہ اپنے خدا پر بھروسہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسان ہوں، کچھ غلطیاں کر بیٹھا ہوں لیکن جب تک زندگی ہے اس سے مدد مانگتا رہوں گا۔ کسی ناپاک قوت کو آواز نہیں دوں گا۔''

''ارے تو پھر تو اس کالے سنسار میں کیسے آ پھنسا؟''

''تجھے یہ سب بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''ضدمت کر، یہ بتانا تیرے لئے فائدہ مند بھی ہوسکتا ہے۔ چھ پورنیاں تیرے چرنوں میں ہیں، یہ سات ہوتی ہیں۔ ساتویں کا پتا ہی بتا دے اور یہ بتا دے کہ اتنا بڑا کام تو نے کیسے کرلیا۔ ابھی جو تجھ سے باتیں کر رہا تھا وہ شنکھا تھا۔ شنکھا بھی انہی کے پاس آتے ہیں جو خود بہت کچھ ہوتے ہیں۔ یہ سب کیا بھاؤ بھید ہیں۔ تو پورنا ہے، تو خود کو مسلمان کیوں کہتا ہے۔ ارے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہمارے، کالی داس ارے کیا کریں ہم.....'' شمبھو نے سر پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہا۔

''آپ کیا ہیں شمبھو جی۔ آپ خود کیا ہیں.....؟''

''ہم کالکے ہیں، سمجھا کالی مائی کے چیلے، سب جانتا ہوگا تو پاپی۔ پھیر کر رہا ہے ہمارے ساتھ۔''

''کالکے کیا ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کالے علم کے آٹھ درجے ہوتے ہیں۔ چار کلکتے والی کے اور چار چنڈولوں کے اور چنڈولے بیس ہوتے ہیں۔ بیس کے بیس مل کر چنڈول بھرتے ہیں، ان کا ویاس گووردھن سے ہے۔ سری کرشن جی نے جب اپنے دشمن راجہ کنس کو قتل کر کے اس کے باپ راجہ اوگرسین کو تخت پر بٹھا دیا تو راجہ کنس کی ارتھی کی راکھ ایک چنڈولی میں بھر دی گئی اور مونگرہ پہنچا دیا۔ مونگرہ میں کنس کی پوجا کرنے والے موجود تھے۔ انہوں نے عقیدت سے وہ راکھ گائے کے گوبر میں ملا کر اس کا ایک بت بنایا اور اس کو بت راجہ سمجھنے گئے۔ پھر ایک دن کنس جی گیا اور اس نے مونگرہ والوں کو جادو سکھایا اور اس سے اپنے دشمنوں پر مٹھ مارنے لگا۔ جادو کے سارے منتر اس کے پاس تھے مگر کلکتے کی کالی نے ان سے چار مندھر کھینچ لئے اور وہ انہیں لے نہ سکے۔ تب سے چار کالی کے اور چار چنڈولوں کے جو اصل میں مونگرہ والے تھے، ان کے چار ہی درجے ہوتے ہیں جن میں آخری درجہ کھنڈولا کا ہوتا ہے۔ کالکوں کے درجے الگ الگ ہوتے ہیں اور ان کا کوئی انت نہیں ہوتا جسے جو مل جائے۔''

''رانی مہاوتی کیا ہے؟''

''وہ درگامتی ہے اور لونا چماری اس کے قبضے میں ہے۔''

''اور تم.....؟''

''میں متھا ہوں۔'' وہ غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

''خدا کی لعنت ہو تم سب پر.....!'' میں نے کہا اور وہ پھر اچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں میں پھر غصے کے تاثرات جاگ اٹھے۔ اس نے دیوانوں کی طرح ناچتے ہوئے کہا۔

''میں نے تجھے یہ سب اس لئے بتایا تھا کہ تو مجھے اپنے بارے میں بتا دے گا' مگر کتے کی دم کی طرح تو ٹیڑھے کا ٹیڑھا رہے گا۔ میں ایک اشارہ کروں تو یہ سارے ناگ تیرے بدن میں زہر ہی زہر بھر دیں، اتنا ڈسیں تجھے کہ..... کہ..... ارے او کالی داس......!''

''جی مہاراج......''

''اندر لے چل اسے۔ ارے اسے اندر لے چل۔ یہ ایسی زبان نہیں سمجھے گا۔ لے چل رے اسے اندر......''

''مہاراج۔ اس کے بندھن نکال دیں۔'' کالی داس نے کہا اور شمبھو نے آگے بڑھ کر سانپ میرے بدن سے کھینچ لئے۔ میری بندشیں کھل گئیں اور کالی داس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ سانپوں نے اس طرح مجھے جکڑا ہوا تھا کہ دوران خون رک گیا تھا اور

بدن کے وہ حصے سُن ہو گئے تھے جہاں بندشیں تھیں۔ کالی داس نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر غار کے اس دہانے کی طرف گھسیٹا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت طاقتور تھا، با آسانی مجھے اندر لے گیا۔ شمبھو پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے اپنی کمزوری پر غصہ آنے لگا مگر پاؤں زمین پر ٹک ہی نہ رہے تھے۔ دہانے کے دوسری طرف ایک تاریک سرنگ تھی جو کافی لمبی لگ رہی تھی۔ میرا دوران خون بحال ہونے لگا تھا تاہم جھنجناہٹ برقرار تھی۔ البتہ میں نے اپنا وزن کالی داس پر ڈالے رکھا تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میں مفلوج ہوں۔ اسے دھوکے میں رکھ کر کچھ کیا جا سکتا تھا مگر یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ لمبی کالی سرنگ کے دوسرے دہانے پر سرخ روشنی نظر آ رہی تھی بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے آگ روشن ہو۔ دوسرا سرا قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر وہ مجھے لئے ہوئے اس سرخ دہانے سے اندر داخل ہو گئے۔ بہت بڑا غار تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑ اندر سے کھوکھلا ہو۔ جگہ جگہ دیواروں میں چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور یہ انہی کی روشنی تھی جو پورے غار کو سرخ کئے ہوئے تھی مگر اس کی تپش بالکل نہیں تھی اس کے برعکس غار میں ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔ پورے غار میں جگہ جگہ نہ جانے کیا کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں انسانی جسم کی ہڈیوں کے انبار بھی تھے۔ لاتعداد انسانی کھوپڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے رنگین کپڑے اور نہ جانے کیا کیا۔ میرے کان ایک آواز سن رہے تھے۔ چپڑ چپڑ کی آواز جیسے کوئی بڑا جانور کچھ کھا رہا ہو۔

''چھوڑ دے اس پاپی کو یہاں...... مہاوتی جانے اور یہ......'' شمبھو نے کالی داس سے کہا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں بے جان شہتیر کی طرح نیچے گر پڑا۔ اب بھی میں مفلوج ہونے کا اظہار کر رہا تھا۔

''اب کیا کریں مہاراج......؟''

''پڑا رہنے دے اسے یہاں۔''

''جو آ گیا......'' کالی داس نے کہا۔

''آ جا......!'' شمبھو بولا اور وہ دونوں غار سے باہر نکل گئے۔ میں اسی طرح زمین پر پڑا رہا۔ میری نگاہیں پورے غار کا جائزہ لے رہی تھیں اور دل لرز رہا تھا۔ کیا ہولناک جگہ تھی۔ غار کی بلندی ناقابل یقین تھی، اس کی چھت تو نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ ابھرے ہوئے چٹانی پتھروں میں موٹے موٹے تاروں والے مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے البتہ مکڑیاں نظر نہیں آئی تھیں اور پھر وہ آواز، چپڑ چپڑ کی آواز...... یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ کیسی بھیانک آواز ہے نہ جانے۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو اور اس کے بعد زمین میں ابھرے ایک کوہان کے عقب سے ایک ہولناک چیز باہر نکلی۔ آہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ چٹانی کوہان کے پیچھے سے ایک سیاہ انسانی جسم برآمد ہو رہا تھا۔ ایک تنومند انسانی جسم جو کسی عورت کا تھا۔ اس کا عقبی حصہ نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کسی شے کو گھسیٹ رہی ہو۔ پھر سیاہ جسم کوہان کے عقب سے مکمل طور پر باہر نکل آیا اور وہ ہولناک منظر میری آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو گیا جسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بند ہو جائیں۔ سیاہ رنگ کی تنومند عورت جس چیز کو گھسیٹ کر پیچھے ہٹ رہی تھی وہ بھی ایک نسوانی بدن تھا۔ خون میں نہایا ہوا، بے جان...... خونخوار عورت کے لمبے سیاہ بالوں سے دوسرے جسم کا کچھ حصہ ڈھکا ہوا تھا، خود اس کا چہرہ بھی اس کے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بلی کی طرح دونوں ہاتھوں پیروں کے بل پیچھے کھسک رہی تھی اور یقینی طور پر دوسرے مردہ جسم کو دانتوں میں دبوچے ہوئے تھی۔ میں سانس روکے اسے دیکھتا رہا۔ سیاہ رنگ کی ہولناک بلا نے اپنے کام سے فارغ ہو کر رخ بدلا اور پھر انسانوں کی طرح بالوں کو زور سے پیچھے جھٹک کر انہیں ہاتھوں سے سنوارنے لگی۔ بالوں کے پیچھے ہٹ جانے سے اس کا چہرہ نمایاں ہو گیا۔

کیا بھیانک چہرہ تھا۔ مکمل طور پر انسانی نقوش اور شاید جانے پہچانے۔ بس رنگ کا فرق تھا ورنہ وہ سو فیصدی مہاوتی تھی۔ رانی مہاوتی...... سیاہ چہرے پر جگہ جگہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں...... اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی سفیدی نمایاں تھی۔ کالی پتلیوں کی جگہ ایک سیدھی سبز روشن لکیر نظر آ رہی تھی۔ تیز سبز روشن لکیر...... ہونٹ گہرے سرخ ہو رہے تھے۔ مجھ پر شاید اس کی نظر نہیں پڑی تھی چنانچہ وہ پھر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھک کر منہ سے اس انسانی بدن کو ٹٹولنے لگی۔

وہ اسے جگہ جگہ سے سونگھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک غراہٹ جیسی آواز نکالی اور مردہ جسم کے سینے میں دانت گاڑھ دیئے۔ وہ ہاتھوں پر وزن سنبھال کر شاید لاش کا سینہ کھول رہی تھی اور اس پر دانتوں سے قوت صرف کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے خوفناک غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ پھر شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی البتہ اس کوشش میں لاش کا چہرہ میری طرف ہو گیا، گردن شاید پہلے چبالی گئی تھی مگر چہرہ محفوظ تھا اور گردن کے ساتھ لگے ہوئے کھال کے کسی ٹکڑے سے جھول رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور بے اختیار میرے حلق سے چیخ آزاد ہو گئی۔ وہ رجناوتی تھی۔ وہی معصوم لڑکی جو املی کے درخت پر چھپی ہوئی تھی اور بھوک سے بے تاب ہو کر کھڑکی کے راستے اندر آئی تھی۔ اسے زندگی کا خطرہ تھا۔ آہ اسے اپنی جان کا خوف تھا اور وہی ہوا۔ اس نے کچھ اس طرح کے الفاظ کہے تھے۔ میری آواز پر لاش سے لپٹی ہوئی مہاوتی نے گردن اٹھا کر سیدھی پتلیوں سے مجھے گھورا۔ اس کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا پھر اس نے ہونٹ سکیڑ کر دانت نکالے۔ خون میں ڈوبے ہوئے نوکیلے دانت۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

✦✤✦✤✦

پھر دوبارہ جھک کر لاش کے کھلے ہوئے سینے میں سر ڈال دیا۔ دانتوں سے اس نے رجناوتی کے اندرونی جسم میں کسی چیز کو جھٹکا دیا اور اس کا کلیجہ دیگر لوازمات کے ساتھ باہر نکال لیا۔ میں نے جنون کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا، ایک انسانی پاؤں کی سوکھی ہوئی ہڈی مجھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور گھما کر پوری قوت سے مہاوتی پر دے مارا۔ نشانہ درست نہ رہا، ہڈی اس کے سر سے گزر گئی مگر مہاوتی نے جلدی سے کلیجہ دانتوں میں دبا کر ایک لمبی چھلانگ لگائی اور ایک چٹان سے دوسری پر، دوسری سے تیسری پر اور پھر کافی اوپر ایک دیوار میں نکلی ہوئی چٹان پر جا بیٹھی۔ یہ چھلانگیں نپی تلی اور مہارت سے بھرپور تھیں۔ وہ اس وقت بالکل کالی بلی لگ رہی تھی۔ انسان کا اس سے خوفناک روپ کبھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا جو میں دیکھ رہا تھا...... وہاں پہنچ کر وہ پھر جھک کر بیٹھ گئی اور منہ میں لٹکا ہوا کلیجہ اسی طرح چپڑ چپڑ چبانے لگی۔

”مہاوتی، کتیا...... تو نے...... تو نے رجناوتی کو مار دیا۔ تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا تجھے۔“ میری آواز پر اس نے چونک کر مجھے پھر دیکھا اور اس کے بعد پھر جھک کر کلیجہ چبانے لگی۔ میں بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میں نے دور پڑی ہڈی اٹھالی۔ اس نے رجناوتی کا کلیجہ ہضم کر لیا تھا۔ میرے ہڈی اٹھانے پر وہ سنبھلی اور اس نے ایک اور چٹان پر چھلانگ لگا دی۔ بالکل بلیوں جیسا انداز تھا۔ میں نے اس چٹان پر یہ ہڈی پھینکی تو وہ نیچے کود آئی۔ مگر وہ مجھ پر حملہ نہیں کر رہی تھی۔ بس رک رک کر غرا رہی تھی، دانت نکال رہی تھی۔ میں اب مسلسل اس پر ہڈیاں پھینکنے لگا اور وہ ادھر سے ادھر بھاگتی رہی۔ پھر ایک بار اس نے بڑی زور سے چیخ ماری اور دروازے سے کالی داس اور شمبھو اندر داخل ہو گئے۔

”ارے۔ ارے یہ کیا کر رہا ہے تو......“ شمبھو نے کہا۔ اور اس بار میں نے ہڈی اس پر دے ماری۔ وہ میرے اس وار کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہڈی اس کے سر پر لگی اور وہ چکرا گیا۔ دوسرے لمحے وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کالی داس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”تیری موت آ گئی ہے پاپی۔ یہ تو نے کیا کیا۔“ میں نے دوسری ہڈی اٹھا کر کالی داس کو نشانہ بنایا اور وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔ ہڈی اس پر سے نکل گئی تھی مگر اس وقت ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ مہاوتی مجھ پر آ پڑی۔ وہ زبردست تن و توش کی مالک تھی اس لئے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میرا سر زمین پر لگا اور آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ گئے۔ مہاوتی خوفناک غراہٹوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ دوسری بار میرے سر میں پھر چوٹ لگی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے بعد کوئی ہوش نہ رہا تھا...... دوبارہ ہوش آیا تو ماحول بدلا ہوا تھا۔ یقیناً محل ہی کا کوئی کمرہ تھا، نرم بستر، شفاف ماحول۔ دو لڑکیاں سامنے موجود تھیں۔

”جاگ گئے مہاراج......“ ایک نے دوسری سے کہا۔ میں وحشت زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”کون ہو تم......؟“

''ہمارا نام شیلا ہے...... یہ روپا ہے۔''
''یہاں کیا کر رہی ہو......؟''
''سیوا کے لئے ہیں۔ ناشتہ لگائیں؟''
''یہ کون سی جگہ ہے؟''
''راج محل......!''
''مہاوتی کہاں ہے؟'' میں نے کہا اور وہ دونوں چونک پڑیں۔ انہوں نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک بولی۔ ''رانی جی نواس میں ہیں۔''
''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''آپ کا سندیس انہیں دے دیں گے مہاراج مگر یہاں کوئی ان کا نام ایسے نہیں لیتا۔ ناشتہ لگا دیں آپ کے لئے۔''
''نہیں۔ تم فوراً باہر نکل جاؤ۔'' میں غرا کر بولا اور ان دونوں کے چہرے کی شگفتگی کافور ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ میں خونی نظروں سے پورے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ سر کے بائیں حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یہیں وہ چوٹ لگی تھی جس نے مجھے بے حواس کر دیا تھا۔ ہاتھ وہاں پہنچ گیا۔ گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ اسے سہلاتا رہا۔ پھر نیچے اتر کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔
''دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو۔'' میں چیخ چیخ کر اسے پیٹنے لگا۔ کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ میں جنونی انداز میں دروازہ پیٹتا رہا اور پھر جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو کمرے میں موجود ہر شے تباہ و برباد کرنے لگا۔ کیوپڈ کا سنگی مجسمہ میں نے چور چور کر دیا۔ چھت میں لٹکے ہوئے قیمتی فانوس کو نیچے گرا کر کچل دیا۔ دیواریں کھرچ کر پھینک دیں۔ کمرے کا حلیہ پوری طرح بگاڑ دیا لیکن کہیں سے کوئی آواز نہیں ابھری تھی۔ بہت دیر تک یہ کوشش کرتا رہا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ خاموشی سے ایک طرف جا بیٹھا۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ سخت پریشانی کا شکار تھا۔ بہت دیر گزر گئی، سر کی دکھن بے چین کر رہی تھی مگر کیا کرتا مجبوری تھی۔ اچانک بالکل ویسی ہی ''شی شی'' کی آواز سنائی دی جیسی ایک بار محل کے باغ میں پتھر کے مجسمے کے منہ سے نکلی تھی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہاں تو کوئی مجسمہ بھی نہیں تھا۔ کوئی کھڑکی یا روشن دان بھی نہیں تھا۔ پھر یہ آواز...... آواز دوبارہ سنائی دی اور میری نظر زمین پر پڑی۔ یہاں تباہی پھیلاتے ہوئے میں نے دیوار سے چند روغنی تصاویر بھی اتار پھینکی تھیں۔ انہیں پیروں سے روندا تھا۔ یہ ''شی شی'' کی آواز ایک تصویر سے ابھری تھی۔ ایک جٹا دھاری سادھو کی تصویر تھی جو پالتی مارے آسن جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں ایک درخت پھیلا ہوا تھا۔ پیچھے جنگل تھا۔ نزدیک پیٹھے کے پھل سے بنا ہوا کنڈل رکھا تھا۔ یہ تصویر بھی میری کارستانی کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی ایک آنکھ پھٹ گئی تھی مگر باقی چہرہ بچا ہوا تھا۔
''ادھر آ...... میرے پاس آ......'' تصویر کی آواز پھر ابھری اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے تصویر کو دیکھا، اس کی اکلوتی آنکھ جھپک رہی تھی اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ ''نکلنا چاہتا ہے یہاں سے؟''
''ہاں......!'' میری سرگوشی ابھری۔ اس قدر حیرتوں سے گزرا تھا کہ اب کسی ناممکن پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔
''وہ دیکھ ادھر دیوار میں۔ ایک کڑا لٹکا ہوا ہے۔'' میں نے اس کے اشارے پر ادھر دیکھا۔ یہاں پہلے کیوپڈ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا مگر اب وہ چور چور ہو کر نیچے پڑا ہوا تھا۔
''دیکھا......''
''ہاں۔''
''وہ تیری مشکل کا حل ہے۔''
''کیسے؟''

''اسے زور سے کھینچ۔ تجھے راستہ مل جائے گا۔'' سادھو کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔
''کہاں پہنچوں گا میں؟'' میں نے سوال کیا مگر سادھو کی آنکھ بند ہو گئی تھی۔
''کہاں پہنچوں گا میں۔'' میں غرایا مگر جواب نہ ملا۔ تصویر بے جان ہو گئی تھی۔

''بول میں کہاں پہنچوں گا۔'' میں نے گرج کر کہا۔ تصویر اٹھائی اور اسے چندھیاں چندھیاں کر ڈالا۔ اس وقت مجھے ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ چندھیاں پھینک کر میں پھر اپنی جگہ جا بیٹھا۔ کڑا میرے سامنے ہی تھا، میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر دماغ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ واقعی اس کڑے کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ یہاں کیوں ہے۔ دیکھو اسے کھینچ کر۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ دیوار کے پاس جا کر میں نے کڑے میں انگلیاں پھنسائیں اور اسے زور سے کھینچا۔ کڑے کے ساتھ ایک چوکور سل کھنچی چلی آئی۔ حالانکہ پہلے دیوار میں کوئی نشان نہیں نظر آیا تھا۔ چوکور سل کے پیچھے تاریک خلا تھا۔ عجیب سا دروازہ تھا۔ نہ جانے دوسری طرف کیا ہے۔ کڑا چھوڑا تو سل اپنی جگہ جا لگی اور دروازہ بند ہو گیا۔ عجیب میکنزم تھا۔ دوسری بار میں اس سے اندر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ کڑا کھینچ کر سل کو ہٹایا۔ اپنے شانے سے اسے روکا اور بدن سکوڑ کر اس کے پیچھے پہنچ گیا۔

دوسری طرف بہت کشادہ جگہ تھی لیکن میرے اندر داخل ہوتے ہی دیوار کا خلاء بند ہو گیا اور اندر گھور تاریکی چھا گئی۔ آگے جانے کا راستہ تھا اس لئے میں نے بغیر کسی وسوسے کے آگے قدم بڑھا دیئے۔ یہاں کسے پروا تھی۔ اگلا قدم اگر تحت الثریٰ میں لے جائے تو لے جائے، موت کی کسے پروا تھی۔ چنانچہ میں آگے بڑھتا رہا۔ کوئی تین سو قدم چلنے کے بعد راستہ رکا لیکن دایاں ہاتھ جگہ بتا رہا تھا چنانچہ میں ٹٹول کر اس طرف بڑھ گیا۔ یہاں بھی اتنا ہی چلنا پڑا تھا یہاں تک کہ یہ راستہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے دونوں سمت ہاتھ پھیلائے مگر ہاتھ دیواروں سے جا لگے۔ اس کا مطلب ہے کہ آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب کیا کروں۔ بند دیوار پر ہاتھ پھیرنے لگا کوئی چار فٹ کی بلندی پر اچانک ہاتھ رک گیا۔ بالکل ویسا ہی کڑا محسوس ہوا تھا۔ جلدی سے اسے پکڑ کر اس پر زور لگایا تو تیز روشنی ہو گئی۔ ساتھ ہی ویسا ہی خلاء نمودار ہو گیا۔ دل کے ساتھ دوسری طرف نکل آیا۔ دوسری طرف آتے ہی دیوار پھر برابر ہو گئی تھی مگر جس جگہ پہنچا تھا وہ سرخ پتھروں کی دیواروں سے بنا ہوا ایک وسیع کمرہ تھا جس میں ایک چھوٹا سا مضبوط دروازہ لگا ہوا تھا۔ چھت کے قریب روشن دان تھے، ایک روشن دان ذرا نیچا تھا اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ باہر جانے کا کون سا راستہ تھا۔ دفعتاً مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''کون ہے، کیا کوئی ہے؟'' ساتھ ہی روشن دان کے پاس دیوار بجانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے بسی سے ادھر دیکھا۔ دیوار سپاٹ تھی اور کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جس سے چڑھ کر روشن دان کے دوسری طرف جھانکا جا سکے۔ میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ آواز پھر ابھری۔ ''کوئی ہے، کوئی ادھر ہے تو مجھ سے بات کرو بھائی......''

''ہاں...... میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کون ہو۔ کون ہو بھائی۔ میری مدد کرو۔ مجھے یہاں سے نکال دو، تمہاری مہربانی ہوگی۔'' میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنی ہوئی آواز تھی پھر ذہن جاگ گیا۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ چندر بھان، مہاوتی کا شوہر چندر بھان...... اور سرخ پتھروں کی عمارت...... وہ عمارت جہاں میں باغ کی سیر کرتا نکل آیا تھا اور مجھے راجہ چندر بھان ملا تھا...... آہ...... تو یہ ہے میرے باہر نکلنے کا راستہ۔ گویا اس تصویر والے سادھو نے بھی دھوکا دیا تھا۔ کیوں نہ دیتا سادھو جو تھا......!''

''بولو بھائی۔ مدد کرو گے میری؟''

''تم راجہ چندر بھان ہو؟''

''ہاں۔ تمہارا مہاراج۔ میری مدد کرو...... اتنا انعام دوں گا تمہیں کہ کئی پشتیں آرام سے رہیں گی!''

''راجہ چندر بھان۔ میں خود یہاں قیدی ہوں۔''

''قیدی؟''

"ہاں...... یہ ایک بڑا سا کمرہ ہے اس میں ایک دروازہ اور کچھ روشن دان ہیں۔"

"اوہ۔" چندر بھان کے لہجے میں بھی مایوسی پیدا ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ "تمہاری کمر میں زنجیر بندھی ہے؟"

"نہیں۔"

"پیروں میں؟"

"نہیں میں آزاد ہوں۔"

"ارے بھائی تو دروازہ کھول کر دیکھو۔ دیکھو کھلا تو نہیں ہے۔" چندر بھان نے کہا اور میں چونک پڑا۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھول کر دیکھا' مگر وہ باہر سے بند تھا۔ چندر بھان نے پوچھا۔ "کیا ہوا...... پتہ چلا؟"

"بند ہے۔" میں نے کہا۔ چندر بھان مایوس ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کئی آوازیں دیں لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ بعد میں، میں نے دیوار کے اس حصے پر بھی ہزاروں کوششیں کر لیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے چندر بھان کو پھر پکارا۔ "ہاں۔ میں بیٹھا ہوں۔"

"تم مہاوتی کے شوہر ہو چندر بھان؟"

"شوہر......؟" اس نے کہا۔ پھر بولا۔ "کیا تم مسلمان ہو؟"

"ہاں۔ تم نے شاید لفظ شوہر سے اندازہ لگایا ہے۔"

"ایسا ہی ہے مگر...... تم...... تم...... اس نے...... کسی مسلمان کو۔ تم اس کے پھیر میں کیسے آ پھنسے بھائی۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"مسعود۔"

"کیا ہوس کے جال میں آ پھنسے تھے......؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا ہوا تھا۔ مہاوتی بری آتما ہے۔ چنڈولنی ہے وہ۔ کالی کی داسی ہے۔ جیسا من چاہے بن جاتی ہے۔ ایسی کہ انسان اسے دیکھے تو سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ جسے وہ اپنی سندرتا کے جال میں پھانسنا چاہے اس کا بچنا مشکل ہو جائے۔ کیا تم اس کے جال میں پھنس کر اس حال کو پہنچے ہو؟"

"نہیں چندر بھان۔ ایسا نہیں ہوا۔ میں تقدیر کے جال میں پھنس کر یہاں پہنچا ہوں۔"

"ہاں کھیل تو سارے بھاگ کے ہوتے ہیں، کہانیاں مختلف ہوتی ہیں۔" چندر بھان افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

"تمہارے بدن پر زنجیریں کیوں باندھ دی گئی ہیں چندر بھان؟ جب کہ تم ویسے بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے؟" میں نے سوال کیا اور دوسری طرف سے چند لمحات جواب نہ ملا پھر اس نے کہا۔

"کیونکہ وہ مجھے جانتی ہے۔ اسے میری قوتوں کا پتا ہے۔ اس نے مجھے یہاں رکھ کر جو تکلیفیں دی ہیں اس کے خیال میں میری طاقت اس طرح ختم ہو جائے گی مگر کتنی۔ آخر کتنی۔ چندنا پھر بھی چندنا رہے گا۔"

"چندنا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بھنڈا، گوری۔ آس پاس ہی نہیں دور دور تک تم چندنا کا نام پوچھ سکتے ہو۔"

"مگر چندنا کون ہے؟"

"راجہ چندر بھان۔ میرے سورگباشی پتا مہاراجہ سورج بھان راجہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ پہلوانی ان کا شوق تھا مگر ان کا یہ شوق میری ماتا رانی سچندا کو پسند نہیں تھا۔ یہ شوق پتاجی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور میں نے کھل کر پہلوانی نہیں کی مگر چندنا کے نام سے بڑے بڑے پہلوان پچھاڑتا رہا۔ ماتا جی مر گئیں، پتاجی سورگباش ہو گئے۔

میری شادی راج کماری روپ کلی سے ہوگئی مگر چندنا، چندنا رہا۔ لوگ بھی یہ نہ جان پائے کہ چندر بھان ہی چندنا پہلوان ہے۔ مگر وہ جانتی تھی۔''

''کون؟''

''مہاوتی۔ پاپن چنڈولنی......''

''وہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''اور روپ کلی؟''

''روپ کلی......!'' چندر بھان کے حلق سے سسکی سی نکلی۔ پھر اس کی آواز نہیں سنائی دی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اسے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں خاموش ہوگیا اور اس کے بارے میں غور کرنے لگا۔

''نہ جانے کیا وقت ہوا تھا۔ جب میں نے دروازے پر آہٹیں سنیں اور چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا اور مجھے وہی منحوس شکل والا نظر آیا جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وحشی اور نیم پاگل۔ اس نے ایک بڑا سا تھال اندر کھسکا دیا۔ تھال میں پھلوں کے انبار تھے۔ کیلے، ناشپاتیاں، سیب، انگور اور بہت سے کچے ناریل جو پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ تھال کھسکاتے ہی اس نے دروازہ پھرتی سے بند کر دیا تھا۔ یہ میرے لئے خوراک تھی اور جتنی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید کئی دن کے لئے ہے۔ ناریل پانی کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ مہاوتی مجھے یہاں مستقل قید رکھنا چاہتی ہے۔ بھوک دیوانہ کئے دے رہی تھی۔ دو ناشپاتیاں، چار کیلے کھائے اور ایک ناریل کا پانی پیا۔ بدن پر کھولت طاری ہوگئی۔ زمین پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر نہ جانے کب آنکھ کھلی تھی۔ گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ غالباً رات کا کوئی پہر تھا۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ صبر و سکون سے پھر آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ اس وقت جاگا جب سورج کی کرنیں چمکتے دن کا پتا دے رہی تھیں۔ دوران خون جاری رکھنے کے لئے اپنے اس قید خانے کے بہت سے چکر لگائے۔ ابھی چکر لگا ہی رہا تھا کہ روشن دان کے دوسری طرف سے دیوار بجنے کی آواز سنائی دی۔

''جاگ گئے؟'' دوسری طرف سے چندر بھان کی آواز آئی۔

''ہاں۔''

''میں کئی بار دیوار بجا چکا ہوں۔''

''ہاں میں سو رہا تھا۔''

''کچھ کھایا؟''

''ہاں۔ وہ پھل رکھ گیا تھا۔''

''کون مچھنڈا؟ وہی بڑے بالوں والا؟'' چندر بھان نے پوچھا۔

''ہاں، وہی مگر......؟''

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''دوسری ضروریات کے لئے کیا ہوتا ہے چندر بھان؟''

''جنگل پانی کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''کچھ کریں گے۔ مجھے تو دس آدمی جنگل پانی کے لئے دن میں ایک بار لے جاتے ہیں۔ اگر تمہارے پاس وہ نہ آئیں تو سمجھو تمہیں سزا دے رہے ہیں۔ یہ سزا مجھے تین مہینوں کی قید میں ملی تھی۔''

''پھر تم نے کیا کیا تھا؟''

''وہی جو ایک مجبور انسان کر سکتا ہے......!'' اس نے جواب دیا اور میں ایک پریشان کن کیفیت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ معمولی سی لیکن کتنی مشکل بات تھی۔

''مسعود۔ یہی نام بتایا تھا تم نے۔''

''ہاں۔''

''مجھ سے باتیں کرو بھائی۔ بڑا دل چاہتا ہے کسی سے باتیں کرنے کو......''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔''

''تم نے اپنی پتا مجھے نہیں سنائی۔''

''میری کوئی پتا نہیں ہے۔ ایک مسلمان شخص کے ہاں ملازم ہوں، یہاں بنارسی کپڑے لے کر آیا تھا۔ رانی مہاوتی نے پہلے مجھے مہمان رکھا، پھر قید کر دیا۔''

''کیا تم ایک خوبصورت مرد ہو۔ نوجوان ہو۔ تم نے اس کا کوئی حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کچھ تو ہوگا، کیا تم نے ہمارے باغ کی سیر کی؟''

''ہاں۔''

''تم نے وہاں مجسمے دیکھے ہوں گے۔''

''ہاں۔'' میں نے دم روک کر کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ بت ہیں؟''

''پھر......؟''

''نہیں مسعود۔ وہ سب انسان ہیں۔ سارے کے سارے انسان ہیں۔ انہیں کسی سنگ تراش نے نہیں بنایا بلکہ وہ مہاوتی کے عتاب کا شکار ہیں۔ جیتے جاگتے، ہٹ دھرمی کی حکم عدولی کی سزا کاٹ رہے ہیں۔

''اوہ......تو وہ سب......؟''

''ہاں اور بھی نہ جانے کیا کیا ہے۔ وہ چڑیل ہے، ڈائن ہے، انسانی خون پیتی ہے، انسانی گوشت کھاتی ہے، نئے نئے منتر اور جاپ کرتی رہتی ہے۔ کالی شکتی حاصل کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ تم نے کالی داس کو دیکھا ہوگا۔''

''دیوان کالی داس؟''

''دیوان۔ آہ تمہیں یہی بتایا گیا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''دیوان کالی داس میرا دوست تھا۔ بچپن کا وفادار دوست۔ اس نے میری منتیں کیں، مجھے بہت سمجھایا مگر میں نے نہ مانی اور اس نے میرے لئے...... میرے لئے جان دے دی۔ مر گیا وہ میرے ہاتھوں۔ میرا دوست میرے ہاتھوں مر گیا۔'' چندر بھان کی آواز رندھ گئی۔

''تو پھر یہ کالی داس؟''

''یہ مہاوتی کا بیر ہے جو دیوان کالی داس کے شریر میں رہتا ہے اور مہاوتی......مہاوتی......!''

''چندر بھان تم مجھے اپنی پوری کہانی نہیں سناؤ گے؟'' میں نے کہا۔

''پوری کہانی۔ ہاں جی چاہتا ہے وہ کہانی دہرانے کو۔ اپنے پاپ سنانے کو جی چاہتا ہے۔ مہاراجہ سورج بھان زندہ تھے۔ مہارانی سپندا جیتی تھیں۔ میں اکیلا راج کمار تھا۔ ماتا پتا کی آنکھ کا تارا۔ ریاست انہی کے دور میں ختم ہوگئی مگر ہمارے پاس بہت کچھ تھا۔ ہم بھٹنڈا حویلی میں آ گئے۔ میں یہاں بھی خوش تھا۔ عیش کرتا تھا۔ پہلوانی کرتا تھا۔ ماتا پتا نے روپ کلی کو

دیکھا۔ کلی ہی کا روپ تھا۔ مجھے دکھایا اور میں نے شادی کی ہامی بھر لی۔ میرا بیاہ ہو گیا۔ ہم دونوں عیش سے زندگی گزارنے لگے۔ روپ کلی پتی ورتا تھی، وفادار تھی، مجھ پر جان دیتی تھی۔ میری پہلوانی کے شوق کو اس نے میری وجہ سے ماتا جی سے چھپائے رکھا۔ بھگوان نے ہمیں پانچ سال تک اولاد نہ دی۔ اسے پروا تھی، مجھے نہ تھی۔ ایک بار میں بہت بڑی کشتی مار کر کالی داس کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ دوپہر کا سمے تھا۔ ٹھیک ٹھیک دوپہری تھی۔ دھوپ ایسی کہ چیل انڈہ چھوڑ دے۔ گھوڑے پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بیچ میں پیپل کا ایک بہت بڑا درخت پڑتا تھا۔ آس پاس بھی بہت سے درخت تھے۔ میرا من مچل اٹھا میں نے کالی داس سے کہا کہ وہاں رکیں گے۔ کالی داس بولا۔ ''یہاں رکنا خطرناک ہے چندر مہاراج۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ سانسا کنڈل ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں بھوت پریت کا راج ہے۔ سر کٹے اور چڑیلیں رہتی ہیں۔'' میں ہنسنے لگا۔ سانسا کنڈل کے بارے میں، میں نے بھی کہانیاں سنی تھیں مگر ہمیشہ اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اس وقت بھی میں نے ہنس کر کالی داس کا مذاق اڑایا اور اس بڑے پیپل کے درخت کے نیچے گھوڑا روک دیا۔ یہاں بڑی ٹھنڈک تھی، ہوا بالکل ٹھنڈی اور مست کر دینے والی تھی۔ گھوڑوں نے بھی گردنیں ڈال دیں۔ کالی داس بھی خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں آرام کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''کالی داس بھوت پریت کہاں ہیں؟'' اس نے خوفزدہ ہو کر کہا کہ اس دوپہر میں ان چیزوں کا نام بھی نہیں لیتے۔ بہت دیر گزر گئی۔ اچانک میں نے چھن چھن کی آواز سنی۔ کالی داس کی تو گھگھی بندھ گئی۔ دہشت سے بولا۔

''چندر مہاراج آ گئی۔''

''کون......؟'' میں نے پوچھا مگر اس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ رنگین کپڑوں میں ملبوس ایک سندری تھی۔ پیروں میں پہنے ہوئے جھانجھن چھن چھن بج رہے تھے، دھوپ سے چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ آگ جیسی نظر آ رہی تھی۔ کالی داس نے آہستہ سے کہا کہ اس کے پاؤں تو سیدھے ہیں۔ چڑیل تو نہیں لگتی۔ سندری نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ پیپل کے درخت کے پیچھے دوسرے حصے میں وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی کے پلو سے پنکھا کرنے لگی۔ ہم دونوں سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ پسینہ سکھاتی رہی پھر چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنے لگی۔ کسی دور کے درخت پر کوئل کوکی تو وہ بھی کوک اٹھی۔ دونوں میں مقابلہ ہو رہا تھا اور وہ کوئل کی بولی بول بول کر ہنس رہی تھی۔ میرا من اسے دیکھ کر ڈول گیا۔ بڑی سندر لگ رہی تھی وہ۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''کوئل کالی میٹھے بول والی، بول میرا پیا کہاں؟''

اور میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ گھبرا گئی، ڈر گئی۔ اس نے سہمی سہمی کالی آنکھوں سے مجھے دیکھا مگر ان آنکھوں میں خوف کے ساتھ پسند بھی تھی۔ اسی وقت دور سے ہمیں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ ایک دیہاتی ہمارے دونوں گھوڑوں کی لگامیں پکڑے ادھر آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے کہا۔ ''مہاراج یہ گھوڑے آپ کے ہیں؟''

''ہاں۔ یہ کہاں سے پکڑے تم نے؟''

''ادھر ہماری کٹیا ہے۔ یہ چرتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی مسافر ہیں جو پیپل کے درختوں تلے سو گئے ہیں۔ سو ادھر آ گیا۔ پھر اس نے لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ارے مہاوتی تو پھر دوپہری میں نکل بھاگی۔'' اور وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔

گھوڑے والا بولا۔ ''سنبھالو مہاراج اپنے گھوڑے اور تو چل چنڈولنی کہیں کی۔'' وہ اسے ساتھ لے گیا مگر میں شکار ہو گیا تھا اور اس کے بعد میں چھپ چھپ کر شمبھو کے پاس آنے لگا۔

''شمبھو۔'' میرے منہ سے نکل گیا مگر چندر بھان نے پھر میری بات کا جواب نہیں دیا اور بولا۔ ''مہاوتی مجھ سے بے تکلف ہو گئی اور میں زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنے لگا۔ میری ماتا کا دیہانت ہو گیا۔ کوئی سال بھر بعد پتا جی بھی مر گئے۔

روپ کلی اب مجھے بری لگنے لگی تھی مگر نبھا رہا تھا اسے۔ شمبھو سے میں نے کہا کہ مہاوتی کے مجھ سے پھیرے کرا دے۔ وہ بولا کہ مہاراج وہ آپ کی ہے جب چاہیں اسے لے جائیں۔ ہم چنڈولے ہیں، ہمارے ہاں پھیرے نہیں ہوتے۔ اس سے میں چنڈولوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ روپ کلی سے میں لڑنے جھگڑنے لگا پھر ایک دن میں مہاوتی کو اپنے گھر لے آیا۔ روپ کلی اور دوسروں کو میں نے بتایا کہ وہ میری دوسری پتنی ہے۔ روپ کلی روئی پیٹی مگر بے بس تھی۔ آہستہ آہستہ محل پر مہاوتی کا راج ہونے لگا۔ کالی داس ہمیشہ روپ کلی کا پاٹ لیتا تھا، کئی بار میں نے اسے ڈانٹا تھا مگر وہ کہتا تھا کہ ایک دن مہاوتی مجھ پر مصیبت لائے گی۔ مجھے بہت برا لگتا تھا مگر دوستی کی خاطر خاموش ہو جاتا تھا۔ پھر محل میں کچھ انوکھے واقعے ہونے لگے۔ مہینے، دو مہینے میں ایک آدھ داسی ختم ہو جاتی تھی اور وہ بھی عجیب طریقے سے۔ اس کا بدن کسی جانور کا کھایا ہوا ملتا تھا۔ بڑی پریشانی ہوگئی۔ بہت سی داسیاں ماری گئیں۔ ایک دن اکیلے میں کالی داس نے ایک سادھو کو میرے سامنے پیش کیا اور کہا۔ ”یہ دھنی رام جوگی ہیں۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”پچھلے دنوں یہ میرے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔“

”کیا کام کرتے رہے ہیں؟“

”مہاوتی کے بارے میں معلومات......؟“ کالی داس نے کہا۔

میں نے غصے سے کالی داس کو دیکھا اور وہ جلدی سے دھنی رام جوگی سے بولا۔ ”بتاؤ دھنی رام جی۔“

”تیرے محل میں چنڈولنی آ بسی ہے چندر بھان۔ یہ جادوگرنیاں ہوتی ہیں جو خون پیتی ہیں، ماس کھاتی ہیں اور اپنے جاپ پورے کرتی ہیں۔ جاپ پورے کرنے کے لئے انہیں عورتوں کا بلیدان دینا پڑتا ہے، ہوسکتا ہے وہ چنڈولنی تیری دوسری دھرم پتنی ہی ہو۔“

”تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ جوگی مہاراج۔ ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ سمجھے۔“ میں نے دھکے دے کر جوگی مہاراج کو نکال دیا اور کالی داس سے کہا۔ ”کالی داس تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ تم نے مہاوتی سے جو بیر باندھا ہے وہ نہ تمہارے کام آئے گا، نہ روپ کلی کے۔ اس کے بعد مہاوتی کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ کالی داس خاموش ہو گیا۔ بہت دن گزر گئے۔ پھر ایک دن مہاوتی نے مجھ سے کہا۔

”تمہارا نمک کھاتی ہوں چندر بھان، تمہارے اچھے برے کا خیال رکھنا میرا دھرم ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”کیا بات ہے مہاوتی؟“

”تمہارا دیوان تمہارا وفادار نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”اور نہ تمہاری دھرم پتنی روپ کلی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس سے زیادہ کچھ اور سننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی میں نے۔ میں غصے سے بے قابو ہو گیا۔ سیدھا روپ کلی کے پاس پہنچا اور اس سے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ روپ کلی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتی رہی اور پھر گردن جھکا کر خاموش ہو گئی۔ پھر دوسری صبح مجھے داسیوں نے آ کر بتایا کہ روپ کلی زہر کھا کر مر گئی۔

”مر گئی۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں...... عزت والی تھی۔ اپنے اوپر گندے الزام برداشت نہ کر سکی۔ زہر کھا لیا اس نے۔ اس کی ارتھی اٹھی تو کالی داس بے قابو ہو گیا۔ اس نے مجھے برا بھلا کہا۔ میں غصے میں تو تھا ہی میں نے کالی داس پر حملہ کر دیا مگر مہاوتی نے مجھے اسے مارنے سے روک دیا۔ اس نے کہا کہ کالی داس کو کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ یہی اس کی سزا ہے۔ میں کالی داس کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مگر مہاوتی نے مجھے ایسا نہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بھی میں نے نو دن تک کال کوٹھری میں رکھا۔ دسویں دن جب

میں نے اسے نکالا تو وہ میرے قدموں میں گر گیا۔ اس نے مجھ سے معافیاں مانگیں اور تصدیق کی کہ روپ کلی بری عورت تھی۔ اس طرح میرے دل میں جو خلش پیدا ہوگئی تھی وہ ختم ہوگئی۔ میں شانت ہوگیا۔ روپ کلی کی آتم ہتھیا کا خیال میرے دل سے نکل گیا۔ یوں کئی سال بیت گئے۔ اب محل پر مہاوتی کا راج تھا، وہ ہی سیاہ وسفید کی مالک تھی۔ میں اس کے کسی معاملے میں نہیں بولتا تھا۔ مگر محل میں داسیاں پھر بھی مرتی رہیں، بہت سی بھاگ گئیں۔ یہ بھید میری سمجھ میں آتا تھا۔ بات یہیں تک نہیں رہی، کئی بار میں نے محل میں کچھ نوجوانوں کو دیکھا بعد میں ان کے مجسمے باغ میں سجے ہوئے دیکھے۔ مجھے پھولوں کا ہمیشہ سے شوق تھا اور میں نے نہ جانے کہاں کہاں سے پھول منگوا کر اپنے باغ میں سجائے تھے۔ ان پھولوں کے بیچ مجھے یہ بہت برے لگتے تھے۔ مہاوتی نے کہا کہ یہ اس کا شوق ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔

کافی دن کے بعد ایک بار مجھے جوگی دھنی رام پھر مل گیا۔ مجھے دیکھ کر طنز سے مسکرایا اور بولا۔ ''کیوں چندر سورما...... مزے کر رہا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''آنکھوں کے اندھے ہمیشہ دیکھے مگر عقل کے اندھے کو پہلی بار ہی دیکھا ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''تو اور کون......؟''

''اگر تم اتنے بوڑھے نہ ہوتے تو تمہیں اس کا جواب دیتا جوگی مہاراج۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''ہاں۔ بہت بڑا پہلوان ہے تو، میری ہڈیاں چرمرا دیتا اور کیا کرتا۔''

''پہلوان......؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''چندنا پہلوان۔''

''کس نے بتایا تمہیں؟ سمجھ گیا۔ کالی داس نے بتایا ہوگا۔''

''بیچارا کالی داس اپنی نیکیوں کا گھاؤ کھا گیا، اپنی نیکیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ وحشت تیرے کی اندھے۔ تجھے سزا ملے گی اس معصوم دھرم پتنی کی موت کی چندر بھان جو پوتر تھی، اس وفادار دوست کی موت کی جو کتے کی طرح وفادار تھا تیرا۔'' میں مسکرایا۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں کالی داس کی موت کے بارے میں کس نے بتایا مہاراج۔''

''تیری طرح عقل کا اندھا نہیں ہوں میں۔'' دھنی رام نے غصے سے کہا۔

''کالی داس سے ملو گے مہاراج۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''اس گندے بیر سے جو کالی داس کے شریر میں رہتا ہے۔''

''کیا بکتے ہو؟'' میں غرایا۔

''بکتا نہیں سچ کہتا ہوں۔ کالی داس بیچارا تو اسی کال کوٹھری میں بھوکا پیاسا مر گیا اور جونہی اس کی آتما نے اس کا شریر چھوڑا چنڈولنی کے بیر نے اس کے شریر میں آکر چنڈولنی کا کام پورا کر دیا۔ اسے کالی داس کی ضرورت جو تھی تاکہ تیرے بعد دیوان کے ذریعے تیری دولت سنبھال سکے۔''

''تو حد سے آگے بڑھ رہا ہے دھنی رام۔ گندے الزام لگا رہا ہے مہاوتی پر۔ میں تیری گردن اڑا دوں گا۔''

''مہاوتی نہیں، مہان وتی کہہ اسے بڑی مہان ہے وہ، تحقیقات کر۔ تجھے بہت جلد سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ ذرا سورج ڈوبے اپنے باغ میں چلے جانا اور ان مجسموں سے ان کی بپتا پوچھ لینا، اپنی کہانی سنا دیں گے تجھے۔ اور آج...... آہا...... آج کی رات کام کی ہے۔ ٹھیک ہے۔ آج کی رات پرانی حویلی کے نیچے جو تہہ خانہ ہے اس میں خود اپنی پھوٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینا۔''

دھنی رام چلا گیا مگر وہ مجھے حیران کر گیا تھا مسعود۔ ایسی اندر کی باتیں کہی تھیں اس نے کہ کوئی انہیں نہیں جانتا تھا۔ پرانی

حویلی یہی جگہ ہے جہاں ہم قید ہیں۔ اس کے نیچے تہہ خانہ بھی ہے جس کے بارے میں کسی دوسرے کو نہیں معلوم۔ میرے دل میں کریدسی پیدا ہوگئی۔ میں کچھ پریشان ہو گیا۔ اس شام میں باغ میں آ نکلا۔ ان مجسموں کے بیچ گھومنے لگا۔ تبھی مجھے کسی نے سرگوشی میں پکارا۔ میں نے حیرت سے اس مجسمے کو دیکھا جو مجھے بلا رہا تھا۔

''تم زندہ ہو۔'' میں نے اسے چھوتے ہوئے پوچھا۔

''ہم تو جو ہیں وہ تم دیکھ رہے ہو مگر تم ضرور زندہ ہو، بھاگ جاؤ یہاں سے جتنی جلدی ہو بھاگ جاؤ۔''

''کیوں؟''

''وہ جادوگرنی تمہیں بھی پتھر کا بنا دے گی۔''

''کون؟''

''مہادوتی۔ وہ کالکی ہے، کالی کی پجارن۔ وہ ہمیں اپنے کالے جادو کو پورا کرنے کے لئے نوکری کے دھوکے سے بلاتی ہے، ہمیں ایسے حکم دیتی ہے جو ہم پورے نہیں کر سکتے اور پھر وہ ہمیں سزا دیتی ہے، پتھر کا بنا دیتی ہے۔ تم بھاگ جاؤ۔ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بولتے مجسمے ایک ہی کہانی سنا رہے تھے اور میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ روپ کلی یاد آ رہی تھی۔ کالی داس پر بھی غور کر رہا تھا اور اب غور کرنے پر وہ مجھے بھی بدلا بدلا لگنے لگا تھا۔ آہ اس کا مطلب ہے کہ دھنی رام سچ کہہ رہا تھا۔ میں چنچل کے نیچے بری آتما کا شکار ہو گیا تھا۔ اور، اور میں نے اپنے دوست کو، اپنی دھرم پتنی کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میرا دل دکھتا رہا پھر میرے اندر دھواں اٹھا۔ میں نے دانت پیستے ہوئے سوچا کہ اگر یہ سچ ہے تو......تو میں مہادوتی کو زندہ جلا دوں گا۔ اسے جیتا نہیں چھوڑوں گا۔ دھنی رام کی دوسری بات بھی مجھے یاد تھی حویلی کے تہہ خانے والی۔ چنانچہ میں رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر کافی رات گئے میں دبے پاؤں حویلی کے تہہ خانے میں داخل ہوا۔ یہ تہہ خانہ ویران پڑا رہتا تھا مگر اس وقت وہاں روشنی تھی۔ سرخ روشنی جو ایک جلتے الاؤ سے اٹھ رہی تھی۔ تہہ خانے میں کوئی تھا، ضرور کوئی تھا۔ میں نے ایک ستون کی آڑ سے دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر میرا دماغ سن ہو گیا۔ ایک داسی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس سے خون ابل رہا تھا اور اس کے قریب مہادوتی جس کا رنگ اس سے گہرا کالا تھا، چہرہ بھیانک اور خون میں لتھڑا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں اور پیروں کے بل جھکی اس کا ماس کھا رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ اس نے سن لی۔ آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا......!''

وہ آنکھیں! وہ آنکھیں کسی انسان کی نہیں تھیں۔ ان کی سفیدیوں میں پتلیوں کی جگہ دو سیدھی کھڑی چمکدار لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ان کا رنگ گہرا کالا ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ مہادوتی کو اس کیفیت میں دیکھ کر میرا غصہ تو ہوا ہو گیا۔ خوف سے میری گھگی بندھ گئی۔ میں نے بھاگنے کے لیے قدم اٹھائے مگر میرے پاؤں میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے شاید میں اس کے سحر میں جکڑ گیا تھا۔ اس جادوگرنی نے مجھے دیکھ کر مجھ پر اپنا کوئی جادو آزما ڈالا تھا۔ پھر میں نے اپنے پیچھے تہہ خانے کا دروازہ بند ہوتے ہوئے سنا۔ میرا بدن تھراتا رہا اور وہ میری نگاہوں کے سامنے ایک انسانی جسم کو خونخوار درندے کی طرح بھنبھوڑتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کوئی آٹھ انچ لمبی سرخ زبان باہر نکالی۔ اس زبان کو پورے چہرے پر گھما کر اس نے خون کے دھبے صاف کئے، اپنے ہاتھوں کو چاٹا۔ اس وقت وہ صرف ایک بھیانک درندہ معلوم ہو رہی تھی جو انسانی روپ میں تھا۔

✦✤✦✤✦

میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جس کے ساتھ میں نے زندگی کا اتنا وقت گزار دیا، جس کے لیے میں نے نجانے کس کس کو قربان کر دیا، وہ انسان نہیں بلکہ ایک گندی آتما ہے۔ دھنی سچ کہہ رہا تھا۔ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا اور اب اس کی کسی بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ محل سے محل میں جو داسیاں گم ہو گئی تھیں، یقیناً ان کے جسموں کی ہڈیاں اسی تہہ خانے میں پڑی سوکھ رہی ہوں گی۔ وہ عورت ان سب کی قاتل تھی۔ اس نے انہیں کھا لیا تھا اور یہ تصور میرے لیے اتنا بھیانک تھا کہ میرا بدن ہی میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ روپ کلی بھی یاد آ رہی تھی۔ میری وفادار بیوی! جس پر

میں نے اس پاپن کی وجہ سے شک کیا تھا۔ کالی داس میرا وفادار ساتھی، میرے بچپن کا دوست! اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسی پاپن کا بیر تھا۔ مجھے ابھی تک اپنی ذات کو درپیش کسی خطرے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اسی کے جال میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ شاید اپنا پیٹ بھر چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھے دیکھا، مسکرائی اور بلی کی طرح دونوں ہاتھ آگے کر کے اور پاؤں پیچھے کر کے اس نے انگڑائی لی پھر زمین پر دو چار لوٹیں لگائیں اور اس طرح آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی جیسے سوگئی ہو لیکن میں نے اس کے وجود کو تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بدن کی سیاہی چھٹ گئی اور وہ بالکل پہلے جیسی ہوگئی۔ اس نے قریب ہی پڑا ہوا سفید لباس اپنے کاندھوں پر ڈالا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے سامنے پہنچ گئی۔ اب اس کی آنکھیں بھی بالکل ٹھیک تھیں۔ میرے جسم میں جیسے دوبارہ زندگی دوڑ گئی۔ میں نے ایک پھریری سی لی اور خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''مہاوتی! تو کون ہے؟ آج تیری اصل شکل میرے سامنے آگئی۔ بتا مجھے تو کون ہے؟ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، تو...... تو میری روپ کلی کی قاتل ہے اور تو نے اتنی داسیوں کو اپنی بھینٹ چڑھایا ہے۔ بتا تو کون ہے...... کون ہے تو......؟''

''آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو چندر بھان! یہ جگہ تمہیں کیسی لگی......؟''

''میں تجھ سے پوچھتا ہوں مرنے سے پہلے مجھے اپنے بارے میں بتا دے تو اچھا ہے۔ تجھے زندہ چھوڑنا میری زندگی کا بدترین گناہ ہوگا۔''

''کالکی ہوں۔ کالی مائی کی پجارن ہوں اور کیا بتاؤں تمہیں! گیان حاصل کر رہی ہوں، شکتی حاصل کر رہی ہوں، جیون بڑھا رہی ہوں اپنا، یہ انسانی گوشت، انسانی خون میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سمجھ رہے ہو نا اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''مگر تو...... تو......؟''

''ہاں...... ہاں بولو......''

''تو نے مجھے دھوکا دیا۔ تو مجھے وہاں انسانی روپ میں ملی تھی۔''

''یہ تو ہمارا کام ہے چندر بھان جی! اگر میں وہاں تمہارے من کو نہ بھاتی تو تم مجھے یہاں تک کیسے لے آتے؟ اگر میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیتی تو سوگند کھا کر کہو، وہی کرتے تم، جو تم نے کیا، مجبوری تھی ایسی کون سی بات ہے، مگر تمہیں اس کھوج میں پڑنا نہیں چاہیے تھا۔ جو کچھ میں کر رہی تھی، مجھے کرنے دیتے۔ یہ سب کچھ تو سیکڑوں سال سے کر رہی ہوں، سیکڑوں سال سے......!''

''کیا مطلب......؟''

''اب سارے ہی مطلب جان لو گے۔ ڈھائی سو سال ہے میری عمر سمجھے! ہوسکتا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ ہو۔ ڈھائی سو سال سے جی رہی ہوں میں اور...... اور ہزاروں سال جینا چاہتی ہوں، ہزاروں سال جیتی رہوں گی۔ تھوڑا سا کام کرنا ہے مجھے بس! شکتی حاصل کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور میں کافی شکتیاں حاصل کر کے اپنے آپ کو امر کر لینا چاہتی ہوں۔''

''دوسروں کی زندگیوں سے کھیل کر......؟''

''ہاں......! یہی تو کالی شکتی کی مانگ ہوتی ہے۔ کالے جادو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تم! یہی وجہ ہے چندر بھان جی! اور عام لوگوں کو جاننا بھی نہیں چاہیے۔ جو جان لیتے ہیں، وہ شکتی مان بن جاتے ہیں یا پھر شکتی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اب تم دیکھو نا جنہوں نے جان لیا، وہ پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہوگئے مگر تمہارے ساتھ ایسا کرنا ذرا ٹھیک نہیں رہے گا۔ چندر بھان جی! پتی ہو نا تم میرے، راج محل کے مالک ہو۔ پتا نہیں کہاں تمہاری ضرورت پیش آجائے۔ میں اپنے کام تو کر سکتی ہوں لیکن جو کام تمہیں کرنے ہوتے ہیں، وہ کون کرے گا؟ اس کا ایک ہی طریقہ ہے چندر بھان مہاراج! وہ یہ

کہ تم جیتے رہو اور ایسے جیو کہ سنسار سے تمہارا کوئی واسطہ نہ رہے۔ واسطہ رکھو گے تو میرے خلاف کام کرتے پھرو گے۔ جوگیوں، سادھوؤں اور سنتوں کے چکر میں پڑتے پھرو گے، مجھے بھی پریشانی ہوگی، تمہیں بھی اور انہیں بھی! اس سے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے تم بیمار ہو جاؤ چندر بھان! سمجھے، تم بیمار ہو کر اسی پرانی حویلی میں رہو، کوئی تکلیف نہیں ہوگی تمہیں، جیتے رہو گے مگر ایسے نہیں کہ یہاں سے کہیں باہر چلے جاؤ اور میرے لیے پریشانیاں پیدا کرو۔''

''تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا میں! تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ ہنس پڑی پھر اس نے زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی، منہ کے قریب لا کر اس پر کوئی منتر پڑھا اور میری جانب اچھال دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ ایسی آگ کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے کپڑے جل رہے تھے، نہ کہیں سے بدبو اٹھ رہی تھی، نہ دھواں نکل رہا تھا۔ لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے شعلے مجھے چاٹ رہے ہوں۔ میرے حلق سے دہشت بھری آوازیں نکل رہی تھیں اور میرا شریر جل رہا تھا۔ میں زمین پر گر کر لوٹنے لگا اور اس کے قہقہے تہہ خانے میں گونجتے رہے۔ پھر یہ آگ رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑتی چلی گئی۔ آگ ہی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی مسعود، بلکہ میرا دماغ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو اس کمرے میں تھا جس کمرے میں تم اب مجھے دیکھ رہے ہو۔ میں اب بہتر کیفیت میں تھا۔ بس ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا ہو، جان ہی نہیں رہی تھی میرے ہاتھوں، پیروں میں! زمین پر چت پڑا ہوا تھا میں۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی پھر ذرا بدن میں کچھ جان واپس آئی تو ہمت پکڑی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ پرانی حویلی کے اس کمرے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ظاہر ہے میرے پرکھوں کی حویلی تھی۔ اس نے مجھے قید کر دیا تھا اور یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ دروازہ کھولے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا اور دروازہ باہر سے بند ہو تو کوئی بڑے سے بڑا سورما اسے توڑ نہیں سکتا۔ یہ پرانے دور کے بنے ہوئے دروازے ہیں۔ ان پر بڑی ضربیں لگائی جائیں تب بھی ٹس سے مس نہ ہوں جبکہ میرے پاس یہاں کچھ نہیں تھا، خالی ہاتھ تھا میں۔ تب پہلی بار میں نے مچنڈا کو دیکھا۔ وہ آدمی جو اس دن تمہیں بھی نظر آیا تھا۔ گونگا مچنڈا! وہ کون ہے، کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ شکل وصورت سے وہ بھی مجھے کوئی گندی آتما ہی لگتی ہے مگر میں مچنڈا کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے لیے کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا جو ایک تھال میں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ تھال رکھا واپس پلٹا تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے دبوچ لیا۔ وہ گینڈے جیسی طاقت رکھتا ہے۔ کسی بھینسے کی طرح ٹکر مار کر دیواریں ہلا سکتا تھا مگر مقابلہ چندنا سے ہو گیا تھا اور چندنا کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس کا ثانی بھٹنڈہ اور اس کے آس پاس کہیں نہیں تھا۔ میں اس سے زور آزمائی کرتا رہا۔ وہ مجھ پر حملے نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ بالآخر میں نے اسے کندھے پر اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی آیا ہے اور ایک بار پھر میرے حلق سے دہشت بھری چیخیں نکلنے لگیں۔ اسی آگ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آہ......! دوبارہ میں اس آگ سے دوچار ہو چکا ہوں اور شاید الفاظ میں تمہیں اس کی جلن نہ بتا سکوں۔ ایسی شدید آگ ہوتی ہے وہ کہ بھگوان ہر انسان کو اس سے محفوظ رکھے۔ وہ نرکھ کی آگ ہے مسعود! نرکھ کی آگ ہے۔ اس آگ نے ایک بار پھر مجھے بے ہوش کر دیا اور اس کے بعد جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن میرے ہاتھوں، پیروں اور کمر میں یہ زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ زنجیروں کی لمبائی اتنی ہے کہ بس میں تھوڑی ہی دور تک پہنچ سکوں۔ مچنڈا آتا ہے میرے لیے کھانے پینے کی چیزیں لاتا ہے۔ مجھے جنگل پانی کو لے جاتا ہے مگر اپنا فاصلہ اتنا رکھتا ہے وہ کہ میں اس تک نہ پہنچ پاؤں اور اس وقت سے میں اسی طرح جی رہا ہوں۔ بھگوان کی سوگند ایک بار مجھے ان زنجیروں سے نجات مل جائے تو میں کم از کم مچنڈا کو ضرور ہلاک کر دوں۔ اس پاپی کو جو گونگا ہے لیکن اس عورت کا ہرکارہ ہے۔ یہ ہے میری کہانی مسعود! میں نجانے کب سے یہاں قید ہوں۔ اس نے مجھے بیمار مشہور کر رکھا ہے، کسی کو میرے پاس نہیں آنے دیتی۔ بہت چالاک ہے وہ نجانے کس کس طرح لوگوں کو ٹالتی رہتی ہے۔ میں جانتا ہوں جب تک میں جیتا ہوں، وہ میری ضرورت محسوس کرتی ہے۔ مر جاؤں گا تو وہ اس وقت تک سارا نظام سنبھال چکی ہوگی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے کاغذوں پر دستخط کرانے آتی ہے اور میں اس کے جادو کے زیر اثر اس کے کہنے پر عمل کر لیتا ہوں مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو جادو کا اثر مجھ

پر سے ختم ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کے لیے میرے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایسی زندگی گزار رہا ہوں میں! یہ زندگی گزار رہا ہوں۔"

میں شدت حیرت سے گنگ تھا۔ زبان کچھ کہنے سے قاصر تھی۔ اس نے مہاوتی کی جو شکل بتائی تھی، اس شکل میں، میں بھی مہاوتی کو دیکھ چکا تھا۔ ایک لفظ جھوٹ نہیں معلوم ہوتا تھا چندر بھان کا اور اس طرح مہاوتی کی شخصیت بھی سامنے آجاتی تھی۔ کس جال میں پھنس گیا میں...... ! نہ مجھے اس جادوگرنی کی زندگی سے کوئی دلچسپی تھی، نہ موت سے...... ! میں تو یہاں سے واپس جانا چاہتا تھا۔ حاجی فیاض الدین احمد نے نجانے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ کم بخت نوشاد چلا گیا تھا۔ بھگوتی پرشاد اپنی جان بچا کر نکل گیا تھا اور میں یہاں اس عذاب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے کیوں قید کر رکھا ہے۔ کیا وہ میرا بھی گوشت کھانا چاہتی ہے؟ لیکن اب تک تو جو بات علم میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عورتوں ہی کو کھاتی ہے اور اس دن بھی میں نے ایک عورت ہی کے جسم کو دیکھا تھا یعنی رجناوتی! معصوم اور مظلوم رجناوتی...... ! چند لمحات کے بعد چندر بھان کی آواز سنائی دی۔ "ڈر گئے...... ڈر گئے تم...... ؟"

"نہیں چندر بھان! سوچ رہا ہوں اس کے بارے میں۔"

"کوئی اس کے بارے میں ڈرے بغیر بھی سوچ سکتا ہے مگر تم سے وہ ضرور کچھ چاہتی ہوگی۔ دیکھو مشورہ دیتا ہوں تمہیں۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ اور اگر نہیں بھاگ سکتے تو پھر جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، وہ کر لو...... ورنہ پتھر بنا دیئے جاؤ گے۔ ہوسکتا ہے مگر تم سے اس کا مقصد پورا ہو جائے تو وہ تمہیں نکل جانے دے یا پھر تمہیں اپنا مستقل ساتھی بنا لے۔ اگر ایسا بھی ہو جائے تو تمہیں تو تمہیں بہت کچھ ہوگا۔ اس سے یہ معلوم کرنا کہ وہ کیسے کسی جال میں پھنس سکتی ہے اور ہم سب کیسے بچ سکتے ہیں۔"

"چندر بھان! اگر مجنڈا ہاتھ آ جائے تو میں تمہیں یہاں سے رہا کرانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

"مجنڈا تمہارے بس کی بات نہیں ہے، کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے۔ میں ہی مار سکتا ہوں اسے! ایک بار وہ میرے قبضے میں آ جائے۔ یقین کرو جو زبان سے کہہ رہا ہوں، کر کے دکھا دوں گا۔ نہ کروں تو کتا کہہ دینا، چندر بھان مت کہنا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے چندر بھان! میں کوشش کروں گا کہ مجنڈا تمہارے ہاتھ لگ جائے۔" چندر بھان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یقینی طور پر میری بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی لیکن یہ الفاظ بھی بلاوجہ نہیں کہے تھے۔ دروازے کے اوپر ایک ایسی چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی جو دروازے ہی کا ایک حصہ تھی لیکن...... ! لیکن کچھ کیا جاسکتا تھا وہاں سے، کچھ کیا جاسکتا تھا اور میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ پھل ختم ہو گئے۔ گل سڑ گئے اور مجھے بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑا۔ غالباً تیسرا دن تھا جب آج مجنڈا پھر آیا۔ گلے سڑے پھل اٹھا کر لے گیا، نئے پھل رکھ گیا۔ ابھی تک مہاوتی کی طرف سے مجھے نہ تو کوئی پیام ملا تھا اور نہ ہی کسی نے میری خبر گیری کی تھی۔ مجنڈا کے بارے میں یہ اندازہ میں نے لگا لیا کہ وہ تیسرے ہی دن پھر آئے گا۔ اس دوران میری اور چندر بھان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اپنے بارے میں تو میں نے چندر بھان کو کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ مگر وہ اپنے پرکھوں کے بارے میں نجانے کیا کیا کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ معذرت بھی کرتا تھا۔ مجھ سے کہ وہ زیادہ بولتا ہے مگر میں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ انسان کی ذہنی کیفیت تنہا رہ کر کیا ہو جاتی ہے۔ پھر چھٹا دن ہو گیا۔ کچھ پھل بچ گئے تھے، زیادہ تر میں نے کھا لیے تھے۔ کمرے میں ناقابل برداشت بدبو پھیل چکی تھی۔ طبیعت ویسے ہی ہر وقت متلاتی رہتی تھی۔ آج زندگی اور موت کی بازی لگانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پہلے مجنڈا سے نمٹ لیا جائے اور اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ یہاں رہنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ مجنڈا کے آنے کا وقت تھا۔ میں نے اپنے جسم کو سمیٹا اور دروازے کے اوپر بنی ہوئی چھوٹی سی جگہ چڑھ گیا۔ اس مختصر جگہ پر خود کو سنبھالنا بہت مشکل کام تھا لیکن یہ زندگی بچانے کا معاملہ تھا اور ایسے اوقات میں انسان وہ کچھ کر جاتا ہے جو عام حالات میں کسی طور ممکن نہ ہو۔ میں چھپکلی کی طرح وہاں چپکا رہا۔ خوش قسمتی سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی، دروازہ کھلا اور مجنڈا نئے پھل اٹھائے

اندر داخل ہو گیا۔ وہ جھونک میں سیدھا آگے بڑھ گیا۔ یہی موقع تھا میں نے بدن کو سکوڑ لیا اور جھپاک سے دروازے سے باہر رینگ گیا۔ مجھے نہ پا کر مجنڈا کی کیا کیفیت ہوئی، اس کا اندازہ لگانا تو ممکن نہیں تھا لیکن اس وقت صورتحال اچانک دہری شکل اختیار کر گئی۔ یہاں سے نکل کر بھاگ سکتا تھا۔

ایسی سمت اختیار کر سکتا تھا جس سے محل سے ہی باہر نکل جاؤں۔ لیکن یہاں ایک مصیبت زدہ اور تھا۔ تنہا بے آسرا......! یہ غیر انسانی عمل تھا۔ اپنی ذات سے پیار کسی اور سے اپنی ذات کے لیے اجتناب تو پوری زندگی نہیں کیا تھا، اب کیا کرتا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا، برق رفتاری سے کرنا تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر چندر بھان کے کمرے کی کنڈی کھولی اور دروازے کا پٹ بھی تھوڑا سا کھول دیا۔ چندر بھان کی بتائی ہوئی کچھ باتیں یاد تھیں اور اس وقت ان پر عمل کرنا تھا۔ چھپنے کے لیے ایک ستون تلاش کیا ہی تھا کہ مجنڈا کی غراہٹیں سنائی دیں۔ وہ آندھی طوفان کی طرح باہر نکلا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ میں ستون کی آڑ میں چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر مجنڈا کی نگاہ چندر بھان کے قید خانے کے دروازے پر پڑی۔ وہ اس طرف دوڑا۔ دروازے کو پورا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ مجنڈا کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور چندر بھان اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شاندار تن و توش کے مالک چندر بھان کے چہرے پر مجنڈا کے لیے نفرت کے آثار تھے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا جبکہ مجنڈا کی پشت میری طرف تھی۔ دروازے سے اندر گھستے ہی میں نے خود کو سنبھالا اور پھر پوری قوت سے مجنڈا کو آگے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں پیچھے گر گیا۔

''چندر بھان! سنبھالو اسے!'' مجنڈا سنبھل نہ پایا اور چندر بھان سے کچھ فاصلے پر جا گرا۔ چندر بھان فوراً میرا مقصد سمجھ گیا۔ اپنی وزنی زنجیریں سنبھالے وہ مجنڈا کے پیچھے آ گیا۔

''کھڑا ہو جا اے مہاوتی کے کتے! بڑا لمبا حساب کرنا ہے تجھ سے۔'' اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

مجنڈا کے چہرے پر خوف کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا چندر بھان چیخا۔ ''دروازہ...... دروازہ......!'' میں نے پھرتی سے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ مجنڈا نے بھیانک چیخ ماری اور ایک طرف ہو کر نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن چندر بھان نے زنجیر اٹھا دی اور وہ الجھ کر گر پڑا۔ ''بڑے دنوں کی پیاس ہے سسرے! آج بجھے گی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ مجنڈا پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے مجنڈا پر گرفت قائم کر لی اور مجنڈا اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ چندر بھان بولا۔ ''تم مسعود ہو نا۔''

''ایں...... ہاں!''

''میں نے تمہیں چندنا کے بارے میں بتایا تھا؟''

''ایں...... ہاں!''

''تو دیکھو چندنا کو! یہ حرام خور مہاوتی کا کتا ہے۔ گندی آتما کی پیداوار......! مگر جب چندنا اکھاڑے میں ہوتا ہے تو پھر چندنا ہی ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو اس کو، یہ کلی پٹکا ہے، چندنا کا مخصوص داؤ!'' چندر بھان نے مجنڈا کے اوپری سمت آ کر پہلے اس کی ٹانگوں میں دونوں ہاتھ پھنسائے، اپنی ٹھوڑی اس کی ریڑھ کی ہڈی پر رکھی اور اس کے بعد اپنے ہی لمبے ہاتھوں سے مجنڈا کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں، حالانکہ زنجیریں اسے اس برق رفتاری سے اپنا عمل کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چندر بھان جسمانی طور پر کسی ہاتھی جیسی قوت کا مالک تھا۔ مجنڈا کو اس طرح اٹھا لینا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ٹھوڑی اس کی ریڑھ کی ہڈی سے لگا کر اور اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں پکڑ کر چندر بھان نے اپنے گھٹنے زمین پر لگائے اور مجنڈا کے دونوں ہاتھ پیچھے سے گھسیٹ کر اسے اپنے شانوں پر لیے کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد وہ برق رفتاری سے دوڑا اور مجنڈا کو دیوار سے دے مارا۔ مجنڈا کے حلق سے نکلنے والی چیخ اس قدر زوردار تھی کہ کانوں کے پردے جھنجنا کر رہ گئے۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون کی دھاریں بہنے لگی تھیں۔ چندر بھان نے ایک ہی داؤ میں اسے ادھ مرا کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود مجنڈا نے زمین پر لوٹ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ چندر بھان ہی کی زنجیروں کا سہارا لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ

خون سے سرخ ہو کر اتنا بھیانک لگ رہا تھا کہ کمزور دل والا آدمی اسے دیکھ لیتا تو وہیں اس کے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ اس کے فوراً بعد وہ اندھوں کی طرح چندر بھان پر لپکا تھا لیکن چندر بھان اپنی پہلوانی کے داؤ پیچ دکھا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے بدن کو بل دیا۔ مجنڈا کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈالے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور پشت کی طرف سے زمین پر دے مارا۔ ایک ضرب چہرے پر لگی تھی، دوسری سر کے پچھلے حصے میں شانے اور گردن پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی تھیں۔ مجنڈا کے حلق سے اب درد بھری آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ اس نے پھر اپنے آپ کو بچا کر نکلنا چاہا لیکن اس بار وہ جونہی گھٹنوں کے بل اٹھا، چندر بھان پہلے سے تیار تھا۔ اس نے موٹی کڑیوں والی زنجیر مجنڈا کے گلے میں لپیٹ دی اور اسے دو بل دینے کے بعد مجنڈا کی پشت پر سوار ہو گیا۔ درحقیقت اس وقت چندر بھان ایک وحشی جانور لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار تھے، دانت بھنچے ہوئے تھے اور وہ مجنڈا کی گردن زنجیر سے دبا رہا تھا۔

میں ساکت کھڑا طاقت کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ مجنڈا کے حلق سے نکلنے والی غراہٹیں اب خرخراہٹوں میں تبدیل ہونے لگی تھیں اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ دونوں ہاتھ سیدھے ہو کر بار بار نیچے گر رہے تھے۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ اب وہ زنجیر پکڑنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ غالباً اس کے ہاتھوں میں اتنی جان ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق رخ تبدیل کر سکیں۔ چندر بھان نے چند لمحات اس طرح اس کی گردن پر طاقت صرف کی اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر شدید وحشت نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں تو وہ کچھ معتدل ہوا۔ مجنڈا زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ چندر بھان نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہے سہاوتی کا بیر سمجھے مسعود، دیکھا تم نے چندنا کو میرے مدمقابل جب بھی اکھاڑے میں میرے سامنے آتے تھے، ان کے بدن پر پہلے ہی کپکپی طاری ہو جاتی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ میری دوسری کشتیاں دیکھ چکے ہوتے تھے۔ اپنے مدمقابل کے لیے میرا دل یہ کبھی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے پیروں سے اکھاڑے سے واپس جائے۔ بعض اوقات تو بارہا میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ جس نے مجھ سے کشتی لڑی تھی، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر میرے دوست او ہو...... او ہو! تم...... تم!'' چندر بھان کو اب اس بات کا احساس ہوا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ میرا اس قید خانے سے نکل آنا اور اس کے بعد مجنڈا کو چندر بھان کی طرف دھکیل دینا، ان ساری باتوں پر اب اسے حیرت ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔

''اور جو منصوبہ میں نے بنایا تھا چندر بھان! وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا......؟''

''مگر تم نکلے کیسے وہاں سے......؟''

''بس! ایک تدبیر کارگر ہو گئی تھی۔''

''آہ! مجنڈا سے تو ہمیں نجات مل گئی ہے لیکن اس زنجیر کو اور ان کڑوں کو توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہاں مجنڈا کے علاوہ اور کوئی پہریدار نہیں ہوتا تھا۔ تم...... تم کوئی ایسی چیز تلاش کرو مسعود! جس سے میری زنجیریں کھل جائیں۔ کوئی بڑا ہتھوڑا، کوئی ایسی چیز یہ سب کچھ یہ سب کچھ توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہزار کوششیں کر چکا ہوں۔ بس کلائیاں زخمی ہو جاتی ہیں، پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں، کمر دکھنے لگتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔''

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ان کڑوں کو ایک بار پھر قریب سے دیکھا۔ کھینچا تانی کی لیکن یہ ساری کارروائی مجھے مضحکہ خیز ہی لگ رہی تھی۔ یہ سب کچھ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی اور اب اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ باہر نکل کر کوئی ایسی چیز تلاش کروں۔ میں نے چندر بھان سے کہا۔

''ہمت نہیں ہارنا چندر بھان! میں اگر چاہتا تو اکیلا بھی بھاگ سکتا تھا لیکن میں نے یہی سوچا کہ پہلے مجنڈا سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اس کے بعد دونوں یہاں سے فرار کا پروگرام بنائیں گے۔'' چندر بھان کے چہرے پر شکر گزاری کے آثار نظر آئے۔ اس نے کہا۔

''دیر نہ کرو، جاؤ کوئی چیز تلاش کرو جس سے یہ کڑیاں کھل سکیں اور کچھ نہ ہو سکے تو یہ زنجیروں کی کڑیاں ہی درمیان سے ٹوٹ جائیں۔ کام بن جائے گا۔'' میں نے دروازے کی جانب رخ کیا۔ دل ڈر رہا تھا کہ مہاوتی اس طرح یہ سارا معاملہ مجنڈا کے شانوں پر چھوڑ کر بے خبر تو نہ ہو گئی ہوگی۔ پہلے صرف چندر بھان اس کا قیدی تھا۔ چلو ٹھیک ہے چندر بھان کے بارے میں وہ سب کچھ جانتی تھی لیکن میرے بارے میں بھی جانتی تھی۔ کہیں یوں نہ ہو کہ ساری محنت اکارت چلی جائے لیکن اب جبکہ اتنا عمل کر چکا تھا تو چندر بھان کو بے سہارا چھوڑنا حماقت کی بات تھی۔ میں وہاں سے نکلا اور چاروں طرف بھٹکنے لگا۔ یہ پرانی حویلی عجیب وغریب طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ پیچ در پیچ کمرے، تنگ تنگ راہداریاں جن کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک طرح سے بھول بھلیاں ہی بنی ہوئی تھیں اور میں ان بھول بھلیوں میں سے گزر کر چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوا کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھا جس سے چندر بھان کے ان کڑوں کی زنجیریں توڑی جا سکیں لیکن یقین نہیں تھا۔ ایسی کون سی مضبوط چیز ہاتھ آسکتی ہے۔ وہ ایک کمرہ تھا جس میں، میں داخل ہوا۔ نیم تاریک ماحول میں وہاں مجھے کچھ چیزیں نظر آئیں اور جب میری آنکھوں نے ایک وزنی ہتھوڑا دیکھا تو خوشی سے چمک اٹھیں۔ یہ ہتھوڑا ایک سمت سپاٹ اور دوسری طرف سے چھینی کا سا ڈیزائن رکھتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ اسی مقصد کے لیے یہاں رکھا گیا ہو کہ میں چندر بھان کی زنجیر کاٹ دوں۔ پھرتی سے ہتھوڑے کی طرف لپکا اور میں نے اس کا دستہ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا۔ دستہ جونہی سیدھا ہوا، مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹیں محسوس ہوئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لوہے کا ایک فولادی جنگلہ میرے اور اس دروازے کے درمیان حائل ہو گیا تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ عقبی سمت سپاٹ دیواریں تھیں اور بہت چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں حیرت سے اس ہتھوڑے کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ جتنا میں اسے اٹھا چکا تھا، وہاں ساکت ہو گیا ہے۔ اس کا اگلا سرا زمین پر ویسے ہی پڑا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نیچے سے وہ زمین میں پیوست ہو۔ چند لمحات کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ یہ کوئی ہتھوڑا نہیں تھا بلکہ ایک ایسی چیز تھی جسے اس آہنی دروازے کا کنٹرول سسٹم کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اس کا دستہ اٹھانے سے آہنی دروازہ چھت سے نکل کر دستہ اٹھانے والے اور دروازے کے درمیان حائل ہو جائے۔ ناقابل یقین سی بات تھی۔ یہ سب کچھ کیسے سوچا گیا تھا۔ کیا مہاوتی مجھ پر نگاہیں رکھ رہی ہے، کیا یہ سب کچھ اس کی اسکیم کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا تھا۔ ہتھوڑے کے دستے کو میں نے بدن کی پوری قوت سے نیچے دبانے کی کوشش کی۔ یہ سوچ کر کہ شاید آہنی دروازہ واپس اپنی جگہ چلا جائے لیکن وہ اس طرح ساکت ہو گیا تھا کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ گویا میں قید ہو گیا۔

بیچارہ چندر بھان...... بیچارہ چندر بھان! اس کی تقدیر میں شاید آزادی نہیں۔ فولادی سلاخوں والے دروازے کو میں نے بری طرح جھنجوڑ جھنجوڑ کر دیکھا لیکن اس میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ بالکل سوچی سمجھی اسکیم تھی، بالکل سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ میں ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں جا پڑا تھا اور اب مجنڈا بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ بہت دیر تک جدوجہد کرتا رہا۔ ہتھوڑے پر بھی جس قدر طاقت صرف کر سکتا تھا، کر لی اور جب تھک ہار گیا تو ننگے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بلاشبہ تعجب خیز بات تھی لیکن کم از کم میرے لیے نہیں کیونکہ اب تک جن حالات سے گزر چکا تھا، ان میں انہونے واقعات اس قدر ہوئے تھے کہ کسی بھی واقعے پر بہت زیادہ حیرت نہیں ہوتی تھی۔ دکھ ہو رہا تھا یہ سوچ سوچ کر چندر بھان کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوں گی۔ اس کے دل میں آس پیدا ہو گئی ہوگی۔ ہر آہٹ پر منتظر ہوگا اس بات کا کہ میں واپس پہنچوں اور اسے اس طویل ترین قید سے نجات مل جائے۔ درحقیقت اپنی کوئی فکر میں نے پہلے بھی نہیں کی تھی، اب بھی نہیں تھی لیکن بیچارہ چندر بھان ان تمام سوچوں کے علاوہ اس وقت اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس نئی قید میں میرا کیا حشر ہوتا ہے۔ مہاوتی کو میری اس نئی قید کے بارے میں معلوم ہے بھی یا نہیں اور جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ مجنڈا مر چکا ہے تو اس پر کیا ردعمل ہوگا۔ وقت گزرتا رہا۔ رات گئی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا۔ روشندانوں سے سفید چاندنی چھن رہی تھی۔ اب تک کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ کسی کو میری اس افتاد کے بارے میں نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ! رات گزری، صبح ہوئی، دوپہر پھر شام! گھپ اندھیرا پھیل گیا اور اچانک مجھے کچھ سرسراہٹیں محسوس ہوئیں۔ سلاخوں

وار دروازہ یونہی تھا لیکن پچھلی دیوار کھسک رہی تھی اور اس سے روشنی کی لکیریں اندر آنے لگی تھیں۔ پھر دیوار پوری ہٹ گئی اور سامنے وہی باغ نظر آنے لگا جسے میں دیکھ چکا تھا۔ ہواؤں کے جھونکے اندر آگئے اور بڑی تازگی محسوس ہوئی۔ دوڑ کر باہر نکل آیا مگر باہر قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ سامنے ہی سندری نظر آرہی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''آؤ!'' میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے نزدیک خوش رنگ پھلوں کے تھال رکھے ہوئے تھے۔ ''بیٹھو!'' وہ بولی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا انتظار! بیٹھو تو؟''

''نہ بیٹھوں تو......؟'' میں نے کہا اور وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

''کیا مطلب......؟''

''اپنی سمجھ سے کام نہیں لیتے۔''

''جو کچھ کہہ رہی ہو، صاف الفاظ میں کہو۔''

''اس سے پہلے تم اپنے قید خانے سے نکل سکے۔ تم خود جانتے ہو کہ تمہیں نکالا گیا ہے اور جب نکالا گیا ہے تو یہ بھی سوچا گیا ہوگا کہ تم بھاگ سکتے ہو گے۔ یہ سوچا ہوگا تو بندوبست بھی کیا گیا ہوگا کہ بھاگ نہ سکو۔ کیا فائدہ ایک کے بعد دوسری مصیبت میں پھنسنے سے!''

''خوب! بات تو سمجھداری کی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تو بیٹھو۔'' اس نے کہا اور میں گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔

''گویا اب میں ایک آزاد قیدی ہوں۔''

''لو پھل کھاؤ۔ تم بھوکے ہو۔''

''کیا چھپا ہے ان پھلوں میں؟''

''تمہاری سوگند یہ پوتر ہیں، پیڑوں سے اترے ہوئے۔''

''قسم بھی میری کھا رہی ہو۔''

''ہاں! اس کی وجہ ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا اور سندری خاموش ہوگئی۔ دیر تک کچھ نہ بولی۔ پھر اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور مدھم لہجے میں بولی۔

''پہلے میں صرف مہا دیوی کے حکم سے تم سے ملتی تھی۔ اب بھی انہی کے حکم سے یہاں آئی ہوں مگر میرے من میں تمہاری ہمدردی اتر آئی ہے۔ تم میرے محسن ہو، تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔''

''میں نے...... احسان......؟''

''تو اور کیا......! مجھے شنکھا اٹھا لے گیا تھا بھینٹ چڑھانے، کوئی میری رکھشا نہ کر سکا تھا۔ اگر تم شنکھا کی بات ماننے سے انکار نہ کر دیتے تو میرا جیون چلا گیا تھا۔ اس لیے اب تمہارا یہ احسان مجھ پر ہے۔''

''اوہو......! اچھا تو پھر اس احسان کے کچھ اور بدلے بھی چکاؤ۔''

''کہو۔'' اس نے سنجیدگی سے گردن ہلائی۔

''کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ پھل کھاؤ، ان میں کوئی کھوٹ نہیں ہے، پیڑوں سے اتارے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کھا لوں گا۔ مجھے جلدی نہیں ہے۔''
''عجیب ہو۔ خیر پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''
''بہت سے سوال ہیں۔''
''پوچھو۔''
''پہلا سوال۔ مجھے کیوں نکالا گیا ہے؟''
''میں نہیں جانتی۔ بس مجھے یہاں تمہاری سیوا کے لیے بھیجا گیا ہے۔''
''مہاوتی کہاں ہے؟''
''محل میں۔''
''اسے میری نئی قید کے بارے میں معلوم تھا؟''
''کیوں نہیں! جو ہو رہا ہے، مہا دیوی کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ ویسے تمہارے لیے مہا دیوی بھی حیران ہیں۔''
''کیوں......؟''
''شمبھو مہاراج اور وہ باتیں کرتے ہیں۔ مہا دیوی کہتی ہیں کہ تم بڑے شکتی مان ہو۔ بہت کچھ کر سکتے ہو مگر نہیں کرتے۔ نہ جانے کیوں؟''
''اب وہ کیا چاہتی ہے؟''
''تمہاری ہی سوگند مجھے نہیں معلوم۔''
''سندری! تمہیں شنکھا اٹھا لے گیا تھا۔ فرض کرو اگر میں اس کی بات مان لیتا تو تمہاری زندگی تو ختم ہو گئی تھی۔''
''ہاں۔''
''مہاوتی نے تمہاری مدد نہیں کی؟''
''اوّل تو مہا دیوی کالی جاپ کرنے گئی ہوئی تھیں اور پھر شنکھا سے تو وہ مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔''

✦✤✦✤✦

''وہ اپنے گیان میں شنکھا سے ہلکی ہے؟''
''اس کا کوئی جواب نہیں دے سکوں گی۔''
''مجھے یہاں سے نکال سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اداسی سے بولی۔ ''نہیں!''
''بس اور کچھ نہیں پوچھنا مجھے!''
وہ خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے ایک تھال سے انگوروں کا ایک گچھا نکال لیا۔ خود بھی سمجھتا تھا کہ ہزار آنکھیں میری نگرانی کر رہی ہوں گی۔ نکلنا ممکن نہیں ہے، بہتر ہے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کا انتظار کروں۔ پھل کھاتا رہا پھر آسمان پر چاند نے سر ابھارا اور مصنوعی روشنیاں مدھم پڑ گئیں۔ پورا کھلا چاند تھا۔ سندری بھی چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''پورا چاند ہے۔'' میرے منہ سے نکلا۔
''پورن ماشی ہے آج۔''
''ہوں۔'' میں نے کہا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر اچانک ایک عمل ہوا۔ ایک جانا پہچانا عمل! چاند کی کچھ روشن کرنیں سیدھی زمین پر پڑیں اور انہوں نے میرے گرد احاطہ کر لیا۔ پھر یہ کرنیں سفید روشن غبار میں بدلنے لگیں اور میرے منہ سے بے اختیار یہ نکل گیا۔ ''پورنیاں!'' روشن غبار حسین عورتوں کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ منظر ایک بار پہلے بھی سامنے آ چکا تھا۔ ایک معصوم پنڈت کے گھر کے احاطے میں! گویا پورن ماشی کی رات یہ جادو کی پتلیاں نیچے اترتی ہیں اور پورن بھگتی کرتی ہیں۔ میری نگاہ سندری پر پڑی۔ وہ آنکھیں پھاڑے ششدر بیٹھی تھی۔ طرح طرح کے ساز لیے چھ عورتیں

انسانی شکل اختیار کئے میرے سامنے تھیں۔ ان کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''چھ......!'' میں نے دل میں سوچا۔ پہلے یہ سات تھیں۔ ایک میں نے کشنا کی شکل میں ہلاک کر دی تھی۔ بہت سی باتیں خود سمجھ میں آ رہی تھیں۔ پورنیاں اس وقت میرے پاس آتی ہیں جب میں پورے چاند کے نیچے کسی کھلی جگہ موجود ہوں۔ کسی بند جگہ وہ نہیں آتیں۔ انہوں نے وہی کھیل شروع کر دیا جو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ سندری زمین پر اوندھی ہو گئی تھی۔ بہت دیر تک ان کا عمل جاری رہا پھر معمول کے مطابق ختم ہو گیا اور پورنیاں واپس چلی گئیں۔

''سندری...... سندری!'' میں نے سندری کو پکارا مگر وہ کسی اور ہی جہان کی سیر کر رہی تھی۔ عقب سے آواز آئی تو میں ایک دم گھوم کر پیچھے دیکھنے لگا۔ کالی داس کا منحوس چہرہ نظر آیا تھا۔

''جے پورنا...... جے بھگت۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

''دیوان کالی داس!''

''آپ کے چرنوں کی دھول بھگت۔''

''کہو...... کیا بات ہے۔''

''آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے مہاراج!''

''کہاں......؟''

''کالی نواس!''

''یہ کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے مہاراج!''

''کیا کرنا ہے مجھے وہاں جا کر۔''

''ساری باتوں کے فیصلے ہو جائیں گے مہاراج! اس کے بعد کوئی راز، راز نہیں رہے گا پورنا! آخری باتیں کرنا چاہتی ہیں مہا دیوی آپ سے!'' کالی داس نے ادب سے کہا۔

''کیا باتیں کرنا چاہتی ہیں، آخر مجھے بتاؤ۔''

''دھول ہوں آپ کے چرنوں کی مہاراج! آپ سورج سمان ہیں، میں ذرہ۔ میں ایسی باتیں کیا جان سکتا ہوں۔ سولہ سو ستر منتروں کی سوگند مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''چلو۔'' میں نے گردن ہلا دی اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ باغ کے دور دراز گوشے میں جہاں میں آج تک نہیں آیا تھا، ایک مصنوعی پہاڑی ٹیلا بنا ہوا تھا جس پر جگہ جگہ پھولوں کے جھاڑ اُگے ہوئے تھے۔ نیچے ایک قد آدم چوکور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ کالی داس مجھے اس دروازے سے اندر لے گیا۔ باہر سے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا اور تاریکی نظر آتی تھی لیکن اندر ایک چوڑی سرنگ سی تھی جہاں خوب روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور یہ روشنیاں دیواروں میں لگے ہوئے پتھروں سے ابھر رہی تھیں۔ یقیناً یہ قیمتی ہیرے تھے جو کرنیں بکھیر رہے تھے۔ کالی داس نے کہا۔ ''چلتے رہیے مہاراج! سرنگ لمبی ہے۔''

''کہاں تک گئی ہے یہ؟''

''کالی نواس تک مہاراج!''

''کیا کالی نواس اسی محل میں ہے؟''

''نہیں مہاراج......!''

''پھر......؟''

''وہ کالنکا بھنڈار میں ہے۔''

''تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ زیادہ دور نہیں ہے۔''

''بس مہاراج، یہ سرنگ طے کرنی پڑے گی۔'' کالی داس نے کہا۔ وہ بڑا باادب نظر آرہا تھا۔ وہ مجھ سے کئی قدم پیچھے چل رہا تھا۔ لمبی سرنگ میں سیکڑوں مشعلوں سے روشنی کی گئی تھی۔ بالآخر اس کا اختتام ایک روشن دروازے پر ہوا اور میں نے اس دروازے کے دوسری طرف قدم رکھ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری طرف قدم رکھ کر مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ ایک عظیم الشان غار تھا جس کی بلندی ناقابل یقین تھی۔ پوری گردن پیچھے کرکے اوپر دیکھا جاتا تو چند چھوٹے چھوٹے سوراخ نظر آتے تھے جن کے اوپر چاند چمک رہا تھا۔ غار ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اس میں پتھر کے ستون تھے اور ہر ستون پر انسانی کھوپڑیاں سجی ہوئی تھیں۔ ان کھوپڑیوں کے جبڑے ہل رہے تھے اور آنکھوں سے تیز روشنیاں خارج ہو رہی تھیں۔ غار کے عین درمیان سنگ موسیٰ سے بنا ہوا ایک کالا چبوترہ تھا اور اس چبوترے پر کالی دیوی کا عظیم الشان مجسمہ ایستادہ تھا۔ سیاہ رنگ کا مجسمہ! جس کے بے شمار ہاتھ تھے۔ ان ہاتھوں میں قدیم ہتھیار اور دو انسانی کھوپڑیاں تھیں جنہیں بالوں سے پکڑ کر لٹکایا گیا تھا۔ ان کی کٹی ہوئی گردنوں سے تازہ تازہ لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے جو نیچے سنگی چبوترے پر جمع ہو رہے تھے۔ اصلی خون تھا اور شاید یہ کٹی ہوئی گردنیں بھی تازہ تھیں۔ نہ جانے کون بدنصیب تھے۔ مجسمے کی گردن میں تقریباً بیس انسانی کھوپڑیوں کو پرو کر ہار ڈالا گیا تھا۔ اس کی کئی فٹ لمبی زبان لہو سے لتھڑی ہوئی باہر لٹک رہی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں سے وحشت نمایاں تھی۔ اس ہیبت کے ساتھ یہ بت اس سنگی چبوترے پر آویزاں تھا۔ سنگی بت کے عقب میں ایک عجیب سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ کوئی پچاس سیڑھیاں تھیں جو ایک پلیٹ فارم پر جاکر ختم ہوگئی تھیں۔ پلیٹ فارم پر ایک عجیب سا شکنجہ لگا ہوا تھا جس کے اوپری حصے میں زنجیریں اور حلقے نظر آتے تھے۔ الغرض ایک تھرا دینے والی جگہ تھی اور میں اسے دیکھ کر ایک انوکھے خوف کا شکار ہو گیا تھا۔

''یہ کالی نواس ہے مہاراج!'' کالی داس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اسے بغور دیکھا پھر کہا۔ ''مجھے کیا کرنا ہے؟''

''مہا دیوی!'' کالی داس نے ایک سمت اشارہ کرکے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ میں نے مہا دیوی کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ بے حد چست لباس پہنے ہوئے تھی جو جھلملا رہا تھا۔ سر پر ہیروں کا ہار پہنا ہوا تھا، چہرہ انگاروں کی طرح چمک رہا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی شان سے آرہی تھی۔ اس کے پیچھے شمبھو آرہا تھا جس کی گردن میں ناگ لپٹا ہوا تھا جس نے اپنا چوڑا پھن اس کے سر پر پھیلا رکھا تھا۔ دونوں اسی سمت آرہے تھے۔ چند لمحات کے بعد وہ میرے سامنے پہنچ گئے۔

''جے پورن بھگت......!'' مہاوتی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے پھر کہا۔ ''پدھاریئے مہاراج......! آج میں آپ کے شایان شان سواگت کروں گی۔ پدھاریئے!'' کالی داس نے اس دوران نہ جانے کہاں سے ایک کرسی لاکر رکھ دی تھی مگر میں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

''اب کیا چاہتی ہو مہاوتی......؟'' میں نے کہا۔

''آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں مہاراج!''

''کہو......!''

''آپ بیٹھ جایئے۔''

''نہیں! تم بیٹھو۔''

''ہم کالی کے چرنوں کے سوا کہیں نہیں بیٹھتے۔ آپ کیوں نہیں بیٹھ رہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''پورن! کالی کو تو ماننا ہوگا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ کرسی کو ایک ٹھوکر مار کر میں نے اس جگہ سے ہٹایا اور بیٹھ گیا۔ مہاوتی، شمبھو اور کالی داس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری کے آثار نظر آئے مگر مہاوتی نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ ''شمبھو مہاراج کا کہا ٹھیک نکلا۔

پورن! کیا تم مجھ سے سچ بولو گے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی مگر میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ''کیا تم مسلمان ہو؟'' کمبخت نے ایسا سوال کیا کہ مجھے بولنا پڑا۔

''الحمدللہ۔'' وہ تینوں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مہاوتی نے پھر کہا۔ ''یہ پورنیاں تمہیں کہاں سے مل گئیں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بڑے پریشان تھے ہم۔ ایک نظر میں ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ تم پورنا ہو مگر مسلمان بنے ہوئے تھے تم۔ یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر کسی طرح بھید نہ کھلا، ہر جتن کرلیا اور پھر پورن ماشی میں ہم نے پورنیاں دیکھیں۔ کوئی شک نہیں رہا اور یہ بھی شک نہیں رہا کہ تم مسلمان ہو۔ مگر تمہارا دھرم اب تمہارا نہیں رہا۔ پورنیاں اس سے ملتی ہیں جب کالا دھرم اپنا لیا جائے۔ ایک پوتر دھرم جو ہر گندگی سے پاک ہے۔ اس کالے دھرم کے ساتھ کیسے چل رہا ہے۔''

میں چونک پڑا۔ مہاوتی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں شہد گھول گئے تھے۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دوبارہ اپنے الفاظ کہو۔''

''تمہارا دھرم پاک ہے۔ جس دھرم میں پانچ مرتبہ وضو کیا جاتا ہے، گندے پانی کی ایک چھینٹ جسے ناپاک کر دیتی ہے، اس میں پورنیوں کے جاپ کی کیا گنجائش ہے، کالی شکتی تو ایک دور کی چیز ہے۔''

''تیرا کیا خیال ہے مہاوتی، میں کون ہوں؟''

''من سے مسلمان ضرور ہو۔ نہ ہوتے تو اتنے کشٹ نہ اٹھاتے۔ پورنیوں کے بیر تمہارے لیے سب کچھ کر سکتے تھے، مگر تم نے کبھی ان سے بات نہ کی۔ ہم نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا، تم سمجھ میں نہیں آئے۔''

''تیرے لیے میرے دل میں بہت کچھ ہے مہاوتی! مگر میرے دین کے لیے اتنے اچھے الفاظ کہہ کر تو نے میرا دل نرم کر دیا ہے۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو اس وقت میں تجھے انعام دے دیتا۔'' مہاوتی یہ سن کر اچھل پڑی۔ اس نے کہا۔

''مسلمان ہو تو زبان کے پکے بھی ہو گے؟''

''ہاں! ہوں۔''

''ساری باتیں بیکار ہوگئیں۔ تم نے کہا ہے کہ تمہارے پاس کچھ ہوتا تو اپنے دھرم کے نام پر مجھے دے دیتے۔''

''ہاں اپنے ایمان کے علاوہ۔''

''تو مجھے انعام دو۔ تمہارے پاس ایک ایسی چیز ہے جو مجھے دے سکتے ہو، تمہارے دھرم کے علاوہ۔''

''کیا......؟'' میں نے سوال کیا۔ میں کچھ حیران ہوگیا۔ عجیب سا لگ رہا تھا مجھے۔ کیا مانگنا چاہتی ہے وہ۔ ایسی کیا چیز ہے میرے پاس۔ ادھر اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑی چیز مانگنا چاہتی ہو۔

مہاوتی کا انداز ایک دم بدل گیا۔ وہ کسی ایسے خیال میں ڈوب گئی جس نے اس کی سانسیں تیز کر دیں۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ پھر اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''پورنیاں مجھے دے دو، یہ چھ پورنیاں مجھے دے دو۔ مسلمان ہو، پورنیاں تمہارے دھرم میں ناپاک ہیں۔ یہ بوجھ کیوں اٹھائے پھر رہے ہو؟ دے دو یہ پورنیاں مجھے، انعام میں دے دو۔'' اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں اس کے جملوں پر غور کرنے لگا۔ پورنیاں اس طرح کسی کو دی جاسکتی ہیں؟ میں تو خود انہیں ہلاک کرنا چاہتا تھا، میں تو خود ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو میری روح پر بوجھ تھیں۔ بڑی مشکل سے ان میں سے ایک سے چھٹکارا حاصل ہوسکا تھا۔ کیا ان سے پیچھا چھڑایا جاسکتا ہے؟ مہاوتی سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔ میں نے بہت دیر غور نہیں کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔

''ٹھیک ہے مہاوتی! مسلمان ہوں، اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ یہ چھ پورنیاں میں نے تیرے حوالے کیں مگر میں نہیں جانتا کہ مجھے اس کے لیے کیا عمل کرنا ہوگا؟ یہ تیری ذمہ داری ہے، میں اپنا وعدہ خوشی سے پورا کرتا ہوں۔''

مہاوتی کے پورے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ شمبھو اور کالی داس ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور خوشیاں منانے لگے۔ مہاوتی آگے بڑھی، گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی، دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور سر جھکا کر سجدے کی سی کیفیت میں آگئی۔ میں نے فوراً ہی رخ بدل لیا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی پھر سیدھی ہوئی اور اس نے مجھے پکارا۔

''پورنا...... پورنیاں ہمیں دے کر تو اپنے بوجھ سے آزاد ہو جائے گا۔ تو سچ مچ مسلمان لگتا ہے مگر میرا گیان مجھے یہ نہیں بتا پاتا کہ پورنیاں ایک مسلمان کی غلام کیسے ہوگئیں۔ چلو ہوگا۔ تیری یہ بھینٹ ہم سویکار کرتے ہیں اور تیرا احسان مانتے ہیں لیکن یہ کام جلدی ہو جانا چاہئے۔ ارے کالی داس...... شمبھو مہاراج! دیر کیوں کر رہے ہیں۔ آپ جلدی کریں، جلدی کریں۔ کام پورا کرلیں، اسے مہان کنڈ لے جائیں۔ شمبھو مہاراج...... کالی داس جلدی کریں۔ میں پورنا بننے جا رہی ہوں۔ جلدی کریں۔'' وہ اِدھر سے اُدھر بھاگنے دوڑنے لگی۔

شمبھو اور کالی داس میرے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے گردن جھکا کر کہا۔ ''ہمارے ساتھ آئیں مہاراج۔'' میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اب نتیجہ کچھ بھی ہو، یہ پورنیاں مجھ سے منتقل ہو جائیں تو کم از کم میرے وجود کی غلاظت ڈھل جائے۔ وہ مجھے اس طرف لے گئے جہاں سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں اور پھر انہوں نے بڑے احترام سے مجھے اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ کچھ سمجھ نہیں پایا تھا اور صرف ان کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں اس پلیٹ فارم پر پہنچ گیا جو کالی کے ہیبت ناک مجسمے کے عین سر پر بنا ہوا تھا۔ بڑی عجیب سی جگہ تھی۔ ایک عجیب سی بدبو وہاں پھیلی ہوئی تھی، زمین پر خون کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہوتا ہوگا۔ دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ انسانی خون ہے اور ہو سکتا ہے یہاں انسانی جسم ذبح کر کے ان کا خون کالی کے بت پر گرایا جاتا ہو۔ گویا قربانی کی وہ بھیانک رسم جس کے بارے میں قصے کہانیوں میں ہی پڑھا تھا لیکن اچانک ہی ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ پورنیاں اسے دینے کا کیا مقصد ہے۔ کیا یہاں میری بھی گردن کاٹ دی جائے گی؟ شمبھو اور کالی داس کچھ فاصلے پر رک گئے تھے اور میں پلیٹ فارم کے بالکل آخری سرے پر تھا۔ کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک ہی میرے پیروں میں دونوں طرف سے زنجیروں کے دو کڑے آپڑے۔ ان سے زنجیریں بھی منسلک تھیں مگر کچھ ایسے انداز سے کہ اوپر سے نظر نہیں آتی تھیں۔ پھر اچانک سر چکرا سا گیا۔ پلیٹ فارم کو جنبش ہوئی۔ ایک چوڑی سل اچانک ہی آگے بڑھی۔ میں اس پر کھڑا ہوا تھا۔ بدن کو جھٹکا لگا تو اوندھے منہ گر پڑا لیکن سل برق رفتاری سے پیچھے ہٹ کر واپس اپنی جگہ پہنچ گئی اور پورا پلیٹ فارم اتنی تیزی سے پیچھے ہٹا کہ میں اوندھا لٹک گیا۔ زنجیریں پلیٹ فارم کے اوپری حصے پر بنے ہوئے ایک کرین نما راڈ میں پڑی ہوئی تھیں۔ یوں میرا چہرہ پلیٹ فارم سے ٹکرانے سے بچ گیا لیکن اب کیفیت یہ تھی کہ میں ان زنجیروں میں اوندھا لٹکا ہوا تھا اور کالی کے بت کے بالکل اوپر تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے میں جمع ہوگیا تھا۔ ٹانگوں میں سخت تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ فولادی کڑے میری ہڈیوں کو دبا رہے تھے۔ میرے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ پہلے تو بدن کو کچھ جنبشیں دیں لیکن جب اس عمل سے تکلیف کے علاوہ کچھ نہیں ملا تو ساکت ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ ہاتھ نیچے لٹکے ہوئے تھے اور اس وقت کی کیفیت کو میں الفاظ میں بیان کرنے کے قابل نہیں تھا۔ دماغ شدید ہیجان کا شکار تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی اہلیت نہیں رہی تھی۔

شمبھو، کالی داس اور مہاوتی اب ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اوپر دیکھ رہے تھے۔ میں سخت پریشان تھا۔ چیخ کر انہیں اپنی تکلیف کے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر نہ جانے کہاں سے مہاوتی نے ایک تیر کمان اٹھا لیا۔ چوڑے پھل کی چمکدار انّی والا تیر تھا جسے وہ کمان میں جوڑ رہی تھی۔ میری آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں اور میں اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔ بارہا موت کو پکارا تھا، زندگی کو بے حقیقت جانا تھا لیکن اب جبکہ موت نگاہوں کے سامنے پہنچ گئی تھی تو زندگی مچل رہی تھی۔ جینا چاہتا تھا اور اس آفت سے چھٹکارا پانے کا خواہشمند تھا۔ مہاوتی کا چھوڑا ہوا تیر میری گردن کے پاس شانے میں پیوست ہوگیا۔ حلق سے دلخراش چیخ نکلی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس قدر شدید تکلیف ہوئی تھی کہ جو ناقابل بیان تھی۔ میں اچھل کر تیر کو اپنے شانے سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن توازن نہیں بن پا رہا تھا اور مہاوتی دوسرا تیر کمان

میں جوڑ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور موت کو یاد کرنے لگا۔ چلو ٹھیک ہے، زندگی کا یہ اختتام برا تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہے مسعود احمد! موت قبول کرلو۔ جو کیا، سو پایا۔ اس میں کسی کا کیا قصور! کسی کو الزام دے کر سب کو مزید تباہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح یہ سوچیں ذہن تک پہنچیں۔ کرب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ دونوں شانے خون اگل رہے تھے اور پھر تیسرا تیر، پھر چوتھا! اب ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ آنکھوں سے بینائی رخصت ہوگئی تھی۔ بس دھندلے دھندلے نقوش تھے۔ ایک بڑا سا چمکدار پیالہ کالی کے بت کے قدموں میں رکھ دیا گیا تھا۔ مہاوتی کا جسم پھر ویسا ہی سیاہ ہوگیا تھا جیسا میں نے اسے اس پہاڑی غار میں دیکھا تھا۔ مدھم مدھم شور کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ قہقہے ابل رہے تھے اور مہاوتی رقص کر رہی تھی، ایک جنونی رقص......! وہ پورے ہال میں برق کی طرح کوندتی پھر رہی تھی۔ شمبھو اور کالی داس نظر نہیں آرہے تھے۔ مہاوتی بار بار کالی کے قدموں میں آتی اور میرے جسم سے بہنے والا خون چاٹتی پھر رقص کرتی ہوئی دور نکل جاتی۔ کالی کا ہیبت ناک مجسمہ میرے خون سے سرخ ہوگیا تھا۔ اس پر سیاہی کے بہت کم دھبے نظر آرہے تھے۔ بس مجھے نظر نہیں آرہا تھا لیکن یہ دھندلا دھندلا سا احساس تھا جو میرے ذہن پر سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ پھر کچھ سکون سا خود بخود محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے میرا بدن بے خون ہوگیا ہو۔ ٹانگوں میں پڑے ہوئے کڑے بھی اب ہڈیوں کو وہ دکھ نہیں دے رہے تھے جو پہلے محسوس کر رہا تھا۔ بس کوئی احساس ہی باقی نہیں رہا تھا۔ اگر یہ منظر نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا، مہاوتی کے جسم کی جنبشیں نظر نہ آتیں تو یہ سمجھتا کہ روح جسم سے نکل گئی ہے اور جسم خالی ہونے کے بعد بے وزن ہوگیا ہے۔ نگاہوں کے سامنے جو کچھ تھا، وہ ذہن تک بھی پہنچ رہا تھا۔ مہاوتی کے ہاتھ میں ایک چمکدار پیالہ تھا جس کے دونوں سمت کنڈے لگے ہوئے تھے، وہ کالی کے سامنے دوزانو بیٹھی تھی۔ میرے جسم کا بہا ہوا خون جو ایک دھار کی شکل میں اس پیالے تک پہنچا تھا، ہونٹوں سے لگا کر بدن میں اتارنے گی۔ گاڑھا گاڑھا گہرا سیاہ خون اس کے جسم میں اترتا چلا گیا اور اس نے پیالے کو اپنی لمبی زبان سے چاٹنا شروع کردیا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کالی کے بت سے چمٹ کر اس پر پڑا ہوا خون چاٹنے لگی۔ پھر اس نے چند بوندیں انگلی میں ڈبو کر کالی داس اور شمبھو کی طرف اچھالیں اور وہ کتوں کی طرح زمین پر گرنے والی بوندوں کو چاٹنے لگے۔ مہاوتی کے قہقہے اس ہال میں بری طرح گونج رہے تھے اور اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"میں پورنی ہوں...... میں پورن واس ہوں، میں پورن واس ہوں۔ شمبھو مہاراج...... کالی داس! جھک جاؤ میرے چرنوں میں، میں چھ پورنیوں کی مالک ہوں۔ میں نے مہان شکتی حاصل کرلی ہے۔ جھک جاؤ میرے چرنوں میں، جھک جاؤ۔ اب میں صرف مہاوتی نہیں بلکہ مہان وتی ہوں۔ جھک جاؤ...... جھک جاؤ۔"

کالی داس اور شمبھو ناتھ اس کے سامنے اوندھے گر پڑے تھے اور مہاوتی کے خوفناک قہقہے غار کے درو دیوار ہلائے دے رہے تھے۔ بہت خوش تھی وہ...... میری طرف کسی کی کوئی توجہ نہیں تھی۔ میرے جسم میں اب بھی تیر چبھے ہوئے تھے لیکن اب کوئی تکلیف نہیں تھی بلکہ ایک عجیب سی ٹھنڈک رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ پھر کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ اچانک ہی تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے اور ہر چیز اڑنے لگی۔ مہاوتی سیدھی کھڑی ہوگئی۔ شمبھو اور کالی داس بھی اس کے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ چمکدار ذرات کا ایک غبار غار کے اندر داخل ہوا اور پورے غار میں پھیل گیا۔ پھر اس نے سمٹ کر ایک شکل اختیار کرنا شروع کردی اور کچھ دیر کے بعد وہاں بھوریا چرن نظر آیا۔ وہی بدنما اور بدہیئت شکل لیے۔ وہ خونخوار نگاہوں سے مہاوتی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار نظر آرہے تھے۔ مہاوتی اور اس کے دونوں ساتھیوں نے بھوریا چرن کو دیکھا اور بھوریا چرن کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ پھر اوپر مجھ تک پہنچ گئیں اور اس کا چہرہ بگڑ گیا۔

"مہاوتی...... مہاوتی کالی کی پجارن! یہ ادھار کی شکتی اچھی تو نہیں ہے۔ تو نے اپنے گیان سے یہ بھی نہ معلوم کیا کہ اس مسلمان کو یہ شکتی کہاں سے مل گئی؟"

"جے شنکھا مہاراج! کیسے پدھارے، کیسے آنا ہوا؟"

"تجھے بتانے آیا ہوں مہاوتی کہ تو نے چور دروازے سے پورن شکتی حاصل تو کرلی مگر چھ پورنیوں کی! ساتویں پورنی

کہاں ہے، بتائے گی؟"
"یہ بات تو شاید شنکھا بھی نہ بتا سکے شنکھا مہاراج......!"
"پاگل مہاوتی! پورن شکتی میں نے ہی اسے دی تھی۔ میں نے پورن جاپ کیا تھا اور پورنیاں اس کے شریر میں اتار دی تھیں اور تو نے میری کمائی ہوئی چیز اس سے چھین لی۔ ساتویں پورنی کو اس نے مار ڈالا ہے اور تو یہ بات اگر نہیں جانتی تو مجھ سے سن لے کہ اگر پورنیاں سات نہ ہوں تو پورن پورا نہیں ہوتا، ادھورا رہتا ہے اور ایسے جاپ، ایسے منتر، ایسے گیان ہیں جو لنگڑے پورن کو بڑا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں ہے مہاوتی...... ! لیکن اس بات پر جھگڑا ہو سکتا ہے کیونکہ تو نہیں جانتی کہ اس سے پورن شکتی چھین کر تو نے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اسے پورن بنا کر میں نے جو بڑا کام کیا تھا، وہ تو نہیں جانتی کہ وہ تیرے اور میرے اور ہمارے جیسے ہزاروں کے لیے کتنا بڑا کام تھا۔ عورت ہے نا باؤلی! عورت ہے نا......! اگر عقل ہوتی تو آگے پیچھے دیکھ لیتی۔"
"جے شنکھا...... جے مہاراج......! شنکھا مہاراج میرے گھر پدھارے۔ میرا بڑا مان ہوا لیکن اس سے میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں۔ نہ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے، نہ سمجھ پاؤں گی۔ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں مہاراج! سچ کہہ رہے ہوں گے لیکن اگر آپ نے یہ شکتی اسے دے دی تھی تو دے کر آپ پیچھے ہٹ گئے تھے اور اس نے اپنی خوشی سے وہی چیز مجھے دے دی۔ بہرحال اس کا برا نہ مانیں۔"
"وہی تریا ہٹ وہی عورت والا کھیل! چل ٹھیک ہے۔ میں تو اپنا بچاؤ کر لوں گا، تجھے بھی پورن شکتی کا مزہ آئے گا۔ ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ اس کا کیا کرے گی اب؟"
"کس کا مہاراج؟"
"یہی پاگل کتا جو نجانے کیا کیا کرتا رہا جیون بھر، جس نے اپنی ذات کو کشٹ دیئے ہیں ہمیشہ۔ کیا نہیں ملا اسے اور کیا لیا اس نے اس سے، یہ کتا مجھے دے دے مہاوتی! اس کتے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ بڑا مہان بنتا ہے۔ سات پورنیوں کا پورن تھا۔ کبھی کسی سے کوئی کام نہیں لیا، کشٹ میں پڑا رہا، تکلیفیں اٹھاتا رہا، بھوکا پڑا رہا، بیمار پڑا رہا لیکن بیروں کو نہ پکارا۔ ارے دے دے اسے اس پاپی کو بہت کچھ دکھانا ہے اسے سنسار میں ابھی، ایسے تھوڑی مرنے دوں گا۔ سارا خون دے دیا بدن کا۔ سترہ آدمی مارے تھے میں نے اس کے لیے، نکال دیا سارا خون بدن سے اور اب پڑا ہے بلی کا کھایا چھچھڑا......! دھت تیرے کی۔ لا اتار اسے...... اتار دے اسے!"
"بیرو...... بیرو......" مہاوتی نے آواز دی اور پورا غار ان ٹیڑھے میڑھے ناپاکوں سے بھر گیا۔ جو پہلے میرے تھے اور اب مہاوتی کے غلام تھے۔ وہ سب مہاوتی کے سامنے جھک گئے۔ مہاوتی کی آنکھوں میں فخر اتر آیا اور اس نے فاتحانہ نگاہوں سے بھوریا چرن اور اس کے بعد شمبھو اور کالی داس کو دیکھا۔ پھر بولی۔
"بیرو......! شنکھا یہ شریر مانگتا ہے۔ دے دو اسے، اتار دو یہ شریر اوپر سے!" سارے بیر اوپر کی جانب دوڑے اور انہوں نے مجھے احتیاط سے نیچے اتار کر زمین پر ڈال دیا۔ میرا جسم تو اب جسم تھا ہی نہیں بس ایک بے جان گوشت کا لوتھڑا تھا۔ پتا نہیں شکل وصورت کیسی ہو گئی تھی۔ دیکھ رہا تھا، سوچ رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔ بول نہیں پا رہا تھا۔ اپنے چیخنے کی آواز بھی بلکہ کراہ تک منہ سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ بھوریا چرن شدید غصے میں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اوپر کیا۔ چمڑے کا ایک پٹا اور زنجیر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے پٹا میری گردن میں ڈالا، زنجیر اپنی مٹھی میں پکڑی اور مجھے گھورتا ہوا بولا۔
"ہاتھ، پیروں کے بل چلتا میرے ساتھ آ جا۔ چل اٹھ۔" اس نے آگے بڑھ کر ایک لات میرے جسم پر رسید کی اور میں اپنے بدن کو سنبھال کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن کتے کی طرح نہیں چل سکا بلکہ اپنے پیروں پر ہی کھڑا ہو گیا۔ بھوریا چرن نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"اگر تو چاروں ہاتھ، پیروں کے بل نہیں چلا تو میں تجھے آگ میں جلا دوں گا۔ کتا بن جا کتے! کتا بن جا......!" اس کی

آواز میرے حواس پر مسلط ہونے لگی اور اس کے بعد میں دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ غار سے باہر آ گیا اور بھوریا چرن نے ایک عجیب سی سمت کا رخ کیا۔ آنکھوں میں دھندلاہٹیں تھیں اور بدن میں لرزشیں۔ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ کنکر، پتھر ہاتھوں اور پیروں میں چبھ رہے تھے لیکن انہی کے بل چلنا تھا۔ پھر شاید بدن کے نیچے گھاس آئی اور میں جانوروں ہی کی طرح اوندھا اس گھاس پر لیٹ گیا۔ بھوریا چرن نے زنجیر ایک طرف ڈال دی اور خود ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ نجانے پرانی حویلی سے کس طرح باہر نکل آیا تھا۔ نجانے کتنا فاصلہ طے کر کے کہاں پہنچ گیا تھا۔ اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بھوریا چرن سامنے موجود بھی ہے یا نہیں یا زنجیر ڈال کر کہیں چلا گیا تھا، کسی بات کی تصدیق نہیں ہو سکتی تھی۔ نجانے کب تک اسی طرح پڑا رہا اور نجانے کیا کیا کیفیات مجھ پر بیتتی رہیں۔ میرے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ نکل گیا تھا یا پھر کچھ خون باقی تھا۔ یقیناً باقی تھا۔ نہ ہوتا تو اعضاء کو جنبش کیسے دیتا۔ گردن اٹھائی تو یوں لگا جیسے سر کا وزن منوں بڑھ گیا ہو۔ بمشکل تمام آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو محسوس ہوا جیسے پپوٹے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے لیے تیار نہ ہوں۔ آہ کاش! کچھ ہو جائے، اس عالم میں ہی کچھ ہو جائے۔ دم نکل جائے میرا...... ! بہتر یہی ہوگا۔ بے جان جسم، بند آنکھیں، بھاری دماغ یہ بھی کوئی زندگی ہے اور اس طرح بھی کیا زندہ رہنے میں مزہ آتا ہے۔ سوچیں، سوچیں، سوچیں صرف سوچیں...... ! اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی سوچ ترتیب سے نہیں تھی۔ بس نجانے کیا کیا خیالات ذہن سے گزر رہے تھے۔ ایک بار یہ بھی سوچا کہ مہاوتی کی بات مان کر میں نے غلط تو نہیں کیا۔ مجھ سے تو پورنیوں کو قتل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ میں انہیں دان کر دوں۔ کیا پھر مجھ سے غلطی ہو گئی؟ پورنیوں سے چھٹکارا ہی حاصل کرنے کے لیے کہا گیا تھا مجھ سے، کر لیا۔ جہاں تک کوشش ہو سکی، ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ رعایت ملنی چاہئے، ملنی چاہئے۔ بھوریا چرن کی آواز نے خیالات کا طلسم توڑ دیا۔ پکار رہا تھا مجھے، کہنے لگا۔

''ارے او مہان پرش! ذرا گردن تو اٹھا رے۔ بہت بڑا انسان ہے تو...... بڑا دھرماتما ہے۔ اب بول کیا بیت رہی ہے۔'' میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ بھوریا چرن کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میرے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر بھوریا چرن اور آگ بگولہ ہو گیا۔ ''بڑا بے غیرت ہے بھئی! نہ دیکھے تیرے جیسے، نہ دیکھے۔ حالت بکٹ ہے اور دانت نکل رہے ہیں۔''

''میرے دین میں اسے صبر کہتے ہیں بھوریا چرن!''

''چنتا مت کر بچے سارا جیون صبر ہی کرنا پڑے گا۔''

''مجھ سے زیادہ تیری حالت خراب ہے بھوریا!''

''لات دوں گا جبڑا ٹوٹ جائے گا۔ زیادہ بک بک مت کر! کوئی نہ بچا سکے گا اب۔ نہ تیرا دھرم، نہ بیر، سب کچھ دے دیا اسے باپ کا مال سمجھ کر۔''

اس بار مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔ بھوریا چرن کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ اپنی تمام تر تکلیفوں کے باوجود میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا اور اس بات سے وہ بالکل ہی دیوانہ ہو گیا۔ دانت پیس کر آگے بڑھا۔ میرے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پھر بولا۔

''مرے ہوئے کو کیا ماروں۔ ایسا مرے گا، ایسا مرے گا کہ دیکھنے والے کان پکڑیں گے تجھے دیکھ کر۔ ایسا بدلہ لوں گا تجھ سے کہ سنسار میں کسی نے کسی سے ایسا بدلہ نہ لیا ہوگا۔ تو نے میرا تو ستیاناس کیا ہی ہے مگر بیٹا! اپنا بھی ستیاناس دیکھنا۔ ابھی کیا دیکھا ہے تو نے۔ بدلہ لوں گا تجھ سے! بدلہ لوں گا۔ ایسا بدلہ لوں گا کہ یاد کرے گا۔ ایسے گھاؤ لگاؤں گا تیرے دل میں کہ میرے من کے سارے گھاؤ بھر جائیں گے۔ چل اٹھ اور اب تو بول کر دکھا نا ذرا! دیکھوں گا کیسے تیری زبان چلتی ہے۔'' اس نے جھک کر زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی۔ میرے قریب پہنچا اور یہ مٹی میرے منہ میں بھر دی۔ عجیب غلیظ سی مٹی تھی۔ بدبودار! میں تھوتھو کرنے لگا۔ مجھے ابکائیاں آنے لگیں مگر جسم اس طرح بے جان تھا کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً ہاتھوں اور پیروں کے بل چل کر یہاں تک جو آیا تھا تو وہ بھی بھوریا چرن ہی کی دی ہوئی قوت تھی ورنہ جس شخص کے جسم سے سارا خون بہہ

جائے، وہ جنبش کیسے کر سکتا ہے۔
بمشکل تمام منہ کی مٹی صاف کی اور اس کے بعد بھوریا چرن کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔
''اب ذرا ایک لفظ بھی بول کر دکھا دے اپنے منہ سے! بول دکھا اپنے منہ سے ایک لفظ بول کر مان لیں گے تیرے کو، کہ بہت دھرماتما ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔
''ارے اونواب کے جنے! ذرا چل آگے بڑھ۔'' اس نے زنجیر پکڑی اور مجھے گھسیٹنے لگا۔ گھسیٹتا ہی رہا تھا۔ نجانے کتنی دور تک گھسیٹتا رہا تھا۔ پھر شاید کوئی آبادی آگئی تھی۔ دماغ تو ساتھ دے نہیں رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز تھی جس نے یہ احساس دلایا تھا کہ اس وقت کسی آبادی کے قریب سے گزر رہا ہوں میں۔ نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے اور پکی زمین تھی۔ پتا نہیں بدن کی کیا حالت ہو رہی تھی۔ پتا نہیں میرا جسم گھسٹ رہا تھا یا شاید مردہ حالت میں مجھے گھسیٹے لے جا رہا تھا۔ پھر اس نے میری زنجیر چھوڑ دی، پٹا گلے سے نکال دیا اور مجھے وہیں ڈال کر کہیں چلا گیا۔ میں آسمان کو دیکھتا رہا، چت پڑا رہا۔ نجانے کیا کیفیت ہو رہی تھی۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بہت دیر کے بعد بھوریا چرن واپس آیا۔ خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے آواز دی تو میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔
''کہو تیا گی جی مہاراج! کیسے حال ہیں تمہارے......؟'' میں نے بولنے کی کوشش کی۔ منہ کھلا لیکن آواز غائب ہو چکی تھی۔ بہت ہی زور لگایا۔ پتا نہیں جسم کی کمزوری تھی یا پھر بھوریا چرن نے جو حرکت کی تھی، اس کا نتیجہ۔ بولنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو وہ قہقہے لگانے لگا۔ خوب ہنسا پھر بولا۔
''بھوک لگ رہی ہوگی ایں! لگ رہی ہے نا بھوک...... کھانا کھلائیں تمہیں۔ لو یہ کھا لو۔'' اس نے ایک برتن سامنے کیا۔ ایک عجیب سی تعفن زدہ چیز تھی۔ وہ اس نے میرے چہرے کے بالکل قریب کر دی۔ ایک بار پھر حالت بگڑنے لگی تھی۔
''ڈرو نہیں مہاراج! بہت اچھا بھوجن ہے۔ گائے کا گوبر ہے۔ یہ کھا لو...... کھا لو۔ بہت اچھا ہوتا ہے اور پھر ہے بھی گائے کا، لو!'' اس نے پلیٹ میرے منہ پر پھینک دی اور گوبر میرے چہرے پر جگہ جگہ تھپ گیا۔ ہاتھ اٹھا کر بمشکل تمام چہرہ صاف کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بھوریا چرن کہنے لگا۔
''چلو یہ بھوجن ناپسند ہے تو ادھر دیکھو، وہ کھا لو'' اس نے پاؤں سے میرا رخ دوسری جانب کر دیا۔ ایک گندی نالی تھی جس میں سفید رنگ کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ بھوریا چرن ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ کیڑوں کو مٹھی میں بھرا اور میرے چہرے کے قریب کر دیا۔
''بڑے بڑھیا ہیں یہ، کھا کر دیکھو آتما کو شانتی ملے گی، پیٹ بھی بھر جائے گا۔'' میں نے وحشت کے عالم میں رخ بدل لیا اور بھوریا چرن قہقہے لگانے لگا۔ ''ستیاناس مار دوں گا تیرا ستیاناس مار دوں گا تیرا! چل اٹھ...... اٹھ۔'' اس نے جھک کر میرے بال پکڑے اور اس کے بعد مجھے سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پیروں میں بالکل جان نہیں تھی۔ کھڑا ہوا تو زمین پر گر گیا۔ پھر دوبارہ کھڑا ہوا اور دوبارہ زمین پر گر گیا۔ بھوریا چرن بدستور قہقہے لگا رہا تھا اور میں نے اپنا ذہن و دل ساکت کر لیا تھا۔ نہ غصہ آ رہا تھا، نہ افسوس ہو رہا تھا۔ بس دل میں ایک ٹھنڈک سی اتر رہی تھی اور شاید یہ ہی ٹھنڈک مجھے زندہ رکھنے کا باعث تھی۔ بھوریا چرن نے میرے منہ پر تھوکا اور اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں پڑا رہا۔ بدن میں تحریک ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور اس کے بعد وہیں رخسار زمین پر رکھ کر ساکت ہو گیا۔
موت کتنی بے رحم ہے۔ وہ جو جینا چاہتے ہیں، وہ جو زندگی کی تمام آسائشیں چاہتے ہیں، وہ جو تندرست و توانا ہیں، انہیں ایک لمحے میں لپیٹ لے جاتی ہے اور وہ جو اس کے آرزو مند ہوتے ہیں، وہ جن پر زندگی عذاب جہنم ہوتی ہے، انہیں وہ دور سے دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے۔ اس وقت موت بھی میرے قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے، کیا حرج ہے۔ ہر حالت میں شکر ہی کرنا ہوگا کیونکہ اور کچھ کر نہیں سکتا۔ پڑا رہا۔ دماغ بے جان ہو گیا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئیں۔ پھر شاید کسی نے چہرے پر پانی ڈالا تھا۔ لوٹے کی دھار سے پانی ڈالتا رہا۔ ہوش تو آ گیا تھا لیکن آنکھیں نہ کھل پا رہی تھیں۔ بدن میں توانائی سی

محسوس ہوئی۔ آنکھیں کھولیں دیکھا تو کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ ایک سنسان سڑک نظر آ رہی تھی اور میں اس سڑک کے کنارے زمین پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کون یہاں لے آیا، منظر کیسے بدل گیا۔ رفتہ رفتہ رونق ہونے لگی۔ جوں جوں روشنی جاگنے لگی، لوگ آتے جاتے نظر آئے۔ کسی نے رک کر میرے سامنے کچھ ڈال دیا۔ دیکھا تو ایک روپے کا نوٹ تھا۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں پھر کوئی اور آیا اور میری گود میں کچھ رکھ گیا۔ ٹٹول کر دیکھا تو دو پوریاں دونان پر رکھی ہوئی ترکاری تھی۔

یہ میری ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اس من وسلویٰ کو احترام سے اٹھالیا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے لگا۔ اس نعمت کو کھا کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ دل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیاس لگنے لگی تھی۔ پانی تھوڑے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ غالباً میونسپلٹی کا نلکا تھا جس سے تھوڑا تھوڑا پانی بہہ رہا تھا۔ بدن کو جنبش دی۔ پیروں سے کھڑا تو نہ ہوا گیا، گھسٹتا ہوا نلکے تک پہنچا۔ پانی پیا اور جسم آسودہ ہوگیا۔ ایک بار پھر پھل چکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر پھل چکھ رہا تھا۔ ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔

✦✤✦✤✦

سزا پوری ہونی چاہیے تاکہ جزا ملے...... میں خوش ہوں میرے معبود!...... میں خوش ہوں...... مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے...... میں بالکل مطمئن ہوں۔ میں تیری رضا میں خوش ہوں۔ بہت شکر ہے تیرا کہ تو نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں۔"

واپس پلٹنا چاہا کہ اپنے پیروں سے چلوں۔ نہ چل پایا۔ درخت کا سایہ غنیمت تھا۔ پورا دن وہی گزار دیا۔ دینے والے دیتے رہے۔ زبان ہلا کر یہ کہنے کی کوشش کی کہ یہ پیسے میرے لئے بے کار ہیں۔ اگر ہو سکے تو روٹی دے دو۔ لیکن گویائی تو بھوریا چرن لے گیا تھا۔ نہ سہی۔ دینے والے نے صبح کا ناشتہ دیا ہے تو ضرورت کے مطابق کھانا بھی دے گا اور بڑا اطمینان ہوا اس وقت جب دو تندوری روٹیاں اور ایک پلیٹ سالن جو مٹی کے ایک برتن میں تھا، لا کر میرے سامنے رکھ دیا گیا۔ میں نے بڑے اعتماد سے اسے کھایا۔ یہ جگہ بہت مناسب ہے۔ بقیہ زندگی یہاں باآسانی گزاری جاسکتی ہے۔ رزق دینے والا غافل نہیں ہے۔ کھانا مل جاتا ہے اور پانی قریب ہی موجود ہے۔ میں نے وہیں بسیرا کرلیا۔ نجانے کتنے دن گزر گئے۔ لیکن دنوں کا حساب وہ رکھیں جنہیں دنوں سے دلچسپی ہو۔ مجھے دن گننے سے کیا ملتا۔ داڑھی بڑھ گئی۔ بال بڑھ گئے۔ وقت نے شکل بدل دی۔ ہڈیاں ابھر آئیں۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے۔ صبر و سکون سے گزر بسر کرتا رہا۔ پاؤں بے جان تھے۔ قوت گویائی ختم ہو گئی تھی۔ گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا بس لیکن اس دن صبر کا پیمانہ پھر چھلکا جب میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے میرا دل سینے سے نکال لیا۔

ابا جان تھے...... ہاں...... بھلا انہیں بھول سکتا تھا؟...... بینائی بھی ختم ہو جاتی تو تب بھی انہیں محسوس کرلیتا۔ لاغر ہو چکے تھے۔ خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ دل دیکھ کر بری طرح دھڑکنے لگا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرنے کی کوشش کی۔ زبان سے انہیں پکارنا چاہا، رک گئے، مجھے دیکھا، جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا، میرے ہاتھ میں تھمایا اور وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ میں اس نوٹ کو دیکھنے لگا۔ انہیں آوازیں دینا چاہیں۔ نہ پہچان سکے تھے مجھے۔ یہ بھوریا چرن کا جادو نہیں تھا۔ یہاں دل کی گہرائیاں پکار رہی تھیں کہ وہ میرے باپ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔ نوٹ کو چومتا رہا، سینے سے بھینچ کر روتا رہا۔ پتہ نہیں آنکھوں سے آنسو نکل بھی رہے تھے یا نہیں۔ پیروں میں قوت ہوتی تو دوڑتا، ان کا پیچھا کرتا۔ کسی طرح انہیں بتا دیتا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں...... آپ کا مسعود ہوں...... دل نجانے کب تک زخموں سے چُور رہا۔ بدن کے زخم دل کے اس زخم کے سامنے بے جان ہو گئے تھے تب ہی ایک احساس دل میں ابھرا۔ کسی نے میرے کان میں کہا۔

"اور اس کے باوجود تو شکر ادا نہیں کرتا۔ کم از کم تجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ تیرے باپ زندہ ہیں۔ وہ تیرے سامنے سے گزرے ہیں۔ بے شک وہ تجھے نہ پہچان سکے۔ لیکن کیا یہ شکر کے لیے کافی نہیں ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ لیا۔"

آنکھیں بند ہوگئیں اور دل اندر ہی اندر شکر کے کلمات ادا کرنے لگا۔ آرزوئیں ہی تو اس جگہ لے آتی ہیں۔ یہ بھی ایک آرزو تھی، لیکن اللہ کی طرف سے۔ اسے یہیں تک رہنا تھا، ورنہ باپ کا خون جوش مار سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابا جان اس شہر میں موجود ہیں۔ نجانے کون سی جگہ ہے...... نجانے کون سا شہر ہے...... کسی سے پوچھنے کے لیے گویائی تو ساتھ ہی نہیں دے رہی تھی۔ صبر وسکون سے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گیا۔ وہ نوٹ میں نے سنبھال کر احتیاط سے اپنے سینے کے قریب رکھ لیا جس میں مجھے اپنے باپ کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تھا اور سینے کے قریب اس نوٹ کی قربت نے بڑی ٹھنڈی بخشی تھی۔ جلتی ہوئی روح کو، پیاسے بدن کو نہ جانے کیا دے دیا تھا اس نوٹ کے لمس نے۔

آہستہ آہستہ آسمان سے رات اترتی آ رہی تھی۔ بڑی بے چین رات گزری تھی۔ بڑا بے کل رہا تھا دن۔ تصورات نجانے کہاں کہاں پہنچ رہے تھے...... ابا جی مجھے پہچان نہ سکے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا...... پتہ نہیں ان سب کے ذہنوں میں میرا کیا تصور رہ گیا ہے۔ اب اتنے عرصے کے بعد تو وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ سوچا تو ہوگا انہوں نے کہ کہیں سے میری کوئی خبر نہیں ملی۔ تو ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ اب اس دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ میں یہاں سے جا چکا ہوں...... اچھا ہے۔ ایسا ہی ہوا ہو۔ کم از کم انہیں تو صبر آ گیا ہوگا۔ میں تو ابھی امتحان کی منزل سے گزر رہا ہوں۔ مجھے اگر صبر مل جائے تو بات ہی کیا ہے۔ آنسو نجانے کس طرح آنکھوں سے نکل آتے تھے۔ نجانے یہ ذخیرہ بدن کے کون سے گوشے میں پوشیدہ تھا۔ پھر نیند نے آغوش مادر کا کردار ادا کیا اور اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔

دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔ چلتے پھرتے انسان، انسانوں پر رحم کھاتے ہوئے۔ رزق عطا ہو جاتا تھا۔ ابھی تک اتنے دن گزر چکے تھے۔ یہاں پڑے ہوئے، ایک رات بھی بھوکا نہیں سویا تھا۔ کبھی بے بسی سے بھوک سے ایڑیاں نہیں رگڑی تھیں۔ یہ معاملہ بھوریا چرن کا نہیں تھا' بلکہ یہاں رزق عطا کرنے والے نے میرے لئے حکم صادر فرما دیا تھا کہ بھوکا نہ رہوں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کچھ فقیروں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ایک میرے قریب سے گزرا، رکا اور جھک کر بولا۔

''ابے کیوں مر رہا ہے یہاں؟ بھاگ جا۔ پولیس فقیروں کو پکڑ رہی ہے۔ اٹھا کر لے جائے گی بیٹا! اور ہڈیاں توڑ دے گی۔ ابے بھوت۔ آ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے دوڑ لیا۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آ رہا تھا۔ درحقیقت تھوڑے فاصلے پر پولیس کے دو بڑے ٹرک کھڑے ہوئے تھے اور پولیس والے ڈنڈے لئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جو فقیر ان کے ہاتھ لگتا اسے بازوؤں سے پکڑتے اور ٹرک میں ڈال دیتے۔ میں نے صبر وسکون کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔ نہ تو بھاگ سکتا تھا نہ ان سے کچھ کہہ سکتا تھا۔ دو موٹے تازے پولیس والے ڈنڈے ہاتھوں میں لئے میرے قریب پہنچے اور خونی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولے۔

''آپ یہاں براجمان ہیں مہاراج! اب ذرا سرکاری بھیک اور لے لیجئے۔ ابے اٹھ یا لگاؤں ڈنڈا کمر پر۔''

میں نے ہاتھوں کے بل آگے کھسکتے ہوئے انہیں اپنے پیروں کی جانب متوجہ کیا۔ دوسرا پولیس والا کہنے لگا۔ ''معذور ہے سالا۔ چلو، اٹھا کر لے چلو۔''

انہوں نے بے دردی سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈالے۔ میں نے پاؤں سیدھے کر کے زمین سے ٹکائے اور ان کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ ٹرک کے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے دو تین بار جھلایا اور پھر ٹرک پر پھینک دیا۔ دو فقیروں نے مجھے زور زور سے دھکے دیئے اور غراتے ہوئے بولے۔

''اندھے کے بچے! دیکھتا نہیں ہے ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابے سرک۔'' انہوں نے لاتوں سے مجھے ایک طرف سرکا دیا اور میں سمٹ کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ کئی اور فقیر یہاں سے پکڑے گئے تھے گالیاں دے رہے تھے۔ پولیس والوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ خوفناک بددعائیں دے رہے تھے اور پولیس والے ہنس رہے تھے۔

''بیٹا! اگر ان بددعاؤں سے ہمارا یہ حال ہوتا تو تمہارا یہ حال کبھی نہ ہوتا۔ اب چپ بیٹھو۔ ورنہ ڈنڈے مار مار کر سر پھاڑ دیں گے۔'' دو پولیس والے ٹرک پر چڑھ آئے اور اس کے ایک گوشے میں خود بھی بیٹھ گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا اور

میں اس نئی منزل کا انتظار کرنے لگا جو میرے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ یہاں اس درخت کے نیچے جیسی بھی گزر رہی تھی، بہتر تھی۔ پانی بھی موجود تھا، غذا بھی اللہ تعالیٰ فراہم کر دیتا تھا۔ باقی سب کچھ اس کے اپنے اختیار میں تھا۔ لیکن نجانے یہ نئی جگہ کیسی ہو گی۔ دل ہی دل میں توبہ کی۔ جس نے یہاں زندگی عطا کی اور رزق پہنچایا، وہی قادر مطلق ہر جگہ موجود ہے۔ بھلا فکر کیوں کی جائے؟...... جب اس نے یہ سانسیں بخشی ہیں تو ان سانسوں کے لیے یہ بھی متعین کر دیا گیا ہوگا کہ وہ کیسے گزریں گی۔ آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرک ایک بڑی سی عمارت کے احاطے میں داخل ہو کر رک گیا۔ اس کے تختے کھول دیئے گئے اور فقیروں کو نیچے کودنے کے لیے کہا گیا۔ جو معذور تھے انہیں پولیس والے اتار اتار کر نیچے ڈال رہے تھے۔ پھر نیچے اتارنے کے بعد انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ایک سمت ہانکنے لگے اور سب کو ایک کونے میں جمع کر دیا۔ یہ ٹرک وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ سب طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ خدا کا خوف دلا رہے تھے۔ بھگوان، پرمیشور اور نجانے کیا کیا نام لے کر پولیس والوں کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔ پھر پولیس کا اعلیٰ افسر قریب آیا۔ اس نے ان سب کو دیکھا اور کہا۔

''تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟...... تم میں تو بے شمار ایسے ہوں گے جو ہم سے بھی زیادہ تندرست و توانا ہیں۔ میں معذوروں کو نہیں کہتا، لیکن جو تندرست ہیں وہ تو اپنا کام محنت مزدوری کر کے چلا سکتے ہیں۔ یہ لعنت آخر تم لوگوں پر کیوں سوار ہے؟ ملک کو محنت کشوں کی ضرورت ہے اور تم ہو کہ حرام خوری کرتے ہو، بھیک مانگتے ہو۔''

جو ہٹے کٹے مشٹنڈے تھے وہ توبہ تلا کرنے لگے اور کہنے لگے کہ آئندہ محنت مزدوری کر کے وقت گزاریں گے۔ جو معذور تھے وہ خاموشی اور بے بسی سے پولیس والوں کو دیکھتے رہے۔ پولیس کے اعلیٰ افسر نے کہا۔

''تمہیں سزا ملے گی بھیک مانگنے کی۔ سرکار نے یہی حکم دیا ہے۔ ایک ہفتے کی سزا کاٹو گے یہاں اور اس کے بعد جو معذور ہیں انہیں ایسے اداروں کے سپرد کر دیا جائے گا جہاں معذوروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ انہیں وہاں کچھ کام دھندے کرنے ہوں گے۔ یہ فیصلہ ہے سرکار کا۔ چلو، انہیں کوٹھریوں میں بند کر دو۔''

فقیروں کو ایک بار پھر ہانکا جانے لگا۔ مجھے معذور تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بہر حال مجھے بھی سہارا دے کر ایک کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ کوٹھری میں میرے علاوہ دو تین فقیر اور بھی تھے۔ اور ایک دو ایسے ملزم تھے جنہیں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ ایک گوشے میں ہمیں بٹھا دیا گیا۔ ان لوگوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک ملزم نے پولیس افسر سے کہا۔

''حوالدار صاحب! ان کوڑھیوں کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟...... انہیں کہیں اور رکھا جائے، ورنہ ہم سب ہڑتال کر دیں گے۔''

''ابھی تیری ہڑتال کراؤں...... نکالو بے...... نکالو اسے باہر...... یہ لیڈر ہے۔ ہڑتال کرے گا۔'' پولیس کانسٹیبل نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور اس لیڈر کو باہر گھسیٹ لیا۔ پھر لاک اپ کے سامنے ہی ڈنڈوں سے اس کی خوب پٹائی کی گئی اور وہ چیخنے چلانے لگا۔ بعد میں اسے مار پیٹ کر دوبارہ لاک اپ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ میرے ساتھ بھی چار پانچ فقیر تھے جو بیٹھے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش تھا۔ فقیروں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ ایک نے کہا۔

''بات تو ایک ہی ہے۔ سڑک پر زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ دھوپ، ٹھنڈک برداشت کرنا پڑتی تھی۔ یہ پولیس کی بھیک ہے۔ روٹی تو دیں گے ناسسرے۔ پھر رفاہی اداروں میں بھیج دیں گے۔ وہاں بھی روٹی ملے گی۔ ارے بھئی بھیک مانگنا ہی کون چاہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ہی کام نہ کریں تو کیا، کیا جائے۔ کیوں بھائی میاں؟''

''ٹھیک ہے...... مگر یار! ہوئی بری ہے۔ دیکھیں گے، سسرے کب تک کھلاتے ہیں۔ ہونہہ...... باپ دادا کا دھندہ ہے، ہم بھلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟''

جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں تو ان میں حصہ ہی نہیں لے سکتا تھا چنانچہ سکون سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ عجیب دنیا تھی۔ ایک انوکھا تجربہ تھا میرے لیے۔ وہاں اس درخت کے نیچے تنہا ہی ہوتا تھا، لیکن اب یہاں اس نئی برادری سے واسطہ پڑا تھا اور

خوب مزے مزے کے لوگ تھے یہ۔ رات ہو گئی۔ سارے کے سارے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کراتے رہے۔ اپنی اپنی کہانیاں سناتے رہے اور میں سن کر حیران رہ گیا۔ وہ معذور تھے۔ کسی کے ہاتھ نہیں تھے، کسی کے پاؤں مفلوج تھے اور کسی کو کوئی بیماری تھی۔ لیکن زندگی ان کے لیے کسی طرح ان لوگوں سے کم دلکش نہ تھی جو دنیا میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی کمائی کے بارے میں بتا رہے تھے اور اس کے بعد اپنے مشاغل کے بارے میں۔ ایک نے کہا۔

''یار! میرے پاس تو اتنی بڑی شاندار جگہ تھی۔ وہاں بیٹھ کر تو ڈیڑھ دو سو روپے چٹکیوں میں آ جاتے تھے۔ اور کبھی کوئی صدقہ خیرات مل جائے یا زکوٰۃ دینے والا آ جائے تو سمجھ لو مزے آ گئے۔ پچھلے مہینے پانچ فلمیں دیکھیں اور بال بچوں کے لیے بڑے کپڑے بنائے۔ کم بختوں نے وہ جگہ بھی چھڑوا دی۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں کوئی اور نہ وہاں بیٹھ جائے۔''

''ارے سارے شہر میں ہی فقیر پکڑے جا رہے ہیں۔ کوئی اور وہاں کیسے جا سکتا ہے؟''

''تو فقیر چھوڑے بھی تو جائیں گے۔ ابے ہم سب سمجھتے ہیں، کوئی نیا حکم آیا ہوگا۔ کسی نئے افسر کو سوجھی ہوگی۔ اس نے یہ حکم چلا دیا۔ بعد میں بھول جائے گا۔ وہ بھولے گا تو باقی لوگ بھی بھول جائیں گے۔'' تمام فقیر ہنسنے لگے تھے۔

شام ہو گئی۔ جھٹپٹے رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فقیر نے دوسرے سے کہا۔ ''ابے پہلوان! بیڑی ہوگی تیرے پاس؟''

''ابے میں خود مر رہا ہوں۔ پورا بنڈل پڑا ہوا تھا جیب میں۔ اٹھا پٹخ میں نکل گیا کہیں۔''

''مارے گئے۔ اب کیا ہوگا؟''

''کوئی جگاڑ لگانی پڑے گی پیارے! یہ پولیس والے بھی سارے کے سارے رام بھروسے ہوتے ہیں۔ چائے تک نہیں ملی۔ سارا دن گزر گیا۔''

''بیڑی کی طلب ہو رہی ہے یار! ابے کسی کے پاس بیڑی ہے؟''

''سگریٹ پیو تو لے لو بادشاہ! بیڑی نہیں ہے۔''

''لا، دے دے۔''

''ہفتے بھر کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ مال احتیاط سے خرچ کرو۔'' تیسرے فقیر نے باقی دو کو ہوشیار کیا اور سگریٹ کے کش بڑی ترتیب سے لگائے جانے لگے۔ پٹنے والا ملزم کراہ رہا تھا۔ دو پارٹیاں ہو گئی تھیں۔ ایک فقیروں کی، دوسری جرائم پیشہ افراد کی۔ مگر کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا کیونکہ ایک بولنے والے کی کراہیں اب تک سنی جا رہی تھیں۔ رات کا کھانا دیا گیا۔ دو دو روٹیاں، دال وغیرہ۔ سب کھانے میں مصروف ہو گئے۔ لاک اپ کے سامنے راہداری میں ایک ملگجا بلب روشن تھا جس سے لاک اپ میں بھی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب آرام کرنے زمین پر لیٹ گئے۔ میں بھی اپنی جگہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا ہوا تھا لاک اپ میں ایک اور ملزم کا اضافہ ہوا۔ دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پورا بدن کرب سے چیخ اٹھا...... زخموں کے منہ کھل گئے اور وہ چیخ اٹھے۔ پورے بدن کو ایسا ہی جھٹکا لگا تھا......

وہ ماموں ریاض تھے...... ماموں ریاض...... انہیں اندر پہنچا کر دروازہ بند کر دیا گیا اور ماموں ریاض گھبرائے سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک خالی جگہ جا بیٹھے۔ وہ بدحواس اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کلیجہ منہ کو آ گیا۔ پھر حواس نے کچھ یاد دلایا۔ پہلے بھی بھوریا چرن نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ ماموں ریاض پہلے بھی میرے سامنے لائے گئے تھے، بعد میں کچھ اور نکلا تھا۔ اس شیطان کے لیے یہ سب کچھ کر دینا مشکل نہیں تھا۔ وہ اس عالم میں پہنچانے کے بعد بھی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ میں جلتی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ پریشان، سر جھکائے بیٹھے تھے۔ رات گزرتی رہی اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ قیدی سو گئے۔ بھانت بھانت کے خراٹے ابھرنے لگے۔ سنتری بھی گشت ختم کر کے کہیں جا بیٹھے تھے۔ میں مسلسل ماموں ریاض کو گھورتا رہا۔ اس قدر ہیجان کا شکار ہو گیا تھا کہ اپنی حالت کا احساس بھی نہ رہا۔ زبان کو جنبش دی تو طویل عرصہ کے بعد اپنی سرگوشی سنی۔ اس ہیجان نے میری گویائی واپس کر دی تھی۔ میرے بدن میں زندگی

دوڑا دی تھی۔ میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں بول سکتا تھا۔ مگر سب کچھ بھولے ہوئے تھا۔ ماموں ریاض پر نظریں جمی ہوئی تھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ ماموں ریاض کی طرف بڑھا اور پھر ان پر گر پڑا۔ میرے مضبوط ہاتھ کے شکنجے نے ان کا حلقوم بھینچ لیا تھا۔ انہوں نے مدافعت شروع کر دی۔ دونوں ہاتھوں سے میری کلائی پکڑی۔ مگر میرا پنجہ حلق سے نہ ہٹا سکے۔

''کلمہ پڑھو......'' میں نے غرا کر کہا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ''میں گرفت ڈھیلی کر رہا ہوں۔ کلمہ پڑھو...... ورنہ تمہاری زبان باہر نکال دوں گا۔'' میں نے یہ کہہ کر گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گردن مسلنے لگے۔ پھر انہوں نے خوف زدہ آواز نکالی تو میں نے جھپٹا مار کر دوبارہ ان کی گردن پکڑ لی۔ ''اگر تم مسلمان ہو تو صرف کلمہ پڑھو۔ دوسرا ایک لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو......'' میں نے پھر دباؤ ہلکا کر دیا۔

ماموں ریاض نے پھنسی پھنسی آواز میں کلمہ پڑھا۔

''دوبارہ۔'' میں نے کہا اور انہوں نے دوبارہ پھر میرے کہنے پر تیسری بار کلمہ پڑھا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ماموں ریاض مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

''ریاض احمد ہے آپ کا نام؟'' میں نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... ہاں......'' وہ جانکنی کے سے انداز میں بولے اور میں ان سے لپٹ گیا۔ میں نے انہیں بھینچ لیا۔ وہ گھبرا گھبرا کر مجھ سے خود کو چھڑا رہے تھے۔ نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے وہ۔ بہ مشکل تمام انہوں نے مجھے قدرے دور کیا۔

''کیا ہو گیا؟...... کیا بات ہے بھائی؟'' وہ سہمی سہمی آواز میں بولے۔

''مجھے پہچانئے...... مجھے پہچانئے ماموں ریاض!''

''مم...... ماموں ریاض...... کک...... کون ہو تم؟...... میں...... میں تمہیں نہیں جانتا۔'' وہ اسی انداز میں بولے۔

''میں مسعود احمد ہوں ماموں ریاض! آپ کا بھانجا مسعود۔ ماموں! میں آپ کا بھانجا ہوں۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''مسعود!...... مسعود!'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورنے لگے۔ بہت دیر تک گھورتے رہے۔ پھر کھوئے کھوئے لہجے میں ہی بولے۔ ''مسعود!''

انداز ایسا تھا جیسے اس نام کو یاد کر رہے ہوں۔ مجھے گھورتے بھی جا رہے تھے۔ پھر نہ سمجھنے والے انداز میں بولے۔

''مسعود احمد...... محفوظ احمد کے بیٹے؟''

''ماموں! آپ کا مسعود...... آپ کا چہیتا مسعود۔''

''معاف کرنا بھائی! کچھ عجیب سی بات ہے۔ میرا بھانجا مسعود تھا تو سہی مگر وہ تو...... وہ تو......''

''مر چکا ہے۔ یہی نا؟'' میں نے سسکی لے کر کہا۔

''تم مسعود کیسے ہو سکتے ہو؟'' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ''تم واقعی مسعود ہو؟...... معاف کرنا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر تم مسعود ہو تو...... تو......'' ان کا بدن تھر تھرانے لگا۔ بہت زور کی تھرتھری طاری ہو گئی تھی ان پر۔

''ماموں! میں مسعود ہی ہوں۔'' میں ان سے لپٹ کر سسکنے لگا اور ماموں کانپتے رہے۔ یکا یک ان کے انداز میں تغیر پیدا ہوا اور پھر انہوں نے بے اختیار مجھے بھینچ لیا۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔

''مسعود...... مسعود!...... آہ...... میرے بیٹے!...... میرے بیٹے!'' وہ زار و قطار رونے لگے۔ ''تم زندہ ہو مسعود!...... تم واقعی زندہ ہو۔''

''ہاں ماموں ریاض! جتنا زندہ ہوں، آپ دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بیٹے؟...... کیا کر ڈالا تم نے مسعود...... ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہو۔ مسعود میرے بیٹے! یہاں

ملنا تھا تمہیں...... یہ زخم بھی لگانا تھا میرے کلیجے پر؟''

''سنبھالئے ماموں! خود کو...... خدا کے لیے سنبھالئے۔''

''آہ ...... کیسے سنبھالوں؟...... ہزاروں آنسو رکے ہوئے ہیں میری آنکھوں میں۔ لاکھوں دعاؤں کا نتیجہ ہو تم۔ کیسے سنبھالوں؟''

''ضروری ہے ماموں!...... ضروری ہے۔ خدا کے لئے خود کو سنبھالئے۔''

''آہ...... مسعود! کیا بیت گئی ہم پر۔ اب تو عرصہ ہو گیا۔ اب تو تمہاری یاد بھی کھو بیٹھے تھے ہم۔ مسعود! کیا کہوں، کیسے بتاؤں تمہیں میرے بچے! کیا کیا گزری ہے ہم پر۔ باجی پر کیا گزری ہے۔ سب پر کیا گزری ہے۔ ہم انسانوں کی طرح جینا بھول گئے بیٹے! ہم ایسے نہیں جی رہے جیسے دنیا والے جی رہے ہیں۔ ہم...... ہم......''

میں نے اپنے لباس سے ماموں کے آنسو خشک کئے۔ ماموں بار بار میرا چہرہ سامنے کر لیتے تھے۔ مجھے دیکھتے تھے۔ پھر سینے سے بھینچ لیتے تھے۔ تمام فقیر اور قیدی مزے سے سو رہے تھے۔ کوئی ہم جیسا نہیں تھا۔ ماموں نے کہا۔

''تم مسعود!...... کوئی تمہاری زندگی پر یقین نہیں کرے گا۔ اگر میں کسی سے کہوں تو وہ مجھ پر ہنسے گا۔''

''ہاں ماموں! میں خود اپنی زندگی پر ہنستا ہوں تو دوسروں کا بھی یہی حال ہوگا۔''

''ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے ہو۔ کہاں تھے؟...... کیسی زندگی گزار رہے تھے؟''

''مجھ سے کچھ نہ پوچھیں ماموں!...... مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ رات مختصر ہے۔ صبح بہت جلد ہو جائے گی۔ بعد میں نہ جانے کیا ہو۔ پہلے مجھے سب کچھ بتا دیں ماموں! مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے کچھ معلوم ہو سکے گا۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''امی......؟''

''حیات ہیں...... اندھی ہو چکی ہیں۔''

''اندھی......؟'' میری رندھی ہوئی آواز ابھری۔

''ہاں...... رو رو کر بینائی کھو بیٹھی ہیں۔ اب تو طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم تو اسی وقت سے برباد ہیں جب سے تم نے......'' ماموں خاموش ہو گئے۔

''پھر کیا ہوا ماموں؟''

''پڑوسی خلاف ہو گئے۔ انہوں نے ہم پر گھناؤنے الزامات لگائے۔ یہ کہا کہ ہم سفلی علم کرتے ہیں، غیر مسلم ہیں، مرتد ہیں۔ محمود جھگڑ پڑا اور اس کے ہاتھوں سے ایک قتل ہو گیا۔ ہماری کیا اوقات تھی کچھ کرتے۔ پولیس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ عجیب عجیب سوالات کرتے تھے۔ مجھے سترہ دن تھانے میں رکھا۔ تمہارے اور محمود کے بارے میں پوچھتے رہے کہ تم کہاں چھپے ہوئے ہو۔ ہم نے گھر بار چھوڑ دیا۔ اپنوں نے رشتے دار ماننے سے انکار کر دیا۔ وہاں سے نکال دیئے گئے۔ کئی شہروں میں جا کر رہے اور...... اور......''

''اور ماموں......؟''

''ایک اور المناک واقعہ ہوا۔''

''کیا؟''

''خورجے میں تھے ہم لوگ۔ گھر کے سامنے ایک اور خاندان رہتا تھا۔ انہوں نے شمسہ کا رشتہ مانگا ہم قیامت زدہ بھلا کیا شادی بیاہ کر سکتے تھے۔ انکار کر دیا اور......'' ماموں نے سسکی بھری۔

''اور کیا؟''

''انہوں نے شمسہ کو اغواء کر لیا۔''

''پھر......؟''

''وہ پھر کبھی نہیں ملی۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ماموں بھی خاموش ہو گئے۔ بہت دیر کے بعد میں نے کہا۔''ابو......؟''

''ٹھیک ہیں۔ایک دکان پر نوکری کرتے ہیں۔''

''آپ......؟''

''میں بھی ایک اسٹور پر کام کرتا ہوں۔ اسٹور کے مالک کا بیٹا عیاش طبع ہے۔ مجھ سے رقمیں لے جاتا رہا ہے۔حساب میں گڑبڑ ہوئی تو مالک نے مجھے غبن کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔''

''آپ نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''ہمیشہ ہی بتاتا رہا ہوں مگر......لوگ کہاں مانتے ہیں؟ خدا ہی اس کے دل میں رحم ڈالے تو میری گلوخلاصی ہو جائے۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوگا۔'' میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ماموں نے کہا۔''اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتا دو۔''

''اتنا کچھ سن چکے ہوں گے میرے بارے میں کہ اور کیا بتاؤں۔ داستان اتنی لمبی ہے کہ...... جی...... ویسے ایک انکشاف کر دوں۔آپ کو خوشی ہوگی۔''

''کیا؟''

''محمود کے بارے میں کوئی خبر ملی آپ کو؟''

''آج تک پتہ نہیں چل سکا۔''

''وہ بیرون ملک ہے۔ مجھے مل گیا تھا۔ایک بھلے انسان کی مدد سے میں نے اسے بیرون ملک نکال دیا۔ یقیناً بعد میں اس نے آپ سے رابطے کی کوشش کی ہوگی لیکن آپ کا پتہ نہ پا سکا ہوگا۔''

''آہ......کیا سچ مچ ایسا ہے؟''

''ہاں......امی اور ابو کو یہ بات ضرور بتا دیجئے انہیں خوشی ہوگی۔''

''مسعود تم......تم......''

''نہیں ماموں! میں شاید ابھی ان کی قدم بوسی کے قابل نہیں ہوں۔شاید ابھی یہ سعادت میرے مقدر میں نہیں ہے۔''

''تمہارے اوپر جو مقدمات تھے ان کا کیا ہوا؟''

''بہت سے مقدمات کے اضافے ہو چکے ہیں۔ فیصلے ہوں گے۔سب کے فیصلے ہوں گے۔اللہ مالک ہے۔''

''ان سے ملو گے نہیں؟''

''امی ابو سے؟''

''ہاں۔''

''ضرور ملوں گا۔ان سے کہہ دیجئے زندہ رہیں۔ میرے لئے زندہ رہیں۔ میں ان سے ضرور ملوں گا۔''

''یہاں کس الزام میں آئے ہو؟''

''بس ماموں! اور کچھ نہ پوچھیں۔خدا کے لیے اور کچھ نہ پوچھیں۔اللہ آپ کو اس مشکل سے نکالے۔'' ہم دونوں ساری رات روتے رہے۔باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے بارے میں انہیں کیا بتاتا۔

صبح ہو گئی۔ دن کے دس بجے تھے کہ کچھ لوگ لاک اپ کے دروازے پر آئے۔ ماموں ریاض انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ایک خاتون بھی تھیں۔ ایک عمر رسیدہ شخص، ایک نوجوان اور پولیس انسپکٹر۔ انسپکٹر نے کانسٹیبل سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا اور کانسٹیبل نے دروازہ کھول دیا۔انسپکٹر نے ماموں ریاض سے باہر آنے کے لیے کہا اور ماموں ریاض باہر نکل آئے۔

معمر شخص نے ماموں ریاض کے ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور انہیں ساتھ لے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں کیا قصہ تھا۔ خاموشی سے وقت گزرتا رہا۔ ماموں ریاض کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ واپس نہیں آئے۔

دوپہر کو تمام فقیروں کو نکالا گیا اور احاطے میں کھڑے ہوئے ایک ٹرک میں بٹھایا گیا۔ ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ پھر اس نے کوئی چھ گھنٹے تک مسلسل سفر کیا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔ پولیس والے نیچے اترے اور انہوں نے ٹرک کا پچھلا حصہ کھول کر فقیروں سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ سب نیچے اترنے لگے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ویران اور لق ودق جگہ تھی۔ دور دور تک ریتلی زمین اور اس میں اُگی ہوئی تھوہڑ کی جھاڑیاں۔ پرندے اور دوسرے جانور بھی نظر آ رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ لوگ یہاں لا کر ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ فقیروں نے احتجاج شروع کر دیا اور چیخنے چلانے لگے۔ پولیس والوں نے ان میں چند کو ڈنڈوں سے مارا۔ ایک موٹا تازہ پولیس والا کہنے لگا۔

''شہر کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے تم لوگوں نے۔ اب رہو یہاں بھوکے پیاسے اور جاؤ سیدھے جہنم میں۔ کم بختوں سے کام کاج ہوتا نہیں ہے، ہٹے کٹے مسٹنڈے ہو اور بھیک مانگ کر ہماری حق تلفی کرتے ہو۔'' پولیس والے ٹرک میں چڑھنے لگے۔ کچھ معذور فقیروں نے کہا۔

''بابا اللہ تمہارا بیڑا غرق کرے۔ واپس شہر پہنچنا نصیب نہ ہو تمہیں۔ ٹرک کا حادثہ ہو جائے۔ ارے ہم سے تو کچھ اور کہا تھا تم لوگوں نے۔ ارے یہاں کیا کریں گے ہم؟ تمہارا ستیاناس...... تمہارا ستیاناس۔''

پولیس والے ہنستے ہوئے ٹرک پر چڑھ گئے اور ٹرک اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گیا۔ واقعی بڑا عجیب کام کیا تھا ان لوگوں نے۔ اس ویرانے میں تو بھوک اور موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فقیر روتے پیٹتے رہے۔ پولیس والوں کو گالیوں سے نوازتے رہے۔ کچھ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ ان میں سے کچھ فقیر اونچائی کی جانب بڑھنے لگے۔ پھر دفعتاً ان میں سے ایک نے کہا۔

''ادھر...... ادھر آبادی ہے۔ ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ارے چلو بھائی! وہ تو کوئی مزار ہے۔ ذرا اوپر چڑھ کر دیکھو، بڑا سا جھنڈا نظر آ رہا ہے اور مزار کا گنبد بھی۔''

شوقین فقیر اس جانب دوڑے۔ بلندی تھی تھوڑی سی۔ وہ بھی اوپر چڑھے اور شاید اطلاع دینے والے فقیروں کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ سب ہنسنے مسکرانے لگے۔ قہقہے لگانے لگے۔ معذور فقیروں میں سے کچھ نے کہا۔

''ارے بھائیو! اگر لمبا فاصلہ ہے تو ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ہم وہاں تک کیسے پہنچیں گے؟''

''مزدوری کون دے گا؟'' سودے طے ہونے لگے۔ کچھ نے کچھ کو اپنے کندھوں پر لاد لیا۔ جن کی مزدوری طے نہیں ہوئی تھی وہ خود ہی بلندی کی جانب گھسٹنے لگے۔ میں خاموش اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فقیر نے جو سب سے آخر میں رہ گیا تھا، میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے تو نہیں چلے گا کیا؟ ادھر یقیناً لنگر مل جائے گا۔ یہاں تو بیٹا! کھانے کے لئے گھاس بھی نہیں ہے۔''

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''تمہارا شکریہ بھائی! چلا جاؤں گا۔ میرے تو پاؤں ٹھیک ہیں۔''

فقیر نے شانے ہلائے اور بلندی کی جانب بڑھ گیا۔ میرے دل میں کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا تھا۔ شام جھکتی چلی آ رہی تھی۔ ہوا میں خنکی پیدا ہونے لگی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بدن لاغر تھا۔ ہاتھ پاؤں بے شک سلامت تھے لیکن اتنی جان نہیں تھی کہ کوئی طویل فاصلہ طے کرتا۔ بدن کا خون نکل جانے کے بعد سے اب تک ایسی نقاہت بدن پر طاری رہی تھی۔ بہرحال شام کے جھٹپٹے رات کی سیاہیوں میں تبدیل ہونے لگے۔ کچھ فاصلے پر دو عجیب سے کالے رنگ کے مڑے تڑے پھل سے پڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کیا شے تھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھا، اٹھایا، ٹٹول کر دیکھا، پھر ان میں ایک پھل توڑا۔ کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکا کہ کیا چیز تھی۔ پھینک دیا اور اس کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر تھوڑا سا آگے بڑھ گیا۔ بلندی پر پہنچ کر میں نے کافی فاصلے پر اندازے کے مطابق دو اڑھائی فرلانگ پر آبادیاں دیکھیں۔ غالباً کوئی مزار ہی تھا۔

قرب و جوار میں مکانات وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ مزار والی جگہ روشن تھی۔ عمارت بنی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچی پکی قبریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ فقیر جو یہاں سے گئے تھے شاید یہ فاصلہ طے کر کے مزار شریف تک پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ اس جگہ سے وہاں تک کے راستے میں اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس علاقے کے بارے میں واقعی کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ چلو، ضرورت مندوں کا کام تو بن گیا۔ مجھے تو بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہیں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دور جگمگاتی روشنیاں بھلی لگ رہی تھیں۔ پھر ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اذان کی آواز سنائی دی۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......''

''جل شانہٗ......'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ دل میں ایک ہُوک سی اٹھی۔ اذان کی تکرار کرنے لگا۔ روحانی سکون محسوس ہوا تھا۔ دنیا کی ہر نعمت سے زیادہ لذت انگیز تھا۔ اذان ختم ہوگئی۔ پتھر کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا تالاب نظر پڑا۔ بارش کا پانی جمع ہوگیا تھا اس میں۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز نکلی۔ لڑکھڑاتی ہوئی غیر یقینی آواز میں نماز کی نیت باندھی۔ الحمد شریف کا تصور کیا، ذہن ساتھ دینے لگا۔ آیت یاد آتی رہی...... ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ برسوں کا چھنا ہوا سرمایہ واپس عطا ہو گیا تھا۔ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ روح کو طہارت عطا ہو گئی تھی۔ رکوع، سجدہ...... رو رو کر نماز پڑھتا رہا۔ سجدے سے سر اٹھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر نماز پوری کرنی تھی۔ اعتماد بڑھتا گیا۔ نماز مکمل کر لی۔ بدن تھا کہ آگ کی طرح تپ اٹھا تھا۔ کسی کمزوری کا نام و نشان نہیں تھا۔ مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آہ...... مجھے میرا سرمایہ واپس مل گیا...... مجھے میرا سرمایہ واپس مل گیا...... اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اسی جگہ بیٹھا رہا۔ عشاء کی اذان سنائی دی۔ پھر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیا وقت ہو گیا پلکیں جڑنے لگیں۔ وہیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ بدن سکوڑ لیا۔ نیند آ گئی۔ غالباً نیم غنودگی کی کیفیت تھی کہ کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھا، دو سائے نظر آئے۔ اسی سمت آ رہے تھے۔ خاموش لیٹا رہا۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔

''ارے...... یہ کون ہے؟''

''کوئی سائل ہے۔''

''رکو۔'' کسی نے کہا اور وہ میرے پاس رک گئے۔

''میاں صاحب! بھوکے ہو؟''

''شکر ہے۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''روٹی کھاؤ گے؟''

''کھائیں گے۔''

''لو...... یہ لو......'' ان میں سے ایک نے جھک کر دو روٹیاں جن پر دال رکھی ہوئی تھی میرے ہاتھوں پر رکھ دیں۔

''شکر الحمدللہ۔'' میں نے کہا اور بڑے احترام سے رزق لے لیا۔

''یہ پانی ہے۔'' دوسرے نے آبخورہ میرے حوالے کر دیا۔

''سردی ہے۔ یہ کمبل اوڑھ لینا۔'' پہلے نے کمبل اپنے شانے سے اتار کر میرے قریب رکھ دیا۔

''اللہ اجر عطا فرمائے۔'' میں نے کہا۔

''آؤ۔'' پہلے نے دوسرے سے کہا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

شکم سیری ہوگئی۔ آبخورہ سے پانی پیا۔ سردی اور بڑھ گئی۔ خنک ہوائیں تیز ہوگئی تھیں اور معدے میں وزن بڑھا تو دوسرے احساسات بھی جاگ اٹھے۔ کمبل یاد آیا۔ جلدی سے اٹھا کر بدن کے گرد لپیٹ لیا۔ نہ جانے کون خدا کے نیک بندے

تھے۔ بڑے کام آئے۔ دل سے دعا نکلی۔ وہیں لیٹ گیا۔ کمبل بدن کے گرد لپیٹ لیا۔ مزید سردی لگی تو چہرہ بھی ڈھک لیا اور چہرہ ڈھکتے ہی ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوا۔ آنکھیں بند کر لیں لیکن روشنی کم نہ ہوئی۔ دیر تک ساکت رہا۔ پھر بدن گرم ہو گیا۔ کمبل نے سردی سے نجات دلا دی۔ ماموں ریاض یاد آئے۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور ماموں کو کہاں لے گئے۔ منظر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ معمر شخص نے ماموں ریاض کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آیئے۔'' ماموں ریاض خاموشی سے ان کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ لوگ انہیں لے کر انسپکٹر کے کمرے میں آئے۔

''بیٹھیے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ عورت اور لڑکا بیٹھ گئے۔ پھر معمر شخص بھی۔ انسپکٹر نے ماموں ریاض سے کہا۔ آپ بھی بیٹھیے۔''

''جی...... میں......''

''ہاں...... تشریف رکھیے۔'' انسپکٹر نرمی سے بولا۔

''شش...... شکریہ۔''

''نجم الحسن آپ سے سخت شرمندہ ہیں۔''

''جی......؟'' ماموں ریاض حیرت سے بولے۔

''جی ہاں۔ انہوں نے غلط فہمی میں اور جذباتی ہو کر آپ کے خلاف رپورٹ درج کرا دی تھی اور اب انہوں نے یہ رپورٹ واپس لے لی ہے۔ حالانکہ پولیس کے کام ذرا مشکل ہوتے ہیں لیکن نجم الحسن میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کے لئے کچھ لچک پیدا کر لی ہے۔ میری رائے ہے ریاض صاحب! آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔''

''سر! میں سمجھا نہیں۔''

''بھئی میں اپ کو یہاں لاک اپ سے رہا کرتا ہوں۔ باقی معاملات آپ خود نجم الحسن صاحب سے طے کر لیں۔'' ماموں ریاض کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔ انہوں نے آنسو بھری نگاہوں سے نجم الحسن کو دیکھا اور بولے۔

''بڑے صاحب! آپ...... آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں بے گناہ ہوں؟''

✦✤✦✤✦

''انسپکٹر صاحب ہمیں اجازت دے دیجئے۔ کوئی ایسی آفیشل کارروائی تو نہیں کرنی ہے جس کی ضرورت ہو۔'' نجم الحسن صاحب نے کہا۔

''نہیں نجم جاؤ، عیش کرو اور ان صاحب کو ذرا مطمئن کر دینا۔'' سب لوگ اٹھ گئے۔ معمر عورت نے ریاض ماموں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ریاض بھائی ہمارے ساتھ چلئے۔ آپ سے کچھ کام ہیں۔'' فوراً ہی ریاض ماموں کے ذہن میں میرا خیال آیا اور انہوں نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب...... وہ...... وہ......'' اسی وقت دو کانسٹیبل اندر داخل ہوئے اور انہوں نے سلیوٹ کر کے کہا۔ ''سر ڈی ایس پی کی گاڑی آ کر رکی ہے۔''

''اوہو اچھا اچھا۔'' انسپکٹر صاحب جلدی سے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے نجم الحسن صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ڈی ایس پی صاحب آ گئے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب، نجم الحسن صاحب سے پہلے اپنے آفس کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ نجم الحسن صاحب نے ماموں ریاض کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''آیئے آیئے ریاض صاحب آئیں۔'' ماموں ریاض غالباً میرے بارے میں پھر کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن یہ موقع نہیں تھا چنانچہ وہ خاموشی سے نجم الحسن صاحب کے ساتھ باہر نکل آئے۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ نجم الحسن صاحب نے انہیں ڈرائیور کے ساتھ بٹھایا۔ پچھلے حصے میں وہ نوجوان لڑکا، معمر خاتون اور نجم الحسن صاحب بیٹھ گئے اور کار اسٹارٹ ہو کر تھانے کی عمارت کے احاطے سے باہر نکل آئی۔ اس کے بعد یہ لوگ ایک خوبصورت بنگلہ نما عمارت میں داخل ہوئے، کمرے میں پہنچے

اور نجم الحسن صاحب نے نوجوان لڑکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"اگر تمہارے خون میں شرافت کا ایک ذرہ بھی باقی ہے تو ریاض احمد صاحب کے قدموں میں گر کر معافی مانگو، وہ اگر چاہتے تو تمہارا نام بھی لے سکتے تھے۔ کیا دھرا سب کچھ تمہارا تھا، ہم نے انہیں بے عزت کیا۔ تھانے بھی بھجوایا اور انہیں سزا بھی ہو سکتی تھی اس الزام میں، کچھ غیرت ہے تمہارے اندر۔" نوجوان لڑکا آگے بڑھا اور اس نے جھک کر ریاض ماموں کے ہاتھ پکڑنے چاہے۔ ریاض ماموں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کہنے لگے۔
"بیٹے میری مجبوریاں ہیں، میں نے تم سے کئی بار کہا کہ جو رقم تم مجھ سے لیتے ہو اس کا کسی نہ کسی شکل میں اندراج کرا دو۔ تمہارے ابو تمہیں تو معاف کر سکتے ہیں میرے لئے مشکل ہو جائے گی لیکن خیر تقدیر میں یہ بھی تھا اور پھر...... اور پھر......"
ماموں ریاض کے ذہن میں میرا تصور ابھرا لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نجم الحسن صاحب سے وہ کیا کہیں تاہم انہوں نے اتنا ضرور کہا۔
"بڑے صاحب جو کچھ ہوا وہ اللہ کی مرضی تھی اور اللہ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہاں تھانے کے لاک اپ میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان لڑکے سے ہوئی تھی جو وہاں بند تھا لیکن میرے اس سے ایسے رابطے ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ آپ میرے اوپر اگر کوئی احسان کرنا چاہتے ہیں تو صرف ایک کام کر دیجئے میرا۔"
"ہاں ہاں کہئے، آپ نے وہیں کیوں نہ کہا ریاض صاحب۔ انسپکٹر میرا گہرا دوست ہے۔ آپ اسی وقت بتا دیتے تو میں اس لڑکے کو بھی چھڑا لیتا۔ کیا جرم کیا ہے اس نے؟"
"یہ تو مجھے نہیں معلوم، اس کا نام مسعود احمد ہے۔ حلیہ میں آپ کو تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔"
ماموں ریاض میرا حلیہ دہرانے لگے۔
"بالکل اطمینان رکھیں میں کل ہی اس کے لئے کچھ کروں گا۔ آپ خلوص دل سے اسے معاف کر دیں اور مجھے بھی، جو کچھ ہوا غلط فہمی میں ہوا، میں دل سے شرمندہ ہوں۔" نجم الحسن نے کہا۔
"تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پورا ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میری عزت بحال ہو گئی۔"
دماغ پر غنودگی طاری ہو گئی اور پھر گہری نیند آ گئی۔ صبح اذان کی آواز نے جگایا تھا۔ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہی جگہ تھی۔ مدھم مدھم اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا پانی دستیاب نہیں تھا۔ آب خورے کی شفاف مٹی سے تیمم کیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بدن توانا تھا۔ خشوع و خضوع سے نماز پڑھی۔ دل و دماغ شاد ہو گئے۔ سورج کی پاکیزہ کرنیں انہیں چھونے لگی تھیں۔ ادھر ادھر دیکھا پھر مزار شریف کی طرف اور پھر کمبل اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ رخ مزار شریف کی طرف تھا۔ فاصلہ محسوس ہی نہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ گو قرب و جوار میں باقاعدہ کوئی شہر یا بستی آباد نہیں تھی لیکن خود یہ بستی بھی کم نہیں تھی۔ زائرین کے لئے قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ ایک بزرگ کو دیکھا۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دو بڑے تھیلے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے ہوئے تھے۔ میری طرح نڈھال نظر آ رہے تھے۔ مجھے امداد طلب نظروں سے دیکھا پھر اشارہ کیا تو میں قریب پہنچ گیا۔
"میاں مزدوری کرو گے؟" وہ بولے۔
"ضرور کریں گے۔"
"یہ تھیلے وہاں پہنچانے ہیں۔ انہوں نے کافی فاصلے پر اشارہ کیا۔
"بسم اللہ۔" میں نے جلدی سے تھیلے اٹھائے۔
"پہلے پیسے بتا دو۔"
"جو عنایت فرمائیں گے، لے لیں گے۔"
"بعد میں جھگڑا نہ کرنا۔"

''نہیں کریں گے، آیئے۔'' میں تھیلے سنبھال کر آگے چل پڑا۔ بزرگ میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وزنی تھیلے مطلوبہ جگہ پہنچا کر میں سیدھا ہوا تو بزرگ نے دو روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''بے حد شکریہ۔''

''کم تو نہیں ہیں۔''

''نہیں ہیں اگر آپ نے خوشی سے دیئے ہیں۔''

''ناشتہ کرو گے؟''

''نہیں عنایت ہے۔ ناشتے کے لئے اللہ نے بندوبست کرا دیا ہے۔'' میں نے دونوں روپے مٹھی میں دبا کر کہا۔ اسی وقت ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے سے کوئی گیارہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ایک عورت، ایک لڑکی اور ایک 30، 32 سالہ شخص دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ لڑکے نے چیخ کر کہا۔

''دادا میاں پکڑیئے۔'' میرے ساتھ آنے والے معمر بزرگ چونک پڑے۔ ان کے حلق سے لایعنی سی آواز نکلی۔ میں نے بھی چونک کر لڑکے کو دیکھا اور اچانک لڑکا ٹھٹک گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر بری طرح چیختا ہوا واپس اندر گھس گیا۔ اس کے پیچھے دوڑنے والے رک گئے، جیسے کچھ نہ سمجھ پائے ہوں۔ میرے وہاں رکنے کا جواز نہیں تھا اس لئے میں پلٹ کر واپس چل پڑا۔ جہاں دکانیں لگی ہوئی تھیں، وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ روپے کی دو پوریاں اور ترکاری ملی۔ کاغذ پر رکھے ایک گوشے میں آ بیٹھا۔ پڑا کھول کر سامنے رکھا تو ایک بوڑھا فقیر نزدیک آ بیٹھا۔ اس نے کہا۔

''ارے واہ چپڑی اور دو، دو۔ حصہ کر لو۔ مل بانٹ کر کھانا اچھا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک تم لے لو۔'' میں نے ایک پوری پر آدھی ترکاری رکھ کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے خوشی سے پوری لے لی اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ہم فارغ ہو گئے۔

''پانی پیو گے۔''

''ایں۔ ہاں آؤ تلاش کریں۔''

''نہیں۔ میں دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی گدڑی سے ایک ٹوٹا پھوٹا سلور کا گلاس نکالا۔ گلاس خالی تھا۔ اس نے اسے میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ لو پہلے تم پی لو۔''

''ایں۔'' میں حیرت سے بولا۔ پانی کہاں ہے؟''

وہ ایک دم ہنس پڑا پھر بولا۔

''دیکھو تو پانی، دیکھنا تو ضروری ہوتا ہے نا۔'' بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اچانک ہی ہاتھ میں تھما ہوا گلاس وزنی محسوس ہوا اور اس سے پانی چھلکنے لگا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''تم پیو بھائی پھر مجھے دو۔''

مگر میں پانی پینا بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی گدڑی سے خالی گلاس نکالا تھا اور جب یہ گلاس میرے ہاتھ میں آیا تھا تو بالکل ہلکا تھا' لیکن اب وہ پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس نے پھر ایک قلقاری ماری اور کہنے لگا۔ ''پوری تمہاری، پانی ہمارا، حساب برابر۔ دیکھو تو ملے، سوچو تو پاؤ، ارے جلدی کرو ہمیں پیاس لگ رہی ہے، مرچیں لگ رہی ہیں مرچیں۔'' وہ اپنے دونوں گال پیٹتا ہوا بولا اور میں نے بادل نخواستہ پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ طبیعت سیر ہو گئی اور پھر جب گلاس پیچھے ہٹایا تو وہ کناروں تک لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے گلاس میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

''نہ گلاس تمہارا، نہ کمبل ہمارا، اپنا راستہ ناپو، ہم بھی چلے۔'' یہ کہہ کر اس نے گلاس گدڑی میں ڈالا اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں شدت حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ عجیب سا شخص تھا، پھٹے پرانے چیتھڑے لگے ہوئے لباس میں ملبوس، کاندھے سے جھولی لٹکائے ہوئے، ایک اونچی سی قبر کے کتبے کے پیچھے پہنچ کر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میں

سوچتا ہی رہ گیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ گردن جھٹکی اور پھر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ دن خوب چڑھ گیا تھا اور رات کی نسبت دھوپ میں تیزی پیدا ہونے لگی تھی جگہ جگہ بوسیدہ قبریں، ٹوٹے پھوٹے لکھوری اینٹوں سے بنے مقبرے نظر آ رہے تھے۔ بہت سی جگہ چھاؤں تھی۔ کسی بھی جگہ کا انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ کچھ ایسا شکم سیر ہو گیا تھا اس ایک پوری سے کہ بدن بوجھل محسوس ہونے لگا تھا بہرحال وہاں سے ہٹا، کمبل کاندھے پر ڈالا اور اس کے بعد قبروں کے درمیان مارا مارا پھرتا رہا۔ دوپہر کو بڑے مزار پر جانا نصیب ہو گیا۔ بڑی ٹھنڈک تھی وہاں، بے شمار افراد گنبد کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ دل چاہا کہ فاتحہ خوانی کروں چنانچہ مزار کے قدموں میں پہنچ کر فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ وہاں سے واپس نکل آیا۔ اسی جگہ پاؤں پسار کر لیٹنا اچھا نہ لگا، یوں محسوس ہوا جیسے مزار اقدس کی بے حرمتی ہو گی اگر میں وہاں لیٹ جاؤں، بہت سی جگہیں پڑی ہوئی تھیں۔

گھنے درختوں کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ باہر نکلا اور ایک گھنے درخت کے نیچے آ کر لیٹ گیا۔ کمبل کو تہہ کر کے تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھا اور درختوں کے پتوں کو گھورنے لگا۔ ننھے ننھے پرندے چہچہا رہے تھے۔ جگہیں تبدیل کر رہے تھے۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ بڑی خوشنما لگ رہی تھی۔ طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت تھی جسے الفاظ نہیں دے سکتا تھا۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ آنکھوں میں کچھ بوجھ سا پیدا ہو گیا تھا۔ بھوک تو نام و نشان کو نہیں تھی۔ لگتا تھا ایک پوری نے دن بھر کی کسر پوری کر دی ہے۔ پھر وہ شخص یاد آیا۔ ایسی جگہوں پر اللہ کے نیک بندوں سے ملاقاتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ کیا کہہ گیا تھا۔ دیکھو تو پاؤ، سوچو تو جانو۔ غور کرنے لگا اور یہی غور کرتے کرتے اچانک پچھلے دنوں کی باتیں یاد آ گئیں اور اچھل پڑا۔ ماموں ریاض تھانے میں ملے تھے اور وہ لوگ انہیں لے گئے تھے لیکن اس کے بعد جو کچھ علم میں آیا تھا وہ کیا حیثیت رکھتا تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے تمام واقعات میری نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں۔ میں خود بھی ان میں شریک ہوں۔ یہ کیسے ہوا تھا، یہ کیا بات تھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت دیر تک غور کرتا رہا اور پھر گردن ہلا کر کروٹ بدل لی۔ ماموں ریاض بیچارے۔ اگر جو کچھ میرے ذہن میں آیا، سچ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مصیبت سے نکل گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ذہن میں کیسے آیا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے آنکھوں کے پپوٹے بوجھل کر دیئے تھے اور ہلکا سا سرور ذہن پر طاری ہو گیا تھا لیکن سوچوں کے دائرے محدود نہیں ہوئے تھے۔

سوچوں کا عظیم سرمایہ محفوظ تھا۔ دماغ بوجھل ضرور ہو گیا تھا لیکن حاضر تھا۔ ماموں ریاض کے دل میں ضرور ہو گا کہ میرے لئے کچھ کریں۔ ہر چند کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اتنا جانتا تھا کہ وہ بھی دیوانے ہو گئے ہوں گے۔ اگر بڑے افسر نہ آ جاتے تو...... ہو سکتا ہے جو کچھ میرے ذہن میں آیا اس کے بعد بھی انہوں نے کچھ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے انہوں نے گھر جا کر میرے بارے میں امی اور ابو کو بتایا ہو۔ کیا گزری ہو گی ان پر، ماموں ریاض......

ٹوٹا پھوٹا سا گھر تھا۔ بوسیدہ کواڑ جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ پلاستر کی دیواریں تھیں۔ دروازے کے دوسری طرف چھوٹا سا صحن، ایک برآمدہ جس میں تخت پڑا ہوا تھا۔ ایک کمرہ جس میں بائیں سمت غسل خانہ اور بیت الخلاء، دوسری طرف باورچی خانہ۔ ابو اور امی تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ امی کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں بے نور تھیں اور وہ بار بار پلکیں جھپکا رہی تھیں۔ ابو اچھل پڑے۔ انہوں نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

''ریاض آ گیا۔''

''آ گیا؟'' امی اچھل پڑیں۔

''ہاں۔''

''ریاض، ریاض بیٹے!'' امی کی لرزتی آواز ابھری۔

''ہاں باجی...... میں آ گیا۔''

''کہاں ہے، کہاں ہے۔ میرے پاس آ۔ ریاض میرے پاس آ۔'' ماموں ریاض امی کے سینے سے جا لگے تھے۔ کیا ہوا

تھا۔ مارا تو نہیں تجھے۔ انہوں نے تجھے مارا تو نہیں۔'' امی ماموں ریاض کو ٹٹولتی ہوئی بولیں۔
''ارے نہیں باجی، کوئی میں ڈاکو تھا، چور تھا، مارتے کیسے؟'' ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اللہ تیرا شکر ہے۔ اللہ تیرا احسان ہے۔ کچھ کھایا ہے تو نے۔''
''پیٹ بھر کر کھایا ہے باجی۔ اطمینان سے بیٹھو۔''
''جھوٹ بول رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ سنئے روٹیاں لے آیئے بازار سے، میں چائے بنا لیتی ہوں، روٹیاں لے آیئے۔''
''باجی۔ میں نے کھانا کھا لیا ہے۔''
''اور کھائیں گے۔ ریاض ہم نے نہیں کھایا، کل سے نہیں کھایا۔''
''اوہ، میں لاتا ہوں۔ آپ بیٹھئے بھائی جان۔ میں لاتا ہوں۔'' ماموں ریاض بولے۔
''نہیں ریاض، تو نہ جا بیٹے کہیں پولیس دوبارہ نہ پکڑ لے، تو نہ جا ریاض۔''
''باجی پولیس کیوں پکڑ لے گی مجھے آخر۔ اسے دھوکا ہوا تھا۔ بعد میں سب نے معافی مانگی ہے۔ یہ دیکھئے نجم الحسن صاحب نے مجھے پانچ سو روپے بھی دیئے ہیں ہرجانے کے طور پر۔''
''تجھ پر اب الزام تو نہیں ہے؟''
''نہیں باجی، فیض الحسن بری صحبتوں میں ضرور پڑ گیا ہے' مگر وہ برا لڑکا نہیں ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے جو رقمیں غائب کی ہیں ان کے الزام میں اس کے باپ نے مجھے گرفتار کرا دیا ہے تو وہ باپ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے ساری بات بتا دی۔ نجم الحسن خود تھانے گئے، ان کی بیوی اور فیض بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے مجھے چھڑا لیا، بڑی معافیاں مانگی ہیں۔ انہوں نے دو سو روپے تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا ہے۔''
''اللہ تیرا شکر ہے۔''
''بھائی جان میں کھانا لے آتا ہوں۔''
''روٹیاں لے آ...... میں چائے بنا لیتی ہوں۔''
''نہیں باجی مرغی کا سالن لاؤں گا۔ محنت کے پیسے ملے ہیں اور یہ آپ کو چائے بنانے کی کیا سوجھی۔ کیا آپ پھر چولہا جلانے لگی ہیں۔''
''نہیں مانتیں۔ مجھے بتاؤ کیا کروں......؟'' ابو بولے۔
''خدا کے لئے باجی چولہے کے پاس نہ جایا کریں۔ پورا دوپٹہ جلا لیا تھا۔ اللہ نے بچایا۔''
''اب بار بار ایسا تھوڑی ہوگا۔ جا کھانا لے آ۔'' امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ماموں دروازے سے نکل گئے تھے۔ پھر میں نے ان سب کو دسترخوان پر دیکھا۔ امی ہاتھ والے پنکھے سے پنکھا جھل رہی تھیں۔
''اب یہ پنکھا رکھ دیں اور کھانا کھائیں۔'' ابو بولے۔
''افوہ کھاؤ تم لوگ مکھیاں بیٹھیں گی کھانے پر۔''
''ایک بھی مکھی نہیں ہے۔ رکھئے پنکھا، کھانا کھایئے۔'' ماموں بولے۔ ''ذرا دیکھئے بھنی ہوئی مرغی کیا مزا دے رہی ہے۔''
''کھا لوں گی نا۔ تم لوگ کھاؤ۔'' امی بے
اختیار رو پڑیں۔ ابو اور ماموں کے ہاتھ رک گئے۔ ماموں نے کہا۔
''باجی۔''
''کھا لوں گی میں۔ میرے پیچھے مت پڑو۔ مت پڑو میرے پیچھے۔ پتہ نہیں میرے بچے...... میرے بچے۔'' امی بلک بلک کر رو پڑیں۔ ابو بھی سسکنے لگے۔ ماموں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ رک گئے تم

لوگ، نہ کھاؤ تو مجھے مردہ دیکھو، کھاؤ، میں کہتی ہوں کھاؤ۔" امی ان کے ہاتھ ٹٹولنے لگیں۔ ماموں ریاض نے کہا۔
"آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا بھائی جان۔" ابو نے آنکھوں میں آنسو بھر کے انہیں دیکھا۔ آپ کے اور باجی کے سوا دنیا میں میرا اور کوئی ہے۔ آپ دونوں کی قسم کھا کر ایک بات کہہ رہا ہوں۔ یہ رزق ہے میرے ہاتھ میں، جھوٹ نہیں بول رہا۔ مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ کہنا ہے باجی کے سامنے ہی کہہ دوں۔"
"بات کیا ہے؟" ابو نے آنکھیں خشک کر کے ماموں ریاض کو دیکھا۔
"مسعود زندہ ہے۔ خیریت سے ہے۔ بس ذرا کمزور ہو گیا ہے۔ حلیہ بدل رکھا ہے۔ داڑھی چھوڑ دی ہے۔ کہتا ہے کہ کچھ مشکلات ہیں جن پر قابو پالیں تو واپس گھر آ جائے گا، اس کی فکر نہ کی جائے۔"
"کیا......" ابو اچھل کر کھڑے ہو گئے۔
"آپ کی اور باجی کی قسم جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ زندہ سلامت ہے اور اسے محمود کے بارے میں بھی معلوم ہے، ہمارا محمود بھی خدا کے فضل سے خیریت سے ہے اور ملک سے باہر چلا گیا ہے، اگر اسے ہمارا پتہ معلوم ہوتا تو یقیناً وہ اب تک ہم سے رابطہ کر چکا ہوتا۔"
"ریاض...... ریاض تجھے اللہ کا واسطہ۔ کلیجہ نکال لیا ہے تو نے۔ ہائے تو نے کلیجہ نکال لیا ہے۔ ارے تجھے اللہ کا واسطہ بتا تو دے بتا دے کہ دل رکھ رہا ہے یا سچ بول رہا ہے۔" امی نے جھک کر ماموں ریاض کے پاؤں پکڑ لئے۔
"میں نے آپ دونوں کی قسمیں کھائی ہیں باجی۔ اور بھی کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے بتائیں۔"
"کہاں ملا وہ، تیرے ساتھ گھر نہیں آیا؟"
"تھانے کے لاک اپ میں ملا تھا۔"
"ایں......" ابو کے حلق سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔
"اللہ نے چاہا تو واپس آ جائے گا۔ نجم الحسن کل اپنے تھانیدار دوست سے مل کر اسے رہا کرا لیں گے۔"
"مجھے لے چل، مجھے لے چل ریاض، مجھے لے چل۔ اپنے، اپنے بچے کو چھونا چاہتی ہوں میں، آہ میں اسے چھونا چاہتی ہوں۔" امی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔
"آپ نے اس طرح دل دکھا دیا باجی ورنہ میں ابھی آپ کو کچھ نہ بتاتا۔ مجھے اپنی یہ خاموشی جرم محسوس ہوتی تھی۔ ہر قیمت پر آپ کو انتظار کرنا ہوگا بھائی جان آپ غور کریں۔ اس پر قتل کا الزام ہے کہ جانے کس طرح اس نے خود کو چھپایا ہوا ہے۔ پولیس کی یادداشت اتنی خراب نہیں ہوتی، سب یکجا ہو گئے تو کہیں تھانیدار کو ماضی یاد نہ آ جائے۔ پھر ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"
"ہیں......" امی کے منہ سے نکلا۔
"ہاں۔ باجی صبر کرنا ہوگا آپ کو۔ اللہ نے آپ کو ان دونوں کی زندگی کی خبر دی ہے، ایک دن ہم سے آ بھی ملیں گے۔"
"کل نہیں......" امی نے حسرت سے پوچھا۔
"سب کچھ اللہ جانتا ہے وہی سب کچھ......"
ایک دم سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کوئی پاؤں پکڑ کر چلایا تھا۔ پھر ایک آواز سنائی دی تھی۔
"بابا جی...... بابا صاحب......" میں چونک پڑا۔ چند افراد کھڑے ہوئے تھے۔ شکلیں جانی پہچانی سی تھیں۔ ان بزرگ کو میں نے فوراً پہچان لیا جن کا سامان اٹھانے کے دو روپے ملے تھے مجھے۔ میں جلدی سے اٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔
"بابا صاحب اٹھیے۔ اٹھیے بابا صاحب۔"
"کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے۔" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''غلطی ہم سے ہوگئی ہے بابا صاحب۔ آپ کو پہچان نہ سکے۔''

کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیں۔

''اللہ کے نام پر آپ ہماری مدد کریں بابا صاحب۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

''آپ لوگ یقین کریں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہی خاندان تھا جو ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اب میں نے سب کو پہچان لیا تھا۔'' وہ سب بھی میرے اردگرد بیٹھ گئے۔ بزرگ نے کہا۔

''عامر میرا پوتا ہے۔ میرے بیٹے کا ایک ہی بیٹا، دوسری بیٹی ہے۔ یہ ہے نسیمہ۔ عامر اسکول میں پڑھتا تھا۔ شوخ کھلاڑی مگر ذہین تھا، کبھی کبھی بچوں کے ساتھ اسکول سے آوارہ گردی کرنے نکل جاتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے اسکول سے کافی فاصلے پر ایک جگہ کربلا کے نام سے مشہور ہے وہاں تعزیئے دفن کئے جاتے ہیں۔ نزدیک ہی قبرستان بھی ہے۔ آس پاس کھیت بکھرے ہوئے ہیں۔ وہیں کھیلنے چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رات کو بخار آ گیا۔ وہ ہذیان بکتا رہا۔ اس کے بعد میاں صاحب ہم زیر عتاب ہیں۔ سیکڑوں ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن کی تفصیل طویل ہے، اس پر سایہ ہو گیا ہے بابا صاحب۔ نہ جانے کیا کیا کر چکے ہیں ہم مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ بابا صاحب اس وقت بھی اس پر جنون طاری تھا جب وہ بھاگ کر باہر آیا تھا۔ آپ کو دیکھ کر سہم گیا۔ اس وقت سے اندر گھسا ہوا ہے جب کہ اندر رہتا ہی نہیں تھا، اب کہتا ہے باہر نہیں جاؤں گا، باہر وہ ہے...... وہ!''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سے ڈر رہا ہے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں۔''

''مجھ سے کیوں؟''

''اللہ جانتا ہے۔''

میں ہنسنے لگا۔ عجیب ہیں آپ لوگ۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں خود ایک غریب آدمی ہوں۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرتا ہوں۔ چچا میاں آپ کو خود علم ہے کہ میں نے آپ کا سامان اٹھا کر صبح کا ناشتہ کیا تھا!''

''اللہ کے نیک بندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھئے بابا صاحب۔ ہم بھلا آپ سے کچھ کہنے کی کہاں اہلیت رکھتے ہیں۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ نے اپنی کوئی امانت آپ کو سونپی ہے تو اسے دوسروں کی بھلائی کے لئے ضرور استعمال کریں۔ آپ کی سربلندی میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہم پریشان حال لوگ ہیں نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ معصوم بچہ ہے، کل گیارہ سال عمر ہے اس کی۔ پوری زندگی تباہ ہو جائے گی اس کی۔ ماں رو رو کر مر جائے گی اس کی۔ سولی پر لٹکے ہوئے ہیں ہم لوگ، اللہ کے نام پر ہماری مدد کریں۔ بزرگ رونے لگے۔

مگر محترم...... میں...... میں ایک عام آدمی ہوں۔ میں خود زندگی کا ستایا ہوا ہوں۔ آپ کو ضرور میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''وہ صرف آپ سے خوفزدہ ہے۔ کہتا ہے باہر نہیں جائے گا۔ باہر کمبل والے بابا ہیں اور کمبل آپ ہی کے پاس ہے۔''

''کمبل!'' میرے پورے وجود میں بم سا پھٹا۔ کمبل...... کمبل۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کمبل کو دیکھا جسے ابھی سرہانے رکھے سو رہا تھا۔ یہ عطیہ انہیں دو۔ بزرگوں میں سے ایک نے مجھے دیا تھا' مگر اس وقت میری اندھی آنکھوں نے اسے نہیں پہچانا تھا، اب تک نہیں پہچانا تھا۔ یہ تو وہی کمبل تھا جو ایک بار پہلے بھی مجھے مل چکا تھا۔

میں بھلا اس کمبل کو بھول سکتا تھا جب یہ ملا تھا تو مجھے عروج ملا تھا اور پھر میں نے اسے کھو دیا تھا۔ آہ یہ وہی کمبل تھا، سو فیصد وہی تھا، دماغ میں شیشے ٹوٹنے لگے۔ چھناکے ہونے لگے، وہ دونوں بزرگ یاد آئے جن میں سے ایک نے مجھے کمبل دیا

تھا۔ شکلیں یاد نہیں تھیں لیکن...... باقی سب کچھ یاد تھا کمبل اوڑھا تھا اور اس کے بعد امی اور ابو کو دیکھا تھا۔ ماموں ریاض کے بارے میں آگے کا سارا حال دیکھا تھا۔ کوئی تصور اتنی جامع شکل نہیں اختیار کرسکتا۔ میں نے تو وہ سب کچھ دیکھا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''بابا صاحب......'' بزرگ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

جی...... میں...... وہ۔

''خدا کے لیے بابا صاحب، خدا کے لیے اللہ نے آپ کو کچھ دیا ہے تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کریں خدا کے لیے بابا صاحب۔''

بزرگ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور میں تڑپ اٹھا۔

''ایسا نہ کریں محترم، خدا کے لئے ایسا کر کے مجھے گناہ گار نہ کریں۔''

''ہماری مدد کریں۔''

''آپ مجھے وقت دیجئے کچھ کرسکا تو ضرور کروں گا۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں خود حاضری دوں گا۔''

''بہت بہتر، ہم انتظار کریں گے۔''

''آپ جایئے میں آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔ اگر آپ کا کام نہ کرسکا تو معذرت کرنے آؤں گا۔'' میں نے کہا اور وہ سب اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر کمبل اٹھالیا اسے سینے سے لگالیا، سکون کا ایک سمندر سینے میں اتر گیا تھا دیر تک اس سکون سے بہرہ ور ہوتا رہا۔

شام کے سائے جھلک رہے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ پانی تلاش کر کے وضو کیا نماز پڑھی۔ اسی درخت کے نیچے بسیرا کرلیا تھا۔ رات ہوگئی عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تھا کہ کھانا آگیا۔

''بابا صاحب لنگر لے لیجئے۔ صاحب مزار کے نام کا ہے۔'' انکار نہ کرسکا تھوڑا بہت کھانا کھایا اس کے بعد کمبل اوڑھ لیا، دل میں کہا۔

''مجھے اس نعمت سے سرفراز کرنے والو! مجھ سے زیادہ تم میرے بارے میں جانتے ہو میں کور بینا ہوں، میری نظر محدود ہے۔ میری عقل محدود ہے جو منصب مجھے عطا کیا گیا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے رہنمائی درکار ہے۔ میری عقل ناقص صحیح فیصلے کرنے سے قاصر ہے مجھے رہنمائی عطا ہو۔ مجھے رہنمائی عطا ہو، مجھے رہنمائی درکار ہے، مجھے رہنمائی چاہیئے۔'' آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے کسی نے زور سے دھکیل کر کہا۔

''بڑا پھیل کر سو رہا ہے سرک جگہ دے۔'' میں لڑھک گیا تھا، جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ بھی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ''زمین اللہ کی ہے اس پر سب کا حق ہے۔''

''کیوں نہیں آپ آرام سے لیٹ جائیں۔'' میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوڑھا آدمی اطمینان سے لیٹ گیا کچھ دیر خاموشی سے گزر گئی پھر اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

''پیروں میں بڑا درد ہو رہا ہے ذرا دبا دے۔''

''جی......!'' میں نے اس کا پاؤں اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور اسے دبانے لگا۔

دفعتاً اس نے بڑی زور سے دوسرا پاؤں میرے سینے پر مارا اور میں بے اختیار لڑھک کر دور جا گرا۔

''ہاتھوں میں کانٹے اگے ہوئے ہیں۔ آہستہ نہیں دبا سکتا طاقت آزما رہا ہے میرے پیروں پر۔''

''اوہ نہیں بابا صاحب معاف کردیجئے اب آہستہ دباؤں گا۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ اس کے پاس آبیٹھا۔ احترام سے دوبارہ اس کا پاؤں لے کر گود میں رکھا اور اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

''ہاں اب ٹھیک ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کرلیں، کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا تو اس نے کروٹ بدل کر دوسرا پاؤں میری

گود میں رکھ دیا۔ میں دوسرا پاؤں دبانے لگا۔ کافی دیر گزر گئی اچانک وہ بولا۔ ''قاتل بہت ہیں کچھ زیادہ خطرناک کچھ کم۔ دشمن کے وار کرنے سے پہلے اس پر وار کردو۔ اسے مار ڈالو۔ دشمن نمبر ایک غرور ہے، خود پسندی ہے، تمہارے بدن کا لباس، تمہاری بینائی، تمہاری سوچ اور سب سے بڑھ کر تمہاری زندگی اپنی نہیں ہے پھر کس چیز پر حق جتاتے ہو۔ بیوقوفی ہے نا...... کیوں ہے نا......؟''

''ہاں......'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''سب کچھ قرض ہے ادھار ہے ادائیگی ضرور ہوتی ہے، بچا کھچا اپنا ہوتا ہے دوسرے کے مال پر کیا اترانا کیوں ہے کہ نہیں؟''

''ٹھیک کہتے ہیں بابا صاحب۔''

''پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لو۔''

''کس سے بابا صاحب؟''

''بتانے والا اندر ہوتا ہے پوچھو گے جواب ملے گا، بھٹکنے کی ضرورت ہی کیا ہے مگر کرنے سے پہلے پوچھو۔''

''جی بابا صاحب۔''

''خود غرضی ہمیشہ نقصان دیتی ہے پہلے دوسروں کے بارے میں سوچو پھر اپنے بارے میں۔ جذبات سنبھالنے پڑتے ہیں ورنہ کھیل بگڑ جاتا ہے کیا سمجھے۔ اور کچھ پوچھنا ہے۔''

''آپ نے جتنا بتایا ہے اتنا تو سمجھ لیا بابا صاحب۔''

''میں نابینا ہوں بابا صاحب کچھ نہیں جانتا۔ سچائی سے سب کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر ناواقفیت کا شکار ہو جاتا ہوں۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''چہرہ ڈھک لینا، دل و دماغ روشن ہو جائیں گے بس کافی ہے۔''

بوڑھے شخص نے پاؤں سمیٹ لیے۔

''اور دباؤں بابا صاحب؟''

''نہیں...... چلتا ہوں۔'' بوڑھے نے کہا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا میں اسے دیکھتا رہا اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور پھر ایک اور درخت کی آڑ میں گم ہو گیا۔ دل بری طرح کانپ رہا تھا، رہنمائی ملی تھی، انعام عطا ہوا تھا، ہدایت کی گئی تھی۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔ ساری باتوں کو یاد کر کے دل میں اتار رہا تھا پھر وہ لوگ یاد آ گئے جن سے وعدہ کیا تھا۔ کیا کروں، کیا کرنا چاہئے لیٹ کر کمبل چہرے پر ڈال لیا۔ ذہن میں ان کا تصور کیا تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ وہ سب نگاہوں کے سامنے آ گئے بزرگ، ان کا بیٹا، بہو، لڑکی اور وہ بچہ۔ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں دہشت رقصاں تھی۔ نوجوان لڑکی نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور خوف سے کانپ رہی تھی، بچے کی ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ حسرت بھری نظروں سے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا شوہر سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اور وہی بزرگ تسبیح ہاتھوں میں لیے کچھ پڑھ رہے تھے۔

دفعتاً لڑکے کی زبان لمبی ہونے لگی۔ سرخ زبان کسی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی لمبائی کوئی چار گز ہو گئی اور پھر اچانک اس نے ان بزرگ کے ہاتھوں میں دبی تسبیح کو لپک لیا، نوجوان لڑکی نے دہشت بھری چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گئی۔

''بات کرلو...... چلے جاؤ...... حال معلوم ہو جائے گا...... چلے جاؤ کام ہو جائے گا۔'' مجھے اپنی آواز سنائی دی، میں بول رہا تھا، میں سن رہا تھا۔ مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمبل تہہ کر کے شانے پر رکھا اور تیز تیز قدموں سے اس طرف چل پڑا، کچھ دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا سب لوگ ریسٹ ہاؤس میں تھے۔ میں نے دروازہ بجایا انہی بزرگ نے دروازہ کھولا تھا۔

''آپ......آیئے، دیکھئے اندر کیا ہو رہا ہے۔''
انہوں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''آ سکتا ہوں؟''
''آ جایئے۔'' بزرگ دروازے سے ہٹ گئے میں اندر داخل ہو گیا۔ بچہ اچھل پڑا تھا اس کی زبان فوراً اندر چلی گئی اور اٹھ کر دیوار سے جا لگا۔ وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور شاید بھاگنے کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا، اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔
''میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، اپنا کام کرو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''
''ایک گلاس پانی دیجئے۔'' میں نے بزرگ سے کہا اور وہ جلدی سے ایک طرف رکھی صراحی کی طرف بڑھ گئے۔
''تم سن نہیں رہے، میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔''
لڑکے نے بھاری آواز میں کہا۔
''یہاں تم سے جھگڑا کون کر رہا ہے۔ اللہ کے بندے ہو، اللہ کا نام لے کر بات کرو۔'' میں نے بزرگ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس پر بسم اللہ پڑھ کر پھونکی اور اس کے بعد پانی کا گلاس لڑکے کی طرف بڑھا کر بولا۔
''لو میاں پانی پیئو، محبت سے کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے محبت سے ہی قبول کرنا چاہیے۔''
''دیکھو آخری بار سمجھا رہا ہوں، ہمارے بیچ میں مت آؤ تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا سوائے نقصان کے۔''
''اللہ کے بندے ہو کے، اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچاؤ گے تو تمہارے ساتھ بھی تو بہتری نہیں ہوگی جواب دو، ورنہ یہ پانی میں تمہارے جسم پر پھینک دوں گا اور تم سمجھتے ہو کہ یہ گناہ صرف تمہارے سر ہوگا۔''
''ارے واہ جھگڑا ہمارا ہے، بیچ میں کود رہے ہو تم۔ ذرا اس سے پوچھو کیا کیا ہے اس نے، بچے کھیل رہے تھے اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا، شرارت اپنی جگہ ہوتی ہے، پتھر مارنے شروع کر دیئے اور اچھا خاصا زخمی کر دیا میرے بچے کو، میں بھلا چھوڑ دوں گا اسے، اتنے ہی زخم لگا دوں اسے تو میرا بھی نام نہیں۔''
''درگزر بھی تو ایک پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔ بچپن ہے، بے شک تمہیں نقصان پہنچا ہوگا لیکن اس کی زندگی لے کر تمہیں کیا مل جائے گا۔''
''اور اگر میرا بچہ مر جاتا تو......''
''اللہ نے اسے زندگی عطا فرمائی تم اس کے صدقے اس کی زندگی بھی قائم رہنے دو...... یہ ضروری ہے۔''
''کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، میں سمجھتا ہوں تم اپنی یہ ولایت لے کر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرا تمہارا جھگڑا ہو جائے گا اور ہاں پہچانتا ہوں تمہیں اچھی طرح، جانتا بھی ہوں ایک بار دیکھ بھی چکا ہوں مگر وہ معاملہ ذرا دوسرا تھا ہر ایک کے بیچ میں پہنچ جاتے ہو۔ تمہارا بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''
''اگر میرے سر میں پتھر مار کر تمہارا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو میں حاضر ہوں کچھ نہ کہوں گا تمہیں، لیکن بچوں کے باپ ہو، معاف کر دو اسے۔ میں اس کی طرف سے اور اس کے تمام اہل خانہ کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر کوئی جرمانہ کرنا چاہو تو جرمانہ کر دو ادائیگی ہوگی۔ مگر اب اسے معاف ہی کر دو تو بہتر ہے۔''
''اور اگر نہ کروں تو......؟''
''تو پھر بات دوسری شکل اختیار کر جائے گی۔'' میں نے گلاس سیدھا کر لیا اور لڑکا دیوار کے سہارے ادھر سے ادھر کھسکنے لگا پھر بولا۔ ''یہ طریقہ ہوتا ہے دوستی کرانے کا، ان لوگوں سے کہو کہ آئندہ اگر یہ بچہ اس طرف دیکھا گیا تو پھر میں اسے نہیں چھوڑوں گا اور تم، ٹھیک ہے میں نہ سہی کوئی دوسرا تمہیں ٹھیک کر دے گا۔ ہر ایک کے بیچ میں ایسے ہی مت آ جایا کرو۔''

✦✦✦✦✦

''بہر حال فی الحال تو تم یہ بتاؤ کہ سچے دل سے اسے معاف کر رہے ہو یا یونہی عارضی طور پر مجھے ٹال رہے ہو؟''
''اور اگر یہ بچہ دوبارہ ادھر دیکھا گیا تو......؟''
''اس کا وعدہ اس کے والدین کریں گے۔''
عورت جلدی سے بولی۔ ''نہیں جائے گا ہم وہ شہر ہی چھوڑ دیں گے، وہ جگہ چھوڑ دیں گے ہم، کبھی نہیں جائیں گے اس طرف، کبھی نہیں جائیں گے۔''
''دیکھو میاں جی مشورہ دے رہے ہیں تمہیں ہم ایسے معاملات میں ٹانگیں مت اڑایا کرو، ورنہ کسی وقت نقصان بھی اٹھا جاؤ گے۔ ارے ہاں پہنچ گئے ولی بن کر۔'' لڑکے نے کہا اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں، رفتہ رفتہ اس کا جسم ڈھیلا پڑتا جارہا تھا اور پھر وہ دیوار کے ساتھ پیچھے کھسکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ وہ بھی بے ہوش ہوگیا تھا بزرگ جلدی سے آگے بڑھے ان کا بیٹا بھی آگے بڑھا اور باپ نے بیٹے کو گود میں اٹھالیا۔ لڑکا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ عورت کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں میں نے آہستہ سے کہا۔ ''خدا نے اپنا کرم کردیا میرے خیال میں اب سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں۔ اب خدا نے چاہا تو سب بہتر ہوجائے گا۔''
بزرگ جلدی سے میرے قریب پہنچے اور انہوں نے جھک کر میرے پاؤں پکڑنا چاہے تو میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔
''نہیں محترم، خدا کے لیے نہیں یہ آپ کیا کررہے ہیں۔ یہ میرے ساتھ دشمنی ہے، محبت کے جواب میں دشمنی۔''
بزرگ ایک دم سیدھے ہوگئے تھے۔
''میرا دل کہہ رہا ہے، میرا بچہ ٹھیک ہوگیا۔ آہ ہم سب کو نئی زندگی ملی ہے اپنے جذبات کا اظہار میں کیسے کروں۔'' وہ بولے۔
''بس ایک ہی التجا ہے۔''
''حکم کیجئے بابا صاحب۔''
''میرے حق میں دعائے خیر کیجئے۔''
''سنئے بابا صاحب سنئے، کچھ خدمت کا موقع دیجئے ہمیں۔''
''اللہ نے آپ کو اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ ایسی باتیں نہ کیجئے خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور وہاں سے نکل آیا اس کے بعد رکنے کو دل نہیں چاہا تھا چنانچہ کسی سمت کا تعین کئے بغیر چلتا رہا۔
مزار شریف سے بہت دور آبادی تھی وہاں سے بھی گزر گیا۔ لق و دق میدان شروع ہوگئے، چاند نکل آیا تھا، ایک پرسکوت ماحول تھا اسی طرح چلتے رہنے میں لطف آرہا تھا، چلتا رہا اور نہ جانے رات کا کونسا پہر گزر گیا، پاؤں کچھ وزنی محسوس ہوئے تو رک گیا، جھاڑیاں، پتھر مٹی کے تودے گڑھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا جھینگر بے وقت کی راگنی الاپ رہے تھے۔ کسی قدر صاف ستھری جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور تھکن محسوس کر کے وہیں آرام کرنے کی ٹھانی۔ ایک پتھر سے سر لگایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور آنکھیں کھل گئیں، چار انسان نظر آئے۔ چاندنی میں انہیں صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ دیہاتی تھے لاٹھیاں اٹھائی ہوئی تھیں، لمبے تڑنگے تھے۔ سہمے سہمے قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''سنو...... بات سنو۔'' میں نے کہا اور وہ چاروں رک گئے۔ انہوں نے شاید مجھے دیکھا تھا اس لیے وہ چاروں طرف دیکھنے لگے۔ پھر سب ہی دہشت سے چیخنے لگے۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ایک دوسرے میں الجھ کر گر پڑے۔
''ارے دیا رے دیا۔ ارے شردھانند تیرا ستیاناس۔ ہے پربھو...... ہے بھگوان...... ارے بھاگو...... ارے بھاگو۔''
ان میں سے کسی نے چیخ کر کہا مگر ان کی ہمت پست ہوگئی تھی۔
''ڈرو نہیں بھائی، میں بھی تمہارا جیسا انسان ہوں، ڈرو نہیں۔'' میں کھڑا ہوگیا۔

''ہرے ماردیو، رام دیال۔ ہرے بھاگو بھیا'' کوئی اور چیخا اس دوران میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔
''دیکھو میں پھر کہہ رہا ہوں تم سے ڈرو نہیں میں کوئی بھوت پریت نہیں تمہارے جیسا انسان ہوں۔''
''ہرے بھیا بھوت ناہیں ہو تو کا یہاں کھیت رکھا رہے ہو؟'' ایک نے ہمت کر کے کہا۔
''مسافر ہوں سفر کر رہا تھا۔ تھک کر یہاں لیٹ گیا تھا۔''
''ایں۔'' ان کی کچھ ہمت بندھی ایک ایک کر کے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھا اور پھر ڈرے ڈرے انداز میں ہنسنے لگے۔
''ارے تو ڈر کون رہا تھا۔ ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے ہاں...... واہ رے رام دیال تو بھی بڑا بکٹ ہے بھائی۔''
''بس بس چپ ہو جا شرم کر جان تو تیری نکل رہی تھی مگر بھائی مسافر لگو تو تم بھوت ہی رہو۔ ارے بھیا اکیلے یہاں پڑے ہوئے تھے۔''
''تم لوگ کون ہو اور اس وقت کہاں جا رہے تھے۔''
''ارے بس کیا بتائیں یہ شردھانند ہے بس ہریالی بستی گئے تھے کام سے صبح کو چلتے مگر یہ گھر والی سے کہہ آیا تھا کہ رات کو واپس آ جائے گا۔ بس بھیا ہمیں کھینچ کر چل پڑا حالانکہ راستے میں لال تلیا پڑے ہے مگر بھیا بیاہ کو چار مہینے ہوئے ہیں وعدہ کیسے نہ پورا کرتا ارے ہے نا شردھانند......''
''اب چلو یا یہیں پڑے رہو گے۔'' شردھانند نے کہا۔
''بھائی مسافر، تم کدھر جا رہے تھے۔''
''بس سیدھا ہی جا رہا تھا۔''
''کہیں دور سے آ رہے ہو کا؟''
''ہاں۔''
''چلو گے ہمارے ساتھ یا یہیں جنگل میں مزے کرو گے؟''
''تم لوگ کہاں رہتے ہو؟''
''دھونی پور کے رہنے والے ہیں ہم۔''
''چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں نے کہا تھکن تھی مگر پھر بھی ان سادہ دل دیہاتیوں کے ساتھ جانے کو دل چاہا۔ وہ سب آگے بڑھ گئے تھے۔
''تمہارا نام کیا ہے؟'' شردھانند نے پوچھا۔
''مسعود۔'' میں نے جواب دیا۔
''میاں بھائی ہو؟''
''ہاں۔''
''پہلے کبھی دھونی پور نا گئے؟''
''کبھی نہیں۔''
''بڑھیا جگہ ہے۔ مگر......''
''مگر کیا؟''
''ارے نا بھائی نا۔ رات کا وقت ہے کچھ نا بولیں گے ہم۔ ویسے ہی اس سسرے شردھانند نے مروا دیا ہے ہمیں۔'' رام دیال نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد دیر تک خاموشی طاری رہی تھی پھر ان لوگوں کے قدم رکنے لگے سب ڈرے ڈرے سے لگ رہے تھے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا بات ہے؟''
''لال...... لال تلیا۔''
''تم لوگ پہلے بھی اس کا نام لے چکے ہو۔ یہ لال تلیا کیا ہے۔''
''ارے بھیا یہاں سے نکل چلو، بعد میں بتا دیں گے۔''
''نہیں ابھی بتاؤ۔''
''جمناداس......'' شردھانند نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور سب رک گئے۔ شردھانند خوفزدہ انداز میں ایک طرف اشارہ کر رہا تھا، میں نے اس سمت دیکھا آگ روشن تھی اور کوئی شخص بیٹھا اس جلتی آگ میں لکڑیاں ڈال رہا تھا۔ جس سے آگ اور بھڑک اٹھتی تھی۔
''کیا بات ہے آگے نہیں چلو گے۔'' میں نے پوچھا مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سب وحشت زدہ نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر ان کے ساتھ کھڑا رہا پھر میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں تم یہاں آرام کرو۔''
''ارے کوئی دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔ آگے نہ بڑھنا بے موت مارے جاؤ گے، گردن مروڑ کر رکھ دے گا تمہاری۔''
''کون؟''
''سر کٹا...... ہرے رام غلطی سے منہ سے نام نکل گیا۔'' رام دیال نے دانتوں تلے زبان دبالی۔
''سر کٹا کہاں ہے وہ۔''
''تلیا کنارے آگ کون جلا رہا ہے۔''
''وہ سر کٹا ہے۔''
''ارے تو کیا چاچا ہے ہمارا۔'' سب کے سب دہشت زدہ نظر آرہے تھے۔
''مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔''
''تمہاری تو گھوم گئی ہے کھوپڑی۔ ہمیں کاہے کو مرواؤ ہو بھائی۔ ارے واپس چلو بھیا آج کی تو رات ہی مصیبت کی ہے۔ کہہ رہے تھے شردھانند سے آج گھر پہنچ جائیں تو جانو۔''
''ٹھیک ہے۔ تم یہاں رکو میں دیکھتا ہوں۔'' میں آگے بڑھنے لگا تو چاروں نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔
''ساری شیخی نکل جائے گی میاں جی رک جاؤ، آؤ واپس چلتے ہیں۔ دن نکل آئے گا تو آگے بڑھیں گے۔ تمہیں اس کے قصے نہیں معلوم۔''
''بتاؤ گے تو پتہ چلیں گے نا۔''
''کوئی ایک ہو تو بتائیں جمناداس کے سارے کٹم کو کھا گیا ہے یہ۔ ہری داس کو اس نے مارا۔ سلیم چاچا کا جوان بیٹا اس کے ہاتھوں مارا گیا، کلو سنگھاڑی کی لاش تال میں گل گئی۔ راتوں کو مستی میں نکل آتا ہے اور آوازیں لگاتا ہے۔ سنگھاڑے لے لو سنگھاڑے۔ کسی نے جھانک لیا تو سمجھو گیا۔ ہماری بستی تو بھوت بستی ہوگئی ہے آج کل۔ بے چارے بنسی لعل پر تو مصیبت آئی ہوئی ہے۔''
''آؤ، بیٹھو، مجھے اس کے بارے میں مزید بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ بات دلچسپ تھی خلق خدا کو تنگ کیا جارہا تھا تو ذمہ داری تو آتی تھی، ان لوگوں نے معصومیت سے مکمل کہانی سنائی۔ جمناداس دھونی پور کا بنیا تھا۔ دو بیٹے ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹا دکان کے کچھ پیسے جوئے میں ہار گیا۔ باپ کے خوف سے لال تلیا پر آچھپا، صبح کو اس کی اکڑی ہوئی لاش ملی تھی۔ جمناداس نے ایک منتر پڑھنے والے کو بلا کر تلیا کنارے جاپ کرایا بس غضب ہوگیا۔ منتر پڑھنے والا تو خیر بھاگ گیا مگر جمناداس کی مصیبت

آ گئی۔ بیوی مری، بیٹی آگ سے جل کر مرگئی پھر دوسرا بیٹا پاگل ہو گیا اور سب کے غم میں جمناداس نے دھتورہ کھا کر خودکشی کر لی۔ ہری داس اہیر بھی تلیا کنارے مارا گیا۔ سلیم چاچا کا بیٹا پہلوانی کرتا تھا۔ مسلمان تھا۔ سر کٹے کو تسلیم نہ کیا۔ تلیا کنارے آ کر سر کٹے کو للکار دیا۔ بہت سے لوگوں نے بے سر کے پہلوان کو اس سے کشتی لڑتے دیکھا اور پھر نو جوان لڑکا خون تھوک تھوک کر مر گیا یہی ساری کہانیاں تھیں میں نے بنسی لعل کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ دوسری بات ہے۔''

''کیا؟''

''ارے وہ اور واقعہ ہے بنسی لعل مہاراج بھی تو کسی سے کم نہیں ہیں۔''

''وہ اس سر کٹے کا قصہ نہیں ہے؟''

''نہیں وہ ان کے کرموں کا پھل ہے۔''

''چلو تم لوگ یہاں بیٹھو میں ذرا اس سے ملاقات کر لوں۔'' میں نے کہا اس بار میں ان کے روکے سے نہ رکا تھا آگ کو نشان بنا کر ہی آگے بڑھا اور تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ خاصا وسیع قدرتی تالاب تھا جس میں سنگھاڑوں کی بیلیں تیر رہی تھیں، میں نے جلتی آگ کے پاس اسے بیٹھے ہوئے دیکھا لباس سے بیگانہ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا اور درحقیقت اس کے شانوں پر سر موجود نہیں تھا۔ میری آہٹ پا کر وہ کھڑا ہو گیا میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کون ہے رے تو۔'' ایک منمناتی آواز سنائی دی۔

''مسعود ہے میرا نام۔ تمہارا بھی کوئی نام ہے؟''

''سورما بن کر آیا ہے؟''

''نہیں تمہیں سمجھانے آیا ہوں؟''

''کیا سمجھائے گا؟''

''تمہارا اصل ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔''

''تم خلق اللہ کو پریشان کرتے ہو تمہیں یہ جگہ چھوڑنا ہوگی یہاں سے چلے جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔''

''لڑے گا؟'' اس نے ران پر ہاتھ مار کر اچھلتے ہوئے کہا۔

''مجبور کر دگے تو لڑنا پڑے گا، میں چاہتا ہوں ایسا نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ دل کہہ رہا تھا کہ جو کچھ کر رہا ہوں درست ہے وہ گندی روح ہے اور انسان کو نقصان پہنچاتی ہے اسے روکنا ضروری ہے وہ کئی بار ران پر ہاتھ مار کر اچھلا اور پھر اس نے اپنے بائیں شانے سے میرے سینے پر ٹکر ماری۔ لڑکھڑا گیا، ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ اس کے بدن کے درمیان سے نکل گئے۔ اس نے عقب میں آ کر پھر ایک ٹکر ماری اور میں پھر لڑکھڑا گیا مگر گرا نہیں تھا۔ ایک منمناتا بھیانک قہقہہ اس کے حلق سے نکلا اور وہ اچھل کود کرنے لگا۔ کبھی سو گز دور نظر آتا کبھی بالکل قریب، اسے چھونے کی کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور تیار ہو گیا۔ اس نے قریب آ کر میرے سینے پر لات ماری تو میں نے فوراً کمبل اس پر اچھال دیا اور کمبل پوری طرح پھیل کر اس پر چھا گیا، ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ کمبل کے نیچے وہ بری طرح جدوجہد کر رہا تھا اور اس کی چیخیں بھیانک سے بھیانک تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا پھر اس کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی اور کچھ دیر کے بعد کمبل بالکل زمین پر پھیل گیا جیسے اس کے نیچے کچھ نہ ہو، میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور نیچے کا منظر دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا۔ زمین پر ایک بے سر کے انسانی جسم کا پورا سیاہ نشان بنا ہوا تھا جس سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے کمبل لپیٹ کر کندھے پر ڈال لیا نہ جانے کس طرح ان چاروں کی ہمت پڑی کہ وہ میرے قریب آ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھنے لگے۔

''بھسم ہو گیا۔'' رام دیال نے کہا پھر سب نے مجھے دیکھا اور اچانک چاروں ہاتھ جوڑ کر میرے پیروں سے لپٹ

گئے۔ ''جے ہو مہاراج کی۔''

''مہاراج میاں ہیں۔'' دوسرا بولا۔

''ہم سمجھے نہ تھے مہاراج۔'' بمشکل تمام میں پیچھے ہٹا اور میں نے ان سے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟''

''آپ نے سر کٹا مار دیا مہاراج، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ہم نے۔ آپ دھرماتما ہیں۔ ہم سمجھے نہیں تھے آپ کو مہاراج۔ آپ نے سر کٹا مار دیا، ارے دیا رے دیا، یہ بات تھی اور ہم اندھے ہیں پہچان نہیں پائے آپ کو مہاراج۔ کوئی بری بات منہ سے نکل گئی ہو تو معاف کر دیں، ان سب کی حالت خراب ہو رہی تھی، میں نے انہیں تسلی دے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ چلئے آپ لوگوں کو ایک گندی روح سے تو نجات مل گئی۔''

''ارے مہاراج بستی والے سنیں گے تو چرنوں میں آ پڑیں گے آپ کے۔ سب کا ناک میں دم کر رکھا تھا اس سر کٹے نے اور مہاراج یہ تو بھسم ہو گیا

دھرتی میں سما گیا، ہرے رام۔ ہرے رام۔'' ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں، میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے یہ کام تو ہو گیا اب تو بستی چلو گے۔''

''اب بھی نہ چلیں گے مہاراج۔'' وہ چاروں بڑی عقیدت سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے راستے میں، میں نے ان سے بستی میں رہنے والوں کے بارے میں پوچھا۔

''بڑی اچھی ہے ہماری بستی مہاراج۔ ہندو، مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہم اس بستی میں پیدا ہوئے، جوان ہو گئے، کبھی کوئی خرابی نہیں ہوئی۔ سنسار میں ادھر ادھر لوگ لڑتے بھڑتے رہتے ہیں اور ہم بڑے پریم سے رہتے ہیں۔ جہاں ہم مولوی حمید اللہ کی باتیں سنتے ہیں وہیں پنڈت کرشن مراری کی کتھائیں بھی سنتے ہیں، بھگوان کا نام سب اپنے اپنے طور پر لیتے ہیں مہاراج۔ کیا ہندو کیا مسلم۔''

''مولوی حمید اللہ کون ہیں؟''

''دھونی پور کی مسجد کے مولوی صاحب ہیں، بڑے اچھے آدمی ہیں بیچارے۔''

''مسلمان یہاں کتنے آباد ہیں؟''

''ہمیں ٹھیک سے نہیں معلوم مہاراج پر بہت ہیں اور سب اپنے اپنے کام کرتے ہیں۔'' راستے بھر ہم آگے باتیں کرتے آئے اور پھر دھونی مسجد پہنچ گئے۔ صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ پھر بستی کے سرے میں قدم رکھا تو مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی اور میرے قدم رک گئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ذرا مسجد کا راستہ اور بتا دو مجھے۔''

''وہ ہے، سیدھے ہاتھ کی سیدھ میں وہ جو روشنی جل رہی ہے۔'' شردھانند نے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا اور پھر کہا۔ ''اچھا تو بھائیو! میری منزل وہ ہے۔''

''دھونی پور میں رہیں گے تو مہاراج؟''

''دیکھو جو اللہ کا حکم۔''

''ہم آپ کی سیوا کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں بھائی تمہارا بے حد شکریہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا اب تم لوگ اپنے گھروں کو جاؤ میں بھی اپنے اللہ کے گھر کی جانب قدم بڑھاتا ہوں۔'' میں نے کہا، انہوں نے ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے گردنیں جھکا دیں اور عقیدت سے واپس چل پڑے۔ میرا رخ مسجد کی جانب ہو گیا تھا۔

مسجد زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ چھوٹی چھوٹی تقریباً پانچ فٹ اونچی دیواریں چاروں طرف بنی ہوئی تھیں۔ احاطہ وسیع تھا اور مسجد کی اصل عمارت بہت چھوٹی۔ احاطے میں تھوڑے فاصلے پر ایک چبوترہ بلند ہو گیا

تھا۔ بائیں طرف ہاتھ سے چلنے والا نلکا لگا ہوا تھا اور اس کے بعد ایک سمت گھروں کا سا منظر تھا۔ یقینی طور پر مسجد کا حجرہ ہوگا۔ مولوی صاحب ابھی تک بلندی پر اذان دے رہے تھے غالباً یہ مسجد کی چھت کا حصہ تھا جہاں وہ موجود تھے۔ ایک سمت سے سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ میں نے کمبل ایک سمت رکھا جوتے اتارے، ہاتھ سے نلکا چلایا اور وضو کرنے بیٹھ گیا۔ اذان ختم ہوچکی تھی، غالباً مولوی صاحب نیچے اتر رہے تھے، میں نے وضو سے فراغت حاصل کر کے کمبل سنبھال کر بغل میں دبایا اور اس کے بعد ایک سمت بڑھ گیا۔ مولوی صاحب میری ہی طرف آ گئے تھے۔ میں ان کے احترام میں کھڑا ہوگیا۔ چوڑا چکلا جسم اور معمر آدمی تھے، بڑی سی داڑھی سینے پر بکھری ہوئی تھی اور آنکھوں میں چمک تھی، مجھ سے بولے۔

''مسافر معلوم ہوتے ہیں حضرت۔''

''جی مولوی صاحب۔''

''ابھی ابھی بستی میں داخل ہوئے ہیں؟''

''جی ہاں بس یوں سمجھ لیجئے...... کہ آپ کے منہ سے اذان کی آواز نکلی اور میں نے آپ کی بستی میں پہلا قدم رکھا۔''

''خوش آمدید...... میرا نام حمید اللہ ہے۔''

''خاکسار کو مسعود احمد کہتے ہیں۔''

''نمازی آنے والے ہیں ذرا انتظامات کرلوں اس کے بعد آپ سے گفتگو رہے گی۔ نماز کے بعد چلے نہ جایئے گا۔ صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کیجئے گا۔''

''بہتر۔'' میں نے جواب دیا اور ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ آنکھیں بند کیں اور درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ مولوی صاحب مجھ سے ملنے کے بعد کہیں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد مسجد کے دروازے سے نمازیوں کا داخلہ شروع ہوگیا۔ نلکا چلنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ کوئی بیس بائیس افراد جمع ہوگئے۔ مولوی صاحب بھی تیار ہوکر واپس آگئے اور پھر میں نے نماز باجماعت ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد نمازی تو ایک ایک کر کے چلے گئے، بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی چنانچہ میں وہیں بیٹھا رہا اور درود شریف کا ورد کرتا رہا۔ مولوی صاحب میرے قریب آگئے تھے کہنے لگے۔ ''آیئے مسعود صاحب تشریف لایئے، چائے تیار ہوگئی ہے ناشتہ کچھ دیر کے بعد پیش کیا جائے گا۔''

''زحمت ہوگی آپ کو......''

''نہیں۔ مہمان رحمت خداوندی ہوتے ہیں اور پھر اتنی صبح ہماری بستی میں داخل ہونے والا مہمان تو ہمارے لئے بڑا باعث رحمت و برکت ہوسکتا ہے۔ آیئے تکلف نہ کیجئے، مجھے میزبانی کا شرف بخشیئے۔''

میں مولوی صاحب کے پیچھے چل پڑا۔ مسجد کا وہ بغلی حصہ جسے میں گھروں کا سلسلہ سمجھا تھا ایک سرے سے دوسرے سرے تک مولوی صاحب ہی کے پاس تھا۔ اندرونی حصے میں شاید ان کے اہل خانہ کی رہائش تھی، تھوڑا سا برآمدہ تھا، اس کے بعد وسیع و عریض صحن، جس میں املی کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے تھے اور ان کی چھاؤں بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح بلند نہیں ہوا تھا لیکن اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مولوی صاحب نے کچی مٹی کے پیالے میں چائے پیش کی اور میں نے اسے قبول کرلیا۔ مولوی حمید اللہ میرے سامنے بیٹھ گئے تھے، بغور مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''میاں برا نہ مانئے گا ہماری اور آپ کی عمروں میں جتنا فرق ہے اس کے تحت اگر کہیں کوئی تھوڑی سی بے تکلفی کی گفتگو ہوجائے تو برا نہ محسوس کریں۔''

''نہیں مولوی صاحب۔ بزرگ ہیں آپ میرے۔''

''کہنا یہ چاہتے تھے کہ ویسے تو آپ ایک عام سے نوجوان ہیں، لیکن نجانے کیوں آپ کے چہرے میں ایک خاص بات محسوس ہوتی ہے ہمیں......''

''کیا عرض کرسکتا ہوں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مزید تعارف نہ ہوگا......؟''

''کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے میری جو قابل تعارف ہو، بس یوں سمجھ لیجئے کہ صحرا نورد ہوں، نجانے کہاں کہاں گھومتا رہتا ہوں۔ میں اچانک اس بستی کی جانب نکل آیا۔ علم بھی نہیں تھا کہ کون سی بستی ہے یہ اور پھر آپ نے اذان دے دی......''

''کہیں نہ کہیں تو رہائش ہوگی آپ کی۔ کوئی نہ کوئی تو مشغلہ ہوگا......!''

''بس یہی مشغلہ ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں۔''

مولوی حمید اللہ صاحب گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے، چائے کے گھونٹ لیتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''میاں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی جی، کہئے......''

''اب اس بستی میں تشریف لائے ہیں آپ تو کچھ وقت ضرور میرے ساتھ اس بستی میں قیام کیجئے گا، مجھے خوشی ہوگی۔''

''اور مجھے ندامت......'' میں نے کہا۔

''کیوں......؟''

''اس لیے کہ آپ کو زحمت ہوگی۔''

''اب ان تکلفات کی گنجائش نہیں ہے۔ مسعود صاحب میری درخواست ہے، جب تک بھی ممکن ہوسکا، آپ یہاں قیام فرمایئے گا۔ دیکھئے یہاں املی کے درخت کے نیچے چارپائی ڈلوادوں گا آپ کی۔ آرام سے قیام کریں اور پھر ہمارا کیا جاتا ہے۔ اللہ کی سمت سے رزق حاصل ہوتا ہے اور ہم سب کھاتے ہیں، آپ کا اضافہ ہوگا تو یقینی طور پر رزق میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔'' میں نے مسکرا کر گردن ہلادی۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے حمید اللہ کے گھر سے پراٹھے اور ترکاری آگئی ساتھ میں چائے بھی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ ناشتہ کیا۔ حمید اللہ صاحب کہنے لگے...... ''اور اگر صبح کے اس حصے میں آپ یہاں پہنچے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ رات بھر سفر کیا ہوگا۔ اب مناسب یہ ہے کہ ظہر کے وقت تک آرام فرمایئے گا اگر نیند گہری ہوگئی تو میں نماز کے وقت جگادوں گا۔''

میں نے قبول کرلیا تھا۔ املی کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ کمبل سرہانے رکھ لیا اور آنکھیں بند کرکے یہ تصور کرنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ذہن میں خیالات بیدار ہونے لگے۔ حکم ملا کہ ابھی یہاں قیام کرنا ہے۔ بڑی حیرانی ہوئی تھی یہ میری اپنی آواز تھی جو میرے کانوں میں گونجی تھی۔ ایسا کیوں ہے۔ مجھے اپنی ہی آواز خود سے دور کیوں محسوس ہوتی ہے۔

''یہ سب کچھ جاننا ضروری نہیں ہے۔ کچھ باتوں کو جاننے کے لیے وقت متعین ہوتا ہے۔ سوجاؤ۔'' مجھے پھر اپنی آواز سنائی دی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب کسی انحراف کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ دوپہر کو مولوی حمید اللہ نے جگایا اور میں اٹھ گیا۔ مولوی صاحب بولے۔

''مسعود میاں۔ ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ خوب سوئے اب جاگ جایئے۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''ساڑھے بارہ بج گئے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں۔ غسل کریں گے......؟''

''اگر زحمت نہ ہو تو۔''

''نہیں۔ گرم حمام موجود ہے۔ زحمت کیسی۔ یہ اور بتادیں کہ کھانا نماز کے بعد کھائیں گے یا پہلے۔''

''بعد میں ہی مناسب رہے گا ورنہ جو حکم ہو۔''

''میں خود بھی نماز کے بعد کھاتا ہوں۔ آیئے حمام بتادوں۔''

غسل سے فارغ ہوکر باہر نکلا۔ مسجد کے دروازے کے باہر سے کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے غور نہیں

کیا۔ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ کچھ دیر کے بعد مولوی حمید اللہ صاحب مسکراتے ہوئے آ گئے۔

''کہیے نیند پوری ہو گئی۔''

''اللہ کا احسان ہے۔''

کچھ پوچھ سکتا ہوں۔''

''جی فرمایئے......؟''

''یہ سرکٹے کا کیا قصہ ہے۔''

''خیریت۔ کیا ہو گیا......؟''

''صبح دس بجے سے لوگوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔''

''کیوں......؟''

''آپ کو علم نہیں ہے۔ کسی سرکٹے کو جلا کر راکھ کر دیا ہے آپ نے۔''

''اوہو...... وہ...... جی ہاں۔ بس وہ اللہ کے کلام سے ٹکرانے آ گیا تھا۔ ویسے بھی خلق اللہ سے دشمنی کر رہا تھا۔''

''میں ایک جاہل دیہاتی ہوں مسعود احمد صاحب۔ میرا کوئی امتحان نہ لے ڈالیے گا۔ اللہ کے واسطے۔''

''کوئی گستاخی ہو گئی محترم......؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''شرمندہ نہ کریں مسعود احمد صاحب، اپنے بارے میں عرض کر رہا ہوں مجھ سے گستاخی ہو جائے تو درگزر فرمایئے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بزرگ ہیں اور پھر آپ نے بڑی خاطر داری کی ہے میری۔ ویسے یہ سرکٹا۔''

''جی ہاں۔ خبیث روح تھی۔ لال تالاب پر کوئی بیس سال سے قبضہ جما رکھا تھا۔ ذات کا دھوبی تھا مگر بڑا سرکش اور کمینہ انسان تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ ماں اس واقعے سے متاثر ہو کر کنویں میں کود کر مر گئی۔ بستی والوں نے بستی سے نکال دیا تو تالاب کے پاس جا کر رہنے لگا۔ یہاں اسے سانپ نے ڈس لیا اور کوئی بارہ پندرہ دن کے بعد اس کی سڑی ہوئی تعفن زدہ لاش کا پتہ چلا۔ لوگوں نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا اور وہ وہیں مٹی ہو گئی مگر پھر راتوں کو اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اسے تالاب کے کنارے چھورام چھورام کرتے دیکھا جانے لگا۔ ادھر سے گزرنے والے بے شمار افراد کو اس نے اپنی خباثت کا شکار بنایا۔ کافی خوف و ہراس چھایا رہتا ہے اس کی وجہ سے۔ مجبوری یہ ہے کہ بستی سے باہر کا راستہ ایک ہی ہے۔ دھونی پور کے لوگ اس سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں۔ دوپہر کو بارہ بجے سے تین بجے تک کوئی ادھر سے نہیں گزرتا اور شام کو سورج چھپنے کے بعد سے صبح سورج نکلے ادھر سے سفر نہیں کیا جاتا۔ کوئی بھولا بھٹکا گزر گیا تو بس اس کا شکار ہو گیا۔''

''خدا کا شکر ہے۔ موذی سے نجات ملی۔'' میں نے کہا۔

''لوگ صبح سے آ رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ۔ یہ ایک تکلیف دہ پہلو ہے۔''

''ٹالتا رہا ہوں کہ آپ سو رہے ہیں۔ مگر ملنا پڑ جائے گا آپ کو...... بڑی عقیدت سے آ رہے ہیں۔ کچھ مقامی لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے پورا واقعہ بتایا بستی والوں کو۔ یوں سمجھ لیں پوری بستی میں کاروبار بند ہے لوگ جوق در جوق لال تالاب جا رہے ہیں۔ وہاں اس کے زمین میں زندہ جل جانے کا نشان موجود ہے......!''

''اللہ کا یہی حکم تھا اس کے لیے، مگر اب میں کیا کروں......؟'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''بس ایک بار مل لیں ان سے۔ ویسے بھی کسی کا دل رکھنا عبادت ہے۔''

''چلیے......!''

''ابھی مناسب نہ ہو گا۔ میں اعلان کیے دیتا ہوں کہ نماز کے بعد آپ باہر آئیں گے۔''

''نہیں۔ اس میں رعونت کا پہلو جھلکتا ہے۔ آیئے ان سے ملاقات کرلیں۔''

''سبحان اللہ۔ آیئے۔'' حمید اللہ صاحب بولے اور میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا، بیس بائیس افراد تھے، زیادہ تر ہندو تھے چند مسلمان۔ مولوی حمید اللہ نے کہا۔ ''لیجئے ٹھاکر جیون کمار جی۔ مل لیجئے مسعود میاں سے۔''

''ہیں...... یہ ہیں وہ مہان پرش۔ چرن چھوئیں گے ہم ان کے۔'' ٹھاکر صاحب نے کہا اور آگے بڑھے۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھ سے ہاتھ ملائیں ٹھاکر صاحب میرے گلے لگیں۔ میں اتنا بڑا انسان نہیں ہوں کہ آپ میرے پاؤں چھوئیں۔''

''آپ نے جتنا بڑا کام کیا ہے میاں جی وہ تو ایسا ہے کہ ہم آپ کو سر پر بٹھائیں۔ دھونی بستی کو نیا جیون دیا ہے آپ نے۔''

''اس کے لیے آپ اپنے بھگوان کا اور مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں۔ میں تو بس ایک ذریعہ بنا ہوں۔ مجھے تو اس خبیث کا علم بھی نہیں تھا۔ آپ کی بستی کے چار جوان مجھے اس کے سامنے لے آئے۔''

''وہ پھر تو نہ جی جائے گا مہاراج۔''

''ان شاء اللہ اب ایسا نہ ہوگا......!''

''ہم بستی والے آپ کی کیا سیوا کریں مہاراج۔ آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔''

''مجھے صرف آپ کی دعائیں درکار ہیں۔''

''آپ ابھی جائیں گے تو نہیں مہاراج۔''

''نہیں۔ مولوی حمید اللہ صاحب کے حکم کے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا......!''

''ہم آپ کے چرنوں میں کچھ بھینٹ کریں گے۔''

''مجھے آپ کی دعاؤں کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔''

''ہم آپ سے پھر مل سکتے ہیں مہاراج......؟''

''جہاں حکم دیں گے حاضری دوں گا!''

''نماز کا وقت ہونے والا ہے ٹھاکر صاحب! اب اجازت دیجئے......!'' حمید اللہ صاحب نے کہا اور سب مجھے سلام کر کے واپس چلے گئے۔ نماز پڑھی۔ کھانا کھایا اور اس کے بعد حمید اللہ صاحب املی کی چھاؤں میں میرے پاس آ بیٹھے......

''چراغ تلے اندھیرا ہے مسعود احمد صاحب۔ میں نے خود تو آپ کو خراج عقیدت پیش ہی نہیں کیا۔ اپنے بارے میں مختصر بتادوں۔ اسی بستی میں پیدا ہوا۔ یہیں پروان چڑھا والد صاحب کا منصب سنبھالا، دو جوان بیٹیوں کا باپ ہوں۔ اہلیہ ہیں اور میں ہوں۔ بس اللہ کا نام جانتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں......!''

''اس سے زیادہ کچھ ہے بھی نہیں حمید اللہ صاحب۔ اللہ آپ کی مشکلات دور کرے۔''

یہاں آ کر خوشی ہوئی تھی جھگیوں کی بستی تھی۔ لوگوں نے بڑا احترام کیا تھا جوق در جوق ملنے آتے رہے تھے۔ بہت کچھ چاہتے تھے مجھ سے۔ میں خود شرمندہ ہوگیا تھا۔ نماز وغیرہ سے فراغت کر کے رات کا کھانا کھایا بہت دیر تک لوگوں کے درمیان بیٹھا رہا۔ پھر زیادہ رات ہوئی تو آرام کرنے لیٹ گیا۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا...... پھر غنودگی طاری ہوگئی۔ دفعتاً ہی کچھ آہٹیں ابھریں اور آنکھیں کھل گئیں۔ نظر سامنے اٹھ گئی۔ احاطے کی دیوار پر دو پاؤں لٹکے ہوئے تھے۔ صرف دو پاؤں جو عجیب سے انداز میں جنبش کر رہے تھے باقی جسم کا وجود نہیں تھا۔

آنکھیں پوری طرح کھل گئیں...... پھر کوئی آ گیا...... پھر کچھ کرنا ہے...... غور سے دیکھنے لگا پھر کچھ تصور بدلا، خالی پاؤں نہیں تھے باقی بدن بھی تھا جس جگہ سے احاطے کی دیوار نظر آ رہی تھی، وہاں املی کے درخت کی گھنی شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور جو

کوئی دیوار پر تھا اس کا باقی جسم پتوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا یہ اس وقت پتا چلا جب وہ نیچے کودا، شاید کمزور بدن کا مالک تھا چونکہ زیادہ بلندی نہ ہونے کے باوجود وہ نیچے گر پڑا تھا، میں خاموش لیٹا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ وہ اُٹھ کر میری طرف بڑھنے لگا اور پھر میرے قریب آ گیا۔ آنکھوں میں جھری کر کے میں اسے دیکھنے لگا۔ دھوتی کرتا پہنے ہوئے ایک سفید بالوں والا شخص تھا۔ مونچھیں بڑی اور سفید تھیں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کون ہے وہ، میرے پلنگ کے پاس کھڑا مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے لرزتے ہاتھ سے میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا اور اس کی آواز اُبھری۔

''مہاراج...... جاگیے مہاراج...... سوالی آیا ہے اور آپ سو رہے ہیں جاگیے مہاراج۔''

اب اُٹھنا ضروری تھا میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور زمین پر بیٹھ گیا، تب میں جلدی سے اپنی جگہ سے اُترا اور میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ارے...... ارے...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ یہاں بیٹھنے مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔''

''بھگوان سکھی رکھے جسے بھگوان عزت دیتا ہے وہ دُوسروں کو عزت دیتا ہے مگر میں آپ کے چرنوں میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ سوالی ہوں، مجبور ہوں، دُکھی ہوں، آپ کے سائے میں سر جھکا کر آپ سے مدد مانگنے آیا ہوں۔''

''آپ آرام سے یہاں بیٹھیں اور مجھے بتائیں کیا بات ہے۔'' میں نے اسے اُٹھا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

''اَنا کا مارا ہوا ہوں مہاراج...... پر دوش اکیلے میرا نہیں ہے، پرکھے ہی سکھا کر گئے تھے، وہ تو ایک معیار بنا کر چلے گئے نقصان مجھے ہوا اور اب سچ بھی بولوں گا تو لوگ مذاق اُڑائیں گے میرا، کوئی سچ نہ مانے گا سب یہی کہیں گے کہ ٹھاکر پر بپتا پڑی تو سیدھا ہو گیا ہے بھگوان...... میرا کوئی ہمدرد نہیں رہا سنسار میں......''

✦✧✦✧✦

آنے والے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے مہاراج رات کی تاریکی میں آیا ہوں آپ کو دُکھ دیا معاف کر دیں۔'' اس کی آواز آنسوؤں میں گندھی ہوئی تھی۔

''تمہارا معاملہ قدرت کے ہاتھ ہے خدا کا یہ گناہ گار بندہ اگر تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہے تو اس سے گریز نہیں کرے گا۔''

''بپتا سنو گے میری؟'' وہ بولا۔

''ضرور سنوں گا۔'' میں نے کہا۔

''بنسی راج بہادر ہے میرا نام...... کھرا برہمن ہوں، بیس باغ کا مالک ہوں اور ہزاروں بیگھے زمین چھوڑی ہے پرکھوں نے، ساتھ میں یہ نصیحت بھی کہ اپنے علاوہ سب کو نیچ سمجھو، دولت سنسار کی سب سے بڑی بڑائی ہے۔''

''کیسا پایا اس نصیحت کو۔''

''مار دیا سسروں نے مجھے یہ سوچ دے کر...... سنسار میں سب سے نیچا کر دیا مجھے۔''

''اب تم کیا ہو۔''

''ایک بے بس اَپرادھی...... جو کسی مدد کرنے والے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا ہے بیس باغ اور ہزاروں بیگھے زمین بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔''

اس کی سسکیاں جاری ہو گئیں، میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے دھرم کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہتا لیکن میرا دین کہتا ہے کہ اگر کسی نے گناہ کیا ہے تو اس کی سزا دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تم کسی کے کام آ سکتے ہو تو اس سے گریز نہ کرو۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارا معاملہ تمہارے اور خدا کے درمیان ہے۔ میری ذات سے اگر تمہیں کوئی فائدہ ہو سکتا ہے تو میں ضرور تمہارے لیے جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا کروں گا۔ اب وقت ضائع نہ کرو اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتانا چاہتے ہو بتا دو۔''

''تھوڑا بہت تو بتا چکا ہوں مہاراج اس سوچ نے مجھے سنسار سے دُور کر دیا تھا۔ ہر ایک کو نیچ سمجھنا میرا کام بن گیا تھا۔

کسی کو اپنے خلاف پایا پکڑوا لیا۔ جوتے لگا دیئے، کسی نے زیادہ سرکشی کی تو ہاتھ پاؤں تڑوا دیئے، بڑے بڑے عزت داروں کی عزت اُچھال دی میں نے، پانچ بیٹے تھے میرے دو بیٹیاں اور یہ سب میری نگاہوں میں دھونی پور کے سب سے اُونچے لوگ تھے کیونکہ میری اولادوں میں سے تھے۔ ایک بہن بھی ہے میری۔ ہرناوتی نام ہے اس کا، میری بیٹیوں سے دو چار سال ہی بڑی تھی، کہانی لمبی نہیں سناؤں گا مہاراج، ہرناوتی بہک گئی جوانی کے جوش میں، اس نے پرکھوں کے ریت رواج بھلا دیئے اور ایک نیچ ذات سے پریم کر بیٹھی۔ ہیرا تھا اس کا نام، لاکھو کا بیٹا تھا۔ دھونی پور کے ایک مشرقی گوشے میں گھر بنا کر رہتا تھا، نوکر تھا ہمارا مہاراج، ہماری زمینوں پر کام کرتا تھا، باپ بیٹے ہمارا دیا کھاتے تھے۔ پھر بھلا ٹھاکر بنسی راج بہادر یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ہیرا پوری آنکھیں کھول کر ہرناوتی کو دیکھے، پر ایسا ہوا نہ جانے کب اور کہاں ملے تھے وہ لوگ، ہرناوتی، ہیرا کے پریم میں گرفتار ہوگئی اور چھپ چھپ کر اس سے ملنے لگی، بستی والوں نے دیکھا کسی کی مجال تو نہیں تھی کہ کوئی ہم سے آ کر یہ بات کہہ سکے لیکن آپس میں کانا پھوسیاں کرتے تھے، ہمیں اس سے تک کچھ نہیں معلوم تھا لیکن پھر میری دھرم پتنی نے ایک رات ہرناوتی کو گھر سے چوری چوری نکلتے ہوئے دیکھا تو چونک گئی، دن بھر اور رات بھر سوچتی رہی اور مجھے بتا دیا، میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ مہاراج دُوسری رات میں نے ہرناوتی کا پیچھا کیا اور دیکھا کہ چاندنی رات میں میرے ہی باغ کے ایک گوشے میں وہ لاکھو کے بیٹے ہیرا کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں باتیں کر رہے ہیں اور سنسار سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ خون اُتر آیا تھا میری آنکھوں میں۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں اور جب برداشت نہ کر سکا تو ان کے سامنے پہنچ گیا، میں نے ان کے پاس پہنچ کر کڑک دار آواز میں دونوں کو مخاطب کیا تو دونوں تھر تھر کانپنے لگے۔ ہیرا میرے قدموں میں گر گیا اور میں نے زوردار ٹھوکر مار کر اس کا سر پھوڑ دیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا لیکن میری بہن ہرناوتی نے اپنی ساڑھی کا پلو پھاڑ کر میرے ہی سامنے اس کے ماتھے پر پٹی کسی اور پھر آنکھیں نکال کر مجھ پر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ حق کس نے دیا ہے کہ میں اس کے پتی کو اس طرح ٹھوکر ماروں، اس بات پر میں جو کچھ نہ کر ڈالتا کم تھا لیکن عقل سے کام لیا، خون میرا ہی تھا، ہرناوتی کی یہ مجال کبھی نہ ہوئی تھی کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی بھی ہو جائے لیکن اس سے وہ جس طرح بات کر رہی تھی وہ چونکا دینے والی بات تھی، میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تیرا پتی کہاں سے ہو گیا ری کمینی؟''

''تم اسے پاپ کہہ سکتے ہو بھیا جی مگر اب یہ پاپ میں کر چکی ہوں۔''

''کب کیسے......؟''

''ہیرا سے میں بہت پہلے سے پریم کرتی ہوں، ہم دونوں کا پریم پوتر تھا اور جب میں نے ہیرا کو مجبور کیا کہ وہ میرے ساتھ پھیرے کر لے تو میرے مجبور کرنے سے ہیرا بھی مجبور ہو گیا اور اس نے رام مندر میں جا کر پجاری شونارائن کے سامنے اگنی کے گرد میرے ساتھ پھیرے کر لیے اور میں اس کی پتنی بن گئی۔ ہم جانتے تھے مہاراج کہ آپ کو پتا چلے گا تو آپ کا من سلگ اُٹھے گا اس لیے چھپ چھپ کر یہاں ملتے ہیں اور اس سمے کا انتظار کر رہے ہیں جب آپ ہم دونوں کو ساتھ رہنے کی آگیا دے دیں گے۔''

''تو سچ کہہ رہی ہے......؟''

''بھیا جی کی سوگند بالکل سچ......''

''ٹھیک ہے گھر جا بات کروں گا میں تجھ سے پھر۔'' میں نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ بہن کو بیٹی ہی کی طرح پالا تھا میں نے...... ماتا پتا جی تو پہلے ہی مر چکے تھے محبت بھی تھی مجھے اس سے لیکن اپنی انا، اپنا مان سب سے پیارا تھا یہ سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا کہ کل کلاں اگر بستی والوں کو یہ بات پتا چلے تو میری کیا عزت رہ جائے گی، کوئی کام تو کرنا تھا ایسا جس سے یہ بات راز میں رہ جائے چاہے اس کے لیے مجھے کتنی ہی انسانی زندگیوں کی قربانی دینی پڑے۔ بہر حال میں نے اپنے ایک خاص آدمی امرناتھ کو اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ جب دُوسری رات میں نے امرناتھ کو بلا کر اسے یہ کہانی سنائی تو

امرناتھ گردن جھکا کر بولا کہ مہاراج مجھے تو یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔ بڑا غصہ آیا مجھے امرناتھ پر اور میں نے غرا کر اس سے کہا۔ ''کمینے، نمک حرام، اگر تجھے یہ بات معلوم تھی تو مجھ سے کیوں نہ کہا تو نے؟''

''ہمت نہیں پڑی تھی مہاراج، ہمت نہیں پڑی تھی۔''

''اب یہ بتا کہ کیا کیا جائے......؟''

''مہاراج سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہرناوتی جی ہی سب کے سامنے یہ سب کچھ کہنے کو تیار ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی غور نہیں کیا مگر میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ وہ اس شادی کو چھپانا نہیں چاہتیں اور بڑی ہمت سے سنسار کے سامنے آنے کو تیار ہیں۔''

''نکال دوں گا اسے گھر سے باہر، ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج کر دوں گا۔''

''اگر آپ یہ بات ہرناوتی جی سے کہیں گے تو وہ آپ کے چرن چھوئیں گی اور خوشی خوشی گھر سے چلی جائیں گی۔ محبت کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں مہاراج، آپ کو اس سے کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔''

''تو پھر میں کیا کروں امرناتھ، مجھے بتا میں کیا کروں؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا مہاراج آپ مجھ سے کہیں بڑا دماغ رکھتے ہیں۔''

''سب نے میرے ساتھ غداری کی ہے۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں اور وہ پجاری شونارائن اس نے پھیرے کرا دیئے میری بہن کے ایک نیچ ذات کے ساتھ، جیتا رہ سکے گا وہ؟ پہلے اسی کی زبان بند کروں گا، امرناتھ پہلے میں اسی کی زبان بند کروں گا، جیتا نہیں چھوڑوں گا اسے۔''

''مندر کا معاملہ ذرا دُوسرا ہوتا ہے مہاراج۔ ویسے بھی آپ یہ بات جانتے ہیں کہ دولت مندوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دھونی پور کے لوگ آپ سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے اس قدم سے وہ آپ کو نقصان پہنچانے پر تل جائیں۔''

''ایک ایک کو مروا دوں گا، ایک ایک کو ختم کرا دوں گا۔'' میں نے غرا کر کہا۔

''نہیں مہاراج دھونی پور کے ساروں کو آپ نہیں مار سکتے۔ آپ کو کچھ اور ہی سوچنا ہوگا۔'' امرناتھ کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں سوچتا رہا پھر میں نے کچھ فیصلے کر لیے، میں نے کہا۔ ''تو یہ کام خاموشی ہی سے کرنا ہوگا امرناتھ اور تجھے میرا ساتھ دینا پڑے گا، اتنی دولت دوں گا تجھے کہ جاگیردار بن کر جیون بسر کرے گا۔ میری عزت بچانا اس وقت تیرا ہی کام ہے۔''

''امرناتھ اپنی جان دینے کو تیار ہے مہاراج منہ سے بول کر دیکھیں۔'' تب میں نے امرناتھ کے ساتھ مل کر ایک ایسا منصوبہ بنایا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہی کیا میں نے، بادلوں بھری ایک رات ہم گھر سے باہر نکلے، امرناتھ کو میں نے جو ہدایات دے دی تھیں وہ ان پر عمل کر رہا تھا، اس بیچ میں نے ہرناوتی سے کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ جب دُوسری رات وہ چوری چوری گھر سے باہر نکلی تب بھی میں نے اسے نہ روکا حالانکہ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس پاپی اچھوت کے ساتھ وقت گزارتی رہی مگر میں اپنا کام آگے بڑھانے کا پورا پورا منصوبہ بنا چکا تھا، میں اور امرناتھ رام مندر پہنچے، پجاری شونارائن جی کو اُٹھایا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات سچ ہے، پجاری جی سچے آدمی تھے، انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ دو پریم کرنے والے ایک ہونا چاہتے تھے، انہوں نے سنسار کی ریت کے مطابق وہ سب کچھ کر دیا جو انہیں ایک کر دیتا، تب میں نے زہر کی شیشی شونارائن جی کو دیتے ہوئے کہا۔

''اور آپ نے جو کچھ کیا شونارائن جی اس کے نتیجے میں آپ کو یہ موت قبول کرنا ہوگی۔'' شونارائن مسکراتے ہوئے بولے۔

''موت اور جیون بھگوان کی لین دین ہے، اگر اس زہر سے میری موت لکھی ہے تو مجھے یہ ہر حالت میں پینا پڑے گا اور اگر ابھی کچھ جیون باقی ہے تو یہ زہر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' سو میں نے دیکھا کہ شونارائن جی زہر کی پوری شیشی حلق میں اُنڈیل گئے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ ہم نے پہلے سے سارا بندوبست کر رکھا تھا، زہر نکلتے ہوئے

ایک سانپ کی دُم مروڑ کر اسے شونارائن جی کے پاؤں سے چپکا دیا اور سانپ کے دانت شونارائن جی کے پاؤں میں گڑھ گئے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ پنڈت شونارائن مہاراج سانپ کے ڈسے سے مرے۔ اس طرح ہم نے ہرناوتی اور ہیرا کی شادی کے اس سب سے بڑے گواہ کو ختم کر دیا لیکن بات یہیں تک محدود نہیں رہنی تھی۔ دُوسرا انتظام بھی کرنا تھا۔ شونارائن جی کی موت پر کسی نے کوئی شبہ نہیں کیا۔ ہرناوتی چھ راتیں ہیرا سے ملتی رہی مگر ساتویں رات ہیرا کے جیون میں کبھی نہیں آئی۔ منصوبے کے مطابق ہرناوتی کو دُوسرے گاؤں بھیجا گیا اور وہ سب کے ساتھ خوشی خوشی گئی تھی مگر میں اور امرناتھ آٹھ آدمیوں کے ساتھ تیار تھے۔ ہم لوگ رات کی تاریکی میں لاکھو کے گھر پہنچے دروازہ بجایا تو لاکھو نے دروازہ کھول دیا۔ میرے آدمیوں میں سے ایک نے اس کے سر پر لاٹھی ماری اور لاکھو ''ہائے'' کہہ کر ڈھیر ہو گیا، تب ہیرا باہر نکلا اور ہم نے اسے بھی لاٹھیوں پر رکھ لیا، پھر گھر کی تین عورتوں، باپ، بیٹے اور ایک بچے کو ہم نے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہیں ڈال دیا اور اس کے بعد پورے گھر پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی، اتنی تیز آگ لگائی تھی ہم نے اور اتنا تیل ڈالا تھا کہ کوئی ان کی مدد نہ کر پائے۔ بس گھر جلے تھے اس آگ سے اور ہیرا اور لاکھو اپنے مزید پانچ گھر والوں کے ساتھ جل کر بھسم ہو گئے تھے اس گھر میں۔ تب میرے دل کو سکون ملا۔ ہرناوتی واپس آ گئی، بستی والے کبھی یہ نہ جان سکے کہ آگ کیسے لگی۔ بس انہوں نے کوئلہ ہوئی لاشیں نکالی تھیں اور ان کا کریا کرم کر ڈالا تھا مگر ہرناوتی مجھے شبہے کی نظروں سے دیکھتی تھی اور پھر ایک رات وہ میرے پاس پہنچ ہی گئی۔ میں اس وقت اپنے کسی کام میں مصروف تھا۔ ہرناوتی کا چہرہ دیکھ کر میں چونک پڑا اور میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا کیسے آنا ہوا تو اس نے پُراسرار لہجے میں کہا۔ ''میرا سہاگ کیسے بھسم ہوا مہاراج؟''

''مجھے کیا معلوم۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''مگر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔''

''کیا معلوم ہو گیا ہے۔''

''میرے سسر لاکھو کے گھر میں آگ لگی نہیں لگائی گئی تھی۔''

''لگائی گئی تھی، کس نے لگائی؟''

''امرناتھ، بھیل چند، شکتی لعل، پربی رام، رگھو، شنکر، راجن اور سوتا آگ لگانے والے تھے اور آپ آگ لگوانے والے۔''

''کیا بک رہی ہے۔'' میں غصے سے دھاڑا۔ مگر میرے بدن میں سردی دوڑ گئی تھی، سارے نام سچے تھے کس نے مخبری کر دی نہ جانے کس نے زبان کھول دی۔ ہرناوتی حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھی اس نے کہا۔

''شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا بھیا جی۔ آخر آپ میرے بھیا ہیں، ہم نے ایک ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے مگر آپ نے جو انیائے کیا، وہ اچھا نہیں تھا۔ سارے کنبے کو مروا دیا، بچے کو بھی نہ چھوڑا، دوش تو ہیرا کا تھا مہاراج، سب کا تو نہیں تھا۔ آپ کو رحم نہ آیا ان پر، زندہ جلوا دیا آپ نے انہیں آگ میں۔''

''ہرناوتی، جو کچھ میں نے تیرے ساتھ آج تک کیا ہے اس کا یہ بدلہ دے رہی مجھے، الزام لگا رہی ہے میرے اُوپر، ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو جا تھانے چلی جا میرے خلاف رپٹ درج کرا دے، گرفتار کرا دے مجھے ان سب کے قتل کے الزام میں۔'' ہرناوتی عجیب سے انداز میں ہنسی پھر بولی۔

''کہا تھا میں نے ہیرا سے بھیا جی، کہا تھا مگر اس نے کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بنسی راج مہاراج بڑے اختیار والے ہیں۔ پولیس کو اپنے جال میں پھانس لیں گے مال و دولت دے دیں گے اسے اور بات ختم ہو جائے گی لیکن اب اپنا کام ہیرا خود ہی نبٹائے گا بنسی راج مہاراج۔''

''کک...... کیا بک رہی ہے تو...... تو...... تو کہتی ہے اور...... اور وہ ہیرا...... ہیرا۔'' بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی ہرناوتی نے آہستہ سے کہا۔

''آیا تھا ہیرا میرے پاس۔ پہلے مجھ سے اس نے اپنی ساری بپتا سنائی اور اس کے بعد کہنے لگا کہ اگر اکیلا مار دیا جاتا اسے تو یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ چلو ہرناوتی کے بھیا نے مارا ہے مگر سارے مار دیئے پتا جی کو بھی مار دیا، کہہ رہا تھا کہ سب نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بدلہ وہ خود لیں گے تم سے، سمجھے بنسی راج مہاراج میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی۔ ہیرا تو کہہ رہا تھا کہ کیا فائدہ یہ سب کچھ کہنے سے، جب بدلہ شروع ہوگا تو بنسی راج مہاراج خود ہی دیکھ لیں گے، کہنے سننے سے کوئی فائدہ نہیں ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہرناوتی کو دیکھتا رہا شاید پاگل ہوگئی تھی، وہ ہمدرد نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی واپس چل پڑی۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''کہاں جا رہی ہے تو......؟''

''اب کہاں جاؤں گی بھیا جی، میرا سسرال تو ختم ہی ہوگیا۔'' اس نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بے حیا، بے شرم، نیچ ذات تھے وہ...... اس گھر کو اپنا سسرال کہتے تجھے شرم نہیں آتی؟'' جواب میں اس نے مجھے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی، مگر مجھے کچھ کرنا تھا۔ اگر اس نے کسی اور کے سامنے زبان کھول دی تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں، چنانچہ میں نے اسے دوسرے ہی دن ایک الگ تھلگ جگہ رکھ دیا، میری حویلی پرکھوں کی بنائی ہوئی ہے۔ دو حصے ہیں، اس کا ایک حصہ ویران پڑا رہتا ہے۔ میں نے اسی ویران حصے کو صاف ستھرا کرایا اور اسے وہاں پہنچا دیا، میری پتنی پہلے تو حیران ہوئی بعد میں مجھے اسے اپنا رازدار بنانا پڑا۔ امرناتھ وغیرہ سے میں نے ہرناوتی کی کہی ہوئی باتوں کی پوری تفصیل نہیں بتائی تھی کہ کہیں وہ ڈر نہ جائے لیکن ہرناوتی کی قید کی نگرانی کرنے کے لیے اسی کو منتخب کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ہرناوتی کو اس بات کا شبہ ہوگیا ہے کہ لاکھو کے گھرانے کو مارا گیا ہے۔ امرناتھ میرا وفادار آدمی تھا آنکھیں بند کر کے اپنے کام میں لگ گیا مگر میری نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ مہاراج میں یہ سوچتا تھا کہ ہرناوتی، ہیرا کا نام کیسے لیتی ہے۔ وہ یہ بات کیسے کہہ رہی تھی کہ ہیرا نے اسے یہ تفصیل بتائی تھی۔ ویسے تو میں نہ مانتا مگر اس نے ان تمام لوگوں کے نام بالکل ٹھیک ٹھیک لیے تھے جو لاکھو کے گھرانے میں آگ لگانے گئے تھے۔ پھر ایک خوفناک واقعہ پیش آیا، امرناتھ اور اس کے دو ساتھی جو رات کو وہیں سویا کرتے تھے جہاں ہرناوتی قید تھی، اچانک ہی آدھی رات کو وحشت سے چیختے ہوئے دوڑتے نظر آئے، ان تینوں کے جسموں میں آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے اتنے بلند تھے کہ حویلی کے دُوسرے ملازموں نے انہیں دیکھ لیا، سب اکٹھے ہوگئے، یوں کہتے ہیں میں تو اس وقت موجود نہیں تھا، کہ انہوں نے آگ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کے جسموں میں لگی آگ نہ بجھی اور تینوں کے تینوں ایسے جل گئے جیسے کوئلہ جل کر سخت ہو جاتا ہے، پتا ہی نہ چل سکا کہ ان کے جسموں میں آگ کیسے لگی۔ اس واقعہ سے بڑا خوف پھیل گیا تھا میں ضروری کارروائیوں میں مصروف رہا۔ بستی والوں کو اس بارے میں بس اتنا ہی پتا چل سکا تھا کہ کسی طرح تین آدمی جل کر بھسم ہوگئے۔ اصل بات کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ہرناوتی سے میں خود ملا تو وہ مطمئن نظر آئی، ہنس کر بولی۔

''باقیوں کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونا ہے مہاراج تھوڑا سا انتظار کرلیں اور اس کے بعد آپ کی باری آئے گی۔''

''تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے، دُشمن ہوگئی ہے تو ہماری۔''

''نہیں مہاراج میں نے تو ایسا نہیں کیا، ہیرا مجھے پہلے ہی بتا گیا تھا کہ ابتداء وہ امرناتھ اور ان دونوں آدمیوں سے کرے گا، میرے اُوپر پہرہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے مہاراج، بچا سکتے ہو تو ان کے گھروں کو اور انہیں بچا لینا جنہیں تم نے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا، میں کہاں جاؤں گی میرا کون سا ٹھکانہ ہے۔'' میں واقعی پریشان ہوگیا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، امرناتھ میرا مشیر تھا، ہر طرح کے رازداری کے مشورے میں اسی سے کرتا تھا وہ نہ رہا تھا، مجھے اس کی موت کا بہت افسوس تھا، بہرحال پریشانیوں کا آغاز تو اسی دن سے ہوگیا تھا مہاراج جس دن سے مجھے یہ پتا چلا تھا کہ ہرناوتی نے اس نیچ ذات سے شادی کرلی ہے اور اب یہ پریشانیاں عروج کو پہنچتی جا رہی تھیں۔ میرے بیٹے عیش و عشرت کی زندگی میں پروان چڑھے تھے۔ بڑے بیٹے کی شادی کرنے والا تھا میں، مگر کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ رگھو

اور شنکر جو کھیت پر کام کر رہے تھے، سانپ کے ڈسنے سے مر گئے۔ کسی ایسے ناگ نے ڈسا تھا انہیں جو بہت زہریلا تھا، دونوں کی لاشیں تک نہ اُٹھائی جا سکی تھیں بدن کا سارا گوشت گل کر پانی کی طرح بہہ گیا تھا اور ہڈیوں کے ڈھانچے کھیتوں میں پڑے نظر آئے تھے۔ جہاں جہاں ان کا پانی بہا تھا، وہاں زمین ایسی کالی ہوگئی تھی کہ جیسے آگ لگا دی گئی ہو اور اس کے بعد مہاراج وہ کھیت پھر سے سرسبز نہ ہو سکے، پھر اس کے بعد دُوسرے لوگوں کی باری آئی، بیر چند اور شکتی راج بھی مارے گئے۔ راجن اور سونا تو پہلے ہی امرناتھ کے ساتھ بھسم ہو گئے تھے۔ بیر چند اور شکتی کہیں سے آ رہے تھے کہ راستے میں ان کی گاڑی ٹکرا گئی اور اس طرح ان کا قیمہ قیمہ ہوا کہ ان کی لاشیں بھی نہ اُٹھائی جا سکتی تھیں۔ اب میرے حواس جواب دینے لگے تھے، میں بیمار ہو گیا تھا اتنا بیمار کہ بخار اُترے نہ اُترتا تھا کہ ایک دن ایک وید جی میرے پاس آئے، بھدّی سی شکل کے مالک تھے، میرا بیٹا کپور چند انہیں لے کر آیا تھا، دواؤں کا بکس ان کے پاس تھا۔ کپور چند نے کہا کہ یہ بہت نامی گرامی وید جی ہیں اور بڑا اچھا علاج کرتے ہیں، میں آپ کو انہیں دکھانا چاہتا ہوں پتا جی، میں تیار ہو گیا وید جی نے کہا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے کچھ باتیں کریں گے، سب چلے گئے۔ وید جی نے مجھے اپنے تھیلے سے دواؤں کی دو پڑیاں نکال کر دیں اور کہا کہ میں انہیں پانی کے ساتھ کھا لوں، میں نے ایسا ہی کیا۔ پڑیاں کھانے کی دیر تھی کہ مجھے اپنے بدن میں بڑی طاقت محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے میں ٹھیک ہوتا جا رہا ہوں۔ میں نے عقیدت بھری نگاہوں سے وید جی کو دیکھا تو وہ ہنسنے لگے پھر بولے۔

''اگر ابھی سے مر گئے ٹھاکر بنسی راج تو بعد کے کام کیسے دیکھ سکو گے۔ میرا تمہارے پاس آنا تو بہت ضروری تھا تمہیں ابھی جیتے رہنا ہے مہاراج بہت عرصے تک جیتے رہنا ہے۔ تم نے میرے پریوار کو ختم کیا ہے۔ اپنا پریوار ختم ہوتے ہوئے بھی تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔'' اور جب میں نے حیران ہو کر وید جی کے چہرے پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی کہ وہ ہیرا تھا ہیرا جسے میں نے جلا کر بھسم کیا تھا وہ مجھے شریر آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''بھگوان کے ہاں کوئی ذات نہیں بنائی جاتی نہ اُونچی ذات نہ نیچی ذات اور دل تو بھگوان نے سبھی کو دیا ہے۔ ہم نے تو پھیرے کئے تھے آپ کی بہن سے مہاراج کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ سویکار کر لیتے ہمیں تو کیا ہو جاتا اور پھر دوشی تو ہم تھے۔ ہمارے پتا جی کو بھی مار دیا تم نے ماتا جی کو بھی مار دیا، ہمارے بھتیجے کو بھی مار دیا، کیسا انیائے کیا تم نے مہاراج ہم تو ہرنا دتی کی وجہ سے خاموش ہو جاتے، معاف کر دیتے تمہیں مگر دُوسرے معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ تو مارے گئے جنہوں نے ہمارا گھر پھونکا تھا اور اب تمہارے پریوار کی باری ہے مہاراج، پانچ بیٹے ہیں تمہارے۔ دو بیٹیاں ہیں، بیٹیوں کی تو شادی کر دی تم نے ان کا نمبر سب سے بعد میں آئے گا۔ پہلے اپنے ان پانچ ستونوں کو گرتے ہوئے دیکھ لو ہم ایسا کر دیں گے مہاراج کہ تمہارے گھر میں پھر کبھی روشنی نہ آئے، ہم تمہاری ساری دیوالیاں بجھا دیں گے، ہم سب نے یہی فیصلہ کیا ہے مگر تمہیں جینا ہے، بیمار ہو گے تو رہو یہ تمہاری مرضی ہے مگر زندہ رہو تا کہ اپنے کئے کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو۔'' یہ کہہ کر ہیرا دروازے سے باہر نکل گیا، میرے پورے جسم میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں، کوئی شبہ نہیں تھا، کوئی دھوکا نہیں تھا جو کچھ دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جو کچھ سنا تھا اپنے کانوں سے سنا تھا اور دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے میرے بیٹوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے اپنی اولاد اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی، بڑا بدحواس ہو گیا تھا میں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرا بیٹا جو سب سے بڑا تھا میری اس بیماری پر کافی توجہ دے رہا تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا کہ میرے من کو کیا روگ لگ گیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی؟ میری دھرم پتنی بھی ضد پر آ گئی تو میں نے ساری کہانی ان لوگوں کو سنا دی۔ میرا بڑا بیٹا ہنسنے لگا پھر بولا۔

''یہ آپ کا وہم ہے مہاراج آپ کے دل میں چور بیٹھ گیا ہے۔ وہ سارے کے سارے جو مرے آپ کو ان کی موت کی وجہ معلوم ہے، حادثے ہی ہوئے تھے ان کے ساتھ۔''

''وہ کیسے حادثے ہوئے تھے ذرا مجھے بھی بتا دو، انسانی جسموں میں آگ لگ جائے، ناگ ایسے کاٹیں کہ بدن پانی ہو جائے، یہ سارے کھیل کیا تم انسانی کھیل سمجھتے ہو یا صرف حادثہ کہہ سکتے ہو۔'' وہ لوگ بھی کچھ متاثر ہو گئے تھے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آ سکی اور پھر مہاراج میرا سب سے بڑا بیٹا آہ...... میرا سب سے بڑا بیٹا ایک صبح جب گھر والوں نے اسے نہ پایا تو

اس کے کمرے میں اسے پکارنے گئے تو نوکر نے اس کی لاش چھت کے کنڈے سے لٹکی ہوئی دیکھی تھی۔ اس کی زبان اور آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں۔ یہ نہیں پتا چلا تھا کہ کس نے اسے سولی پر لٹکایا ہے۔ زمین سے آٹھ فٹ اُونچا لٹک رہا تھا وہ، گردن میں رسّی ڈلی ہوئی تھی اور رسّی کنڈے میں۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی پولیس کو بلا لیا گیا۔ پولیس نے اپنا سارا کام کیا مگر مجھے ہیرا کی بات یاد تھی۔ میرا دماغ اسی طرف جا رہا تھا جو حشر ہو سکتا تھا میرے من کا مہاراج آپ کو پتا ہے۔ اسی بیٹے کی شادی میں کرنے والا تھا سب کچھ چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا آہ...... مہاراج میں اپنی جیون بھر کی کمائی لٹا بیٹھا تھا اپنے ہاتھوں، ہرناوتی کے پاس پہنچا ہاتھ جوڑ کر اس کے چرنوں میں جھک گیا اور اس سے میں نے کہا کہ اگر ہیرا اس سے ملتا ہے تو ہیرا سے کہے کہ وہ ہم پر رحم کرے۔ ہرناوتی نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کسی پر رحم کیا ہے مہاراج آج تک، آپ رحم کا نام جانتے ہیں؟''

''تو بھی تو ان کی موسی ہے ہرناوتی تیرے بھی تو کچھ لگتے ہیں وہ۔'' میں نے رو کر کہا۔

''کوئی رشتہ نہیں ہے تم سے میرا...... قیدی ہوں میں تمہاری...... میرا تمہارا صید و صیاد کا رشتہ ہے بس، تم نے اس کا پورا کٹم مار دیا...... اس نے سوگند کھائی ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔''

''ہرے رام ایسا مت کہہ ہرنا...... ایسا مت کہہ بچا لے اپنے بھتیجی بھتیجوں کو...... بچا لے انہیں۔''

''خون کا بدلہ خون...... سب مریں گے، سب مریں گے کوئی نہیں بچے گا۔'' وہ پاگلوں کی طرح بولی اور پھر ہنسنے لگی، پھر چیخنے لگی، پھر رونے لگی اور اس کے بعد کچھ کہنے کو باقی نہ رہا، کچھ نہیں بگاڑ سکا میں اس کا۔ اس مہینے کے بعد میرا گوونداا مار دیا گیا۔ وہ بھائیوں میں سب سے تگڑا جوان تھا۔ سب سے خوبصورت جوان تھا، دیکھنے والے اسے دیکھتے تھے تو اس کی جوانی پر رشک کرتے تھے۔ مہاراج میرا گووندا رات کو کھاپی کر آرام سے سویا، آدھی رات کو اس کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں، وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا، سب کو پکار رہا تھا، ہم سب اُٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے بند تھا، بہت سے نوکروں نے مل کر اسے توڑا تو اندر کمرے میں دُھواں بھرا ہوا تھا مہاراج۔ گہرا گاڑھا کالا دُھواں جس میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور اب گووندا کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے جب اس کی چیخیں سنائی دی تھیں تو پوری طاقت سے چیخ رہا تھا وہ بعد میں اس کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی تھی۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھے، پتا ہی نہیں چلا کہ دُھواں کہاں سے آیا، نوکروں نے روشنیاں جلائیں لیکن گہرے گاڑھے کالے دھوئیں کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دروازے کھڑکیاں کھول دیئے گئے جس طرح بھی ممکن ہو سکا کمرے کا دُھواں باہر نکالا گیا اور میں نے، میں نے اپنے گووندا کی لاش زمین پر اکڑی ہوئی پائی، اس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا مہاراج یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن دبا کر اسے مار دیا ہو اور پھر ہمیں ایک قہقہہ سنائی دیا۔ بھلا میں اس قہقہے کو نہ پہچانوں گا، اسی پاپی کا تھا، اسی پاپی ہیرا کا قہقہہ تھا وہ جیسے اپنی کامیابی سے بڑا خوش ہو مہاراج ہم پر جو بیتی ہمارا من ہی جانتا ہے۔ جو کر بیٹھے تھے وہ تو کر ہی بیٹھے تھے مگر اس کے بعد، اس کے بعد مہاراج جو ہو رہا تھا وہ سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ایک بار پھر میں ہرناوتی کے پاس گڑگڑاتا ہوا پہنچا مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے، وہ بھی پاگل ہو چکی ہے، من تو چاہتا ہے کہ سسری کو زندہ جلا دوں آگ میں۔ سب کچھ اسی کی وجہ ہوا ہے مگر مہاراج ہمت نہیں پڑتی۔ گووندا کے بعد میرا ایک اور بیٹا میرے ہاتھوں میں دَم توڑ گیا، ایسا پاپی باپ ہوں میں جو مرنا چاہتا ہے مگر موت بھی اسے نظر انداز کر چکی ہے۔ نہیں آتی موت بھی مجھے سمیٹنے، بھگوان کے لیے میری مدد کریں، میری مدد کریں، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں میرے، تین بیٹوں کو صبر کر چکا ہوں بڑا دل پتھر کر لیا ہے میں نے، مجھے جیون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آج مر جاؤں تو سارے پاپ کٹ جائیں مگر جیتے جی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ایک ایک کر کے سارے میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو جائیں۔ کھانا پینا ختم ہو چکا ہے میرا مہاراج، جب بہت بھوک لگتی ہے تو تھوڑی بہت کوئی چیز کھا لیتا ہوں۔ چھ چھ دن کے فاقے کئے ہیں میں نے، صرف اس خیال سے کہ بھوک اور پیاس سے مر جاؤں مگر موت نہیں آتی۔ میری ہی طرح میری دھرم پتنی کا بھی حال ہے حالانکہ وہ تو بے گناہ ہے، اس نے کچھ نہیں کیا مگر مجھ سے زیادہ وہ مر رہی ہے۔ میری مدد کر سکتے

ہیں تو اللہ کے نام پر میری مدد کریں۔ آپ مسلمان ہیں اور اللہ کے نام پر اگر آپ سے کوئی مدد مانگی جائے تو سنا ہے مسلمان اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں سوال کرنے والوں پر...... میں سوالی ہوں مہاراج آپ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے میں نے اگر بھگوان نے، اگر اللہ نے آپ کو کچھ دیا ہے تو مجھ پر خرچ کر دیں، دُعائیں ہی دے سکوں گا اس کے بدلے اور کچھ نہیں کر سکوں گا مہاراج۔ ساری بستی والے مجھے ناپسند کرتے ہیں اگر آپ حکم دیں کہ میں ان سارے بستی والوں کے سامنے ان کے چرنوں میں گر جاؤں تو میں اپنی اَنا توڑنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ اَنا مجھے ورثے میں ملی تھی مہاراج مگر میرے ورثے نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔"

وہ اس طرح بلک بلک کر رویا کہ میرا دل پانی ہو گیا جو کہانی اس نے سنائی تھی اس میں اس کے ظلم کی داستان چھپی ہوئی تھی لیکن اب بنسی راج ایک تھکا ہوا انسان تھا۔ ایک ایسا شخص تھا جس سے کوئی انتقام لینا بھی گناہ سمجھے۔ ایسے آدمی کو بھلا میں کیا کہتا، بہت دیر تک وہ روتا رہا اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں اس کی بے بسی کی حالت کو محسوس کر رہا تھا اس نے پھر کہا۔

"اگر میں بستی والوں کے سامنے دن کی روشنی میں آپ کے پاس آتا تو جوتے مارتے میرے سر پر، اتنی باتیں کرتے وہ کہ مجھ سے سہی نہ جاتیں، اس لیے مہاراج رات کا یہ سے چنا ہے۔ آپ کو جو تکلیف ہوئی وہ مجھے پتا ہے مگر مجھے جو تکلیف ہے مہاراج ایک ڈوبتا ہوا آدمی ہر اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے ہاتھ آ سکے، میں بھی ویسا ہی ہوں۔ آپ کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف میں بھول گیا ہوں، مجھے معاف کر دیں میری مدد کریں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑے، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ چہرہ حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "آج کی رات مجھے دو بنسی راج، کل میں تم سے اس بارے میں بات کروں گا۔ میں کسی نہ کسی طرح تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا، اس وقت تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا لیکن کل میں تمہیں بتا سکوں گا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج دو بیٹے اور دو بیٹیاں رہ گئی ہیں میری۔ بیٹیاں اپنی سسرالوں میں ہیں۔ ان کے بچے بھی ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ ہیرا کہتا ہے کہ میرے سارے پریوار کو میری آنکھوں کے سامنے ختم کر دے گا تو مہاراج بیٹوں کے بعد بیٹیوں کا نمبر آئے گا اور اس کے بعد نواسے نواسیوں کا پتا نہیں کیا کرے گا وہ۔ کیا سب کو مار دے گا؟ مہاراج بڑی اُمید لے کر جا رہا ہوں، بڑی آس لے کر جا رہا ہوں، بڑی آس لے کر جا رہا ہوں۔ دھونی پور والے آپ کا نام لے رہے ہیں۔ میں، میں میں، بھی بڑا سہارا رکھتا ہوں آپ کا مہاراج بڑا سہارا رکھتا ہوں۔"

"تم جاؤ بنسی راج بس اب جاؤ۔" میں نے کہا اور بنسی راج اسی راستے سے واپس چلا گیا جس راستے سے آیا تھا۔ میرے لیے بڑی مشکلات چھوڑ گیا تھا وہ بہر طور مجھے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ میں نے نیند کا خیال ترک کر دیا، پانی تلاش کر کے وضو کیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ میں اپنے لیے رہنمائی چاہتا تھا اور میری رہنمائی ہو گئی۔ میرے دل سے آواز اُبھری کہ گناہ کرنے والا گناہ کر بیٹھتا ہے اس کا حساب کتاب اللہ کے حوالے، انسان کو انسان پر رحم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اگر کوئی کسی کے ساتھ کچھ کر سکتا ہے تو اسے اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ بات اگر صرف بنسی راج کی ہوتی تو بنسی راج ہر سزا کا مستحق تھا اور وہ بھی جو اس کے ساتھ شریک تھے لیکن وہ شریک نہیں تھے جنہیں موت کے گھاٹ اُتارا گیا اور یہ ایک خبیث رُوح کا کارنامہ ہے جو بھٹک گئی ہے اور انتقام کی آگ میں جل رہی ہے اور وہ عورت بھی بے قصور ہے جو ماں ہے۔ باپ نے جرم کیا سزا بس اسی کو ملتی تو مناسب تھا لیکن ماں اس جرم میں شریک نہیں تھی اور جو ظلم اس کو ہو رہا ہے وہ جاری نہیں رہنا چاہیے۔ یہ روشنی کی رہنمائی تھی لہٰذا مجھے اطمینان نصیب ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں بنسی راج کی مدد کر سکتا ہوں اور اس کے بعد مجھے مدد کرنے کا طریقہ دریافت کرنا تھا اور میری رہنمائی ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے بستر پر لیٹ کر کمبل اپنے چہرے پر ڈھک لیا تھا اور تصورات کی ہوائیں مجھے اُڑا کر نہ جانے کہاں سے کہاں لے گئی تھیں۔

صبح کی نماز کے بعد جب نمازی مسجد سے واپس چلے گئے تو حافظ حمید اللہ صاحب میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے میں نے حمید اللہ صاحب کو بتایا۔

''حمید اللہ صاحب رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ٹھاکر بنسی راج دیوار پھلانگ کر میرے پاس پہنچا اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ شاید آپ کو اس بات کا علم ہو کہ دھونی پور کا ٹھاکر بنسی راج کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔''
''ایسی ویسی مصیبت...... کیئے کا پھل پا رہا ہے وہ، تین بیٹے ہلاک ہو چکے ہیں اس کے اور بڑی پُراسرار داستانیں سنائی جارہی ہیں اس کے سلسلے میں مگر وہ آپ کے پاس مدد کے لیے آیا تھا حیرت کی بات ہے وہ تو کسی کو پاس بھی نہیں بیٹھنے دیتا۔''
''اس کی اَنا ٹوٹ چکی ہے اور اب وہ دھونی پور کے ہر شخص کے سامنے ناک رگڑنے پر تیار ہے۔ میرا خیال ہے حافظ صاحب اس کے باقی بچوں کو زندہ رہنا چاہیے۔ انتقام کا یہ طریقِ کار مناسب نہیں ہے۔ سزا اگر صرف اسے ملے جس نے گناہ کیا ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے جو بے گناہ ہوں انہیں کسی اور کے گناہوں کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔'' حافظ حمید اللہ صاحب نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر بولے۔ ''اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں مسعود میاں صاحب تو ٹھیک ہے اس سلسلے میں میری جو خدمات ہوں گی انہیں سرانجام دینے کے لیے میں حاضر ہوں۔''
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی میں نے کہا۔ ''بس آپ کی دُعائیں درکار ہوں گی مجھے اس کے علاوہ اور کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' حافظ حمید اللہ صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے، پھر میں نے ان سے پوچھا۔ ''ویسے بستی والے بھی بنسی راج سے نفرت کرتے ہوں گے، آپ کا کیا خیال ہے؟''
''سب اس سے گھن کھاتے ہیں، وہ بڑا سرکش آدمی رہ چکا ہے اور اس کے ہاتھوں ہمیشہ ہر ایک کو نقصان ہی پہنچا ہے۔ آج بھی اس کے بہت سے کارندے اس کی کنجوسی سے تنگ ہیں، کمبخت کچھ بھی نہیں دیتا کسی کو اور سب کچھ ہڑپ کر لینے کے چکر میں رہتا ہے۔ آپ دیکھ لیں مسعود میاں اگر آپ کا دل گواہی دیتا ہے تو اس کے لیے کام کریں۔''
''ہوسکتا ہے حمید اللہ صاحب اس سے بہتوں کی بہتری بھی ہو جائے یعنی انہیں کچھ مل جائے جنہیں اس کے ہاتھوں سے کچھ نہیں ملتا۔ وہ تو اپنے آپ کو اتنا مجبور و بے کس ظاہر کر رہا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے اب اسے اپنے دھن دولت سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ بہر حال دیکھے لیتے ہیں اس کی مدد تو کرنا ہی ہوگی، ہاں یہ بتایئے کہ اس تک پہنچنے کا کیا ذریعہ ہوسکتا ہے؟''
''میں آپ کو اس کی حویلی تک لے جاسکتا ہوں یہ کونسا مشکل کام ہے۔''
''بس ذرا لوگوں سے چھپ کر جانا چاہتا ہوں تاکہ بلاوجہ شہرت نہ ہو پائے، اس سلسلے میں اس شہرت سے بہت سی رُکاوٹیں درمیان میں آجائیں گی۔'' میں نے کہا۔
''اس کے لیے تو میرے خیال میں رات کا وقت ہی مناسب ہوگا، آج کا دن گزار لیجئے عشاء کے بعد نکل جایئے۔ ویسے بھی رات کے ایک حصے میں دھونی پور کی بستی مکمل پُرسکون ہو جاتی ہے اور یہاں راتوں کو کوئی رونق نہیں ہوتی، میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔''

✦✤✦✤✦

''آپ مجھے بس وہاں تک کا پتا بتا دیجئے گا۔'' میں نے حمید اللہ صاحب سے اتفاق کر لیا۔ رات کو حمید اللہ صاحب نے میرے ساتھ جانا چاہا لیکن میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے تنہا جانے دیں یہ ضروری ہے۔ مجبوراً وہ رُک گئے، البتہ انہوں نے مجھے بڑی وضاحت سے حویلی کا پتا بتا دیا تھا۔ میں چل پڑا، حمید اللہ صاحب نے سچ کہا تھا پوری بستی شہرِ خموشاں بنی ہوئی تھی۔ کتے تک نہیں بھونک رہے تھے۔ اِکا دُکا گھروں میں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ ورنہ زیادہ تر گھر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کبھی کسی گھر سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دے جاتی اور پھر خاموشی پھیل جاتی۔ میں بستی کے ایک کھلے میدان میں نکل آیا جہاں میدان کے بیچوں بیچ ایک چبوترا نظر آرہا تھا جس کے عین درمیان ایک بڑ کا درخت پھیلا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے ایک دیا روشن تھا اور اس کی لرزتی روشنی میں کچھ لوگ بیٹھے نظر آرہے تھے۔ حمید اللہ صاحب نے اس درخت کے بارے میں بھی بتایا تھا سیدھے چلنا تھا اور میدان کے اختتام سے بائیں ہاتھ مڑ جانا تھا مگر میں نے سوچا ان بیٹھے ہوئے لوگوں سے اور تصدیق کر لوں چنانچہ ان کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ وہ عورتیں تھیں، لہنگا اور چولی پہنے ہوئے سوگوار بیٹھی

ہوئی تھیں، ان سے کوئی دو گز کے فاصلے پر ایک شخص گھٹنوں سے اونچی دھوتی باندھے اور شلوکا پہنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا، درمیانی عورت کی گود میں ایک تقریباً سات سال کا بچہ سو رہا تھا، ان کے اس انداز پر مجھے حیرت ہوئی نہ جانے بے چارے کس مصیبت کا شکار تھے۔

''کیا بات ہے بہنو...... یہاں کیسے بیٹھی ہو۔''

''دھیرا ارتھی مانگ رہا ہے میں اسے ارتھی کہاں سے دوں۔'' اس عورت نے کہا جو بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

''کیا مانگ رہا ہے۔'' میں کچھ نہ سمجھ کر بولا۔ میں نے جھک کر بچے کو دیکھا اور پھر بری طرح چونک پڑا، بچے کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اس کا جسم اکڑا ہوا تھا اور کوئلے کی طرح سیاہ ہو رہا تھا، اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی چہرے کے نقوش تک جل کر بگڑ چلے تھے۔

''ارتھی...... ارتھی کہاں سے لاؤں ارتھی۔'' عورت نے جھنجلا کر کہا دفعتاً بچے نے گردن اٹھائی اور پھٹی پھٹی آواز میں۔

''ہیں...... ہیں۔'' کر کے رونے لگا پھر بھیانک آواز میں بولا۔

''بپو...... ارتھی...... ارتھی۔'' پھر اس کی گردن اپنی جگہ پہنچ گئی، اسی وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے شخص نے گردن اٹھا کر کہا۔

''میں بتاتا ہوں میاں جی...... سنو میں بتاؤں بستی کے بیس گھر جل گئے تھے، چار ہمارے ناتے داروں کے تھے وہ بے چارے اپنی مصیبت میں پڑ گئے، کر یا کرم کون کرتا ہمارا، کٹی کی طرح جلے ہوئے شریر گھسیٹے اور شمشان ڈال آئے، چتائیں تو جیتے جی پھنک گئی تھیں ہماری...... بڑے تو سمجھدار تھے مگر دھیرا بچہ ہے ضد کرتا ہے پگلا کہیں کا......! جاؤ تم اپنی گیل کھوٹی مت کرو خود چپ ہو جائے گا سسرا۔'' اس نے کہا اور گردن دوبارہ گھٹنوں میں دبا لی۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا، حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا، میں دو قدم آگے بڑھا اور گھٹنوں میں سر دیئے آدمی کے قریب پہنچ گیا۔

''تم لاکھو ہو۔'' میں نے پوچھا اور اس نے پھر سر اٹھا لیا۔ اس بار اس کا چہرہ اور بھیانک نظر آنے لگا۔

''ہیں ناہیں تھے، میاں جی تھے...... ایک اونچی جات والے نے...... سب رے مار دیئے، سب بھسم کر دیئے، کتوں نے کھوپڑیاں پھاڑ دیں ہماری دیکھو یہ دیکھو۔'' اس نے سر جھکا دیا، اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور پھر وہ اوندھے منہ چبوترے پر گر گیا، اس کے بدن سے دھواں اٹھنے لگا، فضا میں گوشت کی چراند پھیل گئی تھی، دھویں نے ان عورتوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور میں بدبو اور دھویں سے گھبرا کر کئی گز پیچھے ہٹ گیا۔ آنکھیں اور ناک بند کر لینے پڑے تھے، پھر ناک بند کرنے سے دم گھٹا تو ہاتھ ہٹا لیا مگر چبوترہ خالی پڑا تھا، نہ عورتیں تھیں نہ بچہ، نہ لاکھو اور نہ ہی چراغ...... تاریکی میں لپٹا بڑ کا درخت بھیانک سناٹے میں تنہا کھڑا تھا......! یہ منظر بہتوں کی جان لے سکتا تھا، ہو سکتا ہے یہ خبیث روحیں اکثر لوگوں کو نظر آتی ہوں۔ ٹھنڈی سانس لے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میدان عبور کر کے جب بائیں طرف مڑا تو پرانی طرز کی حویلی نظر آ گئی۔ یقیناً دھونی بستی کی سب سے بڑی عمارت تھی۔ حویلی کے دروازے پر روشنی نظر آ رہی تھی لیکن پوری حویلی پر خاموشی طاری تھی، میں آگے بڑھ کر حویلی کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔ ''کوئی ہے بھائی میاں...... کوئی ہے۔'' میں نے آواز لگائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا، تیسری آواز پر کچھ آہٹیں سنائی دیں اور پھر گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھل گئی۔ سفید موٹے کھیس میں لپٹے ہوئے ایک شخص نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین اونچی کر کے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''کون ہو بھیا تم......؟''

''یہ بنسی راج کی حویلی ہے؟''

''تا تمہاری ہے...... لے جاؤ اٹھا کر...... ارے تم ہو کون۔'' چڑچڑے آدمی نے پوچھا۔

''مجھے بنسی راج سے ملنا ہے۔''

''کیوں ملنا ہے؟''
''بلایا ہے انہوں نے مجھے۔''
''آدھی رات کو بلایا ہے، جھوٹ بولو ہو۔''
''اگر وہ حویلی میں موجود ہیں تو انہیں خبر دے دو کہ جسے انہوں نے بلایا تھا، وہ آیا ہے۔''
''آؤ۔'' اس نے کہا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ اتنی رات تو نہیں ہوئی ہے کہ یہاں یہ سنّاٹا قائم ہو جائے مگر ظاہر ہے چھوٹی آبادی ہے اور پھر حویلی کی فضاء میں خوف و ہراس چھایا ہوا ہے، سب لوگ کونوں کھدروں میں گھسے ہوئے ہوں گے۔ یہ شخص غالباً چوکیدار تھا اور خود بھی سوتے سے اُٹھ کر آیا تھا اسی لیے بگڑا ہوا تھا۔ بڑے گیٹ سے حویلی کے اصل رہائشی علاقے کا فاصلہ اچھا خاصا تھا، چوکیدار میرے آگے آگے چلتا رہا۔ سامنے کی سمت سے جانے کے بجائے اس نے بغلی سمت اختیار کی۔ غالباً مختصر راستے سے لے جا رہا تھا۔ میرا اندازہ دُرست نکلا اور وہ چند سیڑھیاں چڑھ کر اندر ایک غلام گردش میں داخل ہوگیا۔ نیم تاریک راستے پر وہ آگے بڑھتا رہا، کئی موڑ مڑے آگے بالکل اندھیرا تھا اگر اس کے ہاتھ میں لالٹین نہ ہوتی تو آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا۔
''تم مجھے بنسی راج کے پاس لے جا رہے ہو یا پوری حویلی گھما رہے ہو۔''
''پوری حویلی تو تم ساری رات میں نہ گھوم سکو گے مہاراج۔'' چوکیدار نے عجیب سے لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور کتنا چلنا ہے؟''
''آؤ......!'' اس نے ایک جگہ رُک کر کہا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس نے لالٹین نیچے رکھی اور شاید کوئی دروازہ کھولنے لگا پھر دوبارہ لالٹین اُٹھا کر بولا۔
''آؤ اندر چل کر بیٹھو...... مہاراج کو خبر کر دوں۔''
''لعنت ہے۔'' میں نے کہا اور دروازے کو ٹٹول کر اندر داخل ہوگیا۔ ''یہاں روشنی نہیں ہے۔'' میرے منہ سے نکلا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگلا پاؤں خلاء میں لہرایا ایک دم توازن بگڑ گیا، سنبھلنے کی کوشش کی لیکن نہ سنبھل سکا اور دُوسرے لمحے میرا بدن خلاء میں نیچے جا رہا تھا، میں نے بے اختیار دونوں طرف ہاتھ مارے مگر پکڑنے کے لیے کچھ نہیں تھا، میں کسی گہرے کنویں میں گر رہا تھا۔

چند لمحات کے لیے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوگئیں، کلیجہ حلق میں آ گیا۔ اسی احساس کا شکار تھا کہ اتنی گہرائی میں گروں گا تو جسم کا کیا حشر ہوگا۔ گہرائیاں ختم ہوئیں مگر آخری لمحات میں جیسے بدن ٹھہر گیا، پاؤں سیدھے ہو گئے اور پھر پیروں کے نیچے زمین محسوس ہوئی، گویا دباؤ نہیں پڑا تھا، بدن ساکت ہو گیا تھا لیکن گھور تاریکی تھی، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، یہ کیفیت بھی کچھ لمحات رہی پھر آہستہ آہستہ اجالا سا ابھرنے لگا، آس پاس نظر آنے لگا، یہ کنواں تو نہیں تھا۔ اچھی خاصی وسیع و عریض جگہ تھی، گھسے ہوئے گول پتھر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، میں بھی ایک بڑے پتھر پر کھڑا ہوا تھا البتہ اوپر کچھ نہیں نظر آ رہا تھا، آسمان کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ کیا تھا یہ سب...... چوکیدار کون تھا۔ بدن کو جنبش دی، پاؤں آگے بڑھائے اور انہیں پتھروں پر جماتا ہوا آگے بڑھا۔ کوئی تیس چالیس قدم نکل آیا، اب چاروں طرف مدھم سی روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ روشنی نہ تو تاروں کی چھاؤں تھی، نہ کسی مصنوعی شے سے پیدا ہوئی تھی بس آنکھوں کو نظر آ رہا تھا لیکن آس پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر اچانک عقب سے کسی کے پتھروں پر چلنے کی آواز آئی اور میں چونک کر پلٹ پڑا۔ ایک انسانی جسم تھا لباس سے بے نیاز سیاہی مائل...... میری طرف آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ قریب آیا تو دل پر ہلکا سا اثر پڑا۔ سب کچھ مکمل تھا مگر چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ ناک، نہ آنکھیں، نہ ہونٹ۔ بس بے خدوخال کا ایک گول سا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ رک گیا۔
''کون ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

''ماما ہیں توہار...... تے کون رہے؟'' آواز آئی۔
''بھانجا ہوں تمہارا۔'' میں بے اختیار مسکرا پڑا۔ ویسے یہ آواز اس چوکیدار کی بھی نہیں تھی جس نے مجھے فریب دے کر یہاں پہنچایا تھا۔
''ٹھٹھول کرے ہے میاں جی۔ ہمکا جانت نا ہے تے...... سارا ٹھٹھول نکال دئی ہے۔ ہاں...... منتر پڑھویں آئے رہے۔ پڑھ منتر۔ ہم او دیکھیں تورے منترو......!''
''ہیرا ہو تم......؟'' میں نے پوچھا۔
''بھٹی میں گیا ہیرا۔ تے حویلی ماں کاہے آئے رہے۔ ادھر توہار کام نا ہوئی ہے۔ ہم کہہ دیت۔ ارے اس پاپی کے لئے گرے ہے تے جس نے ہمرا کاتر سا دئی ہے۔ سب کے سب بدلہ لیں گے اس سے ہاں......!''
''تم کون ہو...... مجھے بتاؤ؟'' میں نے کہا اور چند قدم آگے بڑھا کر اس کے پاس پہنچ گیا لیکن اچانک ہوا کا ایک جھونکا سا آیا اور میں نے اس کے سیاہ جسم کو بکھر کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ گول چکنے پتھروں پر جلے ہوئے کوئلے کی راکھ بکھری نظر آ رہی تھی۔
''توکا کچھ بتانے کی جرورت نا رہے ہمکا...... تے اپنی سنبھال۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ وہ دوسری طرف اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔
''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' میں نے سنبھل کر پوچھا۔
''حویلی ماں بہت سارے رہے ہیں۔ تے ادھر اپنا چکر نا ہی چلائی سکت......!''
''یہ کونسی جگہ ہے؟'' میں نے پھر قدم آگے بڑھائے اور ہوا کے ساتھ پھر اس کی راکھ بکھر گئی مگر اس کی آواز تیسری سمت سے سنائی دی تھی۔
''توہار ماما کی سسرال...... تے اب جیتے جی یہاں سے ناں نکل سکت......!''
میرا چہرہ اسی طرف گھوم گیا، وہ موجود تھا۔
''توہار دو مجھے......!'' میں نے کہا۔
''ارے ہم کاہے ماریں سسر، بھوک پیاس سے کھود ہی مر جئی ہے۔'' اس نے کہا۔
''پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟''
''توہار باپ کی مڑھیار ہے نا...... جو ہمکا آنے کو منع کرت ہے۔ ابھی بٹوا سب پتہ چل جئی ہے جب ناگ پھنکاریں گے۔ بچھوا ناچیں گے توہار چاروں طرف......!''
''ہوں...... میں نے تمہیں پہچان لیا۔ سنا تھا تمہارے بارے میں آج دیکھ بھی لیا، بتاؤں تم کون ہو......؟''
''جارے...... بتئی ہے...... ہونہہ۔'' اس نے حقارت سے کہا۔
''چھلاوے ہو۔'' میں نے کہا اور دفعتاً ہی ہوا کا جانا پہچانا جھونکا مجھے محسوس ہوا مگر اس بار اس جگہ اس کی راکھ نہیں بکھری تھی بلکہ وہ غائب ہو گیا تھا۔ چوتھی بار اس کی آواز کہیں سے نہ سنائی دی۔ یہ خیال میرے ذہن میں ایسے ہی نہیں آ گیا تھا، بہت پرانی بات تھی۔ اس وقت کی جب میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں معصوم تھا لیکن سمجھدار تھا اور کہانیوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ کسی بزرگ نے ایک چھلاوے کی کہانی سنائی تھی اور بتایا تھا کہ وہ کیا ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے۔ وہی کہانی یاد آ گئی تھی اور میں نے اسے چھلاوا کہا تھا۔ یہ بھی سنا تھا میں نے اس کہانی میں کہ اگر چھلاوے کو پہچان لیا جائے تو وہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر نظر نہیں آتا اور اس وقت یہ سب کچھ بالکل سچ ثابت ہوا تھا۔ وہ سو فیصد چھلاوا ہی تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں کیا کروں۔ کیا اس کے الفاظ یہ بتاتے تھے کہ حویلی میں باقاعدہ بری ارواح کا بسیرا ہے اور زیادہ تر لوگ بنسی راج کے ستائے ہوئے ہیں۔ اب یہ تو سوچ نہیں سکتا تھا کہ میں ایک ایسے ظالم آدمی کو نظر انداز کر دوں جس نے بہت سوں پر مظالم کئے ہیں اور

اب ان کی سزا بھگت رہا ہے کیونکہ مجھے ہدایت مل چکی تھی۔ بعض معاملات میں برا انسان بھی کسی کی وجہ سے کسی طرح بچ جاتا ہے۔ اس کے تین بیٹوں کی تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا، باقی میں نہیں جانتا تھا کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے وہاں سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس جگہ کی وسعت کتنی ہے۔ پتھروں پر سے گزرتا ہوا میں آگے بڑھتا رہا اور ایک بار پھر مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ذرا سی گہرائی نظر آئی تھی اور میں نے کنارے سے اس سمت دیکھا تھا۔ وہی خاندان موجود تھا جس سے میں بڑ کے درخت کے نیچے مل چکا تھا۔ لڑکے نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور لاکھو سے بولا۔

''بپو ارتھی چاہئے، سیندور چاہئے، گھی چاہئے، لکڑیاں جلا دو بپو، بھوک لگ رہی ہے۔''

لاکھو نے ویسے ہی گردن اٹھائی، ادھر ادھر دیکھا اور پھر جھڑک کر لڑکے سے بولا۔ ''ارے چپ کر جا انجائی، بھوک لگ رہی ہے، ارتھی چاہئے۔ ارے ہم سب کو نا دیکھ رہا کا، ہمارے پاس کا رہے؟''

''بپو، بھوکا ہوں۔'' لڑکا بولا۔

''تو پھر ادھر دیکھ...... وہ کھڑا ہے اسے کھا لے، اسی کو کھا لے، میں کا کروں۔'' لاکھو نے کہا اور لڑکے نے بھاڑ سا منہ کھول دیا۔ عجیب وغریب منظر تھا یہ بھی۔ لڑکے کا سر بہت بڑا تھا، بدن سوکھا ہوا تھا اور اتنا سوکھا ہوا تھا کہ یقین نہ آئے۔ سر اسی مناسبت سے بڑا تھا۔ اس نے گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھا اور منہ کھول دیا۔ اتنا بڑا منہ، اتنا بڑا کہ ایک اچھی خاصی گیند اس کے منہ میں چلی جائے۔ چہرے پر انتہائی خوفناک تاثرات لئے وہ اپنے سوکھے سوکھے قدموں سے چلتا ہوا میری جانب بڑھا۔ شاید انہیں توقع ہو کہ میرے حلق سے اب دلخراش چیخ بلند ہوگی اور میں پلٹ کر بھاگ نکلوں گا لیکن میں اسے دیکھتا رہا۔ لڑکا آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور کہا۔

''آؤ آؤ آگے آؤ، کھا لو مجھے۔'' ہوا کا بالکل ویسا ہی جھونکا محسوس ہوا اور لڑکا میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ اب میرے چاروں طرف کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ سب دہشت سے مار دینے والے کھیل ہو رہے تھے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب بیکار سی باتیں ہیں۔ مجھے جو عمل کرنا ہے اس کے لئے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا اور اب میں جہاں بھی آ پھنسا ہوں مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایک ہی ذریعہ تھا میرے پاس۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا اعتماد تھا مجھے اپنے اس ذریعے پر، انسانی فطرت کے تحت کسی بھی غیر متوقع بات پر ایک لمحے کے لئے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ بے شک دوڑ جاتی تھی لیکن اس کے بعد وہ اعتماد بحال ہو جاتا تھا جو مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں نے شانے سے کمبل اتارا اور اسے اپنے گرد لپیٹ کر اپنا چہرہ اس میں چھپا لیا اور میرا خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ چند لمحات اسی طرح گزرے اس کے بعد میں نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور منظر بدلا ہوا دیکھا۔ حویلی کے بڑے دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ دروازے کا آدھا پٹ کھلا ہوا تھا اور وہ پراسرار جگہ جہاں چوکیدار نے مجھے پہنچا دیا تھا، نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

میں اس شان کریمی کے قربان ہونے لگا۔ مجھے جو اعتماد بخشا گیا تھا، وہ ناقابل تسخیر تھا۔ بڑے اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھائے اور حویلی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چھلاوے اور ارواح خبیثہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو چکی تھیں اور مجھے اس سمت روانہ کر دیا گیا تھا جہاں آنا تھا۔

حویلی کی راہداریاں سنسان پڑی ہوئی تھیں، بے شک مجھے کسی رہنما کی ضرورت تھی جو مجھے بنسی راج تک پہنچا دے لیکن شاید یہاں کے لوگوں پر بھی خوف و ہراس طاری تھا۔ جیسا کہ اس چھلاوے نے مجھے بتایا کہ یہاں وہ اکیلا نہیں رہتا، بہت سے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے حویلی میں رہنے والوں کا خون ویسے ہی خشک ہوتا رہتا ہوگا۔ یہی بڑی بات ہے کہ وہ اب بھی اس حویلی میں موجود تھے۔ غرض یہ کہ میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک ایسے کمرے کے قریب پہنچ گیا جہاں روشنی جھلک رہی تھی۔

گو یہ سب کچھ ایک غیر مناسب عمل تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ میں نے تو باقاعدہ چوکیدار کے ذریعے یہاں آنے کی کوشش کی تھی۔ اب چوکیدار کی جگہ کون تھا، مجھے معلوم تھا۔

روشن کمرے کے دروازے کے سامنے رک کر میں نے دستک دی۔ اندر بے شک روشنی تھی لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ دوسری بار اور تیسری بار دستک دی تو اندر سے ڈری ڈری آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر کسی نے انتہائی ہمت کر کے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کک ......کون ہے، کون ہے؟'' آواز اس قدر ڈری اور سہمی ہوئی تھی کہ ایک لمحے کے لئے تو سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ کسی مرد کی ہے یا عورت کی۔ لیکن میں نے پھر دستک دی اور آواز سنائی دی۔

ارے کون ہے، کون ہے؟'' اور اس بار میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ بنسی راج ہی تھا جس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ میں نے صاف لہجے میں کہا۔ ''دروازہ کھولو بنسی راج مہاراج۔ میں مسعود ہوں۔''

''کک ......کون بھائی۔ کون؟''

''مسعود۔ جس کے پاس تم مولوی حمید اللہ کے گھر ملنے گئے تھے۔'' میرے ان الفاظ نے غالباً بنسی راج کے دل سے خوف دور کر دیا بلکہ کچھ زیادہ ہی دور کر دیا۔ ہلکی سی گرنے کی آواز سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے بنسی راج اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگا ہو اور کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑا ہو۔ پھر دروازے پر آہٹیں سنائی دیں اور ساتھ ہی کسی عورت کی ڈری ڈری آواز۔ ''ارے دیکھ تو لو، گردن نکال کر دیکھنا، پھر دروازہ کھولنا۔'' یقیناً بنسی راج کی دھرم پتنی ہوگی۔ بنسی راج نے تھوڑی سی جھری کی اور مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''بنسی راج میں ہی ہوں۔ میں نے تم سے تمہاری حویلی آنے کا وعدہ کیا تھا نا؟''

''ہاں، مہاراج۔ آ جایئے۔'' بنسی راج نے کہا اور پورا دروازہ کھول دیا۔ بڑی سی مسہری کے ایک گوشے میں سفید ساڑھی میں ملبوس ایک عورت سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار منجمد تھے اور آنکھوں سے انتہائی ہراس ٹپک رہا تھا۔ بنسی راج نے تیز روشنی جلا دی اور عورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں اس وقت آنے کی لیکن یہی وقت میرے لئے مناسب تھا۔''

''ارے مہاراج پدھاریئے، پدھاریئے، بھگوان کی سوگند آپ کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا ہوں۔ میں نے پورا دن انتظار کیا، اب تک انتظار کرتا رہا ہوں میں، من ٹوٹ گیا تھا اور میں اپنی دھرم پتنی سے یہ کہہ رہا تھا کہ شاید بھگوان نے ہماری تقدیر میں کوئی اچھائی نہیں لکھی ہے ورنہ مہاراج مسعود ضرور آ جاتے۔'' بنسی راج نے مخصوص بناوٹ کی ایک قیمتی کرسی اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی اور میں بیٹھ گیا۔ ''یہ میری دھرم پتنی چندراوتی ہے، مہاراج یہ بہت دکھی ہے، یہ تین بیٹوں کا دکھ بھوگ رہی ہے۔''

''برا مت ماننا بنسی راج تم نے بھی تو بہت سی ماؤں کو ان کے بیٹوں کا دکھ دیا ہے، کرنی کا پھل تو ملتا ہی ہے۔''

''نا مہاراج نا۔ ایسا مت کہو۔ بڑی آس لگا رکھی ہے ہم نے۔ ارے انیائے میں نے کیا ہے۔ بھگوان کی سوگند کوڑھی ہو جاؤں، سانپ بچھو لپٹ جائیں میرے شریر سے، آنکھیں بہہ جائیں پانی بن کر جو بھی سزا ملے، مجھے مل جائے۔ بھگوان میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو بچا لے۔ سے لوٹ آئے اور میں اپنے سارے پاپوں کا پرائشچت کر لوں۔ کچھ ایسا ہو جائے مہاراج۔ وہ بچ جائیں بس۔ اب کوئی اور دکھ مجھ سے نہ سہا جائے گا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ ایسا کرب تھا اس کی آواز میں کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ یہ پچھتاوا تھا، احساس تھا، ندامت بھی۔ اب کچھ اور کہنا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا بنسی راج۔ پورا کرنے آ گیا، دل چھوٹا نہ کرو، اللہ مالک ہے، میں کوشش کروں گا!''

''بڑی دیا ہوگی مہاراج۔ بڑی دیا ہوگی۔''

''چلتا ہوں۔''

''حویلی میں رک جاؤ بھگوان۔ ہمیں ڈھارس ہو جائے گی۔'' بنسی راج نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''پھر آؤں گا بنسی راج۔ ضرورت پڑنے پر پھر آؤں گا۔'' میں اٹھ گیا۔ بنسی راج مجھے حویلی کے باہر تک چھوڑنے آیا

تھا۔ میری منت سماجت کرتا رہا تھا۔ میں اسے دلاسے دے کر آگے بڑھ گیا۔ مسجد تک واپسی میں کوئی واقعہ نہیں پیش آیا۔ حجرے میں تاریکی تھی۔ میں درخت کے نیچے اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔ اس مختصر وقت میں ہی بڑے انوکھے واقعات پیش آئے تھے۔ بے شک وہ ارواح خبیثہ تھیں لیکن ان کے ساتھ بھی ظلم ہوا تھا۔ ان سب نے بنسی راج کی حویلی میں بسیرا کر لیا تھا اور وہ اپنا انتقام لینا چاہتی تھیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ واضح اشارہ مل چکا تھا کہ میں بنسی راج کی مدد کر دوں لیکن ان ارواح خبیثہ کے ساتھ مجھے کیا کرنا چاہئے، یہ میرے علم میں نہیں تھا۔ نیند آنکھوں سے دور ہو گئی تھی۔ اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ بنسی راج کے ہاتھوں چوٹ کھائے آسیب میری طرف سے ہوشیار ہو گئے تھے جس کا ثبوت مجھے حویلی میں داخل ہوتے ہی مل گیا تھا۔ بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر نماز پڑھنے کو دل چاہا، یوں بھی تہجد کا وقت تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر صحن مسجد میں آیا، وضو کیا اور عبادت کرنے لگا۔ دل کو ناقابل بیان سکون ملا تھا۔ سلام پھیرا تو ایک اور تہجد گزار پر نظر پڑی۔ ادھیڑ عمر شخص تھا۔ میری دائیں سمت بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی سلام پھیرتے ہوئے مجھے دیکھا اور نماز سے فارغ ہو کر مجھے سلام کیا، میں نے احترام سے اسے جواب دیا۔

''موسم خوشگوار ہے۔'' اس نے کہا۔

''بے شک۔ رحمت الٰہی سے منور۔'' میں نے جواب دیا۔

''کلام الٰہی کا ایک ایک حرف کائنات کی عبادت کرتا ہے، جہاں اس کا ورد ہو وہاں رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ گو امراض مختلف ہوتے ہیں اور جب دل بے چین ہو اور دماغ فیصلہ نہ کر پائے تو گیارہ بار درود پاک پڑھ لیا کرو اور آنکھیں بند کر کے رہنمائی طلب کر لیا کرو اور اتنا ہی کافی ہے ہر مرض کے علاج کے لئے، یہ سب کچھ کبھی نہ سمجھ پاؤ گے لیکن بہت کچھ ہے اتنا کچھ کہ مشکل کم اور حل زیادہ اور اس وقت جو فیصلہ ہو اس پر غور نہ کرو کیونکہ دماغ کی کیا مجال کہ ان وسعتوں کے تصور کو بھی پا لے۔ اچھا سپرد رحمت۔ السلام وعلیکم۔''

وہ صاحب اٹھے اور صحن مسجد کے باہر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ میرے منہ سے بلند آواز میں سلام کا جواب نکلا تھا اور بس یوں لگا جیسے خواب سے آنکھ کھل گئی ہو۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات کے خزانے سامنے بکھر گئے ہوں۔ ہر شے جواہرات کی طرح جگمگانے لگی۔ اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ وہاں سے اٹھ آیا۔ درخت کے سائے سے الگ ہو کر زمین پر دوزانو بیٹھا اور درود شریف پڑھنے لگا۔ دماغ نے تصور دیا۔ گناہ کو تائید شیطانی حاصل ہے اور شیطان وشیطنیت کی قوت حاصل ہے۔ اسے لاحول سے بھگایا جا سکتا ہے لیکن اس کی ذریات کا خاتمہ عمل سے گزر کر ہوتا ہے اور عمل یہ ہے کہ اس کفر زادے کو اہل خاندان کے ساتھ نکال کر دریا پار کرا دیا جائے اور دریا پار اس کا گھر ہے یہاں اس عمل کا اختتام ہو چکا ہے لیکن کسی کو نہ چھوڑا جائے۔ کھٹاک کی آواز ہوئی اور جیسے ایک روشن خانہ بند ہو گیا بالکل ویسے ہی جیسے بجلی کا بلب بجھا دیا جائے لیکن مجھے رہنمائی مل گئی تھی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوتی۔ ایک ناواقف کو جس طرح نوازا گیا تھا اس کے لئے سجدہ شکر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا اور سجدے کر کے جی نہ بھرا یہاں تک کہ مولوی حمید اللہ آ گئے۔

''فجر کا وقت ہو گیا ہے مسعود میاں۔'' انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ میں اٹھ گیا۔ ''سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ جوانی کی اس عبادت کو قبول فرمائے۔ میاں نماز کے بعد باتیں ہوں گی۔ اذان کہہ دوں، وقت ہو گیا ہے۔'' وہ مسجد کے مینار کی طرف چل پڑے۔ میں اس طرح تازہ دم تھا جیسے جی بھر کے سویا ہوں۔ خمار کا نشان بھی نہ تھا۔ اذان ہوئی، نمازی آئے۔ مجھ سے بہت محبت سے ملے پھر فراغت ہو گئی۔ مولوی صاحب چائے لے آئے، مجھے پیش کی اور خود بھی لے کر بیٹھ گئے۔

''رات کو بہت دیر تک جاگتا رہا تھا، کس وقت واپسی ہوئی؟''

''دیر ہو گئی تھی۔''

''حویلی مل گئی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''اور بنسی راج لعل؟''
''وہ بھی مل گیا تھا۔''
''کچھ اندازہ لگایا؟''
''ہاں! حمید اللہ صاحب...... ظالم انسان تھا۔ خود پر بیتی تو آنکھ کھلی مگر بہت نقصان اٹھا چکا ہے۔''
''اللہ رحم کرے۔ جو کیا ہے بھر رہا ہے؟''
''مشکل فلسفہ ہے حمید اللہ صاحب۔ کیا اس نے ہے لیکن بھگتنا اس کے تین بیٹوں کو پڑا۔''
''ہاں میاں، باپ کا گناہ اولاد کے سامنے آتا ہے۔''
''یہ غلط ہے۔'' میں نے کہا۔
''کیوں؟'' حمید اللہ صاحب چونک کر بولے۔
''عقل تسلیم نہیں کرتی۔''
''مگر سامنے کی بات ہے۔''
''ہمارے آپ کے سامنے کی بات، عقل اس کی نفی کرتی ہے۔''
''مجھے سمجھاؤ؟''
''میرے خیال میں گناہ کی سزا صرف گناہ گار کو ملتی ہے، اس گناہ گار کو جو اللہ کا مجرم ہوتا ہے اور اللہ سچا منصف ہے۔ جو دنیا سے گئے ان کی زندگی اتنی ہی تھی مگر مجرم کو اس وقت تک ان کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑے گا جب تک وہ زندہ ہے۔ میں نے کہا نا مشکل فلسفہ ہے، حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ خدا ہی بہتر سمجھتا ہے۔''
''اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''کہانی تو سچ ہے۔''
''اور وہ ارواح خبیثہ۔''
''حویلی ان سے بھری ہوئی ہے جو اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے حویلی کو حصار میں لیا ہوا ہے۔''
''بالکل درست کہتے ہیں۔ کئی واقعات ہو چکے ہیں۔''
''کیسے؟''
''بنسی راج نے ہندوستان بھر سے سادھو، پنڈت اور جوگی بلائے۔ زر و جواہر کے انبار لگا دیئے ان کے سامنے۔ ہر کوشش کی گئی مگر کچھ نہ ہوا بلکہ ان سب کو نقصان ہوئے۔ مہاشے درگا داس تو ابھی کچھ دن پہلے مرے ہیں۔''
''یہ کون تھے؟''
''گیانی دھیانی تھے۔ الہ آباد سے آئے تھے۔ حویلی میں جاپ کیا، تین بار اٹھا کر پھینکے گئے، چوٹیں لگیں، باز نہ آئے یہاں تک کہ پاگل ہو گئے۔ الہ آباد سے ان کے گھر والے انہیں لے گئے مگر دو مہینے کے بعد پھر واپس آ گئے۔ اس کے بعد کئی مہینے یہاں رہے۔ تھوڑے دن قبل لال تلیا میں ان کی لاش تیرتی ملی، اسی سرکٹے کا شکار ہو گئے تھے۔''
''اوہ افسوس ہے۔'' میں نے کہا۔
''ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، کچھ کام کرنا پڑے گا۔''
''اللہ کامیاب کرے۔ امان میں رکھے۔'' حمید اللہ صاحب خلوص سے بولے لیکن کچھ تشویش بھی تھی ان کے لہجے میں۔
دوپہر کو دوبارہ بنسی راج کی حویلی پہنچا۔ بنسی راج موجود تھا۔ راستے میں اچھا خاصا مجمع میرے ساتھ حویلی پر جا کر منتشر ہوا۔ بنسی راج نے ہاتھ جوڑ کر میرا استقبال کیا تھا۔
''کہیئے بنسی جی۔ سب خیریت رہی؟''

''نہیں مہاراج۔ رات تو بڑی دھاچوکڑی رہی۔''
''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''بڑا اودھم مچا ہے رات کو۔ آگ کے گولے گرے حویلی پر۔ خوب شور مچا، کئی نوکر بھاگ گئے۔ میرے کمرے کا دروازہ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ چار فانوس توڑ دیئے گئے، چیخیں اور آوازیں سنائی دیں۔''
''ہوں۔ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا۔''
''نہیں مہاراج مگر اب کچھ اور مشکلیں نظر آ رہی ہیں۔''
''کیا؟''
''نوکر تو اب کوئی نہیں ٹکے گا یہاں۔''
''آپ کے دونوں بیٹے کہاں ہیں؟''
''ونود اور راجیش یہیں ہیں۔ پہلے تو وہ نہیں ڈرتے تھے مگر اب پیلے پڑ گئے ہیں۔''
''بیٹیاں؟''
''وہ سسرال میں ہیں۔''
''کہاں؟''
''ایک دلی میں ہے، دوسری جے پور میں۔''
''انہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا کبھی؟''
''نہیں۔ بھگوان کی دیا ہے۔''
''یہاں آس پاس کوئی ندی ہے؟''
''نیما ندی ہے۔ بڑی مشہور ہے۔''
''اس کے پار آپ کی کوئی حویلی ہے؟''
''سونا باغ ہے ہمارا، سونا باغ میں پورن نے حویلی بنائی تھی۔ اس کی موت کے بعد ہم وہاں نہیں گئے۔''
''پورن آپ کا بیٹا تھا؟''
''ہاں......'' بنسی راج نے بھاری آواز میں کہا۔
''ہمیں وہاں چلنا ہے۔''
''ہیں...... کب؟''
''جو وقت بھی آپ بتائیں، جلد سے جلد۔''
''آپ حکم دیں مہاراج۔''
''تیاریاں کر لیں، آج ہی چلیں۔''
''نوکر کو کھتوریہ ماجھی کے پاس بھیجے دیتا ہوں ناؤ تیار کر لے۔ میری اپنی ناؤ ہے۔''
''بھیج دیں اور اپنے گھر والوں کو تیار کر لیں۔''
''کسے کسے لے چلنا ہے مہاراج؟''
''دونوں بیٹے، آپ کی بیوی اور بہن۔''
''ہرناوتی؟'' بنسی راج چونک کر بولا۔
''ہاں۔ اس کا جانا بھی ضروری ہے۔ آپ یہ ہدایت دے دیں اور پھر مجھے اس سے ملائیں۔''
''ٹھیک ہے مہاراج'' بنسی راج نے کہا۔ مجھے وہیں انتظار کرنا پڑا۔ پھر بنسی راج مجھے لے کر ہرناوتی سے ملانے چل

پڑا۔ حویلی کا یہ حصہ کھنڈر بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں ہرناوتی موجود تھی۔ سفید ساڑھی میں ایک پاکیزہ چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''یہ کون ہیں بھیا جی؟''

''میرے دوست ہیں ہرنا۔''

''لگتے تو نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔

''ہمیں لینے آئے ہیں۔''

''کہاں لے جائیں گے؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سب جا رہے ہیں، تمہیں بھی چلنا ہے ہرناوتی۔'' میں نے کہا۔

''میری قید ختم ہو گئی؟''

''تو قید کہاں تھی ہرنا۔ میں ہی اندھا ہو گیا تھا، پاگل ہو گیا تھا مگر اب۔'' بنسی راج نے سسک کر کہا۔

''پرائی پیر جانو سوامیں، لے چلو جہاں من چاہے، ہم اپنے ہیں ہی کب۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ بنسی راج نے نوکر کو کشتی کے انتظام کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ میں ہرناوتی سے مل چکا تھا، کوئی خاص بات نہیں تھی، بس ملازم بہت دیر میں آیا۔

''کھتوریہ ہریاپور گیا تھا مہاراج۔ دیر میں آیا اس کا انتظار کر رہا تھا۔''

''آ گیا؟''

''ہاں ناؤ تیار کر رہا ہے، کہتا ہے مہاراج گھاٹ آ جائیں، نیا تیار ملے گی۔''

ملازم شام کو چھ بجے واپس آیا تھا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ ہم لوگ گھاٹ چل پڑے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج چھپ گیا۔ بنسی راج، اس کے دونوں بیٹے، بیوی اور ہرناوتی میرے ساتھ تھے۔ میری ہدایت پر کسی ملازم کو نہیں لیا گیا تھا۔ گھاٹ پر بڑی سی کشتی ڈول رہی تھی اسی پر بادبان باندھا گیا تھا۔ بنسی راج قریب آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ونود نے رسی کھینچ کر کشتی کو کنارے لگایا اور عورتوں کو سہارا دے کر کشتی پر اتار دیا گیا۔

''یہ کھتوریہ کہاں مر گیا۔ ویسے ہی رات ہو گئی۔'' اسی وقت کھتوریہ کھیس سنبھالے دوڑتا نظر آیا۔ ونود نے خود بھی کشتی میں بیٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

''کہاں چلا گیا تھا رے تو۔ چل جلدی کھونٹا کھول دیر کر دی بے وقوف نے۔'' کھتوریہ نے کھونٹا کھولا، رسی لپیٹ کر بادبان میں پھینکی اور خود کشتی میں کود کر بادبان کا رخ بدلنے لگا۔ کشتی پانی میں آگے بڑھنے لگی۔ کھتوریہ پتوار سنبھال کر کشتی کے دوسرے سرے پر جا بیٹھا تھا۔ کشتی بہاؤ پر چل پڑی۔ سب خاموش تھے۔ بہت دیر تک یہ خاموشی طاری رہی پھر بنسی راج بولا۔

''سونا باغ سونے کا باغ کہلاتا ہے۔ کچھ بھی لگوا دو ایسی فصل ہوتی ہے وہاں کہ کہیں نہیں ہوتی۔ آم، ناریل اور پپیتا تو اتنا اگتا ہے کہ بس مگر اسے لگانے والا نہ رہا۔''

''پتا جی۔ ان باتوں کو یاد نہ کریں۔'' راجیش نے کہا۔

''جب سے پورن نے سنسار چھوڑا، میں آج اس باغ میں جا رہا ہوں۔'' بنسی راج درد بھرے لہجے میں بولا اور اس کی معصوم پتنی سسکنے لگی۔

''پتا جی۔'' راجیش نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''کیسے بھولوں اسے۔ کیسے بھول جاؤں اپنے تین ہاتھیوں کو۔ وہیں جا رہا ہوں۔ ایک ایک چیز سے اس کی یادیں برستی ہیں۔''

میں نے افسردہ نظروں سے سب کے چہرے دیکھے۔ آخر میں میری نظر ہرناوتی کی طرف اٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں چمک رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

''کون بھولتا ہے، کوئی نہیں بھولتا۔'' آہستہ بولی تھی لیکن میں نے سن لیا تھا۔ نہ جانے کیوں راجیش کو غصہ آ گیا۔

''آپ تو چپ ہی رہا کریں بوا جی۔ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا۔''

''راجیش چپ بیٹھ!'' بنسی راج بولا۔

''آپ نے سنا نہیں پتا جی، وہ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''خاموش بیٹھ!'' بنسی راج بولا اور راجیش منہ بنا کر بیٹھ گیا۔ ہرناوتی آہستہ آہستہ ہنس رہی تھی۔

''اپنی چوٹ سب کو دکھتی ہے۔ دوسرے کو کون جانے۔'' وہ پھر بولی۔ کھتوریہ بادبان کا رخ درست کر رہا تھا۔

''یہ رخ کیوں بدل رہا ہے کھتوریہ۔ وہ سامنے تو ہے سونا باغ۔'' ونود نے کھتوریہ سے کہا اور اس نے بدن سے لپٹا کھیس تار دیا۔ ایک تو نیم تاریک ماحول تھا، دوسرے کھتوریہ نے چہرہ ڈھکا ہوا تھا اس لئے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی، کھیس اتارنے سے اس کا چہرہ نظر آیا۔ کالا سیاہ چہرہ، خون کی طرح سرخ آنکھیں مگر یہ سیاہ چہرہ بالکل جلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کھتوریہ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا ہی ہو لیکن اچانک پوری کشتی پر چیخیں گونجنے لگیں۔ بنسی راج کی بیوی نے چیخ کر اپنے دونوں بیٹوں کو سینے سے لپٹا لیا تھا۔ بنسی راج تھر تھر کانپ رہا تھا اور ہرناوتی کی ہنسی کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میری نظریں سب سے ہوتی ہوئی کھتوریہ پر آ گئیں۔ اس نے دونوں گال پھلائے ہوئے تھے اور منہ سے ہوا نکال رہا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں شیطانی چمک لہرا رہی تھی اور منہ سے اتنی تیز ہوا نکل رہی تھی کہ اس کا احساس اتنے فاصلے پر بھی ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ہوا بادبان میں بھرتی جا رہی ہے اور کشتی کی رفتار بھی تیز ہونے لگی ہے۔ صورتحال پوری طرح تو سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

✦✤✦✤✦

میں نے بنسی راج کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' بنسی راج نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

''ہیرا...... ہیرا۔''

''میں تمام صورتحال سمجھ گیا تھا۔ ہرناوتی کی ہنسی بھی اب سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کشتی کی برق رفتاری کسی خوفناک حادثے کو جنم دینے والی ہے۔ وہ تو ایک خبیث روح تھی' لیکن باقی سب ذی روح تھے اور رفتار پکڑنے والی بے آسرا کشتی کسی بھی لمحے دریا میں الٹ سکتی تھی۔''

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑی۔ چند قدم آگے بڑھا اور ہیرا کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے بادبان کی طرف سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی شرارت سے مسکراتی ہوئی سرخ آنکھوں میں نفرت کی پرچھائیاں دوڑنے لگیں۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھا اور رخ تبدیل کر لیا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی ہوا اب میرے سینے پر پڑی اور مجھے ایسا ہی محسوس ہوا جیسے کوئی سخت اور موٹی سل میرے سینے پر آ ٹکی ہو اور پوری قوت سے مجھے پیچھے دھکیل رہی ہو۔ یہ ہو کی طاقت تھی لیکن خدا نے مجھے بھی یہ ہمت عطا کی کہ میں اس شیطانی طاقت کا مقابلہ کر سکوں۔ تیز ہوا بے شک میرے جسم میں سوراخ کئے دے رہی تھی' لیکن میرے قدموں کو ایک تل برابر بھی پیچھے نہ ہٹا سکی۔ ہیرا مسلسل کوششیں کرتا رہا۔ تب میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''بس ہیرا رک جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے نقصان کی باری آتی ہے۔'' وہ رک گیا۔ ہوا بند ہو گئی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''جتنا کچھ تم کر چکے ہو ہیرا میرے خیال میں وہ بہت زیادہ ہے اور اب تمہیں یہ سلسلہ ترک کر دینا چاہئے۔'' اس نے

خونخوار انداز میں منہ کھولا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے او میاں جی۔ زیادہ باتیں نہ بنا ہمارے سامنے۔ بڑا مہاتما ہے تو، بڑا علم والا ہے۔ ہم نہ مہاتما ہیں، نہ علم والے، ہم تو مظلوم ہیں، انیائے ہوا ہے ہمارے ساتھ۔ یہ پاپی، یہ ہتھیارا ہمارے پورے خاندان کو ختم کر چکا ہے، ارے تیرا ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے میاں، بیچ میں مت آ ہمارے، جو سوگند ہم نے کھائی ہے اسے پوری کئے بغیر ہم نہیں رہ سکیں گے، بیچ کا جھگڑا مت نکال میاں جی، بیچ کا جھگڑا مت نکال۔''

''تم اس سے انتقام لے چکے ہو۔ تین بیٹے مار دیئے ہیں تم نے اس کے اور کیا کرو گے، بس اتنا کافی ہے اور تم تو اس کے خاندان کے ایک فرد ہو، ہرناوتی سے شادی ہوئی ہے تمہاری، کچھ بھی ہے یہ اپنا خاندان ہے تمہارا، بس اتنا ہی کافی ہے جو تم کر چکے، بس اس کے بعد تم اپنی یہ کارروائیاں بند کر دو۔''

''ارے جا رے جا۔ کارروائیاں بند کر دو۔ ہم اس کے خاندان کے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے خاندان والوں کے ساتھ رے، ہمیں بھی تو اس کی طرح اس سنسار میں بھیجا گیا تھا، کون نیچا ہے، کون اونچا ہے، چار پیسے انسان کو اتنا اونچا بنا دیتے ہیں کہ وہ نیچا دیکھ ہی نہیں سکتا، ہم بھی اس کی بہن کو عزت دیتے، ہم بھی عزت سے جی لیتے۔ بیچ میں مت آ میاں، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔''

''اور اگر اب تم نے کوئی کارروائی کی تب بھی اچھا نہیں ہو گا ہیرا۔''

''ٹھیک ہے پھر، ہمیں جو کرنا ہے ہم کر رہے ہیں، یہ لے۔ اس نے پھر بادبان کی جانب رخ کیا۔ کشتی کی رفتار اب بھی بہت تیز تھی اور اسے کوئی سنبھالنے والا نہیں تھا چنانچہ خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ اب میرے لئے ضروری تھا کہ میں خود بھی اپنے آپ کو عمل میں لاؤں۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بادبان کی جانب دیکھنے لگا۔ میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ یہ بادبان جل جائے اور دوسرے لمحے بادبان سے شعلے ابھرنے لگے۔ بادبان کسی سوکھے ہوئے کاغذ کی طرح جل اٹھا تھا اور اس میں ایک دم آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آگ کے بھڑکتے ہی بادبان کی ساری ہوا نکل گئی اور کشتی کی رفتار سست ہو گئی۔ ہیرا نے میری طرف دیکھا اور پھر خونخوار انداز میں آگے بڑھا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے کر لئے اور آہستہ سے کہا۔

''اب تم جل کر راکھ ہو جاؤ گے ہیرا۔ آگے نہ بڑھنا ورنہ یہی آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی، سوچ لو ہیرا، جو کچھ نقصان تمہیں پہنچایا جا چکا ہے میں اس میں شریک ہونا نہیں چاہتا لیکن اگر تم نے ان لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈالی تو مجبوراً مجھے بھی تمہارے ساتھ بدسلوکی کرنی پڑے گی۔ ہاں اگر تم اپنی شیطانی قوتوں کو میرے خلاف استعمال کرنا چاہو تو کرو اگر ناکام ہو جاؤ تو میری بات مان لینا اور مجھے جوابی کارروائی کے لئے مجبور مت کرنا۔''

وہ مجھے دیکھتا اور اور پھر دفعتاً اس نے اپنے جلے ہوئے کالے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔

''سب مرے کو مارتے ہیں، سب مرے کو مارتے ہیں، جو ظالم ہوتا ہے اس کے لئے کوئی کچھ نہیں کرتا، کوئی کچھ نہیں کرتا۔''

''ہیرا مجھے تم سے ہمدردی ہے، مجھے سچ مچ تم سے ہمدردی ہے، جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا میں اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا لیکن، لیکن اب تم اپنی انتقامی کارروائیوں کا یہ سلسلہ ترک کر دو، تم اپنے آپ کو پرسکون کرو ہیرا، جس دنیا سے تمہارا تعلق ختم ہو چکا ہے اب اس سے یہ تعلق مت رکھو۔''

''تعلق ختم ہو چکا ہے، چتا تک نہ ملی ہمیں، سارا پریوار جلا دیا ہمارا، چتا تک نہ دی پاپیوں نے......''

''میں تمہیں چتا دلوا سکتا ہوں ہیرا، میں تمہیں چتا دلوا سکتا ہوں سمجھے۔ یہ کام بنسی راج کو کرنا ہو گا۔ بنسی راج تم اپنے باغ کی طرف جا رہے ہو نا، پہلا کام تمہارا یہ ہو گا کہ ہیرا کے لئے چتا بناؤ، اس کی چتا جلاؤ۔'' بنسی راج نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں تیار ہوں مہاراج، سچے من سے تیار ہوں، جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے مجھے اس کا بڑا دکھ ہے ہیرا، میرا دل کبھی خوش نہ ہو سکے گا، میری وجہ سے میرے تین بچے مجھ سے چھن گئے، میں تیار ہوں، ہیرا میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔'' بنسی راج

رونے لگا۔ ہیرا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے پتوار سنبھال لئے۔ کشتی کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ سب کے جسموں میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک بدروح کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بنسی راج کی دھرم پتنی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس پر نیم غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ ہرناوتی جو کچھ دیر پہلے ہنس رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے رخساروں پر دو لکیریں چل رہی تھیں۔

کچھ عجیب سی کیفیت تھی، شیطانی روحوں سے واسطہ پڑ چکا تھا مگر یہ پہلا شیطان تھا جو مظلوم تھا۔ کشتی کنارے جا لگی۔ اصل جگہ سے دور نکل آئی تھی۔ بنسی راج کا سونا باغ دور رہ گیا تھا۔ ہیرا خشکی پر کود گیا۔ میری ہدایت پر وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح خشکی پر اتر آئے۔ بنسی راج کی دھرم پتنی سے چلا نہیں جا رہا تھا، میں نے کہا۔ ''اپنا وعدہ پورا کرو بنسی راج۔''

''ہاں، میں تیار ہوں مگر یہاں...... یہاں میں کیا کروں باغ تک جانا ہوگا۔''

''چلو......!'' میں نے کہا۔ سب گرتے پڑتے باغ کی طرف چل پڑے۔ ہیرا چند گز تک ہمارے پیچھے چلا پھر غائب ہو گیا۔ میں نے ہی پلٹ کر دیکھا تھا اور مجھے اس کے غائب ہونے کا علم ہوا تھا مگر میں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ باغ واقعی خوبصورت تھا۔ بیچوں بیچ ایک عمارت بنی ہوئی تھی جس میں باغ کا رکھوالا تیجا رہتا تھا۔ تیجا نے حیرانی سے مالکوں کا استقبال کیا۔ اس وقت بنسی راج کو ہیرا کے موجود نہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔

''گیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے بنسی راج......!''

''اب میں کیا کروں؟''

''چتا تیار کراؤ......'' بنسی نے گردن جھکا دی۔ ہرے بھرے باغ کے ایک گوشے میں لکڑیاں ڈھیر کی جانے لگیں۔ ملازم تیجا کے ساتھ بنسی راج کے دونوں بیٹے اور خود بنسی راج بھی مصروف ہو گئے تھے۔ موٹی اور پتلی لکڑیوں کے انبار کا احاطہ بنا دیا گیا۔ تب میری نگاہ اس درخت کے چوڑے تنے کی طرف اٹھ گئی جس کے قریب وہ سب بیٹھے تھے۔ بوڑھا لاکھو، تین عورتیں، ایک بچہ۔ میں نے بچے کی آواز سنی۔

''بپو...... ارتھی نہیں ہے۔''

''چپ ہو جا پوت، پاپی کے ہاتھ سے چتا ہی مل جائے تو کافی ہے۔'' عقب سے ہیرا بھی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ عورتیں خاموش تھیں، کوئی اجنبی شخص تو اس منظر کو سمجھ بھی نہ پاتا مگر جو شخص بھی ہوتا، وہ ہوش و حواس میں نہیں رہ سکتا تھا۔ بنسی راج کی دھرم پتنی کو اندر عمارت میں بھجوا دیا گیا تھا پھر تیجا نے انہیں دیکھ لیا اور ایک لمحے پہلے میں نے جو سوچا تھا، وہ سامنے آ گیا۔ یقیناً تیجا ان کے بارے میں جانتا ہوگا، اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ بنسی راج اور اس کے بیٹوں نے بھی اب انہیں دیکھ لیا تھا اور بری طرح کانپنے لگے تھے۔

''اپنا کام جاری رکھو بنسی راج، وعدہ پورا نہ ہو سکا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ بنسی راج پہلے سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کرنے لگا تھا مگر اس طرح کہ دہشت سے ان سب کی بری حالت تھی۔ چتا تیار ہو گئی، لکڑیوں کا انبار جمع ہو گیا، بیچ میں جگہ تھی۔

''چلو چاچا...... چلو ماسی چتا تیار ہو گئی۔ سب اندر چلے جاؤ۔'' ہیرا نے کہا اور درخت کے پیچھے بیٹھے اٹھ گئے، کچھ دیر کے بعد وہ لکڑیوں کے ڈھیر کے اندر پوشیدہ ہو گئے۔ ہیرا نے ہرناوتی کو دیکھا، وہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ ہیرا نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ ''ہرنا...... ہرنا......! مگر ہرناوتی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی تب ہیرا آہستہ سے بولا۔

''چلتا ہوں ہرنا دیر ہو رہی ہے، پہلے ہی دیر ہو گئی تھی مگر میں کیا کرتا...... ٹھیک ہے بنسی راج۔ سوچا تو یہ تھا کہ جب تک میں روتا رہوں گا تجھے رلاتا رہوں گا مگر میاں جی بیچ میں آ گئے۔ میاں جی منش کو جیتے جی سنسار میں کچھ ملے یا نہ ملے مگر اس سے اس کی چتا بھی چھین لی جائے تو...... اچھا چلتا ہوں ہرنا چلتا ہوں، بنسی راج...... یہ باغ تیرے بیٹے پورن نے لگایا تھا نا؟''

''ہاں......'' بنسی راج نے کہا۔
''اب یہ تیرا نہیں ہے ہمارا ہے، ان سب کا ہے جو تیرے ہاتھوں مارے گئے، اس کے ایک پیڑ پر اب کوئی پھل نہ لگے گا، کوئی پیڑ ہرا نہ رہے گا، سب سوکھ جائیں گے۔ تو جب بھی نیا سے گزرے گا اسے دیکھے گا اور تجھے اپنا کیا ہوا یاد آ جائے گا۔ دیکھ پتے سوکھنے لگے، شاخیں سلگنے لگیں۔ ساری آتمائیں پہنچ گئی ہیں۔ ہم سب یہاں رہیں گے، منع کر دینا اپنوں کو، کبھی ادھر سے نہ گزریں نہیں تو ہمیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔ تیرے پریوار کا کوئی ادھر سے گزرا تو جیتا نہ جائے گا۔''
وہ منظر میں نے بھی دیکھا۔ درخت پتوں سے خالی ہوتے جا رہے تھے، ان کی شاخیں ٹنڈ منڈ ہونے لگی تھیں۔ لمحوں میں ایسا انوکھا اجاڑ کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ ہرا بھرا باغ منٹوں میں سوکھ گیا تھا۔ یہ سب میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ میں ان ہولناک ناقابل یقین واقعات کا گواہ ہوں۔ ہیرا نے آخری نظر ہرناوتی پر ڈالی اور پھر چتا کی طرف بڑھ گیا۔
''اپنا کام کرو بنسی راج...... اپنا کام۔'' بنسی راج کپکپاتے قدموں سے آگے بڑھا، جیب سے ماچس نکالی اور سوکھی لکڑیوں میں آگ لگا دی۔ آہستہ آہستہ آگ بھڑکنے لگی اور پھر لکڑیوں کا ڈھیر جہنم بن گیا، شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔
''چلو ونود...... چلو راجیش اپنی ماتا جی کو سنبھالو، چلیں یہاں سے مہاراج، ہرنا اٹھو بیٹی!''
''میں...... میں کہاں جاؤں گی بھیا جی، یہ میرا سسرال ہے، میکے میں بہت رہ لی اب تو سسرال میں رہنے دو نا بھیا جی، کوئی کھیل نہیں تھی، میں ہیرا کی پتنی ہوں، اس کے ساتھ پھیرے کئے تھے میں نے، بدائی تو نہ کی تم نے، ستی بھی نہ ہونے دو گے کیا، ارے واہ۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔
''ہرنا...... ہرنا...... نہیں...... نہیں میری بیٹی......!''
''جاؤ جاؤ بھیا، ماتا پتا ہوتے تو وہ نہ کرتے جو تم نے کیا، وہ جہیز میں آگ نہ دیتے بھیا۔ ہونہہ۔'' اس نے کہا اور چتا کی طرف بڑھ گئی۔
''ارے...... ارے ونود...... راجیش۔ پکڑو اسے...... ارے...... ارے......!'' بنسی راج چیخا......!
بنسی رام کے دونوں بیٹے ہرناوتی کی طرف لپکے مگر وہ دوڑتی ہوئی آگ کے حصار میں داخل ہو گئی۔ شعلوں کی خوفناک تپش اتنے فاصلے سے جلائے دے رہی تھی۔ ایسی ہولناک آگ میں کسی کے داخل ہو جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر میں نے یہ منظر بھی دیکھا اور یہ ایسا مرحلہ تھا کہ میں خود بھی کچھ نہیں کر سکا۔ انسانی گوشت کے جلنے کی چراند اٹھی اور معدوم ہو گئی۔ بھڑکتی آگ آن کی آن میں ہرناوتی کو چٹ کر گئی۔
راجیش اور ونود دیکھتے رہ گئے تھے۔ پھر شعلوں کی تپش سے گھبرا کر پیچھے ہٹ آئے۔ بنسی راج بلک بلک کر رو رہا تھا۔
''ہرنا ستی ہو گئی میری ہرنا ستی ہو گئی۔ ہائے رام میری چھوٹی سی بھول نے مجھے کتنوں سے دور کر دیا۔ دوش میرا بھی نہیں تھا۔ یہ اونچ نیچ کا فرق مجھے سکھایا گیا تھا۔ بھگوان کے بنائے سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہ ہم ہی پاپی ہیں جو ان میں فرق کر دیتے ہیں۔ میری بہن جل مری مہاراج، میری بہن جل مری۔'' وہ روتا رہا، میں خاموش کھڑا تھا پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجیش اور ونود کو دیکھا۔ انہیں آواز دی۔ دونوں قریب پہنچے تو اس نے لپک کر انہیں اپنے سینے سے بھینچ لیا۔
''تم بچ گئے، سن رہی ہے تو ہمارے راجیش اور ونود بچ گئے۔ ہمارے کسم اور شردھا بچ گئیں، ہمارے چار بچے بچ گئے۔ مہاراج آپ نے میرے بچوں کو بچا لیا۔'' وہ میرے پیروں پر گرنے لگا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔
''نہیں بنسی راج۔ میرے دین میں یہ حرام ہے۔ ایسا نہ کرو۔''
''آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے مہاراج۔ بہت بڑا احسان کیا ہے۔''
''میں نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کرتا ہے اوپر والا کرتا ہے، وہ کسی کو ذریعہ بنا دیتا ہے۔ تمہارے جتنے بچے دنیا سے چلے گئے انہیں اسی عمر میں جانا تھا۔ ایسے نہ ہوتا تو کچھ اور ہوتا مگر یہ تمہارے لیے سزا تھی۔ ہو سکے تو انسانوں سے محبت کرنا سیکھو بنسی راج۔ اسی میں نجات ہے۔''

''میں اپنے پاپوں کا پرائشچت کرونگا مہاراج۔ چلئے واپس چلیں، جو ہوا بہت ہوگیا۔ چلئے مہاراج۔''
''تمہارا کام ہوگیا بنسی راج۔ اب تم کشتی میں بیٹھ کر واپس جاؤ۔ میری منزل کہیں اور ہے۔''
''نہیں، نہیں مہاراج۔ اب تو میرے باغ میں پھول کھلے ہیں۔ ہم آپ کی سیوا کریں گے۔ ایسے نہ جانے دیں گے آپ کو مہاراج۔''
''نہیں بنسی راج بس اب تم جاؤ'' میں نے کہا۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا مگر میں تیار نہیں ہوا۔ معصوم لوگوں کی آبادی تھی، یہ واقعہ مشہور ہوگا لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر دوڑ پڑیں گے۔ پوجا شروع کردیں گے میری، پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا اور یہ سب کچھ مناسب نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے بنسی راج کو راضی کرسکا تھا۔
''ہم سے کچھ بھی نہ لوگے مہاراج۔'' وہ بولا۔
''جو کچھ مجھے دینا چاہتے ہو خاموشی سے مولوی حمید اللہ کو دے دینا، ان کی دو جوان بیٹیاں ہیں۔ غریب اور مفلس انسان ہیں۔ ان کی بیٹیوں کی شادی کا بوجھ بانٹ لینا۔ سمجھو مجھے سب کچھ مل جائے گا۔''
''بھگوان کی سوگند۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے ان کا بیاہ کروں گا۔ سارا خرچہ اٹھاؤں گا ان کا۔''
''نہیں میرا اسلام کہہ دینا'' وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ جو کچھ ہوا تھا خوب ہوا تھا۔ بہت سے مناظر حیران کن تھے۔ چانک ہرا بھرا باغ سوکھ گیا تھا۔ کسی درخت پر ایک پتا نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ مظلوم روحوں کا انتقام تھا۔ نہ جانے یہ راستہ کس طرف جاتا ہے، کچھ پوچھا نہیں تھا بنسی راج سے مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ زمین کی وسعتوں میں کسی بھی جگہ چلا جاؤں۔ مجھے جانا ہی کہاں ہے۔ حلق میں ایک گولا سا آپھنسا، کچھ یادیں ذہن میں سرسرائیں مگر مجھے اجتناب کرنا تھا۔ ہدایت نہیں ملی تھی اور خود سوچنا بھی گناہ تھا۔ جلدی جلدی وہاں سے دور نکل آیا۔ جب تک چل سکتا تھا چلتا رہا۔ تھک گیا تو بیٹھ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی مگر آس پاس کچھ نہیں تھا۔ ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ عشاء کی نماز پڑھی اور پھر لیٹ گیا۔ فضا میں خنکی سی پھیل گئی تھی جو بڑھتی گئی، کمبل کھول کر اوڑھ لیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کچھ غنودگی سی طاری ہوگئی۔ اسے نیند نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جانا پہچانا سا ماحول نظر آیا۔ غور کرنے لگا کونسی جگہ ہے۔ یاد آگیا یہ وہ جگہ تھی جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ اور جہاں میں نے مہاوتی کو بلی کو طرح انسانی گوشت چباتے دیکھا تھا۔
بالکل وہی جگہ تھی۔ یہاں بھی کالی کا ایک عظیم مجسمہ ایستادہ تھا۔ پھر میں نے مہاوتی کو دیکھا۔ سر پر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیروں کا تاج تھا۔ ایک سمت سادھو شمبھو ناتھ تھا، دوسری طرف کالی داس۔ بڑی شان سے چلتی ہوئی کالی کے مجسمے کی طرف جارہی تھی، اس کے پیچھے بیروں کا مجمع تھا یہ پورنیوں کے بیر تھے۔ کالی کے مجسمے کے قدموں کے پاس کوئی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا نہ جانے کون تھا۔ سر گھٹنوں میں ہونے کی وجہ سے چہرہ نہیں نظر آرہا تھا۔ پھر بیر رک گئے، کالی داس اور شمبھو بھی رک گئے۔ مہاوتی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور کالی کے پیروں کے پاس بیٹھے شخص کے سامنے پہنچ گئی۔ عجیب سا کھیل ہورہا تھا۔ مہاوتی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئی، اس نے مجسمے کے قدموں کو چھو کر ہاتھ ماتھے سے لگائے اور پھر کالی کے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر اپنے ہاتھ میں منتقل کرلیا۔ مگر اس وقت بیر چیخنے لگے۔ اس عظیم الشان غار کے بغلی گوشے سے نارنجی رنگ کا ایک غبار اندر داخل ہورہا تھا جو پہاڑی غار کے ایک سوراخ سے نکل رہا تھا۔ بیر پیچھے ہٹنے لگے اور بہت پیچھے پہنچ گئے، مہاوتی بھی رک کر دیکھنے لگی تھی۔ نارنجی غبار ایک انسانی جسم کی شکل اختیار کرنے لگا اور پھر اس سے جو انسان تشکیل ہوا وہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔ یہ بھوریا چرن تھا، نارنجی رنگ کا جوگیا لبادہ اوڑھے ہوئے، سر پر کوئی چار فٹ اونچا تاج پہنے ہوئے، گردن میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پڑی ہوئی۔ چہرے پر غصے کے آثار تھے۔
''جے شنکھا'' مہاوتی نے خنجر نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔ ''لنگڑی پورنی۔'' بھوریا چرن نے زہریلے لہجے میں کہا اور مہاوتی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے بھوریا چرن کو گھورتے ہوئے کہا۔
''کالی کنڈ میں شنکھا کو عزت دی جارہی ہے، مگر شنکھا کو بھی کالی نواس کے آداب کا خیال رکھنا چاہئے۔''

"کالی چنڈولی اپنی سرحدوں کا خود خیال نہیں کر رہی، بہت آگے بڑھ رہی ہے۔"
"کوئی بھول ہوئی مجھ سے۔"
"بھول ہی بھول...... تو نے شنکھا کی پیٹھ میں خنجر مارے ہیں۔"
"کیسے؟"
"کئی طرح سے نرکھنی، تیرا پیڑھ کیا ہے؟"
"پورنی ہوں۔"
"شرم نہیں آتی تجھے۔ تو نے پورن پاٹھ کیا ہے۔"
"شنکھا تو بڑا ہے تیری شکتی مہان ہے۔ ہم تیرا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر ہمیں ہماری بھول بتا۔"
"چھ پورنیاں تیری ہیں۔ ساتویں کہاں ہے۔"
"تو جانتا ہے؟"
"ہاں میں جانتا ہوں۔ میں نے یہ پورنیاں ایک مسلمان کو دان کی تھیں۔ میرا اس کا پرانا معاملہ تھا۔ میں اس کا دھرم بھرشٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دھرم کا سیوک ہے۔ میں نے اس کا خون بدل کر اسے پورنا بنایا اور تو نے وہ خون نچوڑ کر اسے پھر سے پوتر کر دیا۔"
"تو اسے لے گیا تھا شنکھا مجھے یاد ہے۔"
"کچھ نہ بگاڑ سکا اس کا میں۔ تیری وجہ سے اس کی پوترتا اسے واپس مل گئی۔"
"کیا وہ بہت بڑا گیانی ہے۔"
"تھا نہیں، تیری وجہ سے بن گیا ہے۔ ایک پورنی اس نے خود ماردی چھ کو اور مارنا چاہتا تھا مگر برسوں لگ جاتے اسے۔ تو نے اس کا برسوں کا کام لمحوں میں کر دیا اور اسے اپنے دھرم کی شکتی مل گئی۔"
"شنکھا سے بڑی شکتی؟"
"وہ تو تجھے پتہ چل جائے گا۔"
"مجھے جو پتہ چلے گا وہ میں دیکھ لوں گی شنکھا۔ مگر تیرے میرے بیچ کوئی بات نہ ہو تو اچھا ہے۔"
"کالی کنڈ میں جیون بتا دے گی کیا۔ باہر نہ آئے گی اس سے۔ شنکھا سے مقابلہ کرے گی۔"
"بھول کر بھی کہیں سوچ سکتی مگر تو برابر میرا اپمان کر رہا ہے۔ میرے بیر اسے اچھا نہیں سمجھ رہے۔" مہاوتی نے کہا۔
"تیرے بیر...... میرے بیروں کو دیکھنا ہے۔ نہیں دیکھا تو دیکھ لے۔" بھوریا چرن نے پیلے کپڑے کی ایک جھولی میں ہاتھ ڈال کر ماش کی مٹی بھر دال نکالی اور اسے زمین پر دے مارا۔ مہاوتی نے زمین پر بکھرے ہوئے دال کے دانوں کو دیکھا جو پھولتے جا رہے تھے اور پھر ہر دانے سے پیلے رنگ کی ایک مکڑی نکل آئی۔ پہلے وہ ننھی سی ہوتی پھر ایک دم بڑی ہونے لگتی یہاں تک کہ چھالی کے دانے برابر ہو جاتی۔ دانے دور تک بکھر گئے تھے اور اسی مناسبت سے مکڑیاں اس علاقے میں پھیل گئی تھیں۔ سب سے پہلے شمبھو اور کالی داس اچھل اچھل کر اونچی جگہوں پر چڑھ گئے۔

مہاوتی کے چہرے پر عجیب سے آثار نظر آ رہے تھے۔ بھوریا چرن نے اور دال نکالی اور پہلے کے سے انداز میں زمین پر پھینک دی، مکڑیوں کا پورا کھیت اُگ گیا، بڑی مکڑیوں نے وہاں موجود ہر چیز چاٹنا شروع کر دی تھی۔ پورنیوں کے بیر بدحواس ہونے لگے تھے، وہ بے چینی سے ادھر ادھر دوڑنے لگے، مکڑیاں ان پر بھی چڑھنے لگیں اور وہ ناچ ناچ کر انہیں جھاڑنے لگے، ادھر بکھری ہوئی مکڑیوں نے وہاں صفایا شروع کر دیا تھا۔ دفعتاً شمبھو ناتھ چیخا۔
"شما کر دے شنکھا۔ شما کر دے دھن پوریا۔ تجھے دیوی کی سوگندھ۔ تجھے پاٹھک دیوتا کا واسطہ شما کر دے۔ مہاوتی شما مانگ لے شنکھا سے ہم اس کے آگے کچھ نہ کر سکیں گے۔"

''میں نے کب ایسی بات کہی شمبھو ناتھ جی، شنکھا مہان ہے اسے کون نہیں مانتا۔''
''شما مانگ لے شنکھا سے۔ جے جگدمبے جے مہانی۔ شما کردے شنکھا شما کردے۔'' شمبھو چیخا!
''شما کردے مکڑ...... تیرے بیر شکتی مان ہیں۔'' مہاوتی نے کہا اور بھوریا چرن اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ سیدھے کر کے ادھر ادھر کئے اور مکڑیاں غائب ہو گئیں۔
''تیرے بیر تیرے ایمان کو اچھا نہیں سمجھ رہے تھے تو کچھ کر کیوں نہ کر سکے مہاوتی۔'' بھوریا چرن نے کہا۔
''شنکھا گرو ہے۔ جو جانتا ہے وہی جانتا ہے۔'' مہاوتی نے کہا۔
''بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے تجھے۔''
''شنکھا کے سامنے نہیں۔ ہاں شنکھا کے بل پر ہو سکتا ہے۔'' مہاوتی نے اچانک چولا بدل لیا۔ وہ دلکش انداز میں مسکرانے لگی۔ مکار شنکھا ہنسنے لگا۔ اس نے شمبھو اور کالی داس کو دیکھا اور بولا۔
''سسری کھونڈی ہے نری۔ ایک دم کھونڈی۔ چار منتر سیکھ لیے، کالی کھان بن گئی۔ اسے سمجھاؤ کالی سنتھو ہے۔ کالی سنتھال ہے۔ اس کے انت پاتال سے گہرے ہیں، یہ چار منتر کالی کھان نہیں بنا دیتے، جیون بھر کالی پاٹھ کرے گی تھوڑا رہے گا۔ پگلی چنڈولی تریا چرتر دکھا رہی ہے شنکھا کو۔ مسکرا کر لبھا رہی ہے۔ اسے جس نے سات اپسرائیں دان کر دیں ایک انجانے کو۔ وہ اپسرائیں جو مہاراج اندر کی سبھا میں ستاروں کی طرح جگمگاتی ہیں، ہونہہ لنگڑی پورنی۔''
''شنکھا مہان ہے۔'' مہاوتی سنبھل کر بولی۔
''تو نے اس مسلے کو اس کی دھرم شکتی دیدی جو ہم نے بڑی مشکل سے چھینی تھی اور اب وہ گیانی بن گیا ہے۔ اس کے ہاتھوں ہماری پیڑھ کو جو نقصان پہنچے گا اس کا ذمہ کون لے گا؟''
''مجھے پتہ نہیں تھا مہاراج۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے۔''
''لال تلیا کا ماتھ مار دیا اس نے۔ ایک کرودھی پریوار کو بھسم کر دیا، اگنی ٹیں، ورنہ وہ سنسار میں خوب کام کرتے۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔''
''تم اسے کتوں کی طرح گھسیٹتے لے گئے تھے مہاراج، مار کیوں نہ دیا تم نے اسے؟''
''تو مار دینا چنڈولی۔ آئے گا وہ تیرے پاس بھولے گا نہیں تجھے۔'' بھوریا چرن طنزیہ لہجے میں بولا۔ پھر کالی کے قدموں میں بیٹھے نوجوان سے بولا۔
''تیرا کیا خیال ہے اے چھورا۔ ہوش ٹھکانے آئے تیرے۔ اٹھ کھڑا ہو۔'' وہ شخص جو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا تھا پھر اس کے چہرے پر وحشت ابھر آئی۔
''میں کہاں ہوں؟'' اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔
''ابھی تو اسی سنسار میں ہے۔ ہم کچھ دیر نہ آتے تو چنڈولی کے پیٹ میں ہوتا۔ اب کیا کہتا ہے؟''
''یہ...... یہ سب کیا ہے۔ اوہ مہاوتی مہارانی جی۔''
''اسے اسے کیوں جگا دیا مہاراج۔ یہ کالی دان ہے۔ میں اسے کالی کو بھینٹ دے رہی ہوں۔'' مہاوتی نے بے چینی سے کہا۔
''تیرا ستیاناس ہو۔ سارے کام وہ کر رہی ہے جو میرے نقصان کے ہوں۔''
''سمجھی نہیں مہاراج؟ اسے کالی بھینٹ دینے دو۔ یہ میرے کام کا ہے۔'' مہاوتی بولی۔
''تجھ سے پہلے یہ میرے کام کا تھا، سمجھی۔ یہ اماوس کی رات پیدا ہوا ہے اور پاکل ہے۔''
''یہی میرے سنکٹ کو دور کر سکتا ہے۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے پایا ہے مہاراج۔'' مہاوتی عاجزی سے بولی۔
''کھونڈی ہے نری کھونڈی، حرامخور۔ اری باؤلی میرے پاس سے بھاگا ہوا ہے اور یہ چھپتا پھر رہا تھا کمینہ کہیں کا۔ جانتی

ہے وہ جو ایک بیکار سا لڑکا تھا اور میں نے اسے اس کی مرضی سے پیر پھاگن کے مزار پر بھیجنا چاہا اور وہ نہ گیا اس وقت سے میرا شکار ہے، مگر میری ضد نے اسے گیانی بنا دیا۔ وہی لڑکا جو تیرے پاس سے میں لے گیا تھا۔ اگر سسرا مجھے پیر پھگنوا دوار پہنچا دیتا تو کھنڈولہ بن گیا تھا میں، سنترا کے سترہویں گیان کو جانتی ہے، نام بھی نہ سنا ہوگا تو نے تو چنڈولی۔ ہم پابند ہوتے ہیں شنکھا کی حد سے نکل کر کھنڈولہ بننے کے لیئے۔ سنترا کے سترہویں پاٹھ کے اور اس میں پہلا آدمی ہی ہوتا ہے جو آخری آدمی ہوتا ہے اور اس کے بعد اگر کام نہ ہو تو شنکھا شکتی بھی چلی جاتی ہے۔ بڑا پچھ کیا ہم نے اس سسرے کا اور ہماری ہی وجہ سے وہ اپنا دھرم گیانی بن گیا، بڑی مشکل سے ہم نے اس کا توڑ نکالا اور یہ چھوکروا تلاش کیا، جو اماوس کا پائل ہے، مگر یہ سسرے مسلمان چھوکرے، پتہ نہیں ان کے کان میں کیا بھر دیا جاتا ہے، کبھی کام کے نہیں نکلتے۔ یہ بھاگ آیا اور چھپتا چھپاتا تیرے پاس پہنچ گیا مگر سسرا آ کاش سے گرا کھجور میں اٹکا۔ تیرے ہی پاس مرنا تھا اسے، تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں، جو کچھ تجھے بتایا ہے ہم نے کان کھول کر سن لے وہ سسرا تیرے ہاتھ لگے تو جس طرح بھی ہو سکے اس سے اس کا گیان چھین لینا، اس میں تیری نجات ہے، آئے گا وہ تیرے پاس...... ضرور آئے گا۔ میں اسے لے جا رہا ہوں، یہ میرے کام کا ہے۔" مہاوتی سخت بے چین نظر آنے لگی، اس نے خونی نگاہوں سے اپنے بیروں کو دیکھا، پھر بے بسی سے شمبھو اور کالی داس کو...... سب نے گردنیں جھکالی تھیں۔

بے بس نوجوان جس کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی، سہمی ہوئی نظروں سے اس سارے ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ جب بھوریا چرن نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

"نہیں...... نہیں میں نہیں جاؤں گا...... نہیں جاؤں گا، میں اس خبیث روح کے ساتھ۔"

"بھوریا چرن نے اس کے بازو کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔"

"گیدڑ کی اولاد، بھاگ کر شہر ہی میں آیا نہ، اتنی جلدی مرنے کی کیوں سوچ ہے، ہم نہ آتے تو اس نے خنجر تو اٹھا ہی لیا تھا، گردن کاٹ کر بلی دیتی تیری اور اس کے بعد ماس کھا جاتی۔ گیا تھا بیٹا اس سنسار سے، اری او چنڈول، ہم جھوٹ بولے ہیں کیا!"

مہاوتی تند نگاہوں سے بھوریا چرن کو دیکھ رہی تھی۔ نوجوان لڑکا سہمے سہمے انداز میں بھوریا چرن کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور اس کے بعد اچانک ہی جیسے آنکھ کھل گئی۔ میں نے آہستہ سے کمبل چہرے سے ہٹایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہی ماحول تھا، وہی جگہ تھی جہاں میں تھک کر آرام کرنے لیٹ گیا تھا، آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے گردش کر رہے تھے۔ اور تاریک رات تاحد نظر پھیلی ہوئی تھی، دل پر ایک عجیب سی بے چینی طاری ہوگئی، سوچ کی وسعتیں بڑھ گئیں، مجھے میری دوسری منزل کا احساس دلایا گیا تھا مجھے میرے آئندہ قدم کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ سب مختلف انداز سے میرے کانوں تک پہنچا تھا جو مجھے سوچنا چاہئے تھا۔ ایک منصب عطا کیا گیا تھا، مجھے ایک ذمہ داری دی گئی تھی، اور بتایا گیا تھا کہ اپنی زندگی کو کس انداز سے آگے لے جانا ہے، جو قوتیں عطا کی گئی ہیں
انہیں کہاں استعمال کرنا ہے، کون کون سے فرائض جو پورے کرنے ہیں، نجانے کیوں راجہ چندر بھان کو بھول گیا تھا، نجانے کیوں مہاوتی کے باغ میں جگہ جگہ نصب وہ بے شمار مجسمے ذہن سے نکل گئے تھے جو مہاوتی کے کالے جادو کا شکار تھے، ان سب کی مدد تو مجھ پر قرض تھی اور مجھے خود ہی ان کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ ساری تھکن دور ہوگئی، یا دور نہ ہوئی تھی تو فرض کے احساس نے چستی عطا کر دی تھی، رکنا نہیں چاہئے بلکہ فرض کی ادائیگی کے لیے چلتے رہنا ضروری ہے، کچھ سوچے سمجھے بغیر، کوئی تعین کئے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ انسانی آبادیوں کی تلاش تھی۔ رہنمائی کے لئے کوئی ذی روح درکار تھا اور اب اس وقت تک نہ رکنا تھا جب تک نشان منزل نہ مل جائے، آسمان پر تیرتے ہوئے کالے بادلوں کے ٹکڑے آپس میں جڑ گئے اور گھٹا ٹوپ تاریکیاں چھا گئیں۔ پھر کچھ ننھی ننھی بوندوں نے پیشانی، آنکھ اور ناک پر اپنی موجودگی کا احساس دلا کر

خوف زدہ کرنا چاہا لیکن جو احسان کیا گیا تھا مجھ پر اس کا فرض یہی تھا کہ سب کچھ بھول جاؤں، چلتا رہوں، بارش شروع ہو گئی۔ تیز ہوا کے ساتھ آئی تھی اور موسم بہت سرد ہو گیا تھا۔ ہوا کے تھپیڑے بھیگے بدن میں سوراخ کر رہے تھے مگر وہ بدن کسی اور کا تھا میرا کیا تھا جو میں سوچتا۔ میرا ذہن تو اس جگہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں مہاوتی رہتی تھی، سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ چندر بھان، وہ بولتے مجسمے جو مظلومیت کا نشان تھے، انہیں اس جادوگرنی سے نجات دلائی تھی۔ وہ عورت کالے جادو کی لٹیا، غلیظ روحوں کی ملکہ، کالی دیوی کی پجارن تھی اور اپنے جادو کی قوتیں بڑھانا چاہتی تھی۔ بھوریا چرن ملعون نے جو ناپاک خون میرے جسم میں داخل کر دیا تھا، مہاوتی کے ذریعے مجھے اس سے نجات مل گئی تھی۔ پورنیاں اس کے قبضے میں چلی گئی تھیں اور میں آزاد ہو گیا تھا۔ صحیح معنوں میں اب بھوریا چرن کے زوال کا آغاز ہوا تھا، مگر وہ نوجوان لڑکا کون تھا جسے وہ عورت پکڑ لائی تھی اور بھوریا چرن...... جسے اپنے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ آہ کیا وہ لڑکا مسلمان ہے۔ کیا اب اس کے ذریعہ وہ پیر پھاگن کے مزار مقدس کو ناپاک کرنا چاہتا ہے۔ نہیں یہ نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا نہیں ہوگا کسی قیمت پر نہیں ہوگا۔ دیکھوں گا تجھے مردود بھوریا چرن۔ میرے دانت بھنچ گئے۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' کسی نے مجھے مخاطب کیا اور میں چونک پڑا۔ میں نے اسے دیکھا اور پھر حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ پوری آبادی تھی بڑے بڑے مکانات نظر آ رہے تھے، دن نکل چکا تھا، نجانے کب رات ختم ہوئی، نجانے کب بارش بند ہوئی، کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں بھائی میں نے تو کچھ نہیں کہا۔'' میں بولا، وہ شخص عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''کچھ کہا تھا آپ نے۔''

''خود سے باتیں کر رہا تھا۔''

''آپ کے کپڑے بری طرح بھیگے ہوئے ہیں، کہیں پانی میں گر پڑے تھے؟''

''ایں...... یہاں بارش نہیں ہوئی۔''

''بارش! اس موسم میں؟ یہ بارشوں کا موسم کہاں ہے۔''

''ایں...... ہاں...... شاید۔'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ مجھے واقعی کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن بارش ہوئی تھی، میرے بھیگے ہوئے کپڑے اس کا ثبوت تھے۔ اس شخص کے چہرے پر ایسے آثار نظر آئے جیسے وہ مجھے خبط الحواس سمجھ رہا ہو۔ وہ جانے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔ ''سنو بھائی! یہ کونسا شہر ہے بتا سکتے ہو؟''

''ہمیں نہیں معلوم۔'' اس نے جواب دیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے پریشانی نہیں تھی پتہ چل ہی جائے گا۔ دیر تک آبادی میں چلتا رہا کپڑے بدن پر ہی سوکھ گئے تھے۔ ایک مسلمان نان بائی کی دکان نظر آئی تو اس میں داخل ہو گیا۔ نا وقت پہنچا تھا اس لئے گاہک نہیں تھے۔ نانبائی سے کھانا طلب کیا تو اس نے گردن ہلا دی۔

''کتنی روٹیاں لگا دوں میاں صاحب؟''

''دو کافی ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ نانبائی نے پہلے تندور میں دو روٹیاں پکائیں پھر سالن وغیرہ نکال کر دے دیا۔ ''میاں بھٹنڈہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''کوئی ستر کوس دور ہوگا میاں صاحب۔ کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''جانا ہے وہاں۔''

''کب جا رہے ہو۔''

''بس جلدی، ہو سکتا ہے آج ہی چلا جاؤں۔''

''پرون پور میں ہی رہتے ہو۔''

''نہیں باہر سے آیا ہوں۔''

''میاں صاحب میرا ایک رقعہ لے جاؤ گے وہاں، میری بیٹی وہیں بیاہی ہے اس کے میاں کو دے دینا۔''

''آپ دے دیجئے، دیدوں گا۔''

''تم روٹی کھاؤ، لڑکی سے کہہ دوں ذرا لکھ دے گی۔ تم ہاتھ کے ہاتھ دے دو گے۔ ڈاک سے تو کئی دن لگ جاتے ہیں۔ نانبائی اندر چلا گیا اور دو منٹ کے بعد واپس آ گیا اب وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آ رہا تھا۔ اپنے خاندانی معاملات بتاتا رہا کہنے لگا۔ ''میرا بڑا بھائی شروع سے وہیں رہتا ہے اسی کے لونڈے سے بیاہ ہوا ہے میری بیٹی تھا۔''

''آپ بھی جاتے رہتے ہوں گے وہاں تو؟''

''لو گھر آنگن ہے ہمارا تو۔ دو چار مہینے میں چکر لگ جاتا ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''راجہ چندر بھان ہوتے تھے وہاں۔''

''ہاں رہتے تھے۔ میاں ان راجوں مہاراجوں کی کیا پوچھو ہو۔ بس عیاشیوں میں سب کچھ کھو بیٹھے۔ چندر بھان نے تو حد ہی کر دی۔ ایک ڈائن گھر میں ڈال لی ہے۔ بڑی کہانیاں سنی ہیں اس کی تو۔ سارا بھٹنڈا خوف سے کانپے ہے ان کے نام سے۔'' نانبائی بہت سے انکشافات کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے رقعہ دے دیا۔ کھانے کے پیسے اس نے بڑی مشکل سے لیے، مجھے مکمل رہنمائی حاصل ہو گئی۔ پرون پور سے ریل میں بیٹھا اور بھٹنڈا پہنچ گیا، مہاوتی کا شہر آ گیا تھا۔ نانبائی کا گھر تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ عارضی ٹھکانہ درکار تھا جو ان پر اخلاق لوگوں کے پاس مل گیا، بس ایک خط لایا تھا مگر اتنی مہمان نوازی کی انہوں نے کہ شرمندہ ہو گیا۔ رات انہی کے ہاں گزاری، اور پھر رات کو حسب ہدایت درود شریف پڑھ کر کمبل اوڑھ لیا۔ مہاوتی کا محل دیکھا۔ باغ کے مجسموں کو دیکھا۔ مہاوتی محل میں نہیں نظر آئی، کالی داس موجود تھا۔ محل پر خاموشی طاری تھی۔ اس جگہ پر غور کیا جہاں مہاوتی نے کالی نواس بنا رکھا تھا۔ مگر اس کا پتہ نہیں چل سکا، البتہ ذہن نے کہا۔ ہر کام سہل نہیں ہوتا جستجو اور عمل قائم نہ رہے تو وجود ناکارہ ہو جاتا ہے، عمل لازم ہے جواب ملا تھا، گرہ میں باندھ لیا اور اس کے بعد عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ آغاز محل ہی سے کرنا تھا۔ دوسرے دن حلیہ درست کیا اور میزبانوں سے اجازت لے کر چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد محل کے دروازے پر تھا۔ دربانوں نے کڑی نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ''دیوان کالی داس سے ملنا۔''

''کیا کام ہے؟''

''بہت ضروری کام ہے۔ تم انہیں خبر کر دو۔''

''ہمیں ہدایت ہے کہ محل میں کسی نئے آدمی کو نہ آنے دیں۔ خبر کرنا بیکار ہے۔''

''مگر مجھے بہت ضروری کام ہے۔''

''شما کر دو بھائی ہم وہ کر سکتے ہیں جو ہم سے کہا گیا ہے۔'' دربانوں سے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سندری نظر آ گئی۔ سامنے سے گزر رہی تھی مجھے دیکھ کر رک گئی اور پھر جلدی سے میرے پاس آئی۔

''آپ مہاراج آپ......؟''

''سندری یہ مجھے اندر آنے سے منع کر رہے ہیں۔''

''ارے ناسمجھی رام جی آنے دیں انہیں یہ تو مہادیدی کے خاص آدمی ہیں۔'' سندری نے کہا۔

✦✤✦✤✦

''آیئے مہاراج آیئے!''

میں سندری کے ساتھ محل میں داخل ہو گیا، کچھ دور چلنے کے بعد اچانک اس نے راستہ بدل دیا۔ ''ادھر سے آجایئے مہاراج۔ سیدھے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ آیئے ادھر سے آجایئے میں ٹھٹکا پھر بڑھ گیا۔'' یہ باندیوں کا علاقہ ہے۔ میں یہیں رہتی ہوں۔ جلدی آجایئے کوئی دیکھ نہ لے۔''

''مگر سندری......!'' میں نے تعجب سے کہا۔

''اندر چل کر باتیں کریں گے جی۔ وہ سامنے ہی تو میرا ٹھکانہ ہے۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ اب جی بھر کر باتیں کریں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔

''تم یہاں رہتی ہو؟''

''زیادہ تو محل میں رہتی ہوں۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو یہاں آجاتی ہوں۔ مہادیوی تو ان دنوں یہاں نہیں ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''پتہ نہیں شاید کالی نواس میں ہوں۔''

''کالی نواس کہاں ہے سندری؟''

''سوگند لے لیں مجھے نہیں معلوم۔ بس اس دن اس کے غار کا دروازہ دیکھا تھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دن یاد کرتی ہوں مہاراج تو جان نکل جاتی ہے میری، اگر تم نہ ہوتے تو میرا کیا ہوتا۔

''سندری مجھے کچھ بتاؤ گی تم؟''

''پتہ ہوگا تو ضرور بتاؤں گی۔''

''وہ سب کیا تھا سندری۔ مہاوتی آخر ہے کیا؟''

''تم نے پہلے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ ہم باندیاں ہیں مہاراج اسی محل میں پیدا ہوئے، اسی میں جوان ہوئے اور اسی میں مرجائیں گے، پر ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوگا۔ جو کہا جاتا ہے کرتے ہیں، تم نے ہم پر دیا کی تھی اس دن، ورنہ نہ جانے کیا ہوتا، ہمیں نہ تو پہلے پتہ تھا نہ اب پتہ ہے۔ مہاوتی جی نے جیسا کہا ویسا کیا۔'' سندری بولی اور پھر اس نے جلدی سے زبان دانتوں میں دبالی اور خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی، میں اس کے اس انداز پر چونک پڑا۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ میرے اس طرح دیکھنے سے وہ اور گھبرا گئی۔ بولی، ''ہم نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی مہاراج۔''

''ہاں سندری میرا خیال ہے تو سچ بول گئی ہے۔ میں زہریلے لہجے میں بولا۔

''کونسا سا؟'' وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

''اس نے سچ ہی کہا ہے مہاراج۔ دوسرا سچ میں آپ کے سامنے کہوں گا۔'' دروازے سے آواز سنائی دی اور میں نے اس طرف دیکھا، دیوان کالی داس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سندری کو اشارہ کیا اور وہ احترام سے واپس نکل گئی۔ کالی داس اندر آ گیا تھا۔ اس نے سچ کہا ہے مہاراج، جیسا دیوی نے کہا اس نے ویسا ہی کیا۔ پہلے ہم نے کچھ اور سوچا تھا مگر شمبھو مہاراج نے ایک دم خیال بدل دیا۔ آپ مسعود جی مہاراج ہیں نا۔''

''تم لوگ مجھے بھول گئے کالی داس؟''

''بھلا بھول سکتے ہیں۔ آپ بھوریا چند کو بھی جانتے ہیں، شوشنکھا کو۔ سب کچھ جانتے ہیں آپ۔ اس نے کہا تھا آپ آرہے ہیں۔ مہادیوی نے پہرے لگا دیئے، پھر انہوں نے سوچا کہ سندری کے ہاتھوں آپ کو بیہوش کرا دیں اور قید کرلیں، مگر ابھی ابھی مہادیوی نے کچھ اور سندیس بھیجا ہے میرے پاس۔'' کالی داس نے کہا۔ میں دلچسپ نظروں سے کالی داس کو دیکھتا رہا، مجھے علم تھا کہ بھوریا چرن اور مہاوتی کے درمیان کیا باتیں ہوئی ہیں۔ ''سندیس آپ کے لئے بھی ہے مہاراج۔'' وہ پھر بولا۔

''بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''انھیں...... میرے ساتھ چلیں یہ پہرے آپ کی وجہ سے لگائے گئے تھے مگر نیا سندیس کچھ اور ہے۔''

''مہاوتی بہت پریشان معلوم ہوتی ہے شاید۔ چلو اب کہاں چلنا ہے اور وہ خود کہاں چھپی ہے۔''

''مہادیوی آپ سے بھینٹ کریں گی۔ اوش کریں گی اور جہاں تک ان کی پریشانی کا تعلق ہے تو آپ کا یہ خیال غلط ہے، وہ پریشان کیوں ہوں گی۔ آپ کو ان کی شکتی کا اندازہ نہیں ہے، جیون بتا دیا ہے انہوں نے گیان دھیان میں۔''

میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھے پرانی حویلی کی طرف ہی لے جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہاں اس

نے اپنی جادونگری بنا رکھی ہے لیکن مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ کالی داس کے ساتھ میں پرانی حویلی میں داخل ہوگیا۔ میں نے پرانی حویلی پوری کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس بار کالی داس مجھے اس کے بالکل عقبی حصے میں لے گیا۔ میں نے اس جگہ کو جادونگری غلط نہیں کہا تھا۔ ایک ویران اور سنسان برآمدہ تھا جس میں ایک بند دروازہ نظر آ رہا تھا، کالی داس نے وہ بند دروازہ کھولا اور مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اندر داخل ہوگیا لیکن اندر قدم رکھتے ہی دل و دماغ معطر ہوگئے۔ یہ سچ مچ جادونگری تھی۔ سبز رنگ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایک وسیع و عریض باغ نظر آ رہا تھا، لیکن سو فیصد مصنوعی باغ تھا۔ انتہائی اونچے درخت جن کی شاخیں اور پتے اوپر جا کر ایک دوسرے میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ آسمان کا نام ونشان نہیں نظر آتا تھا، گویا ایک چھت بنی ہوئی تھی اور سب کچھ اس چھت کے نیچے تھا۔ انگوروں کی بیلیں ان میں جھولتے سیاہ اور سبز انگوروں کے خوشے۔ خوش رنگ پھول، چہچہاتی چڑیاں اور دوسرے ننھے پرندے، جگہ جگہ فوارے، بعض جگہوں پر فواروں کے گرد بنی ہوئی بینچوں پر حسین لڑکیاں بیٹھی ہوئی۔ سب میری طرف نگراں، آنکھوں میں شوخی اور لگاوٹ لئے ہوئے، کالی داس میری رہنمائی کرتا ہوا اس باغ میں بنی ایک عمارت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ”مہاوتی آپ کا انتظار کر رہی ہیں مہاراج۔“

دروازے سے اندر قدم رکھا۔ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوئی بارہ سیڑھیاں تھیں اور ایک گول سا کمرہ، جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔ دیواریں بھی سفید پتھر ہی سے بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک سنگھاسن تھا جس پر مہاوتی نیم دراز تھی۔ شمبھو ناتھ اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ یہاں کوئی نہ تھا۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور مہاوتی نے مجھے دیکھ کر پاؤں سکوڑ لیے۔ شمبھو ناتھ تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا اور مہاوتی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں استقبالیہ تاثرات تھے اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً وہ میری آمد پر خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھی اور یہ یقیناً مفاہمت کی ایک کوشش تھی، میں تھوڑا سا اور قریب پہنچا تو اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر دلآویز انداز میں گردن جھکائی اور پھر سیدھی ہو کر بولی۔

”مہاوتی، مہاراج کا سواگت کرتی ہے۔ آیئے سنگھاسن پر پدھاریے مہاراج، ایک شکتی مان، دوسرے شکتی مان کو جو احترام دے سکتا ہے وہ اس وقت میرے من میں آپ کیلئے ہے۔ پدھاریے مہاراج، مجھے خوشی ہوگی۔“ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں مہاوتی، کالے جادو کی یہ تخلیق میرے دین میں حرام ہوتی ہے اور ایسی کسی چیز کو بغیر کسی مجبوری کے چھونا میرے لیے مناسب نہیں ہے، میں ان ناپاک چیزوں کو اپنی کسی آسائش کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔“ مہاوتی کی مسکراہٹ سکڑ گئی، لیکن فوراً ہی اس نے ان الفاظ کے ردعمل کو زائل کرتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر بتایئے مسعود جی مہاراج، میں آپ کا سواگت کیسے کروں؟“

”میں یہاں کھڑا ہوا ہوں مہاوتی، بس اتنا ہی کافی ہے۔“

”تو پھر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ سنگھاسن میرے لیے ہے، اسے بیچ سے ہٹا دینا ہی اچھا ہوگا۔“ اس نے مڑ کر انتہائی خوبصورت سنگھاسن کو دیکھا اور دوسرے لمحے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ مہاوتی پھر میری جانب متوجہ ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ”مسعود جی مہاراج، بہت سی باتیں بڑے سے بڑے گیانی کی سمجھ میں نہیں آتیں، آپ ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے میرے سامنے تھے، جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، لیکن آپ کا گیان چیخ چیخ کر مجھے بتا رہا تھا کہ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔ اب اگر میں آپ سے کوئی بات چھپاؤں تو اسے میں اپنی بیوقوفی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ مسعود جی، مہاراج کو ایک نظر دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ پورنا ہیں اور پورنیاں ان کے بس میں ہیں، پورن بھگت ہمارے گیان میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔ مہاراج، پر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسلمان کے نام سے ایک کاروباری شخص کا نوکر میرے پاس کیوں آیا ہے۔ ساری باتوں کا اعتراف کر رہی ہوں مہاراج۔ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کی اصلیت کیا ہے اور اسی لیے میں نے آپ کو روک لیا تھا، پر نہ تو میں سمجھ سکی نہ میرا بیر کالی داس اور نہ ہی مہاراج شمبھو ناتھ کہ آپ کی اصل کیا ہے اور بات بعد میں

سمجھ میں آئی، مہاراج کہ اصل میں آپ ہندو نہیں تھے بلکہ آپ کا گیان وہ تھا جو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا، مگر پھر پورنیا میرا من للچا گیا، کیونکہ میں نے یہ دیکھا تھا کہ پورنیا ہونے کے باوجود آپ نہ تو پورنیوں کو اپنی آغوش میں جگہ دیتے ہیں اور نہ ہی پورن بیروں کو کوئی کام سونپتے ہیں، ہم سب بڑے پریشان رہے آپ کے لیے مہاراج۔ انہونی بات تھی جو کسی طرح سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔ بھید جاننے کے لیے ہم سارے کے سارے بے چین ہو گئے، مگر کوئی پتہ نہیں چل سکا اور جب ہمارا یہ کام ایسے نہیں ہوا تو شمبھو ناتھ مہاراج نے دوسرے کھیل کھیلنا چاہے۔ اس سے آپ کو تکلیف پہنچی مسعود جی، پر انسان ہوس کا پتلا ہوتا ہے۔ پورنیاں معمولی چیز نہیں ہوتیں اور جسے یہ مل جائیں وہ بڑا شکتی مان بن جاتا ہے، آدھا جیون بھنگ کرنے کے بعد بھی پورنیوں کا حصول ممکن نہیں ہوتا، مہاراج یہ بات میں آپ سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کی بڑی قدر کرتی ہوں، بہت بڑا درجہ ہے آپ کے لیے میرے من میں اور اگر آپ اسے یہ سمجھیں کہ اپنے کیے پر پچھتا رہی ہوں میں کہ وہ نہ کرتی جو میں نے کیا، بلکہ دوسری طرح آپ سے اپنی منوکامنا پوری کراتی، مہاراج آپ نے اپنی خوشی سے وہ گندی پورنیاں جو آپ کے دھرم میں گندی سمجھی جاتی ہیں، میرے حوالے کر دیں اور ان کا طریقہ وہی تھا جو میں نے اختیار کیا اور کوئی ایسا کام نہیں ہو سکتا تھا، جس سے پورنیاں مجھے مل جائیں، پرنت مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ خود ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور انہیں زبردستی آپ پر سوار کر دیا گیا تھا اور جب پورنیوں سے آپ کو چھٹکارا ملا، مہاراج تو آپ نے اپنے گیان کا پاٹ شروع کر دیا اور آپ کو وہ ساری چیزیں مل گئیں جو ایک بڑے گیانی کو ملتی ہیں۔ ایک طرح سے تو مہاراج میں نے آپ کے ساتھ دوستی ہی کی اور اگر ایسی بات ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اتنا بڑا گیانی، مہاوتی کو دوست کی نگاہ سے دیکھے۔ کیا مہاراج میرے من کی بات سمجھ کر میری دوستی قبول کر لیں گے؟" میں نے مسکراتی نگاہوں سے مہاوتی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"مہاوتی، جہاں تک تیری دوستی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اول تو ہم دونوں کے دین الگ ہیں اور پھر تو، تو اپنے ہی دھرم کی نہیں ہے، ہندو دھرم میں بھی کالے جادو کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ تمہارے دیوی دیوتاؤں کا بھی یہ درس نہیں ہے کہ کالی قوتوں کو انسانوں کے خلاف استعمال کرو، میرا تو مسئلہ ہی بالکل مختلف ہے۔ بہر حال میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، مگر ایک کام تجھے کرنا ہوگا اور اگر تو یہ کام کر دے تو مجھے تجھ سے کوئی دشمنی نہ رہے گی۔"

"ہاں ہاں مہاراج کہو، ٹھیک ہے تم مجھے اپنا دوست نہیں بنا سکتے، داسی تو بنا سکتے ہو، حکم تو دے سکتے ہو مجھے۔"

"اپنے جادو کو خاک کر دے مہاوتی، کیونکہ تیرا یہ جادو انسان دشمنی ہے اور مجھ پر لازم ہے کہ میں انسانوں کو تیرے جادو کے چنگل سے نجات دلاؤں جو زندگی کی مصیبتوں کا شکار ہیں اور جنہیں تو نے عذاب میں گرفتار کر لیا ہے، جیسے پتھر کے وہ مجسمے جو جیتے جاگتے نوجوان تھے اور تیری ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے، جیسے تیرا شوہر راجہ چندر بھان، سب کو ان کا مقام دے دے اور خود جا کر ایسے ویرانوں میں اپنا مسکن بنا لے جہاں انسان نہ ہو، کالی قوت کے کالے شیطانوں کو ویرانوں ہی میں رہنا چاہیے تاکہ انسان ان کے عذاب سے محفوظ رہیں، اگر تو ایسا کرے گی مہاوتی، تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور میری تیری کوئی ایسی نہیں رہے گی جس سے میرے ہاتھوں تجھے کوئی نقصان پہنچے۔" مہاوتی کے چہرے پر رنگ آ رہے تھے جا رہے تھے، اب اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں غصے کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "کیا یہ دشمنی نہیں ہے مسعود جی مہاراج؟"

"کالے جادو سے دشمنی ہے، تیری ذات سے نہیں مہاوتی، مجھے تجھ سے کیا لینا دینا۔"

"میں چنڈولی ہوں، کالی ماتا کی پجارن اور کالی ماتا نے میرے جیون بھر کی تپسیا میں مجھے یہ شکتی دان دی ہے اور تم کہتے ہو مسعود جی مہاراج کہ میں اس شکتی کو بھسم کر دوں، ارے اگر یہ شکتی بھسم ہو جائے گی تو میں کہاں رہوں گی، میں تو بس ایک شکتی ہوں، اس سے آگے کچھ نہیں۔"

"میرے لیے تیری کالی قوتوں کا خاتمہ ضروری ہے مہاوتی۔"

"ارے واہ، خوامخواہ داروغہ بنے پھر رہے ہو، تم اپنے دھرم کی شکتی آزماؤ، میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی،

مجھے میرے دھرم کی شکتی پر رہنے دو۔"
"تیرا دھرم کیا ہے مہاوتی؟" میں نے سوال کیا۔
"جے مہا کالی کلکتہ والی......"
"جادوگرنی، انسان کو نقصان پہنچانے والی۔"
"سارے کے سارے تمہارے دھرم کے تو نہیں ہیں۔ تمہیں شہر کا اندیشہ کیوں ہے، مسعود جی مہاراج؟"
"میرا دین یہی کہتا ہے کہ اپنی طاقت کو بدی کی طاقت کے خلاف استعمال کرنا ضروری ہے اور اگر انسانوں کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے اور تمہیں اللہ نے وہ قوت دی ہے کہ تم نقصان پہنچانے والے کو روک سکو تو تم پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ تم نقصان پہنچانے والے کو نقصان پہنچاؤ۔"
"دیکھو مسعود جی مہاراج، بھوریا چرن کو جانتے ہو گے اور کیوں نہ جانتے ہو گے اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے، وہ شنکھا ہے، تم اس کی شکتی کا سامنا کیوں نہیں کرتے، ایک چنڈولی کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا دھرم، تمہارا گیان سب سے بڑا ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں تم سے ٹکر نہیں لینا چاہتی لیکن جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سیدھا سادہ دشمنی کی علامت ہے اور جب دشمنی ہے تو میرے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنی دشمنی کا اظہار کروں، دوست نہیں مانتے تو پھر تو دشمنی ہی ہو گی۔"
"ہاں مہاوتی تو نے ٹھیک کہا۔ میں نے تجھے دوستی کی ایک پیشکش کی کہ اپنی ساری قوتوں کو اپنے ہاتھوں سے فنا کر دے، انسان ہے تو انسان کے روپ میں آجا، ایسا نہ کرے گی تو تجھے مٹانا میرا فرض ہے۔"
"چھوڑو چھوڑو میاں جی، ہم نے بھی جیون بھر چنے نہیں بھونے ہیں، ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو تم اپنی شکتی آزماؤ اور ہم اپنی۔" مہاوتی نے دونوں ہاتھ دونوں سمت پھیلا دیئے اور اچانک ہی ایک حیران کن واقعہ رونما ہو گیا۔ سنگ مرمر کی سفید دیواروں میں سیکڑوں سوراخ نمودار ہو گئے اور ان سوراخوں سے پانی کی تیز دھاریں نیچے گرنے لگیں۔ دروازے کی سیڑھیاں ایک دم غائب ہو گئی تھیں اور اب یہ جگہ سنگ مرمر کے ایک کنویں کی حیثیت رکھتی تھی، جو تقریباً بارہ فٹ گہرا تھا اور پانی ان دیواروں سے اس طرح نکل رہا تھا جیسے کسی دریا کا رخ ان کی جانب موڑ دیا گیا ہو، دیکھتے ہی دیکھتے اس حوض میں پانی بھرنے لگا، میں نے کالے جادو کی قوت کا یہ حیران کن کرشمہ دیکھا۔ ویسے تو زندگی میں نجانے کن کن واقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ پانی ٹخنوں سے گزر کر گھٹنوں، گھٹنوں سے گزر کر رانوں اور پھر کمر تک پہنچ گیا اور دفعتاً ہی میں نے مہاوتی کو ایک مچھلی کی صورت اختیار کرتے ہوئے دیکھا کہ چہرہ تو اس کا اپنا ہی رہا تھا لیکن گردن کے بعد سے اس کا بدن مچھلی کی شکل اختیار کر گیا اور وہ اس پانی میں تیرنے لگی، برق رفتاری سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر میرے اردگرد چکرا رہی تھی، حالانکہ پانی کی طاقتور دھاریں میرے جسم پر پڑ رہی تھیں اور ان کی قوت اتنی تھی کہ میرا بدن بمشکل تمام اپنا توازن قائم کئے ہوئے تھا لیکن چونکہ یہ دھاریں چاروں طرف سے پڑ رہی تھیں، اس لئے میں کسی ایک سمت نہیں لڑھکا تھا، دوسرے شمبھو ناتھ نے بھی اپنا روپ بدلا اور سبز رنگ کے ایک چیتے سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا، ایسے سانپ عموماً پانی میں نظر آتے ہیں، ناگوں کا یہ پجاری ناگ بن گیا تھا اور ان دونوں نے اس پانی میں اپنے لیے مقام حاصل کر لیا تھا، لیکن میں ظاہر ہے انسان تھا اور انسانی شکل میں ہی رہ سکتا تھا۔ البتہ ایک تصور دماغ میں ضرور تھا، میرا رب میرا معبود میری مدد ضرور کرے گا۔ میں کالے جادو کا توڑ نہیں جانتا تھا لیکن میرے معبود نے مشکل ترین لمحات میں میری مدد کی تھی اور اس وقت بھی میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں تھا، چنانچہ پوری خود اعتمادی سے اپنی جگہ جما رہا۔ کمبل میں نے شانے سے اتار کر سر پر رکھ لیا تھا تاکہ وہ پانی میں بھیگ نہ جائے۔ مہاوتی کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی اور بوڑھا شمبھو سانپ کی شکل میں خود کو محفوظ رکھے ہوئے تھا۔ پانی گرنے کی آوازیں سماعت شکن تھیں اور ماحول دھواں دھار ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ میری کمر سے گزر کر شانوں تک اور پھر وہاں سے گردن تک آچکا تھا اور بس کچھ لمحات باقی تھی کہ وہ سر سے اونچا

ہوجائے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پانی کی سطح کو بلند ہوتا محسوس کرتا رہا۔

پانی کے تھپیڑے میرے قدم اکھاڑے دے رہے تھے لیکن دل کو کسی خوف کا احساس نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اب مجھے یہ قوت عطا فرما دی تھی کہ ہر خوف میرے دل سے نکل گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کائنات میں آنکھ کھولنے والے ہر نومولود کے بارے میں ہم کچھ اور کہہ سکتے ہوں یا نہ کہہ سکتے ہوں، یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر یہ ایک دن مر جائے گا۔ موت برحق ہے اور اس کا تعین کرنے والا حق ہے اور حق سے انحراف کیسا......! آنکھیں اس لئے بند کرلی تھیں کہ ذہن کسی تدبیر کے جھگڑے میں نہ پڑ جائے اور قدرت سے انحراف نہ ہو۔

اچانک شور تھم گیا اور سناٹے چیخنے لگے۔ آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ سامنے مہاوتی تھی جو بے چینی سے اچانک رک جانے والے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا مچھلی کا بدن پانی میں جنبش کررہا تھا۔ دفعتاً فرش میں ایک بڑا سوراخ نمودار ہوگیا اور پانی دہشتناک آواز کے ساتھ اس سوراخ میں داخل ہونے لگا۔ مہاوتی نے ایک بھیانک چیخ ماری اور کم ہوتے ہوئے پانی میں ایک سوراخ کی طرف لپکی۔ ایک دم اس کا بدن لمبی چمکدار لکیر کی شکل اختیار کرگیا اور یہ لکیر تڑپ کر ایک سوراخ میں داخل ہوگئی لیکن شمبھو ناتھ جو سانپ کی شکل میں تھا اور پانی میں مزے سے تیرتا پھر رہا تھا، اس جیسی پھرتی نہ دکھا سکا حالانکہ اس کا پتلا بدن زیادہ آسانی سے ان لاتعداد سوراخوں میں سے کسی ایک سوراخ میں داخل ہوسکتا تھا۔ شاید وہ صورتحال نہیں سمجھ سکا تھا۔ پانی اس برق رفتاری سے سوراخ میں غائب ہوا کہ چند لمحوں میں زمین صاف ہوگئی۔ سوراخ چونکہ بلندی پر تھے اس لئے شمبھو ان تک نہ پہنچ سکا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں بار بار چکنی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتا رہا مگر ہر بار پھسل کر نیچے گر جاتا۔ پھر آخری کوشش کے طور پر وہ میری طرف لپکا لیکن مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ تب میں نے آگے قدم بڑھائے اور جھک کر اسے پھن سے پکڑ لیا۔ شمبھو میری کلائی سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے پہلی بار قریب سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سانپ کے بدن کی مناسبت سے چھوٹا ضرور ہوگیا تھا لیکن اصل تھا۔ وہ بری طرح خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ پھر اس کی باریک سی آواز ابھری۔ ''جے ہو تیری مہاتما! مجھے چھوڑ دے۔ چھوڑ دے میاں! چھوڑ دے مجھے، میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ میں تو سنتھا ہاری ہوں۔ مجھے چھوڑ دے ولی! مجھے چھوڑ دے۔''

''ایک ہی مقصد ہے میرا شمبھو ناتھ! مہاوتی کا جادو ختم کردوں۔ اس نے جتنے لوگوں کو اپنے سحر میں گرفتار کیا ہے، انہیں آزادی دلا دوں۔ نہ میری تجھ سے کوئی دشمنی ہے نہ کسی اور سے!''

''وہ تو چنڈال ہے، کالی دیوی کی سنتھیا! مشکل سے ختم ہوگی۔ پر میں آتما ہوں، مجھے چھوڑ دے!''

''کہاں بھاگ گئی وہ......؟''

''میں نہیں جانتا، مجھے نہیں معلوم! ہوسکتا ہے کالی کنڈ چلی گئی ہو۔ اس کا کالا جادو تجھ پر اثر نہیں کرسکا۔ ڈر کر بھاگی ہے تجھ سے! اس کے تو ہزار ٹھکانے ہیں دھرتی پر، تجھ سے نہ بچ سکی تو پاتال میں چلی جائے گی۔ مارے تو ہم گئے! چھوڑ دے ہمیں، چھوڑ دے۔'' شمبھو باریک آواز میں چیختا رہا۔

''مجھے کالی کنڈ کا راستہ بتا شمبھو! مجھے وہاں لے چل۔''

''وہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔''

''ادھر میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

''مر گئے دیوا سنتھ! ہم تو مر گئے۔ ہائے! اب ہم کیا کریں؟'' میں نے اس دروازے کی طرف رخ کیا جس سے گزر کر یہاں آیا تھا۔ باہر کالی داس موجود نہیں تھا۔ ''کالی داس کہاں گیا؟''

''وہ الگ کہاں ہے مہاوتی سے! وہ تو اس کا تھوک ہے، اس کا گند ہے۔ ساتھ ہی ہوگا اس کے!'' شمبھو نے بتایا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس خوبصورت ماحول کا شائبہ بھی نہیں تھا جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا جبکہ یہ اسی ٹوٹی حویلی کی ایک اجاڑ راہداری تھی جو سخت گندی پڑی تھی۔ درختوں کے پتے، کوڑا کرکٹ اور اس پر دوڑتے ہوئے چوہے......! جو کچھ پہلے

دیکھا، وہ فریب نظر تھا۔ یہ اس جگہ کی اصل تھی۔ راہداری کا دوسرا سرا حویلی کے باہر نکلتا تھا۔ میں باہر نکل آیا۔

''ہاں شمبھو ناتھ......! کدھر چلنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سیدھے چلتے رہو مہاراج!'' اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ شمبھو میری گرفت میں تھا۔ اس نے گھٹی ہوئی باریک آواز میں کہا۔ ''مہاراج! میری گردن چھوڑ دیں تو میں انسان کی جون میں آجاؤں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کالی نواس میں لے جاؤں گا۔''

''نہیں شمبھو ناتھ! سانپ پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔''

''میری گردن تو ڈھیلی کر دیں، دم گھٹ کر ہی مر جاؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم ایسے نہیں مرتے۔ میں اس وقت تک تمہیں اسی طرح جکڑے رہوں گا جب تک کالی نواس میرے سامنے نہیں آجائے گا۔''

''سیدھے ہاتھ مڑ جاؤ۔'' اس نے مردہ لہجے میں کہا اور میں نے رخ بدل دیا۔ بھٹنڈہ کے بارے میں مجھے معلومات نہیں تھیں لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، وہ غلط نہیں تھا۔ کچھ جانی پہچانی جگہیں نظر آنے لگیں اور میں انہیں پہچانتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی جہاں میں نے خود کو دیکھا تھا۔ سامنے ہی اس غار کا دہانہ نظر آرہا تھا جہاں میں پہلے بھی آچکا تھا۔ اندر داخل ہوا تو گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ شمبھو نے مردہ آواز میں کہا۔ ''مہاراج! بچھو۔'' میں ایک دم رک گیا۔ میری آنکھوں نے زمین پر انتہائی ننھی ننھی سرخ چنگاریاں متحرک دیکھیں۔ پھر آنکھیں تاریکی کی عادی ہوئیں تو میں نے دو انچ کے بچھو دیکھے جو اپنا کالا ڈنک اٹھائے میری طرف لپک رہے تھے۔ ننھی سرخ چنگاریوں جیسی ان کی آنکھیں تھیں۔ اتنے قریب آگئے تھے وہ کہ ان سے بچنا مشکل تھا۔ میں نے بادل ناخواستہ کندھے سے کمبل اتار کر ان کی طرف لہرایا۔ اس وقت میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہوا کے جھونکوں سے ڈر کر وہ دور ہٹ جائیں لیکن نتیجہ کچھ اور ہی نکلا۔ ہوا کے جھونکے انہیں چھونے لگے اور وہ ساکت ہوگئے۔ ان کے ڈنک نیچے جھک گئے جو ان کی موت کی علامت تھے۔

''مر گئے۔'' شمبھو کے منہ سے نکلا۔

''یہ بچھو پہلے تو نہیں تھے؟'' میں نے کہا۔

''ہم سے کچھ نہ پوچھو مہاراج! یہ کالے بچھو ہیں۔ پتھر پر ڈنک ماریں تو پانی بن جائے ہے۔'' شمبھو نے کہا۔ میں بچھوؤں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھا تو ایک اور دہانہ نظر آیا جس کے دوسری طرف روشنی تھی۔ یہ وہی دہانہ تھا جس میں، میں نے مہاوتی کو خونخوار بلی کے روپ میں دیکھا تھا۔ جونہی میں نے دہانے سے اندر قدم رکھا، اچانک تیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ لاتعداد پتھر نیچے گرے۔ پتھر کیا چٹانیں تھیں جن میں سے کچھ براہ راست میرے جسم پر گری تھیں۔ بس یوں لگا جیسے روئی کے گولے ہوں لیکن یہ گولے نیچے گر کر ریزہ ریزہ ہوگئے اور مٹی کا بادل بلند ہوگیا۔ قدم رک گئے اور میں اس وقت تک ساکت کھڑا رہا جب تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگیا۔ اب مجھے اندازہ ہوگیا کہ مہاوتی اندر موجود ہے اور اپنا جادو آزما رہی ہے۔ میں نے ماحول صاف ہونے کے بعد اندر نگاہ ڈالی۔ آگ کی لکیریں کھنچ رہی تھیں۔ سائیں سائیں کی آوازوں کے ساتھ یہ لکیریں ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر کوئی کالی شے نظر آرہی تھی۔ پھر وہ واضح ہوگئی۔ مہاوتی تھی لیکن نہایت بھیانک شکل ہو رہی تھی اس کی...... کوئلے جیسی سیاہ آنکھیں، گہرے سرخ ہونٹ مڑے ہوئے تھے۔

''آ گیا تو پاپی مسلے......؟ ہار نہیں مانوں گی تجھ سے، ہار نہیں مانوں گی۔ پیس کر رکھ دوں گی۔ کچا چبا جاؤں گی، کچا کھا جاؤں گی تجھے!'' اس کی زبان باہر نکل آئی۔ ایک فٹ دو فٹ اور پھر تین فٹ! آنکھیں بھیانک انداز میں پھیلنے لگیں، بدن پر بال جھولنے لگے۔ وہ بھیانک بلا کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اتنی ہولناک چنگھاڑ منہ سے نکالی کہ پورا غار لرز کر رہ گیا۔ اس چنگھاڑ کے ساتھ ہی وہ فضا میں بلند ہوئی اور دوڑتی ہوئی مجھ پر آئی۔ میں نے فوراً درود پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ چمگادڑ کی طرح مجھ پر سے پرواز کر گئی۔ کچھ دور جا کر وہ پھر پلٹی۔ میں نے رخ بدل کر اس پر پھونک ماری اور یوں لگا جیسے

اس کا پرواز کرتا ہوا بدن کسی ٹھوس دیوار سے ٹکرایا ہو۔ دھماکے کے ساتھ چیخ کی آواز سنائی دی اور وہ نیچے گر پڑی لیکن نیچے گر کر وہ لوٹتی ہوئی دور چلی گئی اور اس کا جسم پتھر ہوتا گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے کالی ناگن کی شکل اختیار کر لی اور اس کے منہ سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے ایک خوفناک پھنکار ماری اور اچانک میری کلائی سے لپٹے شمبھو ناتھ کے بل کھلنے لگے۔ میرا ورد بدستور جاری تھا۔ شمبھو میری مٹھی میں جکڑا ہوا، اب نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور مہاوتی مسلسل پھنکاریں مار رہی تھی۔ اچانک میں نے غار کے کونوں کھدروں سے بے شمار پھنکاریں سنیں۔ کالے رنگ کے لاتعداد سانپ بے چینی سے پھنکارتے ہوئے باہر نکلے تھے اور پھر وہ مجھ پر لپکے تھے۔ میں نے ان پر پھونک ماری اور جدھر رخ کر کے میں نے پھونک ماری تھی، وہاں سانپ ساکت ہو گئے۔ ان کے جسم لمبے لمبے ہو گئے تھے لیکن چونکہ سانپ چاروں طرف سے لہراتے ہوئے آ رہے تھے اس لئے مجھے چاروں طرف کا خیال رکھنا تھا۔ میں نے شمبھو ناتھ کو دوسرے سانپوں پر اچھالا اور پھر بدستور درود شریف پڑھتے ہوئے کمبل دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر لہرانے لگا۔ مہاوتی کی پھنکاریں بھیانک ہو گئیں۔ کمبل لہراتے ہوئے سانپ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے کچھ دیر یہ عمل جاری رکھا۔ پھر اس کا نتیجہ دیکھنے کیلئے رکا۔ نتیجہ خاطر خواہ تھا۔ تمام سانپ مردہ پڑے تھے۔ ان میں شمبھو ناتھ بھی تھا مگر ایک تبدیلی بھی ہوئی تھی۔ مہاوتی کا ناگن کا روپ بدل گیا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک انتہائی بوڑھی چڑیل بیٹھی ہوئی تھی جس کے سر کے بال برف کی طرح سفید اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے کی جھریاں اتنی تھیں کہ اصل خدوخال چھپ گئے تھے۔ سارے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر نسوں کا جال ابھرا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً وہ اس کا اصل روپ تھا۔ وہ اس عمر کی عورت تھی اور اس نے کالے جادو کے عمل سے یہ دلکشی اور جوانی حاصل کر رکھی تھی۔ اس کا سر دائرے کی شکل میں گھوم رہا تھا، آنکھیں چڑھی اچانک اس کے منہ سے گہرا گاڑھا سیاہ خون ابل پڑا لیکن اس کا سر بدستور اسی طرح دائرے کی شکل میں گھومتا رہا جس کی وجہ سے خون دور دور تک اچھلنے لگا۔ میں نے کمبل احترام سے سمیٹ لیا مگر درود پاک اسی طرح پڑھتا رہا۔ آہستہ آہستہ مہاوتی کے سر گھومنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب اس کے منہ سے ایک مسلسل بھیانک آواز بھی بلند ہونے لگی تھی۔ پھر اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس کا بدن اذیت سے مڑنے تڑنے لگا۔ اس کے بعد وہ ساکت ہو گئی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ یقیناً وہ مر چکی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور غار میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینے لگا۔ مردہ سانپ ہوا میں تحلیل ہونے لگے تھے۔ نہ جانے کیا کیا الابلا موجود تھیں، وہ سمٹتی جا رہی تھیں اور پھر وہاں خالی غار کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مہاوتی اپنے جادو سمیت فنا ہو چکی ہے۔ دل مسرت سے سرشار ہو گیا۔ کسی راہ کا تعین کئے بغیر چل پڑا۔ دل میں آرزو تھی کہ مہاوتی کے محل جاؤں۔ سمت درست ہی نکلی۔ تھوڑی دیر کے بعد آبادی نظر آ گئی اور آبادی تلاش کرنے کے بعد محل تلاش کرنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن محل سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ کسی غیر معمولی بات کا احساس ہو گیا۔ اندر بھاگ دوڑ ہو رہی تھی، پہریدار مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے باہر ہی روک دیا گیا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''اندر بھائی......!''

''نہیں جا سکتے۔''

''ضروری کام ہے۔''

''کہہ تو دیا نہیں جا سکتے۔ مہاراج چندر بھان نے منع کرا دیا ہے۔''

''کہاں ہیں مہاراج چندر بھان......؟''

''اندر ہیں اور کہاں ہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ وہ تو کہیں گئے ہوئے تھے؟''

''واپس آ گئے ہیں۔''

''تم نے خود دیکھا ہے انہیں......؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں تو کیا ہم اندھے ہیں؟''

''اچھا بھائی! سندری کو تو بلا سکتے ہو؟ میں اس سے دو باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔''

''عجیب ڈھیٹ آدمی ہو۔ اس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' پہریدار نے آنکھیں بگاڑیں تو میں وہاں سے ہٹ آیا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں ان سنگی مجسموں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ محل سے کچھ فاصلے پر دھونی رمالی...... اور وہاں سے جائزہ لیتا رہا۔ افراتفری نظر آ رہی تھی۔ پھر کچھ لوگوں کو باہر نکلتے دیکھا۔ نوجوان تھے، تباہ حال تھے، بدحواسی سے باہر نکلے تھے۔ بڑی مشکل سے ان میں سے ایک کو روک سکا۔ ''سنو بھائی......!'' میں نے روکا اور وہ سہم کر رک گیا۔ ''کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے!''

''کیا......؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تم محل سے آ رہے ہو؟''

''ایں......!'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ پھر بولا۔ ''ہاں! وہیں سے آ رہا ہوں۔''

''کیا مہاراجہ چندر بھان محل میں آ گئے ہیں؟''

''اس مہان پرش نے ہی تو ہمیں نجات دلائی ہے۔'' نوجوان بے اختیار بولا۔

''تم پتھر کے بت بنے ہوئے تھے نا......؟'' میں نے کہا۔

''ارے ساری باتیں جانتے ہو تو ہمیں کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اپنا فرض پورا کرنا چاہتا تھا۔ یہ میری ذمہ داری تھی جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہاں دو دن رکا۔ محل کے سامنے ہی بسیرا کیا اور معلومات حاصل کرتا رہا۔ پھر دوسرے دن سندری نظر آ گئی۔ محل کے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔ وہ اپنا نام سن کر رک گئی۔ مجھے دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ بولی۔ ''مہاراج! آپ......؟''

''سندری! تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو......!''

''چندر بھان محل میں آ گئے؟''

''ہاں! انہوں نے چڑیل مہاوتی کو مار دیا، اس کا جادو توڑ دیا، سارے پتھر کے بت انسان بن کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب پرانا محل کھدوا کر پھنکوا دیا جائے گا۔ باغ اجاڑ کر دوسرا لگایا جائے گا۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''اور کوئی کام ہے ہم سے مہاراج......؟''

''نہیں سندری! تمہارا شکریہ!'' میں نے کہا اور سندری آگے بڑھ گئی۔ تصدیق ہو گئی۔ کام ختم ہو گیا۔ اب چندر بھان سے ملنا ضروری نہیں تھا چنانچہ میں نے وہاں سے باہر جانے کی ٹھانی اور بھٹنڈہ سے باہر جانے والے راستے پر پیدل چل پڑا۔ مہاوتی کی جادوگری میری آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ جادو کی بھی ایک دنیا ہے۔ ساری چیزوں کا تعلق شیطان سے ہے۔ اس ملعون نے بھی اپنا ایک نظام قائم رکھا ہے۔ متعدد انساوں کو بھٹکا کر انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کیلئے اس نے اپنی ضروریات کو شیطانی قوتوں سے آراستہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے کلام الٰہی کی برکت اور اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے سامنے شیطنیت فنا ہو جاتی ہے اور بالآخر انسانیت کو اس سے نجات مل جاتی ہے۔ شیطانی قوتیں حاصل کرنے والے دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے کیلئے غلاظت کی آخری حدود کو چھو لیتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ انسان تو فطرتاً بہت نفیس ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طاقت حصول کی کوششیں اور طاقت کا نشہ اسے فطرت سے بہت دور لا پھینکتا ہے اور وہ اسی میں اپنے آپ کو مکمل سمجھ لیتا ہے۔ پتا نہیں ایسے لوگوں کی اندرونی کیفیات کیا ہوں۔ سوچوں کے دائرے پھیلتے گئے اور میں ماضی میں پہنچ گیا۔ درحقیقت صرف ایک احمقانہ سوچ، صرف ایک غلطی ساری زندگی کا غم بن جاتی ہے۔ میں اگر اپنے والد اور ماموں کی طرح عام انسانوں کی مانند اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا تو آج زندگی سے اتنا دور نہ ہٹ گیا ہوتا۔ کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائی تھیں، کیا کیا صدمے نہیں برداشت کئے تھے۔ صرف ایک میری غلطی نے کیسے کیسے زندہ درگور نہیں کر دیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ فطرت

کے بنائے ہوئے اصولوں سے ہٹ جاؤں اور محنت کئے بغیر دولت حاصل کرلوں۔ یہی جذبہ تو تھا جو مجھے کالا جادو سیکھنے پر مجبور کر رہا تھا اس وقت اور کم بخت بھوریا چرن مل گیا تھا۔ محنت کے بغیر جو کچھ بھی حاصل ہو جائے، وہ گندے علوم سے ہی ہو سکتا ہے۔ خیالات کے ہجوم نے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ کتنا فاصلہ طے کرلیا ہے اور جب ہوش کی دنیا میں واپس آیا تو چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی اور مجھے سفر کرتے ہوئے کتنے ہی گھنٹے گزر چکے تھے۔ تا حد نگاہ ویرانی، سناٹا، درخت، جھاڑیاں، پتھر، کچی زمین......!

میں آبادی سے بہت دور نکل آیا تھا لیکن اب اس کا کوئی افسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے ایک بے منزل کیلئے ہر جگہ جہاں پاؤں تھک جائیں، منزل ہی ہوتی ہے۔ ایک صاف ستھری جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں پہلی دفعہ تھکن کا احساس ہوا تھا۔ کھانے پینے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ کمبل احترام سے سرہانے رکھا اور لیٹ گیا۔

نیند آ گئی تھی اور سوتا رہا تھا۔ غالباً اس وقت رات کے چار ساڑھے چار بجے ہوں گے جب آنکھ کھل گئی۔ چونکہ جلدی سو گیا تھا اس لئے نیند پوری ہو گئی۔ وضو کیلئے پانی موجود نہیں تھا اس لئے تیمم کیا اور دوزانو ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہو گیا اور اس کے بعد سورج نکلنے تک اسی طرح مصروف رہا تھا۔ پھر آگے کے سفر کی ٹھانی اور دوبارہ چل پڑا۔ بہت دور نکلنے کے بعد جھاڑیوں میں خربوزے جیسی کوئی چیز نظر آئی۔ یہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ ان میں جو خوشنما پھل لگے ہوئے تھے، انہیں کھایا جا سکتا تھا۔ وہ کیا تھے، کیسے تھے، یہ اللہ جانے لیکن میری شکم سیری کیلئے بہت کافی ثابت ہوئے تھے۔ بس دو پھلوں نے پیاس بھی بجھا دی تھی اور پیٹ کی آگ بھی! سوا اس سے زیادہ کچھ نہ لیا۔ جس نے اس ویران سفر میں ان جھاڑیوں میں میرے لئے پھل اگائے تھے، وہ آگے چل کر بھی کہیں سے مجھے رزق عطا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی فکر کرنا بے سود تھا۔ اس کے بعد شام ڈھلے جب سورج کی نارنجی کرنیں زمین پر ایک عجیب سی اداسی بکھیر رہی تھیں، مجھے ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر نظر آیا۔

◆✤◆✤◆

آبادی اس کے اطراف میں بھی نہیں تھی بلکہ دور دور تک نہیں تھی لیکن یونہی قدم اس کھنڈر کی جانب اٹھ گئے۔ نجانے کون سی جگہ ہے۔ کبھی یہاں کچھ ہوگا، اب کچھ نہیں تھا۔ لال رنگ کی اینٹوں کے ڈھیر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ بہت سی جگہیں صاف بھی تھیں۔ قریب پہنچ کر اندازہ ہوا کہ مسجد جیسی کوئی جگہ ہے اور یقینی طور پر انسانوں کے استعمال میں رہتی ہے۔ درخت اُگے ہوئے تھے اور ایک وسیع و عریض چبوترے پر درختوں کے بے شمار سوکھے پتے اڑتے پھر رہے تھے اور ان سے سرسراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے ہی منبر بنا ہوا تھا۔ اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ کوئی قدیم مسجد ہے۔ پھر دوسرے لوازمات بھی نظر آ گئے۔ ایک جانب گہرا کنواں تھا۔ اس کے کنارے چرخی لگی ہوئی تھی اور چرخی پر رسی لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ قریب ہی چمڑے کا ایک ڈول رکھا ہوا تھا۔ دیکھ کر تقویت ہوئی یقیناً آس پاس کوئی بستی موجود ہے۔ رات کی تاریکی میں جب روشنیاں ہوں گی تو بستی نظر آ جائے گی لیکن مجھے کسی بستی سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ دل میں کچھ خیالات جاگے۔ کنوئیں کے نزدیک پہنچا اور جھک کر کنوئیں میں جھانکنے لگا۔ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن رسی کا ڈھیر بتاتا تھا کہ کنواں کافی گہرا ہے۔ بہرطور ڈول پانی میں ڈالا اور اس کے بعد تھوڑا سا پانی نکال لیا۔ سامنے ہی ایک ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں نمازیوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مٹی کے لوٹے قطار سے رکھے ہوئے تھے۔ بس جی میں سما گئی۔ بہت سا پانی نکالا اور اس جگہ کو بھر دیا۔ لوٹے دھو کر قرینے سے رکھے اور اس کے بعد صحن کی مسجد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جھاڑو موجود نہیں تھی۔ بڑے بڑے تنکے سمیٹے اور انہیں اپنی قمیض کے دامن سے ایک دھجی پھاڑ کر باندھا پھر صحن مسجد سے سوکھے ہوئے پتے صاف کرنے میں مصروف ہو گیا اور اس کام میں سورج بالکل چھپ گیا۔ مسجد کا فرش صاف ہو چکا تھا۔ پتے سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر دیئے تھے۔ کچھ ایسا سکون ملا اس کام میں کہ ذہن بھی بٹ گیا اور دل بھی مسرور رہا۔

پھر اچانک ہی مسجد کی چھت کی بلندیوں پر سے اللہ اکبر کی صدا ابھری اور پہلی ہی آواز پر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں نے کسی کو مسجد کی جانب آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں ویسے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اگر مؤذن مسجد ہی کے کسی حصے

میں رہتا ہوگا تو کم از کم مجھے اس کی آہٹیں تو سنائی دینی چاہئے تھیں۔
اذان کہی گئی لیکن اس کے بعد بھی میں دیر تک مؤذن کے بلندی سے اترنے کا انتظار کرتا رہا لیکن مؤذن کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دی۔ وضو کیا اور ابھی وضو سے فراغت ہی ہوئی تھی کہ مجھے انسانوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے نمازیوں کو چبوترے پر چڑھ کر آتے ہوئے دیکھا اور اطمینان ہوگیا کہ جو کچھ میں نے کیا، وہ میرا مناسب فرض تھا۔ صفیں درست ہونے لگیں، لوگ بیٹھ گئے۔ وہ آپس میں مدھم مدھم گفتگو کررہے تھے۔ میں نے سوچا کہ نماز کے بعد کسی سے قریب کی بستی کے بارے میں پوچھوں گا اور اگر بستی زیادہ دور نہیں ہوئی تو وہیں چلا جاؤں گا۔ کچھ دیر کے بعد نماز شروع ہوگئی اور امام صاحب منبر کے سامنے کھڑے ہوگئے، صفیں بندھ گئیں اور نماز شروع ہوگئی۔ نماز سے فراغت ہوئی اور نمازی واپس جانے لگے۔ میں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے لگا جس سے بستی کے بارے میں معلوم کروں۔ اسی وقت عقب سے آواز ابھری۔

''مسعود میاں......!'' میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہاں کون ہے جو میرا شناسا ہے۔ سفید لباس میں ملبوس ایک نورانی شخصیت مجھے مخاطب کررہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا اور میں آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''انہیں متوجہ نہ کرو......!'' بزرگ نے کہا۔

''میں کسی سے......!'' میں نے کہنا چاہا اور انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''ہاں...... ہاں علم ہے......لیکن آبادی بہت دور ہے۔''

''جی!'' میں ششدر رہ گیا۔ میں نے زبان سے پوری بات بھی نہیں ادا کی تھی اور وہ سمجھ گئے تھے۔

''نمازیوں کو چلا جانے دو پھر بات کریں گے۔ آؤ ادھر آجاؤ۔'' اس ہستی نے اشارہ کیا اور میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مجھے مسجد کے شرقی گوشے میں لے آئے۔ یہاں پتھر کی ایک صاف ستھری چوکی نظر آئی۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں پتھر کی سل پر بیٹھ گیا۔ بزرگ میرے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ ''ہمارا نام جلال حسین ہے۔''

''آپ مجھے جانتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں! جانتے ہیں۔''

''مگر میں پہلے آپ سے نہیں ملا۔''

''بہت سے لوگ، بہت سے لوگوں سے نہیں ملتے۔''

''پھر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''میاں! یہ بات ہمارے سینے میں رہنے دو۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے ادب سے کہا۔ نمازی ایک ایک مسجد سے باہر نکل گئے۔ میں انہیں دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے فرمایا تھا کہ آبادی بہت دور ہے؟''

''انسانوں کی آبادی یہاں سے ساٹھ ستر کوس ہے۔''

''مگر یہ نمازی......؟''

''یہ دوسرے بندۂ خدا ہیں۔ چلو کھانا کھالو۔'' کھانا آگیا۔ جلال حسین نے دو آدمیوں کو دیکھ کر کہا جو ہاتھوں میں سینیاں اٹھائے قریب آگئے تھے۔ ایک نے کپڑے کا دسترخوان بچھایا، دوسرے نے سینی اس پر رکھ دی۔ پانی کا کٹورہ اور صراحی بھی قریب رکھ دی گئی۔ سینی سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اس بھاپ کے ساتھ چاولوں کی خوشبو شامل تھی۔ موتی کی طرح بکھرے چاولوں کا انتہائی خوشبودار پلاؤ تھا۔ جلال حسین نے کہا۔ ''چلو میاں! بسم اللہ کرو......اول طعام، بعد کلام!''

کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جلال حسین بھی میرے ساتھ اسی سینی میں شریک ہوگئے۔ کھانے کی لذت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی تاہم اعتدال سے کام لیا۔ ہاتھ روکا تو جلال صاحب مزید کھانے پر اصرار کرنے لگے۔ ''مکمل شکم سیری بیشک غیر

مناسب ہے لیکن تم بہت بھوکے ہو، کھاؤ......!'' کچھ دیر کے بعد کھانے سے فراغت ہوگئی۔ جلال حسین نے کہا۔ ''نماز عشاء سے فراغت ہوجائے اس کے بعد نشست رہے گی۔''

''آپ یہیں قیام فرماتے ہیں؟''

''ہاں......!''

''اذان آپ نے کہی تھی......؟''

''نہیں...... امیر احمد نے۔''

''وہ بھی یہیں رہتے ہیں؟''

''ہاں......!''

''جب میں آیا تھا تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔''

''ہاں! نہ دیکھا ہوگا۔''

''آپ نے مجھے دیکھ لیا تھا......؟''

''کیوں نہیں......!'' جلال حسین مسکرائے پھر بولے۔ ''تم خانہ خدا کی خدمت میں مصروف تھے۔ ہم نے مداخلت نہیں کی۔ تھوڑی دیر چہل قدمی کرلو، ہم کچھ ضروری امور نمٹالیں۔'' وہ اٹھ گئے۔

''بہتر ہے۔'' میں نے کہا اور جلال حسین وہاں سے چلے گئے۔ کچھ دور تک نظر آتے رہے پھر اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے روپوش ہوگئے۔ میں مسجد سے دور نکل آیا۔ تاریکی، حشرات الارض کی سرسراہٹ، کبھی کبھی پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ! بڑا پراسرار ماحول تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا جارہا تھا۔ جلال حسین کی شخصیت اور ان کے الفاظ بھی یاد آرہے تھے۔ یہ دوسرے بندۂ خدا ہیں۔ انسانوں کی آبادی یہاں سے ساٹھ ستر کوس دور ہے۔ یہ لوگ انسان نہیں تھے۔ جنات تھے یقیناً......! بدن میں پھریریاں اٹھنے لگیں۔ ایک سرد احساس پورے وجود میں دوڑ گیا۔ کیا جلال الدین بھی...... جن ہیں؟ یہی لگتا تھا لیکن مہربان تھے اور محبت سے پیش آرہے تھے۔ چہل قدمی ہی کررہا تھا کہ عشاء کی اذان سنائی دی اور واپسی کیلئے قدم اٹھا دیئے۔ عشاء کی نماز میں نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور پورا صحن بھر گیا تھا۔ بالآخر نماز سے فراغت ہوگئی۔ اس سرخ سل پر جا بیٹھا اور کچھ دیر کے بعد جلال حسین وہاں پہنچ گئے۔

''میاں!
کسی شے کی حاجت تو نہیں ہے؟''

''الحمدللہ......!''

''سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟''

''اللہ کا فضل ہے۔''

''کچھ باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔''

''ارشاد......!''

''اول اپنی شناخت سے گریز کرو۔''

''وضاحت کا طلبگار ہوں۔''

''اب تمہیں اس کمبل کی ضرورت نہیں ہے، رہنمائی کرنے والی ذات الٰہی ہے۔ اللہ کا کلام سینے میں ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔ اس کی رہنمائی طلب کرو۔ یہ کھیل شناخت بنے گا تو خودنمائی کے زمرے میں آجاؤ گے۔ اسے خود سے دور کرو تو اعتماد پیدا ہوگا۔''

''جی......!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''دل میں وسوسہ نہ لاؤ۔ اعتماد سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی۔''

''درست فرمایا......!''

''یہ چار روپے رکھ لو، ضروریات پوری کریں گے۔ تمہارا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔'' جلال حسین نے چار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''رزق حلال ہوگا؟''

''عطیہ ہے۔ اس وقت تک ملے گا جب تک ضرورت ہوگی۔''

''بسم اللہ......!''

''جمال گڑھی چلے جاؤ، ادھر سے بلاوا ہے۔''

''راستے کی نشاندہی کر دیں۔''

''ہاں......بس سیدھے چلے جانا مگر صبح سفر کا آغاز کرنا۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ اچھا اب ہم بھی چلتے ہیں۔ فی امان اللہ......!'' جلال حسین نے کہا اور سلام کر کے وہاں سے چلے گئے۔ میں بہت دیر تک پتھر کی سل پر پالتی مارے بیٹھا رہا۔ جلال حسین کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ بہت فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ وہیں لیٹ گیا اور تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا رہا۔ دل کی وادیوں میں بہت سے پھول کھلنے لگے، یادیں ذہن میں سرسرانے لگیں۔ کچھ لوگ یاد آئے اور سسکی بن گئے۔ ان یادوں پر پابندی تھی، وقت جب تک خود آواز نہ دے۔ نیند مہربان ہوگئی۔ رات کے آخری حصے میں خنکی ہوگئی تھی۔ کئی بار آنکھ کھلی۔ نیم خوابی کی شکل میں ان تہجد گزاروں کو دیکھا جو عبادت میں مصروف تھے پھر سو گیا۔ فجر کے وقت آنکھ کھل گئی۔ اذان کے آخری بول سنائی دے رہے تھے لیکن اس وقت صحن میں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے وضو کیا۔ انتظار کرتا رہا مگر کوئی نہیں آیا تھا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا، نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فراغت پائی اور رخ اس پتھر کی سل کی طرف کیا۔ وہاں سینی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں دو پراٹھے، آلو کی ترکاری اور چائے کا پیالہ رکھا ہوا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور میرا کمبل موجود نہیں تھا۔ ایک لمحے کیلئے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پہلے یہ کمبل میری نادانی سے چھن گیا تھا اور اب واپس لے لیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ میں نے ناشتے پر توجہ دی۔ تمام ناشتہ صاف کیا۔ اس کے بعد یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ وہاں سے سیدھ اختیار کی اور چل پڑا۔ تین دن اور رات کے کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک آبادی نظر آئی۔ اس وقت بھی صبح کے کوئی پانچ بجے تھے۔ میں رات کو ہی ادھر چل پڑا تھا اور جب رات کی سیاہیاں ختم ہوئیں تو مجھے درخت، کھیت اور ان سے پرے ٹمٹماتے چراغ نظر آئے تھے جن سے آبادی کے قریب آنے کا احساس ہوا تھا۔

آبادی کے پہلے درخت کے پاس رک گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک ٹنڈ منڈ درخت پر کئی گدھ بیٹھے ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر انہوں نے پر پھڑپھڑائے اور پھر ان میں سے ایک گدھ بھیانک آواز کے ساتھ پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا جیسے کسی کو اس کی آمد کے بارے میں اطلاع دینے گیا ہو۔ نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا چنانچہ درخت کے تنے کی آڑ میں میں نے ایک صاف جگہ تلاش کر کے فجر کی نماز پڑھی اور درود شریف کا وظیفہ کرنے لگا۔ جب اس سے فراغت حاصل ہوئی تو اپنے دائیں بائیں بہت سے مردہ خوروں کو منتظر بیٹھے دیکھا۔ غالباً میرے بدن کے سکوت سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنے پتلے پتلے پیروں سے اچھل اچھل کر پیچھے ہٹنے لگے اور پھر مایوس ہو کر فضا میں بلند ہو گئے۔ یہ مردہ خور گدھ بعض اوقات زندہ انسانوں پر بھی حملے کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں سے آگے بڑھ جانا ضروری تھا۔ ذرا بستی پہنچ کر یہ معلوم کیا جائے کہ یہی بستی جمال گڑھی ہے۔ ایک سمت اختیار کر کے چل پڑا۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر مجھے ایک انسانی جسم نظر آیا۔ کوئی پشت کیئے ایک جھاڑی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس سمت قدم بڑھا دیئے اور اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ہوسکتا ہے یہی میری رہنمائی کر دے۔ کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی تو بیٹھی ہوئی شخصیت اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ ایک بھیانک صورت عورت تھی جس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے،

رنگ بھی مٹیالا تھا اور جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ جسم پر لباس بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہاتھ ضرورت سے زیادہ لمبے تھے۔ جب اس نے میری سمت نگاہیں اٹھائیں تو میرے قدم ٹھٹک گئے۔ بہت خوفناک شکل تھی ساتھ ہی اس نے بھیانک چیخ ماری اور ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ میں ششدر کھڑا رہ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کچھ فاصلے پر باجرے کے کھیتوں میں جا گھسی۔ چند لمحات اپنی جگہ ساکت رہا پھر غیر اختیاری طور پر اس سمت نگاہ اٹھ گئی جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے بری طرح چونک پڑا۔ ایک انسانی جسم وہاں بھی موجود تھا اور زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور خوف سے اچھل پڑا۔ نو یا دس سالہ بچے کا جسم تھا جس کا پھٹا ہوا لباس اس سے چند قدم کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا سینہ چاک تھا اور جسم کی آلائش قرب و جوار میں بکھری ہوئی تھی۔ جگہ جگہ زمین پر خون نظر آ رہا تھا۔ گردن مڑ کر دوسری سمت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے سینے کی جو کیفیت نظر آئی، اسے دیکھ کر سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس میں زندگی ہوسکتی ہے۔ میں بچے کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی مڑی ہوئی گردن سیدھی کی۔ معصوم شکل کا بچہ تھا جسے اس وحشی عورت نے اپنی درندگی کا شکار بنایا تھا لیکن کیوں.....؟ ایک اتنے معصوم بچے سے اس بدبخت کو کیا دشمنی تھی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں لیکن فرض تھا کہ بستی والوں کو فوراً ہی اس حادثے کی خبر دوں۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ ابھی چند لمحات میں مردہ خور گدھ آجائیں گے اور اس کی لاش کو نوچنا شروع کر دیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لاش کی بکھری ہوئی آلائش کو جمع کرنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہ بنی کہ بستی کی جانب دوڑوں۔ سو میں دوڑنے لگا۔ زیادہ فاصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ پریشان حال انسان نظر آئے۔ ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے زور زور سے انہیں پکارا۔ ''سنو بھائیو.....! ادھر آؤ، میری بات سنو..... سنو!'' اور وہ جلدی سے میرے قریب آ گئے۔

''وہاں اس طرف جھاڑیوں میں ایک بچے کی لاش پڑی ہوئی ہے جس کا جسم ادھیڑ دیا گیا ہے۔''

''کیا.....؟'' ان میں سے ایک شخص نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا اور شاید اسے غش آ گیا۔ اس نے لاٹھی زمین پر ٹکا کر اپنا سر اس سے لگا دیا۔ دوسرے نے اس کا بازو تھام کر مجھ سے پوچھا۔ ''کدھر..... کہاں.....؟''

''آؤ میں تمہیں اس سمت لے چلوں۔''

''جنک رام! خود کو سنبھال بھائی، آ ذرا چلیں، ہمت کر۔'' جس شخص کو جنک رام کے نام سے پکارا گیا تھا، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آہ! وہی ہوا، وہی ہوگیا جس کا اندیشہ تھا۔ میرا بھائی تو بے موت مر جائے گا۔ اجڑ گیا یہ گھر، اجڑ گیا۔ برباد ہوگیا۔ ہائے کیسے دیکھوں گا میں اپنے بھتیجے کی لاش.....!''

''ہمت کر جنک رام! آ چلیں تو سہی۔'' دوسرے آدمی نے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''چلو بھیا! ذرا بتاؤ ہمیں وہ جگہ.....!''

''یہاں مردہ خور گدھ بھی ہیں۔ میں دوڑتا ہوا جاتا ہوں، تم میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ کہیں مردہ خور بچے کی لاش کو خراب نہ کریں۔ ویسے بھی لاش بہت خراب ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا اور واپس دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں بھی ہانپتے کانپتے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میرا خیال درست تھا۔ گدھ بلندی پر منڈلانے لگے تھے۔ میں نے ایک سوکھی ٹہنی اٹھائی اور لاش کے پاس جا کھڑا ہوا۔ منڈلاتے ہوئے مردہ خوروں کو میں نے منہ سے آوازیں نکال کر ڈرایا اور لکڑی ہوا میں لہرانے لگا۔ چند لمحات کے بعد وہ دونوں بھی میرے پاس پہنچ گئے۔ جنک رام نے بچے کا چہرہ دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ دوسرا اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہمت کر جنک رام.....! تو سوچ رگھبیر بھیا کا کیا حال ہوگا۔ بھابی کیسے جئے گی۔ بڑی مصیبت آ پڑی یہ تو.....!''

''ارے لٹ گئے ہم تو ہیرا بھیا! ارے جیون برباد ہوگیا ہمارا، میرا پرکاش، میرا پرکاش!'' جنک رام روتا ہوا لاش سے لپٹ گیا۔

''تمہارا نام ہیرا ہے؟'' میں نے دوسرے آدمی سے کہا۔

''ہاں بھیا! ہیرالال......!''

''ہیرالال! لاش کو یہاں سے اٹھانے کا بندوبست کرو۔ تم بستی جا کر دوسرے لوگوں کو خبر کر دو۔''

''جاتا ہوں بھیا جی......! بڑی بپتا پڑی ہے جمال گڑھی پر......! تم یہاں رکے رہو بھیا جی! ذرا سنبھالنا جنک رام کو۔'' ہیرا نے کہا۔

''تم جاؤ۔'' میں نے کہا اور ہیرالال جنک رام سے بولا۔ ''جنک! سنبھال خود کو، ابھی تو تجھے بھیا، بھابی کو سنبھالنا ہے۔ میں بستی جا رہا ہوں سنبھال جنک رام! خود کو۔''

''جا...... بھیا......!'' جنک رام نے روتے ہوئے کہا اور ہیرا اس کا شانہ تھپتھپاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''جنک رام......! خود کو سنبھالو، یہ بچہ تمہارا کون ہے؟''

''بھتیجا ہے ہمارا...... اکلوتا تھا اپنے ماتا، پتا کا۔ لاڈلا تھا ہمارا۔ بڑا انیائے ہو گیا بھیا......! بڑا انیائے ہو گیا۔''

''یہ یہاں کیسے آ گیا؟''

''بھگوان جانے، رات کو کھیلنے نکل گیا تھا بچوں کے ساتھ۔ رات گئے تک واپس نہ آیا تو سب پریشان ہو گئے۔ سب کے سب ڈھونڈتے پھرے ہیں رات بھر۔ ساری رات تلاش کیا ہے بھیا! ملی تو اس کی لاش!''

''تمہارے خیال میں اسے کس نے مارا......؟''

''نہ معلوم بھیا! کوئی ڈائن لگے ہے۔ ہائے دیکھو اس کا بھی کلیجہ نکال کر کھا گئی ہے۔''

''ڈائن......!'' میری سانس رکنے لگی۔

''تم خود دیکھ لو بھیا! پہلے بھی چار کا یہی حال ہوا ہے۔''

''کیا......؟'' میں اچھل پڑا۔ میں نے پریشان نظروں سے ان کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں وہ خوفناک عورت جا گھسی تھی۔ کیا وہ ڈائن تھی، بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جانے والی......!

''تم جمال گڑھی کے نہ ہو کیا بھیا......؟''

''نہیں...... میں تو مسافر ہوں۔''

''تبھی تو......! جمال گڑھی میں کوئی ڈائن گھس آئی ہے بھیا! چار بچوں کو مار چکی ہے جان سے۔''

''خدا کی پناہ! تمہیں ایک بات بتاؤں جنک رام!''

''بتاؤ بھیا!'' اس نے انگوٹھے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں صبح ہونے سے پہلے اس علاقے میں داخل ہوا تھا۔ بستی کے بارے میں کسی سے معلوم کرنا چاہتا تھا......!'' میں نے جنک رام کو پوری کہانی سنائی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''کونسے کھیتوں میں......؟'' اس نے اپنی لاٹھی مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا اور میں نے کھیتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ جنک رام لاٹھی ہلاتا جوش کے عالم میں چیختا کھیتوں کی طرف دوڑا۔ میری نظریں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنک رام کھیتوں میں گھس گیا تھا۔ پھر اس کی دھاڑ سنائی دی۔ ''رک تو سسری! بھاگ کہاں رہی ہے؟ اری رک تیرا ستیاناس......!'' پھر میں نے خوفناک عورت کو لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے دیکھا۔ جنک رام لاٹھی پکڑے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا پھر اس نے لاٹھی گھما کر پوری قوت سے عورت پر پھینکی۔ عورت بال بال بچی تھی۔ جنک رام جوش غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ عورت اگر اس کے ہاتھ آ جاتی تو وہ یقیناً اسے ریزہ ریزہ کر دیتا۔ جنک رام اس کے پیچھے بھاگتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ اتنا دور کہ اب مجھے نظر بھی نہیں آ رہا تھا البتہ بستی کی طرف سے بے شمار لوگ دوڑتے آ رہے تھے۔ ہیرالال سب سے آگے آگے تھا۔ کچھ دیر کے بعد بستی والے قریب آ گئے اور کہرام مچ گیا۔ مجھے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ ایک آدمی جس کی حالت بہت خراب تھی، آگے بڑھا۔ لوگ اسے پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بچے کی لاش دیکھی اور غش کھا کر گر پڑا۔

''جنک رام! کہاں گیا؟'' ہیرالال نے مجھ سے پوچھا مگر جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جنک رام جوش سے لاٹھی گھماتا واپس آ رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا قریب پہنچ گیا۔

''پتا چل گیا آج، سب کچھ معلوم ہو گیا بھیا! آج ساری باتیں پتا چل گئیں۔ ارے کہاں ہے وہ سسرا تلسیا......! کہاں چھپا ہے رے سامنے آ......!''

تلسیا نے کیا کر دیا جنک رام......؟'' کسی نے پوچھا۔

''ڈائن پتا چل گئی رمھا چاچا! ڈائن پتا چل گئی۔''

''کون ہے......کون ہے وہ......؟'' بہت سی آوازیں ابھریں۔

''بھاگ بھری ارے وہی سسری بھاگ بھری! خون سے رنگی ہوئی تھی کمینی! ارے آنکھوں سے دیکھ لیا اپنی!''

''بھاگ بھری...... باؤلی بھاگ بھری......؟''

''بنی ہوئی باؤلی ہے بھیا! آج دیکھ لیا آنکھوں سے! ارے جائے گی کہاں، کئی دیئے بجھائے ہیں اس نے......! پوت کہاں چھپا ہوا ہے اس کا......؟ ارے دیکھ لئے اپنی میا کے کرتوت......!'' جنک رام کا سانس پھول رہا تھا۔ پھر اس نے لاش کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور ایک بار پھر دھاڑیں مارنے لگا۔

''ارے بھیا! ہمارا چراغ بھاگ بھری نے بجھایا ہے۔ وہی ڈائن ہے بڑے بھیا......! ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

''کچھ بتاؤ تو سہی جنک رام......!''

''سب ڈھونڈ رہے تھے پرکاش کو، مسافر نے خبر دی۔ ہم نے لاش دیکھی، ہیرا خبر کرنے گیا۔ مسافر دوسری بستی کا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے ڈائن کو کلیجہ چباتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کھیتوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ارے ہم دوڑے کھیتوں میں، وہاں چھپی ملی بھاگ بھری...... ہمیں دیکھ کر نکل بھاگی۔ خون میں رنگی ہوئی تھی سسری! نکل گئی مگر جائے گی کہاں۔ ارے نہ جانے دیں گے سسری کو......!''

''سب سکتے کے عالم میں سن رہے تھے اور میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ کیا ہے یہ سب کچھ...... مگر کچھ تھا......ضرور کچھ تھا۔ مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ یقیناً اس کا کوئی مقصد ہوگا۔ یقیناً!

میں نے اس عورت کو دیکھا تھا، صورت واقعی خوفناک تھی۔ میں نے خود اس کے چہرے پر خون کے دھبے دیکھے تھے مگر وہ ڈائن تھی اور پہلے بھی یہ بھیانک عمل کر چکی تھی۔ بچپن میں جو باتیں کہانیوں کی شکل میں سنی تھیں، سب ہی تو سامنے آتی جا رہی تھیں۔ نہ جانے مستقبل اور کیا کیا دکھائے گا۔ چڑیل دیکھی تھی، پچھل پیری سے واسطہ پڑا تھا، کالی دیوی سے بھی خوب واقف ہو گیا تھا، ہندوؤں کے ساتھ رہن سہن کی وجہ سے ہولی دیوالی سے شناسائی ہوئی تھی۔ یہاں تو سارے قصے کہانیاں یہی تھیں، بھوت، پریت، سرکٹے، چڑیلیں، ان کے علاوہ اور کیا تھا مگر یہ مزیدار کہانیاں جنہیں سن کر راتوں کو ڈر لگتا تھا اور ماں سے چمٹ کر سونے کو جی چاہتا تھا، آج آنکھوں کے سامنے تھیں۔ آج ڈائن سے بھی ملاقات ہو گئی تھی، ایسی ہوتی ہیں ڈائنیں۔

جنک رام رو رو کر ساری رام کہانی سنا رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اس مظلوم بچے کی لاش کو بغور دیکھا، اب صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ لوگوں کا کہنا دُرست تھا۔ اس کا اُوپری جسم برہنہ تھا اور سینے کے مقام ہی سے کھلا ہوا تھا، دُوسری آلائشیں بکھری ہوئی تھیں لیکن کلیجہ موجود نہیں تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

''پر وہ گئی کہاں جنک رام......؟''

''ارے بھیا کیا بتائیں مسافر نے کہا کھیتوں میں چھپی ہے سسری۔ ہم لٹھیا لے کر لپکے تو ہمیں دیکھ کر نکل بھاگی اور بھیا کیا تیز دوڑی مسافر سے پوچھ لو، پیروں میں پنکھے بندھے ہوئے تھے۔ ذرا سوچو ڈائن نہ ہوتی تو اتنی تیز بھاگتی۔ ہم تو پیچھا ہی نہ کر پائے اور وہ یہ جا وہ جا، کیسی بڑھیا بنی پھرتی تھی۔ ہرے رام ہرے رام ہمارے بھیا کے

پوت کو کھا گئی، ارے اب کچھ کرو بھیا کو اُٹھا کر لے چلو۔ دیکھو تو سہی کہیں دل کی دھڑکن بند تو نہیں ہوگئی۔ ارے بھیا، ہمارے بڑے بھیا ارے رگھبیر بھیا۔''

''ہاں ہاں چلو رے چادر بچھاؤ، پرکاش کو اس میں ڈالو۔ اب تو وہ اس سنسار سے چلا ہی گیا۔ ساری باتیں کرلو پرنت جسے جانا تھا وہ تو جا چکا۔''

بہت سے لوگ مل کر لاش کی آلائش سمیٹنے لگے اور اس کے بعد بچے کے جسم کو اٹھا کر چادر پر لٹا دیا گیا۔ وہ اپنے عقیدے کے مطابق مقدس اشلوک پڑھ رہے تھے۔ چند لوگوں نے رگھبیر رام کو سنبھال کر ہاتھوں پر اُٹھایا اور پھر یہ سارا قافلہ آبادی کی جانب چل پڑا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن بہت ہی کم باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں۔ جمال گڑھی کا نام لیا جا چکا تھا، اس لیے اب اس میں بھی شبہ نہیں تھا کہ جس بستی کی جانب میں جا رہا ہوں، وہ جمال گڑھی ہی ہے جہاں جانے کی مجھے ہدایت کی گئی تھی۔ تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہی کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ تمام باتیں ذہن میں محفوظ تھیں جو بتائی گئی تھیں۔ مجھ سے خود پر اعتماد کرنے کو کہا گیا تھا اور وہ عطیہ واپس لے لیا گیا تھا جو میرے لیے بڑی تقویت کا باعث تھا لیکن دل کو ایک اعتماد تھا کہ میری امداد سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ میں کونسا عالم تھا کہ ہر مرض کی دوا میرے پاس ہوتی، بس یہ ایک امتحانی منزل تھی جس سے بازو پکڑ کر گزارا جا رہا تھا دل میں یہی دُعا تھی کہ اللہ مجھے اس منزل تک پہنچا دے جو میرے لیے متعین کی گئی ہے۔ بڑی ہمت اور بڑے صبر سے اپنے فرض کی بجا آوری کر رہا تھا اور کہیں بھی سرکشی ذہن میں نہیں اُبھری تھی۔ اپنے یاد آتے تو زبان کو دانتوں میں دبا لیتا، اپنے جسم کو نوچنے لگتا کہ یادیں پیچھا چھوڑ دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات ناگواری کی منزل میں پہنچ جائے اور ایک بار پھر مصائب کا شکار ہو جاؤں۔ اپنے طور پر جس حد تک ممکن ہو رہا تھا ان ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔

بستی کا سفر انہی خیالات میں کٹ گیا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی جنک رام کے گھر کے دروازے پر پہنچا تھا اور اس کے بعد وہاں جو کچھ ہونے لگا تھا وہاں رُکنا میرے لیے بے کار سی بات تھی۔ لوگ جنک رام کے گھر کے دروازے کے باہر جمع ہوگئے تھے، اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، ان آوازوں میں عورتوں کا شور بھی تھا، مردوں کی آوازیں بھی تھیں۔ میں وہاں سے واپس پلٹا، تقریباً ساری بستی والوں کو اس واقعہ کی خبر ہوگئی تھی۔ کوئی اپنے کام پر نہیں گیا تھا، سب کے سب جنک رام کے دروازے پر جمع ہوگئے تھے۔ میں نے ایک شخص کو روکا تو وہ فوراً ہی رُک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تم مسافر ہو نا بھیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بھائی یہ بستی جمال گڑھی ہی ہے نا......؟''

''ہاں بھیا یہی ہے۔''

''یہاں کوئی ایسی جگہ مل سکتی ہے بھیا جی جہاں میں کچھ وقت قیام کرسکوں۔''

''دھرم شالہ موجود ہے پنڈت رام نارائن کے پاس چلے جاؤ، ارے ہاں یہ تو بتاؤ ہندو ہو یا مسلمان......؟''

''مسلمان ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر مسجد میں چلے جاؤ۔ یا سنو وہ سیدھے ہاتھ جا کر جب اُلٹے ہاتھ کو مڑو گے تو تلسیا کا گھر نظر آئے گا تمہیں...... اللہ دین بھٹیارے کی سرائے اسی کے سامنے ہے، وہاں تمہیں رہنے کی جگہ مل جائے گی۔ مسجد تو ابھی نامکمل ہے دوبارہ بن رہی ہے، سارا سامان پڑا ہوا ہے وہاں کہاں ٹھہرو گے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے جواب دیا اور اس شخص کے بتائے ہوئے پتے پر چل پڑا، اللہ دین بھٹیارے کی سرائے شاید اس بستی کی واحد سرائے تھی۔ کچا احاطہ بنا ہوا تھا اور اس میں کچھ کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک سمت تندور لگا ہوا تھا جس کے کنارے بنی ہوئی بھٹیوں میں آگ سلگ رہی تھی مگر کوئی موجود نہیں تھا، البتہ زیادہ دیر نہ گزری کہ دس بارہ سال کے ایک لڑکے نے اندر سے گردن نکال کر جھانکا اور پھر واپس اندر گھس گیا۔ میں نے زور زور سے آوازیں دیں تو ایک درمیانی عمر کی

عورت باہر نکل آئی۔ موٹی تازی تھی، شلوار قمیض پہنے دوپٹہ اوڑھے ہوئے مسلمان عورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''اللہ دین بھٹیارے کی سرائے یہی ہے نا؟''

''ہاں یہی ہے مگر تو کون ہے بھیا؟''

''اللہ دین کہاں ہے؟''

''ارے بس نکل کھڑا ہے تماشا دیکھنے کیلئے، ساری ہنڈیا جلا کر خاک کر دی۔ پورا کا پورا تین سیر گوشت تھا..... مگر تو کون ہے بھیا؟''

''مسافر ہوں، بہن اس سرائے میں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔''

''ارے کلواو..... کلو تیرا ستیاناس کہاں مر گیا ارے باہر نکل۔''

''اماں تو نے ہی تو منع کر دیا تھا کہ باہر نہ نکلوں ڈائن کھا جائے گی۔'' لڑکے نے کہا۔

''ارے ڈائن کے بچے باہر آ، دیکھ مسافر آیا ہے۔'' عورت نے کہا اور وہی لڑکا جو مجھے جھانک کر اندر گھس گیا تھا، باہر نکل آیا۔

''جا ابا کو بلا کر لا، کہہ دے تماشا ختم ہو گیا۔ مسافر آیا ہے اور وہ باہر مستا رہا ہے۔ ارے بھیا مجھ سے بات کرو میں اللہ دین کی گھر والی ہوں۔''

''مجھے یہاں رہنے کیلئے جگہ مل سکتی ہے؟''

''لو بھیا پورے کے پورے چار کمرے خالی پڑے ہیں جس میں جی چاہے ٹھہر جاؤ مگر ڈیڑھ روپے روز ہوتا ہے کمرے میں ٹھہرنے کا اور کھانے پینے کے پیسے الگ، صبح کی چائے دو آنے کی۔ جب بھی چائے پیو گے دو آنے دینے پڑیں گے۔ دوپہر کو کھانا کھاؤ گے تو دس آنے الگ ہوں گے۔ رات کو کھاؤ گے تو بھی دس آنے ہوں گے۔ سوچ لو منظور ہو تو ٹھیک ہے۔''

میری جیب میں چار روپے موجود تھے جو مجھے وظیفے کے طور پر عطا کئے گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر یہ پیسے دیکھے اور تین روپے نکال کر خاتون کو دے دیئے۔

''یہ دو دن کا کرایہ رکھ لیجئے کھانا کھاؤں گا تو اس کے پیسے الگ دوں گا۔''

''آؤ بھیا کوٹھا دکھا دیں تمہیں۔'' عورت نے کہا۔ جو کوٹھا مجھے دکھایا گیا وہ بھی کچی مٹی کا ہی بنا ہوا تھا، اُوپر پھونس کا چھپّر پڑا ہوا تھا۔ مٹی میں تین روشن دان نکالے گئے تھے جن سے کمرہ خوب روشن ہو گیا تھا۔ ایک طرف بانوں سے بنی ہوئی چارپائی پڑی تھی۔ دُوسری جانب ایک گھڑونچی جس پر مٹکا، پانی نکالنے کا ڈونگا اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ یہ تھی کل کائنات اس کمرے کی..... میرے لئے بھلا اعتراض کی کیا بات ہو سکتی تھی، میں نے فوراً ہی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ عورت کہنے لگی۔ ''ہم دردی بچھائے دے ہیں تکیہ اور کھیس بھی مل جائے گا ہمارے ہی ہاں سے۔ یہ کمرے کے کرائے میں ہوگا۔ اب بتاؤ ناشتہ کرو گے.....؟''

''نہیں بہن..... ہاں ایک پیالی چائے اگر مل جائے۔''

''چار پیالی پی لو لیکن اٹھنّی نکال لو۔'' عورت نے کھرے کاروباری لہجے میں کہا اور میں نے ہنستے ہوئے اسے مزید چار آنے دے دیئے اور بارہ آنے واپس لے لیے۔ اس میں رات کا کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ غرض یہ کہ مجھے جمال گڑھی میں ایک عمدہ قیام گاہ مل گئی اور کچھ دیر کے بعد چائے بھی......

میں چائے پی رہا تھا کہ ایک دُبلے پتلے آدمی نے جو کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور سر پر کپڑے کی ٹوپی لگائی ہوئی تھی، اندر جھانکا۔ سلام کیا تو میں نے اسے سلام کا جواب دیا اور وہ مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

''تم وہی مسافر ہو نا بھیا جی جس نے ڈائن کو بے چارے پرکاش کا کلیجہ چباتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ہاں میں ہی وہ گناہگار ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
''بھیا تم ہماری سرائے میں ٹھہرے ہو۔''
''تمہارا نام اللہ دین ہے۔''
''ہاں بھیا...... اپنی ہی سرائے ہے یہ۔ بڑا اچھا ہوا تم یہاں گئے۔ ہماری گھر والی نے ہمیں بتایا تو ہم سمجھ گئے کہ تم ہی ہو سکتے ہو اور بڑی اچھی بات ہے کہ مسلمان ہو۔ بھیا ذرا ہمیں پورا واقعہ تو بتاؤ۔'' وہ بڑے اطمینان سے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
''بہت افسوسناک واقعہ ہے اللہ دین اب کیا بتاؤں میں تمہیں۔ جو کچھ تم نے باہر سے سنا، بس اتنا ہی ہے۔''
''اری زبیدہ او...... زبیدہ اری اندر آ۔ میں نے کہا تھا نا تجھ سے وہی مسافر بھیا ہیں جنہوں نے ڈائن کو دیکھا ہے۔'' اللہ دین نے بیگم صاحبہ کو بھی طلب کرلیا اور بیگم صاحبہ دوڑتی ہوئی اندر آ گئیں۔
''اری...... اری...... میرے اوپر نہ گر پڑیو۔'' اللہ دین ایک طرف کھسکتا ہوا بولا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیگم اللہ دین کے مقابلے میں وہ بہت کمزور تھا۔ بیگم صاحبہ ہانپتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''وہی ہیں...... وہی ہیں......؟''
''تو اور کیا...... میں نے کہا تھا نا تجھ سے کہ بستی میں ایک ہی مسافر داخل ہوا ہے، ہوسکتا ہے یہ وہی مسافر بھیا ہوں۔'' محترمہ بھی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ ''بھیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یقین نہ آوے ہے ہمیں۔''
''اری چھوڑ، یقین نہ آوے ہے تجھے۔ بستی والے مار مار کر بھرکس نکال دیں گے تیرا۔ سب غصے میں بھرے ہوئے ہیں۔ اب بے چارے ہلسیا کی شامت آ گئی۔'' بھٹیارے نے کہا۔
میں ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا میں نے کہا۔
''مگر یہ بھاگ بھری ہے کون......؟''
''ارے بھیا پہلے تو ہمیں قصہ تو سناؤ بعد میں بتا دیں گے بھاگ بھری کون ہے۔'' اللہ دین نے کہا۔
''قصہ بس یہ تھا بھائی اللہ دین کہ میں ایک دُوسری بستی سے آ رہا تھا۔ تمہاری جمال گڑھی میں کھیتوں کے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے میں نے اس عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اس لیے میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے دیکھ کر زور سے چیخی اور بھاگ کر کھیتوں میں جا گھسی۔ اس کے بعد دُوسرے لوگ آ گئے۔ میں نے باقی واقعات ان لوگوں کو سنائے اور اللہ دین دونوں کانوں کو ہاتھوں کی قینچی بنا کر چھونے لگا اور گالوں پر درمیانی اُنگلیاں مارنے لگا جبکہ بیگم اللہ دین کا چہرہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔
''اللہ بچائے رکھے میرے کلو کو...... ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ڈائن بستی ہی میں کوئی ہے۔ بھلا باہر سے کہاں سے آئے گی۔'' مسز اللہ دین نے کہا۔ میں ان دونوں کی احمقانہ حرکتیں دیکھتا رہا۔ دونوں ہی سیدھے سادے معصوم دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔
''اب آپ لوگ مجھے اس ڈائن کے بارے میں بتائیں۔''
''ارے بھیا اللہ جانے کیا ہوگیا وہ پگلی تو تھی، جانے ڈائن کیسے بن گئی۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ سارا جیون ہمارے سامنے گزرا ہے بھاگ بھری کا، میرے سامنے بیاہ کر آئی تھی رتن لال کے ہاں۔ سارے کام یہیں کے یہیں ہو گئے، ہے رے تقدیر۔''

✦✤✦✤✦

''تمہارے سامنے بیاہ کر آئی تھی وہ یہاں؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں مسافر بھیا سامنے کا گھر ہی تو ہے رتن لال کا۔ بھرا پرا گھر تھا، ہم جی چھوٹے ہی سے تھے، رتن بھیا سے بچپن ہی سے یاد اللہ تھی۔ بھلا آدمی تھا بے چارہ کام سے کام رکھنے والا، شادی ہوئی تھی اس کی گوناپور میں، بھاگ بھری بچاری وہیں کی

تھی۔ ایک بہت ہی غریب آدمی کی بیٹی جس نے پتہ نہیں کیسے کیسے کر کے اپنی بٹیا کی شادی کری تھی۔ بھاگ بھری رتن لال کے گھر آ گئی۔ رتن لال بے چارہ خود بھی غریب آدمی تھا، بس محنت مزدوری کرتا تھا اور زندگی گزارتا تھا پر ٹھیک ٹھاک زندگی چل رہی تھی۔ ان کے بیٹے ہوئے تھے ایک ایک کر کے تین اور پل بڑھ رہے تھے، بھاگ بھری کو سب ہی اچھا کہتے تھے۔ ہماری اماں تو اسے بہت ہی پسند کرتی تھیں۔ ہماری شادی میں بھی اس نے گھر کے سارے کام کاج کرے تھے بھیا بہت اچھی تھی وہ۔ اللہ جانے کس کی نظر کھا گئی بے چاری کو۔ بڑا بیٹا کوئی آٹھ سال کا ہوگا، چھوٹا کوئی چار سال کا اور اس سے چھوٹا کوئی تین سال کا...... رتن لال کام پر گیا ہوا تھا، تینوں بچے نکل گئے پوکھر پر اور بھینس کی پیٹھ پر بیٹھ کر پوکھر میں گھس گئے، بس بھیا وہیں سے کام خراب ہوگیا۔ بھینس پوکھر میں بیٹھ گئی اور بچے جو اس کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے تھے، پوکھر ہی میں ڈوب مرے۔ وہ تو رمضان گھسیارے نے دُور سے بچوں کو بھینس کی پیٹھ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا اور اسے پتہ چل گیا تھا مگر تیرنا وہ بھی نہیں جانتا تھا، دوڑا دوڑا بستی آیا۔ گھر میں خبر دی پھر رتن لال کو بتایا۔ پوری بستی ہی پہنچ گئی تھی پوکھر پر...... رتن لال کے تینوں پوت پوکھر میں ڈوب گئے تھے۔ معمولی بات تو نہیں تھی، رتن لال پاگل ہوگیا۔ کھٹ سے چھلانگ لگا دی پوکھر میں اور بھیا پوکھر میں چھ کنوئیں ہیں، دیکھا تو کسی نے نا ہیں البتہ پُرکھوں سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ بارہ سال کے بعد بھینٹ لیتے ہیں یہ کنوئیں اور کوئی نہ کوئی ڈوب ہی جاتا ہے۔ بارہ سال پورے ہو چکے تھے، بھینٹ لے لی مگر اس بار تین بچوں کی بھینٹ لی تھی ان کنوؤں نے اور چوتھا رتن لال نیچے گیا تو واپس اُوپر نہ آیا۔ بھلا کس کی مجال تھی کہ پوکھر میں گھس کر رتن لال اور اس کے بچوں کی لاشوں کو تلاش کرتا۔ وہیں کے وہیں دفن ہو کر رہ گئے بے چارے، تین بیٹے اور ایک باپ۔ تم خود سوچ لو مسافر بھیا، کیا بیتی ہوگی ماں پر؟ اس بیچ بے چارہ تلسی بھی آ چکا تھا۔ تلسی اصل میں بھاگ بھری کا چھوٹا بھیا تھا۔ جب گونا پور میں اس کے پتا جی مر گئے تو رتن لال خود جا کر تلسیا کو اپنے ساتھ لے آیا اور اپنے بچوں ہی کی طرح پالنے پوسنے لگا اسے...... تلسیا یہیں رہتا تھا اور بھاگ بھری کو بس اسی کا سہارا مل گیا تھا۔ تینوں بچے اور پتی کے مرجانے کے بعد بھلا ہوش وحواس کیسے قائم رکھتی۔ سر پھوڑ لیا اپنا اور اس کے بعد پاگل ہوگئی۔ سر میں چوٹ لگ گئی تھی، بھیا غریب غرباء کی بستی ہے کون کس کو سہارا دے سکے ہے۔ لوگوں نے کہا اس کا علاج ہوسکتا ہے دماغ ٹھیک ہو جائے گا مگر غریبوں کیلئے تو پیٹ بھرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے، دوا دارو کہاں سے کریں۔ بے چارہ تلسیا محنت مزدوری کرتا ہے، بستی بھر کی چاکری کر کے جو چار روٹی کما لے ہے اس سے پاگل بہن کا اور اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ سنسار میں اس کا بھی کوئی نہیں ہے، اپنی اس پگلی بہن کے سوا۔ بھاگ بھری پوری بستی میں بھاگتی پھرتی ہے۔ کبھی بچے اس کا پیچھا کریں تو انہیں پتھر مار دیتی تھی۔ بس اس سے زیادہ اس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا مگر بھیا پھر یہ ہوا کہ سب سے پہلا چھوکرا رام لال کا تھا جو بے چارہ ڈائن کا شکار ہوا۔ رات ہی کا وقت تھا۔ مغرب کی اذان ہوئی ہوگی، تیل لینے باہر نکلا تھا کہ غائب ہوگیا۔ بے چارہ رام لال ایک ایک سے پوچھتا پھرا کہ کسی نے اس کے چھورا کو تو نہیں دیکھا۔ کسی نے نہ بتایا۔ صبح کو بھیا ہریا کے کھیت کی مینڈھ پر رام لال کے چھوکرے کی لاش ملی، ساری چھاتی اُدھیڑ کر رکھ دی تھی کسی نے۔ سب یہی سمجھے کہ بگھرا لگ گیا۔ کبھی کبھی بھیا بستی کے آس پاس جنگلوں سے بگھرا نکل آوے ہے اور اگر انسانی خون کا لاگو ہو جاوے تو پھر گھروں سے بچے اُٹھا لے جائے ہے۔ چرواہوں کی بکریوں کو مار ڈالے ہے، بچوں کو لے جا کر کھا پی کر برابر کر دیوے ہے۔ پہرہ دینا پڑے ہے ایسے دنوں میں، چار پانچ بگھرے مارے جا چکے ہیں اس طرح۔ سب لوگ یہی سمجھے کہ بگھرا لگ گیا۔ رام لال کا گھر تو لٹ ہی گیا تھا، راتوں کو پہرے ہونے لگے۔ لوگ لٹھیا لے کر رات بھر اپنے اپنے حساب سے بستی کے چاروں طرف پہرہ دیا کرتے تھے لیکن کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد ہی دُوسرا واقعہ بھی ہوگیا اور اس بار منشی امام دین کا بیٹا بگھرے کے ہاتھ لگا تھا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اس کا بھی کلیجہ نکال لیا گیا تھا پھر دھنو نے یہ بتایا کہ یہ کام بگھرے کا نہیں ہے کیونکہ بگھرا کسی گھر میں نہیں گھسا تھا۔ چرواہوں کی بکریوں کو اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، کہیں اس کے پنجوں کے نشان نہیں ملے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے تو پتہ چلتا۔ جہاں لاشیں پڑی ہوئی تھیں وہاں پر بھی بگھرے کے پیروں کے نشان نہ ملتے تھے جبکہ پہلے کبھی ایسا ہوا تو جگہ جگہ بگھرے کے پیروں کے نشانات دیکھے گئے پھر جب تیسری لاش ملی تو دھنو نے آخری بات کہہ دی کہ یہ کام کسی ڈائن کا

ہے جو بچوں کے کلیجے نکال کر چبا جاتی ہے۔ بھیا جمال گڑھی والوں کو پہلے بھی کسی ڈائن کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ خوف پھیل گیا، پوری بستی میں لوگ کام دھندے چھوڑ کر ڈائن کی تلاش میں لگ گئے۔ بھاگ بھری کی طرف تو کسی کا خیال بھی نہیں گیا تھا۔ کسی کو کیا پتہ تھا کہ وہ بھاگ بھری نہیں، بھاگ جلی ہے اور وہ ڈائن بن گئی ہے۔ بستی کی پگلی کہلاتی تھی، کسی نے روٹی دے دی تو کھا لی۔ کسی نے کپڑے پہنا دیئے تو پہن لئے ورنہ اسے اپنا ہوش کدھر تھا۔ بے چارہ تلسیا ہی تھا جو بہن کو سنبھالے سنبھالے پھرتا تھا۔ ادھر چاکری کرتا تھا اُدھر بہن کی تیمارداری۔ پر بھیا یہ تو بڑی ہی غضب ہوگیا چوتھا بچہ بھی اس کا شکار ہوگیا...... اور جمال گڑھی میں ان دنوں بھیا بس یوں سمجھ لو شام ڈھلی اور سناٹا ہوگیا۔ لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کئے، دن میں سونا شروع کر دیا گیا اور راتوں میں جاگنا مگر ڈائن نظر نہیں آئی۔ کیا پتہ تھا کسی کو کہ بھاگ بھری ڈائن ہوگی۔ بے چارے رگھبیر رام کا بیٹا پرکاش بھی رات ہی کو کھویا تھا اور چاروں طرف ڈھونڈ مچی ہوئی تھی۔ سب ڈھنڈیا کر رہے تھے۔ سارے بستی والے لاٹھیاں سنبھالے رات بھر ادھر سے اُدھر پھرتے رہے اور اب صبح کو اس کی لاش مل گئی مگر تم نے بتا دیا بستی والوں کو کہ ڈائن کون ہے۔ ارے بھیا ہاتھ نہیں لگی وہ جنک رام کے...... جنک رام بھی بڑا بکٹ ہے اگر مل جاتی کہیں بھاگ بھری تو لٹھیا مار مار کر جان نکال لیتا اس کی۔ بڑا پریم کرتا تھا اپنے بھتیجے سے...... اور رہتا بھی تو رگھبیر رام کے ساتھ ہی تھا۔ رگھبیر رام بے چارے کا بھی اکیلا ہی بیٹا تھا پرکاش، بڑا برا ہوا مگر اب...... اب سمجھ میں نہ آوے آگے کیا ہوگا۔ یہ تو پتہ چل گیا کہ بھاگ بھری ڈائن ہوگئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہم نے تو پہلے کچھ سنا بھی نہیں۔'' میں خاموشی سے یہ کہانی سنتا رہا۔ بڑی دردناک کہانی تھی، ایک لمحے کیلئے یہ احساس بھی دل سے گزرا تھا کہ کہیں میرا یہ انکشاف غلط تو نہیں ہے اور ایک انسان بلکہ دو انسان میرے اس انکشاف کا شکار ہو جائیں گے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ خدا کرے جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہی سچ نکلے۔ یہاں کسی خبیث رُوح کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ایک انسان ہی کا معاملہ تھا، پتہ نہیں اب کیا ہوگا۔ بہرطور بھٹیارے اللہ دین نے یہ کہانی سنائی۔ مجھے خاص نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اللہ دین واپس آیا اور ایک روپیہ میرے حوالے کر گیا۔ کہنے لگا۔ ''بھیا ڈیڑھ روپے روز کا کوٹھا ملا ہے تمہیں، ہم نے اُٹھنی کی رعایت کر دی ہے۔ اب ایک روپے روز پر تم یہاں رہ سکتے ہو۔ دیکھو بھیا ہمارے ساتھ بھی تو پیٹ لگا ہوا ہے مجبوری ہے۔ ورنہ تم سے کچھ نہ لیتے۔''

''نہیں اللہ دین تمہارا شکریہ کہ تم نے رعایت کر دی میرے ساتھ، اب کھانا کھلوا دو۔''

دوپہر کا کھانا جو دال روٹی پر مشتمل تھا، کھا کر فراغت حاصل کی تھی کہ شور شرابہ سنائی دیا۔ باہر نکل آیا دیکھا تو بہت سے لوگ سامنے کے گھر پر جمع تھے۔ یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ یہ گھر تلسی یا بستی والے جسے تلسیا کہتے تھے کا ہے۔ شاید بھاگ بھری گھر واپس آئی تھی اور پکڑی گئی تھی، اللہ دین اور زبیدہ بیگم بھی باہر نکل آئیں، پتہ یہ چلا کہ جنک رام اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا تھا اور تلسی کو پکڑ کر لے گیا ہے۔

''یہ تو ناانصافی ہے اللہ دین، جنک رام، تلسی کو کیوں پکڑ کر لے گیا؟''

''بھیا خون سوار ہے جنک رام پر بھی، بھتیجا مر گیا ہے۔ کریا کرم کر کے لوٹے تھے کہ بے چارہ تلسیا گھر پر مل گیا، لے گئے اسے پکڑ کے......!''

''اب وہ کیا کریں گے اس کا......؟''

''اللہ جانے...... تم بیٹھو میں معلوم کر کے آؤں۔''

''میں بھی چلوں؟''

''مرضی ہے تمہاری چلنا چاہو تو چلو۔''

''نا بھیا مسافر تمہاری بڑی مہربانی ہوگی یہیں پر ٹک جاؤ۔ میری تو جان نکلی جاوے ہے، ارے کہیں بھاگ بھری میرے ہی گھر میں نہ گھس آئے۔ اللہ میرے کلو کو اپنی امان میں رکھے۔'' کلو، اللہ دین اور زبیدہ بیگم کی واحد اولاد تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ میں سرائے کے کوٹھے میں آرام کرتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ مجھے جمال گڑھی آنے کی ہدایت کیا اسی

سلسلے میں کی گئی ہے اور اگر یہی بات ہے تو میرا کیا عمل ہونا چاہیے۔ یہ تو بالکل ہی الگ سا واقعہ ہوگیا، ایک زندہ عورت انسانی خون کی لاگو ہوگئی تھی۔ میں اس کے خلاف کیا کرسکوں گا۔ کوئی بھوت پریت کا معاملہ تو تھا نہیں، شام کے تقریباً ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ باہر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی نے میرے اس کوٹھے یا کمرے کی کنڈی بجائی۔ باہر نکلا تو بیگم اللہ دین کھڑی ہوئی تھیں، چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ کہنے لگیں۔ ''مسافر بھیّا ٹھاکر جی کے آدمی آئے ہیں، تمہیں بلانے کیلئے۔ باہر کھڑے ہوئے ہیں۔''

''کون ٹھاکر جی......؟''

''ارے اپنی بستی کے مکھیا ہیں کوہلی رام مہاراج۔'' زبیدہ بیگم نے بتایا۔ میں نے جلدی سے جوتے وغیرہ پہنے باہر نکل آیا۔ دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ''بھائی صاحب آپ کو ٹھاکر جی نے بلایا ہے۔ بھاگ بھری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے۔''

''اچھا اچھا چلو چل رہا ہوں......'' اللہ دین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ واقعی مست مولا آدمی تھا۔ گھر کی کوئی پروا نہیں تھی اسے...... زبیدہ بیگم نے میرے باہر نکلتے ہی دروازہ مضبوطی سے بند کرلیا، میں ان دونوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور جمال گڑھی کے چھوٹے چھوٹے گھروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک بڑے سے گھر کے سامنے آ رُکا جو لال رنگ کی اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور یقیناً یہی کوہلی رام جی کا گھر تھا۔ بڑے سے گھر کے سامنے جمال گڑھی کے سیکڑوں افراد جمع تھے، ہر ایک اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ دونوں آدمی میرے لیے ان کے درمیان راستہ بنانے لگے اور میں گھر کے سامنے پہنچ گیا، بڑی سی پتھر کی چوکی بنی ہوئی تھی جس پر مکھیا جی بیٹھے ہوئے تھے، صورت ہی سے مغرور آدمی نظر آتے تھے۔ دُوسرے تخت سے نیچے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ بائیں طرف ایک مفلوک الحال نوجوان نظر آیا جسے رسّی سے کس دیا گیا تھا۔ اس کا رُخسار نیلا پڑا ہوا تھا، ایک آنکھ بھی نیلی ہو رہی تھی۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے، پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ اسے بہت مارا گیا ہے۔ میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ یہ تلسی یا ان لوگوں کی زبان میں تلسیا تھا، قابلِ رحم اور شریف معلوم ہوتا تھا۔

''سلام کرو ٹھاکر جی کو۔'' مجھے لانے والوں نے کہا۔ میں نے سرد نظروں سے ان دونوں کو دیکھا پھر ٹھاکر کو جو مجھے دیکھتے ہوئے بائیں مونچھ پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

''ٹھاکر جی...... یہ مسافر ہیں۔'' مجھے لانے والے دُوسرے آدمی نے کہا۔

''کہاں سے آئے ہو......؟'' ٹھاکر نے پوچھا۔

''بہت دُور سے۔''

''جگہ کا نام تو ہوگا۔''

''ہاں ہے مگر بتانا ضروری نہیں ہے۔''

''ارے...... ارے ٹھاکر جی پوچھ رہے ہیں بتاؤ۔'' انہی دونوں میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

''تم بکواس بند نہیں رکھ سکتے۔'' میں نے غرا کر کہا اور وہ شخص بغلیں جھانکنے لگا۔

''داروغہ لگے ہو کہیں کے، کوئی نام تو ہوگا تمہارا......'' ٹھاکر نے کہا۔

''تم نے مجھے میرے بارے میں پوچھنے کیلئے بلایا تھا، ٹھاکر......؟''

''پوچھ لیا تو کیا برائی ہے۔''

''بس مسافر ہوں اتنا کافی ہے اصل بات کرو۔''

''کہاں ٹھہرا ہے یہ؟'' ٹھاکر نے دُوسرے لوگوں سے پوچھا۔

''اللہ دین کی سرائے میں۔''

''ہوں، مسلمان ہے۔'' ٹھاکر نے دُوسری مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا دیکھا بھئی تو نے؟''

''ان لوگوں نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔'' مجھے اس شخص پر غصہ آ گیا تھا۔
''تو بتا۔''
''بس اتنا دیکھا تھا کہ وہ عورت لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوگئی اور چیخ مار کر بھاگی پھر کھیتوں میں جا گھسی بعد میں جنک رام نے اسے وہیں دیکھا تھا۔''
''وہ لڑکے کا کلیجہ چبا رہی تھی؟'' ٹھاکر نے پوچھا۔
''یہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔''
''ٹھاکر جی اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ منہ پر بھی خون لگا ہوا تھا'' جنک رام نے کہا تب میں نے اسے دیکھا۔ وہ بھی مجمع میں موجود تھا۔
''چلو مان لیا میں نے، بھاگ بھری ڈائن بن گئی ہے مگر تلسی کا اس میں کیا دوش ہے؟''
''یہ اس کا بھائی ہے۔'' ہیرا بولا۔
''ارے تو یہ تو نہیں کہتا اس سے کچھ، اس بیچارے کو تم نے کیوں مارا۔'' ٹھاکر بولا۔
''اس سے کہو ٹھاکر کہ تلاش کر کے لائے اپنی بہن کو، اسے پکڑ کر لائے بستی والوں کے سامنے۔'' جنک رام بولا۔
''اور تم سب چوڑیاں پہن کر گھروں میں جا گھسو۔'' ٹھاکر آنکھیں نکال کر بولا۔
''ہمارے دل میں جو چتا سلگ رہی ہے ٹھاکر...... تم اسے نہیں دیکھ رہے۔'' جنک رام بولا۔
''سب کچھ دیکھ رہا ہوں، بہت کچھ خبر ہے مجھے۔ دل کا حال بھی جانتا ہوں مگر یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سب مل کر ڈھونڈو اسے یہ بھی ڈھونڈے گا۔ تمہارے بیچ کچھ نہیں بولے گا، کھولو اسے اور خبردار اس کے بعد کسی نے اسے ہاتھ لگایا، ارے مادھو کھول دے اسے۔'' ایک دُبلا پتلا آدمی تلسیا کے بدن سے رسّی کھولنے لگا۔ ''اور تم جاؤ داروغہ جی بس پوچھ لیا ہم نے تم سے۔'' اس بار ٹھاکر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے نوکر مادھو سے بولا۔ ''اسے اندر لے جا ہلدی چونا لگا دے، مار مار کر حلیہ بگاڑ دیا سسرے کا...... ابے شکل کیا دیکھ رہا ہے بیری لے جا اندر۔'' آخر میں ٹھاکر جی نے کڑک کر مادھو سے کہا اور مادھو تلسی کا ہاتھ پکڑ کر اندر جانے کیلئے مڑ گیا۔ ٹھاکر صاحب دوسروں سے بولے۔
''جاؤ بھائیو گھروں کو جاؤ۔ پہلے بھی برا ہوا تھا، اب بھی برا ہوا ہے مگر بات ایسے کیسے بنے گی۔ گدھے پر بس نہیں چلا گدھیا کے کان اینٹھے۔ اب تو ڈائن کا پتہ بھی چل گیا، بھاگ بھری کو پکڑ لو مگر سنو جو میں کہہ رہا ہوں، میں مکھیا ہوں جمال گڑھی کا، خود فیصلہ مت کر بیٹھنا پولیس بلوا لوں گا، بھاگ بھری مل جائے تو باندھ کر میرے پاس لے آنا سسری کو۔''
لوگ منتشر ہونے لگے، میں بھی پلٹ پڑا۔ تھوڑی دُور چلا تھا کہ اللہ دین میرے قریب آ گیا۔ ''خوب آئے بھیا مسافر تم ہماری جمال گڑھی میں، کھیل ہی نیارے ہو گئے۔''
''ارے تم اللہ دین کہاں غائب ہو گئے تھے۔''
''ارے بس مسافر بھیا بہتیرے کام تھے رگھبیر رام کے بیٹے کے کریا کرم میں شمشان گئے تھے پھر بے چارے تلسیا کی گھڑنت دیکھتے رہے، ٹھاکر کے آدمی نہ پہنچ جاتے تو جنک رام اس کا بھی کریا کرم کرا دیتا۔ بڑا لٹھیت ہے وہ۔''
''تلسی کو مارنا تو غلط تھا۔'' میں نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
''وہ تو ہے پر جنک رام پر تو خون سوار ہے۔''
''میرے خیال میں بری بات تھی۔ تمہارا یہ مکھیا عجیب نہیں ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اسی نے تلسی کو پٹوایا ہوگا۔''
''ارے مسافر بھیا، تم نے تو اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔'' اللہ دین نے قہقہہ لگایا۔ ''منہ دیکھتا رہ گیا تمہارا۔''
''متعصب آدمی معلوم ہوتا ہے، عجیب سے انداز میں کہہ رہا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔''
''نا مسافر بھیا نا...... آدمی برا نہیں ہے۔ اصل بات بتاؤں؟''

''کیا۔''

''ذات کا ٹھاکر نہیں ہے، بنا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اہیر ہے ہرنام پور کا، ٹھکرائن گیتا نندی کا من بھایا تھا۔ انہوں نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر شادی کر لی ان سے...... ہرنام پور کے ٹھاکر سدھا نندی نے دولت جائیداد دے کر دُور جمال گڑھی میں پھنکوا دیا۔ یہاں ٹھاکر کہلایا، اپنے آپ مکھیا بن گیا۔ دولت کے آگے کون بولے، سب نے مکھیا مان لیا۔ سوچے ہے سب سلام کریں، سر جھکائیں اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''اور کوئی سر نہیں جھکائے تو؟''

''خود جھک جائے ہے۔ سب کو پتہ چل گیا ہے کہ کیسا آدمی ہے، اس لیے لوگ اس کا مان رکھ لیں ہیں۔''

''دلچسپ بات ہے۔ اب ہوگا کیا؟''

''یہ تو مولا ہی جانے ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بھاگ بھری پاگل تو ہے مگر...... مولا جانے ایسی کیوں ہوگئی۔ چھوڑیں گے نا یہ لوگ اسے۔ سسری بستی سے بھاگ ہی جائے تو اچھا ہے۔'' اللہ دین نے دُکھی لہجے میں کہا۔ سرائے آگئی تھی۔

''زبیدہ بہن کھانا پکایا ہے کیا؟''

''ہاں مونگ کی دال میں پالک ڈالا ہے۔ مگر پیسے نہیں دیئے تھے تم نے۔''

''اری خدا کی بندی۔ اری خدا کی بندی۔ کچھ تو آنکھ کی شرم رکھا کر!''

''لو گھوڑا گھاس سے یاری کرے تو کھائے کیا۔''

''بہن ٹھیک کہہ رہی ہیں اللہ دین بھائی۔ آپ نے ویسے ہی میرے ساتھ رعایت کرا دی ہے۔ یہ پیسے بہن!'' میں نے مطلوبہ پیسے دے دیئے بلکہ باقی پیسے بھی دے دیئے اور کہا کہ کل مزید پیسے دوں گا۔ ورنہ یہاں سے چلا جاؤں گا۔

رات ہوگئی۔ چاروں طرف سناٹا پھیل گیا۔ باہر مٹی کے تیل کا اسٹریٹ لیمپ روشن تھا جس کی روشنی ایک کھڑکی کے شیشے سے چھن کر آ رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ حکم ملا تھا جمال گڑھی جاؤں وہاں سے بلاوا ہے۔ آ گیا تھا۔ واقعہ بھی میرے ہمرکاب تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نہ جانے کتنا وقت انہی سوچوں میں گزر گیا پھر ذہن نے فیصلہ کیا اور اُٹھ گیا۔ مٹکے میں پانی موجود تھا، لوٹا بھی تھا۔ وضو کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ بری طرح اُچھل پڑا، ''لینا پکڑنا۔ جانے نہ پائے، پکڑو'' کی بھیانک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

بے اختیار باہر لپکا اور دروازہ کھول کر نکل آیا۔ دس پندرہ افراد پتھراؤ کر رہے تھے، کوئی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ غور سے دیکھا تو ایک دلدوز منظر نظر آیا۔ وہی عورت بھاگ بھری، تلسی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ تلسی شاید اسے بچانے کیلئے اس کے اُوپر گر پڑا تھا اور پتھر کھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں بازوؤں میں چھپا رکھا تھا اور پتھر اس کے بدن پر پڑ رہے تھے۔ پورا جسم تھرا کر رہ گیا۔ بے بسی سے دیکھتا رہا، کیا کرتا۔ اچانک تلسی اُچھل کر دُور جا گرا۔ بھاگ بھری نے اسے اُچھال دیا تھا۔ پھر اس نے بھیانک چیخ ماری، اس کا چہرہ اور سر کے بال خون سے رنگین ہو رہے تھے اور اتنی بھیانک لگ رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے ایک دُوسری منمناتی ہوئی چیخ ماری اور پتھراؤ کرنے والوں کی طرف لپکی۔ سارے کے سارے سورما اس طرح پلٹ کر بھاگے کہ ہنسی آ جائے۔ دس بارہ تھے اور بڑھتے جا رہے تھے، مگر سب جی چھوڑ بھاگے۔ بھاگ بھری نے دو تین لمبی لمبی چھلانگیں ماریں اور پھر ایک طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرے پیچھے اللہ دین آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیا ہو گیا، کیا ہوا مسافر بھیا؟''

''شاید بھاگ بھری آئی تھی۔''

''پھر......''

''لوگوں نے اسے پتھر مارے، جب وہ ان پر دوڑی تو وہ بھی بھاگ گئے اور بھاگ بھری بھی غائب ہوگئی۔''

''ارے، وہ تلسی ہے اسے کیا ہو گیا۔ تلسی ارے او تلسیا؟''
''ٹھور مار دئی بھیا، جان نکال دی ہائے رام۔'' تلسی رونے اور کراہنے لگا اور اللہ دین اس کے پاس پہنچ گیا۔
''ارے ارے یہ پتھر، کیا انہوں نے پتھر مارے ہیں تجھے بھی؟'' ابھی اللہ دین نے اتنا ہی کہا تھا کہ مارنے والے شور مچاتے ہوئے دوبارہ آ گئے۔ وہ سب غصّے سے پھنکار رہے تھے۔
''کہاں گئی بھاگ بھری، کہاں چھپا دیا ہے۔''
''گھر میں گھسی ہے۔ نکال لاؤ، جاؤ۔ ہاں نہیں تو مار مار کر ہماری جان نکال دئی۔'' تلسی نے روتے ہوئے کہا۔
''تو نے اسے بھگایا ہے، تو نے اسے پتھروں سے بچایا ہے۔ نہیں تو آج وہ ماری جاتی۔'' کسی نے کہا۔
''تو رک کاہے گئے، مار مار پتھر ہماری چورن بنائے دیو، کون روکے ہے تمکا۔'' تلسی بولا۔
''تو نے مکھیا جی کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ تو بھاگ بھری کو پکڑوائے گا۔ بستی کے دُوسرے لوگوں کی طرح مگر تو نے اس کی حفاظت کی۔'' ایک اور شخص نے الزام لگایا۔
''ارے تو بار حفاجت۔ چلو جراتم لوگ مکھیا کے پاس، ہم اسے بتائیں کہ ہم بھاگ بھری کو دبوچ لیں کہ وہ لمبی نہ ہو جائے پر ای سب نے ہمکا پتھر مار مار کر ہٹا دین اور اوکا نکلوا دین۔'' تلسی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔
اس بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر تلسی سے ہمدردی سے کہا۔
''تو نے اس لیے پکڑا تھا تلسی؟''
''ارے جاؤ بس جاؤ تم لوگ بڑے سورما ہو، مرے کو مارو ہو۔'' لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ پھر سناٹا ہو گیا۔ تلسی اب بھی رو رہا تھا، بچوں کی طرح ہیں ہیں کر کے اور نہ جانے کیوں میرا دل کٹ رہا تھا۔ اللہ دین آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔
''اُٹھ تلسیا۔'' اس نے تلسی کا بازو پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا اور وہ اُٹھ گیا۔
''بڑا مارا ہے ہمکا سب نے دینو بھیا، صبح سے مار رہے ہیں!'' وہ بدستور روتا ہوا بولا۔
''آ میرے ساتھ اندر آ جا۔'' اللہ دین اسے سرائے میں لے آیا۔ اندر لا کر بٹھایا اور پھر آواز دی۔ زبیدہ اری کیا گھوڑے بیچ کر سوئی ہے، ایک پیالہ دُودھ لے آ......
''ہم نا پی ہے دینو بھیا، جی نہ چاہ رہا بھیا۔'' تلسی اب بھی اسی طرح رو رہا تھا۔
''چپ تو ہو جا تلسی، کیا زیادہ چوٹ لگی ہے؟'' اللہ دین نے ہمدردی سے کہا۔
''ارے ہم چوٹ پر نا رور ہے۔ ہمار من تو بہنیا کے لیے رووے ہے، ماتا کی سوگند دیکھو بھیا ہمار بہنیا ڈائن نہ ہے۔ ہم اسے جانیں ہیں۔ او سسری تو کھود بھاگ جلی ہے۔ اولاد کے دُکھ کی ماری۔ تم کھود دیکھت رہے ہو بچے اسے پتھر ماریں ہیں۔ وہ ان سے کچھ کہے ہے کبھی۔''
''مگر تلسی صبح کو اسے مسافر بھیا نے دیکھا تھا۔'' اللہ دین بولا۔
''ارے پگلیا تو ہے ہی، ڈولت ڈولت پھرے ہے۔ شریر پڑا دیکھا ہوگا رگھبیرا کے چھورا کا۔ بیٹھ گئی ہوگی۔ ٹٹولنے لگی ہوگی۔ کھون لگ گیا ہاتھ منہ پر، کسی نے اسے کلیجہ کھاتے ہوئے دیکھا؟
میرا دل دھک سے ہو گیا۔ ایسا ہو سکتا تھا، یہ ممکن تھا۔ یہ انکشاف میں نے کیا تھا۔ بستی والوں کو میرے ذریعہ یہ سب ہوا تھا، میں پتھرا گیا۔ تلسی کہہ رہا تھا۔ ''اب اللہ دین بھیا لاگو ہو گئے ہیں، مار ڈالیں گے ہمار بہنیا کو سب مل کر......''
''نہیں تلسی۔ ایسا نہیں ہوگا۔'' میرے منہ سے نکلا۔
''ایسا ہی ہوگا ہمکا پتہ ہے۔''
''اگر بھاگ بھری نے دیوانگی میں، ان بچوں کو مار کر ان کا کلیجہ نہیں کھا لیا ہے تلسی تو میں وعدہ کرتا ہوں جمال گڑھی

والوں کی یہ غلط فہمی دُور کر دوں گا۔ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو پھر مجبوری ہے۔''

''تو یہیں سو جا تلسی اپنے گھر مت جا۔''

''نا دینو بھیا گھر جانے دو اگر وہ پھر آ گئی تو۔ دینو بھیا ہم کوئی اسے پکڑ تھوڑی رہے تھے۔ ہم تو اسے بچا رہے تھے۔ اس پر پڑنے والے پتھر کھا رہے تھے۔ بہنیا ہے ہمار وہ۔ ارے ہم اسے نا مرنے دیں گے اسے۔ چلے بھیا تمہاری مہربانی۔'' وہ وہاں سے چلا گیا۔

بہت دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ ''اللہ دین بھائی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ ڈائن ہے۔''

''مولا جانے۔'' اللہ دین گہری سانس لے کر بولا۔

''ایک بات بتاؤ اللہ دین۔''

''ہوں۔''

''بستی والے مکھیا کی بات مانتے ہیں؟''

''بہت، کسی بات پر ٹیڑھا ہو جائے تو سب سیدھے ہو جاتے ہیں۔''

''میں مکھیا سے ملوں گا۔ اس سے کہوں گا کہ وہ بستی والوں کا جنون ختم کرے۔ ان سے کہے کہ وہ خود کھوج کر رہا ہے۔ پتہ چل گیا کہ بھاگ بھری ہی ڈائن ہے تو وہ خود اسے سزا دے گا۔ اس نے بستی والوں سے یہ بات کہی بھی تھی۔'' میں نے یہ جملے کہے ہی تھے کہ اندر سے زبیدہ کی آواز سنائی دی۔

''ارے اب اندر آؤ گے یا باہر ہی رہو گے۔ میں کب سے بیٹھی ہوں۔''

''جاگ رہی ہے؟ اچھا مسافر بھیا آرام کرو۔'' اللہ دین اندر چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ باوضو تھا اور اس ہنگامے سے پہلے ایک ارادہ کر کے اٹھا تھا چنانچہ اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا۔ ایک صاف ستھری جگہ منتخب کی اور وہاں دوزانو بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے درود شریف بخشا گیا تھا۔ یوں تو کلام الٰہی کا ہر زیر زبر پیش مد اور جزم اپنی جگہ آسمان ہے مگر مجھے رہنمائی کے لیے درود پاک عطا کیا گیا تھا، چنانچہ آنکھیں بند کر کے میں نے ورد شروع کر دیا۔ پڑھتا رہا ذہن سوسا گیا مگر ہونٹوں سے درود پاک جاری رہا۔ تب میرے ذہن میں کچھ خاکے اُبھرنے لگے۔ ایک بندر کی شکل اُبھری جو تاج پہنے ہوئے تھا پھر ایک عمارت کا خاکہ اُبھرنے لگا۔ بندر کے قدموں میں کوئی سیاہ سی شے پھڑک رہی تھی، سمجھ میں نہ آ سکا کیا ہے۔ عمارت کے محراب نما دروازے پھر ایک چہرہ۔ پہلے آنکھیں پھر ناک اور ہونٹ پھر پورا چہرہ۔ ایک مکمل چہرہ جو کسی عورت کا تھا۔ اس کے بعد دماغ کو جھٹکا سا لگا اور میں جیسے جاگ گیا۔ میری پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ چہرہ یاد تھا، عمارت کے نقوش یاد تھے اور بس۔ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا اس کے بعد دوبارہ درود شریف پڑھنا شروع کیا۔ اور وضاحت چاہتا تھا لیکن شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا جانا تھا اس لیے نیند آ گئی اور وہیں لڑھک کر سو گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا سوتے ہوئے کہ اچانک ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور پھر مسلسل چیخیں اُبھرنے لگیں۔ ایک لمحے تو دماغ سناٹے میں رہا پھر احساس ہوا کہ چیخوں کی آوازیں زبیدہ اور اللہ دین کی ہیں۔ اٹھا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ زبیدہ ہی تھی اور اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔

''ہو، ہو، ہو۔'' اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ چہرہ خوف کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ کمرے کے دروازے کی طرف اٹھا ہوا تھا اور وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر دہشت نے زبان لڑکھڑا دی تھی۔ چیخوں کی آواز کے سوا کچھ منہ سے نہیں نکل پا رہا تھا۔ اللہ دین بھیا کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ان دونوں کو سنبھالنا تو مشکل تھا مگر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے اس کمرے میں ہے جس میں یہ سوتے ہیں چنانچہ اللہ کا نام لے کر کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور اس کی مدھم مٹیالی روشنی کمرے کے ماحول کو اور خوفناک بنا رہی تھی۔ بستر پر کلو بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ کلو...... کلو...... ساکت ہے! اتنے شور و

شرابے کے باوجود اس کے بدن میں جنبش نہیں ہے۔ تو کیا وہ......؟ مگر یہ سوچ مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک چوڑے پلنگ کے نیچے سے دو ہاتھ باہر نکلے اور انہوں نے برق رفتاری سے میرے دونوں پاؤں پکڑ کر کھینچے۔ میں توازن نہ سنبھال سکا اور دھڑام سے نیچے آ رہا۔ میرے گرتے ہی ایک بھیانک وجود پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں میرے سینے پر آ چڑھا تھا اور میرے اعضاء بالکل ساکت ہو گئے تھے۔

خوفناک وجود ایک لمحے میرے سینے پر سوار رہا پھر اس نے ایک اور چیخ ماری اور میرے سینے سے اتر کر دروازے کی طرف لپکا اور جھپاک سے باہر نکل گیا۔ اللہ دین دوبارہ چیخا۔ زبیدہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ دین خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''نکل گئی، نکل گئی۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پہلے اللہ دین کے بیٹے کلو کو دیکھا۔ بغور دیکھنے سے اندازہ ہو گیا کہ بچہ گہری نیند سو رہا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ اندازے سے میں نے ایک خوفناک وجود کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ بھاگ بھری ہی ہو سکتی تھی۔ اللہ دین ایک طرف بیوی کو سنبھال رہا تھا اور دوسری طرف بیٹے کیلئے فکر مند تھا۔

''تمہارا بیٹا سو رہا ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''ارے زبیدہ، ہوش میں آ......! کلو ٹھیک ہے، اسے کچھ نہیں ہوا۔'' اللہ دین نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور میرے پاس آ کر کلو کو دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مولا تیرا شکر ہے۔''

''وہ بھاگ بھری تھی......؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے ہاں! اس سسری نے تو ناک میں دم ہی کر دیا۔ لو یہاں بھی آ گھسی۔ اب کیا ہوگا؟ مولا نہ کرے اگر ہم جاگ نہ جاتے تو......!''

''کیا ہوا تھا......؟''

''بس مسافر بھیا! یہ دھماچوکڑی ہوئی تو دروازہ کھلا رہ گیا۔ ہم سو گئے تھے، کسی کھٹکے سے آنکھ کھلی تو اس بھیڑنی کو دیکھا، کلو پر جھکی ہوئی تھی۔ ہم سمجھے کہ مولا نہ کرے......! مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اللہ دین سجدے کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد زبیدہ بیگم ہوش میں آ گئیں۔ چیخیں مار کر رونے لگیں۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین آیا کہ کلو زندہ ہے۔ نہ جانے کیا کیا اول فول بکنے لگیں۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ رات تقریباً پوری گزر چکی تھی۔ اس کے بعد نیند نہیں آئی۔ نماز سے فراغت پا کر باہر نکل آیا۔ بڑی خوشگوار صبح تھی۔ ننھے منے پرندے چہلیں کر رہے تھے۔ اللہ دین بھی میرے پاس آ گیا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ فکر مندی سے بولا۔ ''بڑی مشکل آ گئی مسافر بھیا...... اب ہوگا کیا؟''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، فکر مت کرو۔''

''گھر والی تو بری طرح ڈر گئی ہے۔ بخار آ گیا ہے بے چاری کو...... ویسے اب تو کچھ گڑبڑ لگے ہی ہے مسافر بھیا!''

''کیا......؟''

''بھاگ بھری ڈائن بن ہی گئی۔ بال بال بچ گیا ہمارا کلو!'' اللہ دین نے کہا۔ میرے پاس کہنے کیلئے کچھ نہیں تھا، کیا کہتا۔ کوئی فیصلہ کن بات کہنا مشکل ہی تھا۔

''چائے بنا لیں، ناشتے میں کیا کھاؤ گے؟''

''جو بھی مل جائے۔'' میں نے کہا اور اللہ دین چلا گیا۔ میں خیالات میں کھو گیا۔ وہ چہرہ اور وہ عمارت یاد تھی جسے مراقبے کے عالم میں دیکھا تھا۔ ہدایت کی گئی تھی کہ اب خود پر بھروسہ کروں۔ کمبل واپس لے لیا گیا تھا۔ امتحان تھا مگر دل کو یقین تھا کہ امتحان میں پورا اتارنے والی بھی وہی ذات باری ہے جس نے اس امتحان کا آغاز کیا ہے۔ خیالوں میں جیب میں ہاتھ چلا گیا۔ کوئی مانوس شے نظر آئی، نکال کر دیکھا تو چار روپے تھے۔ یہ تائید غیبی تھی۔ مجھے اس اعتماد پر یقین دلایا گیا تھا جو میرے دل میں تھا۔ میرا وظیفہ مجھے عطا کر دیا گیا تھا۔ بڑی تقویت ملی۔ دل کو اور اطمینان ہو گیا کہ جو کچھ ہوگا، بہتر ہوگا۔ چائے پیتے ہوئے

تین روپے اللہ دین کو دے دیئے۔ وہ بولا۔ ''شرمندہ کر رہے ہو مسافر بھیا! مگر اتنے کاہے کو......؟''

''بس حساب رکھنا، کل، پھر دوں گا۔'' اللہ دین نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ کوئی نو بجے ہوں گے کہ تلسی کراہتا ہوا آ گیا۔

''بخار چڑھ گیا ہے سسرا...... بھیا دینو، ایک اٹھنی ادھار دے دو گے؟''

''ہاں...... ہاں! کیوں نہیں، یہ لو۔'' اللہ دین نے جیب سے اٹھنی نکال لی۔

''یہ روپیہ بھی لے تو تلسی! فالتو پڑا ہے میری جیب میں۔'' میں نے جیب سے روپیہ نکال کر تلسی کو دیا جو اس نے بڑی مشکل سے لیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں بستی گھومنے نکل گیا۔ آبادی بہت چھوٹی تھی۔ ایک مسجد بھی بنی ہوئی تھی مگر نہایت شکستہ حالت میں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں نظر آیا۔ اندر داخل ہو گیا، صفائی ستھرائی کی۔ اذان بھی نہیں ہوئی، میں نے خود اذان دی لیکن ایک بھی نمازی نہ آیا۔ نماز سے فارغ ہو کر گھومنے نکل گیا۔ کھیتوں اور جنگلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہاں! کافی دور نکل آنے کے بعد ایک مٹھ نظر آیا۔ اس کے عقب میں ایک سیاہ رنگت عمارت بھی نظر آئی تھی۔ قدم اسی جانب اٹھ گئے۔ عمارت کے اطراف میں انسانی قد سے اونچی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان پتلی سی پگڈنڈی بھی پھیلی ہوئی تھی جو اسی عمارت تک جاتی تھی۔ میں اسی پگڈنڈی پر آگے بڑھتا رہا۔ راستے میں کئی جگہ سانپوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی تھی۔ یقیناً ان جھاڑیوں میں سانپ موجود تھے۔ ویرانے میں بنی ہوئی یہ عمارت بڑی عجیب نظر آ رہی تھی لیکن میرے لئے بہت دلچسپی کا باعث تھی۔ چنانچہ میں آگے بڑھتا ہوا اس کے دروازے پر پہنچ گیا اور پھر اچانک ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ عالم استغراق میں جو عمارت میں نے دیکھی تھی، اس وقت یقیناً وہی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ کم از کم اس سلسلے میں مجھے اپنی یادداشت پر بھروسہ تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مقصد ہے کہ جو نشاندہی کی گئی تھی، وہ بالکل مکمل تھی اور یقینی طور پر مجھے یہاں سے کوئی رہنمائی ملے گی۔ وہی محرابیں، وہی انداز...... آگے بڑھتا ہوا اس بڑے سے ٹھنڈے ہال میں پہنچ گیا جو نیم تاریک تھا، روشن دانوں سے جھلکنے والی کچھ روشنی نے ماحول کو تھوڑا سا منور کر دیا تھا ورنہ شاید نظر بھی نہ آتا۔ درمیان میں ہنومان کا بت ایستادہ تھا۔ ہاتھ میں گرز لئے، ہنومان کا بت بہت خوفناک نظر آ رہا تھا اور اس سنسان ماحول میں یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بت اپنی جگہ سے آگے بڑھے گا اور مجھ پر حملہ کر دے گا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک دیکھی حالانکہ پتھر کا تراشا ہوا بت تھا لیکن آنکھیں جاندار معلوم ہوتی تھیں۔ میں ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا لیکن بت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ یہ صرف تنہائی اور ماحول کا دیا ہوا ایک تصور تھا البتہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میری رہنمائی بے مقصد نہ کی گئی ہوگی۔ آگے بڑھ کر بت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ہلکی ہلکی سرسراہٹوں سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے آس پاس کہیں کوئی موجود ہے لیکن نظر کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بت کے قدموں میں دیکھا اور دو زانو بیٹھ کر دیکھنے لگا۔

✦✦✦✦✦

عالم استغراق میں مجھے ان قدموں کے نزدیک کوئی سیاہ شے پھڑکتی ہوئی نظر آئی تھی لیکن نظر کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہاں، خون کے چند دھبے نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے حالانکہ ان کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ سے خون کو تھوڑا سا رگڑ کر دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے چھٹ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ذرات میری انگلی میں لگے رہ گئے اس کے بعد میں نے اس ہال کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا۔ اندرونی سمت ایک دروازہ بنا ہوا تھا، ہمت کر کے میں اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا ایک کمرہ تھا لیکن بالکل خالی! کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی۔ وہاں سے باہر نکل آیا اور یوں لگا جیسے کوئی بھاگ کر دروازے سے باہر نکل گیا ہو۔ تیزی سے دوڑتا ہوا باہر آیا اور دور دور تک نگاہیں دوڑائیں لیکن اگر کوئی تھا بھی تو اسے تلاش کرنا ناممکن تھا کیونکہ آس پاس بکھری ہوئی جھاڑیوں میں تو اگر سیکڑوں انسان بھی چھپ جاتے تو ان کا سراغ لگانا مشکل ہوتا۔ یہ جگہ یقینی طور پر بہت پراسرار تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کا تعاقب کرتا ہوا میں باہر نکلا تھا لیکن ابھی وہاں بہت سی چیزیں جائزہ لینے کیلئے موجود تھیں چنانچہ پھر اندر داخل ہو گیا اور ایک بار پھر ہال میں ادھر ادھر دیواروں، کونوں، کھدروں کو تلاش کرنے لگا۔

صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ یہ جگہ انسانی پہنچ سے دور نہیں ہے۔ دیوار میں دو مشعلیں گڑھی ہوئی تھیں جن میں نجانے کیا چیز جو ڈالی جاتی تھی۔ روئی سے بنی ہوئی بتیاں ان مشعلوں میں تراشے ہوئے دیوں میں پڑی ہوئی تھیں اور ایک عجیب سے رنگ کا موم جیسا مادہ بھی موجود تھا۔ یہ بتیاں یقیناً روشن کردی جاتی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے یہاں پوجا ہوتی ہو۔ ظاہر ہے مذہب کے متوالے اپنے اپنے دھرم کے مطابق یہ عمل کرتے ہی ہیں لیکن جگہ بے حد بھیانک اور پراسرار تھی۔ میں نے اس کا پورا پورا جائزہ لیا اور اس کے بعد وہاں سے بھی باہر نکل آیا۔ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک بار پھر کھیتوں کے قریب پہنچا۔ چار پانچ افراد پر مشتمل ایک گروہ نظر آیا جو ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب غیر مانوس شکلیں تھیں لیکن وہ شاید مجھے جانتے تھے۔ تیکھی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے اور میری طرف اشارہ کرکے باتیں کرنے لگے۔ میں خود ہی ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا کررہے ہو بھائی......؟''

''اسی چڑیل کو تلاش کررہے ہیں۔ ڈائن بچ کر کہاں جائے گی ہمارے ہاتھوں سے! ارے بستی میں آگ لگا دی ہے اس نے، ہر گھر میں رونا پیٹنا مچا ہوا ہے اس کی وجہ سے......! بھگوان کی سوگند نظر آجائے، جیتا نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ پھر مکانوں کے بیچ سے نکلا تھا کہ سامنے مکھیا کا گھر نظر آگیا۔ غالباً یہ عقبی راستہ تھا۔ یونہی ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور اس گھر کے قریب پہنچ گیا لیکن آج بھی وہاں تماشا ہورہا تھا۔ بیچارے تلسی کو دیکھا جسے دو آدمی پکڑے ہوئے لا رہے تھے اور چار پانچ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ چوپال کی جگہ ٹھاکر صاحب بدستور بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ دوپہر کا وقت تھا لیکن ٹھاکر صاحب قصہ نمٹانے آگئے تھے۔ میں بھی تیز قدموں سے آگے بڑھتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹھاکر صاحب کسی قدر ناخوشگوار انداز میں ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے۔ ''ارے تم اس بیچارے کے پیچھے کاہے پڑ گئے ہو۔ آخر مار دو سسرے کو، دولٹھیاں مارو بھیجہ نکال باہر کرو، جان تو چھوٹے!''

''ٹھاکر جی! جھوٹ نہیں کہہ رہے ہم لوگ، سوگند لے لو ہم سے بھی اور اس سے بھی! اس سے پوچھو رات کو بھاگ بھری اس کے پاس آئی تھی یا نہیں......؟''

''کیوں رے بتا بھائی بتا! کیا کریں تیرا ہم، ارے بستی چھوڑ کر ہی چلا جا پاپی! کہیں مارا جائے گا ان لوگوں کے ہاتھوں۔ دھت تمہارے کی۔ ارے آئی تھی وہ کیا تیرے پاس......؟''

''آئی تھی ٹھاکر!''

''تو پھر تو نے پکڑا اسے......؟''

''پکڑا تھا مگر ان لوگوں نے پتھر مار مار کر ہمارا ستیاناس کردیا۔ وہ ہمیں دھکا دے کر نکل بھاگی۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے ٹھاکر! اس نے اسے پتھروں سے بچانے کیلئے اپنے بدن کے نیچے چھپا لیا تھا۔''

''تو پاپیو، بھیا تو ہے نا کیا کرتا۔ ارے تم لوگوں کا بھگوان کا خوف ہے کہ نہیں۔ ساری بستی پر تباہی لاؤ گے۔ تم مجھے بتاؤ، ٹھنڈے من سے بتاؤ، سوچ کر بتاؤ۔ تمہاری بہن پاگل ہوجاتی۔ کوئی اس پر الزام لگا دے کہ وہ ڈائن ہے اور تم نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو تو کیا مروا دو گے اسے بستی والوں کے ہاتھوں، پتھر مار مار کر سر کھلوا دو گے اس کا! ارے اس نے اگر ایسا کیا بھی ہے تو کونسا برا کام کیا کیا۔ تم یہ بات کہنا چاہتے ہو کہ یہ بھی اپنی بہن کے ساتھ بچوں کو مارتا ہے۔ بولو جواب دو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس بیچارے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ جاؤ پکڑ لو کہیں سے بھاگ بھری کو، لے آؤ سسری کو میرے پاس! میں خود تم سے کہوں گا کہ جان نکال لو اس کی۔ ارے کسی نے ٹھیک سے دیکھا تو ہے نہیں اور پڑ گئے پیچھے۔ دیکھو میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب جیسے کہہ رہا ہوں، اسے سمجھ لو۔ تلسی کو اس کے بعد اگر کسی نے ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا اور بھاگ بھری کے بارے میں بھی میں تم سے یہی کہتا ہوں۔ دیکھ لو، پکڑ لو تو جان سے مت مارنا۔ پہلے میرے سامنے لے آنا۔ وہ تم میں سے کسی کو نہیں کھا جائے گی۔ سمجھے سورماؤ! اس بیچارے کو بار بار پکڑ کرلے آتے ہو۔''

''یہ انصاف نہیں ہے ٹھاکر صاحب!'' یہ آواز جنک رام کی تھی۔

''ارے جنک رام! بھیا ہم جانیں ہیں تیرے من میں آگ لگی ہے پر ایسا تو نہ کر جیسا تو کر رہا ہے۔ بھاگ بھری کو ایک بار بھی پکڑ کر لے آئے گا تو ہم تجھ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس بیچارے کی جان کے پیچھے کیوں لگ گئے ہو تم لوگ، دیکھ تلسیا...... ! بھاگ بھری اگر تیرے پاس آجائے تو بھیا مت بنیو اس کا! پکڑ کر ہمارے پاس لے آنا۔ ارے ہم بھی تو دیکھیں ذرا ڈائن کو کھلی آنکھوں سے! پتا تو چل ہی جائے گا، سسری کب تک چھپے گی۔ تم لوگوں نے تو بھیا مغز خراب کر کے رکھ دیا۔'' ٹھاکر کوبلی رام دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا۔

''اسے کچھ نہیں کہو گے ٹھاکر......؟'' جنک رام بولا۔

''کیا کہیں اور کیا کہیں! بتاؤ اور کیا کہیں؟ ادھر آ رے تلسیا! ادھر آ ہمارے پاس۔'' تلسی آگے بڑھ کر اس کے پاس آگیا۔ ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چونک پڑا۔ ''ارے تجھے تو تاپ چڑھا ہوا ہے۔''

''کل سے پٹ رہا ہوں ٹھاکر! دن بھر مارا، رات کو مارا، تاپ نہ چڑھے گا تو کیا ہوگا۔'' تلسی مظلومیت سے بولا اور ٹھاکر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''پاپیو...... ! جان لئے بنا نا چھوڑو گے اسے! ارے کچھ شرم کرو، کچھ شرم کرو۔ سنو رے! کان کھول کر سن لو سب کے سب، جنک رام! تو بھی سن لے بھیا۔ تیرا دکھ اپنی جگہ مگر تم سب نے مل کر ہمیں کھیا بنایا ہے تو کھیا کا مان بھی دے دو۔ اس کے بعد تلسی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے ورنہ ہم پولیس کو بلائیں گے اور پھر دیکھ لیں گے ایک ایک کو۔''

''اس کا پاٹ لے رہے ہو ٹھاکر!'' کسی نے کہا۔

''چورسیا او چورسیا!'' ٹھاکر نے کسی کو آواز دی اور ایک قوی ہیکل آدمی آگے بڑھ آیا۔ ''دیکھ تو کون سور ما بولا۔ پکڑ لے اسے اور بیس جوتے لگا دے اس کی کھوپڑی پر! کون بولا تھا پاٹ والی بات......؟'' ٹھاکر نے آنکھیں نکال کر مجمع کو گھورتے ہوئے کہا لیکن دوبارہ کوئی نہ بولا۔ ٹھاکر نے اس وقت شاید مجھے دیکھا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''بات سمجھ میں آگئی ہو تو جاؤ، اپنے گھروں کو جاؤ۔ جو کہا ہے، اسے یاد رکھنا ورنہ ذمہ دار خود ہو گے۔ زبان چلاؤ ہو حرام خور ہم سے! جاؤ سب جاؤ۔'' لوگ گردنیں جھکائے چل پڑے۔ میں بھی واپسی کیلئے مڑا تو ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ''ارے او داروغہ جی! تم کہاں چلے، ذرا ادھر آؤ ہمارے پاس۔''

میں جانتا تھا داروغہ کسے کہا گیا ہے، رک گیا۔ مڑ کر ٹھاکر کوبلی رام کے پاس پہنچ گیا۔ ''جی ٹھاکر صاحب......؟''

''مہربانی تمہاری بھائی کہ عزت سے نام لے لیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بھنگی چمار کہو گے ہمیں!''

''آپ یہ کیوں سمجھ رہے تھے ٹھاکر صاحب!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی لگے ہے ہمیں! بیٹھو...... جمال گڑھی میں مہمان آئے ہو، ہم بھی یہیں کے رہنے والے ہیں۔''

''آپ حکم دے کر بلوا لیتے ٹھاکر صاحب! اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرا ہوں۔''

''تم ہمارا حکم کا ہے مانتے بھیا! دبئل میں بسو ہو ہماری کیا۔ دو پور سے سلام تو کیا نا تم نے!''

''سلام اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے ٹھاکر! آپ کی بستی میں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ آپ ضرور جانتے ہوں گے کہ مسلمان کسی کے حکم پر نہیں جھکتے۔''

''ارے بیٹھو تو، دو چار گھڑی کچھ جل پان کرو؟''

''شکریہ! میں بیٹھ جاتا ہوں۔''

''تم خوب پھنسے اس پھیر میں، بستی میں کسی سے ملنے آئے تھے یا ایسے ہی گزر رہے تھے؟''

''بس گزر رہا تھا ٹھاکر! پتا نہیں میری بدقسمتی تھی یا کسی اور کی کہ میں نے وہ منظر دیکھ لیا۔''

''بھگوان جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ! فیصلہ تو بھگوان ہی کرے گا۔ بھاگ بھری باؤلی ہوگئی ہے۔ بچے مر گئے تھے اس کے، پتی بھی مر گیا بے چارہ...... ! مگر ایسا کیسے ہوگیا۔ ایسی عورت ڈائن کیسے بن گئی۔ وہ باؤلی تو ہے۔ ہوسکتا ہے بچے کی لاش

پڑی ہو اور وہ پاگل پن میں اس کے پاس بیٹھ کر اسے ٹٹولنے لگی ہو۔ تم نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ بچے کو مار رہی تھی؟"
"پہلے بھی بتا چکا ہوں، اس کی پیٹھ تھی میری طرف!"
"بھگوان جو کرے، اچھا کرے۔ بستی والے اسے چھوڑیں گے نہیں۔ ہم تو کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ پولیس لا کر بھاگ بھری کو پکڑوا دیں۔ پولیس جانے اور اس کا کام۔" ابھی ٹھاکر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے ایک لمبی تڑنگی عورت نکل آئی اور کرخت لہجے میں بولی۔
"تمہیں پنچایت لگانے کے علاوہ اور کوئی کام بھی ہے؟ جب دیکھو پنچایت لگائے بیٹھے ہو۔ کاکا بلا رہے ہیں اتنی دیر سے۔" میں نے عورت پر نگاہ ڈالی اور دفعتاً دل دھک سے ہو گیا۔ یہ چہرہ اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی چہرہ تھا جسے میں نے مراقبہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اچھے نقوش مگر کرختگی لئے ہوئے...... ٹھاکر بوکھلا گیا۔ جلدی سے اٹھتا ہوا بولا۔
"ہاں...... ہاں! بس آ ہی رہے تھے۔ اچھا بھیا! پھر کبھی آؤ، آدمی بھیجیں گے تمہارے پاس، کبھی جل پان کرو ہمارے ساتھ اچھا!" وہ اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن میرا ذہن چکرایا ہوا تھا۔ وہی چہرہ تھا، سو فیصد وہی چہرہ......! مندر کی عمارت بھی نظر آ گئی تھی اور وہ عورت بھی۔ اب کیا کروں، کیسے کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سرائے واپس آ کر بھی میں سوچتا رہا اور کئی دن سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
جمال گڑھی میں قیام کی پانچویں رات تھی۔ میں پریشان تھا۔ بات کسی طور آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ تین دن سے خاموشی تھی۔ بھاگ بھری بھی شاید دور نکل گئی تھی۔ تین دن سے اسے بستی میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ تلسی البتہ ملتا رہتا تھا۔ اداس اور ملول تھا۔ بات بات میں سسکنے لگتا تھا۔ مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا لیکن میں کیا کر سکتا تھا بے چارے کیلئے۔ ٹھاکر کوہلی رام کے پاس بھی بہت سے چکر لگائے تھے۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ ظاہری کیفیت سے بالکل برعکس...... تلسی کیلئے خود بھی افسردہ تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔
"ہم اسے کسی دوسری بستی بھیج دیں گے۔ انتظام کر رہے ہیں۔ یہاں رہا تو مارا جائے گا۔ بھگوان نہ کرے اور کوئی ایسا واقعہ ہو گیا تو پھر میں بھی شاید بستی والوں کو نہ روک سکوں۔"
رات کے کوئی دس ہی بجے ہوں گے لیکن یوں لگتا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔ جمال گڑھی میں شام سات بجے ہی رات ہو جاتی تھی۔ پانچ چھ بجے تک سارے کاروبار بند ہو جاتے تھے اور لوگ اپنے گھروں میں جا گھستے تھے۔ بس بھولے بھٹکے مسافر آٹھ نو بجے تک نظر آ جاتے تھے ورنہ خاموشی! سر شام ہی بادل گھر آئے تھے اور اس وقت بھی آسمان تاریک تھا۔ اللہ دین رات کے کھانے کے بعد مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں جا گھسا تھا۔ وہ مضبوطی سے سارے دروازے بند کر کے سوتا تھا اور اس نے مجھ سے بھی کہہ دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، رات کو اس کا دروازہ نہ بجاؤں۔ وہ دروازہ نہیں کھولے گا۔ یہ زبیدہ بیگم کی ہدایت تھی۔
مجھ پر اکتاہٹ کا دورہ پڑا تھا۔ اس وقت عجیب سی بے کلی محسوس ہو رہی تھی۔ چارپائی کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ خاموشی سے سرائے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ تلسی کا گھر بھی تاریک پڑا تھا۔ یہاں سے چل پڑا۔ سوچا کہاں جاؤں اور اس ویران مندر کا خیال آیا۔ کوئی کتنا ہی بہادر ہو، اس وقت اس مندر کی طرف رخ کرنے کے تصور ہی سے خوف زدہ ہو جاتا لیکن دل اس سمت جانے کو چاہ رہا تھا۔ میں چل پڑا۔ پوری بستی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی، کتے تک نہیں بھونک رہے تھے۔ فاصلہ کم نہیں تھا۔ بس چلتا رہا۔ راستے میں کسی ذی روح کا نشان بھی نہیں نظر آیا تھا۔ گھنی اور خوفناک جھاڑیاں خاموش کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سے احتیاط سے گزرا تھا کیونکہ وہاں سانپ موجود تھے۔ رات میں تو وہ نظر بھی نہ آتے لیکن اس خوف سے اپنا ارادہ ترک نہیں کر سکا۔ کوئی انجانی قوت مجھے وہاں لے جا رہی تھی۔ تاریک مندر، تاریکی میں اور بھیانک نظر آ رہا تھا لیکن اس کے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی بری طرح چونک پڑا۔ کسی بچے کے سسک سسک کر رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ماں...... ماں! کھول دو، بھگوان کی سوگند اب باہر نہیں جاؤں گا۔ ماں! بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ماں! دیا جلا دو۔ تمہاری بات مانوں گا، باہر نہیں جاؤں گا۔ ماں! رسی میرے پیر کاٹ رہی ہے۔ ماں! پیٹھ میں کھجلی ہو رہی ہے، کھول دو ماں......!''

دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ خون کی روانی طوفانی ہو گئی، کنپٹیاں آگ اگلنے لگیں۔ رکنا بہتر ہوا، اندر داخل ہو جاتا تو یقیناً وہ نہ ہوتا جو دوسرے لمحے ہوا۔ اندر یک بیک روشنی ہو گئی تھی۔ وہی دونوں مشعلیں روشن ہوئی تھیں جو اس دن دیکھی تھیں۔ میں فوراً ایک محراب کے ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ روشنی نے اندر کا ماحول اجاگر کر دیا تھا اور میں اس ماحول کو دیکھ سکتا تھا۔ ہنومان کا بت اسی طرح ایستادہ تھا۔ اس کے پیروں کے نزدیک ایک آٹھ نو سالہ بچہ رسی سے بندھا ہوا پڑا تھا۔ روشنی ہوتے ہی وہ سہم کر ساکت ہو گیا تھا۔ ہنومان کے بت سے کوئی پانچ قدم کے فاصلے پر کالے اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ایک وجود سر نیہوڑائے بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مرد نظر آ رہا تھا جس نے چہرے پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔ سیاہ لباس میں ملبوس وجود کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ بے حد پراسرار اور خوفناک ماحول تھا۔ دم روک دینے والا سناٹا طاری تھا۔ بچے کی سہمی سفید آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ رونا بھول گیا تھا تب ایک آواز ابھری۔ ''نندنا......!''

''جے دیوی......!'' دوسری آواز ابھری۔ پہلی آواز نسوانی تھی اور میں نے اسے فوراً آشنا محسوس کیا تھا۔ دوسری بھاری مردانہ اور اجنبی آواز تھی۔

''ہاتھ پاؤں کھول دے اس کے!''

''جے دیوی......!'' مردانہ آواز نے کہا۔ روشنی میں ایک آبدار خنجر کی چمک ابھری اور ڈھاٹا باندھے ہوئے شخص آگے بڑھ کر بچے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ایک لمحے میں بچے کے ہاتھوں اور پیروں میں بندھی رسیاں کاٹ دیں۔ بچہ تڑپ کر اٹھا تو مرد نے خوفناک آواز میں کہا۔

''لیٹا رہ اپنی جگہ لیٹا۔ ہلا تو گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' سہما ہوا بچہ جیسے بے جان ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ لڑھک گیا۔ سیاہ پوش عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لمبے قد و قامت کی مالک تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر خنجر مرد کے ہاتھ سے لے لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر بچے اور ہنومان کے بت کے قریب پہنچ گئی۔ پھر اس کی بھیانک آواز ابھری۔

''جے بجرنگا......! ساتویں بلی دے رہی ہوں، اسے سویکار کر بجرنگ بلی! میری بھینٹ سویکار کر، میری منوکامنا پوری کر دے، تیرا وچن ہے آخری بلی کے بعد میری گود ہری کر دے۔ مجھے بچہ دے دے بجرنگ بلی! مجھے بیٹا دے دے...... بجرنگ بلی......!''

صورتحال سمجھ میں آ گئی۔ پتا چل گیا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جس قدر بھیانک آواز بنا سکتا تھا، بنا کر چیخا۔ ''بھاگ بھری...... وہ مندر میں گھسی ہے، نہیں پکڑنا۔ وہ رہی، وہ رہی۔'' ایک چھوٹا سنگی مجسمہ رکھا تھا جو میری ٹکر سے زور سے اپنی جگہ سے گرا اور نیچے آ کر چور چور ہو گیا۔ اس کے ٹکڑوں کے گر کر بکھرنے کا چھنا کا مندر میں گونج اٹھا۔ مجھے خود یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ بے شمار لوگ چیخ رہے ہوں اور نتیجہ نکل آیا۔ عورت سے پہلے مرد، باہر بھاگا اور اس کے پیچھے عورت قلانچیں لگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ مشعلیں جلتی چھوڑ گئے تھے، اپنے عمل کو پختہ کرنے کیلئے میں نے اور زور زور سے چیخنا شروع کر دیا، رات کے پر ہول سناٹے میں میری چیخیں دور دور تک پھیل گئیں۔ بچے نے دہشت سے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ چیخ پڑا۔

''مت مارو، مجھے مت مارو...... مت مارو مجھے!''

''اٹھ بیٹے......! میں تجھے نہیں ماروں گا۔ اٹھ! میں تو تجھے بچانے آیا ہوں۔'' کوئی بڑا ہوتا تو شاید زندہ ہی نہ رہ پاتا خوف کے مارے لیکن بچہ تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب باہر نہیں کھیلوں گا۔ مجھے مت مارو چاچا!''

''بالکل نہیں ماروں گا۔ آ میرے ساتھ چل......!'' میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے

ہوئے کہا۔ جانتا تھا کہ باہر خطرہ ہے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں جھاڑیوں میں چھپے ہوں اور اکیلا پا کر حملہ کریں۔ مندر میں رکنے سے اور خطرہ تھا۔ آسانی سے گھیر لیا جاؤں گا۔ کسی نے اگر خبر کردی اور مجھے اس بچے کے ساتھ دیکھ لیا گیا تو حالات بگڑ سکتے تھے۔ نکل جانا ہر طرح سے بہتر ہے۔ اللہ کا نام لے کر باہر نکل آیا۔ رات کے بیکراں سناٹے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ اس وقت تک خاموش رہا جب تک جھاڑیوں کے کھیت سے باہر نہ نکل آیا پھر میں نے بچے سے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تیرا بیٹے......؟''

''للو......!''

''پتا کا نام کیا ہے؟''

''گنگو!''

''تیرا گھر کہاں ہے؟''

''پچھائی پلے!''

''راستہ جانتا ہے اپنے گھر کا؟''

''ہاں......!''

''یہاں تجھے کون لایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ بچے نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

''معلوم نا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو کھیل رہا تھا کہیں؟''

''سو رہا تھا۔''

''کہاں......؟''

''اپنے گھر میں۔ ماتا جی نے کہا تھا کہ ڈائن پھر رہی ہے باہر، کلیجہ نکال کر کھا جائے گی۔ باہر مت کھیلیو۔ ہم تو سو رہے تھے چاچا!''

''پھر تو یہاں کیسے آ گیا؟''

''بھگوان کی سوگند ہمیں نا معلوم ہم تو سمجھے ماتا جی نے پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ اس نے یہی کہا تھا کہ کھیلنے باہر گئے تو وہ ہاتھ، پاؤں باندھ کر ڈال دے گی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ سمجھ گیا تھا کہ بچے کو بے ہوش کر کے لایا گیا تھا اور یقیناً وہی کھیل ہونے والا تھا جو پہلے پانچ بچوں کے ساتھ ہوا پھر چھٹے بچے کے ساتھ اور اب یہ ساتواں بچہ! بستی میں داخل ہو کر بچے سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا اور وہ بتانے لگا۔ گھر والوں کو ابھی تک اس کی گمشدگی کا علم نہیں ہوا تھا کیونکہ گھر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ یقیناً ان لوگوں نے کھولا ہوگا جنہوں نے بچے کو اغواء کیا تھا۔ میں نے للو سے کہا۔

''تیرے گھر والوں کو ابھی کچھ نہیں معلوم، جا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ جا اندر جا......!'' بچہ اندر چلا گیا اور میں فوراً وہاں سے واپس چل پڑا۔ میری آج کی بے کلی نے بہت اہم انکشاف کیا تھا۔ ایک بچے کی جان بچ گئی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ یہاں سرائے میں بھی وہی کیفیت تھی۔ کسی کو نہ میرے جانے کی خبر ہوئی تھی، نہ واپس آنے کی! اپنے کمرے میں آ گیا پھر بستر پر لیٹ کر اس بارے میں سوچنے لگا۔ ڈائن کا معمہ حل ہو گیا تھا۔ بھاگ بھری بے قصور تھی۔ اس پر جھوٹا الزام لگ گیا تھا۔ بستی والے اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ جو آواز میں نے سنی تھی، اسے پہچان لیا تھا۔ میری سماعت نے مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ یہ سو فیصد کو بلی رام کی بیوی کی آواز تھی۔ دوسرا نام نندا کا تھا جو اس کا شریک کار تھا۔ اس کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ ساتویں بلی دے رہی ہوں، میری گود ہری کر دے۔ مجھے بچہ دے دے۔ مجھے بیٹا دے دے۔'' تو یہ قصہ ہے۔ وہی کالا جادو، وہی مکروہ علم! کمبخت عورت نے ایک اولاد کی خاطر چھ چراغ گل کر دیئے تھے۔ اب سب کچھ علم ہو گیا تھا۔ میری رہنمائی کی گئی تھی۔ پہلے

مجھے جمال گڑھی بھیجا گیا اور پھر ہنومان مندر اور اس عورت کی شکل دکھائی گئی اور اب......! سارے انکشافات ہو گئے تھے اور اب اس برائی کا خاتمہ کرنا تھا مگر اس کیلئے کوئی عمل درکار تھا۔

باقی رات سوچوں میں گزر گئی تھی۔

صبح کو اللہ دین کے ساتھ چائے پیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تم نے ٹھاکر کوہلی رام کے بارے میں خوب کہانی سنائی تھی اللہ دین!''

''کونسی کہانی بھیا......؟''

''یہی کہ وہ کھرا ٹھاکر نہیں ہے۔''

''ہاں! وہ مگر کسی سے کہنا نہیں مسافر بھیا! دشمنی ہو جائے گی ٹھاکر سے۔''

''نہیں! مجھے کیا ضرورت ہے۔ ویسے کوئی بچہ نہیں ہے اس کا؟''

''نہیں! بچہ نہیں ہے۔''

''اسے آرزو تو ہو گی؟''

''ہاں ہو گی تو پوجا پاٹھ کراتا رہتا ہے۔ رشی منی آتے رہتے ہیں۔ ٹھکرائن گیتا نندی ٹونے ٹوٹکے کرتی رہتی ہیں۔''

''ہوں!'' میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ اس سے زیادہ کیا کہتا۔ اچانک میں نے کچھ یاد کر کے کہا۔ ''یہ نندا کون ہے؟''

''نندا......!''

''کسی نندا کو جانتے ہو؟''

''نندا...... ہاں تین نندا ہیں جمال گڑھی میں۔''

''کوہلی رام کے ہاں کوئی نندا ہے؟''

''جگت نندا......! ہاں نندا چمار نوکری کرتا ہے وہاں۔ کوئی کام ہے اس سے......؟''

''نہیں! بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ پتا نہیں بے چارے تلسی کا کیا حال ہے۔''

''بخار میں پڑا ہوا ہے۔ میں صبح منہ اندھیرے چائے، روٹی دے آیا تھا بیچارے کو۔''

''ارے اتنی صبح مجھے تو پتا ہی نہ چلا حالانکہ میں جاگ گیا تھا۔'' اللہ دین مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ''کیا کریں مسافر بھیا! عورت چھوٹے دل کی ہووے ہے۔ بیوی کے ڈر کے مارے ایسے کام چھپ کر کر لیتے ہیں۔''

''اوہ اچھا! تم ڈرتے ہو اپنی بیوی سے؟''

''ارے کچھ تو ڈرنا ہی پڑے ہے۔'' اللہ دین نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں بھی ہنسنے لگا تھا۔

یہاں پڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسے ہی گھومنے نکل گیا۔ پھر کسی خیال کے تحت کوہلی رام کے گھر کا رخ کیا۔ سامنے سے گزر رہا تھا کہ کوہلی رام نے کہیں سے دیکھ لیا۔ ایک آدمی اندر سے دوڑا آیا تھا۔

''ٹھاکر جی بلا رہے ہیں۔'' میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ کوہلی رام دروازے کے بعد بغلی سمت بنی ڈیوڑھی میں موجود تھا۔

''آؤ داروغہ جی! کہاں ڈولت گھومت ہو؟''

''بس آپ کی جاگیر میں گھوم رہے ہیں ٹھاکر!''

''بیٹھو...... تم بھی ہمیں من موجی ہی لگو ہو کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میرے منہ سے بے اختیار اپنے شہر کا نام نکل گیا۔ طویل عرصے کے بعد یہ نام نہ جانے کیوں میری زبان پر آ گیا تھا۔ کہہ تو دیا تھا مگر دل میں اینٹھن سی ہوئی تھی

ٹھاکر میرے ہر احساس سے بے نیاز تھا۔ کہنے لگا۔ ''یہاں بستی میں کوئی جان پہچان ہے کیا؟ کیسے آنا ہوا؟''

''بس ٹھاکر صاحب! ایسے ہی سیر سپاٹے کیلئے نکل آیا تھا۔ ہو سکتا ہے جمال گڑھی سے آگے بڑھ جاتا مگر یہاں جو

واقعات دیکھے، دلچسپ لگے سو یہاں رک گیا۔ میں نے کبھی کوئی ڈائن نہیں دیکھی تھی۔ بڑا عجیب سا لگا مجھے اور میں یہ دیکھنے کیلئے رک گیا کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' ٹھاکر کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ اس نے کہا۔

''بس داروغہ جی! کیا بتائیں۔ بستی پر آفت ہی آگئی ہے۔ ہماری تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔ دل دکھتا ہے ان سب کیلئے جن کے بچے مارے گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھاگ بھری کو کیا ہو گیا۔ ارے انسان پاگل تو ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تو بری بیتی تھی مگر اس کے بعد جو کچھ وہ کر رہی ہے، وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم تو کہتے ہیں بھگوان اسے اپنی طرف سے موت دے دے۔ بستی والوں کے ہاتھ لگ گئی تو کچل کچل کر مار دیں گے۔ بستی کی عورت ہے۔ اس کا پتی بھی برا آدمی نہیں تھا پر بیچاری کا گھر بگڑا تو ایسے کہ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں، سوچ سوچ کر!''

''جی ٹھاکر صاحب! کیا کہا جاسکتا ہے۔ ویسے ٹھاکر صاحب! یہ بات تو آپ کو پتا ہی ہے کہ بھاگ بھری کو کسی نے یہ سارے کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں بھی بتا چکا ہوں کہ اس دن وہ پیٹھ کئے بیٹھی تھی میری طرف، پاگل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاش دیکھ کر بیٹھ گئی ہو، دماغ میں کچھ نہ آیا ہو۔'' ٹھاکر خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے اُمید تھی اور جس کا شاید انتظار بھی تھا۔ ٹھکرائن اندر داخل ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ دیکھتی رہی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر سوچ کے آثار نمودار ہو گئے ہیں لیکن ٹھاکر صاحب کسی قدر حواس باختہ ہو گئے۔ جلدی سے بولے۔ ''آؤ...... آؤ ان سے ملو، بستی کے مہمان ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ہیں سیر سپاٹے کیلئے اور داروغہ جی! یہ ہماری دھرم پتنی ہیں۔ بڑی مہان ہیں یہ......!'' میں نے گردن خم کی۔ ٹھکرائن کے چہرے پر خشونت کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ مسکرانا تو جیسے جانتی ہی نہیں تھی۔ میں نے خود ہی کہا۔ ''ابھی ابھی ٹھاکر جی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ کا کوئی بچہ نہیں ہے۔'' وہ پھر چونکی اور مجھے دیکھنے لگی۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ٹھاکر سے بولی۔

''آج لکشمی پوجا ہے۔ کچھ انتظام و انتظام بھی کیا تم نے......؟''

''ارے ہمیں کیا کرنا ہماری ٹھکرائن جیتی رہیں۔ بھلا گھر کے کام کاج میں ہم کبھی کوئی دخل دیتے ہیں۔''

''ہاں! بس بیٹھ کر باتیں بنانے لگتے ہو اس کے علاوہ اور کوئی کام کرنا آتا ہے تمہیں!'' ٹھاکر عجیب سے انداز میں ہنسنے لگا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''دوش اس کا نہیں ہے۔ پہلے ایسی نہیں تھی مگر عورت جب تک ماں نہ بنے، اپنے آپ کو پورا نہیں سمجھتی۔ یہ بھی ادھوری ہے اور اپنے آپ کو ادھورا ہی سمجھتی ہے۔''

''ہاں! ہو سکتا ہے۔ میں اب چلوں۔''

''برا تو مان گئے ہو گے۔ یہ کہنا تو بیکار ہے کہ برا ہی نہ مانے ہو گے مگر معاف کر دینا اسے! بس جو بھگوان کی مرضی۔ اچھا چلتے ہیں۔'' ٹھاکر خود ہی اٹھ گیا۔ ٹھکرائن کے انداز سے یہ پتا چل گیا تھا کہ اس کے ذہن میں میرے لئے کوئی خاص بات ضرور گونجی ہے۔ میں خود بھی یہاں بے مقصد ہی آیا تھا لیکن اب دن کی روشنی میں ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا تھا، اس کی آواز سنی تھی اور ہر طرح کا شبہ مٹ گیا تھا۔ ہنومان مندر میں اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ گھومتا پھرتا کھیتوں کی سمت نکل آیا۔ باجرہ پک رہا تھا اور کھیتوں کے رکھوالے ''ہاہو'' کی آوازیں نکال رہے تھے۔ میں ایک جگہ سے گزر رہا تھا کہ کھیتوں کی مینڈھ کے پیچھے سے ایک لمبا چوڑا آدمی باہر نکل آیا اور اس طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا جیسے میرا راستہ روکنا چاہتا ہو۔ وہ کڑی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''کوئی بات ہے بھائی......؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''تم اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہو نا......؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں......!''

''تلسی کا گھر تمہارے سامنے ہے؟''

''ہاں! اللہ دین نے یہ بتایا تھا۔''

''بھاگ بھری تو نہیں آئی وہاں......؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، کیوں......؟''

''بس! اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں اس بات کا علم ہوگا ساری بستی بھاگ بھری کی تلاش میں لگی ہوئی ہے۔ وہ پاپی عورت ڈائن بن گئی ہے۔ میں بھی اس کی تلاش کرتا پھر رہا ہوں، سبھی کے بال بچے ہیں مسافر! تمہارا بستی میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تمہیں!'' میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بھاگ بھری میرا بھی کلیجہ نکال کر کھا جائے گی؟''

''نہیں اور کوئی بات ہوسکتی ہے۔ پچھلی رات تم ہنومان مندر کی طرف کیوں گئے تھے؟'' ایک لمحے کیلئے میرے ذہن میں سنسناہٹ پیدا ہوگئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''میں اور ہنومان مندر میں......! نہیں بھائی، میں مسلمان ہوں۔ تمہیں اسی سے اندازہ ہوگیا کہ میں اللہ دین کی سرائے میں ٹھہرا ہوں۔ میرا بھلا ہنومان مندر میں کیا کام اور یہ ہنومان مندر ہے کہاں......؟''

''ادھر سیدھے ہاتھ پر کھیتوں کے بیچ بیچ چلے جاؤ، کافی دور جاکر ہنومان مندر نظر آتا ہے۔ پرانا مندر ہے۔ بھوت پریت کا بسیرا ہے۔ کوئی نہیں جاتا اس طرف مگر میں نے تو رات کو تمہیں ادھر دیکھا تھا۔''

''بھول ہوئی ہوگی تم سے! میں تو آج تک اس طرف نہیں گیا لیکن کبھی دیکھوں گا ضرور جاکر یہ ہنومان مندر ہے کیسی جگہ!''

''بھول کر بھی نہ جانا۔ بھوت بہت سے لوگوں کو مار چکے ہیں۔''

''تمہارا شکریہ مگر تمہیں میرا مطلب ہے یہ خیال کیسے آیا کہ میں تمہیں بھاگ بھری کے بارے میں بتاؤں گا؟''

''بس! ایسے ہی مجھے شبہ ہوا تھا کہ رات کو میں نے تمہیں ہنومان مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' وہ چلا گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ گویا ان لوگوں کو مجھ پر شبہ ہوگیا ہے البتہ اب مجھے پورا پورا یقین ہوگیا تھا کہ ان وارداتوں کے پیچھے ٹھکرائن ہی ہے۔ سرائے پہنچا تو اللہ دین کہنے لگا۔

''گنگو اور جنک رام دو دفعہ آچکے ہیں تمہیں پوچھتے ہوئے، نہ جانے کیا بات ہے۔ کہہ گئے ہیں کہ جیسے ہی تم آؤ، میں تمہیں گنگو کے گھر لے آؤں۔ مجھے یاد آگیا کہ بچے نے اپنے باپ کا نام گنگو ہی بتایا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے یہ بات کھول دینی چاہئے۔ اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ گنگو اور جنک رام نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ گنگو نے سیدھے سیدھے بچے کو میرے سامنے لا کھڑا کیا اور بچے نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہی تھے باپو!''

''تم نے میرے بچے کو بچایا ہے مسافر بھیا! یہ احسان تو مر کر بھی نہ بھولیں گے ہم مگر تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ بھید کیا ہے؟'' گنگو نے کہا۔ اللہ دین حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ ''ارے ہمیں تو کچھ نہیں پتا، کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔'' جواب میں گنگو نے اسے پوری تفصیل بتائی اور بولا۔ ''یہ کام تو دیوتا ہی کریں ہیں۔ مسافر بھیا ہمارے لئے تو دیوتا ہی ہیں۔ نہیں تو ہم بھی گئے تھے کام سے......! چھورا نے انہیں پہلے بھی دیکھا تھا، پہچان لیا۔ اس نے ہمیں ساری کتھا سنائی۔ انہوں نے تو دیوتاؤں ہی جیسا کام کرا تھا خاموشی سے، احسان تک نہ جتایا ہم پر!''

''دوستو......! تم نے مجھ پر اعتماد کر ہی لیا ہے تو مجھے زبان کھولنی پڑ رہی ہے۔ بے چاری پاگل بھاگ بھری کو بلاوجہ ہی ڈائن سمجھ لیا گیا ہے۔ اصل ڈائن کوہلی رام کی بیوی گیتا نندی ہے۔ مجھے اس کے ڈائن بننے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی ہے۔ پچھلی رات میں بے چین ہو رہا تھا اس لئے ٹہلتا ہوا ہنومان مندر جا نکلا اور وہاں میں نے یہ کھیل دیکھا۔ قصہ یہ ہے کہ گیتا نندی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی جس کیلئے وہ جادو،

ٹونوں کا سہارا لے رہی ہے۔ اپنی آرزو پوری کرنے کیلئے اس نے چھ بچوں کی قربانی دے دی ہے اور ساتویں قربانی آخری ہوگی۔ میں اکیلا تھا ورنہ اسے اس جگہ پکڑ لیتا اس لئے میں نے بچے کی جان بچانے کیلئے شور مچا دیا اور وہ بھاگ گئی پھر میرے لئے یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو جاتا البتہ تم لوگ ایک بات ضرور دماغ میں رکھو، وہ ساتویں قربانی کیلئے دوبارہ کوشش کرے گی۔''
میرے انکشاف سے سنسنی پھیل گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر جنک رام نے کہا۔
''مسافر بھیا ٹھیک کہتے ہیں۔ بات سمجھ میں آ گئی، بالکل سمجھ میں آ گئی۔ ٹھکرائن بڑی ٹوٹکن ہے، یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھا مگر وہ ڈائن ایسا کرے گی، یہ نہیں سوچا تھا۔ ارے ہوگی ٹھکرائن اپنے گھر کی، ہم اس کا دیا کھاویں ہیں کیا؟ چلو گنگو! جمع کرو سب کو، لٹھیاں لے کر چلو، مار مار بھیجا نکال دیں گے اس کا، دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ کوئی ونبل میں نہیں ہیں ہم۔ اٹھو ساروں کو بتا دیں جن کے کلیجے چھن گئے ہیں۔ دیکھ لیں گے سب کو......!''
''اگر تم میری بات سن لو تو اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔
''بولو مسافر بھیا......!''
''دیکھو یہ بات میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ٹھاکر کہہ دے گا مسافر جھوٹ بول رہا ہے، پھر کیا کرو گے؟''
''ارے ہمارا چھورا بتا دے گا۔ ہم اسے لے چلیں گے۔'' گنگو نے کہا۔
''میری کچھ اور رائے ہے۔ تم اسے ہنومان مندر میں پکڑو اس وقت جب وہ یہ عمل کر رہی ہو۔ نندا چمار اس کیلئے بچوں کو اٹھاتا ہے۔ تمہیں کسی ایسے بچے کو چھوڑنا پڑے گا جسے نندا اٹھا لے۔ ہم سب ہوشیار ہوں گے، نندا پر نظر رکھیں گے۔ جیسے ہی نندا اس بچے کو اٹھائے گا، ہم اس کا پیچھا کریں گے اور عین اس وقت دونوں کو پکڑیں گے جب وہ اپنا کام کر رہے ہوں گے۔''
''اور اگر چوک ہو گئی تو......؟'' جنک رام بولا۔
''چوک ہوگی کیسے؟ بڑا اچھا مشورہ دیا ہے یہ پھر کوئی کیا بولے گا۔'' اللہ دین نے کہا۔
''سو تو ٹھیک ہے مگر بچہ کونسا ہوگا؟''
''میرا بچہ ہوگا، میرا کلو ہوگا۔'' اللہ دین سینہ ٹھونک کر بولا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اللہ دین نے کہا۔ ''ارے ہم مسلمان ہیں، اللہ پر بھروسہ ہے۔ ہمیں جو کچھ ہوتا ہے، مولا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ پیچھا تو چھوٹے اس ڈائن سے! ساری بستی مصیبت میں پھنسی ہے۔ میں تیار ہوں مسافر بھیا!''
''ہم سب جان لڑا دیں گے کلو کیلئے فکر مت کر اللہ دین بھیا!'' جنک رام نے کہا۔ اس آمادگی کے بعد اس منصوبے کی نوک پلک سنواری جانے لگی۔ بالآخر تمام باتیں طے ہو گئیں۔ اس سنسنی خیز عمل کا آغاز آج ہی رات ہونے والا تھا۔

✦✤✦✤✦

گنگو اور جنک رام کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سارے کام آج ہی نمٹا لینا چاہتے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ گیتا نندی آج ہی دوبارہ یہ کوشش کرے گی۔ اگر ہمارے اندازے بالکل درست تھے اور وہی ان وارداتوں کے پس پشت تھی تو اس نے اس عمل میں جلد بازی نہیں کی تھی۔ ہنومان دیوتا کے چرنوں میں اس نے چھ بچوں کی بلی دی تھی۔ ان لوگوں سے گفتگو کے دوران میں ان وارداتوں کے درمیانی وقفے معلوم کر چکا تھا۔ ان میں دنوں کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ اسے جب بھی موقع ملا تھا اس نے یہ کام سرانجام دے ڈالا تھا لیکن اب شاید پہلی بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ وہ چالاک تھی۔ نہ جانے اسے مجھ پر شبہ کیسے ہوا تھا یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے اندھیرے میں تیر پھینکا ہو۔ وہ نندا ہی تھا۔ خود جتنا چالاک تھا، اس کا اندازہ اس کی بات سے ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے مجھے ہنومان مندر کے پاس دیکھا تھا۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ خود وہاں کیا کر رہا تھا۔ اب یہ تو مجھے ہی معلوم تھا کہ وہ وہاں کیا کر رہا تھا۔ گنگو کے گھر سے واپسی پر اللہ دین نے کہا۔
''واہ مسافر بھیا۔ اتنا بڑا کام کر لیا اور ہمیں خبر بھی نہ دی۔''

''کوئی اتنا بڑا کام بھی نہیں تھا اللہ دین۔''
''بے چارے گنگو کے بیٹے کو ڈائن کے منہ سے نکال لیا اور کہتے ہو بڑا کام ہی نہیں کیا۔''
''اللہ کو اس کی زندگی بچانی تھی، وہ بچ گئی۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔''
''مگر اتی رات گئے تم ادھر نکل کیسے گئے تھے۔''
''بس دل بے چین ہو رہا تھا۔ سوچا ذرا گھوم آؤں۔''
''اتی دور، ہنومان مندر کوئی یہاں دھرا ہے۔ بھیا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہمت والے ہو اور پھر ہمیں تو کچھ اور ہی لگے ہے۔''
''پیر فقیر لگو ہو ہمیں تو۔ راتوں کو نماز پڑھتے دیکھا ہے تمہیں۔'' اللہ دین سادگی سے بولا۔
''توبہ کرو اللہ دین، توبہ کرو۔ میں ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہوں!''
''ارے تم نے ہم سے نندا کا نام پوچھا تھا؟''
''ہاں، ہنومان مندر کا واقعہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ میں نے بلاوجہ ان دونوں کا نام نہیں لے دیا ہے۔'' میں نے کہا اور اللہ دین سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ ''سو تو ہے۔ ایک کام تم نے گنگو کے بیٹے کو بچا کر کرا، دوسرا بڑا کام اور کر رہے ہو بھیا۔ بہت بڑا۔''
''وہ کیا؟''
''ارے تم نے بھاگ بھری کا جیون بچا لیا، تلسی بے چارے کو بچا لیا۔''
''یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ اپنی عقل سے کچھ نہیں سوچتے۔ بھاگ بھری اور تلسی کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ایک لمحے میں پلٹ گئے۔ اگر میں نہ روکتا تو شاید سوچے سمجھے بغیر لاٹھیاں لے کر چڑھ دوڑتے کھیا کے گھر پر۔''
''برے نہیں ہیں مسافر بھیا۔ دن رات پریشان ہو رہے ہیں۔ بچوں کو چھپائے چھپائے پھر رہے ہیں۔ کیا کریں آخر اولاد سے بڑھ کر کون ہووے ہے۔ اس کے لئے پاگل ہو رہے ہیں۔''
''مجھے ایک خطرہ ہے۔''
''کیا؟''
''وقت سے پہلے زبان نہ کھول دیں۔ وہ ہوشیار نہ ہو جائے ورنہ پھر اسے پکڑنا مشکل ہوگا۔''
''سمجھا تو دیا ہے۔ اتنے باؤلے نہیں ہیں۔ ساری بات سمجھا دی ہے انہیں۔''
''اس کے علاوہ اللہ دین، زبیدہ بہن تو کلو کو سینے میں چھپائے چھپائے پھرتی ہیں، تم اسے اس خطرے میں ڈال دو گے؟''
''اللہ پر بھروسہ کریں گے بھیا۔ کون تیار ہوتا۔ بستی کے بچے مر رہے ہیں، سب ہی اپنے ہیں، وہ بھی جو مارے گئے اپنے ہی تھے۔''
''زبیدہ بہن تیار ہو جائیں گی؟''
''وہ عورت ہے، ماں ہے۔ اس سے چار سو بیسی کرنی ہوگی کوئی۔ ہم یہی سوچ رہے تھے۔'' اللہ دین کے جذبے کو میں نے سراہا تھا۔ خود بھی مستعد رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، معاملہ ہی ایسا تھا۔ سرشام اللہ دین کلو کو لے کر باہر نکل آیا۔ نہ جانے اس نے بیوی سے کیا کہا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیا تھا، میں بھی احتیاط سے باہر نکل آیا اور سیدھے راستے پر چل پڑا۔ کافی فاصلے پر اللہ دین مجھے مل گیا، مسکرانے لگا۔
''کیا کہا زبیدہ بہن سے؟'' میں نے سوال کیا۔
''ارے بھیا دیہاتی عورتیں دیہاتی ہی ہووے ہیں، بس میاں نے جو کچھ کہا، مان لیا، ہم نے بھی بڑی چار سو بیسی

کری۔ کلو کو چلتے ہوئے دیکھا تو ہم نے آنکھیں پھاڑ دیں اور ایسا منہ بنا لیا جیسے ہماری جان نکل گئی ہو۔ وہ سامنے ہی موجود تھی، ہم سے پوچھنے لگی کیا ہوا، تو ہم نے اسے کان میں بتایا کہ کلو کے پیر لڑکھڑا رہے ہیں اور لگتا ہے لقوہ مار جائے گا، بھیا ڈر گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہم نے اس سے کہا کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، بچے اگر کھیلیں کودیں نہیں تو ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب آئے تھے ایک دفعہ ہماری بستی میں، پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے، وہ پولو پولو کا مرض، کوئی مرض ہووے ہے پولو کا......؟''

''پولیو کا......''

''ہاں ہاں بالکل وہی وہی...... تو ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بچوں کو یہ کرنا چاہئے، وہ کرنا چاہئے، ہم نے اسے وہی یاد دلا دیا، ڈر گئی۔ کہنے لگی کہ اب کیا کریں۔ باہر کھیلنے دینے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو خطرہ ہو جائے۔ ہم نے کہا ہم کیا مر گئے ہیں، ہم خود ساتھ لے جائیں گے، کھیلنے کودنے کے لئے چھوڑ دیں گے...... رو رو کر کہنے لگی۔ ذرا خیال رکھیو...... ہم نے کہا باؤلی وہ تیرا ہی بیٹا ہے کیا۔ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ یوں بہلا پھسلا کر نکال لائے۔'' میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔

''ویسے تم بہت ہمدرد انسان ہو اللہ دین، بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔''

''بھیا سچی بات بتائیں تمہیں بستی کے رہنے والے ہندو ہوں یا مسلمان سارے کے سارے ایک دوسرے کا دکھ اپنا ہی دکھ سمجھے ہیں۔ ہم بھی کوئی ان سے الگ تھوڑی ہیں، ارے ستیاناس ہو اس ٹھکرائن کا، اپنے ہاں اولاد نہیں ہوئی، ایک بیٹا ہو گیا فرض کرو ٹونوں ٹوٹکوں سے تو سات ماؤں کی گودیں اجاڑے گی وہ، ارے وہ انسان ہے۔ جی تو ہمارا بھی یہی چاہوے ہے بھیا کہ کچا چبا جاویں اس سسری کو دانتوں سے، نرکھنی کہیں کی، ایسی نہ ہوتی تو ماتا پتا گھر سے باہر نکال کر یوں جمال گڑھی میں کیوں پھنکوا دیتے، پتہ نہیں کہاں سے آ گئی ڈائن ہماری بستی میں، ہمارا تو جی چاہے ہے کہ ٹھاکر کو ساری باتیں بتا دیں اور اس سے کہیں اب بول، کیا کہہ وے ہے، مگر وہی تمہاری بات سچی ہے کہ وہ مکر جائے گی۔ بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے سب کی سمجھ میں بات آ گئی۔ رنگے ہاتھوں پکڑیں تو پھر دیکھیں کہ کیسے مکرتی ہے ارے بھیجہ باہر نکال دیں گے اس کا، وہیں توڑ مروڑ کر پھینک دیں گے حرام خور کو۔'' اللہ دین چلتا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''باقی لوگوں سے ملاقات تو نہیں ہوئی ہوگی؟''

''سب کے سب لگے ہوں گے بھیا۔ معلوم ہے ہمیں، پوری بستی کی مصیبت ہے، کسی ایک آدمی کی تو نہیں ہے اور اللہ دین کا کہنا سچ ہی نکلا تھا۔ جنک رام اور گنگو ساتھ ہی تھے۔ دو آدمی اور بھی ان کے ساتھ تھے۔ جنک رام نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

''اللہ دین بھیا تمہاری یہ بات بستی والوں کو جیون بھر یاد رہے گی، لے آئے کلو کو......؟''

''ہاں بھیا، کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو چھ بچھڑ گئے ہیں ہم سے، ہماری کیا مجال تھی کہ انہیں بچا لیتے، اللہ کی مرضی تھی مگر اب کسی اور کو نہ بچھڑنے دیں گے، اللہ کرے ہمارا کلو خیریت سے رہے مگر کام تو کرنا ہی تھا نا کسی کو، ہاں بس تم ایک بات بتا دو؟''

''پوچھو اللہ دین بھیا۔'' گنگو بولا۔

''سمجھا بجھا دیا ہے سب کو، ارے کہیں کوئی زبان نہ کھول دے، ٹھکرائن ہوشیار ہو جائے گی اور اس کے بعد الٹی گلے پڑ جائے گی، کون مانے گا؟''

''اس کی تو تم چنتا ہی مت کرو بھیا۔ دیکھو اصل بات بس ان لوگوں تک پہنچائی ہے جن کے سینوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ مطلب سمجھ گئے ہو گے اور ان سے کہہ دیا ہے کہ جب پہرے پر نکلیں تو سب سے یہی کہیں کہ بھاگ بھری کی تلاش ہو رہی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ سب کو اچھی طرح بتا دیا ہے اور یہ بھی سمجھا دیا ہے انہیں کہ کہیں سے بے چاری بھاگ بھری مل جائے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ ارے ویسے ہی بڑے پاپ ہو چکے ہیں ہم سے، ایک بے زبان کو ستایا ہے ہم نے۔ باؤلی تو تھی ہی

بے چاری کیا کرتی، بول بھی تو نہیں سکتی اپنے بارے میں۔ ہرے رام ہرے رام۔ ویسے اب کدھر کا ارادہ ہے؟''

''میرا خیال ہے نجو کی بگیا ٹھیک رہے گی۔ ہنومان مندر کا راستہ بھی ادھر ہی سے پڑتا ہے۔'' پھر اللہ دین نے آنکھ دبائی، کلو کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔''اور نندا کا کیا کیا ہے تم لوگوں نے؟''

''اس کی تم بالکل چنتا نہ کرو۔ چھمن اور شنکر اس پر نظر رکھ رہے ہیں۔ چھمن کے بارے میں تو تمہیں پتہ ہے کہ نندا کا یار ہے مگر اس مسئلے میں اس نے ساری یاری ختم کر دی۔ چھمن، شنکر کو اشارے دے گا۔ ظاہر ہے نندا جب اس طرف آئے گا تو چھمن کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کام پکے ہیں بھیا جو کچھ تم کر رہے ہو۔ ظاہر ہے ہم اس میں کسر تھوڑی چھوڑیں گے۔''

بہر حال یہ لوگ اپنی اپنی جگہ مستعد تھے، میں اور اللہ دین آگے بڑھ گئے۔ جنک رام وغیرہ دوسری سمت مڑ گئے تھے۔ جس جگہ کو نجو کی بگیا کہا گیا تھا، وہ ایک چھوٹا سا باغ تھا، آموں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ کلو تو آموں کے درختوں کو دیکھ کر ہی مچلنے لگا۔

''ابا کیری کھالوں......؟''

''ارے ہاں ہاں جا مزے کر۔ گھوم پھر، کوئی بات نہیں ہے۔'' بچہ تھا۔ خوشی خوشی آگے بڑھ گیا اور اس کے آگے بڑھتے ہی اللہ دین کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔''بھیا ذرا نظر رکھیو...... اللہ کے حوالے کر دیا ہے پر کیا کریں باپ کا دل ہے، ڈرتا تو ہے ہی۔''

''جگہیں بدل لو اللہ دین۔ تم ایک طرف ہو جاؤ۔ میں ایک طرف ہوا جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ درحقیقت ہم لوگوں نے بڑی مہارت سے کلو کو نظر میں رکھا تھا۔

جھٹپٹے تاریکی میں بدل گئے۔ کلو مزے سے کیریاں توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ بہت دن کے بعد باہر نکلنے کا موقع ملا تھا، کھیلنے سے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ پھر جب اچھی خاصی رات ہو گئی اور کوئی واقعہ نہیں ہوا تو اللہ دین نے سیٹی بجائی۔ میں جواب میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ اللہ دین بولا۔''کیا خیال ہے بھیا اور انتظار کریں......؟''

''میرا خیال ہے اب بیکار ہے مگر اب یہ کام سر شام ہی شروع ہو جانا چاہئے۔ رات کو تو خاص طور سے شبہ ہو سکتا ہے کہ آخر اتنی دیر تک ان حالات میں کلو باہر کیسے موجود ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو مسافر بھیا۔ تمہارا دماغ بہت تیز ہے۔'' غرض یہ کہ ہم واپس چل پڑے۔ سرائے میں ایک ایک کر کے کئی آدمی آئے۔ مشورے ہوئے اور یہ سلسلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ پھر دوسرے دن شام کے چار بجے ہی کلو کو باہر لے آیا گیا۔ شام تک انتظار کیا گیا۔ آج مزید احتیاط برتی گئی تھی۔ میرے دل میں مایوسی پیدا ہوتی جا رہی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہوشیار ہو گئی ہو اور اب اپنا عمل بدل دے۔ ویسے جنک رام، گنگو اور دوسرے چند لوگوں کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگوں نے مستقل ہنومان مندر کے گرد ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور ایسی جگہوں پر پوشیدہ ہو گئے ہیں جہاں سے آنے جانے والے پر نظر رکھیں اور ان کے بارے میں کسی کو پتہ نہ لگے۔ یہ اطلاع بھی تسلی بخش تھی اور تیسرے دن وہ ہو گیا جس کے لئے پچھلے دو دنوں سے تگ و دو کی جا رہی تھی۔

اس وقت کلو کیریاں توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ یہ جگہ اسے بہت پسند تھی۔ آتے ہوئے اس نے کئی دوسرے بچوں کو بھی دعوت دی تھی مگر بچے اسے حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے گھروں میں جا گھسے تھے۔ کسی نے کلو کا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا چنانچہ وہ خود ہی یہاں آ گیا تھا۔ میں اور اللہ دین ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے۔ کلو کو پتہ نہیں تھا کہ ہم درخت پر ہیں۔ وہ اس درخت سے صرف دو تین گز کے فاصلے پر کیریاں اکٹھی کر رہا تھا کہ دفعتاً ہی اللہ دین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''مسافر بھیا۔'' اللہ دین کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ ایک نظر میں پہچان لیا، نندا ہی تھا، وہ اسی سمت آ رہا تھا۔ کمبل اوڑھے ہوئے تھا لیکن صرف کاندھوں تک حالانکہ موسم کمبل کا نہیں تھا۔ میرے

چہرے پر خون سمٹ آیا۔ ننداآہستہ آہستہ چلتا ہوا کلو کے پاس پہنچ گیا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں اور کلو کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''ارے تو اللہ دین کا چھورا ہے نا؟''

''ہاں نندا چاچا مجھے نہیں پہچانتے؟''

''کیوں نہیں..... مگر یہاں اکیلا کیا کر رہا ہے.....؟''

''کیریاں چن رہا ہوں۔''

''اچھا اچھا..... تجھے اکیلا چھوڑ دیا اللہ دین نے..... تجھے پتہ ہے کہ بستی میں ڈائن پھرتی ہے۔''

''ڈائن کیا ہوتی ہے نندا چاچا؟''

''کتنی کیریاں جمع کر لیں تو نے.....؟''

''بس یہ ہیں۔''

''اور جمع کرے گا؟''

''بس تھوڑی سی اور جمع کروں گا پھر تو رات ہونے ہی والی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ چل ٹھیک ہے اور جمع کر لے۔ وہ دیکھ وہ درخت کے نیچے پڑی ہوئی ہیں۔''

''کدھر؟'' کلو نے معصومیت سے پوچھا اور اس سمت دیکھنے لگا اور اسی وقت نندا نے شانوں پر پڑا کمبل کلو پر ڈال دیا اور اسے بھینچ لیا۔ اللہ دین کے حلق سے آواز نکلنے ہی والی تھی کہ میں نے اس کا منہ بھینچ لیا۔ اللہ دین کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نندا، کلو کو دبوچے ہوئے تھا اور کلو کمبل میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اللہ دین نے سرگوشی میں کہا۔ ''بب بھیا۔ کک کہیں دم ہی نہ نکل جائے میرے بچے کا۔''

''نہیں۔ وہ لوگ بچوں کو زندہ رکھتے ہیں۔'' اللہ دین کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی۔ میں نے اس کے بدن میں تھرتھری محسوس کی اور میرا دل دکھنے لگا۔ بہرحال ساری باتوں کو بھول کر میں بھی مستعد ہو گیا تھا۔ نندا، کلو کو کندھے پر ڈال کر تیزی سے ہنومان مندر کے راستے کی جانب چل پڑا۔ میں اور اللہ دین نیچے اترے ہی تھے کہ چھمن اور شنکر پہنچ گئے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''ساری خبر تھی ہمیں، کام ہو گیا نا مگر چنتا نہ کرنا اللہ دین بھیا، بیس آدمی ہیں مندر کے آس پاس۔ سارے کے سارے لمبے لمبے چکر کاٹ کر وہاں پہنچ چکے ہیں۔ ایک ایک جگہ پر نظر رکھی جا رہی ہے، اور تو اور دو تین تو مندر کے اندر موجود ہیں اور ستونوں کے بیچ چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی نندا اس طرف چلا، چھمن نے مجھے خبر کر دی اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے ان سارے آدمیوں کو جو تاک میں لگے ہوئے ہیں، تو پروا مت کریو اللہ دین بھیا۔ بال بیکا نہیں ہوگا ہمارے کلو کا۔ پہلے ہماری جان جائے گی۔''

''ارے بھیا خدا کرے۔ ڈائن سے ہمارا پیچھا چھوٹ جائے۔ چلیں؟''

''ایک ایک کر کے ادھر ادھر گھوم کر۔ نندا بڑا چالاک ہے اور سنو بات ابھی یہیں ختم تھوڑی ہوئی ہے۔ چلو چلو ہم بھی چل رہے ہیں۔'' جنک رام نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ بڑی احتیاط سے نندا کو نگاہوں میں رکھے ہوئے چل رہے تھے، وہ محتاط قدم اٹھاتا ہوا مندر کی طرف جا رہا تھا۔ جنک رام نے کہا۔

''مکھیا جی کی حویلی پر بھی پہرہ لگا ہوا ہے اور سارے لوگ نگرانی کر رہے ہیں۔ جیسے ہی گیتا نندی باہر نکلے گی اس کی بھی خبر ہمیں مل جائے گی۔'' ہم اس طرح باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جھٹپٹے تیزی سے رات میں تبدیل ہو گئے۔ نندا مندر میں داخل ہو گیا تھا۔ ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ اللہ دین بے چارہ تو ابھی تک تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ آواز بھی اتنی مدھم ہو گئی تھی اس کی کہ مجھے

حیرت تھی۔ غرض یہ کہ نندا تو مندر میں داخل ہو گیا۔ میں اور اللہ دین مندر کے بالکل قریب دیواروں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ دفعتاً اللہ دین نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ادھر ادھر...... دیکھو۔'' میں نے اللہ دین کا اشارہ سمجھ لیا۔ مندر کا اس سمت کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اینٹیں ایک دوسرے پر ڈھیر کی شکل میں پڑی ہوئی تھیں اور ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ تو مندر میں اندر جانے کا راستہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں انتہائی محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اللہ دین سے سرگوشی کر کے میں نے اسے بھی محتاط رہنے کے لئے کہا اور اللہ دین نے گردن ہلا دی۔ ہم لوگ ایک ایک انچ سرک رہے تھے کہ کہیں کوئی اینٹ اپنی جگہ سے سرک نہ جائے اور نندا ہوشیار نہ ہو جائے لیکن ایک بات اور بھی تھی کہ اگر نندا ہوشیار ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا، وہ بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن جتنے افراد کی اطلاع ملی تھی کہ وہ مندر کے گرد چھپے ہوئے ہیں، وہ اسے بھاگنے کہاں دیں گے۔ کوئی اور طریقہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ گیتا نندی کو یہاں کے بارے میں اطلاع مل جائے۔ بہرطور ٹوٹے ہوئے حصے سے ہم مندر کے ایک پتلے سے حصے میں داخل ہو گئے اور اس پتلی سی راہداری میں جہاں کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے اور چوہے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے ہم سامنے کے حصے میں پہنچ گئے جہاں سے تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس علاقے میں داخل ہوا جا سکتا تھا جہاں ہنومان کا بت ایستادہ تھا۔ میں نے اللہ دین کے کان سے منہ جوڑ کر آہستہ سے کہا۔ ''دیکھو اللہ دین بھیا ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو ساری قربانی بیکار جائے گی، سنبھل کر رہنا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اللہ دین نے کہا اور ہم ستونوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے سامنے نظر ڈالی جا سکتی تھی لیکن ہمارے عقبی ستون میں بھی کچھ لوگ پوشیدہ تھے۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ سرسراہٹیں سنائی دی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ پوری طرح ہوشیار ہیں۔ نندا مزے سے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا اور ہنومان کے بت کے قدموں میں کلو پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کی مدھم مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے اس آواز پر کان لگا دیئے۔ کہہ رہا تھا۔

''نندا چاچا۔ نندا چاچا چھوڑ دو مجھے۔ کیوں لے آئے ہو یہاں۔ نندا چاچا یہ میرے ہاتھ پاؤں، یہ میرے ہاتھ پاؤں کیوں باندھ دیئے ہیں تم نے......؟''

''آواز بند کر۔ نہیں تو چھری پھیر دوں گا تیری گردن پر جیسے کہ رمضان بکرے کی گردن پر چھری پھیرتا ہے، بات سمجھ میں آئی۔''

''نہیں نہیں نندا چاچا چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو مجھے نندا چاچا۔''

''ارے چپ ہوتا ہے یا نہیں'' نندا نے سچ مچ اپنے لباس سے وہ خنجر نکال لیا جس کا میں پہلے بھی دیدار کر چکا تھا۔ اللہ دین نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے تھے۔ میں نے اس کے شانے پر آہستہ آہستہ تھپکیاں دیں اور وہ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا جن میں بے کسی اور بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے بچے کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ کلو چیختا رہا۔ چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا اور نندا مزے سے بیڑی پر بیڑی سلگاتا رہا۔ بڑا صبر آزما وقت تھا۔ ایسے لمحات گزارنا زندگی کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جن لوگوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا تھا کہ ڈائن کو روشنی میں لا کر رہیں گے، وہ بھی بڑے صبر ہی سے وقت گزار رہے تھے۔ کیا مجال کہ کسی کو چھینک بھی آ جائے۔

پھر اچانک ہی سرسراہٹیں بلند ہوئیں۔ یوں لگا جیسے غیر محسوس طریقے سے ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو خبر دی ہو۔ لمحہ لمحہ سنسنی خیز تھا اور میرا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔ یہ سرسراہٹیں درحقیقت ایک پیغام ہی تھیں اور اس کی تصدیق اس وقت ہو گئی جب گیتا نندی مندر کے احاطے میں داخل ہوئی۔ کالے رنگ کی ساڑھی باندھی ہوئے تھی۔ اوپر سے شال اوڑھی ہوئے تھی۔ اکیلی تھی اور بڑے پُراعتماد قدموں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ نندا چونک کر سیدھا ہو گیا۔

''جے دیوی۔'' گیتا نندی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور قریب پہنچ گئی۔ اس نے بھاری آواز

میں کہا۔ ''نندا اگر آج ہمیں کامیابی نہ ہوئی تو یوں سمجھ لے کہ میری ساری تپسیا بیکار چلی جائے گی۔''

''میں جانتا ہوں دیوی۔'' نندا نے کہا۔

''سوامی ادھیر نا چندو ساتویں دن درشن دیں گے اور بس پھر میرا کام بن جائے گا۔''

''ہاں دیوی سات دن رہ گئے ہیں۔''

''بستی والے الگ ہوشیار ہیں۔ خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' نندا نے کہا۔

''چل ہاتھ پاؤں کھول دے اس کے۔'' گیتا نندی نے کہا اور نندا نے خنجر نکال لیا۔ اس نے کلو کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹ دیں۔ کلو نے بھی اسی طرح تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر نندا نے اسے بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ گیتا نندی نے خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''اللہ دین درحقیقت صابر تھا۔ اس کی جو حالت ہو رہی تھی مجھے اندازہ تھا مگر ضبط کئے ہوئے تھا۔ گیتا نندی کی آواز ابھری۔

''جے بجرنگا۔ ساتویں بلی دے رہی ہوں۔ اسے سویکار کر بجرنگ بلی۔ میرے گود ہری کر دے۔''

''ٹھکرائن، کمینی، کتیا، میں تیری بلی دے دوں گا۔ ڈائن شیطان۔'' اللہ دین کی بھیانک آواز سے مندر گونج اٹھا اور اس نے دیوانوں کی طرح لمبی چھلانگ لگائی۔ گیتا نندی اچھل پڑی۔ اس نے خونی نظروں سے اللہ دین کو اور پھر کلو کو دیکھا۔ پھر وہ بھیانک آواز میں بولی۔

''تو بھی مارا جائے گا بھٹیارے۔ پیچھے ہٹ جا۔ مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔ نندا اسے سنبھال۔'' لیکن صبر کرنے والوں سے کہاں صبر ہوتا، وہ سب بیک وقت نکل پڑے۔ نندا کو انہوں نے دبوچ لیا۔ ٹھکرائن نے اللہ دین پر وار کیا مگر اللہ دین کی تقدیر اچھی تھی، اس کے سینے پر بس ہلکی سی خراش لگی۔ مشتعل لوگوں نے ٹھکرائن کے لمبے بال پکڑ کر اسے پیچھے سے گھسیٹ لیا تھا ورنہ اللہ دین ضرور مارا جاتا۔ گیتا نندی نے کئی لوگوں کو زخمی کر دیا مگر کیونکہ بے شمار افراد تھے اس لئے وہ زیادہ دیر خنجر نہ گھما سکی۔ کسی نے اس کے ہاتھ پر لاٹھی مار کر خنجر گرا دیا اور جونہی خنجر اس کے ہاتھ سے نکلا لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ بھول گئے تھے کہ وہ ٹھکرائن ہے۔ اس کے بال نوچ ڈالے گئے۔ کپڑے تار تار کر دیئے گئے۔ نندا کی تو شکل ہی نہیں پہچانی جا رہی تھی۔ باہر سے بہت سی آوازیں ابھریں۔

''ٹھاکر جی آ گئے۔ کوہلی رام جی آ گئے۔'' ٹھاکر بہت سے لوگوں کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔

''کیا ہے، کیا ہو رہا ہے۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔ ارے یہ گیتا نندی، چھوڑ دو اسے۔ چھوڑ دو ورنہ میں گولی چلوا دوں گا۔'' ٹھاکر کے دو آدمیوں کے پاس بندوقیں تھیں۔

''انصاف سے کام لو ٹھاکر۔ کتنی گولیاں چلاؤ گے۔ آخر میں تمہارے پاس گولیاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر کیا ہو گا۔ جانتے ہو؟'' پیچھے سے کسی نے کہا۔

''ہم تمہیں گولیاں چلانے کے لئے نہیں لائے ٹھاکر، اس لئے بلا کر لائے ہیں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''سب کچھ تو کر ڈالا تم نے۔ اب میں کیا دیکھوں۔'' کوہلی رام بولا۔

''اس بھول میں نہ رہنا ٹھاکر، یہ سب کچھ نہیں ہے۔ زندہ جلائیں گے ہم اس ڈائن کو اور اس چمار کو۔ بھگوان کی سوگند اسے زندہ نہ جلایا تو ماں کا دودھ حرام ہے ہم پر۔'' رگھبیر نے کہا۔

''دیکھو کتنوں کے گھاؤ لگائے ہیں اس نے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ارے تم دھن والے سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔

چلواؤ

چلواؤ ٹھاکر......!'' رام پال نے کہا۔ اس کا بیٹا بھی مارا گیا تھا۔
''گیتا نندی کیا ہے یہ سب کچھ......؟ یہ سب کیا ہے گیتا......!''
''جھوٹے ہیں پاپی سارے کے سارے۔ سب کچھ اس مسافر کا کیا دھرا ہے۔ یہ سب اس کی سازش ہے۔'' ٹھکرائن نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔
''نام مت لینا اس دیوتا کا ٹھکرائن۔ بھگوان کی سوگند زبان کاٹ لیں گے تمہاری۔'' گنگو دھاڑا۔
''تم یہاں کیا کر رہی تھیں ٹھکرائن......؟'' کوہلی رام نے پوچھا۔
''ہنومان پوجا کرنے آئی تھی۔ سپنے میں درشن دیئے تھے، انہوں نے بلایا تھا مجھے، سو نندا کو ساتھ لے کر چلی آئی۔'' گیتا نندی بولی۔
''تمہارا منہ ہے ٹھاکر جور کے ہوئے ہیں، نہیں تو لاٹھیاں مار مار کر بھیجہ باہر کر دیتے اس کا۔'' ایک پرجوش آدمی بولا۔
''ارے تم منہ دیکھو ٹھاکر کا۔ ہم نہیں دیکھیں گے، مارو اس حرام خور کو، جان سے مار دو......!'' لوگ ایک بار پھر بے قابو ہو گئے۔ چند افراد نے بندوق برداروں پر حملہ کر کے بندوقیں چھین لیں۔ صورتحال بگڑتے دیکھ کر میں نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر چیخ کر کہا۔
''سنو بھائیو! کلو کی جان بچ گئی ہے۔ اللہ نے گنگو کے بیٹے للو کو بھی بچا لیا ہے۔ گیتا نندی اور نندا کو پکڑ کر حویلی لے چلو۔ پوری بات ٹھاکر کو بتاؤ پھر دیکھو وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔''
''فیصلہ ہم کریں گے، ٹھاکر نہیں۔''
''پھر بھی کوہلی رام کو تفصیل تو بتاؤ۔''
''ٹھیک ہے۔ لے چلو اس ڈائن کو۔ لے چلو۔'' لوگوں نے میری اتنی بات مان لی۔
''کپڑے پھاڑ دیئے ہیں تم نے اس کے۔ یہ چادر اوڑھا دوں میں اسے۔'' ٹھاکر نے کہا۔
''بندوقیں اب دوسروں کے ہاتھوں میں تھیں اس لئے کوہلی رام بھی بے بس ہو گیا تھا۔ گیتا نندی اور نندا چمار کو مندر سے باہر لایا گیا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے تھے اور پھر پورا جلوس ہی واپس چل پڑا۔ جنک رام، گنگو اور اللہ دین میرے ساتھ تھے۔ راستے میں جنک رام نے کہا۔
''ہم کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ٹھاکر پولیس کو بھی بلا سکتا ہے اور اگر پولیس آ گئی تو ٹھکرائن بچ جائے گی۔''
''سو تو ہے......''
''بستی میں گھستے ہی دس بیس آدمیوں کو دوڑا دو۔ پوری بستی جمع کر لو۔ سب کے سب ٹھاکر کی حویلی کو گھیر لیں، کسی کو بستی سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ جس کے پاس جو ہتھیار ہے، لے کر آ جائے۔ ٹھاکر کوئی چال نہ چل جائے کہیں۔''
''بالکل ٹھیک کہا تو نے جنکیا۔ میں دوڑ کر بستی جاتا ہوں۔ ارے آ ؤ رے آ ؤ، دو چار میرے ساتھ......'' گنگو نے کہا۔ فوراً چند لوگ اس کے ساتھ ہو لئے اور گنگو جلوس سے آگے دوڑ گیا۔ پھر جب بستی میں داخل ہوئے تو بستی کے تمام گھر روشن ہو چکے تھے۔ لوگ چیختے پھر رہے تھے۔ ''ڈائن پکڑی گئی بھائیو۔ سب کے سب گھروں سے نکل آ ؤ۔ ٹھاکر کی حویلی کے سامنے جمع ہو جاؤ۔ ڈائن پکڑی گئی۔'' جلوس ٹھاکر کی حویلی پہنچا تو وہاں کا منظر ہی بدلا ہوا ملا۔ گنگو حویلی کے دروازے پر بندوق لئے جما ہوا تھا۔ بیس پچیس آدمی اس کے ساتھ تھے۔ جو لوگ حویلی میں تھے، انہیں نہتا کر کے باہر جمع کر لیا گیا تھا اور دو آدمی ان پر بندوقیں تانے ہوئے تھے......! ٹھاکر آگے بڑھا تو گنگو نے اس پر بندوق تان لی۔
''تم اندر نہیں جاؤ گے ٹھاکر۔ جب تک فیصلہ نہیں ہو جائے گا اندر نہیں جاؤ گے۔'' گنگو نے کہا۔
''تم لوگوں نے میرے گھر پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ جانتے ہو اس کے جواب میں پولیس کیا کرے گی۔''
''یہ کام اب پولیس نہیں کرے گی ٹھاکر، ہم کریں گے۔ بھول جاؤ پولیس کو، بچے ہمارے مارے گئے ہیں، پولیس کے

نہیں۔'' گنگو نے کہا۔

''میں مکھیا ہوں تمہارا......!''

''یہیں پنچایت ہوگی۔ یہیں فیصلہ ہوگا۔ پھر اندر جاؤ گے تم......!''

''تو پھر فیصلہ تم ہی کر لو، میری کیا ضرورت ہے۔''

''فیصلہ تو ہو گیا ہے ٹھاکر۔ زندہ جلائیں گے ہم ان دونوں کو......!'' کوہلی رام کو اندازہ ہو گیا کہ صورتحال بہت بگڑی ہوئی ہے۔ وہ پریشانی سے دوسروں کی صورت دیکھنے لگا۔ بستی کے لوگ چاروں طرف سے آ کر جمع ہو رہے تھے۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا اور میرا دل جواب دے رہا تھا۔ کوئی شک نہیں ہے گیتا نندی کے مجرم ہونے میں۔ چھ معصوم بچوں کی جان لی ہے اس نے۔ اس کے ساتھ یہی سب ہونا چاہئے۔

''اللہ دین۔ کلو کو گھر پہنچا دو۔'' میں نے کہا۔

''کلیجہ نکل گیا ہے مسافر بھیا۔ ہائے کیا حالت ہو رہی تھی میرے بچے کی، ارے میں تو چاہتا تھا وہیں مار ڈالتے ان دونوں کو۔ یہ ٹھاکر وہاں کیسے پہنچ گیا۔''

''یہ بات تو پہلے ہی طے کر لی گئی تھی کہ کچھ لوگ ٹھاکر کو بلا لائیں گے تاکہ وہ بھی دیکھ لے۔''

''اب کیسے رنگ بدل رہا ہے سسرا۔ گنگو نے ٹھیک کرا بھیا نہیں تو سسرا پولیس بلا لیتا اور پھر ہماری دال نہ گلتی، بچا لیتا وہ کسی نہ کسی طرح ٹھکرائن کو، ٹھیک ہے مسافر بھیا ہم کلو کو گھر پہنچا دیں۔ ابھی آتے ہیں۔'' اور اللہ دین وہاں سے چلا گیا۔ مجھے صورتحال کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ بستی والے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ حیران تھے اس بات پر کہ ڈائن بھاگ بھری نہیں تھی اور اس کی طرف شبہ ایسے ہی چلا گیا تھا۔ ٹھکرائن اصل ڈائن ہے، بات آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھی، لوگ ایک دوسرے کو تفصیل بتا رہے تھے، وہ لوگ سب سے زیادہ مشتعل تھے جن کے بچے ٹھکرائن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ سب کچھ وہیں کر ڈالتے لیکن جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی طرح ٹھکرائن اور نندا کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ بہت سے لوگ جنگل اور کھیتوں کی طرف بھی نکل گئے تھے، ان کی آمد کے بعد ان کے ارادوں کا پتہ چلا۔ لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے اور حویلی کے سامنے ہی ایک صاف ستھرے حصے میں انبار کرنے لگے تھے۔ ٹھکرائن کو حویلی میں نہیں جانے دیا گیا تھا بلکہ وہیں ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ نندا بھی تھوڑے فاصلے پر موجود تھا۔ گیتا نندی جتنا شور مچا سکتی تھی، مچا چکی تھی اور اب اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ٹھاکر کوہلی رام لوگوں سے صلاح و مشورے کر رہا تھا۔ تقریباً ساری بستی ہی امڈ آئی تھی بس عورتیں اور بچے ہی گھروں میں رہ گئے تھے۔ تلسی بھی موجود تھا مگر اتنے فاصلے پر کہ میں اس کے چہرے کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ بہرطور یہ ہنگامہ آرائیاں جاری رہیں۔ لوگوں کی زبانی ان فیصلوں کا پتہ چل رہا تھا جو کوہلی رام اور دوسرے لوگوں کے درمیان بات چیت کرنے سے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ صبح کو پنچایت ہوگی اور ساری باتیں سننے کے بعد فیصلے کئے جائیں گے۔ بستی میں جیسے کوئی تہوار منایا جا رہا تھا۔ پوری بستی روشن تھی، لوگ آ جا رہے تھے۔ ٹھاکر کوہلی رام بھی ایک طرف بیٹھ گیا تھا تھک کر۔ غرض یہ کہ یہ ہنگامے ساری رات جاری رہے۔ اللہ دین میرے پاس واپس آ گیا تھا۔ اب وہ خاصی بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ جنک رام اور گنگو وغیرہ بھی میرے پاس ہی موجود تھے۔ ان دونوں کو مجھ سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی خاص طور سے گنگو کو جس کا بچہ قربان ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ اللہ دین کے لئے بھی بڑی عقیدت کے الفاظ ادا کئے جا رہے تھے کہ اس نے اپنے بیٹے کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نہ تو ٹھاکر کوہلی رام یہ بات مانتا کہ اس کی دھرم پتنی ڈائن ہے اور نہ ہی ٹھکرائن رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی۔ جن لوگوں نے اندر کا منظر دیکھا تھا وہ تو خیر کسی اور بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے لیکن بعض لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ بھی پایا جاتا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ آخر کار صبح ہو گئی۔ ٹھاکر کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے بندھ کر رہ گیا تھا وہ۔ پتہ نہیں اس کے اپنے دل میں کیا تھا۔ ٹھکرائن بھی اب مضمحل نظر تھی غالباً اب اسے اپنی تقدیر کا فیصلہ معلوم ہو گیا تھا۔ صبح کو لوگ

منتشر ہوئے اور کچھ دیر کے بعد پنچایت جم گئی۔ جمال گڑھی کے بڑے بوڑھے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ٹھاکر کو اس وقت مکھیا کا درجہ نہیں دیا گیا تھا لیکن پھر بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس کی عزت کرتے تھے۔ ٹھاکر کے ملازم اس بات پر حیران بھی تھے اور شرمندہ بھی کہ ٹھکرائن کی نوکری کرتے رہے تھے۔ اب ان کے خیالات بھی بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بالآخر لوگوں سے خاموش ہونے کے لئے کہا گیا اور پھر میری پکار پڑی۔ اللہ دین نے کہا۔

''میں جانتا تھا بھیا، پنچایت تمہیں ضرور بلائے گی۔ گنگو، جنک رام اور وہ بہت سے آدمی جن کے بچے مرے تھے، میرے ساتھ ہی آگے بڑھے تھے۔ پنچایت والوں نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹھکرائن غضب ناک آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ نندا کی حالت اب کافی خراب ہوگئی تھی۔ اس کی نظریں بار بار لکڑیوں کے اس ڈھیر کی جانب اٹھ جاتی تھیں، جسے اب چتا کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک راستہ رکھا گیا تھا ٹھکرائن اور نندا کو اندر پہنچانے کے لئے، باقی پوری چتا ایسے بنا دی گئی تھی جیسے مردوں کو جلانے کے لئے شمشان گھاٹ میں بنائی جاتی ہے۔ ایک بزرگ نے کہا۔

''ٹھاکر کوہلی رام ساری باتیں ہمیں پتہ چل گئی ہیں اور اب فیصلہ کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ تو اگر مکھیا کی حیثیت سے اس چوکی پر بیٹھنا چاہے تو اب بھی بیٹھ سکتا ہے لیکن فیصلہ انصاف سے کرنا ہوگا، کوئی ایسی بات نہیں مانی جائے گی جو جھوٹی ہو۔''

''تمہاری مرضی ہے دھرمو چاچا، جیسا من چاہے کرو۔'' ٹھاکر کوہلی رام نے اداس لہجے میں کہا۔

''مسافر بھیا تم کسی اور بستی سے ادھر آئے اور تم نے بھاگ بھری کو اس لاش کے پاس بیٹھے دیکھا۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں بالکل سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ بھاگ بھری صرف بیٹھی ہوئی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاگل ہے، ایک پاگل عورت لاش کو دیکھ کر اس طرح بیٹھ بھی سکتی ہے، اسے ٹٹول بھی سکتی ہے اور یہی بات میں نے دوسروں سے کہی تھی۔''

''اچھا بھیا اب تم لوگ ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ٹھکرائن گیتا نندی ہنومان مندر میں بچوں کی بلی دیتی ہے۔''

''میں بتاتا ہوں دھرمو چاچا۔ مسافر بھیا کو شبہ ہوگیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور بھاگ بھری ڈائن نہیں ہے۔ سو وہ ایک رات ہنومان مندر کی طرف نکل گئے جہاں انہوں نے گیتا نندی اور نندا کو دیکھا۔ وہ میرے بچے کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے انہوں نے اور وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا بیٹا للو وہاں پڑا ہوا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے، مسافر بھیا اکیلا تھا اس لئے اس نے شور مچا دیا۔ گیتا نندی اور نندا چمار بھاگ گئے وہاں سے اور میرا بچہ مسافر بھیا کی وجہ سے بچ گیا۔ وہی اسے لے کر آئے، اس سے گھر کا پتہ پوچھا اور چپ چاپ اسے گھر میں چھوڑ گئے۔ میرے گھر والوں کو اور مجھے تو اس کا پتہ بھی نہیں تھا لیکن صبح کو جب ہم نے للو کی حالت دیکھی تو وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا اور بار بار چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے نہ مارو۔ مجھے گھر جانے دو۔ بری حالت ہوگئی ہماری۔ بڑی مشکل سے ہم بچے کو سمجھا بجھا کر اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوئے تو اس نے یہ کہانی سنائی۔ مسافر بھیا کے بارے میں بھی بتایا۔ ہم نے معلومات کیں تو مسافر بھیا نے ہمیں اصل بات بتا دی۔ وہ باہر کے آدمی ہیں لیکن ہمارے لئے تو دیوتا سمان ہیں۔ میرے بچے کا جیون بچایا ہے انہوں نے۔ میں تو ان پر ہزار جیون قربان کرسکتا ہوں سمجھے دھرمو چاچا۔ بعد میں ہم سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ایسا کام کیا جائے جس سے سب کو اصل بات معلوم ہو جائے۔

✦✤✦✤✦

ایسے ہی اگر ہم کوہلی رام کو یہ باتیں بتاتے تو بھلا چلتی ہماری اور پھر جنک رام اور دوسرے کچھ سر جوڑ کر بیٹھے۔ اللہ دین نے اپنے بیٹے کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا اور ایسا موقع دیا کہ نندا، کلو کو اغوا کر لے اور ہم سب اس کی تاک میں لگ گئے۔ اس کی گواہی بہت سے لوگ دیں گے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بس کچھ دیر ہی تھی کہ گیتا نندی، کلو کو مار ڈالتی مگر ہم سب تیار تھے۔''

''گیتا نندی ایسا کیوں کرتی تھی؟''

''اسی سے پوچھو۔''

"بتائے گی ٹھکرائن؟"

"جھوٹ بول رہے ہیں، سب کے سب جھوٹے ہیں۔ سب پاپی دشمن ہو گئے ہیں میرے، ایک ایک کو ٹھیک کر دوں گی۔ دیکھتے رہو تم سب۔ مہاراج ادھیرنا چندو، چلے میں نہ بیٹھے ہوتے تو......تو......!"

"ادھیرنا چندو......!" ٹھاکر کوبلی رام حیرت سے بولا۔

"وہ کالا جادوگر......!" دھرمو چاچا نے کہا۔"اس سے تیرا کیا واسطہ؟"

"گیتا نندی۔ اس سے تیرا کیا سمبندھ ہے۔"

"کچھ بھی نہیں بتاؤں گی کسی کو!"

"نندا بتائے گا۔ ارے او پاپی روٹی کے کچھ ٹکڑوں کے لئے تو نے کتنے گھر اجاڑ دیئے، زبان کھول دے شاید بچ جائے ورنہ تو زندہ پھونک دیا جائے گا، زبان کھول دے پاپی، اپنی چتا دیکھ رہا ہے تو۔"

نندا کی قوت برداشت جواب دے گئی، دھاڑیں مارنے لگا۔ چیخ چیخ کر رونے لگا۔"ہم نردوش ہیں کھیا جی۔ ہمارا دوش نہیں ہے۔ ہمیں تو......ہمیں تو ٹھکرائن نے مجبور کر دیا تھا۔" گیتا نندی چونک پڑی۔ اس نے گھور کر نندا کو دیکھا۔

"کیا بک رہا ہے نندا؟"

"ارے ارے چتا تو بنوا دی تم نے ہماری ٹھکرائن اب بھی چپ رہیں۔"

"ادھیرنا چندو تجھے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ بھسم کر دیں گے تجھے۔"

"وہ تو بعد میں بھسم کریں گے، ابھی جو بھسم ہو رہے ہیں اسے کون روکے گا؟"

"ارے بولنے دے گیتا نندی۔ پنچایت کے بیچ دخل نہ دے۔"

"سب جھوٹے ہیں۔ سب کائر ہیں اور......اور تم دیکھ رہے ہو کوبلی رام......تم چپ دیکھ رہے ہو۔ بندوقیں نکالو، بھون دو سسروں کو۔" ٹھکرائن غضب ناک لہجے میں بولی۔

"تو نے یہ کیا کر دیا ہے گیتا۔ جیون بھر مجھے دبائے رکھا۔ میں انہیں کیسے دباؤں؟" ٹھاکر نے بے بسی سے بولا۔

"رہے نا نیچ ذات۔ اچھی ذات کے ہوتے تو بہادری دکھاتے۔ پتا جی نے سچ کہا تھا۔" ٹھکرائن نفرت سے بولی۔

"ارے اونچی ذات والی تو نے اپنی ذات خوب دکھائی۔" ٹھاکر کو بھی غصہ آ گیا۔ گیتا نندی اسے خونی نظروں سے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ نندا مسلسل رو رہا تھا۔ اس نے کہا۔"ہم تو نوکر تھے بھائیو۔ مالکن نے جو کہا سو کیا۔ گود سونی تھی اس کی، ٹونے ٹوٹکے کرتی تھی۔ ہمیں کئی جگہ لے گئی نہ جانے کیا کیا کرم کرائے پھر ادھیرنا چندو مہاراج مل گئے۔ انہوں نے یہ کرم بتائے۔ سات بھینٹ دینی تھی ہنومان کے چرنوں میں۔ سو ہم سے یہ بھی کرایا مالکن نے۔ اپنی گود ہری کرنے کے لئے اس نے ہم سے چھ بچے اٹھوائے، ساتویں بلی گنگو کے چھورا کی تھی سو ہم لے گئے اسے اور مسافر نے دیکھ لیا، بلی نہ ہو سکی۔ دھیرنا جی چلے میں بیٹھے ہیں نہیں تو ضرور آ جاتے۔ بڑا سمبندھ ہے اس کا......!"

"اور کچھ سننا ہے ٹھاکر......" دھرمو چاچا نے کہا۔

"میں کیا کہوں دھرمو چاچا، مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔"

"ختم کرو یہ پنچایت۔ اسے چتا میں لے جاؤ۔ نندا کو بھی بھسم کرنا ہوگا۔ اس نے مالکن کے کہنے پر جو کچھ کیا، کرنے سے پہلے خود نہ سوچا؟ اسے بھی بھسم کر دو، جلا دو اسے۔" لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔ تصدیق ہونے کے بعد لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا نندا کو گھیر لیا گیا، لکڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، لوگوں نے نندا کو اٹھا کر آگ میں جھونک دیا تھا۔ پھر وہ گیتا نندی کی طرف بڑھے۔ گیتا نندی بھی خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔ نندا کے گوشت کی چراند فضا میں دور دور تک پھیل رہی تھی اور اسے اپنا حشر نظر آ رہا تھا۔

دفعتاً عقب میں کچھ بھگدڑ سی مچی۔ لوگ چیخنے چلانے لگے۔ میں نے بھی چونک کر دیکھا۔ ایک بے نتھا بیل دوڑتا چلا آ رہا

تھا، اس کی ننگی پیٹھ پر سادھوؤں جیسا حلیہ بنائے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ بیل کی زد میں آ کر کچل گئے تھے۔ گیتا نندی نے اسے دیکھا تو بے اختیار چیخ پڑی۔

''مہاراج ادھیراج...... ادھیرنا چندو...... مجھے بچاؤ مہاراج، مجھے بچاؤ!''

بپھرے ہوئے لوگ رُک گئے۔ ان کی نظریں بیل کی پیٹھ پر بیٹھے سادھو پر تھیں اور اس کی آمد پر وہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس نے جس طرح لوگوں پر بیل دوڑا دیا تھا اس سے اس کی سنگدلی کا پتہ چلتا تھا اور سرکشی کا بھی، جیسے اسے کسی کا خوف نہ ہو اور وہ ان جیتے جاگتے انسانوں کو گھاس کوڑا سمجھتا ہو۔ آن کی آن میں وہ نزدیک آ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ گیتا نندی نے اس کا نام لے کر مجھے اسے سے روشناس کرا دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں درود پاک کا ورد شروع کر دیا کیونکہ ہر مشکل کے حل کیلئے مجھے یہی بخشا گیا تھا۔ ادھیرنا چندو نے خونی نگاہوں سے یہاں موجود لوگوں کو دیکھا اور لوگ دہشت سے کانپنے لگے۔ سفلی علوم کے اس ماہر کے بارے میں بستی بھر کے لوگ جانتے تھے۔ اس سے نفرت بھی کرتے تھے اور خوفزدہ بھی رہتے تھے۔

''کیا ناٹک رچایا ہے رے کم ذات تو نے۔ کیا کہہ رہی ہے یہ......!'' اس نے کوہلی رام کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں نے، میں نے نہیں مہاراج، سب بستی والوں نے......'' کوہلی رام ہاتھ جوڑ کر کانپتا ہوا بولا۔ لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے تھے، دور تک ادھیرنا کے لئے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

''کاہے رے حرام خورو...... کاہے موت کو آواز دی تم نے۔ جانتے ہو ہماری رن بیوتا ہے گیتا نندی، ہماری شکتی کے سائے میں ہے۔ ارے او بڈھے سرپنچ تو بتا کیا ہے یہ سب کچھ۔'' ادھیرنا چندو شاید بستی والوں کو جانتا تھا، اس نے دھرمو چاچا کو مخاطب کیا تھا۔

''گیتا نندی ٹھکرائن، ڈائن بن گئی ہے مہاراج۔'' دھرمو نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''ارے او ڈائن کے سگے۔ باؤلے بن گئے ہو کیا تم سارے کے سارے...... ہنومان بلی دے رہی تھی وہ، اس کی گود بھی تو سونی تھی۔''

''اس نے چھ پریوار سونے کر دیئے مہاراج۔ چھ بچوں کو مار کر ان کے کلیجے چبا گئی۔'' جنگ رام ہمت کر کے بولا۔

''ارے پاپیو۔ ارے باؤلو۔ ارے جنم کے اندھو، امر ہو گئے وہ ہنومان کے چرنوں میں بھینٹ ہو کر۔ تم سب بال بچوں والے ہو، ایک ایک کے گھر میں چھ چھ کھیل رہے ہیں۔ ایک کے چلے جانے سے کون سا فرق پڑ گیا۔ یہ چتا اندھ کیسے اُٹھ رہی ہے اگنی سے۔ کیا جلا رہے ہو تم اس میں؟''

''انہوں نے نندا کو زندہ بھسم کر دیا ہے مہاراج۔ زندہ آگ میں جھونک دیا ہے اسے اور مجھے بھی یہ اگنی میں جھونکنے والے تھے۔'' گیتا نندی شیر ہونے لگی۔

''تمہارا ستیاناس پاپیو، اپنا نرکھ تم نے دھرتی پر ہی بنا لیا۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نندا ہمارا سیوک تھا۔ ٹھیک ہے تم نے جو کیا اس کا پھل بھگتو گے۔ نندا نے بھوت بن کر تم سب کو ایسے ہی بھسم نہ کیا تو ہمارا نام بھی ادھیرنا چندو نہیں ہے۔ کون سورما جھونکے گا اسے آگ میں آؤ آگے بڑھو، اسے چھو کر دکھاؤ...... اور تو زنخے، کم ذات کھڑا دیکھ رہا ہے سب کو۔ دیکھ لیا گیتا نندی، یہ فرق ہوتا ہے ذات کا۔ تیرے ماتا پتا کہتے تھے تجھ سے۔'' ادھیرنا نے کوہلی رام کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''یہ انیائے ہے مہاراج۔ ہمارے من سلگ رہے ہیں۔ ہم بدلہ لیں گے۔ ہمیں بدلہ لینے دو......'' کچھ لوگوں نے کہا اور ادھیرنا چندو کی گردن ان کی طرف گھوم گئی۔

''آؤ آؤ۔ آگے آؤ، ہم نیائے کر دیں۔ یہ اگنی تم نے جلائی ہے۔ بہت بڑی چتا بنائی ہے تم نے۔ لاؤ پہلے اسے بجھا دیں۔ پھر تمہارے سلگتے من بھی بجھا دیں گے۔'' ادھیرنا چندو بیل کی پیٹھ سے اُتر آیا۔ اس نے تیزی سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھا پھر ہونٹ سکوڑ کر ان پر پھونک مارنے لگا۔ تیز سنسناہٹ کے ساتھ آگ دبنے لگی۔ جلتی ہوئی موٹی لکڑیاں ہوا کے دباؤ سے جگہ

چھوڑنے لگیں اور لوگ گھبرا کر اس رُخ سے ہٹ گئے جدھر لکڑیاں سرک رہی تھیں۔ شعلے بجھنے لگے۔ لکڑیاں اس طرح بجھ گئیں جیسے ان پر اوس پڑ گئی ہو۔ نندا کی لاش بھی نظر آنے لگی تھی۔ کوئلہ ہو گیا تھا جل کر۔

میرے لئے اب عمل ضروری تھا۔ میں نے ایک تصوراتی حصار ادھیرنا چندو کے گرد قائم کر دیا۔ ادھیرنا نے آگ ٹھنڈی کر کے اپنا کام ختم کیا۔ پھر بولا۔ ''اب بولو کس کس کا من سلگ رہا ہے۔'' لوگوں کے چہرے فق تھے مگر بھاگا کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے پیچھے سے کچھ لوگ کھسک گئے ہوں یا پھر وہ چلے گئے تھے جو زخمی ہو گئے تھے۔ گیتا نندی کی نظر اچانک مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف اشارہ کر کے بولی۔

''یہ سب سے آگے آگے تھا مہاراج۔ مسلمان کا چھوکرا۔ اس نے بڑی ہتھیا مچائی ہے۔'' ادھیرنا چندو مجھے گھورنے لگا۔ پھر کسی قدر حیرانی سے بولا۔

''یہ کون ہے؟ کون ہے رے تو؟''

''میری کہانی تو بہت لمبی ہے ادھیرنا چندو مگر تو نے بہت برا کیا ہے۔ گیتا نندی کو تو نے ہی اس برے کام پر آمادہ کیا تھا۔''

''ہاں کیا تو تھا۔ سزا دے گا کیا تو مجھے۔'' ادھیرنا کے لہجے میں غرور اور انداز میں تمسخر تھا۔

''مجرم تو، تو بستی والوں کا ہے وہی تجھے سزا دیتے تو اچھا تھا مگر یہ معصوم لوگ تجھ سے ڈرتے ہیں، مجبوراً مجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔''

''اچھا۔'' ادھیرنا مسکرا کر بولا۔ کیا جرم کیا ہے ہم نے مہاراج؟'' وہ مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔

''تم تینوں مجرم ہو، تم نے گیتا نندی کو گمراہ کیا اور گیتا نندی شیطان بن گئی۔ اس نے چھ بچوں کی جان لے لی۔ نندا نے اس کے ساتھ مل کر ان بچوں کو اغوا کیا۔ اسے تو سزا مل گئی تم دونوں باقی ہو۔''

''تو ہمیں بھی سزا دے دو مہاراج۔ تمہاری چتا تو بجھ گئی۔''

''ایسی ایسی ہزاروں چتائیں بھڑک سکتی ہیں دھیرنا۔ تو نے اسے بجھا کر کوئی بہت بڑا کام کیا ہے؟''

''جے ہنومان گورا چوکیہ۔ یہ مہاراج ادھیراج کیا کہہ رہے ہیں۔ جاؤ مہاراج پہلے تو بجرنگ بلی کی لنکا کی سیر کر لو......'' اس نے میری طرف رُخ کر کے ہونٹ گول کر لئے۔ تیز ہوا کی سنسناہٹ سنائی دی۔ غالباً وہ مجھے پھونکوں سے اُڑا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں سے خارج ہونے والی ہوا کسی ٹھوس شے سے ٹکرا کر واپس ہونے لگی۔ یہ ٹھوس شے میرا قائم کیا ہوا حصار تھا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ ہمت بندھ گئی۔ تیز ہوا حصار میں گھٹ گئی تھی اور اندر منتشر ہو رہی تھی جس سے گیتا نندی اور خود ادھیرنا چندو کے بال اور کپڑے اُڑنے لگے۔ ساتھ ساتھ اندر موجود کوڑا کرکٹ اور جلی ہوئی لکڑیوں کی راکھ بھی۔ اُدھیرنا حیران ہو کر رک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

''بجرنگ بلی کی لنکا تو مجھے نظر نہیں آئی ادھیرنا۔ مگر اب تیرا یہ بیل تجھے سیر کرانے لے جا رہا ہے۔'' میں نے بیل کو گھورتے ہوئے کہا۔ اچانک بیل کے تیور بگڑنے لگے۔ اس نے اپنی جگہ اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور اور ادھیرنا ایک طرف ہٹ گیا۔ بیل نے کھر زمین پر گھسے اور پھر گردن جھکا کر ادھیرنا پر حملہ آور ہو گیا۔ ادھیرنا بدحواس ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ بیل آگے بڑھ کر حصار کی دیواروں سے ٹکرایا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے سر سے خون بہا تو وہ شدت جوش سے دیوانہ ہو گیا اور پھر اس نے ادھیرنا کو تاک لیا اور پھنکاریں مار مار کر اس پر قلانچیں بھرنے لگا۔ گیتا نندی دہشت زدہ ہو کر بھاگی لیکن وہ حصار کے قیدی تھے، وہ بھی نادیدہ دیوار سے ٹکرائی اور چیخ مار کر گر پڑی۔ ادھر بیل نے ادھیرنا کو گھیر لیا اور سینگوں پر اٹھا کر بری طرح رگیدنے لگا۔ ادھیرنا کا داہنا گال پھٹ گیا مگر بیل اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ادھیرنا جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کرتا وہ اگلے پاؤں اٹھا کر پوری قوت سے ٹکر مارتا اور ادھیرنا کئی کئی فٹ اُچھل کر گرتا۔ اِدھر گیتا نندی مسلسل کوششیں کر رہی تھی۔ بستی والے دم بخود کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ادھیرنا چندو کے حلق سے دلدوز چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر گیتا نندی بھی بیل کی لپیٹ میں

آ گئی۔ کوہلی رام کے منہ سے آواز نکل گئی جسے اس نے جلدی سے دبا لیا۔ بستی والوں کا سکوت ٹوٹ گیا، وہ شور مچانے لگے۔ خوشی سے اچھلنے لگے قہقہے لگانے لگے۔ شور کی آواز سے بیل اور بپھر گیا۔ اس نے ٹکریں مار مار کر ان دونوں کا قیمہ بنا دیا۔ وہ گوشت کے لوتھڑے بن گئے تھے۔ بیل بھی کئی بار حصار سے ٹکرایا تھا اور بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی گر پڑا اور اس نے پاؤں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا۔

کچھ منٹ گزر گئے تو میں آگے بڑھا اور ان لاشوں کے قریب پہنچ گیا۔ بستی والے میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ پھر ان کی ہمت بڑھ گئی اور دوسرے لمحے وہ ''مسافر مہاراج کی جے، مسافر مہاراج کی جے!'' کرتے ہوئے قریب آ گئے۔ وہ میرے پاؤں چھو رہے تھے، ہاتھ چوم رہے تھے۔ انہیں روکنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے بے بسی سے دل میں کہا۔

''معبود کریم...... میں مجبور ہوں۔ کتنا ہی شور مچاؤں، یہ میری نہیں سنیں گے۔ جس طرح ممکن ہو سکتا تھا ان سے بچ رہا تھا۔''

جنک رام چیخ کر بولا۔ ''رک جاؤ بھائیو۔ رک جاؤ۔ پریشان نہ کرو مسافر مہاراج کو۔ بعد میں مل لینا ان سے...... پریشان مت کرو۔'' ......لیکن کون مانتا۔ کوہلی رام اس بھیڑ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگ ادھیرنا سے بھی نفرت کرتے تھے چنانچہ چتا پھر جلا دی گئی اور ان کے جسموں کے لوتھڑے گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیئے گئے۔ اس عمل کے دوران مجھے ان سے بچ نکلنے کا موقع مل گیا اور میں وہاں سے سرائے کی طرف بھاگا۔ سرائے میں آ کر دم لیا تھا لیکن اندازہ تھا کہ اب کیا ہو گا۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ گیتا نندی ختم ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ایک خبیث بھی جو سفلی علوم کا ماہر تھا۔ نہ جانے مزید کتنے انسانوں کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچتا لیکن جو کچھ اس کے بعد ہوا تھا اور ہونے والا تھا وہ میرے لئے بھیانک تھا۔

اللہ دین آ گیا۔ بیوی کو پکارتا ہوا اندر گھسا تھا۔ ''زبیدہ اری نیک بخت کہاں گئی۔''

''کیا ہے؟'' زبیدہ کی آواز ابھری۔

''غضب ہو گیا۔ وہ مسافر شاہ صاحب تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ اری معمولی آدمی نہیں ہیں وہ۔ وہی ہیں، ساری بستی ان کا نام لے رہی ہے۔ مقدر پھوٹ گیا ہمارا۔ پیسے نہ لیتے ان سے یونہی خدمت کرتے تو بیڑا پار ہو جاتا۔ خوش ہو کر کچھ ایسی چیز دے دیتے ہمیں کہ وارے نیارے ہو جاتے۔''

''مسافر بھیا کی بات کر رہے ہو؟''

''تو اور کیا۔''

''کیا ہوا؟'' زبیدہ نے پوچھا اور اللہ دین اسے کوہلی رام کے گھر پر پیش آنے والے واقعات بتانے لگا۔ یہ جگہ بھی مخدوش ہو گئی۔ بعد میں جب عقیدت مند یہاں پہنچیں گے تو نہ جانے کیسی کیسی مشکلیں پیش آ گئیں۔ خود اللہ دین زبیدہ سے جو کچھ کہہ رہا تھا اس سے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ زبیدہ کو میرے یہاں آنے کا علم تھا۔ چنانچہ بس کچھ دیر جا رہی تھی کہ وہ مجھ تک پہنچ جاتے۔ نکل جانا چاہئے۔ آج کے تین روپے زبیدہ کو دے چکا تھا۔ ایک روپیہ پاس موجود تھا۔ اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز چلتا ہوا بستی سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ چند لوگوں نے مجھے دیکھا لیکن یہ وہ تھے جنہیں میرے بارے میں معلوم نہیں تھا اس لئے وہ مشکل نہ بنے اور میں ان کے درمیان سے نکل آیا۔ کھیتوں وغیرہ کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر ہنومان مندر کی عمارت نظر آئی۔ ویران اور کھنڈر عمارت میں بہت بھیانک ڈرامے ہوتے رہے تھے۔ رات یہاں گزاری جا سکتی ہے۔ بستی کے لوگ مجھے تلاش کرنے کم از کم یہاں نہیں آئیں گے۔ کل دن کی روشنی میں یہاں سے کسی سمت کا تعین کر کے نکل جاؤں گا۔ حالانکہ بھیانک جگہ تھی لیکن میرے لئے بے حقیقت تھی۔ اندر داخل ہو گیا ایک پرسکون گوشہ منتخب کر کے آرام کرنے لگا۔

سامنے ہی ہنومان کا بت ایستادہ تھا، اسے دیکھتا رہا۔ بے جان پتھر جسے انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا۔ ایک بے ضرر سی

شے۔ ذہن نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ تاریکیاں گہری ہوتی گئیں۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ ہنومان کے بت کا ہیولا بھی نہیں نظر آ رہا تھا تو کسی نے ادھر آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ویسے بھی لوگ اس جگہ سے خوفزدہ رہتے تھے۔ چنانچہ سکون تھا۔ رات گزرتی رہی۔ نہ جانے کیا وقت تھا۔ کئی بار نیند کے جھونکے آئے تھے لیکن ہر بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھی۔ چت لیٹا ہوا تھا۔ اس لئے مندر کی چھت سامنے تھی اور چھت پر دو ننھی ننھی آنکھیں متحرک تھیں۔ پیلی بدنما آنکھیں۔ شناسا آنکھیں۔ آنکھیں آہستہ آہستہ جگہ چھوڑ رہی تھیں۔ مکڑی...... میرے ذہن میں خیال ابھرا۔ ایسی مکڑیاں بھوریا چرن ہی کی فرستادہ ہوتی تھیں۔ آہ کاش یہاں روشنی ہوتی۔ ایسی کوئی چیز ہوتی جسے روشن کر کے میں اس مکڑی کو دیکھ سکتا۔ یہ خیال دل میں گزرا تھا کہ اچانک ہی ماحول روشن ہونے لگا۔ دیواریں نظر آنے لگیں۔ ہنومان کا بت صاف نظر آنے لگا۔ ہر چیز اتنی نمایاں ہو گئی کہ عام حالات میں بھی نہیں ہوتی تھی لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ مکڑی روشنی ہوتے ہی تیز تیز چل پڑی اور پھر ایک سوراخ میں گھس کر روپوش ہو گئی۔ پیلے رنگ کی مکڑی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مکڑی تو غائب ہو گئی تھی لیکن روشنی بدستور تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ روشنی میرے دل سے پھوٹی ہے۔ میرے دل نے روشنی طلب کی میرے تو اطراف منور ہو گئے۔ یہ عطیۂ الٰہی تھا۔ یہ کرم نوازی تھی میری ذات پر...... دل سرور سے بھر گیا۔ بڑے انعام سے نوازا گیا تھا مجھے۔ شکر نہیں ادا کر سکتا تھا۔ کچھ رقت سی طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ مندر سے باہر کھلی جگہ پر نکل آیا۔ باہر سنسان خاموشی طاری تھی۔ ایک صاف سی جگہ دیکھی اور سجدہ ریز ہو گیا۔ دل شکر گزار تھا اور ذکر الٰہی نے ساری تنہائیاں دور کر دی تھیں۔ کسی کی آواز کانوں میں ابھری۔

''تم تنہا کہاں ہو۔ ہم سب تو ہیں تمہارے ساتھ۔ کبھی خود کو تنہا نہ سمجھنا۔'' دور دور تک کوئی نہ تھا لیکن لگ رہا تھا جیسے بہت سے لباس سرسرا رہے ہوں، بڑی تقویت ملی تھی اور اس احساس نے بہت خوشیاں بخشی تھیں کہ میری پذیرائی ہو رہی ہے۔ کیا کم تھا یہ سب کچھ، اتنا بڑا مرتبہ دے دیا گیا تھا۔ مجھ گناہ گار کو، دل سرشار ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر پہلے جو کیفیت ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی تھی۔ نجانے کب تک اسی جگہ سجدہ ریز رہا، یہ سجدۂ شکر تھا، یہاں تک کہ پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں سنائی دینے لگیں۔ صبح کا آغاز ہو گیا تھا اور فجر کی نماز کا وقت بھی، نماز پڑھی اس سے پہلے کہ بستی کے لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے اس طرف نکل آئیں، میرا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ چنانچہ نماز کے فوراً بعد چل پڑا اور تیز رفتاری سے اسی جانب بڑھتا رہا، جدھر رُخ ہو گیا تھا۔ منزل کے بارے میں تو پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ جانتا تھا کہ کوئی منزل نہیں ہے، سفر کرتے کرتے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ نجانے کون سے راستے تھے، نجانے کس سمت رخ تھا۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی کے قریب پہنچا تو سامنے سے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ کوئی دیہاتی تھا جس نے پیچھے سبزیوں کا ڈھیر لاد رکھا تھا مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی اور زور سے آواز دی۔

''ارے او بھیا۔ بھیا رے کدھر جا رہے ہو؟''

اس کو دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر اس پر غور کیا اور پھر کہا۔ ''بس بھیا مسافر ہوں، کسی بستی کی تلاش میں تھا۔''

''کسی بستی کی کیوں؟''

''راستہ بھول گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''پردن پور تو نہیں جانا......؟''

''کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''پردن پور......''

''چلے جائیں گے اگر تم لے جاؤ تو......'' میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو ہم کون سی اپنی کھوپڑی پر بٹھا کر لے جائیں گے بھیا۔ بیل گھسیٹ لیں گے تمہیں بھی۔ آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔'' بیل گاڑی

پر میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ خوش مزاج سا نوجوان معلوم ہوتا تھا کہنے لگا..... "کہاں سے آ رہے ہو، کہاں کا راستہ بھول گئے تھے؟"

"اللہ جانے کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، بس چل پڑے تھے ایسے ہی۔"

"ارے گھر والی سے لڑ کر بھاگے ہو یا ماں باپ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑا ہے؟"

"ہاں بس ایسا ہی سمجھ لو، اپنی تقدیر سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیا ہے بلکہ تقدیر نے گھر چھین لیا ہے۔"

"دیکھو بھائی ہم ٹھہرے دیہاتی آدمی، ہماری کھوپڑیا ہے چھوٹی، کھری کھری صاف صاف باتیں تو سمجھ میں آ جاتی ہیں، باقی باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ لوگ ویسے ہی للو کہتے ہیں، حالانکہ نام ہمارا رشید ہے، چونکہ باتیں ذرا کم سمجھ میں آتی ہیں اس لئے سارے کے سارے للو کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"تم برا نہیں مانتے اس بات کا......"

"ارے نہیں بھیا، جو بھی کہتا ہے پیار سے کہتا ہے۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"مسعود"...... میں نے جواب دیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ مسلمان ہے، پھر میں نے اس سے کہا۔ "تم پردن پور میں رہتے ہو؟"

"نہیں بھیا۔ ہم تو کھیری بستی کے رہنے والے ہیں۔ سبزیاں اُگاتے ہیں اور پردن پور جا کر بیچ آتے ہیں، لگے بندھے گراہک ہیں اپنے کھرا مال دیتے ہیں، کھرے پیسے لیتے ہیں۔ اب پردن پور جائیں گے ان لوگوں کو سبزی دیں گے پیسے وصول کریں گے اور بھیا گھر کا سودا لے کر واپس چلے آئیں گے۔ رات تک کھیری پہنچ جائیں گے۔"

"اچھا۔ رات تک کھیری پہنچ جائیں گے۔"

"اچھا، عزت سے کمائی کرتے ہو۔ یہ عبادت ہے۔" میں نے کہا...... اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "بس بھیا اللہ کا کرم ہے روزی دے دیتا ہے اور سنو، اگلی عید میں ہماری شادی ہو رہی ہے، اس کا نام بشیرن ہے۔ بھیا بڑی نیک لڑکی ہے۔ پتہ ہے اس کا باپ پچھلے دنوں پالا لگنے سے معذور ہو گیا ہے۔ بے چارہ شریف آدمی ہے بخشو بھی۔ رونے لگتا ہے مجھے دیکھ کر، کہتا ہے کہ دل میں پتہ نہیں کیا کیا تھا بیٹی کے بیاہ کے لئے مگر اب کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے بھی کہہ دیا۔ بھیا کہ لڑکی دے دے دو کپڑوں میں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تیرے للو کے پاس، عزت سے رکھے گا تری لونڈیا کو، بس بھیا انسان کو انسان سے محبت ہونی چاہئے، یہ روپیہ پیسہ ہے کیا چیز، آج کسی کا کل کسی کا، کیسے مریں ہیں لوگ اس پر...... بھیا اپنی تقدیر لے کر آئے گی۔ دو روٹی کھائے گی، ہمارا بھی گھر بس جائے گا کیوں ہے کہ نا......؟"

"بالکل بالکل ٹھیک کہا تم نے رشید بھیا۔" میں نے جواب دیا تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔ "جب کوئی ہمیں رشید کہتا ہے تو ہم ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں جیسے رشید ہمارا نام ہی نہ ہو، تم بھی للو ہی کہو۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"پردن پور میں کسی کے پاس جاؤ گے؟" باتیں کرنے کا شوقین معلوم ہوتا تھا، مجھے بھی برا نہیں لگ رہا تھا میں نے کہا۔

"کسی سرائے میں ٹھہروں گا جا کر۔"

"اچھا اچھا...... کوئی ہے نہیں وہاں تمہارا......؟"

"نہیں۔"

"کوئی کام ہے وہاں کسی سے۔"

"ہاں بس ایسے ہی۔"

"ہماری مانو تو واپس ہمارے ساتھ کھیری چلو، تھوڑے دن ہمارے مہمان رہو، اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور بھی یار دوست ہیں وہاں، ہمارے ساتھ مزہ آئے گا تمہیں۔"

''بہت بہت شکریہ رشید بھیا لیکن مجھے وہاں سے کہیں اور بھی جانا ہے۔''

''اچھا اچھا تمہاری مرضی۔'' اس نے کہا اور اس کے بعد خاموش ہو گیا جیسے اب اس کے پاس باتیں کرنے کے لئے کچھ نہ رہا ہو لیکن اتنی دیر کی خاموشی میں اس نے غالباً یہی سوچا تھا کہ اب آگے کیا باتیں کرے یا ہو سکتا ہے کچھ سوچ رہا ہو۔ بہرحال تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ ''ارے ہاں تمہاری شادی ہو گئی؟''

''نہیں۔''

''ماں باپ، بہن بھائی تو ہوں گے''؟

''ہاں اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ کھایا پیا؟ ارے لو...... اصل بات تو بھول ہی گیا۔ ارے بھیا کچھ کھایا پیا تم نے یا نہیں......'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں للو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔''

''تو پھر کہا کیوں نہیں۔ ارے واہ بھیا اب ایسا بھی کیا کہ آدمی بھوکا ہو اور منہ سے کچھ نہ بولے۔'' اس نے بیل گاڑی روکی۔ پیچھے ہاتھ کر کے کپڑے کی ایک پوٹلی سی اٹھائی، اسے کھولا، چار روٹیاں پکی رکھی تھیں۔ ساتھ ہی گڑ کی ڈلیاں بھی تھیں۔ اس نے دو روٹیاں میرے سامنے رکھ دیں اور دو اپنے سامنے رکھ لیں۔ گڑ بھی آدھا آدھا تقسیم کیا اور مسکرا کر بولا۔ ''غریب کا کھاجا تو یہی ہے، چلو اللہ کا نام لے کر شروع ہو جاؤ۔'' میں نے بسم اللہ کہا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ مسلمان کے گھر کی پکی ہوئی روٹیاں تھیں، اس لئے کوئی تکلف نہیں ہوا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا پانی کا بھی اس نے بندوبست کر رکھا تھا چنانچہ پانی پینے کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

پردن پور اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا بلکہ اسے چھوٹا موٹا شہر ہی کہنا درست تھا۔ آبادی میں داخل ہونے کے بعد میں اس سے رخصت ہو گیا۔ اللہ نے یہاں تک پہنچانے کا ذریعہ پیدا کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ رزق سے بھی نوازا تھا لیکن یہاں اس علاقے میں میری آمد کا کوئی اہم مقصد نہیں تھا۔ جمال گڑھی کے بارے میں تو حکم ہوا تھا اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں مجھے کس لئے بھیجا گیا تھا۔ ایک معصوم عورت مصیبت سے بچ گئی تھی اور دوسری شیطان صفت عورت جو چھ انسانوں کا خون کر کے ساتویں کی زندگی کی گاہک بنی ہوئی تھی، ایک گندے شیطان کے ساتھ فنا ہو گئی تھی۔ نندا، گیہوں کے ساتھ گھن کی حیثیت سے پس گیا تھا۔ ظاہر ہے شریک جرم بھی اتنا ہی مجرم ہوتا ہے جتنا کہ اصل مجرم، نندا نے صرف مالکن کی خوشنودی کے لئے ان چھ بچوں کو اغوا کیا تھا اور برابر کا اس جرم میں شریک رہا تھا۔ اس طرح تین شیطان کیفر کردار کو پہنچ گئے تھے۔ ادھیر ناچندو بھی اپنے سفلی علم کے ذریعے نجانے کسے کسے نقصان پہنچاتا۔ گندے علوم کے یہ ماہر جو غلاظتوں کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، اس روئے زمین پر بدنما دھبے ہیں۔ شیطانی جنتر منتر پڑھ کر وہ معصوم انسانوں کو نقصان پہنچاتے تھے چنانچہ ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ اور اس کے لئے ضروری نہیں تھا کہ میں اشاروں کا انتظار کروں۔ ایک سپاہی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی جگہ قانون شکنی دیکھے تو اپنا فرض پورا کرے۔ قانون اسے اختیار اسی لئے دیتا ہے چنانچہ نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

آبادی وسیع تھی کوئی جگہ ٹھکانہ بن سکتی تھی۔ شہر گردی کرنے لگا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب مسجد نظر آئی، ظہر کی نماز وہاں پڑھی۔ مسجد کے سامنے وسیع میدان تھا جہاں گھنے درخت بکھرے ہوئے تھے۔ ٹھکانہ ہی ٹھکانہ تھا۔ کوئی مشکل ہی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دو روٹیاں عطا کر دی تھیں۔ کام چل گیا تھا۔ رات کا کھانا ایک نانبائی کی دکان پر کھایا۔ ڈیڑھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ دو افراد نظر آئے جو شاید بھکاری تھے اور کھانا کھانا چاہتے تھے۔ پچھلے کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے، انہیں دے دیئے اور فراغت ہو گئی۔ مسجد کی قربت سے عمدہ جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی چنانچہ وہیں ڈیرہ جمالیا۔ رات ہو گئی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آرام کرنے لیٹ گیا اور نیند آ گئی۔ صبح ہی آنکھ کھلی تھی۔ دن بھر شہر کا گشت کیا شام کو راستہ بھول گیا۔ دیر تک چکراتا رہا لیکن اسٹیشن نہ پہنچ سکا۔ کسی سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ کچھ فاصلے سے ایک شخص گزر رہا تھا لیکن لمبی داڑھی میلے کچیلے لباس میں ملبوس۔

''سنو بھائی۔'' میں نے اسے پکارا اور وہ رُک گیا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

''ریلوے اسٹیشن جانا چاہتا ہوں۔''

''تو میں کیا کروں؟'' وہ ترش لہجے میں بولا۔

''رستہ بھول گیا ہوں۔''

''تو یہاں کیوں مر رہے ہو۔''

''جی۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے سمجھے، وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے ریل میں بیٹھو اور سالم نگر چلے جاؤ۔ بابا شاہ جہاں کا عرس ہو رہا ہے۔'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور میں حیرت سے اس شخص کو دیکھنے لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور پھر بند مٹھی میری طرف کرتے ہوئے بولا ''ٹکٹ کے پیسے سنبھالو۔''

''آپ، آپ کون ہیں؟''

''کوتوال، سمجھے۔ جاؤ اپنا کام کرو زیادہ بک بک نہیں کرتے، لو پیسے لو۔'' اس نے زبردستی پیسے میری جیب میں ٹھونسے اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ میں حیران نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا کہ یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ اور کیا ہوتے۔ سالم نگر چلے جاؤ وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے۔ میں نے چونک کر اس سمت دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ ریلوے اسٹیشن سامنے نظر آ رہا تھا۔ ماحول ہی بدل گیا تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں کچھ دیر قبل کھڑا تھا اور جہاں سے میں نے پہلے اسٹیشن کا پتہ پوچھا تھا۔ سوچنا بیکار تھا، آگے قدم بڑھا دیئے۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ سالم نگر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ بکنگ ونڈو پر پہنچ گیا۔

''سالم نگر جانا ہے۔'' میں نے اندر جھانکتے ہوئے کہا جہاں چند لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''خدا حافظ۔'' ایک نے کہا اور دوسرے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

''ریل کس وقت آئے گی؟''

''جب اللہ کی مرضی ہوگی۔''

''ٹکٹ مل جائے گا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پیسے دو گے تو ضرور مل جائے گا۔'' وہ شخص مسلسل مذاق کر رہا تھا۔

''کتنے پیسے ہوں گے۔''

''یار جان کو ہی آ گیا تو تو ...... لطیفہ بیچ میں رہ گیا۔ تیس روپے نکالو۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تیس روپے اسے دے دیئے اور اس نے چھبیس روپے کا ٹکٹ میرے حوالے کر دیا۔ ٹکٹ پر درج شدہ رقم دیکھ کر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس پر چھبیس روپے لکھے ہیں۔''

''چار روپے ٹیکس ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی چھوڑ دی۔ تھوڑی ہی دور پہنچا تھا کہ اچانک اندر دھما کہ سنائی دیا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھ آیا۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں ایک ستون کے سہارے بیٹھ گیا۔ ابھی لائن خالی پڑی ہوئی تھی۔ کسی سے پوچھ لوں گا ریل کے بارے میں۔ بیٹھے بیٹھے کوئی بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک آدمی تیزی سے میرے قریب آ گیا۔ میں نے سے غور سے دیکھ کر پہچان لیا، یہ وہی ریلوے بکنگ کلرک تھا۔ میرے قریب بیٹھ گیا۔ ''معافی چاہتا ہوں معاف کر دیں گے۔''

''کیا ہو گیا بھائی۔''

''بس مجھے معاف کر دیں میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی مجھے سزا مل گئی۔ آپ نے بد دعا دی ہو گی مجھے۔''

''خدا نہ کرے اتنی سی بات پر کسی کو بددعا کیسے دی جا سکتی ہے۔''
''میرے دل نے یہی کہا۔ میں نے آپ سے مذاق کیا اور اور آپ سے چار روپے زیادہ لے لئے۔ یہ دیکھئے میرا ہاتھ زخمی ہو گیا اور دوسری مصیبت الگ گلے پڑ گئی۔''
''ارے یہ
ہو گیا۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر کسے ہوئے رومال کو دیکھ کر کہا جو خون سے سرخ ہو رہا تھا۔
''بس بھائی صاحب ایک ریک گر پڑا، جو بالکل ٹھیک رکھا ہوا تھا۔ شیشے کا کچھ سامان رکھا ہوا تھا اس پر وہ بھی ٹوٹ گیا اور شیشہ میری کلائی پر لگا۔ اچھا خاصا خون بہہ گیا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تین آدمیوں کے بھی اچھی خاصی چوٹ لگی ہے۔ ہم سب کے دل میں ایک ہی خیال آیا وہ یہ کہ ہم لوگوں نے آپ سے بلاوجہ مذاق کیا اور میں نے چار روپے زیادہ لے لئے۔ میں انتہائی عاجزی سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں اور یہ رہے آپ کے چار روپے۔ اس نے چار روپے میری جانب بڑھا دیئے میں نے شرمندہ سی نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا۔ ''آپ کے چوٹ لگنے کا مجھے افسوس ہے۔ اگر تھوڑی سی دل آزاری ہوئی ہے میری تو اس کے لئے میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔''
''بہت بہت شکریہ جناب میری طرف سے آپ ایک پیالی چائے ہی پی لیجئے، مجھے خوشی ہو گی۔''
''نہیں بھائی چائے کی حاجت نہیں ہے۔''
''میری خوشی کے لئے۔'' وہ شاید بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر چائے بیچنے والے سے اس نے دو پیالی چائے کے لئے کہا میں نے اس سے پوچھا۔
''اب اگر احسان ہی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے یہ بتا دیجئے کہ سالم نگر جانے کے لئے ریل کتنی دیر میں آئے گی۔''
''بس اب سے تقریباً پونے گھنٹے کے بعد اگر لیٹ نہ ہوئی ہو تو۔''
''کدھر سے آئے گی۔'' میں نے سوال کیا اور اس نے اشارے سے مجھے سمت بتا دی۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ کر اس نے چائے پی اور اٹھتا ہوا بولا۔ ''میرے حق میں دعائے خیر کیجئے۔ آپ نے مجھے معاف تو کر دیا ہے۔''
ریل ٹھیک پون گھنٹے کے بعد آ گئی اور میں اس کے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ مسافر زیادہ تر سو رہے تھے۔ ایک مسافر نے مجھے شی شی کر کے اپنی طرف مخاطب کیا اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ ریل کا ڈبہ بھرا ہوا تھا۔ سونے والوں نے زیادہ تر جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس شخص نے مجھے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں بیٹھ جاؤ تم نے ریلوے بابو سے یہ نہیں پوچھا کہ سالم نگر کا فاصلہ کتنا ہے اور تم کس وقت وہاں پہنچو گے۔'' میں نے حیرانی سے اس شخص کو دیکھا، صورت شکل میرے لئے اجنبی تھی۔ سادہ سا چہرہ تھا۔ میں ششدر کھڑا ہی ہوا تھا کہ وہ بولا۔
''بیٹھ جاؤ یہ جگہ تمہارے لئے محفوظ رکھی گئی ہے اور ہاں سنو صبح فجر کی اذان جیسے ہی سنائی دے نیچے اتر جانا، وہی سالم نگر کا اسٹیشن ہو گا۔ مسجد اسٹیشن پر ہی ہے۔ صاف نظر آ جائے گی اچھا خدا حافظ۔'' وہ دروازے کی جانب بڑھا پھر وہاں سے رک کر پلٹا اور میری طرف رخ کر کے کہنے لگا۔
''کسی سے اس کے بارے میں پوچھتے نہیں ہیں۔ ہاں جو لوگ تم سے متعارف ہونا چاہیں ان کی بات اور ہے ورنہ ان کی پیشانی پر اس چمک کو دیکھ لیا کرو جو انہیں اعزاز کے طور پر ملتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا اور میں ایک عجیب سی کپکپی اپنے وجود میں محسوس کرنے لگا۔ یہ ساری رمز کی باتیں تھیں۔ اس شخص نے اپنے آپ کو کوتوال کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا جس نے میری رہنمائی سالم نگر کی جانب کی تھی اور اب یہاں بھی میرے لئے انتظامات موجود تھے۔ ریل ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ سیٹیوں کی دو آوازوں پر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ میری نگاہیں کھڑکی سے پرے تاریکی میں بھٹکنے لگیں لیکن کوئی اور مجھے نظر نہیں آیا۔ ایک عجیب سا احساس دل میں جاگزیں تھا۔ آنکھیں بند کر لیں اور ان دو رہنمائیوں کے بارے میں سوچتا رہا، دل کو وہی احساس ہوا تھا جو اس وقت میرے دل میں آ بسا تھا، جب میں ہنومان مندر کے باہر ویران جگہ سربسجود تھا یعنی تنہا نہ ہونے

کا احساس، ہر جگہ رہنمائی ہوئی تھی۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان محبتوں کو برقرار رکھے۔ میں تو لاچار ہوں سرکشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سفر جاری رہا۔ سالم نگر کے بارے میں سوچتا رہا جہاں بابا شاجہاں کا عرس ہو رہا تھا اور مجھے وہاں عرس میں شریک ہونا تھا۔

✦✤✦✤✦

رات کا وقت خاموشی، باہر دوڑتے اندھیرے، خیالات کی ریل چلتی رہی۔ وہ پیلی مکڑی یاد آئی جو مندر کی چھت پر نظر آئی تھی۔ یقیناً بھوریا چرن کی جاسوس ہوگی۔ بھوریا چرن طویل عرصے سے سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس نے مجھے نظرانداز بھی نہیں کیا تھا، مسلسل میری تاک میں رہتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس مکڑی کے بھیس میں وہی ہو اور ہوسکتا ہے یہاں کسی مقصد سے آیا ہو۔ شکر تھا میں مندر میں سویا نہیں تھا ورنہ اسے کامیابی حاصل ہو جاتی۔ ہر جگہ مجھ سے محتاط رہتا تھا۔ تہاوتی کو بھی اس نے مجھ سے ہوشیار کیا تھا۔ کمبخت میرا مسلسل دشمن تھا۔ اس کی وجہ سے کیا کچھ نہ چھن گیا تھا میرا، بھرا پرا گھر بہن بھائی، ماں باپ، سب برباد ہو گئے تھے۔ سب کے سب تباہ ہو گیا تھا۔ تمام شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔ دل میں پھر وہی احساسات ابھر آئے۔ آنکھیں تو آنسو برسانے کیلئے تیار رہتی تھیں۔ دل اُلٹنے لگا۔ اس احساس کی منادی تھی اس کے لئے رونا نہیں تھا۔ منہ پر تھپڑ مارنے لگا، خود کو سمجھانے لگا۔ آہ مجھے اس سے باز رہنا ہے۔ دعائیں مانگنے لگا، مدد مانگنے لگا اور یوں لگا جیسے کسی نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ پھر یہ مہربانی وسیع ہو گئی۔ نیند آ گئی تھی پھر بدن کو جھٹکا لگا، کانوں میں اذان کی آواز ابھری۔ بری طرح چونک پڑا۔ بدن کو جھٹکا ریل رکنے سے لگا تھا۔ اذان کی آواز اسٹیشن کی مسجد سے آ رہی تھی اور مجھے یہی جگہ بتائی گئی تھی۔ دیوانوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگا اور نیچے اتر گیا۔ فوراً ہی ریل کی سیٹی سنائی دی تھی۔ پلیٹ فارم پر کودا ہی تھا کہ ریل چل پڑی۔ اللہ نے مدد کی تھی۔ چند لمحے اور سو کر گزار دیتا تو سالم نگر نہ اتر پاتا۔ اس وقت کچھ اور سوچنا ممکن نہیں تھا۔ مسجد کے گنبد نظر آ رہے تھے انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ وضو کیا نمازی آنے شروع ہو گئے تھے۔ نماز فجر سے فراغت ہوئی تو باہر نکلتے ہوئے نمازیوں میں سے ایک سے پوچھا۔ ''بھائی یہ سالم نگر ہے؟''

''ایں ہاں، ہے تو۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''بہت بہت شکریہ۔''

''تمہیں نہیں معلوم تھا۔''

''ہاں مسافر ہوں کچھ دیر قبل ریل سے اترا ہوں۔''

''کہاں جا رہے تھے؟''

''یہیں آیا تھا۔''

''کون سے محلے جا رہے ہو؟''

''مجھے بابا شاجہاں کے مزار پر جانا ہے۔''

''اوہو عرس میں آئے ہو۔''

''ہاں!''

''میرا تانگہ باہر موجود ہے چلو گے۔''

''ضرور چلوں گا۔ کیا مزار شریف دور ہے؟''

''یہاں سے پانچ کوس کا فاصلہ ہے۔''

''کتنے پیسے لو گے؟''

''جو جی چاہے دے دینا۔''

''پھر بھی بتا دو۔''

"ڈیڑھ روپیہ دے دینا۔ ویسے پورے تانگے کے چار روپے ہوتے ہیں مگر بابا جی کے مہمان ہو اس لئے ڈیڑھ روپیہ لوں گا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا، وہی چار روپے تھے جو بنگ کلرک نے واپس دیئے تھے یعنی آج کا وظیفہ۔ بڑا کھرا حساب تھا۔ بے چارہ بنگ کلرک میرا وظیفہ کیسے روک سکتا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تانگے والے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تانگے میں بیٹھ کر میں نے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"نعمت خان!" اس نے گھوڑے کو ٹخٹاتے ہوئے کہا اور تانگہ آگے بڑھا دیا۔

"بابا شاہجہاں کے عقیدت مند ہو؟"

"کون نہیں ہے بھائی صاحب۔ کیا ہندو کیا مسلمان ان کے عقیدت مند تو سب ہیں۔"

"ہندو بھی؟"

"مسلمانوں سے زیادہ، بابا جی سب کے ہیں۔ ہندو پاک صاف ہو کر ننگے پاؤں مزار پر جاتے ہیں چادریں چڑھاتے ہیں، منتیں مانگتے ہیں اور اللہ ان کی مرادیں بھی پوری کر دیتا ہے۔ بڑا فیض ہے بابا شاہجہاں کا سالم نگر پر۔"

"ٹھیک" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا لیکن تانگے والا شروع ہو گیا تھا۔ راستے بھر وہ مجھے بابا شاہجہاں کی کرامتیں سناتا رہا اور بتاتا رہا کہ سالم نگر پر ہی نہیں بلکہ یہاں آنے والوں کو بابا صاحب کے مزار سے کیا کیا فیض حاصل ہوتے ہیں۔ پانچ کوس کا فاصلہ معمولی نہیں تھا۔ خوب سورج چڑھ گیا تب ہم بابا شاہ جہاں کے مزار پر پہنچے۔ درحقیقت پر نور مزار تھا۔ کسی قدر بلندی پر بنا ہوا تھا۔ اطراف میں گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا لیکن جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ دکانیں لگی ہوئی تھیں، جگہ جگہ خیمے اور چھولداریاں نصب تھیں۔ صاحب حیثیت لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں آئے تھے اور اپنے ساتھ چھولداریاں لائے تھے۔ ہر جگہ یہ چھولداریاں نصب تھیں۔ جو اپنے خیمے اور چھولداریاں نہیں لا سکے تھے انہوں نے گھنے درختوں کی چھاؤں میں پناہ لی ہوئی تھی۔ چولہے گرم ہو رہے تھے، جگہ جگہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ زیارت کرنے والے مزار پر آ جا رہے تھے اور ان کے چہرے سے عقیدت کا اظہار ہوتا تھا۔ بہت سے دھوتی برداروں کو بھی دیکھا۔ ننگے پاؤں مزار سے نکل رہے تھے۔ مجھے بھلا کسی پناہ گاہ کی کیا ضرورت تھی۔ جہاں شب ہوتی وہیں شب بسری کی جا سکتی تھی۔ فوراً ہی مزار اقدس کی جانب بڑھ گیا اور سب سے پہلے مزار پر فاتحہ خوانی کی۔ بہت دیر تک دو زانو بیٹھا رہا اور صاحب مزار سے رہنمائی طلب کرتا رہا۔ اپنی آخرت کی بہتری کے لئے، اپنی عاقبت کے لئے پھر وہاں سے واپس پلٹا۔ بس وہی کھایا ہوا تھا جو پچھلی رات کو کھایا تھا۔ چنانچہ شدید بھوک لگ رہی تھی۔ پانی تک نہیں پیا تھا۔ جیب میں ڈھائی روپے تھے چنانچہ دوپہر کا کھانا ایک جگہ سے دو روٹی اور تلی ہوئی مچھلی لے کر کھائی پھر بھی جیب میں ایک روپیہ باقی بچ گیا تھا۔ اسی میں مجھے شب کی خوراک حاصل کرنی تھی۔ آرام کیلئے ایک جگہ منتخب کی اور گھنے درخت کے سائے میں جا بیٹھا۔ یہ سوچنے لگا کہ یہاں مجھے کیوں بھیجا گیا ہے۔ آنکھیں بند کر کے راہنمائی کا طلب گار ہوا لیکن کوئی بات نہ بتائی گئی چنانچہ خاموشی اختیار کر لی۔ وقت خود فیصلے کرے گا اور وقت پر ہی راہنمائی ہو گی۔ ابھی کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے جلد بازی بھی نہیں کرنی چاہئے۔

دوپہر سر پر سے گزر گئی اور شام کی چہل پہل کا آغاز ہو گیا۔ مزار شریف پر قوالوں کا قبضہ تھا چنانچہ وسیع و عریض صحن میں قوالوں کی محفل جم گئی۔ ہر ایک اپنی اپنی عقیدت کا اظہار کرنے آیا تھا۔ میں خود بھی اندر داخل ہو گیا اور ایک سمت جا بیٹھا۔ قوالوں کو لوگ حسب توفیق کچھ نہ کچھ دے رہے تھے اور قوال بڑے جوش و خروش سے گا رہے تھے لیکن بدقسمتی سے میرے پاس صرف ایک روپیہ موجود تھا جس کے بارے میں میں دیر تک سوچتا رہا تھا۔ پھر نجانے کیوں جی چاہا اور میں نے وہ روپیہ نکال کر ایک قوال کو پیش کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ رات کا فاقہ ہی ہو جائے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے کل صبح وظیفہ ملے گا تو پیٹ بھر لوں گا۔ بہ آسانی گزارہ ہو سکتا ہے اور پھر بہت زیادہ کھانا پینا بھی انسان کے ذہن کو عبادت سے غافل کر دیتا ہے۔ اس احساس سے مطمئن ہو گیا۔

رات ہو گئی تقریباً دن بھر ہی یہاں لوگوں کے درمیان رہا تھا اور اب ساڑھے دس بج رہے تھے چنانچہ سو جانے کا فیصلہ

گیا اور صحن مزار سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف چہل پہل تھی، سب کے اپنے اپنے چراغ روشن تھے۔ میں ایک بے چراغ درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ یہیں تھوڑی سی جگہ ہاتھ سے صاف ستھری کی اور بازوؤں کا تکیہ بنا کر درخت کی ایک ابھری ہوئی جڑ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کا خواہشمند تھا کہ سوچوں کو ذہن سے نکال سکوں۔ سوچیں تو بڑا الجھا دیتی ہیں اور ان سوچوں میں نجانے کیا کیا تصورات شامل ہوجاتے ہیں جو ذہن کو پراگندہ کردیتے ہیں۔ دماغ کو ان آوازوں پر مرکوز کردیا جو اندر سے آرہی تھیں، قوال گا رہے تھے۔

تیری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام

الٰہی میری سحر کی بھی شام ہوجائے

دل رو پڑا۔ الٰہی میری سحر کی بھی شام ہوجائے۔ جھلس گیا ہوں، اس دھوپ میں سارا وجود جل کر راکھ ہو چکا ہے اور کتنا جلتا رہوں گا اور کتنا...... ہونٹ دانتوں میں دبا کر زخمی کر لئے۔ خون کا نمک زبان پر پھیل گیا۔ توبہ کرتے ہوئے بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا، کان بند کر لئے۔ کیسا شعر تھا دل پر ایسی ضرب پڑی تھی کہ کمبخت بے قابو ہو گیا تھا۔

الٰہی میری سحر کی بھی شام ہوجائے

کچھ لوگوں کی آمد نے سکون بخشا۔ مجھے بیٹھے دیکھ کر آ گئے تھے۔ دو آدمی ایک بوری پکڑے ہوئے تھے، بوری پر دیگ رکھی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی دیگ سے کچھ نکال رہا تھا۔

''لنگر کے چاول ہیں بھائی میاں، کوئی برتن ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے آواز سنبھال کر کہا۔

''رکابی دیدو۔'' اس نے کہا اور بوری پر رکھی ایک پلیٹ میں مجھے میٹھے چاول دے کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ بابا شاہجہاں کا مہمان تھا، بھوکا کیسے سونے دیتے۔ پیٹ بھرا تو ذہن بوجھل ہو گیا۔ پریشانی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر کے سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر ہوگئی تھی مجھے سوتے ہوئے کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ سینے پر ایک زبردست دباؤ محسوس ہوا تھا۔ وحشت زدہ ہو کر آنکھیں پھاڑ دیں۔ ایک انسانی جسم سینے پر سوار تھا۔ اس نے مجھے اپنی رانوں میں دبوچ رکھا تھا۔ پھر آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی اور اس کے ساتھ ہی شانے کے قریب سینے کے گوشت میں بجلیاں اتر گئیں۔ کسی تیز دھار والے خنجر نے شانے کے قریب کا گوشت کاٹ دیا، شدید تکلیف کے باعث حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

دماغ نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوش و حواس قائم نہیں ہوئے تھے۔ حلق سے آزاد ہونے والی چیخ تکلیف کی وجہ سے نکل گئی تھی۔ اس میں کوشش شامل نہیں تھی کیونکہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ اگر بغل میں آگ نہ سلگ اٹھی ہوتی تو شاید اسے خواب ہی سمجھتا، لیکن تکلیف نے ایک لمحے میں حواس جگا دیئے۔ میرے سینے پر سوار شخص نے دوبارہ خنجر بلند کیا۔ وہ پوری طرح مجھ پر حاوی تھا اور یقیناً میں اس کا یہ وار نہیں روک سکتا تھا لیکن اسی وقت کچھ فاصلے سے چیخیں اُبھریں۔

''ہرے رام، ہرے رام، خون، ہتھیا، خون ہو گیا۔ ارے دوڑو، پکڑو، خونی بھاگ نہ جائے، رام جی، ماتھر، دھریا، دوڑو پکڑو۔''

ان آوازوں نے میرے سینے پر سوار دُشمن کو بوکھلا دیا۔ اور وہ دوسرا وار نہیں کر سکا۔ میں نے بھی اس کی گرفت سے نکلنے کیلئے جدوجہد شروع کر دی تھی چنانچہ وہ اُچھل کر کھڑا ہوا اور پھر قلانچیں بھرتا ہوا تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے سینے سے اُترتے ہی میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ زخم شدید تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ خون بری طرح بہہ رہا تھا پورا ہاتھ چپچپا رہا تھا۔

جس طرف سے چیخیں اُبھری تھیں وہاں چہل پہل تو ہوگئی تھی مگر کوئی آگے نہیں بڑھا تھا۔ مجھ پر وار کرنے والا اگر سمجھ داری سے کام لیتا تو دُوسرا کامیاب وار کرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوتی کیونکہ چیخنے والے بہادر اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ البتہ کسی نے کئی بار ماچس کی تیلیاں روشن کیں اور پھر پیٹرومیکس روشن ہو گیا۔ اس کے مینٹل نے چند بار شعلے اُگلے

پھر تیز روشنی بکھیر دی۔

''ارے ہنڈا اُٹھاؤ، دھت تمہاری جوانی کی، ہتھیارا بھاگ گیا کوئی آگے نہیں بڑھا۔ ارے اب تو اسے دیکھو سورماؤ۔ میرے پیچھے پیچھے تو آجاؤ۔ ہے رہے تمہاری......'' کوئی کسی کو لعنت ملامت کرنے لگا، گیس کا ہنڈا اُٹھایا گیا اور چند افراد میری طرف بڑھنے لگے۔

یہ خاندان مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھولداری میں مقیم تھا۔ یہاں قیام کرتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں کو محسوس کیا تھا مگر ان پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ سب میرے قریب آگئے۔ سب سے آگے دھوتی کرتے میں ملبوس ایک اُدھیڑ عمر شخص تھا اس کے پیچھے تین چار افراد اور تھے جن میں سے ایک پیٹرومیکس اُٹھائے ہوئے تھا۔ میں بھی ہمت کر کے اُٹھ گیا۔

''ارے......ارے......زندہ ہے۔ ارے بچ گیا بے چارہ۔ ارے کون ہے بیرا تو۔ گھاؤ لگا ہے کیا؟'' ہمدرد انسان نے پوچھا، پھر ہنڈا اُٹھانے والے سے کڑک کر بولا۔ ''تیرا ستیاناس دھرما۔ روشنی تو آگے لا، دیکھنے تو دے۔ پوت گھاؤ لگا ہے کیا تیرے؟''

''ہاں چاچا جی۔ بغل کے پاس کٹ گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہیں......؟ ہاں اُٹھاؤ رے اسے۔ منڈوے میں لے چلو۔ ارے رُکمنی او رُکمنی۔ جاگ گئی کیا بٹیا۔ ذرا اپنی ڈاکٹری نکال لے۔ اُٹھاؤ رے سنبھال کر اُٹھاؤ۔''

''وہ پھر نہ آجائے گنگا جی۔'' ہنڈے والے نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''لات دیں گے سسر تیری کمر پر، اُچھل کر منڈوے میں جا کر گرے گا۔ سنبھال کے رام جی، سنبھال کے ماتھر۔''

دو افراد نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا تھا اور پھر چھولداری کی طرف لے چلے تھے جہاں اندھیرے میں کچھ اور لوگ نظر آرہے تھے۔ اُدھیڑ عمر شخص مسلسل چیخ رہا تھا۔ ''رُکمنی بٹیا، جاگ گئی تو۔ رُکمنی......اری او رُکمنی۔''

''جاگ رہی ہوں تاؤ۔ کون ہے، کیا ہوا......؟'' ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''اری ڈاکٹری نکال اپنی، گھائل ہے بے چارہ، کوئی پاپی ہتھیا کر رہا تھا اس کی، بھگوان نے بچا لیا، مگر گھاؤ لگ گیا ہے۔''

''چنتا مت کرو تاؤ جی، دُوسرے لوگ بھی آس پاس موجود ہیں۔ مجمع لگ جائے گا۔'' میرے ساتھ چلنے والے ایک شخص نے کہا۔ اتنی دیر میں ہم چھولداری کے پاس آگئے۔

''اندر لے چلو اندر......!'' اُدھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''چلو اندر قدم بڑھاؤ......'' مجھے سنبھالنے والوں نے کہا۔ میں بادل ناخواستہ ان کے ساتھ چھولداری میں داخل ہو گیا۔ چھولداری کافی وسیع تھی۔ اس میں جگہ جگہ گدّے پڑے ہوئے تھے۔ ان گدّوں پر یہ لوگ سو رہے ہوں گے لیکن اب کوئی ان پر نہیں تھا البتہ سکڑی سمٹی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہنڈے کی روشنی چھولداری میں پھیل گئی۔

عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ ''بیٹھ جا پوت بیٹھ جا۔ رُکمنی۔ ارے کہاں ہے ری تو۔''

''یہ کیا ہوں تمہارے پیچھے تاؤ۔'' کسی لڑکی نے جواب دیا۔

''ارے کیا کہا تھا میں نے۔ اُونچا سننے لگی ہے کیا۔''

''آپ ہٹیں سامنے سے تو میں کچھ دیکھوں تاؤ۔'' لڑکی بولی۔

''ارے بٹھاؤ اسے، تو بیٹھ جا بیٹا، کیا تیرے بھی کان خراب ہیں۔ ارے یہ تم لڑکی لڑکوں کو کیا ہو گیا ہے۔ بیس بیس بیری کوئی بات کہو تو اکیسویں بیری سنتے ہو۔ ارے بیٹھ جا۔''

''گدا خراب ہو جائے گا، خون بہہ رہا ہے میرے بدن سے۔'' میں نے کہا۔

''خون۔'' ایک اور نسوانی آواز اُبھری۔

''بیٹھ جا میرے بیٹا، بیٹھ جا، میری آواز بیٹھی جا رہی ہے۔'' معمر شخص نے کراہتے ہوئے کہا اور میں بیٹھ گیا۔

''لو ڈوب گئی لٹیا۔'' دُوسری نسوانی آواز پھر سنائی دی۔
''گیس لیمپ قریب لاؤ۔ دھرما آگے آ جا، نیچے بیٹھ جا۔'' رُکمنی نامی لڑکی نے کہا۔ وہ فرسٹ ایڈ بکس لے کر میرے پاس بیٹھ چکی تھی۔ دھرما نے پیٹرومیکس قریب رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ''اُوپر اُٹھا رے دھرما۔'' لڑکی بولی، اور دھرما کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔ ''رام...... رام جی...... رام جی۔ تم اُٹھا لو۔ مم...... مجھ سے خون نہیں دیکھا جاتا۔'' دُوسرے آدمی نے پیٹرومیکس اُٹھا کر قریب کر لیا اور لڑکی میرا زخم دیکھنے لگی۔ پھر اس نے فرسٹ ایڈ بکس سے بینڈ یج کا سامان نکال لیا۔ مکمل ڈاکٹر معلوم ہوتی تھی پہلے اس نے کوئی محلول میرے زخم پر اور اس کے آس پاس اسپرے کیا۔ اس کے بعد خون صاف کر کے کوئی مرہم لگایا۔ پھر فل بینڈ یج کرنے لگی۔ اس کے لیے میری قمیص اُتار دی گئی تھی۔ خود معمر آدمی ہر کام میں پیش پیش تھا۔
بینڈ یج ہو گئی تو معمر آدمی بولا۔ ''ثریا، اری ثریا بیٹی،
کر لے چندو، ایک گلاس گرم گرم دُودھ پلاؤ اسے۔ جان پکڑے گا، بڑا خون بہہ گیا۔ رام رام...... رام رام......!''
''مجھے بلایا گنگا جی......'' رام جی نے کہا۔
''ارے چپ بیٹھ نہیں تو...... اتنا خون نکل گیا۔ تو لیٹ جا پوت۔''
''خون میں بھرا ہے پورے کا پورا۔ گدا خراب ہو جائے گا۔ ارے ثریا دُوسری دَری بچھا دے۔'' عورت نے کہا۔
''او دُوسری دری۔ تیری آواز پھر نکلی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔'' معمر شخص جسے گنگا جی کہہ کر پکارا جا رہا تھا، بگڑ کر بولا۔ پھر اس نے سینے پر دباؤ ڈال کر مجھے لٹا دیا۔
میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔''
''صبح اُٹھ کر چار جوتے مار دینا ہمارے منہ پر...... اور چلے جانا۔ احسان اُتر جائے گا۔'' معمر شخص نے کہا۔
''جی......!'' میں حیرانی سے بولا۔
''تاؤ جی، چپ رہنے دیں انہیں۔ زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوگا، آپ دُودھ پی لیں پھر میں آپ کو انجکشن دوں گی۔ آپ آرام سے سو جائیے صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''
''ہاں۔'' عورت کی آواز پھر اُبھری۔
''پھر بولی۔'' گنگا جی غرائے، اتنی دیر میں دُودھ کا گلاس آ گیا اور مجھے سہارا دے کر اُٹھایا گیا۔ دل میں ہچکچاہٹ اُبھری تھی لیکن کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ دُودھ پینا پڑا۔ رُکمنی انجکشن تیار کر چکی تھی۔ اس نے مجھے انجکشن لگایا اور پھر مجھے دوبارہ لٹا دیا گیا۔
''بس آنکھیں بند کر لو۔ ابھی نیند آ جائے گی۔''
''نیند کا انجکشن ہے؟'' گنگا جی نے پوچھا۔
''ہاں خواب آور ہے۔'' رُکمنی بولی۔ میں نے اس کی ہدایت پر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں ہلکی سی سنسناہٹ ضرور اُبھری تھی لیکن نیند یا بے ہوشی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ سب لوگ چھولداری ہی میں تھے لیکن رُکمنی نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی اس لیے ایک دم خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ کوئی بیس منٹ گزر گئے لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ جاگ رہا تھا پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ پھر رُکمنی نے کہا۔ ''بس ٹھیک ہے کام ہو گیا۔''
''ایں، کیا کام ہو گیا۔'' معمر شخص کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔
''اوہ، تاؤ جی، میرا مطلب ہے یہ گہری نیند سو گیا بلکہ بے ہوش ہو گیا۔''
''ارے بھیا، تو بے ہوش ہو گیا کیا۔ بتا رے بھائی۔ ارے بولے گا نا کیا؟''
''تاؤ جی، تاؤ جی۔ وہ بے ہوشی میں بولے گا کیا؟'' اس بار نوجوان نے کہا۔
''ایں، ہاں سو تو ہے۔'' تاؤ جی نے کہا۔

''بھگوان نے اتنی عقل دی ہوتی تو وارے نیارے نہ ہو گئے ہوتے۔ کچھ کما نہ کھاتے۔'' نسوانی آواز نے کہا۔

''ہاں تو تو جیسے کمنڈل ہاتھ میں لے کر بھیک مانگتی ہے سڑکوں پر اسی طرح سب کا پیٹ بھرتا ہے۔'' معمر شخص نے کہا۔

''ارے ارے، آپ لوگ پھر لڑنے لگے۔'' یہ آواز رُکمنی کی تھی۔

''تو خود دیکھ رکمنی۔ اناتھ آشرم بنا رکھا ہے انہوں نے ایک کے بعد ایک کو بھرے لے رہے ہیں۔ گدا خون سے خراب کر دیا، چادر بھگو دی خون میں، نقصان پہ نقصان۔ اس کے سوا اور کیا کرتے ہیں یہ۔ ارے میں پوچھتی ہوں یہ ہے کون......؟''

''دیکھتی نہیں ہے انسان ہے۔''

''یہ تو آپ ہمیں بھی بتایئے تاؤ جی؟'' نوجوان نے کہا۔

''ارے ہمیں کیا معلوم بھیا۔ تم سب لوگ لمبے پڑے تھے منڈوے میں اور یہ کیا بھیں بھیں کر رہی تھی، سوتے میں اتی زور سے خراٹے لے رہی تھی کہ ہماری نیند اُکھڑ گئی اور ہم باہر نکل آئے۔ ارے بھیا کیا دیکھا کہ ایک پاپی خونی چڑھ بیٹھا اس بے چارے چھورا پر، خنجر بھی دیکھ لیا ہم نے بس چل پڑے ہم اور بھگوان نے دیا کی کہ وہ اسے چھوڑ بھاگا۔ نہیں تو مارا گیا تھا بے چارہ۔ اور تم سسر، گٹی بیٹھ گئی تمہاری۔ ایک بھی آگے بڑھ کر نہ دیا۔ ارے واہ رے جوانو، یہ ہے تمہاری جوانی ارے جوانی دیکھنی تھی تو ہماری دیکھتے سسر بیسیوں ڈکیت پکڑ پولیس کے حوالے کر دیئے۔ پچاسیوں خونی دبوچ کے پولیس کو دے دیئے۔''

''اے لالہ جی، اے لالہ جی، ذرا میری طرف دیکھیو۔'' اس عورت کی طنزیہ آواز اُبھری جس سے گنگا جی کی مسلسل چل رہی تھی۔ غالباً وہ اس کی دھرم پتنی تھی۔

''مر کر بھی نہ دیکھوں تیری صورت تو...... صبح دیکھ لو تو دن بھر مصیبت اُٹھاؤ، رات کو دیکھو تو بگھرّے ہی اُٹھا لے جائیں۔''

''ہیں، میری طرف دیکھو گے تو شرم جو آئے گی، کونسے ڈکیت پکڑے تم نے، ذرا بتائیو، وہ ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ہوا تھا تو کیا ہوا تھا۔ ذرا بتاؤ ان بچوں کو۔''

''اچھوت جاتی کی ہے تو پکی اچھوت جاتی کی، ایک بات پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ہزار بار بتا چکے ہیں بچوں کو، جلاب لیا تھا وید جی کے کہنے سے، جنگل پانی کو گئے تھے۔ ہو گیا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا۔ لٹھیاں چل رہی تھیں بھاگتے نہیں تو کیا کرتے۔ ایں، کالی کبوتری، بھگوان نے جیسی شکل دی ویسی ہی زبان بھی۔'' لالہ جی بگڑ کر بولے۔

''جلتی پر کیسا تیل پڑا اب...... ہیں۔''

''بات پوری ہونے دیں تائی جی۔'' نوجوان بولا۔ ''پھر کیا ہوا تاؤ جی۔''

''لے پھر جو ہوا تمہارے سامنے نہیں ہے کیا۔''

''اوہ، اب کیا کریں گے۔'' رُکمنی بولی۔

''کریں گے کیا، سونے دے بے چارے کو، صبح کو دیکھیں گے۔''

''اور چھورے چھوریاں کہاں سوئیں گے۔'' دیوی جی بولیں۔

''تیرے سر پر، ارے ایک گدا ہی تو ملا ہے بے چارے کو، میرے لیے دری بچھا دے اس کے پاس۔''

''صبح کو بھگا دینا اسے، کہے دے رہی ہوں، اچھا نہ ہوگا۔''

''جا تو جا پڑ کونے میں، صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔''

''ہنڈا بجھا دوں گنگا جی؟''

''نا میرے سر پر پھوڑ دے۔ لے کھوپڑی جھکا رہا ہوں۔'' لالہ جی بولے۔ دھرما نے ہنڈا بجھا دیا۔ پھر شاید ایک ایک کر کے سب لیٹ گئے۔ میں دم سادھے خاموش لیٹا ہوا تھا۔ رُکمنی نے زخم پر بینڈیج کی تھی، غالباً اسے سن بھی کر دیا تھا کیونکہ کوئی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کا لگایا ہوا انجکشن مجھ پر بے اثر تھا۔ نہ نیند آئی تھی نہ بے ہوشی طاری ہوئی تھی۔ مکمل

سناٹا چھا گیا اور میں اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جو خنجر سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ کون تھا وہ، کیا چاہتا تھا، کوئی چور، لٹیرا، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگی، میں تو گہری نیند سو رہا تھا۔ میری جیبیں ٹٹول کر بھاگ جاتا۔ یہ جان لیوا حملہ کیوں کیا اس نے۔ نہ جانے کون تھا۔ کیا چاہتا تھا۔ میں تو صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر ذہن ان لوگوں کی طرف چلا گیا اور ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ معمر شخص دلچسپ انسان ہے۔ تلخ مزاج تلخ زبان لیکن ہمدرد۔ بیوی سے خوب چلتی ہے۔ نام شاید گنگا ہے، آگے پیچھے بھی کچھ ہوگا۔ خوب آدمی ہے مگر ایک نام دماغ میں چبھنے لگا۔ اس نے جس لڑکی سے دُودھ لانے کے لئے کہا تھا اس کا نام ثریا لیا تھا۔ یہ تو مسلمان نام ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایک مسلمان لڑکی ان کے ساتھ کیوں ہے۔ دُوسری بات یہ بھی تھی کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود بابا شاہجہاں کے مزار پر فروکش تھے۔ تانگے والے نے مجھے بتایا تھا کہ بابا صاحب کے عقیدت مندوں میں ہندو بھی ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ایسا ہو...... مگر وہ مسلمان لڑکی نہ جانے کون ہے۔

دماغ کی تھکن سے ہی نیند آئی تھی۔ نہ جانے کب تک سوتا رہا تھا۔ جاگا تو بدن پر کمبل ڈھکا ہوا تھا۔ معمر شخص کی آواز سنائی دی۔ ''جاگ گیا رکمنی۔''

''آئی تاؤ......'' چھولداری کے باہر سے آواز سنائی دی تھی۔ میں نے کمبل سمیٹ کر اُٹھنا چاہا تو معمر شخص نے جلدی سے کہا۔

''ارے او...... ارے اوسورما، ارے لیٹا رہ بھائی۔ بڑا سورما ہے تو مان لیا ہم نے، لیٹا رہ کمبل نہ اُتار، ہوا لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''میں ٹھیک ہوں گنگا جی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے تو...... ایں...... ارے...... ارے تجھے ہمارا نام کیسے معلوم ہوگیا۔ ارے بھیا تو ہمیں کیسے جانتا ہے۔'' معمر شخص نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''رام جی نے آپ کو گنگا جی کہہ کر پکارا تھا۔''

''لے اور لے، رام جی کا نام بھی معلوم ہے۔ چل اس نے ہمیں گنگا کہہ کر پکارا تھا مگر رام جی کو تو کیسے جانے ہے۔''

''آپ نے اسے رام جی کہہ کر پکارا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ اس وقت ایک خوبصورت لڑکی جس نے سفید ساری باندھی ہوئی تھی۔ دراز قامت اور شوخ مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ ہاتھ میں دُودھ کا گلاس اور بسکٹوں کا پیکٹ لیے اندر آگئی۔

گنگا جی نے آہستہ سے کہا۔ ''اری رُکمنی بٹیا یہ تو ہمارے پورے کُنم کو جانے ہے۔''

''کیسے۔'' رُکمنی میرے پاس بیٹھ کر بولی۔

''سب کا نام لے کر بتا رہا ہے۔ اچھا اس بٹیا کا نام بتا۔'' گنگا جی نے معصومیت سے رُکمنی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور مجھے پھر ہنسی آگئی۔ رُکمنی نے غور سے مجھے دیکھا، دیکھتی رہی پھر خود بھی ہنس دی۔ اور بولی۔ ''کیا قصہ ہے۔''

''کچھ نہیں رُکمنی جی۔ گنگا جی اس بات پر حیران ہیں کہ میں سب کے نام کیسے جانتا ہوں حالانکہ وہ بار بار آپ کو رُکمنی کہہ کر پکار رہے ہیں اور اب مجھ سے آپ کا نام پوچھ رہے ہیں۔''

''تاؤ جی بہت سادہ لوح ہیں، بہت معصوم، چلو تھوڑے سے اُٹھو یہ چائے اور دُودھ ملا ہوا ہے نہ خالص دُودھ ہے نہ چائے۔ کچھ بسکٹ کھالو اس کے ساتھ پھر تمہیں دوا دوں گی۔ خالی پیٹ دوا نہیں دی جاسکتی......''

''آپ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے میری وجہ سے، ویسے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔''

''مجھے پتا ہے، صرف ایک سو چار بخار ہے آپ کو۔ چلئے اٹھئے بھوک نہیں لگی کیا؟''

''اوہو، بخار آگیا مجھے۔ تعجب ہے۔'' میں نے اُٹھ کر دُودھ اور بسکٹ لے لیے۔ باقی لوگ چھولداری میں نہیں نظر آرہے تھے۔ کئی بسکٹ کھانے کے بعد میں نے دُودھ نما چائے پی لی۔ ایک بار پھر ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر رُکمنی سے پوچھا......! کیا وقت ہوگیا رُکمنی دیوی......!''

''چار بجکر بیس منٹ ہوئے ہیں۔'' رُکمنی نے اپنی کلائی پر بندھی چھوٹی سی گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔
''جی۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔
''ہاں۔ آپ پورے سولہ گھنٹے سوتے رہے ہیں انجکشن کے اثر سے نہیں بخار کی غفلت سے۔''
''اوہ۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''او کے، دوائیں لے آؤں آپ کیلئے۔'' رُکمنی گلاس اور بسکٹ سنبھال کر اُٹھ گئی۔ گنگا جی نے کہا۔ ''میں بات کر لوں اس سے ڈاکٹرنی صاحبہ؟''
''ضرور تاؤ جی۔'' وہ باہر نکلتے ہوئی بولی۔ اور گنگا جی میری طرف متوجہ ہو گئے۔
''تو بڑا گیانی ہے بھائی تجھے سب کے نام معلوم ہو گئے۔ ہم ٹھہرے بدھو کے بدھو، تو نے سن ہی لیا ہماری بٹیا کے منہ سے۔ ہمیں تیرا نام نہیں معلوم۔''
''میرا نام مسعود ہے گنگا جی۔''
''مسلمان ہے؟''
''الحمد للہ!''
''تیرا دُشمن کون تھا؟''
''میں بالکل نہیں جانتا۔''
''دُشمنی چل رہی ہے کسی سے؟''
''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''پھر کوئی اُچکا ہوگا۔ سسرا جان لینے پر تل گیا تھا۔ وہ تو ہم نے دیکھ کر شور مچا دیا نہیں تو پاپی دوسرا وار کرتا۔''
''میں خلوص دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں گنگا جی۔''
''ارے نا بیرا بھگوان کو تیری جان بچانی تھی۔ ہمیں کارن بنا دیا اور پھر بہت بڑی سرکار کے دوارے آیا ہے تو۔ گھاؤ ضرور لگ گیا مگر بابا جی کسی کو ایسے مرنے دیتے۔ اس پاپی کو ضرور سزا ملے گی جس نے تجھے بابا جی کے در پر گھائل کیا۔ زیارت کو آیا ہے؟''
''ہاں۔''
''اکیلا ہے؟''
''ہاں۔''
''کہاں رہتا ہے؟'' میں نے جواب میں اپنے شہر کا نام بتایا۔
''بڑی دُور سے آیا ہے۔ مگر بابا شاہجہاں کے دوارے تو نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں اور ہم تو پرکھوں سے بابا جی کے داس ہیں۔ سال کے سال آتے ہیں عرس میں اور سال بھر کے لیے شانتی لے جاتے ہیں۔''
''آپ ہندو ہو کر اتنی عقیدت رکھتے ہیں بابا جی سے؟''
''ارے بیٹا سارے کھیل سنسار کے ہیں۔ کون کہاں سے آتا ہے کہاں چلا جاتا ہے یہ کوئی اور ہی جانتا ہے، روتے ہوئے آتے ہیں کراہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ہندو کہہ لو، سکھ کہہ لو، عیسائی کہہ لو، مسلمان کہہ لو۔ یہ ساری باتیں بس کہنے کیلئے ہوتی ہیں۔''
''بہت بڑے ہیں آپ گنگا جی، صرف انسان ہیں آپ! آپ کا پورا نام کیا ہے؟''
''تو بتا گیانی تو جانیں۔'' گنگا جی نے مسکرا کر کہا۔
''میں نے جتنا سنا ہے اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''ہیں آ گیا نا راستے پر۔ ہمارا نام گنگا دھر ہے، پتا کا نام مرلی دھر تھا ہماری دھرم پتنی کا نام پریم وتی ہے۔ پریما دیوی کہتے ہیں سب اسے۔ ہری مرچ کے کھیت میں اُگی تھی۔ کیا ہوئی ہری مرچ۔ ہمیں پرلے سرے کا گدھا سمجھتی ہے۔ مہا کنجوس ہے دانے دانے پر جان دیتی ہے۔ دونوں بچے ماتھر اور رُکمنی ہمارے سورگباشی بھائی کے بچے ہیں۔ پتی پتنی ریل گاڑی کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ تب سے بچوں کو ہم نے پالا پوسا، پڑھایا، لکھایا۔ رُکمنی ڈاکٹر بن چکی ہے اور اسپتال میں نوکر ہوگئی ہے۔ ماتھر انجینئرنگ کا امتحان پاس کر چکا ہے نوکری ڈھونڈ رہا ہے۔ منت مانگنے آیا ہے بابا شاہجہاں کے مزار پر۔ رام جی پرانے نوکر ہیں، ہم سب عزت کرتے ہیں ان کی۔ دھرے بھی کوئی چھ سال سے نوکری کرتا ہے۔ سب سمجھ میں آ گیا یا کچھ رہ گیا؟''

''کچھ رہ گیا گنگا جی۔''

''کیا؟'' گنگا جی غرا کر بولے۔

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''ایں...... ہاں۔ سچی مچی رہ گیا'' گنگا جی مسکرا کر بولے۔ ''خورجے کے رہنے والے ہیں ہم لوگ۔''

''اور بھی کچھ رہ گیا گنگا جی؟''

''وہ کیا؟''

''ثریا کون ہے؟'' میں نے پوچھا اور گنگا دھر کی آنکھیں پھر پھٹ گئیں۔

وہ مجھے گھورنے لگے پھر بولے۔ ''بڑا بکت لگے ہے بھائی تو...... اب کہہ دے کہ ثریا کا نام بھی لیا تھا ہم نے۔''

''لیا تھا۔'' مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ رُکمنی دوبارہ اندر داخل ہوئی تھی، ٹھٹک کر رُکی...... ایک لمحے مجھے دیکھا پھر آگے آ گئی۔

''کس بات پر ہنسا جا رہا ہے۔ نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے دوبارہ میرے قریب بیٹھ کر کہا۔

''یہ ثریا کو بھی جانتا ہے۔ رات کو گھائل ہوا تھا۔ سب کے نام سن لیے تھے اس نے اور پھر تو نے اسے بے ہوش کر دیا مگر پھر بھی یہ سنتا رہا۔ اب ثریا کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔'' گنگا دھر جی نے مخصوص انداز میں کہا۔

''واقعی ثریا کا نام کہاں سے سن لیا تم نے؟'' رُکمنی بولی۔

''رات کو گنگا جی نے یہ نام لے کر دُودھ منگوایا تھا۔'' میں بدستور ہنستا ہوا بولا اور رُکمنی بھی ہنس پڑی۔

''ہاں تاؤ جی آپ نے دُودھ تو ثریا ہی سے منگوایا تھا۔ لو یہ گولیاں کھا لو یہ پانی پکڑو۔ نام نہیں بتایا تم نے؟''

''مسعود۔'' میں نے جواب دیا اور گولیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ گولیاں معدے میں اُتار کر میں نے پانی کا گلاس واپس کر دیا پھر کہا۔ ''گنگا دھر جی اب مجھے اجازت دیں گے؟''

''لام پر جانا ہے؟'' وہ بولے۔

''نہیں لیکن جانا تو ہے۔''

''اچار نہیں ڈالیں گے ہم تمہارا۔ اچھے ہو جاؤ تو چلے جانا۔ کیسا برا سے آ گیا ہے رکمنی، اگر ہم مسلمان ہوتے تو یہ یہاں ضرور رُک جاتا۔ سوچ رہا ہوگا ہمارے ہاں کھائے پیئے گا تو دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔ ارے بھائی ثریا ہے ہمارے پاس، تیرے دھرم کی ہے وہی دو روٹی پکا دے گی تیرے لیے مت کھانا ہمارے ہاتھ کا۔ سالن کسی مسلمان کی دُکان سے منگوا لینا، یہاں کیا کمی ہے اتنی جلدی تو نہ بھاگ۔''

''آپ مجھے اتنا گرا ہوا نہ سمجھیں گنگا جی۔ آپ کی محبت اور احسان کا تو میں صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ لیکن مجھے احساس ہے کہ آپ سب کو میری وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے۔''

''ارے تو ہمیں ہو رہی ہے تکلیف، تجھے تو نہیں ہو رہی۔''

''تاؤ جی۔ ان کے کان بہت لمبے ہیں سب کچھ سن لیا ہے تو تائی جی کی باتیں بھی سن لی ہوں گی۔ لیکن مسٹر مسعود آپ کے ابھی یہاں سے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ کا زخم گہرا ہے، چلیں گے پھریں گے تو خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپ کمزور بھی ہو گئے ہیں۔ اسی لیے آپ کو بخار چڑھ گیا ہے۔ میں آپ کی ڈاکٹر ہوں اور ابھی آپ کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''ہیں...... اب بول۔'' گنگا دھر خوش ہو کر بولے۔

''ٹھیک ہے۔ آپ سوچ لیں آپ کو کیسی پریشانی ہوگی۔''

''اگر آپ کے خیال میں ہماری پریشانی صرف تائی جی ہیں تو ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ ہماری طرح انہیں انجوائے کریں۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

✦✦✦✦✦

''رُکمنی بٹیا!''

''جی تاؤ جی!''

''مزار شریف پر جائے گی کیا؟''

''آپ بتایئے۔''

''تو تو دن میں ہو آئی ہے۔ میں چلا جاؤں تھوڑی دیر کے لیے۔''

''ضرور چلے جائیں تاؤ جی۔''

''ٹھیک ہے تو اسے سنبھالو سب کے ساتھ ہی واپس آؤں گا۔''

''او کے۔''

''کیا؟'' گنگا دھر جی آنکھیں نکال کر بولے۔ اور رُکمنی ہنس پڑی پھر بولی ٹھیک ہے تاؤ جی آپ جایئے۔ گنگا دھر جی اُٹھ کر باہر نکل گئے تھے، رُکمنی میری طرف دیکھ کر بولی۔ ویسے آپ کو یہ ماحول برا نہ لگا ہوگا مسعود۔ بڑے دلچسپ ہیں تاؤ جی۔ دن رات بولتے رہتے ہیں مگر من کے بڑے اچھے اور سچے ہیں۔ جو جی میں آیا زبان سے نکال باہر کیا دل میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ ایسے لوگ برے نہیں ہوتے۔

''یقیناً۔'' میں نے اعتراف کیا۔ اس کے بعد رُکمنی نے بھی مجھ سے میرے دُشمن کے بارے میں وہی سوالات کئے جو گنگا دھر جی نے کئے تھے۔ وہ بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ کسی بات پر مجھے ہنسی آئی تو وہ پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''ایک بات کہوں۔''

''جی، ضرور کہیے۔''

''کم ہنسا کرو اور اکیلے میں ہنسا کرو۔''

''سمجھا نہیں۔''

''یوں تو آپ نے اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ نہ جانے یہ کیا ناٹک ہے آپ کا مگر ہنستے ہیں تو بڑے پیارے لگتے ہیں۔ ایسے کہ انسان دیکھتا رہ جائے، نظر لگ جائے گی کسی کی۔ ایک بات اور ان الفاظ کو کچھ اور نہ سمجھنا بڑے مان سے دیدی کہہ سکتے ہیں مجھے۔ ماتھر سے الگ نہیں ہیں میری نگاہ میں کیا سمجھے؟''

''جی۔'' میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

رُکمنی کی بات پھر ادھوری رہ گئی۔ چھولداری کے باہر آوازیں اُبھریں۔ پہلے داخل ہونے والی پریما دیوی تھیں، مجھے دیکھا۔ رُکمنی کو دیکھا پھر بولیں۔ ''کہاں گئے تمہارے تاؤ؟''

''آپ کو نہیں ملے تائی جی۔''
''چلے گئے کیا؟''
''ہاں۔'' ماتھر، رام جی اور دھرما آ گئے۔ پریما دیوی نے ایک دونا آگے کرتے ہوئے کہا۔''لو پرساد لے لو۔ اس کا بخار کیسا ہے؟''
''کچھ کم ہے۔''
''آج بھی یہیں رہے گا کیا؟''
''ہاں تاؤ جی یہی کہہ رہے ہیں۔'' رُکمنی شرارت سے بولی۔
''ٹھیک ہے۔ دھرما، رام جی اس کا گدا کونے میں کرا دو۔ اور چلو کھانے پینے کا ڈول بتاؤ۔'' ماتھر اور رُکمنی نے حیرانی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی پھر رُکمنی بولی۔
''آپ تاؤ جی سے بات کر لیں تائی جی۔ آخر نیا مہمان کب تک ہمارے ساتھ رہے گا اور پھر ہماری تو کوئی ناتے واری بھی نہیں ہے اس سے۔''
''ارے تو ہم پر کونسا بوجھ ہے، جو بھگوان دے گا کھا لے گا اپنے بھاگ کا۔ کیسا لوہے کی طرح تپتا رہا ہے بے چارا دن بھر، اری ثریا...... ارے یہ ثریا کہاں رہ گئی۔'' میری نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کردار کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ثریا اندر آ گئی، دُبلی پتلی جسامت کی دراز قامت لڑکی۔ عمر کوئی بیس اکیس سال، اُلجھے بال لیکن گھٹاؤں کی طرح اُمڈتے ہوئے۔ بڑی بڑی انتہائی حسین آنکھیں، خوف میں ڈوبی ہوئی۔ ہونٹوں پر قدرتی گلاب کھلے ہوئے۔ ایسے جاذب نقوش کہ دل کی حرکت بند ہونے لگے لیکن مجسم حسرت و یاس، سارے جہاں کا کرب خود میں سمیٹے ہوئے۔ چال میں بھٹکا بھٹکا پن۔ سادہ سی قمیض شلوار میں ملبوس۔
''ثریا بٹیا۔ مہمان والی چادر بدل دے۔ صبح کو اسے دھو ڈالیو۔''
''ہرے رام۔ ہرے کرشن۔ ہرے رام۔'' ماتھر منہ ہی منہ میں گنگنانے لگا۔ ثریا ایک طرف چلی گئی مگر میں غیر اختیاری طور پر اسے دیکھتا رہا۔ رُکمنی نے کہا۔
''دھرما۔ ایک برتن میں پانی گرم کر کے لے آؤ۔ میں بینڈیج تبدیل کروں گی۔''
''جی رُکمنی بٹیا'' پریما دیوی چھولداری سے باہر نکل گئیں تو ماتھر آلتی پالتی مار کر میرے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور آنکھیں بند کر کے جے بھگوتی، جے پربھو کی گردان کرنے لگا۔
''ماتھر بھیا کیا کر رہے ہو۔ تائی جی آ جائیں گی۔''
''ارے آنے دو۔ پربھو پدھارے ہیں ہماری کٹیا میں ایسے مہان پُرش دیکھے نہ سُنے۔ ارے ایک نظر میں پریم وتی دیوی کی کایا پلٹ دی انہوں نے۔ وہ جو چیونٹیوں کو ایک چٹکی آٹا نہ کھلا دیں کہہ رہی ہیں کہ بھگوان دے گا کھا لے گا اپنے بھاگ کا۔ جے بھگوتی جے شنکر، جے بھگوتی! ماتھر پر شرارت سوار تھی۔ ثریا سوٹ کیس سے نئی چادر نکال لائی۔ مجھے سہارا دینے کیلئے دھرما اور رام جی آگے بڑھے لیکن میں خود ہی جلدی سے گدے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ رُکمنی زور سے چیخی۔
''ارے ارے سورما جی۔ زیادہ بہادری نہ دکھائیں زخم کھل جائے گا چکر آ جائے گا گر پڑیں گے۔''
''نہ زخم کھلے گا نہ چکر آئیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں رُکمنی جی۔''
''بالکل ٹھیک کہا مہاراج نے۔ جے بھولے ناتھ، آپ جو کچھ کہیں گے ہم مانیں گے پربھو، ہماری تائی جی نے آج جو کچھ آپ کیلئے کہہ دیا وہ ہم نے جیون بھر ان کے منہ سے نہ سنا۔ آج پہلی بار جے بھگوتی۔''
''دھرما۔ ارے رام جی۔ کام ہو گیا اندر کا۔ اب باہر بھی آ جاؤ۔'' باہر سے پریما دیوی کی آواز سنائی دی۔
''جاؤ جاؤ۔ اندر کے کام ہم کر لیں گے۔'' رُکمنی نے کہا۔ ثریا نے چادر بچھا دی اور پرانی چادر لے کر باہر نکل گئی۔ میں

نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی۔ یہ گناہ تھا لیکن نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ یہ چہرہ میری آنکھوں میں بس گیا تھا۔ ایک ایک نقش اَزبر ہو گیا تھا۔

رُکمنی نے ماتھر کو میرا نام بتا دیا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے مسعود مہاراج کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ بڑے ہنس مکھ لوگ تھے کافی حد تک معلوم ہو گیا تھا ان کے بارے میں، ثریا کے بارے میں بعد میں یہی سوچا میں نے کہ وہ ان کے ہاں نوکری کرتی ہوگی۔ اس خیال سے دل میں عزت بھی ہوگئی ان لوگوں کیلئے۔ اوّل تو وہ بابا شاہجہان کے اتنے عقیدت مند تھے کہ ہر سال عرس میں آتے تھے۔ دوم انہوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ میں مسلمان ہوں، مجھ سے احتراز نہیں کیا اور پھر کشادہ دلی کی یہ انتہا کہ ایک مسلمان لڑکی کو نوکر رکھا ہوا تھا۔

گنگا دھر مہاراج آ گئے۔ بگڑ کر بولے۔ ''تم لوگوں نے انتظار بھی نہیں کیا میرا؟''

''جتنا انتظار کرنے کو کہا تھا اتنا کرلیا۔ کیا تمہارے لیے بیٹھے رہتے وہاں۔'' پریما دیوی بولیں۔

''پھیرے کرنے کیلئے تو پانچ سال بیٹھی رہی تھی۔ یہاں گھنٹہ بھر بھی انتظار نہ کیا۔''

''ارے وہی تو ایک غلطی ہوئی تھی جو آج تک بھگت رہی ہوں۔''

''تو بھگت رہی ہے کہ میں؟''

''تم کیا بھگت رہے ہو۔ ایک میرے ہی ماتا پتا بھولے تھے کہ آنکھیں بند کرلیں بعد میں سب نے کہا کہ بھاگ پھوڑ دیئے بیٹی کے۔''

''کسی ایک کہنے والے کا نام تو بتا ذرا۔''

''تاؤ جی، تائی جی، مہمان کا تو خیال کریں کیا سوچے گا وہ اپنے دل میں۔'' رُکمنی بولی۔

''ارے ثریا۔ ثریا چندو، مسعود جی تیرے دھرم کے ہیں بیٹا۔ تو ان کے لیے کچھ پکا لے۔ ان کی مہمانداری تیرے سپرد۔ رُکمنی تو بتا کیا کھلائے گی اپنے مریض کو؟'' پریما دیوی چونک کر بولیں۔

''ایں۔'' گنگا دھر جی چونک کر بولے۔

''تائی جی دلیہ مل جائے یا کھچڑی، ہلکی غذا ہو تو اچھا ہے۔''

''دلیہ تو ہے۔ لو ان کے لئے برتن بازار سے منگوا لو، نہیں تو دیر ہو جائے گی۔'' پریما دیوی نے پلو سے پیسے نکال کر دھرما کو دیئے۔

''جے بھگوتی۔'' ماتھر گردن پٹختا ہوا بولا۔ گنگا دھر جی بھاڑ سا منہ کھولے کھڑے تھے پھر وہ آہستہ سے بولے۔ ''رُکمنی۔ یہ تیری تائی ہے نا؟''

''رات ہوئی۔ سب نے کھانا کھا لیا۔ سب مجھ سے باتیں کر چکے تھے لیکن میں نے ثریا کو بالکل خاموش پایا تھا۔ اس نے کسی سے ایک بار بھی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ ان لوگوں کے انداز میں اس کے لیے محبت اور اپنائیت تھی لیکن وہ اُداس ملول اور خاموش تھی۔''

''دُوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا یہ سب بہت اچھے تھے۔ بڑے سادہ لوح اور محبت کرنے والے۔ میرے ساتھ بہترین سلوک کیا انہوں نے لیکن ثریا بہت پراسرار تھی، خاموش اور بے سکون۔ نہ جانے کیوں۔ میں نے اسے راتوں کو مضطرب دیکھا تھا۔ مگر وہ بولتی بھی تو نہیں تھی۔ کئی بار میں نے براہ راست اس کا نام لے کر اس سے اپنے کام کرائے تھے۔ وہ بڑی خوش دلی سے میرے کام کر دیتی تھی لیکن اب تک میں نے اس کی آواز ایک بار بھی نہیں سنی تھی۔

رُکمنی نے بینڈیج کھول کر میرا زخم دیکھا اور خوش ہو کر فخریہ انداز میں بولی۔ ''دیکھیں تاؤ جی ہماری ڈاکٹری۔ تین دن میں زخم بھر دیا ہم نے۔ کوئی کر کے تو دکھا دے۔''

''یہ تو ہم مانتے ہیں رُکمنی دیوی۔''

''اب میں باہر جاسکتا ہوں رُکمنی بہن۔'' میں نے پوچھا۔
''کہاں باہر؟''
''مزار پر۔''
''ہوں۔آہستہ آہستہ جاسکتے ہیں آپ۔ ابھی تیز چلنا منع ہے۔اس کے علاوہ بھیڑ میں اس جگہ گھسنا منع ہے جہاں دھکم پیل کا امکان ہو۔کسی طرح کی بھاگ دوڑ کی اجازت نہیں ہے۔''
''خیال رکھوں گا۔''
''دھرما یا رام جی آپ کے ساتھ جائیں گے۔''
''میں چلا جاؤں گا، مجھ سے زیادہ کون خیال رکھے گا۔'' گنگا دھر جی بولے۔
''یہ اجازت اس لیے دے دی گئی ہے کہ آپ کا دل گھبرا گیا ہوگا۔ ورنہ ابھی دو چار دن اور اجازت نہ ملتی۔'' رُکمنی بولی۔
''بے حد شکریہ۔'' میں نے کہا یہ سچ تھا ان لوگوں کی محبت کی وجہ سے میں نے ان کے احکامات مان لیے تھے ورنہ میں تو نہ جانے کیسے کیسے گھاؤ کھا چکا تھا۔ یہ معمولی زخم میرے لیے کیا حیثیت رکھتا تھا لیکن یہ سب کچھ ایسا تھا کہ مجھ سے روگردانی نہیں کی جارہی تھی۔ گنگا رام جی کے ساتھ باہر نکل آیا اور مزار شریف کی طرف چل پڑا۔ خوب چہل پہل تھی۔ میلہ سا لگا ہوا تھا۔ نئے نئے زائرین آ گئے تھے۔ مزار شریف کے پاس بھی خوب رونق تھی۔ رُکمنی نے احتیاط کی ہدایت کی تھی لیکن حقیقتاً مجھے نہ تو کمزوری محسوس ہورہی تھی اور نہ ہی زخم میں تکلیف تھی۔ اطمینان سے مزار کے احاطے میں پہنچ گیا۔
''آپ اندر جاتے ہیں گنگا دھر جی؟''
''کیوں نہیں، شاہجہاں بابا کے چرن چھونے جاتے ہیں۔''
''میں فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔''
''تو چلو تم فاتحہ پڑھ لینا۔ ہم چرن چھو لیں گے۔'' جوتے اُتارے اور عقیدت سے مزار شریف کے احاطے میں پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ موجود تھے۔ پھول اور چادریں چڑھائی جارہی تھیں۔ مرد عورت بچے سبھی موجود تھے۔ میں ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا اور آنکھیں بند کر کے فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد فراغت ہوئی تو میں نے گنگا دھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پہلی ہی نظر نے چونکا دیا۔ کچھ فاصلے پر ثریا نظر آئی تھی۔ تنہا سوگوار دونوں ہاتھ بلند کئے دُعا مانگ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سفید دھاریں اُمڈی آرہی تھیں۔ رُخسار جل تھل ہورہے تھے۔ ایسا کرب سمٹا ہوا تھا اس کے چہرے پر کہ دیکھنے والے کا کلیجہ ہل جائے۔
میں پتھرا گیا۔ دل جیسے بند بند ہو گیا تھا۔ بدن میں رعشہ سا آ گیا تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہیں سے اسے دیکھتا رہا۔ عجیب سی کیفیت ہوگئی تھی۔ دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ خواہش ہورہی تھی کہ آگے بڑھوں اور...... اور اس کا سارا کرب خود میں سمولوں۔ اسے ہر دُکھ سے آزاد کردوں لیکن ایک قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ تبھی گنگا دھر میرے پاس آ گئے۔
''دُعا پڑھ لی پوت؟''
''ایں......'' میں نے چونک کر کہا۔
''دُعا پڑھ لی؟''
''ہاں!'' میں نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔
''رُکو گے یہاں یا چلو گے۔''
''گنگا جی۔ وہ...... وہ۔'' میں نے اشارہ کیا اور گنگا دھر میرے اشارے پر اس طرف دیکھنے لگے۔ ثریا آنسو خشک کر رہی تھی پھر وہ پلٹ کر تیزی سے چل پڑی۔
''ثریا کی کہہ رہے ہو؟''

''ہاں!''
''دُعا پڑھنے آئی ہوگی۔ آتی رہتی ہے کوئی منادی تھوڑی ہے اسے۔''
''آیئے چلیں۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''ثریا کون ہے گنگا جی؟ آپ نے مجھے سب کے بارے میں بتا دیا اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ آپ کے ہاں نوکری کرتی ہے۔''
''ارے رام، رام۔ نا بیرا وہ تو ہمارے لیے رُکمنی جیسی ہے۔''
''کون ہے وہ؟''
''سچی بات یہ ہے بیرا کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''رُکمنی کے اسپتال میں داخل تھی۔ کسی پاپی نے اس کی زبان کاٹ دی تھی۔ اُنگلیوں کے پور بھی کاٹ دیئے تھے۔ رُکمنی کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ لاوارث ہے، کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے۔ اُنگلیوں کے پوروں کا تو علاج ہوگیا مگر زبان ٹھیک نہ ہو سکی۔''
''گونگی ہے وہ؟'' میں نے بے اختیار پوچھا
''تو اور کیا تم نے اسے بولتے سنا ہے کبھی؟''
''پھر کیا ہوا۔''
''ٹھیک ہوگئی تو رُکمنی اسے ساتھ لے آئی۔ اپنے گھر رکھ لیا ہم نے اسے۔ سنسار میں اس کا کوئی نہیں ہے اور اب تو وہ گھر کی سی ہوگئی ہے۔ ہماری طرف سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسے۔ مگر......''
''مگر کیا؟''
''بے چین ہے۔ بے سکون ہے۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔ حالانکہ سارے چھورے اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ہنسنے کے بجائے رو پڑتی ہے، کوئی گہرا گھاؤ ہے من میں۔ آخر کسی نہ کسی نے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہوگا۔ راتوں کو جاگتی رہتی ہے۔ کبھی کہیں بیٹھے بیٹھے تاریکیوں کو گھورتی رہتی ہے۔ کبھی رات رات بھر نماز پڑھتی رہتی ہے۔ گھنٹوں سجدے میں پڑی رہتی ہے۔''
''گنگا رام جی بتا رہے تھے اور میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ آج انکشاف ہوا تھا کہ وہ گونگی ہے۔ کون ہے وہ، کیا کہانی ہے اس کی...... کیا مجھے علم نہیں ہو سکتا۔ اچانک ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔
''ان کا نام کیسے معلوم ہوا آپ کو؟''
''اس کے پاس ایک رومال تھا جس کے کونے پر تارکشی سے اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ اس نے اس پر اُنگلی رکھ کر اپنے سینے پر اشارہ کر کے بتایا تھا کہ یہ اس کا نام ہے۔'' گنگا جی نے کہا اور پھر چونک کر بولے۔ ''ارے یہ دھرما اور رام جی کیسے بھاگے بھاگے آ رہے ہیں۔ کوئی بات ہوگئی کیا؟ میں نے بھی ان کے اشارے پر دیکھا۔ دونوں بری طرح گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔''
''ضرور کچھ ہوگیا۔'' گنگا دھر ان کی طرف لپکے۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا۔ نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔
دھرما اور رام جی تو گنگا دھر جی کو نہیں دیکھ سکے تھے لیکن ہم ہی ان کے قریب پہنچ گئے۔ گنگا جی قریب پہنچ کر دھاڑے۔
''ارے او بیل کے دیدے والوں کہاں اونٹ کی طرح منہ اُٹھائے اُٹھائے پھر رہے ہو۔'' دونوں اُچھل پڑے ایک ساتھ پلٹے اور پھر ایک ساتھ بولے۔ ''گنگا جی وہ...... وہ سادھو مہاراج۔''
''جٹا دھاری......'' دھرما بولا۔

''کالا کمنڈل ہاتھ میں لیے۔'' رام جی نے کہا۔
''گلے میں مالائیں اور......'' دھرما آگے بولنا چاہتا تھا کہ گنگا دھر جی غصّے سے لال پیلے ہونے لگے۔ انہوں ۔ نے غرّا کر کہا۔
''سسرو جوتی اُتاروں گا اور بیس ماروں گا سر پر...... ارے بھجن گا رہے ہو کیا تم دونوں۔ ایک آدمی بات کیوں نہیں بتاتا۔''
''میں بتاتا ہوں گنگا جی۔'' رام جی بولا۔ ''ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک دَم ایک سادھو مہاراج منڈوے میں گھس آئے۔ ماتھر جی نے غصّے سے کہا کہ وہ منہ اُٹھائے اندر کیوں گھس آئے تو سادھو مہاراج نے گھور کر انہیں دیکھا اور اپنا کمنڈل آگے بڑھا کر بولے۔ ''اسے دیکھ بالکا'' اور مہاراج اچانک ماتھر جی چیخ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پتہ نہیں انہیں اس میں کیا نظر آیا جبکہ کمنڈل میں کچھ نہیں تھا۔''
''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کمنڈل میں کچھ نہیں تھا۔''
گنگا دھر نے پوچھا۔
''بعد میں انہوں نے کمنڈل پھر لٹکا لیا اور وہ اُلٹا ہو گیا۔ کوئی چیز ہوتی تو اس سے گرتی نا۔''
''ارے تو آگے تو بولو رام جی۔ بک بک لگائے ہوئے ہو۔''
''سنت مہاراج نے دیوی جی سے کہا کہ کل صبح یہاں سے گھوڑی آگے بڑھا دیں۔ نہیں تو نقصان کی ذمے دار خود ہوں گی۔''
''گھوڑی آگے بڑھا دیں......؟''
''مطلب یہ تھا کہ سالم نگر سے چلے جائیں۔''
''کہاں چلے جائیں......؟''
''یہ نہیں بتایا۔''
''دھت تیرے کی۔ ارے آگے تو بولو بھگوان کے داس۔''
''بس آگے کیا بولیں۔ دھمکیاں دیں اور چلے گئے۔''
''تو پھر تم یہاں کیوں آگئے......؟''
''پریما دیوی بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ آپ کو تلاش کر کے فوراً واپس بلا لائیں۔''
''کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ آؤ مسعود چلیں۔'' اور ہم واپس چل پڑے کچھ دیر کے بعد چھولداری پر پہنچ گئے۔ پریما دیوی کا منہ اُترا ہوا تھا۔
''نکل چلو جلدی۔ نہیں تو کچھ ہو جائے گا۔ تمہیں بتایا ان لوگوں نے۔'' وہ بولیں۔
''ہاں بتا دیا۔ مگر بات کیا تھی تو نے پوچھا نہیں بھاگوان۔''
''خود ہوتے تو پوچھ کر دیکھ لیتے۔'' پریما دیوی نے کہا۔
''کیوں...... کیا تیرے میکے سے آئے تھے......؟''
''نہیں سسرال سے آئے تھے۔ ورنہ ایسے نہ ہوتے۔''
''کیسے......؟'' گنگا دھر جی نے کہا
''آنکھیں چیپڑ بھری ہوئیں۔ دانت پیلے، گنجی کھوپڑی، سوکھا بدن، چہرے سے بُھتنے لگ رہے تھے پورے۔'' پریما دیوی نے کہا اور گنگا رام جی جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے پھر بولے۔ ''زبان بہت لمبی ہو گئی ہے تیری۔ تھوڑی سی کاٹنی پڑے گی...... ہیں۔''

''وہ بھی کاٹ لیتا۔ مگر بستر اسمیٹو۔''
''اری چپ بیٹھ، تو باؤلی ہوگئی ہے تو کیا سب باؤلے ہوگئے ہیں۔ رُکمنی بٹیا تو بتا کون تھا وہ......؟''
''عجیب سا تھا تاؤ۔ صورت سے واقعی شیطان نظر آتا تھا۔''
''ارے نا بٹیا نا...... ایسے نہیں کہتے حلیہ تو سادھوؤں جیسا تھا۔ ارے ہاں ماتھر بیٹا...... تو نے اس کے کمنڈل میں کیا دیکھا تھا......؟''
''ایں...... ہاں تاؤ جی...... اس کا کمنڈل مکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پیلی پیلی زندہ بجبجاتی ہوئی مکڑیاں۔ رام رام......'' ماتھر نے کراہیت سے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔ مگر میں چونک پڑا۔
''مکڑیاں......؟''
''ہاں مسعود بھیا۔ ابھی تک من اُلٹ رہا ہے۔'' ماتھر سینہ ملتا ہوا بولا۔
''بڑی عجیب بات ہے۔ مگر تم لوگوں سے بھولے سے بھی عقل کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ارے جب ہمیں بلایا تھا تو انہیں روک لیتے کسی طرح بہلا پھسلا کر۔ ہم بھی ملتے ان سے پوچھتے کہ مہاراج یہاں سے جانے کو کیوں کہہ رہے ہو۔ کوئی بھول ہوئی ہے ہم سے، کوئی کشٹ پڑنے والا ہے ہم پر...... آخر تمہاری اس چتاؤنی کا کارن کیا ہے۔ مگر تم لوگوں کو اتنی عقل ہو تب نا۔''
''عقل تو سب تمہارے حصے میں آ گئی۔ ہم میں کہاں سے ہوگی۔ ارے وہ تو خود ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ یوں آئے اور یوں چلے گئے۔ چلو یہاں سے ورنہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔'' پریما دیوی بولیں۔
''یوں آئے...... یوں چلے گئے اور اب ہم چلیں یہاں سے۔ عرس ختم ہونے سے پہلے کوئی نہیں جائے گا۔ سادھو سنتوں کی سیوا کرنی چاہئے۔ مگر تو نے سوچا ہوگا خرچہ ہوگا۔'' گنگا جی نے منہ بگاڑ کر کہا۔ پھر خاموش ہو کر ثریا کو دیکھنے لگے جو جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔
''دیکھو، میں کہتی ہوں چلنا اچھا ہوگا۔ کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔''
''تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دوبارہ ملیں گے وہ مہاراج تو ان سے پوچھ لیں گے۔''
وہ باتیں کر رہے تھے مگر میرا ذہن کہیں اور تھا۔ مکڑیاں، پیلی پیلی مکڑیاں، بھوریا چرن کا نشان تھیں اور جو حلیہ بتایا گیا تھا وہ بھی اس کے علاوہ اور کسی کا نہیں تھا۔ لیکن وہ ناپاک جادوگر یہاں...... اور...... پھر اس کا اس جگہ آنا۔ یقیناً وہ میری یہاں موجودگی سے واقف ہوگا۔ کیا اس نے میری وجہ سے ان لوگوں کو یہاں سے جانے کو کہا ہے۔ پریما دیوی اور گنگا دھر جی حسب عادت لڑ رہے تھے۔ رُکمنی نے کہا۔
''حد ہے تاؤ جی...... آپ لوگوں میں تو جنم جنم کا بیر ہے۔ بس کوئی بات مل جائے لڑنے کیلئے۔''
''ہاں سارا دوش میرا ہوتا ہے۔ اس سادہ تری کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اری ثریا تو چائے کا پانی چڑھا جا کر...... اس عورت نے تو بھیجہ پگھلا کر رکھ دیا ہے۔''
''ہم واپس چلیں گے بس......!'' پریما دیوی نے کہا۔
''اکیلی چلی جاؤ...... ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ کہہ دیا ہم نے۔'' گنگا دھر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''اکیلی ہی چلی جاؤ۔''
''سیدھی میکے جانا۔ میرے گھر میں وہ رہے گا جو میری مرضی پر چلتا ہو۔'' بات آگے بڑھنے لگی تھی۔ ماتھر گنگا دھر کو چھولداری سے باہر لے گیا۔ رُکمنی نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
''پسند آئے ہمارے تاؤ اور تائی۔ ساری باتیں کر لیں گے مگر ایک دوسرے کے بنا پل بھر نہیں جی سکیں گے۔ ارے آپ ہی ہنس دیں۔ رُت بدل جائے گی۔''

''بات سوچنے کی ہے رُکمنی جی......!'' میں نے کہا۔

''ہاں ہے تو...... خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔''

''میرے خیال میں گنگا رام جی کو مان لینا چاہیے۔ کوئی بات بلاوجہ نہیں ہوتی آخر اس سادھو کے آنے کا کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں۔ مگر...... دیکھ لیا تم لوگوں نے۔ کیا سلوک ہوتا ہے میرے ساتھ۔'' پریما دیوی بسورتے ہوئے بولیں۔

''آپ چنتا نہ کریں ہم تاؤ جی کو سمجھائیں گے۔''

''ارے جسے بھگوان نہ سمجھا سکا اسے کون سمجھائے گا۔'' پریما دیوی نے بدستور بسورتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں ثریا چائے لے کر آ گئی۔ میری نگاہیں بے اختیار اس کے چہرے کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ میرے سامنے ٹرے لے کر آ گئی جس میں تین پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ کپکپا سی گئی جس کا احساس پیالوں سے چائے چھلکنے سے ہوا تھا۔ میں نے اپنا پیالہ اُٹھا لیا۔ ثریا نے پریما دیوی اور رُکمنی کو چائے دی اور کسی قدر لڑکھڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''میں باہر جاؤں رُکمنی جی......!''

''ہاں ضرور...... میں بھی آ رہی ہوں۔'' رُکمنی نے کہا اور میں پیالہ سنبھالے ہوئے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر ماتھر، دھرما اور رام جی گنگا دھر جی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گنگا دھر پرجوش لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''چلے جاتے مگر ہم بھی ہٹ کے پکے ہیں۔ اب تو عرس کے ختم ہونے کے بعد ہی جائیں گے۔''

''عرس بھی ختم ہونے والا ہے گنگا جی۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ رے بھائی۔ تو آیا ہے اندر سے۔ کان بھرے ہوں گے تیرے، گنگا جی اگر ضدی نہ ہوتے تو آج نہ جانے کیا ہوتے۔ اب تو عرس ختم ہونے کے بعد ہی جائیں گے۔ کوئی بھیج کے تو دیکھ لے ہمیں۔'' ایسا لہجہ تھا گنگا رام کا کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ پریما دیوی نے بھی ساری کوششیں کر لیں مگر گنگا دھر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ سب ہار گئے۔

رات ہو گئی۔ کھانا وغیرہ کھایا گیا۔ ماتھر اور رُکمنی خوب شرارتیں کرتے تھے۔ وہ شرارتیں کرتے رہے۔ پریما دیوی کو گنگا دھر سے لڑاتے رہے میں بھی ہنس رہا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے دیر تک باتیں ہوئیں مکڑیوں والے سادھو کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ وہ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے لیکن میرے ذہن میں کچھ اور ہی خیال تھا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ وہ سادھو بھوریا چرن کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کمبخت نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ہوسکتا ہے مجھ پر حملہ بھی اسی کی کوئی سازش ہو۔ اب وہ میری موت کے سوا اور کیا چاہتا تھا۔ مہاوتی اور اس کی باتیں میں سن چکا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میری وجہ سے کالا علم خطرے میں پڑ گیا تھا۔ وہ لوگ اپنے طور پر باتیں کرتے رہے اور میں بھوریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ سب سونے لیٹ گئے۔ میں اُلجھا ہوا تھا۔ کسی قدر بے چین تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں اُٹھا اور چھولداری سے باہر نکل آیا۔ دھرما اور رام جی باہر گہری نیند سو رہے تھے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مزار شریف پر قوالیاں ہو رہی تھیں۔ قوالوں کی آواز ہوا کے دوش پر آ رہی تھی۔ سو جانے کو جی نہ چاہا فاصلہ کافی تھا۔ پھر بھی کافی دُور نکل آیا اور بے مقصد گھومتا رہا۔ بھوریا چرن اگر یہاں موجود ہے تو میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ جانے ان لوگوں کو یہاں سے بھگانے کا کیا مقصد ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ میں ہی ہوں۔ مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹہ بے مقصد گھومتا رہا پھر واپس چل پڑا۔ چھولداری سے کچھ فاصلے پر تھا کہ کسی سائے کو متحرک دیکھا اور ایک دَم ساکت ہو گیا۔ کون ہے؟ میں نے گھاس پر نگاہیں جما دیں پھر اسے پہچان لیا۔ ثریا تھی۔ نماز پڑھ رہی تھی۔ یہ آخر کون ہے، کس کے ظلم کا شکار ہو گئی ہے۔ قدم خود بخود آگے بڑھ گئے اور اس سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ دو زانو بیٹھ گئی۔ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور دیر تک اسی عالم میں رہی پھر میں نے اس کی سسکیاں سُنیں۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔ میرا دل پگھلنے لگا۔ اس کا درد سینے میں محسوس ہو رہا تھا۔ دل

بری طرح اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ ہاتھ اُٹھائے سسکتی رہی۔ میں بے اختیار ہو کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے جب میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ ایک دَم سہم کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں وحشت تھی۔

''نہیں ثریا۔ ڈرو نہیں۔ میں مسعود ہوں۔''

اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔ ''میں تمہارے لیے بے حد افسردہ ہوں ثریا۔ کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔ میں...... میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کیا دُکھ ہے۔ ثریا میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے تمام دُکھ دُور کر دوں۔ میں نے تمہیں مزار پر بھی دیکھا تھا۔ تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم مجھے۔ نہ جانے کون ظالم تھے جنہوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا۔ کاش مجھے ان کے بارے میں معلوم ہو جائے۔''

قریب سے میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے رُخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ میں اس کے بالکل قریب آ گیا۔ ''مجھے بتاؤ ثریا کیا کروں میں تمہارے لیے۔'' وہ روتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ پھر اس کا سر آہستہ آہستہ جھکا۔ اس نے اپنی پیشانی میرے سینے سے ٹکا دی۔ دل پھٹنے لگا۔ ایک دَم خواہش پیدا ہوئی کہ اسے سینے میں چھپا لوں، کچھ بھی نہیں تھا میں اس کا۔ پہلی بار براہ راست مخاطب ہوا تھا۔ مگر اس طرح میرے سینے سے سر ٹکانے میں بڑی اپنائیت تھی۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے۔ مگر میرے ہاتھ نہ اُٹھ سکے۔ وہ اپنی آنکھیں میرے سینے سے رگڑتی رہی پھر ایک دم چونکی گردن اُٹھا کر مجھے دیکھا۔

''ثریا...... تم لکھنا پڑھنا جانتی ہو۔'' اس نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تم نے لکھ کر کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''کیوں......؟'' میں نے پوچھا...... اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر سامنے کر دیئے۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے۔ گنگا دھر نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری اُنگلیاں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ کیا اس لیے کہ تم کسی کو لکھ کر کچھ نہ بتا سکو۔'' اس نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔ ''مگر اب تو تمہاری اُنگلیاں ٹھیک ہیں۔ اب تو تم بتا سکتی ہو۔'' وہ مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ پھر زور زور سے نفی میں گردن ہلانے لگی۔ ''کیوں...... خود پر ظلم کرنے والوں سے ڈرتی ہو؟'' اس نے گردن جھکا لی۔ ''اُنہیں جانتی ہو تم......؟'' میں نے پوچھا۔ اور اس نے انکار کر دیا۔ ''اوہ......'' میں آہستہ سے بولا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ''تمہیں ایک کام کرنا ہوگا ثریا۔ کل میں تمہیں لکھنے کا سامان فراہم کروں گا۔ تم پر جو بیتی ہے وہ لکھ کر مجھے بتا دینا۔ ثریا مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے دُکھ دُور کر کے رہوں گا۔'' وہ سیاہ چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑا اسے آنکھوں سے لگایا اور تیزی سے مڑ کر چھولداری میں چلی گئی۔

میرے ہاتھ کی پشت میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جلن جیسے میرے ہاتھ سے چپک گئی تھی۔ میں اپنا ہاتھ پکڑ کر مسلنے لگا۔ ایک انوکھی لذت پوشیدہ تھی اس جلن میں۔ دُنیا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ پتھرا گیا تھا۔ دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہو گئی تھی۔ ایک بالکل اجنبی احساس جاگا تھا سینے میں۔ اس سے پہلے کبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ کون ہے۔ نہ جانے کون ہے۔ خاموش تھی۔ ساکن تھی۔ میری طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ کیا ان چند دنوں میں اس کے سینے میں کوئی جذبہ جاگا تھا۔ کونسا جذبہ تھا وہ۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگایا تھا۔ کیا مجھے اس کے بارے میں پتہ چل سکتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں میری رہنمائی ہو سکتی ہے۔ خیال ہی نہیں آیا تھا اس بات کا۔ یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ خود پر حملہ کرانے والے کے بارے میں کلام الٰہی سے رہنمائی حاصل کروں۔ کوئی حرج تو نہیں ہے اس میں۔ خود سے سوال کیا اور پھر آنکھوں میں اس کا چہرہ اُبھر آیا۔ نہ جانے کتنی دیر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل مچل رہا تھا اس کے لئے۔ آرزو کر رہا تھا کہ وہ دوبارہ باہر آ جائے۔ اسے زبان مل جائے وہ مجھ سے باتیں کرے۔ آہ شاید اس بار کوئی اور ہی جذبہ جاگا تھا سینے میں۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی تھی۔ ہاں ایسا ہو گیا تھا۔ ایک انوکھی بے کلی طاری ہو گئی۔ ایک گوشہ منتخب

کیا، وہاں بیٹھ گیا۔ درود شریف کا ورد کیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل سے آواز اُبھری۔
مناسب نہیں ہے۔ نافرمانی کے راستے اپنا رہا ہے۔ کیا تجھے اجازت ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات پوری کرے۔ اپنے لیے کچھ کرے۔ اگر کسی کیلئے تیرے دل میں آگ اُبھرے تو وہ تیرے ماں باپ بہن بھائی ہوں کہ...... وہ اوّل ہیں۔ ان سے گریز کر کے اپنی خواہشوں کی طرف لپک رہا ہے۔ پھر بھٹک رہا ہے۔
پورے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ آنکھیں خوف سے کھل گئیں۔ دل اُچھل رہا تھا۔ خود کو سنبھالے نہ سنبھال پا رہا تھا۔ اچانک کانوں میں ایک چیخ اُبھری۔
''آگ۔'' دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ پھر فوراً ہی نتھنوں سے کپڑا جلنے کی بو ٹکرائی اور چھولداری سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ''آگ لگ گئی۔ آگ ارے اُٹھو۔ دھرما، رام جی۔ ماتھر۔ ارے اُٹھو۔ آگ...... آگ۔'' آواز پریما دیوی کی تھی۔
اعصاب پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ ایک طرف دل میں اُبھرنے والی آواز، دُوسری طرف پریما دیوی کی چیخیں۔ عجیب اعصاب شکن ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ اندر مدھم لیمپ ہمیشہ جلتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی روشنی تھی۔ دھرما اور رام جی بدحواس ہو کر اندر بھاگے۔ میں بھی خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال کر اندر داخل ہوگیا۔ عجیب منظر تھا۔ آگ کا ایک شعلہ بھی نہیں تھا لیکن آگ لگی ہوئی تھی۔ بالکل ایسے جیسے جلی ہوئی ماچس کی تیلی سلگتی ہے۔ یہ آگ ہر طرف تھی۔ گدے جل رہے تھے۔ سوٹ کیس پگھل رہے تھے۔ بدبو پھیل رہی تھی لیکن شعلہ نہ تھا۔ سب دہشت سے آنکھیں پھاڑے یہ آگ دیکھ رہے تھے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
''بجھاؤ۔ ارے بجھاؤ۔ ہائے سب جل گیا۔ ارے سب جل گیا'' پریما دیوی چیخیں۔
''تونے آواز بند نہ کی تو تیری منڈیا پکڑ کر اسی سوٹ کیس پر رکھ دوں گا۔ آس پاس کے لوگوں کو جمع کرے گی کیا''
''ارے کرلو ظلم، جتنا من چاہے کرلو۔ ہائے سب جل گیا۔ ارے آگ تو بجھا دو۔ سب کھڑے دیکھ رہے ہو۔''
سب کو جیسے ہوش آ گیا۔ رام جی، ماتھر اور دھرما پانی لینے دوڑے اور پھر ہر چیز پر پانی اُنڈیل دیا گیا۔ آگ بجھ گئی۔ مگر سچ مچ سب تباہ ہوگیا تھا۔ گدے جل گئے، سوٹ کیسوں میں رکھے کپڑے جل گئے۔ شکر تھا چھولداری بچ گئی تھی۔ پریما دیوی رونے لگیں۔
''دیکھ نتیجہ ضد کا۔ دیکھ لیا۔ نہ جاؤ۔ جمے رہو یہاں۔ جل مرو سب کے سب۔ بھسم ہو جاؤ میرا کیا ہے۔ ارے ایسی آگ دیکھی نہ سنی۔ دیکھو یہ دیکھو ہر چیز جل گئی۔ ارے اب بھی سوچو گے کیا۔ اب بھی سوچو گے۔ ارے رام جی۔ دھرما رے۔ ارے چل بھیا۔ میکے میں پہنچا دے مجھے۔ ارے آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ اکیلی جی لوں گی۔ ہائے سب جل گیا۔ میری ساڑھیاں بچوں کے کپڑے۔ اور ضد کرو۔''
''رام رام رام۔ بھیا عورت ہے کہ بھونپو، رُکے بغیر بولے جارہی ہے۔ کیا دُشمنی ہے آخر ان سادھو مہاراج سے ہماری۔ ارے کوئی کارن تو بتائیے، ایسے ہی چل پڑیں۔'' گنگا جی بولے۔
''گیانی مہاراج۔ اے گیانی مہاراج۔ تم پوچھتے رہو دُشمنی دوستی۔ چلو رے بچو۔ چلو سب کو مروا دیں گے۔''
''تو کترنی کو لگام دے گی کہ نہیں۔ تم بھی تو کچھ بولو رے۔ مگر یہ بولنے دے تب نا۔''
''چلنا چاہئے تاؤ جی۔ ایسی آگ دیکھی نا سُنی۔''
''ٹھیک ہے رہے مہان آتما۔ ٹھیک ہے صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ بس سورج نکل آنے دو۔'' گنگا دھر نے ہاتھ جوڑ کر سر سے اُوپر کرتے ہوئے کہا۔ میں خاموشی سے ثریا کو دیکھ رہا تھا۔ خاموش کھڑی تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ رو رہا تھا اس کیلئے۔ تڑپ رہا تھا، سسک رہا تھا۔ کیا ہوگیا ہے مجھے۔ کیا ہوگیا ہے۔ سب کچھ چھنا جا رہا ہے۔ سرکشی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سب کچھ فراموش کرنا تھا۔ سب کچھ بھول جانا تھا۔ آنکھوں میں نمی اُتری ہوئی تھی۔

گنگا دھر جی باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ گنگا دھر نہ جانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

''تو ہمارے ساتھ چلے گا پوت۔''

''میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کہاں جائے گا، تجھے کیا چنتا۔''

''ہاں میں یہاں رُکوں گا۔''

''اچھے بھگائے جا رہے ہیں ہم۔ ارے کیا بگاڑ رہے تھے کسی کا۔ جانا تو تھا آرام سے جاتے۔ چلو ٹھیک ہے جو بابا کی مرضی۔'' اندر اُٹھا پٹخ ہو رہی تھی۔ ویسے میں دیکھ چکا تھا سارا سامان جل چکا تھا، بے چاروں کو یہ نقصان میری وجہ سے اُٹھانا پڑا تھا۔

✦✤✦✤✦

''تم خور جے آؤ گے مسعود۔ آؤ تو ہمارے پاس ضرور آنا۔''

گنگا دھر نے نہ جانے کیا کیا کہا۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ بس سوچ رہا تھا کہ یہاں رُکنے سے کیا فائدہ۔ جانا ہے تو انتظار کیسا۔ ابھی چلا جائے۔ بیکار ہے رُکنا۔ کچھ نہیں ہے۔ یہ دُنیا میرے لیے نہیں ہے۔ سب کچھ چھن گیا ہے مجھ سے۔ سب کچھ چھن گیا ہے۔ بیکار ہے سب بیکار ہے وہیں سے پلٹا اور آگے بڑھ گیا۔ گنگا دھر سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اس طرح چل پڑوں گا۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ کہیں آس پاس جا رہا ہوں۔ واپس جاؤں گا۔ مگر میں چلتا رہا۔ بہت دُور نکل آیا۔ اتنا دُور کہ کوئی تلاش نہ کر سکے۔ مزار کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ ایک گوشے میں پناہ لی۔ یہاں بھی ڈیرے جمے ہوئے تھے۔ خلقت ہر جگہ موجود تھی۔ ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ رونے کو جی چاہ رہا تھا، بلک بلک کر روتا رہا۔ ثریا یاد آ رہی تھی۔ سینے پر اس کے سر کا لمس، ہاتھ پر اس کی آنکھوں کا لمس زندہ تھا۔ بے کلی ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اُٹھا اور نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ ساری رات پڑھتا رہا۔ سورج نکل آیا۔ دُھوپ نکل آئی۔ دوپہر ہوگئی۔ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ پھر کسی نے شانہ ہلایا۔

''میاں صاحب یہ لے لیجئے۔'' آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بینائی ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔ دُھندلا نظر آ رہا تھا۔ چند خاکے سامنے کھڑے تھے۔

''کیا ہے؟'' بمشکل کہا۔

''دال دلیا ہے میاں صاحب۔''

''شکریہ بھائی۔ حاجت نہیں ہے۔''

''لے لو میاں صاحب۔ غریب کا دل نہ توڑو۔''

''بھائی بہت شکریہ۔ ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں میاں صاحب۔ رات سے اسی طرح بیٹھے ہو۔ ہلے بھی نہیں ہو اپنی جگہ سے۔ انتڑیاں اینٹھ گئی ہوں گی ایمان کی قسم۔''

''ایں۔'' میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں رات کو قوالیوں سے لوٹا تو دیکھا تھا تمہیں۔ تین بار آنکھ کھلی تو ایسے ہی دیکھا۔ صبح سے ایسے ہی بیٹھے ہو۔ لو میاں صاحب لے لو۔ ہم بھی مسلمان بھائی ہیں۔''

''جی ضرورت نہیں ہے۔''

''لے لو میاں صاحب۔ تمہیں بابا شاہجہاں کا واسطہ۔ اماں اتنی خوشامد کر رہے ہیں مان لو۔ ہماری بھی خوشی ہو جائے گی۔''

دل ڈُوبا ڈُوبا سا تھا۔ پیٹ بے شک خالی تھا لیکن کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن وہ شخص اس طرح اصرار کر رہا تھا کہ

مجبور ہوگیا۔ جو دیا کھانے لگا اور کچھ دیر کے بعد شکم سیر ہوگیا۔ اس نے پانی بھی پلایا تھا۔

''ہمارے حق میں دُعائے خیر کرنا میاں صاحب۔ اٹھارہ سال ہوگئے تھے بیاہ کو، اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بابا جی کے مزار پر منت مانی، بیٹا مل گیا اللہ کے فضل سے۔ منت پوری کرنے آئے تھے۔ لونڈے کا نام فضل الدین رکھا ہے۔ ہمارا نام کمال الدین پہلوان ہے۔ خورجے کے رہنے والے ہیں۔ نام ہے اپنا۔ ہماری دُعا سے خورجے کے اسٹیشن پر اُتر کر کمالے پہلوان کا اکھاڑہ پوچھ لو، سیدھے پہنچ جاؤ گے اور کوئی ضرورت ہو تو بتا دو۔''

''نہیں بھائی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''دُعا ضرور کرنا۔ بس چلتے ہیں۔'' وہ سلام کر کے واپس مڑ گیا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔ ''اماں عمر چھوٹی ہے تو کیا۔ دیکھتے نہیں کتنے عبادت گزار ہیں۔ پہنچے ہوئے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' اس کی آواز دُور ہوگئی۔ پیٹ بھرا تو آنکھوں میں کچھ روشنی جاگی۔ دل کو سنبھالنے لگا۔ کیا ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے۔ دل اتنا بے اختیار کیوں ہوگیا تھا۔ ایک صورت آنکھوں میں بسی تو اتنا بے بس ہوگیا لیکن اس دل کو سنبھالنا تھا، اس وشت ویراں میں کسی کا بسیرا نہیں ہونا چاہئے۔ جو کیا گیا درست ہی تو ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی کیلئے تو دل کو سمجھا لیا مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ ثریا کیلئے دل میں صرف ہمدردی نہیں تھی۔ جس طرح بے اختیار ہوگیا تھا اس سے کچھ اور ہی احساس ہو رہا تھا۔

کراہتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور مزار شریف کی طرف چل پڑا۔ بابا صاحب کے قدموں میں ہی سکون مل سکتا تھا۔ چلتا رہا سوچتا رہا۔ گنگا دھر نے سوچا ہوگا کہ خود غرض اور ناسپاس ہوں، بے مروت ہوں، ملے بغیر خاموشی سے چلا آیا۔ مگر ان سے رُخصت ہونے کے لمحات شاید کچھ اور زخم لگا دیتے۔ نہ جانے کس طرح بے اختیار ہو جاتا۔ کچھ اور گناہ ہو جاتے۔ اور...... اور نہ جانے نہ جانے ثریا نے کیا سوچا ہوگا۔ رفتار تیز کر دی۔ جلد از جلد بابا جی کے قدموں میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پہنچ گیا۔ بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ دہائی دینے لگا۔ سکون مانگ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ قرار آنے لگا۔ زائرین جوق در جوق آ رہے تھے۔ رات ہوگئی۔ خوب رات ہوگئی۔ قوالی جم گئی۔ لوگ مزار سے ہٹ گئے۔ ہارمونیم اور ڈھولک کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ قوالوں کے سُر سنائی دینے لگے۔ کیا گا رہے تھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ٹوٹا ٹوٹا تھا، خود پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ سب

کچھ جانے کے بعد سب کچھ کھونے کا خوف دل میں بیدار ہوگیا تھا۔ تھک گیا تو اُٹھ گیا۔ ایک پُرسکون گوشہ تلاش کیا۔ لیٹ گیا۔ نیم غشی سی طاری تھی۔ سوجانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے نیند آئی۔ صبح کو جاگا۔ حالت کسی قدر بہتر ہوگئی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو چار روپے موجود تھے۔ بڑے گھر سے جب تک تھا، جن دنوں گنگا دھر جی کے ذمے کھا رہا تھا۔ وظیفہ نہیں ملا تھا مگر آج چار روپے موجود تھے۔ ایک دم دل میں خوشی جاگ اُٹھی۔ وظیفہ ملا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ناخوشی نہیں ہے۔ قابل معافی ہوں، بروقت سنبھل گیا ہوں۔ حکم ماننے والوں میں تصور کیا گیا ہوں۔

''بابا جی ناشتہ کرو گے؟''

''نہیں بھائی فقیر نہیں ہوں۔'' جواب دیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھا چائے ڈبل روٹی خریدی، ناشتہ کیا۔ کل بارہ آنے خرچ ہوئے تھے۔ دن آسانی سے گزرے گا کوئی اور حکم نہیں ملا تھا۔ جب تک دُوسرا حکم نہ ملے۔ یہیں رہنا ہے کوئی کام نہیں سونپا گیا تھا۔ رہنمائی ضرور ہوگی یقین تھا۔ دن گزرا، کوئی شام کے پانچ بجے ہوں گے آس پاس لوگ موجود تھے۔ سب اپنے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے تھے۔ اچانک عقب میں ایک سایہ سا محسوس ہوا، پلٹ بھی نہیں پایا تھا کہ ذہن پر دھماکہ سا ہوا۔ ایک آواز سنائی دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دُوسرا دھماکہ ہوا۔ کوئی شے دوسری بار سر پر لگی تھی۔ ایک دم شور مچا کچھ لوگ دوڑے۔ میں بادل ناخواستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ نوجوان آدمی تھا۔ ہاتھ میں چری ہوئی لکڑی کا بڑا سا کندہ تھا، آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے تیسری بار اس کے کندے سے میرے سر کا نشانہ بنایا۔ اس سے پہلے بھی شاید اس نے دو بار مجھ پر اس لکڑی سے بھرپور وار کیا تھا مگر اللہ کو بچانا مقصود تھا۔ دونوں وار خالی گئے تھے۔ تیسرا وار ان لوگوں نے روک لیا جو میری مدد کو پہنچے تھے۔ ایک آواز اُبھری۔

''ابے پیچھے سے وار کرتا ہے بزدل کی اولاد۔ لکڑی پھینک دے بھوتنی والے، نئیں تو قینچی لگا کر گچی اُتار دیں گے۔ زندگی بھر گردن سیدھی نہیں کر سکے گا۔ ابے کمالے پہلوان کی قینچی ہے۔ ایرے غیرے کی نہیں۔'' آواز بھی پہچان لی تھی، صورت بھی۔ کمال الدین پہلوان خورجے والے تھے۔ مجھے کھانا کھلا چکے تھے مگر یہ نوجوان کون ہے۔ میں نے کمال الدین پہلوان کے شکنجے میں پھنسے نوجوان کو دیکھا۔ انوں نے اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گردن پر ہاتھ جما رکھے تھے اور نوجوان بے بس ہو گیا تھا۔ مگر یہ شکل، یہ صورت جانی پہچانی تھی۔ اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا مگر کہاں؟

''ابے گڈا ابھی تک نہیں گرایا، کام کر ہی دیں تیرا گیا۔'' کمالے پہلوان نے کہا۔ پھر برابر کھڑے ہوئے شخص سے بولا۔ ''اماں چمن بھائی گڈا

لے لو اس کے ہاتھ سے ورنہ میرے کو غصہ آ رہا ہے۔'' دُوسرے آدمی نے نوجوان کے ہاتھ سے لکڑی چھین لی اور کمالے پہلوان نے نوجوان کو جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا اور اس کے بعد سیدھا نہیں ہوا تھا۔ ''جان ہوتی نہیں سسروں میں اور خون خرابہ کرنے نکل پڑتے ہیں۔'' پھر کمالے پہلوان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میاں صاحب تم سے کیا دُشمنی ہو گئی اس کی۔ تم تو بڑے اللہ والے ہو؟''

''اللہ جانے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اماں دیکھو چمن میاں، کیا ہو گیا اسے۔ منکا تو نہیں ٹوٹ گیا کہیں۔'' پہلوان نے کہا۔ لکڑی چھیننے والے صاحب آگے بڑھ کر اوندھے پڑے ہوئے نوجوان کو سیدھا کرنے لگے مگر بجلی سی چمک گئی۔ نوجوان سیدھا ہوتے ہی اُچھلا اور اُٹھ کر بری طرح بھاگا۔

''پکڑ لو۔'' چمن میاں چیخے، مگر میں نے ان کا راستہ روک لیا۔

''جانے دیجئے۔ بھاگ گیا۔ بھاگ جانے دیجئے۔''

''ہاں چھوڑو چمن میاں۔ مگر جھگڑا کیا تھا میاں صاحب؟''

''عرض کیا نا اللہ ہی جانتا ہے۔''

''تمہیں نہیں معلوم؟''

''نہیں۔''

''عجیب بات ہے حالانکہ لکڑی اس نے ایسی تاک کر ماری تھی کہ اگر پڑ جاتی کہیں تو کتر گئے تھے قسم اللہ کی۔ کمال ہے لوگ اللہ والوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔''

جمع ہونے والے منتشر ہو گئے۔ مگر میرا ذہن بری طرح اُلجھ گیا۔ وہ رات یاد آ گئی جی مجھ پر خنجر سے حملہ ہوا تھا۔ کیا اس رات بھی حملہ آور یہی نوجوان تھا۔ وہ حملہ بھی جان لیوا تھا۔ اگر گنگا دھر جی شور نہ مچاتے تو سوتے میں دوسرا وار ضرور کارگر ہو جاتا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کیوں آخر کیوں......؟ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ خون تھا۔ جیسے وہ مجھے ہر قیمت پر ختم کر دینا چاہتا ہو۔ اور اس کا چہرہ۔ وہ چہرہ دیکھا دیکھا کیوں لگ رہا تھا۔ کہاں دیکھا تھا میں نے اسے؟ کچھ یاد نہیں آیا۔ ذہن اس طرف سے ہٹا لیا۔ خود بھی وہاں سے ہٹ گیا۔

رات ہو گئی، حملہ آور بھاگ گیا تھا۔ وہ پھر کوشش کرے گا۔ زندگی ہوئی تو پھر اللہ بچنے کے اسباب پیدا کر دے گا اور اگر موت اسی طرح کسی کے ہاتھوں لکھی ہے تو کیا بری ہے، البتہ کھا پی کر لیٹا تو ذہن متضاد خیالات میں اُلجھا ہوا تھا۔ ثریا کی یاد دل میں کسکی، پھر اس نوجوان کا چہرہ آنکھوں میں اٹک گیا۔ اچانک کچھ مناظر اُجاگر ہوئے یہ کونسی جگہ ہے۔ غالباً کالی کنڈ تھا۔ مہاوتی کا کالی کنڈ......! مہاوتی ہاتھ میں خنجر لیے آگے بڑھ رہی تھی اور کالی کے مجسمے کے قریب کوئی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا پھر بھوریا چرن نظر آیا۔

''لنگڑی پورنی......سسری کچوندی ہے نری......اے چھورا...... ہوش ٹھکانے آئے تیرے۔ اُٹھ کھڑا ہو...... یہ اماوس کی

رات پیدا ہوا ہے اور پائل ہے...... میرے پاس سے بھاگا ہوا ہے یہ...... اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں آ گئے۔''
دماغ کو اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ پورا بدن ہل گیا۔ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل سینہ توڑ کر باہر نکلنے کیلئے بے تاب تھا۔ پہچان لیا تھا میں نے اسے۔ اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہی نوجوان تھا جسے میں نے کالی کنڈ میں مہاوتی کا قیدی دیکھا تھا اور بھوریا چرن اسے وہاں سے لے گیا تھا۔
''کمنڈل میں مکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ پیلی پیلی بے شمار مکڑیاں۔'' ماتھر نے یہی کہا تھا۔ وہ بھوریا چرن ہی تھا۔ وہ یہاں موجود ہے۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں نے اُٹھ کر پاگلوں کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ رُخ مزار کی طرف تھا۔ پیروں میں کسی حد تک گھوڑے جیسی قوت آ گئی تھی اور میں قلانچیں بھر رہا تھا۔ مزار پر قوالیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ قوالوں کے گرد جمع تھے میں مزار مبارک کے پاس جا پہنچا۔ بے چین نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا۔ سب قوالیوں میں مگن تھے۔ میں نے ایک ایسے ستون کی آڑ میں جگہ بنا لی جہاں سے مزار پر نظر رکھی جا سکے۔ مزار شریف کے عقب میں طاق بنے ہوئے تھے۔ میری نگاہوں نے ان طاقوں کا طواف کیا۔ تمام طاق خالی تھے۔ دل میں بہت کچھ تھا۔ یہاں آ کر سکون ہوا تھا۔ وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ یقیناً وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ سانسیں درست کرتا رہا۔ رات گزر گئی صبح ہو گئی۔ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ ایک لمحہ نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ انتظار کروں گا خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے۔ شام ہو گئی۔ بھوکا پیاسا تھا مگر فکر نہیں تھی عادت تھی، کوئی پریشانی نہیں تھی بس نگرانی کر رہا تھا۔ وقت آ گیا۔ میرا خیال دُرست نکلا۔
مغرب کا وقت تھا۔ نمازیوں نے کچھ فاصلے پر صفیں بنا لی تھیں۔ ایک شخص اذان کہہ رہا تھا۔ میں نے اس جگہ نماز ادا کی اور پھر آخری رکعت کے بعد سلام پھیرا ہی تھا کہ میں نے اسے آتے ہوئے دیکھا۔ سفید رنگ کی ملگجی چادر اوڑھے ہوئے۔ شبے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اکثر ایسے لوگ مزار پر آتے تھے، لیکن میرے دل نے کہا کہ انتظار ختم ہو گیا ہے عمل کا وقت آ گیا ہے۔
اس کا پورا جسم چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔ ہاتھ بھی چادر کے اندر تھے۔ مزار مقدس کے عقب میں پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کسی بھوکے عقاب کی مانند پر تول لیے اور پھر جونہی اس نے اپنا ایک ہاتھ چادر سے باہر نکالا۔ میرے حلق سے ایک غضب ناک چیخ نکل گئی۔ میں برق کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ پہچان لیا اور پھر ایک سمت چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنا عمل مکمل نہیں کر سکا تھا۔ سامنے کی سمت بھاگنے کے بجائے وہ مزار کے عقبی حصے کی طرف دوڑا تھا۔ ایک تنگ سی جگہ مزار کے عقب میں جانے کیلئے بنی ہوئی تھی۔ پیچھے ایک چھوٹا سا احاطہ تھا چونکہ مزار ایک بلند ٹیلے پر بنا ہوا تھا، اس لئے احاطے کے بعد ڈھلان پھیلے ہوئے تھے۔ اس سمت بلندی تک آنے کیلئے سیڑھیاں نہیں بنائی گئی تھیں تاکہ لوگ اس طرف سے نہ آ سکیں۔ احاطے میں کوئی دروازہ بھی نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر اُچھل کر احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا۔ پلک جھپکتے وہ دُوسری طرف ڈھلان میں کود گیا۔ میں جس جگہ تک پہنچا تھا۔ وہیں سے احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے میں نے اسے ڈھلان میں لڑھکتے ہوئے دیکھا۔ بدحواسی کے عالم میں نیچے کودتے ہوئے وہ اپنا توازن نہیں قائم رکھ سکا تھا اور بری طرح گرا تھا۔ لیکن میں نے اس کی طرح بدحواسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مناسب جگہ دیکھ کر نیچے کودا اور تیزی سے اس کے عقب میں اُترنے لگا۔ دوسرے لوگوں کو اس بھاگ دوڑ کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں قدم جما کر نیچے اُترتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ دامن میں پہنچ گیا۔ وہ جس طرح گرا تھا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بری طرح زخمی ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ ٹیلے کے دامن میں پہنچ کر وہ ساکت ہو گیا مگر میں نے اس پر توجہ دینے کے بجائے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور اس سے کچھ فاصلے پر وہی منحوس گڈا پڑا ہوا تھا۔ وہی گڈا جو میری تباہی کا باعث بنا تھا۔ بھوریا چرن کا وہ ناپاک پتلا جسے وہ مزار مقدس پر پہنچانا چاہتا تھا۔ ناقابل شکست سفلی قوتوں کے حصول کے لئے۔ خدا کا احسان تھا کہ اسے ایک بار پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے شدت غضب سے دانت بھینچ کر اس پتلے کی طرف دیکھا۔ میں اس کے ناپاک وجود کو فنا کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ میرے ارادے سے واقف ہو گیا۔ دوسرے لمحے اس ننھے سے پتلے نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا

دی۔ وہ بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا مگر میں بھی کسی گھوڑی کی رفتار سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے جھک کر ایک پتھر اُٹھایا اور نشانہ لے کر اس پر دے مارا، نشانہ ٹھیک لگا اور وہ اُچھل کر گرا۔
لیکن نیچے گرتے ہی وہ بری طرح لوٹنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ اس کے شدید چوٹ لگی ہے لیکن لوٹتے لوٹتے اس کا جسم گھٹنے لگا اور چشم زدن میں اس نے پیلے رنگ کی ایک بدشکل مکڑی کا رُوپ دھار لیا اور پھر تیزی سے رینگتا ہوا وہ قریب کی چٹان کے ایک ننھے سے سوراخ میں داخل ہوگیا تب میں اس کی شیطنیت سمجھا۔ میں سوراخ کے قریب پہنچ گیا۔ نیچے جھک کر میں نے سوراخ میں اُنگلی داخل کر دی مگر سوراخ بہت گہرا تھا۔ مجھ پر دیوانگی طاری تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کچھ فاصلے پر پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اُٹھا کر میں اس سوراخ میں مارنے لگا۔ میں ہر قیمت پر اسے باہر نکالنا چاہتا تھا مگر اس پتھر کی ضربیں چٹان پر اثرانداز نہ ہوسکیں اور میرے ہاتھ میں دبا پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس ناکامی پر مجھے شدید جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ آہ کاش کچھ ہوسکتا۔ کیا کروں۔ اس سوراخ کے قریب آگ جلا دوں مگر کیسے، کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر اتنا ضرور کیا میں نے کہ ٹوٹے پتھروں کے ٹکڑے سوراخ کے منہ پر رکھ کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔
آس پاس کوئی نہیں تھا۔ کسی نے اس بھاگ دوڑ پر توجہ نہیں دی تھی۔ کوئی سمجھ ہی نہیں پایا ہوگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں سوراخ کو گھورتا رہا۔ بھوریا چرن کو باہر نکالنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور پھر کمبخت پراسرار شیطانی علوم کا ماہر ہے، نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا ہوگا۔ وہ تو صرف میری پہنچ سے نکلنے کیلئے اس نے سوراخ کی پناہ حاصل کی تھی ورنہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا۔ پھر مجھے اس شخص کا خیال آیا جسے اس نے اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ زخمی ہوگیا تھا۔ پلٹ کر نگاہ دوڑائی تو اسے وہیں ساکت پایا۔ میں پلٹ کر اس کی طرف چل پڑا اور چند لمحات کے بعد اس کے قریب پہنچ گیا۔
میں نے وہاں بیٹھ کر اس کے زخموں کو دیکھا۔ نیچے گرنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے بدن چھل گیا تھا۔ کپڑے خون میں ڈوب گئے تھے۔ سر میں بھی چوٹ لگی تھی اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ اپنے لباس سے کچھ پٹیاں پھاڑ کر میں نے اس کے زخموں پر باندھیں۔ ابھی اس کام سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ اُوپر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ شاید کسی نے ادھر دیکھ لیا تھا۔ چند افراد سنبھل سنبھل کر نیچے اُترنے لگے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوگیا؟'' بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

''گر پڑا ہے۔''

''کیسے؟''

''غلطی سے اس طرف آ گیا تھا......!'' میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

''ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں کیا؟''

''پتہ نہیں۔''

''ہٹو...... میں دیکھتا ہوں۔'' ایک شخص نے کہا اور لڑکے کے قریب بیٹھ کر اس کا بدن ٹٹولنے لگا۔ اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں لڑکے کے بدن کو ٹٹول رہے تھے۔ پھر وہ بولا۔

''نہیں ہڈی نہیں ٹوٹی۔''

''تمہارا کون ہے یہ......؟''

''بھائی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ادھر آ کیسے گیا تھا......؟''

''دماغی توازن خراب ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ اور بہت سے انسانوں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ مذہب کے رشتے سے میرا بھائی تھا اور اسی مشکل کا شکار ہوا تھا جس سے میں عرصہ دراز سے گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھوریا چرن کے طلسم کا شکار تھا اور اس کا ذہن اس کے قبضے میں نہیں تھا۔

سب ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ بے ہوش نوجوان کو اُٹھایا گیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر وہاں سے دُور مزار شریف کے سامنے والے حصے میں لے آیا گیا، اس کے تمام زخم دیکھ کر ان پر پٹیاں کی گئیں جس شخص نے اس کی ہڈیاں دیکھی تھیں وہ ہڈیوں کا علاج کرنے والا ایک پہلوان تھا۔ اس نے اپنے طور پر نوجوان کی دیکھ بھال کی اور دوائیں اور پتے وغیرہ اس کے زخموں پر کس دیئے۔ اسی اثنا وہ ہوش میں آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے انداز میں وحشت اُبھری لیکن میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی اور شفقت سے کہا۔

''آرام سے لیٹے رہو۔ تمہارے چوٹیں لگی ہیں۔ شاباش، کوئی فکر مت کرو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ میرے بھائی کو تنہا چھوڑ دیں ان کی مہربانیوں کا شکریہ۔ ایک ایک کر کے لوگ چلے گئے اور میں نوجوان کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔ آیا اس وقت بھی بھوریا چرن کے سحر کا شکار ہے یا آزاد ہے۔ اس کا جسم مسلسل کپکپا رہا تھا۔ ''سردی لگ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ ''کچھ کھاؤ گے۔'' میں نے پھر سوال کیا۔

''مار دو...... مار دو۔'' تم ہی مجھے مار دو...... خدا کیلئے...... خدا کے لیے مجھے اس اذیت سے نجات دلا دو۔ خدا کے لیے، خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو...... مجھے مار دو مجھے ہلاک کر دو۔'' تمہارا بھلا ہوگا۔ ثواب ہوگا تمہیں۔ مجھے مار دو۔'' وہ کپکپاتی آواز میں ہولے ہولے رو رہا تھا۔ حد سے زیادہ سہمے ہوئے انسان کی مانند جسے کسی سے ہمدردی کی توقع نہ ہو، جسے کہیں سے زندگی کی اُمید نہ ہو۔

میں محبت بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے نرم اور شفیق لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں یاد ہے کہ اس رات تم نے خنجر سے حملہ کر کے مجھے شدید زخمی کر دیا تھا تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ان دونوں حملوں کیلئے میں نے خلوص دل سے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں تم سے کوئی بدلہ نہیں لوں گا۔ مکمل اطمینان رکھو۔ دُوسری بات یہ کہ کسی کی زندگی لینے سے کبھی ثواب نہیں ملے گا۔ کیا تم مسلمان ہو؟''

''ہاں، ہاں میں ایک مسلمان کا بیٹا ہوں مگر، مگر......'' وہ رُک کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''کلمۂ طیبہ یاد ہے؟''

وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے سردی سے بخار چڑھ رہا ہو لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ بے شمار ننھی ننھی سُرخ چنگاریاں ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ زمین پر رینگتی اس سمت بڑھ رہی تھیں۔ میرے منہ سے حیران سے لہجے میں نکلا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''پیلے رنگ کی زہریلی مکڑیاں۔ یہ...... یہ سب میرے پورے بدن سے چمٹ جائیں گی، اور...... اور میرے آہ...... سوئیاں۔ میرا گلا بند ہو جاتا ہے۔ آواز...... آواز نہیں نکلتی۔ یہ میرا خون پیتی ہیں۔ آہ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دیکھ لو۔ بس اب......'' وہ نڈھال ہونے لگا۔

بے اختیار میرے منہ سے درود شریف جاری ہو گیا۔ صرف تین بار درود شریف پڑھ کر میں نے اُنگلی سے زمین پر ایک وسیع دائرہ بنا دیا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ان مکڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اب وہ تمہارے قریب نہیں آئیں گی۔'' میں نے پُریقین آواز میں کہا۔

''کوئی نہیں۔ کوئی نہیں روک سکتا انہیں۔ وہ...... آہ دیکھو وہ آ گئیں۔''

''وہ آگے نہیں آئیں گی اکرام۔ جہاں تک وہ پہنچی ہیں وہاں سے آگے نہیں آئیں گی۔ دیکھ لو وہ میرے بنائے ہوئے حصار کو عبور نہیں کر پا رہیں۔ دیکھا......!'' مکڑیاں رُک گئی تھیں وہ ایک دائرے کی شکل میں پھیل گئی تھیں اور حصار کی لکیر کو واقعی عبور نہیں کر رہی تھیں حالانکہ ان میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ اندر گھس آنے کے لیے بے چین تھیں۔

''یہ تو واقعی رُک گئیں۔'' اکرام کے منہ سے نکلا۔ ''اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''تمہیں ان کا حشر دکھاؤں۔'' میں نے بے خیالی کے عالم میں کہا۔ پھر میرے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور

میرے ہونٹوں سے ہوا خارج ہونے لگی۔ حالانکہ ہونٹوں سے خارج ہونے والی ہوا تھی ہی کتنی لیکن جہاں ہوا لگی تھی وہاں کی مکڑیاں روئی کے گالوں کی طرح اُڑ گئی تھیں۔ میں نے رُخ بدل کر پھونک ماری اور مکڑیوں کی صفیں اُکھڑ گئیں۔ باقی مکڑیاں سہم کر بھاگنے لگیں اور میں ان پر پھونکیں مارتا رہا۔ پھر وہاں کسی مکڑی کا نشان بھی نہیں رہ گیا تھا اور اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا خیال آیا۔ بہت انوکھا خیال۔ مکڑیوں کو دیکھ کر حصار بنانے کا خیال میرے دل میں نہیں آیا تھا بلکہ اچانک ہی سوچے سمجھے بغیر میرے ہونٹوں سے درود پاک جاری ہو گیا تھا۔ اس میں میری کسی سوچی سمجھی کوشش کا دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے پھونکیں مار کر ان مکڑیوں کو اُڑا دیا تھا۔ ایسا بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ یہ خود بخود ہوا تھا اور اس سے ایک نتیجہ اخذ ہو رہا تھا۔ میری رہنمائی ہو رہی تھی خدا کے فضل سے۔ مجھے جو کرنا ہوتا تھا وہ مجھ سے خود بخود سرزد ہو جاتا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں زخمی ہونے کے بعد خود پر حملہ کرنے والے کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرتا اور ممکن تھا کہ مجھے اس کے بارے میں معلوم بھی ہو جاتا لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں تھی، میری اپنی ذات کا معاملہ تھا۔ جب وقت آیا تو سب کچھ منکشف ہو گیا۔ آہ یہ تو بڑا احسان ہے اس ذات باری کا۔ دل کو خوشی ہوئی تھی۔

''مسعود بھائی۔'' اکرام کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ پھر خوف زدہ ہو گیا۔

''کہو......!'' میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

''آپ نے۔ آپ نے خود مجھے اجازت دی تھی۔''

''کیسی اجازت؟''

''آپ نے کہا تھا کہ...... کہ میں آپ کے چھوٹے بھائی کی مانند ہوں۔ اس لیے میرے منہ سے مسعود بھائی نکل گیا۔'' وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

''تو پھر......؟'' میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ میرے مسعود بھائی کہنے سے ناراض ہوئے ہیں نا......!''

''پاگل ہو تم......؟'' میں مسکرا کر بولا۔

''آپ ناراض نہیں ہوئے؟''

''یہ ناراض ہونے کی بات ہے بھلا۔''

''آپ نے میری مجبوری پر یقین کر لیا۔'' وہ کسی قدر خوش نظر آنے لگا۔

''ہاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ میرا رویہ مختلف ہوتا۔''

''خدا کی قسم مسعود بھائی، خدا کی قسم، میں ایک شیطان کے زیر اثر تھا۔ میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن...... لیکن......'' وہ سسکی لے کر بولا۔

''میں جانتا ہوں اکرام مجھے معلوم ہے۔''

''میں نے اسے پہلی بار ناکام دیکھا ہے۔ یہ شیطان مکڑیاں میری آنکھوں کے سامنے کئی زندہ انسانوں کو پلک جھپکتے ہڈیوں کا پنجر بنا چکی ہیں۔ یہ اس کے اشارے پر عمل کرتی ہیں۔ اگر وہ انہیں حکم دیتا ہے کہ انسانی گوشت کھا جاؤ تو یہ مکڑیاں اسے نوچ نوچ کر کھا جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کا خون پی لو تو...... آہ...... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مسعود بھائی۔ انسانی جسم میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہتا اور یہ پہلی سے سُرخ ہو جاتی ہیں۔ ان کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ یہ خون پی کر پھول جاتی ہیں۔ میں اس سے ذرا بھی انحراف کرتا تھا تو یہ مکڑیاں میرے بدن میں اپنے ڈنک چبھوتی تھیں اور...... آہ...... آہ۔'' وہ کراہنے لگا۔

''اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے دیکھ لیا ہے۔ مجھے اپنی پناہ میں لے لیں مسعود بھائی۔ آپ اللہ والے ہیں خدا کے لیے مجھے اپنی پناہ میں

لے لیں۔" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔
"نہیں بھائی۔ بُری بات ہے توبہ کرو۔ اللہ کے سوا کسی سے پناہ نہ مانگو۔ کسی میں کسی کو پناہ دینے کی قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے۔"
"میں تھک گیا ہوں۔ آہ میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔"
"اپنے دل سے اس کا خوف بالکل نکال دو۔ اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ آؤ یہاں سے چلتے ہیں، آؤ۔" میں نے اسے دلاسہ دیا اور پھر اسے ساتھ لے کر مزار سے بہت دُور نکل آیا۔ اتفاق سے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں گنگا دھر جی کی چھولداری لگی ہوئی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی صرف چند نشان نظر آ رہے تھے۔ میرے قدم وہیں رُک گئے اور پھر میں وہیں بیٹھ گیا۔ میں نے اکرام کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اب میں کیا کروں مسعود بھائی......؟"
"یہیں آرام کرو......!"
"آپ، آپ اب سو جائیں گے اور اگر وہ آ گیا تو......تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا!"
"میں تمہارے گرد حصار بنائے دیتا ہوں۔ انشاء اللہ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ نماز آتی ہے تمہیں؟"
"ہاں۔"
"نماز پڑھا کرو۔ ہر بلا تم سے دُور رہے گی۔ ٹھہرو پہلے میں تمہارے گرد حصار بنا دوں۔ میں نے درود پاک کا تحفظ اپنے اور اس کے لیے حاصل کیا اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ حصار میں بیٹھ گیا۔ مجھے خوش دلی سے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گے اکرام احمد......؟"
"آپ حکم دیں گے تو ضرور بتاؤں گا۔"
"حکم نہیں۔ اگر تمہارا دل چاہے تو...... ورنہ کوئی مجبوری نہیں ہے۔"
"میرا دل چاہتا ہے۔ کیونکہ، کیونکہ میں نے اس کے طلسم میں گرفتار ہو کر دو بار آپ کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔"
"میں نے تمہیں بے گناہ قرار دیا ہے۔"
"شکریہ مسعود بھائی۔ آپ نے مجھ پر اعتبار کر لیا ورنہ آپ کی جگہ اور کوئی ہوتا تو نہ جانے میرا کیا حال کرتا۔ اپنا نام بتا چکا ہوں۔ میں نے اور میری بہن نے بچپن ہی سے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ بڑی انوکھی کہانی ہے میری۔ میں بستی جونا پوری کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد نظام احمد مرحوم ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ اپنے اُصولوں میں بہت سخت تھے وہ۔ پھر گھر والوں کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ ہولی کے موقع پر کسی ہندو نے ان پر رنگ پھینک دیا۔ انہوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ والد صاحب گرفتار ہو گئے اور انہیں موت کی سزا ہوئی۔ ان کی موت کے بعد ہم بے سہارا ہو گئے۔ ہمارے جینے کا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ ماں، والد صاحب کی گرفتاری کے بعد سے ہی بیمار رہنے لگی تھیں۔ فاقہ کشی اور بے کسی کی زندگی گزرنے لگی اور ہم بستی کے ہندوؤں کی نفرت کا الگ شکار تھے۔ رشتے کے ایک ماموں بھٹنڈہ میں رہتے تھے مجبور ہو کر ہم بھرسنڈہ چلے گئے۔"
"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ بھٹنڈہ کے نام کے ساتھ مجھے مہاوتی یاد آ گئی تھی مگر پھر یہ بھی یاد آ گیا کہ عالم استغراق میں اس نوجوان کو میں نے مہاوتی کی قید میں دیکھا تھا۔
"بھٹنڈہ......" اس نے جواب دیا۔
"ہوں۔ پھر؟"
"ماموں خود غریب آدمی تھے بال بچوں والے تھے۔ ہمارے ساتھ مہربانی سے پیش آئے مگر ہمارے لیے کچھ کر نہ سکے۔ ماں کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ماموں بھی مر گئے اور میں محنت مزدوری کر کے اپنی بہن کا پیٹ بھرنے لگا۔ بھرسنڈہ ماموں کی وجہ سے آیا تھا۔ نہ وہ رہے نہ ماں رہی، چنانچہ میں بہن کو لے کر جونا پوری واپس آ گیا۔ یہاں زندگی کچھ بہتر گزرنے لگی مگر بہن کا خیال دل میں چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ وہ اب میری ذمے داری تھی اور اس کے مستقبل کے لیے میں پریشان

رہتا تھا مگر کچھ نہیں بن پا رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا مگر میرے حالات خراب تر ہوتے گئے۔ جہاں نوکری کرتا تھا، وہاں کچھ دوست بن گئے تھے۔ یہ جوا اور سٹہ کھیلتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی سٹہ کھیلنے کی لت لگا دی اور میں باقاعدہ سٹہ کھیلنے لگا۔ کبھی تھوڑا بہت جیت بھی جاتا تھا مگر اس طرح کہ بعد میں سب برابر ہو جاتا تھا۔ دیوان لال میرا دوست تھا، وہ سٹے کا نمبر معلوم کرنے کے لیے جنتر منتر کرتا رہتا تھا۔ جوگیوں، سنیاسیوں اور سادھو سنتوں کے پھیر میں پڑا رہتا تھا۔ ایک دن شمشان گھاٹ پر ایک سادھو دھونی رمائے نظر آ گیا۔ بڑا بدشکل آدمی تھا۔ دیوان لال وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

سادھو مہاراج کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک نئی جلی ہوئی چتا موجود تھی۔ جس میں بہت سی انسانی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں، سادھو مہاراج کچھ دیر تک منتر پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے بند مٹھی کھولی اور چتا کی طرف ہاتھ اُٹھا دیا۔ ہم نے دیکھا کہ جلا ہوا مردہ جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں، ہڈیاں سمیٹ کر اُٹھنے لگا اور پھر چتا سے نکل کر سادھو مہاراج کے سامنے پہنچ گیا۔ دیوان لال تو دہشت سے چیخ مار کر بھاگ گیا تھا لیکن میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور وہیں بیٹھا تھر تھر کانپنے لگا لیکن دیوان لال کی چیخ پر سادھو مہاراج چونک پڑے اور انہوں نے بھاگتے ہوئے دیوان لال کو دیکھا۔ پھر ان کی نظریں مجھ پر آ کر ٹک گئیں۔ ان کی آنکھوں میں شدید غصے کے آثار تھے اور وہ بری طرح سُرخ ہو رہی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں کا غصہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور ان کے چہرے پر حیرت کے آثار بکھر گئے ہیں۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے سیدھا ہاتھ اُٹھا کر سامنے کھڑے ہوئے مؤدب مردے کو اشارہ کیا اور بولے۔ ''جا، بھاگ جا، بھاگ جا۔'' اور مردہ خاموشی سے واپس جا کر اپنی چتا میں لیٹ گیا۔ سادھو مہاراج دلچسپی کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''کیا بات ہے بالکا، کیسے آ بیٹھا میرے پاس اور کون تھا وہ کم ولا جو بھاگ گیا.....'' میرے منہ سے خوف کے مارے آواز نہیں نکل پا رہی تھی، بمشکل تمام میں نے ہاتھ اُٹھائے اور انہیں جوڑ کر عاجزی سے بولا۔

''معافی چاہتا ہوں سادھو مہاراج معافی چاہتا ہوں۔ وہ کم بخت دیوان لال مجھے اپنے ساتھ لے آیا تھا ورنہ...... ورنہ میں آپ کو پریشان نہ کرتا.....''

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ سٹے کا نمبر معلوم کرنے آیا ہے نا......؟''

''جی جی...... جی مہاراج''

''دولت کمانا چاہتا ہے ایں...... دولت کمانا چاہتا ہے۔'' سادھو مہاراج ہنستے ہوئے بولے۔ میری ہمت بندھ گئی، وہ مجھ سے مہربانی سے پیش آ رہے تھے، میں نے گردن جھکا کر کہا......

''بہت غریب آدمی ہوں مہاراج۔ اگر آپ مہربانی کر دیں تو میری مشکل دُور ہو سکتی ہے۔''

''مشکل تو ہماری بھی دُور ہو سکتی ہے بالک، چل ٹھیک ہے نام کیا ہے تیرا......؟''

''اکرام احمد۔'' میں نے جواب دیا اور سادھو مہاراج کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بڑی مکروہ اور خوفناک ہنسی تھی ان کی، مجھے بے حد ڈر لگا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ہو سکتا ہے دیوان لال کی تقدیر میں دولت نہ ہو اور میرا کام بن جائے، ایسے لاتعداد واقعات سنے تھے میں نے۔ اور اس وقت سادھو مہاراج کی نرمی یہی بتا رہی تھی کہ میرا کام بننے والا ہے۔ ان کی ہنسی کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ انہوں نے کہا۔

''سات اور نو کھیل لے، جا سات اور نو کھیل لے، اور یہ لے پیسے، تیرے پاس تو بہت تھوڑے پیسے ہوں گے۔ یہ سارے پیسے سات اور نو پر لگا دے، جا چل بھاگ جا۔ یاد رکھنا ہمیں، یاد رکھنا......''

میں نے اپنے دل میں بے پناہ خوشی محسوس کی، سادھو مہاراج نے مجھے مٹھی بھر کے چاندی کے روپے دیئے تھے، جنہیں میں نے بڑی عقیدت سے قبول کر لیا تھا۔ اتنے روپے سچی بات یہ ہے کہ سالہا سال سے نہیں دیکھے تھے میں نے، سٹے کا نمبر نہ

بھی لگاتا تو یہ روپے ہی میرے لیے بہت دن تک کام دے سکتے تھے۔ وہاں سے پلٹا، خوشی سے قدم بوجھل ہو رہے تھے، بنواری لال کی دُکان پہ آ کر میں نے سات اور نو کے نمبر لگا دیئے، سارے روپے لگا دیئے اور وہ بھی جو اپنے پاس موجود تھے۔ اس خیال کے تحت کہ شاید میرا کام بن ہی جائے۔

✦✤✦✤✦

اور یہی ہوا۔ نمبر نکلا اور اتنی دولت مل گئی مجھے کہ میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں گھر میں داخل ہوا۔ بہن کے سامنے دولت کے انبار لگا دیئے تو اس پر بھی نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے کہا۔

''بھیا! کہاں سے آئے یہ پیسے؟...... خدا کیلئے سچ بتاؤ۔ کہیں...... کہیں کوئی غلط کام تو نہیں کیا؟''

''پاگل ہے تو...... بس یہ سمجھ لے ہمارے دلدر دور ہوگئے۔ تو بھی عیش کرے گی۔ اور اب دیکھنا کہ میں بھی کیا کرتا ہوں۔''

کھانے پینے کا سامان لایا۔ مجھے وہ شام یاد ہے مسعود بھائی! میری بہن بہت خوش تھی۔ میں بھی بے پناہ خوش تھا۔ ہم نے پیسے زمین میں ایک ہنڈیا میں رکھ کر دفن کر دیئے۔ بس اتنے نکال لئے کہ ہمارا کام چلتا رہے۔ تھوڑے سے پیسے میں نے دیوان لال کیلئے بھی نکال لئے تھے اور دوسرے دن دیوان لال میرے پاس آ گیا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں سٹے میں بہت بڑی رقم جیتا ہوں۔ وہ افسوس کرنے لگا کہ وہ ڈر کر کیوں بھاگ آیا۔ بہرحال اچھا آدمی تھا۔ کوئی خاص بات نہ کی اس نے بلکہ پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا' جو میں نے اس کیلئے نکالے تھے۔ لیکن میں نے اپنے دوست کو محروم نہیں رکھا اور اس کو مجبور کر دیا۔

دوسرا اور تیسرا دن گزر گیا۔ سٹے کا نمبر ایک بار لگ گیا تھا اور میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ خدا کرے سادھو مہاراج پھر سے مل جائیں۔ وہاں پہنچا جہاں سادھو مہاراج کو دیکھا تھا لیکن شمشان گھاٹ کے پاس وہ جگہ خالی پڑی ہوئی تھی' البتہ دیوان لال مجھے وہاں مل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھسیانی سی ہنسی ہنس کر خاموش ہوگیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ سادھو مہاراج کی تلاش میں آیا ہے۔ لیکن اب وہ موجود نہیں تھے۔

رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ سردیوں کی راتوں میں ساڑھے آٹھ بجے کا مقصد یہ ہے کہ رات آدھی کے قریب ہوگئی۔ بستی سنسان پڑی تھی کہ کسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی...... میں نے دروازہ کھولا اور سادھو مہاراج کو دیکھ کر حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ مسکرا دیئے اور بولے۔

''اندر آنے کو نہیں کہے گا بالک؟''

''آپ...... آیئے...... آیئے سادھو مہاراج! آیئے' آیئے...... مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میرے اس غریب خانے پر بھی تشریف لے آئیں گے۔''

سادھو مہاراج اندر آ گئے۔ دالان سے گزر کر انہوں نے کوٹھے کے [illegible] پر قدم رکھا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ یوں لگا جیسے ان کے بدن کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو...... ایک لمحے کیلئے ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔

''آ...... باہر آ' تجھ سے بات کرنی ہے۔''

''آپ اندر آ جایئے مہاراج! آپ کا گھر ہے۔ آ جایئے اندر۔''

مگر مہاراج اندر آنے کے بجائے گھر کے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔ کافی دور پہنچ کر وہ ایک پلیا پر بیٹھ گئے' پھر مجھے دیکھ کر بولے۔

''نمبر لگا تھا؟''

''ہاں مہاراج!...... آپ کی مہربانی سے میرے دن پھر گئے۔''

''ہونہہ......دن پھر گئے......تو انہیں دن پھرنا کہتا ہے؟...... چار پیسوں میں کہیں دن پھرتے ہیں؟'' سادھو مہاراج نے کہا۔

''ہم بہت غریب لوگ ہیں مہاراج! ہمارے لئے تو یہ پیسے بڑا خزانہ ہیں۔''

''ماتا پتا مر چکے ہیں تیرے؟''

''ہاں مہاراج!''

''اور کون ہے گھر میں؟''

''بس ایک بہن ہے۔''

''ہوں...... بہت محبت کرتا ہوگا تو اس سے؟''

''جی سادھو جی!...... دنیا میں اب میرا اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ آپ اندر آیئے' بیٹھئے۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

''نہیں...... وہاں تیری عبادت کی کتاب رکھی ہے۔ دھرم کتاب۔ تیرے پتا کیا کرتے تھے؟''

''مسجد میں پیش امام تھے۔''

''چل چھوڑ' ایک بات بتا۔''

''جی مہاراج!''

''جنتر منتر سے لگاؤ ہے تجھے؟......کوئی چلہ کھینچے گا؟...... کچھ سکھاؤں تو سیکھے گا؟...... یہ بھاگ ہیں تیرے کہ ہم تجھے کچھ سکھانا چاہتے ہیں ورنہ ہزاروں ہمارے پیچھے ہاتھ باندھے پھرتے ہیں۔''

''چلے سے کیا ہوگا سادھو مہاراج؟''

''پھر تجھے کسی سے سٹے کا نمبر نہیں پوچھنا پڑے گا...... لکشمی تیری داسی ہوگی۔ جدھر انگلی اٹھاوے گا' سونے کے انبار لگ جائیں گے۔ راج رانی ہوگی تیری بہن۔ جیون سوارت ہوجائے گا تیرا۔ اس کے بدلے میں تجھے ہمارے کچھ کام کرنے ہوں گے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بعد میں بتا دیں گے تجھے۔''

''میں منتر سیکھنا چاہتا ہوں مہاراج!''

''ہاتھ دے ہمارے ہاتھ میں۔'' سادھو نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ بولا۔

''بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو نے...... نبھا سکے گا؟''

''کیوں نہیں مہاراج!''

''بیچ سے تو نہیں بھاگے گا؟''

''نہیں۔''

''پھر یوں کرنا' کل شمشان گھاٹ آجانا۔ دن کے بارہ بجے سے کچھ پہلے۔ ٹھیک بارہ بجے ہم تجھ سے وچن لیں گے اور سن! اپنی بہن سے کہہ کر آنا کہ کچھ دنوں کیلئے کہیں جارہا ہے۔ کوئی چالیس دن لگ جائیں گے واپسی میں۔''

''چالیس دن......؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''پورے چالیس دن۔''

''مگر میری بہن اکیلی رہے گی؟''

''سو تو ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا' یہ سوچ بھی نہیں سکتا تو...... جتنی چاہے گا دولت حاصل کرلے گا۔ جس طرف نظر اٹھاوے گا لوگ نظریں جھکا دیں گے تیرے سامنے۔ تیرا بڑا مقام ہوگا۔ غریبوں کو امیر اور امیروں کو پلک جھپکتے میں غریب بنا

دے گا تو...... کوئی دم نہ مارے گا تیرے سامنے۔ بہن کو اپنی پسند سے جہاں چاہنا بیاہنا۔ بول' کیا کہتا ہے؟''
میری آنکھوں میں نہ جانے کیا کیا خواب سا گئے تھے۔ میں نے جلدی سے کہا۔''میں تیار ہوں۔''
''کل تک اور سوچ لینا۔''
''میں نے سوچ لیا ہے۔''
''وچن دینا پڑے گا تجھے...... سوگند کھانی پڑے گی اور جب سوگند کھائے گا تو اسے نبھانا پڑے گا۔ نہیں نبھائے گا تو مصیبتوں میں پھنس جائے گا' پھر چھٹکارا مشکل ہوگا۔''
''میں تیار ہوں مہاراج!''
''کل بارہ بجے آجانا۔''
''آجاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور سادھو ایک دم واپسی کیلئے مڑ گیا۔ میں نے اس کے پیچھے قدم اٹھانے چاہے مگر ہل بھی نہیں سکا۔ میرے قدم جم گئے تھے' پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میرے پاؤں کھل گئے۔ مجھے بڑا خوف محسوس ہوا تھا' مگر میں نے خود کو سنبھال لیا اور گھر کے اندر آگیا۔ بہن کو میں نے اصل صورتحال نہیں بتائی تھی اور سادھو مہاراج کے بارے میں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ دیوان لال کے رشتے دار تھے اور میری نوکری کیلئے آئے تھے۔
''نوکری کیلئے؟'' میری بہن نے پوچھا۔
''ہاں...... دیوان لال کے کہنے پر انہوں نے میرے لئے ایک بڑی اچھی نوکری تلاش کی ہے۔''
''سچ بھیا؟...... یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔''
''ہاں...... کل مجھے جانا ہوگا۔ بستی کے باہر۔ شاید چندوسی۔ واپسی میں مہینہ سوا مہینہ لگ جائے گا۔''
''اور میں اکیلی رہوں گی کیا؟''
''شمشاد چچا سے کہہ جاؤں گا۔ حسینہ چچی تیری خبر رکھیں گی۔ پیسے تیرے پاس موجود ہیں۔ کسی کو ہوا تک لگنے نہ دینا۔ آرام سے نکال نکال کر خرچ کرتی رہنا۔ سوا مہینے کے بعد میں واپس آجاؤں گا اور اگر نوکری اچھی ہوئی تو تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔''
میری معصوم بہن تیار ہوگئی۔ شمشاد چچا اور حسینہ چچی ہمارے ساتھ والے پڑوسی تھے اور بڑے ہمدرد لوگ تھے۔ ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو بھی یہی کہانی سنائی اور اس طرح اپنی بہن کیلئے بندوبست کر دیا۔ ساری رات خوشی کے مارے نیند نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا میں مسعود بھیا! خوبصورت کوٹھیاں' شاندار کاریں اور نہ جانے کیا کیا۔
دوسرے دن اسی طرح تیاریاں کیں جیسے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ بارہ بجے سے پہلے شمشاد گھاٹ پہنچ گیا' مگر وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ نئی چتا بنائی گئی تھی اور کسی مردے کی ارتھی لائی جا رہی تھی۔ میں وہاں سے دور ہٹ گیا اور ایک سنسان گوشے میں جا بیٹھا۔ ٹھیک بارہ بجے اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی اور میں نے سادھو کو وہاں کھڑے پایا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔
''آگیا بالک؟''
''ہاں مہاراج!''
''ادھر تو مردہ جلایا جا رہا ہے۔''
''ہاں...... میں تو پریشان ہوگیا تھا۔''
''کیوں؟''
''سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کی وجہ سے آپ یہاں نہ آئیں۔''
جواب میں سادھو نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''تماشا دیکھے گا؟''

''تماشا.....؟''

''ہاں..... میری شکتی کا تماشا۔ شاید تو مجھے کوئی معمولی جوگی یا سنیاسی سمجھتا ہے۔ باؤلے! میں شنکھا ہوں۔ پدم شنکھا۔ بھوریا چرن ہے میرا نام۔ کالے جادو کے سنسار کا سب سے بڑا نام ہے یہ۔ دیکھ' تجھے تماشا دکھاتا ہوں۔ ادھر دیکھ۔'' اس نے مجھے ان لوگوں کی طرف متوجہ کیا جو چتا کے قریب تیاریوں میں مصروف تھے۔ ارتھی چتا کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ پنڈت اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اچانک ارتھی پر پڑے ہوئے مردے نے ایک چنگھاڑ ماری اور آس پاس کھڑے لوگ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ یہاں سے مردہ صاف نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کے بدن میں جنبش محسوس ہو رہی تھی' پھر اس نے اپنے بدن پر چمٹے ہوئے کپڑے کے بند توڑ دیئے اور دوسری چنگھاڑ مار کر کپڑے اتار کر پھینکے۔ قریب کھڑے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چیختے چلاتے ایک دوسرے کو پھلانگتے جدھر منہ اٹھا' دوڑ پڑے۔ وہ اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے کہ بتا نہیں سکتا۔ مردہ ارتھی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ آن کی آن میں لوگوں کا صفایا ہو گیا۔ اب وہاں چڑیا کا بچہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ بس اکیلا مردہ ساکت کھڑا تھا۔ سادھو نے ہنس کر کہا۔

''اب بول.....!'' مگر میں کیا بولتا۔ خوف کے مارے خود میرا بدن پسینہ چھوڑ رہا تھا۔ ''انہیں بھگا دینا کچھ مشکل ہوا ہمارے لئے؟''

''نن..... نہیں مہاراج!..... مگر وہ مردہ..... کیا وہ زندہ ہے؟''

''بالکل نہیں۔''

''پھر.....؟''

''ہماری شکتی سے کھڑا ہے..... اس کے اندر ہمارا بیر گھس گیا ہے۔ اس نے سب کو ڈرا کر بھگا دیا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''اسے چتا میں پہنچائے دیتے ہیں۔ اس بے چارے کی چتا چھیننے سے کیا فائدہ؟'' وہ بولا۔ میری نظریں اس طرف تھیں' اچانک میں نے مردے کے بدن میں جنبش دیکھی۔ وہ جھکا اور اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹنے لگا۔ پھر اس نے خود ہی انہیں اپنے بدن پر لپیٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا چتا میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ چتا پر لیٹ گیا۔ پھر اچانک سادھو کے منہ سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور پرواز کرتا ہوا چتا کی لکڑیوں سے جا ٹکرایا۔ میں نے لکڑیوں کو آگ پکڑتے دیکھا۔ سادھو مسلسل منہ سے شعلے اگل رہا تھا اور میں چتا میں ہر طرف آگ لگتے دیکھ رہا تھا۔ خوف سے میری بری حالت تھی۔ یہ سادھو تو میری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔

اول تو مجھے کالے جادو جیسی کسی چیز سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس قسم کے سٹے کے نمبر بتانے والے سادھو اور سنیاسی تو کبھی کبھی سڑکوں پر بھی مل جاتے ہیں۔ میں اسے ایسا ہی کوئی سادھو سمجھا تھا' لیکن اب جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ ناقابل بیان تھا۔ وہ کافی قوتوں کا مالک تھا اور اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ میں سوچ رہا تھا لیکن جو کچھ اس نے مجھ سے کہا تھا اور جو سبز باغ دکھائے تھے اگر واقعی میری کوششوں سے وہ مجھے حاصل ہو جائیں تو کتنا لطف آجائے گا۔ زندگی کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ اس خیال کے تحت اپنے آپ کو سنبھالا اور چتا کا جائزہ لینے لگا' جس نے مردے کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ سادھو کہنے لگا۔

''اب چھوڑ ان باتوں کو۔ تو نے کہا تھا کہ ان لوگوں کے آجانے کی وجہ سے کہیں ہمارا کام بھنگ نہ ہو جائے۔ سو میں نے تجھے یہ بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری مہان شکتی ہر وہ کام کر سکتی ہے جو میں چاہوں۔ سو بالکا! اب جو کچھ میں تجھے بتا رہا ہوں' وہ کر۔ تاکہ تو میری پناہ میں آجائے۔ تو مسلمان کا بیٹا ہے نا؟''

''ہاں مہاراج!''

''تیرے دھرم نے تجھے کیا دیا؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''بس یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ دین دھرم ڈھکو سلے ہوتے ہیں اور منش بس ان کی لکیر پر چلتا رہ جاتا ہے۔ اصل دھرم کالی شکتی ہے جس سے منش کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ دین دھرم بعد کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ ملے گا' وہ ملے گا۔ مگر کالی شکتی وہ چیز ہے جس سے فوراً ہی من کی منوکامنا پوری ہوجاتی ہے۔ تو بتا' وہ بڑی یا یہ؟''

مسعود بھیا! میری معلومات بہت زیادہ نہیں تھیں۔ کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا ایسی معلومات سے۔ یہ بات اس وقت میرے ذہن میں نہیں آئی کہ شیطان اسی طرح تو بہکاتا ہے۔ اسی طرح تو وہ انسان کو مذہب سے منحرف کرتا ہے۔ یہی تو شیطنت ہے۔ انسان اس سے بچ جائے تو انسان رہتا ہے ورنہ شیطان بن جاتا ہے اور اس وقت میں ایک شیطان کے قبضے میں تھا۔ مکمل طور پر۔ اس کی باتیں میرے دل میں تو نہیں اتر رہی تھیں لیکن میں سوچ ضرور رہا تھا ان باتوں پر۔ اس نے کہا۔

''بیٹھ جا...... جیسے ہم بیٹھے ہیں' ویسے بیٹھ جا۔ اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔''

سورج آسمان کے بیچوں بیچ اٹکا ہوا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سادھو کو پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ غالباً اس انداز سے بیٹھنے کو آسن رمانا کہتے ہیں۔ اس نے آسن رمایا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے' گردن سیدھی کی' سینہ تانا اور مجھ سے بھی ایسے ہی بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ بڑی مقناطیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں۔ مجھے ان سے شعلے اگلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بدن میں بار بار تھرتھری پھیل جاتی تھی' لیکن میں خود کو سنبھالنے کی کوششوں میں تھا۔ اس نے کہا۔

''بول' سوجے لم۔''

میں نے اپنے منہ سے وہی لفظ ادا کیا' پھر اس نے کچھ اور ایسے ہی الفاظ میرے منہ سے نکلوائے اور اس کے بعد کہنے لگا۔

''سوگند کھا سات سڑی ہوئی لاشوں کی...... سات پورنیوں کی...... راجہ اندر کی...... ادھیرنا مکندی کی کہ آج سے تو میرے چیلوں میں شامل ہوا اور جو کچھ میں کہوں گا اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرے گا۔ منہ سے بول جو میں کہہ رہا ہوں۔''

میں اس کے کہنے کے مطابق دہرانے لگا۔ اس نے تین بار مجھ سے یہ الفاظ کہلوائے اور پھر مسکرا کر بولا۔

''اس طرح تو میرا چیلا بن گیا۔ اب میں تیرے ماتھے پر تلک لگاتا ہوں۔''

اس نے زمین پر تھوکا۔ پیلے پیلے رنگ کا یہ بدبودار تھوک تھا۔ اس نے انگوٹھا ڈبویا اور میرے ماتھے پر لکیر کھینچ دی۔ مجھے اپنی پیشانی جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کوئی جلتی ہوئی چیز میرے ماتھے سے لگا دی ہو۔ وہ مسکرا کر بولا۔

''تو رہے گا تو مسلمانوں کے بھیس میں مگر ہوجائے گا شدھی۔ نہ ہندو' نہ مسلمان۔ کالی شکتی کا پجاری' کالے علم کا خادم۔ تو ہمیشہ بیر چتروں کی سیوا کرے گا' انہی کے کرموں پر چلے گا سمجھا۔ لوگ تجھے مسلمان سمجھیں گے۔ پر تو کچھ اور ہی ہوگا۔ مسلمانوں کی طرح پوجا پاٹ کرے گا۔ نمازیں پڑھے گا۔ دیکھنے والے سمجھیں گے کہ تو مسلمان ہے' مگر تو ہوگا کالی شکتی کا سیوک۔ سمجھا بالک! تو کالی شکتی کا سیوک بن چکا ہے...... اب اپنے آپ پر مان کر۔ بہت سی طاقتیں تیری مٹھی میں آنے والی ہیں۔''

اچانک ہی دل اندر سے الٹنے لگا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا یہ تو مجھے قبول نہیں تھا۔ میرے کانوں میں تو پیدا ہوتے ہی اذان کی آواز پڑی تھی۔ میں نے تو ناہوشی کے عالم میں اللہ کا نام سنا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کی ذات کو دھوکہ دوں۔ نماز کیلئے جائے نماز پر کھڑا ہوں اور میرا دل گندگی میں ڈوبا ہو۔ اندر سے شدید ترین ہلچل ہونے لگی۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میری نگاہیں اس پر گڑ گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری اندر کی کیفیت سے بے خبر اپنی کامیابی پر۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔

''اسی طرح بیٹھ جا...... اسی طرح بیٹھا رہ۔''

''مم...... مگر مہاراج!''

''نہیں بالک! اس سے تک اب تو کچھ نہیں بولے گا جب تک میں تجھے بولنے کو نہ کہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک سمت چلا گیا۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے اور انہیں آہستہ آہستہ نیچے اتارنے لگا۔ پھر میں نے دیکھا کہ زمین پر ایک سفید رنگ کی گائے آکھڑی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی۔ پیتل کی ایک چمکدار گڑوی میرے قریب رکھی ہوئی تھی۔ اس نے گائے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے اس کی کمر تک پھیرتا چلا گیا۔ گائے نے پیشاب کر دیا تھا۔ اس نے وہ گڑوی نیچے رکھ دی اور اس میں غلاظت بھر لی۔ پھر وہ مسکراتا ہوا گڑوی لئے میرے قریب پہنچ گیا۔

''لے...... امرت جل کچھ نہیں ہے اس کے سامنے...... ہزار امرت جل مل جائیں گے تجھے...... لے پی جا اسے۔''

دوسرے لمحے میرے بدن میں جیسے چنگاریاں بھر گئیں۔ اچانک ہی میری پیشانی کی لکیر جلنے لگی۔ اچانک ہی میرے پورے وجود میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوگئی۔ اچانک ہی میری آنکھوں سے شرارے ابلنے لگے۔ اچانک ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

''کیا بک رہا ہے تو؟...... یہ گائے کا پیشاب ہے۔''

''یہ امرت جل ہے...... یہ ساری شکتیوں سے زیادہ شکتی مان ہے۔ اسے پی کر تو امر ہوجائے گا سمجھا۔ یہیں سے کالی شکتی کی ابتدا ہوتی ہے باؤلے! اس کا اپمان کر رہا ہے تو؟''

''سنو سادھو! لعنت بھیجتا ہوں میں تمہاری اس کالی قوت پر...... لعنت بھیجتا ہوں اس کالے جادو پر...... تھوکتا ہوں اس دولت پر جو مجھ سے میرا ایمان چھین لے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خبردار اس کے بعد اگر تم نے اس قسم کی کوئی بدتمیزی مجھ سے کی۔'' میں نے اچھل کر اس کے ہاتھوں پر لات ماری اور پیتل کی چمکدار گڑوی اچھل کر کافی دور جا گری۔ وہ ایک دم خونخوار ہوگیا تھا۔ میں نے پیشانی سے اس کا غلیظ تھوک بھی صاف کر دیا اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

''نہیں سادھو!...... دنیا کی ہر چیز دے سکتا ہوں' اپنے دین کے علاوہ۔ میں اپنے مذہب سے کسی بھی طرح نہیں ہٹ سکتا۔ میں اپنے دھرم کو کبھی بھی فریب نہیں دے سکتا۔ کیا ہے میرے پاس؟ زندگی ہی گزارنی ہے نا' گزارلوں گا غریب رہ کر' محنت مزدوری کر کے' سوکھے ٹکڑے کھا کر۔ لیکن وہ نہیں کروں گا جو تو کہہ رہا ہے۔ تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ ان سونے چاندی کے ٹکڑوں کے عوض تو مجھ سے میرا ایمان چھیننا چاہتا ہے۔ لعنت ہے تیری شکل پر۔ غلطی میری ہی تھی شیطان کے بچے! کہ میں دولت کی وجہ سے تیرے فریب میں آگیا۔ اب مجھے یہ دولت نہیں چاہئے۔''

اس کا چہرہ سرخ سے سرخ ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں خون اگلنے لگی تھیں۔ اس نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دھت تیرے کی۔ سارے کے سارے ایسے ہی کمینے نکلے ہو تم۔ سارے کے سارے ایسے ہی ہو۔ ایک وہ تھا جس نے جیون ختم کر لیا اپنا۔ آج کتوں کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے' مگر دھرم شکتی چاہئے' دھرم شکتی۔ کالی شکتی چھوڑ کر دھرم شکتی چاہئے۔ ٹھیک ہے رہنے...... ٹھیک ہے۔ دیکھوں گا تم لوگ کب تک مجھے شکست دیتے ہو۔ ارے تم ہو ہی کمینے۔ کسی کا احسان نہیں مانتے۔ میں نے تجھے سوکھے ٹکڑوں کے سنسار سے نکال کر عیش و عشرت کی دنیا میں لانا چاہا' مگر...... مگر اب ایسے نہیں۔''

اس وقت مجھے کچھ نہیں معلوم تھا مسعود بھیا! کہ وہ یہ بکواس کس کیلئے کر رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہے وہ تم ہو۔''

''یہ کیسے پتہ چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''حالات سے۔''

''حالات کیا تھے؟''

''تھوڑی سی کہانی اور رہ گئی ہے۔اس سے پتہ چل جائے گا۔''

''ایں...... ہاں ٹھیک ہے۔''

اکرام چند لمحات خاموش رہا' پھر بولا۔

''وہ گرجتا برستا رہا۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچنے لگا۔ پھر ایک دم ہنس پڑا۔

''واہ رے واہ...... واہ رے واہ...... تو نے ایک نیا راستہ دکھایا مجھے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تجھے ایک نیا روپ دوں۔ اوپر سے مسلمان' اندر سے کچھ اور۔ پھر جب تو اس پاپی کے سامنے آئے تو وہ آسانی سے تجھ سے دھوکہ کھا جائے۔ تیرے ہاتھوں ماروں اسے۔ مگر نہ سہی...... تو مسلمان رہ۔ پکا مسلمان۔ بس میرا ایک کام کرنا ہوگا تجھے۔''

''میں اب تجھے سمجھ چکا ہوں شیطان! کوئی کام نہیں کروں گا میں تیرا۔ یہاں رکوں گا بھی نہیں۔''

''کرے گا...... کرے گا...... کرنا پڑے گا تجھے۔ نہ رک...... بھاگ جا...... ٹھیک ہے' بھاگ جا۔'' وہ خود ایک طرف چل پڑا۔ میں نے بھی بستی کی طرف رخ کیا۔ خود پر لعنت ملامت کر رہا تھا۔ لالچ نے اندھا کر دیا۔ ایمان کھونے جا رہا تھا۔ تھو ہے ایسی دولت پر۔

میں بستی میں داخل ہو گیا۔ اپنے گھر کی طرف چل پڑا' لیکن نہ جانے کیوں سر چکرا رہا تھا۔ سب کچھ اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ اور یہ جگہ...... میرا گھر ہی یہاں موجود نہیں تھا...... سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا...... نہ جانے میرا گھر کہاں گیا؟...... پاگلوں کی طرح اپنا گھر ڈھونڈنے لگا۔ پھر ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔

''بھائی صاحب! یہ کون سا محلہ ہے؟''

''کاچھی ٹولہ۔''

''یہاں میرا گھر تھا۔''

''کہاں؟''

''وہ سامنے...... یہی جگہ ہے...... برابر میں چچا شمشاد رہتے تھے۔''

''کتنے سال پہلے کی بات ہے؟''

''سال نہیں' کل...... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔''

''اس گھر میں رہتے ہیں پنڈت سدھا شنکر۔ برابر میں لالہ امرناتھ بزاز۔ کوئی بیس سال سے تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہیں اور ہوگا تمہارا گھر۔'' وہ شخص مجھے پاگل سمجھ کر آگے بڑھ گیا۔ آہ...... میرا گھر کھو گیا تھا۔ میرے دوست کھو گئے تھے...... پورے جونا پوری میں کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ دیوان لال کے گھر گیا' وہ بھی نہ ملا...... اس کے گھر میں بھی کوئی اور رہتا تھا۔ خون کے آنسو رو دیا۔ مسعود بھیا! جونا پوری میں پیدا ہوا تھا' وہیں پلا بڑھا تھا مگر کوئی جاننے والا نہیں تھا وہاں...... بہن بھی کھو گئی تھی میری۔ سب کچھ گم ہو گیا تھا۔ مہینہ گزر گیا پورا۔ حلیہ بدل گیا۔ ایک دن اس ظالم سادھو کا خیال آیا۔ شمشان گھاٹ چل پڑا' وہ وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

''آ گئے مکتی میاں!''

''میرا گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں کیا معلوم؟''

''تجھے معلوم ہے...... تجھے سب کچھ معلوم ہے ذلیل!''

''اوہو...... ابھی تک بگڑے ہوئے ہو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ دماغ ٹھکانے آ گیا۔ ہم سے سمجھوتہ کرنے آئے ہو؟''

''تو نے اپنے مکروہ علم سے میرا گھر گم کر دیا ہے۔ مجھے بتا' میرا گھر کہاں ہے؟''

''چلو ٹھیک ہے' ہم نے ایسا کر دیا ہے۔ کیا کر لو گے تم ہمارا؟''

''میں تجھے جان سے ماردوں گا۔'' میں نے غیظ کے عالم میں کہا اور وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔
''ٹھیک ہے...... پہلے تم ہمیں جان سے ماردو' پھر تم سے بات کریں گے۔''
''میری بہن کا پتہ تو بتادے ظالم!...... کچھ تو بتادے مجھے۔''
''سب کچھ بتادیں گے۔ جو کہو گے کریں گے تمہارے لئے...... مگر ابھی نہیں۔ اس وقت جب تم ہمارا کام کردو گے۔''
''کیا کام ہے تمہارا؟''
''ایسے نہیں بتائیں گے۔ جب تک تم من سے تیار نہ ہوجاؤ گے۔ اور اب تو تمہیں سمجھنا پڑے گا۔ سسرے کچھ کئے بنا سب کچھ حاصل کرلینا چاہتے ہیں۔ وہ کمینہ بھی ایسے ہی آیا تھا گھوڑے دوڑانے' ریس جیتنے' سٹہ جیتنے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ سن رے' تجھے ایسے سارے کام کرنے پڑیں گے جو تیرے دھرم کے خلاف ہوں۔ چھوڑوں گا نہیں۔ کیا سمجھتا ہے تو مجھے۔ بھوریا چرن ہے میرا نام۔ شنکھا ہوں میں۔ تجھے سب کچھ کرنا پڑے گا ہمارے لئے۔ ورنہ اس بار وہ کریں گے ہم' جو پہلے نہ کیا تھا۔ وہ بھی تیری طرح تھا۔ بالکل تیری طرح۔ ہم نے کہا پیر پھاگن دوارے پہنچادے۔ پر دھرم مہاتما ابھر آئی۔ کتا بنادیا سسرے کو ہم نے بھی۔ یہی حشر تیرا ہوگا۔''
اور مسعود بھیا! اس نے اس وقت مجھے تمہارے بارے میں تفصیل بتائی' پھر بولا۔
''پہلے ہم نے سوچا تھا کہ تجھے مسلمان بنائے رکھیں اور کالی شکتی سے ماریں۔ پھر تو مسلمان بن کر اسے مارے۔ لوہے کو لوہا کاٹے۔ مگر تو نے ایک نیا راستہ دکھا دیا ہمیں۔ جو کام وہ نہ کرسکا' وہ تو کرسکتا ہے۔ کیونکہ تو اماوس کی رات کو پیروں کی طرف سے پیدا ہوا ہے۔''
''دیکھ بھوریا چرن! میرا پیچھا چھوڑ دے۔ کوئی بھی مسلمان اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہے تو ایسا غلیظ کام نہیں کرے گا۔ کالا جادو کفر ہے۔ ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کسی اور سے اپنا کام کرالے۔ میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔''
''اے چل پاجی! تو ہمارا کام نہیں کرے گا تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے تیرے کام آنے کی۔ جادفع ہوجا یہاں سے۔''
''مجھے میرا گھر بتادے بھوریا چرن! ورنہ میں تجھے مارڈالوں گا۔ پتھر مار مار کر ہلاک کردوں گا تجھے۔'' میں نے زچ ہوکر روتے ہوئے کہا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس پر کھینچ مارا' مگر پتھر اس کے بدن سے گزر کر دور جاگرا۔ پھر جتنے پتھر آس پاس پڑے تھے میں اٹھا اٹھا کر اس پر مارنے لگا' مگر سارے پتھر اس میں سے گزر گئے اور وہ ہنستا رہا۔
''اب ہمارا کھیل دیکھ۔'' وہ بولا۔ ''یہ ہے تیرا گھر...... ہے نا؟'' اس نے کہا اور منظر بدل گیا۔ میں نے اپنا گھر دیکھا۔ اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ گھر کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔
''اور یہ رہے ہم۔'' اس نے کہا۔ میں نے بھوریا چرن کو دیکھا جو اچانک میری بہن کے سامنے پہنچا تھا اور وہ اسے دیکھ کر دہشت سے کھڑی ہوگئی تھی۔ پھر میں نے بھوریا چرن کو...... میں نے مسعود بھیا!...... میں نے دیکھا کہ اس نے میری بہن کو دبوچ کر اس کا منہ کھولا اور اس کی زبان چھری سے کاٹ دی...... اس نے مزاحمت کی تو...... اس نے چھری اس کے ہاتھوں پر ماری۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں۔ میری بہن کے منہ سے......'' اکرام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ کٹی ہوئی انگلیاں...... کٹی ہوئی زبان...... میں ایسی ایک شخصیت کا شناسا تھا۔ صرف شناسا ہی نہیں تھا بلکہ زندگی سے نفرت کرنے کے باوجود' کائنات کی ہر خوشی سے دور ہونے کے باوجود وہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ وہ ہر سانس کے ساتھ میرے دل میں کسکتی تھی۔ ماں باپ' بہن بھائی سے جدائی ہی میرے لئے کیا کم تھی کہ وہ میری زندگی میں ایک اور دکھ بن گئی تھی۔ مجھے متنبہ کیا گیا تھا۔ مجھے اس کی طرف بڑھنے سے روکا گیا تھا۔ مجھے احساس دلایا گیا تھا کہ خود کو سنبھالوں اور میں نے سینے پر پتھر رکھا تھا۔ لیکن...... لیکن مشکل لگ رہا تھا۔ آہ...... بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ اکرام کے منہ سے یہ سن کر ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

اکرام نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''یہ سب کچھ دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ مکروہ آواز میں ہنس پڑا۔

''نراش ہو گئے تھے ہم۔ مگر تو نے ہمارے من میں نئی جوت جگا دی ہے۔ کرم بھنڈار سے ایک موقع اور مل گیا ہے کھنڈولا بننے کا۔ ایک پائل یہ کام کر سکتا ہے۔''

''بھوریا چرن!'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''بول...... بول کیا کہتا ہے؟''

''جونا پوری سے میرا گھر کہاں گیا؟''

''گھر کہاں جا سکتا ہے باؤلے! بس تجھے نہیں ملے گا۔ چاہے جیون بھر کوشش کرتا رہ۔''

''اور وہ جو میں نے دیکھا۔''

''کیسا لگا؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''کیا وہ سچ تھا؟''

''کیا سچ ہے' کیا جھوٹ' ایسے تو نہیں پتہ لگتا۔ بالک ہے۔ سچ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اگر ہے تو ''نہیں'' میں بدل سکتا ہے اور نہیں ہے تو ''ہے'' میں ڈھل سکتا ہے۔ جیسے تو جہاں تھا' وہاں نہیں ہے اور جہاں نہیں تھا وہاں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا لینا ہے اور کیا دینا ہے۔''

''میں تیری باتیں سمجھ نہیں سکتا بھوریا چرن!''

''ہائے' یہی تو رونا ہے۔ بھاگ پھوٹے تو کس نسل کے ہاتھوں میں۔ مگر کوئی کیا کرے؟ کالی شکتی اپنا دھرم کھونے سے نہیں مل جاتی۔ کھنڈولا بننے کیلئے کسی مہمان دھرمی کے دوار بھرشٹ کرنے پڑتے ہیں۔ کسی کا دھرم چھیننا پڑتا ہے۔ خود یہ کام کر سکتے تو ہزار بار کر لیتے۔ پاپیو! یہ کام تمہارا ہے۔ ارے سنسار میں اربوں ایسے ہیں جو ٹکے ٹکے کیلئے دھرم بیچتے پھرتے ہیں۔ مگر مجھے ملے تو سسرے سب ایک جیسے۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا بھوریا چرن!''

''اپنے چاروں طرف دیکھ۔''

''کیا ہے؟'' میں حیرت سے بولا۔

''ارے دیکھ تو...... کھوپڑی مت گھما ہماری۔'' وہ جھلا کر بولا اور میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ آہ نہ شمشان گھاٹ تھا اور نہ وہ جگہ جہاں میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ کوئی اور ہی جگہ تھی۔ چاروں طرف ٹنڈ منڈ درخت کھڑے تھے۔ بھوری بھوری چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ میرا سر چکرا گیا۔ مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا اور میں بیٹھ گیا۔ بھوریا چرن ہنسنے لگا تھا' پھر اس نے کہا۔

''اب یقین آ گیا ہو گا تجھے۔ جو ہے وہ ''نہیں'' میں بدل سکتا ہے اور جو نہیں ہے وہ ہو سکتا ہے۔ تو نہ مان ہماری اور نتیجہ دیکھتا رہ۔''

''میری جان بخش دے بھوریا چرن!''

''بڑی آسان بات ہے۔''

''کیا؟''

''ہمارا ایک کام کر دے سچے من سے۔ جو چاہے مانگ لے ہم سے۔ راج کھنوتی کی سوگند کھا کر وچن دیتے ہیں' جو مانگے گا سو دیں گے۔''

''میں گائے کا پیشاب نہیں پیوں گا۔''

''کون پاپی کہتا ہے۔''

''میں نماز پڑھ کر کسی کو دھوکہ نہیں دوں گا۔''

''سچے من سے اپنے دھرم کے مطابق عبادت کر۔ ہم تجھے نہ روکیں گے۔''

''پھر کیا کام کرنا ہوگا مجھے؟''

''اپنے دھرم کی سوگند کھا کر کہہ کر ان دونوں کاموں کے علاوہ ہم جو کہیں گے کر دے گا۔ بول' کھائے گا سوگند؟''

''میں قسم نہیں کھا سکتا۔ تو جادوگر ہے' مجھ سے کوئی ایسا ہی کام کرائے گا جو ایمان کے خلاف ہوگا۔'' میں نے کہا اور بھوریا چرن غصے سے سرخ ہو گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا' پھر بولا۔

''چل آگے بڑھ...... بعد میں باتیں ہوں گی۔''

مسعود بھیا! بری طرح پھنس گیا تھا اس کے جال میں۔ اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کہ اس کے کہنے سے آگے بڑھوں۔ نہ جانے کون سی جگہ تھی۔ میں اس سے بہت خوفزدہ تھا۔ سورج ڈھلے تک وہ چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ رک گیا۔ کچھ دیر کیلئے میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ پھر واپس چلا آیا۔

''بھوکا ہے؟''

''نہیں۔''

''مرتا رہ۔ مجھے کیا۔ بھوک لگے تو مجھے بتا دینا۔''

''بھوریا چرن! مجھے میری بہن کے بارے میں بتا دے۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہ کیا تھا؟''

''نوکر لگا ہوں تیرے پتا کا؟ یہ کر دے' وہ کر دے۔ اور تو میرا ایک کام بھی نہ کرے۔''

''آخر کیا کام ہے تیرا؟ مجھے بتا تو سہی۔''

''دھرم کی سوگند کھا' تب بتاؤں گا۔''

''نہیں بھوریا چرن! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کام پوچھے بغیر میں قسم نہیں کھاؤں گا۔''

وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور بولا۔

''صبح کو ہم یہاں سے چلیں گے۔ آگے ایک بستی ہے شاہ گڑھی۔ وہاں ملنگ شاہ کا مزار ہے۔ تجھے ایک چیز ملنگ شاہ کے دوار پہنچانی ہے۔''

شاہ گڑھی کے بابا ملنگ شاہ کے بارے میں' میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ بڑی کرامات ان کے نام سے منسوب تھیں۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا چیز ہے وہ؟''

''ارے بس' ہمارا دھرم دوسرا ہے۔ ان کا دوسرا۔ مگر ہم بھی انہیں کچھ بھینٹ دینا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''بری بات ہے بالکا!...... انسان کے اندر اتنی کھوج نہیں ہونی چاہئے ہر بات میں۔ کیا' پھر کیوں۔ ارے تیرا فائدہ ہی ہوگا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارا کام کر دیا تو سمجھ لے کہ پار لگ گیا۔ ہم گندے ہیں۔ تیرا دھرم اور ہے' ان کا اور۔ ہم گندے لوگ ایسی جگہ کب جا سکتے ہیں؟ تو مسلمان ہے' تیرے لئے یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔ ہماری منو کامنا پوری ہو جائے گی۔''

''وہ کیا چیز ہے بھوریا چرن؟ اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے کسی قدر آمادہ ہوتے ہوئے کہا اور وہ بھی ایک دم نرم ہو گیا۔

''ابھی چلیں بالکا! تو کہے تو ابھی چلیں۔ تو تھکا ہوا نہ ہو تو ایسا کر یو ہم شاہ گڑھی چلتے ہیں۔ تو وہاں سے پہلے اپنی پیٹ پوجا کر یو اور پھر ہم تجھے بتا دیں گے وہ جگہ جہاں تجھے جانا ہے اور جو کرنا ہے۔ ارے تو تیار تو ہو اور پھر دیکھ تماشا۔''

میں نے گردن جھکا لی اور سوچ میں ڈوب گیا' پھر میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن اب اس وقت شاہ گڑھی' یہاں سے ہے کتنی دور؟''
جواب میں بھوریا چرن ہنسنے لگا۔ پھر وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے دھکا دے دیا۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ گرتے گرتے بچا۔ زمین پر ہاتھ ٹکا دیئے تھے ورنہ چہرے پر چوٹ لگ جاتی۔ میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس حرکت کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ اس نے خود ہی میرے بازو کو سہارا دے کر مجھے کھڑا کر دیا اور ہنستا ہوا بولا۔
''لے...... آ گیا تو شاہ گڑھی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ ایسے ہی پریشان ہو رہا تھا۔ ارے باؤلے! تیرے سارے کام ایسے ہی پورے ہو جائیں گے۔ پلک بھی نہ جھپک پائے گا اور دیکھے گا کہ جو تیرے دل میں آیا وہ پورا ہو گیا۔''
میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سر چکرا گیا۔ کہاں تو ایک ایسا ویران علاقہ تھا جہاں کوئی انسانی وجود ہی نہیں تھا اور کہاں اب میرے چاروں سمت آبادی نظر آ رہی تھی۔
اس بھیانک جادوگر کی بھیانک جادوگری کا تو پہلے ہی قائل ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ بری طرح اس کے جال میں جکڑ چکا ہوں۔ بہت دور سے شاہ گڑھی کے شاہ بابا کا مزار نظر آ رہا تھا۔ یہاں اچھے خاصے لوگ ہوا کرتے تھے۔ کبھی آیا تو نہیں تھا اس مزار شریف پر۔ لیکن باپ دادا سے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔
بھوریا چرن نے کہا۔ ''جیب میں ہاتھ ڈال' پیسے موجود ہیں تیری جیب میں۔ ہم دیں گے تو برا مانے گا۔ جا' سامنے دکانیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھا پی لے۔''
بھوک واقعی لگ رہی تھی' اور ذہنی طور پر بھوریا چرن سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو واقعی اچھے خاصے پیسے پڑے ہوئے نظر آئے...... میں نانبائی کی دکان پر پہنچ گیا۔ سالن روٹی خرید کر کھائی' پانی پیا' خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے بعد وہاں سے باہر نکلا تو بھوریا چرن میرے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ ایک سنسان سی جگہ پہنچ کر اس نے مجھے رکنے کیلئے کہا اور پھر بولا۔
''دیکھ' وہ جو سامنے پیڑ نظر آ رہا ہے' اس کے پیچھے لکڑی کا ایک صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔ اس صندوقچے کے اندر ایک پتلا رکھا ہوا ہے۔

✦✣✦✣✦

اس پتلے کو چپ چاپ شاہ بابا کے مزار کے پیچھے جو بھی ایسی جگہ ہو جہاں کوئی چیز رکھی جا سکے، رکھ کر چلا آ۔ بس اتنا سا کام ہے تیرا اور بات ختم!''
''پتلا کیسا ہے......؟''
''اب دیکھ تو نے پھر وہ باتیں شروع کر دیں جس سے دماغ خراب ہو جائے۔ باؤلے! یہ کام کر کے آ پھر بتائیں گے تجھے کہ پتلا کیسا تھا اور ہم نے ملنگ بابا کو کیا بھینٹ دی ہے۔'' بھوریا چرن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے اشارے پر میں درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو واقعی لکڑی کا ایک صندوقچہ رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں ربڑ جیسا ایک پتلا رکھا ہوا تھا۔ چہرے کے قریب کر کے دیکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ پتلا بالکل بھوریا چرن کی شکل تھا۔ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ میں نے چند لمحات سوچا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پتلا لے کر آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے پیروں میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔ جیسے جیسے مزار اقدس کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا، نجانے کیسی کیسی کیفیتوں کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی، کوئی احساس نہیں ہوا تھا جو الفاظ کی شکل اختیار کر سکتا لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی انجانی قوت مجھے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر تک میں ان کیفیتوں کو برداشت کرتا رہا لیکن پھر بے چینی عروج کو پہنچ گئی تو میں رک گیا۔ میرا دل الٹ رہا تھا اور مسلسل یہ آوازیں آ رہی تھیں کہ مجھے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ یہ ایک ناپاک وجود ہے۔ مزاروں پر تو پھول چڑھائے جاتے ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں،

عقیدت کے آنسو نچھاور کئے جاتے ہیں۔ یہ بت پرستی ہے۔ کسی انسانی پتلے کو مجھے مزار شریف تک نہیں پہنچانا چاہئے۔ یہ گناہ عظیم ہے۔ میں نے رک کر صندوقچی کھولی اور اس میں رکھے ہوئے پتلے کو دیکھنے لگا۔ تب ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ننھی ننھی آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی غرائی ہوئی باریک سی آواز سنائی دی۔

''کتے کے پلے! جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ یہاں تک آ گیا ہے تو اب بیکار باتوں میں نہ پھنس۔ اب آگے بڑھ پاپی! کیوں بہکاوے میں آ رہا ہے۔'' وہ بول رہا تھا اور میرا دل خوف و دہشت سے کانپ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھوریا چرن خود اس پتلے کی شکل میں موجود ہے۔ جب میں درخت کے پیچھے پہنچا تھا اور وہاں سے باہر نکلا تو وہ موجود نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ اس صندوقچی میں یہ شکل اختیار کر گیا تھا۔ میرے دل نے آخری فیصلہ کر لیا اور میں نے صندوقچی کو پوری قوت سے دور پھینک دیا۔ دل ہی دل میں، میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ غلیظ کام میں نہیں کروں گا۔ کسی مزار مقدس کی بے حرمتی کسی مسلمان کے ہاتھوں ممکن نہیں ہے اور میں اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان ہوں۔ میرے اس عمل کا کوئی ردعمل تو نہیں ہوا، صندوقچی دور پڑی تھی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ بھوریا چرن کا کیا ہوا۔

میں وہاں سے تیزی سے بھاگا اور بھاگتا رہا۔ نجانے کہاں کہاں، نجانے کب تک!

صبح ہو گئی پھر دوپہر! تب ایک آبادی نظر آئی اور میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ آبادی میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھٹنڈہ ہے۔ گھنی آبادی تھی مگر میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو میری مدد کر سکے مگر بدقسمتی نے میرا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ ایک بوڑھا سا آدمی نظر آیا اور میں نے اسے آواز دی۔ وہ رک گیا تھا۔

''بھائی صاحب! میری مدد کریں۔ میں ایک مجبور مسافر ہوں۔ بھائی صاحب......!'' اس شخص نے ناگواری سے مجھے دیکھا اور پھر چونک سا پڑا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا تھا۔ اچانک وہ نرم لہجے میں بولا۔

''کیا بات ہے، کیا پریشانی ہے تجھے؟''

''مجھے کوئی ٹھکانہ چاہئے، کچھ پیسے چاہئیں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں ہے تیرا گھر......؟'' میں نے اسے اپنے بارے میں مختصر الفاظ میں بتایا لیکن بھوریا چرن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ہمدردی سے سنتا رہا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔ ''آ میرے ساتھ!'' میں اس کے ساتھ چل پڑا لیکن آبادی میں جانے کے بجائے وہ آبادی کے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا تھا۔ میں کسی قدر گھبرا گیا۔

''سنیئے بابا جی......!''

''کیا ہے......؟''

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''مہاوتی کا نام سنا ہے کبھی تو نے؟''

''نہیں......!''

''رانی مہاوتی کا نام نہیں سنا......؟''

''افسوس نہیں!''

''بہت بڑی سرکار ہے، ان کے پاس لے جا رہا ہوں، تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔''

''مگر میں......!''

''خاموش رہ۔ تیری تقدیر اچھی ہے کہ مجھے مل گیا۔ رانی تیری ساری پریشانیاں دور کر دے گی۔ بڑی مہان، بڑی نرم دل ہے وہ!'' بوڑھے نے کہا۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ پھر وہ مجھے لئے ہوئے ایک عجیب سی جگہ پہنچ گیا۔ یہاں بدنما اور بدصورت پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے، جنگل سا پھیلا ہوا تھا، سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ پہاڑی غار تھے اور ایک پہاڑی غار کے دہانے سے وہ اندر داخل ہو گیا۔ مجھے بے حد خوف محسوس ہو رہا تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا، اس کے

ساتھ اندر چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ تو ایک عظیم الشان غار تھا۔ جو جگہ باہر سے بس ایک ٹیلہ نظر آتی تھی، وہ اندر سے اتنی کشادہ تھی کہ یقین نہ آئے۔ غار کے بیچوں بیچ طلسم کی دیوی، کالی دیوی کا ایک بھیانک مجسمہ ایستادہ تھا اور اطراف کا ماحول بے حد خوفناک تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ''بابا صاحب! یہ کونسی جگہ ہے؟''

''مکتی کنڈ......!'' بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں صاف شیطنیت جھلک رہی تھی۔

''میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

''کیوں......؟''

''یہ عجیب سی جگہ ہے، مجھے وحشت ہو رہی ہے۔''

''کالی کنڈ ہے یہ باؤلے! یہاں مکتی ملتی ہے۔ ہر پریشانی سے مکتی مل جاتی ہے یہاں! یہ مہاوتی نواس ہے۔''

''مگر میرا تو تھوڑا سا کام ہے میں...... میں یہاں نہیں رک سکتا۔''

''مہاوتی سے نہیں ملے گا؟''

''کہاں ہے مہاوتی......؟''

''وہ ہے رانیوں کی رانی، مہارانی مہاوتی......!'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک بڑے سے پتھر کے چبوترے پر میں نے ایک عجیب اور خوفناک چیز دیکھی۔ تم نے کالا چیتا دیکھا ہے مسعود بھیا! ایک نگاہ میں مجھے ایسا ہی لگا جیسے کوئی کالا چیتا بیٹھا ہو مگر وہ چیتا نہیں، انسان تھا۔ ایک عورت، کالی بھجنگ۔ لال لال خوفناک آنکھوں والی! جو اس انداز میں پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی جیسے بلی بیٹھتی ہے۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی۔

''میں جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے وحشت میں کہا اور غار کے دہانے کی طرف چھلانگ لگا دی مگر دہانہ غائب ہو چکا تھا۔ وہاں اب سپاٹ پہاڑی دیوار نظر آ رہی تھی۔ بوڑھے شیطان کا مکروہ قہقہہ غار میں گونج اٹھا۔ وہ ہنستا ہوا بولا۔ ''یہ کالی کنڈ ہے باؤلے! یہاں لوگ آتے ہیں، جاتے نہیں۔ تو بھی نہیں جائے گا۔''

''مجھے جانے دو بابا جی! میں بہت مظلوم ہوں، میں پہلے ہی بہت ستایا ہوا ہوں۔''

''اسی لئے تو میں تجھے مکتی نواس لایا ہوں، یہاں ساری مصیبتوں سے مکتی مل جاتی ہے۔''

اس وقت ایک پائیدار نسوانی آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے شمبھو ناتھ......! کون ہے یہ......!'' میری گردن گھوم گئی۔ شاہانہ جھلملاتے ہوئے لباس میں مجھے ایک حسین اور بلند و بالا قامت کی عورت نظر آئی جو صورت سے ہی رانی معلوم ہوتی تھی۔

''تیرے لئے ایک تحفہ لایا ہوں مہاوتی!''

''کون ہے یہ......؟''

''اماوس کی رات کا پائل......! مہا کالی کیلئے تیری بھینٹ!'' بوڑھا مسکراتا ہوا بولا۔ میری نگاہ اس چبوترے کی طرف اٹھ گئی جہاں وہ کالی بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا اور چبوترہ خالی پڑا ہوا تھا۔ بوڑھے کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی مگر عورت کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ وہ بولی۔ ''ارے ہاں شمبھو جی! کہتے تو ٹھیک ہو...... کہاں سے مل گیا یہ......؟''

''بس! مل گیا۔ ہم نے کھوجا ہے۔'' بوڑھا بولا۔

''کون ہے یہ......؟''

''مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ اسے بالکل نجات مل جائے گی۔'' وہ بھی ہنس کر بولی۔ عجیب ماحول تھا۔ وحشت سے دل بند ہوا جا رہا تھا، پاؤں لرز رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ دونوں کی ہنسی میرے کانوں میں گونجی تھی اور پھر وہ دونوں غائب ہو گئے۔ آہ مسعود بھیا......! آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا تھا۔ باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جب تک بدن میں جان رہی، راستہ تلاش کرتا رہا پھر تھک کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں مجھے نظر آئے۔ کچھ تیاریاں

کرر ہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو وہاں بھوریا چرن موجود تھا۔ عورت کے اور اس کے درمیان باتیں ہورہی تھیں۔ بھوریا چرن عورت کو بتا رہا تھا کہ میں اس کا مفرور قیدی ہوں۔ پھر وہ مجھے اس غار سے نکال لایا اور میں تیورایا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ کہانی بے حد طویل ہے مسعود بھیا! وہ مجھے کئی مزاروں پر لے گیا۔ اس نے مجھے اسی مکروہ عمل پر مجبور کیا۔ اب اس نے ایک اور اذیت دینا شروع کردی تھی مجھے۔ میں کہیں بھی ہوتا، جونہی سورج چھپتا، نہ جانے کہاں سے پیلے رنگ کی بے شمار مکڑیاں آجاتیں اور میرے بدن سے چمٹ جاتیں۔ آہ! ان کے زہریلے ڈنک میرے بدن میں آگ روشن کردیتے۔ وہ مجھے کاٹتیں، میرا خون چوستیں اور میں اذیت سے دیوانہ ہوجاتا۔

بھوریا چرن کہتا۔ ''سوگند کھا کتے! سوگند کھا میرا کام کردے گا۔'' مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے لئے مارا مارا پھرتا رہا اور ایک دن اس اذیت کے سامنے میں نے سر جھکا دیا۔ میں نے کہا۔ ''بھوریا چرن! میں تمہارا کام کردوں گا مگر میں کیا کروں۔ میں نے اس وقت مزار پاک کی طرف قدم بڑھائے تھے تو میرا دل الٹنے لگا تھا۔''

''سوگند کھا لے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اور میں نے قسم کھا لی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اب میں اس کا کام کردوں گا۔

''ایک مسلمان کا وعدہ ہے یہ......!'' بھوریا چرن نے پوچھا۔

''ہاں......!'' میں نے جواب دیا۔

''پگلے......! بلاوجہ اتنی مصیبت اٹھائی۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''اب بتا میں کیا کروں؟''

''پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کر! دیکھ کتنا کمزور ہوگیا ہے۔ ایک بار پھر شنکھا تجھے یقین لاتا ہے کہ تجھے مہان بنا دے گا۔ سنسار میں جو خواہش کرے گا، وہ پوری ہوجائے گی۔''

''میری بہن مل جائے گی مجھے......؟''

''راج کرے گی وہ راج......! بادشاہوں کی بیٹیوں کی طرح بیاہ کرنا اس کا اور اس کے بعد مسعود بھیا! اس نے میرا حلیہ بدل دیا۔ خوب عیش کرائے مجھے پھر وہ مجھے لے کر یہاں آگیا۔ یہاں مجھے وعدے کے مطابق اس کا منحوس پتلا مزار پاک پر پہنچانا تھا۔ آہ! میں بالکل بے بس تھا اس کے سامنے! وہ خونخوار مکڑیاں مجھ سے میرا حوصلہ، میرا صبر چھین چکی تھیں۔ وہ اتنا خوف زدہ کرچکی تھیں مجھے کہ راتوں کو خوابوں میں ان کے تصور سے میں دہشت زدہ ہوجاتا تھا اور اس کے بعد مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ اتنا سہم گیا تھا میں ان مکڑیوں سے اور اس کی ہر بات ماننے پر آمادہ تھا۔ غرض یہ کہ اب میں اس کے کام کیلئے تیار ہوگیا تھا اور اس نے مجھ پر عنایتوں کی بارش کردی تھی۔ پھر یہاں پہنچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑا آرام کروں۔ عرس ہورہا ہے یہاں ان بزرگ کا اس لئے بہت زیادہ رش رہتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ عرس ختم ہوجائے، زائرین چلے جائیں تو اس کے بعد اپنا کام سرانجام دوں۔''

میں تو اس کی ہر خواہش پر آمادہ ہو ہی گیا تھا چنانچہ اس پر بھی میں نے اعتراض نہ کیا اور وقت گزرتا رہا۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر مجبوریاں دامن گیر تھیں۔ اگر دل میں بھی خیال لاتا کہ اس کی خواہش پر عمل نہیں کروں گا تو مکڑیاں آنکھوں کے سامنے کلبلانے لگتی تھیں۔ اچانک ہی ایک دن بھوریا چرن میرے پاس بڑا سہما سہما سا آیا اور کہنے لگا۔

''سن رے تجھے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔ مجبوری ہوگئی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں کام پر کام تیرے ذمے ڈالے جارہا ہوں۔ مجبوری ہوگئی ہے۔''

''کیا بھوریا چرن!'' میں نے سوال کیا۔

''وہ پاپی یہاں بھی آگیا ہے۔ وہ کمینہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے اور...... اور......! وہ ہمارے راستے ضرور روکے گا۔ ضرور روکے گا وہ ہمارے راستے......!''

''کون ہے وہ......؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔ بھوریا چرن کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا منحوس شیطان کسی سے خوف زدہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے جھلا کے کہا۔ ''ارے وہی پاپی...... مسعود...... مسعود کا بچہ!''

''وہ کون ہے؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''کہہ تو دیا دشمن ہے میرا دشمن نمبر ایک......!''

''مجھے کیا کام کرنا ہے؟''

''تو اس کو مار دے گا۔ یہ کام تو کرسکتا ہے۔ مار دے اس کو سمجھا؟ مار دے اسے۔''

''مگر بھوریا چرن......!''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ جو میں نے کہا، وہی کرنا ہے تجھے! مار ڈال اسے۔ لے یہ چھرا لے لے...... میں تجھے بتا دوں گا کہ وہ کون ہے۔ رات کو وہ جہاں بھی سوئے، یہ چھرا اس کے سینے میں گھونپ دیجیو اور سن! اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو میں...... میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتا رے......! دیکھ میں گھبرایا ہوا ہوں، جھلایا ہوا ہوں اور مجبوری میں یہ بات کہہ رہا ہوں تجھ سے! مارنا ہے اسے، ہر قیمت پر مارنا ہے اسے! سمجھا......؟''

''ٹھیک ہے بھوریا چرن! جب میں ایک گندا کام کرنے پر آمادہ ہوگیا ہوں تو دوسرے گندے کام پر مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''ارے کہہ لے جو تیرا من چاہے۔ گندا کہہ لے، اگھور کہہ لے مگر اس کے بعد تجھے جو کچھ مل جائے گا، جیون بھر یاد کرے گا۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''ہم جیون کی بات نہیں کرتے بھوریا چرن! ہماری اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ چند لمحاتی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہم تو عاقبت کی زندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ یہ زندگی اگر مجھے عیش و عشرت دے بھی دے گی تو ہے ہی کتنی! نہ اپنی مرضی سے آیا، نہ اپنی مرضی سے جاؤں گا لیکن اپنی عاقبت خراب کر جاؤں گا یہاں رہ کر...... خیر اگر تقدیر میں یہی لکھا ہے تو یہی سہی۔''

''زیادہ عالموں کی سی بات نہ کر! عالموں کا کام عالموں پر چھوڑ دے۔ سنسار میں سب ہی اپنا من پسند جیون گزار رہے ہیں۔ تو بہت مہان بن رہا ہے۔ ارے جو کچھ میں نے کہا ہے، وہی کر اور مسعود بھیا! اسی رات میں نے آپ پر اس چھرے سے حملہ کیا۔ میرے دل میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ میرا دل رو رہا تھا مگر خوف نے مجھے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا اور میں اس گناہ کا مرتکب ہوا مگر ڈرا ہوا تھا، دوسرا وار نہیں کرسکا آپ پر...... اور اللہ کے فضل و کرم سے آپ زندہ بچ گئے۔ اس بات پر وہ مجھ سے بہت ناراض ہوا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ میرا قصور نہیں ہے پھر اس کے بعد سے وہ مسلسل گھبرایا ہوا ہی رہا۔ کبھی کچھ کہتا تھا، کبھی کچھ! مجھے بھی آپ سے خوف زدہ کرتا رہتا تھا۔ کہتا تھا آپ بہت خطرناک ہیں۔ پھر وہ دوسرا مرحلہ آیا۔ آپ بچ گئے اور وہ اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ خود وہ آپ کے قریب نہیں آتا تھا۔ بالآخر اس نے کہا کہ اب میں آپ کا خیال چھوڑ دوں اور اس کا کام کردوں چنانچہ یہ سب کچھ ہوا۔ یہ سب کچھ ہوگیا آہ...... یہ میری کہانی ہے مسعود بھائی! یہ میری کہانی ہے۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مجسم آنسو تھا۔ بہت تھوڑا سا فرق تھا اس کی اور میری داستان میں...... ہم دونوں ایک ہی شیطان کے چیلے تھے۔ مجھ سے زیادہ اس کا درد اور کون محسوس کرسکتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو اکرام......؟''

''کیا بتاؤں مسعود بھائی! کیا کہوں۔''

''تمہاری بہن کا کیا نام تھا؟''

''ثریا!'' اس نے جواب دیا اور میرے دل میں پھر کسک ہونے لگی۔ میرا خیال درست ہی نکلا تھا۔ ثریا ہی تھی اور اس

کتے بھوریا چرن نے اس کی زبان کاٹ دی تھی۔

''تمہارے دل میں کوئی خیال تو ہوگا اکرام......!''

''میری کہانی سن لی ہے آپ نے مسعود بھائی! بہن کے سوا اور کیا ہے میری زندگی میں مگر میرا گھر ہی کھو گیا ہے۔''

''بہن کو تلاش کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں......!''

''اس کے بعد کیا کرو گے؟''

''اللہ جانے مگر کیا وہ مل سکتی ہے؟''

''اللہ کیلئے کیا مشکل ہے۔''

''مگر بھوریا چرن......!''

''وہ کچھ نہیں ہے اکرام! شیطان کو ایک حد تک قوتیں دی گئی ہیں۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔''

''آہ......! خدا مجھے اس سے نجات دے دے۔ آہ میری بہن مجھے مل جائے۔ بس، اس کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہئے۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہو جائے گا۔''

''مسعود بھیا! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو......!''

''آپ کون ہیں؟''

''تمہیں میرا نام معلوم ہے؟''

''وہ تو ہے مگر...... کیا آپ اس کے دشمن ہیں؟''

''ہاں! کائنات میں مجھے صرف اس سے دشمنی ہے اور تم دیکھ لینا اس کا خاتمہ میرے ہی ہاتھوں ہوگا۔''

''آپ کی اس سے دشمنی کیوں ہوئی؟''

''وہ کافر ہے، کالے جادو کا ماہر ہے۔ میں اللہ کے فضل سے مسلمان ہوں اور اس کا شیطانی علم ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ عالم ہیں......؟''

''نہیں اکرام! جسے علم مل جائے، اس سے زیادہ خوش نصیب اس کائنات میں اور کون ہو سکتا ہے۔ بس مجھے کچھ سہارے حاصل ہیں، انہی پر چل رہا ہوں۔''

''وہ...... وہ آپ سے ڈرتا ہے، بہت ڈرتا ہے وہ آپ سے! آپ کے سائے سے بھی بھاگتا ہے مگر اب وہ میری تاک میں رہے گا۔ مجھے نہیں چھوڑے گا وہ......! آپ کب تک مجھے اس سے بچائیں گے؟''

''پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں اکرام! تحفظ کرنے والی ذات اللہ کی ہے۔ وہی سب کا محافظ ہے۔ ان شاء اللہ وہ تمہیں اس کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ دنیا ایک شیطان کے وجود سے پاک رہے گی۔ نماز پڑھتے ہو؟''

''نہیں......!'' اس نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ ''آج سے شروع کر دو۔ دن میں پانچ مرتبہ تم اللہ کے حضور حاضری دو گے اور اس شیطان کو اس کا احساس رہے گا پھر وہ تمہارے قریب آنے سے کترائے گا۔''

''مجھے آپ کی رہنمائی چاہئے۔''

''اللہ تمہاری رہنمائی کرے۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے آرام کرنے کے لئے کہا تھا مگر اکرام خوف سے ساری رات نہیں سویا تھا۔ وہاں حمام بنے ہوئے تھے۔ میں نے اسے غسل کرنے کیلئے کہا۔ غسل سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ فجر کی اذان ہوئی اور اس کے بعد وہاں موجود نمازی نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، ہم دونوں بھی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ نماز

سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میں اسے ساتھ لے کر مزار شریف سے باہر آ گیا۔ عرس اختتام کو پہنچ رہا تھا، زائرین کی واپسی شروع ہوگئی اور کافی لوگ کم ہو گئے تھے، اس وقت کی نسبت جب میں یہاں آیا تھا۔ میں نے ابھی تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہاں آنے کا مقصد ایک حد تک میرے علم میں آ چکا تھا۔ جو واقعات پیش آئے تھے، ان کے تحت یہی سوچ سکتا تھا کہ مزار پاک کی بے حرمتی سے روکنے کیلئے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے لیکن ابھی تک واپسی کا کوئی اشارہ نہیں ہوا تھا اور میرے لئے کسی بھی شکل میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں واپس چل پڑوں۔ جہاں تک ثریا کے تصور کا تعلق تھا تو اس وقت میں اپنی تمام دعاؤں میں اس دعا کو اولیت دیتا تھا کہ میرے دل و دماغ سے اس کا تصور مٹ جائے۔ میں تو خود ہواؤں کا مسافر تھا۔ قدم نہ زمین پر تھے اور نہ آسمان پر......! بس ان میں کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ڈول رہا تھا۔ کہیں بھی گر سکتا تھا۔ ذرا سی لغزش ایک بار پھر مجھے پستیوں کے انہی گڑھوں میں دھکیل سکتی تھی جن میں گرنے کی اب سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بے چارہ اکرام میری ہی طرح مصیبت کا شکار تھا مگر میں اسے کیا بتاتا کہ میں کیسی کیسی مصیبتوں سے گزر چکا ہوں۔ اسے تو ان کے عشر عشیر کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا لیکن خدا کا شکر تھا کہ اس نے ہی مجھے یہ قوت بخشی تھی کہ میں اب تک زندگی سے لڑ رہا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وظیفہ تلاش کیا تو یہ دیکھ کر آنکھیں حیرت و خوشی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ آج چار روپے کی جگہ میری جیب سے آٹھ روپے برآمد ہوئے تھے۔ اس احساس سے دل سرشار ہو گیا کہ میرے اقدام کو برا نہیں تصور کیا گیا ہے اور از راہ کرم مجھے اکرام کا وظیفہ بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ دل بڑھ گیا۔ گویا میرا عمل ناپسندیدہ نہیں رہا ہے۔ ایک جگہ اکرام کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا اور ناشتے سے فراغت ہوئی تھی کہ عرس کے خاتمے کا اعلان ہونے لگا۔ سجادہ نشین نے زائرین کو واپسی کی اجازت دے دی تھی اور عرس کی تقریبات مکمل ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ اب میری بھی واپسی ہو جائے۔ اکرام کو ساتھ رہنے کی اجازت ان آٹھ روپے کی موجودگی سے مل گئی تھی چنانچہ اکرام نے ہی مجھ سے سوال کر دیا۔

''مسعود بھائی! اب کیا کریں گے ہم......؟''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''جونا پوری جانا چاہتا ہوں مگر آپ کے ساتھ!''

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' اور اس کے بعد ہم نے جونا پوری کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ایک لاری یہاں سے جونا پوری بھی جاتی تھی۔ تین تین روپے کرایہ تھا۔ میں ڈیڑھ روپیہ خرچ کر چکا تھا ناشتے میں، آٹھ آنے موجود تھے میرے پاس۔ باقی چھ روپے کے ٹکٹ خرید لئے اور ہم لاری میں بیٹھ کر جونا پوری چل پڑے۔ میں تھوڑی سی الجھن کا شکار تھا۔ اصل بات اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ غرض یہ کہ جونا پوری پہنچ گئے اور وہ بھی نشاندہی کرتا ہوا اپنے محلے میں جا پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس کے منہ سے مسرت بھری آواز نکلی۔

''مسعود بھیا! وہ ہے...... وہ ہے میرا گھر! آہ میں اس شیطان کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔ آہ! وہی میرا گھر ہے۔'' وہ دیوانہ وار اپنے گھر کی جانب دوڑنے لگا۔ گھر کے دروازے پر زنجیر لگی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ثریا اسے اس گھر میں نہیں ملے گی لیکن اس کے احساس کی تکمیل کیلئے میں نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی۔ زنجیر کھول کر وہ دیوانہ وار اندر گھس گیا اور زور زور سے بہن کو آواز دینے لگا۔ میں دروازے پر ہی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگ آ گئے اس کی آوازیں سن کر انہی میں سے ایک معمر بزرگ نے اندر داخل ہو کر اسے پکارا۔

''اکرام...... اکرام...... آ گیا تو کہاں غائب ہو گیا تھا دیوانے......! کہاں چلا گیا تھا بہن کو چھوڑ کر......؟''

''چچا......! ثریا کہاں ہے؟ ثریا کہاں ہے چچا!'' اکرام نے دیوانہ وار پوچھا اور معمر شخص کی گردن جھک گئی۔ اکرام پھر چیخا۔

''چچا! میں اسے آپ کے حوالے کر کے گیا تھا، کہاں چلی گئی وہ...... کہاں ہے وہ......؟'' معمر شخص نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے اکرام......! ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ چچا؟ خدا کیلئے جلدی بتایئے مجھے، کیا ہوا......؟''

''تو تو واپس ہی نہیں آیا۔ ہم تیرا انتظار کرتے رہے۔ سب لوگ اس کی خبر گیری کرتے تھے مگر ایک صبح جب شبراتن اس کے گھر گئی تو چیختی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے بتایا کہ ثریا کے منہ سے خون بہہ بہہ کر سینے پر جم چکا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کٹی ہوئی ہیں اور وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ سارے کے سارے دوڑ پڑے۔ اسے اٹھا کر ڈاکٹر کی دکان پر لے گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی زبان کاٹ دی گئی ہے اور اس کی انگلیوں کو بھی چھری سے کاٹ دیا گیا ہے۔ نجانے کس ظالم نے یہ کام کیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یہاں اس کا علاج نہیں ہوسکتا، شہر لے جانا پڑے گا اسے! محلے والوں نے آپس میں چندہ کیا اور اسے لے کر شہر چل پڑے۔ شہر کے ایک اسپتال میں اسے داخل کردیا گیا۔ چھ سات دن تک تو شبراتن اس کے ساتھ رہی۔ خیراتی اسپتال تھا۔ ہم نے اسپتال والوں سے بات کی اور اسپتال والوں نے کہا کہ اس کا علاج تو بہت عرصے تک کیا جائے گا۔ بھیا! سچی بات ہے کہ ہم بھی غریب لوگ تھے۔ تو نے تو واپس مڑ کے ہی نہیں دیکھا۔ جب تک ہوسکا، اس کی خبر گیری کرتے رہے۔ آخری بار جب رشید خان شہر جا کر اس کی خبر لینے گئے تو پتا چلا کہ وہ اسپتال میں نہیں ہے، کہیں چلی گئی تھی۔ وہ وہاں سے کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ کچھ اور پتا نہیں چل سکا بھیا......! بس یہ ہے بیچاری ثریا کی کہانی!''

اکرام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ ایسا بلک بلک کر رو رہا تھا وہ کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہورہے تھے۔ بہت سے لوگ سسکیاں لے رہے تھے اور میں خاموش ایک کونے میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بعد کی کہانی میرے علم میں تھی اور میں اپنے آپ سے سوال کررہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں سوچوں میں گم رہا اور اکرام دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ محلے والے ہمدردی ظاہر کررہے تھے مگر اکرام کو قرار نہیں تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ آرام کریں، میں اکرام کو سنبھال لوں گا۔ ایک ایک کرکے لوگ چلے گئے۔ اکرام سسکتا ہوا بولا۔ ''اس نے یہی دکھایا تھا مجھے مسعود بھیا! جو کچھ اس نے مجھے دکھایا تھا، وہی سچ تھا۔ آہ میری پیاری بہن...... کیا ہوگیا اسے۔ آہ وہ گونگی ہوگئی مسعود بھیا، اب کیا کروں...... کیا اب بھی مجھے جینا چاہئے؟''

''جینا تو ہے تمہیں اکرام!''

''کس کیلئے جیوں، کیا کروں جی کر......؟''

''تو کیا خودکشی کروگے؟''

''اب تو یہی کرنا چاہئے۔ آہ اب تو......؟''

''توبہ کرو اکرام! توبہ کرو، خودکشی حرام ہے۔''

''پھر میں کیا کروں بھیا، بتاؤ میں کیا کروں؟''

''ثریا کو تلاش کرنا ہے تمہیں!''

''کہاں تلاش کروں؟ آہ میں اسے کہاں تلاش کروں؟''

''صبر کرو اللہ سے روشنی طلب کرو۔ وہ سب کو روشنی دکھاتا ہے۔'' بمشکل میں نے سمجھایا بجھایا۔ محلے والے پرسش احوال کو آرہے تھے۔ کچھ اس کیلئے کھانے پینے کی اشیاء بھی لائے تھے۔ وہ حتیٰ المقدور اس کی دلجوئی کررہے تھے۔ ہم نے تین دن وہاں قیام کیا۔ اکرام باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا تھا، وہ تہجد بھی پڑھنے لگا تھا۔ اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آتے تھے۔ گھنٹوں دعا کیلئے ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ بہن کی سلامتی کیلئے دعائیں کرتا ہے۔ اسے اس کیفیت میں دیکھ کر میرا سینہ بھی دکھنے لگتا تھا۔ میری بھی بہن تھی، بھائی تھا۔ ماں، باپ تھے، بھرا کنبہ تھا، بھرا گھر تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں تھا اور...... اور جو کچھ تھا، اس کے بارے میں جاننے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔ ان تین دنوں میں مجھے آٹھ روپے روز ملتے رہے تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء محلے والے بدستور لا دیتے تھے۔ یہ پیسے جمع ہوگئے۔ میں نے اکرام سے کہا۔

''اکرام! یہاں رکو گے؟ میرے ساتھ چلو گے؟''

''مجھے اپنے ساتھ رکھو گے مسعود بھیا......؟''
''ہاں......! اس وقت تک جب تک تمہاری بہن تمہیں مل جائے۔''
''وہ مل جائے گی مسعود بھیا......؟''
''ان شاء اللہ!'' میں نے کہا۔ وہ خوش ہوگیا اور بولا۔ ''آپ کہتے ہیں تو وہ ضرور مجھے مل جائے گی۔''
ہم نے تیاریاں کیں اور اس کے بعد میں نے خورجہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ثریا، گنگا دھر کے پاس تھی مجھے علم تھا مگر میں نے مصلحتاً اکرام کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ خدا کرے وہ محفوظ ہو۔ وقت سے پہلے آس دلا کر اسے ہیجان میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خورجے کے بارے میں سن کر اکرام نے پوچھا۔ ''خورجہ کس کام سے جارہے ہیں مسعود بھیا......!''
''وہاں کچھ کام ہے۔'' میں نے کہا اور وہ خاموش ہوگیا۔ بھوریا چرن کا پھر کوئی نشان نہیں ملا تھا اور مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا مگر جانتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور وار کرنے سے نہیں چوکے گا۔ میری وجہ سے اسے پھر ناکام ہونا پڑا تھا اور اس ناکامی نے اسے دیوانہ کردیا ہوگا۔ چنانچہ اس سے ہوشیار بھی تھا۔ ہم خورجے پہنچ گئے۔ ایک سرائے میں قیام کیا اور پھر میں نے گنگا دھر جی کے بارے میں معلومات شروع کردیں۔
''کیا کام کرتے ہیں گنگا دھر جی......؟''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم، ان کی بیٹی رُکمنی ڈاکٹر ہے اور بیٹا......!''
''خورجہ چھوٹی سی جگہ تو نہیں ہے۔ کچھ اتا پتا ہوتا تو......!'' مگر کوئی اتا پتا نہیں تھا میرے پاس! بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ ان سے پتہ تو پوچھ لیتا مگر اس وقت احساسات مختلف تھے۔ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ ثریا ان کے پاس تھی اور مجھے سرزنش کی گئی تھی۔ کیا پتا تھا کہ اسے اس طرح تلاش کرنا پڑے گا۔ واقعی خورجہ چھوٹا نہیں تھا۔ ہم گنگا دھر جی کو تلاش کرتے پھرے۔ کہیں سے پتا نہیں چل رہا تھا۔ میری نگاہیں سڑکوں پر چلتے ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں مگر نہ دھرما، نہ رام جی......! کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اب کیا کروں...... کیا کرنا چاہیے۔
''کوئی بہت ضروری کام تھا اس سے؟'' اکرام پوچھتا۔
''ہاں......!''
اس شام خورجے کے ایک تنگ بازار سے گزر رہا تھا کہ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک آواز ابھری۔ ''اماں تم......! تم یہاں کہاں......؟''
چونک کر پیچھے دیکھا اور پہچان لیا۔ کمال الدین پہلوان تھے۔ بابا شاہجہاں کے مزار پر انہوں نے مجھ پر دو احسان کئے تھے۔ ''اماں! پہچانا ہمیں یا نہیں میاں صاحب......؟ وہ بابا جی کے مزار پر...... ایں! یہ تو وہی لونڈا ہے جس نے تم پر وار کئے تھے گدے سے!'' اس بار کمالے پہلوان نے اکرام کو دیکھ کر کہا۔ میں نے کمالے پہلوان کو سلام کیا اور کہا۔ ''کیوں نہیں پہلوان صاحب! پہچان لیا میں نے۔''
''اماں! خورجہ کب آئے؟''
''تین چار دن ہوگئے۔''
''اور ہمارے پاس نہیں آئے اماں! قسم اللہ کی حد ہوگئی بے مروّتی کی اور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی پیارے! دشمن کو گلے لگائے لگائے پھر رہے ہو۔''
''دوستوں کو سب گلے لگاتے ہیں پہلوان صاحب! مزا دشمنوں کو گلے لگانے میں ہے۔'' میں مسکرا کر بولا۔
''ہائے...... ہائے...... ہائے! لاکھ روپے کی بات کہہ دی۔ ایمان کی قسم میاں! اللہ والوں کے درجے کو کون پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پہنچے ہوئے ہو مگر ایک شکایت ہے قسم اللہ کی!''
''کیا پہلوان صاحب......؟''

''خورجے آئے اور ہمیں نہ پوچھا کسی سے حالانکہ دعوت دے کر آئے تھے۔''
''آپ کی بے حد مہربانی ہے۔ایک کام سے خورجے آیا تھا۔''
''میاں! سارے کام ہوں گے مولا کے فضل سے۔ چلو ہمارے ساتھ! ایمان کی قسم اب نہیں چھوڑنے کے۔''
''کمالے پہلوان......!'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔
''نہ...... بالکل نہ! جو کہنا ہے گھر چل کر کہنا۔'' وہ کچھ اس طرح پیچھے پڑے کہ ایک نہ چلنے دی۔ مجبوراً ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ کمالے پہلوان ہم دونوں کو اپنے گھر لے گئے۔ صاحب حیثیت معلوم ہوتے تھے، گھر بھی بڑا تھا، مہمان خانہ الگ تھا۔ اسی سے متصل اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں لے پہنچے۔''یہ تمہاری قیام گاہ ہے میاں صاحب!''
''ہم آپ کے حکم سے یہاں آ گئے ہیں۔ کچھ دیر رک کر چلے جائیں گے۔''
''میاں! بڑی مشہور کہاوت ہے کہ مہمان آئے اپنی مرضی سے ہے، جائے کمالے پہلوان کی مرضی سے ہے۔ ابھی تو تم سے بڑی برکتیں سمیٹنی ہیں میاں صاحب! چھری تلے دم لو۔ تم تو ایسے بھاگ رہے ہو جیسے بجھار پیچھے لگا ہو۔''
''ہمارا سامان سرائے میں ہے۔''
''چمن خان آتے ہوں گے، اٹھا لائیں گے۔''
''سرائے کا مالک دے دے گا؟''
''کمالے پہلوان کا نام لیں گے چمن خان، میاں صاحب! آپ کی دعا سے اللہ نے بڑی بنا رکھی ہے۔'' غرض کمالے پہلوان کسی طور آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جگہ بہت عمدہ تھی۔ کمالے پہلوان سرائے کا نام پوچھ کر نکل گئے۔ اکرام خاموش تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چائے کے ساتھ واپس آئے لیکن ساتھ میں اتنا کچھ لائے تھے کہ دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ تین سینیاں بھری ہوئی تھیں جن میں مٹھائی، پھل اور نہ جانے کیا کیا تھا۔
''ارے یہ آپ نے کیا کیا......؟''
''اماں مولا قسم! ہم نے کچھ نہیں کیا، اللہ نے تمہارے لئے بھجوایا ہے۔ وہ ایک لونڈے نے شاگردی کی ہے، بڑے آدمی کا لونڈا ہے، وہی سب کچھ لایا ہے۔ کرم ہے مولا کا......!'' اس کے بعد کمالے پہلوان کا اصرار کہ سب کچھ کھائیں۔ ناک میں دم کر دیا۔ نہ کھانے سے ناراض ہونے لگے۔ ناک تک ٹھونسنا پڑا۔ چمن میاں سرائے سے سامان اٹھا لائے۔ بدقسمتی سے رات ہو گئی۔ بدقسمتی سے اس لئے کہ پھر کھانے کا وقت آ گیا تھا۔ کمالے پہلوان کھانے کے دیوانے تھے اور کھلانے کے شوقین! ان کا خیال تھا کہ تکلف کر رہے ہیں۔ نہ جانے کس طرح پیچھا چھوٹا۔ رات کو نو مولود کو اٹھا لائے۔''میاں صاحب! دم کر دو، تم اللہ والے ہو۔''
''میں گناہگار بندہ ہوں کمالے پہلوان! غلط فہمی میں نہ پڑو۔''
''سب پتا ہے مولا قسم ہمارے کو! جو دشمنوں کو گلے لگا لے، وہ کیا ہو سکتا۔ آہاہاہا......! کیا لاکھ روپے کی بات کہہ دی ہے تم نے میاں صاحب!'' یہ مرحلہ بھی گزرا اور پھر دوسری صبح ان سے مدعائے دل کہا۔
''میاں! ہمیں ایک صاحب کی تلاش ہے پہلوان صاحب!''
''نام بولو۔''
''گنگا دھر ہے ان کا نام، بیٹے کا نام ماتھر ہے۔'' میں نے بتایا۔
''سمجھ گئے۔ ویسے ایک بات کہیں میاں صاحب! خورجے میں کوئی پچاس گنگا دھر ہوں گے مگر ہم اس لئے سمجھ گئے کہ بابا جی کے مستانے وہی گنگا دھر ہیں جن کا تم نام لے رہے ہو۔ شاہجہاں کے مزار پر ملے تھے نا......؟''
''ہاں......!''
''بس! اسی لئے سمجھ لیا ہم نے۔ کیا کام ہے ان سے......؟''

''ملنا ہے۔''
''دوپہر کا کھانا کھا کر چلیں گے۔ ابھی کچھ لونڈوں کو زور کرانا ہے۔''
''بس! پتہ بتا دیں۔''
''جلدی ہے کیا؟''
''ہاں......!''
''شکور کو بھیج دیں تمہارے ساتھ؟''
''کون شکور؟''
''شاگرد ہے اپنا میاں صاحب! سب سے کام کا لونڈا ہے۔ کھٹیا کلی اور کلا جنگ تو ایسی مارتا ہے کہ پلک نہ جھپکے۔''
''وہ پتہ جانتا ہے؟''
''سمجھا دیں گے اسے!''
''عنایت ہوگی آپ کی!'' میں نے عاجزی سے کہا۔ کمالے پہلوان نے اپنے کلا جنگ کے ماہر شاگرد کو بلایا اور بولا۔ ''شکورے چندا! ذرا میاں صاحب کو گنگا دھر کے گھر لے جا۔ دیکھ، چھپی کی تلیا دیکھی ہے نا......؟''
''ہاں استاد!''
''بس! اس کے پیچھے دھنیا رام کا کوٹھا ہے، برابر کا گھر گنگا دھر جی کا ہے۔''
''وہ ڈاکٹرنی کے تاؤ؟'' شکورے نے پوچھا۔
''بس......بس، وہی۔'' کمالے پہلوان نے کہا اور شکورے تیار ہو گیا۔ میں نے اکرام کو ساتھ لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ کسی قدر پریشانی سے بولا۔ ''کتی دیر میں آپ کی واپسی ہوگی مسعود بھائی! اور تو کوئی پریشانی نہیں بس پہلوان صاحب کھلا کھلا کر ہلاک کر دیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں بس رات کو چند گھنٹے مل گئے تھے ورنہ ہر تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہ کچھ آ رہا ہے۔ ناشتے ہی نے حلیہ خراب کر دیا ہے۔'' میں ہنسنے لگا۔ میں نے وعدہ کیا کہ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ بس دل نے کہا تھا کہ اسے ساتھ نہ لے جاؤں، خدا جانے کیا صورتحال پیش آئے۔ ہاں وہاں سے روانہ ہو کر جب کافی دور نکل آیا تو دل کئی بار بری طرح دھڑکا۔ میں نے استغفار پڑھی۔ خود کو سمجھایا، دل کو سمجھایا۔ بیکار ہے اسے دل میں بسانا بیکار ہے۔ میں انسان ہوں ہی کہاں! میں تو بس ایک گناہ ہوں۔ زندگی کی جتنی سانسیں باقی ہیں، بس کفارہ ہیں، صرف کفارہ......! اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ثریا کے بارے میں گنگا دھر جی کو بتا دوں گا کہ وہ کون ہے۔ بس ضروری باتیں بتا دوں گا۔ تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ دوں گا کہ اس کا بھائی موجود ہے۔ یہ بھی کہوں گا کہ ان بے چاروں کو کہیں رکھوا دیں بلکہ اس کے لئے کمال الدین پہلوان زیادہ موزوں ہیں۔

✦✧✦✧✦

ان دونوں کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی جائے۔ یا اگر اکرام کچھ اور پسند کرے تو پھر اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ ظاہر ہے انہیں کہاں ساتھ لئے پھروں گا؟ اور پھر مناسب بھی نہیں ہوگا۔ بھٹکتا رہوں گا۔
راستہ انہی سوچوں میں گزر گیا۔ اس وقت چونکا جب کسی نے قریب آ کر کہا۔
''ارے تم...... بھیا! تم......؟
میں نے چونک کر دیکھا۔ رام جی تھے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا۔
''ارے رام جی......!''
''چولہے میں گئے رام جی۔ ہم تمہارے کون ہیں؟''
''ناراض ہو رام جی؟''

''واہ رے، ٹانگیں سوجا دیں ہماری...... سارا دن تلاش رہی تمہاری۔ دھرما الگ، ہم الگ۔ کم پریشان کیا گنگا جی نے؟''

''اوہ...... وہاں؟''

''تو اور کیا؟''

''ہم جائیں یا ہمارے ساتھ چلو گے؟'' شکورے نے پوچھا۔

''تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ رام جی! تم کمالے پہلوان کو جانتے ہو؟''

''لو...... انہیں کون نہ جانے۔''

''گھر پتہ ہے ان کا؟''

''پتہ ہے۔''

''بس ٹھیک ہے شکور! تم جاؤ، میں آجاؤں گا۔''

''شکور کو روانہ کر کے میں نے رام جی سے کہا۔

''اب شکایتیں کئے جاؤ گے یا گنگا دھر کے پاس لے جاؤ گے؟''

''سو تو لے جانا ہی ہے۔ مگر ہم تمہیں ایک بات اور بتائیں۔'' رام جی نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سامنے کے دروازے سے پریما دیوی باہر نکل آئیں۔ رام جی کو آواز دینا چاہتی تھیں کہ مجھے دیکھ کر رک گئیں۔ پھر تیزی سے آگے بڑھیں اور مجھے بغور دیکھ کر بولیں۔

''ارے...... تم یہاں بھی آگئے؟...... جان چھوڑ دو ہماری بھیا! بھر پائے، ارے بھر پائے سب سے۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''گنگا جی سے مل کر چلا جاؤں گا چاچی جی!''

''پھر چلے گئے تم۔ ضرور چلے گئے۔ ارے بھیا! مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں ہم۔ شما کر دو ہمیں۔''

''مالکن! مالک سنیں گے تو ناراض ہوں گے۔ اندر لے چلیں انہیں۔ میری بھی موت آجائے گی۔'' رام جی نے کہا۔

''لے جا...... لے جا...... بس آ گئی شامت۔ آؤ'' وہ برا سا منہ بنا کر بولیں اور میں رام جی اور پریما دیوی کے ساتھ چل کر اندر داخل ہو گیا۔

گنگا دھر ایک مسہری پر لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ کھلے ہوئے منہ میں نہ جانے کیسے حقے کی نے اٹکی رہ گئی۔ پھر وہ زور سے اچھل کر سیدھے ہو گئے۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھ پر جمی ہوئی تھیں، پھر بڑے غصے سے حقے کی نے منہ سے نکالی اور سنبھل کر بولے۔

''تم...... تم یہاں کیسے آ گئے میاں جی؟''

''گنگا جی!...... میں...... میں مسعود ہوں۔''

''ارے تو ہم باؤلے ہو گئے ہیں؟...... اندھے ہو گئے ہیں کیا کہ تمہاری شکل بھی نہ پہچانیں؟ ارے ہمارا تمہارا واسطہ کیا۔ مل گئے تھے راستے میں۔ رشتے ناتے تو نہیں تھے، وہ تو انسانی ہمدردی تھی جو تم نے سمیٹی اور اس کے بعد کہے سنے بنا رفو چکر ہو گئے...... بھیا! میل جول تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی رشتہ ناتا ہو۔ یہاں تو دھرم بھی ایک نہیں ہے۔ پھر یہاں کیسے آ گئے تم؟''

''اگر آپ میرے کہے سنے بغیر چلے جانے پر ناراض ہیں گنگا دھر جی! تو خدا کیلئے مجھے معاف کر دیجئے گا۔ آپ لوگوں سے کچھ اتنا پیار ہو گیا تھا وہاں کہ جدا ہوتے ہوئے دل دکھ رہا تھا۔ بس میں نے سوچا کہ آپ مجھے وہاں سے اپنے ساتھ لے جانے کیلئے کہیں گے۔ میں جا نہیں سکتا تھا۔ بس اسی الجھن کا شکار ہو کر خاموشی سے آپ سے دور ہو گیا۔''

''خاموشی سے آپ سے دور ہو گیا...... ارے کتنے پریشان رہے تھے ہم تمہارے لئے۔ یہ تو سوچا ہوتا...... انسان،

انسان سے ملتا ہے۔ کون کسی کو روک سکتا ہے بھیا! نہ دھرم نہ ناتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ دیتے کہ خورجے آؤ تو ہم سے مل لینا۔ پیار ہی ہو جاتا ہے انسان کو انسان سے...... مگر تمہیں نہیں ہوا بھیا!...... اب کیسے آ گئے ہو یہاں گنگا دھر کے ہاں؟''

''گنگا دھر جی! بڑی عجیب سی کہانی ہے۔ آپ کی ناراضگی کو دل سے مانتا ہوں۔ مگر آپ یقین کیجئے میرا آپ سے دور ہو جانا ہی مناسب تھا۔ کیا آپ کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ وہاں آپ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا میری ہی وجہ سے ہوا۔ وہ سادھو میرا دشمن ہے۔ میری وجہ سے اس نے آپ کو وہاں سے واپس جانے کیلئے کہا تھا۔ کیونکہ آپ مجھ سے ہمدردی کر رہے تھے۔ وہ اسی کا ہرکارہ تھا گنگا دھر جی! جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اس رات کے واقعات کے بعد یہی سوچا کہ آپ سے دور ہو جاؤں۔ کہیں آپ کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائیں۔''

''تمہاری کیا دشمنی تھی اس سے؟...... ارے وہ تو اس بے چاری بچی کا دشمن تھا۔ لے گیا پاپی اسے۔ بھگوان کا ناس کرے۔ سادھو نہیں تھا بھیا! وہ...... ارے وہ تو ایک جادوگر تھا۔ مہا پاپی، گندا، گھوری۔ چھی......'' گنگا دھر جی نے زمین پر تھوک دیا، مگر ان کے الفاظ نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔

''لے گیا؟...... کک...... کیسے؟'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ارے وہ بچی تھی نا ہمارے پاس۔ بے چاری ثریا۔ تمہارا بھی دشمن تھا وہ اور اس کا بھی۔ ہمیں تو یہ لگتا ہے کہ اس کی زبان بھی اس پاپی نے کاٹی تھی اور انگلیوں کے پور بھی۔ بھیا! نجانے کیا دشمنی چل رہی تھی۔ بچی تو بڑی معصوم تھی۔''

''وہ ثریا کو لے گیا؟...... کب؟...... کیسے؟...... کہاں؟'' میں نے بے اختیار سوالات کئے۔

''لمبی کہانی ہے۔ بیٹھ جاؤ مسعود! بھگوان کی سوگند دل کے اتنے نرم نہ ہوتے تو سچ مچ پریما کے کہنے کے مطابق کچھ بن گئے ہوتے۔ مگر یہ پاپی جو سینے میں دھڑکتا ہے نا، بڑا پیار کرتا ہے انسانوں سے۔ سارے کرودھ ڈھل جاتے ہیں۔ بس کیا بتائیں تمہیں۔ ارے بیٹھو! اونٹ کی طرح منہ اٹھائے کیوں کھڑے ہو؟ جب آئے ہو کچھ سمجھ کے تو تھوڑی دیر بیٹھو۔ کچھ جل پان کرو۔''

''گنگا دھر جی! مجھے...... مجھے ثریا کے بارے میں بتایئے۔'' میرا دل سینے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ اس وقت بھلا گنگا دھر کی باتوں میں کیا دلچسپی لے سکتا تھا۔

''بتاتے ہیں...... بتاتے ہیں۔ ہم دن بھر تمہیں وہاں تلاش کرتے رہے۔ رام جی سے پوچھ لو، دھرما سے پوچھ لو، ماتھر سے پوچھ لو۔ ارے سب سے پوچھ لو۔ نہیں ملے تم۔ ادھر گھر والی کی جان نکلی جا رہی تھی۔ سو چل پڑے بھیا! گھر آ گئے اپنے۔ دو تین دن تک تمہیں یاد کرتے رہے اور پھر اپنے منہ پر تھپڑ لگائے کہ ہر ایک کو دل میں بسا لیتے ہو۔ ارے کوئی کہیں کا، کوئی کہیں کا۔ پھر وہی بات ہیں گے کہ نہ تو دھرم کا ناتا نہ خون کا۔ ملے، کام نکلا، چلے گئے۔ بس بھول گئے تمہیں۔ مگر اس پاپی نے پھر یاد دلا دیا۔

شام کا وقت تھا۔ گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹایا کسی نے۔ ماتھر نے دروازہ کھولا تو وہ اس سادھو کو دیکھ کر ڈر گیا۔ پاپی گھسا ہی چلا آیا۔ ہم بیٹھے تھے برآمدے میں۔ دھرم پتنی بھی ساتھ تھیں۔ وہ تو بس ہے ہی بھگوان کی گائے۔ چیخ مار کر اندر بھاگ گئی۔ سادھو مہاراج نے ہمیں گھورتے ہوئے کہا کہ وہ لڑکی ثریا کہاں ہے؟ سچ بتائیں۔ ہماری بھی سٹی گم تو ہو گئی تھی مگر ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولے۔ ''کون ہو تم بھائی؟''

''بھوریا چرن ہے ہمارا نام۔''

''ہم سے کیا کام ہے مہاراج؟''

''تمہاری دھرم پتنی جانتی ہے کہ ہمیں تم سے کیا کام ہو سکتا ہے۔''

''ارے تم وہی سادھو تو نہیں ہو جس نے ہمیں شاہجہاں بابا کے مزار سے بھگایا تھا؟''

''لعنت ہے تم پر...... ہندو دھرم کے ہو اور مزاروں کی باتیں کرتے ہو۔ آخر تمہارے دھرم سے ان مزاروں کا کیا

واسطہ؟''

بھیا! ہمیں بھی غصہ آ گیا۔ بات یہ ہے کہ بابا شاہجہاں پر تو ہم جان دیتے ہیں۔ ارے کوئی بھی دھرم ہو کسی کا' انسان تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ بابا جی کے مزار پر جا کر ہمیں ہمیشہ سکون ملتا ہے تو چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بتائے وہ کیا چاہتا ہے اور ثریا سے اس کا کیا واسطہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ خاموشی سے ثریا کو اس کے حوالے کر دیا جائے...... اس کا یہاں رہنا ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ کہہ گیا کہ ثریا کو خاموشی کے ساتھ پیتل کنڈ پہنچا دیا جائے۔ وہ وہاں موجود ہوگا...... ہم نے کہا۔ جاؤ' جاؤ۔ ہو گے سادھو سنت اپنے گھر کے۔ ہمارا نام بھی گنگا دھر ہے۔

وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر ثریا پیتل کنڈ نہ پہنچی تو نقصان کے ذمہ دار ہم خود ہوں گے۔ پیتل کنڈ ایک پرانا کھنڈر مندر ہے۔ کبھی اس میں کرشن بھگوان کی پیتل کی بہت بڑی مورتی لگی ہوئی تھی۔ مگر کچھ پاپی چور اسے چرا کر لے گئے اور اس کے بعد سے وہاں طرح طرح کے کھیل ہونے لگے۔ چنانچہ بھیا! لوگوں نے ادھر آنا جانا بند کر دیا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ آخر یہ سادھو بے چاری ثریا کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ گھر والی اندر کھٹیا پر جا پڑی تھی۔ پوچھا اس سے تو کہنے لگی وہی سادھو تھا جو وہاں خیمے میں آ گھسا تھا اور جس کی وجہ سے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ سب پوچھنے لگے ہم سے کہ اب وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ تو ہم نے ثریا کے بارے میں بتا دیا۔ رُکمنی تو جان کو آ گئی۔ کہنے لگی' پران دے دے گی' ثریا کو گھر سے نہیں جانے دے گی۔ ماتھر خاموش تھا۔ مگر پریما دیوی کی زبان چل پڑی تھی کہ ثریا کو فوراً گھر سے نکال دیا جائے۔ جو دیکھا ہے اس کے بعد خطرہ مول نہ لیا جائے۔ بھیا! انسان تھی' گونگی تھی بے چاری۔ سیدھی سادی تھی۔ ہم تو ہیں ہی پریم کے مارے لڑ گئے گھر والی سے کہ ثریا نکلی تو ہم بھی گھر سے باہر نکل جائیں گے۔ رُکمنی ہمارے ساتھ تھی۔ باقی لوگ کوئی رائے نہیں دے رہے تھے' مگر رات کو بھیا! بھونچال آ گیا۔ گھر کا گھر وا ہو گیا۔ ارے رات بھر انگارے برسے۔ جو چیز کھلے میں پڑی تھی' جل کر راکھ ہو گئی۔ رُکمنی کے کمرے میں اندر سے آگ لگ گئی۔ سارا سامان جل گیا اس کا۔ کپڑے' پلنگ' بستر۔ وہ تو ہماری بٹیا بچ گئی۔ نہیں تو وہ بھی بھسم ہو جاتی۔ بڑی پریشانی ہو گئی۔ رُکمنی تو رونے لگی تھی۔ مگر پریما دیوی نے سارے ہاتھ پاؤں نکال لئے۔ مرنے مارنے پر تیار ہو گئیں۔ آتما ہتیا کرنے پر تل گئیں۔ ثریا بے چاری کو بھی صورتحال کا پتہ چل گیا تھا۔ سادھو کو تو اس نے نہیں دیکھا تھا مگر روئے جا رہی تھی مسلسل۔ پھر اس نے اشاروں میں کہا کہ اسے سادھو کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کا یہاں رہنا گھر والوں کیلئے خطرناک ہے۔ بھیا! ہماری زبان بھی بند ہو گئی۔ اب اپنے گھر میں کون آگ لگاتا ہے؟ تم خود سوچو۔ پھر یہ بلا ٹلی تو دوسری رات گھر میں مکڑیاں گھس آئیں۔ جدھر دیکھو مکڑیاں' جدھر دیکھو مکڑیاں۔ ہر چھت سے مکڑیاں اتر رہی تھیں۔ دیواروں پر' زمین پر۔ پاؤں رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ چھت پر سے جالے بنا بنا کر نیچے اتر رہی تھیں۔ کسی کے کندھے پر تو کسی کے سر پر۔ گھر سے نکل بھاگے سارے کے سارے۔ بھلا کیسے ٹکتے؟ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ ثریا بھی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور رو رو کر اشارے کر رہی تھی کہ اسے سادھو کے حوالے کر دیا جائے۔ بھیا! کوئی چارہ نہ رہا اس کے سوا کہ ثریا کو پیتل کنڈ پہنچا دیں۔ روتے پیٹتے چھوڑ آئے اسے وہاں اور کیا کرتے؟ مجبوری تھی...... بالکل ہی مجبوری تھی۔''

گنگا دھر جی کی آواز بھرا گئی۔ لیکن میرا دل بری طرح دکھ رہا تھا۔ میں خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک بار پھر دل میں ثریا کی محبت سینہ توڑ کر ابھر آئی تھی اور میری آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''گنگا دھر جی! پیتل کنڈ کہاں ہے؟''

''جاؤ گے وہاں؟''

''ہاں...... اسے تلاش کروں گا۔''

''مگر...... مگر تمہارا اس سے کیا واسطہ ہے؟''

''گنگا دھر جی! بس آپ یہ نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔''

''ارے بھیا! ہمیں بھی انسان سمجھو۔ تم تو چار گھنٹے کی ملاقات میں اس کیلئے آنسو بہا رہے ہو۔ ہم سے پوچھو...... رُکمنی

سے پوچھو جو بیمار پڑی ہوئی ہے۔ بستر سے لگ گئی ہے اس کے غم میں۔ پریما بھی خوش تھوڑی ہے اسے نکال کر؟...... پریم سے رکھا ہوا تھا' بیٹیوں کی طرح۔ مگر کیا کریں؟ اپنے گھر پر جب مصیبت ٹوٹے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔" گنگا دھر جی دکھ سے بولے۔

"گنگا دھر جی! وہ بڑی معصوم لڑکی ہے۔ اس کا بھائی میرے ساتھ آیا ہے۔ بے چارہ بھائی اپنی بہن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یوں سمجھ لیجئے ایک لمبا چکر ہے اور آپ اس کے بارے میں نہ ہی جانیں تو زیادہ اچھا ہے۔ آپ کا ہنستا کھیلتا گھرانہ تباہ ہو جائے گا۔ اچھا ہی ہوا' آپ نے اس بے چاری کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ مگر اس کا بھائی اس کیلئے دیوانہ ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ ہی یہاں تک آیا ہے۔ میں خود شاید خورجہ نہ آتا لیکن آپ کو تلاش کرتا ہوا آیا ہوں ثریا کی وجہ سے۔ تاکہ وہ اپنے بھائی کو مل جائے۔"

گنگا دھر جی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے' پھر بولے۔

"ہم ہی لے چلتے ہیں تمہیں۔ پیتل کنڈ بہت دور ہے آبادیوں سے...... مگر اب وہ تمہیں کہاں ملے گی؟ بیکار ہی ہے سب کچھ بیکار ہی ہے۔"

رُکمنی کو بھی میری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ خود ہی اٹھ کر گنگا دھر کے کمرے میں آ گئی۔ میں نے دیکھا وہ پہلے کی نسبت کافی لاغر ہو گئی ہے۔ مجھ سے کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ گے؟...... کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔"

"جی......" میں نے کہا۔

"جاؤ...... ہو آؤ اس کیساتھ۔ جب سے بیمار پڑی ہے۔ سمجھاؤ اسے' کچھ نہیں ملے گا بھیا! یہ جادو ٹونوں کے چکر ہیں۔ ارے ہم کیا اور ہماری اوقات کیا کہ ان جھگڑوں سے نمٹیں۔ پریما ٹھیک کہتی ہے۔ جاؤ...... جاؤ چلے جاؤ اس کے ساتھ۔"

میں رُکمنی کے کمرے میں آ گیا۔ رُکمنی کافی غمزدہ معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی۔ "تاؤ جی نے تمہیں ساری باتیں' بتا دی ہوں گی مسعود!"

"ہاں رُکمنی دیوی!"

"نجانے قصہ کیا ہے؟...... ایک ہندو جوگی کو جو گندے علم کا ماہر بھی معلوم ہوتا ہے' ثریا کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے بھی مسعود! بڑی پراسرار لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ جان ہی نہیں سکی میں۔ لیکن یقین کرو' بڑی محبت ہو گئی تھی مجھے اس سے۔ تم بھی اس معاملے میں کچھ ملوث ہو۔ کم از کم دل کے سکون کیلئے یہ تو بتا ہی دو کہ اصل قصہ کیا ہے؟"

"میں اس معاملے میں ملوث نہیں ہوں رُکمنی دیوی! بس یوں سمجھ لیجئے کہ وقت نے مجھے اس سے ملوث کر دیا۔ یہ سب کالے جادو ہی کا چکر ہے۔ وہ بدمعاش جوگی جس کا نشان لکڑی ہے' ایک غلیظ جادوگر ہے اور ثریا کے بھائی اکرام سے وہ اپنے جادو کی تکمیل کیلئے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ اکرام نے وہ کام نہیں کیا تو اس نے اکرام کو قیدی بنا لیا۔ ثریا کی زبان بھی اس نے کاٹی صرف اس شخص کو اپنے کام کیلئے آمادہ کرنے کی غرض سے۔ غرض یہ کہ وہ نوجوان مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے اپنی بہن کی کہانی سنائی اور مجھے یہ پتہ چل گیا کہ ثریا ہی اس کی بہن ہے۔ بس میں اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا اور یہاں آ کر یہ غمناک خبر سنی کہ ثریا کو وہ جوگی ایک بار پھر لے گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔"

"کیا وجہ ہے؟" رُکمنی نے بے اختیار پوچھا۔

"جب اس جوگی نے دیکھا کہ وہ اپنے کام میں ناکام ہو گیا ہے تو اس لڑکی کے ذریعے اس کے بھائی کو مجبور کرنے کیلئے اس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس بات کا مجھے علم ہے کہ بھوریا چرن اب وہی سب کچھ کرے گا اس شخص کے ساتھ جو اس نے...... جو اس نے......" اور پھر میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بے خیالی میں' میں رُکمنی کو اپنے بارے میں بتانے جا رہا تھا۔ رُکمنی نے بھی شاید میری بات پر توجہ نہیں دی تھی' کہنے لگی۔

''یہ تو ظلم ہے۔ ایک انسان کا انسان پر ظلم۔ کوئی اس بے چاری کو اس ظالم سے نہیں بچا سکتا؟''
''اللہ بچانے والا ہے...... یقینی طور پر وہ اس کی مدد کرے گا۔''
رُکمنی مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''ہنسو ایک بار...... تمہاری ہنسی کائنات کا نقشہ بدل دیتی ہے۔''
''نہیں...... ہنس نہیں سکتا رُکمنی دیوی! نہیں ہنس سکتا۔''
''کیوں؟'' اس نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''بس نہیں ہنس سکتا۔ ہنسی میری تقدیر سے نکل چکی ہے۔''
''تو کیا تم بھی؟'' رُکمنی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''جی......؟'' میں سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔
''تو کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہو؟...... کیا تم بھی اسے چاہنے لگے ہو؟''
رُکمنی کے سوال نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا تو وہ بولی۔
''میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں ...... پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ وہ تمہیں چاہنے لگی تھی...... وہ...... وہ...... عورت ہوں میں اور عورت ہی عورت کو صحیح طور پر سمجھ سکتی ہے۔ ایسی اداس اداس سی رہتی تھی' ہمیشہ جیسے اس سے کوئی بہت ہی قیمتی شے چھن گئی ہو۔ میں نے ایک بار تمہارا نام لے دیا تھا اس کے سامنے۔ پوچھا تھا اس سے کہ کیا وہ تمہیں چاہنے لگی ہے؟ تو ایسی بلک بلک کر روئی تھی کہ دل پھٹنے لگا تھا۔ بھگوان کی سوگند مسعود! وہ تمہیں چاہنے لگی تھی...... وہ بہت زیادہ...... بہت ہی زیادہ...... عورت ایسی ہی چیز ہوتی ہے۔ گھائل ہوتی ہے تو ایک ہی نظر میں اور نہیں ہوتی تو اس کے پورے بدن کو داغدار کر دو' کبھی گھائل نہیں ہوتی۔ اب کیا کرو گے؟...... یہ بتاؤ' کیسے مدد کرو گے اس کی؟...... کہاں ملے گی وہ؟''
''اللہ جانتا ہے۔ میں کیا کہوں؟''
رُکمنی کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ پھر گنگا دھر جی نے ہی آواز دی تھی۔
''ارے چل رہے ہو کیا؟...... میں نے تانگہ منگوا لیا ہے۔'' میں رُکمنی سے اجازت لے کر گنگا دھر جی کے ساتھ باہر نکل آیا اور تانگہ اس سمت چل پڑا جسے پٹیل کنڈ کا نام دیا گیا تھا۔
پرانا مندر تھا اور اب کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے عقب میں مرگھٹ تھا۔ مگر میں خود بھی جانتا تھا کہ یہاں آنا بیکار ہے۔ بھوریا چرن یہاں بیٹھا تھوڑی ہوگا۔ پھر بھی ہم نے مندر کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ گنگا دھر نے تو حلق پھاڑ پھاڑ کر شریا کو آوازیں بھی دی تھیں۔ ان کی آواز میں محبت تھی' درد و کرب تھا۔
''بھگوان ناس کرے اس کا کہ جانے کہاں لے گیا۔''
''چلیں۔'' میرے حلق سے بمشکل آواز نکل سکی تھی۔
''تو اور کیا...... بس نہ جانے کیوں...... من چاہا تھا تمہارے ساتھ ادھر آنے کا۔''
تانگے والے کو روکے رکھا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ کر واپس چل پڑے۔
''پتہ ہی نہیں چل سکا کون تھی۔ کیا بپتا پڑی تھی بے چاری پر۔ تم نے بتایا تھا اس کا بھائی ملا ہے تمہیں۔''
''ہاں۔''
''کہاں ہے وہ؟''
''یہیں' میرے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔''
''کہاں؟''
''کمال الدین پہلوان کے ہاں۔ آپ مجھے وہیں اتار دیں۔''
''میرے پاس نہیں رکو گے؟''

''ابھی نہیں گنگا دھر جی! اسے سنبھالنا بھی ضروری ہے۔'' میں نے کہا اور گنگا دھر خاموش ہو گئے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی' پھر گنگا دھر نے کہا۔

''ایک بات کہیں بیٹا! پوری کر دو گے؟''

''کہئے گنگا جی!''

''وچن دو ہمیں' اگر ثریا مل جائے تو ایک بار...... بس ایک بار اسے ہمارے پاس ضرور لانا۔ بیٹی سمجھنے لگے تھے ہم اسے۔ ہمارے بھیا کے یہ دو بچے تھے۔ ہمارے پاس ہی رہے۔ سسری گونگی تھی مگر بھول نہ سکیں گے اسے جیون بھر۔''

گنگا دھر رونے لگے۔ میرے بھی آنسو نکل گئے تھے۔ ان سے وعدہ کر کے میں اپنی منزل پر اتر گیا تھا۔ اچھا ہوا تھا کہ اکرام کو ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ اس سے اس بارے میں بات بھی نہیں کی تھی ورنہ اسے آس ہو جاتی۔ اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ پتہ چل جاتا تو اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔

میں کمالے پہلوان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ کمالے پہلوان موجود نہیں تھے۔ کچھ شاگرد اکھاڑے میں کام کر رہے تھے۔ مجھے بڑے ادب سے سلام کیا۔ شاید کمالے پہلوان نے انہیں میرے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بتا دیا تھا۔

اکرام کمرے میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا ورنہ دل تو اندر سے بری طرح زخمی تھا۔

''کہاں ہو آئے مسعود بھائی؟''

''بتایا تھا تمہیں' گنگا دھر جی سے ملاقات ہو گئی۔''

''اوہو...... کام ہو گیا آپ کا؟''

''ہاں۔'' میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور اکرام ہنسنے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''یہاں سے کب چلنا ہے مسعود بھائی؟''

''کیوں؟...... کیا بات ہے؟''

''کمالے پہلوان ہمیں کھلا کھلا کر مار دیں گے۔ بڑا دلچسپ نظریہ ہے ان کا۔''

''کیا؟'' میں نے بیٹھ کر پوچھا۔

''کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں زمین پر اتاری ہیں ان سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ ورنہ روز قیامت ایک اور گناہ کا جواب دینا پڑے گا۔''

''کچھ اور کھلایا ہے؟'' میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ صبح کا ہولناک ناشتہ مجھے یاد تھا جو استاد کمال الدین نے ہمیں ناک تک ٹھنسا دیا تھا۔

''آپ کے جانے کے کچھ دیر بعد سرخ سرخ ٹماٹر نمک چھڑک کے ہوئے سینی بھر کے لے آئے اور بیٹھ گئے کھلانے۔ کہنے لگے خون کی کمی پوری ہوتی ہے ٹماٹروں سے۔ بڑی مشکل سے خاصے ٹماٹر کھانے کے بعد پیچھا چھوڑا تھا کہ کچھ دیر کے بعد سیر بھر شکر قندیوں کے ساتھ نازل ہو گئے۔ فرمایا کہ بھاڑ پر بھنوا کر منگوائی ہیں' خاص طور سے ہمارے لئے۔ نہ کھانا گناہ...... بلکہ اگر زیادہ انکار کیا جائے تو دھوبی پاٹ مار کر چت کر دیں گے اور سالم شکر قندی حلق میں اتار دیں گے۔ ایسے ہی تیور ہوتے ہیں ان کے کسی چیز کے کھانے سے انکار پر۔''

میں ہنسے بغیر نہیں رہ سکا۔ اکرام نے کہا۔ ''ہنس لیجئے۔ آپ کیلئے بھی احکامات دے دیئے گئے ہیں۔''

''کیا؟'' میں نے سہم کر پوچھا۔

''کافی بچ گئی تھیں۔ مگر شاگردوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ ساتھ ہی ایک شاگرد کو حکم دیا گیا کہ شبن بھڑ بھونجے سے کہہ دے کہ شام کو کچھ اور شکر قندیاں بھون دے میاں صاحب کیلئے...... ٹھنڈی ہو کر خراب ہو جاتی ہیں۔''

''واقعی' خوب ہیں ہمارے پہلوان۔''
''ماشاء اللہ ان کی خوراک بھی قیامت ہے۔ حالانکہ جسامت ایسی نہیں' مگر خوب کھاتے ہیں۔''
تھکن ہوگئی تھی۔ اپنی بپتا کسی کو نہیں سنا سکا تھا۔ دل پر بھاری بوجھ تھا۔ بھوریا چرن نے جوابی کارروائی کی تھی۔ نہ جانے بے چاری ثریا کس حال میں ہو؟...... وہ جانتا تھا کہ اکرام میرے پاس ہے اور یقیناً اپنی داستان بھی سنائے گا اور اس کے بعد میں خورجے کا رخ ضرور کروں گا' چنانچہ وہ ثریا کو لے گیا تھا۔
زیادہ دیر آرام نہیں کر سکا تھا کہ کمال الدین پہلوان کی دھاڑ سنائی دی۔
''اماں آ گئے کیا میاں صاحب!...... ابے کچھ کھلایا پلایا میاں صاحب کو یا سوکھا ہی ڈال رکھا ہے؟'' یہ الفاظ انہوں نے اپنے کسی شاگرد سے کہے تھے۔ پھر اندر آ گئے تھے۔
''ملاقات ہوگئی میاں صاحب! گنگا دھر سے؟''
''جی پہلوان صاحب!''
''ایک خوشخبری لایا ہوں آپ کیلئے۔''
''کیا پہلوان صاحب؟''
''یہ تمنا خان پہلوان میرٹھ والے کو سنا ہے کبھی؟''
''نہیں۔''
''جادو ہے آواز میں۔ پاگل کر دیتے ہیں سننے والے کو۔ کل شام کو آ رہے ہیں صوفی جبار کے ہاں۔ قوالیوں کی محفل جمے گی۔ صوفی جبار کے پوتے کا عقیقہ ہے۔ بتایا تھا میں نے آپ کے بارے میں۔ بے چین ہو گئے ملنے کیلئے۔ مگر انتظام میں لگے ہوئے ہیں۔ شام کو خود آئیں گے دعوت دینے۔''
مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر انہوں نے کلائی الٹی کر کے گھڑی میں وقت دیکھا اور بولے۔
''ابے لو...... کھانے کا ٹیم ہو گیا اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ کھانا لگواتا ہوں میاں صاحب! ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاؤ۔''
کھانے سے فراغت کے بعد اکرام نے پوچھا۔
''خورجے میں کب تک قیام کریں گے مسعود بھائی؟''
''اب یہاں کوئی کام نہیں رہا ہمارا۔''
''کل عقیقے میں شرکت کریں گے؟''
''نہیں۔''
''کمال الدین پہلوان چھوڑ دیں گے ہمیں؟''
''ہاں اکرام! یہ مشکل پیش آئے گی۔ مگر اس کا یہی حل ہے کہ خاموشی سے نکل جایا جائے۔''
''اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اکرام نے کہا۔
میں خاموشی سے کچھ سوچتا رہا' پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔
''اکرام!...... تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟''
''کیا ہو سکتا ہے بھائی!...... میری زندگی تو کھلی کتاب ہے۔ بہن کی تلاش کی حسرت ہے۔ وہ مل جائے تو جینے کی سوچوں' ورنہ زندگی کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔''
''میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں اکرام؟'' میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔
''مجھے خود سے جدا کرنا چاہتے ہیں مسعود بھائی؟''

"یہ تو کرنا پڑے گا اکرام! تم میرا ساتھ کہاں تک دو گے؟" میں نے کہا اور وہ چھلک پڑا۔ پھر ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔
"میرا بھی تو دنیا میں کوئی نہیں ہے بھائی!...... کوئی منزل بھی نہیں ہے میری۔ کوئی نشان بھی نہیں ہے کہ بہن کو تلاش کروں۔ بھٹکنا ہی ہے مجھے۔ اپنے ساتھ رہنے دیں مجھے بھائی! جہاں بھی جائیں۔ آپ کے ساتھ چلوں گا۔ کبھی آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دوں گا۔ آپ کا ہر حکم چھوٹے بھائی کی طرح بجالاؤں گا۔ آپ پر کبھی بوجھ نہیں بنوں گا۔ میں اکیلا کیسے جی سکتا ہوں بھائی!" وہ زار و قطار رونے لگا اور میرا دل بھی بھر آیا۔ میں نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔
"تجھے میرا غم نہیں معلوم اکرام!...... تجھے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم میرے بھائی! میں بھی...... میں بھی سینے میں طوفان چھپائے پھر رہا ہوں۔ میرا بھی بہت کچھ کھو گیا ہے...... اتنا کچھ کھو گیا ہے کہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے سینے میں بھی زخم ہی زخم ہیں۔ مگر میرے لئے کچھ ہدایات ہیں۔ آہ...... میں ابھی تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ میرا دل تیرے لئے دکھا ہوا ہے۔ لیکن شاید میرے پاس تیرے درد کا درماں نہ ہو۔ خیر اللہ مالک ہے۔ دیکھیں گے سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ تو اکرام!...... تو اپنی بہن کو تلاش نہیں کرے گا؟"
"کہاں تلاش کروں؟ اتنا بے دست و پا ہوں کہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتا۔ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں میرے۔ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ کوئی منزل نہیں ہے میرے سامنے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دیکھو بھائی! اگر تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تو مر جاؤں گا میں۔ مجھے سہارا درکار ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بنے رہیں تو کیا حرج ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"
میں نے اکرام کا شانہ تھپتھپایا' حالانکہ اپنے طور پر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا' کہاں ساتھ لئے پھرتا اسے۔ بے چاری ثریا' بھوریا چرن کے قبضے میں تھی۔ ہاں' بھوریا چرن کا جب بھی سامنا ہوا' میں اس مظلوم لڑکی کو اس کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس کے بعد...... اس کے بعد کیا ہوگا؟...... اس دوران اکرام نجانے کہاں سے کہاں نکل جائے؟...... جی سکے یا نہ جی سکے؟......
بے چارے کمالے پہلوان اپنی عادت سے مجبور تھے۔ نچلا بیٹھنا ہی نہیں آتا تھا۔ خاطر مدارت کے چکر میں دیوانے ہو گئے تھے۔ کچھ سوچنے سمجھنے نہ دیا اور ایک بار پھر نازل ہوئے۔ اس بار ایک بڑی سی سینی میں گنڈیریاں اور سنگھاڑے رکھے ہوئے تھے۔ لا کر ہمارے سامنے رکھ دیئے۔
"کالی تال کے سنگھاڑے ہیں' کیوڑے کے رس گلے۔ کھا کر دیکھو' کمرے بھر میں خوشبو نہ پھیل جائے تو ہمارا نام کمالے پہلوان نہیں ہے۔ اور یہ گنے' لالہ بنواری لعل کے کھیت کے ہیں جن کی ہم نے گنڈیریاں کتروائی ہیں آپ کیلئے میاں صاحب!...... چلو شروع ہو جاؤ۔ دیر نہ کرو۔"
"کمالے پہلوان! ابھی تو کھانا کھایا ہے۔"
"اماں تو کھانے کے بعد ہی کی تو چیز ہے یہ۔ چلو' چلو...... تکلف نہ کرو۔ کچھ بھی ہے' جوان تو ہو۔ یہی کھانے پینے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں نہ کھایا تو پھر کیا بڑھاپے میں کھاؤ گے' جب منہ میں دانت ہوں گے نہ پیٹ میں آنت...... چلو بھائی! شروع ہو جاؤ۔ تم کیسے ہو؟ شکل دیکھنے لگتے ہو کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر۔ جب ہم جوان تھے نا تو بس یوں سمجھ لو' سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے کھا جائیں۔"
کمالے پہلوان کا انداز ایسا تھا کہ کچھ دیر کیلئے ذہن سے سارے خیالات ہٹ گئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اکرام کا تو دم نکلنے لگا تھا' اب کمالے پہلوان کی صورت دیکھ دیکھ کر...... ہم نے ان کے کہنے پر کچھ گنڈیریاں اٹھا لیں اور انہیں چبانے لگے۔ کمالے پہلوان گنڈیریوں کی افادیت پر لیکچر دینے لگے تھے جو مسوڑھوں اور دانتوں کے بارے میں تھا...... پھر خدا کے فضل سے کسی نے انہیں باہر سے آواز دے لی اور وہ چلے گئے۔
اکرام خاموش خاموش تھا۔ میں نے بھی کوئی گفتگو نہیں کی۔ بہر حال مسئلہ تو گھمبیر تھا اور اس بارے میں فیصلہ کرنا میرے

لئے بھی مشکل تھا۔ ہاں میں نے یہ ضرور سوچ لیا تھا کہ اب مدد طلب کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ مجھے ہدایات ضرور لینا پڑیں گی اور اس کیلئے مراقبہ کرنا پڑے گا۔ یہ وہ عام بات نہیں تھی جس کا فوراً ہی فیصلہ کرلیا جائے۔ چنانچہ گنڈیریاں اور سنگھاڑے مصیبت بنے رہے اور اس کے بعد کمالے پہلوان ایک بار پھر آ گئے۔

''اماں ایک خوشخبری سنائیں آپ کو میاں صاحب! گنے کا رس نکلوایا ہے۔ رساول پکا رہی ہے گھروالی۔ رات کے کھانے میں مزہ آئے گا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ ساتھ میں گوبھی گوشت پکا لے۔ کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا'' میں نے آہستہ سے کہا۔ اب ساری توجہ اس بات پر ہوگئی تھی کہ اکرام کو ساتھ رکھا جائے یا نہیں؟ خود کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

رساول اور گوبھی گوشت منہ میں ٹھونسنا پڑا۔ میزبان کی دل آزاری بھی گناہ تھی۔ پھر جب رات بھیگ گئی' اکرام سو گیا تو اٹھ کر وضو کیا' ایک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ گیا۔ درود پاک کا ورد مبارک کیا۔ رہنمائی کی دعا مانگی اور انتظار کرنے لگا۔ ملعون بھوریا چرن ایک بڑی سی مکڑی کی شکل میں نظر آیا۔ زمین سے آسمان تک اس نے جالا تان رکھا تھا اور بڑے بڑے بدنما پیروں سے اس پر دوڑ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں کسی خاص سمت دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دور سے اکرام نظر آیا۔ وہ حیران و پریشان اس جالے کے تاروں پر چل رہا تھا۔ اس کے بھٹکے قدم کبھی ایک سمت اٹھتے' کبھی دوسری سمت...... مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اکرام کو شکار کرنا چاہتا ہے اپنے گھناؤنے مقصد کیلئے۔ ظاہر ہے وہ میرے ذریعے اس مقصد کی تکمیل میں ناکام رہا تھا۔ اب اکرام اس کی امید کا مرکز تھا۔ وہ آسانی سے اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کیلئے وہ سب کچھ کرے گا۔ پھر میں نے اسے اکرام کے عقب میں پہنچتے دیکھا۔ اکرام اس کی گرفت میں آنے والا تھا۔ اچانک ہی میں نے آگے بڑھ کر اکرام کا ہاتھ پکڑ لیا اور بھوریا چرن مجھے دیکھ کر واپس بھاگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ منظر ختم ہوگیا۔ یہ گویا اکرام کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ میں نے ذہن نشین کرلیا۔ اس کے بعد پھر ذہن میں ریل چلنے لگی۔ میں خود کو ریل میں سفر کرتا محسوس کر رہا تھا۔ باہر مناظر دوڑ رہے تھے۔ اسٹیشن آ رہے تھے اور ٹرین ان سے گزر رہی تھی۔ پھر ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر وہ رک گئی۔

اسٹیشن کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اس پر جوالا پور لکھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے ٹرین میں بیٹھا رہا' پھر ایک آواز سنائی دی۔ آخری اسٹیشن ہے' تمام مسافر اتر جائیں' آخری اسٹیشن ہے' میں خود بھی نیچے اتر آیا۔ پورا اسٹیشن خالی پڑا ہوا تھا۔ آدم نہ آدم زاد ...... چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں حیران پریشان کھڑا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ پھر میں اسٹیشن سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ باہر نکلا تو کسی گھوڑے کے ناک سے آوازیں نکلنے کی آواز سنائی دی۔ پورے اسٹیشن پر ایک تانگہ نظر آ رہا تھا۔ تانگے بان سامنے کے حصے میں کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف ملگجا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میرے قدم تانگے کی طرف بڑھ گئے اور تانگے والے نے کمبل اتار دیا۔ ایک سفید ریش بوڑھا شخص تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

''جلدی کرو' دیر ہو رہی ہے۔''

میں جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگے والا تانگہ ہانکنے لگا۔ بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑا اور تانگہ ایک پرانی مسجد کے سامنے رک گیا۔ فجر ہو چکی تھی اور میرے کشف کا اختتام بھی ...... مجھے میرے آئندہ عمل کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔ اذان کی تکرار کرتا ہوا اٹھ گیا۔ اکرام کو بھی جگاتا تھا۔ دل کو بے انتہا سکون کا احساس تھا۔ گویا میرے راستے اطمینان بخش ہیں۔

اکرام معصوم بچوں کی طرح سو رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور دل پھر بُری طرح دھڑک اُٹھا۔ کبھی غور نہیں کیا تھا اس پر' کبھی نگاہ نہیں جمائی تھی' لیکن اس وقت غور کیا تو اس کے چہرے میں ثریا کی شباہت نظر آئی۔ بہت مماثلت تھی بہن بھائی کے چہرے میں۔ دل میں ہوک اُٹھی۔ ثریا کی آنکھیں یاد آئیں' ان آنکھوں میں سب کچھ تھا۔ وہ اپنی ذات میں مکمل تھی۔ بس اس سے' اس کا اپنا آپ چھین لیا گیا تھا۔ اسے کچھ نہ رہنے دیا تھا اس شیطان نے۔ کتنے لوگ اس کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں؟ کتنی دلدوز کہانیاں جنم دی ہیں اس نے؟ اس ناپاک علم نے نجانے کہاں کہاں کس کس کو کیا کیا

نقصانات پہنچائے ہیں۔ یہ سفلی علوم کتنے خاندانوں کی بربادی کا باعث بنے ہیں؟ لیکن بہرحال شیطان کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرے اور جو صاحب ایمان ہیں وہ اس سے اپنا بچاؤ کریں۔

اللہ نے ان کیلئے تحفظ قائم ہے' مگر اس کا توڑ مکمل ہونا چاہئے۔ کم از کم ان لوگوں کو ظلم کا شکار نہیں ہونا چاہئے جو کالے جادو کا توڑ نہیں جانتے۔ اس کے لیے کون سا ایسا عمل ہو جو بروئے کار لایا جائے سوائے اس کے کہ کہیں کسی سفلی علم کے مہر کو دیکھا جائے اور اسے فنا کر دیا جائے' یقیناً یہ گناہ نہیں تھا۔ میں مقدور بھر کوشش کر سکتا تھا اس سلسلے میں' بلکہ مجھے اس کوشش کا آغاز فوراً کر دینا چاہئے تھا۔ آہ بے چاری ثریا مزار پر جا کر دُعائیں مانگتی تھی۔ رو رو کر فریادیں کرتی تھیں' راتوں کو اُٹھ کر نمازیں پڑھتی تھی' یقینی طور پر اس کے ہاتھ اپنے بھائی کی زندگی کے لیے پھیلتے ہوں گے۔ اس کی مصیبتوں کے خاتمے کے لیے وہ بے زبانی کے انداز میں دُعائیں مانگتی ہوگی اور ظاہر ہے بھائی کے علاوہ اور کون اس کی محبتوں کا محور ہوتا۔ اکرام کا جو معاملہ جہاں تھا بھوریا چرن اسکی تاک میں تھا اور بے چارہ معصوم نوجوان اس شیطان کی شیطنیت سے اپنا بچاؤ کیسے کر سکتا تھا۔ جس قدر اس کے بس میں تھا اس نے مدافعت کی تھی' پھر اس کی مدافعت دم توڑ گئی تھی اور وہ بحالت مجبوری کے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا کہ ایک صاحب تقدیس کے مزار کی بے حرمتی کرائی جائے سو اس نے رہنمائی فرمادی۔

✦✤✦✤✦

لیکن اب کچھ تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ بھوریا چرن اب تک وار کرتا رہا، اب میری طرف سے ان کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ مجھے اس کا تعاقب کرنا چاہئے اور اس کی شیطنیت کو ختم کرنے کے لیے رہنمائی طلب کرنی چاہئے۔ ذہن عجیب و غریب احساسات میں بٹا رہا۔ اکرام کے چہرے کے نقوش میں ثریا کی شباہت نظر آئی اور دل کی جو حالت ہوئی اس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ ثریا کو بھولنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے اجازت نہیں دی گئی تھی...... لیکن اپنے اس دل کو کیا کرتا جس میں لحہ لحہ وہ نقوش اُجاگر ہو جاتے تھے۔ دعائیں بھی مانگی تھیں میں نے اس کے لیے کہ میرا دل اس کے تصور سے آزاد ہو جائے، لیکن ہر بار کچھ کچو کے دل پر لگ جاتے تھے۔ آہ رُکمنی نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، اس نے بڑے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ عورت کو عورت جانتی ہے، اس نے کہا تھا کہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہیں چاہنے لگی تھی۔ ایسی افسردہ سی رہتی تھی جیسے اس سے کوئی بہت ہی قیمتی شے چھن گئی ہو۔ میں نے ایک بار تمہارا نام لے دیا تھا اس کے سامنے اور اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ تمہیں چاہنے لگی ہے تو ایسی بلک بلک کے روئی تھی کہ دل پھٹنے لگا تھا، بھگوان کی سوگند مسعود وہ تمہیں چاہنے لگی تھی۔ رُکمنی کے ان الفاظ نے دل میں گہرے زخم ڈال دیئے تھے مگر کیا کر سکتا تھا اس کے لیے، کیا کر سکتا ہوں؟

دفعتاً چونکا، اذان ہو چکی تھی اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ نماز کی ادائیگی ہر چیز سے افضل ہے۔ جلدی سے اکرام کا پاؤں پکڑ کر زور زور سے ہلایا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ دیکھتا رہا، پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''جی مسعود بھیا! کوئی بات ہو گئی کیا......!''

''ہاں نماز کا وقت ہو گیا ہے اور دیر ہو رہی ہے، جلدی اٹھو......'' اکرام نے پھرتی سے پلنگ پر سے چھلانگ لگا دی تھی اور اس کے بعد ہم دونوں نماز میں مصروف ہو گئے۔

نماز سے فراغت حاصل ہو گئی۔ اب ایک دلچسپ مرحلہ پیش آنے والا تھا۔ یعنی ناشتہ...... کمالے پہلوان کی زندگی میں غالباً یہی مرحلہ سب سے زیادہ اہم تھا۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے اکرام کا چہرہ دیکھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بھی اس وقت اس بارے میں سوچ رہا ہوگا لیکن میں نے اس کے چہرے پر مردنی پائی اور ایک لمحے کے لیے اس مردنی کی وجہ سمجھ نہ سکا لیکن دوسرے لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اکرام اب کیا سوچ رہا ہے، اور میرے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی......!

''غالباً تم کمالے پہلوان کے بارے میں سوچ رہے ہو، جو ناشتے کی خوفناک تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔'' میں نے انجان بن کر کہا اور اکرام کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں وہ ناشتہ بھی ہمیں خوفناک ہی کرائیں گے۔'' اس نے مدھم سے لہجے میں کہا۔
''کیا بات ہے، نیند نہیں پوری ہوئی......؟''
''نہیں مسعود بھائی! ایسے ایسے ہی بس سوچ رہا تھا کہ اب نجانے آپ کا کیا ارادہ ہو، بتائیں گے مجھے......؟''
''یہ تو طے کر چکے ہیں ہم اکرام کہ خاموشی سے خورجے سے نکل چلیں گے اور بلاشبہ یہ بری بات ہے، میزبان سے اجازت لینا ضروری ہے لیکن تم خود سمجھ لو، ہمیں یہ اجازت آسانی سے نہیں ملے گی لیکن اب زبردستی بھی یہاں پڑے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔''
''ہاں یہ تو ہے...... واقعی اس طرح سے جانا ذرا افسوناک ہوگا لیکن کمالے پہلوان سے ہم نے ذکر بھی کیا تو بگڑ جائیں گے اور ہوسکتا ہے ایک آدھ پٹخ لگا دیں۔'' میں بھی ہنسنے لگا تھا، اکرام نے آہستہ سے کہا۔ ''مسعود بھائی میرے بارے میں کیا سوچ؟ ایک بار پھر آپ سے وہی عرض کر رہا ہوں، آپ یقین کیجئے میں آپ کی غلامی کروں گا۔ کسی بھی مشکل میں آپ پر بار نہیں بنوں گا۔ محنت مزدوری کر کے اللہ کا عطا کیا ہوا رزق حاصل کروں گا۔ دونوں مل کر کھائیں گے، بس مجھے اپنے ساتھ رہنے دیں۔ آپ جہاں بھی جائیں گے اس پر اعتراض نہیں کروں گا۔ آپ کا جو بھی مشغلہ ہوگا اس میں مداخلت نہیں کروں گا، بس مجھے اپنے ساتھ رہنے دیجئے...... مسعود بھائی مجھے اپنے ساتھ رہنے دیں۔'' وہ دیر تک آنسو بہاتا رہا اور میں نے اس کے آنسو خشک کر دیئے۔''
''نہیں اکرام! میرے بھائی نہ رو، میرا دل دُکھتا ہے تمہارے لیے۔ براہ کرم نہ رو......'' اکرام خاموش ہوگیا۔ اس نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔
''کچھ سمجھ میں نہیں آتا، زندگی طویل ہوتی ہے اور مسائل اس قدر کہ جینے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیسے جیا جائے......؟''
''نہیں زندگی اللہ کی عطا کی ہوئی ہوتی ہے اور ہمیں جینا ہوتا ہے۔'' ابھی ہم یہی گفتگو کر رہے تھے کہ کمالے پہلوان کی آواز سنائی دی۔
''اَماں جاگ گے کیا...... ہم تو پہلے ہی سمجھ رہے تھے کہ بھلا تم اور نہ جاگے ہو گے۔'' وہ اندر آ گئے اور ہم سے سلام دُعا کرنے لگے پھر بولے۔
''مجھے تو نکل جانا ہے، عقیقے کی تیاریوں میں، اَماں دوستی تو نبھانی ہی پڑتی ہے۔ بس کیا کیا جائے، ذرا جلدی سے ناشتہ وغیرہ کر لیتے ہیں۔ میں نے ذرا جلدی تیاریاں کرائی ہیں، کیا خیال ہے......؟''
''جیسا آپ کا حکم ہو کمالے پہلوان!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اکرام بھی مسکرانے لگا۔ ناشتہ آ گیا اور ہماری توقع کے مطابق ہی تھا، خاموشی سے ناشتہ کیا۔ کمالے پہلوان بولے۔
اَماں محسوس نہ کریئو، دوستی کا معاملہ ہے، صبح ہی صبح نکل جانا پڑے گا اپنے سارے پٹھوں کے ساتھ، دوپہر کو ملاقات ہوگی۔ تم بھی گھوم پھر آنا خورجے میں، بڑھیا جگہ ہے، ابھی تم نے اسے دیکھا ہی کہاں ہے۔''
''جی کمالے پہلوان!'' میں نے کہا شکر ہے انہوں نے نہ کوئی اقرار لیا اور نہ ہی کوئی ایسی بات کہی جو بعد میں ہمارے لیے وعدہ خلافی کا باعث بن جاتی۔ پھر وہ چلے گئے، یہ بھی شکر تھا کہان کی غیر موجودگی میں ہمیں نکلنے کا موقع بآسانی مل جائے گا۔ اکرام کو ابھی میں نے اپنا پروگرام نہیں بتایا تھا۔ لیکن جب مکمل طور پر کمالے پہلوان کے چلے جانے کا اطمینان ہوگیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''ہمیں یہاں اور کوئی کام تو نہیں ہے اکرام؟''
''یہ تو آپ بتایئے مسعود بھیا! میں تو زندگی میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ بس نام سنا تھا اس شہر کا دیکھا پہلی بار ہے۔'' اکرام نے سادگی سے کہا۔
''مجھے افسوس ہے کمالے پہلوان کے سلسلے میں، لیکن بہرحال جانا ہے۔ تیاریاں کرو، ممکن ہے ان کا کوئی ہرکارہ ہی یہاں

پہنچ جائے یا پھر صوفی جبار بنفس نفیس ہمیں دعوت دینے نہ آ جائیں۔'' اکرام تیار ہو گیا۔ استاد اپنے تمام پٹھوں کے ساتھ گئے ہوئے تھے اس لیے کسی سے کچھ کہنا بھی نہیں پڑا اور میں اکرام کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گنگا دھر یاد آئے لیکن اب سب بیکار تھا اب تو جوالا پور ذہن پر سوار تھا۔

''کسی سے ریلوے اسٹیشن کے بارے میں معلوم کرو......'' میں نے اکرام سے کہا، عقب سے آواز آئی۔

''دو سواری ٹیشن، دو سواری ٹیشن۔'' تانگہ تھا چند افراد اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بھی بیٹھ گئے اور پھر اسٹیشن پر جا اترے۔ اکرام سر جھکائے میرے ساتھ تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ بکنگ سے میں نے جوالا پور کے بارے میں پوچھا۔

''جوالا پور چھوٹا اسٹیشن ہے۔ تمہیں ٹونڈلا جانا پڑے گا۔ وہاں سے گاڑی جوالا پور کے لیے مل سکتی ہے۔'' بکنگ کلرک نے بتایا۔ میں نے اس سے دو ٹکٹ طلب کر لیے اور بڑے اعتماد سے جیب میں ہاتھ ڈال کر مطلوبہ رقم نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔ ٹرین کے لیے ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ پھر ٹرین آ گئی۔ جگہ کیوں نہ ملتی بلاوے پر جا رہے تھے۔ آرام سے ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے اور کچھ دیر کے بعد سفر جاری ہو گیا۔ اکرام اب مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ٹونڈلے تک کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہاں اترے پھر معلوم کر کے جوالا پور کے ٹکٹ خرید لیے۔ کوئی پانچ گھنٹے کا راستہ تھا۔ جوالا پور پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹرین دو منٹ سے زیادہ نہیں رُکی لیکن یہ پہلا ریلوے اسٹیشن دیکھا تھا جہاں پورے پلیٹ فارم پر ایک بھی انسان کا وجود نہیں تھا سوائے ان دو افراد کے جو ٹرین سے پلیٹ فارم پر اُترے تھے۔ ایک بزرگ تھے اور ایک برقعہ پوش خاتون۔ بزرگ کے پاس ٹین کا ایک صندوق تھا اور، خاتون کے ہاتھ میں بڑی سی ٹوکری۔ وہ صاحب خود ہکا بکا کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں مخاطب کرتا وہ خود ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''عزیزی! زحمت دوں گا ذرا......'' وہ چند قدم آگے بڑھے تو میں خود ان کے قریب پہنچ گیا۔ ''یہ سب کچھ کیا ہے۔ کوئی سانحہ ہو گیا کیا......؟''

''میں خود حیران ہوں محترم، پورا پلیٹ فارم خالی پڑا ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ بھی۔'' میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے، آثار کچھ بہتر نہیں ہیں۔ آپ بھی جوالا پور میں اجنبی ہیں؟''

بزرگ بولے۔

''جی ہاں، پہلی بار آیا ہوں۔''

''تب تو صورت حال آپ کے لیے بھی اتنی ہی پریشان کن ہے۔ یہاں کون ہے آپ کا؟''

''کوئی نہیں۔''

''پھر آمد کیسے ہوئی؟''

''بس اتفاقیہ۔''

''عجیب ہُو کا عالم ہے، ٹرین بھی روانہ ہو چکی ہے۔ نہ جانے کیا قصہ ہے۔ رات بھر کوئی اور ٹرین بھی نہیں آئے گی کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے یہ بھی بہتر ہے کہ آپ......'' بزرگ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر کچھ رُک کر بولے ''حضور کا اسم شریف......؟''

''مسعود۔''

''الحمدللہ مسلمان ہیں، آپ کے ساتھی بھی مسلمان ہیں؟''

''جی......اس کا نام اکرام احمد ہے۔''

''احقر کو غلام سبحانی کے نام سے پکارا جاتا ہے، لکھنؤ سے آیا ہوں، میرے ساتھ اہلیہ ہیں۔ یہاں میری بیٹی رہتی ہے،

نورچشم ضمیر الدین میرے داماد ہیں، دکان کرتے ہیں بساط خانے کی، بچوں سے ملنے آیا تھا۔ ویسے آثار کچھ بہتر نہیں ہیں، ضمیر میاں نے لکھا تھا کہ پچھلے کچھ عرصہ سے بڑی ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں۔ کچھ متعصب ہندو فساد کے درپے ہیں مگر کوئی تازہ خبر نہیں تھی۔ ورنہ نہ آتا۔ اب کیا کیا جائے۔"

"رب العزت صحت و زندگی قائم رکھے۔ ہم نے سوچا تھا کہ قلی وغیرہ مل جائیں گے۔ بڑی ناگہانی پڑی ہے۔"

بزرگ نے پریشان لہجے میں کہا۔ اکرام نے خاتون کے ہاتھ سے ٹوکری لی اور پھر صندوق میرے ہاتھ سے لینا چاہا مگر میں نے منع کر دیا۔ ہم سب آگے بڑھے اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ کمرے کے دروازے کے باہر کی سفید دیوار پر خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آ رہے تھے۔ زمین پر بہت سا خون پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر ہم سب ہی دہشت زدہ ہو گئے۔ بزرگ کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی تھی۔ وہ متوحش نظر آ رہے تھے۔

"کوئی ہے...... اندر کوئی ہے۔" میں نے آواز دی اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بلب روشن تھا اور اندر دو انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کون تھے۔ باہر نکل آیا خود کو پُرسکون رکھنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔

"اندر کوئی ہے۔" بزرگ آگے بڑھے تو میں نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں روک دیا۔ "آیئے باہر چلیں۔"

"میاں ہمیں تو چکر آ رہا ہے، خدا کے لیے ہمیں سنبھالو، کیا کریں ہم سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آہ اب کیا ہوگا؟" غلام سبحانی بہت نروس ہو گئے تھے۔ میں انہیں سہارا دے کر باہر لایا۔ باہر بھی وہی کیفیت تھی مگر ہم دو قدم آگے بڑھے تھے کہ کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے پاس آ گئی۔ پولیس کی بڑی سی جیپ تھی جو ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ اس میں سے پولیس کے کئی جوان نیچے اُتر آئے۔ ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہیں آپ لوگ؟"

"مسافر ہیں، ریل سے اُترے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"موت آئی ہے آپ لوگوں کی، یہاں فساد ہو رہا ہے اور آپ کو سفر کی سوجھی ہے، کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"لکھنؤ سے۔" غلام سبحانی نے جواب دیا۔

"ٹکٹ ہیں آپ کے پاس؟"

"جی ہاں۔"

"کون سے محلے جانا ہے؟"

"کاچھی نگریا۔ مکان نمبر بارہ سو اٹھانوے۔ عزیزی ضمیر الدین......"

"یار فیض اللہ۔ میں اندر جاتا ہوں تم ان چاروں کو کاچھی نگریا چھوڑ آؤ ورنہ مارے جائیں گے بے چارے۔"

"ٹھیک ہے سر...... میں جاتا ہوں۔ آؤ بھئی۔" ہم خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ بزرگ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"بالکل خاموش رہنا، خود کو ہم سے جدا نہ بتانا۔ اس وقت موقع بھی نہیں تھا کسی تکلف کا چنانچہ ہم خاموشی سے بیٹھ گئے۔ دو پولیس والے ہمارے ساتھ تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ اگر ہندو ہوتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ گاڑی چل پڑی۔ اسٹیشن سے کچھ دُور ہی نکلے ہوں گے کہ شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ پھر کچھ مشعلیں نظر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مکان سے شعلے اُٹھنے لگے۔ فیض اللہ اور دوسرے کانسٹیبل نے رائفلیں سنبھالیں اور ہوائی فائر کرنے لگے۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور مشعلوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ فیض اللہ اور اس کا ساتھی مسلسل ہوائی فائر کر رہے تھے۔ اس نے شاید ڈرائیور سے کہا۔

"رمضان استاد...... گاڑی تیزی سے بھگا لینا۔ کسی نے برقعہ دیکھ لیا تو آفت مچ جائے گی۔ اَماں جی! سر نیچے کر لو ذرا......" غلام سبحانی نے بیوی کی گردن سیٹوں میں دبا دی۔ مگر فسادی پولیس فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ گئے تھے۔ گاڑی چلتے

مکان کے قریب سے گزر گئی، اندر چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بزرگ کپکپاتی آواز میں آیت الکرسی پڑھ رہے تھے اور میں سوچ میں گم تھا۔ جوالا پور، آخری اسٹیشن، مسجد، یقیناً کوئی ذمے داری سونپی گئی ہے مجھے...... اور سہارے بھی عطا کئے گئے ہیں ورنہ یہ لمحات بڑے پریشان کن ہوتے ہیں۔ اس فساد زدہ آبادی میں کہاں جاتے ہم دونوں......! پھر شاید مطلوبہ جگہ آ گئی۔ فیض اللہ نے پوچھا۔

''مکان پہچانتے ہو بابا جی......؟''

''ہاں، وہ سامنے سرخ اینٹوں والا'' غلام سبحانی نے اشارہ کیا اور گاڑی اس مکان کے سامنے جا رکی۔ بہت وسیع مکان تھا۔ دوسرے کانسٹیبل نے اتر کر زور زور سے دروازہ بجایا مگر اندر سے آواز نہیں آئی۔

''او خدا کے بندو! مہمان آئے ہیں تمہارے، انہیں اندر بلا لو، ڈرو مت......'' میں نے محسوس کیا تھا کہ آس پاس کے مکانوں میں بھی آہٹیں ہونے لگی ہیں۔ مگر سرخ اینٹوں والے مکان کا دروازہ نہیں کھلا۔ پھر کسی دوسرے مکان کی چھت سے آواز آئی۔

''نعرۂ تکبیر......''

''اللہ اکبر'' چاروں طرف سے آوازیں اُبل پڑیں۔ فیض اللہ اور دوسرا کانسٹیبل چیخا۔

''او خبردار...... خبردار پولیس ہے کوئی حرکت نہ ہو۔ خبردار۔ او بابا جی نیچے اترو خود آواز دو۔'' فیض اللہ کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ بڑا عجیب ماحول تھا، بڑی مشکل سے غلام سبحانی صاحب کو نیچے اتارا گیا اور وہ دروازے پر پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''میاں ضمیر الدین! ہم غلام سبحانی ہیں، تمہارے سسر، لکھنؤ سے آئے ہیں شومیٔ تقدیر...... میاں تمہیں اللہ کا واسطہ دروازہ کھول دو۔'' اچانک اندر سے آوازیں اُبھریں اور مضبوط دروازہ کھل گیا۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ''ارے، ابا میاں آپ......'' ایک توانا شخص باہر نکل آیا۔

''امی بھی ہیں تمہاری۔ انہیں اتارو۔''

''چلو جلدی کرو بھائی۔ واپس جانا ہے۔'' ہم بھی نیچے اتر آئے، بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم سب اندر داخل ہو گئے۔

''ارے بھئی سنتی ہو...... نور جہاں...... ابا میاں اور امی آئے ہیں لکھنؤ سے......'' ضمیر الدین نے دروازہ بند کر کے آواز لگائی۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ ضمیر الدین کو اب ہمارا خیال آیا اور وہ ہمیں گھورتا ہوا بولا۔ ''یہ کون ہیں ابا میاں؟''

''یہ تعارف کا وقت ہے؟۔ آہ کس بُری گھڑی گھر سے نکلے تھے۔ پانی پلواؤ ہمیں نیم جان ہیں۔''

''جی جی آیئے اندر آ جایئے۔ شکر ہے جلد بازی میں حملہ نہیں ہو گیا یہاں تو سب تیار بیٹھے ہیں۔ آیئے۔'' ہم اندر داخل ہو گئے۔ وسیع و عریض والان، تعداد کمرے، حویلی نما گھر تھا۔ ہمیں ایک وسیع کمرے میں لایا گیا۔ بیٹھنے کے لیے کہا گیا اور ہم بیٹھ گئے۔ ضمیر الدین نے کہا۔ ''امی! آپ آیئے اندر آیئے نور جہاں ڈری ہوئی ہیں، اس لیے ان کی آواز نہیں سنائی دی۔'' برقعہ پوش خاتون اندر چلی گئیں۔ غلام سبحانی نے کہا۔

''میاں قیامت ٹوٹی ہے، اسے کہتے ہیں ناگہانی۔ یہاں تو محاذ جنگ کھلا ہوا ہے۔ سنو میاں ذرا بھی غیریت نہ سمجھنا۔ ہمارا تم سے تفصیلی تعارف نہیں ہے مگر انسان اور مسلمان ہونا کافی ہے۔ ویسے تمہارا کوئی شناسا ہے جوالا پور میں؟''

''نہیں ہے، لیکن بس ہمیں ایک رات اس چھت کے نیچے پناہ دلوا دیجئے صبح کو چلے جائیں گے۔''

''یعنی یہ ہماری محبت سے انحراف نہیں کیا، ہم تمہیں جانے دیں گے ایسے اور کیا تمہارا جانا مناسب ہوگا؟''

''آپ خود یہاں مہمان آئے ہیں محترم اور پھر ان حالات میں کسی پر بار بننا مناسب نہیں ہے۔''

''ہرگز نہیں، تمہاری زندگی بھی تو ہمیں عزیز ہے۔ فاقے کرنے پڑے تو مل کر کریں گے۔ ہمیں تو بالکل علم نہیں تھا کہ

جوالا پور اس طرح فسادات کی لپیٹ میں ہے۔تم بھی یقیناً لاعلمی میں یہاں آ گئے ہو گے؟ اگر یہاں تمہاری شناسائی نہیں ہے تو بھلا کہاں جاؤ گے۔ یہاں لوگوں پر خون سوار ہے۔ یہ جنون فرو ہو جائے تو ہمیں بھی جانا ہے اور تمہیں بھی۔ اس لیے جانے کے موضوع کو تو دماغ سے نکال دو۔''

''کچھ دیر کے بعد دو خواتین اور ضمیر الدین اندر آ گئے۔ ایک بیگم ضمیر الدین یعنی نور جہاں تھیں جن کا چہرہ دہشت سے سفید پڑا ہوا تھا۔ دوسری غلام سبحانی کی اہلیہ یعنی نور جہاں کی والدہ تھیں۔ نور جہاں آگے بڑھ کر باپ سے لپٹ گئیں اور غلام سبحانی ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ پھر بولے۔

''یہ کیا حال بنا لیا تم نے نور جہاں؟ اگر یہاں یہ حالات تھے تو گھر میں تالا لگا کر لکھنؤ آ جاتے۔ یہاں کیوں پڑے رہے، ہمیں کسی طرح خبر کر دیتے۔ بس اللہ نے بچا لیا ورنہ ہم تو گئے تھے۔ یہ دونوں بچے نہ ملتے تو۔ تو اللہ جانے کیا ہوتا۔''

''اس کا موقع ہی کہاں ملا ابا میاں۔ اس قدر اُمید ہی کہاں تھی، وہ تو بس ہو گیا جو ہونا تھا۔'' ضمیر الدین نے کہا۔

''ابا میاں! کھانے کا بندوبست کروں، بھوک لگ رہی ہوگی، اتنا وقت گزر گیا ہے.....'' نور جہاں نے کہا۔

''کس نامعقول کو بھوک پیاس لگ رہی ہے، یہاں تو ان گناہ گار آنکھوں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے اس سے پیٹ بھر گیا ہے۔ ارے ہاں مگر یہ دونوں بچے بھی تو ہیں۔ بھئی تمہیں تکلیف تو کرنا پڑے گی اس وقت۔''

''نہیں محترم! براہ کرم کوئی تکلیف نہیں کیجئے گا۔ ہم انتہائی عاجزی سے یہ درخواست کرتے ہیں۔''

''میاں کچھ کھاؤ گے پیئو گے نہیں کیا..... نور جہاں کیا پکایا تھا دن میں.....؟''

''ابا میاں! جان سولی پر اٹکی ہوئی ہے، کیا کھانا پکانا۔ بے چارہ فخرو بھی بخار میں پڑا ہوا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں نا فخرو کو۔''

''تمہارا نوکر نا، کیوں نہیں جانتا۔''

''اس کے بھی بال بچے خدا کا شکر ہے جوالا پور سے باہر گئے ہوئے ہیں، ہمارے پاس ہی رہ رہا ہے آج کل۔ ایک ریلوے بابو سے ملاقات تھی اس کی، اس سے کہلوا دیا ہے بچوں کو کہ ابھی واپس نہ آئیں۔''

''یہ کام تم لوگ بھی تو کر سکتے تھے۔''

''ہمیں تو موقع ہی نہ ملا ابا میاں، آپ یقین کیجئے حالات ایک دَم سے خراب ہوئے.....''

''نور جہاں! ہمت کرو بھئی، جاؤ اور کچھ نہیں تو چائے بنا لاؤ اور ساتھ میں جو کچھ بھی مل سکے۔'' ضمیر الدین نے کہا۔

''چائے کی حد تک ٹھیک ہے مگر آپ تو ویسے ہی بہت پریشان ہیں نور جہاں بہن.....'' میں نے کہا اور نور جہاں نے پہلی بار مجھے دیکھا۔ پھر خاموشی سے اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ غلام سبحانی کی اہلیہ نے کہا۔ ''یہ بچے تو بالکل ہی اپنے لگنے لگے ہیں۔'' ''بیٹا! تم آئے کہاں سے ہو.....؟''

''ٹونڈلہ سے سوار ہوئے تھے، ریل میں، جوالا پور آنے کے لیے، یہاں اُترے تو یہ سب کچھ دیکھا.....''

''مگر ضمیر میاں جوالا پور میں تو اس سے پہلے کبھی ایسا فساد نہیں ہوا تھا، چھوٹی موٹی واردات تو ہر جگہ ہی ہوتی رہتی ہے۔ جہاں چار برتن ہوتے ہیں کھڑکتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ہوا کیا، فساد کس سلسلے میں ہو گیا.....؟''

''بات بہت عرصے سے چل رہی تھی ابا میاں! حالانکہ یہاں ہندو مسلمان سب ہی مل جل کر رہتے ہیں لیکن جب سے گرج ناتھ سیوک یہاں آیا ہے اور اس نے چکر چلایا ہے، تعصب ہی تعصب پھیل گیا.....''

''یہ گرج ناتھ سیوک کون ہے..... پہلے کبھی نہیں سنا اس کا نام۔'' غلام سبحانی نے کہا.....

''ایک ہندو سادھو ہے، کمبخت نجانے کہاں سے آن مرا ہمارا جوالا پور میں۔ آ کر آگ پھیلا دی۔ مایہ کنڈ کا پجاری کہلاتا ہے اور اس نے بابو مول چند پر قابو پا لیا ہے.....''

''بابو مول چند..... وہی زمیندار.....؟''

''جی ہاں...... کنور ریاست علی خان نے اس کی بڑائی پہلے بھی کبھی قبول نہیں کی۔ برابر کا درجہ ہے دونوں کا، جتنی زمینیں بابو مول چند کی ہیں اتنی ہی کنور ریاست علی خان کی ہیں۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی لیکن گرج ناتھ کی وجہ سے یہ دوستی اب دشمنی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جتنا نقصان ہندوؤں نے مسلمانوں کا کیا ہے۔ اتنا ہی مسلمانوں نے ہندوؤں کا بھی کیا ہے۔ یہاں برابر کی ٹکر ہے لیکن بہر حال نقصان نقصان ہی ہے۔ جو لڑنے مرنے والے ہوتے ہیں وہ تو لڑ مر کر نکل بھاگتے ہیں جو اِکا دُکا بے چارے اِدھر اُدھر پھنس جاتے ہیں ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ بے گناہوں کا ہی نقصان ہو رہا ہے، ایک اندازے کے مطابق ستر، اسی آدمی مر چکے ہیں اور ہر گھر میں خوف کا بسیرا ہے۔''

''یہ کمینہ گرج ناتھ آخر چاہتا کیا ہے۔ کون ہے، کہاں سے آیا ہے......؟''

کچھ نہیں معلوم، بس ایک ٹوٹا پھوٹا پرانا مندر تھا، وہیں آ کر آباد ہو گیا۔ مندر میں پوجا پاٹ نہیں ہوتی تھی، ساری دیواریں گری ہوئی تھیں لیکن پھر راتوں رات لوگوں نے دیکھا کہ وہ مندر پھر سے تعمیر ہو گیا ہے۔ یہ واقعی سچ ہے کیونکہ مندر کنور ریاست علی خان کی زمینوں میں آتا تھا اور اس لیے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ وہاں کنور ریاست علی خان نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے بجائے بابو مول چند نے ایک اور جگہ دے دی اور وہاں بڑا مندر تعمیر ہو گیا، لیکن گرج ناتھ سیوک نے راتوں رات یہ مندر تعمیر کر لیا۔ مجھے تو اچھا خاصا جادوگر معلوم ہوتا ہے وہ...... ورنہ سب ہی نے مندر کو دیکھا اور حیران رہ گئے...... کنور ریاست علی خان کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے مندر گرانے کا حکم دے دیا اور ان کے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مندر کی دیواروں پر کدالیں برسائی جاتی رہیں اور کدالیں اس پر پڑ پڑ کر اُچٹتی رہیں لیکن مندر کی دیواروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تب گرج ناتھ سیوک سامنے آیا اور اس نے کہا کہ یہ جگہ مایا کنڈ ہے اور یہاں مایا مکنڈل تعمیر ہوگا۔ اس جگہ کو چھوڑ دیا جائے ورنہ نقصانات ہی نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ کچھ ہندو بھی اس کے ہمنوا ہو گئے اور اس کی کرامت پر غور کرنے لگے لیکن کنور ریاست علی خان نے اپنے نمائندے بابو مول چند کے پاس بھیجے اور کہا کہ اس مسئلے کو روکیں...... بابو مول چند پہلے تو ٹھنڈے دماغ سے اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے گرج ناتھ سیوک کو اپنے گھر بلا کر دعوت دی اور مندر کے بارے میں بات چیت کی لیکن اس کے بعد ان کا دماغ بھی پلٹ گیا اور انہوں نے کنور ریاست علی خان کو پیشکش کی کہ اگر وہ چاہیں تو یہ زمین ان کے ہاتھوں فروخت کر دیں تاکہ مندر قائم رہے۔ کنور ریاست علی خان نے بھی اس بات کو اپنی اَنا کا معاملہ بنا لیا اور کہنے لگے کہ اس مندر میں کبھی پوجا پاٹ نہیں ہوگی اور لوگ آ جا نہیں سکیں گے۔ اس طرح بابو مول چند کا دماغ بھی پھر گیا اور انہوں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ مندروں پر حملے بھی ہوئے اور بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات بڑھتے چلے گئے، جن کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ گلی گلی، محلہ محلہ جہاں ہندو زیادہ تعداد میں ہیں وہاں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا گیا اور جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں وہاں ہندوؤں کے گھر لوٹ لیے گئے ہیں۔ یہ فساد بڑھتا ہی جا رہا ہے، سنا ہے بابو مول چند نے اب باہر کی بستیوں سے آدمی بلوائے ہیں تاکہ یہاں فساد بڑھایا جا سکے۔ وہ جادوگر کہتا ہے کہ پورے جوالا پور کو مایا کنڈل بنا دے گا۔ بڑی عجیب و غریب باتیں ہوئی ہیں۔ مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکرز چوری کر لیے گئے تاکہ اذان کی آوازیں باہر نہ آ سکیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں۔''

''اور وہ گرج ناتھ سیوک کہاں ہے......؟''

''مندر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا ہے، اصل بات یہی ہے کہ وہ جادوگر ہے اور ہندوؤں کا عقیدہ اس کے جادو کی جانب منتقل ہوتا جا رہا ہے یعنی یہ کہ کنور ریاست علی خان نے مندر تڑوانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن مندر ٹوٹا نہیں ہے۔ دروازہ بند ہے اور اس پر پتھر کی ایک بڑی سی سِل لگوا دی گئی ہے جسے کدالوں سے بھی نہیں توڑا جا سکا۔ گرج ناتھ سیوک اندر موجود ہے۔ سنا ہے اسے کئی بار باہر بھی دیکھا گیا ہے لیکن کہاں سے باہر آتا ہے اس کا کوئی پتہ نہیں...... بہر حال اب وہ اس مندر کو مایا مکنڈ کہتا ہے۔''

ہوں، اس طرح تو اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوگا۔ حکومت نے کوئی قدم اٹھایا؟''
''بس پولیس فسادات کو روکنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔ ویسے زمینیں چونکہ ریاست علی خان کی ہیں اس لیے لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ جب قانون حرکت میں آئے گا تو بات ریاست علی خان کی مرضی کی ہوگی۔ وہ اپنی زمینیں نہیں بیچنا چاہتے، نہیں بیچیں گے۔ شاید گفت و شنید ہوئی تھی سرکاری حکام سے۔ انہوں نے سروے کے لیے ایک وفد بھی بھیجا تھا جس نے غالباً یہی رپورٹ دی کہ ہندوؤں کا عقیدہ بھی بڑا مضبوط ہے اس مندر کے بارے میں۔ نتیجہ فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا چنانچہ امن و امان کے نام پر ریاست علی خان سے درخواست کی گئی کہ وہ یہ زمین فروخت کر دیں لیکن وہ بھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں چنانچہ کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ یہ فساد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا محلہ بھی جنگ کے لیے تیار ہے۔ یہاں سارے کے سارے پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ رہتے ہیں، جو خود آگے بڑھ کر کچھ نہیں کرتے لیکن اپنے محلے کے بچاؤ کے لیے انہوں نے معقول انتظامات کر رکھے ہیں۔ اب آپ دیکھئے نا کہ پولیس آئی تھی آپ کو لے کر۔ مگر محلے والے سمجھے کے شاید ہندوؤں کی طرف سے کوئی کارروائی ہوئی ہے۔ نتیجے میں نعروں کی آوازیں آنے لگیں اور اگر کوئی ذرا سی بھی غلط فہمی ہو جاتی تو پتھراؤ شروع ہو جاتا......''
''بس میاں، خدا نے بچا لیا آج ہمیں۔ ورنہ ہم میاں بیوی تو آج گئے تھے۔ ارے بچوں کا شکریہ نہیں ادا کیا تم نے......''
''آپ نے تعارف ہی نہیں کرایا ابا میاں......''
''یہ مسعود میاں ہیں اور ان کا نام اکرام ہے۔ یہاں جوالا پور میں کسی کام سے آئے تھے بیچارے، خود بھی پھنس گئے، یہاں ان کا کوئی نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے ان حالات میں جبکہ انہوں نے مجھے سہارا دیا تھا میں انہیں اپنے ساتھ نہ لے آتا تو کیا کرتا......؟''
''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا ہے ابا میاں۔ بڑی خوشی سے ہم انہیں اپنے مہمان کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ اب ان حالات میں ظاہر ہے ان کا جو کام ہے وہ بھی نہیں ہوگا، چنانچہ خاموشی سے وقت گزارا جائے بلکہ اچھا ہے ذرا رونق ہوگئی آپ لوگوں کے آجانے سے۔ ورنہ ان نور جہاں بیگم نے تو ناک میں دَم کر دیا ہے نہ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں، بس خوف کا شکار ہیں۔ ایک وہ بے چارہ فخرو ہے وہ بھی ان کا ساتھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں خوف زدہ ہونے کا۔ اسے تو بخار آگیا ہے ڈر کے مارے......''
سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ واقعی ان حالات میں تو ان لوگوں کے لیے ہمارا آنا بہتر ہی ہوا ہے لیکن میری مسکراہٹ میں کوئی اور بات بھی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے گرج ناتھ سیوک کا نام سنا ہوا تھا، جو یہاں مایا مکنڈل نام کی چیز قائم کرنا چاہتا ہے اور اس نے ایک ایسا مندر بنا لیا ہے جس پر کدالیں اثر نہیں کرتیں۔ اس کا مقصد ہے کہ میرے شانوں پر پھر کچھ ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں ورنہ جوالا پور ہی کا رُخ کیوں اختیار کرایا جاتا۔ صاف صاف اشارہ کیا گیا تھا کہ میں جوالا پور پہنچوں لیکن اس مسجد کے بارے میں ابھی تک کوئی علم نہیں ہوا تھا جو کسی ویرانے میں واقع تھی اور جس کی نشاندہی کی گئی تھی۔ میرے سفر کا اختتام عالم تصور میں وہیں ہوا تھا۔
نور جہاں بیگم نے چائے کے ساتھ خاصے لوازمات کا انتظام کر لیا تھا۔ ملازم فخرو بھی ساتھ تھا۔ اس نے سلام کیا اور غلام سبحانی اس کی مزاج پرسی کرنے لگے۔ پھر خاطر مدارت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد ضمیر الدین نے کہا۔
''مسعود میاں! اور اکرام میاں! وہ جو کہا ہے کسی نے کہ چمگادڑ کے مہمان آئے اور اُلٹے لٹک گئے۔ اس وقت یہی کیفیت یہاں کی ہے۔ معبود کریم کے فضل و کرم سے اس غریب خانے میں کھانے پینے کی کمی بالکل نہیں ہے۔ گھر کے عقبی حصے کو میں نے ترکاری کا کھیت بنا دیا ہے چنانچہ مٹر کی بیلیں، کدو اور لوکی کی بیلیں پھل پھول رہی ہیں۔ کوئی ستّر مرغیاں موجود ہیں

جو انڈے اور گوشت کی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ بقرعید کے لیے چار بکرے تیار ہیں۔ البتہ چائے کالی پی جائے گی کیونکہ دودھ کا کال ہے۔ اناج بھی کئی ماہ کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کھانے پینے کی تو کوئی مشکل نہیں ہوگی البتہ اگر بدبخت ہندوؤں نے ادھر حملہ کیا تو آپ دو جوان ہماری سپاہ میں ضرور شامل ہوں گے چنانچہ آیئے اور اپنی رہائش گاہ دیکھ لیجئے۔ دو بلم، چھریاں اور لاٹھیاں آپ کو پیش کی جائیں گی۔''

''ہاں میاں آرام کرو۔ اللہ محفوظ رکھے۔'' غلام سبحانی نے کہا۔ ہمیں حویلی نما مکان کے ایک وسیع کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں آرام کا مکمل بندوبست تھا۔ بلم اور لاٹھیاں وغیرہ بھی دے دی گئی تھیں۔ آرام کے لمحات ملے تو میں نے مسکراہٹ ہوئے اکرام کو دیکھا۔ ''کیوں اکرام میاں! لطف آ رہا ہے میرے ساتھ رہ کر......؟''

''بہت مسعود بھیا!'' وہ بھی مسکرا کر بولا۔

''تم بھی سر پھرے ہی لگتے ہو۔''

''نہیں مسعود بھیا! اپنوں اور محبتوں سے محروم انسان ہوں۔ کون ہے میرا اس کائنات میں، بہت مشکلات میں گم ہوگئی ہے۔ تنہا رہ گیا تو جینا ناممکن ہوگا مگر مرنا نہیں چاہتا اور پھر آپ کے ساتھ رہ کر مجھے اس شیطان سے تحفظ حاصل ہے۔''

''ان حالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''جہاں آپ وہاں میں، حالات کیسے بھی ہوں۔'' اس نے جواب دیا پھر بولا۔ ''ویسے مسعود بھیا! میں تو آپ کا مرید بھی ہوں۔''

''مرید......؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں دل و جان سے۔ کیا میں بھول سکتا ہوں کہ وہ منحوس اور کمینہ سفلی علم کا ماہر آپ سے خوفزدہ تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنے ناپاک علم سے آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی مکڑیاں آپ کے قائم کئے حصار کو نہیں عبور کر سکتیں۔ مسعود بھیا! آپ نے مجھے بھائی کہنے کی اجازت دی ہے ورنہ میں تو آپ کو مرشد کہتا۔ انسان ہوں یہ ساری باتیں نظر انداز تو نہیں کر سکتا۔ بھیا! ان شاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ کبھی اپنی اوقات سے بڑھنے کی کوشش نہیں کروں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو اس کے بارے میں آپ سے کبھی سوال نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں بھیا کہ آپ خود بھیجے گئے ہوں گے ورنہ جوالا پور بھی بلاوجہ نہیں آئے ہوں گے مگر یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں ہم جیسوں کو ان کی کرید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کا دل بھی دکھا ہوا ہے۔ آپ کے دل میں زخم ہیں، داغ ہیں۔ دل بے چین ہوگیا تھا یہ سن کر، مگر میں نے کبھی نہیں پوچھا اور بھیا! خدا کی قسم کبھی نہیں پوچھوں گا۔ آپ مجھے اپنے قدموں کی خاک تصور کریں۔ جہاں آپ وہاں میں، مجھے کیا غم ہو سکتا ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ اکرام کے جذبے قابل قدر تھے لیکن مجھے خاموشی ہی اختیار کرنی تھی۔ اس بیچارے کو کیا بتا سکتا تھا۔ پھر اکرام تو سو گیا، میں وضو کر کے تہجد پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد مراقبہ کرنے لگا۔ یہاں آ گیا تھا اور اب مجھے رہنمائی درکار تھی۔ آنکھوں میں اسی مسجد کا نقشہ اُبھرا جو اس وقت دیکھی تھی اور پھر سب کچھ معلوم ہوگیا۔ شاید ابھی اتنا ہی کافی تھا۔ البتہ حالات کے بارے میں ضرور سوچتا رہا۔ بابو مول چند، کنور ریاست علی خان اور گرج ناتھ سیوک۔

دوسری صبح پُرسکون تھی...... جاگے ہوئے تھے۔ اکرام اور میں نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ عقب سے غلام سبحانی کی آواز سنائی دی۔

''سبحان اللہ، معبود کریم قبول کرے۔ جوانی کی عبادت اللہ کو پسند ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نماز کے پابند ہو۔ ورنہ آج کل کے نوجوانوں کا تو وتیرہ ہی کچھ اور ہے۔''

''کالی چائے تیار ہے دوستو، کہو تو پیش کی جائے۔'' ضمیر الدین نے کہا۔

''ضرور ضمیر صاحب۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ سب یکجا ہو گئے تھے۔ پھر کچھ دن چڑھا تو ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فراغت

ہوئی تو چند اہل محلہ رات کے مہمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آ گئے۔ ہمیں ان سے ملایا گیا۔ شہر کی صورتِ حال پر تبصرہ ہوا۔ ابھی کوئی بہتری نہیں نظر آ رہی تھی۔

''ریاست علی خان ہی کچھ لچک پیدا کر لیں تو کیا حرج ہے۔'' ایک صاحب نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو چچا نذیر، مسلمانوں کی بھی تو کوئی آن ہے۔'' دوسرے صاحب نے کہا۔

''میں تو خلق اللہ کی بھلائی کے لیے کہہ رہا تھا۔''

''اللہ مالک ہے، ہم ریاست علی خان کے ساتھ ہیں اور پھر تمہیں جان علی کی مسجد یاد نہیں ہے۔ ریاست علی خان بھی اس بات پر چڑے ہوئے ہیں جب وہ کافر مسجد کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتا تو ہم کیوں مندر بنانے دیں۔

''مگر مندر تو بن چکا ہے۔'' کسی اور نے کہا۔

''وہ تو جادو کا مندر ہے۔''

''ہے تو سہی۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے، کسی مسجد کا تذکرہ ہوا تھا۔

✦✣✦✣✦

میں نے فوراً مداخلت کی۔ ''جان علی کی مسجد کا کیا قصہ ہے؟''

''میاں پرانی مسجد تھی۔ مول چند کی زمینوں پر تھی سارا کیا دھرا ان سسرے انگریزوں کا تھا۔ جگہ جگہ فساد کھڑے کر گئے۔ ورنہ وہ زمینیں تو اصل میں جان علی کی تھیں۔ لاولد مر گئے، زمینیں سرکار کی تحویل میں چلی گئیں بعد میں مول چند کے پرکھوں نے انگریزوں کی چاپلوسی کر کے زمینیں اپنے نام کرا لیں۔ مسجد بھی انہیں میں آ گئی۔ وہ تو خیر پہلے ہی مسلمانوں سے دبے ہوئے تھے، مل جل کر رہتے تھے مگر بعد میں ان سسروں کے پر پرزے نکل آئے۔ ریاست علی خان نے کہا تھا کہ وہ مسجد کی مرمت کرانا چاہتے ہیں، مول چند نے صاف منع کر دیا۔ مسجد پر اللہ کا سایہ ہے، سنا ہے کہ مول چند نے کئی بار اسے شہید کرنا چاہا مگر میا مرگئی سسرے کی، وہاں جن رہتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی کی صفائی کرا چکا ہوتا......؟''

''یہ مسجد کس طرف ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ کوئی آدھے کوس کا فاصلہ ہوگا۔ کربلا کے پیچھے ہی تو ہے۔''

''یہاں سے راستہ جاتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں پیچھے سے نکل کر سیدھے چلے جاؤ۔ کانسی کاکا کے کھیت آتے ہیں، اس کے بعد مول چند کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ مسجد وہیں سے نظر آ جاتی ہے۔'' لوگوں نے یونہی سرسری انداز میں مجھے بتا دیا تھا مگر میں نے پتہ ذہن نشین کر لیا۔

مسلمان اپنے طور پر ہوشیار تھے اور ہندو اپنے طور پر...... اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے صورت حال کا اندازہ ہو جاتا تھا مگر کرفیو نہیں تھا۔ پولیس بس انتظامی امور پر مستعد تھی۔ دوپہر کو میں نے اکرام سے کہا۔

''اکرام، باہر جانے کی ہمت ہے۔''

''کہاں؟''

''بس ایسے ہی باہر نکل کر بتاؤں گا کہاں جانا ہے۔''

''آپ چل رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔''

''خاموشی سے نکلنا ہوگا ورنہ یہ لوگ نہیں جانے دیں گے۔''

''اس میں تو ہم ماہر ہو گئے ہیں مسعود بھیا۔'' اکرام مسکرا کر بولا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم آنکھ بچا کر نکل آئے۔ مکانوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم عقبی حصے میں آئے۔ تھوڑا سا میدان تھا پھر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ میدان کو دوڑ لگا کر عبور کیا اور کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ پورے پکے ہوئے جوار کے کھیت تھے۔ بالیں پیلی ہو رہی تھیں اور جوار کے بھٹے لٹکے پڑ رہے

تھے۔ ہم چونکہ تیز رفتاری سے ان کے درمیان سے نکل رہے تھے اس لیے جوار ہل رہی تھی۔ آدھا کھیت طے کرلیا تھا کہ اچانک دُور سے آواز سنائی دی۔

''ارے ہیرا۔ داھو، بھیم جی...... دوڑو رے۔ مسلے گھس آئے، کھیت جلانے آئے ہیں دوڑو رے......!''

''کہاں...... کہاں...... کہاں؟'' بہت سی آوازیں اُبھریں اور سچ مچ اس وقت رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''بھاگو اکرام۔'' میں نے اکرام کی کلائی پکڑی اور ہم بے تحاشہ دوڑنے لگے لیکن ہمارے پیچھے بھی جوار بری طرح ہل رہی تھی اور کئی بلموں کی تیز انیاں چمک رہی تھیں جن کا فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا......''

بلموں کی چمکتی ہوئی انیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تعداد دس بارہ سے کم نہیں ہے۔ وہ برق رفتاری سے دوڑ رہے تھے۔ ہم کوئی چال بھی نہیں چل سکتے تھے کیونکہ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا اور وہ ہلتی ہوئی جوار کی بالیوں سے ہماری صحیح سمت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اگر رُک کر رُخ بدلنے کی کوشش کرتے تب بھی جوار ہلتی اور وہ اس طرف مڑ جاتے۔ وہیں کھڑے رہتے تو وہ سر پر پہنچ جاتے اور سوچے سمجھے بغیر ہمیں گود کر رکھ دیتے اس لیے بھاگتے رہنے کے سوا چارہ نہیں تھا اور ہم جی توڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اچانک کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، سامنے ہی ایک چوڑا نالہ بہہ رہا تھا جو دُوسری سمت کے علاقے کی حدبندی کرتا تھا۔ میں نے اور اکرام نے دوڑتے ہوئے نالہ عبور کیا۔ وہ لوگ بھی آگے آگئے تھے پھر ان میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔

''وہ رہے...... وہ ہیں۔'' ساتھ ہی انہوں نے بلم، نیزوں کی طرح پھینک کر مارے مگر نشانہ درست نہیں لگا سکے تھے۔ کئی بلم ہم سے آگے سنسناتے ہوئے نکل گئے۔ اسی وقت مجھے مسجد کے بوسیدہ گنبد نظر آئے۔ مسجد زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور ہمارا رُخ اس کی جانب تھا۔ اکرام کو کوئی پروا نہیں تھی وہ بس میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اب چونکہ کھلا علاقہ تھا اور وہ ہمیں صاف دیکھ رہے تھے چنانچہ انہوں نے بلم پھینک کر مارنے شروع کر دیئے تھے لیکن وہ ہمارے دائیں بائیں سے نکلتے رہے اور ہم مسجد کے بڑے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ دروازے کے عین سامنے لکھوری اینٹوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا جسے پھلانگ کر ہم اندر گھس گئے اور پھر میں رُک گیا۔ مجھے یہاں آنے کی ہدایت کی گئی تھی اور میں یہاں آگیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہدایت نہیں تھی چنانچہ اب میری جدوجہد ختم ہو جاتی تھی اور مزید ہدایت کے بغیر میں کچھ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ میری زندگی کے دُشمن ہیں اور مجھے اور اکرام کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے اللہ کو یہی منظور ہے تو یہی سہی۔

آوازیں معدوم ہو گئیں۔ وہ رُک گئے تھے۔ شاید وہ مسجد کے قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ ویسے بھی جان علی کی اس مسجد کے بارے میں روایت تھی کہ یہاں جنوں کا بسیرا ہے۔ ممکن ہے اس روایت نے ان کے قدم روک دیئے ہوں۔ اکرام سانس درست کر رہا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے تو اس نے باہر جھانک کر دیکھا پھر بولا بھاگ گئے؟

''ہاں شاید۔''

''اپنے بلم بھی چھوڑ گئے، اُٹھا لاؤں؟''

''کیا کرو گے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''مقابلہ کریں گے ان سے، ہوسکتا ہے مشورہ کر رہے ہوں اور دوبارہ لڑنے کی کوشش کریں۔''

''نہیں آئیں گے۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''تب ٹھیک ہے۔'' اکرام نے مجھ سے زیادہ پُراعتماد لہجے میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اکرام مجھ سے کتنی عقیدت رکھتا ہے۔ میرے ایک جملے نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔

''اب ان کا خیال چھوڑو، آؤ ہم اپنا کام کریں۔'' میں نے اکرام کو اشارہ کیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مسجد کے بے شمار گوشے گرد آلود تھے۔ جگہ جگہ اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا سا پیپل کا درخت تھا جس کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اندر منبر گرد آلود تھا۔ میں نے پتوں کی سینکیں جمع کر کے جھاڑو بنائی اور سب سے پہلے ہم نے اندرونی حصے کی صفائی شروع کر دی۔ اکرام نے قمیض اُتاری اور منبر صاف کرنے لگا۔ چٹائیوں کی صفیں بے ترتیب پڑی ہوئی تھیں،

انہیں جھاڑ کر صاف کیا اور دونوں نے مل کر انہیں ترتیب سے بچھایا۔ غالباً عصر کا وقت ہو گیا تھا، میں نے اکرام سے کہا۔

''اکرام...... پانی کا مسئلہ ہے۔''

''نہیں مسعود بھیا، بائیں سمت کنواں ہے ڈول بھی رکھا ہوا ہے۔''

''او ہو میں نے نہیں دیکھا تھا تب پھر پانی بھر و وضو کریں گے۔ وضو سے فراغت پا کر میں نے صحن مسجد میں ایک بلند جگہ منتخب کی اور اذان دینے کھڑا ہو گیا۔ اذان سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے نماز پڑھی اور پھر مغرب تک مسجد کے دُوسرے حصوں کی صفائی میں مصروف رہے۔ جان توڑ کر محنت کر رہے تھے اور پھر مغرب کا وقت ہو گیا۔ اکرام نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ رات ہو گئی، کوئی آٹھ بجے ہوں گے ہم مسجد کے دالان میں بیٹھے ہوئے بیکراں اندھیرے کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک مسجد کے عقبی حصے میں ایک روشنی سی متحرک ہوئی، ساتھ ہی اینٹوں پر کسی کے چلنے کی آواز بھی آئی۔ اکرام جلدی سے کھڑا ہو گیا مگر میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''بیٹھ جاؤ اکرام...... اطمینان سے بیٹھے رہو۔'' روشنی گھوم کر سامنے آ گئی۔ بارہ تیرہ سال کا ایک خوبصورت لڑکا ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑے دوسرے ہاتھ میں لوٹا لیے ہمارے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑے اَدب سے ہمیں سلام کیا پھر بولا ہاتھ دھو لیجئے کھانا آ رہا ہے۔

''شکریہ بیٹے بسم اللہ۔'' میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لوٹا اور لالٹین اس کے ہاتھ سے لے لی۔ بچہ فوراً واپس مڑ گیا تھا۔ لالٹین لے کر میں گھوما تو اکرام پر نگاہ پڑی، پتھرایا ہوا کھڑا تھا۔ ''یہ لالٹین کسی مناسب جگہ رکھ دو اکرام اور آؤ ہاتھ دھو لو۔''

اکرام آگے بڑھ آیا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش محسوس ہوئی تھی لیکن اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ بچہ کچھ دیر کے بعد پھر واپس آیا۔ اس کے عقب میں ایک شخص تھا جس نے کھیس اوڑھا ہوا تھا۔ چہرہ تک کھیس میں ڈھکا ہوا تھا بس ہاتھ کھلے ہوئے تھے اور ان کھلے ہوئے ہاتھوں میں وہ بڑی سی ٹرے سنبھالے ہوئے تھا جس میں قابیں ڈھکی رکھی تھیں۔ ایک بڑی پلیٹ میں چار خوشبودار آم رکھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں چھری بھی تھی۔ بادیئے میں گرم روٹیاں تھیں۔ لڑکا اپنے ہاتھوں میں جگ اور گلاس تھامے ہوئے تھا۔ اس نے دونوں چیزیں ایک طرف رکھیں، ساتھ لایا ہوا دسترخوان بچھایا اور کھیس والے شخص نے ٹرے اس پر رکھ دی پھر وہ دونوں واپس چلے گئے۔

''آ جاؤ اکرام......!'' میں نے اسے آواز دی اور اکرام میرے سامنے بیٹھ گیا۔ قاب اُٹھاتے ہی زعفران کی خوشبو پھیل گئی۔ زعفرانی قورمہ اور خمیری نان سے ضیافت کی گئی تھی۔ قورمہ بھی شاید ہرن کے گوشت کا تھا۔ بسم اللہ کہہ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اکرام نوالے ٹھیل رہا تھا، مجھے کہنا پڑا۔ ''لذیذ خوراک سے اجتناب میزبانوں کی دل آزاری کا باعث بنتا ہے، اطمینان سے کھاؤ۔'' اکرام نے میری بات سمجھی اور جلدی جلدی شروع ہو گیا۔ وہ بری طرح ڈرا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد آموں کی باری آئی تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''آموں کا موسم تو نہیں ہے مسعود بھائی۔''

''جو سامنے ہو اسی کا موسم ہے، کھاؤ۔'' ان الفاظ کیساتھ مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ ''مجھے اُستاد کمال الدین یاد آ گئے تھے۔ اگر واقعی آموں کا موسم ہوتا تو...... نہ جانے کیا ہوتا۔'' اکرام میرے الفاظ سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز پڑھی اور پھر وہیں آرام کرنے لیٹ گئے۔ اکرام نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ سہا ہوا تھا، اسے سمجھانا ضروری تھا۔ ''اکرام......!'' میں نے اسے آواز دی۔

''جی مسعود بھیا۔''

''خوف زدہ ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''یہاں کے ماحول سے ان واقعات سے یا باہر کے خطرات سے......؟''

''یہاں پیش آنے والے واقعات سے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' اکرام نے سچ بولا۔

''بڑی عام سی بات ہے اکرام...... کائنات کا ہر گوشہ اللہ کی ملکیت ہے۔ انسان بھٹکا ہوا ہے کہ اس کی زمین کو اپنی ملکیت سمجھ لیتا ہے۔ وہ اس کیلئے فساد کرتا ہے۔ خون خرابہ کرتا ہے، چالبازیاں کرتا ہے۔ اسے اپنا قرار دیتا ہے حالانکہ اس کا کچھ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ بناتا ہے اور اسے بنانے کیلئے انسانیت کے معیار سے اتنا گر جاتا ہے کہ اسے انسان کہتے ہوئے شرم آئے۔ جنت شدّاد کی داستان لے لو، شدّاد نے کتنے ظلم وستم کر کے اپنی جنت بنائی مگر اسے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس نے اللہ کی زمین پر حق جتایا تھا۔ یہی کیفیت ہر ذی رُوح کی ہے، نہ جانے کیا کیا کرتا ہے پھر ساکت ہو جاتا ہے۔ رُوح نکل جاتی ہے، لوگ اسے اُٹھا کر مٹی کے نیچے دفن کر آتے ہیں۔ کیا رہا اس کے پاس؟ جو کچھ اس نے کیا۔ اس کا سب کچھ کسی دُوسرے کا سب کچھ بن گیا۔ اللہ کی زمین پر اس کی کون کونسی مخلوق رہتی ہے وہی جانتا ہے۔ لاکھوں کیڑے مکوڑے پنکھ پکھیرو نہ جانے کون کون کہاں رہتا ہے۔ یہ اسے ہی سمجھنے دو۔ خود نہ سمجھو، کیا سمجھے؟''

''جی۔'' وہ کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔

''سکون سے سو جاؤ، اللہ بہتر کرے گا۔'' اکرام نے پھر کچھ نہ کہا، کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ میں اس کی سانسوں کا تجزیہ کرتا رہا، وہ پُرسکون تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں اُٹھ گیا، ماحول میں کسی آواز کی بازگشت نہیں تھی، گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جن لوگوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا، وہ مسجد کے پاس آنے کی جرأت نہیں کر سکے تھے اور یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اب کوئی آواز نہیں تھی۔ میں باہر نکل آیا لیکن آگے قدم بڑھا رہا تھا کہ دفعتاً دو سائے نظر آئے جو تیزی سے میرے قریب آ گئے۔

''السلام علیکم۔'' انہوں نے بیک وقت کہا۔ جواب دینے کے بعد میں نے انہیں غور سے دیکھا، باریش مگر نوجوان تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''کوئی حاجت ہے؟''

''نماز پڑھنا چاہتا تھا۔''

''آج اندر ہی پڑھ لیں تو بہتر ہے۔ کل سے آسانی ہوگی، باہر کام ہو رہا ہے۔''

''کام......؟''

''ہاں مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ دراصل پہلے اسے آباد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب آبادی ہوئی ہے تو اس کی دُرستگی بھی ضروری ہے۔ صرف آج کی بات ہے صبح تک کام مکمل ہو جائے گا اور ہاں فجر کی اذان آپ اس بلندی پر کھڑے ہو کر دیں وہ جو اس طرف ہے۔'' ایک شخص نے ایک سمت اشارہ کر کے کہا۔

''بہتر......'' میں نے کہا۔

''ابھی تک آپ نے جتنی اذانیں کہی ہیں پوری آبادی میں سُنی گئی ہیں اور بے دینوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

''میری اذان دُور دُور تک سُنی گئی ہے؟''

''ہر گھر میں اور جب آپ اس جگہ کھڑے ہو کر اذان کہیں گے تو بستی کے آخری گوشے تک آواز جائے گی، اس کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ بس اب اندر جایئے ہماری باری آ گئی ہے۔'' وہ دونوں پھر سلام کر کے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ میں اندر آ گیا اور ایک جگہ منتخب کر کے میں نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی اضطراب نہیں تھا، کوئی تردّد نہیں تھا۔ دل میں کوئی سوال نہیں تھا۔ سجدے میں ہی نیند آ گئی پھر کسی نے شانہ ہلایا اور ایک آواز سنائی دی۔ ''اُٹھئے! فجر کا وقت ہو گیا۔'' ہڑبڑا کر اُٹھ گیا، کوئی موجود نہیں تھا۔ اُجالے نمودار ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ باہر نکل آیا، سب کچھ بدلا بدلا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر چیز صاف سُتھری، قرینے سے صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ نلوں میں پانی آ رہا تھا۔ ایک ایک شے چمک رہی تھی۔ جگہ جگہ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک لمحے میں بہت کچھ یاد آ گیا۔ خاموشی سے اس بلند جگہ پر پہنچا اور پھر اذان کہنے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ اکرام اذان کی

آواز سے جاگ گیا اور وضو کیلئے شاید کنوئیں کی طرف دوڑا لیکن پھر اس کی چیخ اُبھری، دُوسری اور پھر تیسری۔ اس کے بعد وہ میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ میں اذان مکمل کر کے نیچے آیا تو وہ ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''مسعود بھائی...... یہ دیکھئے...... وہ دیکھئے...... سب کچھ...... سب کچھ بدل گیا وہ دیواریں...... وہ مینار...... وہ دروازہ...... اور یہ ذرا دیکھئے نلوں سے پانی آ رہا ہے۔ مسعود بھیا وہ صفیں اور...... اور...... یہ سب کچھ راتوں رات۔''

''وضو کرلو اکرام...... نماز کو دیر ہو جائے گی۔''

''ایں...... ہاں...... اوہ......'' اکرام کا لہجہ نڈھال ہو گیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ قدموں سے وضو کرنے چل پڑا۔ میں نے اب مسجد کا جائزہ لیا، بالکل مکمل تھی۔ مجھے رات ہی کو بتا دیا گیا تھا اور جن لوگوں نے اس کام کی ذمہ داری سنبھالی تھی ان کیلئے یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ اکرام کی کیفیت البتہ فطری تھی اسے سنبھالنا تھا، نماز سے فراغت ہوئی دوسری حیرت تیار تھی لیکن میرے لیے نہیں۔ کچھ فاصلے پر برتن رکھے ہوئے تھے۔ چائے دانی سے بھاپ کی خوشبودار لکیر اُٹھ رہی تھی، ایک پلیٹ میں گرم پراٹھے دُوسری میں اصلی گھی سے بنی ترکاری، چائے کیلئے دو پیالے...... اکرام خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''ناشتہ کرو اکرام۔'' میں نے پلیٹیں اس کی طرف سرکا کر کہا اور اکرام نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا پھر خود ہی خجل ہو گیا۔

''آپ، آپ لیجئے بھیا۔''

''ہاں

ہاں بسم اللہ۔'' پھر میں خاموشی سے ناشتہ کرتا رہا۔ چائے کے پیالے بھی بھر لیے تھے۔ بعد میں ہم نے برتن صاف کر کے ایک جگہ رکھ دیئے اور میں اکرام کو ساتھ لے کر صحن میں آ بیٹھا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔

''اکرام۔'' میں نے اسے پکارا تو وہ اُچھل پڑا۔ ''رات کو میں نے تمہیں سمجھایا تھا اکرام۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو اس کے چہرے پر خوف کے آثار پھیل گئے۔ وہ اُوپری سانسیں لینے لگا پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کر دیئے۔

''معافی، معافی چاہتا ہوں مسعود بھائی، معافی چاہتا ہوں، غلطی ہو جاتی ہے معاف کر دیجئے۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''ارے پاگل بے وقوف ہے بالکل۔''

''بھیا ناراض نہ ہو جانا مجھ سے واقعی غلطیاں ہو رہی ہیں۔''

اس نے ہاتھ جوڑے جوڑے کہا۔

''بالکل ناراض نہیں ہوں میں مگر کچھ سمجھانا چاہتا ہوں، غور سے سنو کیا سمجھے؟''

''جی بھیا۔''

''اللہ کی بے شمار مخلوق کے بارے میں تمہیں رات کو بتایا تھا میں نے۔''

''جی۔'' اس نے گردن ہلائی۔

''ان میں کچھ ظاہر ہیں کچھ پوشیدہ اور کچھ جو ہم پر ظاہر نہیں ہوتے وہ بھی احکامات خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں۔ جو وہ کرتے ہیں انہیں وہ کرنے دو جو ہمیں کرنا ہے وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ مسجد اگر راتوں رات تعمیر ہو گئی تو حیرانی کی بات نہیں ہے۔ تمہیں اللہ نے یہ طاقت بخشی ہے۔ اگر کوئی ہمارا میزبان ہے تو اس کا شکریہ بیشک ادا کر دو، اس پر حیرت نہ کرو۔ اسی طرح اکرام آئندہ بھی بہت سے ایسے مواقع آئیں گے جن پر تمہیں حیرت ہوگی جو بتانے کی باتیں ہوں گی میں تمہیں ضرور بتا دوں گا۔ جہاں خاموش رہوں وہاں مجھے مجبور سمجھنا۔ ہاں جس کام کا تعلق تم سے ہوگا تمہیں اس کی اطلاع ضرور دوں گا۔ میرے ساتھ رہو گے تو بہت سے واقعات بہت سے سانحات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان شاء اللہ محفوظ رہو گے۔ خوفزدہ یا فکرمند نہ ہونا اعتماد قائم رکھنا۔''

''جی مسعود بھیا!''

''میری باتیں سمجھ میں آ گئی ہیں؟''

''جی بالکل آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

''کوئی بات تم سے متعلق ہوگی تو میں تمہیں ضرور اس سے آگاہ کروں گا۔'' اکرام نارمل ہوگیا۔ دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ اچانک شور سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی سامنے کے حصے سے بے شمار آوازیں سنائی دینے لگیں، صاف پتہ چل گیا کہ پتھراؤ ہو رہا ہے۔ پتھر دیواروں اور دروازے پر لگ رہے تھے۔ اکرام اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بھی کھڑا ہوگیا۔ اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا کروں، اندازہ ہوگیا تھا کہ بے شمار مجمع ہے جو مسجد پر پتھراؤ کر رہا ہے۔ آن کی آن میں فیصلہ کرلیا۔ خاموشی سے بڑے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اکرام نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر فوراً بند کرلیا۔ اسے میری ہدایات کا خیال آ گیا تھا۔ پتھراؤ مسلسل ہو رہا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ میں نے دروازے کے پٹ کھولے اور باہر قدم رکھ دیا۔ لگ بھگ سوڈیڑھ سو افراد تھے، جیسے ہی دروازہ کھولا ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ پلٹ کر بھاگ اُٹھے اور کافی پیچھے جا کر رُکے۔ یہ شاید یہاں کی روایات کا خوف تھا۔ ان کے درمیان کچھ پولیس والے بھی تھے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے چیخ کر پوچھا۔ میری آواز کے ساتھ وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''تم لوگ یہ پتھر کیوں پھینک رہے ہو؟'' لوگ پولیس والوں سے کچھ کہنے لگے، شاید وہ انہیں آگے بڑھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ مگر پولیس والے بھی انسان تھے۔ کوئی بھی آگے نہ آیا۔ ''جاؤ یہاں سے چلے جاؤ، عبادت گاہوں پر پتھر نہیں پھول پھینکتے ہیں۔''

''یہ زمین مول چند مہاراج کی ہے۔ مسجد کس نے بنائی ہے؟''

''کہاں ہے مول چند اسے بلاؤ۔''

''ہم اسے توڑ دیں گے، اسے توڑ دو۔ توڑ دو اسے۔'' کسی نے پیچھے سے چیخ کر کہا اور مجمع پھر بپھر گیا، پتھروں کی بارش پھر ہوئی لیکن نتیجہ انہوں نے خود دیکھ لیا۔ پتھر پوری رفتار سے ان کے ہاتھوں سے نکلے، ایک لمحے تیرتے نظر آئے اور غائب ہوگئے۔ جتنے پتھر مجمع کے ہاتھوں میں تھے سب فضا میں ہی غائب ہوگئے۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کے شانے پر سے اُچک اُچک کر پتھر تلاش کر رہے تھے۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''اس کے بعد اگر تم میں سے کسی نے ایک بھی پتھر پھینکا تو وہ پلٹ کر اُسی کے لگے گا، مجھے الزام نہ دینا۔''

''زمین مول چند بابو کی ہے، ہم یہاں مسجد نہیں رہنے دیں گے۔'' لوگ پھر چیخے۔

''مسجد یہاں نہ رہی تو مول چند بھی نہ رہے گا یہ یاد رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ایک بہادر نے اس کے باوجود بہادری دکھائی، اس نے ایک پتھر پوری قوت سے پھینکا اور پتھر آدھے راستے پر آ کر پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کی بھیانک چیخ سنائی دی اور وہ لہولہان ہوگیا۔ میں نے اسے چکرا کر گرتے ہوئے دیکھا۔ لوگ خوف سے چیخے اور پھر بھرّا مار کر دوڑ پڑے۔ اس کے بعد وہ نہیں رُکے تھے۔ میرا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہوگیا۔ دل سے شکر یہ نکلا تھا کہ میرے لفظوں کی لاج رکھی گئی۔ مجمع میں سب سے آگے بھاگنے والے پولیس مین تھے۔ اب وہاں صرف زخمی شخص پڑا رہ گیا تھا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی تھی میں نے تشویش سے اسے دیکھا پھر اکرام کو آواز دی۔

''جی بھیا۔'' وہ پیچھے سے بولا۔

''آؤ۔'' میں نے کہا۔ اکرام کے انداز میں اب خوف نہیں تھا۔ وہ پورے اعتماد سے میرے ساتھ زخمی شخص کے قریب آیا۔ زخمی کا پورا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا، تیس پینتیس سال کا شخص تھا۔ سر چکرا رہا تھا اس کا مگر ہوش میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دہشت سے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا کر چیخا۔

''نا میاں جی نا، ارے مر جاؤں گا۔ نا میاں جی تو کا بھگوان کا واسطہ۔ ارے ہمیں نا مارو ارے ہمارے چھوٹے چھوٹے

بچہ ہیں۔ ارے نا مارو ہمیں بھگوان کے لیے۔'' وہ دہشت کے عالم میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے کندھے پر باریک کپڑے کا انگوچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا انگوچھا اُتار لیا، اس کے درمیان سے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا اکرام کو دے کر کہا۔

''اکرام وہ سامنے کھیت کی مینڈھ کے سہارے سہارے پانی بہہ رہا ہے، اس کپڑے کو اس میں بھگو لاؤ۔'' اکرام کپڑا لے کر دوڑ گیا۔ زخمی ہراساں نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا کہ پتھر مت پھینکنا، تم نہ مانے۔''

''ارے رام رام، بھول ہوگئی مہاراج بھول ہوگئی بس ایک بار معافی دے دو۔''

''اطمینان رکھو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ اکرام نے واپس آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ بھیگے ہوئے کپڑے سے میں نے اس کا چہرہ اور زخم صاف کیا۔ پھر اس کے زخم پر کپڑے کی گدی بنا کر رکھی اور کپڑا کس کر باندھ دیا، وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ ''چکر آ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں مہاراج۔''

''گھر جا سکتے ہو؟''

''ہاں۔''

''جاؤ اور سنو عبادت گاہیں خدا اور تمہارے الفاظ میں بھگوان کا گھر ہوتی ہیں، انہیں نقصان پہنچانا گناہ یا پاپ ہے۔ انسان ہو انسان سے پیار کرو۔ ان نفرتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ مسلمان اللہ کا نام لے کر مریں گے، تم بھگوان کو پکار کر مرو گے۔ مرنا دونوں کو ہے پھر آخر یہ جنون کیوں ہے، کیا نام ہے تمہارا؟''

''رام بھروسے۔''

''جاؤ رام بھروسے، احتیاط سے جانا کہیں راستے میں تمہیں کوئی اور جنونی نہ مل جائے۔'' میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ لڑکھڑایا پھر سنبھل گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دُور نکلنے کے بعد اس نے پلٹ کر ہمیں دیکھا، دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور پھر تیزی سے بڑھ گیا۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے اکرام کو واپس چلنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں مسجد میں داخل ہوگئے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، اس کے بعد اور کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو قابلِ ذکر ہو۔ اکرام کی زبان پر بھی تالا لگا ہوا تھا۔ ہماری ضروریات پوری ہو رہی تھیں مگر میں بے اطمینانی کی سی کیفیت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک اضطراب سا دل میں جاگ اُٹھا تھا۔ شام کو میں نے جھنجھلا کر اکرام سے کہا۔

''تمہیں کیوں چپ لگ گئی ہے؟''

''نہیں مسعود بھائی۔''

''ڈر رہے ہو؟''

''خدا کی قسم بالکل نہیں، اب تو ڈر کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اللہ نے مجھے آپ کی قربت دے کر بہت بڑا سہارا دیا ہے۔''

''پھر بھی زیادہ چپ اختیار کر لی ہے تم نے۔''

''آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا بھیا، ایک خیال ہے میرے دل میں۔''

''کیا؟''

''بھیا آپ درویش ہیں اتنا دیکھا ہے میں نے کہ اب دیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں ہے۔ آپ اللہ کے حکم سے سب کچھ کر سکتے ہیں، میں اپنی بہن کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ میرا دل زخموں سے چور ہے مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ آپ، آپ اپنی روحانی قوتوں سے اسے تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ میرے دل کے گھاؤ بھر سکتے ہیں پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے بھیا!'' وہ سسک کر بولا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے گردن جھکا لی۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''اکرام تم نے ابھی کہا ہے کہ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اللہ

کے حکم سے، یہی کہا ہے نا تم نے؟''
''ہاں بھیا۔''
''اللہ کا حکم ہونے دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کچھ نہیں ہوں اکرام، صرف ایک گناہ گار بندہ ہوں اللہ کا۔ جو خود بھی زندگی کے عذاب میں گرفتار ہے جو خود بھی زندگی سے دُور ہے، جو خود بھی اپنا سب کچھ لٹائے بیٹھا ہے۔ اکرام میری امی ہیں میرے ابو ہیں، ایک چھوٹی بہن ہے جسے کچھ لوگوں نے اغواء کر لیا ہے۔ میرا بھائی ہے اور میرے ایک ماموں ہیں محبت کرنے والے مگر سب چھن گئے ہیں مجھ سے، میں انہیں نہیں پا سکتا۔ میں انہیں نہیں تلاش کر سکتا۔ میں اکرام میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ میں سزا بھگت رہا ہوں۔ بس یہ دُعا مانگتا ہوں کہ میری سزا پوری ہو جائے، مجھے معافی مل جائے اور اور میں اپنوں میں پہنچ جاؤں۔ میں طویل سفر پر ہوں اکرام اور اپنی منزل چاہتا ہوں۔ اللہ کے حکم کا منتظر ہوں۔ میری اوقات کچھ نہیں ہے میرے دوست!'' غیر اختیاری طور پر میری آواز رُندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اکرام سکتے کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ بے اختیار آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔
''معاف کر دو مسعود بھیا معاف کر دو میں نے تمہارا دل دُکھا دیا ہے۔ بھیا مجھے معاف کر دو۔''
''نہیں اکرام معافی کس بات کی، میں نے تو تمہیں اپنی اوقات بتائی ہے تاکہ تم مجھے بے حسی کا مجرم نہ سمجھو۔ تمہاری بہن تمہیں ضرور ملے گی۔ میرا خاندان بھی مجھے ملے گا مگر اس وقت جب اللہ کا حکم ہوگا۔''
''آئندہ کبھی کچھ نہ کہوں گا بھیا وعدہ کرتا ہوں۔''
اس کے بعد کیفیت کچھ خوشگوار ہو گئی تھی۔ غالباً دل کا غبار نکل گیا تھا۔ اکرام نے کہا۔ ''اس کے بعد انہوں نے اُدھر رُخ نہیں کیا۔''
''مشکل ہی ہے۔''
''نہ جانے شہر کا کیا حال ہے؟''
''اللہ بہتر جانے۔''
''بے گناہ مر رہے ہیں۔''
''اللہ بہتر سبیل پیدا کرے گا۔'' میں نے کہا۔ رات ہو گئی تھی۔ کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ ہُو کا عالم طاری تھا، کسی پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھی نہ تھی۔ ہم دونوں آرام کر رہے تھے۔ بہت سی باتیں کی تھیں ہم نے اور اب خاموش تھے۔ دفعتاً مسجد کے بڑے دروازے پر دستک ہوئی اور ہم اُچھل پڑے۔ اکرام اُٹھ کر بیٹھ گیا اور سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ دستک پھر ہوئی اور میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
''میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا، اکرام بھی میرے پیچھے آ گیا تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے دروازہ کھولا، باہر تاریکی میں دو سائے نظر آ رہے تھے۔
''کون ہو تم......؟'' میں نے نرمی سے سوال کیا۔ ان کی صورتیں نہیں نظر آ رہی تھیں، ان میں سے ایک نے کچھ کہنا چاہا مگر عجیب سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔ میں نے اندازہ لگایا تو احساس ہوا کہ بے انتہا خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے، وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔
''کیا بات ہے بھائی، کون ہو تم دونوں، کیسے یہاں آنا ہوا؟'' آگے والے آدمی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور تقریباً دوزانو بیٹھتا ہوا بولا۔
''مم مہاراج...... مہاراج آپ کی سیوا میں حاضر ہوئے ہیں، مم مہاراج ہم...... ہم...... ہم......''
''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے۔ کیا تم ہندو ہو؟'' میں نے سوال کیا، پیچھے والا آدمی تھوڑا سا آگے آیا تو میں نے اس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس کیا۔ پیشانی پر بندھی ہوئی سفید پٹی نے بالآخر مجھے یاد دلا دیا کہ وہ رام بھروسے تھا۔ وہ زخمی جسے میں نے زخم

صاف کرنے کے بعد واپس بھیج دیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ارے رام بھروسے تم......؟''

''مم مہاراج میں ہی ہوں۔ میں ہی ہوں۔'' وہ بولا......

''کیا بات ہے، بات بتاؤ......؟''

''یہ...... یہ...... یہ مول چند مہاراج ہیں۔ مول چند اس باغ کے مالک۔''

''اوہو اچھا اچھا۔ تو یہ بابو مول چند ہیں، کہئے مول چند مہاراج کیسے آنا ہوا آپ کا......؟''

''آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں مالک۔ بھگوان کے لیے میرے اس طرح آنے کو برا نہ سمجھیں، بڑی ہمت کی ہے میں نے اور رام بھروسے نے مجھے یہ ہمت دلائی ہے، مہاراج من کی کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔ آپ جو بھی ہیں ہمارے دھرم کے نہیں ہیں مگر سارے دھرم ایک ہی ہوتے ہیں۔ زبان کا فرق ہے، ساری اچھی باتیں دھرم ہی سکھاتے ہیں۔ رام بھروسے نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا مہاراج تو میری ہمت پڑی۔ صبح کو جو کچھ ہوا ہے بھگوان کی سوگند اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں نے کسی سے نہیں کہا تھا کہ جاؤ اور مسجد پر پتھراؤ کرو۔ وہ سب وہ سب انہی پاپیوں کا کیا دھرا ہے مہاراج۔ آپ مجھے شما کر دیں، میرے من کی کچھ باتیں سن لیں۔ مجھے پورا واقعہ معلوم ہوا ہے پر یہ سب تو جگہ جگہ ہو رہا ہے، میں نے کچھ نہیں کرایا، بس مہاراج سن لیجئے میری۔ بڑا دکھی ہوں میں۔ بس ایک بار میری ساری بپتا سن لیجئے۔''

''بیٹھ جاؤ مول چند، تم بھی بیٹھو رام بھروسے۔'' میں نے کہا اور خود بھی سیڑھی پر بیٹھ گیا، وہ دونوں میرے سامنے بڑے ادب سے بیٹھ گئے تھے۔ مول چند کہنے لگا......

''سارے شہر میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے مہاراج۔ رام بھروسے میرے پاس آیا۔ میرا ہی آدمی ہے، اس نے سارا واقعہ مجھے بتایا۔ میری ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی مگر یہ کہنے لگا کہ کوئی حرج نہیں ہے مہاراج سے مل لینے میں۔ بڑے اچھے انسان ہیں، انسانوں کی طرح جینے کا درس دیتے ہیں، بس مہاراج اپنا دکھ لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ یہاں جوالا پور میں جو کچھ ہو رہا ہے مہاراج اس کا ایک کارن ہے۔''

''پہلے یہ بتاؤ، بستی کے ہندو اس وقت بھی انسانی شکار کی تلاش میں تو نہیں نکلے ہوئے ہیں......؟''

''یہاں سے جو لوگ واپس گئے ہیں مہاراج، ان کی تو متا مر گئی ہے، دوبارہ کوئی اِدھر نہیں آئے گا، ویسے اس وقت بستی میں کہیں فساد نہیں ہے، سب اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔''

''ہوں اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''کچھ ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں مہاراج جن کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ آگے چل کر میرے لیے کیسی ہوں، پر یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور کیونکہ گرج ناتھ سیوک کے ہزاروں کان ہیں۔ ہزاروں آنکھیں ہیں، وہ سب کی تاک میں رہتا ہے۔

اس کے قبضے میں بڑے بیر ہیں مہاراج اور وہ اپنے بیروں سے ساری بستی کی خبر رکھتا ہے۔ اسے ضرور پتہ ہوگا کہ ہم اس سے آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''فکر مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ مہان ہیں مہاراج۔ یہاں جو کچھ ہوا میں سن چکا ہوں۔ میں نے ہی نہیں پوری بستی نے آپ کی اذان کی آواز سنی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر، کھلبلی مچ گئی کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ اور اس کے بعد بڑی بڑی باتیں لوگ کر رہے ہیں۔ میرے پاس بھی آئے تھے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں لوگ۔''

''صبح صبح آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ہندو دھرم پر آفت آنے والی ہے۔ کوئی آ گیا ہے اب کیا کریں۔''

"تم نے کیا کہا مول چند۔"
"میں کیا کہتا۔ یہی کہا کہ جاؤ گرج ناتھ کے پاس۔"
"پھر...... وہ گئے......؟"
"ہاں گئے تھے۔"
"کیا کہا اس نے...... تمہیں پتہ چلا۔"
"ہاں مہاراج۔ اس سے تک کسی کو پتہ نہیں تھا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ وہ بولا کہ جاؤ پتہ لگاؤ کہ آواز کہاں سے آئی۔ پھر لوگوں نے یہ مسجد دیکھ لی جو راتوں رات بن گئی ہے۔ بات پوری بستی میں پھیل گئی اور مت کے مارے دوڑ پڑے اس پر پتھراؤ کرنے مگر اس سے ڈرتے بھی تھے۔"
"ڈرتے کیوں تھے؟"
"بس مہاراج، کیا بتائیں۔ بعد میں رام بھروسے نے مجھے پوری بات بتائی، بستی بھر میں شور مچا ہوا ہے کہ مسجد راتوں رات بن گئی۔"
"یہاں ایک مندر بھی تو راتوں رات بن گیا تھا۔"
"ہاں مگر اس کے بارے میں تو سب کو معلوم ہے۔"
"کیا معلوم ہے؟"
"یہی کہ وہ بھوانی کال کا مندر ہے اور کالے جادو سے بنا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ گرج ناتھ سیوک اگھوری ہے اوتار نہیں۔"
"لوگ یہ بات جانتے ہیں۔" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
"کون نہیں جانتا۔"
"پھر بھی اس کے احکامات پر عمل کر رہے ہیں۔"
"بھوت سے کون نا ڈرے ہے مہاراج۔" بابو مول چند نے بتایا۔
"مجھے اس کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ مول چند۔"
"بتانے کے لیے ہی تو آئے ہیں مہاراج۔ جوالا پور کے آس پاس کی زمینیں ہماری ہیں یا پھر کنور صاحب کی۔ وہ ہیں رئیسوں کے دماغ والے۔ ہمیں انہوں نے بھی برابر کا نہ مانا۔ اب مہاراج سب ہی بھگوان کا دیا کھاتے ہیں کون کسی کو مانے۔ ہم نے بھی آنکھیں بگاڑ لیں۔ اس سے پہلے کبھی جوالا پور میں ہندو مسلمان نہ لڑتے تھے مگر...... کنور صاحب ہندوؤں کو نیچ سمجھتے تھے۔ پہلا جھگڑا انہوں نے کر دیا، تب ہندو بھی کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد وہ دوستی ختم ہو گئی جو یہاں مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ بات بات پر جھگڑے ہونے لگے۔ سب کے دلوں میں نفرت کا بیج پڑ گیا تھا۔ کنور کی زمینوں پر مندر تھا پرانا۔ ایک بار ہندوؤں نے اسے بنانا چاہا مگر کنور ریاست علی نے منع کر دیا۔ یہ جان علی کی مسجد ہے، ہم سے کہا گیا کہ مسجد بنانے دیں۔ ہم نے بھی منع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں چل رہی تھیں بڑی بات کبھی نہ ہوئی۔ پھر گرج ناتھ سیوک بستی میں آیا۔"
"کتنی پرانی بات ہے۔" میں نے درمیان میں ٹوکا۔ "کوئی سوا سال ہو گیا مہاراج......"
"وہ بستی میں آیا......؟" میں نے کہا۔
"ہاں گوردھن کے چبوترے پر اس نے آسن لگایا۔ چھ دن چھ راتیں اُلٹی کیلوں پر بیٹھا رہا۔ نہ کھانا نہ پینا، لوگوں کے تو ٹھٹھ لگ گئے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب اسے دیکھنے جاتے تھے۔ پھر اچانک ساتویں صبح وہ نیچے اُترا۔ اس نے پہلی بات یہی پوچھی کہ سامنے کھڑے لوگوں میں کتنے ہندو کتنے مسلمان ہیں۔

✦✤✦✤✦

''خوب، پھر کیا ہوا'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کوئی بیس آدمی تھے۔ سب نے اپنے بارے میں بتا دیا۔ وہ بولا کہ مسلمان وہاں سے بھاگ جائیں، ہندو کھڑے رہیں۔ مسلمانوں نے برا مانا۔ کچھ چلے گئے اور جو نہ گئے ان پر شہد کی مکھیاں دوڑا دیں اس نے......''

''کیسے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں تو وہاں نہیں تھا مہاراج۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے کہا کہ جہاں وہ کھڑے ہیں وہ زمین ہندوؤں کے باپ کی نہیں ہے، وہ نہیں جائیں گے۔ ہندو تو کچھ نہ بولے تھے مگر اس نے ہاتھ اُوپر کر کے مٹھی بند کی اور پھر اسے مسلمانوں کی طرف کر کے کھول دیا، شہد کی مکھیاں اس کی مٹھی سے نکلیں اور مسلمانوں کے چہروں سے چمٹ گئیں۔ خوب کاٹا، وہ چیختے ہوئے بھاگ گئے۔ تب اس نے ہنس کر کہا اب یہ اس بستی سے بھی بھاگ جائیں گے۔ جوالا پور بھوانی کال بنے گا۔ اس کا نام گرج ناتھ ہے اور وہ ہندو دھرم کا سیوک ہے۔ ہندوؤں کو جوالا پور میں رہنے کیلئے جگہ ملے گی اور ایک ایک مسلمان کو وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ بھوانی کنڈ میں صرف گرج ناتھ سیوک کی حکومت ہوگی اور یہ علاقہ پورے ہندوستان سے الگ ہو جائے گا۔ یہاں کے رہنے والے ہندوستان کے بادشاہ کہلائیں گے۔ وہ اتنے دولت مند ہوں گے کہ سارے دیش میں ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکے گا، بس وہ گرج ناتھ سیوک کا ساتھ دیں اور مایا مکنڈ کی تعمیر میں حصہ لیں پھر اس نے زمین پر سے پتھر اُٹھا اُٹھا کر ان لوگوں میں بانٹے جو وہاں موجود تھے اور انہوں نے ان پتھروں کو سونے کے ڈلوں میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ سارے کے سارے نہال ہو گئے تھے۔ پھر بھلا اس کی پوجا کیوں نہ شروع ہو جاتی۔ وہ مہان اوتار مان لیا گیا، بستی میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں نے بھی آ کر کہانیاں سنائیں۔

''جن لوگوں کو سونے کے وہ ٹکڑے ملے تھے، میں نے انہیں بلا کر سونے کے ان ٹکڑوں کو دیکھا، سچ مچ کا سونا تھا مہاراج۔ مگر اس کی باتیں سن کر مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا اور خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب کوئی بری بات ہونے والی ہے۔ خیر میری اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ میں اس کے خلاف کچھ کہتا لیکن میں نے اس کے سامنے جانے سے گریز کیا۔ پھر مہاراج وہ اس مندر پر جا پہنچا، جو ٹوٹے مندر کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتے تھے اور اس کے بڑے عقیدت مند ہو گئے تھے۔ ہر شخص اس کی سیوا کرنے میں لگا رہتا تھا تا کہ اسے کچھ مل جائے۔ آپ جانتے ہیں دولت کا لالچ کتنا برا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے پیچھے لگے ہوئے لوگوں سے کہا کہ پہلے مایا مکنڈ تعمیر ہو جائے پھر لوگ اس سے ملیں۔ اس سے پہلے وہ ان کے لئے کچھ نہیں کرے گا۔ ٹوٹا مندر کنور ریاست علی کی زمینوں پر تھا۔ کنور ریاست علی نے اپنے ہرکاروں کے ذریعے اسے وہاں سے نکلوا دیا اور کہہ دیا کہ وہ مندر بنانے کی اجازت نہیں دیں گے۔

وہ کنور ریاست علی سے تو کچھ نہ بولا، کسی نے اسے میرے بارے میں بتایا اور پاپی سیدھا میرے پاس آ گیا۔ مہاراج اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہ تو اوتار ہے نہ دیوتا نہ سادھو سنت، بس کالا جادو جانتا ہے اور اس کے بل پر کام کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں مندر والی زمین خرید لوں اور وہاں مایا مکنڈ بنانے کی اجازت دے دوں۔ مہاراج بدنصیبی یہ ہوئی کہ جس سمے میں اس سے باتیں کر رہا تھا میری دھرم پتنی بھی وہاں پہنچ گئی۔ سو یہ کرن بہت سیدھی سادی عورت ہے، اس سے ایک دَم متاثر ہوگئی اور اس کی باتیں سننے لگی، پھر اس نے سفارش کی کہ میں کنور ریاست علی سے بات کر کے زمینیں خرید لوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں بات کروں گا۔ مہاراج انسان ہوں ڈر گیا تھا۔ پھر میں نے کنور ریاست علی سے بات کی تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق بڑی حقارت سے میری اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ مندر کے نام پر زمین دے دیں اور اگر مفت نہ دیں تو اس کا مول لے لیں، کہنے لگے مول چند اپنے آپ کو بھی بیچ دو گے تو اس زمین کا مول نہیں دے پاؤ گے۔ وہی باتیں کہیں انہوں نے مہاراج جو بری لگنے والی تھیں، مجھے بھی بری لگیں۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی، چاہتا تو اس وقت بھی ان کی بات کا جواب دے سکتا تھا لیکن نتیجہ فساد کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ ان کے بھی بہت آدمی ہیں۔ یہاں صرف مسلمانوں کا ہی نقصان نہیں ہو رہا۔ ہندو بھی اتنے ہی مارے جا رہے ہیں جتنے مسلمان۔ سو یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ اچانک ہی

لوگوں نے مجھے بتایا کہ مندر کسی پُراسرار قوت نے تعمیر کر دیا ہے اور وہ پورے کا پورا بن گیا ہے۔ اس میں کوئی دروازہ نہیں رکھا گیا چاروں طرف اُونچی اُونچی دیواریں ہیں۔ پھر میں نے اور بھی بہت سی باتیں سنیں مہاراج۔ کنور ریاست علی نے اپنے آدمیوں کو کدالیں لے کر بھیجا اور کوئی سو آدمی مندر پر کدالیں چلاتے رہے لیکن مندر کی مٹی تک نہ اُکھاڑ سکے یہاں تک کہ تھک گئے۔ کنور ریاست علی نے وہاں بارود کے دھماکے بھی کرائے مگر مندر ٹس سے مس نہیں ہوا اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ گرج ناتھ سیوک کوئی بہت بڑا رشی منی ہے۔ یہ جھگڑا چل رہا تھا کوئی سوا سال ہو گیا، حکومت اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتی ہے مگر نجانے کیا ہو جاتا ہے۔ اب سے تھوڑے دن پہلے شاید گرج ناتھ سیوک ہی نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ فساد کریں۔ میرے پاس بھی یہی حکم آیا اور مہاراج میں بھی مجبور ہو گیا، میرے آدمی بھی اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو گئے.....'' میں نے چونک کر بابو مول چند کو دیکھا تو وہ گردن جھکا کر بولا۔ ''اس کا بھی کارن ہے مہاراج'' مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''تو چلو وہ بھی بتا دو بابو مول چند.....''

مول چند گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''میری دھرم پتنی، سوریہ کرن۔ مہاراج اس پاپی نے میرے گھر پر اپنا منحوس سایہ ڈال کر مجھے قابو میں کر لیا.....''

''کیسے؟'' کہانی اور دلچسپ ہو گئی تھی۔

''سوریہ کرن، بھگوان کی سوگند، ایک سیدھی سادی عورت تھی بالکل گھریلو اس نے میری آنکھوں کے اشاروں کے بغیر کبھی کچھ نہیں کیا تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ بدلتی جا رہی تھی۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ اس نے مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ میں کبھی اچانک اس کے کمرے میں چلا جاتا تو وہ چور سی بن جاتی۔ ایسے، جیسے مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ میں نے ایک دن اس سے یہ بات کہی تو وہ بُری طرح بگڑ گئی۔ پہلی بار اس نے میرے سامنے گھر کی بہت سی چیزیں توڑ دیں۔ مجھے غصے سے زیادہ اچنبھا ہوا تھا مہاراج۔ وہ ایسی نہ تھی۔ میں خاموشی سے اس کی نگرانی کرنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے بند کمرے سے کسی مرد کے بولنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ میرے دستک دینے پر وہ دروازہ نہیں کھولتی تھی۔ ایک بار موقع پر میں نے دروازہ تڑوا دیا تو کمرے سے وہ اکیلی نکلی۔ ایک ایک کونا چھان مارا میں نے مگر چڑیا کا بچہ بھی نہیں نکلا۔ وہ تمسخرانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وقت اسی طرح سے گزرتا رہا۔ جوالا پور کے حالات اچھے نہیں تھے۔ کنور صاحب یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ میں نے تعصب میں کیا ہے۔ کئی بار ان کے آدمیوں نے میری تیار فصلیں اُجاڑیں، باغوں کو نقصان پہنچایا۔ انسان تو میں بھی ہوں۔ میں نے بھی جواب دیا۔ مگر معاملہ دُوسرا تھا۔ سوریہ کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کم کی باتیں کرنے لگی تھی۔ ایسے ایسے بناؤ سنگھار کرتی کہ اس نے بھری جوانی میں کبھی نہ کئے تھے۔ تنگ آتا جا رہا تھا میں ان حالات سے مگر کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی پھر ایک دن مہاراج، ایک دن.....''

مول چند خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے چھا گئے، سانس تیز تیز چلنے لگی جیسے کوئی انتہائی خوفناک تصور اس کے ذہن میں جاگا ہو، کوئی بہت بھیانک خیال اس کے ذہن سے گزر رہا ہو۔ نہ صرف میں بلکہ اکرام بھی دم سادھے اس انوکھی داستان کو سن رہے تھے اور اس کے آگے بولنے کے منتظر تھے۔

مول چند کچھ دیر اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ پھر خود کو سنبھال کر بولا۔ ''سوریہ کرن اس شام، سرشام ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ اس نے سب سے منع کر دیا تھا کہ کوئی اس کے پاس نہ آئے۔ مجھے پتا چلا تو میں اندر گیا۔ مجھ سے بھی اس نے کہا کہ اس نے کل بھوگنا برت رکھا ہے اور چاند چمکے ہی وہ باہر نکلے گی اور سب سے پہلے چندرما کے درشن کرے گی۔ میرے لاکھ کہنے پر اس نے دروازہ نہیں کھولا تو میں بگڑ کر چلا آیا۔ مجھے بہت غصہ تھا۔ ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ بات بہت بگڑ گئی ہے، اب کچھ کرنا چاہیے۔ میں اوپر کے گھر میں چلا گیا اور غصے میں جاگتا رہا۔ گھر کے سارے لوگ سو چکے تھے اور چاروں طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں بیلوں کی گھنٹیاں بجنے کی آواز پڑی اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر منڈیر پر آ گیا۔ رات کے اس سمے کس کے بیل کھل گئے؟ میں نے یہ سوچ کر منڈیری سے باہر جھانکا تھا مگر یہ دیکھ کر

میں حیران رہ گیا مہاراج کہ وہ تو ایک رتھ تھا جس میں جوڑی جتی ہوئی تھی، بیلوں پر ساز سجے ہوئے تھے مگر کوئی رتھ بان اس پر موجود نہیں تھا۔ اسی سمے دروازہ کھلا اور سوریہ کرن سجی بنی باہر نکل کر رتھ میں بیٹھ گئی۔ بیل مڑ کر واپس چل پڑے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نظر نہ آنے والا جوڑی ہانک رہا ہو۔ میری حیرت غصے میں بدل گئی۔ کچھ بھی تھا، وہ میری استری تھی۔ میں آندھی طوفان کی طرح نیچے اترا، بغلی حصے سے گھوڑا کھولا اور اس پر زین کسے بغیر بیٹھ کر چل پڑا۔ سوریہ کرن کے اطوار حد سے بگڑ گئے تھے، اب میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ رتھ کافی آگے نکل گیا تھا اور اب بھی چلا جا رہا تھا مگر میں فاصلے سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ جاتی کہاں ہے اور مہاراج! میں نے رتھ کو کنور صاحب کی بغیا میں جاتے ہوئے دیکھا مگر جب وہ گرج ناتھ کے مایا کنڈل کے سامنے رکا تو میرے ہوش بگڑنے لگے۔ میں نے دور ہی گھوڑا روکا، کچھ سوچا اور پھر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ گھوڑے کو میں نے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں آگے بڑھ گیا۔ سوریہ کرن نیچے اتر آئی تھی، پھر وہ چھن چھن کرتی آگے بڑھی، میں بھی اس کا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے سوچا سسری اندر کیسے جائے گی، مندر کا تو کوئی دروازہ ہی نہیں ہے مگر مہاراج! چاند کی پوری روشنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ دیوار کے پاس پہنچی اور پوری کی پوری دیوار میں سما گئی جیسے کسی کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی ہو۔ پہلے تو ڈر لگا۔ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہاں سے بھاگ نکلتا مگر بات دھرم پتنی کی تھی۔ ہو سکتا ہے اس جگہ چور دروازہ ہو۔ آخر گرج ناتھ بھی تو کہیں نہ کہیں سے باہر آتا ہوگا؟ سو اس جگہ پر آنکھیں جمائے میں دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ رتھ مڑ کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ میں نے دیوار کو خوب ٹٹولا مگر مہاراج! کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں سے کوئی اندر گھس سکے۔ غصے سے کلستا ہوا میں پلٹا تو ایک دم میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں مہاراج۔ اس راستے سے چل کر آیا تھا، اسی جگہ کھڑا تھا اور پھر بہت سی بار یہاں آیا تھا مگر وہ کھائی کبھی وہاں نہیں تھی جو اب دیکھی تھی۔ مجھے سنبھلنے کی مہلت بھی نہ ملی اور میں کھائی میں گرنے لگا۔ چیخا بھی تھا خوب زور سے۔ ایسا لگا تھا جیسے پاتال میں گر رہا ہوں۔ یہی خیال آیا تھا کہ اب پران گئے مگر بچ گیا۔ چھپاک کی آواز ہوئی اور بدبو کے مارے میری ناک سڑ گئی۔ کسی گندی کیچڑ کے جوہڑ میں گرا تھا۔ اسی وجہ سے ہاتھ، پاؤں ٹوٹنے سے بچ گئے تھے۔ کچھ دیر تو ہوش ہی نہ آیا مگر جیون سب کو پیارا ہوتا ہے، جوہڑ بھی زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں مار کر باہر نکل آیا۔ چاند اب بھی چمک رہا تھا اور وہ جگہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ عقل ہی ساتھ نہ دے پا رہی تھی۔ کنور ریاست علی کا باغ، بھورتی مندر اور یہ کھائی۔ ساری باتیں عجیب تھیں۔ گندہ جوہڑ پیچھے تھا پھر سامنے کچھ نظر آیا۔ کچھ لوگ تھے۔ انہوں نے ایک تخت بچھایا، اس پر قالین بچھایا گیا۔ دوسرے نیچے قالین بچھا رہے تھے۔ بہت سے لوگ آ آ کر اس قالین پر بیٹھ رہے تھے۔ بیچ میں جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ پھر کنارے کنارے سازندے آ کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد چار خوبصورت عورتیں زیوروں میں لدی ہوئی آئیں اور نیچے بیٹھ کر پیروں میں گھنگھرو باندھنے لگیں۔ پھر اچانک سارے کے سارے اٹھ کھڑے ہوئے اور مہاراج، میں نے دیکھا کہ وہ پاپی کالا جادوگر اوپری بدن سے ننگا، نچلے جسم پر کاریا کندی کی دھوتی منڈھے، سر پر سونے کا تاج پہنے، گلے میں ہیروں کی مالائیں ڈالے، اس سسری کا ہاتھ پکڑے، سینہ تانے چلا آ رہا ہے اور وہ نرکھنی ایسے لجائی شرمائی اس کے ساتھ چل رہی ہے جیسے ابھی ابھی لگن منڈپ کے پھیرے پورے کر کے سیدھی آ رہی ہو۔ دونوں آ کر تخت پر بیٹھ گئے اور نرتکی ہاریاں کھڑی ہو گئیں۔ سازندوں نے ساز سنبھال لئے۔ جو کچھ تھا، اپنی جگہ تھا مگر اپنی استری کو یوں دیکھ کر ڈر، خوف من سے نکل گیا۔ غصے سے بدن کانپنے لگا اور میں دھاڑتا ہوا، اسے گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھا۔ سازندوں کے ہاتھ رک گئے، نرتکی ہاریوں کے پاؤں۔ سب کے سب مجھے دیکھنے لگے۔ گرج ناتھ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"سوریہ کرن...... کیوں آئی ہے یہاں؟ کیا کر رہی ہے تو......!" میں غصے سے دھاڑتا ہوا بولا۔

"کون سوریہ کرن، بابو مول چند! کس کی بات کر رہے ہو؟" گرج ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ...... یہ میری دھرم پتنی ہے گرج مہاراج۔ یہ میری استری ہے۔"

"آگے ایسا کہو گے تو مارے جاؤ گے۔ یہ تمہاری دھرم پتنی نہیں، کنسا بھوانی ہے۔ امر بھوانی...... جے کنسا سروپا۔" اس

نے کہا۔ پھر وہاں موجود لوگوں سے بولا۔ ''کنٹھ سبھا میں یہ کالا چور کیسے گھس آیا؟ تم سارے کے سارے سسرو اندھے ہوگئے؟ سبھا خراب کر دی اس نے، مار بھگاؤ اسے......'' اور مہاراج وہ سب مجھ پر پل پڑے۔ خوب مارا مجھے...... گھسیٹتے ہوئے بہت دور تک لائے اور پھر ایک جگہ ڈال دیا۔ اس کے بعد سب چلے گئے۔ یہ وہی جگہ تھی مہاراج جہاں میرا گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ہی مایا مکنڈ نظر آ رہا تھا۔ ویسے کا ویسا، دروازے کے بغیر۔ میں کراہتا ہوا اٹھا، گھوڑے کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر ڈر گیا اور ہنہناتا ہوا سرپٹ ہولیا۔ یہ نئی پِتا پڑی تھی۔ غصہ تھا، تکلیف تھی۔ گرتا پڑتا گھر کو چل پڑا۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں میں گھر پہنچا تھا۔ بھگوان کا شکر تھا کہ کوئی جاگتا نہ ملا۔ گھر میں آ کر اشنان کیا۔ گندے بدبو بھرے کپڑوں کی گٹھری بنا کر دیوار سے دوسری طرف اچھال دی اور پھر اپنی چوٹوں کو سہلاتا ہوا کمرے کی طرف چل پڑا۔ سوریہ کرن کے بارے میں اب فیصلہ کرنا تھا، جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ بہت زیادہ تھا۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا تھا، کوئی ٹھوس فیصلہ کرنا تھا مگر مہاراج! دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے پلنگ پر سوتے پایا۔ بھیجہ ہل کر رہ گیا۔ وہ گھر کے عام کپڑے پہنے کروٹ لئے گہری نیند سو رہی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ گھر سے نکلی ہے۔ چہرہ بھی بناؤ سنگھار سے صاف تھا، کہیں سے بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلی ہے۔ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ پاگلوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ یہ کیا تھا؟ کس جال میں پھنس گیا تھا میں۔ اسے یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا میں نے اور پھر وہ کالی سبھا میں بھی نظر آئی تھی۔ مجھے اتنا بڑا دھوکا تو نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ سب گرج ناتھ کے جال ہیں، اس کا کالا جادو ہے اور میری دھرم پتنی نردوش ہے۔ وہ بے چاری کالے جال میں پھنس گئی ہے مگر اب کیا کروں، اسے کیسے بچاؤں؟

صبح کو وہ بالکل ٹھیک تھی مگر میرا بدن درد کر رہا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ''جی خراب ہے کچھ......؟''

''ہاں!''

''کیا بات ہے؟''

''کل تم نے بھوگنا برت رکھا تھا؟''

''ہاں۔!''

''چندرما دیکھ کر برت توڑا تھا؟''

''ایں......؟'' وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔ پھر وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ ''کہاں برت توڑا تھا میں نے...... چاند نکلنے کے انتظار میں لیٹی، پھر سو گئی۔ ہائے رام! میرا برت تو بیکار گیا۔'' اس کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

''رات کو نہیں جاگیں......؟''

''کہاں جاگی...... اور...... اور...... ارے تم نے دروازہ کیسے کھولا اندر سے؟''

''تم نے نہیں کھولا تھا......؟''

''بالکل نہیں...... میں تو سو گئی تھی۔'' میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اچانک کہا۔ ''یہ برت کیوں رکھا تم نے؟''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو میں نے پھر اس سے یہی سوال کیا۔ وہ کچھ دیر کے بعد بولی۔ ''تمہیں نہیں بتا سکتی۔''

''بتاؤ۔''

''نہیں...... یہ مشکل ہے۔''

''کیا گرج ناتھ کے کہنے سے؟'' میں نے غصے سے پوچھا اور وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔

''گرو دیو کا نام کیسے لے رہے ہو تم؟''

"گرودیو...... وہ تمہارے گرودیو کیسے ہو گئے؟"
"اس گھر میں ان کا نام عزت سے لینا ناتھ، یہ میں تم سے کہے دیتی ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔
"کیا تم اس سے ملتی رہی ہو......؟"
"میں جو کچھ کرتی ہوں، میں جانتی ہوں۔ مگر جو کچھ میں نے کیا ہے، اس کا الٹا نہ ہو۔"
"کیا بکواس کرتی ہو؟ وہ تمہارے لیے مجھ سے بڑا ہو گیا۔ وہ گندے دھرم والا...... اور پھر تم نے اسے گرو بنانے کی آ گیا کس سے لی؟"
"دیکھو بابو مول چند! میں تمہاری پتنی ہوں، باندی نہیں۔ تم صرف پتی رہو، پرمیشور نہ بنو۔ آخری بار کہہ رہی ہوں گرو جی کا نام عزت سے لو۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔
"لگتا ہے دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ وہ چاہتی ہو جو میں نے کبھی نہیں کیا۔" میں نے کہا اور وہ مجھے گھورنے لگی۔ اس کی سرخ آنکھیں بے حد بھیانک لگ رہی تھیں۔ پھر وہ مسکرائی اور بولی۔
"گزری رات بھول گئے مول چند جی۔ برے سے کو اتنی جلدی نہیں بھولنا چاہیے۔" اور مہاراج میرے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ وہ روشنی میں آ گئی۔ رات کو وہ گھر سے گئی تھی اور پھر واپس آ گئی تھی۔ وہ معصوم نہیں ہے، وہ بہت گہری ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے لیکن گزری رات بے حد بھیانک تھی۔ میں ابھی تک بدن کی دکھن محسوس کر رہا تھا۔ اسے اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں اس کے کمرے سے نکل آیا مگر مہاراج میں بہت پریشان تھا۔ میرا تو گھر ہی لٹ گیا تھا۔ بھگوان نے جو کچھ بھی دیا تھا، مزے سے گزر رہی تھی، پتنی سے پریم بھی تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ پھر مہاراج! ہر رات یہی ہونے لگا۔ رات گئے رتھ آتا، وہ جاتی پھر نہ جانے کب واپس آتی۔ دوبارہ اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے مہاراج۔ سوریہ کرن سے میرے سارے رشتے ختم ہو گئے تھے۔ اس کے کہنے سے میں نے اپنا کمرہ بھی الگ کر لیا تھا۔ میں بھسم ہوا جا رہا تھا مگر بے بس تھا، کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس کا۔ سوریہ کرن ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ادھر گرج ناتھ کے ہاتھ اور پھیلنے لگے۔ اب وہ جوالا پور میں مندر سے باہر بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ کیسے باہر آتا تھا، کسی کو نہیں معلوم تھا۔ رادھے چرن بزاز ہے۔ جوالا پور میں اس کا کپڑے کا سب سے بڑا کاروبار ہے، سو کھڈیاں چلتی ہیں اس کی اور اس کی بنائی ہوئی کھادی پورے ہندوستان میں مانی جاتی ہے۔ اس کا بیٹا امبھا چرن بیمار ہو گیا اور پھر ایک دن وہ چل بسا۔ رادھے چرن تو پاگل ہو گیا۔ امبھا اس کا اکلوتا تھا، جوان تھا۔ رادھے چرن آتم ہتھیا کرنے پر تل گیا، تب کہیں سے گرج ناتھ نمودار ہو گیا۔ امبھا چرن کی ارتھی تیار کی جا رہی تھی۔ وہ ارتھی کے پاس آ کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔ "تجھے بیٹے کا جیون چاہیے رادھے چرن۔ بول اس کا جیون چاہیے تجھے......؟"
رادھے چرن نے گرج ناتھ کے پاؤں پکڑ لیے۔ "مل جائے گا تجھے تیرا بیٹا۔ جیا مل جائے گا مگر ہمارا چیلا بنانا پڑے گا اسے۔ پھر وہ تیرا نہیں، ہمارا ہوگا۔ بول منظور ہے تجھے؟"
"منظور ہے مہاراج، مجھے منظور ہے۔ مجھے میرے بیٹے کا جیون دے دو اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ بس میں اس کا جیون چاہتا ہوں۔"
"بھاگ جاؤ، پھر سارے کے سارے بھاگ جاؤ یہاں سے۔ جاؤ سب یہاں سے باہر بھاگ جاؤ۔" سب باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر کے بعد گرج ناتھ بھی باہر نکل آیا۔ امبھا چرن اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بہت سے لوگ ڈر کے یہاں سے بھاگ گئے، باقی گرج ناتھ کے چرنوں میں گر پڑے۔ بہت بڑا چمتکار تھا۔ اس نے بڑا چمتکار اور کیا ہوتا۔ امبھا چرن ہٹا کٹا ہو گیا۔ گرج ناتھ کے بارے میں ملے جلے تاثرات تھے۔ دوسرا واقعہ ٹھاکر کیداری ناتھ کا تھا۔ ان کے بیٹے کی پتنی نتھیا بڑی سندر تھی مگر اسے سوتے میں چلنے کی بیماری تھی۔ ایک رات وہ سوتے سوتے چل پڑی اور جوالا پور کے سب سے گہرے کنوئیں میں گر پڑی۔ صبح کو پنساریوں نے اس کی لاش کا پتا دیا۔ کہرام مچ گیا۔ نتھیا مر چکی تھی۔ پوری بستی کے کاروبار بند

ہو گئے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، سب دکھ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گرج ناتھ آیا، ہنستا ہوا اس کمرے میں گھس گیا جہاں اس کی ارتھی رکھی ہوئی تھی، پھر نتھیا کے ساتھ باہر نکل آیا مگر دونوں جینے والے گرج ناتھ کے چیلے بن گئے تھے۔ ان کے ماتا پتا اور سرپرست خوش تو تھے کہ انہیں جیون مل گیا تھا مگر ایک طرح سے وہ اپنے گھروں سے دور ہو گئے تھے۔ اسما چرن، رادھے چرن کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گھر سے باہر نکل جاتا۔ نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا۔ وہ تو خیر مرد تھا لیکن نتھیا جو کچھ کر رہی تھی، وہ سب کیلئے پریشان کن بات تھی۔ ٹھاکر کیداری ناتھ کی عزت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ ان کا بیٹا جوالا پور چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی سندر پتنی راتوں کو گھر سے غائب رہے اور سارے جوالا پور میں تلاش کرنے کے باوجود نہ ملے۔ خوب ہار سنگھار کرے، گھر واپس آئے تو ایسے جھومتی ہوئی جیسے نشہ کر لیا ہو۔ یہ دونوں ہمیشہ گرج ناتھ کے گن گاتے رہتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ سوامی ہری داس جو سال کے سال جوالا پور آتے تھے، اس سال بھی جوالا پور پہنچے۔ کیداری ناتھ کے ہاں ہی ٹھہرتے تھے۔ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو الٹے پاؤں واپس پلٹ گئے۔ حیرت سے کیداری ناتھ کو دیکھا اور بولے۔ ''کیداری! یہ گھر میں تو نے کیا بسا لیا......؟''

''کیوں مہاراج! خیریت تو ہے۔''

''یہ گندگی تیرے گھر میں کہاں سے آ گئی کیداری؟''

''کون سی گندگی مہاراج؟'' ہری داس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوبارہ گھر میں واپس آئے، سارے کونے کھدروں کو چھانتے پھرے اور اس کے بعد ایک ایک سے ملے، یہاں تک کہ نتھیا سامنے آئی تو ہری داس کو دیکھ کر اس کی حالت خراب ہو گئی۔ الٹے پاؤں گھر سے بھاگ گئی۔ ہری داس، کیداری ناتھ سے بولے۔ ''یہ تو تیرے بیٹے کی بہو ہے ناں! نتھیا ہی ہے ناں یہ......؟''

''ہاں مہاراج۔'' کیداری ناتھ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''آگے بول، آگے کیداری ناتھ۔''

''اس بیچاری کے ساتھ بری ہو گئی تھی۔ مہاراج! آپ کو یہ تو پتا ہے کہ راتوں کو سوتے میں یہ چلنے کی عادی تھی۔'' کیداری ناتھ نے پورا واقعہ ہری داس کو سنایا تو ہری داس سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''کیداری ناتھ! یہ نتھیا نہیں ہے۔''

''نہیں وہ میری بہو ہی ہے۔''

''نہیں کیداری ناتھ! تیری بہو تو کنویں میں گر کر مر چکی تھی، اب تو اس کے شریر میں ایک گندی آتما رہتی ہے۔ تم اسے بیر کہہ سکتے ہو گرج ناتھ کا۔ وہ گرج بابو کا بیر ہے جو نتھیا کے شریر میں داخل ہو گیا ہے اور اسی کے بل پر اس کا شریر قائم ہے۔'' کیداری ناتھ تو بھک سے رہ گیا تھا۔ نتھیا کی بہت سی حرکتیں اس کے علم میں تھیں جن سے ہری داس کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ پھر جب اس نے اسما چرن کے بارے میں بتایا تو ٹھاکر ہری داس رادھے چرن کے گھر بھی گئے اور گھر کے دروازے کے قریب پہنچتے ہی بولے۔ ''وہی بات ہے، وہی بات ہے۔ نہیں بھئی! تم لوگ اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو اور بستی جوالا پور کو بھی۔ ایک گندی آتما آ گئی ہے یہاں جو کالے جادو کی ماہر ہے۔ اس نے اپنے بیر انسانوں کے شریر میں اتار دیئے ہیں۔ پتا نہیں سسرا کیا چاہتا ہے؟''

''اگر یہ سچ ہے مہاراج تو پھر تو کوئی بڑی بات بھی ہو سکتی ہے، آپ کچھ اپائے کریں۔''

سوامی ہری داس سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے بستی کے ایک ویران سے علاقے میں دھونی رمائی اور تین دن تک وہیں بیٹھے رہے۔ سب لوگ ان کی خبر گیری کر رہے تھے۔ جوالا پور میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ہر سال آتے تھے اور لوگوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ سب ہی ان کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ تیسرے دن جب ان کی دھونی ختم ہوئی تو وہ چپ چاپ اٹھے اور بستی جوالا پور سے نکل گئے۔ پھر کسی نے انہیں جوالا پور میں نہیں دیکھا تھا مگر جو بات وہ چھوڑ گئے تھے، وہ لوگوں

میں گشت کر رہی تھی۔ کچھ نے ان کی بات کو سچ مانا، کچھ نے جھوٹ۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ پھر ایک دن امبھا چرن نے جوالا پور کے چوک میں کھڑے ہو کر ایک ایسی اشتعال انگیز تقریر کی جو پہلے کسی کے دماغ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا۔ جوالا پور کے ہندوؤ! تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ تمہارے درمیان کتنا مہان پرش آ گیا ہے، تمہاری تقدیریں بدلنے والی ہیں، وہ تمہارے لئے دولت کے انبار لگا دے گا۔ جوالا پور درحقیقت اکھنڈ ہندو استھان بنے گا اور سارا ہندوستان اس کے پیچھے ہوگا۔ تم لوگوں نے گرج ناتھ کو سمجھا نہیں ہے۔ بھوانی کنڈ کو پھیلاؤ، کنور ریاست علی سے اس کا باغ چھین لو، اس پورے باغ کے گرد چار دیواری بنوا دو اور اس کا ایک راستہ بنا دو تاکہ تم مایا مکنڈ کی سیوا کر سکو، اس کے درشن کر سکو، وہ بہت بڑا استھان ہے اور گرج ناتھ سیوک جی تمہارے جوالا پور کو تمہارے لئے سورگ بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہی تقریر نتھیا نے بھی کی۔ لوگوں نے سنا، مسلمانوں کے خلاف ان دونوں نے باقاعدہ پروپیگنڈا شروع کر دیا اور بات کنور ریاست علی خان تک پہنچ گئی۔ ریاست علی خان نے فوری طور پر ردعمل کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ریاست علی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جوالا پور کے ہندو سرکشی کر رہے ہیں، مسلمان اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیں۔ وہ سرکار سے رجوع کر رہے ہیں۔ لیکن اگر سرکار سے رجوع کرنے کے باوجود جوالا پور میں کوئی ڈھنگ کی بات نہ ہوئی تو جوالا پور کے مسلمان، ہندوؤں کو خود منہ توڑ جواب دیں گے۔ جوالا پور کے سمجھداروں نے آپس میں بیٹھ کر اس سلسلے میں بات چیت کی۔ کنور ریاست علی خان کو اور مجھے آمنے سامنے کیا گیا۔ میں نے کنور ریاست علی خان سے کہا کہ یہ چند لوگوں کا کام ہے۔ سارے جوالا پور کے ہندو ایسی سوچ نہیں رکھتے تو کنور صاحب نے کہا کہ اگر میں جوالا پور سے ہمدردی رکھتا ہوں تو جا کر حکومت سے بات کروں اور کہوں کہ ان سرکشوں کی سرکشی دبانے کیلئے فوری اقدامات کئے جائیں۔ ابھی تک مسلمانوں نے ایسی کوئی تقریر نہیں کی ہے لیکن جوابی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ میں نے سب کے سامنے وعدہ کیا کہ میں پہلے تو ان لوگوں کو سمجھاؤں گا جو ایسی باتیں کرتے پھر رہے ہیں اور اگر یہ سمجھنے سے باز نہ آئے تو پھر سرکار کو درخواست دوں گا۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے من سے کیا تھا لیکن اس رات جب میں اپنے الگ کمرے میں سو رہا تھا، میرے کمرے کے دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور پھر میں نے اپنی دھرم پتنی اور گرج ناتھ سیوک کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ گرج ناتھ سیوک لال لال آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''تو تم ہندو استھان بنانے سے روک رہے ہو جوالا پور کو۔ تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟''

میں نے ہمت کی اور گرج ناتھ سیوک سے کہا۔ ''مہاراج! ہاتھ جوڑتا ہوں، آپ کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں میں، آپ کی شکتی کے سامنے لیکن مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ ہندو، مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوگا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ لاتعداد ہندو مارے جائیں گے، لاتعداد مسلمان مارے جائیں گے اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔''

''بک بک مت کر۔ تجھ سے زیادہ تو تیری پتنی سمجھدار ہے۔ وہ جوالا پور کو بھوانی کنڈ بنانے پر آمادہ ہے۔ ارے باؤلے! تو ہمیں کیا سمجھتا ہے، ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے۔ گرج ناتھ ہے ہمارا نام، کون سا بھید نہیں جانتے ہم۔ یہ محل تیرے پرکھوں کا ہے نا، یہ حویلی تیرے باپ دادا نے بنائی ہے نا۔ بول کیا وہ تجھے بتا گئے ہیں کہ اس حویلی کے نیچے ایک تہ خانہ چھپا ہوا ہے اور اس تہ خانے میں ایک عظیم الشان خزانہ ہے۔ اتنا بڑا خزانہ کہ تو سارے جنم بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتا رہے، تب بھی اتنا نہ کما پائے۔ ارے یہ ہم جانتے ہیں اور یہی نہیں جوالا پور میں ہی نہیں، آس پاس کی زمینوں میں جتنے خزانے دفن ہیں، ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم سے کوئی کیا ٹکرائے گا...... آ ہم تجھے دکھائیں وہ خزانہ جو تجھے معلوم نہیں ہے، اس کے بعد تجھ سے دوسری باتیں کریں گے۔''

اور مہاراج اس کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔ میں نے اب بھی اس سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دیکھو گرج ناتھ مہاراج! اس دن سے میں تمہارے آڑے نہیں آیا، تم نے میری دھرم پتنی پر قبضہ جما لیا، تم نے میرا سنسار مجھ سے چھین لیا۔ میں کچھ نہیں بولا مگر مہاراج یہ سب کچھ اچھا نہیں ہے۔ بہت سے بچے یتیم ہو جائیں گے، بہت سی عورتیں ودھوا ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کرو۔ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ واقعی مجھے کسی ایسے خزانے تک لے جائے گا بلکہ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب میں کسی

بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں، لیکن حویلی ہی کے ایک ایسے حصے میں جو پرانا بنا ہوا تھا اور اب کھنڈر کی شکل میں پڑا ہوا تھا، وہ ایک چھوٹے سے دروازے سے اندر لے گیا۔ اندر گھس کر میری دھرم پتنی سوریہ کرن نے ایک مشعل روشن کر لی اور اس کے بعد گرج ناتھ سیوک نے ایک دیوار میں کچھ ٹٹول کر ایک دروازہ دریافت کیا جسے میں نے واقعی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم اس دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ لمبی سی سرنگ تھی۔ ناگوں کی سی پھنکار سنائی دے رہی تھی اور میرا شریر خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں اپنے جیون کے انت کا یقین کر چکا تھا لیکن لمبی سرنگ کا خاتمہ ایک بڑے سے چوکور کمرے پر ہوا جو لال اینٹوں ہی سے بنا ہوا تھا اور سیکڑوں سال پرانا معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے میں لکڑی کے بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے جن کی لکڑی کے رنگ سے ان کے پرانے ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ مشعل کی روشنی میں کمرے کا ماحول بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ گرج ناتھ سیوک نے ایک صندوق کھول دیا اور پورا کمرا بھک سے روشن ہو گیا۔ سفید، نیلی، ہری، پیلی، لال روشنیوں کی کرنیں پورے کمرے کو منور کرنے لگیں۔ یہ ہیرے جڑے زیورات تھے جن کی بناوٹ اتنی پرانی تھی کہ اب ایسی بناوٹ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ سونے کے یہ زیورات، گول گول گنیاں اور نجانے کیا کیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ مہاراج! دولت اس سنسار کی سب سے بڑی چیز ہے اور میرے سامنے سچ مچ اتنی دولت موجود تھی کہ میں خواب میں بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے سپنوں میں بھی نہیں سوچا تھا اس کے بارے میں۔ گرج ناتھ سیوک نے کہا۔

”یہ تیری ہے اور یہی کیا بلکہ یوں سمجھ لے کہ دھرتی کے اندر اتنا کچھ چھپا ہوا ہے کہ تو دیکھے تو حیران رہ جائے۔ ہم تجھے بھی یہ سب کچھ دکھا دیں گے۔ تیری دھرم پتنی تو ہمارے ساتھ دھرتی کی گہرائیوں میں سفر کرتی ہے۔ ہم نے اسے مہان بنا دیا ہے۔ وہ اکیلی ہی چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے مگر اب وہ سمے آ گیا ہے جب تجھے ہمارا یہ کام کرنا ہے۔ ہم تجھے مجبور نہ کرتے لیکن جو وعدہ تو کر کے آیا ہے، وہ تیرے پریوار کیلئے بڑا خراب ہوگا اور ہم نہیں چاہتے کہ سوریہ کرن کے من کو دکھ پہنچے۔ سوتو کچھ نہیں بولے گا اس سلسلے میں، نہ کسی کو سمجھائے گا، نہ کہیں باہر جائے گا بلکہ تو اب ہمارے لئے کام کرے گا۔ جوالا پور کا بہت بڑا آدمی بننے کیلئے اب تجھے ہمارے کام کرنے ہوں گے اور جو کام ہم تجھ سے لینا چاہتے ہیں، وہ تجھے بتائے دیتے ہیں۔ کیا سمجھا۔ اب ہندو مسلمانوں کی بات آگے بڑھ جانی چاہیے اور تو چنتا مت کر، ہم ان سارے سسروں سے نمٹ لیں گے، ٹھیک کر دیں گے ایک ایک کو۔ جو مارے جائیں گے، وہ تو مارے جائیں گے، باقی جوالا پور چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور پھر جوالا پور بنے گا اکھنڈ ہندو جاتی۔ اکھنڈ بھوانی استھان، کیا سمجھا؟ وہ قہقہے لگانے لگا لیکن مجھ پر خزانے کا سحر طاری تھا۔ اس بھنڈار میں اتنا کچھ تھا کہ میری عقل ٹھکانے نہیں رہی تھی۔ وہ ہاتھ پکڑے مجھے وہاں سے باہر نکال لایا اور اس کے بعد میری دھرم پتنی سے بولا۔ ”ہم جا رہے ہیں سوریہ! ہمارے بعد تو اس باؤلے کو سمجھا نا۔ یہ کام اب تیرے سپرد ہے۔“

بہت مہان بننے کی کوشش نہیں کر رہا مہاراج۔ انسان تھا، انسان ہوں اور انسان رہوں گا۔ وہ خزانہ دیکھ کر مجھ پر ایسی بدحواسی طاری ہو گئی تھی کہ میری سوچنے، سمجھنے کی قوت ہی ختم ہو گئی تھی۔ سوریہ کرن مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ بڑے پریم سے مجھے بٹھایا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے میرے اتنے قریب آ کر مجھ سے بات چیت کی کہ میرا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ بولی۔ ”سچ یہ ہے کہ مہاراج گرج ناتھ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ ہم تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے پاس مہان شکتی ہے اور وہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ یہ تو میری اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے پہلے مجھے اور اب تمہیں اپنا سیوک چن لیا۔ یقین کرو ہم سنسار کے امیر ترین لوگ بن جائیں گے۔ جوالا پور میں رہنے والا ہر ہندو اتنی دولت حاصل کرلے گا کہ شہر کے شہر خرید سکے۔ مہاراج مجھے دھرتی کے سینے میں نجانے کتنی دور دور تک کا سفر کرا لائے ہیں۔ انہوں نے کھنڈروں میں اور زمینوں میں چھپے ہوئے ایسے ایسے خزانے دکھائے ہیں مجھے کہ تم دیکھو تو تمہاری آنکھوں کی روشنی چلی جائے۔ وہ یہ سارے خزانے اکٹھے کر کے اکھنڈ بھوانی مکنڈ میں لانا چاہتے ہیں۔ جوالا پور کے بھاگ جاگ رہے ہیں تو پھر تم ہندو جاتی ہو کر ہندوؤں کیلئے کام کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”مگر انسانوں کا جیون بھی تو کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ جب لڑائی ہوگی تو کیا ہندو نہ مارے جائیں گے مسلمانوں کے

ہاتھوں؟''

''دیکھو جو کچھ ہونا ہوگا، وہ تو ہو کر رہے گا مگر تم کیوں اپنے جیون کو روگ لگاتے ہو۔ تم وہی کرو جو گرج ناتھ بھگوان کہتے ہیں۔''

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''سب سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ وہ جو مسلمان نواب ہیں نا، ارے میں اس کنور ریاست علی کی بات کر رہی ہوں، تم اس سے گٹھ جوڑ کرو، میل ملاپ بڑھاؤ۔ اس کے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہوا ہے، وہ تعویذ اسے کسی مسلمان جوگی نے دیا تھا۔ وہ تعویذ اسے سنسار کی ہر آفت سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ اس کے ہاتھ پر نہ ہوتا تو اب تک تو اس کا کریا کرم ہو چکا ہوتا۔ تم اس سے اس بارے میں بات چیت کرو کہ تم اسھا چرن اور نتھیا کے بیانوں کے خلاف کام کر رہے ہو اور ہندوؤں کو اپنا ہم آواز بنا رہے ہو۔ اس سلسلے میں تمہیں کنور ریاست علی کی مدد درکار ہوگی۔ اس سے کہو کہ پرانی رنجشیں بھلا کر پھر سے نئی دوستی کی جائے۔ جیسے بھی بن پڑے، اسے جھیل پر نہانے لے جاؤ اور جب وہ جھیل میں اترے تو اس کے بازو سے تعویذ کھول لو یا پھر اسے اس کے گھر میں یا پھر کہیں اور بلا کر نشے کی کوئی ایسی چیز دے دو کہ وہ بے ہوش ہو جائے اور پھر اس کا تعویذ اتار لو۔ یہ کام تمہیں جیسے تمہارا من کہے، کرنا ہے۔ تمہارا بس اتنا ہی کام ہے باقی کا ہم کر لیں گے۔''

میں حیرت سے سوریہ کرن کو دیکھنے لگا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ گرج ناتھ سیوک کے کاموں سے کتنی واقف ہو چکی ہے۔ ایک طرح سے مجھ سے تو وہ ہٹ ہی چکی تھی۔ سارا کچھ تھا مہاراج...... مجھے خزانوں کا لالچ دیا گیا تھا مگر انسانوں کا جیون کھونے کو میرا من نہیں مانتا تھا اور پھر یہ بات بھی بڑی عجیب لگی تھی مجھے کہ وہ ریاست علی کے کسی تعویذ سے خوف زدہ تھا اور اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح کچھ امید بندھی تھی مہاراج کہ کوئی ایسی چیز ہے جو اسے اس کے کالے کرتوتوں سے روک سکتی ہے۔ دل میں، میں نے سوچ لیا کہ یہ کام میں کبھی نہیں کروں گا مگر چالاکی سے کام لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے سوریہ کرن سے کہا۔

''یہ ساری باتیں تو اپنی جگہ سوریہ..... مگر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''کیوں۔ مجھے کیا ہو گیا؟''

''تم تو مجھ سے بالکل ہٹ گئی ہو۔''

''جو گرج ناتھ کے سیوک ہوتے ہیں، وہ کسی اور کے کچھ نہیں ہوتے۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

◆✤◆✤◆

''مگر تم میری دھرم پتنی ہو۔''

''میرا دھرم اب صرف سیوک دھرم ہے۔''

''میرا اب تم سے کوئی ناتا نہیں رہا؟''

''سنسار کی نگاہوں میں جو ہے، سو ہے۔ تم چاہو تو اسے توڑ دو، چاہو بنا رہنے دو، یہ تمہاری مرضی ہے۔ ویسے میری مدد کیلئے آج ناتھ کے سیوک بن جاؤ، سب کچھ مل جائے گا تمہیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب سوریہ کرن وہ سوریہ نہیں رہی جو تھی۔ وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ اب تو اس سے بھی ڈرنا پڑے گا۔''

''کیا سوچنے لگے مول چند بابو؟'' اس نے مجھے خاموش پا کر کہا۔

''سوچ رہا ہوں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تو سرکار سے اس بارے میں بات کرنے جا رہا تھا۔''

''کیوں اپنے جیون پر کشٹ مول لیتے ہو؟ کچھ حاصل نہیں ہوگا اس سے تمہیں جو کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔ اس میں جیون سوارت ہو سکتا ہے، نہیں تو نقصان اٹھاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دھمکیاں کیوں دے رہی ہو مگر آخر ایسی کیا بات ہے اس تعویذ کے اندر جس کی وجہ سے گرج

ناتھ سیوک جیسا مہان کنور ریاست علی سے ڈرا ہوا ہے؟"

"دیکھو جو کام کہا جائے، بس اس کے بارے میں سوچو۔ کیا ہے، کیوں ہے، کیسے ہے، یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں اور ان سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے بہت سی گالیاں دی تھیں۔ دھرم پتنی میری تھی اور بات ایسے کر رہی تھی گرج ناتھ سیوک کے بارے میں جیسے اس سے جنم جنم کا رشتہ ہو۔ بہرطور میں نے وعدہ کرلیا مگر دل میں، میں نے سوچا کہ بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس کوشش میں، میں کامیاب نہیں ہوسکا اور اس کے بعد میں خود ہی کنور ریاست علی کی حویلی پہنچ گیا۔ سلام دعا کی ان سے مگر کنور صاحب اپنے ہی رنگ میں مست تھے۔ کہنے لگے۔ "کہو لالہ جی، کیا خبر لے کر آئے ہو؟ آج کل تو تمہارے آدمی خوب بھاگ دوڑ کر رہے ہیں مسلمانوں کے خلاف۔ سنا ہے بلوہ فساد کرانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں کنور صاحب! اگر آپ کے دل میں یہ خیال ہے تو اسے دل سے نکال دیجئے لیکن کچھ ایسی باتیں ہوچکی ہیں جن سے صورت حال بگڑنے لگی ہے۔"

"چلی نا بنئے والی چال، اپنی جان بھی بچا رہے ہو اور حرکتیں وہی کی وہی جاری ہیں۔ ٹھیک ہے بابو مول چند، جو کچھ ہو رہا ہے، ہم بھی اس کا جواب اسی انداز میں دیں گے۔ یہ مت سوچنا کہ یہاں مسلمان، ہندوؤں سے ہلکے پڑ جائیں گے۔ تمہارے ہرکارے جو کچھ کر رہے ہیں، ہم اس سے بھی نمٹ لیں گے۔"

"ارے تم کیا نمٹو گے کنور صاحب، آج تک ہم نے تمہاری عزت کی ہے مگر تمہارا منہ سیدھا ہی نہیں ہوتا۔ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھے کے ٹیڑھے ہی ہو۔" میں نے کہا۔ اچانک ہی ایک منصوبہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔ کنور صاحب کیلئے تو یہ الفاظ گویا بم کے دھماکے سے کم نہیں تھے، بھتے سے اکھڑ گئے۔ مجھے چار آدمیوں کے ذریعے اٹھا کر حویلی سے باہر پھنکوا دیا اور خوب بے عزتی کی میری! میں خوش تھا اس بات پر مہاراج کہ وہ کام منٹوں میں ہوگیا جس کیلئے میں پریشان تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ میری اس درگت سے ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہوگیا تھا لیکن میں نے انہیں دھیرج رکھنے کیلئے کہا۔ گھر واپس آگیا اور میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ خبر گرج ناتھ سیوک کو پہنچ چکی تھی۔

وہ سوریہ کرن کے ساتھ ہی میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے ساری صورت حال کے بارے میں پوچھنے لگا تو میں نے کہا۔ "وہ کنور کا بچہ تو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کام دوسروں کا ہے، ہماری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہئے تو مجھ پر بگڑ گیا۔ کہنے لگا۔ "او دال کھانے والے بنئے! میری اور تیری دوستی کیا معنی رکھتی ہے۔ اپنی اوقات بھول گیا؟" بس مجھے بھی غصہ آگیا اور اس کے بعد اس نے مجھے اپنی حویلی سے نکلوا دیا۔

"چنتا مت کر مول چند بابو، چنتا مت کر، اب تجھے ایک اور کام کرنا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں، بتا دوں گا۔" وہ بولا۔ "سن ری سوریہ کرن۔" وہ سوریہ کرن سے بولا۔ "آج رات کو تو اس کے ساتھ مایا مکنڈ آجانا۔ سورج چھپنے کے فوراً بعد تم دونوں کو مایا مکنڈ پہنچ جانا ہے۔" یہ کہہ کر گرج ناتھ سیوک چلا گیا۔ سوریہ کرن نے اپنے کمرے میں داخل ہوکر کمرا بند کرلیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ نجانے اب وہ پاپی جادوگر کیا کرنا چاہتا ہے۔ کنور ریاست علی خان سے لڑائی لے کر میں نے کم از کم وہ خطرہ تو ٹال دیا تھا کہ دوست بنا کر مجھے ان کے بازو کا تعویذ حاصل کرنا پڑے۔

لیکن کنور ریاست علی خان صاحب بات نہیں سمجھے تھے۔ اب اس کا نتیجہ ادھر سے نہ جانے کیا ہو۔ شام سورج چھپتے ہی سوریہ کرن میرے پاس آگئی اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ریاست باغ میں داخل ہوکر میں اس مندر کے سامنے پہنچ گیا جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا مہاراج! بڑا ڈر لگ رہا تھا مجھے، نہ جانے اب کیا ہو۔ کہیں اس جادوگر کو یہ پتا نہ لگ جائے کہ میں من سے اس کے ساتھ نہیں ہوں یا کنور صاحب کے بارے میں اس سے چال چلی گئی ہے اور پھر یہ طلسمی مندر۔

ایک دیوار کے سامنے پہنچ کر سوریہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر ہم دونوں دیوار سے گزر کر اس طرح اندر آ گئے جیسے وہ صاف دھویں کی دیوار ہو۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی تھی مگر مہاراج! اندر داخل ہو کر میری کھوپڑی چکرا گئی۔ کنور صاحب کا یہ باغ اتنا بڑا تو نہ تھا اور پھر مندر تو بہت ہی چھوٹا تھا لیکن اندر آ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں سیکڑوں بیگھے پر پھیلے ہوئے کسی عظیم الشان قلعے میں کھڑا ہوں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ سنہرے چمکتے ہوئے مجسمے کھڑے ہوئے تھے جنہیں قریب سے دیکھنے پر پتا چلا کہ سونے کے ٹھوس مجسمے ہیں۔ ان میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ در بنے ہوئے تھے، ان پر بھی سونے کی پترکاری کی ہوئی تھی۔ عجیب مندر تھا بھگوان کی سوگند مہاراج وہاں سیکڑوں من سونا سجا ہوا تھا، کروڑوں کی مالیت کے ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سچ مچ مایا کنڈ تھا۔ میری تو آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ پھر وہیں مجھے گرج ناتھ ملا۔ راجہ بنا ہوا تھا داسیوں کے جھرمٹ میں۔ مجھے دیکھ کر سب کو ہٹا دیا اور پھر ایک در میں جا بیٹھا۔

''بیٹھو مول چند بابو! وہ سسرا مسلمان بہت چالاک ہے مگر سیوک سے بچ کر کہاں جائے گا۔ بس اسی کا کانٹا ہے ورنہ سب ٹھیک ہو جاتا۔ اب تمہیں دوسرا کام کرنا ہے۔''

''حکم دیں مہاراج۔''

''جاؤ سوریہ، لے آؤ۔'' گرج ناتھ نے کہا۔ سوریہ کرن چلی گئی۔ پھر وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جو چاندی کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں آٹے کے بنے ہوئے دو پتلے رکھے ہوئے تھے۔ گرج ناتھ انہیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''یہ ہندو'' اس نے ایک پتلا اٹھا کر کہا۔ ''اور یہ مسلمان۔'' اس نے دوسرے پتلے کو دیکھ کر کہا۔ پھر اس تھالی میں سے اس نے دو سوئیاں اٹھائیں اور بولا۔ ''اور یہ ہیں نفرت کی سوئیاں۔ ایک اس کے دل میں، دوسری دوسرے کے دل میں۔'' اس نے دونوں سوئیاں گندھے ہوئے آٹے کے پتلوں میں چبھو دیں۔ پھر مجھ سے بولا۔ ''تم یہ دونوں پتلے لے جاؤ مول چند، اور انہیں جوالا پور کے چوک جوالا میں بیچوں بیچ گاڑ دو، پھر دیکھو تماشا۔''

میرا دل کانپ اٹھا تھا مہاراج، مگر مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اب اس سے منہ موڑوں۔ اسما چرن میرے ساتھ بھیجا گیا اور میں نے آدھی رات کو وہ دونوں پتلے زمین میں گاڑ دیئے۔ پھر مہاراج تین دن تک لوگ [illegible] نفرت کے [illegible] سے [illegible] اور چوتھے دن اس چوک میں پہلا فساد ہوا۔ وہ جگہ خون میں نہا گئی اور اس کے بعد سے اب تک [illegible] ہو رہے ہیں۔ [illegible] ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اسما چرن روز رات کو جا کر وہاں انسانی خون ڈالتا ہے۔ وہ جگہ ہمیشہ خون میں ڈوبی رہتی ہے جہاں پتلے دبے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ مر رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے مہاراج کہ اس مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی ہے۔ رام بھروسے میرا آدمی ہے، یہ بھی دوسروں کے ساتھ جھگڑے میں تھا مگر اس نے واپس جا کر مجھے یہاں کی کہانی سنائی اور مہاراج میں ہمت کر کے یہاں آ گیا۔''

پوری کہانی سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو مول چند؟''

''بھگوان کی سوگند مہاراج، آپ یہ مسجد پورے باغ پر بنا لیں۔ میں خوشی سے کہتا ہوں سسری دھرتی کون سی کسی کے ساتھ جائے گی مگر کوئی اپائے کرو، انسان بچ جائیں، یہ دیوانگی ختم ہو جائے۔ ہندو ہوں یا مسلمان، ہیں تو انسان، برسوں کے ساتھ رہنے والے۔ ایسے دشمن ہو گئے ایک دوسرے کے اسے رو کئے مہاراج۔''

''تم اچھے انسان ہو مول چند۔ ان شاء اللہ یہاں فساد بند ہو جائے گا۔''

''میرے لئے کوئی حکم ہو تو بتایئے؟''

''نہیں۔ خاموشی سے اپنا کام جاری رکھو۔''

''ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں مہاراج۔''

''ہوں...... کہو۔''

''ہو سکتا ہے دھرم کے دیوانے دوبارہ یہاں کوئی حرکت کرنے آئیں۔ آپ اسے میرا کام نہ سمجھیں۔ میں کھل کر یہ بات

نہیں کہہ سکتا کہ میرے من میں کیا ہے مگر آپ سے کہہ چکا ہوں کہ آپ چاہیں تو میرے اس پورے باغ کو مسجد بنالیں، مجھے اعتراض نہ ہوگا۔''

''میں سمجھتا ہوں مول چند۔''

''پھر میں چلتا ہوں مہاراج۔''

''جاؤ اور اطمینان رکھو، تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے۔ رام بھروسے نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر وہ چلے گئے۔ اکرام کسی پتھر کے بت کی مانند ساکت تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر کہا۔ ''کیا بات ہے اکرام، کچھ بولو گے نہیں؟''

''یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے۔''

''ہاں! دنیا کی کہانیاں ہیں، ایسی ہی ہوتی ہیں اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے کام جاری ہے، آگے بڑھ رہا ہے۔ تم گھبرائے تو نہیں ہو؟''

''بالکل نہیں مسعود بھیا۔''

''اندر تعمیر کا سامان پڑا ہے، وہاں سے دو کدالیں اٹھا لاؤ۔ جا کر لے آؤ۔'' میں نے کہا اور اکرام چلا گیا۔ پھر کدالیں لے کر آ گیا۔

''یہ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔'' وہ حیرت سے بولا۔

''آؤ چلیں۔'' میں نے ایک کدال سنبھال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اکرام بھی میرے ساتھ چل پڑا۔ وہی ویرانی اور ہیبت ناک سناٹا۔ اکرام خوفزدہ تھا مگر ہمت کئے ہوئے تھا۔ اسے خوف تھا کہ کسی طرف سے چھپا ہوا کوئی ہندوؤں کا غول نہ نکل آئے۔ بمشکل اس نے کہا۔

''ہم کہاں چل رہے ہیں مسعود بھیا؟''

''جوالا چوک۔ یہاں سے ہم زمین کھود کر پہلے وہ نفرت کے پُتلے نکالیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے اکرام کے چہرے پر اس جواب کے نتائج نہیں دیکھے تھے۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا لیکن انسان تھا اور ایسے حالات سے خوفزدہ ہو جانا انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ یعنی اس وقت صورت حال یہ تھی کہ جوالا پور کے رہنے والے ہندو، مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب کہاں سے گھات لگائے ہوئے درندے نکل کر حملہ آور ہو جائیں۔ دن کی روشنی تک میں لوگ گھروں سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔ یہ تو رات کے ہولناک سناٹے تھے۔ ہم چلتے رہے۔ ایک آدھ بار پولیس گاڑی کی روشنی نظر آئی تو آڑ میں ہو گئے۔ پتہ نہیں اکرام پر کیا بیت رہی تھی۔ ہم جوالا چوک پہنچ گئے۔ چاروں طرف ویران سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کسی ذی رُوح کا پتہ نہیں تھا۔ میں مدھم قدرتی روشنی میں زمین دیکھتا آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ جگہ بالکل صاف نظر آ گئی جہاں خون کے چکتے جمے ہوئے تھے۔ جادو کے پتلوں کو غسل خون دیا جاتا تھا اور نہ جانے کہاں کہاں سے یہ خون حاصل کیا جاتا رہا ہوگا۔

''یہ...... یہ وہ جگہ ہے نا۔'' دفعتاً اکرام کے منہ سے نکلا۔

''ہاں۔ ٹھیک سمجھے ہو۔ سب سے پہلے ہمیں یہاں سے نفرت کے ان پتلوں کو نکالنا ہے۔'' میں نے کہا اور کدال سیدھی کر لی۔ پھر میں نے پہلی کدال زمین پر ماری تھی کہ چھن کی آواز آئی اور اکرام کی گھگھی بندھ گئی۔ نہ جانے کہاں سے ایک عورت اور ایک مرد نمودار ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے بھیانک سیاہ تھے۔ سرخ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ سامنے کئے ہوئے تھے۔ اکرام تو کانپنے لگا مگر میں نے پُرسکون نظروں سے انہیں دیکھا۔

''تو تمہاری ڈیوٹی یہاں ہے۔'' میں نے کہا اور وہ بھیانک آواز میں اپنا جسم توڑنے مروڑنے لگے۔ ان کے جسم کے اعضاء خوفناک شکلیں پیش کرنے لگے۔ کبھی ان کی آنکھیں حلقوں سے ایک ایک فٹ آگے نکل آتیں، کبھی ناک لمبی ہو جاتی، کبھی

ہونٹ ٹھوڑی سے نیچے لٹک جاتا اور لمبے دانت نظر آنے لگتے۔ وہ یہ حرکتیں کرتے ہوئے ڈرانے والے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے، تب میں نے دوبارہ کہا۔

''رمبھا چرن، نتھیا اور گرج ناتھ کے پالتو کتو! بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ خاک ہو جاؤ گے۔'' میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کئے تو وہ رک گئے۔ اچانک ہی دونوں زمین پر لیٹ گئے، پھر لڑھکتے ہوئے دور چلے گئے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے دوبارہ کدال زمین پر چلائی تو پھر وہ چھن چھن کرتے ہوئے آگئے اور ہمارے جسموں پر جھپٹے مارتے ہوئے دور نکل گئے۔ میں نے اکرام کو دیکھ کر کہا۔

''چلو اکرام شروع ہو جاؤ۔ یہ مکھیاں تو ایسے ہی بھنبھناتی رہیں گی۔ آؤ جلدی کرو۔'' اکرام کیا اچھے اچھوں کے ہوش خراب ہو جاتے جو حرکتیں یہ لوگ کر رہے تھے۔ اس بار پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اکرام خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کدال اس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ ''بسم اللہ کر کے شروع ہو جاؤ۔'' میں نے اسے جگہ دے کر کہا۔ اکرام نے کدال بلند کی اور پھر ایک گھٹی گھٹی آواز نکال کر رک گیا۔ میں نے بھی دیکھ لیا۔ نتھیا اچانک زمین پر اس جگہ نمودار ہوگئی جہاں کدال کی ضرب لگنے والی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اکرام سے رکنے کی درخواست کی تھی۔ میری کدال اوپر اٹھی تو رمبھا چرن نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا تو اچھل کر سامنے آگیا اور لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ اب پہلے تمہارا کام کرنا پڑے گا۔ آؤ ذرا دیکھوں تمہیں۔'' میں نے کہا اور بسم اللہ پڑھ کر درود شریف پڑھنا شروع کر دیا، جو میں نے درود پاک کا آغاز کیا، دفعتاً وہ اٹھ بھاگے۔ بھاگتے ہوئے وہ چیخ رہے تھے۔

''دوڑو اے دوڑو مسلے آگئے۔ آگئے رے آگئے مسلے آگئے۔'' اس کے بعد وہ واپس نہیں پلٹے۔ مگر کچھ گھروں میں روشنیاں ہوگئی تھیں۔

''چلو اکرام...... اب نہیں آئیں گے وہ۔''

میں نے کہا اور زمین پر کدال چلانے لگا۔ اکرام یہاں بھی بدروحوں کی ناکامی دیکھ چکا تھا اور اسے اطمینان ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مصروف ہو گیا۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں تک چیختے ہوئے گئے تھے۔ لوگ جاگ بھی گئے تھے مگر کوئی دیوگی میں باہر نہیں نکلا اور ہم دونوں اپنا کام کرتے رہے۔ ویسے بھی ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی، پتلے زیادہ گہرے نہیں گاڑے گئے تھے۔ تھوڑی سی کوشش سے ہی وہ ہمیں نظر آگئے۔ آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ میں نے کدال کی نوک ہی سے انہیں باہر کھینچ لیا اور پھر ان پر تھوک دیا۔ تھوک کی چھینٹیں ان پر پڑیں تو ایسی ہی آوازیں ابھریں جیسے جلتے لوہے پر پانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے دوبارہ ان پر تھوکا تو دونوں پتلے اچھل کر بھاگے مگر میں نے لپک کر ان میں سے ایک پر پاؤں رکھ دیا اور دوسرے پر کدال پھینک ماری۔ دونوں پچک گئے۔ میں نے پاؤں کے نیچے موجود پتلے کو بری طرح مسل دیا اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پھر آگے بڑھ کر دوسرے کا بھی یہی حشر کیا اور پھر اکرام سے کہا کہ ان کے ٹکڑے جمع کرے۔ اکرام کی ہمت بحال ہو گئی تھی۔ اس نے ان پتلوں کا ملغوبہ سمیٹا۔ اب وہ بالکل ٹھنڈے ہو گئے تھے، پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ رخ باغ کی طرف تھا۔ راستے میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور ہم باغ میں داخل ہو گئے۔ باغ کے ایک گوشے میں پتلوں کا ملغوبہ زمین پر ڈال کر اس میں آگ روشن کر دی۔ چند لمحوں میں وہ جل کر خاکستر ہو گئے۔ تب ہم مسجد واپس آگئے۔ اکرام خاموشی سے اپنی مخصوص جگہ جا لیٹا تھا۔

دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔ صبح، دوپہر پھر شام ہوگئی۔ مغرب ہونے میں دیر باقی تھی کہ مسجد کے بڑے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خود دروازہ کھولا تھا۔ مول چند تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ ''سلام مہاراج۔''

''کیسے ہو مول چند؟''

''دیا ہے بھگوان کی۔ ہمارے آنے کا برا تو نہیں مانے مہاراج۔''

''نہیں بھئی برا کیوں ماننا'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''بھگوان کی سوگند، بتا نہیں سکتا آپ کو کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا من لگ گیا ہے آپ سے......''
''یہ تمہاری محبت ہے۔ کہو جوالا پور کے کیا حالات جا رہے ہیں؟''
''ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے؟''
''پوچھو۔''
''جوالا پور چوک کی زمین کھدی ہوئی ہے، دوسرے اس بارے میں نہیں جانتے، پر میں جانتا ہوں کہ وہاں کیا تھا۔ آپ نے مہاراج......کیا آپ نے۔'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا، پھر کہا۔ ''ہاں مول چند تم نے اس نفرت کی وجہ مجھے بتا دی تھی اور سب سے پہلا کام یہی ضروری تھا کہ نفرت کی وجہ ختم کی جائے۔ میں نے وہ دونوں جادو کے پتلے نکال کر خاکستر کر دیئے ہیں اور اب ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔''
مول چند کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جے ہو مہاراج کی۔ بھگوان کی سوگند، میرا خیال سیدھا اسی طرف گیا تھا اور مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں نے مہاراج کو ان پتلوں کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ کام مہاراج ہی کا ہو سکتا ہے۔ ہوا یوں مہاراج کہ اٹھارہ آدمیوں پر بنی ہوئی ایک کمیٹی میرے پاس آئی، اچھے اچھے لوگ شامل ہیں اس میں، سمجھدار ہیں، جوالا پور کے رئیسوں میں سے بھی ہیں، کاروباری ہیں۔ سارے کے سارے ہندو تھے۔ میرے سامنے آئے اور کہنے لگے کہ مول چند مہاراج آخر یہ قتل و غارت گری کب تک ہوتی رہے گی۔ مسلمان بھی مر رہے ہیں، ہندو بھی مر رہے ہیں، فائدہ کسی کو نہیں ہے، کیوں نہ ایک بھائی چارہ کمیٹی بنائی جائے اور اس سلسلے میں بات کی جائے، اب یہ لڑائی ختم ہو جانی چاہئے، جہاں تک بات گرج ناتھ سیوک کی ہے تو مہاراج گرج ناتھ خود جو من چاہے کرے، بھوانی کنڈ بنائے، جوالا پور کو مایا مکنڈ بنا دے، ہمیں کیا۔ ہم کیوں لڑیں آپس میں اور جہاں تک مسلمانوں کے جوالا پور سے نکال باہر کرنے کا سوال ہے تو مہاراج نے دیکھ لیا کہ اگر مسلمان جوالا پور میں نہ رہے تو ہندو ہی کتنے بچیں گے۔ برابر کی چوٹ جاری ہے چار ہم ان کے مارتے ہیں تو پانچ وہ ہمارے مار دیتے ہیں۔ کیا اس طرح مسلمانوں کو جوالا پور سے ختم کیا جا سکے گا۔ بات تو یہ ہوتی کہ ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔'' میں نے فوراً ہی بات اچک لی اور کہا۔
''یہ تو تم لوگوں کی سوچنے کی بات ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں اگر باہر نکل کر تم سے یہ بات کہتا تو تم لوگ یہی کہتے کہ میں بزدل ہوں اور مسلمانوں کے ڈر سے ان سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔''
''بات ڈر، خوف یا بزدلی کی نہیں ہے مہاراج مول چند، آپ ہمیں یہ بتایئے کہ اب تک کتنے ہندو مرے ہیں اور کتنے مسلمان۔ یہ جھگڑا تو لمبا ہی چلے گا۔ سرکار تک کچھ نہیں کر پا رہی، پولیس والے ادھر جاتے ہیں تو ادھر سے حملہ ہوتا ہے، نقصان ان کا بھی ہوتا ہے اور ہمارا بھی ہوتا ہے۔ بہت سے گھر برباد ہو گئے ہیں مہاراج۔ اب یہ دھندا ختم ہو جانا چاہیے۔''
''تو پھر تم جیسا کہو بھائیو! میں تیار ہوں۔ میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے۔''
''ہونا کیا چاہیے مہاراج۔ ہم اسی لئے آپ کے پاس جمع ہو کر آئے ہیں۔''
''پہلے یہ بتاؤ کہ جو بھائی چارہ کمیٹی تم نے بنائی ہے، کیا تمہاری بات دوسرے بھی مانیں گے۔''
''ارے سسرے کیسے نہیں مانیں گے۔ بھلا لڑنے بھڑنے میں کوئی فائدہ ہو رہا ہے کسی کا۔ سارے کام دھندے چوپٹ پڑے ہوئے ہیں، گھروں میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے اور پھر اگر جو نہیں مانے لگا اس سے ہم منوائیں گے ڈنڈوں کے زور پر۔ پولیس بھی ہمارا ساتھ دے گی، کون چاہتا ہے کہ فسادات ہوتے رہیں۔''
تو پھر اب تمہاری کیا رائے ہے لکھیا سنگھ۔'' میں نے ان میں سے ایک بڑے آدمی سے پوچھا۔
''کنور ریاست علی سے بات کئے بنا بات نہیں بن سکتی۔ جس طرح سے ہندو آپ کی بات مان رہے ہیں مول چند

مہاراج، اسی طرح مسلمان کنور ریاست علی صاحب کی بات مان رہے ہیں بلکہ اُڑتی اُڑتی خبر تو ہم نے یہ سنی ہے کہ کنور ریاست علی نے چوری چھپے بڑا اسلحہ منگوایا ہے اور اب وہ ہندوؤں کے خلاف استعمال ہوگا۔ رام رام رام مہاراج اتنے مریں گے کہ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ آپ ریاست علی کی ٹکر کے آدمی ہیں، آپ ان سے بات کریں اور یہ فیصلہ کرلیں کہ اب آپس میں جھگڑے بند کر دیئے جائیں۔ مل بیٹھ کر سمجھوتہ کرلیا جائے، ایک کمیٹی ادھر سے بنی ہے، ایک کمیٹی کنور ریاست علی خان بنائیں۔ تب ہی بات نمٹ سکتی ہے۔''

''اگر آپ لوگ یہ چاہتے ہیں تو میں کنور ریاست علی خان کے پاس جانے کو تیار ہوں۔''

''ہم تو یہی چاہتے ہیں مہاراج مگر آپ کا کیا خیال ہے کیا کنور ریاست علی خان یہ بات مان جائیں گے۔''

''بھئی کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے تو پھر کل صبح کنور ریاست علی خان کے پاس چلا جائے اور مہاراج یہ بات طے ہوگئی ہے۔ وہ لوگ تو یہ کہہ سن کر چلے گئے ہیں مگر میں نے سوچا کہ آپ کی آشیرواد لےلوں۔ آپ سے پوچھ لوں کہ یہ ٹھیک رہے گا یا نہیں۔''

''بالکل ٹھیک رہے گا۔ تم یہ نیک قدم ضرور اٹھاؤ مول چند اور کنور ریاست علی کے پاس چلے جاؤ، اس سے بات کرو۔''

''ٹھیک ہے مہاراج۔ پر جب یہ کمیٹی بنی اور لوگ ہمارے پاس آئے اور چلے گئے تو میں سب سے پہلے جوالا چوک پہنچا، وہاں جا کر میں نے وہ زمین دیکھی جہاں پُتلے میرے ہی ہاتھوں گڑے تھے۔ زمین کھدی ہوئی ملی مہاراج اور میرے من میں سیدھی بات یہی آئی کہ مہاراج کی کرپا ہوگئی، بس عقیدت میں چلا آیا ہوں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ مول چند، انسانی خون تو ویسے بھی نہیں بہنا چاہیے، چاہے وہ ہندو کا ہو یا مسلمان کا، ہے تو وہ انسان ہی، تم جاؤ اور اب یہ ضروری ہوگیا ہے۔ مجھے آ کر خبر دینا کہ ریاست علی خان سے کیا بات ہوئی؟''

''ٹھیک ہے مہاراج اجازت دیں۔'' مول چند چلا گیا اور میں واپس آ گیا۔ واقعی یہ ایک دلچسپ بات ہوئی تھی اور اب اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ مجھے جوالا پور کی بشارت بے مقصد نہیں ہوئی تھی۔ میرا اعتماد تو اب آسمان سے اونچا ہوگیا تھا، کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا تھا۔ رہنمائی ہوتی تھی جہاں کچھ بتانا ضروری ہوتا تھا وہاں بتا دیا جاتا تھا۔ ہر طرح کی اعانت ہوتی تھی یہاں تک کہ میرے کھانے پینے تک کا بندوبست کر دیا جاتا تھا۔

صحیح معنوں میں مجھے بڑا مرتبہ دیا گیا تھا۔ شکر گزاری میرے رگ وپے میں رچی ہوئی تھی مگر اپنا تجزیہ کرنے کا جب بھی وقت ملتا بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔ میں خود کو کسی قابل نہیں بنا سکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ دل کے زخموں پر کھرنڈ آ گئی ہے، نیچے زخم ہرے ہیں۔ جب بھی یادوں کی ہوا چلتی، یہ زخم کسکنے لگتے اور اب تو اس کسک میں ایک اور کسک شامل ہوگئی تھی یعنی ثریا۔ نہیں بھول سکا تھا اسے۔ نہیں بھول پا رہا تھا، اس کے تصور کو خود سے بھی چھپاتا تھا، دل میں خیال آ جاتا تھا تو خود سے شرمندہ ہو جاتا تھا۔ وہاں سے مجھے اس قدر بلندیاں بخشی گئی ہیں اور یہاں میں اتنا ہی پست انسان ہوں۔ اپنی محبتوں، اپنی چاہتوں کے جال میں جکڑا ہوا ہوں۔ دنیا مجھے اسی طرح سمیٹے ہوئے ہے۔ سب یاد آتے تھے، سب پکارنے لگتے تھے اس وقت جب یادوں کی ہوا چلتی اور یہ لمحات میرے لیے بڑے جاں گسل ہوتے تھے جب میں خود سے چھپتا تھا۔ اکرام کی صورت میں ثریا کے نقوش جھلکتے تھے اور کبھی کبھی تو میں اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ پھر یاد آ گیا تھا، وہ سب کچھ پھر یاد آ گیا تھا۔ نہ جانے اکرام کو بھی وہی موضوع کیوں سوجھ گیا۔

''بڑے دلچسپ واقعات ہیں مسعود بھائی۔ آپ کے خیال میں کیا کنور صاحب مان جائیں گے۔''

''اللہ جانے۔ دیکھنا پڑے گا۔''

''میرے خیال میں مان جائیں گے کیونکہ نفرت ختم ہو چکی ہے۔'' اکرام نے کہا۔ پھر بولا۔ ''جوالا پور میں کب تک رکیں گے بھیا؟''

''کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''نہیں کوئی وجہ نہیں ہے بس ایسے ہی۔ ویسے یہ مسجد بڑی پرسکون ہے۔ پہلے مجھے یہاں خوف محسوس ہوا تھا، اب، اب یوں لگتا ہے جیسے یہاں جتنے لوگ بھی ہیں، دوست اور محبت کرنے والے ہیں۔ اور بھیا ایک بات کہوں۔ دل سے کہہ رہا ہوں۔''

''ضرور کہو۔''

''میں نے ثریا کا بھی صبر کر لیا ہے بس ایک بے بس بھائی کی طرح، ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتا ہوں، اپنے اللہ سے کہتا ہوں کہ میں کیا اور میری اوقات کیا بلکہ میں نے تو اپنی اوقات دیکھ لی۔ ایک لمحے بہن کا محافظ نہیں بن سکا۔ مجھ مجبور بے کس کی کیا مجال ہے کہ میں اس کے کسی بندے کی حفاظت کر سکوں۔ اپنے بندوں کی محافظ اللہ کی ذات ہے۔ بس دعا کرتا ہوں کہ اللہ میری ثریا کو اپنی پناہ میں لے لے اور اس شیطان مردود کے ستم سے اسے بچائے۔ بھیا تمہاری صحبت میں مجھے یہ درس ملا ہے حالانکہ اللہ نے تمہیں بزرگی بخشی ہے، تم بہت سوں کے مسائل حل کر سکتے ہو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے کنبے کو اللہ کی رضا پر چھوڑ دیا ہے۔''

روح بے قرار ہو گئی تھی۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ ایک ہی سہارا تو ہوتا ہے انسان کے پاس۔ میرے پاس بھی بس وہی سہارا تھا مگر میں تو ان کے لیے دعا بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ یاد آ جاتے تھے اور یہ یاد ممنوع تھی میرے لیے......!

مول چند کو واقعی مجھ سے عقیدت ہو گئی تھی۔ دوسرے دن دوپہر ڈھائی بجے میرے پاس آ گیا۔ اس کی دستک سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہی ہو سکتا ہے، چہرہ کسی قدر اترا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر افسردگی سے ہاتھ ماتھے پر رکھ دیئے۔

''کہو مول چند۔ خیریت ہے!''

''خیریت نہیں ہے مہاراج۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کنور ریاست کے پاس گئے تھے ہم لوگ۔''

''پھر......''

''وہ نہیں مان رہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میری بڑی بے عزتی کی انہوں نے۔ کہا دال بھاجی کھانے والے ہندو، شیر دل مسلمانوں کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ابھی لڑائی چلنے دو، نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ میرے ساتھ کے دوسرے تو بگڑ گئے مگر میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ میں نے کہا مجھے اور گالیاں دے لیں مہاراج مگر انسانوں کا خون بہنے سے روکیں۔''

''کیا کہا انہوں نے......''

''کہا انسانوں کے خون کی بات نہ کرو۔ ہندوؤں کے خون کی بات کرو۔ شاید تمہیں پتہ چل گیا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں تو بس یہی پتہ چلا مہاراج کہ کنور ریاست نے اسلحہ منگوایا ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ کہیں سے کچھ آدمی بھی آ رہے ہیں جوالا پور کے ہندوؤں سے مقابلہ کرنے۔ کنور صاحب پورا پورا بدلہ لینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔ آخری بات کیا ہوئی؟''

''کہنے لگے مسلمانوں کا نقصان پورا کر دو۔ ہر زندگی کی قیمت ادا کر دو ورنہ تمہیں بتائیں گے کہ جوالا پور ہندوؤں سے خالی ہوتا ہے یا مسلمانوں سے۔ بس یہ آخری بات تھی۔''

''گویا وہ نہیں مانے۔''

''یہی بات ہے مہاراج۔'' مول چند نے افسردگی سے کہا۔ پھر بولا۔ ''سارے کئے دھرے پر پانی پھر رہا ہے مہاراج۔

ہمارے ساتھ جو گئے تھے اب وہ افسوس کر رہے ہیں، ان سے غلطی ہو گئی ہے۔ ریاست علی خان شاید اسے ہماری کمزوری سمجھ رہے ہیں۔ ان کے دماغ پلٹتے جا رہے ہیں مہاراج۔"

"کیا کرنا چاہتے ہیں وہ؟"

"بس ابھی سوچ رہے ہیں۔ بات کچھ بگڑتی نظر آ رہی ہے۔"

"نہیں بگڑے گی۔ فکر مت کرو، بندگان خدا کا خون بہانے کا حق کسی کو نہیں ہے، ریاست علی خان کو بھی نہیں ہے۔ انہیں بھائی چارہ کمیٹی سے اتفاق کرنا پڑے گا۔"

"مگر کیسے مہاراج؟"

"ذرا ان کی رہائش گاہ کا پتہ بتاؤ۔" میں نے کہا اور مول چند نے مجھے پتہ سمجھا دیا۔ پھر بولا۔ "آپ جائیں گے مہاراج......؟"

"ہاں۔" میں نے بڑے یقین سے کہا۔

"آپ حکم دیں تو ہم بھی چلیں۔"

"نہیں مول چند۔ تم اپنے گھر جاؤ۔ میں تمہاری توہین نہیں چاہتا۔ ریاست علی خان اگر ایسے آدمی ہیں تو دوبارہ تمہیں دیکھ کر سوچیں گے کہ تم ان سے ڈر گئے ہو۔"

"ٹھیک ہے مہاراج۔" مول چند نے کہا اور پھر وہ چلا گیا۔ اکرام نے کہا۔

"کنور صاحب بہت مغرور معلوم ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"عصر کے بعد چلیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ نماز عصر سے فارغ ہو کر میں نے اکرام کو ساتھ لیا اور مسجد سے باہر نکل گیا۔ راستہ طے کرتے ہوئے اک ذرا سی تبدیلی یہ نظر آئی کہ اب سڑکوں پر اکا دکا لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے جب کہ اب سے پہلے جوالا پور، شہر خموشاں لگتا تھا۔ کنور ریاست علی خان کی حویلی پہنچ گئے۔ قلعہ بنا رکھا تھا انہوں نے حویلی کو۔ طرز تعمیر بھی قلعے جیسی تھی۔ دروازے پر دو مسلح آدمی کھڑے تھے مگر دروازہ کھلا تھا۔

"جی۔ فرمائیے؟" انہوں نے مجھے گھور کر پوچھا۔

"کنور ریاست علی خان سے ملنا ہے۔"

"ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"الحمدللہ ہم دونوں مسلمان ہیں۔"

"جاؤ۔ کنور صاحب کے پاس لے جاؤ۔" ایک پہریدار نے دوسرے سے کہا۔ دوسرا میرے قریب آ کر بولا۔ "تلاشی دو۔"

"کیسی تلاشی؟" اکرام بولا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ دیکھنا ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار تو نہیں ہیں۔"

"دیکھ لو بھائی۔ جلدی کرو......" میں نے بیزاری سے کہا۔ پھر وہ شخص ہمیں اندر لے گیا۔ سامنے کے حصے سے گزر کر اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ پھر ایک خوبصورت کھلے حصے میں نکل آئے جہاں سرخ اینٹوں کا فرش تھا، گملے سجے ہوئے تھے، ان میں طرح طرح کے پھول مہک رہے تھے۔ درمیان میں کنور صاحب باریک ململ کا کرتا اور لٹھے کا پائجامہ زیب تن کئے ایک خاص قسم کی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ سامنے پیچوان رکھا ہوا تھا جس سے خمیرے کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ سرخ و سفید چہرے اور اچھی صحت کے مالک روایتی قسم کے نواب نظر آ رہے تھے۔ سرکنڈے سے بنی میز پر خاصدان رکھا ہوا تھا اور کنور

صاحب کے ہونٹوں پر پان کی دھڑی نظر آ رہی تھی۔ آس پاس بہت سے مونڈھے پڑے ہوئے تھے جن میں سے چار پر چار افراد بیٹھے تھے، باقی خالی تھے۔ ویسے حویلی میں خوب چہل پہل تھی اور یہاں تک آتے ہوئے کوئی بیس پچیس افراد نظر آئے تھے۔ کنور صاحب نے ہمیں دیکھ کر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا البتہ سوالیہ نظروں سے ادھر دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ پہریدار ہمیں لے کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے بہ آواز بلند سلام کیا جس کا جواب ملا۔ اس کے فوراً بعد پہریدار نے کہا۔

''قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں یہ دو حضرات۔ حکم کے مطابق حاضر خدمت کیا۔''

''جاؤ.....'' کنور صاحب نے الٹے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پہریدار سر جھکا کر چلا گیا۔ کنور صاحب سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے۔

''سبحان اللہ۔ لگتا ہے دربار اکبری میں آ گئے بلکہ حاضری کی اجازت عطا کر کے وہاں بھی شاید مہمانوں کی کچھ پذیرائی کی جاتی ہو۔ بس اتنا فرق محسوس ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے الفاظ کو محسوس کر لیا، سمجھ لیا گیا۔ ناگواری کے اثرات نمودار ہوئے۔ پھر نخوت بھرے لہجے میں کہا گیا۔

''مونڈھے گھسیٹو اور بیٹھ جاؤ۔''

''چلو اکرام، بیٹھ جاؤ۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔

''کون ہو اور کیوں آئے ہو؟'' کنور صاحب نے کہا۔

''بندگان خدا ہیں اور بندگان خدا کی جان بخشی کرانے آئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''جوالا پور میں داخل ہوئے تو عجیب حال دیکھا۔ ملال ہوا۔ جو بھی مر رہا ہے انسان ہے، چاہے کوئی مذہب ہو اس کا۔ آپ صاحب اقتدار ہیں۔ بہتری تلاش کیجئے۔''

''جوالا پور میں کہاں سے داخل ہوئے۔ یہاں کے رہنے والے نہیں ہو کیا؟'' کنور صاحب نے پوچھا۔

''ہاں۔ کہیں اور سے آئے تھے۔ اسٹیشن پر اترے تو پتہ چلا کہ یہاں تو کشت و خون کا بازار گرم ہے۔''

''بازار تو اب گرم ہوگا۔ ذرا آگے دیکھنا۔ ہوا کھسک رہی ہے لالوں کی، اب ناک رگڑنے آ رہے ہیں وفد لے کر، بھائی چارہ کمیٹیاں بنا بنا کر، ایک دو روز کی بات ہے پھر شروع ہوگا کھیل۔'' کنور صاحب نے بے رحمی سے کہا۔

''نتیجہ کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں نہ گھڑ دوڑ نہ میدان جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔ مگر تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔ یہاں پھنس گئے ہو تو تمہارے باہر نکلنے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ آئے کہاں سے ہو اور جوالا پور کس کام سے آئے تھے؟''

''جو کھیل آپ شروع کریں گے کنور صاحب، اس میں ایک بھی مسلمان کی جان نہیں جائے گی؟'' میں نے ان کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

''کوشش تو پوری پوری کریں گے کہ ایسا نہ ہو...... مگر بنّے جب دو مرغے لڑیں گے تو زخم تو آئیں گے۔''

''انسانوں کی بات کر رہا ہوں کنور صاحب۔'' میں نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔

''اماں تو تم کیوں دبلے ہو رہے ہو شہر کے اندیشے سے۔ تمہارے بال بچے بھی ساتھ ہیں کیا؟''

''اس لیے کنور صاحب کہ آپ نے اپنی حویلی کو قلعہ بنا لیا ہے۔ آپ ان کے بارے میں نہیں سوچ رہے جو مر رہے ہیں۔ راتوں کو جاگ رہے ہیں۔ فاقہ کشی کر رہے ہیں۔''

''لڑائی ہم نے تو شروع نہیں کی۔''

''آپ جوالا پور کے رئیس ہیں۔ آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ اپنے لوگوں کی مدد کریں۔''

''کیا کریں۔ وہ کتے کا پلا جوالا پور کو مسلمانوں سے خالی کرا کے اسے بھوانی کنڈ بنانا چاہتا ہے۔ بنانے دیں اسے؟''

''مگر وہ لوگ اپنی غلطی کا احساس کر کے آپ کے پاس آئے تھے۔''
''ہم نے کہہ دیا نقصان پورا کریں مسلمانوں کا، مان جائیں گے۔''
''آپ جانتے ہیں یہ نہیں ہو سکے گا۔''

❖❖❖❖❖

''ہم جانتے ہیں یہ ہو سکے گا سمجھے۔ گھر لٹیں گے سسروں کے۔ اور ہم نقصان پورا کریں گے۔'' کنور صاحب پُرجوش لہجے میں بولے۔

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کنور صاحب کہ یہ نفرت کا کھیل گرج ناتھ سیوک کا شروع کیا ہوا ہے۔''

''تو جوالا پور کے ہندو کس کے بل پر اچھل رہے ہیں۔ اسی کے نا......؟''

نواب صاحب نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ وہ جارحانہ انداز میں بول رہے تھے لیکن میں نہایت حلیمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اور آپ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کنور صاحب کہ گرج ناتھ سیوک کالے علوم کا ماہر ہے، وہ گندے علم والا ان لوگوں کو اپنی گھناؤنی قوتوں سے متاثر کر کے یہ سارے عمل کرا رہا ہے۔ آپ کو اصل میں تفصیل نہیں معلوم۔ اس وقت گرج ناتھ نے جوالا پور کو اپنی گندگی کا مسکن بنانے کے لئے یہ ضروری سمجھا ہے کہ مسلمان یہاں سے دور ہٹ جائیں۔ دیکھئے کنور صاحب یہ تو ایک طے شدہ بات ہے کہ جس شہر کے کسی بھی گوشے میں اللہ کا نام خشوع وخضوع سے لیا جائے، وہاں گندے علم کی پرورش ناممکن ہے، ہندوؤں نے گرج ناتھ سیوک کے اشارے پر جو کچھ شروع کر رکھا ہے، وہ اچھا نہیں ہے لیکن اسے ختم کرنے کے لئے اگر کچھ سمجھداروں نے کوشش کی ہے تو آپ کو ان کوششوں کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ میں آپ کو دعوے سے یہ تفصیل بتاتا ہوں کہ اس نے اپنے کالے علم کے دو پُتلے جوالا پور کے جوالا چوک کے درمیان زمین میں دفن کئے اور پھر جب لوگ ان پر سے گزرے تو ان کے دلوں میں نفرتیں بیدار ہوئیں اور یوں اس فساد کا آغاز ہوا......لیکن وہ پُتلے اب وہاں سے نکال کر پھینک دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ ایک دم ہی ان کے اثرات ختم ہونے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے اب کافی دن تک اس بات کا امکان نہیں ہے کہ مزید فساد ہو جب تک کہ وہ کوئی دوسری کوشش نہ کرے۔ میری رائے یہ ہے کنور صاحب کہ آپ مول چند کی پیشکش کو قبول کر لیں اور اس سے امن وامان کے سلسلے میں ضرور بات کریں۔''

''کہانی اچھی ہے میاں صاحب، لگتا ہے ہندوؤں سے کچھ لے دے کر تمہیں اس کام کے لئے آمادہ کیا گیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے لیکن ہم نے جو بات کہہ دی سو کہہ دی، مسلمانوں کا نقصان پورا کر دیا جائے جھگڑا ختم ہو جائے گا، نہیں تو پھر بات بہت آگے بڑھ جائے گی۔ ارے ایک بات ہو تو کہیں، گرج ناتھ سیوک کو ہم نے تو اپنے سر پر نہیں بٹھا لیا۔ کالے علم کا ماہر ہے، ہم پر آزمائے اپنا کالا علم، دیکھ لیں گے اسے۔ ان لوگوں کو ہی اس کے کالے علم کا شکار ہونا تھا، جاؤ ہماری زمین پر مندر بن گیا ہے جادو کا، توڑ دو بھائیو، زمین تو ہماری ہے، سارے ہندوؤں کو پتہ ہے، ارے ہماری زمین پر سے مندر ہٹا لو، چلو سارا جھگڑا ختم کر دیں گے، کیا سمجھے......''

''مندر توڑنے کی کوشش تو آپ لوگوں نے بھی کی تھی کنور صاحب، کیوں نہ توڑ دیا؟''

''دیکھو میاں گھر کے دروازے پر پہنچے ہو، عزت سے اندر بلا لیا ہے، اب جوتوں سمیت آنکھوں میں اترنے کی کوشش مت کرو، سمجھے، جاؤ چلو دوسری شرط رکھ دی ہے ہم نے، وہ مندر توڑ دو، ہم مول چند کی بات مان لیں گے۔''

''مول چند کی زمین پر بھی تو مسجد آباد ہو گئی ہے کنور صاحب۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہانی سنی تو ہے ہم نے بھی، دیکھیں گے ذرا وہاں بھی جا کر......''

''اور لوگ کہتے ہیں کہ اس مسجد سے اٹھنے والی اذان کی آوازیں جگہ جگہ سنی جا رہی ہیں......''

''ہم نے خود یہاں سنی ہیں۔'' پہلی بار کنور صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے بے اختیار کہہ دیا۔ کنور صاحب کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے یہ بات بھی ہے، ذرا انہی سے ملیں گے جن کی آواز اس مسجد سے ابھرتی ہے اور جن کے چرچے جوالا پور میں ہونے لگے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' میں نے کسی قدر مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

''بہرحال کنور صاحب میں بڑی امیدیں لے کر آیا تھا آپ کے پاس، میرے خیال میں انسانی خون بہنے سے رکنا چاہیے، آپ جو کچھ بھی کریں جلد فیصلہ کر لیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ امن کمیٹی بن جائے اور انسانی زندگی خطرات سے نکل آئے۔''

''دیکھیں گے۔ سوچیں گے۔'' کنور صاحب نے کہا۔ پھر اپنے ایک ساتھی سے بولے۔ ''اماں حق صاحب ذرا چلیں تو کسی وقت جان علی کی مسجد دیکھیں، کیا قصہ ہے؟''

''ضرور قبلہ۔ مگر سوچ لیجئے۔''

''کیا؟''

''مول چند کے باغ میں ہے وہ۔''

''تو پھر...... اماں ڈرتے ہو۔ دس بیس لونڈے لے کر چلیں گے۔ کیا کرے گا وہ بنیا ہمارا۔''

''پھر بھی کافر ہے، ہوشیار رہنا ضروری ہے۔''

''اماں چھوڑیئے حق صاحب۔ اس طرح ڈرے تو جی لیے اس دنیا میں۔ ہاں بھائی میاں اور کوئی خدمت ہمارے لیے۔''

''نہایت شکریہ۔ یہی عرض لے کر حاضر ہوا تھا۔ اجازت مرحمت فرمایئے۔ اٹھو اکرام۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو بیٹھو۔ کچھ کھا پی کر جاؤ۔ آتے ہی ایسی باتیں شروع کر دیں جنہوں نے جان جلا دی۔ اپنی باتیں ہو ہی نہیں سکیں۔ یہاں کس کے پاس آئے تھے۔ کوئی رشتہ داری ہے؟''

''ہاں۔ جوالا پور کے تمام مسلمانوں سے رشتہ ہے۔ سب کی بہتری اور سلامتی کی دعائیں کرتا ہوں۔ اللہ حافظ......'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور واپسی کے لئے پلٹ پڑا۔ کنور صاحب دیکھتے رہ گئے تھے۔ باہر نکل آیا۔ حویلی سے باہر نکلا اور پھر اکرام کے ساتھ مول چند کے باغ کی طرف چل پڑا۔ اکرام خاموش تھا۔ کچھ فاصلے پر آ کر اس نے کہا۔ ''بڑا ناگوار اثر چھوڑا ہے اس شخص نے ذہن پر۔''

''ہاں۔ خود پرستی کا شکار ہے۔''

''بد خلق بھی ہے۔''

''ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔''

''مانے گا نہیں۔''

''مان جائے گا۔''

''لگتا تو نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہو جائے گا اکرام میاں، فکر مت کرو۔''

''آپ نے اس کے تعویذ کے بارے میں کچھ اندازہ لگایا۔ اکرام نے کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''واہ اکرام میاں۔ اب تو تم بھی ان باتوں پر بڑی گہرائی سے سوچنے لگے ہو اور ان پر غور کرنے لگے ہو۔''

''صحبت صالح جو مل گئی ہے۔'' اکرام نے بھی مسکرا کر کہا۔

''ایسی باتیں نہ کیا کرو اکرام میاں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کیوں۔ غلط کہا ہے میں نے۔ ویسے تعویذ والی بات رہ گئی۔''

''کسی بزرگ نے نظر کرم کر دی ہو گی۔ کالے سحر کا عمل بے شک سخت ہوتا ہے کیونکہ اس میں شیطان شریک ہوتا ہے

لیکن اللہ کے کلام سے ٹکرانے کی قوت کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔"
"شاید کنور صاحب اسی پر اکڑتے ہیں۔"
"یہ اس کی خوبی ہے۔"
"تعویذ کی؟"
"نہیں کنور کی۔"
"کیوں؟"
"عقیدے کی پختگی بڑی چیز ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے نتائج بے حد اہم نکل آتے ہیں اور پھر کیوں نہ ہو، عقیدہ ہی تو ایمان ہے۔ اگر وہ کسی مرد خدا کے دیئے ہوئے تعویذ پر اتنا عقیدہ رکھتا ہے تو یقین کرو اسے کبھی مایوسی نہ ہوگی، تمہیں پوری کہانی پر غور کرنا چاہیے۔"
"مثلاً؟"
"بھئی مول چند نے تمہارے سامنے سنائی تھی۔"
"کہانی تو مجھے یاد ہے لیکن تم کون سے پہلو کی طرف اشارہ کر رہے ہو، اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔"
"تمہارے سوال ہی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔"
"یعنی تعویذ؟"
"ہاں! گرج ناتھ سیوک نے جادو کا مندر تعمیر کر ڈالا جسے کنور کے لاتعداد آدمی گھن چلا کر نہیں توڑ سکے۔ اس کے علاوہ مول چند نے اور بھی کہانیاں سنائیں جیسے سوریہ کرن کا معاملہ۔ اس سے کیا تاثر ظاہر ہوتا ہے۔"
"یہی کہ وہ کالے جادو کا ماہر شخص بے حد خطرناک ہے۔"
"بے شک۔ اور وہ کالے جادو کا ماہر کنور ریاست علی خان کے اس تعویز سے خوفزدہ ہے۔ وہ اسے خود نہیں حاصل کر سکتا اور اس کے لیے مول چند کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے خوفزدہ ہے۔ اس کا بس اس کے بغیر ریاست علی خان پر نہیں چل سکتا۔"
"سمجھ گیا۔" اکرام نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ "مگر وہ مغرور شخص مجھے پسند نہیں آیا۔ اس کے اندر جو خودسری ہے وہ اسے ضرور نقصان پہنچائے گی چاہے اسے کتنے ہی تعویذوں کا سہارا حاصل ہو۔"
"نہیں اکرام، بے ضرر آدمی ہے۔ میرا مطلب ہے ان حالات سے متاثر ہو کر انتقام لینے پر تل گیا ہے لیکن سمجھ جائے گا، ایسے لوگ ذہن کے کچے ہوتے ہیں، جو دماغ کے بجائے دل سے سوچتے ہیں، ایک بات اس کے دل کو لگ گئی، سو سمجھو کہ لگ گئی۔"
"مول چند کو کیا جواب دیں گے؟" اکرام نے سوال کیا اور مجھے پھر ہنسی آ گئی۔
"اس سے کہیں گے کہ کنور ریاست علی مان گئے ہیں، دوبارہ کمیٹی لے کر ان کے پاس جاؤ، وہ تم سے تعاون کریں گے۔" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور اکرام چونک کر میری صورت دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "لل۔ لیکن کیسے آخر کیسے...... میرا مطلب ہے کہ مول چند۔" اکرام بات پوری نہیں کر پا رہا تھا۔
"بھئی کنور سے بات ہوگی ہماری۔ وہ آئے گا مسجد میں ہم سے ملاقات کرنے، اسے سمجھا بجھا دیں گے، اپنا گھر تھا، اس کی چمک دمک تھی، کمزور انسان کے اندر غرور پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ وہاں نہیں مانا ہماری بات، اللہ کے گھر میں آ کر تو مان لے گا۔" اکرام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہت بڑا دعویٰ کر دیا تھا میں نے...... لیکن اکرام کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ اس سے انحراف کرے۔ مول چند کے باغ پہنچ گئے یا مسجد میں آ گئے اور اس کے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ مغرب کی نماز پڑھی، دیئے جلا دیئے اور میرا انتظار کرنے لگے۔ نماز ختم ہوئی، آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرا تھا کہ مسجد کے دروازے پر دستک

ہوئی اور میں نے اکرام کو اشارہ کیا۔ اکرام نے دروازہ کھولا اور سلام و دعا کی آوازیں ابھریں۔ میں بھی سامنے آ گیا تھا۔ باہر کافی افراد تھے اور سب سے آگے کنور ریاست علی خان اپنے ان چاروں گرگوں کے ساتھ۔ میں نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی، تمام ہی لوگ جوتے اتار کر اندر آ گئے تھے۔ کنور ریاست علی خان اور ان کے چاروں ساتھیوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، وہ عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آ رہے تھے...... پھر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ...... آپ...... آپ؟''

''تشریف لایئے کنور صاحب، میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' کنور ریاست علی خان نے بڑی عقیدت سے جھک کر مجھ سے مصافحہ کیا اور کہنے لگے۔

''حضور آپ نے تو...... آپ نے تو ہمیں سمندر میں ڈبو دیا۔ بخدا کتنی ندامت ہو رہی ہے۔ بخدا کیا ہم یہ داغ اپنی پیشانی سے دھو سکیں گے، وہ آپ تھے جو خود چل کر ہمارے سامنے آئے تھے۔ میاں عبدالحق، غفور احمد آپ دونوں نے بالکل درست کہا تھا، ہم ہی کور چشم تھے جو اس نیک روح کو نہ پہچان سکے۔ حضور بڑی داستانیں سن رہے ہیں آپ کے بارے میں، تو حملہ ہوا تھا اس مسجد پر، راتوں رات یہ تعمیر ہوئی تھی اور آپ نے اس میں اذان دی تھی، اس غلطی کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے کیا...... میاں ہمیں احساس شرمندگی ہے، گردن خم ہے ہماری آپ کے سامنے......'' کنور ریاست علی خان ایک دم موم ہو گئے تھے۔ میں نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بخدا نہ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے اور نہ اس شکایت کا کوئی جواز، اب آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں، تشریف رکھیے، خانہ خدا میں تو ہر شخص کی گنجائش ہے لیکن بس ایک عرض ہے جو آپ سے کرنا چاہوں گا......'' تمام لوگ صحن مسجد میں بیٹھ گئے...... اور میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

کنور کی گردن عقیدت سے جھکی ہوئی تھی۔

''آپ نے دیکھا کنور صاحب۔ یہ مول چند کا باغ ہے۔ اس میں مسجد تعمیر ہوئی ہے مگر خانہ خدا کا دروازہ بند تھا۔ آپ کے تعاون سے میں یہ دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ ہر نمازی کے لیے۔''

''مول چند کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے یہ سن کر......'' کنور صاحب نے کہا۔

''نہیں کنور صاحب۔ وہ کہتا ہے کہ اس پورے باغ کے گرد مسجد کا احاطہ تعمیر کر لیا جائے، وہ اسے مسجد کی نذر کرتا ہے۔''

''مول چند......؟''

''ہاں خانہ خدا میں جھوٹ کا گزر نہیں۔'' میں نے کہا اور کنور ریاست علی کا چہرہ بدل گیا۔ ان پر ان الفاظ کا بے حد اثر ہوا تھا۔ بمشکل انہوں نے کہا۔

''مول چند نے یہ کہا ہے تو اس سے جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم۔ اس نے پہلی بار اپنے لیے عزت کا مقام پیدا کیا ہے۔ آپ کے سامنے اقرار کر رہا ہوں۔ میری طرف سے اس سے دشمنی کا دروازہ بند ہو گیا...... اور حضور قبلہ...... یہ افراد جو میرے ساتھ آئے ہیں اور میں خود یہاں سے بابو مول چند کے گھر جائیں گے۔ میں اس سے کہوں گا کہ یہ میری بھائی چارہ کمیٹی ہے۔ میں جوالا پور کے ہندوؤں کے ساتھ امن چاہتا ہوں۔ اس نے اتنی بڑی بات کہی ہے تو میں اسے ضرور گلے لگاؤں گا۔''

''جزاک اللہ۔'' میں نے مسرور لہجے میں کہا۔

''مگر حضور...... آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ میں نے شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے دروازے پر آپ کی توہین کی۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔''

''بخدا مجھے یا اکرام میاں کو اس کا کوئی احساس نہیں۔''

''بے حد شکریہ۔ میں عشاء کی نماز یہاں پڑھتا لیکن اس سے پہلے میں بابو مول چند کے پاس جانا چاہتا ہوں تاکہ اس نیک عمل کا آغاز ہو جائے۔''

"ضرور کنور صاحب۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ وہ سب احترام سے رخصت ہو گئے۔ اکرام عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور تم نے جو کہا تھا وہ ہو گیا مسعود بھائی۔"

"ہاں۔ بفضل تعالیٰ اب امن قائم ہو جائے گا اور اس کے بعد...... اس کے بعد ہم اطمینان سے گرج ناتھ کی مشکیں کس سکیں گے۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔

دلچسپ واقعات تھے۔ لطف آ رہا تھا۔ سب کچھ بھول کر اب ان واقعات میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ابھی تو بہت سے مراحل تھے جن سے گزرنا تھا۔ اکرام بھی اب بہت سنبھل گیا تھا۔ ویسے اس نے ایک اچھا ساتھی ہونے کا ثبوت دیا تھا اور کسی لمحہ میرے لیے تکلیف دہ نہیں ثابت ہوا تھا۔

دوسرے دن سورج چڑھے، مسجد کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اور اکرام باہر آئے تو کنور ریاست اور مول چند کو کھڑے پایا۔ کنور صاحب نے سلام کیا اور مول چند نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پیشانی سے لگا دیئے۔

"تم دونوں کو ساتھ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"برسوں سے دلوں پر لدا بوجھ اُتر گیا مہاراج۔ آپ کے چرنوں کا یہاں آنا ہمارے لیے تو بڑا بھاگوان رہا۔" مول چند نے عقیدت سے کہا۔

"دوسروں کو بھی ایسے ہی ملا دو۔"

"آپ کا آشیرواد لینے آئے ہیں۔"

"میری دُعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ مجھے خبر دیتے رہنا۔" میں نے کہا۔

"ہم تو آپ ہی کی رہنمائی کے طالب رہیں گے شاہ صاحب، ہمیں اجازت دیں کہ آپ کے پاس حاضری دی جاتی رہے۔" کنور ریاست نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ تم لوگ جب چاہو آ سکتے ہو۔"

"مسجد کے دروازے کھول دیں مہاراج۔ نمازیوں کو نماز کیلئے بلائیں۔ اب یہ میرا نہیں آپ کا باغ ہے۔" مول چند بولا۔

"وہ بھی کھل جائیں گے مول چند۔ ویسے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"حکم مہاراج۔"

"تمہارا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ ہندو دھرم کی اپنی روایات ہیں، یہ کالا دھرم تو نہیں ہے جبکہ گرج ناتھ کالے دھرم کا پرچار کر رہا ہے۔ جوالا پور کے ہندو اپنا دھرم چھوڑ کر کالے دھرم کے پیروکار کیوں بن رہے ہیں۔ تم نے ان سے پوچھا کہ وہ کالے دھرم کو کیوں اپنا رہے ہیں؟"

مول چند سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ "میں انہیں سمجھاؤں گا مہاراج......"

"ہاں یہ بات انہیں بتاؤ۔ بہت ضروری ہے۔"

وہ لوگ چلے گئے۔ اب میرے دل میں ایک اور خیال آیا۔ اکرام کو میں نے ساتھ نہیں لیا کیونکہ یہ مناسب نہیں تھا لیکن اس دن پہلی بار میں نے مسجد کے اس عقبی ویران گوشے کا رُخ کیا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ادھر آبادی ہے۔ وہیں سے ہمارے لیے کھانا پک کر آتا تھا۔ وہیں سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس سمت پہنچ گیا۔ سُرخ اینٹوں کا ایک در بنا ہوا تھا جس میں دروازہ لگا ہوا تھا۔ میں اس دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔ چند لمحات تک کوئی آواز نہ سنائی دی مگر پھر ہلکی ہلکی آہٹیں اُبھریں اور بند دروازہ کھل گیا۔ خوشبو کے کئی جھونکے آئے۔ میری نظر سامنے اُٹھ گئی۔ تھوڑا سا کچا راستہ تھا، اس کے بعد تین

سیڑھیاں تھیں۔ اُوپر ایک وسیع دالان نما جگہ تھی جہاں تین قبریں نظر آ رہی تھیں، ان پر گلاب کے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ایک سمت اگردان سے ہلکا ہلکا دُھواں نکل رہا تھا جس سے بڑی مسحور کن خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ بائیں سمت تین دَر بنے ہوئے تھے جن کے دُوسری سمت تاریکی تھی۔ میں آگے بڑھا۔ سیڑھیوں سے نیچے جوتے اُتارے اور پھر قبروں کے قریب پہنچ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ فاتحہ پڑھی۔ چند لمحات خاموشی اختیار کی، پھر آہستہ سے اُٹھ گیا۔ اسی وقت عقب سے آواز آئی۔

''السلام علیکم۔'' چونک کر پلٹا تو ایک عمر رسیدہ شخص کو بیٹھے ہوئے پایا۔ جواب دیا تو وہ فوراً بولے۔

''بیٹھو۔'' میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ ''کہو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی یہاں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''عنایات کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''فرض میزبانی تھا۔'' وہ بولے۔

''ایک اجازت لینے حاضر ہوا تھا۔''

''کہو؟''

''کیا نمازیوں کیلئے مسجد کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے؟''

بزرگ نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولے...... ''خانۂ خدا پر کسی کی آمد کی پابندی لگانا بھلا ہمارے لیے کیسے ممکن ہے، مسجد نمازیوں کے لیے ہی ہوتی ہے، بھلا نمازیوں پر اس کے دروازے کیسے بند کئے جا سکتے ہیں؟''

''میں یہی اجازت لینے حاضر ہوا تھا۔ طویل عرصے سے مسجد غیر آباد تھی اور آپ یہاں فروکش، یقیناً اب آپ کو زحمت ہوگی؟''

''میاں کیسی باتیں کرتے ہو، ہم کہہ چکے ہیں کہ خانۂ خدا کے دروازے بھلا عبادت گزاروں پر کیسے بند کئے جا سکتے ہیں، رہی ہماری بات تو ہمارا یہ حجرہ الگ تھلگ ہے، ہم ذرا اسے اور محفوظ کرلیں گے، اس میں اجازت کی ضرورت نہیں، ویسے عزیزی تمہیں کچھ تکلیفیں ہوتی ہوں گی یہاں جن کے لیے معذرت خواہ ہیں۔''

''نہیں محترم میں خود آپ کی عنایات کا شکر گزار ہوں میرے لیے کوئی رہنمائی فرمایئے؟''

''اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیاب کرے۔'' بزرگ نے جواب دیا۔ میں ایک بار پھر جنبش کرکے اُٹھا تو بزرگ خود بھی اُٹھ گئے کہنے لگے۔

''جب تک یہاں قیام ہے مسعود میاں، کوئی ضرورت ہو تو بلا تکلیف کہہ دینا، ہمیں تو غم ہے کہ صحیح طور پر میزبانی نہ کر سکے۔'' میں نے کچھ اور کلمات کہے جن سے شکر گزاری جھلکتی تھی اور اس کے بعد خاموشی سے وہاں سے پلٹ آیا، کچھ دیکھنا کچھ سوچنا مناسب نہیں تھا۔ بات تو پہلے ہی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اکرام کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور اس سے کہا کہ مسجد کا دروازہ کھول دے۔ حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ سامنے کا علاقہ مسلسل سنسان تھا، لیکن اب نہ تو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور نا ہی کوئی ''ہاہا کار'' کانوں تک پہنچتی تھی۔ ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا...... لیکن میرے نمائندے مجھ سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ مول چند نے آ کر بتایا کہ حالات بالکل پر سکون ہیں۔ کسی محلے میں کوئی فساد نہیں ہوا ہے۔ امن کمیٹیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق دیا ہے اور اس کا نتیجہ کم از کم یہ تو نکلا ہے کہ کسی نے کسی پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ پورے جوالا پور میں کسی ایسے واقعے کی اطلاع نہیں ملی۔ یہ بات بڑی دل خوش کن تھی اور میں بڑا مطمئن تھا۔ نمازیوں نے ابھی تک جان علی کی مسجد کا رُخ نہیں کیا تھا۔ شاید ڈر یا خوف تھا...... لیکن اس شام مغرب کی نماز میں کنور ریاست علی پندرہ بیس افراد کے ساتھ پہنچے تھے۔ میں اذان سے فارغ ہوا تھا کہ میں نے ان لوگوں کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وضو کرنے بیٹھ گئے، خاموشی سے پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد مجھ سے سلام دُعا کی پھر کنور ریاست علی نے مجھے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''حضور قبلہ شاہ صاحب، یہ چار دن تو بڑے پُرسکون گزرے ہیں، گو ابھی جوالا پور کے بازاروں میں دُکانیں وغیرہ نہیں

کھلی ہیں اور لوگ آزادانہ طور پر سڑکوں اور گلیوں میں آتے جاتے ہوئے ہچکچا رہے ہیں لیکن بفضل تعالیٰ کوئی حادثہ وغیرہ نہیں ہوا اور حالات پُرسکون ہیں...... لیکن آج شام کو پانچ بجے گرج ناتھ سیوک کے کچھ نمائندے ہندو محلوں میں ایک اعلان کرتے پھر رہے ہیں۔"

"کیسا اعلان ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"عجیب وغریب اعلان ہے، ان کا کہنا ہے کہ دیوی بھوانی جوالا چوک پر استھان کرے گی اور رات ٹھیک بارہ بجے جب چاند ٹیکا ٹیک آسمان کے بیچ پہنچے گا، بھوانی دیوی جوالا چوک پر براجمان ہوگی اور اس کے چرنوں میں دُنبے کی قربانی دی جائے گی جسے وہ لوگ اپنی زبان میں بلی کہتے ہیں، ہندوؤں کو دعوت دی گئی ہے کہ بھوانی کا استھان دیکھیں اور دُنبے کی قربانی میں حصہ لیں۔ ہندوؤں میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی ہے اور کانا پھوسیاں ہو رہی ہیں۔"

"آج رات بارہ بجے......" میں نے سوال کیا......!

"جی شاہ صاحب......"

"آپ نے مول چند کو یہ بات بتائی؟"

"بات تو سب ہی کو پتہ چل گئی ہے۔"

"میرا مطلب ہے مول چند تو آپ کے پاس نہیں پہنچا؟"

"نہیں......"

"تو پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"مداخلت کی جاسکتی ہے شاہ صاحب، پتہ نہیں یہ کیا چکر ہے، لیکن آپ کی اجازت کے بغیر نہیں۔ میرے پاس ساٹھ بندوقیں ہیں اور انہیں چلانے والے بھی موجود ہیں، کارتوسوں کا ذخیرہ ہے، اگر آپ حکم دیں تو جوالا چوک پر ایک بھی ہندو کو نہ پہنچنے دیا جائے۔" کنور ریاست علی نے کہا اور میں نے ہنس کر ہاتھ اُٹھا دیا۔

"نہیں کنور صاحب، خون بہانے کا مقصد تو پورا ہو جائے گا گرج ناتھ کا۔ اگر ہم نے وہاں ایک بھی ہندو کا خون بہایا...... ایسا نہ کریں انہیں نفرت کے بجائے محبت دیں۔ آپ دیکھ لیجیے، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بھلا کس کافر کو خوشی ہے کہ کسی انسان کا خون بہائے لیکن یہ تعصب بڑھنا نہیں چاہئے شاہ صاحب، ورنہ ایک ایک مسلمان کٹ مرے گا، ہندوؤں کا تسلط نہیں ہونے دے گا جوالا پور پر۔ یہ میں آپ سے عرض کئے دے رہا ہوں۔"

"نہیں ہوگا کنور صاحب، کوئی تسلط نہیں ہوگا کسی پر، آپ مطمئن رہیں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ لوگ بالکل الگ تھلگ رہیں اس معاملے سے، بلکہ چاہیں تو مسلمان بھی تماشا دیکھیں، آپ اطمینان رکھئے وہاں بھی کوئی فساد نہیں ہوگا۔"

"آپ نے کہا...... میں نے خلوص جان سے تسلیم کیا، بس یہی اطلاع دینے حاضر ہوا تھا۔ اجازت چاہتا ہوں۔ ریاست علی چلے گئے، اکرام نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ گویا معاملہ ابھی سرد نہیں ہوا مسعود بھیا......؟"

"سرد ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ گرج ناتھ سیوک کی ان تین چار دنوں کی خاموشی ہی میرے لیے حیران کن تھی۔ اس نے کیسے برداشت کر لیا اس بات کو کہ فسادات بند ہو جائیں۔ ویسے اسے پتہ تو چل گیا ہوگا کہ نفرت کے وہ پُتلے وہاں سے نکال پھینکے گئے ہیں۔ وہ دونوں ہرکارے یقیناً وہاں پہنچ کر اسے سب کچھ بتا چکے ہوں گے جو اس وقت ہمارے قریب آئے تھے جب ہم نے جوالا چوک سے پُتلے نکال پھینکے تھے۔" میں نے اکرام سے کہا۔ "رات کو اس وقت بھی ہم جوالا چوک پر پہنچیں گے، جب یہ سارا کھیل ہوگا۔" اکرام نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ ہم تقریباً پونے گیارہ بجے مسجد کے دروازے سے باہر نکل آئے، چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ میں اور اکرام فاصلے طے کرتے ہوئے بالآخر جوالا چوک پہنچ گئے یہاں البتہ خاموشی نہیں تھی۔ عقیدت مند ہندو بہت پہلے سے وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور اس وقت بھی جب صرف گیارہ بجے تھے وہاں

اچھا خاصا رش تھا لیکن میں نے مسلمانوں کو بھی دیکھا، ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی کسی کے کام میں مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ البتہ کچھ شر پسندوں کے چہروں پر شرارت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں خود بھی خاموشی سے ان لوگوں میں شامل ہو گیا اور ایک جگہ رُک کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک ہی مول چند کوئی پندرہ آدمیوں کے ساتھ جو ہاتھوں میں بندوقیں لیے ہوئے تھے، وہاں پہنچ گیا اور ٹھیک اس جگہ پہنچنے کے بعد جہاں پُتلے گڑے ہوئے تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر اپنے تمام بندوق بردار ساتھوں کو نیم دائرے کی شکل میں پھیلا دیا اور پھر بولا۔

''بھائیو، تم لوگ مجھے جانتے ہو گے، میں بابو مول چند ہوں، برسوں سے جوالا پور میں ہندو دھرم کی خدمت کر رہا ہوں، تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں دھرم سیوک نہیں ہوں۔ میں تم میں سے ایک ہوں اور تمہیں اپنے من کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں، کیا تم سنو گے؟''

''ضرور کہو بابو مول چند...... ہمیں تم پر اعتماد ہے، ہم تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔'' بہت سے لوگوں نے کہا...... مگر کچھ آوازیں ایسی بھی آئیں۔

''بابو مول چند تم غدار ہو، تم بک چکے ہو، تم ڈرپوک ہو، تم کنور ریاست علی سے ڈر گئے ہو۔'' مول چند گرج کر بولا۔

''کون ماں کا لال ہے وہ جو یہ جملے کہہ رہا ہے، پیٹھ پیچھے چھپ کر جو من چاہے کہہ دو۔ ارے سامنے آؤ پاپیو، مجھے غدار کہہ کر تم اپنے باپ کو گالی دے رہے ہو، کون سی غداری کی ہے میں نے، ارے بے وقوفو کالے جادو کے پھیر میں آ کر تم انسان سے شیطان بن گئے ہو، ذرا بتاؤ تو سہی مجھے مہاراج۔ ہے کوئی یہاں، کوئی پنڈت، کوئی دھرم سیوک، بھوانی دیوی تو ہماری بھی دیوی ہے، اسے کالے جادو والوں نے کیسے اپنا بنا لیا، وہ گرج ناتھ سیوک جو جوالا پور کو مسلمانوں سے پاک کر کے اپنے کالے دھرم کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے، کیا ہندو دھرم سے ہے، کیا تمہارا دھرم کالا ہے۔ بولو، بے وقوفو، بھوانی مکنڈ، مایا کنڈ اور ایسے ہی دُوسرے نام دے کر کیا تمہیں کالے جادو والا نہیں بنایا جا رہا۔ کتنا بھوانی تو ہماری بھی دیوی ہے، بھلا اس پر کالے دھرم کی چھاپ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں تمہارا اپنا ایک دھرم ہے، ہمارے ریت رواج ہیں، تم ان سب کو بھول کر کالے دھرم کے پجاری بننے جا رہے ہو۔ گندی کیچڑ کھاؤ گے، غلیظ پانی پیو گے، اور اس کے بعد اپنے آپ کو ہندو کہو گے۔ ارے کالے دھرم والوں کا تو کوئی دھرم ہی نہیں ہوتا۔ ان کے دھرم میں تو لوٹا چماری، بھیروں اور شیروں ہوتے ہیں۔ بھلا ان کا ہندو دھرم سے کیا تعلق، سارے کے سارے اپنا دھرم چھوڑنے پر تُل گئے ہو۔ آخر کس لئے...... تم سب کالے جادو کے اثر میں آ گئے ہو، بے وقوفوں کی سی باتیں مت کرو، گرج ناتھ سیوک کالا جادوگر ہے، وہ تم سب کو اُلّو بنا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے بھائی چارہ قائم ہوا ہے، اگر بھوانی دیوی یہاں استھان کرتی ہے تو ہمیں اعتراض نہیں اور نہ ہی ہمارے مسلمان بھائیوں کو ہو گا، یہ تو مندر اور مسجد کا معاملہ ہے، لیکن اگر کوئی ایسا کالا دھرم یہاں استھان کرتا ہے جو یہاں کے جوالا پور کے رہنے والوں کو نقصان پہنچا سکے، تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے ہم اسے یہاں استھان نہیں کرنے دیں گے۔''

دفعتہً ہی ایک عجیب سا شور مچا اور لوگ گردنیں گھما گھما کر دیکھنے لگے۔ مول چند نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ لیکن اس کی آواز اس شور کی آواز میں دب گئی۔ میری نظریں بھی سامنے کی سمت اُٹھ گئیں، تب میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ پورے دعوے اور اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ پتھر ہی کا مجسمہ ہے اور اس میں گوشت پوست کی کوئی رمق نہیں ہے۔ اس کے پورے جسم سے مدھم مدھم آگ نکل رہی تھی اور یہ پتھر کا مجسمہ جس کی لمبائی کوئی نو فٹ تھی اور جس کی جسمانی ساخت عجیب و غریب، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا جوالا چوک کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے بھیانک تاثرات تھے۔ لوگ خوفزدہ ہو کر کائی کی طرح چھٹ گئے اور مجسمہ آگے بڑھتا ہوا جوالا چوک کے عین درمیان آ کھڑا ہوا۔ لوگ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی اس کا جائزہ لے رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ گندے علوم کے بہت سے مظاہرے دیکھے ہیں میں نے۔ کالے جادو کے ماہر گندے عمل کرتے ہیں لیکن زیادہ تر چھپ کر، اس طرح ایک پوری آبادی کے سامنے خود کو ظاہر کرنے والا پہلا ہی دیکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ گرج ناتھ سیوک زیادہ

قوت رکھتا ہے۔ اپنی معلومات کے مطابق میں نے سوچا کہ کیا وہ کھنڈولا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ پھر میں نے دُوسری بات سوچی اور میرے دل سے دُعا نکلی۔

''رب العزت، عزت و ذلت تیرے رحم و کرم کی بات ہے۔ یہاں کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں ہے۔ بے چارے مول چند نے زندگی داؤ پر لگا کر آج گرج ناتھ کے خلاف کچھ کہا ہے۔ اس کے خلاف اتنا کچھ کہہ کر اس نے اس کا غضب مول لے لیا ہے۔ اس نے مجھ پر تکیہ کیا ہے اور بات یہاں صرف میری عزت اور مول چند کی زندگی کی نہیں ہے۔ تیرے بے شمار بندگان خطرے میں ہیں۔ اس شیطانی طاقت کے خلاف مجھے تیری مدد درکار ہے ورنہ میں کیا ہوں، یہ تو خود جانتا ہے، اس وقت بہت سے عوامل یکجا ہو گئے ہیں۔ اندر سے ایک دَم سکون کا سا احساس اُبھرا۔ یوں لگا جیسے کسی نے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

جادو کا مجسمہ چند لمحات شُعاعیں بکھیرتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سرد ہو گیا اور اب وہ صرف پتھر کا مجسمہ تھا۔ چند عقیدت مند ہندوؤں نے نعرے لگائے۔ وہ کنتا بھوانی کی جے جے کار کر رہے تھے۔ اچانک ہی پھر غلغلہ سا اُٹھا اور جے بھوانی، جے مایا مکنڈل کی آوازیں آنے لگیں۔ میری نظریں پھر اسی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ گرج ناتھ سیوک خود آیا ہے۔ اس کے چاروں طرف بیر اُچھل کود رہے تھے اور وہ ان کے بیچوں بیچ تھا۔ گرج ناتھ کو ماننے والوں نے پھر نعرہ لگایا۔

''جے سیوک مہاراج۔''

''جے سیوک بھوانی۔''

''جے بھوانی۔'' گرج ناتھ نے اس نعرے کا جواب دیا۔ اور پھر وہ سامنے آ گیا۔ ایک کالا مینڈھا اس کے ساتھ تھا۔ نہایت تنومند لمبے لمبے سینگوں والا۔ اس کے گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ اس طرح جھوم رہا تھا۔ جیسے اسے نشہ پلا دیا گیا ہو۔ اس کی زنجیر سیوک نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ گرج ناتھ بھوانی کے مجسمے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر نعرہ لگایا۔

''جے بھوانی جے مایا مکنڈل۔'' جوالا پور کے دھرم داسیو مجھے جانتے ہو۔ میں گرج ناتھ سیوک ہوں، جوالا پور کے ہندو دھرم والوں کا سیوک، میں جوالا پور میں مایا مکنڈل کا بنانے والا ہوں اور تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ سب کچھ میں اپنے لئے نہیں کر رہا، تمہارے لیے کر رہا ہوں۔ ہاں صرف تمہارے لیے اور اس کے لیے میں نے جوالا پور کا چناؤ کیا ہے، ایسے ہی نہیں، وجہ ہے اس کی، کیا سمجھے۔ اس کی وجہ ہے، پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں جوالا پور کو، پورے بھارت ورش میں ایک ایسی آبادی بنانا چاہتا ہوں، جہاں کے لوگوں کو باقی ویش والے دیکھیں تو جن سے کلیجہ پکڑ کر رہ جائیں، جوالا پور کے گھر جیسے سونے کے گھر ہوں گے۔ مایا تمہارے چرنوں میں لوٹے گی اور یہ سب کچھ میں تمہیں دوں گا، بھوانی کنڈل کے زیر اثر...... جوالا پور کے ہندو دھرم والو، میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک پکا بھوانی مکنڈل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے ملیچھوں کا خاتمہ کر دیا جائے، ایک بھی مسلمان جوالا پور میں نہ رہے، یہ میرا نہیں تمہارا کام تھا۔ تمہیں سر انجام دینا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا تم نے کوشش تو کی۔ مگر ناکام کوشش، کوئی کامیابی تمہیں نہ مل سکی اور بھلا کامیابی کیسے ملتی، جبکہ خود تمہارے بیچ غدار موجود ہیں اور انہوں نے اپنے ہی بھائیوں کی گردن کاٹی ہے جوالا پور کے دلیر داسیو، یہ ملیچھ جہاں بھی رہتے ہیں، دھرتی کو ناپاک کرتے ہیں۔ ہماری گئو ماتا کا خون بہاتے ہیں، اسے کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ جانوروں کا گوشت یہ بڑے آرام سے کھا پی لیتے ہیں، جبکہ ایک پورا بھوانی مکنڈل بننے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی باتیں نہ ہونے پائیں اور بھوانی مکنڈل ملیچھوں سے پاک ہو۔ میں نے گہری نظروں سے سب کچھ دیکھا ہے، مجھے پتہ ہے کہ ہمارے بیچ غدار کون کون ہے۔ مگر ہم غدار کو ماریں گے نہیں۔ اس کی غداری اپنی موت آپ مر جائے گی جب بھوانی مکنڈل بن جائے گا۔ تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ غداری کر کے ہمارا کام روک دیا گیا ہے۔ ورنہ تھوڑے تھوڑے ہی کر کے سہی، سارے ملیچھ مارے جاتے، ارے سرکار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی، یہ سارے انتظامات تو میں نے کر لیے تھے۔ ایک طرف وہ کنور ریاست ہے جو زور لگائے ہوئے ہے، میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ کیا کرتے ہو، جب چاہوں اسے بھسم کر کے رکھ دوں گا، آگ لگا دوں اس کی حویلی میں۔

مگر میں نہیں کرنا چاہتا تھا یہ کام، یہ کام تم ہی کرو گے، کیونکہ یہ تمہارا ہی کام ہے اور یہ ضروری بھی ہے۔ اب آ جاتے ہیں

ہم ان غداروں پر، نام نہیں لوں گا کسی کا۔ وہ ملیچھوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا کام کیا ہے اس جوالا چوک میں، جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارا کام رُک گیا ہے۔ سُنا ہے یہاں ایک مہا آتما بھی آئی ہے جس نے بابو مول چند کے باغ پر قبضہ جما لیا ہے اور وہاں کی پرانی مسجد میں اذان دیتی ہے، نماز پڑھتی ہے، ارے کسی جگہ بند ہو کر یہ سارے کام کرنا تو بچوں جیسی بات ہے، ہمت ہے تو کبھی گرج ناتھ سیوک کے سامنے آئے وہ...... اور ہندو دھرم کا سیوک اسے یہ بتائے کہ مہاتما کیا ہوتی ہے۔ گھر میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ میں تم لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو بھائی چارہ کمیٹیاں بنی ہیں، سب ڈھونگ ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ ہی ہندوستان میں ہندوؤں کی کھوپڑیاں توڑی ہیں اور کبھی انہیں سر نہیں اُٹھانے دیا۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کچھ لوگ ان مسلمانوں کی ساری کارروائیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم جوالا پور سے یہ تحریک شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد دیکھیں گے کہ اپنے دھرم رکھشا کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ دولت سب کے پاس ہونی چاہئے اور اس کے بل پر بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔ کسی کی باتوں میں نہ آؤ، کسی کی نہ سنو، اپنا کام آہستہ آہستہ جاری رکھو۔ میں نے اب ایک اور فیصلہ کیا ہے، وہ یہ کہ اپنے بیروں کو تمہاری مدد پر لگاؤں گا، اس طرح تمہیں بزدلی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے اسی لیے بھوانی ماتا کو تمہارے بیچ بھیج دیا ہے اور اب بھوانی ماتا خود تمہاری رکھشا کرے گی۔ تمہیں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے، اس کے چرنوں میں چلے آنا، یہ تمہیں طاقت دے گی اور تمہارے لیے صحیح راستے منتخب کرے گی۔ جوالا پور کے لوگو، کسی غدار کے پھیر میں مت آنا، ملیچھ ہمارے دوست یا ہمارے بھائی ہو ہی نہیں سکتے، یہ صرف ہمارے دُشمن ہیں اور جب بھی موقع ملے گا، یہ تم پر وار کریں گے، ان سے ہوشیار رہنا، اپنا کام جاری رکھو، ان کا خون بہاتے رہو، تمہاری منزل تمہارے سامنے آ جائے گی۔ جے بھوانی، جے بھوانی، اس نے ایک بیر کو اشارہ کیا اور وہ ایک چنڈول لیے سامنے آ گیا۔ گرج ناتھ سیوک نے چنڈول میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر اشرفیاں اُٹھائیں اور سونے کی اشرفیاں بھوانی کے مجسمے پر اُچھال دیں، اس کے بعد وہ چنڈول میں ہاتھ ڈال ڈال کر سونے کی اشرفیاں اُچھالتا رہا اور اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ یہ اشرفیاں لوٹ رہے تھے۔ اب ان میں کون ہندو تھا کون مسلمان۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا، سب لوٹ مار میں لگے ہوئے تھے، پھر چنڈول خالی ہو گیا تو گرج ناتھ سیوک نے کہا۔

''بس اب پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہم بھوانی ماتا کے چرنوں میں اس مینڈھے کی بلی دے رہے ہیں۔ بھوانی ماتا کے چرنوں کو پہلے جاندار کا خون دے کر ہم اسے اَمر کر دیں گے اور اس کے بعد تم لوگوں کے لیے کوئی مشکل نہ رہے گی۔''

لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے مینڈھے کو زنجیر سے آزاد کر دیا گیا۔ چار آدمی جن کے ہاتھوں میں نیزے تھے، جن کی اَنیاں چاندنی میں سونے کی مانند چمک رہی تھیں، چاروں سمت کھڑے ہو گئے۔ مینڈھا سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔ دفعتاً ہی گرج ناتھ سیوک نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور ان چاروں بلم والوں نے بلم سیدھے کر کے مینڈھے پر دے مارے۔ میں مینڈھے کو دیکھ رہا تھا۔ گرج ناتھ سیوک کو پہلے ہی مرحلے پر ناکامی سے دوچار ہونا چاہئے تھا ورنہ یہاں سے اس کی بات لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جاتی اور شاید اس کے بعد مسلمانوں کے خلاف ایسے فسادات ہوتے جو اب تک جوالا پور میں نہیں ہوئے تھے۔

✦✤✦✤✦

میری دِلی آرزو تھی کہ گرج ناتھ سیوک یہیں سے ناکام ہونا شروع ہو جائے اور میں اُمید و بیم کے عالم میں مینڈھے کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں نیزے پوری قوت سے مینڈھے کے جسم کی طرف بڑھے اور اس کے جسم سے ٹکرائے لیکن پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ ان کی اَنیاں مڑ گئیں اور وہ اس طرح بے اثر ہو کر نیچے گر پڑے کہ مینڈھے کے جسم کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ گرج ناتھ سیوک کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ لوگوں میں بھی بھنبھناہٹیں ہونے لگی تھیں۔ گرج ناتھ سیوک متحیرانہ انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے ایک نیزے کو اُٹھا کر اس کی اَنی کو دیکھا، پھر نیزے پھینکنے والوں کو...... وہ خود بھی حیران و پریشان کھڑے ہوئے تھے، اس کے بعد اس نے دوسرا نیزہ اُٹھا کر دیکھا اور پھر چاروں طرف گھورنے لگا۔ اچانک ہی اس نے فضا میں ہاتھ بلند کیا اور چوڑے لوہے کی

ایک چمکدار تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے تلوار کی دھار دیکھی اور پھر اسے قبضے سے پکڑ کر مینڈھے کے چاروں طرف ایک چکر لگایا۔ وہ تلوار کی نوک مینڈھے کے جسم پر جگہ جگہ چبھوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے مینڈھے کے بائیں سمت رُک کر تلوار بلند کی۔ جے بھوانی کا پُرزور نعرہ لگایا اور تلوار پوری قوت سے مینڈھے کی گردن پر دے ماری، لیکن تلوار کا بھی یہی حشر ہوا، گردن جیسے فولاد کی بنی ہوئی تھی، تلوار اس طرح اُچٹی کہ گرج ناتھ سیوک کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے اور گرج ناتھ سیوک شرمندہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اب میرا آگے بڑھنا ضروری تھا کیونکہ یہی وقت تھا کہ لوگوں کو اس کے بارے میں سمجھایا جاتا۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر سامنے آ گیا اور بہت سی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

''جوالا پور کے انسانو! کسی دین اور کسی دھرم کا نام نہیں لوں گا، کیونکہ دین دھرم کا پتہ انسان کو اس دنیا میں آنے کے بعد چلتا ہے، جو مسلمان کے گھر پیدا ہو جائے وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو ہندو گھرانے میں جنم لے وہ ہندو ہوتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ دھرم کا رشتہ وہیں سے چل پڑتا ہے اور ہم اپنے آپ کو ہندو یا مسلمان کہتے ہیں۔ بے شک مذہب اسلام مسلمانوں کا دین اس کائنات کے لیے مکمل ہے، لیکن ہمارے دین نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ کسی دوسرے کے مذہب کو بُرا نہ کہو کیونکہ مذہب سب سے پہلے انسانیت کا سبق دیتے ہیں، تم سب ایک ہی ساخت رکھتے ہو اور یہ ساخت انسانی ساخت ہے۔ بے شک اپنے اپنے مذہب کے اُفکار الگ الگ ہیں، لیکن کوئی بھی مذہب انسانیت کا دشمن نہیں ہوتا، انسانیت کو نقصان پہنچانے کا سبق دیتا، میں وہ ہوں جس کے بارے میں ابھی تمہیں گرج ناتھ سیوک نے بتایا، میں کوئی دھرماتما نہیں ہوں، بس ایک انسان ہوں اور انسان ہی رہنے کا سبق دے رہا ہوں، خون بہہ رہا ہے، ہندو کا ہو یا مسلمان کا، گھر جل رہے ہیں، عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ یہ سب کے سب پہلے انسان ہیں اور اس کے بعد ان کے دھرم شروع ہوتے ہیں لیکن کالے جادو کا کوئی دھرم نہیں ہوتا، یہ صرف انسانیت کو نقصان پہنچانے کے لیے، جیسا ابھی مول چند نے کہا کہ کالا دھرم کوئی دھرم نہیں ہوتا، یہ انسان کا نہیں، شیطان کا دھرم ہے اور اگر تم شیطان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہیں فائدہ پہنچائے گا تو یہ تمہاری بھول ہے، میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گرج ناتھ سیوک کالا علم رکھتا ہے، گندا علم اور یہ گندگی تمہارے دھرم میں بھی نہیں ہے۔ یہ جو ۔ پور کے تمام ہندو سونے کے انبار کے حصول کے لیے اپنا دھرم چھوڑ رہے ہیں اور کالا دھرم اختیار کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ جانتے ہو، نرکھ اور سورگ کا تصور تو تمہارے ہاں بھی موجود ہے، اچھے کام سورگ میں لے جاتے ہیں اور گندے کام نرکھی بنا دیتے ہیں۔ تم نرکھی کیوں بننا چاہتے ہو، یہ کالے علم کا ماہر ہے، کالے جادو کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، جو بہر طور جوالا پور میں کبھی نہیں ہوگی۔ یہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جو انتہا پسند اور دولت کے لالچی اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں وہ کبھی اس دولت کو استعمال کرنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ یہ دیکھ لو یہ ہے اس کی بھوانی دیوی اور یہ اس کی بلی جو وہ دے رہا ہے۔ یہ مینڈھا کبھی قتل نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ اسے شیطان کے نام پر قربان کیا جا رہا ہے، میں تمہیں عقل دیتا ہوں، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ، اس کے منہ پر تھوک دو، یہ کالا جادوگر ہے اور یہ صرف تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ یہ مینڈھا کبھی نہیں مرے گا۔ چل گرج ناتھ سیوک! اب تو کچھ اور کوشش کر اپنے آپ کو آزما لے، میں تجھے بتاؤں گا کہ تیری شکتی کتنی ہے۔'' دفعتاً ہی گرج ناتھ سیوک سنبھل گیا، اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے رے ٹھیک ہے، سوچ رہا تھا کہ ذرا تیری خبر بھی لوں، چل اچھا ہوا گیدڑ کی موت اسے شہر ہی لے آئی۔ تو تو کہتا ہے کہ بلی نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے رے، ٹھیک ہے۔ بلی تو بعد میں ہوگی، پہلے تو اپنی بلی کے لیے تیار ہو جا۔ جے بھوانی، جے مایا مکنڈل، لے ایک مُجھ کی بلی سوئیکار کر۔'' اس نے کہا اور میری طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اور تلوار آ گئی تھی لیکن دفعتاً ہی ایک اور عجیب واقعہ ہوا، اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تلوار میں زوردار چمک پیدا ہوئی اور اس کے حلق سے ایک دھاڑ سی نکل گئی، اس نے جلدی سے تلوار پھینک دی تھی، تلوار بالکل سرخ ہو گئی تھی، بالکل تپتے ہوئے لوہے کی مانند اور گرج ناتھ سیوک اپنا جلا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا، لیکن اس نے ہار نہیں مانی۔ اچانک ہی زمین پر لیٹ گیا اور پھر

ہاتھ لگائے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کالے جادو کا کوئی عمل کیا تھا اس نے، جس کی بناء پر اس کی تکلیف رفع ہو گئی تھی۔ وہ پھر کھڑا ہو گیا اور اس بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تو یہ بات ہے مہاتما جی سنبھالو۔'' اس نے کہا اور دونوں ہونٹ گول کر لیے۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے شعاعیں خارج ہونے لگیں، آگ کی تیز لپٹیں میری جانب بڑھیں اور میں نے دل میں درود پاک کا ورد شروع کر دیا۔ میرے پاس سب سے بڑی قوت تھی۔ یہ شعاعیں میرے جسم کے گرد چکرانے لگیں اور میں نے اپنے آپ کو اس سے بالکل محفوظ پایا۔ گرج ناتھ کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی، لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے گرج ناتھ کو دیکھا اور کہا، ''بیوقوف ہے تو بالکل پاگل ہے۔''

''ہمارے دوار آؤ مہاراج! ہمارے دوار آؤ، پھر دیکھیں گے تمہایں، چلو رہے چلو یہاں سے چلو۔'' اس نے بیروں سے کہا اور بیرے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے، گرج ناتھ سیوک بھی ان کے پیچھے ہی پیچھے لپکا تھا۔ مسلمانوں نے قہقہے لگائے، ہندو ساکت کھڑے رہے، جب وہ سب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر زور سے کہا۔

''خاموش ہو جاؤ، خاموش ہو جاؤ، کسی کو کسی پر نہیں ہنسنا چاہیے۔ ہم اس کی ناکامی پر نہیں خوش ہو رہے، اپنی کامیابی پر خوش ہو رہے ہیں کہ انسانیت کا خون بہنے سے بچا۔ یہ مینڈھا انسانیت کے نام پر قربان کیا جاتا ہے، انسانیت کی بھلائی اور بقاء کے لیے گرج ناتھ اسے بھوانی کے چرنوں میں قربان نہیں کر سکا، دیکھو بھوانی کا مجسمہ پگھل رہا ہے، گرج ناتھ کا کالا جادو ٹوٹ رہا ہے۔'' میں نے پتھریلے مجسمے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سب نے غور سے دیکھا، پتھریلا مجسمہ سر کی طرف سے آہستہ آہستہ گاڑھے مادّے کی شکل میں بہہ رہا تھا اور یہ مادّہ کسی ایسے موم کی مانند زمین پر جمع ہو رہا تھا جو موم بتی میں پگھل رہا ہو۔ میں نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر ایک چھری نکال۔ یہ ساری چیزیں غیر فطری طور پر ہو رہی تھیں، پھر میں نے مینڈھے کے سینگ پکڑ کر اسے اُلٹا کیا اور اللہ اکبر کہہ کر چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ گردن کٹ گئی تھی اور مینڈھا زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔ چاروں طرف سے عجیب وغریب آوازیں گونجنے لگیں۔ بھوانی کا مجسمہ پگھلتے ہوئے دیکھا جا رہا تھا اور ایک کالے پتھر کے ڈھیر کی شکل میں زمین پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ یہ عجیب وغریب منظر لوگوں کے لیے جس قدر حیرت کا باعث ہوگا، اس کا اندازہ ان کے چہروں سے لگایا جا سکتا تھا، سب کے سب حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔ میں نے کہا ''کالا جادو ہندوؤں کا دھرم نہیں ہے بلکہ یہ شیطان کا دھرم ہے۔ اس کی شکست ہندو دھرم کی شکست نہیں ہے بلکہ شیطان کی شکست ہے اور شیطان جوالا پور کے تمام لوگوں کے خلاف عمل کر رہا ہے، آپ لوگ اس بات کو یاد رکھیں، کوئی مسلمان کسی ہندو پر طنز نہ کرے اور کوئی ہندو کسی مسلمان کو اپنا دشمن نہ سمجھے۔ ہم سب کالے جادو کے دشمن ہیں، اپنے گھروں کو جائیے اور آئندہ کبھی گرج ناتھ کی باتوں پر دھیان نہ دیجیے۔'' مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگانے لگے، ہندو خاموش کھڑے رہے۔

''چلو اکرام!'' میں نے کہا اور ہم دونوں وہاں سے واپس چل پڑے۔ سب نے احترام سے ہمیں راستہ دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم مسجد واپس پہنچ گئے۔ اکرام خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی لیکن میری کیفیت کچھ اور تھی۔ میں وضو کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے اکرام سے کہا۔

''اکرام! تم اگر سونا چاہو تو سو جاؤ، میں شکرانے کے نفل پڑھوں گا۔''

''وہ تو میں بھی پڑھوں گا...... مگر......''

''نہیں اکرام! میں اور کچھ باتیں نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا اور وہ ایک دم سنبھل گیا۔

''ٹھیک ہے مسعود بھیا!'' اس کے بعد وہ بھی وضو کرنے لگا۔ میں نوافل پڑھنے لگا، دل ڈوب رہا تھا، آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس عظیم الشان کامیابی پر بے پناہ خوشی تھی مجھے لیکن دل بغاوت کر رہا تھا۔ یہ احساس دل میں داخل ہو گیا تھا کہ مجھے ہر قدم پر کامیابی عطا کی جا رہی ہے، مگر میرے دل کے زخم مسلسل ہرے ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی، جان سے پیارے ماموں ریاض اور...... اور ایک مظلوم ہستی، ایک ایک ہستی جو دل و جان کا ایک حصہ بن گئی تھی، میری ان دعاؤں سے بہرہ ور نہیں ہو

سکتے، انہیں میری ذات سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا۔ ان بدنصیب آنکھوں نے اباجان کو دیکھا تھا، ماموں ریاض کو دیکھا تھا، اپنی عزیز بہن کے بارے میں بڑی دُکھ بھری داستان سنی تھی۔ لیکن...... لیکن میں ان کے لیے کچھ نہیں کرسکا تھا، میرا بھائی بھی ملک سے باہر تھا۔ ماں باپ کی خدمت کرنے کا وقت تھا یہ تو مگر میں ان سے صدیوں کے فاصلے پر تھا، صدیوں کے فاصلے پر۔

''رات گزر گئی۔ صبح کے پُرنور اُجالے آسمان سے زمین پر اُترنے لگے۔ میں نے دُعا کی۔ معبود کریم! تیرا ناچیز بندہ ہوں، کچھ نہیں ہوں اپنی ذات میں، جو کچھ ہے تیرا عطا کیا ہوا ہے، لیکن دُعا کے در تو نے سب کے لیے کھولے ہیں، ہر ذی رُوح تیرے سامنے اپنی حاجتی کے لیے گڑگڑا سکتا ہے۔ میں بھی تجھ سے دُعا مانگتا ہوں، اپنے ماں باپ کے لیے، اپنے بہن بھائی کے لیے، اپنے ماموں ریاض کے لیے، اور...... اور اس مظلوم ہستی کے لیے جو میرے دل میں آ بسی ہے۔ مالک کائنات...... انہیں ہر مشکل سے نجات دے دے، انہیں اپنی پنہ میں لے لے، انہیں اپنی اَمان دے۔ میرے مالک، اگر میری تقدیر میں انکی خدمت کی سعادت نہیں ہے تو، تیرا حکم، مگر انہیں اپنی پناہ ضرور بخش دے۔''

گردن گھما کر اکرام کو دیکھا، اس کا چہرہ بھی آنسوؤں سے تر تھا، دونوں ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ بھول گیا تھا، اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا کہ وہ بھی ساری رات میرے ساتھ جاگتا رہا ہے، نوافل پڑھتا رہا ہے، اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے، پھر بولا۔

''مسعود بھیا! اذان کا وقت ہوگیا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اذان کہی...... مسجد کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ نمازی جوق دَر جوق چلے آرہے تھے۔ کچھ رات کے واقعات کا تاثر بھی تھا۔ مسجد کھچاکھچ بھر گئی۔ میں نے ایک بزرگ سے درخواست کی۔

''حضرت! آپ امامت فرمائیے گا۔''

میں......؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''میری عاجزانہ درخواست ہے۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''مگر ہم آپ کی امامت میں نماز پڑھنے آئے ہیں۔''

''بخدا! میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ میری گزارش قبول فرمائیے۔''

''میں اسے آپ کا حکم سمجھ کر تعمیل کررہا ہوں۔'' بزرگ نے کہا۔ میں نے صف میں کھڑے ہوکر ان بزرگ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر نماز ختم ہوگئی۔ نمازی مسجد سے باہر نکلنے لگے اور مسجد کے باہر جمع ہوگئے۔ تب میں نے کنور ریاست علی کو دیکھا جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے نمازیوں کے مجمع میں، انہیں نہیں دیکھ سکا تھا، میں نے قریب جاکر انہیں سلام کیا جس کا انہوں نے بڑے تپاک سے جواب دیا۔ پھر بولے۔

''شاہ صاحب! آپ کو کالے علم کا منہ کالا کرنے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

''اللہ تعالیٰ جوالا پور کے مسلمانوں کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔'' میں نے کہا۔

''ان شاء اللہ...... حضور کئی درخواستیں کرنی ہیں، کچھ وقت عطا فرمائیں گے؟''

''تشریف رکھیے۔'' میں نے کہا اور سب بیٹھ گئے۔

''حضور...... پہلی درخواست تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ خدمت کا موقع عطا فرمائیے۔''

''کیسی خدمت؟''

''آپ کا قیام تو مسجد میں ہے۔ طعام اور دیگر ضروریات کی پریشانی ہوتی ہوگی۔''

''آپ سے اس موقع پر شاید بات ہوچکی ہے۔ اگر نہیں تو باور فرمائیے کہ خانۂ خدا میں ہر شے موجود ہے، کوئی حاجت

ہوئی تو عرض کروں گا۔''

''پھر بھی...... کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ......''

''نہیں کنور صاحب! یقین فرمائیے کوئی شے درکار نہیں۔''

''مجھے خوشی ہوتی اگر......''

''فی الحال معذرت قبول فرمائیے...... لیکن وعدہ ہے کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئی تو آپ سے درخواست کروں گا۔''

''یہ درخواست نہیں ہمارے لیے اعزاز ہوگا۔ دراصل ہم سب کی آرزو ہے کہ آپ اس وقت تک یہاں ضرور قیام فرمائیں جب تک گرج ناتھ کا فتنہ موجود ہے۔''

''ان شاء اللہ۔''

''اسے نیست و نابود کر کے ہی آپ کوئی دوسرا فیصلہ کیجئے گا۔''

''ان شاء اللہ۔''

''بس ہم مطمئن ہیں۔''

''ردِعمل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''انتہائی حوصلہ افزاء...... مسلمانوں نے گھن چلا چلا کر پگھلے ہوئے مجسمے کے ٹکڑوں کو راکھ بنا دیا ہے۔ ہندوؤں نے بالکل مداخلت نہیں کی، بس خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان میں بددلی کا آغاز ہو گیا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آپ سے کہنا تو نہیں چاہیے، لیکن انسان ہوں، کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''فرمائیے؟''

''شیطان جادوگر بیشک فتنہ انگیزی کرے گا، آپ اس سے ہوشیار رہیں۔''

''ان شاء اللہ اسے کامیابی حاصل نہ ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''باہر لوگ آپ کی زیارت کے لیے جمع ہیں۔'' کنور صاحب نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بالآخر آپ سے کام نکل آیا۔''

''ان لوگوں کو سمجھا دیجئے، میرے لیے یہ ممکن نہیں...... میں اللہ کا ایک گنہگار بندہ ہوں، کوئی برتری نہیں چاہتا، اس طرح مجھے نقصان پہنچے گا، آپ لوگ مجھے یہ دُکھ نہ دیجئے گا۔ آپ انہیں پیار سے سمجھا دیجئے گا، یہ مجھ پر احسان ہوگا۔''

''بہتر ہے۔'' کنور صاحب نے کہا اور اجازت لے کر باہر نکل گئے۔ پھر لوگ چلے گئے جس کی اطلاع اکرام نے مجھے دی تھی۔ میں نے اکرام سے کہا۔

''اکرام میاں! ناشتے کے بعد ظہر تک آرام کریں گے، تم بھی جاگتے رہے ہو۔''

''ناشتہ اپنی جگہ موجود تھا۔ ہمارے نادیدہ میزبان اپنے فرض سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ ناشتے کے بعد ہم سو گئے تھے۔ ظہر اور عصر کی نماز میں بھی نمازیوں کی وہی کیفیت تھی۔ لوگ مجھے دیکھنے آ رہے تھے۔ بہرحال اس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد میں اکرام سے باتیں کر رہا تھا کہ باہر کا دروازہ بجنے کی آواز سنائی دی۔''

''دیکھو اکرام! کون ہے؟'' میں نے کہا۔ اکرام چلا گیا۔ پھر واپس آ کر بولا۔

''بابو مول چند ہے۔'' میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ مول چند باہر ایک پتھر پر متفکر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''خیریت سے ہو بابو مول چند......؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں مہاراج!'' وہ گہری سانس لے کر بولا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟''

''بڑی عجیب مصیبت آ کھڑی ہوئی ہے مہاراج......!'' وہ پریشان لہجے میں بولا۔

نہ جانے کیا مصیبت آئی ہے۔ میں نے سوچا لیکن مول چند کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ ''آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے مہاراج۔ آپ کو پریشان کرنے آ جاتا ہوں مگر کیا کروں اور پھر اب تو بات ہی دوسری ہے۔ میں تو اس حرام خور کو ٹھیک کر لیتا مگر وہ بات ہی ایسی کر رہی ہے۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''سوریہ کرن۔''

''اچھا تمہاری دھرم پتنی۔''

''اور کون مہاراج، مصیبت ہی بنی ہوئی ہے میرے لیے۔'' مول چند ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''اب کیا کہتی ہے؟''

''انوکھی کہانی لے کر آئی ہے مہاراج۔ کہنے لگی کہ جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جو کچھ اس بیچ ہوا ہے اس نے اس کے من میں ایک نئی آرزو پیدا کی ہے۔ مہاراج وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مہاراج سے کہو کہ اسے مسلمان کر لیں۔''

''کیا؟'' میں چونک پڑا۔

''ہاں مہاراج! اسی لیے میں کہہ رہا تھا کہ آپ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ جوالا پور آ کر آپ کو کیسے کیسے تماشے دیکھنے پڑے ہیں۔''

''میری سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آیا مول چند! ذرا مجھے تفصیل سے تو بتاؤ۔'' مول چند گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر دوسری ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''میرے ہاتھوں سے تو وہ بہت پہلے نکل چکی ہے مہاراج، بار بار آپ کے سامنے بات دہرانے سے کیا فائدہ، بس یوں سمجھ لیجیے کہ سنسار نبھانے کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا اور پھر سچی بات یہ ہے کہ اس کالے جادوگر سے ڈرتا بھی تھا، دھرم آج بھی میرا ہندو ہی ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ کالا دھرم نہیں ہے، نہ پہلے تھا اور نہ کبھی ہوگا لیکن اگر آپ ہندو دھرم کے خلاف کوئی کام کرتے تو میں نہیں کہہ سکتا تھا مہاراج کہ میں آپ کا کیسا دشمن ہوتا۔ بات ہندو دھرم کے خلاف نہیں تھی بلکہ کالے دھرم کے خلاف تھی اور سمجھ میں آتی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ میرے من میں ڈر خوف کے علاوہ آپ کے لیے عزت و احترام بھی پیدا ہوا۔ کالا دھرم تو ایک الگ ہی دھرم ہے۔ سوریہ کرن کے بارے میں ساری تفصیلات آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب نہیں کہہ سکتا کہ پاپی گرج ناتھ سیوک نے اسے اپنے جال میں کیسے پھانسا۔ اپنی بھی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ اچھی خاصی بیوی تھی میری، اب تو میرے کسی کام کی بھی نہ رہی۔ خیر بات لمبی ہوگئی ہے میری، مہاراج وہ ویسے تو آتی جاتی رہتی ہے۔ آئی اور بڑی اُداس اُداس سی نظر آنے لگی۔ میرا من تو اس کی صورت دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا بہت سی باتیں سامنے ہیں مگر بات ہی اس نے ایسی کہہ کہ مجھے چونکنا پڑا۔ کہنے لگی کہ وہ اپنے کیئے پر بہت شرمندہ ہے، مگر اسے خود نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا، بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس پر کالا جادو کیا گیا اور وہ گرج ناتھ سیوک کی داسی بن گئی، مگر اب جب مسجد والے مہاراج نے جوالا چوک والا چمتکار دکھایا ہے تو اچانک ہی اس کا من گرج ناتھ سیوک سے پھر گیا ہے۔ گرج ناتھ سیوک کو شکست ہوئی ہے اور صاف پتہ چل گیا ہے کہ وہ مہاراج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ کہتی ہے کہ اتنا بڑا دھرم اس کے سامنے ہے تو وہ کسی اور دھرم میں نہیں رہ سکتی۔ میں اس کے لیے مہاراج سے بات کروں کہ وہ اسے مسلمان کر لیں اور اس وقت سے مہاراج کھانا پینا جینا حرام کر رکھا ہے اس نے میرا، دن بھر پیچھے پڑتی رہی۔ پچھلی رات کو بھی یہی ساری باتیں کرتی رہی، مجبور ہو کر میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' میں حیرانی سے مول چند کی صورت دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔

''مول چند! سچی بات یہ ہے کہ کسی دوسرے دھرم کے انسان کو مسلمان کرنا ہم مسلمانوں کے لیے بہت نیک کام ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میں اس قابل ہوں اور اتنا بڑا کام اپنے شانوں پر لے سکتا ہوں یا نہیں لیکن میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے، البتہ تمہارے اور میرے تعلقات بھی اتنے اچھے ہیں کہ تمہیں کسی کام سے دُکھ ہوگا تو مجھے اس کا افسوس ہوگا، وہ تمہاری بیوی ہے، اگر وہ ہمارے مذہب میں آ گئی تو کیا تمہیں اس کا افسوس نہیں ہوگا؟''

''مول چند آہستہ سے بولا۔ ''مہاراج سچی بات تو یہ ہے کہ اب بھی وہ کون سی میرے دھرم میں ہے، جس دن سے وہ گرج ناتھ سیوک کی داسی بنی ہے، آپ خود سوچیں میرا من کیا کہتا ہوگا۔ ارے کالے جادو والے کون سے پارسا ہوتے ہیں مگر کیا کروں، چادر سرکاتا ہوں تو پاؤں کھلتے ہیں، کون اپنے آپ کو ننگا کرنا چاہتا ہے، بات میرے منہ سے نکلی تو جگ میں پھیل جائے گی اور میری جگ ہنسائی ہوگی، اسی لیے خاموشی اختیار کر رہا تھا، پر ایک بات ہے مہاراج! آپ اسے میری خوشامد نہ سمجھیں، من سے کہہ رہا ہوں یہ بات۔''

''کہو مول چند.....'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر وہ پاپی عورت آپ کے دھرم میں آ جائے تو کم از کم نیک تو بن جائے گی۔ میرے من کو یہ دُکھ تو نہ رہے گا کہ وہ اب بھی کالی حرکتیں کر رہی ہے، جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں، وہ آپ کو بتا چکا ہوں مہاراج، اس کے بعد بھلا اور کیا بات رہ جاتی ہے؟'' مول چند نے کہا اور میں پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا، تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

''تو پھر اب یہ بتاؤ مول چند کہ میں کیا کروں؟''

''بھلا یہ بات میں بتاؤں گا مہاراج کو، وہ پاپی عورت میری جان کھائے ہوئے تھے، میں نے بھی یہی بہتر سمجھا مہاراج۔ آپ اسے مسلمان کر لیں مہاراج، بھگوان کی سوگند میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

''ہوں۔'' میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ ''بہرحال میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' اکرام کو میں نے صورت حال سمجھائی اور اسے وہیں رہنے کے لیے کہہ کر مول چند کے ساتھ چل پڑا۔ مول چند کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ بولا۔

''کاش! آپ میرے مہمان بن کر میرے ساتھ جا رہے ہوتے مہاراج۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم ایک وسیع عمارت میں پہنچ گئے۔ پوری عمارت سنسان تھی۔ زیادہ تر کمرے تاریک تھے۔ میں اس کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ میرے دل میں بھی عجیب سے احساسات تھے اور میں بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ مول چند ایک کمرے کے دروازے پر رُک گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ شاندار خواب گاہ تھی۔ ایک چھپر کھٹ نما پلنگ پر سوریہ کرن براجمان تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے سیدھی ہو گئی۔ چھپر کھٹ سے نیچے اُتر آئی۔ ساڑھی کا پلو سر پر سجا لیا اور آنکھیں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''سوریہ کرن۔'' میں نے اسے پکارا۔ مول چند نے جلدی سے میرے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی لا کر رکھ دی۔ ''بیٹھ جاؤ۔ میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا اور سوریہ کرن بیٹھ گئی۔ مول چند بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

''کہو سوریہ کرن! کیسے حال ہیں تمہارے سیوک کے؟

''مہاراج۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''تم تو اس کی داسی ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تھی مہاراج۔ اب نہیں ہوں

''کیوں؟''

''بس مہاراج نہیں ہوں۔''

''وجہ بتاؤ سوریہ کرن۔''

''وجہ ضرور بتانی ہوگی مہاراج؟''
''ہاں ضرور۔''
''بابو جی کے سامنے......؟''اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔
''کیوں نہیں۔ مول چند تمہارے پتی ہیں۔'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر غم کے تاثرات پھیل گئے، پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بولی۔
''ہیں نہیں تھے مہاراج۔''
''کیا مطلب؟'' میں حیرت سے بولا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔
''اصل بات یہی تو ہے مہاراج...... میں، میں پتی پجارن تھی۔ ان سے پوچھ لیں، ہمیشہ ان کے چرنوں میں رہی مگر...... دوش میرا بھی نہیں تھا۔ میرا کیا دوش تھا۔ گرج ناتھ کو بابو جی ہی پہلی بار گھر لائے تھے۔ یہ مایا کے پھیر میں پڑے ہوئے تھے۔ خزانے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر میں نہیں جانتی کہ میں کس طرح اس کی داسی بن گئی۔ کس طرح اس کے مایا مکنڈل پہنچ گئی، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جو کچھ کرنا پڑتا تھا مجھے اس کا احساس تھا مگر میں سب کچھ کرتی تھی۔ خود نہیں کرتی تھی، مجھ سے کرایا جاتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ بابو جی سے غداری کر رہی ہوں۔ دھرم کے خلاف ہے یہ سب کچھ۔ میرا من ان کا تھا مگر شریر اس کے قبضے میں تھا اور پھر...... اور مہاراج...... اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ٹھیک ہوگئی ہوں۔ میں گھر آگئی مگر جو پاپ میں نے کئے ہیں، وہ میرے من میں ہیں۔ سب کچھ معلوم ہے مجھے۔ جانتی ہوں کہ پتی ورتا نہیں رہی۔ کوئی دھرم نہیں رہا میرا۔ مہاراج آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے مجھے۔ میرے من میں یہی آیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں، اسی دھرم میں مجھے من کی شانتی ملے گی۔''
''یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟''
''کیا مہاراج......؟''
''کہ مسلمان ہو کر تمہیں سکون ملے گا۔''
''میں جانتی ہوں مہاراج...... جو دھرم کالے دھرم کو مار دے وہی بڑا ہے، مجھے اس سے نجات ملی ہے۔''
''وہ کیسے؟''
''آپ سے مار کھا کر وہ بھوانی مکنڈل پہنچا۔ باؤلا ہو رہا تھا۔ جان نکلی ہوئی تھی اس کی، سارے بیروں کو مارا پیٹا۔ ان سے کہا کہ سارے نکمّے ثابت ہوئے۔ مجھے بھی دھکے دے کر باہر نکال دیا اور خود کال گپھا میں جا گھسا۔''
''کال گپھا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جہاں وہ کالی شکتی کا عمل کرتا ہے۔''
''پھر کیا ہوا؟''
''جونہی میں باہر نکلی مہاراج۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے پھیر سے نکل آئی ہوں۔ آپ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ راستہ طے کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ میرا دھرم تو اس نے چھین ہی لیا ہے، میں اگر بابو جی کو دھوکا دے کر ان کے ساتھ رہوں گی تو میرے من کو کبھی شانتی نہیں ملے گی۔ مہاراج بہت بیاکل ہوں میں۔ اندر سے سلگ رہی ہوں، مر جاؤں گی اپنی آگ میں بھسم ہو کر...... مجھے مسلمان کر لو مہاراج۔ مجھے مسلمان کر لو......!'' وہ زار و قطار رونے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا۔
''اور اگر بابو مول چند تمہیں معاف کر دے، تمہیں اب بھی قبول کر لے تو......''
''بابو جی بہت اچھے ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ ایسا کر لیں گے مگر مہاراج میرا من شانت نہ ہوگا۔''
''کوشش کرنا......!''

''نہیں مہاراج۔ اگر آپ نے مسلمان نہ بھی کیا تو میں جوالا پور سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔ جوگن بن جاؤں گی، پھر میرا جو بھی ہوگا آپ کی وجہ سے ہوگا۔''

''میرے مذہب میں کسی کو مسلمان کرنا بہت بڑا کام ہے سوریہ کرن! مگر تمہارے حالات اور ہیں ممکن ہے بعد میں تمہیں احساس ہو کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

''نہیں مہاراج...... میں نے خود کو خوب ٹھونک بجا لیا ہے۔''

''اس کے بعد اور کچھ نہیں کہوں گا سوریہ کرن کہ آخری بار سوچ لو...... کوئی لا مذہب مسلمان ہونا چاہے اور ایک مسلمان اسے اس سے روکے تو یہ اس پر بہت بڑا گناہ ہے، میں یہ گناہ مول نہیں لینا چاہتا۔''

''یہ میرا آخری فیصلہ ہے مہاراج......'' وہ بولی۔

''تم کیا کہتے ہو مول چند؟''

''میں سوریہ سے ساری باتیں کر چکا ہوں مہاراج۔''

''اور اس کے خیال سے متفق ہو چکے ہو؟''

''ہاں!'' مول چند بڑے اعتماد سے بولا۔

''بس ٹھیک ہے۔ جاؤ سوریہ کرن! غسل کر آؤ اور جیسے میں بتاؤں ویسے غسل کرنا۔ میں نے اسے غسل کا طریقہ بتایا جسے سیکھ کر وہ چلی گئی۔'' میں نے تاسف بھری نظروں سے مول چند کو دیکھا اور کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا مول چند کہ میں تم سے کیا کہوں۔''

''وہ جو کچھ کر رہی ہے مہاراج وہ ٹھیک ہے۔''

''ہاں۔ میں تمہارے دل کی کیفیت کا بھی اندازہ کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ کچھ دیر کے بعد سوریہ کرن ایک سفید ساڑھی میں ملبوس میرے سامنے آ گئی۔ اس کے بال بھیگے ہوئے تھے، میں نے اسے سامنے بٹھا کر تین بار کلمہ پڑھایا اور اس کا اسلامی نام عارفہ مقرر کر دیا۔ پھر اسے دین کے ارکان سمجھانے لگا۔ مول چند نے کہا۔

''اب یہ کہاں رہے گی مہاراج......؟''

''موجودہ حالات کا تقاضا ہے مول چند کہ اسے کچھ عرصہ کی مہلت دے دو۔ کسی کو تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ یہاں رہیں گی، بعد میں کوئی حل سوچ لیں گے۔''

''جو حکم مہاراج۔'' مول چند راضی ہو گیا۔ اس کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔ مول چند مجھے مسجد تک چھوڑنے آیا۔ خاصی رات گزر چکی تھی، راستے میں اس نے کہا۔ ''اسے تو مکتی مل گئی مہاراج لیکن بھگوان نے میرے بھاگ میں نہ جانے کیا لکھا ہے۔ پورے جیون کی کہانی ختم ہو گئی۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ میں نے ہمدردانہ نگاہوں سے مول چند کو دیکھا۔ واقعی اس شخص کی زندگی تو بڑی عجیب ہو گئی تھی اور بھی بہت سے معاملات تھے، مثلاً یہ کہ جب یہ بات عام ہو گی تو لوگ اس سے کیا کہیں گے تاہم میں اس بے چارے کو اس سلسلے میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ مسجد کے دروازے پر مول چند نے مجھے چھوڑ دیا۔

''اچھا، اجازت دیں مہاراج......''

''ٹھیک ہے، جاؤ مول چند......'' میں نے جواب دیا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ اکرام میرا انتظار کر رہا تھا، مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کیا رہا......؟''

''بظاہر تو جو کچھ ہوا ہے اکرام! وہ برا نہیں ہوا، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔'' میں نے اکرام کو ساری تفصیلات بتا دیں اور اکرام خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ بہرحال وہ بے چارہ اس سلسلے میں کیا تبصرہ کر سکتا تھا۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے لیے جاگا تھا۔ ابھی اذان کا وقت ہونے میں دیر تھی کہ مسجد کے دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ ویسے تو کھلا ہوا تھا۔ نجانے دستک دینے والا کون تھا۔ مول چند ہی ہوگا کیونکہ وہ مسجد کے دروازے سے اندر نہیں آتا تھا،

میں نے پہلے ہی دن اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اس کے بعد اسے عادت نہیں رہی تھی۔ میں جاگ چکا تھا جبکہ اکرام سو رہا تھا۔ باہر آ کر دیکھا تو مول چند ہی تھا لیکن اس کے عقب میں سوریہ کرن بھی موجود تھی جسے اب میں عارفہ کہہ کر پکاروں گا، میں نے چونک کر دونوں کو دیکھا تو مول چند کہنے لگا۔

''مجھے پورا پورا احساس ہے مہاراج کہ آپ کے لیے ہم لوگ مصیبت بن گئے ہیں مگر جب کوئی مصیبت میں ہوتا ہے تو ایسے ہی سہارے تلاش کرتا ہے جو اس کی مصیبت کے ساتھی ہوتے ہیں، سو میں بھی آپ کے پاس آ گیا۔''

''خیریت تو ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟''

''مہاراج! میں نے ہندو ذات ہوں، آپ کے دھرم کی جگہ قدم نہیں رکھ سکتا مگر کیا سوریہ کرن میرا مطلب ہے وہ جسے آپ نے عارفہ کا نام دیا ہے وہ بھی مسجد میں نہیں داخل ہو سکتی؟'' مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا اور پھر میں نے جذباتی انداز میں مول چند کو اندر آنے کی اجازت دے دی اور کہا...... ''نہیں آؤ مول چند، میں نہیں کہہ سکتا کہ......'' میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا۔ عارفہ تو فوراً ہی اندر آ گئی تھی، جیسے اپنا حق سمجھتی ہو مگر مول چند ٹھٹھکتا ہوا اندر آیا تھا۔ میں نے اسے ایک مخصوص جگہ بٹھایا اور پوچھا...... ''اس وقت آنے کی یقیناً کوئی نہ کوئی خاص وجہ ہو گی؟''

''ہاں مہاراج......''

''کیا بات ہے؟''

''یہ کچھ کہنا چاہتی ہے آپ سے، آپ کو تو یہ پتہ ہی ہے کہ جب تک بات مکمل نہ ہو جائے میرے لیے بھلا سکون کہاں؟''

''کیا بات ہے عارفہ؟''

''شاہ جی! یہ بتائیے کہ جب میں مسلمان ہو چکی ہوں تو یہاں آپ کے چرنوں میں کیوں نہیں آ سکتی؟''

''یہ عبادت گاہ ہے اور عبادت گاہوں میں عورتوں کا گزر نہیں۔''

''مگر جب اس سنسار میں میرا کوئی نہ ہو، جب میں اس پورے سنسار سے الگ ہوں تو میں کہاں جاؤں، کیا آپ کے دھرم میں بھی عورت کے لیے کوئی پناہ نہیں ہے؟'' میں پُرخیال انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے تم وہاں کیوں نہیں رہنا چاہتیں؟''

''وہ جگہ اب میرے رہنے کے لائق نہیں ہے مہاراج، بالکل ہی من نہیں لگا وہاں، رات بھر پاگلوں کی طرح سوچتی رہی اور مجھے یہ محسوس ہوا جیسے من کی شانتی مجھے اب بھی نہیں ملے گی، مہاراج جو کچھ بھی کریں، جہاں بھی جگہ دیں مجھے تھوڑا سا سے تو اپنے پاس دے دیں، ویسے بھی آپ سے دھرم کی باتیں سیکھنا چاہتی ہوں۔''

''مگر ہمارے ہاں مساجد میں عورتیں نہیں رہتیں عارفہ۔''

''تو پھر مجھے بتائیے مہاراج میں کہاں جاؤں؟ سڑکوں پر ماری ماری پھروں، تھوڑا سا سے تو دے دیجئے مجھے۔ اتنا سے تو دے دیجئے کہ مجھے کہ من کی شانتی مل جائے، کچھ تو کر سکوں میں اپنے لیے مہاراج! آپ مجھے، تھوڑا سا سے یہاں دے دیں، کوئی بھی کونا بتا دیں پڑی رہوں گی۔'' میں نے پریشان نگاہوں سے اکرام کو دیکھا تو اکرام کہنے لگا۔

''وہ جو پرانا حجرہ خالی پڑا ہوا ہے، وہ صحن مسجد سے الگ تھلگ ایک گوشے میں ہے اگر آپ خاموشی سے اسے کچھ وقت کے لیے وہاں رہنے دیں تو میرا خیال ہے کہ کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے چونک کر اکرام کو دیکھا۔ بہرطور اکرام کم ہی کچھ ہی کچھ معاملات میں بولا تھا، اب جب وہ بولا تو مجھے اس کی بات بھی رکھنی تھی۔ چنانچہ میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے اکرام......تم کیا کہتے ہو مول چند؟''

''میرے لیے اب کہنے کو کیا رہ گیا ہے مہاراج، میں چلتا ہوں۔'' وہ اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ ہم دونوں ہی اس کے دل کا حال سمجھنے لگا۔ عارفہ کو اکرام کے بتائے ہوئے حجرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے اکرام سے کہا۔

''عارضی طور پر تو ٹھیک ہے اکرام، لیکن تم بعد کے عوامل پر بھی غور کرو، میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔''

''کیا بھیا؟''

'عارفہ کو کنور ریاست علی کے ہاں کیوں نہ بھیج دیا جائے، وہاں وہ پُرسکون رہ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔'' اکرام سوچ میں ڈوب گیا۔

مسئلہ واقعی پریشان کن تھا، اس کے بہت سے خراب نتائج بھی نکل سکتے تھے۔ اول تو مسجد میں کسی عورت کی رہائش ہی خطرناک تھی۔ پھر ایک ایسی عورت جو ہندو سے مسلمان ہوئی تھی، یہ سب کچھ ہنگامی طور پر ہو تو گیا تھا لیکن اب میں اور اکرم پریشان تھے۔

''اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے اکرام۔''

''کیا مسعود بھیا؟''

''کنور ریاست علی اسے اپنی تحویل میں لے لیں گے۔''

''منع تو بالکل نہیں کریں گے، لیکن.....'' اکرام کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''تو پھر میں کوئی پیغام لے کر جاؤں ان کے پاس۔ ہو سکتا ہے مغرب کی نماز میں نکل آئیں یا جیسے آپ کہیں۔''

''سوچ رہا ہوں کہ عارفہ سے بات اور کر لوں۔ اسے سمجھا دوں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ ایک دیوار کی طرف رُخ کئے دوزانوں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری طرف پشت تھی۔ دروازے کو اس نے کھلا رکھا تھا۔ ہماری آہٹ پر پلٹی پھر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ سر پر ساڑھی کا پلو برابر کر لیا۔

''عارفہ بہن! تم سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی؟'' وہ بولی

''وہی مسئلہ ہے۔ اصل میں عارفہ ہمارے مذہب میں واقعی عورت کو مسجد میں رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ بات کسی وقت بہت بڑا مسئلہ بن سکتی ہے۔ ہماری عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ بڑی مشکل سے رُکنے والے فسادات پھر سے جاگ اُٹھیں گے۔

✦✤✦✤✦

''مگر..... میں..... کوئی تو جگہ ہو میرے لئے۔ کیا نیا دھرم مجھے پناہ نہیں دے گا؟'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں۔ تمہارے بارے میں ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کیا؟''

''کنور ریاست علی کو تم جانتی ہو۔ بھرا پرا گھرانہ ہے ان کا، اور پھر جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ تم مسلمان ہو گئی ہو تو اتنا احترام ہوگا تمہارا ان کے گھرانے میں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ بعد میں ہم کوئی مناسب حل نکال لیں گے۔''

''نہیں، مہاراج نہیں۔ ایسا نہ کرو مہاراج۔ مجھے آپ کی پناہ چاہئے۔ میں ڈر کے مارے مر جاؤں گی۔ آپ اسے پوری طرح نہیں جانتے مہاراج، آپ اسے پوری طرح نہیں جانتے۔ یہاں اس جگہ، بس اس جگہ میں محفوظ ہوں ورنہ جب اسے یہ پتہ چلے گا کہ میں.....'' وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔ بُری طرح خوفزدہ تھی بے چاری۔ میں نے پریشان نگاہوں سے اکرام کو دیکھا تو اکرام نے کہا۔

''ٹھیک ہے مسعود بھائی۔ کچھ وقت گزر جانے دیں۔ آیئے چلیں۔'' ٹھیک ہے عارفہ تم آرام کرو۔ میں نے تعجب سے اکرام کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں، اور ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ اکرام بولا۔ ''تو پھر کیا ارادہ ہے، کیا فیصلہ کیا۔''

''اب تم ہی بتاؤ، کتنا وقت گزارنا چاہتے ہو۔ تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔''

''مم۔ میرے ذہن میں؟'' اکرام حیرت سے بولا۔

''تم نے اچانک اس کے پاس سے واپس آنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں سمجھا تم نے کچھ سوچا ہے۔''
''میں نے فیصلہ کرلیا؟'' وہ اور حیرت سے بولا۔
''تم نے کہا تھا نا کہ کچھ وقت گزر جانے دیں۔ اور پھر تم نے کہا تھا کہ آیئے چلیں۔''
''مم...... میں نے......!'' اکرام پریشان ہوگیا۔ اچانک ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ اکرام کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے کہے وہ الفاظ نہیں جانتا، کچھ سوچ کر میں نے پھر کہا۔
''ایک بات اور بتاؤ اکرام......''
''جی مسعود بھائی؟'' وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔
''تم نے عارفہ کے یہاں قیام کی سفارش بھی کی تھی۔ کیا تم نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ وہ جو پرانا حجرہ پڑا ہے، صحن مسجد سے الگ تھلگ اگر آپ خاموشی سے اسے کچھ وقت کے لئے وہاں رہنے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''
''خدا کی قسم مسعود بھائی۔ مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ نہ میں آپ کے سامنے بولنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔ چہ جائیکہ کسی کی ایسی سفارش۔''
''تب سب ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''لیکن مسعود بھائی۔''
''کچھ نہیں اکرام، میرا ابھی یہی خیال ہے کہ ابھی عارفہ کو یہیں رہنے دیا جائے۔''
مغرب کی نماز میں کنور صاحب بھی آئے تھے۔ نماز کے بعد کچھ دیر نشست رہی، پھر انہوں نے جوالا پور کے حالات بتائے۔
''آج تو پورے شہر کی دُکانیں کھلی ہیں۔ کاروبار بھی ہوئے ہیں، اب پولیس اپنا کام کررہی ہے۔''
''کیا......؟''
''جو پولیس کا کام ہوتا ہے۔ معلومات اور پھر پکڑا دھکڑی۔ میں نے کچھ لوگوں کو مقرر کردیا ہے کہ مسلمانوں کا خیال رکھیں۔ دو وکیل بھی ضمانتوں کے لئے حاصل کرلئے ہیں۔ انصاف ہونا چاہئے۔ بلوہ ہوا ہے انفرادی جھگڑا تو نہیں ہے کہ کسی کو نامزد کیا جائے۔ مگر پولیس کے مفادات کے بارے میں سب جانتے ہیں۔''
''بھائی چارہ کمیٹی کیا کررہی ہے؟''
''کام کررہی ہے۔ ہندو، ہندوؤں کو سمجھا رہے ہیں کہ کسی مسلمان کا جھوٹا نام نہ لیا جائے اور اثر ہوا ہے۔ ویسے ایک بات اور ہوئی ہے۔''
''کیا......؟''
''بے چارے بابو مول چند پر سے ہندوؤں کا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ بعض کھلم کھلا کہہ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا پٹھو ہے۔''
''ہاں اسے سب سے زیادہ نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں۔ بہرحال آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''
''آپ کے دم کی رونق رہنی چاہئے شاہ صاحب۔ ہمیں بس آپ کی ضرورت ہے......'' کنور صاحب کو میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ عارفہ کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ جو کچھ اکرام کے ذریعہ کہلوایا گیا تھا، وہ میرے لئے باعث اطمینان تھا۔ اکرام دونوں بار جو کچھ بولا تھا، وہ نہ اس کی زبان تھی نہ اس کے الفاظ، کوئی اور ہی بولا تھا اس کی آواز میں۔''
کنور ریاست چلے گئے۔ عشاء کے بعد مکمل فراغت تھی لیکن ساڑھے دس بجے ایک اور گل کھلا۔ اکرام نے بابو مول چند کو مسجد کے دروازے میں کھڑے دیکھا تھا...... وہ چونک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ میری نظر بھی اسی طرف اُٹھ گئی تھی...... میں بھی جلدی سے آگے بڑھا اور اس کے پاس آگیا۔ مول چند کے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آرہے تھے لیکن جس طرح وہ

کھڑا ہوا تھا، اس سے احساس ہوتا تھا کہ اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ وہ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

''شاہ صاحب، میں اندر آنا چاہتا ہوں۔'' عجیب سی آواز تھی، بڑا پُردرد لہجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے مہاراج کے بجائے شاہ صاحب کہہ کر پکارا تھا۔ یقیناً پہلی بار۔

''آؤ مول چند۔ میں تمہیں پہلے بھی اندر بلا چکا ہوں۔''

''ایسے نہیں شاہ صاحب۔ ایسے جیسے اسے یہاں جگہ ملی ہے۔''

''کسے؟''

''عارفہ کو......''

''کیا مطلب......؟''

''نہا دھو کر آیا ہوں۔ اسی ترکیب سے جو آپ نے اسے بتائی تھی۔''

''مول چند!'' میں شدید حیرت کے عالم میں بولا۔

''ہاں مہاراج، اکیلا رہ گیا ہوں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں، اب تو کوئی بھی میرا ساتھی نہیں ہے، کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا مہاراج، آپ ہی اپنا لیجئے مجھے......''

''یعنی کہ تم، یعنی کہ تم......''

''آپ کے دھرم میں آنا چاہتا ہوں شاہ صاحب۔ بتایئے کیا کروں دھرم ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر، کس کے ساتھ جیوں، وہ بھی آپ کی ہوگئی جس سے جیون بھر کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا، آپ کے چرنوں میں آ گئی وہ شاہ صاحب، مجھے بھی تھوڑی سی جگہ دے دیجئے، سچ کہہ رہا ہوں جگہ چاہتا ہوں آپ کے چرنوں میں پورے خلوص کے ساتھ ان تمام جذبوں کے ساتھ جو انسان کے دل میں جاگتے ہیں اور اس طرح میں ایک بار پھر اس کے قریب ہو سکوں گا، بڑا پریم ہے مجھے اس سے، بات ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کا من بھی صاف ہو جائے گا۔ سوچے گی وہ کہ اب نیا دھرم نیا کرم، نہ وہ وہ رہے گی اور نہ میں میں، لیکن یہ دھرم مجھے اس کا ساتھ دے دے گا، ساتھ دے دے گا مجھے اس کا......'' مول چند کا لہجہ اس طرح ٹوٹا ہوا تھا کہ میرا دل بھی بھر آیا اور میں غمزدہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اس سے کہا۔

''اندر آ جاؤ، اب تو تمہیں مول چند کہنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔'' مول چند میرے ساتھ اندر داخل ہوا لیکن نہ میں نے اور نہ ہی اکرام نے سوریہ کرن کو دیکھا تھا جو نجانے کس وقت اپنی جگہ سے نکل کر ہمارے عقب میں آ کھڑی ہوئی تھی، جیسے ہی مول چند نے آگے قدم رکھے اس نے ایک چیخ ماری اور روتی ہوئی مول چند سے لپٹ گئی۔ وہ مول چند کے قدموں سے اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی اور اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا، مول چند بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے قریب بیٹھ گیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔

''سوریہ، سوریہ، سوریہ کرن، ارے ارے سنبھال خود کو سوریہ، ارے کیا کر رہی ہے باؤلی، اری سوریہ، ناں ناں عارفہ، عارفہ یہ یہ تو سن، سن تو سہی، میرا تیرا اب کوئی سمبندھ نہیں ہے، عارفہ عارفہ۔''

''ہے مول چند، ہے بابو جی، پورا پورا سمبندھ ہے، ہائے مجھے کیا ہو گیا۔ ہائے میں تو کہیں کی بھی نہ رہی، ہائے میں ٹھیک ہوگئی، بابو جی میں ٹھیک ہوگئی، تمہاری سوگند، بھگوان کی سوگند، ٹھیک ہوگئی میں، بھگوان کی سوگند میں ٹھیک ہوگئی۔ ہائے رام یہ سب کچھ کیا ہو گیا تھا مجھے، کیا ہو گیا تھا۔'' میں اور اکرام پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سوگند، بھگوان، رام وہ ایک دم بدلی بدلی نظر آنے لگی تھی۔ مول چند اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے سوریہ کو سنبھالا، وہ وہیں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا۔

''پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے میرا، بھر چکا ہے میرے پاپوں کا گھڑا، اب کب تک، کب تک جھوٹ بولتی رہوں، ہائے

میرا اب بھی کوئی دوش نہیں ہے۔ میں اس پاپی کے پھندے میں ایسی پھنسی ہوں کہ، مگر سنیئے، سنیئے مہاراج، سنئے غور سے سنئے، ہوسکتا ہے ایسا سمے دوبارہ کبھی نہ آئے، بتانا چاہتی ہوں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں، سن لیجئے میری مہاراج، سن لیجئے، بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔"

"بھگوان نہیں عارفہ، اللہ کہو، اللہ......"

"کہوں گی، کہوں گی مگر اب سچے من سے کہوں گی، اب جو کچھ ہوگا سچے من سے ہوگا۔ اب تک جو ہوتا رہا ہے وہ سچے من سے نہیں ہوا۔ معاف کر دیں، معاف کر دیں، مجھے معاف کر دیں، شاہ صاحب مجھے معاف کر دیں، بڑی بھول ہوئی ہے۔ بڑا برا کام کیا ہے میں نے مگر آپ اللہ کی، بھگوان کی جس کی چاہیں سوگند لے لیں یا اس سے بڑی سوگند میں کسی اور کی نہیں کھا سکتی، اپنے بابو جی کی سوگند، اب میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچے من سے کہہ رہی ہوں اور آپ اس پر پورا پورا یقین کریں گے، پورا وشواس کریں گے مجھ پر......" میرے سر میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ عارفہ یا سوریہ کرن کے الفاظ کچھ اور ہی بتا رہے تھے، بات آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آتی جا رہی تھی مگر انتہائی حیران کن؟ ناقابل یقین، خود مول چند بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا، سوریہ کرن زار و قطار رو رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"اس پاپی نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا تھا، میں ہوش میں ہو کر بھی بے ہوش تھی۔ سب سمجھتی تھی مگر کچھ نہیں کر سکتی تھی، اپنے پتی سے پریم کرتی تھی میں، مگر میرا کلیجہ اس کی مٹھی میں تھا، اس کے بس میں تھی میں، پھر جب جوالا چوک پر اس کا منہ کالا ہوا تو وہ ترکیبیں کرنے لگا اور اسی نے مجھ سے کہا کہ میں مسلمان ہونے کا ڈھونگ رچاؤں اور یہ سب کچھ۔ مگر میرا پتی، میرا بابو جی، اس کا سفلی علم میرے بابو جی کے پریم کے آگے ہار گیا۔ میرا من ایک دم صاف ہوگیا۔ بابو جی مسلمان ہونا چاہتے ہیں، میرے لئے تو مہاراج مجھے بھی اب سچے من سے اللہ کی پناہ میں لے لو۔"

اچانک ہی میرے بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ اتنا شدید غصہ آیا مجھے کہ میرا دماغ تاریک ہوگیا۔ یہ سب کچھ مسجد میں ہو رہا ہے۔ اس نے مجھے اس طرح دھوکا دیا ہے، اللہ کے نام پر۔ میں نے سوریہ کرن کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد، سن لے سوریہ کرن، اور تو بھی سن لے گرج ناتھ سیوک۔ اس کے بعد اگر دین کے نام پر کوئی فریب کیا گیا مجھ سے تو، پہلے میں ان دونوں سے اپنی جنگ کا آغاز کروں گا۔ زندہ جلا دوں گا ان دونوں کو۔ پھر تیرے مایا منڈل آؤں گا اور کسی پر رحم نہیں کروں گا۔ کوئی رحم نہیں کروں گا۔ سوریہ، مجھ سے جھوٹ مت بولنا، ایک ایک لفظ سچ بتائے گی تو...... جو کہے گی سچ کہے گی۔ تو نے کلمہ پڑھا ہے میرے سامنے اور مرتد ہوئی ہے۔ تجھے قتل کرنا مجھ پر فرض ہے لیکن سنوں گا، تیری کہانی سنوں گا۔"

"نہیں شاہ صاحب۔ اب خدا کی قسم جس کا کلمہ میں نے پڑھا ہے جس نے مجھے میرا سنسار واپس کیا ہے، اس اللہ کی قسم، اس کے جال میں آ کر کلمہ پڑھا تھا۔ اب سچے دل سے پڑھ رہی ہوں۔ بالکل سچے دل سے، مجھے وہ میٹھے بول یاد ہیں۔ مجھے وہ سب کچھ یاد ہے۔ وہ کلمہ پڑھنے لگی۔ بار بار پڑھنے لگی۔ اس کی آواز میں تیقن تھا۔ کلمہ اس کے ہونٹوں پر سچ بن کر چمک رہا تھا اور بے اختیار بابو مول چند بھی کلمہ دُہرانے لگا۔ وہ دونوں آنکھیں بند کئے وجد میں کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہے تھے اور میں اپنے گرد آہٹیں محسوس کر رہا تھا۔ انجانی آہٹیں جو مجھے احساس دلا رہی تھیں کہ اس وقت میں اور اکرام ہی نہیں بلکہ دُوسرے گواہ بھی موجود ہیں۔ اس کا ثبوت وہ برتن تھا جو پہلے یہاں موجود نہیں تھا لیکن اب تھا اور اس میں کھجوریں بھری ہوئی تھیں۔ اکرام کی نگاہ بھی اس پر پڑی تھی اور اس نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر میں نے اسے خاموش کر دیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی، ان کے دل پگھل رہے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر ہوگئی۔"

"اکرام پانی لاؤ...... کنویں کا پانی لاؤ" میں نے کہا اور اکرام میری ہدایت پر کنویں سے پانی لے آیا۔ "عابد علی پانی پی لو۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں بابو عابد علی۔ یہ تمہارا اسلامی نام ہے۔ پانی پی لو......" میں نے کہا اور مول چند نے پانی لے لیا۔ "بسم اللہ کہو۔" میں نے کہا اور اس نے احترام سے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ بسم اللہ کہہ کر اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور آدھا پانی پی کر وہ رُک گیا۔ اس نے وہ پانی عارفہ کی طرف بڑھایا تو میں نے اسے روک دیا...... "نہیں...... تم دونوں

ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہو، غیر ہو اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن گھبراؤ نہیں۔ میں ناقص العقل ہوں، جو کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے وہ کر رہا ہوں۔ میں اسی وقت اسلامی طرز پر تمہارا نکاح کئے دیتا ہوں۔ اس طرح تم دونوں مسلمان میاں بیوی بن جاؤ گے۔ کہو تم تیار ہو؟''

''ہاں شاہ صاحب۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔ اکرام کو گواہ بنا کر میں نے آیات اللہ کے سائے میں دونوں کا نکاح پڑھایا اور وہ یکجا ہو گئے۔ میں نے کھجوریں تقسیم کر دیں، اور پھر میں نے کہا۔

''مجھے بے حد مسرت ہے عابد علی۔ اللہ نے اس طرح تم دونوں کو اسلام کی سعادت عطا فرمائی۔ اس طرح بہت سی مشکلات کے دروازے بند ہو گئے۔''

''یہی منو کا منالے کر آیا تھا شاہ صاحب!''

''آرزو کہو آرزو...... خیر اب اس کے بعد جو دُشواریاں پیدا ہوں گی، ان کا کیا کرو گے؟''

''دین کی روشنی میں سب کا مقابلہ کروں گا۔ اس کے ساتھ آپ کی رہنمائی درکار ہے۔''

''دونوں اپنی آرام گاہ میں، میرا مطلب ہے اپنے گھر جاؤ۔ ایسی جگہ منتخب کر لو جہاں عبادت بھی کر سکو یا آج رات میرے ساتھ نماز پڑھو اور ضروری باتیں سمجھ لو۔ پھر اس وقت تک جب تک مناسب موقع نہ آ جائے، اپنے مسلمان ہونے کا اظہار نہ کرو......''

''اللہ کے دین سے زیادہ اب مجھے کچھ عزیز نہیں ہے۔ اگر اس کے لئے جوالا پور بھی چھوڑنا پڑا تو چھوڑ دوں گا، کسی ایسی جگہ اپنی کٹیا بنا لوں گا جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔'' عابد علی بولا۔

''اِن شاء اللہ اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ سمجھداری سے حالات کا جائزہ لو، وقت خود عمل متعین کرے گا۔'' پھر یہ رات ان لوگوں کو ضروری ارکان سمجھاتے اور یاد کراتے گزری۔ فجر سے پہلے میں نے انہیں روانہ کر دیا۔ جاتے ہوئے عابد علی نے کہا۔ ''اس سے خطرہ رہے گا شاہ صاحب۔''

''درود پاک کا ورد یاد رکھنا۔ کچھ نہ بگڑے گا......!'' دونوں عقیدت سے گردن ہلا کر چلے گئے۔ رات بھر کی تھکن تھی لیکن دل سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ نماز فجر کے لئے تیاریاں کرتے رہے۔ پھر اس سے فراغت ہو گئی۔ ایک دن دو دن تقریباً سات دن گزر گئے۔ عارفہ اور عابد علی بھی پُرسکون تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ حالات بالکل پُرسکون ہیں۔ کاروبار جاری ہو چکے ہیں۔ گرج ناتھ کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ لیکن اس شام مغرب کی نماز میں پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ آج نمازی خصوصیت سے زیادہ تعداد میں آئے تھے۔ کنور۔ ریاست بھی خاص طور سے مغرب کی نماز میں پابندی سے آتے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد کنور صاحب نے کہا۔ ''حضور شاہ صاحب۔ کیا بات آپ کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔''

''خیریت کنور صاحب، کون سی بات؟''

''شیطان پھر جاگ گیا ہے۔''

''سیوک۔''

''جی...... ملعون سیوک۔''

''نہیں مجھے کچھ نہیں معلوم؟''

''دوپہر بارہ بجے جوالا چوک پر آ کھڑا ہوا اور اس نے یہاں کچھ اعلانات کئے ہیں۔''

''خوب، کیا؟''

''کہا ہے ہندوؤ اور مسلمانو۔ جوالا پور اکھنڈ بھوانی بن کر رہے گا۔ اب بات ہندوؤں کی ہے نہ مسلمانوں کی۔'' دونوں کو جوالا پور خالی کرنا پڑے گا۔ اب صرف یہاں کالی شکتی کے پجاری رہیں گے۔ جسے بھوانی کال کا پجاری بننا ہے، وہ مایا مکنڈ کے ساتھ رکھے ہوئے مٹکے سے گدھے کا پیشاب پیئے۔ اس مٹکے میں رکھے ہوئے پانی میں گدھوں کا پیشاب شامل ہے جو پینے

والے کو کنتا بھوانی کا داس بنا دے گا۔ جو یہ پانی نہ پیئے گا اس پر مصیبت نازل ہوگی۔ اگر اسے مصیبت سے چھٹکارا پانا ہے تو وہ جوالاپور سے بھاگ جائے۔ ورنہ اپنا کیا بھگتے گا۔ کئی بار اس نے یہ اعلان کیا اور پھر ایک کالے گدھے پر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ لوگوں نے مایا منڈل تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔

''اوہ..... خوب۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ سب آپ سے ہدایت حاصل کرنے آئے ہیں۔''

''اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔ صبر و سکون سے کام لیجئے۔ ہندوؤں کا کیا حال ہے۔''

''سخت سراسیمگی پھیل گئی ہے، بہت سے ہندو گھرانوں نے اور چند مسلمان گھرانوں نے رختِ سفر باندھ لیا ہے۔''

''باقی.....؟'' میں نے پوچھا۔

''مسلمان آپ سے راہنمائی کے منتظر ہیں۔''

''انتظار کیجئے۔ پردۂ غیب سے امداد ہوگی۔ ہم سب کا ایمان ہے۔ مجھے حالات سے باخبر رکھئے۔''

''بہتر ہے۔ ویسے سب لوگ پریشان ہو گئے ہیں کہ جانے بدبخت کیا ارادہ رکھتا ہے۔'' اس سے زیادہ نہ وہ کچھ کہہ سکے، نہ میں نے انہیں کوئی آس دلائی لیکن دوسرے ہی دن سے گرج ناتھ سیوک کی طرف سے عمل شروع ہو گیا۔ فجر کی نماز میں تو کوئی خاص بات پتہ نہیں چل سکی لیکن ظہر کی نماز میں بتایا گیا کہ رات بارہ بجے کے بعد سے بھورتی مندر کی طرف سے مٹھ بلند ہو رہے ہیں۔ جادو کی ہانڈیاں فضاؤں میں پرواز کر رہی ہیں اور ہر جگہ گر رہی ہیں۔ جوالا چوک پر چار ہانڈیاں پھوٹی ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور کھلیانوں میں بھی مٹھ گرے ہیں، ابھی تک کوئی ردعمل تو ظاہر نہیں ہوا۔ شام کو کنور صاحب نے بتایا کہ ان کے گھر پر ایک مٹھ گرا ہے۔

پھر دو دن کے اندر انتہائی ہیبت پھیل گئی۔ کوئی سو گھرانوں میں ایک انوکھی وبا کے بارے میں اطلاع ملی۔ ان گھرانوں کے دو دو، تین تین افراد اچانک شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور ان کے جسموں سے پیلا پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ ان کے جسم دیکھتے ہی دیکھتے لاغر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہسپتال اور پرائیویٹ کلینک مریضوں سے بھرتے جا رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحبان سر کھجا رہے ہیں کہ مرض کیا ہے اور علاج کیا ہے؟ مزید دو دن کے بعد خبر ملی کہ مرض کی وجہ دریافت ہو گئی ہے۔ یہ بخار چھوٹی چھوٹی مکڑیوں کے کاٹنے سے پھیل رہا ہے۔ یہ ننھی مکڑیاں اب ہر گھر میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ اس طرح کاٹتی ہیں کہ کوئی تکلیف نہیں ہوتی مگر کچھ ہی دیر کے بعد بخار چڑھ آتا ہے.....''

''پیلی مکڑیاں.....!'' اس خبر نے مجھے چونکا دیا۔ ''بھوریا چرن.....'' میرے منہ سے نکلا..... ! لیکن لیکن.....''

بھوریا چرن اس مسئلے میں کیسے آ گیا۔ گرج ناتھ سیوک تو بالکل ہی الگ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ تو خود کالے جادو کا ماہر تھا۔ اس کا بھوریا چرن سے کیا تعلق۔ اس دوران مجھے ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ان کے الگ الگ گروہ ہوتے ہیں۔ ہندو دھرم لاتعداد دیویوں اور دیوتاؤں کا مرکب ہے۔ ان میں ان کے عقیدے کے مطابق اچھے کرموں والے بھی ہوتے ہیں اور برے لوگ بھی۔ سارا نظام ناقابلِ یقین عمل اور جادو ٹونوں پر مشتمل ہے۔ کوئی کالی دیوی کا پجاری ہے تو کوئی بھوانی ماتا کا۔ کوئی گوردھن کو گردھاری مانتا ہے تو کوئی لونا چماری کا داس۔ سب کے پنتھ الگ الگ ہوتے ہیں۔ انہی میں سے کچھ اچھے عمل کو الٹ کر اسے کالے جادو میں بدل لیتے ہیں اور اس کے بعد ان کے دیوی دیوتا وہ نہیں ہوتے بلکہ سب کا مسلک شیطان سے جا ملتا ہے۔ کوئی کالکا کا سیوک ہوتا ہے تو کوئی لونا پنتھی کا۔ ہو سکتا ہے گرج ناتھ کا مسلک یا نشان مکڑی ہو یا ہو سکتا ہے وہ اسی ملعون سے رابطہ رکھتا ہو۔

دل میں ایک نیا تصور پیدا ہوا تھا۔ اگر گرج ناتھ کا کسی طرح بھوریا چرن سے تعلق ہے تو اس پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے تاکہ بھوریا چرن کا پتہ مل سکے اور بھوریا چرن کا پتہ ملے تو بے چاری ثریا کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ اکرام میرے ساتھ تھا لیکن مایوسی کے عالم میں۔ وہ اپنی بہن کی تلاش کے وسائل نہیں رکھتا تھا لیکن اس کا دل اس آرزو سے کب خالی ہوگا۔

عشاء کی نماز میں مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لوگ باغ میں بھی موجود تھے۔ خلاف معمول کنور ریاست علی بھی آئے تھے۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اتنی تعداد کیسے آئی ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد کنور ریاست علی نے کہا۔

''حضور شاہ صاحب۔ جوالا پور کے مسلمان سخت پریشان ہیں، رفتہ رفتہ پیلی مکڑیوں کی پھیلائی ہوئی بیماری ہر گھر تک پہنچ رہی ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب ہی اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے جسموں کا گوشت خشک ہو رہا ہے۔ ہر گھر سے آہ و بکا کی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ اس طرح گرج ناتھ سیوک کو کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ مسلمان مر جانا گوارہ کرتے ہیں لیکن گندا پانی پینے کو تیار نہیں ہوں گے لیکن بچوں کی بیماری نے سب کو نڈھال کر دیا ہے جب کہ بعض ہندوؤں نے نہ چاہنے کے باوجود بھوانی مکنڈل کے مٹکے سے غلیظ پانی پی لیا اور اس کا ردعمل حیرت ناک ہوا۔

''کیا......؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''وہ صحت یاب ہو گئے۔''

''ایسے لوگ کتنے ہوں گے؟''

''کوئی دس پندرہ گھرانے۔ حضور شاہ صاحب یہ سب پریشان ہیں اور بحالت مجبوری جوالا پور چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر اس طرح اس ناپاک کا مقصد پورا ہو جائے گا۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔'' میں نے کرب سے کہا۔

''شاہ صاحب۔ میری بیوی اور منجھلا لڑکا بھی اس بخار میں مبتلا ہو چکے ہیں۔'' کنور صاحب نے کہا۔

''کنور صاحب۔ رات بھر انتظار کر لیجئے۔ کل صبح کی نماز میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہاں آنے کی دعوت دیجئے۔ ان شاء اللہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

''حضور شاہ صاحب۔ ایک اور اطلاع بھی ملی ہے۔'' ایک دوسرے آدمی نے کہا۔

''کیا......؟''

''جادو کی ہانڈیاں جہاں جہاں گر کر پھوٹی ہیں وہاں کھیتوں اور کھلیانوں میں پیلی مکڑیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ اناج کھا رہی ہیں اور انہوں نے ٹڈی دل کی طرح اناج کی صفائی شروع کر دی ہے۔ مزید سبزیوں میں بدبو آنے لگی ہے اور وہ سڑنا شروع ہو گئی ہیں۔''

''کل صبح تک انتظار کریں آپ لوگ۔'' میں نے کہا۔

نمازی سست قدموں سے

واپس چل پڑے۔ کنور ریاست علی رکے رہے تھے۔ جب وہ تنہا رہ گئے تو بری طرح رو پڑے۔

''ارے ارے کنور صاحب۔''

''شاہ صاحب۔ بڑا سینہ تان کر ساری آفتوں کا مقابلہ کرتا رہا ہوں مگر اب ہمت پست ہونے لگی ہے۔ جو بچہ بیمار ہوا ہے وہ میرا سب سے چہیتا بچہ ہے۔ بچپن میں بیمار پڑ گیا تھا تو پورے ہندوستان کے مزارات پر لئے لئے پھرا تھا، بڑی منتیں مرادیں مانی تھیں، پھر کہیں جا کر خدا نے اسے صحت عطا فرمائی۔ ایک ایک لمحہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا رہا ہوں، بڑا کمزور بچہ ہے شاہ صاحب، میری ساری ہمت پست ہوئی جا رہی ہے، خدا کے لئے مجھے سہارا دیجئے۔ میں...... میں شاید اس دکھ کو برداشت نہ کر سکوں۔''

''حوصلہ رکھئے کنور صاحب، یقیناً اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہاں ذرا ایک بات تو اور بتایئے۔ کیا تازہ تازہ کسی موت کی اطلاع ملی ہے آپ کو۔ میرا مطلب ہے اس بخار سے......''

''نہیں، ابھی تک کوئی نئی اطلاع نہیں ملی۔''

''اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا، آپ صبح فجر کی نماز میں ضرور تشریف لایئے گا۔''

اکرام بھی ان باتوں کو سن رہا تھا اور اتنا ہی متفکر نظر آتا تھا جتنا کہ میں..... کنور ریاست علی کے چلے جانے کے بعد تشویش زدہ لہجے میں بولا۔

"اس طرح سب کچھ مٹی میں مل رہا ہے، بات ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں، انسانوں کی ہے مسعود بھائی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں نے بھی بڑی عقیدت سے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ جو لوگ مشکل کا شکار ہو کر بھٹک گئے ہیں وہ اپنی جگہ۔ لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ رفتہ رفتہ بہت سے لوگ اس ناپاک غلاظت کو پینے پر آمادہ ہو جائیں گے جو انہیں صحت دے رہی ہے۔"

"ہاں اکرام مجھے اندازہ ہے۔" میں نے مختصراً کہا اور ایسا انداز اختیار کیا کہ اکرام اس کے بعد کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا لیکن میرے دل میں بھی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی اور اب ضروری تھا کہ میں رہنمائی طلب کروں۔ اگر کچھ نہ بن پائے تو کم از کم صبح ہونے سے قبل جوالا پور چھوڑ دوں تا کہ ان لوگوں سے شرمندگی نہ ہو جنہیں میں نے صبح کی آس دلائی تھی۔

وضو کر کے مراقبہ کرنے بیٹھ گیا۔ درود پاک کا ورد کرتا رہا اور یہی میرا سب سے بڑا سہارا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہیں سے رہنمائی ملی تھی۔ دعا بھی کر رہا تھا کہ بار الٰہی جو منصب تو نے مجھے عنایت کیا ہے اس کی لاج رکھ، چوروں کی طرح منہ چھپا کر بھاگ جاؤں گا تو نہ جانے کتنے ایمان متزلزل ہو جائیں گے۔ میں تو تیرے ہی نام کے ساتھ ہر شخص سے کوئی وعدہ کرتا ہوں۔ تیری عنایتوں کی وجہ سے جو تو نے اب تک مجھ گناہ گار پر کی ہیں، انسانوں کی بھلائی کے لئے تجھ سے دعا مانگ رہا ہوں۔ میری مدد کرنا۔ یہ سلسلہ آدھی رات سے زیادہ تک جاری رہا۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اب کوئی احساس نہیں تھا۔ ہونٹ ہل رہے تھے، ذہن سو چکا تھا، آنکھیں نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں...... پھر میں نے ایک منظر دیکھا...... وہ کنواں جو اس وقت بھی وہاں موجود تھا، جب میں یہاں آیا تھا، میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اطراف میں پیلی پیلی مکڑیاں بج بجا رہی ہیں۔ زمین ان سے بھری ہوئی ہے اور وہ اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھر رہی ہیں۔ اکرام کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکال رہا ہے...... پھر اچانک ہی اکرام نے یہ دیکھا کہ مکڑیاں کنویں کی منڈیر پر چڑھنے لگی ہیں تو اس نے پانی کا بھرا ہوا ڈول مکڑیوں پر بہا دیا...... اور اس کا ردعمل بڑا ہی عجیب ہوا۔ وہ مکڑیاں پھول پھول کر کُپا ہو گئیں اور اس کے بعد پانی ہی کی طرح زمین پر بہہ گئیں، جہاں جہاں تک پانی کے قطرے پہنچے وہاں مکڑیوں کا صفایا ہو گیا اور دوسری مکڑیاں اس صاف جگہ کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اکرام نے تین چار ڈول پانی بہایا اور پیلی مکڑیوں کا کھیت ختم ہو گیا۔ باقی جو بچیں وہ بری طرح بھاگ نکلیں اور اسی وقت میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ میں چونک پڑا اور میں نے اپنے اطراف میں بکھرے ہوئے گہرے سناٹے کو دیکھا۔

اکرام کی یہ خوبی تھی کہ اگر میں جاگتا تھا تو وہ بھی جاگتا تھا۔ شاذ ہی ایسا ہوتا کہ وہ بے خیالی میں سو گیا ہو ورنہ وہ میرا پورا پورا ساتھ دیتا تھا، اس وقت بھی وہ مجھ سے کافی فاصلے پر دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سرخوشی کے عالم میں اسے آواز دی اور وہ اس طرح ہڑبڑا کر اٹھ گیا جیسے پاؤں میں سانپ نے کاٹ لیا ہو۔

میری خوشی بھری آواز کو اس نے محسوس کیا اور میرے قریب آ کر بولا...... "کیا ہوا، کیا ہو گیا مسعود بھائی......؟"

"ہماری رہنمائی ہو گئی اکرام۔ ہماری رہنمائی ہو گئی، یہاں جو بھی جگہ ہے وہ بھر دو اس پانی سے۔" اکرام حیران نگاہوں سے میرا منہ تک رہا تھا۔ میں نے اس کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اس کنویں کا پانی جوالا پور کے چپے چپے میں پھیلا دو، ہر گھر میں پہنچا دو۔ ہندو ہو یا مسلمان، جانور ہو یا کھیت کھلیان، ہر جگہ اس پانی کو پہنچا دو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ گرج ناتھ سیوک کو ایک بار پھر اپنا منہ کالا کرنا پڑے گا۔ آہ اکرام میرا جی چاہتا ہے کہ میں فوراً ہی یہ عمل شروع کر دوں۔ چلو ایسا تو کرو جتنے برتن ہیں وہ اس پانی سے بھر لو۔ صبح کو اس کنویں پر لاتعداد انسانوں کی یلغار ہو گی۔

اکرام نے عقیدت مندانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے انداز سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے اس کا پورا پورا یقین ہے اور اس کے بعد ہم مسجد میں وہ تمام جگہیں جہاں پانی ذخیرہ کیا جا سکتا تھا، بھرتے رہے یہاں تک کہ روشنی کی کرنوں نے فجر کے وقت کا اعلان کیا اور ابھی اذان بھی نہیں ہوئی تھی کہ لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ میں نے تحمل سے

کام لیا۔ میری ہدایت کے مطابق اس وقت رات سے بھی زیادہ افراد موجود تھے اور بڑے بے چین نظر آ رہے تھے۔ میں پر سکون تھا اور یہ سکون اس بات کی ضمانت تھا کہ جو چیز مجھے عطا کی گئی ہے اس پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

فجر کی نماز پڑھائی، لوگ منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے کہا۔ ''خوشخبری دیتا ہوں آپ لوگوں کو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا کرم فرمایا ہے۔ گندی قوتیں کلام الٰہی کے ایک بول کے سامنے اس طرح فنا ہو جاتی ہیں کہ ان کا نشان بھی نہیں رہتا۔ اس بدبخت نے جو گندگی یہاں پھیلائی ہے اس کا حل دریافت ہو گیا ہے، کنور ریاست علی صاحب آپ کو بڑی تنظیم کے ساتھ کام کرنا ہوگا، مجھے اس وقت بے شمار کارکنوں کی ضرورت ہے۔''

کنور صاحب پُرجوش انداز میں آگے بڑھے اور مجھ سے بولے۔ ''اس وقت جتنے افراد یہاں موجود ہیں شاہ صاحب، وہ سب میرے کارکن ہیں، آپ حکم فرمائیں۔''

''صحن مسجد کے اس کنویں کا پانی اس مرض کے لئے تریاق ہے جو غلاظت سے پھیلایا گیا ہے، جو بھی اسے استعمال کرے گا وہ شفا پائے گا اور کسی بھی قیمت پر اسے دوبارہ وہ مرض نہیں ہوگا۔ میرا وعدہ ہے..... اس پانی کو کھیتوں، کھلیانوں میں چھڑک دیجئے۔ ان تمام سبزیوں پر ڈال دیجئے جو سڑنے لگی ہیں، بچوں کو، عورتوں کو، مردوں کو سب کو پلایئے اور جو بے دین اسے قبول کرے اسے بھی دے دیجئے۔ غرض یہ کہ اس میں مذہب کی تفریق نہیں ہے بلکہ انسانیت کا معاملہ ہے اور ہر انسان کی زندگی کے لئے یہ پانی تریاق ہے۔ اب آپ اسے نکلوانے کا بندوبست کیجئے۔ برتنوں وغیرہ کی ضرورت بھی ہوگی اسے لے جانے کے لئے۔ بسم اللہ کر کے اپنے کام کا آغاز کر دیجئے گا۔ یہ چند برتن جو یہاں بھرے ہوئے موجود ہیں یا یہ پانی کی چھوٹی سی ٹنکی جو ہم نے بھر دی ہے، پہلے خالی کر لی جائے، بسم اللہ کیجئے۔''

اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگوں نے بھرپور عقیدت کے ساتھ سارے انتظامات کئے۔

بڑی بے ترتیبی پھیل جاتی اگر کنور ریاست علی اس سلسلے میں باقاعدہ منظم پیمانے پر کام نہ کراتے۔ لوگوں کو مسجد سے کافی دور پہنچا دیا گیا۔ ہر شخص کو ہدایت کی گئی کہ وہ برتن لے کر آئے، پانی اس تک پہنچ جائے گا۔ لائنیں لگ گئیں، ڈول سے پانی نکالنے والوں کے ہاتھ شل ہو گئے، ڈیوٹیاں بدلتی رہیں اور صبح سے لے کر دوپہر تک اتنا پانی کنویں سے نکالا گیا کہ یقین نہ آئے..... لیکن یہ بھی ایک بابرکت بات تھی کہ کنویں کا پانی کسی طور ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ مسلمان تو مسلمان، ہندو بھی برتن لے کر دوڑ پڑے تھے اور اس وقت مول چند کا باغ انسانوں کے لئے ایک سمندر جیسی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہر شخص برتن لئے وہاں موجود تھا اور کنور ریاست علی درجنوں لائنیں لگوا کر لوگوں کو برق رفتاری سے پانی فراہم کر رہے تھے۔ حالانکہ ابھی تک کسی کی شفایابی کی اطلاع نہیں ملی تھی..... لیکن اس عقیدت کے ساتھ تو ہر وہ کام ہو سکتا ہے جس کا تصور بھی ذہن میں نہ آ سکے۔ مجھے اب اس کے ردعمل کا انتظار تھا۔ یہ ایمان تو تھا میرا کہ جو کچھ مجھے عطا کیا گیا ہے اس میں کہیں بھی کوئی کھوٹ نہیں اور یہ صرف ایک تصور نہیں ہوگا کیونکہ بارہا اس کا تجربہ کر چکا تھا..... غرض یہ کہ پورا دن اسی ہنگامے میں گزر گیا۔ جوالا پور کا کون شخص تھا جو یہاں نہ پہنچا ہو، رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور آدھی رات کے قریب غالباً تمام جوالا پور میں پانی پہنچ گیا، پھر بھی چند افراد نے اجازت چاہی کہ اگر وہ رات میں بھی یہ پانی نکالیں تو کوئی ہرج تو نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک جوالا پور میں رہنے والا ایک ایک شخص شفایاب نہ ہو جائے، پانی حاصل کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کنویں کے پانی میں کمی نہیں ہوگی۔

اور یہی ہوا..... دوسرے دن صبح ہی کی نماز میں خوشیوں بھرے نعروں سے پتہ چلا کہ جس بچے، عورت، مرد، بوڑھے کو پانی پلایا گیا، اس کا حلیہ ہی تبدیل ہو گیا اور اب چاروں طرف عقیدت مندی کا یہ عالم ہے کہ کیا ہندو، کیا مسلمان، سارے کے سارے یہ پانی حاصل کرنے کے لئے چڑھ دوڑے ہیں۔ رفتہ رفتہ پھر ہجوم بڑھ گیا اور یہ سلسلہ تقریباً چار دن تک جاری رہا۔

ان چار دنوں میں..... میں اور اکرام بھی مصروف رہے تھے اور کوئی دوسری بات سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

پانچواں دن تھا، جوالا پور میں ایک بار پھر سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔ عابد علی یعنی سابق مول چند اکثر میرے پاس آتا رہتا

تھا اور مجھے تفصیلات بتاتا رہتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے گھر سے سارے دیوی، دیوتاؤں کے بت ہٹا دیئے ہیں، سارے ملازم نکال دیئے ہیں لیکن ابھی اس سلسلے میں کوئی چرچا نہیں ہوا کیونکہ لوگ اپنی ہی مصیبت کا شکار تھے، انہیں بظاہر کوئی مشکل نہیں ہے۔ عابد علی نے کہا۔

''شاہ صاحب میں چاہتا ہوں کہ باقاعدہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دوں اور اس کے بعد اس کا ردعمل بھی دیکھ لوں، یہ مناسب وقت ہے ورنہ ہو سکتا ہے جب لوگوں کی مصیبتیں ٹل جائیں تو ان کے عقیدے میں کمی آ جائے۔''

''باقاعدہ اعلان کرنا چاہو یا نہ کرنا چاہو عابد علی لیکن اپنے حلقے میں یہ کہنا شروع کر دو کہ تم مسلمان ہو گئے ہو، ردعمل تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ پانچویں رات کو...... یعنی اسی دن کی رات جس دن عابد علی نے مجھ سے ملاقات کی تھی، اکرام نے کہا۔

''مسعود بھائی ایک خیال میرے ذہن میں بار بار آ رہا ہے۔''

''کیا......؟''

''اس کم بخت ملعون کی جرأت چند لمحوں کے لئے ختم ہو گئی ہے۔ شکست تو اسے جوالا چوک پر بھی ہوئی تھی، جب اس کا جادو کا بت وہاں ایستادہ نہ ہونے دیا گیا تھا...... لیکن اس کے بعد اس نے عمل کیا۔ یقیناً سفلی عمل کے ذریعے اس نے وہ گندی وباء پھیلائی ہو گی...... اور اب جب کہ اس کا حل دریافت ہو گیا اور ایک بار پھر امن وسکون پھیل گیا تو آپ کے خیال میں وہ کیا کسی نئی کوشش میں مصروف نہیں ہو گا؟''

''میں نے اس خیال کو نظر انداز نہیں کیا ہے اکرام اور اس کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔''

''یوں تو جوالا پور والے بے چارے بے شمار حادثات کا شکار ہو چکے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ گرج ناتھ سیوک کو کوئی ایسا سبق نہ مل جائے کہ وہ جوالا پور چھوڑ بھاگے۔''

''ہوں، تم نے ٹھیک کہا اکرام۔ اس کے لئے کچھ سوچنا ہی پڑے گا بلکہ میرا خیال ہے کل کا دن میں اس کے لئے مخصوص کئے دیتا ہوں۔''

''کس کے لئے، کیا کریں گے آپ......؟''

''ذرا اس بھوانی مندر کی سیر کر لی جائے۔ ذرا دیکھیں تو سہی اس میں کیا کیا ہے......؟''

''آپ کو اس بات کا علم ہے کہ اس میں کوئی دروازہ نہیں بنایا گیا......''

''اگر اللہ کا حکم ہوا اور کوئی بہتری پیدا کرنی ہوئی اسے تو دروازے ہی دروازے بن جائیں گے اس میں اکرام......''

''ہاں یہ سچ ہے اور سمجھتا ہوں نہایت ضروری بھی کہ اس کے لئے کچھ کیجئے گا۔ کب جائیں گے آپ وہاں......؟''

''ایسی جگہوں پر جانے کے لئے دوپہر کا وقت مناسب رہتا ہے۔ میرا خیال ہے ٹھیک بارہ بجے مجھے وہاں پہنچ جانا چاہئے۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور کہا...... ''نہیں اکرام۔ ہر جگہ جانے کے لئے ضد نہیں کیا کرتے۔ میں تنہا ہی جاؤں گا۔''

اکرام فوراً ہی خاموش ہو گیا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ ضد کبھی نہیں کرتا تھا۔ اس رات کنور ریاست علی خان صاحب سے بھی اس موضوع پر بات ہوئی۔ ریاست علی کا تو چہرہ مجھے دیکھ کر فرط مسرت سے کھل اٹھتا تھا، بڑی عقیدت سے کہنے لگے۔

''آپ بھی عجیب ہیں شاہ صاحب، اس وقت یوں سمجھ لیجئے کہ جوالا پور کا ایک ایک شخص آپ کا پرستار ہے، آپ پر عقیدت سے جان نچھاور کرنے کے لئے تیار۔ ہر شخص اپنا سب کچھ دینے کے لئے آمادہ ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوؤں پر اس کا خاص طور سے اثر ہوا ہے۔ مول چند نے اپنا باغ تو آپ کو دے ہی دیا تھا جیسا کہ اس نے کہا...... لیکن میں سمجھتا ہوں

کہ اگر آپ جوالا پور کے ہندوؤں کو حکم دیں کہ اس باغ کے گرد ایک عمارت تعمیر کر دی جائے تو شاید وہ مول چند سے دوبارہ یہ باغ خریدنے پر آمادہ ہو جائیں اور اپنی جیب سے اس کی رقم ادا کریں۔''

''کنور صاحب اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کو ایک خوشخبری سنا دوں۔ ابھی تک تو میں نے اس بات کو صیغہ راز میں رکھا ہے...... لیکن مستقبل میں آپ کو عابد علی کی مدد کرنا ہوگی، ہوسکتا ہے اپنے مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد ان لامذہبوں کو پھر سے اپنا مذہب یاد آ جائے۔ بھولے تو وہ اب بھی نہیں ہیں اپنے مذہب کو لیکن خیر مسئلہ عابد علی کا ہے۔''

''کون عابد علی؟''

✦✦✦✦✦

''جو کبھی مول چند تھا......''

''کک کیا۔'' کنور ریاست علی خان اچھل پڑے۔

''ہاں خدا کے فضل سے وہ ایک ہفتے قبل مسلمان ہو چکا ہے، نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی سوریہ کرن جو اب عارفہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔'' میں نے کنور ریاست علی خان کو ساری تفصیلات بتائیں اور وہ آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔

''میں تو اسے اپنی اور جوالا پور کی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ اس بدبخت جادوگر کے مدمقابل ہیں جسے واقعی اگر موقع مل جاتا تو اس قسم کی وباؤں کے ذریعے وہ تو خدانخواستہ مسلمانوں تک کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کر دیتا یا پھر انہیں جوالا پور سے بے دخل کر دیتا۔ بہرطور یہ بڑی خوشخبری ہے، میں اگر اجازت ہو تو عابد علی سے مل لوں......؟''

''ابھی نہیں، کچھ وقت کے لئے رک جایئے۔ بہرحال مستقبل میں آپ کو اس کی مدد کرنی ہے۔''

''دل و جان سے حاضر ہوں، نہ جانے کتنے عرصے سے میری اور اس کی مخاصمت چل رہی تھی۔ میں نے کبھی اس کو اپنا ہم پلہ قبول ہی نہیں کیا اور وہ اس بات پر بہت تلملاتا تھا...... لیکن اب...... اب تو میرا اور اس کا دین کا رشتہ ہو گیا ہے۔ اتنا ہی محترم ہے میرے لئے جتنا میرا اپنا کوئی سگا بھائی۔ بہرحال شاہ صاحب اللہ نے آپ کو جوالا پور کے لئے نہ جانے کیا بنا کر بھیجا ہے، کبھی کبھی تو اس بات سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں آپ یہاں سے جانے کا فیصلہ نہ کر لیں۔''

''میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جانا تو مجھے ہے، جب اور جہاں کے لئے حکم ہو جائے، بھلا اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے، یہ تو وہاں کی باتیں ہیں جہاں سے وہ ساری چیزیں عنایت ہوتی ہیں جو میرے تصور سے بھی باہر ہیں لیکن جو مجھے عزت بخشیں اور میرے ذریعے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ تاہم یہ کنور ریاست علی خان سے کہنے کی بات نہیں تھی، البتہ میں نے ان پر اپنا مقصد ظاہر کر دیا۔

''کنور صاحب، گرج ناتھ سیوک بدستور موجود ہے اور اس کا خطرہ ابھی تک دور نہیں ہوا ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں، آج ہی پنڈت دوارکا ناتھ جو بڑے اچھے آدمی ہیں، اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے، کہنے لگے سفلی علوم کا ماہر اپنے بنائے ہوئے مندر میں خاموش نہیں بیٹھا ہوگا جس طرح وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیلی مکڑیوں کا بخار لایا تھا، اسی طرح اب وہ کسی نئی غلاظت کو مسلط کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شاہ صاحب سے کہیں کہ کوئی مستقل یا پائیدار حل نکالیں اس سفلی جادوگر کا، اسے فنا کر دیں کہ جوالا پور کے لوگوں کو اس سے نجات مل جائے۔''

''بہرحال ایسا کوئی دعویٰ تو میں بالکل نہیں کر سکتا کنور صاحب لیکن فیصلہ کر رہا ہوں کہ کل دوپہر بارہ بجے میں ذرا آپ کے باغ میں اس مایا منڈل کو بھی دیکھوں۔'' کنور ریاست علی کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا، چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہنے لگے...... ''آپ، آپ خود وہاں جائیں گے۔''

''ظاہر ہے اس شیطان کے گھر کو ذرا دیکھنا تو پڑے گا نا۔''

''تو میں سواری بھجوا دوں گا، میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور ہدایت فرمایئے۔''

''نہیں کنور صاحب، البتہ مجھے ایک کدال درکار ہوگی اور آپ وہ کدال مجھے فراہم کیجئے گا۔''

''میں خود آپ کے ساتھ چلوں گا، مجھے ہدایت دیجئے۔ اللہ کے کرم سے میں ڈرتا نہیں ہوں کسی سے، طویل عرصے پہلے کی بات ہے کہ ایک بزرگ نے مجھے ایک تعویذ دیا تھا اور کہا تھا کہ ہر آفت سے محفوظ رہوں گا، درحقیقت وہ بزرگ میری والدہ کو اپنی بیٹی کی مانند چاہتے تھے اور انہی کی درخواست پر انہوں نے یہ تعویذ مجھے لکھ کر دیا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس وقت سے اب تک ہر آفت سے محفوظ رہا ہوں اور مجھے پورا پورا تحفظ حاصل ہے کلام الٰہی کا، آپ اطمینان رکھئے، مجھے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔''

''پھر بھی کنور صاحب میرے نقطہ نظر سے آپ کا جانا مناسب نہیں ہے۔''

''جیسا آپ پسند فرمائیں، کدال لے کر خود ہی باغ کے دروازے پر حاضر ہوں گا۔'' میں نے اس بات سے انکار نہیں کیا۔ بہرطور اس کے بعد وقت گزرتا رہا۔ اکرام ذرا سنسنی کا شکار تھا اور کئی بار دبی زبان سے اس کا اظہار کر چکا تھا کہ کل کے سلسلے میں وہ میرے لئے تشویش زدہ رہے گا۔ میری واپسی کب تک ہو جائے گی وغیرہ۔ میں نے اسے تسلیاں دے کر کہا کہ اکرام میری جگہ مسجد تم سنبھالو گے۔ ظاہر ہے اس طلسم کدے میں جس کی ہلکی ہلکی معلومات مجھے عابد علی سے مل چکی ہیں، میں زیادہ وقت رکنا پسند نہیں کروں گا۔ جونہی میرا کام ختم ہوا یا اللہ کا جو حکم ہوا یا تو میں واپس آ جاؤں گا ورنہ تم صبر کر لینا اور میرے لئے دعائے مغفرت کرنا۔'' اکرام پریشان ہوا تو میں نے اسے صبر و رضا کی تلقین کی اور کہا کہ ہر چیز منجانب اللہ ہوتی ہے، جو ہو جائے اسے سچے مسلمان کی طرح اللہ کا حکم سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے۔ غرض یہ کہ میں نے اسے ہر طرح سے تسلیاں دیں اور پھر اپنے آپ کو بھی مضبوط کر لیا اور مقررہ وقت پر مسجد سے باہر نکل آیا۔ اکرام کو دوسری ضروری ہدایات میں نے دے دی تھیں۔ کنور ریاست علی خان صاحب بھی میرے سلسلے میں ہر لمحہ مستعد رہتے تھے لیکن ذرا سی الجھن اس وقت پیش آئی جب ان کے باغ میں داخل ہوا، بہت سے افراد کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ انہوں نے باقاعدہ اعلان نہ کرا دیا تھا ورنہ شاید مجھے باغ تک پہنچنا بھی نصیب نہ ہوتا، ویسے بھی بچ بچ کر ایسے راستوں سے آیا تھا جہاں لوگوں کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ عقیدت مند بہت سے تھے لیکن مجھے یہ عقیدت درکار نہیں تھی، جو صلہ مجھے مل سکتا تھا وہ تو مل ہی رہا تھا۔ کنور ریاست علی خان صاحب ایک نئی کدال لئے ہوئے خود کھڑے تھے، مجھے تمام لوگوں نے سلام کیا اور میں نے ان سے مصافحے کئے۔ کنور صاحب نے کدال مجھے پیش کر دی۔ میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ نے تو اس چیز کو ایک تقریب کی حیثیت دے دی کنور صاحب۔ بہتر یہ تھا کہ یہ بندوبست بھی میں خود ہی کر لیتا۔''

''میں کیا کروں آپ یقین فرمایئے صرف زاہد میاں سے ذکر کیا تھا کہ بات ان چند افراد تک پہنچ گئی۔ ایسی منت و سماجت کی انہوں نے کہ میں تو انکار نہیں کر سکا۔ بہرحال معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو اس سے ذہنی تکلیف ہوئی۔''

''اب آپ لوگ آرام کیجئے اور مجھے قسمت آزمائی کرنے دیجئے۔''

''آپ بسم اللہ کیجئے۔ ہم یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔''

بہرحال ان بے چاروں سے کیا کہتا۔ ظاہر ہے عقیدت ابل رہی تھی ان کے دلوں میں۔ کوئی سختی تو کر نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنے کام سے غرض تھی، خودستائی کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے وہ مندر گہری نگاہوں سے دیکھا جس کے بارے میں لاتعداد کہانیاں میرے علم میں آ چکی تھیں، عجیب و غریب قسم کی پتھریلی اینٹوں سے بنا ہوا تھا اور دیکھنے ہی میں بے حد مضبوط نظر آتا تھا۔ عقب میں کون ہے اور کس نگاہ سے مجھے دیکھ رہا ہے، اب یہ سارا تصور ذہن سے نکال دیا تھا۔ جانتا تھا کہ ایک بار پھر سفلی علم کے ایک ماہر کا سامنا ہے اور مجھے تمام تر توجہ اس کی جانب دینی ہے۔

مندر کی ایک دیوار کے قریب پہنچ کر رکا۔ بسم اللہ کہہ کر کدال اٹھائی اور پہلی کدال اس دیوار پر ماری۔ کدال بری طرح واپس گئی تھی جیسے کسی نے اسے پیچھے دھکیل دیا ہو یا جیسے وہ کسی ایسی ربڑ پر پڑی ہو جو اپنے اوپر پڑنے والی ہر شے کو اسی قوت سے واپس کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ میں نے کدال کو سنبھال لیا اور دانت بھینچ کر دوبارہ قسمت آزمائی کی۔ کدال کو جھٹکا تو

ویسا ہی لگا تھا جیسے پہلے لگا تھا لیکن اس بار میں نے اپنے ہاتھوں میں ایسی لچک رکھی تھی کہ وہ اس قوت سے واپس نہ آئے اور پھر کچھ اور بھی ہوا تھا۔ کدال کا نوکیلا سرا کسی چیز میں اٹکا تھا اور پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ میری ہمت بڑھ گئی اور پھر میں نے مسلسل کدال اسی نشان پر مارنا شروع کر دی۔ اب وہ نشان گہرائی اختیار کرتا جا رہا تھا اور میری ہمت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے مسلسل کوششوں سے ایک اچھا خاصا گڑھا پیدا کر لیا۔ پسینے میں تر ہو گیا تھا، اپنی محنت کا صلہ سامنے دیکھ کر کسی تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں مسلسل کدالیں برساتا رہا اور پہلا سوراخ اس دیوار میں نمودار ہو گیا بس یہیں سے دیوار کمزور ہو گئی اور میں اس کے نچلے حصوں پر طاقت آزمائی کرتا رہا۔ ہر کدال بسم اللہ پڑھ کر مار رہا تھا اور اس کا صلہ مجھے مل رہا تھا یہاں تک کہ اتنا بڑا سوراخ ہو گیا کہ میں اس سے اندر داخل ہو سکوں۔ میں نے سوراخ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور پھر کدال ایک جانب پھینک دی اور اپنا سر سوراخ سے داخل کر دیا۔ ہاتھوں کے زور سے میں اپنے جسم کو اندر لے گیا اور چند لمحات کے بعد میرے پاؤں دوسری جانب ٹک گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ میں سامنے دیکھتا، دفعتاً ہی شعلوں کا ایک طوفان آیا۔ اس تیز ہوا کے ساتھ کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میں نے سنبھل کر سامنے دیکھا۔ تین عظیم الشان مجسمے جو نہایت ہیبت ناک شکلیں اختیار کئے ہوئے تھے، میرے عین سامنے ایستادہ تھے اور ان کے منہ سے شعلوں کے مرغولے ابل رہے تھے۔ شعلوں کا یہ طوفان مجھے تین سمت سے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا، میں ساکت ہو گیا اور میں نے درود پاک کا ورد شروع کر دیا۔ شعلے مجھ تک نہیں پہنچ پا رہے تھے لیکن ان کی تپش مجھے اچھی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور ان بتوں کے قریب پہنچ گیا۔ سب سے سامنے والے بت کے منہ پر میں نے اپنی ہتھیلی رکھ دی ہر خدشے سے بے نیاز ہو کر اور مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے منہ سے شعلے نکلنا بند ہو گئے تھے لیکن دوسرے بتوں نے اپنی گردنیں گھمالی تھیں اور میرے جسم سے شعلے ٹکرا رہے تھے لیکن تپش کے باوجود یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ نہ تو میرے لباس میں آگ لگی تھی اور نہ یہ شعلے میرے جسم پر پڑ کر جلن کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ ایک طریق کار کامیاب ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک ایک کر کے ان دونوں بتوں کے منہ پر بھی ہاتھ رکھے اور شعلوں کی لپکتی زبانیں اندر چلی گئیں۔ تب میں نے ان کے درمیان سے نکل کر دوسرا منظر دیکھا۔ عظیم الشان ہال بنا ہوا تھا۔ اس میں قبر کے کتبوں کی مانند بت نصب تھے۔ چھوٹے بڑے، ننگ دھڑنگ ہیبت ناک شکلوں والے لیکن ان کی آنکھیں انسانی آنکھوں کی مانند چمک رہی تھیں، وہ سو فیصدی پتھر کے بت تھے۔ بس ان کے چہروں پر انسانی آنکھیں موجود تھیں جو گول گول ادھر سے اُدھر گھوم رہی تھیں اور گردش کر رہی تھیں۔ بے شمار آنکھیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں، میں نے دو قدم آگے بڑھائے تو بتوں کے ہاتھ بھی ہلنے لگے...... پھر مزید چند قدم آگے بڑھا تو ان کے درمیان پہنچ گیا اور وہ اپنی جگہ چھوڑنے لگے۔ پھر کہیں سے ایک چیخ کی آواز ابھری اور اس کے بعد چیخوں کا طوفان آ گیا۔ چاروں طرف سے وہ بت شور مچا رہے تھے اور اب ان میں بھاگنے دوڑنے کی صلاحیتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اس ہیبت ناک منظر نے بلاشبہ جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ میں اس خوفناک افراتفری کو دہشت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور میری آنکھیں ان بھاگتے دوڑتے جسموں پر جمی ہوئی تھیں جو عجیب افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے کو دھکیل دھکیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور پھر ان سب نے ایک طرف کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ پھیلائے اور بھرّا مار کر میری جانب دوڑ پڑے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ درود شریف میرا محافظ تھا۔ اللہ کے اس کلام سے مجھے اب تک جو کچھ حاصل ہوا تھا، اسے میں اتنی ہی عقیدت سے محسوس کرتا تھا جتنی میرے دل میں ہونی چاہئے تھی۔ بھاگنے والے مجھ تک پہنچے اور ہوا کے جھونکے کی مانند مجھ سے گزر کر دوسری جانب نکل گئے۔ ایک لمحے تک میں آنکھیں بند کئے رہا۔ وہ شور اچانک ہی معدوم ہو گیا تھا اور شور کے ایک دم ختم ہو جانے سے جو سناٹا پیدا ہوا تھا وہ بری طرح میرے ذہن کو متاثر کر رہا تھا۔ صحیح معنوں میں اس شور سے کانوں کے پردے نہیں پھٹ رہے تھے بلکہ اس سناٹے نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت بھی بحال ہونے لگی۔ مجھے کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اور یہ میری توقع سے مختلف نہیں تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ اب یہ پورا ہال نما حصہ سنسان اور سپاٹ تھا۔ وہ تینوں مجسمے بھی غائب ہو چکے تھے جو آگ اگل رہے تھے۔ وہ

دروازہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ چاروں طرف ایک ہیبت ناک سکوت طاری تھا۔ میں آہستہ آہستہ چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ایک اور قدم آگے رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں زمین میں دھنسنے لگا ہو، میں گرتے گرتے بچا تھا۔ گرنے سے بچنے کے لئے میں نے ہاتھوں کا سہارا لیا تو یوں محسوس ہوا جیسے زمین گندھے ہوئے آٹے کی طرح نرم ہو، میں پھرتی سے سیدھا کھڑا ہو گیا لیکن میرے پاؤں ٹخنوں ٹخنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ میں اچھل کر پیچھے کی سمت آیا جہاں سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا لیکن اب یہ زمین بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی تھی ایک لمحے کے لئے لیکن دوسرے لمحے یہ حیرانی ذہن سے مٹ گئی، جو کچھ بھی نہ ہو جاتا کم تھا۔ اب یہ پورا ہال ایک نرم مٹی کا بنا ہوا ہال تھا جس میں جہاں بھی پاؤں رکھتا وہاں مٹی دھنسنے لگتی تھی۔ میں بار بار اچھل کر اپنی جگہ تبدیل کرتا رہا تاکہ میرے پاؤں اس سے زیادہ زمین میں نہ دھنسیں لیکن یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر ایک منٹ بھی کسی ایک جگہ کھڑا رہا تو شاید اس نرم مٹی میں دفن ہی ہو جاؤں۔ پریشانی کے کچھ لمحات پیدا ہو گئے تھے میرے لئے، میں نے لمبی لمبی چھلانگیں بھی لگائیں لیکن کسی بھی جگہ اپنے پاؤں نہ جما سکا۔ پھر اچانک ہی میرے بدن میں ایک پھریری سی اٹھی اور اس بار جب میں ابھر کر زمین پر گرا تو اس خوداعتمادی کے ساتھ کہ اب میرے پاؤں زمین میں نہیں دھنسیں گے اور خدا نے اس خوداعتمادی کی بھی لاج رکھی۔ میرے پاؤں واقعی اس نرم زمین پر ٹک گئے تھے۔ چند لمحات، میں اسی جگہ کھڑا رہا۔ دفعتاً ہی میری نظر سامنے کی سمت اٹھ گئی۔ وہ گندھے ہوئے آٹے جیسی زمین ایک جگہ سے گومڑے کی شکل میں بلند ہو رہی تھی اور یہ گومڑا ابھرتا ہی چلا جا رہا تھا، پھر اس کا اوپری حصہ پھٹا اور اس میں سے ایک انسانی سر نمودار ہوا۔ بدہیئت اور بدنما، میں اسے دیکھ چکا تھا۔ یہ گرج ناتھ سیوک تھا جو زمین پھاڑ کر برآمد ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ اس طرح ہلے بغیر اوپر ابھرتا آ رہا تھا جیسے کسی مشینی عمل کے ذریعے اوپر ابھر رہا ہو۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں غضب ناک تھیں۔ منہ وحشت سے پھٹا ہوا تھا اور چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''مایا مکنڈ میں آیا ہے پاپی، ہتھیارے، مایا مکنڈ میں آیا ہے۔ جا نہیں سکے گا واپس۔ اب دیکھوں گا تجھے، اب دیکھوں گا کون سی مہان شکتی ہے تیرے پاس۔'' میں نے مسکراتی نگاہوں سے گرج ناتھ کو دیکھا۔ پھر کہا۔

''تیرے اس مکنڈل کے راستے میرے لئے تو کھل گئے گرج ناتھ۔ میرے راستے تو نہ رک سکے۔''

''ارے یہ کون سی بڑی بات ہے۔ بس اسی پر اترا رہا ہے تو......!''

''تیری کنتا بھوانی بھی جوالا چوک پر استھان نہیں کر سکی تھی۔'' میں نے کہا۔

''بس۔ اسی پر تو نے خود کو مہان سمجھ لیا۔''

''تیرے بیر بھی بھاگ گئے۔'' میں مسلسل اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''چنتا مت کر۔ سارے حساب چکتے ہو جائیں گے آج۔''

''تو کیا چاہتا ہے گرج ناتھ۔ یہاں جوالا پور میں تو کیا چاہتا ہے۔''

''اکھنڈ بھوانی۔ اکھنڈ بھوانی بنانا چاہتا ہوں اسے۔ یہاں سب بھوانی داس ہوں گے۔ سونے کا جوالا پور ہو گا۔ یہی بات ہے میرے من میں۔ نہیں میاں جی۔ تم کچھ بھی کر لو...... چلے گی نہیں تمہاری۔''

''ٹھیک ہے پھر وار کر گرج ناتھ۔ میں تیری قوت دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اچانک وہ جس طرح ابھرا تھا اسی طرح زمین میں غروب ہو گیا۔ لیکن میں نے زمین کو عجیب انداز میں متحرک دیکھا، وہ برق رفتاری سے زمین کھودتا ہوا ایک لکیر کی شکل میں آگے بڑھا اور عین میرے سامنے ابھر آیا لیکن میں تیار تھا۔ جیسے ہی اس کا سر زمین پھاڑ کر برآمد ہوا، میں نے ایک زوردار مکا اس کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ پھر زمین میں گم ہو گیا اور زمین کے نیچے بھونچال آ گیا۔ وسیع و عریض ہال میں ابھری ہوئی لکیریں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں اور میں گھوم گھوم کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دوسری بار وہ پھر میرے بالکل قریب ابھرا۔ اس بار میری لات اس کے منہ پر پڑی تھی۔ وہ پھر زمین میں گم ہو کر ساکت ہو گیا پھر مجھ سے دس گز کے فاصلے پر

اچانک زمین پھٹی...... لیکن اس بار وہ انسانی شکل میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ یہ انتہائی ہیبت ناک شکل کا غیر انسانی وجود تھا جس کے درجنوں ہاتھ پاؤں تھے۔ بڑے بڑے اوپر کو اٹھے ہوئے کان، گیند کے برابر گول گول سرخ آنکھیں تھیں۔ لمبے لمبے دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے انسانی آواز میں ایک عجیب سے اشلوک پڑھے۔

''نشنت شورانن پر بھاگوتریان۔ ات ماتنترا سردھا سدھات۔'' اس کے ساتھ ہی اس کے سارے ہاتھ بلند ہو گئے اور میں نے دیکھا اس کے تمام ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار آ گیا۔ کسی میں تیز دھار کی انیوں والا سات کونوں کا ستارہ، کسی میں مڑا ہوا خنجر، کسی میں تلوار، کسی میں ترشول، کسی میں چھوٹا سا نیزہ۔ وہ لاتعداد ہتھیاروں سے مسلح ہو گیا، پھر وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کی گول سرخ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

''بسم اللہ'' میں نے خود بھی سنبھل کر کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ مجھ پر براہ راست حملہ آور ہو گا لیکن میرے منہ سے لفظ ''بسم اللہ'' نکلتے ہی پٹاخے جیسی ایک آواز بلند ہوئی اور اچانک ہی زنجیروں جیسی کھنکھناہٹ ابھری، ساتھ ہی ایک تیز چنگھاڑ۔ وہ جھک کر اپنے پیروں کو دیکھنے لگا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے ہی میری نگاہ اس کے پیروں پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پیروں میں لوہے کے دو بڑے بڑے حلقے آ گھسے تھے جن میں موٹی زنجیریں تھیں جو اسی زمین میں دفن تھیں۔ وہ بری طرح اچھلنے کودنے لگا۔ شاید وہ خود کو ان حلقوں سے آزاد کرا رہا تھا۔ اسی کوشش میں وہ ایک بار زور سے اُچھلا تو زمین پر گر پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ زنجیریں اور تنگ ہو گئیں۔ اس کے حلق سے کسی درندے جیسی غراہٹیں نکلنے لگیں۔ وہ زور زور سے چنگھاڑنے لگا۔ سارے ہتھیار ایک ایک کر کے ہاتھوں سے گر گئے۔ وہ الٹا اپنی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ تمام ہاتھوں سے وہ ان فولادی حلقوں کے جوڑ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اس کے پیروں سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ تھکتا جا رہا تھا اور میں بالکل خاموش کھڑا دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ پھر وہ چند لمحات کے لئے زمین پر لیٹ کر ساکت ہو گیا۔ اس وقت اسے اس کی شکست کا احساس دلانا غرور کے الفاظ ہو سکتے تھے، اس لئے میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر ساکت رہ کر وہ پھر اٹھا اور بیٹھ گیا۔ وہ کراہ رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''جے پدم شنکھا۔ جے پدما پدم ہاری۔ جے شنکھ شنکھاری۔ تیرا داس ہار رہا ہے۔ ایک ملچھ کے ہاتھوں ہار رہا ہے۔ میرے کرنت سماپت ہو گئے ہیں۔ اب مجھے تیری سہائتا چاہئے۔ پدم شنکھا۔ پدم شنکھا۔ شنکھ شنکھاری۔'' ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ میں دبا سنکھ منہ سے لگا کر پھونکنا شروع کر دیا۔ سنکھ کی بھیانک آواز ابھرنے لگی اور اچانک مایا کنڈ کے اس ہال کی چھت میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ چند پتھر نیچے گرے لیکن مجھ سے دور...... اور اس کے ساتھ ہواؤں میں شور، سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ گرد و غبار کا ایک مرغولہ چھت میں ہونے والے سوراخ سے نیچے اتر رہا تھا۔

گہرا مٹیالا غبار گرج ناتھ سیوک سے کوئی دو گز کے فاصلے پر جمع ہونے لگا۔ مجھ سے اس کا زیادہ فاصلہ تھا۔ میں دلچسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس میں سے ایک انسانی بدن نکل آیا اور میں نے ہونٹ بھینچ کر گردن ہلائی۔ بھوری مکڑیوں کے حوالے سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ گرج ناتھ سیوک کا تعلق کسی نہ کسی طرح بھوریا چرن سے ہے اور اب مفلوج ہو کر اس نے پدم شنکھا کو پکارا تھا۔ اس وقت بھی مجھے اس کا خیال آیا تھا اور بھوریا چرن آ گیا تھا لیکن اس کا رُخ گرج ناتھ ہی کی طرف تھا۔

''جے شنکھا۔'' گرج ناتھ نے مسرور لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا رے تجھے۔ یہ کیا ہے گرجے؟'' بھوریا چرن کی آواز اُبھری۔

''پیچھے دیکھ شنکھا۔ پیچھے دیکھ۔'' گرج ناتھ نے کہا اور بھوریا چرن چونک کر پلٹا۔ اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر جو کچھ ہوا اس کی مجھے اُمید نہیں تھی۔ بھورے مٹیالے غبار کا وہ مرغولہ جو شنکھا کی سواری تھا اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا جہاں سے بھوریا چرن نمودار ہوا تھا۔ بھوریا چرن نے اس میں چھلانگ لگا دی اور مرغولہ ایک تیز جھکڑ کی شکل اختیار کر کے اچانک ایک زناٹے کے ساتھ اُوپر اُٹھا اور چھت کے سوراخ سے باہر نکل گیا۔ بھوریا چرن اس طرح دُم دبا کر بھاگ جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ماحول صاف ہو گیا، تب میں نے گرج ناتھ کو دیکھا اس کی آنکھیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ چند لمحات تڑپا اور

پھر ساکت ہوگیا۔ اس کے ساکت ہوتے ہی ایک سنسناہٹ سی اُبھرنے لگی...... میں نے مایا منڈل کے در و دیوار لرزتے ہوئے دیکھے۔ ان سے مٹی جھڑنے لگی تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ طلسمی عمارت زمین بوس ہو رہی ہے۔ اب یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے باہر کا رُخ کیا اور کچھ لمحات کے بعد میں باہر نکل آیا۔ مگر باہر کا منظر دیکھ کر میں مبہوت ہوگیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا جوالا پور کنور ریاست علی خاں کے باغ کے سامنے جمع ہوگیا ہو۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب وہاں جمع تھے اور لطف کی بات یہ تھی کہ خاموش کھڑے تھے۔ مایا منڈل کے سامنے کی دیوار سب سے پہلے گری تھی اور جونہی میں برآمد ہوا، اچانک فضا میں آواز اُبھری۔

''نعرۂ تکبیر......''

''اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔''

مسلمان جوش سے دیوانے ہوگئے تھے۔ ہندو خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ میرے باہر آتے ہی مندر کا ایک ایک حصہ گرنے لگا اور لمحوں میں پوری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ یہ کالے جادو کی شکست تھی۔ ہندوؤں کے ایک ٹولے نے جس کی رہنمائی پنڈت رام اوتار کر رہے تھے آگے بڑھ کر ''مہاراج کی جے، مہاراج کی جے، کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ پنڈت رام اوتار نے کہا۔

''خاموش ہو جاؤ بھائیو۔ خاموش ہو جاؤ۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' سب خاموش ہوگئے۔ ''جوالا پور کے باسیو۔ ہندو اور مسلمانو! جوالا پور انسانوں کی بستی ہے۔ پرکھوں سے ہم یہاں رہتے آئے ہیں۔ ہمارے درمیان دھرم کا نہ سہی بھائی چارے کا رشتہ تو ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وہ پاپی کالے دھرم والا نہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ وہ تو شیطان کا پجاری تھا اور جو کچھ کیا تھا اس نے، شیطانی عمل تھا۔ ہم کالے جادو کے اثر میں آگئے تھے۔ جان علی کی مسجد والے مولوی صاحب نے اس کی شکتی ختم کر کے صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہندوؤں کا بھی بھلا کیا ہے۔ ہم ہندو بھی ان کا احسان مانتے ہیں اور ان کی جے جے کار ہمیں بھی کرنے دو......''

''مسجد والے مہاراج کی جے۔ مسجد والے مہاراج کی جے۔'' ہندو نعرے لگانے لگے۔ میں ساکت کھڑا تھا۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا۔ مگر جوش میں ڈوبے لوگوں کو میں کیسے روک سکتا تھا۔ اسی وقت لوگ کسی کو راستہ دینے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ہجوم میں سے کنور ریاست علی خاں آگے آگئے۔ انہیں دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا تھا۔

''دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں شاہ صاحب۔ اللہ کے نام کا بول بالا ہوا۔''

''مگر یہ سب کنور صاحب......''

''بخدا کسی کو کچھ بتایا نہیں گیا۔ رفتہ رفتہ آپ کے یہاں آنے کی خبر پھیلتی گئی۔''

''یہ سب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ غیر مناسب ہے۔ صرف اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ میں کیا میری اوقات کیا......''

''بے شک مانتا ہوں لیکن ان لوگوں کی عقیدت کا کیا کریں گے آپ انسان تو بہت ہی کمزور اور معصوم شخصیت کا مالک ہے، آپ دیکھئے مسجد کے کنویں کے پانی سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کو بھی اتنا ہی فائدہ پہنچا ہے اور بات وہی انسانیت والی آجاتی ہے۔ بے شک دین دھرم بہت بڑا مقام رکھتے ہیں لیکن انسانی کمزوریوں کو بھی تو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مقام اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو بخشا ہے کہ اس وقت یہ لوگ اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ نے جوالا پور کے آسمان سے کالی نحوست کا نشان مٹا دیا ہے، بڑا کشت و خون ہوا ہے، یہاں دیوانگی طاری ہوگئی تھی لوگوں پر لیکن میرا خیال ہے کہ اب یہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا اور مسعود شاہ صاحب خدا آپ کو طویل عمر عطا کرے بھلا جوالا پور والے آپ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔''

''مم...... مگر میں کیا کروں، یہاں تو بڑا ہجوم ہے مجھے یہاں سے نکالئے کنور صاحب۔''

''آپ کی ایک آواز ان لوگوں کو منتشر کر دے گی۔ میری التجا ہے کہ ان سے کچھ الفاظ کہہ دیجئے، میں اعلان کئے دیتا

ہوں۔"

"کیا کہوں میں ان سے؟"

"کچھ بھی جو آپ کا ذہن قبول کر لے۔ میں خود بھی اتنا ہی پُرجوش ہو رہا ہوں۔" کنور ریاست علی کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولے۔ بہر حال یہاں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اُٹھائے اور لوگ اس طرح خاموش ہو گئے کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے جائے۔ میں نے کہا۔

"جوالا پور کے رہنے والو! ہندو اور مسلمانو! آپ سب لوگوں کو کالے جادو کے ایک ماہر کے تسلط سے نجات مبارک ہو اور باقی ہر شخص کو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قصور کسی کا نہیں تھا، شیطان کو بہرطور قوتیں عطا کی گئی ہیں اور وہ اپنے شیطانی عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ جیسا پنڈت رام اوتار نے کہا کہ کالا دھرم نہ ہندوؤں کا ہے نہ مسلمانوں کا، وہ اور ہی تھا اور آپ لوگوں نے بھی دیکھ لیا کہ ایک وقت ایسا آیا جب اس نے نہ ہندو کی پروا کی، نہ مسلمان کی بلکہ کالے علم سے سبھی کو نقصان پہنچایا۔ اللہ کے کلام میں جو برکت ہے اس کا سہارا لے کر میں نے اللہ کے نام کے ساتھ اس سے جنگ کی اور نتیجے میں وہ ہلاک ہو گیا، آپ سب اطمینان رکھیے اب وہ آپ کو پریشان کرنے کے لئے دوبارہ اس دُنیا میں نہیں آسکے گا۔ اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے آپ کی کچھ خدمت کی ہے تو اس کا صلہ مجھے اس طرح دیجئے کہ بھائی چارے کی فضا پیدا کر کے اپنی اپنی زندگی گزاریئے۔ مسلمان اپنے مذہب کے مطابق عبادت کریں، ہندو اپنے مذہب کے مطابق اور مل جل کر رہیں۔ بس یہی عرض کرنا چاہتا تھا میں آپ سے۔ اب براہ کرم اپنے اپنے گھروں کو جایئے اور نئے انسانوں کی طرح اپنی زندگی گزاریئے، بس اب جایئے میری التجا ہے کہ آپ لوگ اب منتشر ہو جایئے۔" مجمع برق رفتاری سے چھٹنے لگا۔ کنور ریاست علی خاں مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے، لوگ آہستہ آہستہ چلے گئے اور پھر میں بھی کنور ریاست علی خاں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ کنور صاحب کہنے لگے۔

"میں تو ان لمحوں کو کوستا ہوں جب آپ میرے پاس آئے تھے اور میں نے آپ کی ناقدری کی تھی۔ پتہ نہیں آپ اور خدا مجھے معاف کریں گے یا نہیں۔"

"کیا اب بھی اس کی گنجائش ہے کنور صاحب، ہمارے آپ کے درمیان تو بڑی دوستی ہو گئی ہے؟" میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے مسکرا کر کہا اور کنور صاحب نے عقیدت سے جھک کر میرے ہاتھ چوم لیے۔

"لفظ دوستی تو مجھے آسمان میں بلند کرنے کے لئے کافی ہے، مجھے تو اگر آپ خادم کی حیثیت سے بھی قبول کر لیں تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہو گی۔"

"جذباتی نہ ہوں کنور صاحب، کچھ ذمے داریاں اللہ کے حکم سے بندوں کے سپرد بھی کر دی جاتی ہیں اور مجھے یہ اعزاز بخشا گیا تھا کہ یہاں اس گندے علم والے کے خلاف جنگ کروں، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوں میں اور اگر آپ نے اپنی عقیدت کے سہارے مجھے ضرورت سے زیادہ اعزازات بخشے تو آپ یقین فرمایئے میرے لئے تکلیف دہ ہوں گے، بس انسانوں ہی کی مانند میرے ساتھ سلوک کیجئے، آپ کی محبت اتنی ہی کافی ہے میرے لئے۔"

کچھ دیر کے بعد ہم مسجد آ گئے۔ کنور صاحب نے کہا۔ "حضور چند لمحات لے سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں تشریف لایئے فرمایئے۔"

اکرام اندر موجود تھا اور اس بے چارے کو ساری صورت حال شاید معلوم بھی نہیں تھی، وہ ہمارا انتظار ہی کر رہا تھا، کنور ریاست علی کہنے لگے۔ "حضور مجھے یہ گستاخی کرنی تو نہیں چاہئے لیکن جو دل کو لگی ہے اسے زبان تک لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ جوالا پور میں طویل عرصے قیام فرمائیں؟ میں کسی قدر اُلجھی ہوئی نگاہوں سے کنور ریاست علی کو دیکھنے لگا، پھر میں نے کہا۔"

"کنور صاحب، جوالا پور میں انسان ایک مشکل کا شکار تھے۔ میری خدمات یہاں کام آئیں، نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ

کہاں جاؤں، براہ کرم مجھ سے کوئی وعدہ نہ لیجئے، ابھی یہاں مقیم ہوں، کبھی چلا جاؤں خاموشی سے تو اسے میری بے وفائی تصور نہ فرمائیے گا اور نہ ہی وعدہ شکنی، بس یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے کوئی ذمے داری سونپی گئی تھی۔"

کنور صاحب نے عقیدت سے گردن ہلائی اور بولے۔ "میں سمجھتا ہوں لیکن حضور ابھی تک مجھے کسی خدمت کا موقع عطا نہیں کیا گیا۔"

"اس کا تصور بھی نہ کیجئے۔ میں نے آپ سے عرض کر دیا تھا کہ میری ضرورتیں اللہ کے حکم سے پوری ہو رہی ہیں، ہاں اگر کہیں کوئی مشکل پیش آئی تو وعدہ کرتا ہوں کہ آپ ہی کو زحمت دوں گا۔"

"اس کے لئے میں انتہائی شکر گزار ہوں۔" کنور ریاست علی چلے گئے تو اکرام متجسس انداز میں میرے سامنے آ گیا۔

"کیا ہوا مسعود بھائی؟"

"اللہ کے حکم سے وہ شیطان فنا ہو گیا۔" میں نے جواب دیا اور اکرام خوشی سے لرز گیا۔

"زندہ باد، زندہ باد مجھے تو پہلے ہی یقین تھا، تو وہ بالکل ختم ہو گیا۔"

"ہاں اور کنور صاحب کے باغ میں وہ بھوانی کنڈ جو بن رہا تھا، وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو مسلسل کامیابیاں عطا فرمائے۔"

پھر ہم معمولات میں مصروف ہو گئے، لوگوں کی عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ جو شاید کم ہی نماز پڑھتے ہوں گے، یہاں باقاعدہ نماز پڑھنے آنے لگے اور میری درخواست پر وہی بزرگ جنہوں نے روزِ اوّل تمام افراد کی امامت کی تھی، امامت کرتے رہے۔

دو تین دن تک کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو قابل ذکر ہو، میں منتظر تھا کہ اب دیکھئے مجھے یہاں سے کب اور کہاں روانگی کا حکم ملتا ہے۔ رفتہ رفتہ باتیں سمجھ میں آتی جا رہی تھیں، جو ہدایت مجھے ملنا ہوتی تھی، اس کا ذریعہ کسی نہ کسی شکل میں نکل آتا تھا۔ جیسے جوالا پور آنا اس سے پہلے کے چند واقعات، غرضیکہ کام اسی انداز میں چل رہا تھا۔ تیسرے دن البتہ ایک دلچسپ صورت حال پیش آئی۔ کوئی ساٹھ ستر افراد باغ کے کنارے پہنچ گئے۔ وہ مسجد کے قریب نہیں آئے تھے بلکہ انہوں نے اپنا ٹھکانہ الگ بنایا تھا، پنڈت رام اوتار ان کی رہنمائی کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے اور انہوں نے اسحاق احمد نامی ایک شخص کا سہارا لیا تھا، پتہ نہیں کیوں یہ مسئلہ کنور ریاست کو نہیں پیش کیا گیا تھا۔ اسحاق مسجد میں داخل ہوا، مجھے سلام کیا اور کہا۔ "حضور، کچھ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، پنڈت رام اوتار کی رہنمائی میں وہ یہاں آئے ہیں، کیا آپ انہیں شرف ملاقات بخشیں گے۔ میرا نام اسحاق احمد ہے۔"

"آؤ اسحاق احمد، اگر انہیں مجھ سے کوئی کام ہے تو ضرور چلتا ہوں۔"

میں ان ساٹھ ستر افراد کے درمیان پہنچ گیا، سبھی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا لئے تھے، پنڈت رام اوتار بھی آگے بڑھ آئے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں مہاراج آپ کو پریشان کیا، مگر ان لوگوں کی پریشانی بھی بہت بڑی ہے۔ یہ آپ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔"

"ہاں ہاں کہئے پنڈت جی، کیا حکم ہے میرے لئے؟"

"مہاراج یہ سب بڑی پریشانی میں پڑ گئے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حالات سے گھبرا کر مایا منڈل کے سامنے رکھے ہوئے مٹکے سے وہ پانی پی لیا تھا جو ناپاک تھا، انہیں فوراً ہی آرام مل گیا تھا لیکن اب بات یوں ہو گئی ہے کہ ہندوؤں نے انہیں اپنے دھرم سے نکال دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ یہ کالے دھرم والے ہیں، انہیں جوالا پور چھوڑنا ہو گا۔ کوئی بھی ان کے ساتھ رعایت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس وقت بے چارے پریشانی میں سوجھ بوجھ کھو بیٹھے تھے لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ لوگ انہیں اچھوت بنا کر چھوڑے ہوئے ہیں اور ہر طرح کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں ان کی، اب یہ آپ سے

مدد مانگنے آئے ہیں، دوسری صورت میں انہیں جوالا پور چھوڑنا ہوگا، پنچایت نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ آپ اگر ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں مہاراج تو کر دیجئے۔" دفعتاً ہی میرے دل میں ایک خیال آیا، عابد علی اور عارفہ یاد آ گئے تھے۔ بہرطور اس نیکی سے گریز نہیں کر سکتا تھا، میں نے پنڈت رام اوتار سے کہا۔ "آپ ہندو دھرم کے ایک محافظ ہیں پنڈت جی، آپ ان کی سفارش کیجئے ان لوگوں سے جو انہیں ہندو دھرم سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں بتایئے کہ انسانی کمزوری نے انہیں مجبور کر دیا تھا ورنہ شاید یہ ایسا نہ کرتے۔"

"میں ہی کیا، بڑے بڑے لوگ یہ باتیں ایک دوسرے سے کر چکے ہیں مہاراج، مگر کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، شاید آپ کی بات مان لیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہیں وہ مقام کبھی نہیں مل سکے گا جو یہ کھو چکے ہیں۔" میں نے ان سب کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا آپ کے بال بچے بھی آپ سے اختلاف رکھتے ہیں؟"

"نہیں مہاراج، ان بے چاروں کے لئے ہی تو ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ بس مت ماری گئی تھی، تقدیر کو یہ سب کچھ کرنا تھا ہمارے ساتھ، سو ہو گیا، اب ہمارا اپنے دھرم میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"تو پھر پنڈت رام اوتار جی آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں وہ کہوں جو میرے دل میں ہے؟"

"ارے رام رام، ہم اجازت دیں گے آپ کو مہاراج......" پنڈت رام اوتار نے کہا۔

"میں انہیں اپنے دین میں خوش آمدید کہوں گا۔ اگر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب ان کا اپنے دھرم میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اگر یہ چاہتے ہیں کہ جوالا پور ہی میں رہیں اور انسانوں کی طرح رہیں تو پھر میں انہیں مسلمان ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔" رام اوتار نے محبت سے مجھے دیکھا۔ دیر تک سوچتا رہا پھر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مہاراج۔"

"ضرور رام اوتار......"

"مہاراج۔ ان کے شریر گندے ہو چکے ہیں۔ یہ ادھرمی ہو چکے ہیں، کالے جادو کی گند ان کے شریر میں دوڑ رہی ہے۔ کیا آپ کا دھرم اس کے باوجود انہیں سویکار کرے گا۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "ہاں رام اوتار جی۔ اس کی وجوہ ہیں۔"

"ہم جاننا چاہتے ہیں۔"

"انسانی وجود تو مٹی ہے رام اوتار جی۔ مٹی سے بنا، مٹی میں جا ملا۔ اس میں ہے کیا۔ گندگی ہی گندگی۔ صرف رُوح ہے جو اسے پاک صاف رکھتی ہے۔ رُوح نکل جائے دو دن رکھ کر دیکھ لو، پاس کھڑے نہ رہ سکو گے۔ اسلام رُوح کا دین ہے۔ اس میں رُوح کی پاکی کو اوّل مقام دیا گیا ہے۔ اگر رُوح پاک ہے تو جسم بھی پاک ہے۔ پھر ہمارا دین رام اوتار جی انسانی کمزوریوں کو بھرپور تحفظ دیتا ہے۔ گناہ کی معافی ہے۔ غلطیوں کے لئے عفو ہے۔ سچے دل سے انحراف گناہ کر لو۔ معافی کا امکان ہے۔ مقصد یہ کہ ہمارے دین کا معاملہ رُوح کی سچائی سے ہے۔ اگر یہ سچے دل سے کلمہ پڑھ لیں تو عام مسلمانوں میں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔"

"ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔" وہ سب بول پڑے۔

"ٹھیک ہے مہاراج۔ ان کا بھی یہ پرکھوں کا ٹھکانہ ہے۔ پھر جو آپ کہہ رہے ہیں اس سے تو کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب آپ کو مانتے ہیں۔"

"تو پھر تیاریاں کیجئے۔ میں چاہتا ہوں کوئی اختلافی مسئلہ نہ پیدا ہو۔"

"آپ جو حکم دیں مہاراج وہی ہم کریں۔" رام اوتار بولے۔

"اب یہ ذمے داری آپ ہم پر چھوڑ دیں رام اوتار جی۔" میں نے کہا اور وہ تیار ہو گئے۔ اتنی بڑی سعادت حاصل ہو

رہی تھی مجھے۔ میں لاچار گناہ گار بھلا یہ حیثیت کہاں رکھتا تھا لیکن اللہ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ کنور ریاست علی خاں کو بلا بھیجا۔ وہ تو سچے ہی میرے دیوانے، ایک تقریب ہی منا ڈالی انہوں نے۔ دیگیں چڑھوا دیں۔ تمام گھرانوں کو باغ میں بلوا لیا۔ سب کا کھانا کیا۔ ہندو خاموش تھے کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا لیکن کوئی شریک بھی نہیں ہوا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر سابق مول چند اور موجودہ عابد علی نے بھی مع اپنی بیوی سب کے سامنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور یہ مقدس رسم بخیر و خوبی سرانجام پا گئی۔ کنور صاحب بھی بے حد خوش تھے۔ انہوں نے ان نو مسلم گھرانوں کے سارے مسائل نبٹانے کا وعدہ کر لیا تھا۔

اسی رات، رات کے کوئی دو بجے تھے۔ کچھ عجیب سی تھکن سوار تھی۔ گہری نیند سو گیا تھا۔ اچانک کسی نے پاؤں پکڑ کر زور سے ہلایا اور میں چونک کر جاگ گیا۔

"باہر کوئی بلا رہا ہے۔" آواز سنائی دی اور میں ہڑ بڑا کر اُٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر اکرام سو رہا تھا۔ جگانے والا نظر نہیں آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا محسوس ہوا جو آگے بڑھ رہا تھا۔ الفاظ بھی سنے تھے میں نے، پاؤں پر لمس کا احساس بھی تھا۔

❖❖❖❖❖

سوتے ہوئے ذہن نے چند لمحوں میں کوئی فیصلہ کیا۔ لیکن پھر فوراً اپنی بات سمجھ میں آ گئی۔ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے میں نے جلدی سے آنکھیں بھینچ کر ذہن کو جھٹکا اور پھر مسجد کے دروازے کی جانب چل پڑا۔

بالکل درست بات تھی۔ باہر میں نے ایک بیل گاڑی دیکھی ایک آدمی بھی اس میں سوار تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ کر بیل گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا اور میں نے بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کیا، جواب میں وعلیکم السلام سنائی دیا اور پھر اس شخص نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ، طلبی ہوئی ہے، چلو آ جاؤ دیر نہ کرو....." ایک عجیب سا تحکمانہ انداز تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو ذہن سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر کسی احساس نے گاڑی میں لا بٹھایا۔ بیل گاڑی ہانکی جانے لگی تھی..... اور میں اپنے ذہن سے نیند کے اثرات دُور کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیل گاڑی چلانے والے کی صورت دیکھنا چاہی لیکن پتہ نہیں بینائی میں کوئی فرق آ گیا تھا یا پھر آنکھیں رات کی تاریکی کی وجہ سے صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں لگا پا رہی تھیں۔ بیل گاڑی ہانکنے والے کے خدوخال ایک بار بھی واضح نہیں ہو سکے، سیدھا سادا سا معمولی سا لباس بدن پر تھا اور وہ اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔ میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ زیادہ تجسس بھی بہتر نہیں ہوتا، مدھم مدھم روشنیاں گھروں سے جھانک رہی تھیں اور رات کے اس پہر کا صحیح اندازہ ہو رہا تھا۔ انسان کی فطرت میں تجسس بے پناہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ضرورت سے زیادہ تجسس بھی مسائل کا باعث بن جاتا ہے، جس غیر متوقع انداز میں یہ سب کچھ ہوا تھا، اس نے کچھ دیر تک تو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ پھر گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ میں نے اپنا ذہن آزاد چھوڑ دیا۔ جوالا پور کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں، اب دونوں سمت کھیت تھے اور ان کے درمیان ایک پگڈنڈی پر یہ گاڑی چل رہی تھی، کوئی ڈیڑھ گھنٹے یہ سفر جاری رہا۔ بدن کو خوب جھٹکے لگے اور ہوش و حواس اب بالکل بیدار ہو گئے۔ گاڑی چلانے والا بالکل خاموش تھا، میں نے بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ پھر کافی فاصلے پر درختوں کے جھنڈ نظر آئے اور ان کے درمیان مدھم مدھم روشنی، عجیب سی سفید روشنی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ گاڑی کا رُخ اسی جانب تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر رُک گئی۔ لوگ محسوس ہو رہے تھے، سفید سفید سائے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں بھی گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور گاڑی والا میری رہنمائی کرتا ہوا درختوں کے جھنڈ کے بیچ لے گیا مجھے..... یہاں ایک جگہ صاف ستھری کر کے اس پر قالین بچھایا گیا تھا اور میرے پہنچنے کے بعد وہاں گردش کرتے ہوئے تمام سائے گول دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے گردنیں جھکا لی تھیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا ان کے درمیان پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو اچانک ہی ایک شخص نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک دیا۔

''نہیں یہ قطب اور اَبدالوں کی محفل ہے، تم ان کے درمیان نہ بیٹھو، تمہاری جگہ ان کے عقب میں ہے، خاموشی سے انہی کی مانند بیٹھ جاؤ۔'' میں نے ان الفاظ پر غور کیا اور ہدایت کے مطابق بیٹھ گیا۔ قطب اور ابدال...... میں نے دل ہی دل میں سوچا، بڑے مرتبے ہوتے ہیں۔ بھلا میرا ان کے درمیان کیا دخل، تاہم دوزانو بیٹھ کر گردن اسی انداز میں خم کر لی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے ان بند آنکھوں میں بہت سے مناظر روشن ہو گئے ہوں۔ میں نے ان تمام سایوں کو کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ مدھم مدھم آوازیں کانوں میں اُبھر رہی تھیں اور گفتگو کی جا رہی تھی۔ پھر چند افراد میری جانب متوجہ ہوئے اور ایک شخص نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہ تم قطب ہو اور نہ ابدال...... اور یہی تجویز کیا گیا ہے تمہارے لئے کہ ابھی رکنیت اختیار کئے رہو، ایک کارکن کی قدر و قیمت بھی بہت ہوتی ہے اور جو تجویز کیا جائے وہی زیادہ بہتر کہ ترک دُنیا کے لئے بہت کچھ ترک کرنا پڑتا ہے لیکن بُرا نہیں کہ دُنیا سے تمہارا تعلق رہے۔ ہاں جو ذمہ داریاں سونپی جائیں ان کی انجام دہی کے بعد ہی منزل مل سکتی ہے۔ سو ذمہ داریاں نبھانے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے، وقت مختصر نہیں ہوتا، سوچ مختصر ہوتی ہے، عمل طویل اور عمل طویل سے گزرے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ لیکن ترک دُنیا کرنا چاہو تو آرزو کرنا اور نہ چاہو تو نقصان نہیں، تمہارا واسطہ چند افراد سے ہے اور جہاں سے ابتدا ہوئی وہاں واپسی لازم ہوگی اور اس کے بعد چھوڑنا چاہو گے تو قبول کیا جائے گا، وہ بھی فیصلے کے بعد اور عمل کی گنتی گن کر...... چنانچہ تمہارے لئے طے پایا کہ جہاں ذمہ داریاں سونپی جا رہی ہیں وہاں تمہاری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جو تم سے زیر ہوئے بے شک لیکن وہ ابھی حیات ہے، تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے، سات کھونٹے گاڑے ہیں اس نے اور یہ ساتوں کھونٹے اُکھاڑنے ہیں تمہیں کہ ذمہ داریاں تم پر سے کم کر دی گئی تھیں جو پوٹلیاں تم نے اپنی حماقت سے خود پر چڑھا رکھی تھیں، وہ ایک گندی رُوح کا شکار ہو گئیں اور تم خوش قسمتی سے اپنے وقت کی طوالت کو کم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن وقت مختصر نہیں ہوتا اور تمہیں اس طوالت سے گزرنا ہے۔ وہ سات کھونٹے رفتہ رفتہ تمہارے سامنے آئیں گے اور یہ تمہارا فرض ہوگا کہ انہیں اکھاڑ پھینکو، بڑی بڑی باتیں ہی نہیں چھوٹے چھوٹے کام بھی ہوتے ہیں اور صرف بڑے ہی کاموں کی طرف توجہ دینا بالکل غیر مناسب۔ سو یوں کرو کہ چل پڑو اور اسے ساتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کم از کم اس وقت تک جب تک کہ ایک شیطان اس کا پیچھا کر رہا ہے، تمہیں اس کی مدد کرنی ہے۔ اسے بچائے رکھو اور جو چھوٹے چھوٹے ضرورت مند تم تک پہنچیں ان کی ضرورت میں کام آؤ لیکن خاموشی سب سے بہتر ہوتی ہے اور تمہیں ہر کام خاموشی ہی سے کرنا ہے۔ خبردار کسی ستائش سے نڈھال نہ ہو جانا کہ وہیں سے برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ہاں دلوں کو رکھنا بھی ایک عبادت ہے، اس سے گریز نہ کرنا اور جو دل میں آئے اسے زندہ رکھو، ابھی تمہیں قتل کی اجازت نہیں ملی ہے، اس کے لئے تو بڑے مدارج طے کرنا ہوتے ہیں، بس اتنی ہی ذمہ داریاں تھیں تمہاری۔ واپسی میں وہ جگہ چھوڑ دو اور ضروری نہیں ہے کہ تم اس کا اعلان کرو کہ لوگ معصوم ہوتے ہیں اور عقیدت وسیع، لیکن اس میں کچھ برائیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں اور تمہیں اس سے گریز کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ بس اب واپسی اور نہ سمجھ پائے ہو تو سمجھا دیا جائے گا کہ ابھی طالب علم ہو اور علم کے سمندر سے ایک قطرہ بھی حاصل نہیں کر سکے، تاہم جو فرض پورا کر رہے ہو، اس کا صلہ ضرور ملتا ہے، سو ملے گا۔ بس اب جاگ جاؤ۔''

مجھے زوردار جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے اچانک ہی بلندی سے نیچے گر پڑا ہوں۔ اسی طرح دوزانو بیٹھا ہوا تھا لیکن آنکھوں کے سامنے نہ وہ جھنڈ تھا اور نہ وہ روشنی اور نہ ہی اَبدالوں کی محفل بلکہ جہاں مسجد میں سویا تھا وہی جگہ تھی اور کچھ فاصلے پر اکرام نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر دل و دماغ سنبھالتا رہا۔ دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ذہن میں وہ ہدایات تازہ کرنے لگا جو دی گئی تھیں۔ یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ فیصلہ کیا کہ فجر کی نماز سے فراغت حاصل ہوتے ہی سفر کا آغاز کر دوں گا۔ فجر کی اذان دی تو اکرام جاگ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نمازی آنے شروع ہو گئے، نماز پڑھی اور پھر اکرام کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''اکرام یہاں سے چلنا ہے۔''

''کہاں مسعود بھائی؟''

''اللہ کی زمین وسیع ہے۔''

''بے شک لیکن کب؟''

''اب سے چند لمحات کے بعد۔''

''اوہ، تیاریاں کروں؟''

''تیاریاں کیا کرنی ہیں۔ بس اٹھیں گے اور چل پڑیں گے۔''

''ان لوگوں کو اطلاع نہیں دیں گے۔''

''مناسب نہیں ہے اکرام۔ ان کی محبتیں بے پایاں ہیں۔ میں انہیں نہ سنبھال پاؤں گا۔''

''یہ تو درست ہے۔'' اکرام نے کہا۔ نمازی ایک ایک کر کے چلے گئے اور میں اکرام کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ پھر ایک سمت اختیار کر کے ہم تیز رفتاری سے چل پڑے۔ ذہن آزاد چھوڑ دیا تھا، رفتار تیز تھی چلتے رہے دوپہر ہو گئی۔ دھوپ چلچلا رہی تھی۔ گرمی کے مارے بدن جلا جا رہا تھا۔ ایسی شدید پیاس لگ رہی تھی کہ چکر آنے لگے تھے۔ پھر یک بیک اکرام نے کہا۔

''وہ، وہ مسعود بھائی۔ وہ۔'' میں نے اس کے اشارے پر نگاہ دوڑائی۔ بہت دُور گہرائیوں میں کچھ درخت نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُدھر رُخ کرنے سے احتراز نہیں کیا۔ لیکن کافی فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ خدا کی قدرت کا تماشا نظر آیا۔ درحقیقت اسے چشمۂ حیات کہا جا سکتا تھا۔ بے آب و گیاہ چٹانوں میں انسان سے اللہ کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ ایک چٹان سے چشمہ رِس رہا تھا اور پتھریلی شفاف گہرائیوں میں ننھی سی جھیل ہلکورے لے رہی تھی۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ تہہ کے پتھر تک نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں تاڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ پیلے پکے تاڑ کے پھل دُور دُور تک زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ اکرام نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''اللہ کی ملکیت ہے اور ہمیں اجازت ہے۔'' پانی پیا، تاڑ کے پھل کھائے اور آرام کرنے لیٹ گئے۔ چشمے کے پانی سے چھو کر چلنے والی ہواؤں نے پلکیں جوڑ دیں اور سورج ڈھلے تک سوتے رہے۔ اکرام نے بدحواسی سے مجھے جگایا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''عصر کی نماز نکل گئی۔''

''وقت ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں ہے۔''

''قضا پڑھ لیتے ہیں۔ اللہ معاف فرمائے۔'' عصر کی اور کچھ دیر کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ پانی پیا اور چل پڑے دن کا سفر رہ گیا تھا، اس لئے کسر پوری کی اور آدھی رات تک سفر جاری رکھا۔ اس طرح چار دن سفر میں گزر گئے۔ پانچویں رات بھی ایک دشت میں قیام کیا تھا، لیکن یہاں سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر روشنی نظر آئی اور میں نے اکرام کو ادھر متوجہ کیا۔ اکرام نے ایک درخت پر چڑھ کر دُور تک دیکھا پھر نیچے آ کر بولا۔

''پوری آبادی ہے اور کوئی اچھا خاصا شہر ہے۔''

''کیسے اندازہ ہوا......؟''

''وہ جو روشنی سامنے نظر آ رہی ہے کس قدر بلندی پر ہے۔ اس کے پس منظر میں بہت سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ آسمان پر دن کا عکس یہاں سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔''

''گویا ہماری منزل۔''

''یہیں آنا تھا ہمیں؟''

''شاید۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''پھر اکرام سے پوچھا کہ آگے بڑھنے کی ہمت ہے۔''
''کیوں نہیں مسعود بھائی۔''
''آؤ پھر اس پھیلی روشنی میں قیام کرتے ہیں۔ دیکھیں وہاں کیا ہے۔'' ہم چل پڑے۔ روشنی ایک خانقاہ کے چراغ کی تھی جو طاق میں جل رہا تھا۔ پہاڑی پتھروں کو چن کر ایک بلند کمرہ جیسا بنایا گیا تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ انہیں پتھروں کا ایک قدم آدم دیواروں والا احاطہ بنایا گیا تھا جس میں کسی انسان کا پتہ نہیں تھا البتہ کچھ اور چیزیں یہاں موجود تھیں مثلاً ایک سمت پتھروں ہی کو چن کر ایک چبوترا سا بنایا گیا تھا۔ دُوسری سمت چند مٹکے رکھے ہوئے تھے جن میں پینے کا پانی تھا کیونکہ گلاس اور پانی نکالنے والا برتن بھی وہاں موجود تھا، احاطے کی وسعت اچھی خاصی تھی۔ چند درخت بھی لگے ہوئے تھے جن کی چھاؤں زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اُوپر کچھ جھنڈے جیسے بھی لگے ہوئے تھے جن سے یہ اظہار ہوتا تھا کہ یہ خانقاہ کسی کا مزار بھی ہے مگر مکمل ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی یہاں موجود نہیں تھا یا اگر کوئی ہوگا تو پھر اس وسیع و عریض کمرے کے اندر ہوگا، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہم تو روشنی دیکھ کر چلے آئے تھے اور اکرام کے بیان کے مطابق دُوسری سمت ایک وسیع و عریض آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ مدھم مدھم روشنیاں اس آبادی میں زندگی کا پتہ دیتی تھیں۔ یہ جگہ خاصی الگ تھلگ تھی اور کسی پہاڑی کٹاؤ کی بلندی پر واقع تھی، بستی نیچے کی سمت آباد تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اکرام کو دیکھا اور کہا۔ ''اکرام اچھی جگہ ہے۔ کیا خیال ہے؟''
''ہاں مسعود بھائی آپ کے کہنے کے مطابق اللہ کی وسیع و عریض زمین پر ہر جگہ اچھی ہے۔''
''تو بس پھر یہیں قیام کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آؤ وہ گوشہ اپنا لیں، درختوں کی پناہ میں پہنچ جائیں۔'' اکرام نے حسب عادت گردن ہلا دی اور ہم نے ایک صاف ستھری جگہ ڈیرہ ڈال لیا، وقت گزرتا رہا، سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا کہ اچانک کچھ آہٹیں محسوس ہوئیں اور اکرام اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
''کوئی آ رہا ہے بھیا۔'' اس نے کہا۔
''آنے دو، خدا کے بندے ہی ہوں گے۔'' میں لاپروائی سے بولا۔
''معلوم کیا جائے کون سی جگہ ہے؟''
''میرا خیال ہے مناسب نہیں ہے، صبح سورج نکلے گا خود بخود پتہ چل جائے گا جو کوئی بھی ہے نجانے کس مقصد کے تحت آیا ہے۔'' اکرام خاموش ہوگیا اور ہم انتظار کرتے رہے۔ پھر یکے بعد دیگرے اُوپر آنے والی سیڑھیوں سے چند سر اُبھرے۔ مدھم روشنی میں ان کے خدوخال تو واضح نہیں ہو سکے تھے، آنے والوں کی تعداد غالباً سات تھی، کوئی سامان اُٹھائے ہوئے آ رہے تھے۔ خانقاہ کے دروازے کے بغلی حصے سے گزرتے ہوئے وہ غالباً خانقاہ کے عقب میں چلے گئے۔ ہم خاموشی سے بیٹھے انہیں دیکھتے رہے تھے، نجانے کیا سامان لدا ہوا تھا ان کے شانوں پر۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ واپس آئیں، انتظار کرتے رہے، لیکن کوئی واپس نہیں آیا اور پھر آہستہ آہستہ آنکھوں میں نیند رینگ آئی اور ہم دونوں ہی سو گئے۔
صبح کو معمول کے مطابق آنکھ کھل گئی تھی۔ فجر کی نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔
''نماز پڑھ لیں اکرام۔''
''ہاں مسعود بھیا۔''
وضو کا انتظام تھا۔ نماز پڑھی اور پھر وہاں سے آگے بڑھ آئے۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ آسمان سے نور برس رہا تھا۔ تاحد نگاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس سمت آ کھڑے ہوئے، یہاں سے گہرائیوں میں بکھرا شہر نظر آ رہا تھا۔
''نہ جانے کون سا شہر ہے؟''
''معلوم ہو جائے گا لیکن وسیع ہے اور خوبصورت ہے۔''
''اوہ۔ وہ دیکھئے۔'' اچانک اکرام نے اشارہ کیا۔ دو آدمی جو خانقاہ کے بغلی گوشے سے ٹہلتے ہوئے باہر آئے تھے۔ ہم

ان سے زیادہ دُور نہ تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ دونوں ٹھٹک گئے۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ جوان آدمی تھے، چہروں اور آنکھوں میں زندگی تھی اور کسی قدر شبے کے آثار۔

''کیا کر رہے ہو یہاں۔'' ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

''ارے بھائی نہ سلام نہ دُعا۔ عجیب سوال کیا ہے تم نے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''نماز سے فارغ ہوئے ہیں اور حسن خداوندی دیکھ رہے ہیں۔''

''نماز سے فارغ ہوئے ہو۔'' دُوسرے نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

''کیا رات کو یہاں رہے ہو۔'' پہلا بولا۔

''ہاں۔ مسافر ہیں۔ سفر کر رہے تھے۔ روشنی دیکھ کر ادھر آ گئے اور پھر یہاں پڑ رہے۔''

''کہاں سے؟''

''اس درخت کے پیچھے۔''

''کہاں سے آئے ہو۔''

''جوالا پور سے۔''

''اس خانقاہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ تم پہلے انسان نظر آئے ہو۔ تم سے یہاں کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔''

دونوں نے ایک دُوسرے کی شکل دیکھی۔ پھر ایک بولا ''بڑی غلطی کی ہے تم نے یہاں رات گزار کر۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ بہت خطرناک جگہ ہے۔''

''مگر ہمیں تو...... ہمارا خیال تو تھا کہ یہ کسی بزرگ کا مزار ہے۔ یہ جھنڈا اور یہ......''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ یہ بھورے شاہ کا مزار ہے۔ لیکن۔''

''لیکن کیا؟''

''بے وقوف۔ یہاں مغرب کے بعد کسی کا آنا منع ہے۔'' مغرب سے پہلے پہلے لوگ چلے جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یہاں شیر آ جاتے ہیں

''شیر؟''

''ہاں۔ بھورے شاہ کے غلام۔ احاطے کی صفائی کرتے ہیں۔ بھورے شاہ کے دربار میں حاضری دیتے ہیں ہم لوگوں نے خود دیکھا ہے۔ ایسے میں اگر یہاں انسان موجود ہوں تو تم خود سوچو کیا ہو سکتا ہے۔''

''کیا ہو سکتا ہے۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''خوش نصیب ہو بچ گئے۔ ورنہ پتہ چل جاتا کہ کیا ہوتا ہے۔'' دُوسرا ہنس پڑا۔

''شیروں نے کسی کو ہلاک کیا ہے کیا۔''

''لوگ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ دُھوپ چڑھے آتے ہیں، مرادیں مانگنے آتے ہیں اور دُھوپ ڈھلے چلے جاتے ہیں۔ کوئی ہو تو شیر اسے ہلاک کر دیں۔ آئندہ یہاں نہ رُکنا۔''

''آپ لوگ کون ہیں؟''

''ہم خدام ہیں بھورے شاہ کے۔''

''شیروں نے آپ کو نقصان نہیں پہنچایا؟''

"ہم تو اندر رہتے ہیں۔ مگر تم بحث کیوں کر رہے ہو۔" دُوسرا تیز لہجے میں بولا۔

"اس لئے کہ ہمیں تم سے اختلاف ہے۔"

"کیسا اختلاف۔"

"شیر اگر یہاں آتے ہیں تو عقیدت مند بن کر۔ اس وقت وہ شیر نہ ہوتے ہوں گے بزرگ کے خادم ہوتے ہوں گے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ویسے یہ شہر کون سا ہے۔"

"عازم آباد۔ تم یہ بھی نہیں جانتے۔"

"ہاں۔ معلوم نہیں تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے اب معلوم ہو گیا۔ شام ہونے سے پہلے یہاں سے بھاگ جانا۔" وہ آگے بڑھ گئے۔ میں نے مسکرا کر اکرام کو دیکھا۔

"کیا کچھ ہوا اکرام؟"

"عجیب سی باتیں ہیں۔ مگر ہمیں کیا۔"

"ہاں اکرام۔ اب یہی ہمارا ٹھکانہ ہے۔ جب تک۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اکرام نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

حقیقت خانقاہ سے [illegible] اندر موجود مزار کی زیارت کی ایک وسیع قبر بنی ہوئی تھی جو پھولوں اور چادروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد سے رش بڑھ گیا۔ کچھ خوانچے والے بھی آ گئے۔ میری جیب میں آٹھ روپے موجود تھے۔ جو لالا پور سے نکل آئے تھے اس لئے خرچ چل رہا تھا۔ جو کچھ ملا خرید کر پیٹ بھر لیا۔ یوں پورا دن گزر گیا۔ سرِشام لوگوں نے واپسی شروع کر دی۔ کچھ گھبراہٹ سی پائی جاتی تھی۔ غالباً اسی روایت کا نتیجہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسان غائب ہو گئے، سورج چھپ گیا۔ ہم نے پرانا ٹھکانہ سنبھال لیا۔ خانقاہ کا دروازہ بند ہو گیا، چراغ روشن ہو گیا۔ اب اکرام بھی اس ماحول سے پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ رات کو اچانک وہ دونوں آ گئے۔ پورے احاطے کا چکر لگا کر ہماری طرف آئے تھے۔

"ارے تم..... تم ابھی تک یہاں موجود ہو۔"

"ہاں بھائی۔ ابھی کچھ وقت یہاں گزاریں گے۔"

"اور ہم نے جو کچھ کہا تھا۔"

"اللہ مالک ہے۔"

دونوں کچھ سوچتے رہے۔ پھر واپس پلٹ گئے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد وہ پھر آئے ایک کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے۔

"خانقاہ کے مہمان بنے ہو تو لو کھانا کھاؤ۔"

"جزاک اللہ" میں نے انحراف نہ کیا۔ وہ کھانا رکھ کر چلے گئے اور ہم کھانے میں مصروف ہو گئے۔ پانی کے برتن بھی تھے۔ عمدہ کھانا تھا خوب ڈٹ کر کھایا۔ پھر پانی پیا۔ لیکن اچانک۔ پانی پیتے ہی سر بُری طرح چکرانے لگا۔ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی اکرام لمبا ہو گیا۔ میں نے اسے آواز دینا چاہی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی اور پھر میں بھی دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

غالباً صبح ہو گئی تھی۔ کچھ رخنوں سے دھوپ کی لکیریں زمین کرید رہی تھیں اور دن کی وجہ سے اردگرد کا ماحول خوب روشن ہو گیا تھا۔ میری نگاہوں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ بدن کے نیچے کھردرا سنگی فرش بھورے رنگ کی ناہموار دیواریں تھیں، جن رخنوں سے روشنی کی لکیریں جھانک رہی تھیں، وہ بے ترتیب تھیں یعنی روشن دان نہیں تھے بلکہ باریک باریک درزیں پڑی ہوئی

تھیں۔ صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ کوئی پہاڑی غار ہے۔ نگاہوں نے اپنا کام پورا کیا تو دوسرے احساسات جاگے اور ان میں پہلا احساس یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں نہایت مضبوطی سے کس کر باندھ دیئے گئے ہیں اور اس طرح کہ یہ بندشیں کھولی نہ جاسکیں۔ فوراً ہی اکرام کا خیال آیا، دیواریں اور چھت تو دیکھ لی تھی۔ فرش پر اکرام کے تصور سے نظر دوڑائی تو وہ ایک دیوار ہی سے لگا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ مجھ سے پہلے جاگ گیا تھا۔ مگر جاگنے کی بات کہاں، اسے تو بے ہوشی کے بعد ہوش کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اکرام کی صورت دیکھتے ہوئے میں نے گزرے لمحات پر نظر دوڑائی اور صاف ظاہر ہو گیا کہ جو کھانا ہمیں دیا گیا تھا اس میں کوئی خواب آور شے ملی ہوئی تھی۔ کچھ اور پیچھے ذہن دوڑایا تو وہ لوگ یاد آئے جنہوں نے کھانا دیا تھا۔ ہمارے بارے میں ان کے سوالات کرنے کا انداز مشکوک تھا اور اس کے بعد غالباً انہوں نے ہمارے بارے میں فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کے تحت ہمیں خانقاہ کا مہمان بنایا گیا تھا۔ لیکن کیوں آخر کیوں۔ اکرام بھی یقیناً بے ہوش زمین پر پڑا ہوا ہوگا اور کھسک کھسک کر اس نے دیوار کی پشت پناہی حاصل کی ہوگی۔ میں نے بھی اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دے کر دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ میں کھسک کر اکرام کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ سو میں نے اس پر عمل کر ڈالا اور چند لمحات کے بعد اس دیوار سے جالگا۔ اکرام ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی اور وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس یہی تمام سب کچھ اور ایک اور بات بھی سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''مسعود بھائی اگر انسان کو زندگی میں کوئی ایسا دکھ نہ مل جائے جو اس کے دل کو داغدار کرتا رہے تو سچی بات یہ ہے کہ یہ زندگی جو میں گزار رہا ہوں یا اگر آپ مجھ سے اتفاق کریں تو ہم گزار رہے ہیں، بری نہیں ہے۔''

''ارے انوکھی بات کہی تم نے اکرام۔ یعنی یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں، تمہیں پسند ہے؟''

''ہاں اب پسند آگئی ہے، کم از کم اس میں لمحہ لمحہ تبدیلیاں تو ہیں، تجسس تو ہے، انفرادیت ہے، خطرہ ہے، بلکہ میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ جو لوگ ایک لگی بندھی زندگی گزارتے ہیں، گھر سے دفتر یا پھر دکان یا کھیت یا کسی بھی جگہ جہاں سے انہیں رزق حاصل ہوتا ہے اور اس کے بعد واپس گھر، یکسانیت ہوتی ہے اس زندگی میں، اور یہ زندگی جس میں کچھ وقت میں نے گزارا ہے، توقع کے برعکس ہے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ دکان پر جانا ہے، سامان بیچنا ہے، واپس آجانا ہے، دفتر جانا ہے، فائلوں میں وقت گزاری کرنی ہے، گھر کا رخ کرنا ہے بلکہ اس میں پتہ نہیں ہوتا کہ آگے کیا ہوگا اور جب کچھ ہو جاتا ہے تو وہ لطف دیتا ہے۔''

''بڑے فلسفی بنے ہوئے ہو اس وقت۔ ہاتھ پاؤں نہیں دکھ رہے۔''

''دکھ رہے ہیں لیکن لطف آرہا ہے یہ سوچ کر کہ ہوا کیا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے۔'' اکرام کے لہجے میں درحقیقت ذرا بھی خوف کا احساس نہیں تھا اور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میں نے ایک سمت کچھ آہٹیں سن کر کہا۔ ''لو بتانے والے آگئے۔''

بتانے والے دو افراد تھے، دراز قامت، گیروا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، بہترین جسامت کے حامل اور کرخت چہروں والے، ایک دروازے سے اندر آئے تھے اور ہمارے پاس آکھڑے ہوئے تھے، دونوں کڑی نگاہوں سے ہمیں گھورنے لگے۔ میں نے کہا۔

''بھائی باقی تو جو کچھ ہے وہ آپ بہتر جانتے ہیں البتہ ایک زیادتی ضرور ہوئی ہے ہمارے ساتھ۔ فجر کی نماز قضا کرادی آپ نے اور اب تو سورج اتنا نکل آیا ہے کہ۔ کہ۔''

''زیادہ شریف بننے کی کوشش مت کرو۔ جو کچھ تم سے پوچھا جائے اس کا جواب دو ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی بھر کے لئے اپاہج ہو جاؤ گے۔ سڑکوں پر گھسٹتے پھرو گے، دوستانہ مشورہ ہے تمہارے لئے کہ تم سے جو کچھ پوچھا جائے بالکل سچ اور

صاف بیان کردو۔''
''ٹھیک ہے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ لیکن آپ لوگ بھی وعدہ کریں کہ ہمارے کہے کو سچ سمجھیں گے۔''
''اس کا تو پتہ چل جائے گا، زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔''
''چلئے یہ بھی وعدہ ہے کہ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔''
''تو پھر یہ بتاؤ تم لوگ کون ہو؟''
''خدا کے فضل سے انسان ہیں، مسلمان ہیں، مسافر ہیں، بس نہ اس سے کچھ آگے ہیں، نہ کچھ پیچھے ہیں۔''
''ایک جملہ
بھول گئے۔'' ان میں سے ایک نے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
''بھلا وہ کیا؟'' میں نے سوال کیا۔
''سی آئی ڈی والے ہیں۔'' وہ شخص بولا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''ارے نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس مسافر ہیں اور یہ جانے بغیر اس طرف نکل آئے تھے کہ یہ کون سا شہر ہے، یہیں آ کر پتہ چلا۔ جنگل کی جانب سے ادھر پہنچے تھے، خانقاہ کا پہلا چراغ نظر آیا، سو اسی جانب چل پڑے۔ اس سے پہلے کبھی نہ اس شہر میں آئے، نہ بھورے شاہ کے مزار پر۔''
''بکواس مت کرو، جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارا تعلق سی آئی ڈی سے ہے؟''
''ہم نے تو وعدہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولیں گے، سو جھوٹ نہیں بولے لیکن آپ اپنے وعدے پر پورے نہیں اتر سکے۔ اب اس کے بعد آپ کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہیں ہمارے بارے میں تصدیق کریں۔ جھوٹ نکلے تو قابل سزا ہوں گے ہم اور سچ نکلے تو ہمیں رہائی دے دیجئے۔''
''رہائی کی بات کر رہے ہو۔ یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے تم سمجھے۔''
''تقدیر، موت کے لئے وقت اور جگہ متعین کرتی ہے اگر باری تعالیٰ نے یہی جگہ ہماری موت کے لئے منتخب فرمائی ہے تو آپ بھی ہمیں معاف کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں گے۔ موت برحق ہے، بھائی بھلا اس سے کیا خوفزدہ ہونا۔''
''دیکھو ابھی تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی جا رہی۔ تمہارا فیصلہ بابا بھورے شاہ کریں گے، وہ موجود نہیں ہیں، آ جائیں گے تو تمہارے بارے میں انہیں بتا دیا جائے گا۔ البتہ ایک بات ہم ضرور بتا دیتے ہیں۔ ہمیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ تمہارا تعلق سی آئی ڈی یا پولیس سے ہے یا نہیں اور بابا بھورے شاہ کا ایک اصول ہے کہ اگر وہ کسی کے ساتھ مہربانی کرنا چاہیں اور اس کے باوجود وہ ان سے جھوٹ بولے تو پھر وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ اپاہج کر دیتے ہیں، تمہاری زبان کاٹ دی جائے گی یا ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں گے اور اس کے بعد تمہیں مزار سے دور پھنکوا دیا جائے گا۔ تم یہ نہیں کہہ پاؤ گے کسی سے کہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا۔''
''خیر اس بات کو چھوڑیئے۔ لیکن کیا آپ یہ بات بتائیں گے ہمیں کہ مزار پر سی آئی ڈی والوں کا کیا کام ہو سکتا ہے یا پھر یہ کہ آپ کو شبہ کیسے ہوا ہم پر کہ ہم سی آئی ڈی والے ہیں، یہاں بھلا کون کیا کھوج کرنے آ سکتا ہے۔ یہ تو روحانیت کا معاملہ ہے۔ یہاں لوگ نیکیوں کے لئے تو آ سکتے ہیں، بھلا سی آئی ڈی والے یہاں کیا پتہ چلانے آئے ہیں؟''
''میں نے کہا نا، چالاک بننے کی کوشش نہ کرو سمجھے، تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے حالانکہ اصولی طور پر کھولے نہیں جانے چاہئیں، پیر بندھے رہیں گے تاکہ تم بھاگ نہ سکو۔ یہ بھی ایک حماقت کی بات ہے کیونکہ پیر تم اپنے ہاتھوں سے کھول سکتے ہو لیکن یہاں تمہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی، پیروں کی رسی کھلی پائی گئی تو تمہارے ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے سمجھے، جب تک بابا بھورے شاہ تمہارے بارے میں فیصلہ نہ کر دے اسی جگہ بندھے رہو گے۔ ہاتھ اس لئے کھولے جا رہے ہیں کہ اپنے

چھوٹے موٹے کام کرسکو۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے لئے ناشتہ پہنچ جائے گا۔ کھاؤ پیو اور یہیں لوٹیں لگاؤ۔ خبردار یہاں سے باہر نکلنے کا وہی ایک دروازہ ہے، دروازے کے آگے ایک چھوٹی سی سرنگ ہے اور اس سرنگ کے دوسرے حصے پر زبردست پہرہ موجود ہے۔ پہرے دار یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم سرنگ کے دہانے تک کیسے پہنچے اور کیوں پہنچے، انہیں جو ہدایت ملی ہے اس پر عمل کریں گے۔ بس اتنی ہی بات کرنی تھی تم سے، چلو رسیاں کھول دو۔"

"ہمارے ہاتھوں کی رسیاں کھول دی گئیں۔ میں نے گردن خم کر کے کہا۔ "بہت بہت شکریہ بھائی۔ ہم سے آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"کیا کیا نام ہیں تمہارے؟"

"میرا نام مسعود احمد ہے اور یہ اکرام علی ہے۔"

"اور تعلق تمہارا جوالا پور سے ہے؟"

"ہاں جوالا پور سے بھی ہے۔" ان دونوں نے میرے اس "بھی" پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ خاموشی سے کھولی ہوئی رسیاں اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔ میں اور اکرام اپنی کلائیاں مسل رہے تھے جن پر بندھے ہونے کی وجہ سے خاصے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ اکرام کے بارے میں، میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کے اندر بے حد پختگی پیدا ہو گئی ہے اور وہ کسی بھی قسم کے حالات سے گھبرانا نہیں [illegible] اکرام نے مجھ سے کہا۔ [illegible] مسعود بھائی؟"

"تم نے اس پر غور نہیں کیا اکرام۔"

"مجھے تو کچھ اور لگتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ خانقاہ ڈھونگ ہے اور ہوسکتا ہے یہ قبر بھی جھوٹی قبر ہو۔ ایسی داستانیں اکثر سنی ہیں۔ اس قسم کے جعلی مزارات بنا لئے جاتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر بہت سی برائیاں کی جاتی ہیں۔ معصوم اور سادہ لوح انسانوں کو جال میں پھانس کر ان سے چڑھاوے وصول کئے جاتے ہیں۔ آپ یقین کیجئے مجھے تو اسی وقت شبہ ہوا تھا جب ہمیں شیر کی کہانی سنائی گئی تھی۔ بلاشبہ بزرگانِ دین کا ایک مرتبہ ہوتا ہے اور وہاں نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے لیکن اس طرح اس کی پبلسٹی نہیں ہوتی اور پھر آپ ان لوگوں کو بھی نہیں بھول سکے ہوں گے جنہیں ہم نے رات کی تاریکی میں سامان اٹھا کر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ چکر ضرور چل رہا ہے۔ یہاں کوئی جرم ہو رہا ہے۔"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ اگر ہمارے سپرد اس جرم کی بیخ کنی کی گئی ہے تو اپنا فرض ضرور پورا کریں گے۔"

"آئندہ ارادہ کیا ہے؟" اکرام نے پوچھا اور میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا۔ "ارادہ یہ ہے کہ پاؤں کی رسی کھولنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ دیکھتے ہیں کہ یہ بھورے شاہ صاحب۔ ارے ہاں ایک بات تو بتاؤ۔ یہ مزار بھورے شاہ ہی کا تو ہے اور وہ کہہ گئے ہیں کہ بھورے شاہ آ کر فیصلہ کریں گے۔ گویا صاحب مزار زندہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"جلد بازی میں کہہ گئے ہیں شاید۔ ویسے اب ہم ان کے قبضے میں ہیں، ہم سے انہیں خطرہ بھی تو نہیں ہوگا۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ پھر ہمیں ناشتہ دے دیا گیا۔ مکئی کے آٹے کی موٹی موٹی روٹیاں اور ان پر مکھن کے لوندے رکھے ہوئے، ساتھ ہی چھاچھ کے دو بڑے بڑے گلاس۔ ناشتہ تو واقعی بہت عمدہ تھا، لطف دے گیا۔ بڑے عرصے کے بعد ایسی کوئی چیز کھائی تھی۔ اکرام بھی پوری طرح لطف اندوز ہوا۔ البتہ اس نے کہا۔ "ناشتہ بہترین ہے لیکن اسے ہضم کرنے کے لئے تھوڑی سی چہل قدمی ہونی چاہئے تھی۔"

"نہیں۔ ایسے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

غالباً وہاں دوپہر کے کھانے کا رواج نہیں تھا یا پھر میزبانوں نے زحمت اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ دوپہر یونہی

گزر گئی۔ ویسے بھی ناشتہ دیر ہضم تھا۔ شام کے پانچ بجے کے قریب ہی بھوک لگی تھی۔ ساڑھے چھ بجے غار میں کوئی روشنی لے کر پہنچ گیا۔ دیئے تھے جو شاید سرسوں کے تیل سے جلائے گئے تھے۔ دیئے غاروں کے ابھرے ہوئے پتھروں پر رکھ دیئے گئے۔ اوپر سے روشنی بخشنے والے چراغ تاریک ہو گئے تھے اور اب یہ سرسوں کے تیل کی روشنی والے چراغ، غار کی دیواروں کو مدھم سی پیلاہٹوں کا شکار کر چکے تھے۔ آنے والے وہیں کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد ایک شخص اسی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ [illegible]

سیاہ لمبے لبادے میں ملبوس شخص جس کے بال شانوں سے نیچے تک بکھرے ہوئے تھے، ہمارے سامنے [illegible] دو آدمیوں نے ہماری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہمیں کھڑا کر دیا تھا۔ غار میں چھ سات افراد موجود تھے۔ آنے والے نے مشعل، مشعل بردار کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں لی اور ہمارے چہرے کے قریب کر کے ہمیں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''اور تم کہتے ہو تمہارا تعلق سی آئی ڈی سے نہیں ہے۔''

''نہیں پیر صاحب۔ ہم تو غریب مسافر ہیں جو ادھر سے گزرتے ہوئے اس مزار کو پناہ گاہ سمجھتے ہوئے ادھر آ گئے۔''

''میں پیر نہیں ہوں، بیر دار جو اس کے بعد تم نے مجھے پیر کہا۔ میں تو ایک گناہ گار انسان ہوں، بدترین کردار کا مالک، ایک ذلیل ترین انسان...... اس کے بعد مجھے پیر یا بزرگ کہہ کر مخاطب مت کرنا۔ یہ لوگ مجھے بابا بھورے شاہ کہتے ہیں۔ میں وہ بھی نہیں ہوں۔ یہ نام میں نے مجبوراً قبول کیا ہے مگر چھوڑو... تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رات کو مزار پر رکنے کی کوشش مت کرنا۔ تم نے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟''

''ہمارا یہاں اس شہر میں نہ کوئی شناسا ہے، نہ کوئی ٹھکانہ، کچھ وقت یہاں گزارتے، اپنا کھاتے پیتے، پھر یہاں سے آگے بڑھ جاتے بلکہ کسی مزار پر قیام تو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ بس یونہی آوارہ گرد پھرتے ہیں، کبھی کہیں جا پڑتے ہیں، کبھی کہیں، نہ کوئی گھر ہے نہ بار ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کہا تھا کہ اگر جھوٹ نکلے تو آپ اپنے اصولوں کے مطابق عمل کیجئے، ہم اسے اپنی تقدیر سمجھ لیں گے۔''

''عجیب لیچڑ آدمی ہو تم لوگ، پڑھے لکھے ہو؟''

''جی تھوڑے بہت۔''

''شامی اگر یہ پڑھے لکھے ہیں تو کیوں نہ انہیں عرضیاں لکھنے پر لگا لیں۔ بھاگ تو سکیں گے نہیں۔ اندازہ لگائیں گے ان کے بارے میں۔ غلط لوگ نکلے تو ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ عرضی لکھنے والوں کی بڑی پریشانی ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مشکل مجھے اسی کام میں پیش آتی ہے۔''

''جو حکم بڑے بابا۔ جیسا آپ کہو۔'' جس شخص کو شامی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، اس نے کہا۔

❖❖❖❖❖

''ٹھیک ہے سنو! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو خاموشی سے یہاں بیٹھ کر عرضیاں لکھا کرو، یہ لوگ تمہیں بتا دیں گے کہ عرضیاں کیسے لکھی جاتی ہیں۔ بعد میں بھروسے کے آدمی ثابت ہوئے تو بڑا مقام دیا جائے گا۔ دوسری صورت میں ہم تمہیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ تمہارے بارے میں تصدیق نہ ہو جائے کہ تم سی آئی ڈی کے آدمی نہیں ہو، بھوکے پیاسے مرو گے یہاں پر، تم اگر انسان بن کر رہنا چاہتے ہو تو یہاں تمہیں جو کام بتایا جائے اسے سرانجام دو۔ تین وقت کا کھانا، چائے، ناشتہ سب ملے گا اور تمہارا کام پسند آ گیا تو نوکری مستقل بھی ہو سکتی ہے، معاوضہ جو مانگو گے مل جائے گا اس کی فکر نہیں ہے۔''

میں نے سنجیدہ نگاہوں سے اس بڑے بابا کو دیکھا جو بھورے شاہ کہلاتا تھا۔ فی الحال اس سے تعاون کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے گردن خم کر کے کہا۔ ''آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

''شامی تم ان کے انچارج ہو، ان دونوں کا خیال رکھو گے اور سنو میرے اصول جانتے ہو، شیر کی نظر رکھنا ان پر...... لیکن کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ ہو اور جو آسانیاں کسی انسان کو دی جا سکتی ہیں وہ انہیں دی جائیں اور یہ اگر ان

آسانیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو جس چیز کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کریں، اس سے ان کو محروم کر دینا، میرا مطلب ہاتھ، پاؤں اور آنکھیں ہیں۔"

وہ شخص یہ کہہ کر تیزی سے واپس مڑا۔ بڑا پھرتیلا معلوم ہوتا تھا، باقی لوگوں کو اس کے پیچھے دوڑنا پڑتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد غار پھر خالی ہو گیا۔

پیلی روشنی میں غار کا ماحول بے حد پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ اکرام بھی بالکل خاموش تھا مگر جب یہ خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے اسے توڑا۔

"کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو اکرام۔"

"بڑے بابا۔" اکرام نے کہا اور ہنس پڑا۔

"تمہیں اس کے وہ الفاظ یاد ہیں۔"

"کون سے؟"

"جب میں نے اسے پیر کہا تھا۔"

"ہاں یاد ہیں، ساری باتیں انوکھی ہیں اور مسعود بھائی یہ عرضیاں کیا ہیں؟"

"وہی لوگ بتائیں گے تو پتہ چلے گا۔"

"چلئے کیا فرق پڑتا ہے، تین وقت کے کھانے کا تو وعدہ کیا ہے۔" اکرام ہنستا ہوا بولا۔

میں سوچ میں ڈوبا رہا۔ ایک یقین دل کو تھا جہاں میرے قدم پہنچتے تھے، بے مقصد نہیں ہوتے تھے، روانہ ہونے سے قبل ہدایت کر دی جاتی تھی کہ جانا ہے۔ اس بار بھی ہدایات ملی تھیں اور جو کچھ کہا گیا تھا مجھے یاد تھا۔ چنانچہ اب یہاں آیا تھا۔ گو نئی اور انوکھی دنیا تھی مگر دلچسپی سے خالی نہیں تھی۔ نماز کے اوقات کی پریشانی کے علاوہ اور کوئی پریشانی نہیں تھی۔

دوسرے دن ان عرضیوں کے بارے میں معلوم ہوا۔ شامی کو ہمارا انچارج بنایا گیا تھا وہی ہمیں لے کر ایک اور غار میں پہنچا تھا۔ یہاں ایک موٹا قالین بچھا ہوا تھا جس پر دو ڈیسک رکھے ہوئے تھے۔ کاغذ، قلم کا معقول انتظام تھا۔ سامنے دیوار میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ ہمیں قالین پر بٹھا دیا گیا۔ شامی بولا۔

"دیکھو..... شام چار بجے سے چھ بجے تک تمہیں اس لاؤڈ اسپیکر سے آوازیں سنائی دیں گی، عورتوں کی آوازیں بھی ہوں گی، مردوں کی بھی...... وہ اپنا نام، پتہ بتائیں گے، پھر منت مانیں گے، دل کی مرادیں بتائیں گے، جو کچھ وہ کہیں گے تمہیں اس میں سنائی دے گا، تم دونوں ان کے نام، پتے اور جو کچھ بھی وہ کہیں کاغذ پر لکھ لینا۔ ہر عرضی کو الگ الگ سنبھال کر رکھنا۔ "بڑا بابا" انہیں دیکھے گا۔"

"ایک کام کرنا ہے تمہیں شامی۔"

"ہاں بولو....." اس نے کہا۔

"کسی بھی قسم کی ایک گھڑی ہمیں چاہئے۔"

کیوں......؟"

نماز کے وقت کے لئے پریشانی ہوتی ہے۔ غار میں پتہ نہیں چلتا۔"

"مل جائے گی۔ اور کچھ......"

"وضو وغیرہ کے لئے پانی بھی درکار ہوگا۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"بس تمہارا شکریہ......" میں نے کہا۔ ہمارا کام اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ اکرام نے کہا۔ "کچھ سمجھے مسعود بھائی......!"

''ہاں اکرام، وہی تمام تر انسانی کمزوریاں اور ان سے فائدہ اٹھانے والے ان لوگوں نے بھورے شاہ کے نام پر ایک جعلی مزار بنا لیا ہے، لوگ منتیں مرادیں مانتے ہوں گے اور ان لوگوں کا کاروبار چل رہا ہوگا۔''

''ویسے بڑے ظلم کا کام ہے مسعود بھائی...... انسان اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر ایسی باتوں کا سہارا لیتا ہے اور جھوٹے دلاسوں میں کھو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے یہ لوگ انہیں بلانے تو نہیں جاتے ہوں گے، خود ہی یہاں یہ سب آتے ہیں اور ان چالاک انسانوں نے انہیں احمق بنانے کے لئے یہ سارا کھیل رچا رکھا ہے۔ کیا کہا جائے، غلطی کس کی ہے لیکن کیا آپ کا ضمیر اس چیز کو قبول کر لے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجبوریوں کے بارے میں تم کیا کہہ سکتے ہو اکرام...... اگر ہم یہ نہ کریں تو تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہمیں آسانی سے چھوڑ دیں گے۔'' اکرام ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ لازمی امر ہے جو لوگ یہاں آتے ہوں گے وہ مصیبتوں کے شکار ہوتے ہوں گے، مصیبتوں کا حل وہ انہی ذرائع سے چاہتے ہیں، یہ بھی ایمان کی کمزوری ہے۔ بزرگان دین صرف دعائیں ہی کر سکتے ہیں، ان کے لئے، اگر ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا حل کسی طرح اگر میرے علم میں آ جائے تو میں اس چالاک شخص ہی کو سہی، یہ بتا دوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ اگر کسی طرح مشکل میں گھرے انسانوں کو ان کی مشکل کا حل مل سکے، بس ایک احساس دل میں آیا تھا۔

وقت ہو گیا۔ شامی نے مجھے گھڑی لا کر دے دی تھی اور ہمیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ اگر ان لوگوں سے تعاون کیا جائے تو ان کا رویہ ہمارے ساتھ بہتر ہی رہے گا۔ وقت مقررہ پر شامی نے ہی آ کر مجھے ہوشیار کیا۔ کہنے لگا۔ ''بس اب سے چند لمحات کے بعد آوازیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ خبردار ہوشیاری سے اپنا کام سرانجام دینا۔''

میں نے اکرام کو بھی ہوشیار کر دیا۔ دونوں آدمیوں کو اس لئے متعین کر دیا گیا تھا کہ اگر ایک سے سننے میں کچھ غلطی ہو جائے تو دوسرا اس غلطی کا ازالہ کر لے۔ لاؤڈ اسپیکر پر کھر کھراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ پھر رونے کی آواز ابھری۔ کوئی مرد ہی تھا، زار و قطار رو رہا تھا۔ میں اور اکرام اس آواز کو سننے لگے۔ پھر اس شخص کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔

''یا درویش، یا ولی۔ اکیلا بیٹا ہے میرا، بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا۔ بچا لو اسے ولی، بچا لو میرے بچے کو ولی...... وہ ڈائن کھا گئی اسے...... وہ ڈائن اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ بچا لو اسے ولی، بچا لو اسے...... میرا نام شاکر علی ہے درمیں ستی کی بستی میں رہتا ہوں۔ ولی اکیلا بیٹا ہے میرا، شادی کر دی تھی میں نے اس کی۔ وہ پاپی عورت جو اس کی بیوی بن کر آئی تھی اسے کھا گئی، کہیں کا نہ چھوڑا اسے، نہ جانے کیا کیا تعویذ گنڈے کرا دیئے ہیں اس کے لئے، سوکھتا جا رہا ہے اور اب پلنگ سے لگ گیا ہے۔ میرے بیٹے کا نام ناصر علی ہے۔ ولی رحم کر دو...... وہ جادو کے زیر اثر ہے، یہ جادو توڑ دو اس کا...... میں...... میں کسی کی دشمنی نہیں چاہتا۔ بس میرے بیٹے کی زندگی مجھے مل جائے ولی۔ اسے معاف کر دو اسے بچا لو۔'' وہ شخص زار و قطار روتا رہا۔ پھر ایک اور آواز سنائی دی۔ ''چلو وقت ہو گیا، وقت ختم ہو گیا ہے۔ تمہیں فوراً باہر نکل جانا ہے۔''

''میرا خیال رکھنا ولی، اگر میرا کام ہو گیا تو چادر چڑھاؤں گا، لنگر کروں گا، مزار کے لئے دس ہزار روپے دوں گا۔ ولی میرا یہ کام کرا دو۔''

''جاؤ بھائی جاؤ، اب دوسرے کی باری ہے۔'' میں نے اور اکرام نے شاکر علی کا نام اور اس کی مشکل لکھ لی تھی اور دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ اکرام نے مجھے دیکھا تھا۔ شانے ہلائے تھے۔ پھر ایک دوسری آواز سنائی دی۔

''ہمارا نام پاروتی ہے بھورے مہاراج، بستی چنار پور کے رہنے والے ہیں ہم۔ کیتھورام نے کہا تھا کہ تم ہندو، مسلمان سب کے کام آؤ ہو، ہمارا پتی بھوگندر ناتھ مایا جال میں پھنس گیا ہے۔ ایک سسری بیسوا اس کے پیچھے لگ گئی ہے، جان کو اٹک گئی ہے وہ اس کے۔ اس نے پتی چھین لیا ہے ہمارا۔ بھگوان کی سوگند بڑا پریم کرتا تھا ہم سے، پریم کر کے ہی شادی کی تھی اس نے ہم سے۔ مگر وہ نرکھنی اب اسے ہمارے پاس نہ آنے دیوے ہے، ہم ہتھیا کر لیں گے مہاراج۔ نہ چاہئے ہمیں دھن دولت، ٹکڑے کھا کر گزارا کر لیں گے، ہم کو ہمارا پتی ہمیں دلوا دو...... ہمارا پتی ہمیں دلوا دو...... منہ مانگا دیں گے، جو مانگو گے دیں

گے، دیا کرو ہم پر، مہاراج دیا کرو۔"

"چلو بہن، اب دوسرے کی باری ہے۔" آواز آئی۔

"دیا کرو ہم پر مہاراج...... دیا کرو......"

بے بس لوگ، دکھ بھری کہانیاں، دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے، سب مشکل کا شکار، کسی کی کوئی مشکل، کسی کی کوئی مشکل، کوئی بیس عرضیاں لکھی تھیں، کام ختم ہوگیا، وقت ختم ہوگیا تھا۔ میں نے اکرام سے پوچھا۔

"اکرام تم نے سب کے دکھ لکھ لیے۔"

"ہاں مسعود بھیا۔"

"اگر تم سے یہ عرضیاں مانگی نہ جائیں تو انہیں محفوظ رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ہم وہاں سے نکل کر اپنی رہائش گاہ آگئے۔ پھر رات کے کھانے سے فراغت ہوئی تھی کہ بھورے شاہ آگیا۔ شامی اور دو اور آدمی اس کے ساتھ تھے۔ مٹی کے تیل کے کچھ لیمپ بھی ساتھ لائے گئے تھے جنہیں روشن کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ بھورے شاہ کا موڈ بہت اچھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "کہیے دولہا میاں عرضیاں لکھیں؟"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی ہے۔" میں نے ادب سے کہا اور عرضیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا۔

"واہ...... یہ خوب رہی......"

"کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں۔"

"ارے بھائی، ہم پڑھ سکتے تو لکھ بھی لیتے، کیوں تکلیف دیتے، پڑھ کر سناؤ۔" اس نے کہا اور میں اسے عرضیاں پڑھ کر سنانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور خاموشی سے ساری عرضیاں سننے لگا تھا۔ میں نے آخری عرضی بھی پڑھ کر سنا دی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "شامی او شامی......"

"جی بڑے بابا......"

"آدمی تو کام کے لگتے ہیں۔"

"اچھے لوگ ہیں بڑے بابا، نمازی پرہیزگار بھی ہیں۔"

"خیال رکھنا ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔"

"جی بڑے بابا۔" شامی نے کہا اور پھر وہ عرضیاں لے کر چلا گیا۔ میں نے یا اکرام نے اس وقت کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن دوسرے دن جب شامی ملا تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "آج کس وقت عرضیاں لکھنی ہیں شامی۔"

"دو دن کے بعد...... آج منگل ہے...... اب جمعرات کو لکھنا ہوں گی، پیر کو فیصلے سنائے جاتے ہیں۔"

"فیصلے......!"

"ہاں بڑے بابا فیصلے لکھواتا ہے، یہ کام بھی تمہیں کرنا ہوگا اتوار کو۔" میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ اکرام، صابر انسان تھا، میرے ساتھ ہر حال میں خوش رہتا تھا۔ اس دوران میں نے تہجد میں مراقبہ بھی کیا اور اپنے لئے حل مانگا مگر خاموشی رہی تھی۔ جمعرات کو پھر بیس عرضیاں لکھیں اور ہر اتوار کو بھورے شاہ صبح صبح میرے پاس آ بیٹھتا۔

"مسعود نام ہے تیرا ارے بھائی۔"

"ہاں......!"

"چل بیٹھ جا...... منگل کی عرضیوں کے جواب لکھنے ہیں۔"

"جی شاہ صاحب۔"

''نا بھائی نا...... اللہ کے واسطے ایسی کوئی بات مت کہہ میاں، سب ہمیں بڑے بابا کہتے ہیں، تو بھی بڑے بابا کہہ...... یہ شاہ، ولی اور درویش تو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، تو ہم جیسے شیطانوں کو ان سے کہاں ملا رہا ہے۔ بس بڑا بابا کہہ کر کام چلا لیا کر۔''

میں نے ایک بار پھر حیران نگاہوں سے بھورے شاہ کو دیکھا۔ یہ آدمی واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک لمحے اس نے آنکھیں بند رکھیں اور اس کے بعد بولا۔ ہاں پہلی عرضی کیا ہے۔

پہلی عرضی شاکر علی کی تھی جس کا بیٹا ناصر علی معصیت کا شکار تھا اور بقول شاکر علی کے اس کی بیوی نے اس پر جادو کرا دیا تھا۔ بھورے شاہ ہنس پڑا۔

عورت کا جادو تو ویسے ہی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ بڑے میاں کو اپنی بہو سے اختلاف ہوگا۔ یہ کہانی تو ہر گھر میں چل رہی ہے۔ چلو ٹھیک ہے، لکھ دو اس کے آگے کہ سات تعویذ دیئے جائیں گے اور ساتھ فلیتے آگ سے جلانے کے لئے، پڑیا بنا کر رکھی ہے۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اس عرضی پر یہ نوٹ لکھ دیا۔

''پڑھ کر سناؤ۔'' وہ بولا...... اور میں نے عرضی پر لکھی ہوئی تفصیلات اسے پڑھ کر سنا دیں۔ دفعتاً اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

''ارے ہاں اے مسعود بھائی، یہ کام بھی یار تو ہی کر لیجیو، دیکھ سال چھ مہینے یہاں کام کر لے، تو ہمیں سمجھ جائے گا، ہم تجھے سمجھ جائیں گے، پھر ایک لمبی رقم ہم سے لے لیجیو اور یہاں سے دو سو کوس دور چلا جائیو، وعدہ کرتے ہیں خطرہ مول لے لیں گے اور تجھے آزادی دے دیں گے۔ ٹھیک ہے۔'' اس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا اور میں گردن ہلانے لگا۔

''جیسا آپ کا حکم بڑے بابا۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ ہوئی نا بات...... اچھا چل آگے کی عرضی پڑھ۔''

یہ دوسری عرضی پاروتی کی تھی جس کا پتی بھوگندر ناتھ کسی بیسوا کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ عرضی سنتے ہی بھورے شاہ ہنس پڑا۔

''بس بس اس کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لال پینسل سے نشان مار دے، اس کا کام ہو گیا۔'' میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے دوسرا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ڈاکو سنتو خان نے اس کے گھر کا پورا پورا صفایا کر لیا ہے، بے چاری کو دھن دولت نہیں چاہئے تھی، پتی چاہئے تھا، سو بھیا پتی اب کہاں جائے گا۔ بیسوا کا کام تو یہی ہے کہ مال لے اور چھوڑ دے۔ سنتو خان نے بے چاری کی مشکل حل کر دی۔ اب اس بیسوا کو دینے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو گیا ہے، چھٹی ہوئی، من کی مراد پوری ہو گئی اس عورت کی، چل اب آگے کی عرضی پڑھ۔''

اور اس کے بعد دوسری عرضیاں پڑھنے لگا اور وہ ان پر اپنے تبصرے اور ہدایات لکھواتا رہا۔ یہ کام ختم ہو گیا تو وہ اٹھ گیا۔ شامی پاس ہی موجود تھا۔ اس نے کہا۔

''شامی، مسعود کو ہر طرح کی آسائشیں ملنی چاہئیں، کوئی تکلیف نہ ہو اسے، خیال رکھنا......'' بہت سے لوگوں کو تعویذ دینے تھے، کچھ لوگوں کے لئے اس نے الٹی سیدھی جڑی بوٹیاں تجویز کی تھیں، حکمت کی کچھ دوائیں بھی لکھی تھیں۔ غرض سارے کا سارا کھیل دھوکا دہی پر مبنی تھا لیکن سنتو خان والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ سنتو خان نے پاروتی کے گھر ڈاکا ڈالا اور اس کے سارے گھر کا صفایا کر دیا۔ اس طرح اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ بہرحال ابھی اس بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کا وقت نہیں آیا تھا لیکن جب ان سب کے لئے تعویذ اور جڑی بوٹیاں لکھنے کے لئے بیٹھا تو میرے ہاتھ پر سحر طاری ہو گیا۔ جو کچھ اس نے بتایا تھا، وہ نہ لکھا، تعویذوں میں بسم اللہ لکھا اور فلیتوں میں شیطان پر لعنت کے الفاظ میرے قلم سے خود بخود درج ہو گئے اور انہی چیزوں کو میں نے پڑیوں کی شکل میں ہر عرضی کے ساتھ رکھ دیا۔ ایک انوکھا لیکن دلچسپ کام تھا اور اکرام میرے ساتھ ان کاموں میں شریک تھا۔

دس دن پندرہ دن، پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔
صبر و سکون سے ہم نے سارا وقت گزارا تھا۔ عبادت الٰہی سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔ ہمارا تمام وقت اسی طرح گزر جاتا تھا۔ اکرام کے چہرے پر شکن بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے بھی اس ماحول کو قبول کرلیا تھا۔ ان لوگوں کو ہم پر مکمل اعتماد ہوگیا تھا، اس لئے اب کبھی کبھی ہمیں غار سے باہر بھی لے آیا جاتا تھا لیکن یہ سورج ڈھلنے کے بعد ہوتا تھا۔ پہلی بار جب شامی کھلے آسمان کے نیچے لایا تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔
''کیا آج کل شیر یہاں جھاڑو دینے نہیں آرہے۔'' میری بات سن کر شامی ہنس پڑا۔
''کیوں ملنا چاہتے ہو شیروں سے؟''
''کیا مطلب۔''
''یہاں بیٹھو، ملائے دیتا ہوں۔'' وہ ہمیں بٹھا کر ایک طرف چلا گیا اور پھر چند ہی لمحات کے بعد ہم نے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنی۔ اکرام تو اچھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میں بھی حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شیر تو کہیں نظر نہیں آیا مگر اس کے دھاڑنے کی آواز کئی بار سنائی دی۔ پھر شامی واپس آگیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ملے شیر سے۔''
''تو یہ ہے خانقاہ کا شیر۔''
''سارا کھیل ایک جیسا ہے۔ مگر تم اس دنیا کو دیکھو، کیسی انوکھی ہے یہ دنیا۔ کسی بیوپاری کے پاس چلے جاؤ، تمہارے بدن کی کھال اتار لے گا، وہ چکر دے گا تمہیں کہ گھن چکر بن جاؤ گے۔ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ انسانی ہمدردی سے ہٹ کر وہ تمہاری مالی حیثیت کا جائزہ لے گا، تمہاری بیماری کو آسمان پر پہنچا دے گا۔ وکیل، سرکاری افسر، ہر شعبے کا انسان اپنی دولت کے دروازے کھولے رکھتا ہے۔ اسے اپنے فن میں مہارت حاصل ہے، وہ ذہین ہے، چالاک ہے، دوسروں کو احمق بنانا جانتا ہے لیکن اتنی ہی خوشی سے وہ یہاں احمق بننے آجاتا ہے۔ منتیں مرادیں مانگتا ہے۔ کسی کا تکا لگ جاتا ہے، جس کا کام نہیں ہوتا وہ اسے تقدیر سمجھتا ہے۔ اس کی عقیدت کم نہیں ہوتی، جس طرح وہ اپنا کام کرتا ہے اسی طرح ہم بھی اپنا کام کرتے ہیں، آج کل ہر چیز پبلسٹی سے ہوتی ہے۔ ہمارا پبلسٹی کا شعبہ بھی سرگرم رہتا ہے اور ہم اپنی پروڈکٹ کی پوری پبلسٹی کرتے ہیں۔''
''پبلسٹی کا شعبہ؟''
''ہاں۔ ہمارے ملازم۔ ہمارے نمائندے اسی شہر میں نہیں، آس پاس کی متعدد بستیوں میں بکھرے ہوئے ہیں، سب کو تنخواہیں ملتی ہیں، وہ بھورے شاہ کی کرامتوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔ شعبدہ گری کرتے ہیں۔ مختلف طریقے ہوتے ہیں اس کے، کوئی اچانک پاگل ہوجاتا ہے، ننگ دھڑنگ سڑکوں پر پھرتا ہے، لوگوں کو پتھر مارتا ہے، ہمارے چند نمائندے اسے پکڑ کر یہاں لے آتے ہیں۔ یہاں اسے دعائیں دی جاتی ہیں، تعویذ دیئے جاتے ہیں اور اس کا علاج ہوتا ہے۔ کچھ دن میں وہ بھلا چنگا ہوکر چلا جاتا ہے اور لوگ بھورے شاہ پر عقیدت کے پھول برساتے ہیں۔ کاروبارِ حیات کے رنگ ایسے ہی بدل گئے ہیں دوست۔ اسی طرح خانقاہ کا شیر ہے۔ شیروں کی اقسام میں اس کا اضافہ بھی کرلو، جنگل کا شیر، قالین کا شیر، خانقاہ کا شیر۔'' شامی قہقہے لگانے لگا۔
''شامی۔ یہ بھورے بابا کیا ہے؟''
''آدمی ہے۔ مکمل آدمی ہے۔ اپنے فن کا استاد۔''
''وہ کس قسم کا آدمی ہے؟''
''میرے خیال میں اس دور کا ایک کامیاب آدمی۔''
''تمہاری تعلیم کیا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔
''ارے۔ یہ بھورے شاہ سے اچانک مجھ پر کیوں آگئے؟''
''تمہاری باتیں سن کر۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہاری گفتگو بتاتی ہے کہ تم کافی پڑھے لکھے آدمی ہو مگر عرضیاں تم مجھ سے لکھواتے ہو۔ کیوں؟''

شامی ہنس پڑا، پھر بولا۔ ''کہاں کی باتیں کر رہے ہو دوست۔ جو تعلیم اسکولوں میں دی جاتی ہے وہ کس کے پاس ہوتی ہے۔ اصل معلم وقت ہے، وہی سب کچھ سکھاتا ہے۔ وہی میرا استاد ہے۔ اسی کی سکھائی ہوئی باتیں دہرا رہا ہوں میں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتا۔''

''بھورے بابا بھی عجیب سا انسان ہے۔''

''کس لحاظ سے؟''

''وہ جو کچھ کر رہا ہے، خود ہی شدت سے اس کی نفی کرتا ہے۔ میں نے اسے جب بھی شاہ یا درویش کہا، وہ جیسے تڑپ سا گیا۔ اس نے شدت سے مجھے اس کے لئے منع کیا۔''

''ضمیر تو ہر شخص کا ہوتا ہے نا، اور ضمیر اگر زندہ ہوتا ہے تو سچ بولتا ہے...... سچ سنتا ہے۔''

''مگر ضمیر کے خلاف عمل تو ضمیر کو قتل کر دیتا ہے۔''

''بعض اوقات ایسے دوراہے آجاتے ہیں جہاں انسان کو کسی ایک کے قتل کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ بھورے بابا کے سامنے بھی ایسا ہی ایک دوراہا آ گیا تھا۔ اگر وہ ضمیر کو قتل نہ کرتا تو اسے خود قتل ہونا پڑتا۔ مگر اسے زندہ رہنا تھا اپنے لئے نہیں، کسی اور کے لئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اب تم مجھے قتل کروانا چاہتے ہو۔ بھورے بابا کے بارے میں اتنی بات بھی تم سے ہو گئی ہے جب کہ برسوں سے یہاں رہنے والے بھی اس کے بارے میں اتنا نہیں جانتے۔'' شامی نے کہا۔

''لیکن شامی۔''

''بس بس بابا بس۔ مجھے زندہ رہنے دو۔'' شامی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر بولا۔ ''چلو۔ چلو۔ زیادہ وقت ہو گیا ہے۔ کہیں شیر نہ آجائے۔'' وہ ہنس پڑا۔

ہم غار میں آئے۔ اکرام نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بہت ہی پُراسرار کہانی چل رہی ہے مسعود بھائی۔ بڑا انوکھا کردار ہے اس بھورے شاہ کا۔''

''ہاں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

مزید کچھ دن گزر گئے۔ معمولات جاری تھے۔ ایک رات اچانک بھورے شاہ عجیب سی کیفیت میں ہمارے غار میں گھس آیا۔ وہ تنہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ بہت منتشر معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں خاموشی سے گھورتا رہا۔ پھر اس کی آواز سانپ کی پھنکار کی مانند سنائی دی۔

''تم کون ہو۔ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ کون ہو تم۔ اور سچ نہ بولے تو۔ تو۔ تو!'' اس کے دانت بھنچ گئے اور آنکھیں خون اُگلنے لگیں۔

میں نے پریشان نظروں سے بھورے شاہ کو دیکھا۔ اس کی اس کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم میں نے حلیمی سے کہا۔

''کوئی غلطی ہو گئی بڑے بابا؟'' میرے اس سوال پر وہ سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ بڑے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا اس کی کیفیت سے۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے خود ہی دوبارہ نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہم جس دن سے یہاں آئے ہیں بڑے بابا! آپ ہی کا نمک کھایا ہے اور یہی کوشش کرتے رہے ہیں کہ کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ اگر کہیں سے ہمارے بارے میں آپ کو کوئی غلط اطلاع ملی ہے تو ہم آج بھی آپ سے وہی سب

کچھ کہیں گے جو پہلے کہہ چکے ہیں یعنی مسافر ہیں اور آوارہ گردی کرتے ہوئے ادھر نکل آئے تھے اور اس کے بعد سے یہیں موجود ہیں۔ ہمارا تعلق کسی سے نہیں ہے بڑے بابا! جہاں سے بھی آپ کو کوئی غلط اطلاع ملی ہے، آپ یقین کرلیں کہ وہ غلط ہے۔"

"ہاتھ جوڑتا ہوں، تمہارے سامنے، ہاتھ جوڑتا ہوں، تمہارے قدموں میں سر رکھتا ہوں۔ خدا کے لئے، خدا کے لئے ایک بے چین روح کو اور زیادہ بے چین مت کرو۔ دیکھو اگر خدا نے تمہیں عزت سے نوازا ہے، اگر اس نے تمہیں اپنی پناہ میں لے رکھا ہے تو کسی انسان کے ساتھ بدسلوکی مت کرو۔ ایک ایسا جلتا سلگتا انسان تمہارے سامنے ہے جس کے اندر آگ دہک رہی ہے جو زندگی ہی میں جہنم پا گیا ہے، جو جہنم سے گزر رہا ہے، اسے اور جہنمی نہ بناؤ۔ خدا کے لئے تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے قدموں میں سر رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔ دیکھو انسان ہوں، ساری برائیوں کے باوجود انسان ہوں۔ اپنے آپ کو گناہوں کی دلدل میں اس قدر ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس کائنات میں خود سے زیادہ گناہگار اور کوئی نظر نہیں آتا۔ خدا کے لئے مجھے اور گناہوں کی دلدل میں نہ دھکیلو۔ مجھ میں اب قوت برداشت نہیں ہے۔" اس کی آواز لرز گئی اور آخر میں سسکیوں میں تبدیل ہوگئی۔

اکرام نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں خود ہی ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"نہیں بڑے بابا۔ میں...... میں تمہارا نمک خوار ہوں۔ یہ سب کچھ نہیں چاہتا میں۔ مجھے بس وہ بات بتا دو جس کی بناء پر تمہیں مجھ پر شک ہوا ہے۔"

"بات بتا دوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی ہے حالانکہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔ مجھے یقین آگیا ہے کہ تم بہت کچھ ہو۔ میں نے تمہیں جاگتی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن سوتی آنکھوں نے مجھے تمہاری تفصیل بتا دی ہے۔ آہ! کیا بتاؤں تمہیں، کن لمحات سے گزر رہا ہوں میں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے زندگی بھر گناہ کرنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی ایک تو نیک کام کرلیتا جو روح کی تاریکیوں میں کسی سفید نقطے کی طرح روشن ہو جاتا۔ بڑی بے حرمتی ہوئی ہے میرے ہاتھوں تمہاری۔ قید کر رکھا ہے میں نے تمہیں، دھمکیاں دی ہیں اور...... اور کیا کروں، مزاج ہی ایسا بن گیا ہے۔ اپنی اس بے چینی کو بھی صحیح الفاظ نہیں دے سکتا۔ جاہل مطلق ہوں میں۔ چنانچہ جو کچھ کہتا ہوں، اپنی دیوانگی میں کہتا ہوں۔ جس دن سے تم یہاں آئے ہو، نہ جانے کیا ہو رہا ہے، نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں تو لوگوں کے ساتھ فریب کرتا تھا، انہیں غلط دلاسے دیتا تھا، الٹی سیدھی

جڑی بوٹیاں بتا دیا کرتا تھا لیکن جب سے تم نے جواب لکھنے شروع کئے ہیں، جسے دیکھو فائدہ ہو رہا ہے، سب کی مرادیں پوری ہو رہی ہیں، سارے کام سیدھے ہو رہے ہیں۔ وہ سب اتنی نذریں لے کر آرہے ہیں میرے پاس کہ میں خود حیران رہ گیا ہوں اور جو خواب میں نے دیکھے ہیں، ان خوابوں نے مجھے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ آہ! میں پاگل ہو گیا ہوں اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ جو کچھ مجھ سے ہو گیا ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ بابا دیکھو، دیکھو بابا خدا کے لئے بڑا بابا میں نہیں ہوں۔ بڑا بابا تم ہو تم، جو اس طرح یہاں اجنبیوں کی طرح آئے۔ اس خانقاہ میں آکر ٹھہر گئے اور اس کے بعد تم نے لوگوں کو فائدے پہنچانا شروع کر دیئے۔ میرے نام سے ہو رہا ہے یہ سب کچھ۔ اللہ کے واسطے مجھے اپنی حقیقت سے آشنا کر دو۔ دن رات تمہارے قدموں میں پڑا رہوں گا۔ جب تک سر نہیں اٹھاؤں گا تمہارے پیروں سے جب تک تم اپنے منہ سے یہ نہ کہو گے کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ ان تمام گستاخیوں پر جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہیں۔ آہ! مجھ گناہگار کو اور کتنے گناہوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں بابا صاحب! ایک مضطرب دل کا مالک ہوں۔ وہ دل جس سے سکون کا گزر نہیں ہے۔ جو کچھ دل میں آتا ہے، کر ڈالتا ہوں سمجھے۔ ڈاکے بھی ڈالتا ہوں میں، ڈاکو سنتو خان کی حیثیت سے میرا نام ان علاقوں میں گونج رہا ہے۔

راتوں کو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ خانقاہ سے نکلتا ہوں، بستیوں میں لوٹ مار کرتا ہوں، خونریزی نہیں کرتا میں،

کیونکہ انسانی زندگی کو لینے کا حق مجھے نہیں ہے لیکن لوگوں کو قلاش ضرور کر دیتا ہوں اور یہاں بھی میں ڈاکا زنی کرتا ہوں لوگوں کی جیبوں پر، ان کی معصوم آرزوؤں کو جھوٹے دلاسے دے کر انہیں حسرتوں کا شکار کر دیتا ہوں۔ جس کا کام نہیں بنتا، وہ اسے اپنی تقدیر سمجھ لیتا ہے اور جس کا کام بن جاتا ہے، وہ چڑھاوے چڑھاتا ہے اس جعلی خانقاہ پر، اس جھوٹی قبر پر جس میں کچھ نہیں ہے، سوائے اس مشینی عمل کے جو ان کی آرزوئیں تم تک پہنچاتا ہے۔ بابا صاحب! میں یہ گناہ کرتا ہوں اور بابا صاحب میں یہ سب کچھ کر کے خوش نہیں ہوں لیکن کیا کروں، میرے ماضی نے مجھے یہ صورت دی ہے بابا صاحب۔ میری یہ صورت اسی دنیا نے بنائی ہے۔ میرا قصور نہیں ہے۔ میں جب بھی تنہائی میں بیٹھتا ہوں، اپنا حساب کرتا ہوں تو اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا ہوں لیکن بابا صاحب! پھر وہ سکون کہاں ہے جو انسانوں کے دلوں کو میسر ہوتا ہے۔ یہ سب جو میرے ساتھی ہیں، یہ سب سکون سے کھاتے ہیں، پیتے ہیں، آرام کی نیند سو جاتے ہیں لیکن میں نیندوں سے محروم ہوں۔ میرے کانوں میں وہ معصوم آہیں اور سسکیاں گونجتی رہتی ہیں جو میرے ذریعے مصیبت کا شکار ہونے والوں کی ہوتی ہیں۔ بابا صاحب! میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے لئے کیا کروں۔ آہ! مجھے...... مجھے سہارا دیجئے، مجھے مدد چاہئے، مجھے مدد چاہئے۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ اس طرح رو رہا تھا وہ کہ میرا دل موم ہوا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص ہے کیا چیز...... جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کی شخصیت اس سے بالکل مختلف ہے لیکن انداز بتاتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ کیوں...... آخر کیوں۔ اس کے علاوہ اس نے جو انکشاف کیا تھا، اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ رات مجھے یاد آ گئی تھی جب ہم یہاں پہلی بار آئے تھے اور رات کی تاریکی میں ہم نے کچھ لوگوں کو سامان سے لدے پھندے یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ڈاکو سنتو خان! گویا...... گویا یہ جگہ باقاعدہ جرائم کا اڈہ ہے اور اس کا سربراہ یہ شخص ہے لیکن یہ بلکتا ہوا آدمی قابل رحم تھا۔ اس کے اندر احساس گناہ تھا۔ ایک گناہگار کو سزا دینا اللہ کا کام ہے لیکن ایک بلکتے ہوئے انسان کو دلاسہ دینا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اس کے سامنے موجود ہو اور اگر ایک برا انسان کسی کی کوششوں سے اچھے راستے پر آ سکے تو پھر یہ ایک فرض بن جاتا ہے۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر اکرام سے کہا۔

''اکرام! پانی لاؤ۔'' اکرام نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی۔ اب میرا دل اس شخص کی جانب راغب ہو گیا تھا اور جو کچھ میرے بس میں تھا، وہ میں اس کے لئے کرنا چاہتا تھا۔ اکرام کا لایا ہوا پانی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے پلایا اور اس کی پشت پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''دوست! دنیا میں کوئی کچھ نہیں ہوتا۔ بس یوں سمجھ لو، ہر شخص کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ تم نے اپنا دکھ مجھ سے کہا، میں اسے سن کر تمہیں دلاسہ دینا چاہتا ہوں۔ بہت سی باتیں ہوں گی اس دوران۔ لیکن...... لیکن اس وقت جب تم اپنے دل کی ساری بھڑاس میرے سامنے نکال دو گے، مجھے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے سے آشنا کر دو گے۔ میں اس کے بعد تمہارے لئے دعائیں ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تمہیں ان نیک راستوں پر لے آئے جن سے تم دور ہو گئے ہو۔ توبہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس کے لئے ہمیں صاف الفاظ میں ہدایت کر دی گئی ہے کہ کبھی رحمت ایزدی سے ناامید نہ ہوا جائے۔ چنانچہ تم جو کوئی بھی ہو، اگر تمہارا دل گوارا کرے تو اپنے دل کو میرے سامنے خالی کر دو، میں خلوص دل سے تمہارے لئے دعائیں کروں گا حالانکہ مجھ ناچیز کی حیثیت ہی کیا لیکن اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے ان بندوں کی سن لیتا ہے جو خلوص سے کچھ مانگتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کون ہو تم، تمہاری کہانی کیا ہے، کوئی بات راز نہ رکھنا۔ اب تو میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ تمہیں کس نام سے پکاروں۔ بھورے شاہ کہوں، سنتو خان کہوں یا بڑے بابا کہوں؟''

''نہ میں بھورے شاہ ہوں، نہ سنتو خان ہوں، نہ بڑا بابا ہوں۔ میرا نام نادر ہے۔ نادر حسین، یہ میرا اصل نام ہے۔ بابا صاحب! میں کسی زمانے میں صرف نادر حسین تھا۔ ایک معصوم دیہاتی، ایک ایسے گھرانے کا فرد جس کے بارے میں لوگ کچھ نہیں کہتے تھے کیونکہ وہ گھرانہ قابل ذکر ہی نہیں تھا۔ میرا باپ کسان تھا، ماں تھی، دو بہنیں تھیں۔ ایک چھوٹی ایک بڑی۔ یہ کنبہ تھا ہمارا۔ میرا باپ اس کنبے کی پرورش کرتا تھا، میں بھی حسب توفیق اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے باپ کو سانپ

نے کاٹ لیا۔ کھیتوں پر کام کررہا تھا کہ سانپ نے اس کی پنڈلی میں کاٹ لیا۔ زہر چڑھ گیا۔ اس کی پنڈلی پر بند باندھ کر زہر کو آگے بڑھنے سے تو روک دیا گیا لیکن اس کی ٹانگ کا علاج نہیں ہوسکا۔

ہمارے پاس نہ تو پیسے تھے نہ وہ ذرائع کہ ہم کسی اچھی جگہ باپ کا علاج کراسکتے۔ بس میونسپلٹی کے ڈاکٹر نے میرے باپ کی ٹانگ کاٹ دی اور اس طرح ہمارے ہاں ان مصائب کا آغاز ہوگیا جو انسانی زندگی کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ فاقے شروع ہوگئے ہمارے گھر میں...... میرا باپ، چوہدری کے کھیتوں پر کام کرتا تھا مگر چوہدری نے مجھے اس کی جگہ نوکر نہیں رکھا۔ اس کے دل میں برائی آگئی تھی۔ میری بہن کو دیکھ لیا تھا اس نے۔ نوجوان تھی، خوبصورت تھی۔ میری ماں فریاد لے کر گئی تھی اس کے پاس۔ بدنگاہ چوہدری نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا تھا مگر چوہدری نے اسے شیشے میں اتار لیا۔ وہ بانجھ تھی، اولاد نہیں ہوتی تھی اس کے ہاں۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آگئی۔ میری ماں سے اس نے کہا۔

''تمہاری پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ ایک خیال لے کر آئی ہوں تمہارے پاس۔''

''حکم دیں بیگم صاحبہ۔'' میری ماں نے کہا۔

''تمہیں پتا ہے کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔''

''اللہ کرم کرے گا بیگم صاحبہ۔''

''میں نے چوہدری صاحب کو بڑی مشکل سے تیار کیا ہے۔ ایک راستہ ہے میرے سامنے، تمہاری بڑی بیٹی شمو ہے نا؟''

''ہاں......'' میری ماں نے لرز کر کہا۔

''اس کا نکاح چوہدری صاحب سے کردو...... حق مہر میں ہم ایک باغ اور دس بیگھے زمین دیں گے۔ تمہارے بھی دلدر دور ہوجائیں گے۔ یہ کام بالکل خاموشی سے ہوگا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ شمو میرے پاس رہے گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟''

''نکاح......'' میری ماں نے دہشت سے کہا۔

''ایک اولاد پیدا ہوجائے اس سے تو چوہدری صاحب خاموشی سے اسے طلاق دے دیں گے۔ جو اسے دیا ہوگا سب، تمہارا بچہ میرا کہلائے گا۔ بعد میں تم شمو کا بیاہ کردینا، کس کو پتا چلے گا۔''

''کیا کہہ رہی ہو بیگم صاحبہ......'' میری ماں بمشکل بولی۔

میں نے بھی سن لیا تھا۔ خون کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا میرے وجود میں، پاگل ہوگیا تھا میں۔ آگے بڑھ کر میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

''فوراً گھر سے نکل جاؤ بیگم صاحبہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے آدمی تمہاری لاش لینے آئیں۔''

''تو ایسی کون سی بری بات کہہ دی میں نے...... آئے ہائے ایک تو احسان کررہے ہیں۔ چلو ٹھیک ہے بھوکے مرو گے تو خود آؤ گے۔''

خون کے سارے گھونٹ سینے میں اتار لئے میں نے، اپنا لہو خود چاٹ لیا۔ معذور باپ، بے کس ماں، جوان بہنوں کا میرے سوا کوئی سہارا نہیں تھا۔ ان کے لئے مجھے زندہ رہنا تھا، صبر کرنا تھا، میں نے صبر کرلیا۔ ہم نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ پیٹ بھرنے کا سہارا چاہئے تھا۔ سب کو پالنا تھا، سب کچھ بھلا دینا تھا۔ کوشش کی کچھ کامیابی حاصل ہوگئی۔ راجہ خان لوہار کے ہاں نوکری مل گئی۔ بھٹی کا پنکھا چلانے کی، گھن چلانے کی۔ روٹیوں کا سہارا ہوگیا۔ راجہ خان بہت برا آدمی تھا۔ جوا کھیلتا تھا، تاڑی پیتا تھا۔ چار، چھ دن کام کرکے کما لیا۔ چار، چھ دن بیٹھ کے کھالیا۔ مجھے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے گھر میں بھی آنا جانا تھا۔ اس کی بیوی رشیدہ بڑی نیک عورت تھی۔ نمازی، پرہیزگار، شوہر کی برائیوں کو چھپانے والی۔ بے اولاد تھی۔ مجھے بھائی کی حیثیت دینے لگی۔ وہ میری مدد بھی کرتی تھی۔ خود اچھے گھر کی تھی۔ ماں باپ بھی لیتے دیتے رہتے تھے۔ برے وقت کے لئے پیسے بچاتی تھی کیونکہ شوہر ناقابل بھروسا تھا۔ ان پیسوں میں سے وہ میری مدد کرتی تھی۔ میری مجبوریوں نے مجھے اس کی مدد

لینے پر آمادہ کر دیا تھا مگر بدکار راجہ نے ان باتوں کو دوسری نگاہوں سے دیکھا اور ایک دن تاڑی کے نشے میں اس نے اپنی بیوی کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ میں معمول کے مطابق بھٹی پہنچا تھا۔ راجہ تو موجود نہیں تھا مگر رشیدہ کے پورے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ زخمی سر پر پٹی کسی ہوئی تھی۔

''ارے، یہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، تو جا اپنا کام کر۔''

''مارا ہے راجہ بھیا نے؟''

''نادر...... تو اپنا کام کر...... تجھے کیا ان باتوں سے، جا بھٹی سلگا، نہیں تو راجہ بگڑے گا۔''

''کیوں مارا ہے اس نے تجھے؟'' میں نے دلسوزی سے کہا۔

''شوہر ہے وہ میرا۔ میں جانوں، وہ جانے...... تو بلاوجہ بیچ میں آ رہا ہے۔'' میں نے افسردگی سے گردن جھکا لی۔ پھر آہستہ سے کہا۔

''بھائی بھی تو کہتی ہے تو مجھے رشیدہ۔ مگر...... میں غیرت مند بھائی کہاں ہوں، میں تو خود تجھ سے پیسے لیتا ہوں۔'' میرے ان الفاظ پر وہ تڑپ گئی۔ آگے بڑھی اور میرا سر سینے سے لگا لیا۔

''یہ پیسوں کا ذکر تو بیچ میں کیوں لے آیا رے۔ ایسی بیکار باتیں مت کیا کر۔'' اور پھر اس کا چہرہ دہشت سے سفید گیا۔ وہ سہمی ہوئی آنکھوں سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

✦✤✦✤✦

میں نے سنبھل کر گردن گھمائی تو راجہ دروازے میں نظر آیا۔ وہ خاموشی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت ابھر آئی۔ کم بخت نشے باز ایسی نیک عورت پر ظلم کرتا ہے۔
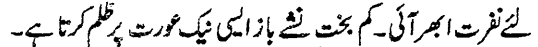
''آج بھٹی نہیں جلے گی کیا؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ میں اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بھٹی جلی، کام ہوا، میں نے گھن بھی چلایا۔ راجہ نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

شام کو میں نے کہا۔ ''راجہ بھیا ایک بات کہوں۔''

''کیا بات ہے؟''

''تم نشہ مت کیا کرو۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے۔''

''تم نے رشیدہ بھابی کو مارا ہے؟''

''تو پھر...... نکاح میں تو میرے ہی ہے وہ۔''

''عورت پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے راجہ بھیا۔'' میں اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

''جا نادر، اپنے گھر جا، میرے منہ مت لگ۔ جا چلا جا۔'' اس نے کہا۔ میرا ان داتا تھا وہ، اس سے زیادہ اور کیا کہتا۔ گردن لٹکا کر واپس آ گیا۔ رشیدہ کے لئے دل دکھ رہا تھا لیکن سچ بات ہے میاں بیوی تھے وہ، میں کیا کر سکتا تھا۔ خود کو سمجھا لیا۔ دوسرے دن اپنا کام کر رہا تھا۔ سرخ لوہے پر گھن چلا رہا تھا کہ راجہ نے بیٹھے بیٹھے ایک بہت بری بات کر دی۔ اتنی بری کہ سارا وجود لوہے کی طرح سرخ ہو گیا۔ میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''بہن ہے وہ میری...... بھابی کہتا ہوں میں اسے، ماں کے برابر ہے وہ میرے لئے۔ آج تم ضرورت سے زیادہ نشے میں ہو راجہ بھیا۔'' مگر وہ نہ مانا۔ اس نے میری روح پر ایسی ضربیں لگائیں کہ مجھے جوابی ضرب لگانی پڑی مگر یہ ضرب ساڑھے چار سیر وزنی گھن کی تھی جو میرے ہاتھ میں تھا اور سر سے اوپر اٹھا ہوا تھا۔ راجہ بھیا کا سر غائب ہو گیا، شاید گردن میں گھس گیا تھا۔ اس کا سفید سفید مغز خون کے ساتھ سرخ دہکتی ہوئی بھٹی میں گر رہا تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں وہ بھی بھٹی ہی پر گر پڑا

اور گوشت کی چراند دور دور تک پھیل گئی۔ میرے ہوش وحواس گم ہو گئے تھے۔ خون کی چادر تنی ہوئی تھی میری آنکھوں پر......
آج تک نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ ہوش اس وقت آیا تھا جب میں چوہدری صاحب کے سامنے تھا۔
''حواس ٹھیک ہو گئے تیرے......'' چوہدری صاحب نے کہا۔
''چوہدری صاحب! میں...... یہ...... یہاں......'' میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''پھانسی کا پھندہ تیار ہو رہا ہے تیرے لئے بیٹے۔ اسی میں گردن پھنسے گی۔ تختہ ہٹا دیا جائے گا، آنکھیں اور زبان باہر نکل آئے گی۔ اوئے جوانی زیادہ چڑھ رہی تھی تجھ پر۔ بیچارے لوہار کو مار ڈالا۔''
''راجہ بھیا خود شیطان بن گیا تھا چوہدری صاحب۔''
''اوئے ہم سے بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ سیدھا پولیس کے ہاتھوں میں جاتا، ہم یہاں لے آئے۔''
''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے چوہدری صاحب، اور اس کے بعد جو ہوگا، وہ میری تقدیر ہے۔''
''اتنا بڑا مان دیا تجھے، سارے گھر والے عیش کرتے۔ اب بھی سوچ لے، ہم بچا لیں گے تجھے۔ تو قبول کر کے نہ دینا۔ کہہ دینا بھٹی میں گر گیا تھا، تو اس وقت پاس نہیں تھا۔ نشہ تو کرتا ہی تھا سسرا، ہم گواہی دے دیں گے، پھر کسی کی مجال ہے کہ بولے مگر ایسے نہیں۔''
''چوہدری صاحب......!''
''سوچ لے اچھی طرح...... فیصلہ تجھے کرنا ہے۔''
''پولیس نہیں آئی چوہدری صاحب؟''
''آئی تھی، ٹال دیا ہم نے۔ تجھے لے آئے اپنے ساتھ اور یہاں بند کر دیا۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ پولیس لے گئی ہے تجھے۔ پولیس والے اپنے یار ہیں۔ جب تک ہم نہیں کہیں گے، وہ دوبارہ نہیں آئیں گے مگر فیصلہ تجھے کرنا ہے۔ تیرا باپ تیرے سامنے نہیں بول سکتا، یہ ہمیں معلوم ہے۔ بول کیا کہتا ہے۔ فیصلہ کر ابھی، اسی وقت...... اور پھر یہ سب کچھ کسی کو پتہ تھوڑی چلے گا۔ ہم خود بھی تو اس بات کو چھپا کر رکھیں گے۔''
''فیصلہ اسی وقت کرنا ہوگا چوہدری صاحب؟'' میں نے پوچھ۔
''سولہ آنے کھرا سودا ہوگا۔ تو تیار ہوگا، ہم نکاح کریں گے اور بس...... اس کے بعد ہم تجھے سامنے لے آئیں گے۔ لوگوں سے کہیں گے کہ پولیس نے تجھے بے گناہ قرار دے دیا۔''
''ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔ ہو گیا فیصلہ۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چوہدری بھی خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر مسکراتا ہوا مجھ سے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔
''اسے کہتے ہیں عقلمندی سالے صاحب۔ یہ ہوئی بات۔ اب تم دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔'' وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گردن دبوچ لی۔ میری انگلیاں اس کی گردن پر شکنجے کی طرح کس گئیں۔
''میرا فیصلہ پسند آیا چوہدری صاحب! کیسا رہا میرا فیصلہ؟'' وہ میری گرفت میں تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں اور زبان باہر نکل آئیں۔ یہی منظر اس نے میرے سامنے پیش کیا تھا۔ جب اس کی جان نہ رہی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کی تلاشی لی۔ بہت سے روپے تھے اس کے پاس، سونے کی چین، ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھا وہ۔ یہی نہیں اس کے اس کمرے میں تجوری بھی تھی جسے میں نے خالی کر دیا۔ میں واقعی عقلمند ہو گیا تھا۔ چھپتا چھپاتا گھر واپس آیا۔ ماں، باپ اور بہنوں کو تیار ہونے کے لئے کہا۔ بدر چاچا کے بیل کھولے، گاڑی جوتی اور سب کو اس میں بٹھا کر چل پڑا۔ صبح پانچ بجے میں ہردوار جنکشن پہنچا۔ وہاں سے کانپور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا اور کانپور آ گیا۔ ماں، باپ، بہنوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اپنے ساتھ اتنا لایا تھا کہ ساری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ ایک گھر خریدا، نام بدلا اور رہنے لگا۔ سب پُرسکون تھے، میں مضطرب تھا۔ پھر ایک دن میں نے اخبار میں اپنی تصویر دیکھی۔ پولیس کو دہرے قتل کے مجرم کی تلاش تھی۔ سارے

ہندوستان کی پولیس کو چوکس کر دیا گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ بات ایسے نہ ٹل جائے گی۔ شمو کے لئے ایک شریف نوجوان تلاش کیا۔ اسے بہت کچھ دے کر اس کی شادی کر دی۔ باقی رقم باپ کو دے کر کہا۔ چھوٹی بڑی ہو جائے تو اسے بھی رخصت کر دیا جائے اور پھر وہاں سے بھاگ آیا۔ ایک روپوش مجرم کیلئے جائے پناہ کہیں نہ تھی۔ زندہ رہنے کیلئے مجرم تنہا تھا چنانچہ میں سنتو خان بن گیا۔ گروہ بنایا، یہ خانقاہ بنائی اور یہاں جعلی پیر بن کر بیٹھ گیا۔ باقی سب کچھ تمہارے سامنے ہے بابا صاحب۔ خوب کھیل کھیلے مگر سکون نہیں ملا۔ احساس گناہ۔ گناہ پر گناہ کرائے جا رہا ہے۔ میری منزل کہاں ہے بابا صاحب۔ کوئی منزل ہے میری۔"

میں سکتے کے عالم میں اس کی کہانی سن رہا تھا۔ اکرام بھی پتھرایا ہوا تھا۔ بہت دیر کے بعد میں نے کہا۔

"ڈاکے کیوں ڈالتے ہو؟"

"دولت کے لئے۔"

"اتنی دولت کا کیا کرو گے؟"

"خرچ کر دیتا ہوں۔"

"کہاں......؟"

"عرضیاں لانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں بیٹیاں بیاہنی ہوتی ہیں، بیماروں کا علاج کرانا ہوتا ہے۔ ان کی دعائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ رات کی تاریکی میں کوئی منہ پر رومال لپیٹے ان کے دروازے پر جاتا ہے اور ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں پیر بھورے شاہ آئے تھے اور سب کچھ ہو گیا تھا۔ پھر وہ انہی پیسوں میں سے پھولوں کی چادر چڑھانے آتے ہیں، گھی کے چراغ جلانے آتے ہیں۔"

"اوہ......تم یہ کرتے ہو؟"

"ہاں بابا صاحب۔"

"پھر بھی سکون نہیں ملتا؟"

"نہیں بابا صاحب! بے سکون ہوں، دل کو قرار نہیں ملتا۔"

"ماں باپ، بہنوں سے دوبارہ ملے؟"

"کبھی نہیں مگر ان کی خبر رکھتا ہوں۔ سب ٹھیک ہیں۔ دوسری بہن کی شادی بھی ہوگئی ہے۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ باپ کے پاس کافی رقم موجود ہے اور وہ خوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ میں صرف اس لئے ان کے پاس نہیں جاتا کہ کہیں میری شناخت نہ ہو جائے اور سب کچھ بگڑ جائے۔ بہت دور ہوں میں ان سے لیکن بس یہ اطمینان ہے کہ وہ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر بابا صاحب، میرا سکھ چین کہاں ہے؟ میرا سکون کہاں ہے؟ مجھے سکون چاہئے بابا صاحب، مجھے سکون چاہئے۔"

بڑی حیران کن کہانی تھی۔ بڑا عجیب احساس تھا میرے دل میں اس شخص کے لئے۔ اکرام کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ کیسا عجیب کردار ہے۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ بھلا میں کیا اور میری اوقات کیا کہ میں ایسے کسی کردار کو کوئی سہارا یا سنبھالا دے سکوں۔ بہت دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا بابا صاحب۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ آپ مجھے اپنے بارے میں نہیں بتائیں گے؟"

"اب میں تمہیں نادر حسین کہہ کر ہی پکاروں گا۔ نادر حسین! یقین کرو جھوٹ نہیں بول رہا میں، جو میں نے روز اول کہا، وہ آج کہہ رہا ہوں۔ ایک مسافر ہوں۔ آوارہ گردی کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا ہوں اور اس کے بعد سے تمہارا مہمان ہوں۔ تم نے جس حال میں بھی رکھا، خوش ہوں۔ اللہ کے کلام میں برکت ہوتی ہے۔ کون بھلا اس بات سے منحرف ہے کہ کلام الٰہی سے

بڑھ کر اور بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے۔ اگر لوگوں کو اس کلام سے فائدہ ہو جاتا ہے، اگر ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ بس یہ کلام الٰہی کی برکت ہے۔"

"آہ! کیا مجھ پر یہ بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ میرے لئے بھی تو دعا کرو بابا صاحب! مجھے بھی تو سکون کی دولت عطا کرو۔ میں جل رہا ہوں، اندر ہی اندر سلگ رہا ہوں، مدھم مدھم دھواں دے رہا ہوں میں...... کم از کم اتنی ہی دعا کردو میرے لئے کہ میرا یہ وجود جلدی بھسم ہوجائے، میں جل کر راکھ ہوجاؤں۔ آہستہ آہستہ جلنا میرے لئے اب ناقابل برداشت ہو چکا ہے۔"
میں نے ہمدردی کی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔

"دیکھو نادر حسین! ضمیر کی عدالت میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ دنیا کے تمام فیصلوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں سچ کی حکمرانی ہے اور تم نے جو کچھ کیا ہے، ضمیر کی عدالت اسے قبول نہیں کرتی۔ تم بے شک نیک راستوں کے مسافر ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو، وہاں شاید توازن متاثر ہو جاتا ہے۔ توازن نہیں ہے نادر حسین...... یہی توازن قائم کرنا ہے تمہیں۔ جب تم لوٹ مار کرتے ہوگے سنتو خان کی حیثیت سے تو ظاہر ہے دلوں سے آہیں نکلتی ہوں گی، بددعائیں دیتے ہوں گے لوگ تمہیں اپنی بربادی پر جس کے نتیجے میں بے سکونی تمہاری روح میں جا بسی ہے۔ اگر مجھ سے مشورہ چاہتے ہو تو میرے چند مشوروں کو قبول کرو۔ سب سے پہلے ڈاکا زنی کا یہ سلسلہ ترک کردو۔ یہ سب سے بری چیز ہے، اس کے بعد اور بھی کچھ مشورے دوں گا میں تمہیں۔ ذرا غور کرلوں اس بات پر...... اکرام پانی لاؤ۔" ایک بار پھر اکرام نے پانی کا ایک پیالہ میرے سامنے پیش کردیا۔
میں نے اس پر درود پاک سات بار پڑھ کر دم کیا اور نادر حسین سے کہا۔

"لو یہ پانی پی لو۔" نادر حسین نے پانی کا یہ پیالہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ لے کر منہ سے لگایا اور اسے غٹا غٹ پی گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اگر طبیعت قبول کرتی ہے تو نماز کا آغاز کردو۔ تمہاری یہ بے سکونی تو چٹکیوں میں ہوا ہوجائے گی۔ اس کے بعد نادر حسین، میں تم سے اور بھی بہت سی باتیں کروں گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"مجھے سکون چاہئے، سکون دے دیجئے مجھے بابا صاحب۔ جو آپ کہیں گے، سو کروں گا۔"

"پھر ٹھیک ہے جاؤ آرام کرو، یہ سارے کام یونہی چلنے دو، سوائے اس کے جو میں نے تم سے کہا۔" نادر حسین اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اکرام ابھی تک اس داستان کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اکرام نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"مسعود بھیا! اس دنیا میں کوئی ایسا ہے جسے کوئی دکھ نہ ہو؟ کیا کوئی ایسا شخص مل جائے گا جو یہ کہے کہ وہ زندگی کے مسائل سے دور رہا ہے اور اس کی ذات میں غم کا کوئی پہلو نہیں ہے؟"

"کچھ نہیں کہا جاسکتا اکرام! کائنات بنانے والے نے اپنی کائنات میں کیا کچھ رکھا ہے، بھلا کون جان سکتا ہے۔ وہی جانے جس کا یہ گورکھ دھندا ہے۔" اکرام عجیب سے تاثر میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنے دکھ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ میرے دل میں ایک بہن کسک رہی ہے، آپ کے دل میں ایک پورا گھرانہ۔ نجانے کس کس دل میں کیا کیا دکھ پل رہا ہوگا۔ ویسے مسعود بھیا، آپ یقین کیجئے کچھ دکھی ایک ساتھ جمع ہوجائیں تو دکھ کا احساس ہلکا لگنے لگتا ہے۔ خیر آپ کے ساتھ یہ وقت گزار کر میری تو کایا ہی پلٹ گئی ہے اور جو سوچیں آپ کی قربت نے دی ہیں اور ان میں سب سے نمایاں سوچ یہ ہے کہ جہاں انسان اپنی تمام تر جدوجہد کر کے تھک جاتا ہے، وہاں پھر اسے اپنی الجھنیں اس کائنات کے خالق کے سپرد کردینی چاہئیں جو تمام مشکلات کا حل رکھتا ہے۔ اس طرح اس پر تکیہ کر کے کم از کم یہ احساس ضرور ہوجاتا ہے کہ جب فیصلہ ہوگا تو بات بن جائے گی۔ مسعود بھیا مجھے اتنا سکون مل گیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا آپ کو۔ ثریا جب بھی یاد آتی ہے، ہاتھ اٹھا کر اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ مالک اسے اپنی پناہ میں رکھنا کہ تو سب سے بڑا رکھوالا ہے، اور مجھے یوں لگتا ہے مسعود بھائی جیسے زبردست طاقتور محفوظ ہاتھوں نے میری ثریا کے سر پر اپنا سایہ ڈال دیا

ہو مگر نادر حسین کی کہانی نے دل پر عجیب سا اثر ڈالا ہے۔ کتنا دکھی ہے یہ شخص۔ آپ کے خیال میں کیا اس کا یہ عمل جو اس نے آج تک کیا، کیا مناسب ہے؟'' اکرام نے پوچھا اور میں گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

''کیا ہے، کیا نہیں ہے، یہ جانے دو۔ بس جو کچھ ہمارے علم میں ہے، اسے بتا دیں گے۔ باقی وہ جانے اور اللہ۔'' اکرام نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی تھی۔

نادر حسین اب زیادہ تر ہمارے پاس بیٹھنے لگا تھا۔ اس کی کیفیت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ پہلے جیسی شان و شوکت اب اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔ اداس خاموش آ کر دوزانو بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے اسے نماز سکھانا شروع کر دی تھی۔ اس نے بڑی پابندی سے ہمارے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی تھی۔ درود پاک کا پھونکا ہوا پانی وہ بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ پیتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے کہا۔

''بابا صاحب! یہ باقی لوگ سرکشی کر رہے ہیں۔ میں اتنے دن سے خاموش بیٹھا ہوں تو آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ سرکشی کریں گے کیونکہ بہت دن سے انہوں نے کوئی ڈاکا نہیں ڈالا ہے اور صرف انہی چڑھاووں کی روٹیوں پر گزر بسر ہو رہی ہے۔ ویسے تو ہمارے پاس بہت کچھ موجود ہے، بھنڈار بھرے پڑے ہیں لیکن ایک عادت جو ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ مجھ سے بغاوت نہ کر دیں۔ ان کی بغاوت اچھی نہیں ہوگی۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور کہا۔

''ان کے پینے کا پانی کہاں ہے نادر حسین؟'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا لیکن پھر سمجھ کر جلدی سے بولا۔

''میں سمجھ گیا بابا صاحب۔ آپ مجھے پانی پڑھ کر دے دیجئے۔'' چھ سات دن تک ان لوگوں کو درود پاک کی برکتوں میں ڈوبا ہوا پانی پلایا گیا اور نادر حسین نے مسکرا کر کہا کہ اب ان کی سرکشی ختم ہو گئی ہے اور وہ معتدل نظر آنے لگے ہیں۔ کچھ دن کے بعد نادر حسین نے خوشخبری سنائی کہ اسے نماز پڑھتے دیکھ کر ان میں سے کچھ نے نماز پڑھنا شروع کر دی ہے۔ ایک دن اکرام نے کہا۔

''ایک خیال میرے دل میں بار بار آتا ہے مسعود بھائی۔ لوگ اس خالی قبر کو کسی بزرگ کی قبر سمجھ کر یہاں منتیں، مرادیں مانگتے ہیں اور ہم مجرمانہ طور پر ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اس طرح وہ فریب کھاتے ہیں، کیا ہم یہ فریب انہیں دیتے رہیں۔''

''بیشک یہ غلط ہے۔ قبر پرستی بت پرستی کے مترادف ہے لیکن میں بہت کچھ سوچ کر بھی اس کا حل نہیں تلاش کر سکا ہوں۔ بس اتنی سوچ ہے میری کہ مخلوق خدا کے مسائل علم میں آ جاتے ہیں اور ہم بساط بھر ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ نادر حسین سے مشورہ کریں گے، ہو سکتا ہے کوئی اور حل نکل آئے۔''

معمولات جاری تھے۔ نہ مجھے اور نہ اکرام کو کوئی پریشانی تھی۔ مجھے تو فوراً ہی پتا چل جاتا تھا کہ میری کیا ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ افسران اعلیٰ فیصلہ کرتے تھے کہ میری پوسٹنگ کہاں کی جائے اور جب تک کہیں اور تبادلہ نہ ہو، مجھے وہیں اپنے فرائض سرانجام دینا ہوتے تھے۔ یہاں بھی میری ضرورت تھی۔ مشکلات میں گھرے لوگ آتے، اپنے دکھ درد بیان کرتے۔ آسمانی رہنمائی میں جو کچھ ذہن میں آتا، انہیں بتا دیتا۔ اس میں میرا کوئی دخل نہ تھا۔ کئی بار مراقبے کر کے اکرام کے اعتراض کا حل مانگا مگر خاموشی رہی تو میں بھی خاموش ہو گیا۔

خانقاہ کا ماحول بے حد پُروقار ہو گیا تھا۔ ہم پر اب کوئی قید نہیں تھی۔ راتوں کو باہر نکل آتے تھے، کھلی فضا میں عبادت کرتے تھے۔ ایک رات میں تنہا باہر نکلا اور تاروں کی چھاؤں میں دور دور تک کے پُرسکون ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ فاصلے پر میں نے ایک ٹیلے پر کچھ تحریک دیکھی۔ غور کیا تو پہچان گیا۔ یہ نادر حسین تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دکھ ہوا۔ نہ جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمدردی ابھر آئی اور میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میرے قدموں کی چاپ پر بھی اس نے گردن نہیں گھمائی اور اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔

''نادر حسین، کیا بات ہے، کیا سوچ رہے ہو؟'' مگر میری آواز پر بھی اس نے جنبش نہیں کی۔ نہ جانے کیوں میرے دل

میں خوف کا احساس ابھر آیا۔ میں نے اسے زور زور سے جھنجوڑا لیکن وہ سکتے کے عالم میں تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں۔ پوری آنکھوں میں سفید ڈھیلے چھائے ہوئے تھے۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ ایک عجیب سا خوف مجھ پر مسلط ہوگیا اور میں اسے اسی طرح چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوگیا ہے۔

دوسری صبح فجر کی نماز کے بعد اکرام سے رات کے اس واقعے کا تذکرہ ہی کرنا چاہتا تھا کہ اکرام نے کہا۔ ''نادر حسین سے کتنے دن سے ملاقات نہیں ہوئی مسعود بھائی۔''

''بہت دن سے ہمارے پاس نہیں آیا لیکن......''

''کچھ عجیب سی کیفیت ہوگئی ہے اس کی۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اکثر چلچلاتی دھوپ میں اسے سورج کی طرف منہ اٹھائے کھڑے دیکھا ہے۔ کئی بار راتوں کو جاگا تو کبھی اسے کھڑے ہوئے پایا، کبھی ساکت بیٹھا ہوتا ہے۔ دو تین دن پہلے کی بات ہے میں رات کو باہر نکل آیا تو وہ کچھ فاصلے پر ٹیلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نظر انداز کر کے آ گیا۔ صبح کو نماز کے بعد بھی اسے کھڑے ہوئے پایا اور پھر ساری دوپہر وہ اسی طرح کھڑا رہا۔''

''مجھے نہیں بتایا تم نے......''

''بس بھول گیا۔''

''اللہ نہ کرے اس کا ذہنی توازن متاثر نہ ہوگیا ہو۔''

''کیا کیا جائے؟''

''تلاش کرو اسے، وہ بہت دکھی انسان ہے۔'' میں نے کہا۔ اکرام کو رات کا واقعہ سنانے کا خیال یکسر ذہن سے نکل گیا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ پوری خانقاہ میں نادر حسین کو تلاش کیا، وہ نہ ملا۔ تب مجھے اس ٹیلے کا خیال آیا اور اکرام کو ساتھ لے کر میں اس ٹیلے کی طرف چل پڑا۔ نادر حسین وہاں بھی نہیں ملا تھا۔ میں نے یہاں آ کر اکرام کو گزری رات کا واقعہ بتایا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ تعجب سے بولا۔

''تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں بھیا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ دیوانگی دوسری بات ہے مگر آنکھوں کا بدل جانا۔ مسعود بھائی میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی اور معاملہ نہ ہو۔''

''اور معاملہ......''

''یہ خانقاہ مصنوعی ہے اور یہاں کسی بزرگ کا دخل نہیں ہے۔ کوئی یہاں اثر انداز ہوسکتا ہے، ہمیں نگاہ رکھنی پڑے گی، خاص طور سے یہ دیکھنا پڑے گا کہ نادر حسین کی کیا کیفیت ہے۔''

میں اکرام کا اشارہ سمجھ گیا تھا لیکن نہ جانے دل اس سے اتفاق کیوں نہیں کر رہا تھا۔ نادر حسین کہیں بھی نہیں ملا اور ہم واپس آ گئے۔ آج عرضیاں لکھنے کا دن تھا۔ حسب معمول اس کام پر بیٹھ گئے۔ یہ بھی باقاعدہ کام ہوتا تھا۔ حاجت مند انہی روایات کے ساتھ آتے تھے اور سورج ڈھلے خانقاہ خالی ہوجاتی تھی۔ ہم نے ان روایات کی تردید نہیں کی تھی اور انہی پر عمل کر رہے تھے۔ خانقاہ خالی ہو چکی تھی۔ اکرام تمام عرضیاں ترتیب دے چکا تھا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے کہ اچانک شامی بدحواس ہمارے پاس دوڑا چلا آیا۔ اس کی کیفیت بے حد خراب تھی۔ سفید دھونکنی بنا ہوا تھا، چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بات منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔

''مم...... مسعود بھائی...... مسعود بھائی۔''

''کیا ہوا...... کیا بات ہے شامی؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔
''بڑا بابا...... بڑا بابا قتل کر دیا گیا۔ کسی نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کی لاش...... اس کی لاش قبر پر پڑی ہوئی ہے۔ سر الگ کر دیا گیا ہے، ہاتھ پاؤں الگ الگ پڑے ہوئے ہیں۔ ساری قبر خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بڑا بابا مار دیا گیا مسعود بھائی...... بڑا بابا مار دیا گیا۔ میں چراغ جلانے گیا تھا تو میں نے...... میں نے۔'' شامی کی آواز رندھ گئی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اکرام بھی سکتے میں رہ گیا تھا۔ بمشکل تمام میں نے شامی سے کہا۔
''آؤ......'' ہم تینوں لڑکھڑاتے قدموں سے خانقاہ کے اس حصے کی طرف بڑھ گئے جہاں قبر تھی۔
باہر کا ماحول سنسان تھا۔ بیرونی لوگ تو سرشام چلے جاتے تھے، خانقاہ کے باسی بھی اپنی کمین گاہوں میں گھس جاتے تھے۔ یہ لوگ اب کیا کرتے ہیں، اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن سنا یہ گیا تھا کہ زیادہ تر لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ باقی ان کے معمولات کیا ہیں، یہ تفصیل سے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔
ہم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ چراغ جل رہا تھا۔ اس کی پیلی روشنی میں نادر حسین عرف بڑے بابا ایک دیوار کی طرف پشت کئے دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بدن سا[illegible] اور ہمارے قدموں کی آہٹ پر بھی اس کے اندر کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ میں نے حیران نظروں سے شامی کو دیکھا [illegible] نے کہا تھا وہ تو نہیں تھا مگر شامی کی آنکھیں حیرت سے چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ چکرا رہا تھا۔ اکرام بھی تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شامی نے بمشکل کہا۔
''خدا کی قسم۔'' میں نے جھوٹ نہیں بولا۔
''کیا مطلب۔ گویا اب بھی......'' میں نے کہا۔
''میں اندھا تو نہیں ہوں۔ میں نے خود دیکھا تھا۔ ارے میرے مالک...... خون...... بھی نہیں ہے مگر اس وقت، گردن یہاں پڑی تھی۔ ہاتھ وہاں اور پاؤں...... اور دھڑ...... قسم کھا رہا ہوں مگر...... بڑا بابا، بڑا بابا......'' میں اندھا دھند آگے بڑھا اور نادر حسین کے قریب پہنچ گیا۔ بڑے بابا تم ٹھیک ہو...... وہ نادر حسین کے سامنے پہنچ گیا، پھر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اُچھل کر ہم پر آ رہا۔ اکرام نے اسے گرنے سے بچایا تھا۔ ''آنکھیں، آنکھیں۔ اوہو، ہو، ہو...... آنکھیں، ہو ہو ہو۔'' شامی کا بدن کانپنے لگا۔ وہ جھومنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اکرام کو ہی اسے سنبھالنا پڑا تھا۔ وہ آنکھیں آنکھیں بڑبڑاتا ہوا بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم دونوں پریشان ہو گئے۔
''اب کیا کروں۔'' اکرام نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ میں آگے بڑھ کر اکرام کے پاس پہنچا اور شامی کو سنبھال لیا۔
''باہر لے چلو......'' میں نے کہا۔
''اور وہ، وہ......'' اکرام نے نادر حسین کے بارے میں کہا۔
''اسے فی الحال چھوڑو۔ آؤ......!'' میں نے شامی کو سنبھال کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں باہر آ گئے۔ کچھ دُور چل کر شامی کو پتھر کی سل پر لٹا دیا گیا۔ اس میں ہوش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر ہراساں سے عاری رہا۔ پھر چونک پڑا، ہمیں دیکھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر بولا۔
''خدا کی قسم میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں ہوش و حواس میں تھا۔ لاش خون میں ڈوبی ہوئی تھی اور بڑے بابا کے اعضا الگ الگ پڑے ہوئے تھے۔ میں تو دہشت کھا کر بھاگا تھا۔ مگر بعد میں...... اور پھر...... پھر مسعود بھائی خدا کی قسم میں نے بڑے بابا کی آنکھیں دیکھیں۔ اُف میرے خدا کیسی بھیانک آنکھیں تھیں۔ ان میں پتلیوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بس سفید سفید ڈھیلے، چمکتے ہوئے، ویران ویران......!'' شامی نے جھرجھری لے کر کہا۔
''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو شامی۔''
''مگر یہ کیا ہو رہا ہے، کچھ سمجھ میں تو آئے۔ اب آپ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے مسعود

بھائی۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے۔ بڑے بابا میں ایک دم تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے اس نے نماز شروع کی پھر تہجد پڑھنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بیشتر دیکھا۔ اس نے سونا چھوڑ دیا۔ راتوں کو نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز نہیں پڑھ رہا تو چاند پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ دن میں دُوسروں سے چھپ چھپ کر یہ عمل کرتا ہے۔ اس کا رنگ کالا پڑ گیا ہے، صحت بھی خراب ہو رہی ہے، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور اب...... میرا خیال ہے مسعود بھائی، میرا خیال ہے......!'' شامی رُک گیا۔

''ہاں کیا خیال ہے تمہارا شامی......''

''اس پر اثرات ہو گئے ہیں۔ کسی جن کا سایہ یا کسی اور ارواح......''

''پھر بولو کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو بہت چھوٹی عقل کا آدمی ہوں مسعود بھائی۔ بس دُعا کر سکتا ہوں اس کے لئے اور اب تو مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے بھی خوف آئے گا۔''

''اللہ مالک ہے شامی۔ میرے خیال میں اسے پریشان نہ کیا جائے۔ دیکھو اللہ کی کیا مرضی ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ اب اس کی ٹوہ میں نہ رہنا۔ اسے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

شامی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ میں اور اکرام خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اکرام نے کہا۔

''اسے اتنی بڑی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔''

''اللہ بہتر جانتا ہے، آؤ چلیں۔'' میں نے کہا۔ اکرام سمجھ گیا کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ آرام گاہ پہنچ کر بھی اس نے اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا مگر میں اب مطمئن نہیں تھا۔ کچھ معلوم ہونا چاہیے مجھے اس بارے میں۔ میری رہنمائی تو مجھے بخش دی گئی تھی درود پاک کا ورد کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں یہ خواہش کی کہ مجھے نادر حسین کی کیفیت کے بارے میں علم ہو جائے۔ رات بھر کوشش کرتا رہا لیکن دماغ سادہ رہا۔ روشنی کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو اُٹھ گیا۔ اب کوئی تردّد نہیں تھا۔ میرا ان حالات سے لاعلم رہنا مناسب تھا۔ اس سے یہی احساس ہوا تھا، اور اب مجھ پر لازم تھا کہ ان معاملات کی کرید نہ کروں۔ جو کام مجھے سونپا گیا ہے، خاموشی سے اسے سرانجام دوں۔ حالانکہ بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن اب جو کچھ بھی تھا، معمولات سے فراغت کے بعد عرضیوں کے حل دریافت کرنے بیٹھ گیا۔ یہ سلسلہ اسی انداز میں چل رہا تھا۔ اس میں تبدیلی کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ہاں جو تبدیلیاں ہو گئی تھیں وہ دل خوش کن تھیں۔ مثلاً اب لوگوں کو فریب دے کر ان کی جیبیں نہیں خالی کرائی جاتی تھیں۔ کوئی اپنی خوشی سے کچھ لے آتا تو مال خانے میں جمع کر لیا جاتا، یہاں جو لوگ موجود تھے ان کی ضرورتیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سنتو خان کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس کے گروہ کے جو افراد تھے، وہ عبادتِ الٰہی میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کے گھر بار مختلف بستیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی ضرورتیں بے شک پوری ہوتی تھیں لیکن اس کے لئے مال خانہ بہت وسیع تھا۔

شامی پورے دن نظر نہیں آیا۔ دُوسرے اور تیسرے دن بھی وہ نہ نظر آیا تو میں نے ایک دُوسرے آدمی سے پوچھا۔

''شامی کہاں ہے؟''

''بیمار ہے۔''

''ارے کیا ہو گیا؟''

''چوتھا دن ہے۔ بخار سے پھنک رہا ہے۔ بستی کے ڈاکٹر صاحب سے روز دوا آ رہی ہے مگر اسے تو سرسام ہو گیا ہے۔''

''مجھے بتایا بھی نہیں کسی نے۔ بڑا بابا کہاں ہے؟''

''وہ بھی بالکل غائب ہے۔ چار دن سے نظر نہیں آیا۔''

میں حیران رہ گیا تھا۔ شامی کا بخار تو سمجھ میں آ گیا۔ اس کے دِل پر دہشت بیٹھ گئی تھی۔ مگر یہ نادر حسین کہاں غائب

ہو گیا۔ شامی کو دیکھنے چل پڑا۔ لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ سرخ تھا۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ پانی دَم کر کے پلایا۔ آیاتِ الٰہی پڑھ کر پھونکیں۔ تسلیاں دیں اور پُرسکون رہنے کی تلقین کر کے واپس آ گیا۔ دُوسرے دن اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ شامی دو ایک دن میں بالکل تندرست ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''بڑے بابا کا کوئی پتہ نہیں ہے مسعود بھائی۔''

''ہاں، نظر نہیں آیا۔''

''آپ اجازت دیں تو اسے تلاش کروں؟''

''تمہاری خوشی ہے۔'' میں نے کہا۔ شامی چلا گیا۔ میرے معمولات اطمینان بخش تھے۔ خلق اللہ کو فائدے پہنچ رہے تھے۔ دُکھی دِل والے اپنے مسائل لے کر آتے۔ میں حسب توفیق مخصوص انداز میں انہیں مشورے دیتا اور اللہ کے فضل سے انہیں فائدے پہنچے۔ اب بھورے شاہ کی اس خانقاہ کا شہرہ دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ آنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ چار پانچ دن مزید گزر گئے۔ پھر ایک شام سورج ڈھلے شامی نادر حسین کو تلاش کر کے لے آیا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں اس سے ملنے چل پڑا لیکن نادر حسین کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لباس نام کی کوئی شے نہیں تھی اس کے بدن پر، سر کے بالوں میں کیچڑ اَٹی ہوئی تھی۔ داہنے رُخسار پر زخم کا نشان تھا۔ آنکھوں میں نیم غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ اس کے جسم کو رسیوں کے ذریعے ایک چٹان سے کس دیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ اسے دیکھ کر رو رہے تھے۔

''ارے۔ یہ کیا؟''

''بڑا بابا، پاگل ہو گیا مسعود بھائی۔ بڑا بابا پاگل ہو گیا۔''

''مجھے راجن پور کے بازار میں ملا، بچے پتھر مار رہے تھے اور یہ دونوں ہاتھ سر پر رکھے بیٹھا تھا۔ کپڑے بھی نہیں تھے اس کے بدن پر، ہم بڑی مشکل سے اسے باندھ کر لائے ہیں۔'' وہ لوگ مجھے بتانے لگے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ نہیں جانتا تھا میں اس کے بارے میں اور شاید جستجو کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

''اب کیا کریں مسعود بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''اگر ہم نے اسے باندھے نہ رکھا تو یہ پھر بھاگ جائے گا۔ بڑی مشکل سے ملا ہے۔ کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اسے۔'' ایک اور شخص نے کہا۔ وہ سب اس کے لئے مضطرب تھے۔ افسردہ تھے، رو رہے تھے۔ شامی نے کہا۔

''میں معلومات کروں گا۔ ہم بڑے بابا کا علاج کرائیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اس وقت تک ہمیں اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ تم سب اپنی رائے دو۔ میں اکیلا ہی بولے جا رہا ہوں۔''

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، ٹھیک کہہ رہے ہو شامی۔ ہم سب اس کی نگرانی کریں گے۔ اس کی خدمت کریں گے۔ جس طرح بھی بن پڑا اس کا علاج کریں گے۔'' ان لوگوں نے خود ہی سارے معاملات طے کر لئے۔ میں نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔ رہائش گاہ میں آ کر اکرام نے کہا۔

''مسعود بھائی۔ ایک بات بار بار ذہن میں آ رہی ہے۔ اجازت ہو تو پوچھ لوں۔''

''کہو......''

''آپ اس سے کچھ غیر فطری بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ آپ ہر شخص کے لئے مضطرب ہو جاتے ہیں اور اس کی مشکل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ پھر نادر حسین تو وہ ہے جس نے آپ کے حکم پر اپنے سارے بُرے کام چھوڑ دیئے۔ وہ سنتو خان کے نام سے ڈاکے ڈالتا تھا، بھورے شاہ کے نام سے......'' اکرام نے جملہ اَدھورا چھوڑ دیا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بارہا میں نے تمہیں بتایا ہے اکرام۔ میں نہ درویش ہوں، نہ عامل نہ ولی۔ ایک گناہ گار ہوں۔ اتنا بے بس ہوں کہ خود

اپنے درد کا درماں نہیں پا سکا۔ بس رہنمائی ہو جاتی ہے۔ سمجھا دیا جاتا ہے اور میں باعمل ہو جاتا ہوں۔ اس بارے میں کچھ سمجھایا نہیں گیا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"معافی چاہتا ہوں مسعود بھائی۔" اکرام نے شاید میرے لہجے کی تلخی محسوس کر لی تھی۔

نادر حسین کو روز ہی دیکھنے جاتا تھا۔ وہ رسیوں سے بندھا رہتا تھا، بہت کم کھاتا پیتا تھا۔ شامی واقعی اسے بہت چاہتا تھا، وہی اس کے لئے سب سے زیادہ مرتا تھا۔ اس کی گندگی صاف کرتا، چہرہ دُھلاتا، دو تین بار اس نے اسے لباس پہنایا مگر وہ ہمیشہ لباس پھاڑ دیا کرتا تھا۔ اس دوران خانقاہ کے معاملات بدستور چل رہے تھے۔ میں نے یہ شعبہ سنبھالا ہوا تھا اور اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ کچھ لوگ جو سنتو خان کے ساتھی تھے، خاموشی سے چلے گئے تھے کیونکہ اب یہاں رہنے میں انہیں مالی فائدہ نہیں تھا۔ لیکن خانقاہ کی شہرت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ بہت دُور دُور سے لوگ آنے لگے تھے۔ تقریباً سب ہی کو فائدہ پہنچ جاتا تھا۔ رنج و غم اور مشکلات سے نڈھال انسان اپنی مشکل کا حل چاہتے تو احترام و عقیدت میں ڈُوبے ہوئے آتے، تحفے تحائف اور نذرانے لاتے، انہی سے خانقاہ کی ضرورتیں پوری ہوتیں۔ پھر ایک دن شیخ مغیث الدین آئے، پریشان حال۔ برے احوال، اپنی بیوی اور والد کو ساتھ لائے تھے۔ بیوی دماغی مریضہ تھی، اس کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ خانقاہ کے خصوصی نظام پر ان کی آواز سنائی دی۔

"یا ولی، یا بزرگ، میری مشکل دُور کر دیں۔ بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ زندگی عذاب ہو گئی ہے میری۔ بے بسی کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میری بیوی دماغی مریضہ ہو گئی ہے۔ نظام حیات درہم برہم ہو گیا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں علاج کر چکا ہوں، کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ کے قدموں میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے میری مشکل کا حل بتا دیں لی۔ آپ کے قدموں میں پڑا رہوں گا۔ اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک مشکل دُور نہیں ہو جائے گی۔"

بڑی پُردرد آواز تھی۔ میں نے عرضی لکھ لی۔ پھر شاید کسی دُوسرے شخص کو بلا لیا گیا تھا۔ اسی رات شامی میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ "ایک مشورہ چاہتا ہوں مسعود بھائی۔"

"کیا؟"

"خانقاہ کے انداز بدل چکے ہیں۔ اب یہاں وہ نہیں ہوتا جو کبھی ہوتا تھا۔ ہم تو دُوسری ہی وجہ سے لوگوں کو یہاں سے دُور رکھتے تھے۔ پریشان حال لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل چاہتے ہیں۔ ان کے پاس قیام کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اگر اب انہیں خانقاہ کے احاطے میں پڑا رہنے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے۔ دراصل یہ بات میں ایک خاندان کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

"کون ہے؟"

"ان کا نام شیخ مغیث الدین ہے۔ بوڑھے باپ اور پاگل بیوی کے ساتھ آئے ہیں۔ بہت دُور سے آئے ہیں اور قیام کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، خانقاہ میں قیام کی اجازت مانگی تو ہم نے منع کر دیا۔ بے چارے خانقاہ سے دُور ایک درخت کے نیچے جا پڑے ہیں۔ کہتے ہیں مجبوری ہے، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ان کا......"

"ایسی کسی مشکل کے شکار شخص کو اگر اجازت دے دو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کسی گوشے میں پڑے رہیں گے۔"

"آپ کی اجازت ہے؟"

"میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ شامی چلا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں اور اکرام ٹہلنے نکلے تو ہم نے تین افراد پر مشتمل اس خاندان کو ایک گوشے میں فروکش پایا۔ یونہی دریافت حال کے لئے ہم دونوں ان کی طرف بڑھ گئے۔ ہمارے قریب پہنچنے سے قبل شیخ صاحب اُٹھ کر ہمارے قریب آ گئے اور عاجزی سے بولے۔ "میاں صاحب تھوڑا سا پانی عنایت ہو سکتا ہے۔ اشد ضرورت ہے ورنہ تکلیف نہ دیتا۔"

✦✦✦

''کیوں نہیں۔ برتن ہے آپ کے پاس۔''

''جی ہاں، مجھے جگہ بتا دیجئے۔ میں لے آؤں گا۔''

''آپ برتن دے دیں۔'' میں نے کہا اور پھر اکرام کو پانی لینے کے لئے بھیج دیا۔

''اگر ضرورت ہو تو کچھ دیر تشریف رکھئے۔ بڑا بے بس انسان ہوں میں، دل میں شدید گھٹن ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔

''آپ کی اہلیہ کو شاید کچھ تکلیف ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔ دورے پڑتے ہیں۔ کیا کیا علاج نہ کرا لیا۔ مگر اس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔ اس درگاہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ شاید یہیں سے ہمیں شفا مل جائے۔''

''ان دوروں کی کچھ نوعیت پتہ چل سکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''نوعیت......'' شیخ صاحب کے لہجے میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ اسی وقت پیچھے سے آواز سنائی دی۔

''سن۔ اگر کچھ بتانا ہے کہ تو سچ سچ بتائیو۔ ورنہ زبان بند رکھیو۔ جھوٹ بولے گا تو اور مصیبت میں پڑ جائے گا۔'' ساری دُنیا کے سامنے جھوٹ بول کر تو گزارہ کر لیا تو نے، اب یہاں بابا کے دربار میں جھوٹ مت بولیو۔ نہیں تو زبان بند رکھ......''

''یہ کون صاحب ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے والد ہیں مگر ٹھیک کہہ رہے ہیں میاں صاحب۔ ہم نے گناہ کیا ہے۔ سزا تو کاٹنی ہی ہوگی۔'' شیخ صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ اسی وقت اکرام پانی لے آیا جسے شیخ صاحب کے والد نے لے لیا۔ شیخ صاحب بولے۔ ''پہلا گناہ گار تو میں ہی ہوں۔ میں نے بے لوث محبت کرنے والوں کی محبت کو ٹھکرا دیا بچپن میں میری والدہ مر گئی تھیں۔ والد صاحب نے مجھے میرے ننھیال سے دُور کر لیا، بارہ سال کے بعد مجھے اپنے ننھیالی خاندان کا پتہ چلا تو میں ان سے ملا۔ محبت کرنے والی بوڑھی نانی، ماموں اور خالہ نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہا۔ ماموں نے مجھے بیٹوں کی طرح سمجھا۔ نانی نے اپنی اولاد کی نشانی سمجھ کر اپنی چھاتی کھول دی۔ گیارہ سال تک میں ان کے ساتھ رہا اور میرے ماموں زاد بہن بھائی، نانی اور تمام لوگ مجھے اپنا سمجھتے رہے۔ پھر انہوں نے میری شادی کر دی۔ بیوی نے مجھے زندگی کا نیا دور دیا اور سب سے پہلے میں ان پیار کرنے والوں سے دُور ہو گیا۔ میں نے ان سے اجتناب برتا اور انہیں اپنی محبت سے بے دخل کر دیا۔ میں ان سے بس ایک شناسا کی طرح ملنے لگا۔ اپنی بیوی اور اس کے خاندان کو ہی میں نے اپنا سمجھ لیا اور وہ جو میری ماں کی نشانی تھے، دل مسوس کر رہ گئے۔ شاید اسی عمل کا ردِعمل تھا کہ قدرت نے مجھے اولاد سے محروم رکھا۔ بوڑھی نانی میرے لئے اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ مجھے کسی سے اُلفت نہ رہی۔ اولاد کی محرومی میرے اور میری بیوی کے لئے بڑا دُکھ تھی۔ علاج معالجے ہوئے، ہر طرح کے جتن ہوئے مگر ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ پھر ہماری ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جو گندے علوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ میری بیوی نے ان سے رابطہ قائم کر لیا اور اولاد کے حصول کے لئے کالے جادو کا سہارا لیا۔ کالے جادو کے ایک ماہر نے اسے بتایا کہ اولاد حاصل کرنے کے لئے اسے ایک جان کی قربانی دینی ہوگی۔ ایک گیارہ سالہ بچہ درکار ہوگا جسے قتل کر کے اس پر کالا علم کرنا ہوگا۔ اس جادوگر نے بچے حصول کا ذریعہ بتاتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ ایسے کام کرتے ہیں انہیں معاوضہ دے کر کسی بچے کو اغوا کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میری بیوی نے یہ کام اس شخص کو سونپ دیا اور اغوا کرنے والوں کا معاوضہ ادا کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد کالے علم کے ماہر نے اسے انسانی گوشت کے کچھ ٹکڑے دے کر کہا کہ انہیں مٹی کی ہانڈی چڑھا کر چولہے پر پکاتی رہے اور جب یہ ہانڈی میں راکھ کی شکل اختیار کر جائیں تو ایک مخصوص طریقے سے وہ اس راکھ کو استعمال کرے۔ میری بیوی کالے علم کے اس ماہر کی ہدایات پر عمل کرتی رہی اور پھر...... پھر ہم ایک بیٹے کے ماں باپ بن گئے۔ ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ بچے کی خوشی میں ہم دیوانے ہو گئے تھے۔ ہم اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ بچہ تین سال کا ہو گیا۔ وہ باتیں کرنے لگا تھا۔ لیکن...... نہ جانے کیوں میری بیوی اب کچھ خوفزدہ سی رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔

کبھی وہ راتوں کو جاگ جاتی تھی۔ وہ سہم سہم کر بچے سے ہٹ جاتی تھی۔ اکثر وہ خوف بھری نظروں سے بچے کو دیکھنے لگتی تھی۔
میں نے کئی بار یہ بات محسوس کی اور ایک دن اس سے پوچھ بیٹھا۔
''تم کچھ عجیب سی نہیں ہوتی جا رہیں۔''
''کیسی؟'' اس نے کہا۔
''بظاہر بیمار نہیں ہو...... لیکن رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ چہرہ اُتر گیا ہے، کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے تمہاری۔''
''کوئی بات نہیں ہے۔''
''مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔''
''نہیں...... کوئی بات ہی نہیں ہے۔''
''نہ بتاؤ وہ دوسری بات ہے لیکن کچھ ہے ضرور۔''
''آپ سے کہوں گی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔''
''کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔ ''آپ نے کبھی کوئی خاص بات محسوس کی ہے؟''
''کس سلسلے میں؟''
''اپنے بیٹے کے بارے میں۔''
''کیسی خاص بات؟''
''دوسرے بچوں کو آپ دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس عمر میں بچے ماں باپ پر جان دیتے ہیں۔ ماں ان کی تمام محبتوں کا محور ہوتی ہے۔ وہ ماں کے سینے سے چمٹ کر سکون پاتے ہیں۔ ماں کی آغوش میں انہیں کائنات مل جاتی ہے لیکن ہمارا بچہ...... ہمارا شانی۔''
''ہاں۔ آگے کہو......''
''بات آج کی نہیں ہے۔ تین سال کا ہو گیا ہے وہ...... مگر...... وہ کبھی میرے سینے سے نہیں چمٹا۔ وہ مجھ سے گھبراتا ہے۔ اب غور کرتی ہوں تو یہ پورے تین سال میری آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔ جھولے میں وہ پُرسکون رہتا تھا۔ میں گود میں لیتی تھی تو رونے لگتا تھا اور خاموش نہیں ہوتا تھا۔ ایسے تاثرات ہوتے تھے اس کے چہرے پر کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے، مجھ سے اُلجھتا ہے۔ میری گود میں نہیں آنا چاہتا۔ مجھے احساس تو ہوتا تھا لیکن میں توجہ نہیں دیتی تھی۔ غور نہیں کرتی تھی۔ مگر اب۔ اب تو......'' میری بیوی رونے لگی۔
''عجیب بے وقوف عورت ہو۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔
''آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میری کیفیت نہیں سمجھ سکتے۔ رات کو وہ میرے پاس سوتا ہے مگر کبھی مجھ سے لپٹتا نہیں۔ میں اسے کہتی ہوں تو رونے لگتا ہے۔ مجھ سے دُور ہٹ جاتا ہے۔ ایک رات میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اسے محبت سے دیکھا مگر...... مگر......''
''مگر کیا؟''
''وہ جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ وہ شدید نفرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے کروٹ بدل لی۔ اور اب اکثر ایسا ہوتا ہے میں راتوں کو اس سے ڈر جاتی ہوں۔''
''تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا پاگل پن کی باتیں کر رہی ہو۔ اپنے بچے کے بارے میں تم ایسا سوچ رہی ہو۔''
''آہ۔ میں کیا کروں، اتنا خود کو سمجھاتی ہوں مگر نہ جانے کیوں یہ سب کچھ دماغ میں آتا رہتا ہے۔ آپ خود دیکھتے ہیں۔ وہ سب سے بولتا ہے، سب سے باتیں کرتا ہے مگر...... ہم سے کتنا کم بولتا ہے وہ۔''

''بس اب اس پاگل پن کے خیال کو دل سے نکال دو۔ بارہ سال کے بعد ہماری مراد پوری ہوئی ہے اورتم......''
وہ خاموش ہوگئی مگر میاں صاحب اس دن سے میں نے بھی اپنے بیٹے کی حرکات نوٹ کرنا شروع کردیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بیوی سچ کہتی ہے، شانی ایسا ہی تھا۔ وہ کسی بات پر ہنس رہا ہوتا تو ہمیں دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔ وہ یقیناً ہمیں ناپسند کرتا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ ناقابل یقین، ناقابل سمجھ۔ اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ بظاہر نارمل تھا، بس ہمارے ساتھ اس کا رویہ ایسا تھا۔ پانچ سال کا ہوگیا وہ۔ میری بیوی بدستور اسی کیفیت کا شکار تھی۔ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میرے ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔ اندرون ملک کے ایک دیہی علاقے میں رہتے تھے اس کے والدین۔ میرا دوست شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اس نے بہت پیچھے پڑ کر مجھے اور میری بیوی کو بہن کی شادی میں شرکت کے لئے آمادہ کرلیا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ اچھا ہے میری بیوی بہل جائے گی۔ ہم وہاں جا کر خوش ہوئے تھے۔ ہمارا بیٹا بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ وہاں بچوں میں گھل مل گیا تھا۔ شادی کے ہنگامے ہو رہے تھے ایک دن چودہ پندرہ سال کی ایک ہندو لڑکی میرے بیٹے کے ساتھ آ گئی۔ وہ اسے گھر چھوڑنے آئی تھی۔''

''یہ کون ہے؟'' میں نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''جمنا داس کی بیٹی ہے۔ جمنا داس پیچھے رہتے ہیں ہمارے۔'' میرے دوست نے جواب دیا۔

''بھگوتی ہمارے گھر تھا چاچا۔ آپ کہو تو ہم اسے ساتھ لے جاویں۔ رات کو پہنچا دیں گے۔'' لڑکی نے کہا۔

''کون بھگوتی؟'' میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ......اور کون۔'' لڑکی بولی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ یہ تو میرا بھتیجا ہے، شانی ہے اس کا نام......''

''تو ہم کب منع کر رہے ہیں چاچا۔ لے جائیں اسے ساتھ......'' لڑکی بولی۔

''نہیں......جاؤ...... بھاگ جاؤ۔'' میرا دوست غصے سے بولا۔

''جانے دو چاچا۔ ماسی سدھاوتی اسے دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ جانے دو نا۔'' لڑکی ضد کرنے لگی۔

''نہیں پریما۔ پھر آ جائے گا۔ اب تم جاؤ...... جاؤ شاباش...... یہ مہمان ہے، یہاں کے راستے نہیں جانتا۔''

''مجھے سارے راستے آتے ہیں۔'' شانی نے غصے سے کہا۔

''نہیں بیٹے ضد نہیں کرتے۔ جاؤ لڑکی۔ پھر آ جائے گا یہ تمہارے پاس۔'' میں نے کہا اور لڑکی آزردہ ہو کر واپس چلی گئی۔

''یہ کیا نام لے رہی تھی اس کا......'' میں نے کہا۔

''پتہ نہیں کیا قصہ ہے۔ میرے دوست کو گھر میں بلا لیا گیا اس لئے بات ختم ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ شانی کا بھی موڈ خراب ہوگیا ہے۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ دوسرا دن شادی کا تھا۔ میں بھی اپنے دوست کے ساتھ تیاریوں میں مصروف تھا۔ بارات آنے والی تھی۔ کوئی چار بجے شام میری بیوی باہر نکل آئی۔ اس نے کہا۔

''شانی نے کھانا کھایا۔ صبح سے کھیلتا پھر رہا ہے۔ کہاں ہے وہ؟''

''کیا......'' میں اچھل پڑا۔ میں نے خود اسے صبح سے نہیں دیکھا تھا۔ ''کیا وہ اندر نہیں ہے؟''

''صبح سے اندر نہیں آیا۔''

''ٹھیک ہے آ جائے گا۔ ابھی آتا ہے۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ میرا دل خود ہول گیا تھا۔ میں گھبرایا ہوا اپنے دوست کے پاس گیا اور اسے یہ ماجرا سنایا۔ وہ بے چارا خود شامیانے وغیرہ لگوا رہا تھا مگر فوراً میرے ساتھ بھاگا۔

''فکر مت کرو۔ مل جائے گا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ شادی میں آیا ہے، جو اسے دیکھے گا وہ اسے یہاں پہنچا دے گا۔ اوہ آؤ ذرا میرے ساتھ، میرے دوست کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ گھوم کر پچھلے علاقے میں آ گیا۔ ایک میدان سا تھا جس کے

دُوسرے سرے پر مکانات نظر آ رہے تھے۔ ایک مکان کے سامنے رُک کر میرے دوست نے دروازے کی زنجیر بجائی اور ایک آدمی باہر نکل آیا۔"

"کیا بات ہے بھیّا۔ سب ٹھیک ہے نا..... کوئی ضرورت ہے ہماری۔"

"بس تیار ہو جائیں جمناداس جی۔ بارات ٹھیک وقت پر آ جائے گی۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں آیا یہاں۔ کل پریما کے ساتھ تھا۔"

"بھگ....." جمناداس کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ میں اور میرا دوست چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جلدی سے بولا۔

"پریما کے ساتھ تھا صبح سے۔ سدھاوتی کے پاس بیٹھا ہے۔ میں بلا کر لاؤں۔ کس کا چھورا ہے وہ؟"

"میرا بھتیجا ہے۔"

"بھگوان کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" جمناداس آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ جمناداس بھی شانی کا نام بھگوتی کہتے کہتے رُک گیا ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تین گھر چھوڑ کر وہ ایک بوسیدہ سے مکان میں داخل ہو گیا اور کوئی تیس سیکنڈ کے بعد ہی شانی کو ساتھ لئے باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے پریما بھی تھی اور ان تینوں کے پیچھے ایک عورت باہر نکلی تھی۔ میلی کچیلی ساڑھی میں ملبوس، بال بکھرے ہوئے، چہرے پر وحشت، رنگ پیلا پڑا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر شانی کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم صبح سے غائب ہو۔" شانی نے ایک نگاہ مجھے دیکھا۔ وہی نفرت بھرا انداز تھا اس کا، منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں اسے ساتھ لئے آگے بڑھا تو وہ دیوانی عورت بھی ہمارے پیچھے چل پڑی۔ جمناداس نے آگے بڑھ کر عورت کا بازو پکڑ لیا۔

"نہ سدھو نہ، مہمان ہیں، جانے دے اپنے گھر جائیں گے۔"

"وہ ...... وہ......" میلی کچیلی عورت نے اُنگلی شانی کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں بڑی بے بسی، بڑا پیار، بڑی حسرت تھی۔ میں اپنے دوست کے ساتھ شانی کو لئے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرا دوست بھی خاموش تھا اور میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ شانی کو میں نے اپنی بیوی کے پاس پہنچا دیا۔ وہ راستے بھر کچھ نہیں بولا تھا، نہ ضد کی تھی، نہ مچلا تھا لیکن اس کے انداز سے اس نفرت کا اظہار بدستور ہو رہا تھا جو اس کی فطرت کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ بارات کے ہنگامے تھے اور میں کوئی ایسا عمل نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یہاں کسی اور قسم کا احساس پیدا ہو۔ چنانچہ میں نے خاموشی ہی اختیار کئے رکھی۔ جہاں تک ہو سکا اپنے آپ کو بارات کے سلسلے میں ضروری کاموں میں مصروف رکھا، البتہ اپنی بیوی کو میں نے ہدایت کر دی کہ شانی کو اپنی نگرانی میں رکھے اور باہر نہ نکلنے دے لیکن میرا دماغ تجسس سے پھٹا جا رہا تھا۔ کوئی بات جو سمجھ میں آ رہی ہو...... بالآخر بارات آ گئی۔ نکاح کا وقت قریب آ گیا۔ یہ لوگ یہاں کے قدیم رہنے والے تھے، ہندو اور مسلمان سب ہی ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شامل ہوتے تھے۔ میں نے جمناداس کو دیکھا، دھوتی اور کرتے میں ملبوس محفل میں موجود تھا اور مہمانوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ دفعتاً ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ جمناداس سے اس بارے میں بات کی جائے، خاموشی سے معلومات حاصل کروں، ہو سکتا ہے کچھ پتہ چل جائے۔ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سارے کام خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ چنانچہ میں جمناداس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اس وقت تو آپ سے بات ہی نہ ہو سکی جمناداس جی۔ میرے دوست نے بتایا ہے کہ آپ تو ان لوگوں کے بڑے پرانے پڑوسی ہیں۔"

"ہاں بھیّا جی...... جیون مرن ساتھ ہی رہا ہے ہمارا۔ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے ہیں، بڑے اچھے لوگ ہیں یہ بھی اور پھر بیٹی کی شادی تو یوں سمجھو پوری بستی کی بیٹی کی شادی ہوتی ہے۔ ہمیں تو افسوس ہے کہ ہم نے اس شادی میں کچھ بھی نہیں کیا۔"

''آپ جیسے اچھے لوگ بڑے خوش نصیبوں کو ملتے ہیں۔ سب لوگ تعریف کر رہے تھے آپ کی جمنا داس جی۔''

''ارے بھیا ہم کیا اور ہماری اوقات کیا، بس جو خود اچھے ہوتے ہیں وہ دُوسروں کو اچھا کہتے ہیں......''

''جمنا داس جی، پریما آپ کی بیٹی ہے۔ میں نے یہاں سے سلسلہ گفتگو کا آغاز کیا......''

''آپ ہی کی ہے بھیا جی......''

''بڑی اچھی بچی ہے۔ میرا بیٹا تو اس سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا ہے۔ ویسے جمنا داس جی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ نے میرے بیٹے کو بھگوتی کہہ کر کیسے پکارا......؟'' یہ بڑی عجیب بات ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا......''

جمنا داس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بے ڈھنگے انداز میں ہنسنے لگا......

''وہ بھیا جی بس ایک ذرا سا کھیل ہے بھگوان کا، کوئی کیا کر سکتا ہے؟''

''مجھے اس بارے میں بتائیں گے نہیں جمنا داس جی۔''

''ارے ہاں ہاں، کاہے ناں۔ وہ دراصل بھیا جی تمہارا چھورا سدھا وتی کے چھورے بھگوتی داس کی شکل کا ہے، بالکل ویسا بے چاری سدھا وتی ودھوا تھی۔ برسوں سے یہاں رہتی ہے، اس کا پتی کارخانے میں کام کرتا تھا، بھٹی میں گر پڑا اور جیتے جی بھسم ہو گیا۔ ایک ہی چھورا تھا سدھا وتی کا جس کے ساتھ جیون بِتا رہی تھی، گھروں کے کام دھندے کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال رہی تھی کہ بے چاری کے ساتھ ایک عجیب وغریب حادثہ ہو گیا۔ ویسے بھی بھیا جی بے چارہ بھگوتی داس ہماری بٹیا پریما کی عمر کا تھا۔ ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے وہ اور پریما۔ اور پھر پڑوسی ہونے کے ناتے دونوں نے ساتھ ساتھ جیون شروع کیا اور دونوں ہی ایک دُوسرے سے بڑی محبت کرنے لگے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بھگوتی داس کھیتوں پر گیا ہوا تھا کہ غائب ہو گیا۔ پھر بھیا وہ ملا نہیں، بے چاری سدھا وتی پاگل ہو گئی اپنے چھورے کے غم میں۔ پولیس میں رپٹ درج کروائی، آدمیوں نے جگہ جگہ اسے تلاش کیا۔ پر بھگوتی داس کہیں نہیں ملا۔ کوئی پانچ چھ سال پرانی بات ہے، بس یوں سمجھ لو کہ اس کے بعد بے چارے بھگوتی کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ یہ تمہارا چھورا جو ہے نا بھیا، یہ بالکل بھگوتی کی صورت کا ہے، پریما ہی اسے دیکھ کر پاگل ہو گئی تھی اور بھگوتی بھگوتی کہتی چڑھ دوڑی تھی۔ مگر وہ بھگوتی کہاں، وہ پانچ سال کا ہوگا زیادہ سے زیادہ۔ جبکہ بھگوتی اگر ہوتا تو اب پندرہ سولہ سال کا ہوتا۔ گیارہ سال کی عمر میں غائب ہوا تھا بے چارہ بھگوتی۔ بھگوان جانے کون لے گیا اسے، کہاں چلا گیا۔ یہ ہے بھیا تمہارے چھورا کو بھگوتی کہنے کی کہانی اور یہ ہے بے چاری سدھا وتی کے پاگل پن کی داستان۔'' جمنا داس نے بتایا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک انوکھا خوف میرے رگ و پے میں جاگزین ہو گیا تھا۔ بارات کے ہنگامے جاری تھے۔ مگر میرا بدن ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے چھوڑ رہا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے بھگوتی غائب ہوا تھا۔ کالے جادو کے ماہر نے ایک گیارہ سالہ بچے کے اغواء کی کہانی سنائی تھی، جس کی قربانی دے کر ہمارے ہاں بچے کی پیدائش ہو سکتی تھی۔ ہم نے اسے رقم ادا کی تھی اور اس نے ہمارا کام کر دیا تھا۔ شانی بھگوتی کی صورت تھا۔ پانچ سال کا ہے وہ۔ چھ سال پہلے بھگوتی اغوا ہوا تھا۔ خدا کی پناہ، خدا کی پناہ۔ واقعات کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔ وہ کالے جادو کا کھیل جس کی بناء پر شانی وجود میں آیا، اب اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ کالا جادو صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں اولاد پیدا ہو جائے، اس کے اثرات اب ہم پر نمودار ہو رہے تھے۔ شانی ہمارا اکلوتا بچہ، منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا بھگوتی کی شکل کا تھا۔ میرے خدا میرے خدا، میرا بدن شدید دہشت کا شکار تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا بھگوتی کی رُوح شانی میں حلول کر گئی ہے یا شانی بھگوتی کا نیا رُوپ ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سب کچھ میرا دل قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن جو کچھ تھا ہمارے سامنے تھا اور میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ بارات رخصت ہوئی، مہمان چلے گئے، رسمی طور پر مجھے بھی وداعی میں حصہ لینا پڑا۔ دوست کی بہن کا معاملہ تھا، خود کو الگ کیسے رکھ سکتا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح میری بیوی نے واپس چلنے کی رٹ لگا دی۔ حالانکہ میرا دوست ابھی یہاں کئی دن قیام کرنا چاہتا تھا۔ یہ وعدہ کر کے لایا تھا مجھے کہ میں کئی دن تک اس کے ساتھ رہوں گا۔ شادی کے بعد کے ہنگاموں میں بھی حصہ لوں گا۔ لیکن اب اس کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی۔ میرا دل تو خوف و دہشت کا شکار

تھا۔ ادھر میری بیوی بھی بری طرح واپس چلنے کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ سب ہی نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ مانی اور بحالت مجبوری میرے دوست نے بھی اجازت دے دی۔ میں خود بھی وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا، جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی میرا دل ہی جانتا تھا، پھر ہم اپنے شہر واپس آ گئے۔ شانی ہمارے ساتھ تھا۔ میری بیوی تو اس سے خوفزدہ رہتی ہی تھی۔ لیکن اب میری بھی کیفیت اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں چور نگاہوں سے شانی کو دیکھتا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی گمبھیرتا، ایک عجیب سی نفرت رچی ہوئی پاتا جیسے وہ ہمارے عمل سے شدید نفرت کرتا ہو۔ پھر ایک دن وہاں سے واپسی کے کوئی ایک ہفتے کے بعد کی بات ہے، میری بیوی نے مجھ سے کہا۔

''ایک بات کہنا چاہتی ہوں میں آپ سے؟''

''ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟''

''وہاں۔ جہاں ہم شادی میں گئے تھے، میں نے ایک عجیب بات سنی ہے، آپ کو خدا کا واسطہ اس بات کو مذاق میں نہ ٹالئے۔ میری تو حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے، کچھ کیجئے، کچھ کرنا پڑے گا ہمیں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں؟''

''بات کیا ہے؟''

''وہاں شانی کے بارے میں تبصرے ہو رہے تھے۔ سدھاوتی نامی کوئی عورت رہتی ہے وہاں اس کا بچہ جس کی عمر گیارہ سال تھی، پانچ چھ سال پہلے وہاں سے اغوا ہو گیا تھا۔ اس کا نام بھگوتی تھا اور وہ۔ وہ بالکل شانی کی صورت تھا، بالکل شانی کی صورت۔'' میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرا خیال تھا یہ کہانی میرے ہی ذہن میں محفوظ ہے۔ لیکن عورتیں بھلا کہاں چوکتیں۔ اسے بھی یہ کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ تاہم میں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''گویا اب تم ایک نئی کہانی کا سہارا لے کر مجھے پریشان کرو گی۔'' میری بیوی زار و قطار رونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''آپ مجھ سے پریشان ہو گئے ہیں؟''

''ہاں، ہو گیا ہوں بالکل ہو گیا ہوں۔ پہلے تمہیں بچے کی خواہش نے دیوانہ کر دیا تھا اور تم سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو گئی تھیں اور اب اس نئی کہانی سے تم نہ صرف خود پاگل ہوئی جا رہی ہو بلکہ مجھے بھی پاگل کئے دے رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں، میں کیا کر سکتا ہوں، مجھے جواب دو۔''

''خدا کے لئے کچھ کیجئے، اس کالے جادو کے ماہر سے ملئے، اس سے کہئے کہ اب ہم کیا کریں اور یہ سب کیا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، ہم تو کالے جادو کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے کالے جادو کے ماہر سے ملوں اور اس کے بعد کوئی نیا جادو کرا کے لے آؤ۔ یہی چاہتی ہو نا تم؟''

''تو پھر کیا ہو گا، شانی ہم سے نفرت کرتا رہے گا ہمارا اکلوتا بچہ، اس کے سوا ہمارا کوئی اور ہے بھی تو نہیں لیکن لیکن، میری بیوی زار و قطار روتی رہی۔ میرے پاس ان آنسوؤں کا کوئی حل نہیں تھا۔

وقت آگے بڑھتا گیا۔ شانی کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب وہ اپنی ماں کے پاس سوتا بھی نہیں تھا۔ اس کی بیزاری اس کی نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک رات جب ہم اپنے بیڈروم میں سو رہے تھے تو اچانک میری بیوی دہشت بھرے انداز میں چیخ پڑی۔ اس کی بھیانک چیخوں سے مجھے بھی دہشت کا شکار کر دیا۔ شانی اپنے الگ بستر پر سو رہا تھا۔ ان چیخوں نے اسے نہیں جگایا تھا۔ بڑی مشکل سے میری بیوی معتدل ہوئی، خوف بھری نظروں سے شانی کو دیکھ رہی تھی۔''

''یہ جاگ رہا ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں یہ جاگ رہا ہے۔ مکر کئے پڑا ہے۔ ابھی ابھی یہ میرے قریب تھا۔ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یہ، یہ مجھے مارے گا۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ بتاؤ کیا کروں میں۔ اسے گھر سے نکال دوں۔ اور کیا کروں۔''

''نہیں نہیں۔ وہ میرا بچہ ہے۔ وہ میری اولاد ہے۔'' میری بیوی سسکیاں بھرنے لگی۔

''تو پھر میں کیا کروں۔'' میں نے کہا۔ اور میاں صاحب مختصر یہ کہ میری بیوی آہستہ آہستہ ذہنی توازن کھونے لگی۔ اس پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے اور آج یہ اس حال کو پہنچ گئی ہے کہ یہ اپنے بیٹے کو چاہتی بھی ہے اور اس سے دہشت زدہ بھی ہے۔ نہ جانے کیا کیا جتن کئے ہیں میں نے ڈاکٹروں کے پاس، بھلا اس کا کیا علاج ہے۔ میں تو اتنا بدنصیب ہوں کہ کسی کو اصلیت بتا بھی نہیں سکتا۔ کس سے کہوں کہ ایک بچے کو قتل کر کے، ایک ماں کی گود اُجاڑ کر ہم نے اپنی سُونی گود بھری ہے، اس خانقاہ کی شہرت میں نے سُنی ہے، بڑی دُور سے آس لے کر آیا ہوں۔ خدا کے لئے ہماری مشکل کا حل بتا دیں۔ خدا کے لئے؟''

میں دہشت سے گنگ تھا۔ اکرام پتھر بنا ہوا بیٹھا تھا۔ بڑی بھیانک بڑی دہشت ناک داستان تھی یہ۔

''بچہ کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نانی نانا کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''شیخ مغیث الدین۔''

''سب سے پہلے اپنا نام بدل دو۔'' میرے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ ساری برائیاں کر لی تھیں کم بختوں نے۔ اپنی ناپاک آرزو کے ہاتھوں نڈھال ہو کر ایمان بیچ دیا تھا اور پھر بہتری کے خواہاں تھے۔ شدید گھن آ رہی تھی مجھے ان دونوں سے، وہ مشرک تھے۔

وہ بولا۔ ''سمجھا نہیں صاحب۔''

''تمہیں اس نام کو اپنائے رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اسلامی نام ہے۔ متبرک اور قابل احترام۔''

''میں مسلمان ہوں۔'' وہ بولا۔

''شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے۔ غور نہیں کیا اپنے کالے کرتوتوں پر۔ عورت تو ناقص العقل ہوتی ہے، تم لوگ اسے سنبھال نہیں سکتے۔ اس طرح کٹھ پتلی بن جاتے ہو تم اس کے ہاتھوں۔ اس کائنات کا ہر ذرّہ مالک کائنات کے اشارے سے جنبش کرتا ہے۔ تمہاری تقدیر میں اولاد ہوتی تو تمہیں ضرور ملتی۔ ہوسکتا ہے اس کا وقت مقرر کر دیا گیا ہو۔ تم نے اپنی ہوس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اس مردود کا سہارا لیا جسے شیطان کہا جاتا ہے۔ تمہاری عقل نے تمہیں ہوشیار نہ کیا کہ تم شیطنت کی طرف بڑھ رہے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ جادو کفر ہے۔ اس شیطان زادے نے تم سے کہا کہ تمہیں اولاد کے حصول کیلئے ایک انسانی جان کی قربانی دینا ہوگی۔ اس کے بجائے کہ تم اسے سنگسار کر دیتے، تم نے اسے اس عمل کا اختیار دیا۔ وہ شیطان زادی اپنی گود بھرنے کے لئے ایک اور ماں کی گود اجاڑنے پر آمادہ ہوگئی اور تم اس کے ہمنوا بنے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے اس ماں کو دیکھ لیا جو اولاد کے کھو جانے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔ قدرت تمہارے کالے کرتوت تمہارے سامنے لائی مگر تم نے غور نہ کیا اور اب تم اس عورت کیلئے بہتری چاہتے ہو۔ خدا کی قسم تم بے دین ہو، تمہارا اس پاک مذہب سے کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''رحم میاں صاحب رحم......'' وہ بولا۔

''تم مردود ہو، قابل سزا ہو لیکن جزا و سزا کا مالک وہ ہے جس کے ہم بندے ہیں۔ تمہارا فیصلہ وہی کرے گا۔ اب میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔''

''کیا میاں صاحب......؟''

''یہ جگہ فوراً چھوڑ دو، یہ غیر مسلموں کیلئے نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ میں دوسروں کو اس پر آمادہ کروں، تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں تو بڑی آس لے کر آیا تھا میاں صاحب۔''

''تمہاری بینائی چھن چکی ہے۔ وہ جنہوں نے تمہیں بے لوث محبت دی، تمہیں تمہارے برے وقت میں اپنایا، تمہارے

لئے کچھ نہ رہے اور وہ قابل نفرت عورت جس نے بالآخر تم سے تمہارا ایمان چھین لیا، تمہارے لئے آسان ہو گئی۔ سنو اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اگر تمہیں لمحاتی عیش و عشرت مل گئے ہیں تو انہیں دھوکا جانو۔ آنے والا وقت تم پر کٹھن ہے۔ گیارہ سال پورے ہو جانے دو۔ وہی بچہ جس کیلئے تم نے ایمان کھویا، تمہاری موت کا سامان بنے گا۔ اسے تمہارے اعمال کی سزا کیلئے مخصوص کیا گیا ہے۔ جاؤ اس سے زیادہ تمہارے ساتھ رعایت نہیں کی جائے گی۔''

''ہمارے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے میاں صاحب؟''

''خدا کی لعنت ہو تم پر۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''سنئے تو سہی میاں صاحب۔''

''جو کچھ سنا دیا ہے تو نے، اس سے زیادہ نہ سنا۔ تیرے حق میں بہتر ہے۔ اکرام انہیں یہاں سے نکال دو۔'' میں ان کے پاس سے اٹھ کر واپس چل پڑا۔ اکرام نے انہیں وہاں نہ رہنے دیا۔ اسی وقت انہیں خانقاہ سے دور جانا پڑا تھا۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ دل لرز رہا تھا اس کہانی پر...... کیسے کیسے مردود انسان ہوتے ہیں اس دنیا میں...... لاحول ولاقوۃ۔ اکرام میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں خاموش تھے مگر یہ خاموشی قائم نہ رہ سکی۔ شامی نظر آیا تھا، اس کے ساتھ نادر حسین بھی تھا۔ لباس پہنے ہوئے نہایت بہتر حالت میں۔ ہم دونوں حیرت سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

''بڑا بابا ٹھیک ہو گیا مسعود بھائی! ہمارا بڑا بابا ٹھیک ہو گیا۔'' شامی خوشی سے بولا۔

''واقعی خوشی کی بات ہے۔ نادر حسین کیسے ہو تم؟''

''میں تو جیسا تھا، ویسا ہی ہوں بس تم لوگوں کی بینائی متاثر ہو گئی ہے۔'' نادر حسین نے جواب دیا۔ میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا تاہم میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا اور شامی سے بولا۔

''چلو شامی! تمہاری محنت بار آور ہوئی۔ ہاں نادر حسین اب ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ایک مخصوص وقت گزارنے کے بعد ہمیں اجازت دے دو گے۔''

''مخصوص وقت گزرا کہاں ہے۔ جلد بازی کیوں کر رہے ہو۔ ابھی نہیں...... ابھی نہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر شامی سے بولا ''جاؤ تم آرام کرو، آرام کا وقت ہے۔''

''جی بڑے بابا۔'' شامی نے کہا۔ پھر مجھے ہلکا سا اشارہ کیا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ باتیں تو ٹھیک کر رہا ہے مگر میں اس کا خیال رکھوں۔ کہیں بھاگ نہ جائے۔ شامی چلا گیا مگر اس نے اور کوئی بات نہیں کی، خاموشی سے گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ مجھے خود ہی کہنا پڑا۔

''شامی کو بھیج کر تم کوئی خاص بات کہنا چاہتے تھے؟''

''ہاں! رکو...... ابھی یہاں رکو۔ کہیں سے بلاوا تو نہیں آیا ہے؟''

''کیسا بلاوا......؟'' میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''بلاوے الگ الگ ہوتے ہیں، کیا سمجھے۔ سارے بلاوے الگ الگ ہوتے ہیں۔ تمہارا کوئی بلاوا نہیں ہے، ابھی رکو، نہ جانے کسے کسے تمہاری ضرورت پڑے۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ نادر حسین کے بولنے کا یہ انداز نہیں تھا۔ وہ تو میرا بہت احترام کرتا تھا لیکن اس کا یہ انداز بالکل مختلف تھا۔ اس کے بعد اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ وہ رخ بدل کر بیٹھ گیا تھا۔ اکرام نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''آپ بیٹھیں گے مسعود بھائی؟''

''نہیں۔ چلو آرام کریں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا حالانکہ شامی مجھے اشارہ کر کے گیا تھا لیکن میں رات بھر چوکیداری نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب وہ بہتر بھی نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی آرام گاہ کا رخ کیا۔ اکرام نے بھی نادر حسین کے انداز کو

محسوس کیا تھا۔ آرام گاہ میں آ کر میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کہیں مسعود بھائی تو میں شامی کو ہوشیار کر آؤں؟''

''کس سلسلے میں؟''

''یہی کہ ہم وہاں سے اٹھ گئے ہیں، اب وہ خود نادر حسین کا خیال رکھے۔ میرے خیال میں وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''اس کے بات کرنے کا انداز بتاتا ہے وہ آپ سے اس لہجے میں تو بات نہیں کرتا تھا۔'' میں نے اکرام کی بات کا جواب نہیں دیا۔ چنانچہ اکرام بھی خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں آرام کرنے لیٹ گئے تھے مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ شیخ مغیث اور اس کی بیوی کا خیال بار بار آ رہا تھا۔ دونوں بدبختوں سے مجھے شدید کراہت محسوس ہوئی تھی۔ یہ نہ معصومیت تھی، نہ لاپروائی۔ اتنا بڑا کام انہوں نے نہایت آسانی سے کر ڈالا تھا۔ کچھ تو سوچنا چاہئے تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ شیخ مغیث پہلے ہی ایک بدانسان تھا، اس کے خون میں وفا نہیں تھی۔ وہ شقی القلب تھا ورنہ اپنے محسنوں کے احسان کو کبھی نہ بھولتا جنہوں نے اس کا مستقبل بنایا، انہیں اس نے تسلیم نہ کیا۔ باقی بات رہی اس کی بیوی کی تو یقیناً وہ بدکردار عورت تھی اور اس سے وفا ممکن نہیں تھی۔ جو کچھ میں نے شدید کراہت کے عالم میں کہا تھا، اس پر مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔

رات کافی گزر گئی۔ اکرام بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں نے اسے پکار لیا۔ ''نیند نہیں آ رہی؟''

''ہاں بھیا۔ باہر چلیں؟''

''میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ باہر کھلی فضا ہو گی۔''

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ عبادت سے بہتر اور کیا مشغلہ ہو سکتا تھا۔ وضو کیا اور آگے بڑھ گئے۔ تبھی نادر حسین نظر آیا۔ جہاں چھوڑ گئے تھے، وہیں گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کرنے کو دل نہ چاہا۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے اس کی طرف سے ذہن ہٹا لیا اور آنکھیں بند کر لیں، پھر میں نے درود شریف کا ورد کیا۔ ابھی پہلی بار درود شریف ختم کیا تھا کہ دفعتاً نادر حسین کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ مار کر کھڑا ہو گیا۔ میں اور اکرام چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''احمق ہو تم...... دیوانے ہو گئے ہو، بالکل پاگل ہو گئے ہو۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا نادر حسین؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''پاک کلمات کسی کی پشت پر نہیں پڑھے جاتے، آئندہ خیال رکھنا۔'' اس نے کہا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ اس نے کہا۔ ''بلاوا آ گیا ہے میرا۔ جب تک تمہارا بلاوا نہ آئے، یہاں سے نہ جانا۔ ایک حاجت مند کی حاجت روائی ضروری ہے۔ حق......'' اس نے زور سے نعرہ لگایا اور اچانک اس کے لباس میں آگ لگ گئی۔ مجھے اور اکرام کو نہیں معلوم تھا کہ شامی کچھ لوگوں کے ساتھ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ابھی ہم دونوں ششدر کھڑے غور کر رہے تھے کیا کریں کہ عقب سے شامی کے چیخنے کی آواز ابھری اور وہ دو تین افراد کے ساتھ دوڑ پڑا۔

''آگ...... آگ...... پانی...... پانی۔'' وہ ناچتا ہوا بولا مگر اتنی دیر میں نادر حسین کا لباس خاکستر ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرا نعرہ لگایا اور اس کے ساتھ خانقاہ کی بلندیوں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ شامی کے حلق سے دلخراش آواز نکلی۔

''بڑے بابا......'' وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا کنارے تک آ گیا۔ میں اور اکرام نے بھی اس کی تقلید کی تھی اور پھر سکتہ کر رہ گئے تھے حالانکہ جتنی بلندی سے وہ نیچے کودا تھا، اس کے ہاتھ، پاؤں ٹوٹ جانے چاہئے تھے لیکن نیچے وہ تاروں کی چھاؤں میں بے تکان دوڑتا نظر آ رہا تھا۔ لباس سے عاری، ہر تکلیف سے بے نیاز۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے بدن میں شدید سنسنی دوڑ رہی تھی۔

''اس پر پھر دورہ پڑ گیا مسعود بھائی۔ آہ! اب کیا ہو گا؟ وہ پھر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔'' شامی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں شامی! وہ ٹھیک ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''ٹھیک ہے؟'' شامی سسکی سی لے کر بولا۔
''ہاں! ہم سب سے زیادہ ہوشمند۔''
''نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔'' شامی جھلا کر بولا اور میں شامی کو تسلیاں دینے لگا۔
''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہی درست ہے شامی۔ اب وہ اس جھوٹی خانقاہ کا بزرگ نہیں ہے۔''
''اب کیا ہوگا مسعود بھائی۔ ہمیں پھر اس کے پیچھے نکلنا ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جائے وہ۔ ہمیں بتاؤ اب کیا کریں۔''
''جو کچھ کرو گے، بیکار ہوگا۔ ویسے تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ آؤ اکرام۔'' میں نے کہا اور اکرام کو ساتھ لے کر اپنی آرام گاہ میں آ گیا۔ خانقاہ میں جتنے لوگ تھے، سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔
''سچ مچ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوں مسعود بھائی۔ برداشت نہیں ہو رہا ورنہ آپ سے نہیں کہتا۔'' اکرام بے بسی سے بولا۔
''کیا بات ہے اکرام؟''
''نادر حسین کو کیا ہو گیا؟''
''وہ جو مصرع ہے نا کہ خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال، وہ صادق آ گیا ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''عہدہ مل گیا ہے اسے، مجذوب ہو گیا ہے۔ ویسے بھی اکرام، تمہیں یاد ہوگا وہ ڈاکو تھا۔ جعلی خانقاہ میں وہ لوگوں کو جھوٹے دلاسے دیتا تھا لیکن خود کو پیر کہلوانے سے لرزتا تھا۔ خود کو دنیا کا بدترین انسان سمجھتا تھا۔ اسے اپنے گناہوں کا شدید احساس تھا۔ اللہ کو اس کی کوئی ادا بھائی، اسے بہت بڑا مقام مل گیا۔''
''سبحان اللہ...... تو یہ بات ہے۔''
''ایک آدھ بار شبہ ہوا تھا، یقین نہیں کر سکا تھا۔''
''پھر یہ اندازہ کیسے ہوا؟''
''اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے درود شریف پڑھ لیا تھا۔ وہ تڑپ گیا۔ کلام الٰہی کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکا۔ اب واقعی وہ اس خانقاہ کا انسان نہیں ہے۔''
اکرام خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں ہی تاثر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نادر حسین کی خوش بختی پر رشک کر رہا تھا۔ بہرحال یہ رمز تھے جو انسانی عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ کچھ دیر کے بعد اکرام نے کہا۔
''یہاں رکو گے مسعود بھائی؟''

✦✤✦✤✦

''تمہاری کیا رائے ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔ ویسے بھی ہم یہاں رک گئے ہیں، کوئی کام نہیں ہو رہا۔'' اکرام نے اس طرح کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ معصوم نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔
''ہم کام ہی کیا کرتے ہیں اکرام۔ بس یہاں وہاں۔ ویسے ابھی کچھ دن یہاں گزاریں گے۔ ابھی یہاں سے جانے کا وقت نہیں آیا۔''
''ٹھیک ہے۔ میں نے بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''
رات گزر گئی۔ نہ جانے کب تک نادر حسین کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور ان حالات پر غور کرتا رہا تھا۔ نادر حسین بے

شک خوش نصیب تھا کہ اس نے اتنا بڑا مقام پالیا تھا۔ دوسرا دن منگل کا تھا۔ آج عرضیاں لکھی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا۔ عرضیاں لکھی جاتیں، حاجت مندوں کی درد بھری آوازیں ہمیں مائیکروفون پر سنائی دیتیں اور ہم انہیں لکھ لیا کرتے، پھر جو کچھ میرے دماغ میں آتا، اس کے مطابق مشورے دے دیا کرتا۔ مشورے جمعرات کو دیئے جاتے تھے۔

معمول کے مطابق ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ اکرام بھی کاغذ، قلم لے کر بیٹھا تھا۔ دردمند اپنی اپنی کہانیاں سناتے رہے۔ بعض کہانیاں آنکھیں بھگو دیا کرتی تھیں۔ دعائیں اور دوائیں چل رہی تھیں۔ اچانک مجھے ایک آواز سنائی دی۔

"دکھیاری ہوں سائیں بابا۔ میری کہانی سنو گے۔ سن لو سائیں بابا! سنو تو اچھا ہے، نہ سنو گے تو سمجھوں گی کہ تم بھی سب کی طرح ہو۔ سب کچھ کھو گیا ہے میرا سائیں بابا...... کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ شمسہ ہے میرا نام، دو کڑیل بھائی تھے۔ ماں، باپ تھے میرے، ایک ماموں تھے۔ بھرا گھر اجڑ گیا سائیں جی...... بھائی بچھڑے۔ ماں باپ جوان بیٹوں کے دکھ میں پاگل ہو گئے۔ دردر پھرے ہم پھر سائیں۔ نحوست میری طرف بڑھی۔ رشتہ آیا۔ میرے ماں باپ اس حالت میں نہیں تھے کہ شادی کریں، منع کر دیا انہوں نے۔ وہ لوگ چڑ گئے، مجھے چھین لیا انہوں نے میرے ماں باپ سے...... جبری نکاح پڑھایا۔ میرا میاں مجھے لے کر مارا مارا پھرتا رہا۔ دل برا تھا اس کا میری طرف سے۔ کبھی عزت نہیں دی اس نے مجھے، چار چوٹ کی مار مارتا ہے ذرا سی غلطی پر۔ تین بچے ہو گئے ہیں میرے، کوئی سہارا نہیں ہے ان کا جی۔ وہ بری عورتوں کے پھیر میں رہتا ہے سائیں...... ماں باپ کا پتا نہیں ہے۔ میرے بھائی نہیں ملتے سائیں جی! میری مشکل دور کر دو سائیں، میری منزل مجھے دے دو۔ مر بھی نہیں سکتی سائیں بابا...... تین جانیں اکیلی رہ جائیں گی جی۔ کیا کروں ان کا، مشکل حل کر دو سائیں جی......"

دل کی حرکت بند ہونے لگی، خون کی روانی رک گئی، سانس تھم گیا۔ یہ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ عرصہ ہو گیا تھا، صدیاں بیت گئی تھیں لیکن یہ آواز کیسے بھول سکتا تھا۔ ہر جملہ سسکی تھا، ہر لفظ زخم تھا۔ آہ! شمسہ میری بہن، میری بہن مجھ سے کچھ گز دور تھی۔ وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ مجھے میری کہانی سنا رہی تھی پھر شامی کی آواز ابھری۔

"چلو بہن...... دوسرے کو آنا ہے۔"

"جاتی ہوں بھیا، جاتی ہوں سائیں۔ بڑی آس لے کر آئی ہوں۔ سائیں، میرے سائیں...... سن لو، مجھ پر غور کر لو، کوئی سہارا نہیں ہے۔"

"چلو بہن، اٹھو جلدی کرو۔"

"اٹھتی ہوں بھیا، جاتی ہوں سائیں، بڑی آس لے کر آئی ہوں سائیں...... جاتی ہوں بھائی، ابھی جاتی ہوں، جمعرات کو آؤں گی سائیں بابا۔ جمعرات کو...... ہاں ہاں جاتی ہوں۔"

درد و کرب میں ڈوبی چیخ کو نہیں روک سکا تھا اور اس آواز پر اکرام بری طرح اچھل پڑا تھا۔ ہچکیاں بندھ گئی تھیں میری۔ اکرام سب کچھ چھوڑ کر مجھ سے آلپٹا تھا۔

"مسعود بھائی، مسعود بھائی۔ کیا ہو گیا مسعود بھائی۔ کیا بات ہے، ارے یہ کیا حالت ہو گئی مسعود بھائی...... مسعود بھائی۔" اکرام بے چین ہو کر مجھے جھنجوڑنے لگا لیکن کچھ ایسا بے اختیار ہوا تھا کہ خود پر قابو ہی نہیں رہا تھا۔ اکرام نے پانی پلایا۔ اس کے بعد کوئی عرضی نہ لکھی جا سکی تھی۔ زمین پر لیٹ گیا۔ دل قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اکرام اوپر جا کر شامی اور دوسرے لوگوں کو بلا لایا۔ بے وقوف کوئی بھی نہیں تھا، اب سب ہی میری حیثیت سے آشنا ہو چکے تھے۔ جانتے تھے کہ جب سے میں خانقاہ میں داخل ہوا ہوں، کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ نقلی خانقاہ اصلی ہو گئی ہے۔ جو آتا ہے یہی کہتا ہوا آتا ہے کہ اس کا کام بن گیا۔ یہاں تک کہ ان کا بڑا بابا بھی میرا معتقد نظر آیا تھا۔ سب کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اب خانقاہ میرے ہی دم سے چل رہی ہے اور ان لوگوں کی دال روٹی کا بندوبست ہے۔ چنانچہ سب ہی مجھ سے مانوس ہو گئے تھے، خصوصاً شامی۔ میری یہ حالت دیکھ کر وہ سب سخت پریشان ہو گئے اور طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کوئی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مشورہ دینے لگا تو کوئی دوائیں تجویز کرنے لگا۔ سب ایک ہی سوال کر رہے تھے کہ کیا ہو گیا، اچانک ہی کیا ہو گیا اور اکرام گھبرا گھبرا کر انہیں بتا رہا تھا کہ بس

بیٹھے بیٹھے ہی طبیعت بگڑ گئی ہے۔کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جو سمجھ میں آسکے۔سب کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے اپنی اس کیفیت پر شرمندگی بھی تھی لیکن کچھ ایسا بے بس ہوا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوا جارہا تھا۔شمسہ کی درد بھری باتیں کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اُتر رہی تھیں۔کیسی بے بسی تھی اس کی آواز میں...... میری بہن...... آہ میری بہن...... اس کے تصور سے آنکھوں سے آنسو ابلتے چلے آرہے تھے۔روکنا چاہتا تھا ان آنسوؤں کو لیکن کچھ ایسے بے اختیار ہوئے تھے کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا۔پانی پلایا گیا، سہارے دیئے گئے۔نہ جانے کیسے کیسے جتن کر کے اپنی حالت پر تھوڑا سا قابو پایا۔بھرائی ہوئی آواز میں ان لوگوں سے کہا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے، بس اندر سے شدید گرمی کی ایک لہر اٹھی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ٹھیک ہوں۔ ہمدرد اور محبت کرنے والے یہ سن کر سہارا دیئے ہوئے زبردستی باہر لائے۔خانقاہ کے عقبی حصے میں ایک صاف ستھری جگہ مجھے لٹا دیا گیا۔ہر شخص ہی کسی نہ کسی چیز سے مجھے پنکھا جھل رہا تھا۔ابھی خانقاہ کے دوسرے حصے میں زائرین موجود تھے۔چنانچہ یہ عقبی حصہ منتخب کیا گیا تھا۔میں نے خود پر قابو پانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہر خیال کو ذہن سے مٹا دیا۔زخم تو دل پر ہمیشہ سے موجود تھے۔بس ان پر ایک ہلکی سی تہہ چڑھا لی تھی لیکن کھرنڈ نہیں بن پائے تھے۔زخم درست نہیں ہوئے تھے۔ایک آواز سے ایک زخم کی جھلی اتر گئی تھی،خون تو بہنا ہی تھا، برسوں سے رکا ہوا تھا۔بہتا رہا لیکن آخر کب تک...... جب خون ہی ختم ہو جائے جسم میں تو کیا بہے گا۔آنسوؤں کی روانی رک گئی۔ وہ قدرتی تسلی جو آسمانوں سے اترتی ہے، دل پر حاوی ہو گئی۔سہارا دیا خود کو اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔اب ان لوگوں کو سمجھانا بھی ضروری تھا جو بے چین تھے، افسردہ تھے،مضطرب تھے میرے لئے۔مدھم سے لہجے میں، میں نے ان سے کہا۔

''بہت معذرت خواہ ہوں آپ سب سے،خوامخواہ ایک ذرا سی گرمی سے کیفیت بگڑ گئی تو آپ لوگوں کو پریشان ہونا پڑا۔ بس دل پر ایک بوجھ سا آپڑا تھا۔نہ جانے کیوں آنکھوں نے آنسو نکل پڑے۔اب ٹھیک ہوں۔''

''آپ ہمارے لئے بہت بڑی چیز ہیں مسعود بھائی...... خدا کیلئے خود کو سنبھالئے۔ہم بے خانماں لوگ جو پہلے بہت برے تھے اور اب ہم میں سے ہر ایک یہ بات کہہ سکتا ہے کہ آپ کے آنے کے بعد ہماری کایا پلٹ ہو گئی۔احمق نہیں ہیں۔ ہم لوگ غور کرتے ہیں، ہم برے راستوں کے راہی تھے۔یہ خانقاہ دھوکے کا گھر تھی۔آپ کے آنے کے بعد سب کچھ بدل گیا یہاں تک کہ ہم بھی بدل گئے۔مسعود بھائی خود کو سنبھالئے خدا کیلئے...... آپ ہماری زندگی کا سہارا ہیں۔آپ کو اگر کوئی نقصان پہنچ گیا تو بے موت مارے جائیں گے ہم سب۔'' میں نے انہیں تسلیاں دی تھیں۔کہا تھا کہ انسان ہوں اور انسان کی کیفیت کبھی نہ کبھی خراب ہو ہی جاتی ہے۔بہرطور اس طرح ان لوگوں کی عیادت میں رات ہو گئی تھی۔زائرین جا چکے تھے اور خانقاہ پر پھر وہی ہُو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔باہر ہی رہا اور ٹھنڈی ہواؤں نے کیفیت کافی بہتر کر دی۔ویسے بھی تمام لوگوں کا ساتھ تھا۔ سوچ کے دروازے عارضی طور پر بند ہو گئے تھے۔چنانچہ سنبھل گیا۔قوت ارادی سے بھی کام لیا تھا پھر واپسی کا فیصلہ کیا اور کچھ دیر کے بعد اکرام کے ساتھ تنہا رہ گیا۔اکرام کے چہرے پر ایک عجیب سی مُردنی چھائی ہوئی تھی۔اس نے اس کے بعد مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ظاہر ہے میرے لئے پریشان تھا مگر میں کیا کرتا۔ایسا ہی ایک موڑ آگیا تھا کہ میری اپنی قوت فیصلہ جواب دے گئی تھی۔ کتنے عرصے کے بعد شمسہ کی آواز سنائی دی تھی۔محبت کرتا تھا میں اپنی بہن سے، بہت محبت کرتا تھا۔وہ ابتدائی دور یاد تھا جب ہم سب ساتھ رہتے تھے۔شمسہ کی شرارتیں، ماموں ریاض کا مجھے ڈانٹنا، ہر چیز مجھے یاد آگئی تھی لیکن...... لیکن یہ کیسی قید تھی، یہ کیسی پابندیاں تھیں کہ میں اپنی بہن تک نہیں جاسکتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ صبر کروں۔کیا انسانی قوت برداشت اس حد تک ہو سکتی ہے۔ذہن بھٹکنے لگا۔توبہ کی، آنکھیں بند کر لیں۔سونا چاہتا تھا اور اس میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ یہ سہارا مجھے دے دیا گیا تھا اور نیند کے اس سہارے نے رات گزار دی۔ایسا بے خبر سویا کہ فجر کے وقت ہی آنکھ کھلی تھی۔ وضو کیا، نماز پڑھی۔ اکرام میرے ساتھ تھا اور اسی طرح سنجیدہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔دل کو کچھ ڈھارس سی ملی تھی لیکن نماز کے بعد اکرام نے پھر پیمانۂ ضبط توڑ دیا۔اس نے عرضی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''مسعود بھائی! وہ شمسہ تھی نا آپ کی بہن؟'' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

میں نے چونک کر اکرام کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کہنے لگا۔ ''بتایئے نا مسعود بھائی! وہ شمسہ ہی تھی نا؟''

''ہاں......'' میں نے اس سے جھوٹ نہیں بولا۔

''میں سمجھ نہیں پایا تھا اس وقت لیکن رات کو میں نے بہت غور کیا اور اس کے بعد یہ عرضی پڑھی جو صرف میں نے لکھی تھی، آپ نے نہیں لکھی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب اسی کا ردعمل ہے، جو کچھ آپ مجھے سنا چکے ہیں مسعود بھائی، اس سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ ہماری بہن شمسہ تھی۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ہاں اکرام! وہی تھی اور میری یہ کیفیت اسی وجہ سے ہوئی تھی۔''

اکرام نے عرضی نکال لی اور کہنے لگا۔ ''دوبارہ پڑھیئے اسے مسعود بھائی، دوبارہ پڑھیے۔''

''نہیں اکرام، خدا کیلئے۔ میں اسے دوبارہ نہیں پڑھ سکوں گا۔ میں تو اسے لکھ بھی نہیں سکا تھا۔''

''حقیقتوں سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے مسعود بھائی۔ آپ دنیا کے مسائل حل کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت اگر آپ اسے اپنی بہن نہ بھی تصور کریں تب بھی آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی مشکل کا حل تلاش کریں۔ آپ نے سن لیا ہے وہ سب کے دکھوں میں ڈوبی ہوئی ہے اور...... اور اس کے بعد بھی اس کی زندگی کو کوئی بہتر راستہ نہیں ملا۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا شوہر اسے لے کر مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ اس کی عزت نہیں کرتا، مارتا ہے اسے۔ تین بچے ہیں اس کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ کیا ہم اسے نظر انداز کر دیں گے مسعود بھائی؟''

''خدا کیلئے اکرام، خدا کیلئے اکرام۔''

''نہیں مسعود بھائی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات پر سر جھکایا ہے۔ یہاں میں وفاداریوں کا حق نہیں ادا کر رہا بلکہ پہلی بار میرے دل نے آپ سے بغاوت کی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ شمسہ پوری توجہ کی مستحق ہے۔ ہمیں اس پر خاص توجہ دینا ہوگی۔''

میں نے بے بسی سے اکرام کو دیکھا۔ کیا بتاتا اسے، کیسے کہتا کہ مجھے اجازت نہیں ہے۔ اکرام نے کہا۔

''وہ جمعرات کو آئے گی مسعود بھائی۔ وہ جمعرات کو آئے گی۔ آپ کو اس سے ملنا ہوگا۔''

''نہیں اکرام، کیسی باتیں کرتے ہو تم۔''

''میں ٹھیک کہتا ہوں مسعود بھائی۔ ہم اسے بھرپور سہارا دیں گے۔''

''اکرام ہماری دنیا ہی بدل جائے گی۔''

''تو بدل جائے...... کیا کر سکتے ہیں، ہم بے بس ہیں، کمزور ہیں۔''

''حکومت، یہ نہیں ہو سکتا۔ عمر بھر کی محنت اکارت جائے گی۔ اکرام یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے تم سے آخری بات کہہ دی ہے۔'' اکرام خاموش ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی تھی۔ ویسے بھی بہت زیادہ نہیں بولتا تھا مجھ سے۔ میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ دن بھر خاموش خاموش رہا۔ معمولات جاری رہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ تعاون کرنے والوں میں سے ہے۔ نہ جانے کتنی بار ہوک اٹھی لیکن پھر دل کو مسوس کر خاموش ہو گیا۔ البتہ دوسرے دن میں نے اکرام سے کہا۔

''وہ شام کو آئے گی اکرام۔ تم اسے تھوڑی سی رقم دے دینا۔ یہ کچھ پیسے ہیں میرے پاس، یہ اس کے حوالے کر دینا اور اسے تسلیاں بھی دینا۔ یہ کام تم کر لینا، میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔''

''آپ نہیں ملیں گے اس سے مسعود بھائی؟''

''نہیں...... سب کچھ ختم ہو جائے گا اکرام۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد کیا ہو جائے۔ خدا کیلئے یہ سب کچھ نہ کرنا، مجھے اس کیلئے مجبور مت کرنا۔'' اکرام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گیا۔ شام ہوئی۔ عرضیاں تیار ہو چکی تھیں یعنی جن جن لوگوں نے اپنی مشکلات کا اظہار کیا تھا، انہیں ان کا حل بتا دیا گیا تھا۔ اکرام کو میں نے ہدایات دے دی تھیں لیکن دل تھا کہ

قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اکرام، شمسہ سے ملے گا۔ جو کچھ بھی کہے گا وہ اس سے، وہ الگ بات ہے لیکن میں، میں اپنی بہن کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ آہ! وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر موجود ہے۔ کتنے برسوں سے بچھڑی ہوئی ہے۔ کتنے دکھ سے اس نے کہا تھا کہ پورا خاندان منتشر ہو گیا ہے۔ بھائی بچھڑ گئے ہیں، کچھ بھی نہیں رہا ہے اس کے پاس۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کچھ فاصلے پر موجود ہے لیکن میں...... میں روتا رہا، اندر ہی اندر روتا رہا اور وقت گزر گیا۔ اکرام واپس میرے پاس نہیں آیا تھا۔ انتظار کر رہا تھا میں اس کا، آئے۔ مجھے بتائے کہ شمسہ سے کیا بات ہوئی۔ کیا کیا اس نے، کیا کہا اس نے...... لیکن اکرام کو ضرورت سے زیادہ دیر ہو گئی۔ وقت اتنا ہو گیا تھا کہ تمام زائرین واپس جا چکے تھے۔ اب ذرا بے چین ہو گیا۔ اکرام واپس کیوں نہیں آیا۔ پھر میں خود بھی باہر نکل آیا۔ شامی اور دوسرے لوگ اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ میں نے اکرام کے بارے میں کسی سے پوچھا نہیں۔ بیکار ہی تھا۔ لگ رہا تھا کہ یہاں موجود ہی نہیں ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اکرام کو کیا ہو گیا، کہاں چلا گیا وہ۔ ذہن طرح طرح کے خیالات میں ڈوبا رہا۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر اکرام کا انتظار کرنے لگا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جذباتی ہو گیا ہے۔ کہیں وہ شمسہ کے پیچھے پیچھے ہی نہ نکل گیا ہو۔ ہوسکتا ہے بہرحال انسان ہے لیکن اگر اس نے ایسا کیا ہے تو حد سے تجاوز کرنے والی بات ہے۔ میں نے اس کو اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو سمجھا بھی لیا۔ اکرام بس میرا ساتھی ہے، محکوم تو نہیں وہ میرا۔ اگر اس نے اپنے طور پر کوئی عمل کیا ہے تو ایسی بری بات بھی نہیں ہے کہ میں اس پر بگڑنے لگوں۔ اپنی مرضی کا مالک ہے وہ۔ کسی بھی لمحے میرے پاس سے جا سکتا ہے۔ ویسے یہ تصور ذرا عجیب سا لگا تھا۔ اب تو اکرام کی کچھ اس طرح عادت ہو گئی تھی کہ اسے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ سمجھنے لگا تھا۔ پگلا کہیں کا وہ کام کر رہا ہے جو میں نہیں کر سکتا، لیکن اچھا تو ہے، کم از کم شمسہ کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ خدا کرے وہ اس کے پیچھے پیچھے ہی گیا ہو۔ کچھ معلومات حاصل کر کے آئے گا۔ ہوسکتا ہے ماں باپ کا کچھ پتا چل جائے۔ انہی خیالات میں بیٹھا رہا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ اکرام واپس آ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھے تلاش کر لیا تھا۔ میرے قریب شرمندہ شرمندہ سا پہنچا۔ کہنے لگا۔

"مجھے یقین تھا مسعود بھیا کہ آپ یہیں موجود ہوں گے، میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج پہلی بار میں نے خانقاہ سے باہر جا کر اس شہر کو دیکھا ہے۔ یہ تو خاصا بڑا شہر ہے۔ بڑی گھنی آبادی ہے اس کی بھیا۔ میں شمسہ کے پیچھے گیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی سی رقم دے دی تھی جو آپ نے مجھے دی تھی اور میں نے اسے تسلیاں بھی دی تھیں کہ اللہ نے چاہا تو اس کی مشکلات آسان بھی ہو جائیں گی۔ بھیا پھر میں اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک پہنچا جہاں وہ رہتی ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر ہے جو حسین خان نامی ایک شخص کا ہے۔ حسین خان، شمسہ کے شوہر کا دوست ہے۔ شمسہ کے شوہر کا نام فیضان ہے۔ فیضان عالم بہت اوباش طبع آدمی ہے، صورت ہی سے برا لگتا ہے اور اس کا دوست بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ کہیں باہر سے آ کر یہاں قیام کیا ہے اور دونوں مل کر کچھ کر رہے ہیں۔ شمسہ اکیلی اس گھر میں رہتی ہے کیونکہ اس کے دوست کی بیوی نہیں ہے۔ تین بچے ہیں شمسہ کے۔ دو بیٹے، ایک بیٹی اور مسعود بھیا...... شمسہ کا ایک بیٹا جو پانچ سال کا ہے، بالکل آپ کا ہمشکل ہے۔ بالکل آپ جیسا۔" میں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ دل بے قابو ہونے لگا تھا۔

"بھیا! وہ بڑی غیر محفوظ ہے۔ اس کا شوہر درحقیقت ایک درندہ صفت آدمی ہے۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ شمسہ کو اپنی بیوی سمجھتا ہے۔ اس کا دوست شمسہ کو گندے فقرے کستا ہے لیکن وہ خاموشی سے بیٹھا ہنستا رہتا ہے۔ شمسہ اس گھر کے سارے کام کاج کرتی ہے، اپنے بچوں کو سنبھالتی ہے۔ بہت دکھی ہے وہ بھیا، بہت دکھی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" میرے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

"نہیں مسعود بھائی! یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ آپ کیا کریں۔ بھائی ہیں آپ اس کے۔ ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے میں تو کر سکتا ہوں۔"

"کیا کرو گے مجھے بتاؤ، کیا کرو گے؟"

"مجھے اس بات کا جواب چاہئے مسعود بھائی کہ اگر آپ کی بہن آپ کے سامنے آ گئی ہے۔ آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں،

وہ آپ جانتے ہیں لیکن اس بہن سے جو آپ کی سگی بہن ہے اور مصیبتوں میں گرفتار ہے، اس سے یہ اجتناب کیسا؟''
''مجھے اجازت نہیں ہے کیا سمجھے اکرام، مجھے اجازت نہیں ہے۔''
''میں نہیں سمجھتا بھیا۔ انسانی رشتے اگر اتنی آسانی ہی سے چھین لئے جاتے تو ان رشتوں کا وجود نہیں ہونا چاہئے تھا۔''
''مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔'' میں نے غرا کر کہا۔
''سزا آپ کو مل رہی ہے، شمسہ کو تو نہیں ملنی چاہئے؟''
''اکرام، کیا کہنا چاہتے ہو اکرام۔ کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ۔''
''شمسہ سے مل لیجئے، اسے تحفظ دیجئے اور کوئی نہیں ہے اس کا۔ آپ ہیں، میں ہوں۔ میں اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔''

''تو جاؤ اس کی خبر گیری کرو، اس کے ساتھ رہو۔''
''انتہائی غمزدہ ہوں مسعود بھیا، انتہائی غمزدہ ہوں۔ سوچا تھا زندگی کے کسی حصے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا، چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ مروں گا بھی آپ کے قدموں میں لیکن معاف کیجئے گا مسعود بھائی، آپ سے شدید اختلاف کر رہا ہوں یہاں اور اس اختلاف کی بنیاد پر آپ سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔''
میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اکرام کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس نے کہا۔
''آپ ہی کے حوالے سے میں اس سے روشناس ہوا ہوں لیکن ایک ایسی بے بس، ایک ایسی تنہا لڑکی جس کا کوئی سرپرست نہیں۔ جس کے سر پر کوئی سایہ نہیں ہے اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کا ماضی کیا ہے، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں اس خانقاہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر عیش و آرام کی زندگی گزارتا رہوں اور وہ اسی طرح زندگی کے جال میں الجھی ہوئی مصیبتیں اٹھاتی رہے۔ آپ ہی کے حوالے سے مسعود بھیا اس کا بھائی ہوں اور میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے کہ بہن کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ جس قابل بھی ہوں میں، اس کی خبر گیری کروں گا۔ دیکھوں گا فیضان اسے کیا نقصان پہنچاتا ہے۔ بس بھیا میرا اور آپ کا ساتھ یہیں تک تھا۔ ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہوں گا لیکن یہ بات بھی آپ یاد رکھئے گا کہ جب آپ کی یاد میرے دل میں آئے گی تو میں سوچوں گا کہ آپ نے اپنی ذات کی بہتری کیلئے رشتوں کو ذبح کر دیا ہے۔ میں متفق نہیں ہوں آپ سے بھیا۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اکرام کو دیکھ رہا تھا۔ میرے اندر گڑگڑاہٹیں ہو رہی تھیں اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ دل چاہ رہا تھا کہ اکرام کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دوں۔ کیوں میری زندگی کو ایک بار پھر تاریکیوں کی جانب دھکیل رہا ہے، کیوں ایسا کر رہا ہے وہ...... لیکن جو جذبے اس کے سینے میں موجزن ہو گئے تھے، ان سے منحرف تو میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اکرام سنجیدہ چہرہ بنائے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔
''میری خواہش ہے مسعود بھیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ شمسہ سے مل لیں۔ فیضان عالم کا قبلہ درست کریں کہ وہ ایک باعزت زندگی گزارے۔ میں اس کے بعد اور کچھ نہیں چاہوں گا لیکن اگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو یہ بہت بڑا گناہ ہو گا۔ آپ اس سے مل لیں، آپ اس سے ضرور مل لیں۔''
''اگر میں اس سے مل لیا تو...... تو''
''ہاں! تو آگے کہئے۔''
''تو گناہگاروں میں شمار کیا جاؤں گا، نافرمان تصور کیا جاؤں گا۔''
''اور اس نافرمانی کی سزا ملے گی آپ کو۔ یہی نا؟''
''اکرام...... اکرام۔ حد سے بڑھ رہے ہو۔''
''بڑھ رہا ہوں بھیا۔ جب رشتے ہی اتنے بے معنی ہوتے ہیں تو پھر میرا آپ کا کیا رشتہ۔ اپنی سزا سے ڈر رہے ہیں

آپ اور وہ سزا جو چار افراد کو مل رہی ہے اور اس سے آگے بہت سے دوسروں کو مل رہی ہے، اس پر کیا کہیں گے؟ آپ جانتے ہیں آپ کا چھوٹا بھائی محمود سمندر پار ہے۔ وہ سب یعنی ماں باپ، ماموں ریاض زندگی کے عذاب میں گرفتار ہیں اور آپ...... آپ صرف اپنی ذات کیلئے جی رہے ہیں، ان سب کو بھول کر۔"

سارے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی، دماغ میں شدید سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، دانت بھینچ لئے اور اپنے آپ کو ان آوازوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عجیب لمحہ آیا تھا۔ ایک طرف شدید خوف دامن گیر تھا۔ جب بھی کبھی انحراف کی منزل میں داخل ہوا، ایسے ایسے عذابوں سے گزرا کہ زندگی لرز گئی اور اس کے بعد جو کچھ بیتی، وہ ایک الگ داستان تھی۔ میں منحرف نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اب وہ محبتیں دل پر عجیب سا اثر کر رہی تھیں جو فطرت کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اکرام کے الفاظ نے دیوانگی طاری کر دی تھی۔ کیا کروں، کیا نہ کروں، کیا کرنا چاہئے مجھے۔ آہ! کیا کروں۔ میں آنکھیں بھینچے ہوئے بیٹھا رہا۔ اکرام میرے سامنے ساکت تھا۔ گڑگڑاہٹیں آہستہ آہستہ رک گئیں اور مطلع صاف ہو گیا۔ میں مغلوب ہو گیا تھا، بالکل مغلوب ہو گیا تھا۔ واقعی بڑا عجیب وغریب تاثر تھا میرے ذہن پر۔ شمسہ کی کربناک آوازیں ابھر رہی تھیں۔ "رحم کرو سائیں، رحم کر دو سائیں۔ چار چوٹ کی مار مارتا ہے وہ مجھے۔ تین بچے ہیں میرے، کوئی سہارا نہیں ہے۔ رحم کر دو سائیں، رحم کر دو۔"

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں رہتی ہے شمسہ؟" میں نے سوال کیا اور اکرام خوشی سے اچھل پڑا۔

"میں اس کے گھر کا پورا پورا پتہ یاد کر کے آیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں لے جا سکتا ہوں۔"

"چلو اکرام۔ چلنا ہے مجھے، جانا ہے مجھے۔ میں شمسہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ تین بچے ہیں نا اس کے۔ چلو اکرام، چلو ٹھیک ہے۔ یہ بھی تقدیر ہی کا ایک حصہ ہے۔ آزما لوں اپنی تقدیر کو بھی۔ آہ چلو اکرام جلدی چلو۔ کہیں میرے پیروں میں لغزش نہ آ جائے۔"

"چلئے مسعود بھیا۔" اکرام نے کہا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ماضی کی تیز وتند ہوائیں ذہن سے گزر رہی تھیں۔ شمسہ کا بچپن یاد آ رہا تھا۔ کیا دردناک لہجہ تھا اس کا اس وقت جب وہ اپنی بپتا سنا رہی تھی اور ایک اس کا بچپن تھا۔ شوخی اور شرارت سے بھرپور۔ میرے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ اکرام کو میرے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک طویل فاصلہ تو ہمیں ایسے ہی طے کرنا پڑا کیونکہ آبادی ذرا دور تھی لیکن اس کے بعد اکرام نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"رفتار سست کر لیجئے مسعود بھیا۔ اس طرح دوڑ دوڑ کر چلیں گے تو لوگ ہماری جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔" میں نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پایا۔ اکرام پہلی بار اس آبادی میں آیا تھا لیکن شمسہ کے گھر کے پتے کو اس نے پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور اب وہ آہستہ آہستہ اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ "تمہیں پتہ ٹھیک سے یاد ہے نا؟"

"ہاں! ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ وہ دیکھئے وہ چبوترہ اور اس پر پیپل کا درخت۔ یہاں شاید ہندو پوجا کرتے ہیں۔ وہ چونے کے نشانات۔"

"کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"بس، وہ چھوٹا سا میدان عبور کر کے ہم ان گھروں کے سلسلے تک پہنچ جائیں گے۔"

"جلدی کرو، تمہارے قدموں کی رفتار سست کیوں ہے؟" میں نے کہا تو اکرام مسکرا دیا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں نے اس کی مسکراہٹ محسوس کر لی تھی۔ "آنکھوں میں روشنی کی طرح پیاری تھی وہ مجھے، مگر کیا کرتا، کیا کرتا۔" میں نے کہا۔ اکرام اب بھی خاموش تھا۔ وہ میرے دل کی کیفیت کیا سمجھتا۔ کیا کیا وسوسے تھے، میرے دل میں کیسے کیسے خوف پنہاں تھے، میں ہی جانتا تھا۔ ملعون بھوریا چرن نے اس سے پہلے بھی تو مجھ پر ایسے کئی وار کئے تھے۔ مختلف شکلیں لایا تھا وہ میرے سامنے۔ کون جانے یہ بھی کوئی دھوکا یا پھر......!

میدان عبور کر لیا۔ مکانات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر اکرام ایک مکان کے دروازے پر رک گیا۔

''یہ ہے۔'' اس نے کہا۔ آگے بھی وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن ایک دلدوز نسوانی چیخ نے اس کی آواز بند کردی۔ چیخ کی آواز اندر سے ہی اُبھری تھی۔

ہم دونوں ٹھٹک گئے، چیخ شمسہ کی تھی۔ میں نے مضطرب نگاہوں سے اکرام کو دیکھا۔ اس بار بھی کچھ نہیں بول پایا تھا کہ قدموں کی بھاری آواز سنائی دی۔ کوئی دروازے کے پاس آ گیا تھا۔ پھر نسوانی آواز اُبھری۔

''بے آبرو نہیں ہوں۔ سمجھا کیا ہے تو نے مجھے۔ دو بھائیوں کی بہن ہوں۔ دو کڑیل بھائیوں کی، تیری اور تیرے بے غیرت دوست کی جاگیر نہیں ہوں۔ ہاں۔''

دُوسری آواز سنائی دی۔ ''دروازے کو ہاتھ مت لگائیو۔ سوچ لے تیرے بچے اندر سو رہے ہیں، تینوں کی گردنیں مار دوں گا۔'' یہ ایک بھاری مردانہ آواز تھی لیکن اس دوران دروازے کی زنجیر نیچے گر چکی تھی۔

''خدا کے لیے۔ تجھے خدا کا واسطہ۔ ہاتھ جوڑتی ہوں تیرے۔ مان لے میری بات۔'' لجاجت بھری، آنسوؤں میں ڈُوبی آواز اُبھری۔ یہ آواز میری شمسہ کی تھی۔

''نکل گئی ساری اکڑ۔ آ جا۔ شاباش، اندر آ جا، تیرے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ یہ زنجیر چڑھا دے۔ کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا۔ تیرے کڑیل بھائی کہیں مزے سے سو رہے ہوں گے۔ آ چل زنجیر چڑھا کر اندر آ جا۔''

میرا پورا بدن لرزنے لگا۔ اکرام کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ اس نے دروازے کو لات ماری اور دروازہ کھل گیا۔ شمسہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے دو گز کے فاصلے پر ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہی اُچھل پڑے تھے۔

شمسہ کے حلق سے پھر چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر اکرام کے قریب آ گئی۔ ''بچا لے مجھے میرے بھائی۔ تجھے اللہ کا واسطہ، بچا لے مجھے میرے بھیا۔ میرے بھائی میرے بچے اندر ہیں یہ مار دے گا انہیں۔ یہ...... انہیں۔''

پیچھے کھڑا شخص آگے بڑھ آیا اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کون ہو تم دونوں، اندر کیسے آئے۔ میں پوچھتا ہوں تم میرے گھر میں کیسے گھسے۔ ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو۔ ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں تمہیں۔''

اکرام نے شمسہ کو پیچھے ہٹایا اور پتھرائے ہوئے انداز میں آگے بڑھا لیکن اس سے پہلے میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ میں نے ہاتھ سیدھا کر کے اکرام کے سامنے کر دیا اور وہ رُک گیا۔ میں اس بدکار شخص کو گھورتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اکرام نے کہا۔ ''نہیں مسعود بھائی۔ تم شمسہ بہن کو سنبھالو، میں اسے دیکھتا ہوں۔'' میں نے اکرام کو دوبارہ ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا۔ میری خونی نظریں سامنے کھڑے شخص کو گھور رہی تھیں۔

''کون ہے تو۔ شوہر ہے اس کا؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بھائی، میرے شوہر کا دوست ہے یہ۔ اسے نشہ کرا کے باندھ دیا ہے اس نے زخمی کر دیا ہے اسے۔ اور...... اور اب یہ بے عزت کرنا چاہتا ہے۔'' پیچھے سے شمسہ کی آواز اُبھری۔ حالانکہ اکرام نے مجھے مسعود کہہ کر پکارا تھا مگر شمسہ کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ میں ہو سکتا ہوں، اس کا اپنا بھائی۔

صورت حال سمجھ میں آ گئی تھی۔ میرا اُٹھا ہاتھ اس شخص کے منہ پر پڑا اور وہ اُچھل کر کوئی پانچ فٹ دُور جا گرا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار پھوٹ پڑی تھی۔ میں آگے بڑھا اور میں نے جھک کر اسے گریبان سے پکڑا۔ تھوڑا سا اُٹھا کر میں نے ایک لات اس کے سینے پر رسید کی اور اس کے منہ سے ہائے نکل گئی۔ وہ کہنیوں کے بل پیچھے کھسکنے لگا۔ چیخنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ خود مجرم تھا۔ شاید نہیں چاہتا تھا کہ باہر آواز جائے۔ میں نے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر رسید کر دی اور وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ کمر سینے اور پنڈلیوں پر لاتعداد ٹھوکروں سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اکرام نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا۔

''مر جائے گا بدبخت۔ چھوڑ دو بھیا، بس چھوڑ دو۔ بس بھیا۔ بس کرو۔ مسعود بھائی رُک جاؤ۔'' اکرام اس طرح سامنے آیا کہ اب اگر میں اس شخص کو مارتا تو اکرام نشانہ بن جاتا۔ چنانچہ رُکنا پڑا۔

شمسہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا۔ ''مظلوم ہوں۔ دُکھیاری ہوں میرے بھائی، تھوڑی سی مدد

اور کر دو میرا مرد اندر بندھا پڑا ہے۔ نشے میں تھا، اس نے دھوکا دیا، اسے بھی مارو۔ اسے ذرا ہوش میں لے آؤ، اللہ تمہیں اجر دے گا۔ تم نے ایک بے آسرا کی مدد کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا صلہ دے گا۔ بس تھوڑی سی مدد اور کر دو۔"

بے ہوش شخص کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر چل پڑے۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ فرش پر ایک شخص بندھا پڑا تھا۔ یہی شمسہ کا شوہر تھا۔ ہم نے اسے سیدھا کیا۔ سر کے بال خون سے چپچپا رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے سر زخمی ہے۔ شمسہ کراہتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"جیسا بھی ہے میرے سر کا سائبان ہے، میرا چھپر ہے، بچوں کا باپ ہے، میرا تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اللہ تمہیں عزت دے۔ میرے بھائیو۔ سگے بھائی بن کر آئے ہو میرے۔ ہائے تم نے میری آبرو بچا لی۔ اللہ تمہاری بہنوں کی آبرو بچائے۔ میرے بھی بھائی تھے، چھین لئے تقدیر نے، ہائے یہ ہوش میں آ جائے تو اس سے پوچھوں کہ اب کیا کرے گا، نشے کا بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ سارے رشتے بھول جاتے ہیں یہ سسرے۔ بھابی بھابی کہہ کر دھوکا دیا اس نے۔ فیضان ارے فیضان، اب تو اُٹھ جاؤ۔ اب تو جاگ جاؤ، فیضان۔"

"ایک کپڑا چاہیے بہن، ان کا سر زخمی ہے۔" اکرام نے کہا۔ میرے بدن میں اب بھی لرزش تھی۔ شمسہ کی آواز کا کرب۔ اس کی باتیں دل چھید رہی تھیں لیکن صبر کرنا آتا ہے مجھے۔ صبر کرنا جانتا تھا، خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ شمسہ نے اپنی اوڑھنی سے ہی ایک ٹکڑا پھاڑ دیا۔

"کتنا خون بہہ گیا ہے، زخم گہرا تو نہیں ہے، لوہے کا کڑا مارا تھا سر میں، زیادہ زخم آیا ہے کیا؟"

"نہیں، فکر مت کرو، بچے کہاں ہیں؟"

"دُوسرے کمرے میں ہیں، وہیں سو رہی تھی میں۔ ان دونوں کے لڑنے کی آواز سن کر اِدھر آئی۔ دیکھا تو فیضان زخمی ہو گیا تھا۔ یہ اسے باندھ چکا تھا اور پھر...... اور پھر...... خدا تمہیں خوش رکھے، تمہاری بہنوں کی آبرو بچائے۔"

فیضان کو بستر پر لٹانے کے بعد میں نے اکرام سے کہا۔ "اسے بھی اندر گھسیٹ لاؤ، دیکھو مر تو نہیں گیا۔ فیضان ہوش میں آ جائے تو اس سے پوچھیں گے کہ اب وہ کیا چاہتا ہے۔"

"آپ بھی آئیے بھیا، آئیے۔" اکرام نے کچھ اس طرح کہا کہ میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ "کچھ بات بھی کرنی تھی آپ سے۔"

"کہو۔" میری آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔

"شکر ہے نشے میں ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ چیخا چلّایا نہیں۔ اس طرح باہر والے متوجہ نہیں ہو سکے۔ ہمیں سوچنے کا وقت مل گیا ہے۔ اس مردود کو باندھ کر ڈالے دیتے ہیں اور پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ویسے آپ نے کمال ضبط کا ثبوت دیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔"

"میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اکرام۔ میرا وجود، چکنا چور ہو گیا ہے۔" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا میں نہیں جانتا۔ لیکن مسعود بھائی، شمسہ بہن آپ کو بالکل نہیں پہچانیں۔"

"میرے گھر والے مجھے زندہ نہیں سمجھتے اکرام۔ شمسہ کو تو میری زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ ماموں ریاض نے مجھے بدنصیب شمسہ کی کہانی سنائی تھی، اس وقت وہ اس ظالم شخص کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" اکرام بولا۔

"کیوں۔ یہ اندازہ کیسے ہوا؟"

"اس نے کئی بار اپنے بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔"

"اللہ جانے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"مگر وہ آپ کو بالکل نہیں پہچان سکی۔ اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ شاید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ میں نے

آپ کو مسعود بھائی اور اسے شمسہ بہن کہہ کر پکارا ہے۔ مگر وہ اس بات پر بھی نہیں چونکی کہ میں نے اس کا نام کیسے لے لیا۔"

"ہاں۔ شاید تمہارا خیال درست ہے۔"

"عارضی طور پر میرے دل میں ایک خیال آیا تھا بھیا۔"

"بتاؤ اکرام۔ میرا دماغ تو ماؤف ہے، بتاؤ کیا کروں؟"

"شمسہ بہن، اس دوران خود آپ کو پہچان لیں تو دُوسری بات ہے، آپ خود انہیں کچھ نہ بتائیں۔ ہوسکتا ہے ان پر کچھ جذباتی اثرات مرتب ہو جائیں۔ اب ان حالات میں انہیں یہاں چھوڑنا تو مناسب نہیں ہوگا۔ ہم انہیں خانقاہ لئے چلتے ہیں، وہاں اطمینان سے سوچیں گے کہ اب کیا کریں۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو اکرام۔"

"آپ کو اختلاف تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔ اب مجھے کسی بات سے اختلاف نہیں ہے۔" میں نے کہا اور اکرام مطمئن ہوگیا۔ اس کے بعد میں سارے کام کئے تھے۔ اس منحوس شخص کو باندھ کر ڈال دیا گیا جس نے دوستی کا بھرم کھویا تھا۔ شمسہ کا شوہر بھی آہستہ آہستہ ہوش میں آرہا تھا۔ اس کا نشہ تو ویسے ہی اُتر چکا تھا۔ ہوش میں آکر اس نے وحشت زدہ نظروں سے ماحول کو دیکھا۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کہاں۔ کہاں گیا وہ؟"

"سب ٹھیک ہے فیضان۔ ہوش کرو، سب ٹھیک ہے۔ اللہ نے مدد بھیج دی فیضان۔ میرے بھائیوں نے مجھے بچا لیا۔ ہائے فیضان تم نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ میں کہتی تھی کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے، اس پر بھروسا نہ کرو۔ مگر نہ مانے تم۔ ہائے فیضان مجھے اللہ نے بچا لیا۔" شمسہ روتے ہوئے بولی۔

"بچے...... بچے۔" فیضان گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔ "اللہ کا کرم ہے، سو رہے ہیں۔ ایک نظر دیکھ آؤں انہیں۔ بھیا ابھی آئی۔" شمسہ کمرے کے دروازے سے نکل گئی۔ فیضان نے لالٹین کی روشنی میں ماحول کو دیکھا، پھر اس کی نظر اپنے دوست پر پڑی اور وہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ چند قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچا، اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"مارا ہے ہم نے۔" اکرام بولا۔

"مر گیا؟"

"نہیں زندہ ہے۔"

"کم اصل ہے، ایسے کہاں مرے گا۔" فیضان نے کہا اور اسے ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ پھر وہ ہماری طرف مڑ کر بولا۔ "تمہارا شکریہ ادا کرنا بیکار ہے۔ شکریہ کوئی عزت دار کسی عزت دار کے احسان کا ادا کرتا ہے۔ مجھ جیسے بے غیرت آدمی نے اگر تمہارا شکریہ ادا کر بھی دیا تو اس لفظ کی بھی توہین ہوگی۔ وہ داغدار ہو جاتی تو اور مشکلات میں ڈوب جاتی، میں ہی اسے نہ جینے دیتا۔ اتنا ہی ذلیل انسان ہوں میں۔"

اکرام نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں خاموش رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد فیضان نے کہا۔ "مگر تم دونوں رحمت کے فرشتے بن کر اس وقت یہاں کیسے آئے اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ......"

"ہم اِدھر سے گزر رہے تھے کہ ہمیں بہن کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگنا چاہتی تھی۔ ہم نے اس شخص کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا کہ اگر باہر نکلی تو وہ بچوں کو گردن دبا کر مار دے گا۔ بس ہم اندر گھس آئے۔"

✦✤✦✤✦

"کمینہ، کتا، میرے بچوں کو...... میرے بچوں کو!" فیضان بے قابو ہو کر پھر اپنے دوست کی طرف دوڑا لیکن اکرام نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔

"وہ بے ہوش ہے۔ جذباتی ہونا بیکار ہے۔ اب یہ بتاؤ بھائی کہ آگے کیا کرنا ہے۔"
"یہ میرا بہت پرانا دوست تھا، بڑا مان تھا مجھے اس پر۔" فیضان نے کہا۔
"اس کی اصلیت معلوم ہوگئی۔ افسوس کرنا بیکار ہے۔ تم دونوں جن راستوں کے راہی تھے وہ اچھے تو نہیں تھے۔"
"ہاں۔ احساس ہوگیا۔ آخر احساس ہو ہی گیا۔ مگر....." وہ خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "یہیں کے رہنے والے ہو؟"
"ہاں۔" اکرام نے جواب دیا۔
"کچھ اور رحم کرو گے ہم پر، تین معصوم بچوں اور ایک مظلوم عورت پر۔" اس کی آواز میں عجیب سی پشیمانی تھی۔
"مظلوم عورت پر۔ تو کیا وہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟"
"ہے تو سہی۔ اللہ کے سامنے تو میں نے بھی اقرار کیا تھا کہ اس کا محافظ بنوں گا۔ مگر وعدہ پورا نہیں کیا میں نے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، کیا کر سکتا ہوں۔ ظلم کئے ہیں میں نے اس پر۔ کاش آنکھ نہ کھلتی۔ اس سے بھی معافی نہیں مانگوں گا۔ جھوٹ سمجھے گی۔ کبھی یقین نہیں کرے گی۔ کوئی فائدہ بھی نہیں، کر کیا سکوں گا اس کے لئے۔ بیکار ہے۔ ارے ہاں اپنی بات لے بیٹھا۔ تم سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا، اپنی کہانی سنانے لگا۔"
"بولو کیا چاہتے ہو؟"
"اس سے تو دشمنی ہوگئی۔ اب اس کے ساتھ تو رہا نہیں جا سکتا، تھوڑی سی مدد کر دو۔ عارضی طور پر سر چھپانے کی جگہ دے دو، کچھ کمانے کی کوشش کروں گا، پھر یہاں سے کہیں اور نکل لوں گا۔ یہ مت سمجھنا کہ نیکی گلے پڑ گئی۔ مجبوری ہے، چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے ورنہ کہیں اور نکل لیتا۔ بن سکتی ہے کوئی بات۔"
"کسی سرائے وغیرہ میں رہو گے؟" اکرام نے پوچھا۔
"پیسے نہیں ہیں۔" فیضان نے جواب دیا۔ اسی وقت شمسہ واپس آگئی۔ فیضان کو دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں بولی۔
"چھوٹا جاگ گیا تھا، سُلانے میں دیر ہوگئی۔" فیضان نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔ شمسہ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "درد ہو رہا ہے سر میں؟ گھاؤ گہرا ہے کیا؟"
"نہیں ٹھیک ہوں۔"
"چلو فیضان، کچھ سامان ہو تو اٹھا لو۔" اکرام نے کہا۔ اس بات پر میں نے بھی چونک کر اکرام کو دیکھا تھا۔ اکرام نے سب کچھ خود سنبھال لیا تھا۔ میری ذہنی کیفیت جانتا تھا اور اس لئے پورے اعتماد کے ساتھ عمل کر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ بہت جذباتی ہوگیا تھا۔ شمسہ کے سلسلے میں اور اس کی وجہ بھی میں جانتا تھا۔ وہ خود بھی تو گھائل تھا۔
فیضان نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ٹین کا ایک صندوق اور کپڑوں کی پوٹلی۔ یہ اثاثہ تھا ان کا۔ شمسہ نے پوٹلی شانے سے لٹکائی اور فیضان سے بولی۔ "ایک بچے کو اُٹھا لو گے؟" فیضان خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے پیچھے اکرام اور پھر میں۔ فیضان نے ایک بچے کو اُٹھایا تو اکرام نے فوراً اپنی گود میں لے لیا۔ شمسہ نے دُوسرے بچے کو اُٹھایا تو میں نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ نرم ننھا سا وجود میری آغوش میں آیا تو محبت کے سوتے کھل گئے۔ بھانجا تھا میرا، ماموں تھا میں اس کا۔ اپنی خوشبو آ رہی تھی اس کے بدن سے، میں نے اسے بھینچ لیا۔ تیسرے بچے کو فیضان نے اُٹھا لیا۔ اکرام نے صندوق بھی ہاتھ میں لٹکا لیا تھا۔ اسی طرح ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ میں جانتا تھا کہ اکرام نے انہیں خانقاہ لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے عمدہ جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ خانقاہ کا رُخ کرتے ہوئے شمسہ چونکی تھی اور پھر میں نے اسے آنکھیں پھاڑ کر اکرام کو اور خود کو دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اکرام نے اس کی مالی مدد بھی کی ہے۔ ہو سکتا ہے شمسہ اسے پہچانتی ہو لیکن اوّل تو رات اور پھر اس حادثے کی بدحواسی نے اسے اکرام پر غور نہ کرنے دیا ہو۔ مگر اب راستہ طے کرتے ہوئے وہ بار بار ہمیں دیکھ رہی تھی۔
ہم خانقاہ پہنچ گئے۔ میں انہیں اپنی رہائش گاہ میں لے گیا تھا۔ اکرام نے کہا۔ "فیضان بھائی۔ آپ اور بہن یہاں آرام

سے رہیں۔ اطمینان رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ مزار ہے کس بزرگ کا؟" فیضان نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے، آپ کو یہاں تکلیف نہیں ہوگی۔" ہم دونوں انہیں چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ ایک کھلی جگہ پتھر پر بیٹھ گئے۔ تا حد نگاہ پُراسرار رات بکھری ہوئی تھی۔ انوکھی کہانیوں کی امین۔ اکرام نے کہا۔ "کیسی عجیب کہانی ہے اب آپ کیا سوچ رہے ہیں مسعود بھائی۔"

"پتہ نہیں اکرام۔"

"میری کسی بات کو فریب نہ سمجھیں مسعود بھائی۔ میری زندگی کا مقصد، میرا مسلک ثریا کی تلاش تھا۔ وہ مجھے شمسہ کی شکل میں مل گئی ہے۔ اگر وہ ثریا نہیں ہے تو کیا ہوا شمسہ تو ہے۔ بلکہ شمسہ کا مل جانا میرے لئے بڑی ڈھارس کا باعث ہے، جس طرح تقدیر نے مجھے شمسہ دے دی، اسی طرح ثریا بھی ضرور مل جائے گی، میرا ایمان ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے میں کوئی جدوجہد نہیں کروں گا۔ ہاں انتظار ضرور کروں گا کسی ایسے لمحے کا جو ثریا کو میرے سامنے لے آئے۔ آپ کا مشن الگ ہے اور میں اس میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔ آپ جس طرح چاہیں اپنا مشن جاری رکھ سکتے ہیں مگر میں اب شمسہ کی خدمت کروں گا۔ اس کی محرومیاں دُور کروں گا۔" اکرام سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کچھ بولیں گے نہیں مسعود بھائی۔"

"کیا کہوں اکرام؟"

"میں نے آج پہلی بار کئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کر ڈالے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ سے پوچھے بغیر۔"

"میں نے تمہیں اپنا محکوم کبھی نہیں سمجھا۔"

"اس عمل سے آپ ناراض تو نہیں ہیں۔"

"وہ میری بہن ہے اکرام۔ اسے سہارا دیا ہے تم نے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شکریہ بھیا، میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ میں اس کے لئے سب کچھ کروں گا، جو بن پڑے گا، کروں گا۔"

"میں ایک درخواست کروں گا تم سے اکرام۔"

"حکم دیں مسعود بھائی۔"

"اسے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

"اوہ" اکرام آہستہ سے بولا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ "ٹھیک ہے حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ...... کہ...... خیر آپ جو بہتر سمجھیں۔ ٹھیک ہے میں نہیں بتاؤں گا۔"

"جاؤ آرام کرو۔ کہیں بھی پڑ رہنا، خانقاہ وسیع ہے۔" اکرام کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔ میرے دل و دماغ پر شدید بوجھ تھا۔ سخت ہیجان کا شکار ہو رہا تھا۔ شمسہ کو کلیجے میں بھر لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ رُواں رُواں چیخ رہا تھا، سارے بدن میں جوار بھاٹے اُٹھ رہے تھے۔ مگر خوف کا شکار تھا۔ پتہ نہیں میرا یہ عمل مجھے کیا سزا دے۔ ابھی اجازت نہیں تھی، ابھی صبر کرنا تھا۔ اکرام کے الفاظ نے جذباتی کر دیا تھا اور میں شمسہ کے پاس پہنچ گیا تھا مگر یہ ضروری تھا۔ بروقت پہنچے تھے ہم لوگ۔ نہ جانے کیا ہو جاتا، نہ جانے وہ منحوس شخص میری شمسہ کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ بے چینی عروج کو پہنچی تو آنکھیں بند کر کے مراقبہ کرنے لگا۔ اس وقت مجھے شمسہ کے لئے رہنمائی درکار تھی۔ آہ میں انہی کی محبت سے مغلوب ہو رہا تھا۔ مگر کوئی اشارہ نہیں ملا۔ کچھ نہیں ہوا۔ ایسا ہوتا تھا۔ بعض اوقات چھوٹی سی بات کے لئے اشارے مل جاتے تھے اور بعض اوقات کچھ نہیں پتہ چلتا تھا۔ گویا معاملہ میری صوابدید پر ہے۔ تاہم اس فیصلے پر اٹل تھا کہ شمسہ پر خود کو ظاہر نہیں کروں گا۔ باقی رات بھی سوچتے ہوئے گزری تھی۔ فیضان اب بہتری کی طرف مائل ہے۔ اس کے بارے میں کسی حد تک معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ انہیں ایک نامعلوم مستقبل کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ کرنا ہوگا ان کے لئے، مگر کیا۔

دُوسری صبح شامی میرے پاس آ گیا۔''وہ مسعود بھائی۔ آپ کے کچھ مہمان آئے ہیں۔''

''ہاں شامی؟''

''میں آپ سے ملنے گیا تھا مگر وہاں ایک خاتون اور چند بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔''

''وہ کچھ دن یہاں رہیں گے شامی۔''

''ٹھیک ہے مجھے ان کیلئے ہدایات دیدیں۔''

''ان کی ضرورتیں پوری کرنی ہیں۔ میرے اُوپر تمہارا احسان ہوگا۔'' میں نے ساجت سے کہا۔

''کیسی باتیں کررہے ہیں مسعود بھائی۔ اندھے تو نہیں ہیں سب لوگ، ہم جانتے ہیں کہ یہاں تمہارے دَم کا ظہور ہے۔ بڑا بابا تو نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔ اسے تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگئی ہے۔ تم نے بس یہ کہہ دیا کہ وہ تمہارے مہمان ہیں، تو سب ٹھیک ہوگیا۔ ہمارا فرض ہے ان کی دیکھ بھال کرنا۔ تم اطمینان رکھو۔''

''شکریہ شامی۔'' وہاں سے اُٹھ کر خانقاہ میں جا بیٹھا۔ ناشتہ وغیرہ وہیں کرلیا تھا۔ پھر اکرام آ گیا۔

''شمسہ نے مجھے پہچان لیا ہے مسعود بھائی۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ...... آپ نے کچھ پیسے دیئے تھے نا مجھے۔ میں نے خود اسے دیئے تھے، صبح کو مجھے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ بہت معصوم ہے وہ...... فیضان کے سامنے ہی بول پڑی کہ بھیّا تم وہی ہو جس نے مجھے پیسے دیئے تھے۔''

''مجھے تو نہیں پوچھا تھا؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''پوچھا تھا۔''

''کیا کہا تھا۔''

''کہنے لگی دُوسرے بھیّا کہاں ہیں۔''

''تم نے کیا جواب دیا۔''

''میں نے کہا۔ وہ کہیں گئے ہیں، کسی بھی وقت واپس آ جائیں گے۔''

''فیضان کا کیا حال ہے؟''

''سخت شرمندہ نظر آتا ہے۔ بالکل خاموش ہے، ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا اس نے میرے سامنے۔''

''شمسہ سے کہنا، پردہ نشین لڑکیوں کی طرح اندر رہے، کسی کے سامنے نہ آئے۔''

''ٹھیک ہے، کہہ دوں گا۔''

''اس کے بچوں کے کیا نام ہیں؟'' میں نے پوچھا اور اکرام مجھے ان کے نام بتانے لگا۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ بہرصورت میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ شمسہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ اسے ایک لمحہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔ مگر رات کے بعد میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔

شام کو فیضان باہر نکل آیا۔ میں نے اسے مغرب کی نماز پڑھتے دیکھا تھا اور مجھے خوشی ہوئی تھی۔ انسان اللہ کے حضور سربسجود ہو جائے تو برائیاں مرجھا جاتی ہیں۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ وہ سر جھکا کر اسے اپنی برائیوں کا کیا جواب دے گا۔ میں اس کے پاس تو نہیں گیا مگر جب شمسہ کے بچے باہر نکل آئے تو میں خود کو باز نہ رکھ سکا۔ یہ میری بہن کے بچے تھے۔ میں ان کا ماموں تھا۔ سگا ماموں...... میں بے اختیار ہو کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ فیضان نے مجھے پہچان لیا۔

''آپ آ گئے شاہ صاحب۔''

''کہو کیا حال ہے فیضان میاں؟''

''حضور سخت زخمی ہوں۔ اپنے زخموں کیلئے مرہم چاہتا ہوں۔'' فیضان نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ تمہیں سکون عطا فرمائے۔'' میں نے بچوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''دل و دماغ میں سخت ہیجان برپا ہے۔ نہ جانے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں مگر کس سے کہوں۔ کیسے دل ہلکا کروں۔ کوئی ہے جو مجھ پر یقین کر لے۔''

''شمسہ تمہاری بیوی ہے۔'' میں نے کہا۔

''نظر ملانے کے قابل نہیں ہوں اس سے، جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا ہے اللہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

''اگر تم شمسہ کے مجرم ہو تو اس سے معافی مانگ لو، اس نے تمہیں معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور معاف کر دے گا۔''

''بہت شرمندہ ہوں میں اس سے، اس کی شخصیت تباہ کر دی ہے میں نے، بہت ذہین بہت سمجھ دار، بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔ اتنا ستایا میں نے اسے کہ اپنی اہلیت کھو بیٹھی۔ تیسرے درجے کی عورت بن گئی وہ۔ سب کچھ اس کے دل میں ہے۔ مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے اسے۔'' فیضان کی سسکیاں اُبھرنے لگیں۔

''وہ کیا کہتی ہے۔''

''اب کچھ نہیں کہتی۔ بہت کچھ کہہ چکی ہے مگر...... اس وقت میں نے سُنا نہیں تھا شاہ صاحب۔ میرے کان بند تھے۔''

''مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتاؤ گے فیضان۔''

''آپ سُن لیں گے شاہ صاحب۔ وعدہ کریں آپ سُن لیں گے۔ آپ مجھے ذلیل کریں گے، خوب ذلیل کریں گے۔ شاہ صاحب، آپ لوگوں نے، آپ نے اور اکرام بھائی نے میری بیوی کی عزت بچائی۔ وہ پاکباز عورت ہے۔ ایک شرابی ایک بدکار انسان ہونے کے باوجود میں اس پر ہر الزام لگانا چاہتا تھا، ہر طرح اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اس پر کبھی بدکاری کا الزام نہیں لگا سکا، اتنی ہی پاکیزہ ہے وہ۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ایسے نیک انسان کا خون ہے کہ...... کہ اس کی بے حرمتی پر اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

''شکریہ فیضان۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ مگر فیضان جذبات میں اس قدر ڈُوبا ہوا تھا کہ اس نے میرے ان جملوں پر غور نہیں کیا۔ وہ بولا۔

''بُرے لوگوں کا ساتھ رہا میرا۔ اچھائی پہ نظر ہی نہ گئی۔ یہ بڑا دربار ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجھے یہاں جگہ بلاوجہ نہیں ملی ہے۔ شاید میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔'' فیضان ڈرتے ہوئے بولا۔

''ابا کیوں رو رہے ہیں۔'' شمسہ کے بڑے بچے نے منہ بسورتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹے۔ اب یہ ہمیشہ ہنسیں گے، اکرام۔'' میں نے دُور سے گزرتے ہوئے اکرام کو آواز دی۔

''جی بھائی۔'' اکرام قریب آ گیا۔ اس نے جان بوجھ کر میرا نام لینے سے گریز کیا تھا اور نہ وہ مجھے خالی بھائی کبھی نہ کہتا تھا۔

''بچوں کو ان کی ماں کے پاس پہنچا دو۔''

''جی۔'' اکرام بچوں کو لے کر چلا گیا۔ فیضان نے پھر گردن خم کر لی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا، پھر بولا۔

''میں سہارنپور میں رہتا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ چار بھائی تھے ہم لوگ۔ تین شادی شدہ تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ بھائیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ بھائی مجھ سے بے نیاز تھے۔ احساس محرومی نے مجھے میرے دوستوں کا راہی بنا دیا تھا۔ برائی کی طرف قدم بڑھاؤ تو دوستوں کی کمی نہیں ہوتی۔ بہت سے بُرے دوست مل گئے تھے مجھے۔ بھاوجیں ہر طرح ذلیل کرتی رہتی تھیں۔ میں نے ایک دن بڑی بھابی سے کہا۔ بھابی میری شادی کر دیں۔''

''خوب...... بیوی کو کہاں رکھو گے۔''

''یہ گھر میرا نہیں ہے کیا؟''

''آئینہ دیکھا ہے کبھی۔''

''کیوں۔''

''صاف صاف سُنو گے۔'' بھابی بہت تیز طرار تھیں۔

''اب تو سننا بہت ضروری ہے۔'' میں نے بھی بھاری لہجے میں کہا۔

''کتنے عرصہ سے کھا رہے ہو ہمارے سر پر...... کیا خرچ ہے تمہارا۔''

''میرا خرچ تو بڑے بھیا اُٹھاتے ہیں۔''

''کچھ شرم آئی ہے کبھی۔''

''آخر کیوں۔''

''سُنو فیضان غور سے سنو۔ تمہارے تینوں بھائیوں میں سے کوئی تمہارا خرچ اُٹھانے کیلئے تیار نہیں ہے اور کیوں اُٹھائیں وہ تمہارا خرچ، جوان ہو، تندرست ہو، یہ بات ہم سب کے درمیان ہو چکی ہے۔ اس مکان میں تمہارا حصہ تھا۔ آج تک تمہارا خرچ اس میں سے اُٹھایا جا رہا ہے۔ وہ حساب بھی برابر ہو چکا ہے، سمجھ میں آ گیا۔''

بھابی کی بات مجھے بہت بُری لگی۔ مگر میں اس بات پر ناراض نہیں ہوا بلکہ میں نے سنجیدگی سے سوچا۔ واقعی میں بہت پست ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک دم خود کو بدل دیا۔ نوکری کی، دوسرے کام کرنے لگا۔ تیز چالاک تھا میں۔ پیسے کمانا مشکل نہ ہوا۔ میں نے اپنی حیثیت بدل لی۔ بھائی بھی خوش تھے۔ بھاوجیں بھی، انہیں بھی بہت کچھ دیتا تھا۔ پرانے دوستوں کو چھوڑ کر، ہر بُری عادت چھوڑ کر مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ ایک اچھا انسان بننا چاہتا تھا میں۔ پھر میں نے شمسہ کو دیکھا۔ یہ لوگ نئے نئے ہمارے محلّے میں آ کر رہے تھے۔ شمسہ مجھے بھا گئی۔ اس کے والد صاحب کا نام محفوظ احمد تھا۔ ایک اور صاحب ان کے ساتھ رہتے تھے جن کا نام ریاض احمد تھا۔ کس قدر پریشان حال تھے وہ لوگ مگر شریف تھے۔ بڑی آرزوؤں کے ساتھ میں نے اپنی بھابیوں کو شمسہ کے گھر رشتہ لے کر بھیجا۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔ میں انتظار کرتا رہا مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک بار پھر میں نے بھابیوں سے کہا تو میری منجھلی بھابی نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''بے کار ہے فیضان، تمہاری شہرت دُور دُور تک ہے۔ کون جان بوجھ کر مکھی نگلے گا۔''

''اب میں ٹھیک ہو چکا ہوں بھابی۔''

''ہونہہ...... ٹھیک ہو چکے ہو دیکھ لینا جو جواب ملے گا دیکھ لینا۔''

''اگر ایسا ہوا تو اچھا نہیں ہوگا بھابی۔''

''کہا نا خود دیکھ لینا۔''

میری بھابی دوبارہ محفوظ احمد صاحب کے گھر گئیں مگر جواب واقعی منجھلی بھابی کے خیال کے مطابق تھا۔ محفوظ احمد صاحب نے کہا کہ تصدیق کرنے سے پتہ چلا ہے کہ لڑکے کا چال چلن اچھا نہیں ہے، اس لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بھابیوں نے میرا خوب مذاق اُڑایا اور میں جل کر کباب ہو گیا۔ میں خود ان لوگوں سے ملا۔ اپنا نام بتا کر میں نے کہا کہ بیشک میں نے کچھ وقت غلط لوگوں کے ساتھ گزارا ہے لیکن اب میں محنت کر کے روزی کما رہا ہوں۔ میری ذات سے انہیں یا ان کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ مگر شمسہ کے ماموں نے صاف انکار کر دیا۔ میری منت سماجت پر کوئی توجہ نہیں دی اور میرا دماغ پھر اُلٹ گیا۔ میں نے شمسہ کو اپنے چند دوستوں کی مدد سے اغوا کر لیا اور اسے لے کر سہارنپور سے دہلی آ گیا۔ پھر الٰہ آباد پہنچا اور وہاں اس سے نکاح کر لیا مگر ان لوگوں کی ضد نے مجھے پھر انہیں راستوں پر لا ڈالا تھا۔ اس کے بعد میں شمسہ سے انصاف نہیں کر سکا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن شمسہ......''

فیضان خاموش ہو گیا۔ یہ میرے گھر کی کہانی تھی۔ ان سب کی کہانی تھی جن کیلئے میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

بہت دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر تجسس نے سر اُبھارا۔ میں نے کہا۔
''شمسہ کے والدین پھر تو نہیں ملے فیضان۔''
''میں تو اپنے بھائیوں سے بھی نہیں ملا۔ ان بیچاروں سے بھلا کیا ملتا۔''
''تمہارا خاندان سہارنپور ہی میں آباد ہے۔''
''ہاں۔ وہیں پیدا ہوئے ہم لوگ۔ دادا، پردادا بھی وہیں کے ہیں۔''
''اور شمسہ کے اہل خاندان۔''
''وہ کہیں اور سے آ کر آباد ہوئے تھے۔'' فیضان نے جواب دیا۔ فیضان کو کرید کرید کر میں اس دور کا تعین کرنے لگا جب ماموں ریاض مجھے تھانے میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے شمسہ کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ پتہ چلانا چاہتا تھا کہ کیا وہ لوگ اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ فیضان اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکا البتہ میں نے اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیا تھا۔
دُوسرا دن عرضیوں کا دن تھا۔ دو دنوں کیلئے تیاریاں ہوتی تھیں۔ خاص خیال رکھا جاتا تھا، باقی دن عام ہوتے تھے حالانکہ خانقاہ کے عقیدت مند عام دنوں میں بھی آ جاتے تھے۔ ان پر روک ٹوک نہیں تھی۔ لیکن وہ عام دنوں میں اس جھوٹی قبر پر نہیں جا سکتے تھے۔ بس منگل کو عرضیوں کیلئے اور جمعرات کو ان کے جواب کیلئے وہ اندر جاتے تھے۔ اس ڈھونگ پر میرا دل لرزتا تھا۔ مگر یہ میں نے نہیں رچایا تھا۔ اس کا سلسلہ تو بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جس نے اس سلسلے کا آغاز کیا تھا وہ مرتبہ پا چکا تھا اور بڑائی حاصل کر کے نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہم لکیر پیٹ رہے تھے۔ ایک بار اکرام سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔
''یہ سب کچھ جو ہم کر رہے ہیں اکرام..... کیا یہ بہتر ہے؟''
''کیا مسعود بھیا۔''
''ہمیں معلوم ہے کہ یہ سب فریب ہے، نہ یہ کسی کا مزار ہے نہ اس کی کوئی اور اہمیت ہے۔ لوگ اس کے بارے میں توقعات لے کر آتے ہیں اور ہم انہیں جھوٹے سہارے دیتے ہیں۔''
''وہ سہارے جھوٹے تو نہیں ہوتے بھیا۔ انہیں فائدہ پہنچتا ہے جو کچھ آپ جانتے ہیں، انہیں بتا دیتے ہیں۔ سب ہی کہہ رہے ہیں کہ جب سے آپ خانقاہ میں آئے ہیں، ضرورت مندوں کو سب کچھ حاصل ہو رہا ہے۔ آپ کے یہاں آنے سے تو فریب کا سلسلہ ختم ہوا ہے اور حاجت مندوں کی اصل ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ بھیا یہ کم ہے کہ لوگوں کو ڈاکو سنتو خاں سے نجات مل گئی ہے۔ آپ خود بتائیے کیا یہ گناہ ہے۔''
''مگر وہ ایک جھوٹی آس لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ..... عام حیثیت سے آتے تو۔''
''یہ ایک دُکان حکمت ہے بھیا۔ آپ کسی بھی جگہ یہ دُکان کھول لیتے، اس کی حیثیت اس سے الگ نہ ہوتی۔ وہاں پھر لوگ کھل کر دل کی ہر بات نہ بتاتے۔ روحانی تعلق کچھ اور ہوتا ہے اور کسی اپنے جیسے سے دل کی بات کر لینے کا مسئلہ کچھ اور۔''
''ہمیں اس فریب سے روزی حاصل ہوتی ہے۔''
''یہاں وہی کچھ لے کر آتا ہے جسے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آپ خود سوچیں اس طرح بہت سوں کو رزق حاصل ہو رہا ہے۔ پہلے یہ لوگ ڈاکا زنی کرتے تھے۔''
میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔
عرضیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں انہیں لکھتا رہا۔ معمول میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن بدھ کی رات میرے لئے بڑی کٹھن تھی۔ اس رات مجھے شدید کرب سے گزرنا پڑا۔ عموماً میں ہر عرضی کیلئے مراقبہ کرتا تھا اور میری رہنمائی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس رات..... اس رات کچھ نہ ہوا۔ سپاٹ اور سنسان رات۔ میرے تمام رابطے ٹوٹ گئے تھے۔ مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا اور میرا دل پنکھے کی طرح لرزنے لگا تھا۔ آہ یہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ خاموشی کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ نافرمانی کا مجرم قرار دیا

جا رہا ہے مجھے۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ آخر وہی ہو گیا۔ میں بار بار کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دل و دماغ سُن ہو گئے تھے۔ ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ معمولات جاری ہو گئے۔ شمسہ کے بچے میرے پاس آ گئے، ان میں ایک واقعی میرا ہم شکل تھا۔ میرا بچپن بالکل ایسا ہی تھا اور کیا کروں۔ اور کیا کر سکتا ہوں، وہ میرے پاس ہے۔ میری رہائش گاہ میں ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ اس کا برسوں سے بچھڑا ہوا بھائی اس کے اتنا قریب ہے اور میں نے دوبارہ اس کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ کہیں محبت عود کر نہ آئے، کہیں سب کچھ کھو نہ بیٹھوں اور کیا کروں...... اور کیا کروں؟''

معمول جاری رکھنا تھا۔ عرضیوں کے جواب لکھنے۔ جو سمجھ میں آیا لکھتا رہا۔ شام کو یہ سارے جواب ضرورت مندوں کو پہنچائے۔ طریقہ وہی تھا جو نادر حسین نے ایجاد کیا تھا۔ پھر شمسہ کی آواز سُنائی دی۔

''سائیں بابا۔ ولی تیرے صدقے واری۔ بگڑی بن گئی میری تیری دُعا سے۔ میرا گھر والا ٹھیک ہو گیا۔ تیرے خزانے وسیع ہیں ولی۔ تیرے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔ ہم ہوس کے بندے ہیں، مانگنا ہمارا کام ہے۔ دینا تیرا...... گھر بچھڑ گیا ہے میرا۔ ماں باپ بھائی۔ سب ہیں ولی۔ دل تڑپتا ہے ان کیلئے۔ بگڑی بنا دے سائیں۔ ایک بار ملا دے سب سے۔ ایک بار صورت دکھا دے۔ تیرے واری ولی۔ تیرے صدقے سائیں۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں شمسہ کا کرب محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دل کی چیخیں سُن رہا تھا۔ پھر وہ چلی گئی۔ میرا ذہنی سکوت ختم نہیں ہوا تھا۔

ملاقاتیوں کا وقت ختم ہو گیا۔ شام کو باہر نکلا تو فیضان سے ملاقات ہوئی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر آیا تھا۔ میرے پاس آ گیا۔

''کیا بات ہے فیضان؟''

''کچھ نہیں شاہ صاحب۔ میں یونہی قدموں میں بیٹھنے چلا آیا کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔''

''کہو۔'' میں نے کہا۔

''شاہ صاحب بہت دن ہو گئے مزار کی روٹیاں کھاتے ہوئے۔''

''کوئی تکلیف ہے۔''

''ہاں۔''

''بتاؤ۔''

''شاہ صاحب۔ یہاں مجھے غیرت کا درس ملا ہے۔ یہاں میری کھوئی ہوئی انسانیت مجھے واپس ملی ہے۔ شاہ صاحب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنا چاہتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر نہیں بیٹھنا چاہتا۔''

''مجھے بتاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں سے جانے کے خواہشمند ہو۔''

''یہاں جو سکون حاصل ہوا ہے مجھے، شاید دُنیا میں کہیں اور نہ ملے۔ میرا کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔ دراصل باہر محنت کیلئے نکلنا چاہتا تھا۔ اتنا کر لوں کہ بیوی بچوں کو لے کر اس شہر سے چلا جاؤں۔ اس وقت تک ہمیں یہاں رہنے کی اجازت مل جائے میں یہی چاہتا ہوں۔''

''تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے۔''

''نہیں شاہ صاحب، میرے دل میں خود یہ خیال آیا ہے۔''

''اور تو کوئی بات نہیں ہے؟''

''نہیں شاہ صاحب۔''

''تو پھر اس وقت تک یہاں رہو جب تک میں تمہیں جانے کی اجازت نہ دے دوں۔ تمہارے یہاں رہنے سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کوئی احساس ذہن پر طاری نہ ہونے دو۔ ہاں ممکن ہو سکے تو پانچوں وقت نماز پڑھ لیا کرو۔''

''بہتر ہے شاہ صاحب۔''

''یہ میری درخواست ہے تم سے۔'' میں نے کہا۔ فیضان نے گردن جھکالی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے دل و دماغ پر وہی سحر طاری تھا۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ دُوسرے دن کوئی گیارہ بجے کے وقت میں نے اکرام کو بلا کر کہا۔ ''اکرام میں تمہیں کہیں بھیجنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں مسعود بھائی۔''

''سہارنپور...... ایک پتہ دے رہا ہوں، وہاں جا کر معلوم کرو کہ محفوظ احمد، ریاض احمد وغیرہ یہاں رہتے ہیں یا نہیں۔ بس یہ معلومات کر کے آنا ہے۔'' اکرام اُچھل پڑا۔ پھر کسی قدر مسرور لہجے میں بولا۔ ''محفوظ احمد تو آپ کے والد کا نام ہے۔''

''ہاں...... فیضان سے پتہ چلا ہے۔ میں ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آج ہی چلا جاتا ہوں۔''

''تیاریاں کرلو۔ واپسی بھی جلدی ہونی چاہئے اور سنو، صرف معلومات کر کے آنا ہے، کسی کو ساتھ نہ لے آنا، سختی سے تاکید کر رہا ہوں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' اکرام نے کہا۔ مجھ سے زیادہ وہ بے چین ہو گیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ چلا گیا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اعصاب جیسے اینٹھ کر رہ گئے تھے۔ سکرات کا سا عالم طاری تھا لیکن شام کو یہ جمود ٹوٹ گیا۔ شامی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے ایک نہایت خوبصورت مخمل کی ڈبیہ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے دیکھئے مسعود بھائی۔''

''کیا ہے یہ؟''

''ایک عجیب واقعہ ہوا ہے۔ پچھلی شام عقیدت مندوں میں ایک دُبلا پتلا سوکھا سا آدمی بھی آیا تھا۔ اس نے خانقاہ میں یہ ڈبیہ نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسے قبول کیا جائے۔ لوگ ایسی چیزیں بھی دے جاتے ہیں۔ میں نے یہ ڈبیہ طاق میں رکھی اور بھول گیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اندر گیا تو یہ مجھے نظر آئی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اُچھل پڑا۔ اس میں پیلے رنگ کی ایک بہت خوفناک مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈبیہ میرے ہاتھ سے گر گئی اور مکڑی برق رفتاری سے لمبے لمبے قدم اُٹھاتی ہوئی قبر کے پتھروں میں گھس گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے مسعود بھائی کہ جس آدمی نے یہ ڈبیہ دی تھی، اس کی آنکھیں بالکل اس مکڑی جیسی تھیں۔''

''پیلی مکڑی۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کہاں ہے کہاں گئی؟''

''مکڑی......'' شامی نے پوچھا۔

''ہاں! آؤ جلدی آؤ۔'' میں نے تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ شامی حیران حیران سا میرے پیچھے دوڑا۔ ظاہر ہے وہ میری بدحواسی کیا سمجھتا مگر میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ پیلی مکڑی کے نام سے میرا دل لرز گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ اس بارے میں کون جان سکتا تھا۔ شامی نے میرے ساتھ دوڑتے ہوئے کچھ کہا تھا مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

اندر اندھیرا تھا۔ بس وہ مدھم چراغ روشن تھا جو عموماً وہاں روشن رہتا تھا۔ اس مدھم روشنی میں بھلا کیا نظر آتا۔ پھر بھی میں جعلی قبر کے پاس بیٹھ کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔ شامی میرے قریب موجود تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے اوپر رکھا چراغ اُتارا اور میرے قریب کر دیا۔

'بیکار ہے شامی۔ وہ...... وہ اب یہاں کہاں ہوگا'' میرے منہ سے نکلا۔

''کون؟'' شامی نے پوچھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دیر تک میں وہاں بیٹھا رہا۔ شامی نے ہی مجھے آواز دی۔ ''مسعود بھائی...... مسعود بھائی۔''

''کیا بتاؤں شامی۔''

''وہ سب کچھ تھا تو عجیب مگر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ لوگ چڑھاوے چڑھاتے ہی ہیں۔ بہت سے عقیدت مند سونے کے چھلے، زنجیریں چادر میں پرو کر قبر پر ڈال جاتے ہیں۔ وہ ڈبیہ بھی میں نے ایسی ہی سمجھی تھی مگر اس کے بعد اس میں سے مکڑی نکلی۔ اس سے زیادہ آپ کی یہ کیفیت پریشان کن ہے۔ ایسی کیا خاص بات تھی اس مکڑی میں جس نے آپ کو اتنا پریشان کر دیا؟''

''پیلی مکڑی نحوست کا نشان ہوتی ہے شامی۔ سخت نحوست کا نشان اور وہ نحوست یہاں آ چکی ہے۔''

''تو پھر، اب کیا ہوگا؟'' شامی کی آواز میں بھی خوف بیدار ہو گیا۔

''پیلی مکڑی جہاں کہیں نظر آئے، اسے فوراً مار دینا، صرف پیلی مکڑی کو۔''

''ٹھیک ہے کل دن کی روشنی میں ہم سب اسے تلاش کریں گے مگر وہ آدمی کون تھا؟ اس کی آنکھیں بڑی عجیب تھیں، بالکل کسی مکڑی کی مانند۔''

''پتا نہیں کون تھا۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ شامی دیر تک میرے پاس بیٹھا نہ جانے کیا کیا کہتا رہا مگر میری حالت بہتر نہ تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بات پھر بگڑ گئی ہے۔ میرے قدموں میں لغزش آ گئی ہے۔ مجھے ایک بار پھر تنہائیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ اکرام بھی موجود نہیں ہے جو کچھ سہارا ہو۔ یہ بے چارے لوگ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان سے کیا کہوں، کیسے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔

''آرام نہیں کریں گے مسعود بھائی؟''

''ہاں...... بس یہیں رہوں گا۔ تم جاؤ۔'' شامی چلا گیا۔ اس نے اداس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں کیا کروں، انسان تو ہوں، ہوش و حواس میں ہوں۔ مجھ سے میرے حواس کیوں نہیں چھین لئے جاتے۔ کتنا جبر کروں دل پر، کیسے اس پیار کو کھرچ کر پھینک دوں جو خون میں رچا ہوا ہے۔ بہن ہے وہ میری...... ماں جائی ہے۔ فریاد کرتی ہوئی آئی تھی، نیم دیوانی ہو رہی تھی۔ ایک انسان کی قسم سے کیسے باز رہ جاتا۔ کتنا تو روکا تھا خود کو۔ خون جوش مار گیا اور پھر اگر اس کی مدد کو نہ جاتا تو وہ کس طرح تباہ ہو جاتی۔ کون تھا اس کا پرسان حال...... اس کے بعد سے مسلسل جبر کر رہا ہوں۔ دوبارہ اس کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کے بچے سامنے آتے ہیں، ان میں سے ایک میں میرا بچپن سمایا ہوا ہے۔ ہو بہو میرا نقش ہے وہ۔ میں اس کا ماموں ہوں اور کتنا جبر کروں خود پر اور کتنا جبر کروں۔ انسان ہوں، مجھ سے میرے ہوش کیوں نہیں چھین لئے جاتے۔ مجھے وہ مقام کیوں نہیں دے دیا جاتا جو نادر حسین کو مل گیا؟ آہ...... آہ...... آہ! میں تڑپنے لگا۔ پورا وجود انگارہ بن گیا۔ صدیاں بیت گئیں خوشیوں سے دور ہوئے۔ خوف بس ایک خوف۔ رہنمائی کرو، میری رہنمائی کرو۔

آج آنکھوں سے آنسو نہیں بہے تھے۔ سنا گیا ہے کہ آنسو توبہ کی قبولیت کا پتا دیتے ہیں۔ دل کا گداز رہنما ہوتا ہے مگر آنکھیں خشک تھیں، سینہ جل رہا تھا۔ رات گزر گئی، کوئی خیال دل سے نہ گزرا، کوئی ہدایت نہ ملی۔ صبح کو سینہ پتھرا گیا، سوچوں سے چھٹکارا مل گیا۔ اس کے بعد کے معمول وہی رہے۔ دوسرا دن اور کئی دن گزر گئے۔ اکرام کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا لیکن ایک بات پر حیرت ہوئی عرضیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے نتائج بھی سامنے آتے رہتے تھے۔ اس عالم میں بھی جو ہدایات دی تھیں، ان کے نتائج اچھے نکلے تھے۔ ایک حاجت مند آیا۔

''شاہ بابا! اللہ مرتبہ بڑھائے شاہ بابا۔ مقدمہ جیت گیا۔ میرا سب کچھ مل گیا مجھے شاہ بابا! ہمیں نئی زندگی مل گئی ورنہ پورے گھرانے کو مرنا پڑتا۔ ہمیں نئی زندگی ملی ہے شاہ بابا۔ یہ نذرانہ ہے۔ جو بھی ضرورت مند آئے، اسے دے دیں۔'' اس نے پچاس ہزار روپے شامی کو دیئے تھے۔

یہ رقم تقسیم ہوگئی مگر اس دن میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا شمسہ کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔ فیضان اب درست ہوگیا تھا۔ وہ نماز پڑھتا تھا، باقی وقت بچوں پر صرف کرتا تھا۔ محنت کر کے زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ ہو، جہاں کہ وہ ایک بہتر زندگی حاصل کرلے۔ کوئی دولت مند شخص اس کیلئے کچھ کردے تو، یہ ہوسکتا تھا۔ ایسے کسی شخص کو تلاش کیا جاسکتا تھا۔ بہت غور کیا تھا میں نے اس بات پر۔ پھر ایک شام اکرام آگیا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا مگر اکرام کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی۔

''کیا ہوا اکرام؟''

''کچھ ہوا نہیں مسعود بھائی۔''

''پہیلیاں نہ بجھاؤ۔'' میں نے زور سے کہا۔

''دونوں پتے درست تھے۔ فیضان عالم کا خاندان وہیں آباد ہے۔ اس کے ہاں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر محفوظ احمد کو تو اب لوگ بھول گئے ہیں۔ ان کی بیٹی کا اغوا ہوا تھا۔ اس کے کوئی سات ماہ بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے۔ کہاں، یہ کوئی نہیں جانتا۔''

''فیضان کے خاندان والوں سے ملے تھے؟'' میں نے صبر وسکون سے کہا۔ ''کیا کہتے ہیں وہ اس بارے میں؟''

''فیضان ہی کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اسے بدکردار، اوباش اور آوارہ کہہ رہے تھے۔ اغوا کے واقعے سے خود کو لاتعلق ظاہر کررہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اب ان کا اپنے بھائی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔''

''کوئی نشاندہی نہیں کرسکے محفوظ احمد کی؟''

''نہیں......''

''چلو ٹھیک ہے، یہی بہتر ہوگا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ہر کام وقت پر ہوتا ہے مسعود بھائی۔ جس طرح ہمیں شمسہ ملی ہے، اسی طرح وہ لوگ بھی مل جائیں گے۔''

''ہاں......شاید!''

''شاید نہیں۔ یقیناً اسی طرح مسعود بھائی جیسے مجھے ثریا کے مل جانے کا یقین ہے۔''

میں نے چونک کر اکرام کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر آفاقی سکون تھا۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ اکرام بھی عظمت کا ثبوت دے رہا ہے۔ اس نے صبر وشکر کرلیا ہے۔ وہ ثریا کا نام بھی نہیں لیتا۔ وہ ان تمام مسائل میں خود کو ضم کرلیتا ہے جو سامنے آتے ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ باظرف ہے۔ شاید نادر حسین کا عقیدہ بھی مجھ سے زیادہ پختہ تھا۔ وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا جس کے تحت اسے جذب کا مقام مل گیا اور اب اکرام کے چہرے پر اس لمحے جو کچھ نظر آیا تھا، اس نے نجانے کیوں ذہن میں یہ تصور پیدا کردیا تھا کہ اس معصوم شخص کو بھی کچھ ملنے والا ہے۔ اس کے عقیدے کی پختگی، اس کا نیک عمل یہی ظاہر کرتا تھا۔ کیا ہی دلچسپ بات ہے اِدھر سے اُدھر دوڑتے رہو، سارا جہان کھنگال مارو۔ جو تلاش کررہے ہو، وہ صرف تمہاری آنکھوں کے تل کی اوٹ ہے۔ اس تل کے عقب میں اگر کچھ نظر آجائے تو ہاتھ بڑھا کر اٹھایا جاسکتا ہے لیکن تل کا سامنے سے ہٹنا ضروری ہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ اکرام نے چونک کر مجھے دیکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ پھر سہمی سہمی آواز میں بولا۔ ''مسعود بھائی۔''

میں نے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا اور دوبارہ ہنس پڑا۔ وہ پھر اسی انداز میں بولا۔ ''مسعود بھائی! خدا کیلئے ذہن کو قابو میں رکھئے۔ دیکھئے اللہ کی ذات پر پورا پورا بھروسا رکھئے۔ کیا آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ شمسہ اس طرح آپ کے سامنے آجائے گی۔ نہ صرف آپ کے سامنے آجائے گی بلکہ آپ صحیح وقت پر اس کا ہاتھ پکڑیں گے، اسے سہارا دیں گے۔ کہاں تھی وہ، کچھ معلوم تھا آپ کو۔ یہ تو امی اور ابو بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں ہے لیکن اللہ نے ذریعہ بنایا۔ اب کم ازکم وہ آپ کے سامنے تو ہے۔ تو آپ اس بات سے مایوس کیوں ہیں؟ امی اور ابو، محمود یا ماموں ریاض آپ کو ضرور ملیں گے۔ آپ یقین

رکھیں۔ آپ اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھئے۔''
''نہیں میرے دوست، نہیں میرے بھائی...... کیا اس ہنسی کو تو میری ذہنی خرابی سمجھ رہا ہے؟ نہیں اکرام! ایسا نہیں ہے۔ بس کچھ خیالات ذہن میں آئے تھے کہ ہنسی نکل گئی۔''
''مجھے تو ڈرا ہی دیا آپ نے۔ دراصل میں خود بھی سہا ہوا واپس آیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ نجانے اس انکشاف سے آپ کے دل پر کیا بیتے گی لیکن اب بھی یہی کہوں گا کہ اللہ کے حکم کا انتظار کیجئے۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہوتا ہے، وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا۔''

✦✦✦✦✦

''میں جانتا ہوں اکرام، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تو طویل عرصے سے صبر کررہا ہوں اور اب بھی صبر کرتا رہوں گا۔ دیکھ لو شمسہ کے سامنے آج تک نہیں گیا۔ وہ پردے میں رہتی ہے، کس کس طرح دل نہیں تڑپتا اس کیلئے لیکن جاؤں گا نہیں اس کے سامنے، بیکار ہے۔ ملیں گے تو سب ہی ملیں گے ورنہ کیا فائدہ۔ غم کی کچھ اور تحریریں رقم ہوجائیں گی، سینہ پھٹ جائے گا اس سے مل کر، جب وہ سب کے بارے میں پوچھے گی، میرے بارے میں پوچھے گی۔ ہمت نہیں کرپاتا اکرام، یقین کرو ہمت نہیں کرپاتا۔''
اکرام نے گردن جھکالی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بہت دیر تک وہ غم میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کہا۔
''اسی لئے تو آپ سے ضد بھی نہیں کرتا حالانکہ ایک بہن کو اگر یہ پتا چل جائے کہ بچھڑا ہوا بھائی سامنے ہے تو کم از کم ایک سہارا تو اسے حاصل ہوجائے گا۔''
''نہیں اکرام! میں اپنی تقدیر کے دروازے خود نہیں کھولنا چاہتا۔ بقول تمہارے جب یہ دروازے خود بخود کھلیں گے تب میں ان کے دوسری جانب جھانکوں گا ورنہ نہیں، نہ سہی۔'' اکرام پھر خاموش ہوگیا تھا۔ بہت دیر تک یہ خاموشی طاری رہی۔ اب اکرام کو تقریباً ساری ہی باتیں معلوم ہوچکی تھیں۔ چنانچہ موضوع بدلنے کیلئے میں نے اس سے کہا۔ ''ایک اور دلچسپ صورت حال سامنے آئی ہے اکرام۔''
''کیا بھیا؟''
''بھوریا چرن یہاں داخل ہوگیا ہے۔''
''کیا؟'' اکرام دہشت سے اچھل پڑا۔
''ہاں۔''
''مم...... مگر کیسے...... آپ کو کیسے پتا چلا مسعود بھائی؟'' اس نے سوال کیا اور میں نے اسے شامی کی ساری کہانی سنا دی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اور یہ جگہ ایسی ہے کہ اس کا راستہ نہیں رک سکتا۔ میرا مطلب ہے یہ ایک جعلی خانقاہ ہے اور یہاں ہر ایک آجاسکتا ہے۔ کوئی روحانی تصور تو وابستہ ہے نہیں اس سے، یہ بات ہم جانتے ہیں مسعود بھائی۔ مم...... مگر اب کیا کیا جائے؟ وہ کم بخت اس جگہ آگیا ہے، ہمارے راستے ضرور کاٹے گا۔''
''سامنا تو ہوا اس بدبخت سے...... اب تو وہ سامنے نکلتا ہی نہیں ہے اکرام۔ بہرحال میں نے بطور تذکرہ تم سے کہہ دیا ہے، تم بھی ذرا ہوشیار رہنا۔ تمہاری طرف سے پریشان تھا۔ واپس آگئے، جی خوش ہوگیا ہے اور اطمینان بھی۔''
''مگر مجھے کوئی خوشی نہیں ہے مسعود بھائی۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، ذرا شمسہ بہن سے مل لوں، بچے تو ٹھیک ہیں نا؟''
''ہاں بالکل۔ مگر ذرہ برابر تذکرہ مت کرنا کسی بات کا۔ کیا سمجھے؟''
''ہاں! یہ تو سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے تذکرے کا کیا امکان ہے اور کہوں گا بھی تو کیا؟''
کچھ دیر کے بعد اکرام میرے پاس سے چلا گیا اور میں آنکھیں بند کرکے سوچوں میں گم ہوگیا۔ وقت گزرتا رہا۔ بس اس بات پر حیرت تھی کہ اب عرضیوں کے جواب کیلئے مراقبہ کرتا تھا تو کوئی جواب نہیں ملتا تھا، کوئی رہنمائی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی

ایسی نشاندہی نہیں کی جاتی تھی جس کے تحت میں ان عرضیوں کا جواب لکھوں جبکہ اس سے پہلے ایسا ہوتا تھا اور مجھے بڑی آسانی ہوجاتی تھی لیکن اب سچی بات یہ ہے کہ ذہنی اختراع سے کام لے رہا تھا۔ عرضیاں لکھی جاتی تھیں۔ ان کے جو جواب سمجھ میں آتے تھے، دے دیتا تھا۔ ٹالنے والی بات ہوتی تھی لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ معیار وہی چل رہا تھا۔ حاجت مند جب آتے تو ان کے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ ہوتا اور چہروں پر خوشی کے آثار۔ ایک بھی ایسا نہیں آیا تھا جس نے کہا ہو کہ اس کی مراد پوری نہیں ہوئی بلکہ اب تو رش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دور دراز کے لوگ آنے لگے تھے اور خانقاہ کے معاملات بہت بہتر انداز میں چل رہے تھے۔ فیضان کو چونکہ میں نے منع کر دیا تھا کہ ابھی وہ کہیں آنے جانے کی بات نہ کرے، خاموشی سے وقت گزارتا رہے۔ شرمندہ شرمندہ سا ضرور نظر آتا تھا لیکن اس کے بعد اس نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ بے چارہ نہایت عقیدت کے ساتھ فاتحہ خوانی وغیرہ بھی کرتا تھا اور عبادت گزاری بھی۔ اب کسی کو کیا بتایا جاتا کہ اس خانقاہ کی کہانی کیا ہے۔ بھوریا چرن کا شبہ بے شک ہوا تھا لیکن خاصا وقت گزر جانے کے باوجود کوئی ایسا عمل نہیں ہوا تھا جو تردد کا شکار کر دے، البتہ دل کو اس بات کا یقین تھا کہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ بھوریا چرن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے کوئی نہ کوئی چکر چلایا ہوگا اور نجانے اس کے کیا نتائج سامنے آئیں۔ کیا کہا جاسکتا ہے، فیصلہ کرنا ناممکن ہی تھا۔ اس دن بھی منگل تھا اور منگل کو مرادیں مانگنے والے آیا کرتے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کی بڑی سی گاڑی آئی تھی اور اس سے ایک بھاری بھرکم جسم کے مالک شیروانی، پائجامے میں ملبوس، وارنش کا پمپ پہنے ہوئے صاحب حیثیت، آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں انگشتریاں پڑی ہوئی تھیں، ساتھ میں تین چار ملازم قسم کے آدمی تھے۔ عقیدت سے خانقاہ پر پہنچے۔ ابھی وہ وقت نہیں ہوا تھا جب خانقاہ کے دروازے کھلتے تھے۔ شامی سے ملاقات کی اور کچھ معلومات حاصل کرنے لگے۔ اکرام معمول کے مطابق میرے پاس موجود تھا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بڑی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔“

”ہاں۔“

”ویسے مسعود بھائی! انسان کو زندگی میں کوئی نہ کوئی سہارا درکار ہوتا ہے۔ وہ جو دولت میں کھیل کر بہت سے احساسات سے بے نیاز ہوجاتے ہیں، کسی نہ کسی لمحے روحانیت کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔“

میں نے اکرام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر عرضیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہم دونوں اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ مختلف لوگ مختلف باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ پھر ایک آواز سنائی دی۔

”میں ایک گناہ گار انسان ہوں۔ یہ نہیں جانتا بابا صاحب کہ ایسی جگہوں کا طریق کار کیا ہوتا ہے لیکن بس ایک مشکل ہے میری، بہت بڑی مشکل ہے، اسے حل کر دیجئے۔ پریشان ہوں۔ نام ہے میرا اعزت بیگ اور دھام پور نگینہ میں رہتا ہوں۔ کاروبار بہت اچھا چل رہا ہے میرا، دولت کی ریل پیل ہے مگر وہ حویلی جس میں، میں رہتا ہوں، آسیب زدہ ہے۔ حویلی کے آسیب مجھے بہت پریشان کرتے ہیں۔ بیوی اور بچے زندگی سے عاجز ہیں۔ کئی بار حویلی چھوڑ چھوڑ کر مختلف جگہوں پر جا کر رہا لیکن جب کہیں اور جاتا ہوں تو گھر کا گھر بری طرح بیمار ہوجاتا ہے اور مجھے واپس اسی حویلی میں آنا پڑتا ہے۔ کچھ اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں کہ میری بیوی مجھے واپس حویلی میں لانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ یہاں آکر پریشانیاں تو بے شک ہوتی ہیں مگر بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ کچھ دن پہلے ایک اور بابا صاحب نے نشاندہی کی تھی کہ میری حویلی آسیب زدہ ہے اور مجھے اس کیلئے انتظام کرنا چاہئے۔ بابا صاحب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ اسے کون سن رہا ہے لیکن اگر میری مدد ہوسکتی ہے تو آپ میری مدد کیجئے۔ میرا کام بن گیا، مجھے سکون مل گیا تو میں اس خانقاہ کو سونے کا بنا دوں گا تاکہ جب عقیدت مند آئیں تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ میری مدد کیجئے بابا صاحب...... جس طرح بھی ہوسکے میری مدد کیجئے۔ میں بہت دور سے آیا ہوں، آپ کے قدموں میں ہی رہوں گا جب تک کہ مجھے کوئی اشارہ نہ مل جائے۔“

میں نے اس کا نام لکھ لیا۔ یونہی دل میں خیال آیا تھا کہ یہ وہی شخص ہوسکتا ہے جسے ہم نے سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اور تصور بھی میرے ذہن میں ابھر آیا تھا اور میں اس پر غور کرنے لگا تھا۔ اگر یہ شخص اتنا

دولت مند ہے اور اگر اس کا کام ہوجائے تو اس جعلی خانقاہ کو پختہ کروانے سے بھلا کسی کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ اگر اس کے ذریعے شمسہ اور فیضان عالم کو کوئی فائدہ حاصل ہوجائے، اگر ان لوگوں کی زندگی میں کوئی تبدیلی آجائے تو کیا یہ اس سے بہتر نہیں رہے گا؟ بس یہ خیال دل میں پختہ ہوگیا۔ یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شخص جمعرات تک یہیں قیام کرے گا۔ لوگوں نے اسے تفصیلات بتادی ہوں گی۔ چنانچہ وقت باقی ہے، اس سے ملاقات کرکے معاملات طے کئے جاسکتے ہیں۔ یہ احساس میں نے ابھی اپنے دل ہی میں رکھا تھا۔

عرضیاں نمٹ گئیں، کام ختم ہوگیا۔ میں اور اکرام باہر نکل آئے۔ اکرام نے کہا۔ ''شمسہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' میں ٹھٹک گیا۔

''کیوں؟''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔ خوش ہے، مطمئن ہے۔ کہہ رہی تھی کہ وہ دوسرے بھیا کبھی نہیں آئے، ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔''

''تم نے کیا کہا؟''

''میرے بجائے فیضان بول پڑا۔''

''کیا؟''

''اس نے کہا وہ درویش منش ہیں، یاداللہ میں کھوئے رہتے ہیں۔ انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''پھر؟''

''خاموش ہوگئی۔''

''یہی بہتر ہے۔''

''کب تک؟'' اکرام نے پوچھا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا کرسکتے ہیں؟''

''کچھ تو کرنا ہوگا۔ یہ جھوٹ کا گھر ہے۔ کب کیا ہوجائے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ نہ بھی ہو تو کیا اسے ہمیشہ یہاں رکھا جاسکتا ہے؟ یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے؟ بچے ہیں اس کے، ان کا مستقبل ہے۔ اس طرح خانقاہ کی روٹیاں توڑ کر فیضان بھی نکما ہوجائے گا۔ ابھی لوہا گرم ہے۔ صحیح چوٹ لگ جائے تو صحیح شکل اختیار کرسکتا ہے۔ جتنی دیر ہوگی، اتنے ہی نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''سوچنا پڑے گا۔''

''میں نے سوچا ہے۔''

''کیا؟''

''پہلے تم اس سے مل لو۔ ایک خوشی تو حاصل ہو اسے۔ نہ جانے کب سے خوشیوں سے محروم ہے۔ اس کے بعد کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔''

''اس کے بعد یہ کبھی نہ کہنا سمجھے اکرام۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اکرام مجھے دیکھنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے اس کے لہجے میں نرمی نہیں محسوس ہوئی تھی، کچھ عجیب سا لہجہ تھا۔ دور سے میں نے سیاہ گاڑی والے صاحب کو دیکھا۔ ملازموں کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''وہ عزت بیگ ہیں؟''

''شاید.....''

''آؤ۔'' میں نے کہا اور اکرام خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑا۔ خانقاہ کی گہرائیوں میں انہوں نے ڈیرہ لگایا تھا۔ گاڑی بھی قریب کھڑی ہوئی تھی۔ ہر طرح کا انتظام کر کے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''حضور اگر ہمارے دسترخوان کو رونق بخشیں تو نوازش ہوگی۔''

''شکریہ۔ کھانا کھا چکے ہیں بلکہ اب افسوس ہو رہا ہے کہ جلدی آ گئے۔ آپ براہ کرم کھانا کھائیے۔''

''یقین کیجئے کھانا کھا چکا ہوں۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نباہ رہا تھا۔ آپ تشریف رکھئے۔ درویشوں کی چھت تقدیر والوں کو نصیب ہوتی ہے۔'' ہم بیٹھ گئے۔

''آپ کا اسم شریف؟'' میں نے پوچھا۔

''خاکسار کو عزت بیگ کہتے ہیں۔''

''کتنے عرصے سے آپ اس مشکل کا شکار ہیں؟''

''جی؟'' مرزا صاحب چونک پڑے۔ اب وہ مجھے گھور رہے تھے۔ اکرام کے انداز میں ایک لمحے کیلئے بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ یقیناً وہ میرے اس سوال پر حیران ہوا ہوگا کیونکہ یہ خلاف دستور بلکہ ایک طرح سے خطرناک تھا۔ مرزا صاحب بولے۔ ''کوئی سات آٹھ ماہ ہو گئے۔''

''انہوں نے کوئی نقصان پہنچایا آپ کو؟'' میں نے سوال کیا۔ سارے نوکر کھانا ختم کر کے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

میں نے پھر پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے آپ کو ان کی موجودگی کا احساس کس طرح ہوا؟ کیا انہوں نے آپ کے اہل خاندان کو کوئی تکلیف پہنچائی جبکہ آپ ان کی وجہ سے حویلی چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے اور وہاں بیماریوں کا شکار ہو گئے اور پھر حویلی پہنچے تو بیماریاں ختم ہو گئیں لیکن اس کے باوجود آپ ان سے خوف زدہ ہیں۔ اس خوف کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' اچانک ہی مرزا عزت بیگ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

''سمجھ گیا حضور، سمجھ گیا۔ مجھے میرا گوہر مقصود مل گیا۔ حضور...... میری مدد کیجئے، بڑی آس لے کر آیا ہوں آپ کے پاس۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ ہاں! حویلی میں میری بیوی اور میرے بچوں کو طرح طرح سے ستایا جاتا ہے۔ وہ خوف سے دیوانے ہو جاتے ہیں، مختلف حرکات کرتے ہیں۔ وہ اور میرے بچے دہشت سے سوکھے جا رہے ہیں۔ دو نوجوان بیٹیاں ہیں میری۔ ایک بیٹا ہے، بیوی ہے۔ چاروں کے چاروں ان کی شرارتوں کا شکار رہتے ہیں۔ عجیب وغریب شرارتیں ہوا کرتی ہیں۔ میں خود بھی اپنے آپ کو لاکھ سنبھالے رکھوں مگر انسان ہوں۔ جب ایسے بعید از عقل واقعات ہوں گے تو بھلا بہادری کیسے دکھا سکوں گا۔ حضور جب آپ نے اس قدر کرم فرمائی کی ہے تو میری مشکل کو دور فرمائیے گا۔ آپ کا بے حد احسان ہوگا۔''

''عزت بیگ صاحب! آپ کا یہ دھام پور نگینہ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''حضور کوئی ایک سو بیس کوس ہے۔''

''مجھے وہاں جانا ہوگا۔ یہی حکم ملا ہے مجھے۔'' میں نے کہا۔ اکرام نے ایک بار پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن اس طرح نہیں کہ کسی پر اظہار ہو جائے۔ عزت بیگ صاحب نے گردن خم کر کے کہا۔

''بسر و چشم...... بسر و چشم۔ اس کا مقصد ہے کہ میری تمنا پوری ہو گئی۔ حضور آپ تشریف لے چلئے، جو بھی خدمت ہوگی، کروں گا، جس طرح بھی حکم فرمائیں گے، جان و مال سے حاضر ہوں۔ آپ بس حکم کر دیجئے۔''

''ہاں عزت بیگ! بہت کچھ قربان کرنا ہوگا آپ کو۔ زندگی کا صدقہ مال ہے۔ خاصے اخراجات کرنے پڑ جائیں گے آپ کو۔''

''بہت کچھ ہے میرے پاس، بچوں ہی کیلئے ہے۔ اگر ان کی مشکل حل ہو جائے تو بھلا مال و دولت کی کیا فکر لیکن آپ

پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ آپ نے میری مشکل اپنی زبان سے ادا فرما دی۔ میرے دل کو یقین ہے کہ جیسے ہی آپ کے قدم مبارک وہاں پہنچیں گے، شریر شیطان وہ جگہ چھوڑ بھاگیں گے۔ بس اب میں آپ کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا۔ حضور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"آج توقف فرمائیے، کل ہم آپ کے ساتھ روانہ ہو جائیں گے۔ آپ مطمئن رہیں، ہر طرح کے آسیبوں کو وہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔"

"مجھے تو گویا نئی زندگی عطا فرما رہے ہیں آپ۔ آہ...... جیسا سنا تھا، ویسے ہی پایا اس عظیم جگہ کو حضور۔ اب تو بیتاب ہوں کہ آپ کب میرے ساتھ چلیں۔ ویسے حضور! کا اسم شریف معلوم کرسکتا ہوں؟"

"مسعود ہے میرا نام۔"

"میں سمجھتا ہوں، یہ میرے لئے ساعت مسعود ہے کہ مجھے اس طرح آپ کی قدم بوسی حاصل ہوئی۔ کب تشریف لے چلیں گے، وقت بتا دیجئے؟"

"آج تو یہیں قیام فرمائیے۔ جیسا کہ میں نے کہا کل دن کو دس بجے ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔ آپ کے پاس انتظام تو ہے؟"

"یہ سب میرے دوست احباب ہیں۔ یہ صاحب گاڑی چلاتے ہیں، یہ دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ آپ اطمینان فرمائیے گا، سفر میں آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، اب اجازت دیجئے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"حضور! اگر کچھ......"

"نہیں عزت بیگ صاحب! اس وقت کوئی حاجت نہیں ہے۔ آپ آرام کیجئے۔" میں واپسی کیلئے پلٹا۔ اکرام بیگ بھی میرے ساتھ ساتھ چل پڑا تھا لیکن اس کی بے چینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے ہی اس نے کہا۔

"تو تو آپ اس کے ساتھ جا رہے ہیں مسعود بھائی! مگر آپ نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیسے کرلیا؟"

"جانا ہے اکرام مجھے اس کے ساتھ۔ ابھی تم نے شمسہ کے بارے میں مجھ سے بہت سی باتیں کی ہیں۔ اس سے ملوں گا اکرام تو دل کے زخم تازہ ہو جائیں گے، کلیجہ پھٹ جائے گا اور اس کے بعد سارے کام ادھورے رہ جائیں گے۔ وہ بہن ہے میری۔ انسان ہوں، خود پر قابو نہیں پا سکوں گا۔ بھلا میں اس کے آنسو دیکھ کر کیسے یہ بات برداشت کرسکتا ہوں کہ ماں، باپ کی تلاش کے بجائے کوئی اور کام کروں۔ تم خود سوچو اکرام! کیا ہوگا، سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ کیا اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ میں اس کیلئے آسائشیں حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے اپنے آپ کو ختم کرلیا ہے اکرام...... بہت نقصان کرلیا ہے میں نے اپنا۔ اس کے نتیجے میں میری بہن کو ایک بہتر زندگی تو مل جائے۔ تم نے دیکھا میں نے اس سے خرچ کی بات کی ہے۔ یہ میں اپنی بہن کیلئے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ صرف محبتیں ضرورتیں نہیں پوری کرسکتیں، کچھ نہ کچھ عملی طور پر بھی کرنا ہوگا۔" اکرام نے حیرت سے میری صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے مسعود بھائی کہ آپ عزت بیگ کا کام کر کے جو کچھ حاصل کریں گے، وہ شمسہ کیلئے ہوگا؟"

"ہاں......" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ دل میں ایک اداس سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ میں جو کچھ کر رہا تھا، اس کے نتائج مجھے معلوم تھے۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ عزت بیگ کے گھر میں جو شیطانی قوتیں رہائش پذیر ہیں، ان کے خلاف کوئی موثر عمل کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ رہنمائی ہوتی تھی اور اقدامات کئے جاتے تھے لیکن اب تنہا بھگت رہا تھا۔ سب کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ میری پہنچ کہاں تک ہوسکتی ہے۔ اکرام نے البتہ مطمئن لہجے میں کہا۔ "آپ یقین کیجئے آپ نے میرے دل میں بغاوت پیدا کردی تھی مسعود بھائی۔ میں سوچنے لگا تھا کہ شاید میں آئندہ آپ کا ساتھ نہ دے سکوں۔ شمسہ بہن کو میری ضرورت ہے لیکن آپ نے مجھے مشکل سے نکال لیا۔ اب میں بے حد پُرسکون ہوں۔ آپ تنہا ہی جائیں گے یا مجھے

ساتھ چلنا ہوگا؟"

"نہیں، بھلا تمہارا ساتھ کس طرح ممکن ہے۔ یہاں شمسہ، فیضان اور بچے تنہا رہ جائیں گے۔ ہاں ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں اکرام، وہ یہ کہ ان سب کا پورا پورا خیال رکھنا۔ ہوسکتا ہے مجھے کچھ زیادہ وقت لگ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ ایک بات اور تمہارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ بھوریا چرن کے آثار یہاں ملے ہیں لیکن اتنے عرصے میں نہ تو اس نے کچھ کیا اور نہ ہی کہیں دوبارہ کسی مکڑی کا وجود ظاہر ہوا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خانقاہ جعلی ہے، اس لئے بھوریا چرن جیسی ناپاک روحیں یہاں آسکتی ہیں۔ تمہیں اس کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔"

اکرام نے سنسنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں مرزا عزت بیگ کے ساتھ جانے کے منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کیسے وسوسے، نجانے کیسے کیسے خیالات میرے ذہن میں جاگزیں تھے لیکن یہ فیصلہ اٹل تھا کہ مجھے عزت بیگ کے ساتھ دھام پور نگینہ جانا ہے اور بالآخر دوسرے دن میں عزت بیگ کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بڑے احترام کے ساتھ مجھے اپنی قیمتی گاڑی میں بٹھا کر لے چلا۔ راستے طویل تھے لیکن خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ اچھا خاصا شہر تھا۔ شام کے کوئی ساڑھے چار بجے تھے جب ہم مرزا عزت بیگ کی حویلی میں داخل ہوئے۔ وسیع و عریض عمارت تھی لیکن بڑے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی احساس ہوا کہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ اس کی ویرانی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ یہاں غیر انسانی مخلوق کا قبضہ ہے۔ احاطے میں بے شمار درخت تھے لیکن ان کے پتے سوکھے ہوئے تھے۔ گھاس کے لان تھے لیکن پیلی اور جلی ہوئی گھاس کے۔ حویلی کا بیرونی حصہ بھی بدنما تھا۔ سامنے ایک اور کار کھڑی نظر آرہی تھی۔ کار کی آواز سن کر ایک ملازم اندر سے نکل آیا۔ کار رکتے ہی ڈرائیور اور دوسرے ملازم آگئے۔ عزت بیگ نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے لئے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے ایک نگاہ پھر حویلی کے بیرونی حصے پر ڈالی۔

"آپ کے ہاں کتنے ملازم ہیں مرزا صاحب۔"

"کافی ہیں۔ میرا مطلب ہے چھ، سات مرد اور چار، پانچ خواتین۔ ہر ایک کے سپرد مختلف ذمہ داریاں ہیں۔"

"مالی نہیں ہے؟"

"ہے۔ شاید آپ یہ اجڑے ہوئے درخت اور سوکھی ہوئی گھاس دیکھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں؟"

"جی......"

"کچھ عرصہ قبل یہ درخت سرسبز تھے، یہ گھاس آنکھوں کو بہار دیتی تھی لیکن سات، آٹھ ماہ سے اس پر بھی خزاں آگئی۔ درخت سوکھ گئے، گھاس جھلس گئی حالانکہ مالی نے اس پر جان توڑ کوشش کی۔"

"یہ سلسلہ کتنے عرصہ قبل شروع ہوا ہے؟"

"آپ اسے دس ماہ کے عرصے کی بات سمجھ لیں۔ تشریف لائیے۔ آپ عمارت کا یہ بیرونی حصہ دیکھ رہے ہیں؟"

"جی......"

"اس پر کوئی تین ماہ قبل رنگ کرایا ہے میں نے۔ تین ماہ میں یہ پھر ایسا ہوگیا ہے۔"

"اور اندر کی کیا کیفیت ہے؟"

"تشریف لائیے۔" مرزا صاحب نے کہا اور میں صدر دروازے سے اندر داخل ہوگیا مگر بڑے ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ انتہائی نرم سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ وکٹورین طرز کے قدیم اسٹائل کے مگر بالکل نئے جیسے صوفے پڑے ہوئے تھے، دیواروں پر سرخ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ رنگ و روغن بالکل درست تھا۔

"گویا اندر کا ماحول ٹھیک ہے؟"

"آپ خود دیکھ لیجئے، یہ بیرونی حصہ ہے، اندر سے تمام حویلی بالکل درست ہے۔ شاہ بابا آپ اندر تشریف لے چلئے، بے شمار آراستہ کمرے ہیں یہاں، آپ جہاں پسند کریں، قیام کریں۔"

''کوئی بھی جگہ دے دیجئے۔ چند روز کا قیام ہے، اس میں کیا تکلف۔'' میں نے جواب دیا۔ بڑے ہال کے دروازے کے دوسری طرف ایک چوڑی راہداری تھی جس میں دو رویہ کمروں کی قطار تھی۔ میں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ مرزا صاحب نے خود دروازہ کھولا تھا۔ نہایت نفیس خواب گاہ تھی، تمام ضروریات سے آراستہ۔ ''یہ کسی کے استعمال میں ہے؟''

''قطعی نہیں۔ خاصے کمرے ہیں اس حویلی میں۔ پانچ میں ملازم رہتے ہیں، دو میں ہم، باقی خالی ہیں۔''

''تو پھر یہ میرے لئے درست ہے۔''

''بہت بہتر، جائزہ لے لیجئے، کسی شے کی کمی ہو تو فرما دیجئے گا۔''

''ملازم بھی اندر ہی رہتے ہیں؟'' میں نے کمرے میں داخل ہو کر سوال کیا۔

''کیا بتائیں شاہ صاحب! سارا نظام ہی الٹ پلٹ گیا ہے۔ ملازموں کی رہائشگاہیں عقبی حصے میں ہیں لیکن ہم نے ان سے ساتھ ہی رہنے کی درخواست کی ہے۔ یہ لوگ ہمارے سب سے وفادار ساتھی ہیں۔ یوں سمجھ لیں پشتنی۔ پہلے ملازموں کی تعداد زیادہ تھی لیکن جو نئے تھے، وہ سب بھاگ گئے۔''

''خوف زدہ ہو کر؟''

''جی ہاں! ہم سب نے اپنے کمرے برابر برابر رکھے ہیں اور سب ایک دوسرے کی خبر گیری رکھتے ہیں۔''

''جی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ زندگی گزار رہے ہیں ہم لوگ۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اچھا شاہ صاحب! سفر کی تھکن ہوئی ہوگی، آرام کیجئے گا۔ چائے کس وقت پئیں گے؟''

''ایک گھنٹے کے بعد بھجوا دیجئے گا۔''

''مناسب، اجازت...... ذرا اہل خانہ کو آپ کی آمد کی خوشخبری سنا دوں۔'' مرزا صاحب باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا، انتہائی موٹے گدے کی مسہری تھی۔ دیوار پر تصویر لگی ہوئی تھی جس میں ایک معمر شخص تلوار لئے کھڑا ہوا تھا۔ ایک گوشے میں مصنوعی درخت رکھا تھا جس میں شاخیں نکلی ہوئی تھیں اور ان شاخوں پر خوش رنگ مصنوعی پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ غرض نفیس ماحول تھا۔ دروازے کے عقب میں ایک کھڑکی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن میں بے شمار خیالات آنے لگے۔ اس بار میں لالچ کے تحت یہاں آیا ہوں۔ ماحول کا جائزہ ظاہر کر رہا ہے کہ بات کافی ٹیڑھی ہے۔ کامیاب ہوسکوں گا یا نہیں۔ میرے یہاں رہنے کا انداز وہی تھا جس طرح جادو، ٹونوں کے عامل کاروباری دوروں پر نکلتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

دیر تک سوچوں میں گم رہا پھر کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہوئی تو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا اور چٹخنی کھول دی۔ کھڑکی کا پٹ کھولا ہی تھا کہ عقب سے شی شی کی آواز ابھری، پھر جملہ سنائی دیا۔

''اے...... اے...... ہش ہش۔ کھڑکی مت کھولو، پرندے اُڑ جائیں گے۔'' میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ کوئی موجود نہیں تھا، دروازہ بند تھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟ ابھی اسی تجسس میں تھا کہ اچانک پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر دیکھا۔ مصنوعی درخت کے نقلی پرندے تمام شاخوں سے پھڑ پھڑا کے بلند ہو رہے تھے، پھر انہوں نے کھڑکی کی سیدھ اختیار کی اور ایک دوسرے کے پیچھے کھلی کھڑکی سے باہر نکل گئے۔ ابھی حیرت سے منہ کھولے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا کہ تلوار بردار بوڑھے شخص کی تصویر کے فریم سے پیچ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ فریم خالی ہو گیا تھا اور اس میں نظر آنے والا بوڑھا تلوار سمیت نیچے کھڑا تھا۔

''منع کیا تھا کہ کھڑکی مت کھولو۔ اڑا دیئے سارے پرندے، اب مشکل سے ہاتھ آئیں گے۔'' اس کی منمناتی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے اس نے کھڑکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر وہ لمبی لمبی چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر

نکل گیا۔
میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ نگاہوں کے سامنے خالی درخت، خالی فریم اور کھلی کھڑکی تھی۔ چند لمحات حیران کھڑا رہا۔ پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر خاموش اور سنسان رات پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر کھڑکی بند کر دی۔ یہ عمل کسی انسان کے دل کی حرکت بند کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس کے نتیجے میں دیکھنے والے کی حالت خراب ہو سکتی تھی لیکن میری نہیں۔ یہ سب کچھ میرے لئے ایک لمحے کی حیرت تو بن سکتا تھا، خوف نہیں۔ چنانچہ میں واپس آ کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ مرزا عزت بیگ کی بات کا یقین تو حویلی میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ تصدیق اب ہو گئی تھی۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ مجھے ان نیک روحوں کے خلاف کیا عمل کرنا چاہیے۔ ذہن پر ایک طرح کا جنون سوار تھا۔ یہ احساس بھی تھا کہ میں زیر عتاب نہ سہی، کم از کم ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے اس حویلی میں کامیابی حاصل نہ ہو لیکن اس کے باوجود میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ دل میں ایک سکون تھا، ایک فریاد تھی جو نہ الفاظ بن سکتی تھی، نہ جامع سوچ۔ بس ایک رویا رویا سا احساس تھا جیسے کسی اپنے نے بے اعتنائی کی ہو۔ جیسے کسی من چاہے نے ناکردہ گناہ کی سزا دی ہو۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر مسہری پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ کچھ نہیں تھا میرے لئے۔ میں بھلا اس سے کیا خوفزدہ ہوتا۔ بند آنکھوں میں نیند نے بسیرا کر لیا۔ شاید سفر کی تھکن نے نڈھال کر دیا تھا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی اور میں چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”کون ہے، آ جاؤ۔“ ملازم چائے لایا تھا۔ اس نے برتن میرے سامنے رکھ دیئے۔

”مرزا صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کون مرزا؟“ ملازم حیرت سے بولا۔

”مرزا عزت بیگ؟“ میں نے اس سے زیادہ حیرت سے کہا۔

”کون مرزا عزت بیگ۔“ ملازم نے اسی انداز میں کہا اور میں چونک پڑا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا تو اچانک ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ ملازم کی صورت جانی پہچانی تھی۔ وہ نادر حسین کی ہو بہو تصویر تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”نن۔ نادر حسین۔ تم......“

”کون نادر حسین۔ نہ جانے کس کس کا نام لے رہے ہو۔ بات ہی اُلٹی ہو رہی ہے، ہم تو چلے......“ ملازم دروازے کی طرف بڑھا تو میں اس کی طرف لپکا۔

”سنو تو نادر حسین۔ سنو تو۔“ مگر ملازم نے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں برق رفتاری سے دروازے سے باہر نکلا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ تاحدِ نگاہ خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کچھ دیر حیران کھڑا رہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر واپس اندر آ گیا۔ بہت عجیب، بہت پُراسرار واقعات تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ نادر حسین ہی تھا۔ آواز تک وہی تھی۔ اب احساس ہو رہا تھا مگر بالکل بدلا ہوا۔ پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ چائے کے برتنوں پر نظر ڈالی تو پھر ششدر رہ گیا۔ چائے دانی، شکر دانی اور دودھ کا برتن تھا۔ لیکن چائے نام کی کوئی شے نہیں تھی البتہ برتنوں کے درمیان ایک چمکدار خنجر رکھا ہوا تھا۔ کوئی دس انچ کا پھل تھا، اس کا اور اس پر نہایت خوبصورتی سے درود پاک کندہ کیا گیا تھا۔ دل کو ایک دھکا سا لگا۔ ہاتھ بے اختیار آگے بڑھے اور بڑی عقیدت سے وہ خنجر میں نے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ درود پاک پڑھا۔ دل روشن ہو گیا۔ ایک دم سے سارے بوجھ دل سے ہٹ گئے۔ سب کچھ غلط ہو سکتا ہے، ہر چیز فریب ہو سکتی ہے لیکن یہ کسی طور دھوکا نہیں ہو سکتا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اچانک تنہائی دُور ہو گئی۔ اچانک بے کسی کا احساس ختم ہو گیا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ سنائی دی اور میں نے جلدی سے اس متاعِ بے بہا کو سینے کے قریب چھپا لیا۔

”آ سکتا ہوں۔“ دروازے سے عزت بیگ کی آواز سنائی دی۔

''تشریف لائیے۔''

''نورِ چشمی قدسیہ بانو بھی ساتھ ہیں۔ آؤ بیٹی......'' ایک پیکرِ شباب اندر آ گئی۔ سادہ لباس مگر حسن سادہ بھی نہایت پُرکار...... ''قدسیہ نام ہے اس کا...... بڑی بیٹی ہے میری شاہ بابا۔ آپ کے قدموں میں آئی ہے۔'' عزت بیگ نے کہا۔ پھر چائے کے برتنوں کو دیکھ کر بولے۔ ''چائے پی لی گیا۔ مگر وہ احمق تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔''

''کون؟'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ نگاہ قدسیہ پر پڑی۔ وہ بڑی میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''شرفو ہے اس کا نام۔ کہہ رہا تھا کہ چائے لے کر جا رہا تھا کہ کسی نے برتن ہاتھ سے چھین لئے۔ ابھی ابھی تو خبر دی ہے اس نے، ادھر ہی آ رہا تھا۔''

''ٹھیک کہہ رہا تھا۔ برتن آئے تو ہیں مگر چائے سے خالی ہیں۔'' میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''دیکھ لیا آپ نے۔ یہ ہوتا ہے یہاں دن رات اور تو کوئی واقعہ نہیں پیش آیا؟'' مرزا صاحب نے کہا۔

''کوئی خاص نہیں۔ بس اس پیڑ کے پرندے اُڑ گئے۔ اس فریم میں جو تھا، وہ ان پرندوں کو پکڑنے نکل گیا۔'' میں نے کہا اور مرزا عزت بیگ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''چلئے اچھا ہوا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہی ہوتا ہے ان بچوں کے ساتھ۔ آپ تو دل کے مضبوط ہیں۔ ایسے واقعات بہت دیکھے ہوں گے آپ نے مگر یہ بچے۔ یہ تو ڈرتے ہی ہیں کیوں قدسیہ......'' مرزا صاحب نے بیٹی کی طرف دیکھا اور میری نظر دوبارہ اس کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز صرف مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور اس کا چہرہ۔ اس کا چہرہ بھی جانا پہچانا لگا۔ کہاں دیکھا ہے یہ چہرہ۔ پھر مجھے وہ پورنیاں یاد آ گئیں جو بھوریا چرن کے ایک عمل کے تحت مجھ پر مسلط ہو گئی تھیں۔ یہ چہرہ ان جیسا تھا۔ میں چونک سا پڑا تھا۔

''میں خود چائے لے کر آتا ہوں۔'' مرزا عزت بیگ اپنی جگہ سے اُٹھے تو میں نے انہیں روک دیا۔

''نہیں مرزا صاحب۔ اب ضرورت نہیں محسوس ہو رہی۔''

''شاہ صاحب۔ ناراض ہو گئے ہیں کیا۔''

''ارے بالکل نہیں۔ اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ آپ نے چند لمحے یہاں گزارے ہیں، مجھے دیکھئے۔ مسلسل ان حالات سے گزر رہا ہوں۔ میری بیوی، میری بچیاں ہر لمحہ خوف کا شکار رہتی ہیں۔ میں یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ زندگی مسلسل عذاب بن کر گزر رہی ہے۔'' مرزا عزت بیگ کی آواز بھرّا گئی۔ پھر وہ اُٹھ گیا۔ ''چائے لاتا ہوں۔'' اب میں اسے نہیں روک سکا تھا۔ وہ باہر نکل گیا۔ اس کی بیٹی بیٹھی رہ گئی تھی۔ میری نگاہ اس پر پڑی تو وہ پہلے کی مانند مجھے دیکھ رہی تھی۔

''آپ لوگ بہت خوفزدہ رہتے ہیں اس گھر سے؟''

''نہیں تو......'' وہ جیسے میرے سوال کی منتظر تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''مطلب...... مطلب تو کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ ''مگر آپ کے والد تو یہی کہہ رہے تھے آپ کے سامنے......''

''والد...... کون والد؟'' اس نے پھر اسی انداز میں کہا اور میں بوکھلا گیا۔

''مرزا صاحب کی بات کر رہا ہوں۔''

''اپنی بات نہیں کرو گے۔'' وہ دلآویز انداز میں بولی۔

''آپ کا مطلب کیا ہے قدسیہ؟''

''قدسیہ، کون قدسیہ۔ سنو، ایک بات بتاؤں تمہیں۔ میرا کمرہ اس کمرے کی آخری قطار کے دُوسری طرف ہے۔ تمہیں

اس سے سرخ روشنی جلتی نظر آئے گی۔ جب رات ڈھلے، جب چاند آدھے آسمان پر آ جائے تم میرے پاس آ جانا۔ بات تکوں گی۔ دروازہ کھلا رکھوں گی...... آنا ضرور......" وہ اُٹھ گئی۔ میں اسے نہ روک سکا تھا۔ دروازے پر رُک کر اس نے گردن گھمائی مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ روشنی چمک رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی یہ مسکراہٹ ہوش چھین لینے والی تھی۔ پھر وہ باہر نکل گئی۔

میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگا تھا۔ نہ جانے کیوں اس میں مایوسی کا احساس بیدار ہونے لگا تھا۔ میں دولت کے لالچ میں عزت بیگ کے ساتھ آ گیا تھا۔ یہ سوچ کر آ گیا تھا کہ اگر اس کا کام ہو جائے تو جو کچھ اس سے ملے گا، اسے شمسہ کے حوالے کر دوں گا۔ فیضان اس سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور میرے دل کو یہ سکون ہو جائے گا کہ میری بہن اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا، جو میں چاہتا ہوں۔ گناہ بے لذت سا ہوتا جا رہا تھا، حالانکہ مرزا عزت بیگ بتا چکا تھا کہ آسیب یہاں ہنگامہ آرائیاں کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ ان کے تابع ہے۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا، اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن بس مایوسی کا ایک احساس خودبخود میرے دل میں پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد عزت بیگ واپس آ گیا۔ چائے کے برتن وہ اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے وہ برتن میرے سامنے رکھے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔ "ارے یہ قدسیہ کہاں چلی گئی؟"

"پتہ نہیں، بس اُٹھ کر چلی گئیں۔" میں نے کہا۔ مرزا عزت بیگ نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

"وہ سب آسیب زدہ ہیں۔ یہ گھر مکمل طور پر آسیب زدہ ہے، ہم یہاں سے کہیں جاتے ہیں تو بیماریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جسمانی طور پر ہم اسی گھر میں تندرست رہتے ہیں لیکن ذہنی طور پر۔ آپ کو خود اندازہ ہو گیا ہوگا شاہ صاحب، سب کی یہی کیفیت ہے اور میرا دماغ چٹختا رہتا ہے، آپ چائے پیجئے......"

"نہیں مرزا صاحب آپ یقین کیجئے بالکل حاجت نہیں ہے۔ میں تو منع کر رہا تھا آپ کو، آپ نے خود ہی زحمت کر ڈالی۔ بہرحال مرزا صاحب میں اس پورے گھر کا جائزہ لوں گا، رات ہو چکی ہے، آپ اپنے مشاغل جاری رکھئے۔ آپ کے اہل خاندان سے بھی ملاقات کروں گا اور ان سے بھی جو یہاں آپ کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔"

"شاہ صاحب بات اتنی ہی نہیں ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ چند انسانی زندگیاں اس وقت آپ کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ کی کاوشیں انہیں نئی زندگی سے روشناس کرا سکتی ہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نیم جان ہو گئے ہیں۔ آپ چائے پی لیتے تو اچھا تھا۔ حالانکہ وقت واقعی کافی ہو گیا ہے۔ رات کے کھانے میں بھی دیر نہیں رہ گئی۔ شاہ صاحب آپ یہ فرمایئے کب سے کام شروع کریں گے؟"

"آج ہی رات سے مرزا صاحب......"

"میرے لائق خدمت بتایئے؟"

"نہیں آپ اپنے کمروں میں محدود ہو جائیں۔ ہاں ذرا ملازمین کو بھی ہدایت کر دیجئے گا کہ میری کارروائیوں میں روک ٹوک نہ کریں۔"

"کہاں شاہ صاحب۔ بس رات کا کھانا تو جلدی کھا لیا جاتا ہے ہمارے ہاں اور اس کے بعد یہ بے چارے بچے، یہ کچھ ملازم بس روایتی طور پر اپنی وفاداریاں نباہ رہے ہیں، اپنے اپنے کمروں میں جا گھسیں گے۔ سب ہی خوفزدہ ہیں۔ میں نے انہیں نجانے کن کن الفاظ میں تسلیاں دی ہیں اور کہا ہے کہ یہ مصیبت دُور ہو جائے گی۔ آپ اطمینان سے اپنا کام کیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔"

مرزا عزت بیگ خود ہی چائے کے برتن لے کر چلا گیا تھا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر گہری سوچوں میں گم ہو گیا

تھا۔ بہت دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا اور اس کے بعد ذہن اس خنجر کی جانب متوجہ ہوگیا جو میرے لباس میں محفوظ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر خنجر اپنے لباس سے نکالا اور اس پر کندہ درود پاک کا جائزہ لینے لگا۔ بہت حسین خنجر تھا اور اس کے بارے میں ایک لحہ بھی یہ سوچتا کہ اس میں کوئی ایسی ویسی بات ہے، میرے لئے گناہ عظیم تھا۔ درود پاک اس کا مکمل ضامن تھا اور اس کے علاوہ کوئی اور ضمانت مجھے جیتے جی درکار نہیں تھی۔ پہلے دل کی جو کیفیت تھی اب نہیں رہی تھی۔ اب تو بڑا اعتماد ہوگیا تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ مقصد جو میرے دل میں ہے پورا ہو یا نہ ہو، لیکن کم از کم یہاں میری زبردست معرکہ آرائی رہے گی اور اس کا نتیجہ بہتر ہی نکلے گا۔

❖❖❖❖❖

پھر خوب رات ہوگئی۔ وقت کا صحیح اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چونک کر دیکھا۔ مرزا عزت بیگ ایک ملازم کے ساتھ آیا تھا۔ ملازم نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی اور مرزا صاحب ہاتھوں میں پانی کا جگ اور گلاس لئے ہوئے تھے۔ میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کیوں زحمت کر رہے ہیں مرزا صاحب؟''

''رہنے دیجئے شاہ صاحب، شرمندگی کی آخری حد کو پہنچا ہوا ہوں، اگر اس گھر کا ماحول اتنا غیر یقینی نہ ہوتا تو کیا ایک معزز مہمان کے ساتھ یکجا بیٹھ کر کھانا نہ کھایا جاتا، مگر کیا کروں، میرے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ براہ کرم جو دال دلیہ مہیا کر سکتا ہوں، حاضر خدمت ہے، قبول فرمایئے۔ میں شکر گزار ہوں گا......''

''بہتر ہے رکھ دیجئے۔'' ملازم نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ مرزا صاحب بولے۔

''تو پھر اجازت، میں چلتا ہوں۔ ہاں اگر کسی اور شے کی حاجت ہو تو براہ کرم باہر تشریف لا کر کسی کو آواز دے لیجئے گا۔ اچھا......'' مرزا صاحب نے ملازم کو اشارہ کیا اور باہر نکل گئے۔ میں نے ایک نظر اس خوان پر ڈالی جس پر خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ جگ کے پانی سے ہاتھ دھوئے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بھوک تو لگ رہی تھی، کھانا بھی کھانا تھا۔ چنانچہ خوان سے خوان پوش ہٹایا۔ بہت ہی عمدہ خوشبو اُٹھ رہی تھی اس قاب سے جس میں سالن تھا۔ برابر میں تین خمیری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں، سلاد بھی تھا، سادہ سا کھانا فیرنی کے دو پیالوں کے ساتھ ٹرے میں سجا ہوا تھا۔ ساتھ ہی پلیٹ اور چمچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے سامنے بیٹھ کر بسم اللہ پڑھی اور قاب کا ڈھکن اُٹھا دیا۔ بھنا ہوا گوشت تھا۔ خاصی مقدار میں تھا، لیکن ابھی میں چمچہ ہاتھ میں لے کر سالن نکالنے ہی والا تھا کہ بوٹیوں میں ہلچل سی محسوس ہوئی اور میرا ہاتھ رُک گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سالن کے اس قاب کو دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بوٹیوں کے نیچے سے کوئی شے پھڑ پھڑا کر اُوپر آنا چاہتی ہو...... اور پھر میں نے بحالتِ ہوش میں اُلو کے سر کو سالن میں سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ بار بار پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ دُوسرے لمحے اُلو کا یہ سر قاب سے پھدک کر ٹرے میں آ گرا اور اس کے بعد ٹرے سے نیچے زمین پر۔ اس کے ساتھ چھینٹیں سی بلند ہو رہی تھیں اور یہ چھینٹیں دھبے لگاتی ہوئی ایک سمت کو جا رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی اُلو کا یہ سر کئی فٹ اُونچا بلند ہوا اور اس کھلی کھڑکی سے باہر نکل گیا جس سے پرندے اور تصویر والا آدمی باہر نکل بھاگا تھا۔ میں پہلے ہی کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور یہ منظر عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سر کے غائب ہو جانے کے بعد سکون چھا گیا۔ سالن کی لذیذ ترین خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ رمز میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی، وہی آسیب وہی انداز...... اس حویلی کے مکینوں نے میرا زبردست استقبال کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد تو اور بھی لطف آ گیا تھا۔ بھلا اب اس بات کی کیا گنجائش تھی کہ میں ایک لقمہ بھی توڑ سکوں۔ مرزا عزت بیگ کو اگر آواز دے کر اس بارے میں بتاتا تو وہ بے چارہ کیا کرتا۔ سوائے اپنے دُکھوں کا رونا رونے کے، لیکن یہ ساری چیزیں واقعی قابل غور تھیں اور اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں سے عمل کرنا چاہیے۔ بھوک بے شک لگ رہی تھی لیکن اب اس واقعے کے بعد وہ کافی حد تک کم ہوگئی تھی اور مجھے اندازہ ہوگیا

تھا کہ میں کھائے پیئے بغیر گزارسکتا ہوں۔ کام شروع کر دینا چاہیے، مرزا عزت بیگ کو اس سلسلے میں پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قاب کا ڈھکن واپس اس کی جگہ پر رکھا اور خوان پوش اس پر ڈال دیا۔ ٹرے اسی جگہ رہنے دی تھی اور میں اس سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا تھا۔ اس واقعہ کو بھی میں نے ان واقعات سے ہی منسلک سمجھا تھا جو یہاں چند گھنٹے قیام کے دوران پیش آ چکے تھے۔ پے در پے شرارتیں ہو رہی تھیں اور ان شرارتوں میں بڑی ہیبت ناک کیفیت تھی لیکن میرے لئے نہیں۔

کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ مرزا عزت بیگ اب دوبارہ میرے پاس آئے گا یا جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، وہ بھی دوسرے لوگوں کی مانند اپنی خوابگاہ میں جا چھپے گا۔ درحقیقت اس بھیانک ماحول میں جہاں اتنی سی دیر میں اتنے سارے محیر العقول واقعات پیش آ چکے تھے۔ ذہنی توازن برقرار رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ بڑی بات تھی کہ وہ لوگ ہوش وحواس کے عالم میں یہاں رہ رہے تھے۔ بہت دیر گزر گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ کھلی کھڑکی بند کی اور پھر دروازے سے باہر نکل آیا۔ حویلی شہر خموشاں بنی ہوئی تھی۔ کہیں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ بھی بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ سناٹے چیخ رہے تھے، دل کی دھمک کنپٹیوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ پیچ در پیچ راہداریوں اور کمروں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، بند دروازوں کی قطاریں مدھم روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ میں ان کے درمیان کسی آوارہ رُوح کی مانند بھٹکنے لگا۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر کسی بھی کمرے میں روشنی نہیں جل رہی تھیں۔ غالباً مرزا عزت بیگ کے اہل خاندان بھی روشنی بجھا کر سونے کے عادی تھے۔ واقعی اس ماحول میں کیا بیت رہی ہوگی ان پر، زندگی یہیں گزار رہے تھے۔ یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ عام دل گردے والوں کا کام نہیں تھا۔ یہ لوگ اگر اس ماحول کے عادی نہ ہو گئے ہوتے تو کلیجہ پھٹ جاتا ان کا یہاں رہ کر، لیکن انسان میں یہی تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ وقت سے لڑنا سیکھ لیتا ہے اور حالات کیسے ہی بھیانک کیوں نہ ہوں، بالآخر اسے ان میں گزارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کوئی پندرہ سے لے کر بیس منٹ تک میں اس حویلی کے مختلف گوشوں میں چکراتا رہا، ہر لمحہ اس بات کا تھا کہ اب کچھ ہوگا، لیکن کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر میری یہ توقع بھی پوری ہوگئی۔ اچانک ہی میرے عقب میں ایک کمرہ روشن ہوا اور ساتھ ہی سناٹے میں دروازہ کھلنے کی آواز کسی بم کے دھماکے ہی کی مانند محسوس ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا...... دروازے سے روشنی باہر پھوٹ آئی تھی اور اس روشنی میں ایک سایہ اُبھر رہا تھا۔ پھر وہ سایہ باہر نکل آیا۔ مرزا عزت بیگ تھا، دروازے ہی میں رُک کر وہ مجھے دیکھنے لگا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''اندر آ جایئے شاہ صاحب۔ یہ میرا کمرہ ہے، غالباً آپ نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔'' میں خاموشی سے واپس پلٹا اور مرزا عزت بیگ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دروازے سے واپس اندر داخل ہوگیا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو عزت بیگ نے جلدی سے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور اس سے کمر لگا کر کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں ننگا فرش تھا، کوئی ایسی چیز نہیں تھی وہاں جو کسی کے بیٹھنے یا آرام کرنے کے لئے ہو۔ دیواریں بھدّی اور بغیر پلاستر کی تھیں، فرش کا پلاستر بھی جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ میں نے متحیرانہ نگاہوں سے عزت بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا کمرہ ہے مرزا صاحب؟''

''آپ ہی کا ہے مہاراج۔'' مرزا عزت بیگ کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور میں پھر چونک پڑا۔

''مم...... مہاراج۔''

''پدم پردھائی مہاراج، گیانی ویانی آکاش کے رہنے والے۔'' مرزا عزت بیگ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مرزا صاحب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' میں نے حیرانی سے کہا اور مرزا کے حلق سے ایک بھیانک قہقہہ نکل گیا۔

''اب بالکل ٹھیک ہے مہاراج پران پردھانی۔''

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں رہے مہاراج، سمجھا رہے ہیں آپ کو، حویلی کے بھوت پکڑنے نکلے ہیں۔ مہان پران پردھانی، کیوں یہی

بات ہے ناں؟" میں سہمی ہوئی سی نگاہوں سے مرزا عزت بیگ کو دیکھنے لگا۔ ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا تھا اور مرزا عزت بیگ نے دوبارہ قہقہہ لگایا تھا۔

"بہت چالاک ہیں آپ مہاراج، بہت بڑے دیوتا ہیں، مہان ہیں، مگر شری شنکھا کے سامنے آ کر آپ نے اچھا نہیں کیا۔ مہمان شنکھا اگر ھنڈولا بن جاتا تو آپ کا کیا جاتا مہاراج، آپ کی چالاکی اسے جگہ جگہ روکتی رہی ہے اور آپ نے اسے اپنا اتنا بڑا دشمن بنا لیا ہے، حالانکہ شری شنکھا کے داس جیون میں مزے ہی مزے کرتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کیسے انسان ہیں، ایک لکیر پکڑے بیٹھے ہوئے ہیں جس نے آپ کو کچھ نہیں دیا، پرکی پردھان پرن تھاری مہاراج۔"

"تت..... تم، تم کون ہو؟" میں نے اب عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"شری شنکھا کا داس، ان کا ایک معمولی سا سیوک۔"

"تم عزت بیگ نہیں ہو۔"

"جو عزت ہمیں چاہیے مہاراج، وہ شری شنکھا کا داس بننے سے حاصل ہو گئی ہے اور کوئی عزت درکار نہیں ہے ہمیں، پرنت آپ کی کم بختی آ گئی، جھوٹی خانقاہ میں رہ کر آپ نے جو جال پھیلا لیا تھا مہاراج آپ کے خیال میں شری شنکھا اس سے بے خبر رہ سکتے تھے، آپ..... اپنے دین دھرم کے ساتھ جو ناٹک رچائے ہوئے تھے وہ صرف ناٹک تھے اور وہاں شری شنکھا کا پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کھوج تو ہوتی ہی ہے ناں دو دشمنوں کو ایک دوسرے کی اور شری شنکھا جی آپ کی کھوج میں بھی تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اب آپ نے ناٹک رچایا ہے اور لوگوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر دولت بٹور رہے ہیں تو شری شنکھا کو موقع مل گیا، پہنچ گئے وہ آپ کی اس جھوٹی خانقاہ میں اور وہاں پہنچ کر آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ پتہ چلا کہ مہاراج کو دولت چاہیے دولت۔ سو انہوں نے ہمیں عزت بیگ بنا کر بھیج دیا۔ آپ کی عزت لوٹنے کو مہاراج اور ہمارا کام تو یہ تھا ہی کہ آپ کو دھوکے سے ادھر لے آئیں۔ سو لے آئے ہم اور اب تو شری شنکھا کو موقع ملا ہے آپ سے سارے حساب کتاب چکانے کا مہاراج، کیا سمجھے، اب تو ساری کہانی آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ ہم شری شنکھا کے داس ہیں، جے شری شنکھا....."

"ہوں، تو ناٹک رچایا ہے اس بار بھوریا چرن نے۔" میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"پکا ناٹک مہاراج پکا ناٹک، دراصل یہ دھن دولت سسری چیز ہی ایسی ہے کہ آدمی کو پھیر میں لاتی ہی رہتی ہے۔ آپ نے بہت بچنا چاہا اس سے مہاراج مگر دیکھ لیجیے دن کے لالچ نے آپ کو نہیں چھوڑا اور اسی کے ہاتھوں مارے گئے آپ۔ ارے ہم نے تو سنا ہے کہ شری شنکھا نے آپ کو سب کچھ دے دیا تھا۔ پورنیاں دے دی تھیں آپ کو، پورنیوں کو آپ سے بڑی شکایت تھی مہاراج، بڑا انیائے کیا آپ نے ان کے ساتھ، ایک پورنی آپ کے سامنے آئی تھی، آپ نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا مہاراج، خیر یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے، اب یہ بتائیے کہ ہم آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں۔"

اس بار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، میں نے اس سے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اب تو میں تمہیں عزت بیگ کے نام سے بھی مخاطب نہیں کر سکتا تو پھر تمہارا کیا خیال ہے۔ شنکھا کے داس بھوریا چرن کو کیا اب کوئی ایسی قوت حاصل ہو گئی ہے میرے خلاف جس سے وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر سکے۔"

"اوش مہاراج اوش، اصل میں شری شنکھا مہاراج کو تو بہت ساری قوتیں ہمیشہ سے حاصل تھیں، پر آپ بچتے رہے ان سے اپنے دین دھرم کے ہاتھوں۔ سنا ہے شنکھا مہاراج نے آپ کا گیان دیان بھی پورا کر دیا تھا اور پورن بن گئے تھے آپ، پورنا بن کر آپ نے پورنیوں کو دھوکا دیا اور ان کے جال سے اپنے آپ کو نکال لیا۔ پر مہاراج اس سے آپ نے جو بھوجن کھایا ہے ناں، وہ ہمارے شنکھا مہاراج ہی کی سوغات تھی۔ اُلو کا گوشت تھا مہاراج، وہ مردہ اُلو کا جسے شنکھا مہاراج نے منتر کے ذریعے جیتا کیا تھا، پھر اس کا گوشت پکوا کر آپ کو بھیجا اور ہمیں بنا دیا مرزا عزت بیگ، کیونکہ مرزا عزت بیگ ہی آپ کو وہ بھوجن کھلا سکتا تھا مہاراج جو آپ کے شریر کو ایک بار پھر نشٹ کر دے اور اب آپ نشٹ ہو گئے۔ نشٹ ہو گئے، آپ کا دھرم

ایک بار پھر آپ سے چھن گیا چونکہ آپ نے جس اُلو کا گوشت کھایا ہے وہ بھیروں کے ہاتھوں جگایا گیا تھا۔ ایک مردہ اُلو، سڑا ہوا گوشت، پر اسے وہ شکتی دے دی گئی تھی کہ وہ آپ کے پورے شریر کو بھشٹ کر دے نجس کر دے اور اس ناپاک شریر سے وہ ساری طاقتیں نکل گئیں مہاراج جن پر آپ پھولتے تھے، جے شری شنکھا، جے شری شنکھا، جے شری شنکھا۔" وہ عقیدت، بھرے لہجے میں بولا اور میری آنکھوں میں خون کی سرخی لہرانے لگی، میں جانتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ایک بار پھر، ایک بار پھر مجھے سرخروئی حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اُلو کا گوشت نہیں کھایا تھا۔ وہ غلط فہمی کا شکار تھے اور اپنی اسی غلط فہمی میں وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا ایمان مجھ سے چھن چکا ہے لیکن میرے ایمان کا تحفظ کیا گیا تھا ہمیشہ کی طرح اور اس بات پر میرا کلیجہ ہاتھ بھر کا نہ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ میرے سینے میں بے پناہ قوت اُبھر آئی اور میرا ایک زوردار قہقہہ اس کا چہرہ اُتارنے کے لئے کافی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناپاک رُوح کے ناپاک پجاری، اتنی آسانی سے تم لوگوں کو میرے خلاف کامیابی نہیں حاصل ہوگی، کیا سمجھے۔ وہ کتا، وہ تمہارا بھوریا چرن پھر ناکام ہو گیا۔"

"ناکام ہو گیا....." وہ بولا۔

"ہاں۔ جاگا ہوا اُلو اُڑ گیا۔ کھڑکی سے باہر پرواز کر گیا۔"

"جھوٹ مت بولو مہاراج۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیا تم نے بھوجن نہیں کیا۔"

"مجھے میرے اللہ نے بچا لیا۔"

"کیسے؟"

"میں نے وہ کھانا ہی نہیں کھایا۔ میرے کھانا شروع کرنے سے پہلے تمہارا بھیروں جاگا اور بھاگ گیا۔"

"جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہے۔ اگر تم نشٹ نہیں ہوئے ہو تو اپنا کوئی چمتکار دکھاؤ۔ دکھاؤ اپنا دھرم چمتکار۔"

"وہ تو تجھے دکھانا ہے۔ کہاں ہے تمہارا بھوریا چرن۔ آخاہ بھوریا چرن آ گئے تم۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مقصد عزت بیگ کو دھوکا دینا تھا۔ جونہی اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے حلقوم میں پیوست ہو گئیں۔ میں نے پوری قوت صرف کر دی اور مرزا عزت بیگ کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ منہ بھیانک انداز میں کھل گیا، زبان بالشت بھر آگے لٹک آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں تشنجی انداز میں ہلتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ بے جان ہو گیا۔ میرے بدن میں شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی موت کا اندازہ لگانے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ پٹ سے زمین پر گر پڑا۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر میں نے حقارت سے اس کے مردہ جسم کو زوردار ٹھوکر رسید کی اور نفرت سے اس پر تھوک کر واپس پلٹا۔ میرا رُخ تبدیل ہوا تھا کہ اچانک میری پنڈلی کسی ہاتھ کے شکنجے میں آ گئی۔ میں بری طرح اوندھے منہ گرا تھا، سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا عزت بیگ پھرتی سے اُٹھ کر میرے اُوپر آ لدا۔

"ایسے بچ کر نہیں جاؤ گے پران پردھائی۔ شنکھا کے بھی جیون مرن کا سوال ہے۔" اس کی منمناتی آواز سنائی دی اور اس نے اپنے ہاتھ میری گردن میں ڈال دیئے۔ میں نے پوری قوت صرف کر کے اسے اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیا اور پھر کندھے سے گزار کر زمین پر پٹخ دیا۔ جونہی وہ نیچے گرا، میں نے پاؤں اُٹھا کر پوری قوت سے اس کے سینے پر مارا۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور پھر پاؤں اس کے سینے کے خول میں پھنس گیا۔ کالے خون کی پھواریں بلند ہونے لگیں اور میں نے دانت کچکچا کر اپنا پاؤں کھینچ لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ڈکراتا ہوا اوندھا ہو گیا۔ پھر شدید تکلیف کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا۔

"جے اے..... اے..... شنکھا..... جے شنکھا....." وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوفناک ہو گئیں اور چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن اچانک لمبے ہونے لگے اور کوئی چھ چھ انچ لمبے ہو گئے۔ اسی طرح دانت بھی دہانے سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت مجھے اپنے لباس میں چھپے ہوئے خنجر کا خیال آ گیا اور دُوسرے لمحے میں نے اسے نکال لیا۔ عین اسی وقت وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے مجھے خنجر نکالتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اس

کی آنکھیں ایک دم چڑھ گئیں۔ چہرہ بے رونق ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں لٹک گئے اور پھر وہ نیچے گر پڑا۔ میں خنجر کھینچ کر پیچھے ہٹ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ دوبارہ اُٹھے لیکن اب وہ نہیں اُٹھ سکا تھا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ پھر وہ لڑکی یاد آئی جسے اس ملعون نے ایک پاکیزہ نام سے متعارف کرایا تھا اور اپنی بیٹی بتایا تھا مگر وہ پورنی تھی اور اب تو اس کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے بلایا تھا، سوچا اس سے بھی مل لوں۔ بھوریا چرن کے بارے میں پوچھوں، ہوسکتا ہے اس کا ٹھکانہ معلوم ہو سکے۔ جس سمت کے بارے میں اس نے بتایا تھا، اس طرف چل پڑا اور میں نے اس کمرے میں روشنی دیکھی۔ میں نے خنجر اپنے لباس میں پوشیدہ کرلیا۔ کچھ دیر کے بعد میں اس دروازے پر تھا۔ پھر میں نے آہستہ سے اس پر دستک دی اور پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ اسی نے کھولا تھا مگر کم بخت سولہ سنگھار کئے ہوئے تھی۔ اسے شاید بدلے ہوئے حالات کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ مجھے بڑی چاہ سے اندر آنے کا راستہ دیا اور میں اندر آ گیا۔ تیز روشنی میں وہ شعلۂ جوالا بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔

''بالی سی عمر کو کیا روگ لگا بیٹھے۔ یہ سنیاس لینے کی عمر ہے شاہ جی۔'' اس نے لبھانے والے انداز میں کہا۔

''کیا تم اس حویلی کے آسیبوں سے نجات نہیں چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا اور وہ ہنس پڑی۔

''آسیب۔ وہ تو ہم خود ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''سب سے بڑا آسیب انسان کے اپنے من میں چھپا ہوتا ہے۔ اسے مار لو، سارے آسیب مر جائیں گے۔ چھوڑو شاہ جی۔ آؤ اپنی بات کریں۔'' وہ مسہری کی طرف بڑھ کر بولی۔ پھر وہ مسہری پر نیم دراز ہوگئی اور چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے قریب پہنچ کر جھک گیا۔

''تو تم پورنی ہو...... مجھے بھوریا چرن کے بارے میں بتاؤ۔ وہ بدبخت کہاں چھپا ہوا ہے۔'' میں نے کہا اور وہ تڑپ گئی۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ بھڑک کر بولی۔

''یہ کیا نام لے دیا تم نے۔ یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ ہٹو ہٹو یہاں سے۔ میرے مالک، میرے دیوتا کا نام لیا جائے اور میں...... ہٹو...... اس نے ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا اور خود تڑپ کر اُٹھ گئی، غالباً وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اسے پکڑنے کی کوشش کی اور اس کے لمبے لمبے بال میرے ہاتھوں میں آ گئے اور میں نے انہیں مٹھی میں جکڑ لیا۔''

''ایسے نہیں جا سکے گی تو شیطان کی بچی، مجھے بتا۔ وہ کتا کہاں چھپا ہوا ہے جس نے میری پوری زندگی کو مسلسل روگ بنا دیا ہے۔ جواب دے وہ کہاں ہے۔ میں نے زور سے اسے دھکا دیا اور اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ مجھ پر بھی دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ ان الفاظ کے ساتھ مجھے بھوریا چرن پوری طرح یاد آ گیا تھا۔ میرے دل میں نفرت کی ایسی شدید لہر اُٹھی تھی کہ میں خاکستر ہوگیا تھا۔ اپنے آپ کو نہ جانے کب سے سلا رکھا تھا میں نے اور صدمے پر صدمہ برداشت کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ دلدوز بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ میری بہن مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھی اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی۔ میں تو ایک دُنیا دار انسان تھا اور میری آرزو صرف اتنی سی تھی کہ میں اس دُنیا میں ایک بہتر زندگی گزار سکوں۔ یہ ملعون بھوریا چرن ہی تھا جس نے مجھے دربدر کر دیا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑے ہوئے تھے، دُوسرے ہاتھ سے خنجر نکال لیا تھا، اسے بھی ہلاک کر دینا چاہتا تھا میں۔ ایک جھٹکے سے میں نے اس کا رُخ تبدیل کیا اور اسے اپنے سامنے لانا چاہا لیکن اس نے بدن کی پوری قوت سے اپنے آپ کو اُچھال کر میرے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کی اور میں نے دیوانگی کے عالم میں خنجر اس کے بالوں پر ہی پھیر دیا۔ گردن پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بال زد میں آ گئے اور بالوں کا پورا گچھا میری مٹھی میں دبا رہ گیا۔ وہ دھڑام سے زمین پر گری تھی اور اس کے فوراً بعد اُٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اب میں اسے پتھرایا پتھرایا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی اور وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور کہنے لگی۔''

''پرم پردھانی آزاد ہوگئی ہوں بھوریا چرن کے جال سے اور اب تمہارے چرنوں کی دُھول ہوں، تمہارے چرنوں کی دُھول ہوں میں۔ حکم دو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''بھوریا چرن کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''سوار سندھو کا میں سات استھان ہیں اس کے، انہی میں سے کسی میں ہوگا۔ تم ہی سے تو چھپا ہوا ہے۔ ایک بار پھر تمہیں بھشٹ کرنا چاہتا تھا۔ اگر تم بھیرڑں چھند کھا لیتے تو وہ سیدھا سیدھا مار دیتا تمہیں، اب وہ صرف تمہاری جان کا لاگو ہے۔''

''تو اسے تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتی ہے؟''

''سات استھان دکھا دوں گی تمہیں مگر اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھے بھسم کر دے گا۔''

''چل اسے میرے ساتھ تلاش کر۔'' میں نے کہا اور وہ تیار ہوگئی۔ میں نے سب کچھ نظرانداز کر دیا۔ سب کچھ بھول گیا، اب میں مجسم انتقام تھا۔ اچانک ہی میرا دماغ پلٹ گیا تھا۔ پورنی کے ساتھ میں بے حواسی کے عالم میں اس حویلی سے نکل آیا۔ ہم نے پہلا سفر دہلی کا کیا۔ دہلی کے ایک نواحی علاقے میں کالی کا ایک مندر تھا جو ایک ویرانے میں بنا ہوا تھا۔ یہ مندر بھوریا چرن کا استھان تھا لیکن جب ہم شام کے جھٹپٹوں میں اس میں داخل ہوئے تو مندر سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ کالی کا ایک عظیم الشان بت ٹکڑے ٹکڑے پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف ٹوٹ پھوٹ مچی ہوئی تھی۔ پورنی نے کہا۔

''اس نے استھان جلا دیا۔ اسے تمہارا پتہ چل گیا۔''

''دُوسرا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''متھرا چلنا ہوگا۔'' پورنی نے کہا۔ ہم دونوں ویران مندر میں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک آہٹ ہوئی اور میں چونک پڑا۔ ایک پتھریلا مجسمہ تھا جو ایک اندرونی حصے سے نکل آیا تھا۔ مجسمے سے آواز بلند ہوئی جو بھوریا چرن کی تھی۔

''اتنا آسان نہیں ہے میاں جی مجھے مارنا۔ لاکھوں کی بلی دینا ہوگی مجھے مارنے میں۔ لاکھوں مارے جائیں گے۔ کیا سمجھے۔''

''خدا اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا بھوریا کتے۔ سامنے آ کر بات کر تو شنکھا ہے۔ مہان شنکھا...... سامنے کیوں نہیں آتا۔''

''آ جاتا پاپی۔ اگر میرا آخری کام ہو جاتا۔'' مجسمے سے آواز اُبھری اور پھر وہ راکھ بن کر ڈھے گیا۔ اب یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پورنی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب وہ اپنے کسی استھان پر نہیں ملے گا مہاراج، اسے پتہ چل گیا ہے کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں اور وہ اپنے سارے استھان تباہ کر دے گا۔''

''پھر بھی میں اسے تلاش کروں گا۔ اس کے ساتوں ٹھکانے تباہ ہو جائیں گے تو پھر کہاں پناہ لے گا وہ...... ؟''

''میں تو تمہاری داسی ہوں مہاراج، جو حکم دو گے اس پر عمل کروں گی۔''

میں نے سارے خیالات ترک کر دیئے تھے، اب تو بس ایک ہی آرزو تھی بھوریا چرن کو فنا کر دوں اور خود بھی موت کے گھاٹ اُتر جاؤں۔ جینا بے مقصد ہو گیا ہے میرا، شمسہ کے لئے دولت کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ بھی نہ کر سکا۔ کس کام کا یہ سب کچھ، جس میں کچھ بھی میرا نہیں ہے، جو کرنا چاہتا ہوں وہ میرے لئے ممکن نہیں۔ کیا فائدہ دُوسروں کو بے وقوف بناتے رہنے سے، سب کچھ فضول ہے۔ نجانے کیا کیا کرتا رہا ہوں، لیکن کوئی بھی صلہ نہیں ملا مجھے...... اپنی بہن کو ایک اچھا مستقبل تک نہیں دے سکتا تو مجھے جینے کا کیا فائدہ۔ ہاں اگر بھوریا چرن میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر جائے تو بس اسے ہی اپنے آخری لمحات میں سکون کا درجہ دے سکتا ہوں۔ باقی سب کچھ بے کار ہے، کچھ نہیں ملا مجھے......

وہاں سے چل پڑے۔ شہر دہلی پہنچے تو دہلی جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف آگ، شعلے، چیخ پکار...... معلومات کیں تو پتہ چلا کہ زبردست ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ پاکستان بن چکا تھا اور ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو اپنے درمیان نہیں

دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ آٹھ سو سال کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ پورے آٹھ سو سال انہوں نے محکوم رہ کر گزارے تھے اور اب وہ اپنے برسوں کے ساتھیوں کو موت کی نیند سلا رہے تھے۔ چاروں طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ بھوریا چرن کے الفاظ مجھے یاد تھے......

''لاکھوں مارے جائیں گے، لاکھوں مارے جائیں گے اور پورا ہندوستان ہی آگ میں جل رہا تھا۔ مسلمانوں کے قافلے موت کے گھاٹ اُتارے جا رہے تھے۔ متھرا، بندرابن، بنارس، اور نہ جانے کہاں کہاں۔ ساتوں ٹھکانے دیکھ لئے میں نے اور انہیں دیکھتے ہوئے اور بھی نہ جانے کیا کیا دیکھا۔ ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہر جگہ موت کا بازار گرم تھا۔ انسان موت سے چھپتے پھر رہے تھے۔ میری محبت بھی جاگ اُٹھی۔ ٹرین کے ایک سفر میں مسلمانوں پر حملہ ہوا تو میں بھی بے قابو ہو گیا۔ سولہ ناپاک ہندو ہلاک کئے میں نے۔ پورنی میری محکوم تھی۔ اس سے کئی کام لئے میں نے۔ مسلمانوں کے ایک قافلے پر ہندوؤں نے حملہ کیا تو میں نے پورنی سے کہا۔''

''تیرے پاس جادو کی قوت ہے۔ انہیں اندھا کر دے۔'' پورنی نے بے چارگی سے راکھ اُٹھائی اور اس کو حملہ آوروں کی طرف اُڑا دیا۔ وہ اندھے ہو گئے اور اپنے ہتھیاروں کو ایک دُوسرے پر استعمال کر کے خود فنا ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس قافلے کو میں نے بحفاظت یہاں سے روانہ کر دیا...... لاکھوں مسلمان مریں گے تو اب لاکھوں ہندو بھی مریں گے بھوریا چرن۔ یہ بھی تجھ سے انتقام ہے۔ میں اس کام میں مصروف ہو گیا۔ یہ بھی دل کو سکون بخش رہا تھا۔ اب کسی جگہ کی تخصیص نہیں تھی، جدھر منہ اُٹھتا نکل جاتا۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی مدد کرتا۔ ان پر ظلم کرنے والوں کو چن چن کر ہلاک کرتا۔ اپنی محکوم پورنی سے مدد لیتا۔ انہیں اس کے ذریعہ دولت، اناج اور لباس فراہم کرتا۔ میرے اس خنجر نے بے حساب ہندوؤں کو قتل کیا۔ مظلوم مسلمان مجھے درویش کا سا درجہ دیتے مگر میں خود پر ہنستا تھا۔ میں کیا تھا۔ یہ میں خود ہی جانتا تھا۔

پھر ایک دن شمسہ کا خیال آ گیا اور میں نے رُخ بدل لیا۔ سیکڑوں واقعات سے گزرتا ہوا خانقاہ تک پہنچا۔ لیکن خانقاہ کو دیکھ کر دِل دَھک سے رہ گیا۔ حلق فرطِ غم سے بند ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ خانقاہ مسمار کر دی گئی تھی۔ چاروں طرف جسم بکھرے ہوئے تھے۔ لاشوں کے سڑنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آگ کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح چیخ پڑا۔ ''شمسہ...... شمسہ میری بہن...... شمسہ...... میری بہن...... شمسہ میں آ گیا ہوں۔ شمسہ میں مسعود ہوں تیرا بھائی۔ تیرا بدنصیب بھائی۔ شمسہ...... شمسہ...... شمسہ...... فیضان، شمسہ......''

خانقاہ کی بلندیاں کس طرح طے کیں۔ مجھے نہیں معلوم، بس میرے حلق سے دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔ ''شمسہ! میری بہن...... میں آ گیا ہوں۔ میں تیرا بھائی مسعود ہوں۔ میری بہن کہاں ہے شمسہ! میں آہ...... میں دیوانہ تھا، پاگل ہو گیا تھا میں، شمسہ میں تیرے پاس رہ کر تجھ سے دور رہا۔ اپنے خوف کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تجھ سے دور رہا۔ شمسہ تجھ سے باتیں بھی نہیں کیں میں نے۔ آہ شمسہ...... شمسہ'' میں زار و قطار روتا ہوا خانقاہ میں پڑی لاشوں میں اپنی بہن کی لاش تلاش کرنے لگا۔ یہ لاشیں یہاں کے لوگوں کی تھیں۔ سب کے سب جانے پہچانے۔

دفعتاً چھٹی حس نے کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس دلایا۔ دیوانوں کی طرح چونک کر پلٹا۔ سامنے کھڑی شمسہ کو دیکھا۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔

میں بے قابو ہو کر اس کی طرف جھپٹا۔ پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ میرے حلق سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں خودبخود الفاظ میں ڈھل کر شمسہ کو میری المناک داستان سنا رہی تھیں۔ میری قوت ارادی کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ شمسہ نے مجھے پہچان لیا، سب کچھ جان لیا۔ ایسی بلک بلک کر روئی وہ کہ کلیجہ پانی ہو گیا۔

''مجھ سے دور کیوں رہا بھیا۔ ہائے مجھ بدنصیب کی قسمت میں یہ روشنی کہاں سے آ گئی۔ میں نے تو تاریکیوں ہی کو زندگی سمجھ لیا تھا۔''

طوفان گڑگڑاتا رہا۔ برسوں کی جدائی تھی، دل اتنی آسانی سے کیسے بھرتا۔ بالآخر سکون ہوا۔

''شمسہ فیضان؟'' میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''فیضان، شامی، اکرام بھیا، بچے تہہ خانے میں موجود ہیں۔ ہندو بیس بار آ چکے ہیں۔ خوب تباہی مچائی انہوں نے، سب کو مار دیا۔ ہم تہہ خانوں میں جا چھپے، اس لئے بچ گئے۔ کچھ لوگ بھاگ گئے۔ ہم کئی دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ باہر خطرہ تھا۔ کوئی باہر نہیں آتا۔ بچے پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ مجھ سے ان کا بلکنا نہیں دیکھا گیا۔ پانی کی تلاش میں نکل آئی تھی، تمہاری آواز سنی۔''

''فیضان، شامی، اکرام زندہ ہیں؟'' میں نے مسرور لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!''

''پانی کہاں ہے؟''

''وہاں ایک مٹکے میں موجود ہے۔ اسی سے یہ گلاس بھرا ہے۔''

''آؤ مجھے بتاؤ مٹکا کہاں ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر شمسہ کی نشاندہی پر مٹکے کے پاس آیا اور اسے اٹھا کر تہہ خانے میں لے گیا۔ سب کی حالت ابتر تھی۔ پہلے بچوں کو، پھر انہیں پانی پلایا اور ان میں زندگی جھلکنے لگی۔ فیضان یہ سن کر ششدر رہ گیا تھا کہ میں شمسہ کا سگا بھائی ہوں۔ اکرام نے وعدے کا پاس کرتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مختصر الفاظ میں انہوں نے خانقاہ کی تباہی کی داستان سنائی۔ پھر فیضان نے کہا۔

''اب کیا کریں مسعود بھائی؟''

''میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں، اس کے بعد سوچیں گے۔''

''کہاں جاؤ گے بھیا؟'' شمسہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''بس، ابھی تھوڑی دیر میں آیا۔''

''نہیں بھیا! کہیں پھر نہ کھو جاؤ۔ ابھی تو دل کو یقین بھی نہیں آیا ہے۔''

''نہیں شمسہ۔ بس ابھی آتا ہوں۔''

''ہم بھی ساتھ چلیں گے۔'' فیضان بولا۔

''ہرگز نہیں اکرام! انہیں سنبھالو، مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے باہر آنے کی اجازت دی تھی۔ دیوار کی اوٹ میں ہو کر میں نے پورنی کو آواز دی۔ وہ جاتی ہی کہاں تھی، حاضر ہو گئی۔ ''پھل درکار ہیں۔ درختوں سے ٹوٹے ہوئے ہوں، جادو کے نہ ہوں۔''

''لو آ گیا سوامی۔'' اس نے گردن جھکا دی اور پھر چشم زدن میں پھلوں کا ٹوکرا میرے سامنے لا رکھا۔ اپنے لئے ساری زندگی کالے جادو کا احسان نہیں لیا تھا مگر اب مجبوریاں آڑے آ گئی تھیں۔ پھل لے کر تہہ خانے پہنچا تو سب جیسے جی اٹھے۔ طرح طرح کے سوالات کئے گئے مگر خاموشی ہی جواب تھی۔ پوچھنے والے تھک گئے، پھر آگے کے منصوبے زیر غور آئے۔ شمسہ نے حسرت سے کہا۔

''بھیا! امی، ابو، محمود، ماموں ریاض کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ کہاں ہیں یہ لوگ، صدیاں بیت گئیں انہیں دیکھے ہوئے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں شمسہ، وہ سہارن پور میں بھی نہیں ہیں۔ میں نے انہیں تلاش کیا ہے۔ نہیں مل سکے البتہ محمود کے بارے میں، میں یہ جانتا ہوں کہ زندہ سلامت ہے۔ اسے میں نے خود ملک سے باہر بھیج دیا تھا۔ اس وقت اس کیلئے یہی ضروری تھا کیونکہ مقامی پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ میں نے تو اپنے آپ کو چھپا لیا مگر محمود کو ملک سے باہر نہ بھیجتا تو وہ خطرے میں پڑ جاتا۔''

''کہاں ہے، یہ نہیں معلوم؟''

''نہیں شمسہ، کچھ نہیں پتا۔'' فیضان نے کہا۔

''اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے مسعود بھائی کہ ہم بھی پاکستان نکل چلیں۔ سارے ہندوستان میں فسادات کی آگ پھیلی ہوئی ہے، ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں ہمارے لئے زندگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' اکرام اور شاہی بھی اس بات کے حق میں تھے۔ چنانچہ تیاریاں کی گئیں۔ بھلا تیاریاں کیا تھیں بس جو کچھ ہاتھ لگا، ساتھ لے لیا اور پھر ایک دن آدھی رات کے وقت ہم خانقاہ کی بلندیوں سے نیچے اتر آئے۔ ایک طویل سفر کا آغاز کیا تھا۔ دل کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔ نجانے کیا کیا تصورات ذہن میں تھے۔ رات بھر سفر کر کے جب دن کی روشنی ہوئی تو ایک ایسی جگہ ویرانے میں پناہ لی جہاں انسانی نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر یہی ہوا۔ راتوں کو سفر کرتے اور دن میں کسی پوشیدہ جگہ کو اپنا لیتے۔ پھر ایک بستی نظر آئی اور یہاں سے ہم نے ایک گاڑی حاصل کی۔ فیضان اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ خالی گاڑی کس کی تھی، کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس اس میں بیٹھ کر کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑے جہاں سے پاکستان جانے کے راستے دریافت ہو سکیں لیکن گاڑی کا یہ سفر بھی ہم نے رات ہی میں کیا تھا۔ صبح کو البتہ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے، وہاں ہمیں ایک زبردست خطرہ پیش آ گیا۔ کوئی پچاس ساٹھ افراد تھے لاٹھیوں، بھالوں اور تلواروں سے مسلح۔ گاڑی کا راستہ روکے کھڑے ہوئے تھے اور ان میں سب سے آگے بھوریا چرن تھا۔

❖❖❖❖❖

کمینہ صفت بھوریا چرن جو یقیناً ان لوگوں کو ہماری راہ پر لے آیا تھا۔ اس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا اور میں نے سرگوشی کے انداز میں پورنی سے پوچھا۔

''اس کے ساتھ جو افراد ہیں، کیا وہ اس کے جادو کے زیر اثر ہیں؟''

''نہیں سوامی! نہیں پرم پردھانی...... یہ سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہیں جنہیں بھوریا چرن آپ کے سامنے لے آیا ہے۔''

''تو پھر ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کر جو تو نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔''

''پرم پردھانی، شنکھا ان کا ساتھی ہے۔'' پورنی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اسے میں دیکھے لیتا ہوں۔'' میں نے ایک پتھر اٹھایا اور اس پر کلام الٰہی کی آیات پڑھ کر اسے پوری قوت سے بھوریا چرن کے سر پر دے مارا۔ پتھر اس کی پیشانی پر پڑا اور اس کی پیشانی پھٹ گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر چکرانے لگا اور میں اس کی جانب جھپٹا۔ میں نے عقب سے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر گردن پر جما دیئے اور اسے پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ ادھر وہ جو بھوریا چرن کے ساتھ آئے تھے، اچانک ہی اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے اور اس بات سے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یونہی اپنی جگہ کھڑے آنکھیں پھاڑتے رہے۔ میں نے بھوریا چرن کو بری طرح زمین سے رگڑ دیا تھا اور اس کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں لیکن پھر اچانک ہی وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں تحلیل ہو گیا۔ ایک دم سے اس کا بدن چھوٹا ہوا اور میری گرفت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ پھر میں نے ایک پیلی مکڑی کو برق رفتاری سے ایک سمت بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ظاہری بات ہے بھوریا چرن تھا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھائے اور مکڑی کا نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن بھوریا چرن کو ایک جگہ چھپنے کا موقع مل گیا۔ ایک درز میں گھس کر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن زمین پر میں نے ننھے ننھے خون کے دھبے دیکھے تھے۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو اندھے ہو گئے تھے، اب ایک دوسرے کو ٹٹول رہے تھے اور ان کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے فیضان کو اشارہ کیا۔ یہ انوکھی لڑائی فیضان کیلئے بھی باعث حیرت تھی۔ بہر حال وہ راستہ کاٹ کر گاڑی آگے نکال لے گیا اور ہم اس خطرے سے بھی دور ہو گئے۔ دن اور رات ایک عجیب زندگی تھی۔ خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی راتوں کو اگر آبادیوں کے قریب ہوتے تو آبادیوں سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیتیں، اللہ اکبر کے نعرے گونجتے۔ ہندو، مسلمان ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے۔ کہیں جے جے کار ہوتی اور کہیں اللہ کا نام لیا جاتا لیکن پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی فسادات کی آگ کو بھلا مجھ جیسا آدمی کیا روک سکتا

تھا۔ ہم تو صرف اپنی جان بچانے کیلئے بھاگ رہے تھے۔ راستے میں طرح طرح کے کام ہوتے رہے۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی حاصل ہوگئیں اور تھوڑا بہت پیٹرول بھی جو گاڑی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہورہا تھا اور اس کے بعد اچانک ہی جب میں نے صورت حال کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ میں اپنے آبائی شہر سے بالکل قریب ہوں۔ قدم رک گئے تھے، بدن کی قوتیں ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہاں! تھوڑے ہی فاصلے پر پیر پھاگن کا مزار پاک تھا۔ میری بچپن کی کہانی پھر سے میری آنکھوں میں تازہ ہوگئی تھی۔

نجانے کتنے عرصے کے بعد اس سمت آیا تھا۔ یہ راستے حالانکہ کبھی اس طرح جانے پہچانے تھے کہ آنکھیں بند کرکے چھوڑ دیا جائے تو میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں لیکن اب سیکڑوں تبدیلیاں ہوچکی تھیں۔ یہاں بھی فسادات ہورہے تھے۔ پیر پھاگن سے بچپن سے عقیدت تھی۔ میں نے شمسہ سے کہا۔

”شمسہ! پہچانیں اس جگہ کو......“

”نہیں بھیا! کون سی جگہ ہے؟“

”ہمارا گھر ہے۔ شمسہ ہمارا شہر ہے۔ وہ دیکھو بلندی پر تمہیں پیر پھاگن کا جھنڈا نظر آرہا ہے؟“ شمسہ سکتے میں رہ گئی۔ آنسو تو اس کی آنکھوں سے نکل پڑنے کیلئے بےقرار رہتے تھے۔ میرے مل جانے کے بعد ماں، باپ اور بھائی کی یاد ایسی تازہ ہوئی تھی کہ جب بھی اس پر نظر پڑتی، اسے روتے ہوئے پاتا۔ شمسہ کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا۔ کہنے لگی۔

”بھیا! اپنے گھر میں جھانک لیں، ہوسکتا ہے امی اور ابو وہیں رہتے ہوں۔“

”نہیں شمسہ...... اب بھلا ان کے یہاں موجود رہنے کے کیا امکانات ہوسکتے ہیں۔ ہاں اگر تیرا جی چاہے تو آ پیر پھاگن کے مزار پر چلتے ہیں، فاتحہ خوانی کریں گے اور ان سے مدد کی درخواست کریں گے۔“ شمسہ تیار ہوگئی۔ فیضان اور اکرام کو بھی میں نے یہ بتادیا تھا کہ یہ میرا آبائی شہر ہے اور وہ لوگ بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔ پیر پھاگن کا مزار پاک اسی طرح سبز رنگ، سینہ تانے پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ ہم لوگ آگے بڑھنے لگے اور پھر اس وقت جب میں بڑی عقیدت کے عالم میں شمسہ کے ساتھ پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیوں کی جانب جارہا تھا کہ میں نے ایک سمت بھوریا چرن کو دھونی رمائے دیکھا۔ سامنے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں سلگ رہی تھیں، ان میں کوئی خوشبو ڈال رہا تھا کمبخت جوگی۔ سر گھٹا ہوا تھا، پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپنی مکروہ شخصیت کو وہ پیر پھاگن سے زیادہ دور نہیں کرسکا تھا اور یقینی طور پر کسی ایسے عمل کے چکر میں تھا جس سے اسے کھنڈولا بننے کا موقع مل جائے۔ اسے دیکھ کر ایک بار پھر میرے بدن میں چنگاریاں دوڑ گئیں۔ میں نے خلوص دل سے اللہ سے دعا کی کہ اس موذی مخلوق کے خاتمے میں میری مدد کی جائے۔ پیر پھاگن سے کہا کہ وہ اللہ سے دعا کریں جس شخص نے میری زندگی کا رخ اس طرح تبدیل کیا ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا ہے، وہیں اس کا انجام بھی ہو۔ یہ تمام احساسات دل میں لئے میں آہستہ آہستہ بھوریا چرن کے سامنے پہنچ گیا۔ اسے شاید میری آمد کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ پھر میں نے اس کے سامنے پڑی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور اسی وقت وہ بری طرح چونک پڑا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل چکی تھیں۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹا تو چت گر پڑا لیکن پھر اس نے الٹی قلابازی کھائی اور میں نے جلتی ہوئی لکڑی اس کے چہرے پر دے ماری۔ بھوریا چرن کی دلدوز چیخ ابھری تھی۔ اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”تو آگئے تم میاں جی۔ یاد ہے یہ جگہ، یہیں سے ہماری تمہاری جنگ شروع ہوئی تھی اور آج یہیں تمہارے پیر پھگنوا کے چرنوں میں تمہارا انت ہوجائے گا۔ آج نہیں چھوڑوں گا میاں جی! آج نہیں چھوڑوں گا۔“ دفعتاً ہی مجھے اپنے سینے کے پاس ایک وزن سا محسوس ہوا اور یہ وزن اس خنجر کا تھا جو مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بھوریا چرن نے گہری نگاہوں سے خنجر کو دیکھا اور دفعتاً ہی اس کے چہرے پر پھر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ غالباً اسے کسی خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے ایک دم الٹی چھلانگ لگائی لیکن یہ چھلانگ پیر پھاگن کے مزار کی سیڑھیوں کی جانب تھی۔ راستہ بھول گیا تھا۔ وہ صحیح راستے کا انتخاب نہیں کرسکا تھا۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے اس پر جھپٹا، باقی لوگ حیران نگاہوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے

تھے۔ بھوریا چرن زور سے چیخا۔

''ارے بچاؤ...... ارے بچاؤ۔ یہ مُسلّہ مجھے مار رہا ہے۔ ہندو ہوں، میں ہندو ہوں۔ ارے ہندو جاتی کے لوگو! بچاؤ مجھے، بچاؤ'' لیکن شاید یہاں کوئی ہندو موجود نہیں تھا یا پھر اس کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا اور دفعتاً ہی اسے عقب سے ٹھوکر لگی۔ سیڑھیاں اس کے راستے میں مزاحم ہوگئی تھیں۔ وہ نیچے گر پڑا اور اسی لمحے میں اس پر چھا گیا۔ میں نے خنجر بلند کر کے اس کے پہلو میں بھونک دیا اور اس کی زبان کوئی ڈیڑھ فٹ باہر نکل آئی۔ اس نے زبان سے میرے چہرے کو چاٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے پیچھے ہٹ کر دوسرا وار پھر اس کے سینے پر کیا۔ اس بار اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے کوئی دو یا تین فٹ باہر نکلیں اور ربر کی طرح کھنچ کر واپس اپنی جگہ پہنچ گئیں۔ میں دیوانہ وار اس پر حملے کر رہا تھا اور میرا خنجر بار بار بلند ہو کر اس کے جسم کے مختلف حصوں میں پیوست ہو رہا تھا۔ قرب و جوار میں کچھ لوگ موجود تھے جو دوڑ دوڑ کر ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے لیکن میں سب سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا اور میں نے بھوریا چرن کی گردن اس کے شانوں سے علیحدہ کر دی۔ اس کی چوٹی پکڑ کر میں نے گردن کاٹی اور ایک طرف اچھال دی۔ پھر اس کی بغل کے پاس سے ایک بازو کاٹا۔ خنجر انتہائی شاندار طریقے سے اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ کچھ لوگ تو یہ ہولناک منظر دیکھ کر وہاں سے فرار ہی ہو گئے تھے۔ بھوریا چرن کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے انہیں قرب و جوار میں پھینک دیا۔ پھر اچانک ہی ایک گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی اور میں نے دیکھا کہ جہاں جہاں اس کے جسم کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، وہاں زمین میں گڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ پتھر چٹخ رہے تھے، اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر ایک بڑا سا گڑھا وہاں نمودار ہوا اور بھوریا چرن کا مردود جسم اس گڑھے میں اُترتا چلا گیا تھا۔ میرے دانت بھنچے ہوئے تھے، آنکھیں شدت غضب سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے اس گڑھے کے قریب پہنچ کر اس میں جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اتنا گہرا گڑھا ہو گیا تھا کہ زمین نظر نہیں آتی تھی، تاہم میں نے اپنی معلومات کیلئے پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر اس گڑھے میں اچھال دیا۔ پتھر کے زمین پر گرنے کی آواز تک نہیں آئی تھی۔ بھوریا چرن انتہائی گہرائیوں میں دفن ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر صاف کر کے اپنے لباس میں واپس رکھا اور اس کے بعد میرے حواس کسی قدر کام کرنے لگے۔ فیضان، شامی، اکرام، شمسہ وغیرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ قرب و جوار کے لوگ بھی حیران حیران سے کھڑے ہوئے تھے۔ میں اپنے اس کام سے فارغ ہو گیا۔ بظاہر تو بھوریا چرن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ آگے اللہ جانتا تھا۔ پیر پھاگن کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ ماں، باپ کے مل جانے کی دعا مانگی۔ شہر جا کر اپنا گھر تلاش کیا۔ وہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ آنسو پی کر واپس چل پڑے اور اب عزم پاکستان تھا۔ ٹرین آگرہ سے روانہ ہوئی۔ چار ڈبے بارڈر کیلئے لگائے گئے تھے۔ سکھ رجمنٹ کے سولہ سپاہی ان کی حفاظت پر مقرر کئے گئے تھے لیکن میں نے ان کے چہروں کی خباثت دیکھی تھی۔ ایک نگاہ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے فرض سے مخلص نہیں ہیں۔ کٹے پھٹے زخمی مسلمان مرد، عورتیں، بچے زندگی کی تلاش میں سرگرداں ٹرین کے ان ڈبوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے اور غم دیکھے نہیں جاتے تھے۔ اکرام، فیضان اور شامی بھی اب بالکل بدل گئے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے مگر ہمارا عزم ہتھیار تھا اور ہم ہر لمحہ کسی واقعے کے منتظر تھے۔ شمسہ سہمی ہوئی ایک گوشے میں اپنے بچوں کے ساتھ سمٹی ہوئی تھی۔ اس وقت سارے خیالات سو گئے تھے۔ پورنی سے میں نے بڑے کارآمد کام لئے تھے اور حقیقتاً اس کی افادیت کا قائل ہو گیا تھا۔ ٹرین کے سفر کے چند گھنٹے کے بعد ہی میں نے اسے سرگوشی میں پکارا اور کہا۔

''کیا تو ان لوگوں کی نیت کے بارے میں بتا سکتی ہے جو ہمارے محافظوں کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہیں؟''

''آپ آ گیا دیں مہاراج! میں ان کے من کھول لوں گی، تھوڑا سمے لگے گا۔''

''مجھے معلوم کر کے بتا۔'' کوئی دس منٹ کے بعد پورنی نے مجھے اطلاع دی۔

''ہری سنگھ اس رجمنٹ کا سردار ہے، ہندوؤں کا پالا ہوا۔ اس نے انجن چلانے والے کو حکم دیا ہے کہ چھتناری اسٹیشن سے آگے نکل کر باندی پورہ اور چھتناری کے بیچ ریل روک دے۔ وہاں ہندو حملہ کرنے کیلئے تیار ہیں۔''

''پورنی! ریل نہیں رکنی چاہئے۔''
''نہیں رکے گی مہاراج۔'' پورنی نے جواب دیا۔ دن گزر گیا، رات ہوگئی۔ ریل کے ڈبوں میں روشنی اور ہوا کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بچے ریں ریں کر رہے تھے، مسافر عالم سکرات میں تھے۔ کوئی دس بجے چھتناری کا اسٹیشن آیا۔ ہر اسٹیشن پر ہم نے ہندو انتہا پسندوں کو دیکھا تھا مگر فوج کی وجہ سے کوئی عمل نہیں ہوا تھا البتہ چھتناری کے بعد جب ٹرین آگے بڑھی تو میں نے درود پاک کا ورد شروع کر دیا تھا۔ میرا دم آنکھوں میں آگیا تھا۔ یک بیک میں نے ٹرین کی رفتار تیز ہوتی دیکھی۔ ہر ایک کو اس کا احساس ہوگیا تھا۔ مسافر چونک پڑے تھے۔ ٹرین تھی کہ گولی بن گئی تھی۔ اس طوفانی رفتار سے گزرتی ہوئی وہ باندی پورہ سے گزر گئی۔ باندی پورہ کے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے بس روشنی کی لکیریں نظر آئی تھیں اور سائن بورڈ پر بس نام کا شائبہ ہوا تھا۔ مزید ایک گھنٹہ گزر گیا، پھر ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر بہت سست ہوگئی۔ پورنی نے میرے کان میں کہا۔
''پرم پردھانی! گڑبڑ ہوگئی ہے۔''
''کیا؟''
''سکھ افسر نے انجن چلانے والے کو گولی مار دی ہے۔ اس نے باندی پورہ کے ہندوؤں سے پیسے لئے ہوئے تھے۔ انجن چلانے والے نے گاڑی نہیں روکی اس لئے افسر نے اسے مار دیا۔ اب افسر بلادی اسٹیشن پر گاڑی رکوائے گا۔ آپ بلادی پر دوسری طرف سے اتر جائیے، وہاں خون خرابہ ضرور ہوگا۔''
''تو کچھ نہیں کر سکتی؟''
''جو بن پڑے گا، ضرور کروں گی مہاراج۔ مگر بہت بڑا جماؤ ہے۔ آپ کو ہوشیار رہنا ہوگا۔''
میں پریشان ہوگیا۔ میرے کمپارٹمنٹ میں جو لوگ نظر آ رہے تھے، وہ بیچارے زخموں سے چور تھے، یہ کسی سے کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ تاہم کچھ دیر کے بعد میں نے انہیں ہوشیار کر دیا۔
''آگے حملے کا خدشہ ہے۔ آپ سب لوگ ہوشیار ہو جائیں۔'' کہرام مچ گیا۔ سہمے ہوئے لوگ طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ میرے لئے جواب دینا مشکل ہوگیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے وقت سے پہلے انہیں موت کے خوف سے دوچار کر دیا ہے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا تھا۔ کچھ لوگوں نے مجھے گالیاں بھی دیں اور کہا کہ میں خوف و ہراس پھیلا رہا ہوں۔ میں نے خاموشی سے سب کچھ سنا البتہ اپنے ساتھیوں کو میں نے ہوشیار کر دیا اور پورنی کی ہدایت کے مطابق انہیں دونوں سمت کے دروازوں پر تعینات کر دیا کہ جس سمت اسٹیشن آئے، اس کے دوسری سمت کا دروازہ کھول دیا جائے۔ بچوں کو میں نے فیضان اور اکرام کی گود میں دے دیا تھا۔ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ بلادی کا اسٹیشن تاریکی میں ڈوبا پڑا ہوا تھا مگر دور ہی سے وہاں چہل پہل محسوس ہو رہی تھی۔ ہمیں سمت کا اندازہ ہوگیا اور میں نے شمسہ وغیرہ کو اس طرف پہنچا کر درود پاک کا ورد شروع کر دیا۔ ٹرین کو کئی جھٹکے لگے اور اس کے ساتھ ہی جے بھوانی، جے ہند اور ست سری اکال کے نعرے لگنے لگے۔
''پوری......'' میں نے پورنی کو پکارا مگر اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ کئی آوازوں پر بھی میں نے اس کی آواز نہ سنی۔ اگلے ڈبوں پر حملہ ہو چکا تھا، چیخ و پکار کی دلدوز آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ دل رو رہا تھا ان سب کو مصیبت میں چھوڑتے ہوئے مگر کیا کرتا۔ انہیں سپرد خدا کر کے شمسہ، بچوں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے کود گیا۔ دوسری طرف گہرائیاں اور لمبے لمبے کھیت کھڑے تھے۔ سب کے سب لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرے۔ بچے بری طرح رونے لگے، ان کے منہ بھینچ کر انہیں چپ کرایا اور سب سنبھل کر کھیتوں میں دوڑنے لگے۔ نعروں اور چیخوں کی مہیب آوازیں تعاقب کر رہی تھیں۔ کھیتوں کا سلسلہ کچھ دور چل کر ختم ہوگیا۔ کچھ فاصلے پر روشنیاں سی دہکتی ہوئی نظر آئیں۔ عجیب سی روشنیاں تھیں جیسے بھٹیاں دہک رہی ہوں۔ رخ اسی سمت ہوگیا۔ چکنی مٹی سے بنی ہوئی ایک قلعے نما عمارت تھی جس کی فصیلوں پر یہ بھٹیاں روشن تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم قلعے کے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ اچانک بڑے دروازے میں ایک ذیلی کھڑکی کھلی۔

''السلام علیکم۔'' کسی نے کہا۔
''وعلیکم السلام...... آپ کون ہیں؟''
''اندر آ جاؤ...... جلدی کرو۔'' ہم سے کہا گیا اور ہم عجلت میں اندر داخل ہو گئے۔ دس بارہ افراد تھے۔ ڈیلی کھڑکی بند کر کے اس کے ساتھ بہت سا کاٹھ کباڑ لگا دیا گیا۔ پھر مشعل کی روشنی میں ہمیں دیکھا گیا اور کسی نے گومجدار آواز میں کہا۔
''جو ریل کٹ گئی، اسی کے مسافر ہو؟''
''اندر آ جاؤ۔ ہمیں ان کتوں کا منصوبہ معلوم تھا مگر افسوس وقت بدل گیا۔ مجبوری تھی، ہم کچھ نہیں کر سکے۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔'' وسیع عمارت تھی۔ ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں راؤ تجمل حسین کو دیکھا۔ تعارف بعد میں ہوا تھا۔ ہمیں چائے پیش کی گئی۔ بہت تھکن سے نڈھال تھے۔ چائے کے بعد راؤ صاحب نے کہا۔
''آپ لوگ آرام کریں۔ ہاں! مرد ہوشیار رہیں۔ اگر حویلی پر حملہ ہوا تو آپ کو جگا دیا جائے گا۔''
''نہیں راؤ صاحب! ہم آپ کے ساتھ جاگیں گے۔''
''ابھی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا ہے کچھ دیر آرام کر کے چاق و چوبند ہو جائیں۔'' راؤ صاحب چلے گئے۔ کسی کے پاس بولنے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ ایک خوف سب پر طاری تھا۔ بچے البتہ سو گئے۔ میں نے سرگوشی میں پورنی کو پکارا۔
''پرم پردھانی!'' اس کا جواب ملا۔
''پرم پردھانی کی بچی۔ کہاں مر گئی تھی؟''
''جے پرم پردھائی۔ آپ پوتر اشلوک پڑھ رہے تھے، ان کے سامنے گندی نہیں آ سکتی تھی۔ میں مجبور تھی۔'' اس نے جواب دیا۔
''کیا ریل کے سارے مسافر مارے گئے؟''
''کچھ جیتے ہیں دھنی، کچھ مارے گئے۔''
اور کیا پوچھتا اس سے، خاموش ہو گیا۔ رات بھی بہت سی راتوں کا مجموعہ بن گئی تھی۔ نہ جانے کیسے صبح ہوئی، ناشتہ ملا، دوپہر کو راؤ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بلادی کے مسلمان رئیس تھے۔ ہندوؤں میں گھرے ہوئے تھے مگر بڑے کلّے ٹھلے کے آدمی تھے۔ ہندوؤں کا مسلسل مقابلہ کر رہے تھے۔ بتانے لگے۔
''بڑی مشکل سے بچاؤ کر رکھا ہے۔ بستی کے سارے مسلمان بھاگ گئے، ہم پھنس گئے ہیں۔ دس بندوقیں ہیں، ہندو ملازموں کے سامنے انہیں سو بتا کر پیش کیا ہے۔ ان کے خوف سے ابھی حویلی پر حملہ نہیں ہوا ہے ورنہ کب کا ہو چکا ہوتا مگر کب تک...... ہاں! اللہ کرے شمس اللہ آ جائے۔ بھتیجا ہے ہمارا، انگریزی فوج کا افسر ہے۔ ایک منصوبہ بنا کر گیا ہے۔ دیکھو اللہ کرے ہماری موت سے پہلے پہنچ جائے۔'' بعد میں شمس اللہ کے بارے میں معلوم ہوا وہ کچھ انتظامات کرنے گیا تھا اور یہاں اس کا انتظار ہو رہا تھا تاکہ پاکستان کی طرف کوچ کیا جائے۔ راؤ صاحب نے بعد میں فصیلوں پر جلتی ہوئی بھٹیاں دکھائیں جن پر بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے اور ان میں تیل ابل رہا تھا۔ قریب ہی لمبی لمبی سینکوں کی جھاڑوئیں انبار تھیں۔
''یہ ہمارے ٹینک ہیں۔ سسرے ایک بار ہمت کر لیں، دوبارہ رخ نہیں کریں گے۔'' راؤ صاحب نے بتایا۔
''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''اسلحہ...... تیل میں گڑ پک رہا ہے۔ حویلی پر حملہ ہوا تو ان جھاڑوؤں کو اس میں ڈبو کر تیل اچھالیں گے۔ کسی پر اس کی ایک بوند بھی پڑ گئی تو سمجھ لو، عمر بھر جلتا رہے گا۔ ساری تیاریاں پوری ہیں۔''
میں اس تدبیر پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ جوالا پور کے کنور ریاست علی یاد آ گئے تھے۔ پھر اسی رات حملہ ہو گیا۔ کوئی ڈیڑھ دو سو ہندو رات کی تاریکی میں حویلی کے پاس آ گئے۔ ہم لوگ جاگ رہے تھے، فوراً بلاوا آ گیا۔ فصیلوں پر سب دم

ساڑھے ہندوؤں کے زد پر آجانے کا انتظار کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد تیار تھے، پھر جونہی وہ لوگ زد میں آئے، اوپر سے ان پر تیل میں جلے ہوئے گڑ کی بارش ہوگئی۔ خدا کی پناہ...... جس طرح وہ بلبلائے، جس طرح زمین پر لوٹیں لگائیں، دیکھنے کا منظر تھا۔ کئی دن کا پکتا ہوا گڑ تیل کے ساتھ مل کر جس کے جسم پر پڑا، اندر تک اترتا چلا گیا۔ تین منٹ بھی نہ لگے، صفایا ہوگیا۔ ایسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ حملہ ناکام ہوگیا۔ راؤ صاحب پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔ دوسری صبح دو جیپیں آئیں جن میں پولیس بھری ہوئی تھی۔ نیچے ہی سے مذاکرات ہوئے۔ راؤ صاحب نے کہا۔

''بھیا! گارڈ لے کر آجاؤ۔ مالک کی قسم ٹینکوں اور توپوں سے مارو گے تب بھی سو پچاس کو لے مریں گے۔ اب جلدی سے پیچھے ہٹ جاؤ، نہیں تو ہم شروع ہو رہے ہیں۔''

جیپیں مڑ کر واپس چلی گئی تھیں۔ راؤ تجمل حسین بیشک عظیم انسان تھے۔ ان حالات میں بھی بات بات پر قہقہہ لگانے والے۔ دو دن تک خاموشی طاری رہی۔ تیسری رات کوئی نو بجے ہوں گے کہ تین گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ اطلاع مل گئی اور اسلحہ تیار ہوگیا۔ گاڑیاں بالکل نیچے آگئیں، پھر کسی نے چیخ کر کہا۔

''چچا ابا...... میں شمس اللہ ہوں۔ کوئی کارروائی نہ کریں۔'' اس نام میں بڑا سحر تھا۔ حویلی کے دروازے کھل گئے۔ شمس اللہ اندر آگیا۔ ایک بس اور دو جیپیں تھیں۔ جیپوں میں مسلح فوجی بھرے ہوئے تھے۔ افراتفری مچ گئی۔ سامان کی گٹھریاں بس میں بھری گئیں۔ بارہ ملازم، پانچ عورتیں جن میں شمسہ بھی تھی اور بس شمسہ کے بچے۔ یہ سب بس میں بیٹھے اور بس چل پڑی۔ راؤ صاحب بھی بس میں تھے۔ دونوں جیپیں بس کو حفاظت میں لے کر چل پڑیں۔ ایک بار پھر موت کا سفر شروع ہوگیا تھا۔ رات بھر میں نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرلیا گیا۔ جوالا پور کے قریب ایک گروہ بس کی طرف لپکا مگر فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ کچھ مرے، کچھ زخمی ہوئے باقی بھاگ گئے۔ پھر صبح ہوگئی۔

خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سفر رکے بغیر جاری رہا۔ روشنی پوری طرح ہوگئی تو اچانک برقع میں لپٹی ایک عورت کے حلق سے عجیب سی چیخ نکلی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اکرام پر جھپٹی۔ اکرام ہونق ہوگیا تھا۔ عورت برقع میں چھپی چھپی اکرام سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے سینے سے منہ رگڑ رہی تھی۔ میں خود ہکا بکا ہوگیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سب ہی حیران تھے۔ اچانک راؤ صاحب بولے۔

''ارے اکرام میاں! اس کی صورت تو دیکھو۔ تمہاری کوئی نہ ہو، بیچاری گونگی ہے۔'' اب اکرام کو ہوش آیا۔ اس نے عورت کے چہرے سے برقع ہٹایا۔ میری آنکھیں بھی اسی طرف نگراں تھیں اور پھر میرے دل کی حالت عجیب ہوگئی۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو الفاظ میں نہیں بیان کرسکتا۔ ثریا تھی۔ اکرام کی بہن...... اور...... اور......!

میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اکرام بھی اس کا چہرہ دیکھ کر چند لمحات کیلئے پتھرا گیا تھا۔ پھر اس نے ثریا کو اپنے سینے میں سمولیا۔ اس کی مدھم مدھم سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''شکر ہے مالک کا...... کون ہے یہ اس کی؟'' راؤ صاحب نے پوچھا۔

''بہن......'' میں نے جواب دیا۔

''ماری باندھی آگئی تھی۔ اکیلی تھی، سلام کیا تھا مجھے اشارے سے۔ آنکھوں میں شرم و حیا تھی۔ گو زبان نہیں تھی بیچاری کی مگر سمجھ میں آگیا کہ مسلمان ہے، ساتھ رکھ لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا بھائی مل گیا اور ایک فرض سے سبکدوشی ہوگئی۔''

شمسہ مل گئی تھی، ثریا مل گئی تھی۔ اللہ کے احسان سے گردن جھکی ہوئی تھی۔ سارے وسوسے دل سے نکلتے جارہے تھے۔ کھیل کیسے شروع ہوگا، کیسے ختم، انسان کیا جانے۔ یہ سب کچھ کسی اور ہی کا کام ہے۔

ثریا، اکرام کے سینے سے لگی رہی۔ نڈھال ہوگئی تھی۔ مونا باؤ پہنچ گئے۔ شمس اللہ کے ساتھ آئے ہوئے فوجی واپس چلے گئے۔ اللہ نے ہمیں سلامتی کے ساتھ پاک وطن پہنچا دیا تھا۔ پناہ گزینوں کے مجمع لگے ہوئے تھے۔ لٹے پٹے قافلے درد کی لاکھوں کہانیاں سمیٹے آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔ وطن نوزائیدہ تھا، وسائل ناکافی تھے۔ جس طرح

بن پڑ رہا تھا، آنے والوں کو سہولتیں مہیا کی جا رہی تھیں۔ ہم نے بھی ایک گوشہ اپنا لیا۔ بوریاں، ٹرنک، گٹھڑیاں دیوار بنے ہوئے تھے۔ بس انہی کی پردہ پوشی تھی، یہی چار دیواری تھی۔ راؤ تجمل حسین پر بھی وہی بیت رہی تھی۔ جو کچھ چھوڑ دیا تھا پاکستان کیلئے، وہ اس عمر میں دوبارہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ ثریا نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا اور ایک عجیب سا احساس جھلکنے لگا تھا اس کی آنکھوں سے۔

مخیر حضرات مصروف عمل تھے۔ جسے دیکھو دل کھولے دے رہا ہے۔ آنے والوں کیلئے اتنا کچھ کھانے پینے کو آ رہا تھا کہ منع کرنا پڑتا تھا۔ معذرت کرنی پڑ رہی تھی کہ بھائی کھا چکے ہیں، اللہ کا دیا موجود ہے۔ دو دن یہاں گزر گئے۔ میرپور خاص کیلئے ریل چکر لگا رہی تھی۔ سب کی پرچیاں کٹ چکی تھیں۔ نمبر سے باری آ رہی تھی۔ تیسرے دن کی بات ہے فجر کی نماز سے فارغ ہوا تھا۔ یونہی سوچ میں بیٹھا ہوا تھا کہ نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ صندوق رکھے ہوئے تھے، ان کے درمیان رخنے بھی بنے ہوئے تھے۔ میری نظر سامنے والے رخنے کے دوسری سمت اٹھ گئی۔ ایک پُرنور چہرہ نگاہوں کے سامنے تھا اور یہ چہرہ...... بھلا آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں بھلا؟ وہ لگن جس نے ایک طویل عرصے سے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی، بینائی کو متاثر کر سکتی ہے۔ ماں تھی میری، امی تھیں میری، یقینی طور پر وہی تھیں۔ بدن میں بجلیاں بھر گئیں، دیوانوں کی مانند اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور ٹین کی اس دیوار کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ نماز پڑھ رہی تھیں، سر جھکا ہوا تھا، اللہ کے حضور سربسجود تھیں۔ جانتا تھا کہ ان کے دل میں کیا دعا ہوگی۔ ماموں ریاض اور ابو بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ لاغر، لاچار مفلوک الحال، بے بسی کا شکار...... میرے کلیجے کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا، آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ بدن میں ایسا تشنج پیدا ہو گیا تھا کہ پیروں پر قابو نہیں پا سکا۔ ایک عجیب سا انداز طاری ہو گیا تھا مجھ پر۔ دو قدم آگے بڑھا اور دھڑام سے ان کے سامنے گر پڑا۔ قوت گویائی تو مفلوج تھی ہی، بدن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ابو اور ماموں ریاض چونک پڑے تھے۔

انہوں نے تاسف بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آگے سہارا دینے کیلئے بڑھے لیکن باپ کی نگاہ تھی۔ وہی دل کے تار جنہیں کوئی شے غیر مرئی طور پر آپس میں جوڑے رکھتی ہے، بھلا ان تاروں میں لرزش کیوں نہ ہوتی۔ تار جھنجنائے۔ ابو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر ایک دلدوز چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئے۔

''مسعود! میرے بچے مسعود۔'' اور یہ الفاظ ایسے تھے کہ امی بھی خود پر قابو نہ پا سکیں۔ ماموں ریاض پاگلوں کی طرح چیخے۔

''ہاں مسعود، ہمارا مسعود ہی ہے، مسعود ہی ہے۔'' ایسے مناظر یہاں عام تھے۔ ایسے واقعات گوشے گوشے میں ہو رہے تھے۔ ہر لحہ کہیں نہ کہیں سے آوازیں ابھر آتی تھیں، بھلا ان آوازوں کی جانب کون متوجہ ہوتا لیکن اس گوشے میں جو کچھ ہوا تھا، وہ عام واقعات میں سے نہیں تھا۔ یہاں تو کہانی ہی انوکھی تھی، یہ تو ملاپ ہی غیر یقینی تھا۔ صدیوں کے بچھڑے ملے تھے، کسے یقین آتا۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے کٹھ پتلیاں نچانے والا کھیل ختم کر چکا ہو، سارے دھاگے قریب لائے جا رہے ہوں۔ سب کو پتا چل گیا کہ میرے ماں، باپ مل گئے ہیں۔ شمسہ، ماں کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ابو نے مجھے کلیجے میں بھینچ رکھا تھا۔ محمود باقی رہ گیا تھا۔ میں نے انہیں خوشخبری سنائی کہ وہ زندہ سلامت ہے، وہ ضرور ہم سے آ ملے گا۔ مبارک ہے یہ وطن پاک جس نے صدیوں کا طلسم توڑ دیا۔ مبارک ہے پاکستان جس نے بچھڑوں کو ملا کر دل کے زخم سی دیئے۔

اکرام نے کہا۔ ''مسعود بھائی! میں نہ کہتا تھا کہ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' گزرے وقت کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنائی گئیں۔ ماموں ریاض خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''وطن پاک نے ہمیں نئی زندگی سے نوازا ہے...... ہم باہمت ہیں، ایک بار پھر وہی گھر بنا لیں گے۔ ہم ایک بار پھر اسی زندگی کا آغاز کریں گے۔''

ہماری روانگی کا وقت آ گیا۔ میرپور خاص، حیدرآباد پھر کراچی۔ کراچی میں ہمیں پرانی نمائش کے کیمپ میں جگہ ملی تھی۔ رفتہ رفتہ زندگی آگے سفر کر رہی تھی۔ یہاں کیمپ میں ہم نے اپنا انتظام کیا۔ امی کو بخار ہو گیا۔ شمسہ اور ثریا نے انہیں ہاتھوں میں

سنبھالا ہوا تھا۔ میرے دل میں ایک خیال سر ابھارنے لگا۔ پورنی میرے قبضے میں ہے، سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔ اس کے ذریعے ایک عالیشان رہائش گاہ، زر و جواہر کے انبار۔ اتنے عرصے کے بعد یہ لوگ ملے ہیں، کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

''غلط......'' عقب سے آواز آئی اور میری گردن گھوم گئی۔ دن کی روشنی میں بھی اس گدڑی پوش کو دیکھ چکا تھا' جو پیوند لگی گدڑی میں سر سے پاؤں تک چھپا بیٹھا تھا۔ اب شام کے دھندلکوں میں بھی وہ وہیں موجود تھا۔ اس نے یہ جملہ کہا تھا۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں شاہ جی! غلط سوچ رہے ہو۔'' گدڑی پوش نے چہرے سے گدڑی ہٹا کر کہا۔ میں اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔ نادر حسین تھا۔ میرے کچھ کہنے سے قبل وہ بول اٹھا۔ ''برے بھلے کی تمیز دی گئی ہے۔ رزق حلال ہر طرح افضل ہے۔ کالی طاقت زہر کا تریاق ہے تو ٹھیک ہے زہر کو زہر سے مارو، لوہے کو لوہے سے کاٹو...... خلق خدا کی مدد کرنے میں حرج نہیں مگر گندگی سر پر نہیں اوڑھنی چاہئے۔ بازو دیئے ہیں اللہ نے، محنت سے کماؤ، ہمت سے جیو...... دنیا داری، ترک دنیا سے بہتر ہے۔''

اس نے دوبارہ گٹھری میں منہ چھپا لیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''نادر حسین! تم بھی یہاں آ گئے؟'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''منہ تو کھولو نادر حسین! میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی گدڑی کھینچی لیکن گدڑی زمین پر پھسل گئی۔ نادر حسین اس میں نہیں تھا۔ میں سکتے میں رہ گیا' لیکن مجھے علم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے نادر حسین کو بہت کچھ دے دیا تھا۔ وہ فنا فی اللہ ہو گیا تھا۔

میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ مجھے پورنی کے بارے میں ہدایت دی گئی تھی۔ اس کی کالی قوت، کالے علم کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ اس سے اپنے لئے کچھ نہیں لے سکتا تھا۔ اس ہدایت سے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب صرف محنت کی کمائی پر گزارا کرنا ہے۔ وقت کا انتظار کروں تو سب سے بہتر ہے ورنہ سزا بھگت چکا تھا۔

اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کیمپ میں محبت و اخوت، بھائی چارے کے ایسے مظاہرے ہو رہے تھے کہ آنسو نکل آتے تھے۔ جسے دیکھو پناہ گزینوں کیلئے اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ۔ امدادی اشیاء کے انبار چلے آ رہے ہیں، حکومت الگ آسانیاں فراہم کر رہی تھی۔ ایک سہ پہر ایک رئیس پھل اور مٹھائیاں لے کر آیا۔ چار ملازم یہ اشیاء تقسیم کر رہے تھے۔ وہ خود نگرانی کر رہا تھا۔ نوجوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ ماموں ریاض نے اسے سب سے پہلے دیکھا۔ بے تابی سے اٹھ کھڑے ہوئے، قریب پہنچے اور آہستہ سے بولے۔

''میاں! آپ کا نام محمود احمد تو نہیں ہے؟'' نوجوان نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھلوں کا تھیلا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے ایک چیخ ماری۔

''ماموں ریاض......'' اور ان سے لپٹ گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بساط کا آخری مہرہ بھی مل گیا تھا، آشیانے کا آخری پرندہ بھی واپس آشیانے میں آ گیا۔ محمود نے تو صرف ماموں ریاض کو پایا تھا۔ سب کو دیکھ کر مسرت سے دیوانہ ہو گیا۔ امی کا بخار شاید اسی لیے تھا۔ ایسی خوش ہوئیں کہ بخار کا نام و نشان نہیں رہا۔ محمود کراچی میں رہتا تھا۔ جمشید روڈ پر اس کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں ہمیں ... نے اپنی کہانی سنائی۔ کئی سال وہ ملک سے باہر رہا اور اس نے خوب دولت کمائی۔ پھر ماں باپ کیلئے بے چین ہو کر واپس آ گیا اور احتیاطاً اس نے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ خفیہ طور پر ماں باپ کو تلاش کرے گا۔ اسی اثناء میں پاکستان بن گیا اور اسے یہاں رکنا پڑا۔

محمود کی اس حیثیت نے کایا ہی پلٹ دی۔ کوئی مشکل نہ رہی۔ اس نے اپنا کاروبار بھی تقسیم سے پہلے یہاں مستحکم کر لیا تھا۔ اکرام، فیضان اور شامی بھی اب غیر نہیں تھے۔ یہاں سب کی کھپت تھی۔ چنانچہ سب تعمیر وطن میں مصروف ہو گئے۔ ہم وطن ہی کے فرد تھے۔ نیک راہوں پر چل کر اپنے گھر کیلئے ہی باعزت روزی حاصل کر لی جائے تو خدمت وطن ہوتی ہے۔ اب اس بارے میں کیا عرض کروں، شرم محسوس ہوتی ہے کہ میری خواہش پر ثریا سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ یہ میری دلی آرزو تھی۔ معصوم و

مظلوم ثریا میری زندگی میں شامل ہوگئی۔ پورنی سے میں نے بھوریا چرن کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''پرم پردھانی وہ شنکھا ہے۔ شنکھا تین بار کالے جنم لیتا ہے۔ ہاں اگر وہ کھنڈولا بن جائے تو پھر اسے امرشکتی حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے وہ مر گیا تھا' مگر کون جانے وہ کب نیا جنم لے لے۔ ہر جنم میں وہ کھنڈولا بننے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اگر اس کے تینوں جنم ختم ہوجائیں تو وہ پھر نہیں جیتا۔'' گویا بھوریا چرن کے دوبارہ سامنے آنے کے امکانات ہیں۔

لیکن چالیس سال گزر چکے ہیں، خدا کا احسان ہے کہ ان چالیس سالوں میں مجھے وہ کبھی نہیں نظر آیا۔ ہمارا باغ ہرا بھرا ہے۔ میرے' محمود کے شامی اور شمسہ کے بہت سے بچے ہیں۔ میں نے زندگی گزارنے کیلئے کاروبار کرلیا تھا۔ اللہ کا احسان ہے، دیانت سے خوب چل رہا ہے۔ خلق خدا کی جس طرح مدد ہوتی ہے، کرتا ہوں۔ پورنی میری غلام ہے۔ کالے جادو کا توڑ مجھ سے بہتر کوئی نہیں کر پاتا۔ اتنے پُراسرار اور پیچیدہ واقعات پیش آئے ہیں ان چالیس سالوں میں کہ سنانے بیٹھوں تو پھر اتنی ہی طویل ایک داستان کا آغاز ہوجائے۔ چلئے یار زندہ، صحبت باقی۔ ہاں! اگر کہیں گھر کی دیواروں پر یا کسی درخت پر کوئی پیلی مکڑی نظر آجاتی ہے تو اپنے بدن کی لرزشوں پر قابو نہیں پاسکتا۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔ آمین...... آپ کا مسعود احمد۔

(تمت بالخیر)
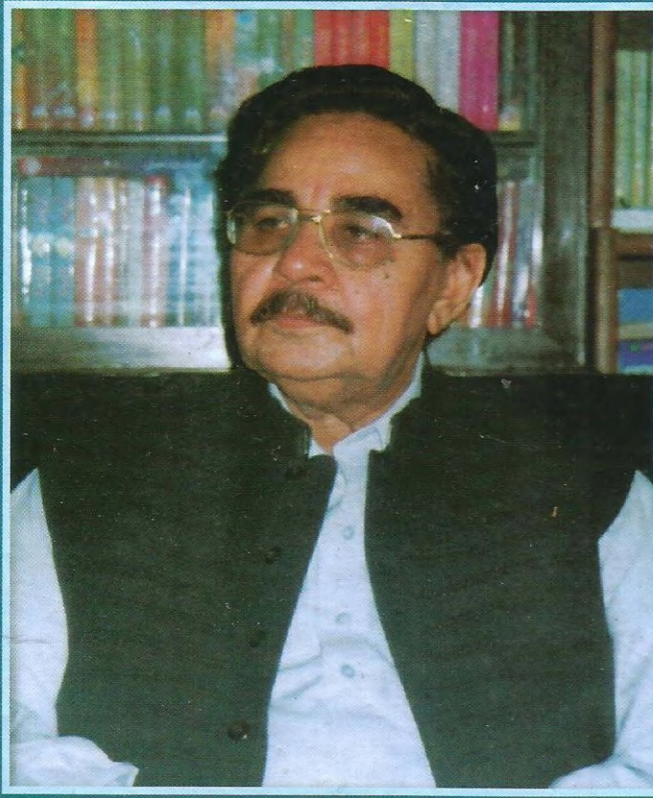
یہ ایک ایسے نوجوان کی داستان الم ہے جس کے خواب نوٹوں سے سجے تھے۔

وہ راتوں رات امیر ہونا چاہتا تھا۔ دولت کے حصول کیلئے اس نے ناجائز راستے اختیار کر لئے۔

نتیجے میں وہ ایک ایسے شیطان کے چنگل میں پھنس گیا جس نے اسے اپنے مذموم عزائم کیلئے استعمال کرنا چاہا،

انکار کرنے پر اس شیطان کے عتاب کا شکار ہوا قاتل بنا، پھانسی پر چڑھا کسی طرح پھانسی سے بچا تو

والدین چھن گئے، بھائی جدا ہو گیا، بہن گم ہو گئی، خود در بدر ہوا اور پھر مصائب کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔

نت نئی مشکلات، کپکپا دینے والے واقعات، خوفزدہ کر دینے والے حادثات

ایک طرف کالے جادو کا فریب تھا تو دوسری طرف ایمان کی روشنی تھی

نیکی بدی کی اس جنگ میں کون جیتا........؟

ایک دلچسپ ناول جسے ختم کئے بنا آپ کو چین نہ آئے گا۔

9789696021773

Website: www.a[illegible]ish.com [illegible] info@alquraish.com

Join [illegible] AL[illegible]URA[illegible]SH PUBLICATIONS